

آیت اللہ العظمیٰ محمد حسین صاحب مدظلہ العالی

ترجمہ

# المیزان

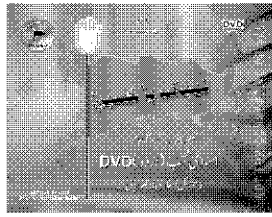
فی

# تفسیر القرآن

آیت اللہ حسن رضا قادری

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرون ملک مقیم ہیں  
مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔



منجانب۔

سبیل سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدرآباد پاکستان



۷۸۶

۹۲-۱۱۰

یا صاحب الزماں اور کئی

DVD  
Version

# لبیک یا حسینؑ

نذر عباس  
خصوصی تعاون: رضوان رضوی

اسلامی کتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری -

SABIL-E-SAKINA

Unit#8,

Latifabad Hyderabad  
Sindh, Pakistan.

[www.sabelesakina.page.fl](http://www.sabelesakina.page.fl)

[sabelesakina@gmail.com](mailto:sabelesakina@gmail.com)

Presented by [www.ziaraat.com](http://www.ziaraat.com)

[www.ziaraat.com](http://www.ziaraat.com)

NOT FOR COMMERCIAL

تالیف:

علامہ السید محمد حسین الطباطبائی

ترجمہ

حسین سکیہ

حیدرآباد، حیدرآباد، پندرہ نمبر ۸-۲۱

# المیزان

فی تفسیر القرآن

(علمی، فنی، فلسفی، ادبی، تاریخی اور حدیثی معارف سے مزین)

جلد ۳

ترجمہ

آیت اللہ حسن رضا غدیری

جملہ حقوق بحق الغدیر اکیڈمی محفوظ ہیں

انٹرنیشنل سینٹر روڈ بک نمبرنگ ایجنسی، حکومت پاکستان، اسلام آباد سے رجسٹرڈ

ISBN No.

978-969-8947-07-1

شناس نامہ کتاب

نام کتاب ..... المیزان فی تفسیر القرآن

جلد ..... سوم

تالیف ..... آیت اللہ علامہ محمد حسین طباطبائی طاب ثراہ

ترجمہ ..... آیت اللہ حسن رضا غدیری مدظلہ العالی

اہتمام و ترتیب ..... سید دولت علی زیدی

ناشر ..... الغدیر اکیڈمی، پاکستان

تدوین و تزئین ..... الحاج آغا محمد رضا غدیری

تاریخ اشاعت ..... مئی 2008ء

بار ..... اول

پبلیکیشن ..... فاطمیہ ٹرسٹ، لندن

مطبع ..... پبلیشنگ پریشرز

13- فین روڈ۔ لاہور فون: 03004442227

☆ ملنے کا پتہ ☆ الغدیر اکیڈمی، حسینہ ہال، ہوپ روڈ، لوکوشیڈ، لاہور - 54900 (پاکستان)

فون 6811712 - 6840622 (+92-42)

Hussaini Research Center ☆

45-Peter Avenue, London, NW10 2DD U.K.

Tel: (+44) 208 621 4088

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## والباقیات الصالحات خیر عند ربک ثواباً و خیر عملاً

انسانی معاشرہ کی بقا ان افراد کے وجود سے وابستہ ہوتی ہے جن کا عقیدہ صحیح اور عمل نیک ہو، وہ دوسروں کو عزت و سعادت کی دولت و نعمت سے بہرہ مندی کی راہ دکھاتے ہی نہیں بلکہ اس پر لاکھڑا کرتے ہیں، ان کے اعمال کو قرآنی زبان میں باقیات صالحات سے موسوم کیا گیا ہے کیونکہ وہ صرف اسی زمانہ اور انہی کی ذات تک محدود نہیں ہوتے بلکہ ان کی اثرگذاری کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے اور دیگر افراد بشر کے لئے شمع راہ ہی نہیں متاع دوام بھی بن جاتے ہیں، انہی خوش قسمت اور بلند پایہ شخصیات میں ایک معتبر نام جناب مولانا سید نور شاہ کاظمی اعلیٰ اللہ مقامہ کا ہے جنہوں نے علاقہ رتہ متہ میں علوم و معارف کو دو بالا کیا، موصوف ایک عالم باعمل، مقدس اور عابد و زاہد انسان تھے، انہوں نے اپنی پاکیزہ سیرت و کردار کے ذریعے دین اسلام و مذہب اہل بیت علیہم السلام کی جو عظیم خدمت کی وہ ان کے لئے توشیحہ آخرت ہے، اس کا صحیح اجر تو خداوند عالم اور حضرات آئمہ معصومین ہی دیں گے کیونکہ موصوف نے جو کچھ بھی انجام دیا وہ انہی کی رضا و خوشنودی کے حصول کی غرض سے کیا تھا لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح کی علمی و عملی تبلیغ کا اعزاز خداوند عالم کی طرف سے حاصل تو فائق کے بغیر ممکن نہیں ہوتا کیونکہ وہ دلوں کے رازوں کو جانتا ہے اور ہر شخص کو اس کی مقصودہ غرض کے مطابق جزا دیتا ہے، خدا کا فضل و کرم اپنے نیک و صالح بندوں کے لئے مخصوص ہے وہ رحمن ہے یعنی اپنی تمام مخلوق پر عنایت کی بارش برساتا ہے، وہ رحیم ہے یعنی اپنے خاص مخلص اطاعت گزار بندوں کو اپنی رحمت سے نوازنے والا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر دنیا میں خدا کے نیک و صالح بندے موجود نہ ہوں تو دنیا تباہ و برباد ہو جائے، مولانا سید نور شاہ کاظمی مرحوم نے اپنی نئی زندگی میں بھی سادگی، قناعت اور زاہدانہ روش کو اپنایا جس سے ان کی دینی پہچان کا تشخص قائم ہوا، موصوف کی انہیں انفرادی و اجتماعی صفات کی قدر دانی کے طور پر ان کی روح کو شاد کرنے کے لئے ان کے فرزند ارجمند حجۃ الاسلام مولانا سید کلب عباس کاظمی آف گا ہی سیدان تحصیل و ضلع راولپنڈی (حال مقیم لندن) نے جہاں دیگر عبادتی اعمال انجام دیئے وہاں کتاب حاضر تفسیر المیزان جلد ۳ کی اشاعت میں مکمل مالی تعاون کیا، ادارہ تمام قارئین کرام سے ملتئم ہے کہ مولانا سید کلب عباس کاظمی کے والدین اور دیگر بزرگان خاندان مرحومین و مرحومات کے ایصالِ ثواب کے لئے سورہ مبارکہ فاتحہ و سورہ اخلاص کی تلاوت کے ساتھ ساتھ ان کی بلندی درجات کے لئے دعا کریں، خداوند عالم مولانا موصوف کی یہ دینی خدمت اور عبادتی عمل کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے اور ہم سب کو اپنی مقدس کتاب کے فہم المعانی اور اس کی ارفع و اعلیٰ تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق دے۔

سید دولت علی زیدی  
الغدیرا کیڈمی پاکستان

سورۃ آل عمران  
۲۰۰ آیات پر مشتمل

## سورۃ آل عمران

۲۰۰ آیات پر مشتمل

یہ سورۃ مبارکہ مدینہ منورہ میں نازل ہوا





## فہرست

- ۱۔ موضوعی فہرست ..... ۲۰
- ۲۔ حرفِ اِذَل ..... ۲۵
- ۳۔ پیشِ گفتار ..... ۲۷
- ۴۔ آیات ۶ تا ۱ ..... ۲۹
- ۵۔ تفسیر و بیان ..... ۳۱
- ۶۔ خدا کی وحدانیت کا واضح اعلان ..... ۳۲
- ۷۔ قرآن کی برحق تنزیل ..... ۳۴
- ۸۔ ”نزول“ کی اصل حقیقت ..... ۳۶
- ۹۔ ”حق“ سے کیا مراد ہے ؟ ..... ۳۷
- ۱۰۔ تورات و انجیل کے نزول کا ذکر ..... ۳۹
- ۱۱۔ فرقان کا نزول ..... ۴۰
- ۱۲۔ آیت الہی کے منکرین کا انجام ..... ۴۳
- ۱۳۔ ”عذاب“ کا معنی، قرآنی نقطہ نگاہ سے ! ..... ۴۴
- ۱۴۔ خدا سے کچھ پوشیدہ نہیں ..... ۴۹
- ۱۵۔ رحموں میں تصویر کشی ..... ۵۰
- ۱۶۔ تقدیر کے حوالہ سے ایک اہم نکتہ ..... ۵۲
- ۱۷۔ ایک علمی نکتہ ..... ۵۲
- ۱۸۔ یکتا، غالب و دانا معبود ..... ۵۳
- ۱۹۔ روایات پر ایک نظر ..... ۵۳
- ۲۰۔ تاریخ کے اوراق سے ! ..... ۵۳
- ۲۱۔ خوش بخت اور بد بخت ..... ۵۶
- ۲۲۔ تخلیق کے مراحل ..... ۵۶
- ۲۳۔ روایات کی تشریح و توضیح ..... ۵۸
- 
- ۲۴۔ آیات ۷ تا ۹ ..... ۶۳
- ۲۵۔ تفسیر و بیان ..... ۶۵
- ۲۶۔ قرآن کا دفعتاً نزول ..... ۶۵
- ۲۷۔ محکم و متشابہ آیات ..... ۶۵
- ۲۸۔ ایک لطیف نکتہ ..... ۶۸
- ۲۹۔ ایک سوال اور اس کا جواب ..... ۷۱
- ۳۰۔ قتنہ پر در لوگ ..... ۷۳
- ۳۱۔ تاویل کا علم ..... ۸۳
- ۳۲۔ ”راخون فی العلم“ کا قول ..... ۸۶
- ۳۳۔ ایمان والوں سے خطاب ..... ۸۷
- ۳۴۔ طلب ہدایت و رحمت ..... ۸۹
- ۳۵۔ ایک سوال اور اس کا جواب ..... ۹۰
- ۳۶۔ قیامت کے دن کی حضوری ..... ۹۱
- ۳۷۔ ایک نہایت لطیف ادبی نکتہ ..... ۹۲
- ۳۸۔ ایک ادبی سوال اور اس کا جواب ..... ۹۴
- ۳۹۔ محکم، متشابہ اور تاویل کی بابت تفصیلی بحث ..... ۹۴

- ۳۰۔ محکم اور تشابہ ..... ۹۵
- ۳۱۔ پہلا قول ..... ۹۶
- ۳۲۔ دوسرا قول ..... ۹۸
- ۳۳۔ تیسرا قول ..... ۹۹
- ۳۴۔ چوتھا قول ..... ۱۰۰
- ۳۵۔ پانچواں قول ..... ۱۰۱
- ۳۶۔ چھٹا قول ..... ۱۰۱
- ۳۷۔ ساتواں قول ..... ۱۰۳
- ۳۸۔ آٹھواں قول ..... ۱۰۳
- ۳۹۔ نواں قول ..... ۱۰۴
- ۵۰۔ دسواں قول ..... ۱۰۵
- ۵۱۔ گیارھواں قول ..... ۱۰۵
- ۵۲۔ بارھواں قول ..... ۱۰۶
- ۵۳۔ تیرھواں قول ..... ۱۰۸
- ۵۴۔ چودھواں قول ..... ۱۰۸
- ۵۵۔ پندرھواں قول ..... ۱۰۹
- ۵۶۔ سولہواں قول ..... ۱۱۰
- ۵۷۔ محکمات کو ام الکتاب قرار دینے سے  
کیا مراد ہے؟ ..... ۱۱۸
- ۵۸۔ تاویل کا معنی کیا ہے؟ ..... ۱۲۱
- ۵۹۔ تفسیر و تاویل کی بابت سات اقوال ..... ۱۲۵
- ۶۰۔ کیا خدا کے علاوہ کوئی شخص تاویل  
قرآن کا علم رکھتا ہے؟ ..... ۱۳۲
- ۶۱۔ کتاب خدا میں تشابہات کیوں ہیں؟ ..... ۱۴۴
- ۶۲۔ روایات پر ایک نظر ..... ۱۵۶
- ۶۳۔ محکم اور تشابہ کا فرق ..... ۱۵۶
- ۶۴۔ ناسخ اور منسوخ کا فرق ..... ۱۵۷
- ۶۵۔ تشابہ و محکم کی بابت رہنمائی ..... ۱۵۷
- ۶۶۔ قرآن اور معرفت الہی ..... ۱۵۹
- ۶۷۔ روایت کی تشریح ..... ۱۶۰
- ۶۸۔ تاویل الکتاب سے آگاہ ہستیاں ..... ۱۶۱
- ۶۹۔ امام موسیٰ کاظم کا عالمانہ و عارفانہ ارشاد ..... ۱۶۲
- ۷۰۔ ”راخون فی العلم“ کے بارے میں  
حدیث نبوی ..... ۱۶۳
- ۷۱۔ ”راخون فی العلم“ کی پہچان ..... ۱۶۳
- ۷۲۔ پیغمبر اسلام کی دعا ..... ۱۶۳
- ۷۳۔ وحی کے بارے میں حضرت علیؑ  
کا فرمان ..... ۱۶۵
- ۷۴۔ ارشادات نبویؐ، ہدایت و رہنمائی  
کی قدیمیں ..... ۱۶۵
- ۷۵۔ قرآن کی صفات و فضائل ..... ۱۶۷
- ۷۶۔ حدیث نبویؐ کی تشریح  
بزبان امام محمد باقرؑ ..... ۱۶۸
- ۷۷۔ دواہم نکتے ..... ۱۷۰
- ۷۸۔ قرآن کی دائمی ہدایت ..... ۱۷۱
- ۷۹۔ قرآن کے ظاہر و باطن سے کون  
مراد ہیں؟ ..... ۱۷۱
- ۸۰۔ ہر آیت کے چار معانی ..... ۱۷۲

۲۱۶	۱۰۲	کافروں کے مغلوب ہونے کی اطلاع ..	۱۷۲	۸۱	تشریح و توضیح .....
۲۱۶	۱۰۳	جنگ بدر میں خدائی نشانی .....	۱۷۴	۸۲	قرآن اور سات حروف .....
۲۱۹	۱۰۴	دو دم مقابل لشکروں کا تذکرہ .....	۱۷۶	۸۳	روایات پر دوسری نظر .....
۲۱۹	۱۰۵	ایک ادبی بحث .....	۱۷۶	۸۴	تفسیر بالرائے کے بارے میں ! .....
۲۲۱	۱۰۶	خدائی نصرت کا اظہار .....	۱۷۶	۸۵	واضح و صریح ارشاد نبویؐ .....
۲۲۳	۱۰۷	دنیاوی زندگی کی مادی لذتیں .....	۱۷۷	۸۶	تفسیر بالرائے کے مرتکب کا انجام .....
۲۲۶	۱۰۸	ایک اہم نکتہ کی وضاحت .....		۸۷	رائے اور تفسیر بالرائے کی بابت
۲۳۲	۱۰۹	ایک سوال اور اس کا جواب .....	۱۷۸		تفصیلی بحث .....
۲۳۳	۱۱۰	زینت کس نے دی اور کیوں دی؟ .....	۱۸۱	۸۸	تفسیر بالرائے کی بابت دس اقوال .....
۲۳۴	۱۱۱	محبت و چاہت کے موارد .....	۱۸۴	۸۹	خدا اور مخلوق کے کلام کا فرق .....
۲۳۶	۱۱۲	ایک اہم نکتہ .....	۱۸۹	۹۰	امام جعفر صادقؑ کا ارشاد گرامی .....
۲۳۸	۱۱۳	دنیاوی زندگی کا ساز و سامان .....	۱۹۲	۹۱	امیر المومنینؑ کا ارشاد گرامی .....
۲۳۸	۱۱۴	بہتر اور بقا شعار زندگی کی نشاندہی .....	۱۹۳	۹۲	غلط تفسیریں کرنے کا نتیجہ .....
۲۳۹	۱۱۵	دوا اہم نکات .....	۱۹۴	۹۳	آیات کی تفسیر و تکذیب کی ممانعت .....
۲۵۲	۱۱۶	بندوں سے کامل آگاہی .....	۱۹۵	۹۴	ایک سوال اور اس کا جواب .....
۲۵۳	۱۱۷	ایک لطیف نکتہ .....		۹۵	ظاہر القرآن اور ظاہر البیان
۲۵۳	۱۱۸	اشکال و اعتراض .....	۲۰۰		کی وضاحت .....
۲۶۱	۱۱۹	متقین کی دعا .....			-----
۲۶۲	۱۲۰	ایک سوال اور اس کا جواب .....	۲۰۴	۹۶	آیات ۱۰ تا ۱۸ .....
۲۶۳	۱۲۱	متقین کی پانچ صفات .....	۲۰۸	۹۷	تفسیر و بیان .....
۲۶۵	۱۲۲	توحید کی گواہی .....	۲۰۹	۹۸	کافروں کی بے بسی و بد انجامی کا تذکرہ .....
۲۶۶	۱۲۳	ایک لطیف نکتہ .....	۲۱۱	۹۹	جہنم کا ایندھن .....
۲۶۸	۱۲۴	صحابان علم کی گواہی .....	۲۱۲	۱۰۰	ایک ادبی نکتہ .....
۲۶۹	۱۲۵	دوا اہم نکات کا بیان .....	۲۱۲	۱۰۱	فرعونوں کے طرز عمل سے تمثیل .....

- ۱۲۶۔ ایک نہایت کمزور رائے ..... ۲۶۹
- ۱۲۷۔ خدائے واحد کی قوت و حکمت ..... ۲۷۳
- ۱۲۸۔ روایات پر ایک نظر ..... ۲۷۵
- ۱۲۹۔ قریش کے برے انجام کا حوالہ ..... ۲۷۵
- ۱۳۰۔ امام جعفر صادقؑ کا ارشاد گرامی ..... ۲۷۶
- ۱۳۱۔ دو اماموں کا بیان ..... ۲۷۸
- ۱۳۲۔ استغفار کی اہمیت اور آثار ..... ۲۷۸
- ۱۳۳۔ آیات ۱۹ تا ۲۵ ..... ۲۸۰
- ۱۳۴۔ تفسیر و بیان ..... ۲۸۴
- ۱۳۵۔ خدائی دین کا تعارف ..... ۲۸۴
- ۱۳۶۔ اہل کتاب کا اختلاف کیوں؟ ..... ۲۸۵
- ۱۳۷۔ دو اہم نکات ..... ۲۸۶
- ۱۳۸۔ حاجت کی صورت میں خدائی فرمان ..... ۲۸۷
- ۱۳۹۔ ایک اہم نکتہ ..... ۲۸۸
- ۱۴۰۔ دوسرا اہم نکتہ ..... ۲۸۹
- ۱۴۱۔ تیسرا اہم نکتہ ..... ۲۸۹
- ۱۴۲۔ دعوت اسلام کی ایک مخصوص صورت ..... ۲۸۹
- ۱۴۳۔ آیات الہی کا انکار کرنے والے ..... ۲۹۲
- ۱۴۴۔ اہل کتاب کے بارے میں خصوصی بیان ..... ۲۹۳
- ۱۴۵۔ اہل کتاب کا غلط نظریہ ..... ۲۹۳
- ۱۴۶۔ قیامت کے دن کی یاد دہانی ..... ۲۹۶
- ۱۴۷۔ روایات پر ایک نظر ..... ۲۹۸
- ۱۴۸۔ دین کی حقیقت ..... ۲۹۸
- ۱۴۹۔ ولایت علی بن ابی طالبؑ ..... ۲۹۸
- ۱۵۰۔ امام علیؑ کے ارشاد گرامی کا اتھاقی ذکر ..... ۲۹۹
- ۱۵۱۔ بنی اسرائیل کے جرائم کا تذکرہ ..... ۳۰۱
- ۱۵۲۔ حق کی پیروی کی دعوت ..... ۳۰۲
- ۱۵۳۔ آیات ۲۶، ۲۷ ..... ۳۰۳
- ۱۵۴۔ تفسیر و بیان ..... ۳۰۴
- ۱۵۵۔ بارگاہ ربوبی میں طلب خیر کی التجاء ..... ۳۰۴
- ۱۵۶۔ ملکیت و مالکیت کی بحث ..... ۳۰۵
- ۱۵۷۔ خداوند عالم کی مالکیت مطلقہ ..... ۳۰۷
- ۱۵۸۔ تین اہم نکات ..... ۳۱۰
- ۱۵۹۔ عطا کرنا اور محروم کرنا سب خدا کے ہاتھ میں ہے ..... ۳۱۱
- ۱۶۰۔ ایک اہم نکتہ ..... ۳۱۲
- ۱۶۱۔ عزت و ذلت خدا کے ہاتھ میں ہے ..... ۳۱۲
- ۱۶۲۔ خدا کی قدرت مطلقہ ..... ۳۱۵
- ۱۶۳۔ مزید وضاحت ..... ۳۲۰
- ۱۶۴۔ ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ ..... ۳۲۱
- ۱۶۵۔ خدا ہر چیز پر قادر ہے ..... ۳۲۱
- ۱۶۶۔ شب و روز کا بحیر العقول نظم و نظام ..... ۳۲۲
- ۱۶۷۔ زندگی اور موت کا نظم و نظام ..... ۳۲۳
- ۱۶۸۔ ایک نظریہ کی وضاحت ..... ۳۲۴
- ۱۶۹۔ خداوند عالم کا اپنے حقیقی مالکانہ حق ..... ۳۲۵
- ۳۲۵۔ کا استعمال

- ۱۷۰۔ آیت کے معنی کا ایک اور پہلو ..... ۳۲۶
- ۱۷۱۔ بغیر حساب رزق کا عطا کرنا ..... ۳۲۷
- ۱۷۲۔ رزق کا قرآنی معنی ..... ۳۲۷
- ۱۷۳۔ تکوین و تشریح کے حوالہ سے! ..... ۳۳۰
- ۱۷۴۔ قرآنی معارف سے غلط فہمی کیوں؟ ..... ۳۳۱
- ۱۷۵۔ بعض اشیاء مضر کیوں؟ ..... ۳۳۲
- ۱۷۶۔ مزید وضاحت ..... ۳۳۵
- ۱۷۷۔ رزق کی وسعت و تنگی ..... ۳۳۷
- ۱۷۸۔ روایات پر ایک نظر ..... ۳۳۹
- ۱۷۹۔ مالک الملک سے کیا مراد ہے؟ ..... ۳۳۹
- ۱۸۰۔ مومن سے کافر اور کافر سے مومن ..... ۳۴۲
- ۱۸۱۔ ایک حدیث نبوی ..... ۳۴۳
- ۱۸۲۔ سلمان فارسی کی ایک روایت ..... ۳۴۳
- ۱۸۳۔ خطبہ جمعہ الوداع کا حوالہ ..... ۳۴۴
- ۱۸۴۔ رزق کے بارے میں امام علیؑ کا فرمان ..... ۳۴۴
- ۱۸۵۔ رزق کا آسمان سے نازل ہونا ..... ۳۴۵
- ۱۸۶۔ ایک علمی بحث ..... ۳۴۶
- ۱۸۷۔ ایک فلسفیانہ بحث ..... ۳۵۵
- 
- ۱۸۸۔ آیت ۲۸ تا ۳۲ ..... ۳۵۷
- ۱۸۹۔ تفسیر و بیان ..... ۳۵۹
- ۱۹۰۔ کافروں سے دوستی کی ممانعت ..... ۳۵۹
- ۱۹۱۔ قرآنی ادب کا ایک نمونہ ..... ۳۶۲
- ۱۹۲۔ کافروں کو اولیاء بنانے والوں کی حیثیت ..... ۳۶۳
- ۱۹۳۔ ادبی ظرافت کی ایک مثال ..... ۳۶۴
- ۱۹۴۔ تقیہ کا استثناء ..... ۳۶۴
- ۱۹۵۔ خدا کا اپنے آپ سے خبردار کرنا ..... ۳۶۶
- ۱۹۶۔ خدا کی ظاہر و باطن سے آگاہی ..... ۳۶۹
- ۱۹۷۔ قیامت کے دن اعمال کا ظاہر بظاہر ..... ۳۷۰
- دکھائی دینا (جسم اعمال) ..... ۳۷۰
- ۱۹۸۔ ایک ادبی و علمی نقطہ ..... ۳۷۲
- ۱۹۹۔ ایک ناقابل عمل تمنا کا ذکر ..... ۳۷۳
- ۲۰۰۔ خدا کا متنبہ و خبردار کرنا ..... ۳۷۴
- ۲۰۱۔ محبت خدا اور اطاعت رسولؐ ..... ۳۷۵
- ۲۰۲۔ محبت کی حقیقت! ..... ۳۷۶
- ۲۰۳۔ گناہوں کی بخشش کا وعدہ و اعلان ..... ۳۸۱
- ۲۰۴۔ اطاعت خدا اور رسولؐ ..... ۳۸۲
- ۲۰۵۔ ایک غلط فہمی کا ازالہ ..... ۳۸۲
- ۲۰۶۔ روگردانی کرنے کا نتیجہ ..... ۳۸۳
- ۲۰۷۔ روایات پر ایک نظر ..... ۳۸۵
- ۲۰۸۔ کفار کی سازش کا واقعہ ..... ۳۸۵
- ۲۰۹۔ تقیہ کے بارے میں واضح بیان ..... ۳۸۵
- ۲۱۰۔ دین اور تقیہ کا ربط ..... ۳۸۶
- ۲۱۱۔ تقیہ کے موارد کی وسعت ..... ۳۸۶
- ۲۱۲۔ محبت اور دین ..... ۳۸۶
- ۲۱۳۔ امام صادقؑ کا ایک سفر سے استناد .. ۳۸۷
- ۲۱۴۔ محبت خدا کی شان ..... ۳۸۷
- ۲۱۵۔ سنت نبویؐ سے روگردانی کا انجام ..... ۳۸۸

- ۲۱۶۔ محبت کا حقیقی معیار ..... ۳۸۸
- ۲۱۷۔ آنحضرتؐ کا انتہائی فرمان ..... ۳۸۹
- ۲۱۸۔ آیات ۳۳، ۳۴ ..... ۳۹۰
- ۲۱۹۔ تفسیر و بیان ..... ۳۹۱
- ۲۲۰۔ انتخاب خداوندی کا صریح اعلان ..... ۳۹۱
- ۲۲۱۔ برگزیدگان الہی کا تذکرہ ..... ۳۹۲
- ۲۲۲۔ ذریت و نسل کا تذکرہ ..... ۳۹۸
- ۲۲۳۔ خدا کا سنا اور جاننا ..... ۳۹۸
- ۲۲۴۔ روایات پر ایک نظر ..... ۳۹۹
- ۲۲۵۔ اہلبیتؑ کی فضیلت پر امام رضاؑ کا بیان ..... ۳۹۹
- ۲۲۶۔ خدا کا ارادہ و عمل ..... ۴۰۰
- ۲۲۷۔ ذریت کی حقیقت ..... ۴۰۱
- ۲۲۸۔ آیات ۳۵ تا ۳۱ ..... ۴۰۲
- ۲۲۹۔ تفسیر و بیان ..... ۴۰۶
- ۲۳۰۔ زوجہ عمران کی منت ..... ۴۰۶
- ۲۳۱۔ آزاد کرنے کا مرادی معنی ..... ۴۰۷
- ۲۳۲۔ ادب القرآن کا خوبصورت حوالہ ..... ۴۰۸
- ۲۳۳۔ زوجہ عمران کا اظہار حزن ..... ۴۱۰
- ۲۳۴۔ خدا کا علم و آگاہی ..... ۴۱۰
- ۲۳۵۔ مریمؑ کی نام گزاری کا اظہار ..... ۴۱۱
- ۲۳۶۔ زوجہ عمران کے یقین کا لطیف اشارہ ..... ۴۱۲
- ۲۳۷۔ نذر کی قبولیت کا خدائی اظہار ..... ۴۱۳
- ۲۳۸۔ مریمؑ کی کفالت ..... ۴۱۴
- ۲۳۹۔ زکریاؑ کا مہراب میں آنا ..... ۴۱۵
- ۲۴۰۔ حضرت زکریاؑ کی دعا ..... ۴۱۷
- ۲۴۱۔ حضرت زکریاؑ کو یحییٰ کی خوشخبری ..... ۴۱۸
- ۲۴۲۔ حضرت زکریاؑ کا اظہار حیرت ..... ۴۲۲
- ۲۴۳۔ خدا جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے ..... ۴۲۴
- ۲۴۴۔ تین دن خاموش رہنے کی ہدایت ..... ۴۲۶
- ۲۴۵۔ طلب اولاد کے حوالہ سے ایک سوال اور اس کا جواب ..... ۴۲۹
- ۲۴۶۔ تین دن خاموش رہنے کا راز ..... ۴۳۰
- ۲۴۷۔ غیبی الہامات اور شیطانی خیالات کی اصل حقیقت ..... ۴۳۱
- ۲۴۸۔ روایات پر ایک نظر ..... ۴۳۵
- ۲۴۹۔ دعائے عمران کی استجابت ..... ۴۳۵
- ۲۵۰۔ کلیسا میں ”آزاد کئے گئے“ سے کیا مراد ہے ..... ۴۳۶
- ۲۵۱۔ تفسیر العیاشی کی ایک روایت ..... ۴۳۶
- ۲۵۲۔ دعائے زکریاؑ اور ندائے ملائکہ ..... ۴۳۷
- ۲۵۳۔ روایات پر ایک اور نظر ..... ۴۳۹
- ۲۵۴۔ دل کے دوکان ..... ۴۳۹
- ۲۵۵۔ رسول اور نبی میں فرق ..... ۴۴۰
- ۲۵۶۔ بصائر الدرجات کی ایک روایت ..... ۴۴۱
- ۲۵۷۔ آیت ۴۲ تا ۶۰ ..... ۴۴۳
- ۲۵۸۔ تفسیر و بیان ..... ۴۵۰
- ۲۵۹۔ فرشتوں کا حضرت مریمؑ سے خطاب ..... ۴۵۰
- ۲۶۰۔ نساء عالمین کی سرداری ..... ۴۵۱

- ۲۶۱۔ حضرت مریمؑ کو فرماں برداری اور  
اطاعت کا حکم ..... ۴۵۲
- ۲۶۲۔ نبیؐ خبروں سے آگاہی دلانا ..... ۴۵۳
- ۲۶۳۔ مریمؑ کی کفالت کی بابت قرعہ اندازی ..... ۴۵۵
- ۲۶۴۔ ایک احتمالی نظریہ اور اس کا جواب ..... ۴۵۵
- ۲۶۵۔ مریمؑ کو خدا کی بشارت ..... ۴۵۷
- ۲۶۶۔ کلمہ "خدا" ..... ۴۶۱
- ۲۶۷۔ لفظ "مسح" کی بحث ..... ۴۶۳
- ۲۶۸۔ لفظ "عیسیٰ" کی وضاحت ..... ۴۶۶
- ۲۶۹۔ دنیا و آخرت میں عزت و تکریم ..... ۴۶۷
- ۲۷۰۔ بچپن اور بڑھاپے میں گویائی کا بیان .. ۴۶۸
- ۲۷۱۔ مریمؑ کا خوشخبری سننے کے بعد اظہار یہ ..... ۴۷۰
- ۲۷۲۔ خداوند عالم کا مریمؑ کو جواب ..... ۴۷۱
- ۲۷۳۔ حضرت عیسیٰؑ کو خدائی تعلیم ..... ۴۷۲
- ۲۷۴۔ تورات کے بارے میں قرآنی بیان .. ۴۷۳
- ۲۷۵۔ انجیل کے بارے میں قرآنی موقف .. ۴۷۴
- ۲۷۶۔ بنی اسرائیل کے لئے ہادی اور ہنما ..... ۴۷۵
- ۲۷۷۔ معجزات کے اظہارات ..... ۴۷۷
- ۲۷۸۔ ایک ضروری وضاحت ..... ۴۷۹
- ۲۷۹۔ نبیؐ خبروں کا اعلان ..... ۴۸۰
- ۲۸۰۔ نبیؐ خبریں اور اذن الہی ..... ۴۸۰
- ۲۸۱۔ تورات کی تصدیق اور بعض احکام  
کا اعلان ..... ۴۸۱
- ۲۸۲۔ بعض احکام شریعت کا حوالہ ..... ۴۸۲
- ۲۸۳۔ پروردگار کی نشانی ..... ۴۸۳
- ۲۸۴۔ بندگی و خدا کا واضح اعلان ..... ۴۸۴
- ۲۸۵۔ حضرت عیسیٰؑ کی پکار ..... ۴۸۴
- ۲۸۶۔ ایک ادنیٰ نکتہ ..... ۴۸۶
- ۲۸۷۔ عیسیٰؑ کے اعلان پر حواریوں کا جواب ..... ۴۸۷
- ۲۸۸۔ مزید وضاحت ..... ۴۸۸
- ۲۸۹۔ گواہوں میں شمار کرنے کی درخواست ..... ۴۹۱
- ۲۹۰۔ دونوں طرف سے مکر ؟ ..... ۴۹۳
- ۲۹۱۔ خدا کا عیسیٰؑ سے خطاب ..... ۴۹۴
- ۲۹۲۔ عیسیٰؑ کا آسمان کی طرف اٹھایا جانا ؟ ..... ۴۹۷
- ۲۹۳۔ مومنین کی کافروں پر برتری ..... ۴۹۸
- ۲۹۴۔ دلیل و حجت کی برتری ..... ۵۰۰
- ۲۹۵۔ ایک اہم نکتہ ..... ۵۰۱
- ۲۹۶۔ قیامت کے دن کا تذکرہ ..... ۵۰۲
- ۲۹۷۔ کافروں کا برا انجام ..... ۵۰۳
- ۲۹۸۔ ایمان والوں کا پورا پورا اچھا ..... ۵۰۴
- ۲۹۹۔ آیات کی تلاوت ..... ۵۰۶
- ۳۰۰۔ حضرت عیسیٰؑ کی تخلیق کا تذکرہ ..... ۵۰۶
- ۳۰۱۔ خدا، سرچشمہ حق و حقیقت ..... ۵۰۹
- ۳۰۲۔ روایات پر ایک نظر ..... ۵۱۰
- ۳۰۳۔ حضرت مریمؑ کا خدائی انتخاب ..... ۵۱۰
- ۳۰۴۔ اصطفاء کا مخصوص معنی ..... ۵۱۰
- ۳۰۵۔ احادیث نبویہؐ سے اقتباس ..... ۵۱۱
- ۳۰۶۔ مریمؑ کی کفالت کا مسئلہ ..... ۵۱۳



- ۳۰۷۔ حضرت مریمؑ کا دومرتبہ اصطفاء ... ۵۱۵
- ۳۰۸۔ حضرت عیسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے درمیان دلچسپ مکالمہ ..... ۵۱۵
- ۳۰۹۔ انبیاءؑ کی شریعتوں اور کتب کا تذکرہ. ۵۱۶
- ۳۱۰۔ حواریوں کی وجہ تسمیہ ..... ۵۱۷
- ۳۱۱۔ حضرت عیسیٰؑ کا تاریخی تذکرہ ..... ۵۱۸
- ۳۱۲۔ ایک نوجوان حضرت عیسیٰؑ کی شبیہ بنا. ۵۲۰
- ۳۱۳۔ حضرت عیسیٰؑ کی منفرد شخصیت ..... ۵۲۱
- ۳۱۴۔ دنیا کی زینت ..... ۵۲۲
- ۳۱۵۔ عیسیٰؑ کی مہمانت کے بارے میں ! ۵۲۲
- ۳۱۶۔ محدث کے معنی میں روایات پر ایک نظر ! ..... ۵۲۳
- ۳۱۷۔ رسول، نبی اور محدث میں فرق ..... ۵۲۳
- ۳۱۸۔ محمد بن مسلم کی روایت ..... ۵۲۵
- ۳۱۹۔ محدث کی نشانی، امام صادقؑ کی زبانی ۵۲۵
- ۳۲۰۔ خدا دوست بندے ..... ۵۲۵
- 
- ۳۲۱۔ آیات ۶۱ تا ۶۳ ..... ۵۳۰
- ۳۲۲۔ تفسیر و بیان ..... ۵۳۲
- ۳۲۳۔ علم و آگاہی کے بعد نزاع کیوں ؟ ..... ۵۳۲
- ۳۲۴۔ دعوت مہابہ ..... ۵۳۳
- ۳۲۵۔ آیات کے الفاظ کی تشریحات ..... ۵۳۵
- ۳۲۶۔ مفرد اور جمع کے صیغوں کا استعمالی فرق ۵۳۶
- ۳۲۷۔ فریقین کے دعووں کی بابت ایک سوال ۵۳۷
- ۳۲۸۔ ایک فنی و تکنیکی سوال اور اس کا جواب ۵۳۹
- ۳۲۹۔ ایک اہم اصولی سوال اور اس کا جواب ۵۴۰
- ۳۳۰۔ سچے واقعات ..... ۵۴۱
- ۳۳۱۔ خدا کا قلبہ و دانائی ..... ۵۴۱
- ۳۳۲۔ خدا فساد یوں سے آگاہ ہے ..... ۵۴۲
- ۳۳۳۔ روایات پر ایک نظر ..... ۵۴۳
- ۳۳۴۔ نجران کے نصاریٰ کا وفد، مدینہ میں ! ۵۴۳
- ۳۳۵۔ عترت اور امت کے درمیان فرق. ۵۴۴
- ۳۳۶۔ اولاد رسول سے کیا مراد ہے ؟ ..... ۵۴۵
- ۳۳۷۔ فضائل علیؑ بزبان علیؑ ..... ۵۴۷
- ۳۳۸۔ تحقیقی اظہار خیال ..... ۵۴۷
- ۳۳۹۔ نصاریٰ کی مہابہ سے روگردانی ..... ۵۴۸
- ۳۴۰۔ اہل بیتؑ کا تعارف ..... ۵۵۱
- ۳۴۱۔ نصاریٰ کا چودہ رکنی وفد ..... ۵۵۳
- ۳۴۲۔ نصاریٰ نجران کے نام مکتوب نبویؐ. ۵۵۳
- ۳۴۳۔ ابن طاووس کا بیان ..... ۵۵۶
- ۳۴۴۔ ایک عجیب و غیر منطقی قول ..... ۵۵۷
- ۳۴۵۔ مضبوط اور منطقی جواب ..... ۵۵۸
- 
- ۳۴۶۔ آیات ۶۴ تا ۷۸ ..... ۵۷۲
- ۳۴۷۔ تفسیر و بیان ..... ۵۷۹
- ۳۴۸۔ اہل کتاب کو دعوت حق ..... ۵۸۰
- ۳۴۹۔ ایک قول اور اس کی وضاحت ..... ۵۸۱
- ۳۵۰۔ کلمہ، توحید کی حقیقت ..... ۵۸۲

- ۳۵۱۔ دعوت انبیاءؑ کا قرآنی تذکرہ ..... ۵۸۵
- ۳۵۲۔ مسلمان ہونے کا کھلا اعلان ..... ۵۸۹
- ۳۵۳۔ اہل کتاب کی توبیح ..... ۵۸۹
- ۳۵۴۔ جانتے اور نہ جانتے ہوئے محاجہ .... ۵۹۰
- ۳۵۵۔ ایک اہم سوال اور اس کا جواب ..... ۵۹۳
- ۳۵۶۔ ابراہیمؑ کے یہودی و نصرانی ہونے کی نفی ..... ۵۹۴
- ۳۵۷۔ ابراہیمؑ کے حقداروں کا تعین ..... ۵۹۵
- ۳۵۸۔ اہل کتاب کی ناحق خواہش و کوشش .. ۵۹۶
- ۳۵۹۔ اہل کتاب کو تنبیہ ..... ۵۹۸
- ۳۶۰۔ ایک بار پھر اہل کتاب کی سرزنش ..... ۶۰۰
- ۳۶۱۔ اہل کتاب کے ایک گروہ کا بیان ..... ۶۰۰
- ۳۶۲۔ وجہ النہار کے بارے میں بعض مفسرین کی رائے ..... ۶۰۲
- ۳۶۳۔ دو قول اور ان کی تحقیق ..... ۶۰۳
- ۳۶۴۔ اہل کتاب کا تاکید و توضیحی بیان ... ۶۰۳
- ۳۶۵۔ سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے ..... ۶۰۷
- ۳۶۶۔ خدا کی رحمت کے اختصاص کا بیان ... ۶۰۸
- ۳۶۷۔ ایک اہم نکتہ ..... ۶۰۹
- ۳۶۸۔ اہل کتاب کے بارے میں ! ..... ۶۱۰
- ۳۶۹۔ جان بوجھ کر تھوٹ بولنا ..... ۶۱۴
- ۳۷۰۔ وفائے بہ عہد اور تقویٰ ..... ۶۱۵
- ۳۷۱۔ عہد الہی کو بچھنا ..... ۶۱۶
- ۳۷۲۔ بد عہدی کا انجام ..... ۶۱۷
- ۳۷۳۔ کتاب پڑھتے ہوئے زبانیں پھیرنا ۶۱۹
- ۳۷۴۔ روایات پر ایک نظر ..... ۶۲۰
- ۳۷۵۔ اہل کتاب کو دعوت عام ..... ۶۲۰
- ۳۷۶۔ بادشاہ روم کے نام مکتوب نبویؐ ..... ۶۲۱
- ۳۷۷۔ حضرت ابراہیمؑ کا دین ..... ۶۲۴
- ۳۷۸۔ ایک سبق آموز واقعہ ..... ۶۲۶
- ۳۷۹۔ دین ابراہیمیؑ کی وضاحت ..... ۶۳۰
- ۳۸۰۔ ” حنیف “ کا معنی ..... ۶۳۱
- ۳۸۱۔ آنحضرتؐ سے دوستی و دشمنی کا معیار . ۶۳۱
- ۳۸۲۔ آئمہ اطہارؑ اور ان کے پیروکار ..... ۶۳۲
- ۳۸۳۔ تم آل محمدؑ میں سے ہو ! ..... ۶۳۲
- ۳۸۴۔ تبدیلی قبلہ اور اہل کتاب کا رد عمل .. ۶۳۲
- ۳۸۵۔ یہودیوں کی شاطرانہ کوشش ..... ۶۳۳
- ۳۸۶۔ عہد الہی کو بچھنے کا انجام ..... ۶۳۳
- ۳۸۷۔ ایک تفسیری بحث ..... ۶۳۴
- ۳۸۸۔ آیات ۷۹ ، ۸۰ ..... ۶۳۵
- ۳۸۹۔ تفسیر و بیان ..... ۶۳۶
- ۳۹۰۔ خدائی ضابطہء اخلاق ..... ۶۳۶
- ۳۹۱۔ ایک ادبی سوال اور اس کا جواب ..... ۶۳۹
- ۳۹۲۔ خدا کی ربوبیت کی دعوت ..... ۶۴۰
- ۳۹۳۔ غلط الزام کی دوسری صورت ..... ۶۴۳
- ۳۹۴۔ آیات کے سیاق کی بابت ایک اہم نکتہ ۶۴۳
- ۳۹۵۔ اسلام کے بعد کفر؟ ..... ۶۴۵

۳۹۶۔	بعض مفسرین کا قول ..... ۶۴۵	۳۱۳۔	حضرت عیسیٰؑ کی بشارت کے حوالہ
۳۹۷۔	چند فضول پر مبنی خاتمہ بحث ..... ۶۴۶	۳۱۵۔	حضرت عیسیٰؑ کی آمد کے حوالہ سے
۳۹۸۔	پہلی فصل : حضرت عیسیٰؑ اور	۳۱۶۔	دسواں اعتراض ..... ۶۹۱
	ان کی والدہ کا قرآنی تذکرہ ..... ۶۴۶	۳۱۷۔	چھٹی فصل : حضرت مسیحؑ کے
۳۹۹۔	دوسری فصل : حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت		بارے میں نظریات کا سرچشمہ؟ ..... ۶۹۵
	اور بارگاہ الہی میں ان کا مقام ..... ۶۵۰	۳۱۸۔	ساتویں فصل : اہل کتاب کی طرف
۴۰۰۔	تیسری فصل : حضرت عیسیٰؑ نے کیا کہا		منسوب کتاب کنسی اور کیسی ہے ؟ .. ۶۹۸
	اور ان کے بارے میں کیا کہا گیا ؟ .. ۶۵۲	۳۱۹۔	ایک تاریخی بحث ..... ۷۰۲
۴۰۱۔	حضرت عیسیٰؑ کی شفاعت اور خدا	۴۲۰۔	موجودہ تورات کا تذکرہ ..... ۷۰۲
	کی قدرت ..... ۶۵۳	۴۲۱۔	سح اور انجیل کی تاریخی حیثیت ..... ۷۰۲
۴۰۲۔	چوتھی فصل : عقیدہ تثلیث کی نفی	۴۲۲۔	روایات پر ایک نظر ..... ۷۲۹
	میں قرآنی بیانات ..... ۶۶۲	۴۲۳۔	تفسیر قمی کی ایک روایت ..... ۷۲۹
۴۰۳۔	پانچویں فصل : مسیحؑ شفاعت کرنے	۴۲۴۔	اہل نجران کی پیغمبر اسلامؐ سے گفتگو ..... ۷۳۰
	والے ہیں، نذیبہ بننے والے نہیں .... ۶۷۰	۴۲۵۔	غیر خدا کو سجدہ کرے کی ممانعت ..... ۷۳۱
۴۰۴۔	عیسائیوں کے عقائد پر دس اعتراضات ..... ۶۷۲		
۴۰۵۔	پہلا اعتراض ..... ۶۷۲	۴۲۶۔	آیات ۸۱ تا ۸۵ ..... ۷۳۲
۴۰۶۔	دوسرا اعتراض ..... ۶۷۳	۴۲۷۔	تفسیر بیان ..... ۷۳۵
۴۰۷۔	تیسرا اعتراض ..... ۶۷۵	۴۲۸۔	انبیاءؑ سے عہد و پیمانہ ..... ۷۳۶
۴۰۸۔	چوتھا اعتراض ..... ۶۷۶	۴۲۹۔	ایک ادبی حوالہ ..... ۷۳۷
۴۰۹۔	پانچواں اعتراض ..... ۶۷۷	۴۳۰۔	ادبی حوالہ سے ایک اہم نکتہ کا التفات ..... ۷۳۸
۴۱۰۔	چھٹا اعتراض ..... ۶۷۹	۴۳۱۔	عہد الہی کا قرآنی حوالہ ..... ۷۳۹
۴۱۱۔	ساتواں اعتراض ..... ۶۸۱	۴۳۲۔	گواہی کا اظہار ..... ۷۴۰
۴۱۲۔	آٹھواں اعتراض ..... ۶۸۱		
۴۱۳۔	نواں اعتراض ..... ۶۸۳		

- ۴۳۳۔ ایک لطیف نکتہ ..... ۷۴۰
- ۴۳۴۔ میثاق کی تاکید ..... ۷۴۲
- ۴۳۵۔ دین الہی کے علاوہ وسرادین کیوں؟ ..... ۷۴۲
- ۴۳۶۔ تمام مخلوق بارگاہ الہی میں سرنخم! ..... ۷۴۳
- ۴۳۷۔ سب کی بازگشت، اللہ کی طرف! ..... ۷۴۴
- ۴۳۸۔ دائرہ ایمان کی وسعت ..... ۷۴۴
- ۴۳۹۔ سابقہ انبیاء پر ایمان ..... ۷۴۴
- ۴۴۰۔ تمام انبیاء پر ایمان کا ذکر ..... ۷۴۵
- ۴۴۱۔ میثاق پر عمل کرنے کا تاکید بیان ..... ۷۴۵
- ۴۴۲۔ روایات پر ایک نظر ..... ۷۴۶
- ۴۴۳۔ انبیاء سے خدائی عہد و پیمان ..... ۷۴۶
- ۴۴۴۔ ہر نبی سے ایک ہی وعدہ ..... ۷۴۶
- ۴۴۵۔ میثاق کے انطباقی مورد کا بیان ..... ۷۴۷
- ۴۴۶۔ اقرار و عہد کی وضاحت ..... ۷۴۷
- ۴۴۷۔ گواہی کے معنی کی وضاحت ..... ۷۴۸
- ۴۴۸۔ عالم ذر کے حوالہ سے عہد و پیمان کا تذکرہ ..... ۷۴۸
- ۴۴۹۔ اعمال کی گویائی ..... ۷۴۹
- 
- ۴۵۰۔ آیات ۸۶ تا ۹۱ ..... ۷۵۱
- ۴۵۱۔ تفسیر و بیان ..... ۷۵۳
- ۴۵۲۔ ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے والے! ..... ۷۵۳
- ۴۵۳۔ رسول کے برحق ہونے کی گواہی ..... ۷۵۴
- ۴۵۴۔ ایک ادبی نکتہ ..... ۷۵۴
- 
- ۴۵۵۔ لعنت کی صورت میں سزا ..... ۷۵۵
- ۴۵۶۔ سچی توبہ و اصلاح نفس ..... ۷۵۵
- ۴۵۷۔ ایمان کے بعد کفر میں اضافہ کے مراحل ..... ۷۵۶
- ۴۵۸۔ روایات پر ایک نظر! ..... ۷۵۸
- ۴۵۹۔ حارث بن سويد کا واقعہ ..... ۷۵۸
- ۴۶۰۔ ”درمنثور“ کی ایک روایت ..... ۷۵۸
- 
- ۴۶۱۔ آیات ۹۲ تا ۹۵ ..... ۷۶۱
- ۴۶۲۔ تفسیر و بیان ..... ۷۶۳
- ۴۶۳۔ پسندیدہ مال کا انفاق ..... ۷۶۳
- ۴۶۴۔ اللہ بخوبی آگاہ ہے ..... ۷۶۵
- ۴۶۵۔ بنی اسرائیل کے لئے ہر غذا کی حلیت ..... ۷۶۶
- ۴۶۶۔ ایک اہم نکتہ ..... ۷۶۶
- ۴۶۷۔ آیت کی بابت عجیب قول ..... ۷۶۹
- ۴۶۸۔ خدا کی طرف سے کھلا اعلان ..... ۷۷۱
- ۴۶۹۔ خدا پر جھوٹا الزام لگانے والے! ..... ۷۷۱
- ۴۷۰۔ آئین ابراہیمی کی پیروی کا حکم ..... ۷۷۲
- ۴۷۱۔ روایات پر ایک نظر ..... ۷۷۳
- ۴۷۲۔ اونٹ کے گوشت کی کہانی ..... ۷۷۳
- 
- ۴۷۳۔ آیات ۹۶ ، ۹۷ ..... ۷۷۵
- ۴۷۴۔ تفسیر و بیان ..... ۷۷۶
- ۴۷۵۔ پہلا عبادت خانہ ..... ۷۷۷
- ۴۷۶۔ واضح نشانیاں اور مقام ابراہیمؑ ..... ۷۸۰

۴۷۷	مقام ابراہیمؑ کا تذکرہ	۷۸۱	۴۹۹	تفسیر و بیان	۸۰۶
۴۷۸	اسن و امان سے کیا مراد ہے ؟	۷۸۷	۵۰۰	اہل کتاب کی توبیح	۸۰۸
۴۷۹	فریضہ حج کا فرمان	۷۸۸	۵۰۱	ایک بار پھر توبیح و سرزنش	۸۰۸
۴۸۰	حج کا انکار	۷۸۹	۵۰۲	اہل کتاب کی گواہی و آگاہی کا حوالہ	۸۰۹
۴۸۱	روایات پر ایک نظر	۷۸۹	۵۰۳	ایمان والو ! خبردار رہو	۸۱۰
۴۸۲	پہلا گھر ہونے کا معنی	۷۸۹	-----		
۴۸۳	”در منثور“ کی ایک روایت	۷۹۰	۵۰۴	آیات ۱۰۲ تا ۱۱۰	۸۱۲
۴۸۴	بکہ اور مکہ	۷۹۰	۵۰۵	تفسیر و بیان	۸۱۶
۴۸۵	بکہ کی وجہ تسمیہ	۷۹۰	۵۰۶	تقویٰ اختیار کرنے کا فرمان خداوندی	۸۱۶
۴۸۶	کعبہ کی منفرد ساخت	۷۹۱	۵۰۷	تأییدات اسلام پر رہو	۸۱۹
۴۸۷	آیات بینات سے کیا مراد ہے ؟	۷۹۲	۵۰۸	اتحاد و عدم تفرقہ کا حکم	۸۲۰
۴۸۸	مسجد الحرام کی توسیع کی کوشش	۷۹۲	۵۰۹	نعمت خداوندی کی یاد	۸۲۲
۴۸۹	مسجد الحرام کی توسیع پر لطیف		۵۱۰	آگ کے شعلوں کی زد میں !	۸۲۵
	استدلال	۷۹۳	۵۱۱	امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے	
۴۹۰	فریضہ حج کی وضاحت	۷۹۵		والی امت	۸۲۷
۴۹۱	انکار سے مراد ترک کرنا ہے	۷۹۵	۵۱۲	ایک ادبی حوالہ	۸۲۸
۴۹۲	کون کافر ہے ؟	۷۹۵	۵۱۳	تفرقہ پیدا کرنے والوں سے	
۴۹۳	ایک تاریخی بحث	۷۹۶		اجتناب کا حکم	۸۲۹
۴۹۴	کعبہ کی شکل	۷۹۸	۵۱۴	چہروں کے سفید و سیاہ ہونے کا دن	۸۳۲
۴۹۵	غلاف کعبہ	۷۹۹	۵۱۵	آیات الہی کی تلاوت	۸۳۲
۴۹۶	کعبہ کا مقام و منزلت	۸۰۰	۵۱۶	خدا اور ظلم ؟ یہ نہیں ہو سکتا	۸۳۳
۴۹۷	کعبہ کی تولیت	۸۰۱	۵۱۷	سب کچھ اللہ کا ہے	۸۳۴
			۵۱۸	بہترین امت کا اعزاز	۸۳۵
			۵۱۹	روایات پر ایک نظر	۸۳۷
۴۹۸	آیات ۹۸ تا ۱۰۱	۸۰۴			

- ۵۲۰۔ حقیقی تقوائے الہی ..... ۸۳۷
- ۵۲۱۔ ایک حدیث نبویؐ ..... ۸۳۷
- ۵۲۲۔ دوسری حدیث نبویؐ ..... ۸۳۸
- ۵۲۳۔ حق التقویٰ کا لطیف معنی ..... ۸۳۸
- ۵۲۴۔ تقویٰ بقدر استطاعت ..... ۸۳۹
- ۵۲۵۔ اسلام و تسلیم میں یکسانیت ..... ۸۳۹
- ۵۲۶۔ اللہ کی رسی ..... ۸۴۰
- ۵۲۷۔ قرآن، وسیلہ ربط باخدا ..... ۸۴۰
- ۵۲۸۔ امام زین العابدینؑ کا فرمان ..... ۸۴۰
- ۵۲۹۔ آل محمدؑ حبل اللہ ہیں ..... ۸۴۱
- ۵۳۰۔ حدیث ثقلین کا حوالہ ..... ۸۴۱
- ۵۳۱۔ ۷۲ فرقوں کا تذکرہ ..... ۸۴۲
- ۵۳۲۔ بنی اسرائیل سے مماثلت و تقابلیت ..... ۸۴۳
- ۵۳۳۔ امام جعفر صادقؑ کی روایت ..... ۸۴۴
- ۵۳۴۔ امت کی خیانت ..... ۸۴۴
- ۵۳۵۔ بنی اسرائیل سے مماثلت کی آخری حد ..... ۸۴۵
- ۵۳۶۔ انس بن مالک کی روایت ..... ۸۴۶
- ۵۳۷۔ صحابہ کا ارتداد ..... ۸۴۶
- ۵۳۸۔ جاہلیت کی موت ..... ۸۴۷
- ۵۳۹۔ ہمیشہ حق پر ..... ۸۴۷
- ۵۴۰۔ اہل بدعت و باطل پرست ..... ۸۴۸
- ۵۴۱۔ درمیانی امت ..... ۸۴۸
- ۵۴۲۔ اہل بیتؑ: بہترین امت ..... ۸۴۹
- ۵۲۳۔ پانچ خدائی عطیے و امتیازات ..... ۸۴۹
- ۵۲۴۔ آیات ۱۱۱ تا ۱۲۰ ..... ۸۵۰
- ۵۲۵۔ تفسیر و بیان ..... ۸۵۲
- ۵۲۶۔ اذیت و آزار ..... ۸۵۲
- ۵۲۷۔ ذلت و عزت ..... ۸۵۲
- ۵۲۸۔ غضب الہی کی بارش ..... ۸۵۲
- ۵۲۹۔ عصیان اور اعتداء ..... ۸۵۷
- ۵۵۰۔ تمام اہل کتاب برابر نہیں ..... ۸۵۷
- ۵۵۱۔ کار خیر کا نیک انجام ..... ۸۵۹
- ۵۵۲۔ کفار خسارے میں ہیں ..... ۸۵۹
- ۵۵۳۔ دنیاوی زندگی کی مماثلت ..... ۸۶۰
- ۵۵۴۔ رازداری کا اصول ..... ۸۶۰

## موضوعی فہرست

جو موضوعات اس جلد میں عنوان قرار پائے وہ درج ذیل ہیں :

- خدا کی وحدانیت
- قرآن کی تنزیل
- حق اور اس کی حقیقت
- تورات اور انجیل
- عذاب و سزا
- بشری تخلیق اور اس کے مراحل
- تقدیر کی اصل و اساس
- محکم و متشابہ آیات
- تفسیر و تاویل
- ہدایت و رحمت
- قیامت کے دن کی حضوری
- محکمات اور ام الکتاب
- تاویل قرآن کا علم
- تشابہات کا راز
- ناسخ اور منسوخ
- قرآن اور معرفت الہی
- راسخون فی العلم
- وحی کی حقیقت
- ارشادات نبویؐ
- قرآن کی صفات و فضائل

- قرآن کی دائمی ہدایت
- قرآن کا ظاہر و باطن
- تفسیر بالرأے
- کلام خدا اور کلام خلق
- ظاہر القرآن اور ظاہر البیان
- جہنم اور اس کا ایندھن
- کافروں کی مغلوبیت
- جنگ بدر
- دنیاوی زندگی
- محبت و چاہت
- خدا کا علم و آگاہی
- متفقین اور ان کی صفات
- صاحبان علم کی منزلت
- خدائی قوت و حکمت
- صدر اسلام کی تاریخ کے نشیب و فراز
- استغفار: اہمیت و آثار
- کتاب اور اہل کتاب
- دعوت اسلام اور اس کے مراحل
- دین کی حقیقت
- بنی اسرائیل اور ان کے جرائم
- خیر اور اس کی طلب
- ملکیت و مالکیت
- خدا کی علی الاطلاق مالکیت
- عزت و وڈلت
- خدا کی علی الاطلاق قدرت



- لیل و نہار
- حیات و موت
- رزق اور اس کا خدائی نظام
- تکوین و تشریح
- قرآنی معارف
- مومن اور کافر
- ادب القرآن
- منت و نذر کی حیثیت
- حضرت مریمؑ اور ان کی عظمت
- حضرت عیسیٰؑ اور ان کا اصل مقام
- حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ
- غیبی الہامات
- شیطانی خیالات
- رسول، نبی اور محدث
- اطاعت خداوندی
- مسیح اور مسیحائی
- معجزات اور ان کی مختلف صورتیں
- غیبی خبریں اور ان کے موارد
- بندگی و پروردگار
- شرعی احکام
- گواہی کی دینی حیثیت
- دلیل و حجت کی قوت
- ایمان و کفر کے اخروی آثار
- اصطفا و اور اس کے موارد و مصداق
- آسمانی کتب

- عیسیٰؑ کے حواری
- مہابہ اور اس کا پس منظر و پیش منظر
- عنقرت اور امت
- اہل بیتؑ
- کلمہء توحید
- دعوت انبیاء
- حضرت ابراہیمؑ اور ان کا دین
- یہودیت و نصرانیت
- رحمت خداوندی
- جھوٹ اور اس کے مذموم آثار
- وفائے عہد و بدعہدی
- مکتوبات نبویؐ
- تبدیلیء قبلہ
- خدا کی ربوبیت
- عقیدہء تثلیث
- شفاعت اور فدیہ
- مسیح اور انجیل
- سجدہ اور اس کا اختصاص
- عہد و پیمان
- بیثاق اور اس کی حیثیت
- اسلام اور دیگر ادیان
- عالم ذر
- اعمال اور ان کی گویائی
- توبہء نصوح
- اصلاح نفس

- انفاق اور اس کی اثرگذاری
- مقام ابراہیمؑ
- پہلا عبادت خانہ
- اسن و امان
- فریضہ حج
- پہلا گھر
- بکہ، مکہ اور کعبہ و غلاف کعبہ
- آیات بینات کی حقیقت
- مسجد الحرام
- اتحاد کی اہمیت و آثار
- امر بالمعروف اور نہی عن المنکر
- بہترین امت
- حق التقوی
- اسلام و تسلیم
- حدیث ثقلین
- امت اسلامیہ کے فرقے
- ارتداد صحابہ
- جہالت و جاہلیت
- بدعت و اہل بدعت
- درمیانی امت
- غضب الہی
- عصیان و اعتداء
- اذیت و آزار اور اس کے نتائج

=====

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## حرف اول

قرآن کریم اپنی خدائی نسبت کی بنیاد پر عظمتوں، فضیلتوں، ہدایتوں اور علمی کمالات کا ایسا پاکیزہ مرقع ہے جس کی قصیدہ خوانی خود خداوند عالم نے کی اور اس مقدس مجموعہء علوم و معارف کو کائنات کے لئے ہادی و رہنمائی دوسرے لفظوں میں ” کتاب ہدایت“ کے نام سے موسوم کیا چنانچہ ارشاد ہوا: ” ذلک الكتاب لما ریب فیہ ہدی للمتقین“، (سورہ بقرہ آیت ۲) اس عظیم کتاب کی دیگر متعدد اہم خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ اسے قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے آئین زندگی بنایا گیا ہے، اسے سب سے آخری اور سب سے بڑے نبی حضرت محمدؐ پر نازل کیا گیا کہ جن کی نبوت و رسالت قیامت تک باقی رہے گی اور ان کے بعد کوئی نبی یا رسول نہ آیا اور نہ ہی آئے گا، اس کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی اور اسے ”ذکر“ قرار دے کر تحریف کرنے والوں کے مذموم مقاصد سے محفوظ رکھا، یہی وجہ ہے کہ آج تک اس کی خدائی نسبت کو چیلنج کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی اور بدخواہوں و بداندیشوں کو ہمیشہ منہ کی کھانی پڑی، قرآن مجید اپنی نبوتی آب و تاب کے ساتھ نسل انسانی کے لئے آج بھی اسی طرح مشعل ہدایت ہے جس طرح اپنے زمانہء نزول میں تھا اور قیامت تک اسی طرح رہے گا، صدیاں گزر جانے کے باوجود اس کی روحانی و معنوی تازگی برقرار ہے اور گردش ایام اس کی علمی لطافت و عظمت کو کم نہ کر سکی بلکہ روز بروز اس کے ہادیانہ کردار کے آثار نمایاں تر ہوتے جا رہے ہیں، ہر دور میں دانشوروں نے اپنی علمی کاوشوں میں اس سے اصولی استفادہ کیا اور ارباب تحقیق نے اس کے عظیم معارف کی بنیاد پر اپنے فکری سفر کے مراحل آسانی سے طے کئے اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے، اس حوالہ سے اس مقدس کتاب کی جامعیت مسلم الثبوت ہے کہ اس میں موضوع کی محدودیت کا کوئی تصور نہیں اور نہ ہی زمان و مکان کی قید و شرط ہے بلکہ یہ ہر زمانہ اور ہر مقام پر ہر موضوع کی بابت سرچشمہ ہدایت اور ہر فرد بشر کے لئے ضامن سعادت ہے۔ اس کے بلند پایہ معارف کی تفہیم و تفسیر کی بابت اہل فکر و دانش نے ہر زمانہ میں اپنی علمی دولت صرف کی تاکہ اس کے خزانہء علم و حکمت سے جس قدر ممکن ہو استفادہ کیا جاسکے، چنانچہ ہر شخص نے اپنے ذوق و رجحان کے مطابق اپنی توانائیاں بروئے کار لائیں، کسی نے اس کی ادبی جہت کو مد نظر قرار دیا، کسی نے اس کے تاریخی

حوالوں کو بنیاد بنایا، کسی نے اس کی فقہی حیثیت کو ملحوظ رکھا، کسی نے علمی و فلسفی اصولوں کے تناظر میں اس سے مطلوبہ مقاصد کے حصول کی راہ اختیار کی، کسی نے اس کی اخلاقی تعلیمات کو محوریت و مرکزیت کے آئینہ میں دیکھا، کسی نے مخصوص اعتقادی زاویہ پر پیش نگاہ رکھے، کسی نے سائنسی اصولوں میں اس کے اشاراتی بیانات کو سرچشمہ قرار دیا، کسی نے علوم طبعی کے ارتقائی سفر میں اس کی ہدایات کو مشعل راہ بنایا، کسی نے اقتصادی اور کسی نے سیاسی پیشرفت میں مربوط امور کے نظم و نظام کی ترتیب و استحکام میں اس کے اصولی ارشادات کو اساس بنایا، خلاصہ یہ کہ سب نے اس کتاب الہی کے مخزن اسرار و رموز سے لعل و جواہر حاصل کئے لیکن ہر شخص کی فکری ترجیحات مختلف تھیں کہ جن کے نتیجہ میں کبھی تو تحقیق کی سمت درست اور کبھی نادرست رہی، درست اس طرح کہ تفسیر کے خدائی اصولوں کو اپنایا گیا اور نادرست اس لئے کہ رائے و قیاس کو بنیاد بنایا گیا، تو جہاں تک تفسیر المیزان کا تعلق ہے تو اس میں کسی مخصوص فکری وابستگی سے بالاتر ہو کر ایک ایسا اصول اپنایا گیا جو خدا پرست و حق آشنا ہے اور وہ ہے تفسیر القرآن بالقرآن، اسی کو حضرت پیغمبر اسلامؐ اور آئمہ اہل بیتؑ و اکابر اصحاب دارباب فن نے معمول بنایا، اس اصول پر اس کتاب کے تفسیری عمل کی بنیاد قائم ہے۔ میری کوشش رہی ہے کہ تحریر کے تسلسل میں اردو دان حضرات کے لئے اس مقدس کتاب کی بیانی لطافت کو محفوظ رکھوں۔ میں اس میں کہاں کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ تو اہل علم قارئین ہی کریں گے مگر اپنی علمی کم مانگی کے صریح اعتراف کے ساتھ ہر طرح کے نقص و خامی پر بارگاہ رب العزت میں عفو و اہل دانش سے ارشاد و تصحیح کا طلبگار ہوں، خداوند عالم میری اس عبادتی کاوش کو اپنے حضور شرفِ قولیت عطا فرمائے اور مجھے اور تمام اہل دین کو اس مقدس گلستانِ علم و معرفت سے گل چینی اور اس کتاب الہی کی اعلیٰ و سعادت آفرین تعلیمات کی عملی پیروی کی توفیق سے نوازے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اہل علم حضرات اور خطباء و دارباب منبر کے اصرار و فرمائش پر ترجمہ کے ساتھ ساتھ روایات و احادیث کی اصل عبارات بھی شامل کی گئی ہیں تاکہ اس سے اظہار و بیان کے موارد میں استناد و استفادہ آسان ہو، اسی طرح حوالہ جات میں بھی یہی مقصد ملحوظ ہے۔

حسن رضا غدیری

لندن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## پیش گفتار

سورہ مبارکہ آل عمران کی آیت (۱) سے آیت (۱۲۰) کی تفسیر پر مشتمل کتاب المیزان کی تیسری جلد کی اشاعت کا مرحلہ پایہ تکمیل کو پہنچا، اس سلسلہ میں حسب سابق ہم نے اپنے مقصد و بھرکوشش کی تاکہ کتاب کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھا جائے اور پہلی دو جلدوں کی طرح اس کی جاہلیت طحوظ و محفوظ ہو۔ ہمیں خوشی ہے کہ اس مقصد میں ہم کامیاب ہوئے ہیں اور کاغذ و طباعت سمیت تمام اشاعتی امور عمدہ معیار کے حامل ہیں، اس حوالہ سے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اپنے نہایت محدود وسائل کے باوجود ہم جس طرح اس سلسلہ کو آگے بڑھا رہے ہیں اس میں تائید خداوندی ہی اصل و اساس اور ہمارا حقیقی سہارا ہے، کہ جس پر ہم جس قدر شکر بجالائیں کم ہے۔ ہمارا مقصد نہ تو تجارتی فوائد حاصل کرنا ہے اور نہ ہی نشریاتی اداروں کی فہرست میں شامل ہو کر کسی امتیازی مقام کو پانا ہے بلکہ صرف رضائے پروردگار کا حصول ہماری پہلی اور آخری ترجیح و مقصد و مطلوب ہے۔ تفسیر المیزان کے علاوہ اپنی دیگر مطبوعات میں بھی یہی مقصد ملحوظ ہے کہ جس قدر ممکن ہو دینی و علمی معارف و مطالب کو اہل ایمان و صاحبان ذوق تک پہنچائیں اور اس طرح روحانی افادہ و استفادہ کا مقدس ہدف حاصل کر سکیں، تفسیر المیزان کی اشاعت ہمارے لئے بہت بڑا اعزاز ہے اور ہم اس خداداد عزت پر فخر کرتے ہیں کیونکہ قرآن مجید ہماری سعادت کا ضامن آئین زندگی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے قیامت تک آنے والی نسل انسانی کے لئے سرچشمہ ہدایت بنایا ہے کہ اس کی ہر آیت میں حق کی نشانی پائی جاتی ہے، جو شخص اس کے نور ہدایت سے مستفیض ہونے کی توفیق پالے وہ دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں سر بلند ہوگا۔

الغدیر اکیڈمی پاکستان خالص دینی و تبلیغی اشاعتی ادارہ ہے اور ہم ہر طرح کی غیر دینی وابستگی سے بالاتر اپنے پاکیزہ روحانی اہداف کے حصول میں سرگرم عمل ہیں، ہماری پوری کوشش ہے کہ اپنی مطبوعات کو معنوی بنیاد پر مزین کر کے قارئین کی

خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کریں لہذا ہم عبارتوں کی درست ترتیب اور آیات مبارکہ کی صحیح کتابت کو خاص طور پر اہمیت دیتے ہیں تاکہ ان کی درست تلاوت کرنے والوں کے ساتھ ہم بھی شریک عبادت ہونے کی عزت حاصل کرنے کے حقدار بنیں، لیکن اس کے باوجود ہم اپنی کوتاہ دہنی، فکر و علم کا اعتراف کرتے ہوئے ہمیشہ اپنے قابل احترام قارئین کرام سے درخواست اور امید کرتے ہیں کہ اگر کسی جگہ لفظی یا اعرابی غلطی نظر آئے تو ہمیں آگاہ فرمائیں گے تاکہ آئندہ اشاعت میں اس کی تصحیح ہو سکے۔

خداوند عالم کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اپنی مقدس کتاب کی خدمت کی توفیق اس کی تفسیر کو عام کرنے کی صورت میں عطا کیا، تفسیر المیزان موجودہ دور کی سب سے بڑی علمی تفسیر ہے کہ جس میں آیات مبارکہ کی توضیح و تشریح اور ان کے معانی سے مربوط مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے اور موضوع سے مربوط بنیادی مباحث کو شامل کر کے تفسیری عمل کی جامع تصویر پیش کی گئی ہے جس سے آیات مبارکہ سے فہم المعنی کی بابت بیشتر مراحل کا طے کرنا آسان ہو جاتا ہے، اس حوالہ سے کتاب کی اہمیت کسی وضاحت کی محتاج نہیں رہی، قرآن نہی کا ذوق رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک عظیم روحانی سوغات ہے، نہایت دقیق اور عمیق مطالب و معانی پر مشتمل عربی عبارتوں کو نہایت آسان اور قابل فہم اردو الفاظ میں ڈھالنا عظیم کارنامہ ہے جس کے لئے آیت اللہ حسن رضا غدیری مدظلہ العالی شکر یہ و داد تحسین اور مبارکباد کے مستحق ہیں کہ جنہوں نے اپنی دیگر علمی و تبلیغی مصروفیات کے باوجود اردو دان طبقہ پر احسان کیا اور قرآنی معارف کی تفہیم کا نہایت عمدہ و دلکش اسلوب و انداز اختیار کر کے تفسیری مطالب کو چار چاند لگا دیئے، خدا سے دعا ہے کہ موصوف اس مقدس عمل کو پایہء تکمیل تک پہنچانے کی توفیق حاصل کریں اور صحت و سلامتی کے ساتھ اپنی علمی کاوشوں و تحقیقی و تبلیغی سلسلوں کو جاری و ساری رکھیں۔ اور الغدیر اکیڈمی پاکستان کا خالص دینی اشاعتی سلسلہ ترقی و توسیع کے مراحل طے کرنے میں کامیاب ہو۔ آمین

سید دولت علی زیدی

انچارج الغدیر اکیڈمی پاکستان

## آیات ۶۳۱

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

- التَّمَّ ۝
- اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۝
- نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنْزَلَ  
التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ ۝
- مِنْ قَبْلُ هَدَى لِلنَّاسِ وَأَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا  
بِآيَاتِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۝ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝
- إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ۝
- هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ۝ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝



## ترجمہ

- ” شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے کہ جو نہایت مہربان ..... اور ..... ہمیشہ رحم کرنے والا ہے “ ۱
- ” اللہ، کہ جس کے سوا کوئی ..... برحق ..... معبود نہیں وہ ہمیشہ زندہ ..... اور ..... تاابد پایندہ ہے “ ۲
- ” اس نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی جو کہ اپنی پیشرو کتب الہیہ کی تصدیق کرتی ہے، اور اس نے اس سے پہلے تورات و انجیل کو لوگوں کی ہدایت کے لئے نازل کیا اور اسی نے فرقان (حق و باطل کے درمیان تمیز دلانے والا ..... قرآن ..... ) نازل کیا “ ۳
- ” جو لوگ خدا کی آیتوں ..... واضح نشانیوں ..... کے منکر ہوئے ان کے لئے سخت عذاب مقرر ہے اور خدا طاقتور اور سخت بدلہ لینے والا ہے “ ۴
- ” حق یہ ہے کہ کوئی چیز خدا سے پوشیدہ نہیں نہ ہی زمین میں اور نہ آسمان میں ! “ ۵
- ” وہی ہے جو ماؤں کے رحموں میں اپنی مرضی کے مطابق تمہاری شکل و صورت بناتا ہے، اس کے سوا کوئی ..... برحق ..... معبود نہیں، وہ نہایت قدرتمند و دانا ہے “ ۶

## تفسیر و بیان

اس سورۃ مبارکہ کے نزول کا بنیادی مقصد اہل ایمان کو اس بات کی دعوت دینا ہے کہ دین کی بابت اتحاد و یکجہتی اختیار کریں اور دشمنان دین مثلاً یہود و نصاریٰ اور مشرکین کہ جو اپنی تمام تر توانائیاں اسلام کے روشن چراغ کو بجھا دینے کے لئے بروئے کار لاکھتے ہیں ان کے مقابلہ میں استقامت و پائیداری اور صبر و ہکیبائی کا مظاہرہ کریں۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ مبارکہ کیجا نازل ہوا کیونکہ اس کی تمام آیات... جو کہ دو سو (۲۰۰) ہیں... شروع سے آخر تک ایک ہی طرز و اسلوب سخن کی حامل اور ترتیب و ترکیب کے حوالہ سے ہم رنگ ہونے کے ساتھ ساتھ معنی و مقصود کے لحاظ سے باہم مربوط، متناسب و ہم آہنگ ہیں،

بنا بریں اس سورۃ مبارکہ کے زمانہ نزول کی بابت یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہ اس دور میں نازل ہوا جب حضرت پیغمبر اسلام اپنے مقدس مشن کے ابتدائی مراحل میں تھے اور ابھی ان کی دعوت دین کے عمل کو استحکام حاصل نہیں ہوا تھا، کیونکہ ان آیات شریفہ میں جنگ احد کا تذکرہ، نجران کے نصاریٰ کے ساتھ مباہلہ کا ذکر، یہودیوں سے متعلق بعض امور کا بیان، اہل ایمان کو مشرکین کے مقابلہ میں قیام کرنے کی ترغیب اور باہمی ربط و یک جہتی، صبر و ہکیبائی و ثابت قدم رہنے کی دعوت کے حوالہ سے اہم مطالب موجود مذکور ہیں جس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ سورۃ مبارکہ اس دور میں نازل ہوا جب اہل اسلام دین حق کے دفاع میں اپنی تمام تر قوتوں و توانائیوں کو بروئے کار لاکر اپنی اجتماعی قوت مضبوط کرنے میں سرگرم عمل تھے اور یہ دور تھا جب مسلمانوں کو ایک طرف سے یہود و نصاریٰ کے فتنوں و سازشوں کا سامنا تھا اور دوسری طرف مشرکین کے جنگی حملوں کا جواب دینا تھا لہذا وہ دشمنوں کی سازشوں کو ناکام بنانے کے لئے بھرپور طریقہ سے میدان عمل میں اتر چکے تھے تاکہ اہل اسلام غلط پروپیگنڈوں کی وجہ سے اعتقادی طور پر کمزوری کا شکار نہ ہونے پائیں اور ادھر مشرکین نے جنگ و قتال کی جو آگ بھڑکائی ہوئی تھی اس میں بھی مسلمان اپنی قوت ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دشمنوں سے مقابلہ کر رہے تھے۔ گویا وہ دور مسلمانوں کے لئے ہر لحاظ سے بد امنی اور جنگ کا دور تھا کیونکہ اسلام کی روز افزوں پیشرفت اور دعوت حق کے پھیلنے کی وجہ سے یہودیوں، نصرائیوں اور مشرکین عرب نے دین الہی کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا تھا اور ان کے علاوہ روم، ایران اور

دیگر عجمی ممالک بھی اسلام دشمنی میں اپنی توانائیاں بروئے کار لانے میں مصروف تھے،

اس صورت و حال کے پیش نظر خداوند عالم نے اس سورۃ مبارکہ میں اپنے مقدس دین کے بعض حقائق کو آشکار کرتے ہوئے اہل ایمان کو دین حق کی عظمت و صداقت سے روشناس کرایا تاکہ ان کے دل ایمان کی پاکیزگی سے آراستہ ہوں اور شبہات و شیطانی وسوسوں اور اہل کتاب کی ریشہ دوانیوں کی گندگی ان کے دلوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے، اور اس کے ساتھ ساتھ انہیں اس امر سے آگاہ کرے کہ خدا عالم ہستی کے نظام کی تدبیر سے لمحہ بھر غافل نہیں ہو اور نہ ہی اپنی مخلوق کے مقابلہ میں عاجز و ناتواں ہے اور اس نے اپنے دین ..... اسلام ..... کو پسند کرنے اور اپنے کچھ بندوں کو اس مقدس آئین کی رہنمائی میں جو طریقہ اپنایا وہ عام رائج طرز عمل اور ہمیشہ سے جاری روش یعنی اصول علی و اسباب کے سوا کچھ نہیں بنا برائیں مومن و کافر دونوں اس طریقہ و اصول پر چل رہے ہیں اور اپنی اپنی طاقت آزمانی میں مصروف ہیں، ایک دن کافر کا اور ایک دن مومن کا ہے، دنیا امتحان و آزمائش کا گھر ہے، آج عمل کا دن ہے اور کل جزا کا دن ہوگا ..... ہر شخص اپنے کئے کا نتیجہ پائے گا۔

## خدا کی وحدانیت کا واضح اعلان

○ ” اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ”

(اللہ، نہیں ہے کوئی معبود سوائے اس کے، وہ زندہ، مضبوط مدبر ہے)

آیت الکرسی کی تفسیر میں اس جملہ ” اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ” کی تشریح ذکر ہو چکی ہے، جو مطالب وہاں بیان ہوئے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات کو وجود عطا کرنے اور تمام مخلوق کے امور کی احسن تدبیر کا کامل سلسلہ خداوند عالم کے دست و قدرت سے قائم ہوا اور اسی سے وابستہ ہے بنا برائیں موجودات عالم کا وجودی سلسلہ و نظام ہر لحاظ سے خداوند عالم کا قائم کردہ ہے کوئی چیز اپنے وجود اور وجودی آثار میں ذاتی استقلال نہیں رکھتی یعنی ایسا نہیں کہ وہ خود بخود وجود میں آئی ہو اور نہ ہی یہ کہ صرف طبیعی اسباب کی اثر آفرینی سے اسے وجود حاصل ہوا ہو کیونکہ طبیعی اسباب خواہ جس قدر قوی و وسیع تاثیر کے حامل کیوں نہ ہوں لیکن وہ شعور سے محروم ہوتے ہیں جبکہ زندگی کا وجودی استقرار علم و قدرت سے وابستہ ہے اور جو چیز خود اس سے محروم ہو وہ کسی اور کو اس سے بہرہ مند کیونکر کر سکتی ہے تو ثابت ہوا کہ زندگی عطا کرنے والے سرچشمہ وجود کے لئے علم و قدرت بنیادی شرط ہے لہذا یہ حقیقت تسلیم کرنی ہوگی کہ تمام موجودات اصل وجود، حیات اور تمام متعلقہ امور و آثار میں خداوند

عالم کے قائم کردہ نظام ایجاد سے وابستہ ہیں، اور علم الہی تمام موجودات پر حاوی ہے کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں، اور قدرت خداوندی بھی تمام موجودات عالم ہستی پر محیط و چھائی ہوئی ہے اس کی مشیت و اذن کے بغیر کچھ بھی وقوع پذیر نہیں ہو سکتا چنانچہ اسی مطلب کو آیت ۶۵ اور ۶۱ میں اس طرح ذکر فرمایا:

”إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ۗ هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ“

(خدا سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں نہ زمین میں اور نہ آسمان میں، وہی تمہاری ماؤں کے رحموں میں تمہاری شکل و صورت بناتا ہے جس طرح چاہتا ہے)

چونکہ اس سورہ کے آغاز میں یہ چھ آیات مبارکہ نہایت عمدہ و منفرد انداز بیان کے ساتھ مقدمہ و تمہید کے طور پر ہیں اور سورہ مبارکہ میں مذکور تمام مطالب کی تفصیلات کے اجمالی بیان پر مشتمل ہیں سورہ مبارکہ کے نازل ہونے کی غرض و مقصد کو بیان کیا جا چکا ہے لہذا یہ آیت شریفہ ”اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ“ ایک ایسے کلی و جامع بیان کی طرح کلام کے آغاز و تمہید کی حیثیت رکھتی ہے جس سے سورہ مبارکہ کی اصل غرض و مقصد کی تکمیل یقینی ہوتی ہے چنانچہ آخری دو آیتیں (إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ۗ هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ۗ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝) مطلوبہ موضوعات کے بیان کے بعد ان کی بنیادی وجوہ اور سبب کی حیثیت رکھتی ہیں کہ جسے علمی زبان میں ”تعلیل بعد البیان“ کہا جاتا ہے لہذا درمیانی دو آیتیں (نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ ۗ وَمِن قَبْلُ هَدَىٰ لِلنَّاسِ وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ ۗ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝) ہی مقدمہ و تمہیدی بیان کے تکمیلی حصہ کی حیثیت رکھتی ہیں، بنا براین ان آیات کے معانی کی بازگشت درج ذیل مطالب کی طرف ہوگی:

- ۱۔ اہل ایمان کو یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ وہ جس خدا پر ایمان لائے ہیں وہ الوہیت میں یکتا ہے،
- ۲۔ وہ (خدا) کائنات کو وجود عطا کرنے (تخلیق) اور اپنی مخلوق کے تمام امور کی تدبیر کا محور و سرچشمہ فیض و بقا ہے۔ موجودات کی حیات کا سلسلہ و نظام اسی سے وابستہ ہے اور ان کی زندگی کی اصل و اساس کا نگہبان و نگران ہے،
- ۳۔ خدا اپنے دائرہ فرمانروائی میں کسی سے مغلوب نہیں ہوتا،
- ۴۔ خدا کے اذن و مشیت کے بغیر کوئی چیز وجود میں نہیں آ سکتی اور نہ ہی کسی فعل و عمل کے وقوع پذیر ہونے کے مراحل طے ہو سکتے ہیں۔

جب اہل ایمان ان مطالب و حقائق..... کو خاطر میں لائیں گے تو انہیں اس حقیقت سے آگاہی حاصل ہو

جائے گی کہ خدا ہی ہے جس نے اس (قرآن) کو نازل فرمایا ہے جو حق کی طرف ہدایت کرنے والی اور حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے کے اصول و معیاروں سے آگاہی دلانے والی کتاب ہے، اور خدا نے اس میں انہی ضابطوں کو ملحوظ رکھا جن پر عالم الاسباب کا وار و مدار ہے اور انہی اصولوں کو بنیادی حیثیت دی جو نظام الاختیار میں اساس العمل کے طور پر معین و مقرر ہیں یعنی خداوند عالم نے جن اصولوں کی بنیاد پر عالم الاسباب و نظام الاختیار قائم کیا انہی کو کائنات کے آئین حاکمیت و دستور فرماں روائی میں بھی معیار قرار دیا، بنا براین جو ایمان لایا وہ اپنا اجر و جزا پائے گا اور جس نے کفر اختیار کیا تو خدا سے اس کے کفر کردار تک پہنچائے گا کیونکہ خدا غلبہ و طاقت والا اور انتقام (سزا دینے کا حق و اختیار رکھنے والا) ہے، ایسا اس لئے ہے کہ وہی معبود ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں جو ان امور میں حکم فرمائی کر سکے، اور کافروں کا کوئی معاملہ خدا سے پوشیدہ نہیں اور نہ ہی ان کے اعمال اور کفر اختیار کرنا خدا کے ارادہ و مشیت کی حدود سے باہر..... بے نیاز..... ہے، بلکہ اگر خدا چاہے تو ان کی فکری و عملی قوتوں کو بے اثر کر کے انہیں مجبور و بے بس کر دے لیکن خدا نے بندوں کے لئے جو نظام الاختیار مقرر کیا ہے اور عالم الاسباب قائم کیا ہے وہ انہیں اسی کے مطابق جزا و سزا دے گا کہ یہی اس کے عدل کا تقاضا و اصول ہے.....

## قرآن کی برحق تنزيل

○ ” نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ“  
(اس نے آپ پر کتاب نازل کی حق کے ساتھ جو کہ اپنی پیشرو کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے)

” نَزَّلَ“ باب تفعیل ” تنزیل“ سے فعل ماضی کا صیغہ ہے، بعض مقامات پر ” أَنْزَلَ“ باب افعال ” انزال“ سے ذکر ہوا ہے، دونوں کا معنی نازل کرنا ہے اور ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ” تنزیل“ تدریجی نازل کرنے جبکہ ” أَنْزَلَ“ میں دفعتاً نازل کرنے کا معنی پایا جاتا ہے۔

یہاں ممکن ہے کہ ” تنزیل“ اور ” انزال“ کے مذکورہ بالا فرق کو نادرست قرار دیتے ہوئے درج ذیل آیات سے استدلال کیا جائے:

سورہ فرقان، آیت ۳۲:

○ ” نَزَّلْنَا نَزْلًا مِّنَ السَّمَاءِ نَزْلًا مُّبِينًا“

(کافروں سے نہ کیا) اس پر قرآن ایک ہی مرتبہ نازل کیوں نہیں کیا جاتا.....

سورہ مائدہ، آیت ۱۱۲ :

○ ” اَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكَ مَآءًا مَّيِّدًا “

(میسلی کے حواریوں نے کہا کہ آیا تراپو دردگار یہ کر سکتا ہے کہ ہمارے لئے مائدہ نازل کرے)۔

سورہ انفعام، آیت ۷۳ :

○ ” لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْكَ آيَةٌ “

(کافروں نے کہا) اس پر کوئی نشانی (معجزہ) نازل کیوں نہیں ہوتی)۔

سورہ انفعام، آیت ۷۳ :

○ ” قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰى اَنْ يُنَزِّلَ آيَةً “

(ان سے کہہ دیں کہ خدا نشانی (معجزہ) نازل کرنے پر قادر ہے)۔

شاید ان آیات سے استدلال کرتے ہوئے کہا جائے کہ ”تنزیل“ میں غیر تدریجی معنی پایا جاتا ہے، اور اسی احتمال کے پیش نظر بعض مفسرین نے کہا ہے کہ بہتر ہے کہ ”نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ“ کا معنی ”انزله انزالاً بعد انزال“ کیا جائے تاکہ تنزیل اور انزال کے درمیان فرق پائے جانے کے اعتراض کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔

لیکن اس احتمال یا اعتراض کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ تدریجی نزول سے مراد یہ نہیں کہ کسی مرکب چیز کے اجزاء میں ایک جزء کا دوسرے جزء سے غیر معمولی زمانی فاصلہ ہو بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر مرکب چیز اپنے اجزاء کے ساتھ موجود ہو اور اس کے وجود کا لحاظ دو طرح سے ہوتا ہے :

ایک: اجزاء کے مجموعہ کی بنیاد پر، اور دوسرا: ہر جزء کے دوسرے جزء سے متصل ہونے کی بنیاد پر،

اجزاء کے مجموعہ کی بنیاد پر مرکب چیز کو جزء جزء کے حوالہ سے نہیں بلکہ من حیث المجموع دیکھا جاتا ہے اور وہ مجموعہ مرکب کی صورت میں ایک غیر منقسم شے کہلاتا ہے کہ جس کا وجود ایک اکائی ہو جاتا ہے، اس بناء پر اس کے لئے ”نزول“ و ”انزال“ کی تعبیر درست ہوتی ہے جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ رعد، آیت ۱۷ :

○ ” اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً “

(اس نے آسمان سے پانی نازل کیا)۔

یہاں پانی نازل کرنے سے بلاش برسانا مراد ہے۔

مرکب چیز کو اس کے جزء جزء کے حوالہ سے دیکھا جائے تو اس کا پے درپے ایک دوسرے سے متصل ہونا ملحوظ ہوتا

ہے خواہ اجزاء کے درمیان زمانی فاصلہ پایا جائے یا نہ پایا جائے، اسے تدریج کہا جاتا ہے اور اسے ”تذلیل“ سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ شوریٰ، آیت ۲۸:

○ ” وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ“

(وہی ہے جو بارش برساتا (نازل کرتا) ہے) ...

اس بیان کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ جو آیات اعتراض کی دلیل کے طور پر پیش کی گئی ہیں ان سے مطلوبہ ہدف حاصل نہیں ہوتا یعنی ”تذلیل“ میں تدریجی نزول کے معنی پائے جانے کی نفی ثابت نہیں ہوتی بلکہ یہ بات اپنے مقام پر باقی رہتی ہے کہ ”تذلیل“ کے تمام صیغوں میں تدریجی نزول کا معنی پایا جاتا ہے لہذا ”لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً“ کا معنی یہ ہوگا کہ کافروں نے کہا کہ: کیوں نہیں نازل کیا جاتا اس (محمد) پر قرآن، ایک ہی دفعہ! یعنی قرآنی آیات کا نزول کسی زمانی فاصلہ کے بغیر ایک ہی متصل وقت میں کیوں ہے؟ جیسا کہ امر واقعہ ہے کہ قرآن مجید مختلف امور و واقعات کی بابت مختلف اوقات میں نازل ہوا۔

بہر حال اس جواب سے اعتراض کی دلیل کے طور پر پیش کی جانے والی دیگر آیات شریفہ کے معانی بھی واضح ہو جاتے ہیں اور اعتراض کی اصل و اساس ہی باقی نہیں رہتی۔

جہاں تک بعض مفسرین کی طرف سے پیش کی جانے والی مذکورہ رائے کا تعلق ہے کہ جس میں کہا گیا ہے کہ ”نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ“ کا معنی ”النزولُ انزالاً بعد انزال“ کیا جائے تو بہتر ہوگا، تو یہ بات استحسان اور ایک فرد کی من پسند رائے ہے جسے کسی لغت و زبان میں جائز و روا قرار نہیں دیا جاتا اور اس کے علاوہ اس رائے سے اصل اعتراض بھی ساقط نہیں ہوتا بلکہ مذکورہ آیات پر اٹھایا جانے والا اعتراض کماکان باقی رہتا ہے۔

## ”نزول“ کی اصل حقیقت

خداوند عالم نے اپنے مقدس کلام (قرآن مجید) میں حضرت رسول اعظم محمد مصطفیٰ کو کتاب سے نوازنے کا ذکر فرماتے ہوئے اسے ”تذلیل“ اور ”نزول“ ... انزال سے تعبیر کیا ہے، ”تذلیل“ نزول سے باب تفعیل اور ”انزال“ (باب افعال ہے)۔ ”نزول“ کا لفظی معنی نیچے آنا، اترنا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ کسی بلند مقام یا مکان سے کوئی چیز اپنے مخصوص انداز میں نیچے والے مقام یا مکان میں اتر کر استقرار پائے (اپنی جگہ ٹھکانہ بنالے) چونکہ خدائے

قدوس نے اپنی توصیف ”علو“ (بلندی) اور رفعت درجات سے کی ہے اور اپنی کتاب (قرآن) کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ اس کی طرف سے آئی ہے، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورہ شوریٰ، آیت ۵۱:

” إِنَّهُ عَلِيُّ حَكِيمٌ “

(وہ بلند مقام والا، حکمت والا ہے)

اور ارشاد ہوا:

سورہ بقرہ، آیت ۸۹:

” وَلَسَّآ جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ “

(اور ان کے پاس کتاب آئی اللہ کی طرف سے، جو تصدیق کرتی ہے اس چیز کی جو ان کے پاس ہے).....

لہذا وحی کے ذریعے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک پر کتاب (قرآن) کے قرار پانے کو ”نزل“ سے تعبیر کرنا صحیح و بجا ہے۔

” حق “ سے کیا مراد ہے ؟

کسی یقینی..... و ناقابل انکار و شک..... امر کی خبر کو اصل حقیقت کے عین مطابق ہونے کی بناء پر ”حق“ کہتے ہیں، جیسا کہ ”صدق“ سے مراد وہ خبر ہے جو واقعہ کے عین مطابق ہو، بنا برائیں ”موجودات عالم“ اور ”حقیقی امور“ کے لئے لفظ ”حق“ کا استعمال ان کے حق و حقیقت ہونے کی بناء پر ان کے بارے میں خبر صحت کے حوالہ سے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ ”حق“ استعمال کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: ”انہ حق“ (وہ حق ہے) اسی طرح دیگر حقائق کے لئے کہا جاتا ہے: ”انہا حقہ“ (وہ حق ہیں) تو یہ تمام استعمالات ان کے حق و حقیقت ہونے سے خبر کی صحت کے حوالہ سے ہیں۔

بہر حال آیت مبارکہ ”تَرٰلَ عَلَیْكَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ“ میں ”حق“ سے مراد وہ ثابت، یقینی، ناقابل انکار، مسلم الثبوت شے ہے جس میں نادرست و غلط ہونے اور ناحق و باطل ہونے کی ہرگز گنجائش نہیں پائی جاتی (السامر الثابت الذی لا یقبل البطلان) یعنی وہ مسلم الثبوت حقیقت کہ جو باطل و نادرستی کو اپنے نزدیک آنے ہی نہیں دیتی،



”بالتحق“ میں حرف ب مصاحبت (ساتھ ہونے) کے معنی میں ہے، اس بناء پر آیت مبارکہ کا معنی یہ ہوگا: ”نزل علیک الکتاب تنزیلاً یصاحب الحق ولایفارقہ“ خدا نے آپ پر کتاب نازل کی، اس طرح سے کہ وہ حق کے ساتھ ہے اور اس سے جدا نہیں ہوگی، دراصل یہ ایک لطیف استعارہ ہے جسے کنایہ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، جس سے مراد اس امر کا بیان ہے کہ یہ قرآن چونکہ حق کے ساتھ ساتھ ہے اور اس کی مصاحبت میں ہے لہذا ہر لحاظ سے محفوظ و مامون ہے، اس پر باطل کا سایہ بھی نہیں پڑ سکتا اور نہ ہی باطل اس سے آمیزش کی راہ پاسکتا ہے۔

یاد رہے کہ ”بالتحق“ میں حرف ب کے بارے میں دیگر معانی بھی ذکر کئے گئے ہیں لیکن وہ مقرون بہ صحت نہیں۔ ”مصدقاً“ تصدیق (صدق سے باب تفعیل) سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، اس (تصدیق) کا معنی کسی بات کے درست ہونے کا اقرار اور کسی خبر کے برطابق واقعہ ہونے کا اعتراف کرنا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے: ”صدقت عقلاً کلاماً“ (میں نے فلاں بات کی تصدیق کی) یعنی اس کے سچا اور درست ہونے کا اقرار کیا اور اس کی صداقت کا اعتراف کیا، ”فلاناً“ (میں نے فلاں شخص کی تصدیق کی) یعنی جس چیز کی وہ خبر دیتا ہے اس میں اس کے سچا ہونے کا اعتراف کیا۔

”مَا بَدِئْنَا بِبَدِيٍّ“ سے تورات اور انجیل مراد ہے چنانچہ سورۃ مائدہ میں ارشاد ہوا:

آیت ۴۴: ”إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ.....“

(ہم نے تورات کو نازل کیا اس میں ہدایت اور نور ہے.....)

آیت ۴۶: ”وَإِنِّي لَأَنْزِلُ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ.....“

(اور ہم نے اسے (عیسیٰ کو) انجیل دی جس میں ہدایت اور نور ہے.....)

آیت ۴۸: ”وَإِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَدِئْنَا بِهِ مِنَ الْكِتَابِ.....“

(اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی حق کے ساتھ جو اپنے سے پہلے کتابوں کی تصدیق کرتی ہے.....)

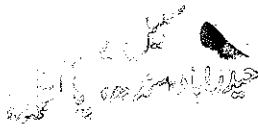
ان آیات مبارکہ کے مجموعی مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کے پاس جو تورات اور انجیل موجود ہے وہ خداوند عالم کی طرف سے نازل ہونے والے احکامات و تعلیمات پر مشتمل ہیں اور خدا نے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ پر جن معارف کی وحی کی وہ ان دو کتابوں میں موجود ہیں اگرچہ ان دونوں میں تحریف اور بعض مطالب کو نکال دینے کا عمل بھی ہوا ہے کیونکہ حضرت رسول خدا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی یہی تورات اور چار انجیل یہود و نصاریٰ کے درمیان موجود تھیں اور قرآن مجید انہی کی تصدیق کرتا ہے، لیکن پورے طور پر نہیں بلکہ کچھ حصوں کی، کیونکہ قرآن مجید نے واضح الفاظ میں ان دونوں میں تحریف اور مطالب کے نکال دینے جانے کا تذکرہ کیا ہے مثلاً سورۃ مائدہ میں ارشاد ہوا:

○ ”وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ.....“ (آیت ۱۲).....

” فَمِمَّا نَقَضْتُمْ فِيهِمَا قَوْلَهُمْ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَيْهِمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَنَسُوا حَظًّا  
فَمَا ذُكِّرُوا بِهِ“ ..... (آیت ۱۳)

” وَ مِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ أَنفُسَنَا مِثْلَ مَا نَقَضْنَا قَوْلَهُمْ فَسُوا حَظًّا فَمَا ذُكِّرُوا بِهِ“ ..... (آیت ۱۳)

آیت ۱۲ میں بنی اسرائیل سے عہد و پیمان کا ذکر ہے، آیت ۱۳ میں ان کی طرف سے عہد شکنی اور اس کی سزا (خدا کی لعنت اور دلوں کی سختی) کے بعد ان کی طرف سے تحریف اور جس چیز کے یاد رکھنے کی تاکید کی گئی تھی اس کے بھلا دینے کا تذکرہ ہے، آیت ۱۴ میں نصاریٰ اور ان کی طرف سے تحریف کے عمل کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے پختہ عہد و پیمان کے بعد اس چیز کو بھلا دیا جس کے یاد رکھنے کی انہیں تاکید کی گئی تھی، ان آیات شریفہ سے صاف طور پر اس امر سے آگاہی حاصل ہوتی ہے کہ ان دو کتابوں میں تحریف کی بناء پر قرآن مجید ان کی کامل تصدیق نہیں کرتا بلکہ جزوی تصدیق کرتا ہے (علمی زبان میں کامل تصدیق کے لئے ”تصدیق بالجملة“ اور جزوی تصدیق کے لئے ”تصدیق فی الجملہ“ کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں)۔



## تورات و انجیل کے نزول کا ذکر

○ ” وَأَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ ۚ مِنْ قَبْلِ هَذِهِ لِّلنَّاسِ  
(اور اس نے تورات و انجیل نازل کی اس سے پہلے، لوگوں کے لئے ہادی و رہنما بنا کر)

” تورات “ عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ” شریعت “ ہے، اور ” انجیل “ یونانی یا بقولے اصل میں فارسی زبان کا لفظ ہے اس کا معنی بشارت (خوشخبری) ہے، ان دو کتابوں کے بارے میں تفصیلی بحث سورۃ مائدہ آیت ۴۴: (إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ فِيهَا هُدًى وَ نُورٌ.....) میں ہوگی، انشاء اللہ تعالیٰ۔

قرآن مجید میں جہاں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب کا تذکرہ ہوا ہے وہاں لفظ ” انجیل “ (مفرد کے صیغہ کے ساتھ) ہی استعمال کیا گیا ہے اور اسے ” خداوند عالم کی طرف سے نازل ہونے والی کتاب “ سے تعبیر کیا گیا ہے، جبکہ کئی انجیلیں موجود ہیں اور ان میں سے معروف چار انجیلیں تو نزول قرآن کے زمانہ اور اس سے پہلے موجود تھیں، ان چار انجیلوں کی تالیف و تدوین کی نسبت لوقا، مرقس، متی اور یوحنا کی طرف دی جاتی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لفظ ” انجیل “ (صیغہ

جمع) کی بجائے ”انجیل“ (صیغہ مفرد) ذکر کرنے اور اسے خدا کی طرف سے نازل ہونے والی کتاب کہنے سے ثابت ہوتا ہے کہ کثرت کے ساتھ پائی جانے والی انجیلیں خدا کی طرف سے نازل نہیں ہوئیں بلکہ اس کی طرف سے صرف ایک انجیل نازل ہوئی ہے اور اس میں تحریف و حذف کے ذریعے ہر شخص نے اپنی من پسند ترتیب و مطالب سے اسے مدون کیا ہے لہذا ان میں سے ہر ایک کو حقیقی اور خدا کی طرف سے نازل کی جانے والی ”انجیل“ نہیں کہا جاسکتا۔

بہر حال اس آئیہ مبارکہ میں جو کہ اس سورہ کی ابتدائی آیات میں سے ہے تو رات اور انجیل کے تذکرہ سے اس امر کا اشارہ ملتا ہے کہ اس سورہ مبارکہ میں یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں مطالب ذکر ہوں گے چنانچہ عنقریب ان کی سرگزشت اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت، نبوت اور آسمان پر اٹھائے جانے کا تذکرہ ہوگا۔

## فرقان کا نزول

○ ”وَأَنْزَلَ الْفُرْقَانَ“

(اور اس نے فرقان کو نازل کیا)

عربی زبان کی مشہور کتاب ”صاح اللغۃ“ میں لفظ ”فرقان“ کا یہ معنی کیا گیا ہے :

”ما یفوق بہ بین الحق والباطل“ (جس چیز کے ذریعے حق اور باطل کے درمیان تمیز کی جائے یا جاسکے)،

البتہ اس لفظ کے مادہ اشتقاق سے ثابت ہوتا ہے کہ دو چیزوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے والی ہر شے کو فرقان کہا جاتا ہے خواہ وہ دو چیزیں حق اور باطل ہوں یا کچھ اور! جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ انفال، آیت ۳۱ :

○ ”يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ التَّقِي الْجَعْنِ“

(فرقان والے دن، اس دن جب دو گروہ آمنے سامنے ہوئے.....)

(اس دن سے مراد جنگ بدر کا دن ہے۔م)

اسی سورہ انفال، آیت ۲۹ میں یوں ارشاد ہوا ہے:

○ ”يَجْعَلُ لَكُمْ فُرْقَانًا“

(وہ قرار دیتا ہے تمہارے لئے فرقان).....

یہاں فرقان سے مراد اہل ایمان کو تقویٰ کے نتیجے میں حاصل ہونے والا نور بصیرت ہے.....  
 بہر حال ”فرقان“ سے یہاں ”حق و باطل کے درمیان فرق پیدا کرنے والا“ مراد ہے اور چونکہ جو ”فرق“  
 خداوند عالم کا پسندیدہ و مطلوب ہے اس کی بازگشت ہدایت کی طرف ہے اور وہ حق و باطل کے درمیان پایا جانے والا جامع و  
 وسیع معنی کا حامل فرق ہے جس میں عقائد و معارف اور دنیاوی زندگی میں انسان کے اعمال کے حوالہ سے واجبات و محرمات اور  
 ضروری و غیر ضروری افعال کی تمیز شامل ہے لہذا اس آیت مبارکہ میں لفظ ”فرقان“ کا اطلاق دین کے ان تمام اصول و فروع  
 پر ہوگا جو خداوند عالم نے بذریعہ وحی اپنے انبیاء پر نازل فرمائے ہیں خواہ کتاب کی صورت میں یا کسی اور انداز میں! چنانچہ  
 خداوند کا ارشاد گرامی ہے:

سورہ انبیاء، آیت ۴۸:

”وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ“

(اور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان دیا).....

سورہ بقرہ، آیت ۵۳:

”وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ“

(اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان دیا).....

سورہ فرقان، آیت ۱:

”تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا“

(برکت والا ہے وہ کہ جس نے اپنے بندے پر فرقان کو نازل کیا تاکہ وہ کائنات کے لئے نذیر (خدا کی محصیت

کے انجام سے خبردار کرنے والا) ہو)

(آیت ۴۸ سورہ انبیاء میں حضرت ہارون کو فرقان عطا کئے جانے کا ذکر ہے جو کہ ”کتاب“ نہ تھی، اور

سورہ بقرہ آیت ۵۳ میں حضرت موسیٰ کو ”کتاب“ اور ”فرقان“ دونوں عطا کئے جانے کا تذکرہ ہوا ہے اور سورہ فرقان

آیت ۱ میں ”فرقان“ سے تمام اصول و فروع اور معارف دین مراد ہیں کہ جن کے ذریعے تبلیغ و انذار کا عمل انجام پاتا ہے

لہذا معلوم ہوا کہ ”فرقان“ کا اطلاق انبیاء کرام پر وحی کے ذریعے نازل کئے جانے والے تمام امور پر درست ہے خواہ

کتاب کی شکل میں ہو یا کسی دوسرے انداز میں ہو)

”فرقان“ کے اسی جامع و وسیع معنی کو خداوند عالم نے ”میزان“ سے تعبیر کیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

”لَقَدْ آسَرْنَا سُرُسَنَا بِالْبَيْتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ“

... سورہ حدید: ۲۵...

(اور ہم نے اپنے پیغمبروں کو واضح نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا تاکہ لوگ عدل و انصاف قائم کریں)۔

یہ آیت درج ذیل آیہ مبارکہ کی ہم وزن و ہم پلہ ہے: سورہ بقرہ، آیت ۲۱۳:

○ "كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيُحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِي مَا اخْتَلَفُوا فِيهِ" .....

(تمام لوگ ایک ہی امت تھے، پھر خداوند عالم نے نبیوں کو خوشخبری دینے والے اور انذار کرنے والے بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ برحق کتاب نازل کی تاکہ وہ لوگوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کا فیصلہ کرے)

اس آیت شریفہ میں ”کتاب“ کو برحق فیصل قرار دیا گیا ہے جبکہ سورہ حدید آیت ۲۵ میں ”میزان“ کو اس عمل کا ذریعہ قرار دیا گیا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس میں معنوی مطابقت و ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور ”میزان“ بھی ”فرقان“ کی طرح اس دین کا نام ہے جو لوگوں میں عدل پر مبنی فیصلہ کرے۔ عدل و انصاف کے قیام کی راہ ہموار کرے اور عادلانہ معاشرہ کے قیام کو یقینی بنائے۔ اور اپنے عظیم معارف و احکام کے ذریعے نوح انسانی کو عادلانہ نظام زندگی فراہم کرے۔ (واللہ اعلم)

بعض حضرات نے کہا ہے کہ ”فرقان“ سے مراد ”قرآن“ ہے،

بعض دانشوروں نے اسے ”حق و باطل کے درمیان حد فاضل اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والا،

تمیز دینے والا“ امر قرار دیا ہے

بعض اہل دانش نے اس سے حضرت پیغمبر اسلامؐ کی طرف سے نصاریٰ کے ساتھ حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کی

بابت بحث میں پیش کی جانے والی ٹھوس دلیل مراد لیا ہے،

بعض حضرات نے اس سے ”نصر“ (نصرت و مدد) اور بعض نے ”عقل“ مراد لی ہے،

بہر حال ہم نے اس کی بابت حقیقت امر کی وضاحت کر دی ہے۔ اس کی روشنی میں اس کے حقیقی معنی و مفہوم سے

آگاہی حاصل کرنا ممکن ہے۔

## آیات الہی کے منکرین کا انجام

○ ” إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انتِقَامٍ ”  
(جن لوگوں نے اللہ کی آیتوں کا انکار کیا ان کے لئے سخت عذاب ہے اور اللہ غالب، سخت انتقام والا ہے)

”انتقام“ کا معنی ”غلطی و جرم کرنے والے کو ان کا جرم پر دی جانے والی سزا“ کیا گیا ہے۔ بنا بریں اس سے عام طور پر مراد لیا جانے والا معنی ”بدلہ“ ہرگز مقصود نہیں کہ جو اپنی نفسی قلب کے لئے لیا جاتا ہے کیونکہ ہمارے درمیان انتقام کا معنی (بدلہ) دراصل غلطی کرنے والے کو اس تکلیف و نقصان پر سخت ترین سزا دے کر اپنے دل کو مطمئن کرنے سے عبارت ہے جو وہ کسی کو پہنچاتا ہے، یعنی جب کوئی شخص کسی کو زبانی یا عملی طور پر تکلیف یا نقصان پہنچائے تو متاثرہ شخص اس کی تلافی اس طرح کرتا ہے کہ اس سے بدلہ لیتے ہوئے اسے اس سے زیادہ تکلیف و نقصان یا سزا دے کر اپنے دل کو سکون پہنچاتا ہے۔ انتقام کا یہ معنی خداوند عالم کی بابت ہرگز درست نہیں کیونکہ اس کی ذات بندوں کی طرف سے پہنچنے والے نفع یا نقصان اور ان کے اعمال کے منفی اثرات سے متاثر ہونے سے پاک و بالاتر ہے، نہ تو اسے بندوں کے اعمال سے کوئی نفع حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی تکلیف و نقصان پہنچتا ہے لیکن اس نے بندوں سے وعدہ کیا ہے..... اور اسی کا وعدہ حق ہے..... کہ وہ اپنے بندوں کے درمیان بہت جلد حق کے ساتھ فیصلہ کرے گا، نیکی کی جزا اور برائی کی سزا دے گا، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۃ مؤمن، آیت: ۲۰

○ ” وَاللَّهُ يَفْضِلُ بِالْحَقِّ ”

(اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرے گا)

سورۃ نجم، آیت: ۳۱

○ ” لِيَجْزِيَ الَّذِينَ أَسَاءُوا بِمَا عَمِلُوا وَيَجْزِيَ الَّذِينَ إِتَّقُوا وَالَّذِينَ هُمْ أَغْنَاهُمْ عَنِ الْعَالَمِ ”

(تاکہ بدکاروں کو ان کے برے اعمال کی سزا دے اور نیک اعمال بجالانے والوں کو اچھی جزا عطا کرے)

ایسا کیوں نہ ہو جبکہ وہ عزیز و غالب علی الاطلاق ہے وہ گستاخ بندوں کی گرفت اور روک تھام پر قادر ہے، جیسا کہ کہا گیا ہے کہ لفظ ”عزت“ کا اصل معنی امتناع اور روک تھام کرنا اور کوتاہی ہے، ”عزیز علی الاطلاق“ سے مراد یہ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے اور کسی محدودیت کے بغیر غلبہ و طاقت رکھتا ہے۔

بنا بریں آیہ مبارکہ ” إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ” کہ جس میں ”عذاب“ کو کسی

خاص وقت و حالت کے ساتھ مقید کر کے ذکر نہیں کیا گیا بلکہ آخرت یا قیامت کے دن جیسے الفاظ سے خالی صرف ”عذاب شدید“ کہا گیا ہے یعنی کافر جس طرح آخرت میں عذاب سے دوچار ہوں گے اسی طرح دنیا میں بھی خدا کا عذاب ان کو اپنی پلیٹ میں لے گا۔

بہر حال یہ مسئلہ ان قرآنی حقائق میں سے ایک ہے جسے آیات قرآنیہ میں بحث کرنے والے مفسرین و مفکرین نے اہمیت کی نگاہ سے نہیں دیکھا اور اس کے معنی و مفہوم کی وسعت پر توجہ نہیں دی، شاید اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ ہو کہ عام طور پر ہم ”عذاب“ سے وہی کچھ مراد لیتے ہیں جس میں جسمانی تکلیف یا مالی نقصان وغیرہ ہو، اسی بناء پر مال و دولت کا ضائع ہو جانا (مال کی کمی یا محرومی)، اپنوں اور عزیزوں کی موت، شدید جسمانی بیماریوں وغیرہ ہی کو عذاب سمجھتے ہیں جبکہ قرآنی تعلیمات میں ان تمام امور سے ماوراء امر کو عذاب سے تعبیر کیا گیا ہے،

### ”عذاب“ کا معنی، قرآنی نقطہ نظر سے!

قرآن مجید خدا کی یاد سے خالی زندگی کو ”حنگی کی حالت“ قرار دیتا ہے خواہ وہ ہماری نظروں میں جس قدر وسعت کی حامل کیوں نہ ہو، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۃ کہ، آیت: ۱۲۴

○ ”وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا“

(جو شخص میری یاد سے روگردانی کرے اس کی زندگی تنگ ہوگی)

اسی طرح اموال اور اولاد کو ”عذاب“ قرار دیتا ہے جبکہ ہم ان کو عظیم نعمت سمجھتے ہیں، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۃ توبہ، آیت: ۸۵

○ ”وَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَأَوْلَادُهُمْ ۗ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ

أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿۸۵﴾“

(ان کے اموال اور اولاد سے آپ تعجب کا شکار نہ ہوں، خدا چاہتا ہے کہ انہیں انہی کی وجہ سے دنیا میں عذاب کرے اور کفر کی حالت ہی میں ان کی رو میں قبض کرے)

حقیقت امر..... جیسا کہ اسی سورۃ مبارکہ (بقرہ) کی آیت ۳۵ ”وَقُلْنَا يَا دُمِّرْ اِسْكُنْ اَنْتَ وَوَجْكَ“

الْجَنَّةَ.....“ کی تفسیر میں اجمالی طور پر بیان ہو چکا ہے..... یہ ہے کہ:

۱۔ ہر انسان کی خوشی، غم، فرح و سرور، حزن و اندوہ، رغبت و دلچسپی، بے رغبتی و بے اعتنائی، رنج و عذاب میں مبتلا ہونا اور نعمتوں سے لطف اندوز ہونا، ان سب کا دار و مدار اس کے اپنے فکری رجحان کے مطابق سعادت و شقاوت کے طے شدہ مخصوص معیاروں پر ہے،

۲۔ نعمت، عذاب اور ان سے قریب المعنی امور میں سے ہر ایک اپنی مخصوص نسبت کی بناء پر مستقل معنی رکھتا ہے یعنی جس چیز کی طرف اس کی نسبت ہوتی ہے اس کے حوالہ سے اس کا مخصوص معنی متعین ہو جاتا ہے، بنا براین ”روح“ کی سعادت و شقاوت اسی سے مخصوص معنی رکھتی ہے اور ”جسم“ کی سعادت و شقاوت اس سے نسبت و مناسبت کے حوالہ سے مخصوص معانی کی حامل ہیں، اسی طرح ”حیوان“ کی سعادت و شقاوت اس سے انتساب کی بنیاد پر اور ”انسان“ کی سعادت و شقاوت اس سے نسبت کے حوالہ سے اپنے مخصوص معانی رکھتی ہیں۔

ان دو نکات کے تناظر میں یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ جو انسان اپنے آپ کو اخلاق الہیہ سے آراستہ نہ کرے اور آداب خداوندی نہ اپنائے (اپنے آپ کو خدا سے وابستہ نہ کرے) وہ ہمیشہ مادی سعادت ہی کو حقیقی اور اصل سعادت سمجھتا ہے وہ روحانی سعادت کو ہرگز خاطر میں نہیں لاتا اور نہ ہی اسے اہمیت و توجہ کی نظر سے دیکھتا ہے، طمع و حرص کے کچھڑ میں لت پت ہو کر مال، اولاد، چاہ و جلال اور اقتدار کے حصول میں اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر دیتا ہے، بظاہر وہ انہی چیزوں کے حاصل کرنے کے درپے ہوتا ہے لیکن حقیقت میں اس کی توجہ اسی موہوم نعمت سے لطف اندوز و بہرہ ور ہونے پر مرکوز ہوتی ہے جو اس کی لوح خیال میں ثبت ہو کر اس کے ارادہ و چاہت کو مغلوب کر چکی ہوتی ہے۔ اور جب وہ اسی خیالی نعمت کو پالیتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ایک لذت ہزاروں غموں اور دکھوں کو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے (وہ جسے اپنے تئیں ”نعمت“ سمجھتا تھا اور اس سے لطف اندوز ہونے کے خواب دیکھتا تھا وہ اس کے لئے عذاب ہے) جب تک وہ ”نعمت“ اسے حاصل نہ تھی تو وہ اس کے حصول کو اپنی سب سے بڑی تمنا و آرزو قرار دیتا تھا اور جب اسے پالیتا ہے تو اس کے خوابوں کا شیش محل ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے اور وہ حاصل شدہ نعمت سے سوائے رنج و زحمت کے کچھ حاصل نہیں کرتا بلکہ محرومی و رسوائی کے سایے اس پر چھا جاتے ہیں اور وہ ان اسباب کے سامنے شرمندہ ہو جاتا ہے جن کے سہارے اس نے اپنی قوتیں و کاوشیں بروئے کار لائی تھیں (اسے ناامیدی و یاس کے سوا کچھ نہیں ملتا)، ایسا کیوں نہ ہو؟ کیونکہ وہ قلبی طور پر اس مرکز فیض سے وابستہ ہی نہ تھا جو سکون، اطمینان اور حقیقی راحت و آرام کا سرچشمہ ہے بلکہ وہ فنا پذیر مادی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کے دھوکہ میں آ کر روحانی نعمتوں سے بہرہ ور ہونے سے محروم ہو گیا، وہ اپنی حاصلہ نعمت کے گھنے جنگل میں سرگرداں ہو گیا، اسے اپنا مطلوب نہ مل سکا اور وہ حسرت و غم کی وحشت ناک وادی میں گم ہو گیا، جو ملاوہ مطلوب نہ تھا اور جس سے محرومی ہوئی اس کی حسرت دل میں باقی



رہی، تو یہ ہے مادی لذتوں کو اپنا اوڑھنا کچھونا بنا کر موہوم و خیالی نعمتوں سے بہرہ مند و لطف اندوز ہونے کا نتیجہ، کہ اس نے اپنی پائی ہوئی نعمت سے سوائے رنج و غم کے کچھ نہ پایا اور کھوئی ہوئی نعمت پر حسرت و انہوس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔

لیکن قرآن مجید، انسان کو دو چیزوں کا مجموعہ مرکب قرار دیتا ہے: ایک ہمیشہ باقی رہنے والے روح اور دوسرا بدلتا رہنے والا تقسیم پذیر مادی بدن، انسان انہی دو وجودی عناصر کے ساتھ اپنے پروردگار کے پاس لوٹ جانے تک اسی حالت و صورت میں باقی رہتا ہے اور جب وہ خدا کی طرف لوٹ جاتا ہے تو اس کے تفسیر ذوال پذیر کی کا دور ختم ہو جاتا ہے پھر وہ کامل ”پیشگی“ پایا ہے کہ جس میں کوئی عجز یا نہ ہوگی، بنا بریں جس چیز میں صرف روح کی سعادت پائی جاتی ہے جیسے علم و دانش وغیرہ تو وہ انسانی سعادت کا حصہ ہے، اسی طرح جو چیز جسم اور روح دونوں کی سعادت کا موجب ہو سکتی ہو مثلاً مال و اولاد وغیرہ بشرطیکہ وہ ذکرا الہی سے مانع نہ ہونے پائیں اور ہمیشہ کی پستی کا موجب نہ بنیں تو وہ بھی انسان کے لئے سعادت ہے۔ اور وہ کس قدر عمدہ سعادت ہے۔ اسی طرح جو چیز بدن کی تکلیف و سختی اور جسمانی محرومی کا سبب ہو جبکہ اس میں روح کی سعادت پائی جائے مثلاً خدا کی راہ میں مارا جانا اور غذا کی خوشنودی کے لئے مال خرچ کر دینا..... کہ جس سے مال میں بظاہر کمی آ جاتی ہے..... تو یہ بھی انسان کی سعادت کا حصہ ہے کہ اس طرح کی کیفیت دراصل ایسے ہے جیسے دوا کی لمحہ بھر تلخی کو سہہ کر طولانی مدت کی صحت و تندرستی کو یقینی بنایا جاتا ہے، یہ سب کچھ قرآنی نقطہ نظر میں انسان کے لئے ”سعادت“ اور ”نعمت“ قرار دیا گیا ہے، اس کے علاوہ وہ چیز جس میں انسان کی جسمانی سعادت اور روح کی شقاوت ہو ہو..... حقیقت میں..... اس کے لئے شقاوت اور عذاب ہے اور قرآن صرف جسمانی سعادت کو نہایت معمولی و ناچیز اور ناقابل توجہ شے قرار دیتا ہے، چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورۃ آل عمران، آیات: ۱۹۶، ۱۹۷

○ ”لَا يَغْرُرُكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ۗ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَا لَهُمْ جَهَنَّمَ وَايُسُّ  
الْبِهَادُ“

(کافروں کا شہر میں گھومنا پھرنا..... مادی زندگی سے لطف اندوز ہونا..... آپ کو غمگین نہ کرے کیونکہ یہ سب

کچھ نہایت معمولی و ناچیز متاع ہے پھر ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے)

اور جو چیز جسم اور روح دونوں کی شقاوت کا باعث ہے تو جس طرح قرآن اسے انسان کے لئے شقاوت و بدبختی (مضرت و نقصان) قرار دیتا ہے اسی طرح افراد بشر بھی اسے اپنے لئے شقاوت سمجھتے ہیں، لیکن دونوں کے معیاروں اور نقطہ نظر میں فرق ہے، کیونکہ قرآن ہر اس چیز کو عذاب قرار دیتا ہے جس میں روح کی شقاوت پائی جائے جبکہ لوگ صرف جسم کی شقاوت کو عذاب سمجھتے ہیں، اس کی مثال سابقہ امتوں پر نازل ہونے والے گونا گوں عذاب سے واضح ہو جاتی ہے، ارشاد

خداوندی ہے:

سورہ فجر، آیات: ۱۴ تا ۶:

○ ”أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۖ إِرْمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۗ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي  
الْبِلَادِ ۗ وَشُعُوبَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۗ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ۗ الَّذِينَ  
طَعَنُوا فِي الْبِلَادِ ۗ فَكَثُرُوا فِيهَا الْفَسَادَ ۗ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۗ إِنَّ  
رَبَّكَ لِبَالِغٍ صَادٍ ۗ“

(کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے قوم عاد کے ساتھ کیا سلوک کیا، ① شہرام کے ساتھ کہ عالیشان بلند  
ستونوں والا ہے؟ ② ایسی بلند عمارتیں شہر میں اس سے پہلے نہیں بنائی گئیں ③ اور قوم ثمود کے ساتھ! کہ جو  
دروں میں بڑے بڑے پتھر کاٹتے تھے ④ اور فرعون کے ساتھ! کہ جو نہایت طاقتور تھا ⑤ انہوں نے شہر میں  
طغیان و سرکشی کا بازار گرم کر دیا ⑥ اور ان میں سے کثرت کے ساتھ فساد پھیلایا ⑦ چنانچہ تیرے پروردگار نے  
انہیں عذاب کا تازیانہ لگایا ⑧ یقیناً تیرا رب کمین میں ہے ⑨)

ذی شعور مخلوق کی سعادت و شقاوت، شعور و ادراک سے وابستہ ہے یہی وجہ ہے کہ جو لذتیں چیزیں ہیں حاصل ہوا اگر ہم  
اس کی لذت محسوس نہ کریں تو اسے اپنے لئے لذت آمیز نہیں سمجھتے، اسی طرح اگر درد و غم انگیز شے کا ادراک نہ کریں تو اسے  
اپنے لئے شقاوت نہیں سمجھتے، اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سعادت اور شقاوت کی بابت قرآنی معیار، مادی معیار و  
مسک سے قطعی مختلف ہے، بنا برائیں جو شخص مادی لذتوں میں غرق ہوا ہے حقیقی سعادت و شقاوت کہ جن کے معیاروں کی  
پہچان قرآن نے کروائی ہے کے ادراک کے لئے قرآن ہی کے بتائے ہوئے راہ و روش زندگی کے فکری و عملی اصولوں کو اپنانا  
ہوگا اور قرآن نے اپنے شاہد افراد کو ان اصولوں سے آگاہی دلاتے ہوئے واضح کیا ہے کہ: وہ اپنے دلوں کو غیر خدا سے  
ہرگز وابستہ نہ کریں، خداوند عالم ہی کو اپنا حقیقی اور ہر چیز کا مالک سمجھیں کہ اس کے سوا کوئی چیز استقلال نہیں رکھتی بلکہ ہر شے  
اسی سے رزق استقلال پاتی ہے، اور ہر چیز کو صرف اسی کے لئے چاہیں۔ کسی چیز کو اس کی رضا و خوشنودی کے حصول کی غرض  
کے سوا اپنا مقصد و مقصود قرار نہ دیں بلکہ ہر چیز میں حقیقی مقصد خدا ہونا چاہیے، جو شخص تربیت کے اس قرآنی اصول کو اپنائے وہ  
دنیاوی زندگی میں اپنے لئے سعادت کے سوا کوئی چیز خاطر میں نہیں لاتا، اس کی سعادت دو طرح کی ہوتی ہے: (۱) روح اور  
جسم دونوں کی سعادت، (۲) صرف روح کی سعادت، اس کے علاوہ وہ کسی چیز کو اپنے لئے سعادت نہیں سمجھتا بلکہ ان دونوں  
قسموں کے علاوہ ہر چیز کو اپنے لئے عذاب و شقاوت سمجھتا ہے، لیکن جو شخص نفسانی خواہشوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہو اور دنیا  
کی مادی لذتوں کا سیر ہو چکا ہو وہ اگر چہ اپنے تئیں دنیاوی زینت کی ہر اس چیز کو اپنے لئے سعادت، خیر اور لذت سمجھتا ہے جو

اسے حاصل ہو جائے لیکن بہت جلد حقیقت کے چہرے پر پڑا ہوا مجازی پردہ اٹھ جائے گا اور وہ اپنی غلطی و غلط فہمی اور کج روی سے آگاہ ہو جائے گا اور جس چیز کو اپنے لئے سعادت گمان کرتا تھا وہی اس کے لئے شقاوت بن جائے گی، خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے:

سورۃ معارج، آیت ۴۲:

○ ” قَدْ رَأَوْهُمْ يَخْضِعُونَ أَوْ يَلْعَبُونَ حَتَّىٰ يُلْقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِينَ هُمْ يُوعَدُونَ“

(انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو کہ وہ..... اپنے کفر و باطل کی تاریکی میں..... گرے پڑے رہیں اور لوہو و لعاب میں مصروف و سرگرم رہیں یہاں تک کہ وہ دن ان پر آجائے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے)

سورۃ ق، آیت ۲۲:

○ ” لَقَدْ كُنْتُمْ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ كَالْحِيدِ“ (۱۰)

(اور تو اس امر سے غفلت میں تھا پھر ہم نے تیرے سامنے سے پردہ ہٹا دیا تو آج تیری نظر بہت تیز ہے)

سورۃ نجم، آیات ۲۹، ۳۰:

○ ” فَأَعْرَضَ عَنْ مَن تَوَلَّىٰ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۗ ذٰلِكَ مَبْلَعُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ“

(جو شخص ہمارے ذکر سے منہ موڑ لے اس سے رخ پھیر لو اور وہ دنیاوی زندگی کے سوا کچھ نہیں چاہتا، یہ ان کے علم کی

آخری حد ہے)

تو اس طرح کے افراد خالص و سالم لطف و لذت سے بہرہ ور نہیں ہوتے بلکہ ان کی ہر خوشی غم و الم سے بھری ہوتی ہوتی ہے اور دکھوں کو اپنے ساتھ لئے ہوتی ہے،

اس بیان سے واضح و ظاہر ہوتا ہے کہ جو فکر و ادراک خدا والوں اور خاصانِ قرآن کو حاصل ہوتا ہے وہ دوسروں کو حاصل فکر و ادراک سے قطعی مختلف ہے جبکہ وہ سب ایک ہی وجودی نوع یعنی انسان ہی سے تعلق رکھتے ہیں (سب کے سب انسان ہیں اور اس وجودی نوع کے حوالہ سے برابر ہیں) اور ان دونوں گروہوں (اہل خدا و خاصانِ قرآن اور خدا و قرآن سے دور افراد) کے درمیان متوسط درجات کے حامل اہل ایمان ہیں کہ جو خدا کی راہ پر ہونے کے باوجود خدائی تعلیم و تربیت کے کمائی درجہ پر فائز نہیں ہوئے۔

یہ ہے ”عذاب“ کا معنی و مفہوم اور اصل و اساس کا قرآنی نقطہ نظر! اس کے باوجود کلامِ الہی میں جسم کی شقاوت (جسمانی تکلیف و اذیت) کو بھی ”عذاب“ سے تعبیر کیا گیا ہے البتہ اسے صرف جسم تک محدود قرار دیا گیا ہے وہ روح تک نہیں پہنچتا، چنانچہ سورۃ ص آیات ۴۱ میں حضرت ایوب کا قول مذکور ہے:

○ ” اِذْ نَادَى رَبَّهُ اَنْى مَسَّنِى الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ“

(جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ خدایا! مجھے شیطان نے سخت تکلیف اور عذاب سے دوچار کر دیا ہے)

اسی طرح سورہ اعراف، آیت ۱۴۱ میں خداوند عالم نے فرمایا:

○ ” وَ اِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اِل فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْكُمْ سُوْءَ الْعَذَابِ يَفْتَتِلُوْنَ اَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ

نِسَاءَكُمْ وَ فِىْ ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّكُمْ عَظِيْمٌ ○“

(اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تمہیں آل فرعون سے نجات دلائی، وہ تمہیں سخت و برے عذاب کا نشانہ بناتے

تھے، تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو خدمت گزاری کے لئے زندہ رکھتے تھے، اور اس میں

تمہارے لئے تمہارے پروردگار کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی)

اس آیت میں خداوند عالم نے فرعونوں کی طرف سے بنی اسرائیل پر ڈھائے جانے والے مظالم کو اپنی طرف سے

ان کی آزمائش و امتحان قرار دیا اور ان (فرعونوں) کے حوالہ سے اسے ”عذاب“ سے تعبیر کیا، یعنی اسے اپنی طرف سے عذاب

قرار نہیں دیا بلکہ فرعونوں کی طرف سے عذاب اور اپنی طرف سے اسے بنی اسرائیل کی آزمائش کا نام دیا ہے۔

### خدا سے کچھ پوشیدہ نہیں

○ ” اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِى السَّمٰوٰتِ ...“

(بیشک اللہ پر کوئی چیز جو زمین میں ہے مخفی نہیں اور نہ ہی جو آسمان میں ہے)

خداوند عالم نے آیات الہی کا انکار کرنے والوں کے عذاب کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے ”ذُو اِنْتِقَاہِ“ (سخت

گرفت والا) ہونے کو بیان فرمایا تاکہ ان پر عذاب کا سبب واضح ہو جائے، لیکن حقیقت الامر کی مزید و تکمیلی وضاحت کے

لئے خداوند عالم نے اپنے بیان میں اضافہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ”زمین و آسمان میں کوئی چیز خدا سے پوشیدہ نہیں“، تاکہ

کسی کے دل میں یہ خیال نہ آنے پائے کہ شاید کسی شخص کا کفر خدا سے پوشیدہ رہے اور خدا اس پر عذاب و انتقام کا اقدام نہ

کرے، تو اس اضافہ سے خداوند عالم نے واضح کر دیا کہ وہ غلبہ و طاقت والا ہے کوئی چیز اس سے مخفی و پوشیدہ نہیں خواہ وہ زمین

میں ہو کہ ظاہری حواس جس کا ادراک کر سکتے ہیں یا آسمان میں ہو کہ جو ظاہری حواس کی دسترس سے باہر ہے، سب کچھ خدا کے

سامنے ہے، ذرہ بھر اس سے مخفی نہیں۔

عین ممکن ہے کہ ”مما فی الارض“ (جو کہ زمین میں ہے) سے ظاہری اعضاء و جوارح سے انجام دیئے جانے والے اعمال اور ”مما فی السماء“ (جو کچھ آسمان میں ہے) سے دلوں میں چھپی ہوئی باتیں مراد ہوں جیسا کہ اس مطلب اور ممکنہ معنی کا ذکر ہم نے سورہ بقرہ کی آیت ۲۸۴ کی تفسیر میں کیا ہے جس میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

○ ”لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَاِنْ تُبَدَّلُوْا اَمْاٰلِيْكُمْ اَوْ تُنْفَسِكُمْ اَوْ تُتَّخَفُوْا يُحٰسِبِكُمْ

بِاِلٰهِهِ“

(جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب خدا کا ہے (اس کی ملکیت ہے) اور اگر تم اپنے دلوں کی باتوں کو ظاہر کرو یا چھپاؤ خدا تم سے اس کا حساب لے گا۔ تمہارا محاسبہ کرے گا۔)

### رحموں میں تصویر کشی

○ ”هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ“

(وہ کہ جو رحموں میں جیسا چاہتا ہے تمہاری تصویریں بناتا ہے)

کسی چیز کو مخصوص شکل و صورت دینے کو ”تصویر“ کہتے ہیں، لفظ ”صورت“ میں سایہ دار جیسے مجسمہ وغیرہ اور غیر سایہ دار تمام اشیاء شامل ہیں،

”ارحام“، رحم کی جمع کا صیغہ ہے اس سے مراد بچہ دانی ہے (عورت کے جسم میں وہ مقام جہاں بچہ ٹھہرتا اور نشوونما پاتا ہے)

یہ آیت مبارکہ، سابقہ دو آیتوں کی نسبت تکاملی بیان کی حیثیت رکھتی ہے اور جو مطالب ان آیتوں میں بیان کئے گئے ہیں ان سے بالاتر امور کا تذکرہ اس آیت مبارکہ میں ہوا ہے، سابقہ دو آیتوں میں مذکور مطالب کا خلاصہ یہ ہے:

”خداوند عالم ان لوگوں پر عذاب نازل کرتا ہے جو اس کی آیات کا انکار کرتے ہیں کیونکہ وہ غلبہ و طاقت والا، انتقام و سخت رفت و مزادینے والا اور مخفی و ظاہر سے آگاہی رکھنے والا ہے، کوئی اس پر غلبہ نہیں پاسکتا بلکہ وہی سب پر غالب ہے“، اور زیر نظر آیت مبارکہ میں جن مطالب کا بیان مقصود ہے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ:

بات اس سے بھی زیادہ بڑی ہے اور وہ یہ کہ: جو شخص خدا کی آیات کا انکار کرے اور اس کے حکم کی نافرمانی کرے

اسے اپنے بارے میں استقلال کا حامل ہونے کی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی خدا سے بے نیاز، اپنی قدرتمندی کا گمان کر کے یہ سوچنا چاہیے کہ وہ امر الہی پر غلبہ پاسکتا ہے اور خداوند عالم کے قائم کردہ نہایت خوبصورت بنیادوں پر استوار نظام خلقت کو درہم برہم کر سکتا ہے کہ جس کے نتیجہ میں اس کا ارادہ خدا کے ارادہ پر چھا جائے گا، (ایسا ہرگز درست نہیں) بلکہ ہر حال میں اسے یہ باور رکھنا چاہیے کہ اس کا وجود اور وجودی قوتوں کے استعمال کی قوت و اختیار خدا کی عطا کردہ نعمتیں ہیں، کوئی چیز خدا کے اذن کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی اور اس نے نظام خلقت کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ اس میں انسان ہی کے اختیار کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور اسی امتیازی صفت کے ساتھ وہ اپنی زندگی کی راہ روش کے اصولوں کا تعین کرتے ہوئے اپنے لئے ایمان و اطاعت الہی یا کفر و معصیت کا راستہ اختیار کرتا ہے، انسان کو اس طرح کی قوت اختیار عطا کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس کی آزمائش و امتحان کا سلسلہ درست بنیادوں پر قائم ہوتا کہ ہر شخص ایمان لانے اور کفر اختیار کرنے میں سے جس چیز کو پسند کرے اسے اپنالے لیکن اسے معلوم ہونا چاہیے کہ ہر شخص کا ارادہ و مشیت خداوند عالم کہ جو پوری کائنات کا پروردگار ہے کے ارادہ و مشیت سے وابستگی کے بغیر کوئی وجودی حیثیت و اعتبار نہیں رکھتا، (فمن شاء فليؤمن ومن شاء فليكفر، وما يشاؤون الا ان يشاء الله رب العالمين)

بنابر ایسا ایمان و کفر سمیت عالم ہستی کی تمام موجودات کا تعلق تقدیر سے ہے، تقدیر سے مراد وہ نظم و نظام ہے جو خداوند عالم نے اشیاء و موجودات عالم کے لئے اس طرح قائم کیا ہے کہ ہر چیز اس کی بناء پر آسانی کے ساتھ اپنے مقصد حیات کو پانے کے لئے اپنی وجودی توانائی کے مطابق راہ و روش و طرز عمل کا انتخاب کر سکے اور خداوند عالم نے اپنی قدرت کاملہ سے ہر چیز کو اس کی وجودی حیثیت کے مناسب و موزوں صورت عطا فرمائی ہے تاکہ اس کی وجودی توانائیاں نتیجہ خیز ثابت ہوں، تو خداوند عالم ہی ہر حال میں غالب اور اپنے ارادہ و مشیت میں قاہر و طاقتور اور اپنی مخلوق پر کامل اختیار رکھنے والا ہے، لیکن انسان اس زعم باطل کا شکار رہتا ہے کہ اسے اپنے ارادہ و مشیت میں کامل استقلال حاصل ہے اور اس کا ہر فعل و عمل صرف اس کے اپنے ارادہ و مشیت پر مبنی ہے لہذا وہ اپنے کامل استقلال کے ساتھ نظام ہستی کے اس جاری سلسلہ کا راستہ روک سکتا ہے۔ خدا نے کائنات کے وجودی تسلسل کے لئے قائم کیا ہوا ہے اور اس طرح اسے تقدیر الہی پر سبقت حاصل ہو جائے گی، یہ اس کی غلط فہمی اور خام خیالی ہے کیونکہ اس کی وجودی قوتوں کے استعمال کے استقلالی اختیار کا تعلق بھی تقدیر خداوندی سے ہے کہ اگر خدا سے اپنی وجودی قوتوں کے استعمال کا اختیار عطا نہ فرماتا تو اسے ہرگز ان سے استفادہ کرنے کی راہ نہ ملتی، یہی ہے آیہ مبارکہ: ”يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ“ کا معنی و مراد، یعنی وہ تمہارے وجود کے اجزاء کو ابتداء ہی سے ایسے نظم و نظام کے ساتھ مرتب کرتا ہے جس کا سلسلہ مشیت الہی سے وابستہ و پیوستہ ہے لیکن وہ خدا کے حتمی فیصلہ پر مبنی نہیں بلکہ اس کے ان سے مربوط اور اس پر موقوف ہے۔

## تقدیر کے حوالہ سے ایک اہم نکتہ

اس آیت مبارکہ میں ایک اہم نکتہ مورد توجہ ہے کہ اس میں ”تقدیر“ کے جس جاری سلسلہ کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ صرف انسان سے تعلق رکھتا ہے پورے عالم ہستی میں جاری سلسلہ تقدیر سے نہیں، اس کی دو وجوہات ممکن ہے:

ایک یہ کہ یہاں کافروں سے انتقام کی بات ہو رہی ہے لہذا سلسلہ کلام اس امر کا متقاضی ہے کہ انسان کی تقدیر کا ذکر کیا جائے تاکہ بحث و گفتگو میں ربط باقی رہے، اور الفاظ و معانی اور عبارت و مقصود کے درمیان مطابقت قائم رہے،

دوسری وجہ یہ کہ اس سورۃ مبارکہ کی ابتدائی آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نصاریٰ کے عقیدہ کا تذکرہ ہوا ہے لہذا یہاں انسان کی تقدیر کا ذکر کر کے اسے سلسلہ بحث سے مربوط کر دیا گیا تاکہ نتیجتاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حقیقت الامر واضح ہو جائے اور ان کا ”مخلوق“ ہونا معلوم ہو جائے کیونکہ نصاریٰ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان کے رحم مادر میں نشوونما پانے کے مراحل طے کرنے سے انکار نہیں کرتے اور نہ ہی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے وجودی تکیوں کو خود انجام دیا،

## ایک علمی نکتہ

اس آیت مبارکہ میں ایک اور علمی نکتہ قابل توجہ ہے، اور وہ یہ کہ اس میں ”نَزَّلَ عَلَيْكَ“ کے بعد ”يُصَوِّرُكُمْ“ کہا گیا ہے، ”نَزَّلَ عَلَيْكَ“ میں ”ك“ کا مخاطب حضرت پیغمبر اسلام ہیں اور ”يُصَوِّرُكُمْ“ میں ”كُمْ“ کا مخاطب تمام افراد بشر ہیں، اسے علمی اصطلاح میں ”تعمیم بعد التخصیص“ کہا جاتا ہے (خاص کے ذکر کے بعد عام کا ذکر کرنا)، یہاں ایسا کرنے میں دراصل اس امر کا بیان مقصود ہے کہ مؤمنین کا ایمان بھی کافروں کے کفر کی طرح تقدیر خداوندی کے دائرہ سے باہر نہیں، تاکہ مؤمنین اپنے بارے میں خدا کی خاص عنایت و رحمت کے استحقاق پر قلبی مسرت پائیں اور تقدیر کے حسن انتخاب پر خوش ہوں، اسی طرح کافروں کے بارے میں ان کے کفر کی وجہ سے خدائی انتقام کا نشانہ بننے کی خبر سن کر انہیں (مؤمنین کو) اطمینان خاطر حاصل ہو،

یکتا، غالب و دانا معبود

○ ”لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ“

(کوئی معبود نہیں سوائے اس کے، وہ غالب، حکیم و دانا ہے)

اس جملہ میں اس موضوع کی یاد دہانی مقصود ہے جس کا ذکر اس سورہ مبارکہ کی ابتدائی آیات کے آغاز میں ہوا ہے یعنی توحید، گویا یہاں تاکید کی غرض سے دلیل کا خلاصہ ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ تمام امور کی بھرپور وضاحت ہو سکے اور اس حقیقت سے آگاہی دلانی جاسکے کہ یہ تمام امور یعنی لوگوں کی تخلیق کے بعد ان کی ہدایت و رہنمائی کا سلسلہ قائم کرنا، کتاب اور فرقان نازل کرنا اور کافروں کو کفر کردار تک پہنچانے سے عالم ہستی کے جاری نظام کی مستحکم تدبیر کا اہتمام کرنا وغیرہ ایسے امور ہیں جو ایک ہی خدائے مدبر سے تعلق رکھتے ہیں اور چونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی برحق معبود نہیں لہذا ثابت ہوا کہ وہی ہے جو لوگوں کو پیدا کرنے کے بعد ان کی ہدایت کرتا ہے، وہی ہے جو کتاب و فرقان نازل کرتا ہے، وہی ہے جو اپنی آیات کا انکار کرنے والوں کو عذاب کرتا ہے اور یہ سب کچھ یعنی ہدایت، کتاب و فرقان کا نازل کرنا، انتقام و تقدیر کے امور اس کی حکمت و عزت کے عملی آثار ہیں۔

## روایات پر ایک نظر

تاریخ کے اوراق سے!

تفسیر ”مجمع البیان“ میں کلبی، محمد بن اسحاق اور ربیع بن انس سے روایت کی گئی ہے کہ اس سورہ مبارکہ (آل عمران) کی ابتدائی آیات سے تقریباً اسی آیات سے کچھ زیادہ تک نجران کے ۶۰ افراد پر مشتمل ایک وفد کے بارے میں نازل ہوئیں جو حضرت پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان میں ۱۴ افراد ان کے بزرگوں و سرداروں میں سے تھے کہ جن میں سے درج ذیل تین افراد وفد کی قیادت کر رہے تھے:



(۱) عاقب، کہ جو قوم کا سردار تھا اور سب ہی اس کی رائے کو بنیادی حیثیت دیتے تھے یہاں تک کہ کوئی فیصلہ اس کی مرضی کے بغیر نہیں ہوتا تھا۔ اس کا اصل نام ”عبدالمسح“ تھا،

(۲) ”اسہم“، ان کی بزرگ قومی شخصیت کہ جس نے تمام ضروریات سفر فراہم کئے،

(۳) ”ابوحارثہ بن علقمہ“، جو ان کی مرکزی دینی شخصیت، بزرگ عالم، مذہبی رہنما اور مدارس علمیہ کے سب سے بزرگ استاد تھے اور اپنی قوم میں نہایت بلند مقام و مرتبت کے حامل تھے، عظیم استاد و معلم کے طور پر پہچانے جاتے تھے چنانچہ روم کے بادشاہوں نے ان کی عزت و تکریم کے طور پر انہیں دینی و مذہبی قائد و پیشوا تسلیم کیا اور ان کے دینی احکامات کو لازم الاتباع قرار دیا اور ان کی علمی و اجتہادی عظمت کی قدر دانی کے طور پر ان کے لئے کئی گرجا تعمیر کروائے،

یہ وفد مدینہ منورہ میں آیا اور مسجد نبویؐ میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا، اس وقت آنحضرتؐ نماز عصر پڑھ چکے تھے۔ وفد کے ارکان نے علماء کا مخصوص لباس (نہایت خوبصورت جے اور قیمتی عبائیں) زیب تن کیا ہوا تھا انہیں دیکھ کر بعض صحابہ کرام نے کہا کہ ہم نے اس سے پہلے اس قدر باوقار وفد نہ دیکھا تھا، وہ ابھی آئے ہی تھے کہ ان کی نماز کا وقت ہو گیا اور وہ کھڑے ہو گئے اور گھنٹیاں بجانے لگے اور انہوں نے مسجد نبویؐ میں اپنی نماز ادا کی،

صحابہ کرام نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کی: یا رسول اللہ! یہ تو آپؐ کی مسجد میں ایسا کر رہے ہیں؟ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو جو کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں انہیں کرنے دو، چنانچہ ان لوگوں نے مشرق کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی، اس کے بعد ان کے سردار ”اسہم“ اور ”عاقب“ نے حضرت پیغمبر اسلامؐ سے گفتگو شروع کی، آنحضرتؐ نے ان دونوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی،

اسہم اور عاقب نے کہا کہ ہم آپؐ سے پہلے اسلام لا چکے ہیں،

آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا، تم جھوٹ بولتے ہو، تم خدا کے دین کو تسلیم نہیں کرتے، تم کیونکر اسلام کے دعویدار ہو سکتے ہو جبکہ تم ”خدا کے لئے بیٹا“ ماننے ہو، صلیب کی پوجا کرتے ہو اور خنزیر کا گوشت کھاتے ہو،

انہوں نے کہا: اگر عیسیٰ خدا کا بیٹا نہیں تو ان کا باپ کون ہے؟

اس کے بعد وہ سب آنحضرتؐ سے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بحث و مناظرہ کرنے لگے،

حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ان سے فرمایا: کیا تمہارا یہ عقیدہ نہیں کہ اولاد باپ کے مشابہ ہوتی ہے؟

انہوں نے کہا: ہاں، بالکل ایسا ہی ہے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: کیا تم یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ ہمارا رب زندہ ہے اور کبھی نہ مرے گا اور یہ کہ عیسیٰ، فانی ہے اور

اس پر موت آ سکتی ہے؟

انہوں نے کہا: بالکل ایسا ہی ہے۔

حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: کیا تمہارا عقیدہ یہ نہیں کہ ہمارا پروردگار ہر چیز پر حاوی اور تمام امور کا مالک ہے اور ہر شے کا محافظ اور اسے رزق دینے والا ہے؟

انہوں نے کہا: کیوں نہیں!

آنحضرتؐ نے فرمایا: آیا حضرت عیسیٰؑ ان تمام صفات کے حامل ہیں؟

انہوں نے کہا: نہیں

پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: کیا تم یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ خداوند عالم ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور آسمانوں اور زمین میں کوئی چیز اس سے مخفی و پوشیدہ نہیں؟

انہوں نے کہا: کیوں نہیں! یہی ہمارا عقیدہ ہے

آنحضرتؐ نے فرمایا: کیا حضرت عیسیٰؑ بھی اسی طرح پوری کائنات میں موجود ہر شے کا علم رکھتے ہیں اور کوئی شے ان سے پوشیدہ نہیں یا صرف اسی حد تک علم رکھتے ہیں جتنا خداوند عالم نے انہیں تعلیم دی؟ انہوں نے جواب دیا: نہیں، وہ پوری کائنات کا علم نہیں رکھتے۔

حضرت رسول خداؐ نے فرمایا: ہمارے پروردگار نے عیسیٰؑ کو خلق کیا اور ان کی والدہ گرامی قدر کے رحم مبارک میں اپنی مشیت کے مطابق ان کی صورت گیری کی، ہمارا رب نہ کھاتا ہے اور نہ پیتا ہے اور نہ ہی اسے رفع حاجت کی ضرورت پیش آتی ہے،

انہوں نے کہا: آپ کی بات درست ہے،

آنحضرتؐ نے پوچھا: کیا تمہارا یہ عقیدہ نہیں کہ عیسیٰؑ علیہ السلام کی والدہ اسی طرح ان کی حاملہ تھیں اور ان کو جنم دیا جس طرح ہر عورت بچے کی حاملہ اور اسے جنم دیتی ہے؟ اور ان کی والدہ نے انہیں اسی طرح دودھ پلایا جس طرح ہر ماں اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے اور دودھ پلائی کی مدت ختم ہونے کے بعد ہر بچے کی طرح حضرت عیسیٰؑ بھی کھانا کھاتے، پانی پیتے اور رفع حاجت کرتے تھے؟

انہوں نے جواب دیا: ہاں، بالکل درست ہے،

حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: جب یہ سب کچھ صحیح ہے تو پھر ان کے بارے میں تمہارے عقائد کی بنیاد کیا ہے؟..... اور تم انہیں خدا کا بیٹا کیونکر مان سکتے ہو؟.....

وہ لوگ آنحضرتؐ کے سامنے لاجواب ہو گئے اور خاموش رہے۔

اس وقت خداوند عالم نے ان کے بارے میں یہ یعنی سورہ آل عمران کی ابتدائی آیات سے اسی (۸۰) سے زیادہ آیتیں نازل فرمائیں۔

(تفسیر مجمع البیان، جلد ۱، صفحہ ۴۰۶)

مؤلف: اسی مطلب کو جلال الدین سیوطی نے تفسیر ”درمنثور“ میں ابن اسحاق، ابن جریر، ابن منذر کے اسناد سے محمد بن جعفر بن زبیر کے حوالہ سے ذکر کیا ہے اور اسی مضمون کی ایک روایت ابن اسحاق کے اسناد سے محمد بن سہل بن ابی امامہ کے حوالہ سے ذکر کی ہے۔ (ملاحظہ ہو: تفسیر منثور، جلد ۲، صفحہ ۳)

بہر حال اصل واقعہ عنقریب ذکر کیا جائے گا، لیکن صحابہ کرام کا یہ قول کہ سورہ آل عمران کی ابتدائی آیات اسی واقعہ کی بابت نازل ہوئیں، ان کا اجتہادی نقطہ نظر ہے، البتہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس سوہ مبارکہ میں جو سیاق الکلام اختیار کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا نزول ایک ہی بار ہوا ہے،

## خوش بخت اور بد بخت

حضرت پیغمبر اسلام سے مروی ہے آپ نے ارشاد فرمایا:

”الشقی شقی فی بطن امه و السعید سعید فی بطن امه“

شقی و بد بخت انسان، اپنی ماں کے شکم ہی میں شقی ہوتا ہے اور سعادت مند و خوش بخت آدمی، اپنی ماں کے شکم ہی میں سعادت و خوش بختی کا حامل ہوتا ہے (نسخ الفصاحۃ، صفحہ ۷۵)

## تخلیق کے مراحل

کافی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے آپ نے فرمایا:

”ان الله اذا اراد ان يخلق النطفة التي هي مما اخذ عليه الميثاق من صلب آدم او ما يبدو له فيه و يجعلها في الرحم حرك الرجل للجماع و اوحى الى الرحم ان الفتحي بابك حتى يلج فيك خلقي و قضائي النافذ و قدرى، و تفتح بابها، فتصل النطفة الى الرحم، فتد في اربعين يوماً، ثم تصير

علقہ اربعین يوماً، ثم تصیر مضغاً اربعین يوماً، ثم تصیر لحمًا تجرى فيه عروق مشبكة، ثم يبعث الله ملكين خلاقين يخلقان في الارحام ما يشاء الله، يقتحمان في بطن المرأة من فم المرأة، فيصلان الى الرحم وفيها الروح القديمة المنقولة في اصلاب الرجال و ارحام النساء فينفخان فيها روح الحياة و البقاء و يشقان له السمع و البصر و الجوارح و جميع ما في البطن باذن الله تعالى ثم يوحى الله الى الملكين : اكتبنا عليه قضائى و قدرى و نافذ امرى و اشترط لى البداء فيما تكتبان، فيقولان: يا رب ما نكتب؟ فيوحى الله عز و جل اليهما ان ارفعا رؤسكما الى راس امه، فيرفعا رؤسهما فاذا اللوح يقرع جبهة امه، فينظران فيه، فيجدان فى اللوح صورته و زينته و اجله و ميثاقه سعيداً او شقيماً و جميعاً شانه، فيملى احدهما على صاحبه فيكتبان جميع ما فى اللوح و يشترطان البداء فيما يكتبان، ثم يختمان الكتاب و يجعلانه بين عينيه، ثم يقيمانه قائماً فى بطن امه قال: فربما عتا فانقلب، و لا يكون ذلك الا فى كل عات او مارد، و اذا بلغ او ان خروج الولد تاماً او غير تام اوحى الله الى الرحم: ان افتحى بابك حتى يخرج خلقى الى ارضى و ينفذ فيه امرى فقد بلغ او ان خروجه، قال: فتفتح الرحم باب الولد فينقلب فتصير رجلاه فوق رأسه و رأسه فى اسفل البطن ليسهل الله على المرأة و على الولد الخروج، وبعث الله عز و جل اليه ملكاً يقال له زاجر، فيزجره زجرة فيفزع منها الولد فاذا احتبس زجره الملك زجرة اخرى فيفزع منها، فيسقط الولد الى الارض باكياً فرعاً من الزجرة“

(جب خداوند عالم چاہتا ہے کہ اس نطفہ کو خلق کرے کہ جس سے صلب آدم میں میثاق لے لیا گیا یا جو کچھ روز ازل سے اس کے لئے مقرر کیا گیا ہے اسے ظہور بخشنے اور نطفہ کو رحم میں قرار بخشنے تو مرد کو مقاربت کی ترغیب دلاتا ہے اور عورت کے رحم کو حکم دیتا ہے کہ انعقاد نطفہ کے مراحل طے کرنے کے لئے آمادہ ہوتا کہ میرا فیصلہ نافذ العمل ہو اور تخلیق کی بابت میں نے جو کچھ طے کیا ہے اسے جامہ عمل مل جائے، چنانچہ رحم اپنا منہ کھول دیتا ہے اور نطفہ آسانی سے رحم کے اندر چلا جاتا ہے اور چالیس دن تک اس میں گھومتا رہتا ہے یہاں تک کہ ”علقہ“ بن جاتا ہے، چالیس دنوں تک اسی حالت میں رہتا ہے اور پھر ”مضغہ“ بن جاتا ہے، چالیس روز تک ”مضغہ“ کی حالت میں رہتا ہے اور پھر گوشت بن جاتا ہے کہ جس میں رگوں کا ایک جال بنتا چلا جاتا ہے، اس کے بعد خداوند عالم تخلیق پر مامور دو فرشتوں کو بھیجتا ہے جو خداوند عالم کی مشیت کے مطابق، رحموں میں تخلیق کے امور انجام دیتے ہیں، وہ عورت کے منہ کے ذریعے اس کے شکم میں داخل ہوتے ہیں اور رحم تک پہنچ جاتے ہیں کہ جس میں وہ قدیم روح موجود ہوتی ہے جو مردوں کی پشتوں اور عورتوں کے رحموں سے منتقل ہو کر وہاں موجود ہوتی ہے، پھر وہ اس میں زندگی و بقا کی روح پھونکتے ہیں اور خدا کے حکم کے مطابق اس کے لئے کان، آنکھیں، اعضاء و جوارح اور بدن کی تمام چیزیں

بناتے ہیں، اس وقت خداوند عالم ان فرشتوں کو وحی کرتا ہے اور انہیں حکم دیتا ہے کہ اس بچے کی تقدیر کو جو میں نے معین کی ہے اسے لکھیں اور اس کے بارے میں میری قضاء و قدر اور ہر فیصلہ کو تحریر کریں اور اپنی تحریر میں میرے لئے بداء کا حق محفوظ کریں، وہ فرشتے خداوند عالم سے پوچھتے ہیں کہ پروردگارا! ہم کیا لکھیں؟ تو خداوند عالم انہیں وحی فرماتا ہے اور انہیں حکم دیتا ہے کہ سر اٹھا کر اس کی ماں کے سر پر نگاہ کرو، وہ سر اٹھا کر دیکھتے ہیں کہ اس کی ماں کے سر پر ایک لوح..... حنقی..... لکھی ہوئی ہے، اسے غور سے دیکھتے ہیں تو اس میں اس کی شکل و صورت، حسن و جمال، زیب و زینت، میثاق..... وعدہ فطرت.....، اس کا خوش بخت یا بد بخت ہونا اور اس سے تعلق رکھنے والے تمام امور درج ہوتے ہیں، ان میں سے ایک اس لوح کو پڑھتا ہے اور دوسرا اسے لکھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ لوح میں مذکور تمام امور کو لکھ لیتے ہیں اور اپنی تحریر میں بداء کے خدائی حق کی لزومی شرط بھی ذکر کرتے ہیں (کہ جس کی بناء پر خداوند عالم ان کے مقدر میں جو تبدیلی چاہے لاسکتا ہے)، پھر اسے تمام کر کے اس پر مہر لگا دیتے ہیں اور اسے بچے کی دو آنکھوں کے درمیان رکھ دیتے ہیں، اس کے بعد اسے ماں کے شکم میں کھڑا کر دیتے ہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ لڑکھڑا کر منقلب ہو جاتا ہے البتہ یہ صورت جھگڑا لویا سرکش افراد میں پیدا ہوتی ہے، پھر جب بچے کی ولادت کا وقت قریب ہوتا ہے خواہ صحیح و کامل پیدا ہو یا ناقص الخلقیت پیدا ہو، تو خداوند عالم رحم کو وحی کرتا ہے کہ اب اپنا منہ کھول دے گا کہ یہ میری مخلوق میری زمین پر آ جائے اور اس کے بارے میں میرے تمام فیصلے پورے ہوں..... اس کی تقدیر کو عملی جامہ مل سکے.....، کیونکہ اب وقت آ پہنچا ہے کہ وہ شکم سے باہر آ جائے، خدا کے حکم پر رحم اپنا منہ کھول دیتا ہے اور بچہ الٹا ہو کر اپنا سر نیچا اور پاؤں اوپر کر لیتا ہے اور اپنا سر ماں کے شکم کے نچلے حصے کی طرف کرتا ہے تاکہ خداوند عالم زچہ و بچہ دونوں کے لئے ولادت کا مرحلہ آسان کر دے، پھر خداوند عالم ایک فرشتہ بھیجتا ہے جس کا نام ”زاجر“ ہے، وہ بچہ کو جھنجھوڑتا ہے جس سے وہ فزع و بے چینی میں مبتلا ہو جاتا ہے، اگر اس کے باوجود وہ رکاوٹ ہے تو وہ فرشتہ دوبارہ اسے جھنجھوڑتا ہے تاکہ وہ فزع واضطراب کے ساتھ ماں کے شکم سے باہر آ جائے، چنانچہ بچہ ماں کے شکم سے زمین پر گر پڑتا ہے اور اسی فزع واضطراب کے باعث گریہ کرنے لگتا ہے) (فروع کافی، جلد ۶، ص ۱۳)

### روایت کی تشریح و توضیح

امام کے ارشاد گرامی: ”جب خدا چاہتا ہے کہ نطفہ کو خلق کرے“ سے مراد یہ ہے کہ جب خداوند عالم نطفہ کو مکمل اور کامل الخلقیت بشر بنانا چاہتا ہے اور اس جملہ کے ساتھ آپ کا یہ ارشاد کہ ”وہ نطفہ کہ جس سے آدم کی صلب میں جہد و پیمان

لے لیا تھا“ تو اس سے ایک اہم مطلب کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ جس کا تفصیلی بیان عنقریب آئے گا اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں آنے سے پہلے ایک عالم میں وجود رکھتا تھا اور وہاں جن حالات و کیفیات کا حامل تھا وہ اس دنیا میں بھی اس کے ساتھ پائی جاتی ہیں کہ اس عالم کو روایات و احادیث میں ”عالم ذر“ اور ”عالم میثاق“ سے تعبیر کیا گیا ہے، تو اس سے اس عالم میں جو عہد و پیمان لیا گیا ہے وہ اس دنیا میں عملی صورت میں آنا چاہیے اور اس کی تخلیق کے مراحل اسی عہد و پیمان کے عین مطابق طے ہونے چاہئیں اور ان میں ہرگز کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے، اسی کو ”حتمی فیصلہ“ اور ”القضاء المحتوم“ کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے امام علیہ السلام نے ابتدائے کلام ہی میں ان افراد کے جن سے عالم ذر میں میثاق لے لیا گیا اور ان افراد کے جن کی تخلیق کے مراحل میں بداء حاصل ہوا، کے درمیان فرق کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ”یا جو کچھ روز اول سے اس کے لئے مقرر کیا گیا“، اس جملہ سے مراد یہ ہے کہ اس کی تخلیق کے مراحل میں بداء حاصل ہوا اور اس سے میثاق نہیں لیا گیا لہذا وہ کامل الخلق نہیں ہوتا بلکہ سقط ہو جاتا ہے بنا برائیں پہلی قسم کے افراد کہ جن سے عہد و پیمان لے لیا گیا ان کی بابت بداء نہیں۔ بلکہ وہ کامل الخلق، دنیا میں آتے ہیں۔ لہذا امام کے اس فرمان کہ ”نطفہ کو رحم میں قرار دیجئے“ کی بازگشت پہلے جملہ ”جب چاہتا ہے کہ نطفہ کو خلق کرے“ کی طرف ہے۔

اور روایت کے یہ الفاظ کہ وہ دو فرشتے عورت کے منہ کے ذریعے اس کے پیٹ میں داخل ہوتے ہیں تو ممکن ہے یہ جملہ امام علیہ السلام کا نہ ہو بلکہ راوی کے الفاظ ہوں چنانچہ اس کی تائید عبارت میں لفظ عورت کے دو بار ذکر کئے جانے سے ہوتی ہے جبکہ ایک بار کہہ کر دوسری مرتبہ اس کی بجائے ضمیر ذکر کی جاتی تو جملہ زیادہ ادبی ہوتا (عبارت اس طرح ہے ”یفتحمان فی بطن المواء من فم المواء“ جبکہ دوسری مرتبہ المراء کی بجائے ضمیر ہا کہنا کافی تھا یعنی یوں کہا جاسکتا تھا ”من فمھا“ لیکن ضمیر کی بجائے اسم ظاہر ذکر کیا گیا جس سے یہ امکان دکھائی دیتا ہے کہ شاید یہ الفاظ امام کے نہ ہوں بلکہ راوی نے خود کہا ہو)۔ البتہ ظاہر الحال پر بناء رکھتے ہوئے اگر اسے امام علیہ السلام کا کلام قرار دیا جائے تو اس سے یہ ثابت ہوگا کہ فرشتوں کا عورت کے شکم میں داخل ہونا جسم کے جسم میں داخل ہونے کے باب سے نہیں کیونکہ شرمگاہ کے علاوہ رحم میں داخل ہونے کے لئے رگوں کے سوا کوئی اور راستہ ہی نہیں اور ان رگوں میں سے ایک وہ رگ ہے جو خون جنین کے رحم تک پہنچنے کا ذریعہ بنتی ہے تاہم رحم میں داخل ہونے کا یہ راستہ شرمگاہ سے رحم میں داخل ہونے سے زیادہ آسان نہیں۔ بنا برائیں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ منہ کے ذریعے داخل ہونے میں وسعت و کشادگی کے علاوہ حکمت ملحوظ ہے جو کہ محتاج بیان نہیں۔

اور امام علیہ السلام کا یہ ارشاد گرامی کہ ”اس میں مردوں کی صلبوں اور عورتوں کے رحموں سے منتقل ہونے والی قدیم روح ہوتی ہے“ گویا اس نباتی روح کی طرف اشارہ ہے جو جسم کے تغذیاتی نظام اور نشوونما کا سرچشمہ ہے۔

اور امام علیہ السلام کے ارشاد گرامی: ”فینفخان فیہا روح الحیاء و البقاء“ (پھر وہ اس میں زندگی اور بقاء کی

روح پھونکتے ہیں) میں بظاہر لفظ ” فیہا “ کی ضمیر ” ہا “ کی بازگشت ” الروح القدیمہ “ کی طرف ہے، بنا برائے حیات و بقاء کی روح، نباتی روح میں پھونکی جاتی ہے، اور اگر بالفرض اس ضمیر کی بازگشت جملہ ” ثم نصیر مضغۃ “ میں، مذکور لفظ ” مضغۃ “ کی طرف ہو تو عبارت کا معنی یہ ہوگا کہ زندگی و بقاء کی روح، نباتی روح کے ذریعے زندگی پانے والے مضغۃ (توتھڑا) میں پھونکی جاتی ہے، تو نتیجہ یہ ہوا کہ مضغۃ نباتیہ میں حیات و بقاء کی روح پھونکی جاتی ہے۔

بہر حال امام علیہ السلام کے ارشاد گرامی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انسانی روح کا پھونکا جانا دراصل نباتی روح کے لئے ایک طرح کی ترقی و کمال پانے سے عبارت ہے کہ جس کا حصول اس کے قوت و استحکام سے بہرہ ور ہونے کی بنا پر ممکن ہوتا ہے (البتہ یہ بات، حرکت جوہریہ کے نظریہ پر مبنی ہے)۔

اس بیان سے روح قدیمہ کے، مردوں کے صلہوں اور عورتوں کے رحموں میں منتقل ہونے کا معنی بھی واضح ہو جاتا ہے اور یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ روح ایک حوالہ سے بدن یعنی نطفہ کے ساتھ وجودی طور پر یکساں ہے البتہ اس ترتیب کے ساتھ کہ خون حیض تدریجی طور پر نطفہ کا جزء بنتا ہے اور پھر نطفہ اور ماں باپ دونوں کے جسموں کے درمیان وجودی طور پر ایک دوسرے سے یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے اور پھر یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، بنا برائے جو کچھ انسان کی زندگی میں پیش آتا ہے وہ کسی حد تک اس کے ماں باپ کے وجود میں متعین ہو چکا ہوتا ہے اور ان کی شخصیت کی صورت گری کے جلوے دکھائی دیتے ہیں گویا وہ ایک طرح سے اس کی کتاب زندگی کی فہرست ہے کہ جو اس کے والدین کی کتاب زندگی میں لکھی جا چکی ہے

مذکورہ بالا بیان سے امام علیہ السلام کے اس ارشاد گرامی کا معنی بھی روشن ہو جاتا ہے کہ ” اللہ تعالیٰ فرشتوں کو وحی کرتا ہے کہ اپنے سروں کو اٹھاؤ اور اس کی ماں کے سر کی طرف دیکھو “۔ اس بیان میں امام نے فرمایا کہ خدا فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ اس کی ماں کے سر کو دیکھو، یہاں ماں کے ساتھ باپ کا ذکر نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ باپ سے تعلق رکھنے والے تضاء و قدر کے تمام مراحل انعقاد نطفہ کے بعد مکمل ہو جاتے ہیں اور پھر سلسلہ تقدیر باپ سے منقطع ہو جاتا ہے اور صرف ماں تک محدود ہو جاتا ہے یعنی جو کچھ بچے کی بابت خدائی فیصلے ہوتے ہیں ان کا ربط صرف ماں سے برقرار ہوتا ہے لہذا اب ماں ہی بچے کی تقدیر کی امانت دار ہوتی ہے اسی وجہ سے امام نے ارشاد فرمایا کہ ” جب وہ فرشتے اس کی ماں کے سر کی طرف نگاہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ایک تختی اس کی پیشانی پر آویزاں ہے “۔

یہاں پیشانی کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ وہ انسان کے حواس و احساسات اور اس کی شخصیت کی مظہر و آئینہ دار ہوتی ہے اور اسی پر انسان کی باطنی کیفیات جلوہ گر ہوتی ہیں، بہر حال فرشتے اس کی پیشانی پر نظر کرتے ہیں تو اس میں بچے کی شکل و صورت، حسن و جمال، مدت حیات، فطری میثاق کی بنیاد پر سعادت و شقاوت کا خاکہ و خدو خال اور اس سے تعلق رکھنے والے تمام امور اس میں لکھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک فرشتہ اسے پڑھتا ہے اور دوسرا اسے لکھتا چلا جاتا ہے

(بچے کی تقدیر اس کی پیشانی پر رقم ہو جاتی ہے) اس طرح ان فرشتوں کی حیثیت فاعل (انجام دینے والے) اور قائل (قبول کرنے والے) جیسی ہو جاتی ہے، وہ ماں کی پیشانی پر آدیزاں لوح تقدیر میں مرقوم تمام امور کو بچے کی پیشانی پر لکھ دیتے ہیں۔

اور امام کا یہ ارشاد گرامی کہ وہ فرشتے تقدیر کے ہر فیصلے کے ساتھ بداء کی شرط بھی لکھ دیتے ہیں (بداء سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ حق حاصل ہے کہ انسان کی مصلحت کے پیش نظر اس کی تقدیر کا رخ بدل دے اور اس میں اپنی مشیت کے مطابق فیصلہ کرے) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بچہ شکم مادر میں، مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات کے تمام علل و اسباب کا حامل نہیں ہوتا کیونکہ جسمانی قوتیں مستقبل میں پیش آنے والے حالات و واقعات اور انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والے تمام امور کے وجود پذیر ہونے کا سرچشمہ ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود ان کو تمام امور کا واحد سرچشمہ ہونے کی حیثیت حاصل نہیں بلکہ ان کے علاوہ دیگر عوامل و اسباب اور جسمانی قوتوں سے باہر کی دنیا کے امور بھی ذخیل ہوتے ہیں اسی وجہ سے غیر یقینی و غیر حتمی امور ہمیشہ بداء کی زد میں رہتے ہیں اور ان کی بابت خداوند عالم اپنی مشیت اور انسان کی بہتری و بھلائی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے، اسی کو بداء کہتے ہیں۔۔۔۔۔

اس مقام پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ مذکورہ بالا روایت میں بچے کی ولادت کے تمام مراحل کے طے ہونے میں جن امور کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف دی گئی ہے یعنی مرد میں جنسی عمل کا میلان پیدا کرنا اور اس کی براہیختی، عورت کے رحم کو انعقاد و نطفہ کی آمادگی کی وحی کرنا، خلق و عطاءے وجود..... جسمانی صورت گیری..... کے امور انجام دینے والے دو فرشتوں کو بھیجنا اور ایک بیرونی حفاظت پر مامور فرشتہ بھیجنا وغیرہ تو اس سے ان امور کی اپنے طبعی اسباب کی طرف نسبت کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ یہ دو عوامل ایک دوسرے کے مد مقابل نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مربوط و مرتبط تسلسلی رشتہ رکھتے ہیں کہ جسے علمی اصطلاح میں ”طولی سلسلہ“ کہا جاتا ہے جبکہ ایک دوسرے کے مد مقابل قرار پانے کو ”عرضی سلسلہ“ کہتے ہیں۔ بنا بریں ایسا نہیں کہ ان میں سے ایک، دوسرے کی نفی کرے، یا وہ ایک دوسرے سے اس قدر متضاد ہوں کہ دونوں ہی ختم ہو جائیں اور یا پھر نوبت یہاں تک پہنچ جائے کہ دونوں سیبوں کے مجموعہ مرکب سے بچے کے تولد کی علت تامہ کو وجود ملے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ہر سبب اپنی اپنی حیثیت میں ”علت تامہ“ ہے نہ کوئی ایک، دوسرے کی نفی کرتا ہے اور نہ ان میں کسی حوالہ سے تضاد پیدا ہوتا ہے بلکہ ہر سبب اپنے طور پر اثر آفرینی کا مظاہرہ کرتا ہے۔۔۔۔۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن ہستیوں کو لوگوں کی روحانی سعادت اور انہیں رضائے الہی کے حصول کی راہ دکھانے کی ذمہ داری سونپی..... یعنی انبیاء علیہم السلام..... تو چونکہ یہ کام نہایت روحانی اور باطنی پاکیزگی پر مبنی ہے لہذا خدائی نمائندوں کا فریضہ ہے کہ وہ لوگوں سے اس انداز میں گفتگو کریں کہ جس سے ان کو روحانیت کی راہ



مل جائے اور اپنے تمام بیانات میں لوگوں کو ان کے پروردگار کی یاد دلاتے رہیں، اور وہ اس طرح کہ انہیں باور کرائیں کہ فرشتوں کو عنایات خداوندی کی فیض رسانی میں وساطت کی ذمہ داری حاصل ہے اور نو پیدا امور کی عملی نسبت انہی کی طرف ہے، البتہ لوگوں کی سعادت مندگی کو ملائکہ کی روحانی تائید و مدد سے نسبت ہے جبکہ ان کی شقاوت و بد بختی اپنی تمام تر مکروہ صورتوں کے ساتھ شیاطین کی وسوسہ انگیزی کا نتیجہ ہے لہذا شقاوت کی ہر صورت کو شیطانوں سے نسبت ہے، اس کے باوجود عالم ہستی کے ذرہ ذرہ کو اپنے وجودی تشخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے نسبت ہے اور وجود پذیر ہونے والا ہر امر اسی سے منسوب ہے البتہ اس معنی میں جو اس کی ذات اقدس کے شایان شان اور اس ایک مقام ربوبیت کو زیبا ہے۔

انبیاء کا یہ انداز اس لئے ضروری ہے تاکہ لوگوں کو ہدایت و گمراہی اور نفع و نقصان کی تمام صورتوں سے آگاہی حاصل ہو اور خلاصہ یہ کہ انہیں آخرت کی زندگی کے بارے میں تمام پہلوؤں کا علم ہو جائے اور وہ جان لیں کہ اس دنیاوی زندگی میں ہدایت کی راہ اختیار کرنا آخرت میں کس قدر مفید ہوگا اور گمراہی کا نتیجہ کس قدر سنگین و تباہ کن ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ان طبعی اسباب کو ہرگز نظر انداز نہ کریں جو عالم ہستی میں کسی شے کے وجود پذیر ہونے کو یقینی بناتے ہیں بلکہ ان اسباب و علل اور وجودی عوامل کو عملی احترام دیں کیونکہ وہ حیات انسانی کے دو بنیادی ارکان میں سے ایک ہے اور وہ پختہ بنیاد ہے جس پر دنیاوی زندگی کے تمام امور قائم و استوار ہیں لہذا ضروری ہے کہ انسان ان سے پوری طرح باخبر ہو جس طرح اس پر یہ لازم ہے کہ روحانی و باطنی علل و اسباب سے آگاہی حاصل کرے تاکہ پوری طرح اپنے آپ کو پہچان لے اور پھر اپنے رب کو پہچان سکے۔ کیونکہ جو شخص اپنے آپ کو پہچان لے وہ یقیناً اپنے پروردگار کو پہچان لیتا ہے، گویا ذات رب العزت کی معرفت کا حصول اپنی ذات کی معرفت پر موقوف اور اس کے ذریعے ممکن ہوتا ہے۔

## آیات ۷۳ تا ۹۳

○ هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ ۚ  
فَأَمَّا الَّذِينَ بَيْنَ يَدَيْهِمْ فَزَيِّغْ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ ۗ وَمَا  
يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَالرُّسُخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۗ وَمَا  
يَذَكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ⑤

○ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً ۗ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ⑥

○ رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْعِثَادَ ⑦

## ترجمہ

” وہی ہے کہ جس نے آپ پر کتاب نازل کی کہ جس میں سے بعض محکم آیات ہیں جو کہ اصل کتاب ہیں اور دوسری متشابہ آیات ہیں، پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ اس کی متشابہ آیات ہی کی پیروی کرتے ہیں تا کہ فتنہ پیا کریں اور ان کی اپنی من پسند تاویلیں کریں جبکہ ان کے اصل معانی کو کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے اور ان کے جو راہنمون فی العلم ہیں کہ جو کہتے ہیں کہ ہم اس کتاب پر ایمان لائے ہیں یہ ساری کی ساری ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور عقل والوں کے علاوہ کوئی نصیحت نہیں پاسکتا“۔ ①

” اے ہمارے پروردگار! ہمیں ہدایت کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے بعد ہمارے دلوں میں کجی پیدا نہ ہونے دے اور ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطا فرما کہ یقیناً تو ہی عطا کرنے والا ہے“۔ ②

” اے ہمارے پروردگار! یقیناً تو ہی لوگوں کو اس دن اکٹھا کرنے والا ہے کہ جس میں کوئی شک نہیں۔ یقیناً اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا“۔ ③

## تفسیر و بیان

### قرآن کا دفعتاً نزول

○ ”هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ“  
(وہی ہے جس نے آپ پر کتاب نازل کی)

اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن مجید نازل کرنے کو ”تنزیل“ کے بجائے ”انزال“ سے تعبیر فرمایا ہے (نزل) کے بجائے (انزل) کہا۔ یاد رہے کہ انزال دفعتاً نیچے اتارنے کے معنی میں جبکہ تنزیل تدریجی طور پر نیچے اتارنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ یہاں نازل ہونے والی پوری کتاب کی بعض صفات و خصوصیات کا ذکر مقصود ہے اور وہ یہ کہ یہ کتاب محکم اور متشابہ آیات پر مشتمل ہے اور متشابہ آیات کی بازگشت محکم آیات کی طرف ہوتی ہے اور ان (محکمات) کے ذریعے متشابہات کے معانی سمجھے جاتے ہیں، اس بناء پر نازل کی جانے والی کتاب کو ایک چیز (مجموعہ) تصور کیا گیا ہے اور اس کی آیات کے تعدد و کثرت کو ملحوظ قرار نہیں دیا گیا لہذا یہاں تنزیل کے بجائے انزال مناسب ہے۔

### محکم و متشابہ آیات

○ ”مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ“  
(اس میں سے کچھ آیات محکم ہیں جو کہ اصل کتاب ہیں اور دیگر متشابہ ہیں)

”محکمات“ کا لفظی اشتقاق مادہ ”حکم“ سے ہے اور اس کا معنی کسی چیز کا اس حال و کیفیت میں ہونا ہے

کہ کوئی چیز اسے کلی یا جزئی طور پر خراب یا غیر موثر نہ کر سکے (اس کی عملداری میں مانع نہ ہو)۔ اردو زبان میں اس کا ترجمہ مضبوطی یا مضبوط ہونا ہے۔ اسی سے احکام (الف کے نیچے زیر کے ساتھ، باب افعال) اور تحکیم (باب تفعیل) بنایا جاتا ہے کہ جن کا معنی کس چیز کو محکم و مضبوط کرنا ہے، اور حکم بمعنی قضاوت و فیصلہ کرنا، حکمت بمعنی کامل معرفت و پختہ اور مفید علم و یقین اور حکمت (ح پر زیر کے ساتھ) بمعنی گھوڑے کو لگام لگانا، ان سب میں مضبوطی اور مخالف و دشمن کو اپنے قریب نہ آنے دینا کے معانی پائے جاتے ہیں اور بعض دانشوروں کا کہنا ہے کہ اس لفظ کے مادہ اشتقاق میں دونوں معنی باہم پائے جاتے ہیں ”المنع“ (مخالف و دشمن سے اپنی حفاظت) اور ”الاصلاح“ (اصلاح و درستگی)، ... المنع مع الاصلاح،

یہاں آیات کے محکم کئے جانے سے مراد ان کا صریح و واضح قرار دیا جانا ہے یعنی ان میں آیات تشابہات کی طرح عدم وضوح نہیں پایا جاتا بلکہ پڑھنے والا فوراً ان کے معانی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، (تشابہات کا معنی یہ نہیں کہ مہمل ہیں، اجمال اور اہمال میں بہت فرق ہے اور کلام الہی میں کوئی آیت ہرگز مہمل نہیں) اگرچہ خداوند عالم نے اپنی مقدس کتاب کے محکم ہونے کے بارے میں واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے کہ اس کی آیات محکم ہیں، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورہ ۶، آیت ۱:

○ ”كِتَابٌ أَحْكَمْتُ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلْتُ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ“

(کتاب (قرآن) کی تمام آیات کو محکم کیا گیا پھر ان کی تفصیل و وضاحت کی گئی، یہ سب کچھ دانا و آگاہ کی طرف سے ہے)

لیکن اس میں آیات کے محکم کئے جانے کے بعد مفصل کئے جانے کے بیان (احکمت ثم فصلت) سے ثابت ہوتا ہے کہ محکم کیا جانا نزول سے قبل کتاب کی ایک صفت کا بیان ہے اور وہ یہ کہ قرآن مجید نزول سے قبل ایک ”اکائی“ (غیر منقسم) تھا اور آیات کی کثرت و تعداد سے متصف نہیں تھا اور یہی، حصہ حصہ ہونے سے قبل اس کا متقن و محکم ہونا ہے۔ بنا برائیں ”محکم“ ہونا دراصل پوری کتاب کی مجموعی صفت ہے جبکہ محکم و متقن ہونے کی جو صفت اس کی بعض آیات کے لئے ذکر کی گئی ہے وہ ان دوسری بعض آیات کے مقابلے میں ہے کہ جن میں یہ صفت نہیں پائی جاتی اور ان دونوں کی وجہ امتیاز بھی یہی ہے کہ جو آیات محکم و متقن ہیں ان کے معنی و مراد کی بابت کوئی ابہام و عدم وضوح نہیں پایا جاتا بلکہ وہ کسی طرح کے تشابہ کو اپنے قریب بھی نہیں آنے دیتیں۔

مذکورہ بالا مطالب کو بالفاظ دیگر یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ آیت مبارکہ ”مِنَّهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ

الکِتَابِ وَآخِرُ مُتَشَابِهَاتٍ“ میں چونکہ قرآن مجید کی آیات کی دو قسموں یعنی محکم اور متشابہ میں تقسیم کا ذکر ہوا ہے لہذا اس سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ یہاں آیات کے محکم ہونے سے سورۃ ہود میں مذکور تمام قرآنی آیات کے مجموعی طور پر محکم ہونے والا معنی مراد نہیں کہ جس میں یوں ارشاد ہوا: ”کِتَابٌ أَحْكَمْتُ آيَاتُهُ.....“ کتاب (قرآن) کی آیات کو محکم کیا گیا، اسی طرح سورۃ زمر کی آیت ۲۳ میں کتاب (قرآن) کے متشابہ ہونے کا جو معنی لٹوٹ و مراد ہے وہ بھی ”وَآخِرُ مُتَشَابِهَاتٍ“ میں لٹوٹ و معنی سے مختلف ہے، سورۃ زمر میں یوں ارشاد ہوا: ”كِتَابٌ مُتَشَابِهٌ مَثَانِي“ (کتاب قرآن متشابہ اور دہرائی جانے والی ہے)۔ بنا بریں زیر نظر آیت مبارکہ میں آیات کے محکم اور متشابہ ہونے کے جو معانی لٹوٹ و مراد ہیں وہ سورۃ ہود اور سورۃ زمر میں مذکور محکم اور متشابہ ہونے کے معانی سے مختلف ہیں اور وہ اس طرح کہ ان دو سورتوں میں آیات کے محکم اور متشابہ ہونے کا تذکرہ تمام قرآنی آیات کے مجموعہ مرکب کے بارے میں جبکہ زیر نظر آیت مبارکہ میں بعض آیات کے محکم اور دوسری بعض کے متشابہ ہونے کا تقابلی تذکرہ ہوا ہے،

زیر نظر آیت مبارکہ میں آیات محکمات کو ”أُمُّ الْكِتَابِ“ کی صفت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے: ”وَمِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ“، تو ضروری ہے کہ لفظ ”ام“ کی وضاحت کی جائے۔

لفظ ”أُمُّ“ کا اصل معنی کسی چیز کی اصل و اساس اور بنیاد ہے، یعنی جس چیز کی طرف کسی کی بازگشت ہو اسے کہتے ہیں، یہاں آیات محکمات کو ”أُمُّ الْكِتَابِ“ (کتاب کی اصل بنیاد) سے موسوم و متصف کرنے سے اس حقیقت کا اظہار اور آیت مبارکہ (مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَآخِرُ مُتَشَابِهَاتٍ) کا معنی یوں ہوگا کہ قرآن کی بعض آیات، تشابہات ہیں کہ جن کی بازگشت دوسری بعض آیات کی طرف ہوتی ہے جو کہ محکمات ہیں: (تشابہات کی بازگشت محکمات کی طرف!)، اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ”أُمُّ الْكِتَابِ“ میں ”أُمُّ“ کی ”الْكِتَابِ“ کی طرف اضافت، ”ام الاطفال“ (بچوں کی ماں) میں لٹوٹ و مقصود، اضافت کی طرح نہیں کہ جسے ”اضافت لامیہ“ کہتے ہیں بلکہ حرف ”من“ (سے) کے معنی میں ہے جس طرح ہم کہتے ہیں: ”نساء القوم“ (قوم کی عورتیں)، ”قدماء الفقهاء“ (فقہاء میں سے قدیم)، اور اس طرح کے دیگر اضافتی جملوں کی طرح ہے کہ جن میں ”سے“ اور ”میں سے“ کا معنی پایا جاتا ہے۔

بنا بریں کتاب قرآن..... ایسی آیات پر مشتمل ہے جو دوسری آیات کے لئے ”ام“ کی حیثیت رکھتی ہیں، یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آیت مبارکہ میں لفظ ”أُمُّ“ کو مفرد ذکر کیا گیا ہے جبکہ ”آیات“ جو کہ جمع کا صیغہ ہے اس کی مناسبت سے ”امہات“ ہونا چاہیے تھا ”امہات الکتاب“ تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آیات محکمات“ ایک دوسری سے مختلف نہیں بلکہ سب یکساں حقیقت کا حامل مجموعہ مرکب ہے لہذا جمع کے صیغہ ”امہات“ کی بجائے

”ام“ کہا گیا۔

## ایک لطیف نکتہ

یہاں ایک نہایت لطیف نکتہ قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ آیہ مبارکہ میں ”مُحْكَمَاتٌ“ اور ”مُتَشَابِهَاتٌ“ کا تقابلی تذکرہ ہوا ہے چنانچہ ارشاد ہوا: ”مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ“ تشابہ کا معنی چند مختلف اشیاء کا بعض اوصاف و کیفیات میں ایک دوسرے سے مطابقت و مماثلت کا حامل ہونا ہے،..... یعنی جب دو یا دو سے زیادہ چیزیں اپنے بعض اوصاف میں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہوں (مشابہت رکھتی ہوں) تو انہیں متشابہ اشیاء کہا جاتا ہے..... چنانچہ خداوند عالم نے پورے قرآن مجید کی توصیف اس صفت کے ساتھ کی ہے، ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورۃ زمر، آیت ۲۳:

○ ” كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِي تَنْفَعُ مَنَّهُ جُلُودَ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ“

(کتاب (قرآن) متشابہ و دہرائی گئی ہے..... اس کی قرأت و سماعت سے ان لوگوں پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے جو اپنے پروردگار... کے کلام و مقام کی بیعت... سے خوفزدہ رہتے ہیں)

اس سے لامحالہ یہ مراد ہوگا کہ کتاب خدا کی آیات، حسن ترتیب و ترکیب، کمال اسلوب و جمال بیان، اظہار حقائق و ذکر نصائح اور صریح و آشکار حق کی طرف ہدایت و رہنمائی کے حوالہ سے ہم رنگ ہیں چنانچہ آیہ مبارکہ میں مذکور قیود و صفاتی شرائط سے اس ہم رنگی کا ثبوت ملتا ہے، تو یہ تشابہ (ایک دوسرے سے مشابہت کا حامل ہونا) پوری کتاب کی جامع صفت ہے، اور زیر نظر آیہ مبارکہ میں جس تشابہ کا ذکر ہوا ہے یعنی کہا گیا ہے ”وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ“ (اور دیگر متشابہات ہیں) تو چونکہ ان آیات کو آیات محکمات سے تقابلی صورت میں ذکر کیا گیا ہے اور ان کی پیروی کو کج فکر و بیمار دل کی فتنہ انگیزی و غلط تاویل کی کوشش قرار دیا گیا ہے لہذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس (تشابہ) کا معنی یہ ہے کہ ان کے سننے والے کو فوری طور پر ان کے معانی و مراد کا تعین نہیں ہوتا بلکہ وہ تردد کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کے ذہن میں کبھی کوئی معنی اور کبھی کوئی معنی آتا ہے یہاں تک کہ وہ آیات محکمات کی طرف رجوع کرتا ہے اور ان کے ذریعے ان کے معانی سے آگاہی حاصل کر لیتا ہے اور پھر ان کا مقصود و مراد اس پر آشکار و واضح ہو جاتا ہے، اس طرح وہی آیات متشابہات، آیات محکمات ہو جاتی ہیں یعنی آیات محکمات کے ذریعے اور ان کی مدد سے وہ بھی محکمات قرار پاتی ہیں جبکہ آیات محکمات اپنی اصل حقیقت میں..... کسی دوسری آیت کی مدد و ذریعہ کے بغیر..... محکمات ہیں..... ان کے معانی سے آگاہی پانے والے کو کسی دوسری آیت کی طرف رجوع کرنے اور اس سے استفادہ کر کے ان کے معانی کے تعین کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ خود اپنے معانی واضح کر دیتی ہیں، آیات متشابہات کے

آیات محکمات میں بدل جانے کی دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

سورۃ تکہ، آیت ۵:

○ "الَّذِينَ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَىٰ"

(خدا عرش پر قائم ہے)

اس آیت کے سننے والے کو عرش پر خدا کے قائم ہونے کا معنی واضح طور پر معلوم نہیں ہو سکتا لیکن جب وہ اس کی بابت سورۃ شوریٰ کی آیت ۱۱ کی طرف رجوع کرتا ہے کہ جس میں ارشاد حق تعالیٰ ہے: "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" (اس کی مانند کوئی چیز نہیں) تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ "قائم ہونے" سے اس پر کامل اختیار و اقتدار اور کائنات پر مکمل کنٹرول مراد ہے اس پر جاگزین ہونا اور جسمانی طور پر لیکن ہونا مراد نہیں کیونکہ کسی "جگہ" و "مکان" میں قرار پانا جسم رکھنے والی چیز کی صفت ہے جبکہ ایسا ہونا خداوند عالم کی ذات قدسیہ کے حوالہ سے ممکن ہی نہیں اور وہ جسم و جسمانیات اور جسمانی تقاضوں و ضرورتوں سے مافوق و ماوراء ہے۔

سورۃ قیامت، آیات ۲۲-۲۳:

○ "وَجُودًا يُؤْمِنُهَا نَاطِقًا ۖ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرًا ۖ ﴿۲۲﴾"

(اس دن کچھ چہرے مسرور و شادمان ہوں گے، اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے)

اس میں چہروں کے اپنے پروردگار کی طرف دیکھنے کا معنی غیر واضح ہے کیونکہ اس سے یہ بات ذہن میں پیدا ہو سکتی ہے کہ خدا بھی اجسام کی طرح رویت کے قابل ہے جبکہ یہ بات غلط و نادرست ہے لیکن جب اس کی بابت سورۃ انعام کی آیت ۱۰۳ کی طرف رجوع کریں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں "دیکھنے" سے حسی نظر (آنکھ) سے دیکھنا مراد نہیں، یہی صورت حال ناسخ اور منسوخ آیات کی ہے کہ جب منسوخ ہونے والی آیت کو ناسخ آیت کے تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ منسوخ ہونے والی آیت زمانی طور پر محدود تھی اور اس میں مذکور حکم، ناسخ آیت میں مذکور حکم کے نازل ہونے تک تھا لہذا ناسخ آیت کے نزول کے بعد منسوخ آیت میں مذکور حکم خود بخود عملی طور پر بے اثر ہو گیا،

تو یہ ہے "محکم" اور "متشابہ" کے معانی کا خلاصہ کہ جسے زیر نظر آیہ مبارکہ: "هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ" سے سمجھا جاسکتا ہے، یہ آیت یقینی طور پر "محکم" ہے خواہ اس کے علاوہ پورا قرآن ہی متشابہ تصور کیا جائے یعنی بفرض محال اگر یہ کہا جائے کہ پورے کا پورا قرآن آیات متشابہات پر مشتمل ہے لیکن اس آیت کے بارے میں قطعی طور پر کہنا پڑے گا کہ یہ "محکم" ہے اور اس کا محکم ہونا ہر طرح کے شک سے خالی ہے، اور اگر اس آیت کو بالفرض "متشابہ" تصور کریں تو تمام قرآنی آیات کو متشابہ قرار دینا پڑے گا اور پھر آیات



کی ”محکم“ و ”متشابہ“ دو حصوں میں وہ تقسیم درست نہ رہے گی جس کی واضح دلیل ان الفاظ میں پائی جاتی ہے: ”منہ آیات محکمات“ (قرآن کی کچھ آیات، محکم ہیں) اور ”هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ“ کے الفاظ بے اثر و بے نتیجہ ہو جائیں گے اور سورہ حم سجدہ کی آیت ۲ بے معنی اور حقیقت و صداقت کی حامل نہ ہوگی کہ جس میں ارشاد حق تعالیٰ ہے: ”كُتِبَ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۗ بِبَشِيرٍ أَوْ نَذِيرٍ“، (کتاب کہ اس کی آیات کو تفصیل کے ساتھ الگ الگ (واضح) کر دیا گیا ہے، عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کا شاہکار قرآن علم رکھنے والوں کے لئے بشارت و خوشخبری دینے والا اور عذاب سے ڈرانے والا ہے)، اسی طرح وہ استدلال و حجت قائم کرنا بھی درست نہ رہے گا جو سورہ نساء آیت ۸۲ میں مذکور ہے کہ جس میں ارشاد حق تعالیٰ ہے: ”أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ ۗ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا“ (وہ قرآن میں غور و فکر اور تدبر کیوں نہیں کرتے اور اس بات کو کیوں نہیں سمجھتے کہ اگر وہ خدا کے علاوہ کسی کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے)، اس کے علاوہ دیگر وہ آیات کہ جن میں قرآن مجید کو ”نور“ (روشنی)، ”ہدیٰ“ (ہادی و رہنما) ”بیان“ (صریح بیان)، ”بیان“ (واضح سخن)، ”مبین“ (نمایاں گفتار) اور ”ذکر“ (یاد دلانے والا) سے متصف کیا گیا ہے وہ سب بے معنی ہو جائیں،

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات نہایت واضح و روشن ہے کہ جو شخص اول سے آخر تک قرآنی آیات مبارکہ کو با نظر غائر دیکھے وہ ہرگز اس حقیقت کے بارے میں کسی شک و شبہ کا شکار نہ ہوگا کہ ان میں سے کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں جس کے مندرجات اپنے معانی سے مطابقت نہ رکھتے ہوں اور ان کے مراد ہی حقائق غیر واضح و نا آشکار ہوں (مہمل یا مبہم ہوں) بلکہ تمام آیات اپنے مراد ہی حقائق کی منہ بولتی تصویریں ہیں خواہ وہ ایک ہی حقیقت کی حامل ہوں کہ جس کی بابت کسی نکتہ سنج و دانائے رموز سخن کو کوئی شک لاحق نہیں ہوتا یا متعدد معانی رکھتی ہوں کہ ان میں سے کسی کا تعین نہ ہو سکتا ہو بلکہ ہر معنی کے مراد ہونے کا شبہ پیدا ہوتا ہو، لیکن اس کے باوجود یہ بات یقینی ہوتی ہے کہ جو معنی مقصود ہے وہ انہی مترددہ معانی میں سے ایک ہے اس سے باہر نہیں ورنہ الفاظ کی اصل دلالت ہی مخدوش و باطل ہو جائے گی اور جو ایک معنی مقصود و مراد ہے وہ لامحالہ قرآن مجید کے ان مسلمہ اصولوں سے عدم مطابقت و نا ہم آہنگ اور بے ربط نہیں کہ جو وجود صانع و آفریدگار عالم اور اس کی توحید و یکتائی، بعثت انبیاء، احکام و عملی دستورات کی تدوین و تشریح، معاد اور روز قیامت اور مرنے کے بعد ایک دن خدا کی بارگاہ میں واپسی و حاضری وغیرہ سے عبارت ہیں، بلکہ وہ معنی انہی اصولوں سے کامل مطابقت رکھتا ہے اور وہ اصول بھی اس سے اسی طرح پیوستہ بنیادوں کی حیثیت رکھتے ہیں کہ جس طرح جڑ اور شاخ یا درخت و پھل کا رابطہ ہوتا ہے اور وہ (اصول) آیت کے متعدد احتمالی معانی و مدالیل میں سے مقصود و مراد معنی کا تعین کرتے ہیں، بنا بریں قرآن مجید ایسی حقیقت واحدہ رکھتا ہے کہ اس کا بعض حصہ دوسرے حصہ کی وضاحت و تشریح کرتا ہے اور بعض حصہ اصل و بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے کہ جس کی طرف اس کے

دوسرے حصہ کی بازگشت اصل کی طرف ہوتی ہے یعنی کچھ حصہ اصل اور کچھ فرع ہے اور چونکہ فرع کی بازگشت اصل کی طرف ہوتی ہے لہذا بعض آیات دوسری بعض سے اصل و فرع کے رشتہ سے منسلک ہیں گویا ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ ہیں۔

پھر جب وہ آشنائے رموز سخن اس آئیہ مبارکہ کی طرف متوجہ و ملتفت ہوگا: ”مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ“ تو اس حقیقت کی بابت ہر طرح کا شک و شبہ اس کے دل و دماغ سے دور ہو جائے گا کہ اس میں ”محکمات“ سے وہ آیات مراد ہیں جو قرآنی مسلمہ اصولوں پر مشتمل ہیں اور ”متشابہات“ سے وہ آیات مراد ہیں کہ جن کے معانی ان مسلمہ قرآنی اصولوں کے ذریعے متعین اور واضح ہوتے ہیں۔

### ایک سوال اور اس کا جواب

اس مقام پر ممکن ہے آپ سوال کریں کہ یہ بات مسلم ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ فروع کی بازگشت، اصول کی طرف ہوتی ہے۔ ہر فرع، اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ یہ سلسلہ ہر موضوع و مسئلہ میں پایا جاتا ہے خواہ وہ قرآنی معارف ہوں یا ان کے علاوہ دیگر علوم و امور ہوں، لیکن یہ بات، فروع کے ”متشابہ“ ہونے کا باعث نہیں بن سکتی اور ”اصول“ کی طرف بازگشت کی بناء پر ان کو ”متشابہات“ قرار نہیں دیا جاسکتا، تو یہاں ایسا کیوں ہے؟ یعنی قرآن مجید میں آیات کو دو حصوں میں تقسیم کر کے بعض کو متشابہ اور بعض کو محکم سے تعبیر کیا گیا اور محکم آیات کو اصول اور متشابہ آیات کو فروع قرار دیا گیا جیسا کہ صریح الفاظ سے ثابت ہے: ”مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ“، ”وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ“، تو اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب ہم یہ دیتے ہیں کہ ایسا ہونے کی وجہ دو امور میں سے ایک ہے، اور وہ یوں کہ قرآنی معارف کی دو قسمیں ہیں:

(۱) کچھ معارف کا تعلق ماورائے طبیعت سے ہے کہ وہ حس اور مادہ کی دسترس و دائرہ سے خارج ہیں اور عام افراد کے اذہان کو ان کے معانی کے تعین میں غیر یقینی صورت حال کا سامنا ہوتا ہے اور وہ کسی معنی کا باآسانی تعین نہیں کر پاتے بلکہ وہ اس سلسلہ میں شک و تردد کا شکار ہوتے ہیں کہ آیا ان سے حسی و مادی معانی مراد لئے جائیں یا غیر حسی و غیر مادی معانی؟ مثلاً:

سورۃ فجر، آیت ۱۴:

○ ” إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْبِصَادِ“

(یقیناً تیرا پروردگار گھات میں ہے)

سورۃ فجر، آیت ۲۲:

○ ”وَجَاءَ سِرَابُكَ“

(اور تیرا رب آیا)

توان الفاظ سے فوری طور پر وہی معانی ذہن میں آتے ہیں جو جسمانی اوصاف و خصوصیات اور حسی حقائق ہیں کیونکہ عام طور پر انسانی ذہن انہی سے مانوس اور انہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے..... طبع و فکر بشری کو صرف مادی معانی سے انس ہے اور ہمیشہ انسانی ذہن انہی کی طرف متوجہ و ملتفت ہوتا ہے..... لہذا جو شخص یہ الفاظ سنتا ہے اس کے ذہن میں ”گھات میں ہونے“ اور ”آنے“ کے وہی معانی آتے ہیں جو عام طور پر جسمانی حرکات ہیں یعنی جس طرح کوئی جاندار کسی جگہ آتا ہے یا کوئی کسی کی گھات میں ہوتا ہے خداوند عالم کا گھات میں ہونا اور آنا بھی اسی طرح سمجھا جاتا ہے لیکن جب ان کی بابت اصول و حقائق کی طرف رجوع کیا جاتا ہے کہ جن میں مادہ و جسم..... جسم و جسمانیات..... کی خداوند عالم سے نفی کی گئی ہے (یعنی وہ آیات کے جن میں خداوند عالم کو مادہ و جسم سے منزہ و پاک قرار دیا گیا ہے) تو غلط فہمی دور ہو جاتی ہے اور حسی و مادی معنی کا ابتدائی التفات دم توڑ دیتا ہے، یہ بات تمام غیر مادی اور غیر حسی معارف و موضوعات اور مباحث میں پائی جاتی ہے اور صرف قرآن مجید سے اختصاص نہیں رکھتی بلکہ تمام آسمانی کتب کہ جو بلند پایہ معارف و حقائق پر مشتمل ہیں اور تحریف سے پاک ہیں اور اسی طرح علم فلسفہ میں عنوان قرار پانے والے دینی والہی معارف و مباحث میں بھی یہ قاعدہ و ضابطہ فہم المعانی موجود ہوتا ہے، اسی کی طرف قرآن مجید میں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے:

سورۃ رعد، آیت ۱۷:

○ ” أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا“

(خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا پھر اس سے ندیاں بہہ پڑیں اپنے اندازے کے ساتھ!)

سورۃ زخرف، آیت ۳، ۴:

○ ” إِنْ جَعَلْنَاهُ قُرْءَانًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ وَإِنَّ فِي آيَاتِنَا لَلْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝“

(یقیناً ہم ہی نے اسے قرآن عربی قرار دیا تاکہ تم اسے سمجھ سکو، حالانکہ وہ ام الکتاب میں ہمارے پاس عظمت و

دانائی کے ساتھ محفوظ ہے)

(۲) کچھ معارف کا تعلق معاشرتی امور و مسائل اور فرعی احکام و دستورات سے ہے اور چونکہ اجتماعی و معاشرتی

زندگی میں یکسانیت نہیں پائی جاتی بلکہ زمان و مکان کے تقاضوں کے مطابق اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں کہ جن کی وجہ سے

احکام و دستورات میں بھی ناسخ و منسوخ کا سلسلہ جاری و قائم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ملحوظ ہوتی ہے کہ قرآن

مجید کا نزول تدریجی ہے بنا برائیں احکام و دستورات پر مبنی آیات کے معانی کی بابت تشابہ پیدا ہو جاتا ہے اور کسی معنی کا تعین

آساں نہیں رہتا لیکن یہ تشابہ اور معنی کے تعین کی غیر یقینی کیفیت اس وقت دور ہو جاتی ہے جب ان کی تفسیر و تشریح کے لئے آیات محکمات کی طرف رجوع کیا جائے تو آیات محکمات، آیات تشابہات کی وضاحت کر دیتی ہیں جس کے نتیجہ میں کسی طرح کا تشابہ باقی نہیں رہتا بلکہ معنی مقصود واضح و معلوم ہو جاتا ہے، یہی حال ناسخ و منسوخ کا ہے کہ منسوخ کو ناسخ کے تناظر میں دیکھنے سے اس کا معنی، مراد و مقصود واضح و معلوم ہو جاتا ہے۔ لہذا فروع کی اصول کی طرف بازگشت اور تشابہات کی محکمات کی طرف بازگشت کے درمیان، ہم رنگی کا مسئلہ واضح ہو گیا اور یہ راز معلوم ہو گیا کہ قرآن مجید میں آیات کی دو قسموں میں تقسیم کا فلسفہ کیا ہے اور یہ کہ محکمات، کیونکر تشابہات کی تفسیر و تشریح کرتی ہیں؟ اور فروع کو تشابہات اور اصول کو محکمات سے تعبیر کرنے کی وجہ کیا ہے؟

### فتنہ پرور لوگ

○ ”فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ

تَأْوِيلِهِ“

(تو جن گوں کے دلوں میں کجی ہے وہ اس میں سے تشابہات کی پیروی کرتے ہیں فتنہ پروری کی غرض سے اور اس کی تاویل کرنے کے لئے!)

”زلیغ“ کا معنی ہے کجی و ٹیڑھا پن! اور اس کا لازمی اثر و نتیجہ دل کا اضطراب و پریشانی ہے کیونکہ آیہ مبارکہ میں قلبی اضطراب و پریشانی کا تقابل دل کے سکون و اطمینان کے ساتھ مذکور ہے چنانچہ آیت کا ذیلی جملہ اس طرح ہے: ”وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا“ (اور جو راسخون فی العلم ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے ہیں، سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے)، اس جملہ میں قرآن مجید کی محکم اور تشابہ آیات کے حوالہ سے لوگوں کی قلبی کیفیات کا تذکرہ ہوا ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے دلوں میں کجی ہے اور وہ قلبی اضطراب و پریشانی کا شکار ہوتے ہیں، وہ فتنہ پروری اور غلط تفسیر و تاویل کی غرض سے تشابہ آیات کی پیروی کرتے ہیں، اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو راسخ العلم ہیں اور دلوں میں سکون و قرار کی نعمت سے مالا مال ہیں وہ آیات محکمات پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور تشابہات پر ایمان تو لاتے ہیں مگر ان کی پیروی نہیں کرتے اور وہ خداوند عالم سے دعا مانگتے ہیں کہ ہدایت کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کے بعد ان کے دلوں کو کجی و ٹیڑھے پن سے محفوظ رکھے،

اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ”تشابہات“ کی پیروی کرنے سے مراد اعتقادی پیروی نہیں بلکہ عملی پیروی مقصود ہے۔ یعنی وہ عملی طور پر تشابہات کا اتباع کرتے ہیں۔ اور تشابہات کی عملی پیروی اسی صورت میں مذموم ہے جب ان کے فہم معانی میں حکمت کی طرف رجوع نہ کیا جائے بلکہ استقلالی طور پر انہی سے ظاہری تمسک اختیار کر کے معانی کا تعین کرتے ہوئے عملی اقدام کیا جائے کیونکہ اگر ان کی تفسیر و تشریح اور ان کے معانی کے تعین کے لئے حکمت کی طرف رجوع کر کے ہم المعنی کا مرحلہ طے کیا جائے تو اس کے بعد ان کی پیروی کرنا تشابہات کی پیروی کرنا نہیں بلکہ حکمت کی پیروی کرنا کہلائے گا کہ جس میں مذمت کی کوئی راہ نہیں ہوتی بلکہ وہ قرین صحت عمل ہے۔

”ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ“ (فتنہ پروری، فتنہ انگیزی، فتنہ پردازی) سے مراد لوگوں کو گمراہ کرنے کی خواہش ... و کوشش ... ہے کیونکہ ”فتنہ“ اور ”اضلال“ (گمراہ کرنا) دو قریب المعنی الفاظ ہیں، گویا خداوند عالم فرماتا ہے کہ وہ لوگ آیات تشابہات کی پیروی کر کے عوام الناس کو آیات الہی کی بابت گمراہ کرنا چاہتے ہیں اور اس سے بڑی بات یہ کہ وہ اس ذریعے سے قرآن مجید کی تاویل اور حلال و حرام کے احکام پر مشتمل آیات کی من پسند تشریح و تفسیر کرنے کے درپے ہیں تاکہ اس طرح اپنے آپ کو دین کے پختہ اصولوں کی پیروی سے بے نیاز کر لیں اور بالآخر دین خدا کی اصل و اساس ہی باقی نہ رہے،

”تاویل“ (باب تفعیل) ”اول“ سے مشتق ہے جس کا معنی رجوع و بازگشت ہے، لہذا ”تاویل“ کا معنی ”لوٹانا“ ہوگا۔ اس بنا پر تشابہ کی تاویل سے مراد وہ مرجع ... رجوع و بازگشت کی وہ بنیاد ... ہے کہ جس کی طرف اسے لوٹایا جاتا ہے اور تاویل قرآن کا معنی وہ ماخذ و سرچشمہ ہے جس سے قرآنی معارف اخذ ہوتے ہیں،

خداوند عالم نے اپنے مقدس کلام میں چند مقامات پر لفظ ”تاویل“ ذکر فرمایا ہے جن میں سے ایک یہ ہے:

سورہ اعراف، آیات ۵۲، ۵۳:

○ ”وَلَقَدْ جِئْتُمُوهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلَهُ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ قَدْ جَاءَنَا رَسُولٌ مِّنَّا يَأْتِي بِالْحَقِّ“

(ہم تو ان کے پاس ایسی کتاب لائے ہیں کہ جسے علم کی بناء پر کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے جو کہ ہدایت و رحمت ہے ایمان والے لوگوں کے لئے ○ کیا وہ اب بھی اس کی تاویل کا انتظار کرتے ہیں؟ جس دن اس کی تاویل آئے گی تو جن لوگوں نے اسے اس سے پہلے بھلا دیا وہ یہ کہتے ہوئے دکھائی دیں گے کہ ہمارے رب کے پیغام بر حق ہی لائے تھے)

یعنی وہ یہ کہیں گے کہ پیغمبروں نے جو کچھ کہا وہ حق تھا اور انہوں نے خدا کے بارے میں جو کہا کہ وہ ان کا مولا و آقا ہے وہ درست بات تھی اور ہم خدا کے علاوہ جس کو پوجتے اور پکارتے تھے وہ باطل تھا، اور نبوت (خدا کی طرف سے انبیاء کا بھیجا جانا) حق ہے، اور دین (جو نظام زندگی خداوند عالم نے ہمارے لئے مقرر کر کے انبیاء کے ذریعے ہم تک پہنچایا ہے) وہ

حق تھا، اور یہ بات حق و درست تھی کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو قبروں سے اٹھائے گا، خلاصہ کلام یہ کہ قیامت کے دن ان تمام معارف کی حقیقت واضح و آشکار اور ظاہر ہو جائے گی جو انبیاء علیہم السلام نے پیش کئے اور جن کی بابت انہوں نے خبر دی۔

مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں بعض حضرات کا کہنا ہے کہ آیت میں تاویل سے مراد وہ حقیقت ہے جس کے بارے میں سچی خبر دی گئی جیسے وہ امور کہ جو قیامت کے دن مشہود ہوں گے یعنی کھل کر سامنے آئیں گے اور جیسا کہا گیا تھا اس کے عین مطابق ہوں گے کہ وہ انبیاء و پیغمبران الہی اور کتب آسمانی کے بیانات و مندرجات کی صداقت کی منہ بولتی تصویریں ہوں گی۔

لیکن یہ قول درست نہیں کیونکہ اس بناء پر تاویل انہی آیات سے مختص ہو جائے گی کہ جن میں صفات خداوندی، بعض افعال اور قیامت کے دن رونما ہونے والے واقعات اور ظاہر ہونے والے امور سے مطابقت و عدم مطابقت سے کوئی ربط نہیں (کیونکہ مطابقت و عدم مطابقت اس چیز کے بارے میں تصور ہوتی ہے جس کے بارے میں خبر دی گئی ہو اور یہ ”خبر“ نہیں بلکہ ”انشاء“ کے باب سے ہیں کہ جس میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم ہوتا ہے) لہذا ان کی بابت تاویل بے معنی ہو جائے گی، کیونکہ ان کی تاویل ان سے باہر نہیں بلکہ خود ان کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے، اسی طرح وہ آیات کہ جن میں اخلاقی دستورات مذکور ہیں اور ان کی بابت صریح عقلی تائید پائی جاتی ہے تو ان کی تاویل بھی خود ان کے ساتھ ہوتی ہے اور اسی طرح انبیاء کی سرگزشت اور سابقہ امتوں کی داستانوں پر مشتمل آیات کی تاویل..... اس معنی کی بناء پر..... زمانہ ماضی میں وجود پذیر ہو چکی ہے لہذا قیامت کے دن ان کی تاویل کی بات بے معنی ہے، اس کے علاوہ یہ کہ ظاہر آئیے میں تاویل کی اضافت پوری کتاب کی طرف ہے آیات میں سے خاص قسم کی طرف نہیں (هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلَهُ.....)، جبکہ تاویل کا جو معنی پیش کیا گیا ہے اس کی بناء پر اس کا تعلق صرف چند آیات سے ہوگا پوری کتاب سے نہ ہوگا۔

زیر نظر آیہ مبارکہ کی مانند ایک آیت سورہ یونس میں ہے جس میں اس طرح ارشاد حق تعالیٰ ہے:

”وَمَا كَانَ هَذَا الْقُرْآنُ أَنْ يُفْتَرَىٰ..... أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ..... بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيظُوا بِهِمْ وَلَسَاءَ لَهُمْ تَأْوِيلَهُ ۗ كَذَلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ“ (آیت ۳۹)، (اور ایسا نہ تھا کہ اس قرآن کو غلط نسبت دی جائے..... یا وہ کہتے ہیں کہ (پیغمبر) نے خود اس کی جھوٹی نسبت دی ہے (اسے غلط طور پر خدا سے منسوب کیا ہے)..... بلکہ وہ اس چیز کی تکذیب کرتے ہیں جس سے آگاہی نہیں پاسکتے اور ابھی تک ان کے پاس اس کی تاویل آئی ہی نہیں اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے تکذیب کی، آپ دیکھیں کہ ظالموں کا انجام کیا ہوا،)

چنانچہ آپ نے ملاحظہ کیا ہے کہ اس آیت میں تاویل کی اضافت پوری کتاب کی طرف دی گئی ہے (تأویلہ)،

بہر حال اسی معنی کی بناء پر بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ”تأویل“ دراصل ایک نفس الامری حقیقت ہے کہ جس پر کلام کا دارومدار ہوتا ہے اور وہ کلام کی اصل بنیاد ہوتی ہے اور وہ ہر مورد و موضوع میں اپنا خاص و مخصوص معنی رکھتی ہے مثلاً کسی ”خبر“ میں اسی چیز سے عبارت ہوتی ہے جس کے بارے میں خبر دی گئی ہو (یعنی وہ حقیقت کہ جو خارجی وجود رکھتی ہے) خواہ وہ (خبر) اس چیز کے بارے میں ہو جو زمانہ ماضی میں واقع ہوئی تھی جیسے انباء کی داستانیں اور گزشتہ اقوام کی سرگذشت، یا مستقبل میں ظہور پذیر و جلوہ گر ہوگی جیسے وہ آیات کہ جن میں صفات و اسماء الہی اور اس کے وہ وعدے جو اس نے اپنی مخلوق سے کئے ہیں اور وہ سب کچھ جو قیامت کے دن رونما ہوگا، اور ”انشاء“ (اوامر و نواہی اور عملی دستورات وغیرہ) میں ان حکمتوں سے عبارت ہوتی ہے جن کی بناء پر احکام صادر ہوتے ہیں مثلاً آیات احکام میں سے یہ آیت مبارکہ: ”وَ اَوْفُوا بِالْعَقْدِ اِذَا كُنْتُمْ وَاَوْفُوا بِالْعَقْدِ اِذَا كُنْتُمْ وَاَوْفُوا بِالْعَقْدِ اِذَا كُنْتُمْ وَاَوْفُوا بِالْعَقْدِ اِذَا كُنْتُمْ“ (سورۃ اسراء آیت ۳۵) اور جب تم ناپ تول کرو تو پیمانہ پورا کرو اور صحیح و درست ترازو کے ساتھ وزن کرو، یہی بہتر اور نہایت اچھا نتیجہ عمل ہے، تو یہ وہ مصلحت و حکمت ہے جس پر انسانی معاشرہ کے امور کا بہتر طور پر انجام پانا ممکن ہے یعنی ناپ تول اور وزن میں عادلانہ و صحیح روش اپنانے اور ناپی تولی جانے والی چیزوں میں پورا پیمانہ اور وزن کا پورا ترازو برقرار رکھنا معاشرتی زندگی کو خوشگوار و خوشحالی کی راہ پر گامزن رکھ سکتا ہے، یہی وہ امر ہے جو احکامات کے صادر ہونے کا بنیادی سبب ہے۔

لیکن یہ قول اس بناء پر مخدوش ہے کہ:

(۱) ظاہر لآیہ یہ ہے کہ تأویل ایک خارجی وجود رکھنے والی حقیقت ہے اور ایک حقیقی اثر و نتیجہ ہے جو کہ لوگوں کے عمل (یعنی ناپ تول کو پورا کرنا اور وزن کو درست برقرار کرنا) پر مرتب ہوتا ہے نہ کہ ایک تشریحی حقیقت، کہ جسے جملہ ”وَ اَوْفُوا بِالْعَقْدِ اِذَا كُنْتُمْ وَاَوْفُوا بِالْعَقْدِ اِذَا كُنْتُمْ وَاَوْفُوا بِالْعَقْدِ اِذَا كُنْتُمْ وَاَوْفُوا بِالْعَقْدِ اِذَا كُنْتُمْ“ میں بیان کیا گیا ہے، بنا بریں تأویل ایک ایسی حقیقت ہے جو کسی دوسری حقیقت کا ملجأ و مأویٰ ہے یعنی ایک اور حقیقت کی بازگشت اس کی طرف ہوتی ہے، لہذا آیات الکتاب (قرآنی آیات) کو تأویل کی حامل ہونے کی صفت سے متصف کرنا اس حوالہ سے کہ وہ ”خبر“ میں، خارجی اور وجود رکھنے والی حقیقتوں کی ترجمانی و عکاسی کرتی ہے اور ”انشاء“ میں، افعال یا خارجی وجود رکھنے والے امور کی نشاندہی کرتی ہیں، درحقیقت، اصل شے کی توصیف نہیں بلکہ اس سے تعلق رکھنے والی شے کی توصیف ہے، یعنی اس طرح آیات الکتاب کی تاویل کا بیان نہ ہوگا بلکہ ان سے مربوط امور کی توصیف ہو جائے گی۔

(۲) تاویل۔ کہ جس کا معنی بازگشت اور لوٹنا ہے۔ اگرچہ اس سے مراد وہ حقیقت ہے جس کی طرف کوئی چیز لوٹتی ہے (کسی چیز کی بازگشت اس کی طرف ہوتی ہے) لیکن ہر لوٹنے اور بازگشت کو ”تأویل“ نہیں کہا جاتا بلکہ اس مقام پر خاص معنی کی حامل بازگشت مراد ہے کیونکہ ہر ملازم اپنے افسر اعلیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے مگر اس رجوع کو تأویل نہیں کہا جاتا،

ہر عدد کی بازگشت ”ایک“ کی طرف ہوتی ہے مگر اس بازگشت کو ”تاویل“ سے موسوم نہیں کیا جاتا، بنا برائیل ”تاویل“ سے مراد لامحالہ رجوع اور بازگشت کے مطلق اور عام معنی کی بجائے خاص طرز کار رجوع ہوگا چنانچہ اس کی بابت قرآنی دلائل و شواہد بھی موجود ہیں ملاحظہ ہو:

سورۃ کہف، آیت ۷۸:

○ ”سَأْتِيَنَّكَ نِبَأٌ وَئِيلٌ مَّا لَمْ تَسْتَطِعْ عَلَيْهِ صَدْرًا“

(میں عنقریب تجھے آگاہ کروں گا اس چیز کی تاویل سے کہ جس پر تو صبر نہ کر سکا)

یہ آیت حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کے واقعہ کے بارے میں ہے۔ اسی سلسلہ کی دوسری آیت یہ ہے:

سورۃ کہف، آیت ۸۲:

○ ”ذٰلِكَ تَأْوِيلٌ مَّا لَمْ تَسْتَطِعْ عَلَيْهِ صَدْرًا“

(یہ ہے اس چیز کی تاویل کہ جس پر تو صبر نہ کر سکا)

کیونکہ حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنے ان تین کاموں کے حقائق سے آگاہ کیا جو انہوں نے انجام دیئے اور حضرت موسیٰؑ نے ان کی ظاہر نگری کی بنیاد پر ان کو مورد سوال و اعتراض قرار دیا یعنی کشتی میں سوراخ کرنا، دیوار تعمیر کرنا اور بچے کو قتل کرنا، تو ان اعمال کے بارے میں حضرت موسیٰؑ نے ان پر اعتراض کیا اور ان سے مربوط حقائق کی طرف عدم التفات کی بناء پر حضرت خضرؑ پر سوالات کی بوجھاڑ کی، دراصل انہوں نے ان اعمال سے مربوط حقائق کے علاوہ دیگر معانی اپنی لوح ذہن میں ثبت کئے جن کے باعث اعتراض کی راہ نکلی اور انہوں نے صبر و تحمل سے کام نہ لیا بلکہ ان اعمال کی وضاحت طلب کرنے میں جلدی کی، قرآن مجید میں ان تین موارد کا تذکرہ اس طرح ہوا ہے:

(۱) ..... سورۃ کہف، آیت ۱۷:

○ ”حَتَّىٰ إِذَا رَكَبُوا فِي السَّفِينَةِ خَرَقَهَا“

(جب وہ دونوں کشتی میں سوار ہوئے تو اس نے اس میں سوراخ کر دیا)

(۲) ..... سورۃ کہف، آیت ۷۴:

○ ”حَتَّىٰ إِذَا لَقِبَا غَلْمًا فَقتَلَهُ“

(جب وہ ایک نوجوان لڑکے سے ملے تو اس نے اسے قتل کر دیا)

(۳) ..... سورۃ کہف، آیت ۷۷:

○ ”حَتَّىٰ إِذَا آتَىٰ أَهْلَ قَرْيَةٍ اسْتَطْعَمَا أَهْلَهَا فَأَبَوْا أَنْ يُصَيِّفُوهُمَا فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ



أَنْ يَنْقُصَ فَأَقَامَهُ“

(جب وہ دونوں، بستی والوں کے پاس آئے تو انہوں نے ان سے کھانا مانگا مگر ان لوگوں نے انہیں مہمانی دینے سے انکار کر دیا، پھر انہوں نے اس بستی میں ایک بوسیدہ دیوار دیکھی جو گرنے والی تھی تو اس نے اس کی مرمت کر دی) حضرت خضرؑ کے ان اعمال پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعتراض کرتے ہوئے اس طرح فرمایا:  
سورہ کہف، آیت ۷۱:

○ ”أَخْرَقَهَا لِنُعْرَفِ أَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا مَّرْمُورًا“

(کیا تو نے اس میں اس لئے سوراخ کیا ہے تاکہ اس کے سواروں کو غرق کر دے، تو نے کیا عجیب کام انجام دیا

(ہے؟)

سورہ کہف، آیت ۷۲:

○ ”أَقْتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِعَدْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا ثَقِيرًا“

(کیا تو نے ایک بیگناہ شخص کو کسی جرم کے بغیر قتل کر دیا، تو نے تو بہت برا کام کیا ہے؟)

سورہ کہف، آیت ۷۳:

○ ”لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِمْ أَجْرًا“

(اگر تو چاہتا تو اس کام کی اجرت لے لیتا)

گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان تین کاموں پر تعجب کرتے ہوئے ان کے مربوط حقائق سے آگاہ ہونے تک صبر کرنے کی بجائے فوراً ان پر اعتراض کر دیا اور ان اعمال کی ظاہری صورتوں اور عام جہتوں کو تصور میں لاتے ہوئے ان کی بابت زبان سوال کھول دی،

اور حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے ان کاموں کی تاویل ان الفاظ میں حضرت موسیٰ کو بتائی:

سورہ کہف، آیت ۸۲:

○ ”وَأَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسْكِينٍ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدْتُ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ

وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ۝ وَأَمَّا الْعُلَمَاءُ فَكَانَ أَبُوهُمُ الْمُؤْمِنِينَ فَحَشِينَا أَنْ

يُرْهَقَهُمَا طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۝ فَأَرَدْنَا أَنْ يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِمَّا كَانُوا وَآقْرَبُ رُحْمًا ۝

وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا

فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ“

(جہاں تک کشتی کا تعلق ہے تو وہ چند مسکینوں کی تھی کہ جو دریا میں کام کر رہے تھے تو میں نے چاہا کہ اسے عیب دار بنا دوں کیونکہ ایک بادشاہ ان لوگوں کی کمین میں تھا کہ جو ہر کشتی پر غاصبانہ قبضہ کر لیتا ہے..... تاکہ وہ اسے غصب نہ کرے..... اور جہاں تک اس بچے کا تعلق ہے تو اس کے والدین مؤمن تھے تو ہمیں یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ وہ انہیں سرکشی و کفر کی جانب کھینچ لے گا لہذا ہم نے چاہا کہ خداوند عالم انہیں اس کے بدلے میں اس سے پاکیزہ تر اور رحمدل و مہربان ترین..... فرزند..... عطا فرمائے، اور وہ دیوار شہر کے دو یتیم بچوں کی ملکیت تھی اور اس کے نیچے ان کا خزانہ پوشیدہ تھا اور ان کا باپ نیک و صالح شخص تھا تو تیرے پروردگار نے چاہا کہ وہ دونوں جوان و بالغ ہو جائیں اور اپنے دینہ کو نکال لیں، یہ تیرے پروردگار کی طرف سے رحمت و مہربانی کی بنیاد پر ہوا)

پھر حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ کے تمام اعتراضات کے جواب میں یوں کہا: ”وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي“ (سورہ کہف، آیت ۸۲) کہ میں نے جو کچھ بھی انجام دیا وہ اپنے طور پر..... اپنی مرضی سے نہیں کیا، مذکورہ بالا آیات مبارکہ میں ”تأویل“ سے مراد..... جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا..... کسی چیز کا اپنی اصل صورت اور حقیقی عنوان (مقصد) کی طرف لوٹنا ہے جس طرح سے بچے کو مارنے کی بازگشت اس کی اصلاح و بہتر تربیت کے مقصد کی طرف ہوتی ہے اور فصد یعنی رگوں کو کھولنے اور خون نکالنے کی بازگشت علاج و معالجہ کی طرف ہوتی ہے، اور اس طرح نہیں کہ جیسے ہم کہتے ہیں کہ زیاد آ گیا تو ہمارے اس قول کی بازگشت اس کے ظاہر بہ ظاہر آ جانے کی طرف ہو..... کیونکہ اسے ”خبر“ کہا جاتا ہے تاویل نہیں کہا جاسکتا، تاویل کا تعلق پس منظر اور پس پردہ حقیقت و مقصد سے ہوتا ہے..... م، تاویل کے اسی معنی سے قریب تر مثالیں حضرت یوسفؑ کے قصہ میں بھی ملتی ہیں، ملاحظہ ہو:

سورہ یوسف، آیت ۴:

○ ”إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنَّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ“

(جب یوسفؑ نے اپنے والد سے کہا کہ بابا جان، میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے اور سورج و چاند مجھے سجدہ کر رہے ہیں)

سورہ یوسف، آیت ۱۰۰:

○ ”وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا وَقَالَ يَا أَبَتِ هَذَا تَأْوِيلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلْنَا رُبِّي حَقًّا“

(اور اس نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا اور جب سب اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے، اس وقت اس (یوسف) نے

نے کہا کہ اے بابا جان! یہ سب اس خواب کی تعبیر ہے جو میں نے دیکھا تھا، اسے میرے پروردگار نے سچ کر دیا ہے) اگرچہ ان آیتوں میں حضرت یوسفؑ کے والدین اور ان کے بھائیوں کے سجدہ ریز ہونے کی بازگشت اس خواب کی طرف ہے جو حضرت یوسفؑ نے دیکھا تھا کہ جسے ”تاویل“ سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن یہ بازگشت اس طرح سے ہے جیسے کسی مثال کی اس کے مثل (جس کی مثال دی گئی یا جس کے لئے مثال دی گئی) کی طرف سے ہوتی ہے۔

قصہ یوسفؑ ہی میں ایک اور جگہ یوں ارشاد ہوا:

سورۃ یوسف، آیات ۴۳-۴۸:

۰ ”قَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَى سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَ سَبْعٌ سُئِلَتْ خُضْرًا وَأُخْرَى يُسْتَبَيَّنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَلْفُتُونِي فِي رَمِيَّ إِن كُنْتُمْ لِلدُّعْيَا تَعْبُرُونَ ۝ قَالُوا أَصْغَاتُ أَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعِلْمٍ ۚ وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُمْ بِتَأْوِيلِهِ فَأَرْسِلُونِ ۝ يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَ سَبْعِ سُئِلَتْ خُضْرًا وَأُخْرَى يُسْتَبَيَّنُ لَعَلِّي أَسْرَجُ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأْبًا فَمَا حَصَدْتُمْ فَذَرَوْهُ فِي سُنْبُلِهِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تَأْكُلُونَ ۝ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ سَبْعٌ شِدَادًا يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تَحْصُونَ ۝“

(بادشاہ نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ سات موٹی تازی گائیں ہیں کہ جنہیں سات دبلی پتلی گائیں کھا رہی ہیں، اور سات سبز خوشے اور دوسرے سات خشک خوشے ہیں، اے اہل دربار! اگر تم خواب کی تعبیر بیان کر سکتے ہو تو میرے خواب کے بارے میں اظہار خیال کرو ۰ انہوں نے کہا کہ یہ خواب پریشان ہے اور ہم اس طرح کے خوابوں کی تعبیر کا علم نہیں رکھتے ۰ ان دو آدمیوں میں سے ایک کہ جسے قید سے رہائی مل چکی تھی اسے کافی دیر کے بعد یاد آیا تو وہ کہنے لگا کہ میں تمہیں اس کی تاویل بتاتا ہوں مجھے بھیج دو ۰ (وہ قید خانہ میں حضرت یوسفؑ کے پاس آیا اور ان سے کہا) اے یوسف! اے سچے انسان! ہمیں اس خواب کے بارے میں بتاؤ کہ سات موٹی تازی گائیں ہیں کہ جنہیں سات کمزور و دبلی پتلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات سبز خوشے ہیں اور سات خشک خوشے ہیں، تاکہ میں لوگوں کے پاس لوٹ جاؤں اور وہ اس خواب کے بارے میں آگاہ ہو جائیں ۰ اس (یوسف) نے کہا: (اس کی تعبیر یہ ہے) کہ تم سات سال تک مسلسل خوب کا شکار کری گے اور جو کچھ تم فصل کاٹو گے اس میں سے تھوڑی مقدار کھا لو گے اور باقی خوشوں میں ذخیرہ کر لو گے ۰ پھر اس کے بعد سات سال نہایت سخت (قطع و خشک) ہوں گے اور جو کچھ تم نے ان کے لئے ذخیرہ کیا ہو گا وہ کھا لیں گے سوائے تھوڑی سی مقدار کے کہ جسے تم بچاؤ گے)

اسی قصہ میں ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا:

سورۃ یوسف، آیت ۴۱:

○ ” وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَتَدَبَّرُ فَقَالَ أَحَدُهَا إِنِّي أَرَأَيْتَ إِذْ أُرْسِنُ أَغْصِرُ حَمْرًا ۚ وَقَالَ الْآخَرُ إِنِّي أَرَأَيْتَ إِذْ أُرْسِنُ أَهْجِلُ فَوْقَ رَأْسِي خُبْرًا تَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ نَبِئًا نَبِئًا وَيَأْتِيهِمْ ۚ إِنَّا نَزَّلْنَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ..... لِصَاحِبِ السِّجْنِ أَمَّا أَحَدُكُمْ فَسَيَنْتَقِي رَبَّهُ حَمْرًا“

(اور اس کے ساتھ قید خانہ میں دونو جوان داخل ہوئے ان میں سے ایک نے کہا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں شراب بنانے کے لئے انگوروں کو نچوڑ رہا ہوں، دوسرے نے کہا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں سر پر روٹیاں لا کر جا رہا ہوں اور پرندے کھا رہے ہیں، ہمیں اس کی تاویل بتاؤ کیونکہ ہم آپ کو نیک لوگوں میں سے سمجھتے ہیں۔ (یوسف نے کہا) اے میرے قیدی ساتھیو! تم میں سے ایک اپنے مالک کو شراب پلانے گا (در بار شاہی میں ساتی بنے گا) اور دوسرے کو تختہ دار پر لٹکا یا جائے گا اور اس کے سر سے پرندے گوشت کھائیں گے، اور جس چیز کے بارے میں تم نے پوچھا ہے یہ اس کی بات حتمی فیصلہ ہے)

ایک اور مقام پر حضرت یوسف کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا :

سورۃ یوسف، آیت ۶:

○ ” وَيَعْلَمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ“

(اور وہ تجھے خوابوں کی تعبیر کی تعلیم دے)

اور اسی سورہ کی آیت ۲۱ اور آیت ۱۰۱ میں بالترتیب اس طرح ارشاد فرمایا: ” وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ“

(اور تو نے مجھے خوابوں کی تعبیر سکھائی ہے)

مذکورہ بالا تمام آیات مبارکہ میں لفظ ”تأویل“ انہی واقعات میں استعمال ہوا ہے جن کی بازگشت خوابوں کی تعبیر کی طرف ہوتی ہے، اور خواب دیکھنے والا جس چیز کو خواب میں دیکھتا ہے وہ انہی حوادث کی ایک مثالی صورت ہوتی ہے۔ بنا برائیں خوابوں کی اصل واقعات سے وہی نسبت ہے جو معنی کی اس صورت سے ہے کہ جو اس صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے (جو نسبت معنی اور صورت کے درمیان پائی جاتی ہے وہی نسبت اصل واقعات اور خوابوں کے درمیان ہوتی ہے) یا یوں کہیے کہ اصل واقعات کا خوابوں سے وہی تعلق ہے جو کسی مثال اور اس حقیقت کے درمیان ہوتا ہے جس کی مثال دی گئی ہوتی ہے کہ وہ مثال اس حقیقت کی عکاسی کرتی ہے اور اسے تجسم دیتی ہے، جیسا کہ ان آیات مبارکہ میں مشاہدہ ہوتا ہے جو حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کے واقعہ میں ہم نے پیش کی ہیں، اور آیت مبارکہ ” وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ ..... وَأَحْسِنُ تَأْوِيلًا“

(سورۃ اسراء، آیت ۳۵)..... اور پیمانہ پورا کرو جب تو لو..... اور نہایت اچھی تاویل..... بھی اسی بابت سے ہے۔  
یہی حال قیامت کے حالات پر مشتمل آیات مبارکہ میں غور و فکر کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ لفظ ”تاویل“ سے مراد  
مذکورہ بالا معنی ہے، ملاحظہ ہو:

سورۃ یونس، آیت ۳۹:

○ ”بَلْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا لِيَخِطُّوا بِعُلْمِهِمْ وَلَسَانِيَاتِهِمْ تَأْوِيلُ“

(بلکہ انہوں نے اس چیز کی تکذیب کی جس سے وہ آگاہی حاصل نہ کر سکے اور ان کے پاس اس کی تاویل نہیں

(آئی)

سورۃ اعراف، آیت ۵۳:

○ ”هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلَهُ“

(کیا وہ صرف اس کی تاویل کا انتظار کر رہے ہیں، جس دن اس کی تاویل آ جائے گی)

اس کی تائید سورۃ ق آیت ۲۲ سے ہوتی ہے جس میں ارشاد حق تعالیٰ ہے:

○ ”لَقَدْ كُنْتُمْ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ“

(تو اس امر کی بابت غفلت میں تھا پھر ہم نے تیری آنکھ سے پردہ ہٹا دیا تو آج تیری نظر بہت تیز ہے)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کی جس صورتحال کی بابت انبیاء اور کتب آسمانی نے خبر دی ہے وہ

اس حسی مشاہدہ سے قطعی مختلف ہے جو اس دنیاوی زندگی میں ہمارا معمول ہے اور جس طرح قیامت کے دن کی اصل برپائی اور

اس میں حکمفرمان نظام و احکام کی کیفیات ہماری دنیاوی زندگی کے معمولات اور روزمرہ کے مشاہدات میں پائی جانے والی

کیفیات سے مختلف ہیں اسی طرح اس کی عملی صورتحال بھی ہمارے معمولات سے مختلف ہے۔ بہر حال اس سلسلہ میں مزید

وضاحت بہت جلد پیش کی جائے گی، اس بناء پر قیامت کے دن کے حالات کی بابت کتب سماوی میں جو کچھ مذکور ہے اور

جو مطالب انبیاء علیہم السلام نے اس سلسلہ میں بیان فرمائے ہیں ان کی بازگشت ان کے ظاہری مصادیق کی طرف اس طرح

نہیں جیسے مستقبل کے حالات کے بارے میں دی جانے والی خبروں کی بازگشت مستقبل میں ان امور کے وقوع پذیر ہونے کی

طرف ہوتی ہے، ان دونوں کی بازگشت کی کیفیات مختلف ہیں،

مذکورہ بالا مطالب سے درج ذیل تین امور واضح ہو گئے:

(۱) تاویل کی حامل آیت اس کی اصل تاویل کی طرف بازگشت اس طرح نہیں جیسے کسی تشابہ آیت کی محکم آیت

کی طرف بازگشت ہوتی ہے۔

(۲) تاویل کا مسئلہ صرف تشابہ آیات تک محدود نہیں اور نہ انہی آیات سے مختص ہے بلکہ اس کا تعلق تمام قرآنی آیات سے ہے اور ہر آیت تاویل کی حامل ہے لہذا تشابہ آیات کی طرح محکم آیات بھی تاویل کی حامل ہیں،

(۳) ”تاویل“ ان مفہیم میں سے نہیں جن پر الفاظ دلالت کرتے ہیں بلکہ وہ ظاہری حقائق میں سے ایک ہے اور آیات کو تاویل کی صفت سے متصف کرنا اس سے تعلق رکھنے امر و واقعہ کے حوالہ سے ہے، اور جہاں تک اس لفظ (تاویل) کے استعمال سے ظاہری الفاظ کے مخالف معانی مراد لینے کا تعلق ہے تو یہ بات نزول قرآن کے زمانہ میں نہیں بلکہ اس کے بعد سامنے آئی ہے لہذا آیہ مبارکہ ”وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ“ میں ”تاویل“ سے خلاف الظاہر معنی مراد لینا بلا دلیل ہے۔ اسی طرح تاویل کے جو معانی ذکر کئے جاتے ہیں ان میں سے اکثر کہ جن کی تفصیل عنقریب ذکر کی جائے گی ان کی صحت پر کوئی دلیل موجود نہیں۔

## تاویل کا علم

○ ”وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ“

(اور اس کی تاویل کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے)

اس جملہ میں ”تَأْوِيلِهِ“ کی ضمیر (ہ) کی بازگشت بظاہر ”ماتشابہ“ کی طرف ہے کیونکہ عبارت میں وہی نزدیک ترین مرجع ..... کہ جس کی طرف ضمیر کو لوٹایا جاسکے ہے جیسا کہ جملہ ”وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ“ میں بھی یہی صورت پائی جاتی ہے، البتہ آپ اس امر سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ ”تاویل“ کی آیات تشابہات کی طرف بازگشت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ انہی میں محدود ہے بلکہ جس طرح آیات تشابہات تاویل کی حامل ہیں اسی طرح آیات محکمات بھی تاویل رکھتی ہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ”تَأْوِيلِهِ“ میں ضمیر (ہ) کی بازگشت ”الْكِتَابِ“ کی طرف ہو جیسا کہ جملہ ”مَنْ تَشَاءُ مِنْهُ“ میں ضمیر (منہ) کی بازگشت اصل کتاب کی طرف ہے (اس بناء پر کتاب (قرآن) کی تمام آیات خواہ محکم ہوں یا تشابہ، تاویل کی حامل قرار پائیں گی۔

زیر نظر جملہ (وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ) سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ تاویل کا علم صرف اور صرف خدا کے پاس ہے اس کے سوا کوئی تاویل کا علم نہیں رکھتا، اور جملہ ”وَالرَّسُخُونَ فِي الْعِلْمِ“ مستقل جملہ ہے کیونکہ ظاہر الکلام سے

معلوم ہوتا ہے کہ ”وَالرَّاسِخُونَ“ میں حرف واو سابقہ جملہ کی طرف عطف کے لئے نہیں بلکہ مستقل اور نئے جملہ کا اشارہ دیتی ہے، لہذا آیت کا معنی یہ نہ ہوگا کہ ”اس کی تاویل کوئی نہیں جانتا سوائے خدا اور راسخون فی العلم کے، گویا یہ ابتدائے آیت کے جملہ ”فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ“ کے مقابل میں ان لوگوں کا تذکرہ کرتا ہے جو تشابہات کی پیروی نہیں کرتے، بنا برائیں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ کتاب سے استفادہ کرنے والوں کی دو قسمیں ہیں، کچھ لوگ وہ ہیں جن کے دلوں میں کجی و میڑھا پن ہے اور وہ ”مَاتَشَابَهَ“ یعنی تشابہات کی پیروی کرتے ہیں اور کچھ لوگ وہ ہیں کہ جب کوئی تشابہ آیت ان کے سامنے آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ”ہم اس پر ایمان لائے ہیں (قرآن پر ایمان لائے ہیں) سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے“۔ دراصل ان لوگوں کے اختلاف کی وجہ ان کے دلوں کی کیفیات اور حالات ہیں کہ پہلے گروہ کے لوگوں کے دلوں میں کجی جبکہ دوسرے گروہ کے افراد ایسے ہیں کہ علم ان کے دلوں میں گھر کر گیا ہے۔

اس کے علاوہ اگر ”وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ“ میں حرف واو عطف کے لئے ہو اور جملہ اس طرح ہو کہ کتاب کی تاویل کوئی نہیں جانتا سوائے خدا اور ”رَاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ“ کے، گویا دونوں اس امر میں شریک ہیں، تو اس صورت میں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ حضرت پیغمبر اسلام ان (رَاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ) میں سے ہیں اور ان میں سب سے افضل و برتر ہیں جبکہ یہ بات کیونکر قابل تصور ہے کہ قرآن مجید آنحضرت کے قلب مبارک پر نازل ہو اور آپ کو معلوم نہ ہو کہ اس کی آیات سے کیا مراد لیا گیا ہے (یعنی یہ کس طرح ممکن ہے کہ آنحضرت اپنے دل پر اترنے والی کتاب کی آیات تشابہات کے معانی سے نا آگاہ ہوں؟)، اس کے ساتھ ساتھ یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ قرآنی بیانات کا اسلوب و ادب یہ ہے کہ جب امت اسلام یا ان لوگوں کا توصیفی تذکرہ کرے جن میں آنحضرت بھی شامل ہوں تو سب سے پہلے منفرد صورت میں آنحضرت کا ذکر ہوتا ہے اور آپ کی عزت و عظمت کے عملی احترام کی بناء پر امتیازی طور پر آپ کا تذکرہ کیا جاتا ہے اور اس کے بعد دیگر تمام افراد کا ذکر ہوتا ہے، ملاحظہ ہو:

سورہ بقرہ، آیت ۲۸۵:

○ ”أَمِنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ“

(ایمان لایا پیغمبر اس چیز پر جو اس کی طرف اس کے رب کی طرف سے نازل کی گئی اور مؤمنین۔ ایمان لائے)

سورہ توبہ، آیت ۲۶:

○ ”ثُمَّ أَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ“

(پھر اس نے اپنی متاع سکون اپنے رسول پر اور مؤمنین پر نازل کی)

سورہ توبہ، آیت ۸۸:

○ ”لَكِنَّ الرَّسُولَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ“

(لیکن رسول اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ایمان لائے)

سورہ آل عمران، آیت ۶۸:

○ ”وَهَذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا“

(اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لائے)

سورہ تحریم، آیت ۸:

○ ”لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ“

(اللہ رسوا نہیں کرتا نبی کو اور ان لوگوں کو اس کے ساتھ ایمان لائے)

ان کے علاوہ دیگر متعدد آیات میں پہلے حضرت پیغمبر اسلام کا نام لیا گیا اور پھر امت و اہل ایمان کا تذکرہ کیا گیا،

یہاں اگر جملہ ”وَالرَّسُخُونَ فِي الْعِلْمِ“ سے ”عالمون بالنسب“ (آیات کی تاویل کا علم رکھنے

والے) مراد ہوتا..... کہ جن میں حضرت پیغمبر اسلام یقینی طور پر شامل ہیں..... تو آیت مبارکہ اس طرح ہوتی: ”وَمَا

يَعْلَمُونَ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ“ وَالرَّسُخُونَ فِي الْعِلْمِ“ (اور نہیں جانتا اس کی تاویل کو سوائے اللہ اور اس کے رسول اور راسخون

فی العلم کے) البتہ اس مقام پر یہ بات ممکن ہے کہ آیت کے ابتدائی الفاظ سے استناد کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ جب

آنحضرت عالم بالکتاب تھے اور کتاب کے تمام معانی و مفہیم اور حقائق و اسرار سے واقف تھے تو ”هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ

الْكِتَابَ“ کے بعد دوبارہ آپ کا تذکرہ کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی..... اس لئے ”وَمَا يَعْلَمُونَ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ“ کے بعد

”ورسولہ“ کہنے کی بجائے ”وَالرَّسُخُونَ فِي الْعِلْمِ“ کہا گیا ہے۔

نتیجہ کلام یہ کہ ظاہر الایہ سے ثابت ہوتا ہے کہ تاویل کا علم خداوند عالم سے مخصوص و منحصر ہے اس کے علاوہ کوئی

اس کا حامل نہیں، البتہ اس سے کسی استثنائی صورت کی نفی نہیں ہوتی یعنی یہ کہ خداوند عالم اپنے سوا ہر ایک سے علم بالتاویل کی نفی

کرنے کے بعد آنحضرت کو استثناء کر کے علم بالتاویل کا حامل قرار دے جیسا کہ علم غیب کے خدا کے ساتھ مخصوص و منحصر ہونے

کے بیان پر مشتمل آیات مبارکہ میں بعض رسولوں کے استثناء کا تذکرہ ہے مثلاً:

سورہ جن، آیت ۲۷:

○ ”عَلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ۖ إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ“

(غیب کا عالم ہے، وہ اپنا غیب کسی پر ظاہر نہیں کرتا سوائے اس رسول کے کہ جسے پسند کرے)



اور نہ ہی اس بات کی نفی ہوتی ہے کہ ”رَسَا سِخُونٌ فِي الْعِلْمِ“ ہی کو مستثنیٰ قرار دیا جائے کیونکہ زیر نظر آیہ مبارکہ کہ جس میں راسخون فی العلم کا تو صبی ذکر ہوا ہے اور ان کی بعض صفات بیان کی گئی ہیں (یعنی وہ جب کسی آیت متشابہ کو دیکھتے ہیں تو اس کی بابت سکوت اختیار کر لیتے ہیں اور کوئی حقیقی رائے قائم یا ظاہر نہیں کرتے اور وہ مریض دل لوگوں کی طرح نہیں بلکہ ایمان و تسلیم کی منزل پر فائز ہیں) اور وہ آیات کہ جن میں ”رَسَا سِخُونٌ فِي الْعِلْمِ“ کے تمام یا بعض افراد کو قرآنی حقائق اور طویل آیات کا عالم قرار دیا گیا ہے، ان کے درمیان کسی طرح کا مفہومی تضاد و تناقض نہیں پائی جاتی..... یعنی وہ ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتیں، اس موضوع کی بابت تفصیلی تذکرہ بہت جلد ہوگا۔

### راسخون فی العلم کا قول

○ ”وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا“

(اور جو لوگ رَسَا سِخُونٌ فِي الْعِلْمِ ہیں وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے)

”رسوخ“ کا معنی نہایت مضبوطی اور گڑ جانا ہے۔ (کہا جاتا ہے: ”رسخ العلم فی القلب“، علم دل

میں جاگزیں ہو گیا)

اس آیہ مبارکہ میں ”رَسَا سِخُونٌ فِي الْعِلْمِ“ کو ”الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ“ (وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں کجی ہے) کے مقابل میں ذکر کیا گیا ہے اور پھر ان کی توصیف اس طرح کی گئی ہے کہ ”وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے“ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں ان کی مکمل پہچان کروائی گئی ہے کہ وہ خداوند عالم اور اس کی آیات کے بارے میں اس طرح علم و آگاہی رکھتے ہیں کہ اس سلسلہ میں انہیں کسی طرح کا شک و شبہ لاحق نہیں ہوتا، اور محکمات کے بارے میں جو علم انہیں حاصل ہے وہ پائیدار و مستحکم ہے کہ جس میں عدم استحکام و بے ثباتی اور تزلزل نہیں پایا جاتا، بلکہ وہ اس پر کامل ایمان رکھتے ہیں اور عملی طور پر اس کا اتباع کرتے ہیں اور جب ان کے سامنے کوئی متشابہ آیت آتی ہے تو اس کا تشابہ ہونا ان کے دلوں میں اضطراب و بے چینی پیدا نہیں کرتا کیونکہ وہ پختہ و پائیدار علم کے حامل ہیں اور آیات کا علم ان کے دلوں میں جاگزیں ہو چکا ہے بلکہ وہ اس پر ایمان لائے ہیں اور اعتقادی طور پر اس سے پختہ فکری وابستگی رکھتے ہیں البتہ اس کی

بابت عملی سکوت اختیار کرتے ہیں اور اس کے اتباع میں عملی اقدام سے رک جاتے ہیں۔

”رَاٰسِحُوْنَ فِي الْعِلْمِ“ کے اس قول میں کہ ”ہم اس پر ایمان لائے اور سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے“ (اَمْثَابِهٖ كَلِّمٌ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا) ان کے راسخون فی العلم ہونے کی دلیل اور نتیجہء گفتار دونوں مذکور ہیں کیونکہ محکم اور متشابہ دونوں قسم کی آیات مبارکہ کا خدا کی طرف سے نازل ہونا اس بات کا متقاضی ہے کہ سب آیات پر ایمان لایا جائے..... خواہ وہ محکم ہوں یا متشابہ، البتہ اس فرق کے ساتھ کہ محکم آیات کے مطالب کا واضح و روشن ہونا ان پر عمل کرنے اور عملی پیروی کا موجب بنتا ہے جبکہ متشابہ آیات کے معانی و مطالب کا عدم وضوح کسی عملی اقدام کا باعث نہیں ہوتا لیکن عملی اقدام سے رک جانا ان کے انکار و رد کے طور پر نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ بھی خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہوتی ہیں البتہ ان پر عمل کرنے کا عدم جواز اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے متشابہ معانی کی بناء پر محکم آیات کے منافی دکھائی دیتی ہیں جبکہ اس کے برعکس محکم آیات کا واضح و روشن بیان ان کی عملی پیروی کو لازم قرار دیتا ہے لہذا ضروری ہے کہ متشابہ آیات کے ان معانی پر عملی پیروی کی جائے جن میں محکم آیات کے معانی سے احتمالی مطابقت پائی جاتی ہو، یہ بات بعینہ متشابہ آیات کو محکم آیات کی طرف لوٹانے کی ایک صورت ہے۔ بنا بریں جملہ ”كَلِّمٌ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا“ دونوں امور کی بابت بمنزلہء دلیل کے ہے: (۱) تمام قرآن پر ایمان لانا اور محکم آیات پر عمل کرنا (۲) متشابہ آیات پر ایمان لانا اور عمل کے مرحلہ میں محکم آیات کی طرف رجوع کرنا،..... یہ دونوں مطالب، جملہ ”كَلِّمٌ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا“ سے ثابت ہوتے ہیں۔

## ایمان والوں سے خطاب

○ ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا...“

(اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو۔)

”تذکر“ سے مراد کسی چیز کی دلیل سے آگاہی پانا ہے تاکہ اس کے ذریعے مربوطہ شے کا اثبات و استنتاج ہو سکے، چونکہ جملہ ”كَلِّمٌ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا“ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے..... رَاٰسِحُوْنَ فِي الْعِلْمِ کی طرف سے استدلال کے طور پر تھا اور اس شے سے آگاہی پانے کا قطعی اظہار تھا کہ جن کا ثبوت ان کے اعمال میں پایا جاتا تھا لہذا خداوند عالم نے اسے ”تذکرہ“ سے موسوم کیا اور اس پر ان کی مدح و تعریف کی،

”الباب“ لُب (لام پر پیش اور ب پر شدہ کے ساتھ) کی جمع کا صیغہ ہے اور اس کا معنی خالص عقل ہے کہ جو وہم وغیرہ کی آمیزش سے پاک ہو، خداوند عالم نے اپنے مقدس کلام میں متعدد مقامات پر ان لوگوں کی عمدہ تعریف کی ہے جو خالص عقل رکھتے ہیں اور ان کی توصیف میں ارشاد فرمایا ہے کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی طرف خالص توجہ و التفات رکھتے ہیں اور احسن القول یعنی اچھی و عمدہ بات کی پیروی اور اس پر عمل کرتے ہیں، پھر ان کے اوصاف ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ وہ ہمیشہ اپنے پروردگار کی یاد میں رہتے ہیں، اس کے بعد ان کے بارے میں فرمایا کہ وہ ”تذکر“ والے ہیں یعنی وہ حقائق و معارف کو دلیل و برہان کے ذریعے پاتے ہیں..... دوسرے الفاظ میں یہ کہ وہ لوگ دلیل کے ذریعے حقائق تک رسائی حاصل کرتے ہیں..... اور وہ حکمت و دانائی اور معرفت کے حامل ہیں ان کی بابت ارشاد الہی ہوا:

سورہ زمر، آیت ۱۸:

○ ”وَالَّذِينَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوتَ أَنْ يَعْبُدُوهَا وَأَنَابُوا إِلَى اللَّهِ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۗ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَاُولَٰئِكَ هُمُ الْوَالِدُونَ ۗ“

(اور وہ کہ جنہوں نے طاغوت کی پرستش سے اجتناب و دوری اختیار کی اور اللہ کی طرف لوٹ آئے (صمیم قلب سے توبہ کی) ان کے لئے بشارت و خوشخبری ہے، پس ان بندوں کو خوشخبری دیجئے کہ جو ہر بات کو غور سے سنتے ہیں اور جو اچھی ہوتی ہے اس پر عمل کرتے اور اس کی پیروی کرتے ہیں کہ وہی ہیں کہ جنہیں خدا نے ہدایت کی اور وہی عقل والے ہیں) اس آیت میں ان کی طرف سے طاغوت کی پرستش سے دوری اختیار کرنے، خدا کی طرف لوٹ آنے اور ہر بات کو غور سے سن کر اس میں سے اچھی بات کو اپنالینے کا تذکرہ کر کے ان کی مدح کی گئی ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نعمت و ہدایت سے بہرہ مند اور عقل والے ہیں، ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا:

سورہ آل عمران، آیت ۱۹۱:

○ ”إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ“

(بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور گردش لیل و نہار میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں، وہ کہ جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے اور لیٹے ہوئے ہر حالت میں)

اس آیت میں ان کے دائمی ذکر اور ہر حال میں خدا کی یاد میں رہنے اور پھر خضوع و انکساری کا جو تذکرہ ہوا ہے دراصل اسی انابت یعنی خدا سے قلبی لو لگانے (اس کی طرف لوٹ آنے) سے عبارت ہے کہ جو ان کے آیات الہی کے تذکرہ اور حقائق و معارف تک رسائی کا موجب ہے، چنانچہ اس بات کا ارشادہ ایک مقام پر یوں ہوا:

سورہ غافر، آیت ۱۳:

○ ” وَمَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا مَنْ يُنِيبُ “

اور کوئی شخص تذکر حاصل نہیں کرتا سوائے اس کے کہ جو انابت کا حامل ہو (خدا کی طرف لوٹ آئے اور صمیم قلب سے اس کی طرف رجوع کر لے)

اسی کے مانند یہ الفاظ دیگر مقامات پر بھی موجود ہیں مثلاً:

سورہ بقرہ، آیت ۲۶۹، سورہ آل عمران، آیت ۷

○ ” وَمَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ “

(اور کوئی تذکر نہیں پاتا سوائے صاحبان عقل کے)

### طلب ہدایت و رحمت

○ ” رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً “

إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ “

(اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو ہدایت کرنے کے بعد ٹیڑھا نہ ہونے دے اور ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطا فرما کہ بیشک تو ہی عطا کرنے والا ہے)

یہ دعا ان لوگوں کے رسوخ فی العلم (علم و آگاہی کی گہرائی اور کمال) کی واضح نشانی اور روشن علامت ہے کیونکہ ان حضرات نے جب اپنے پروردگار کے بلند و بالا مقام و مرتبہ سے آگاہی و معرفت حاصل کر لی اور خدا کی ذات اقدس کا جمال اپنی چشم عقل سے دیکھ لیا تو انہیں اس امر پر یقین حاصل ہو گیا کہ ہر طرح کی مالکیت و اقتدار صرف اور صرف خدائے یکتا کو حاصل ہے اور یہ کہ وہ خود اپنے لئے کسی بھی چیز کے مالک نہیں ہیں، وہ اپنے اس ایمانی مقام و منزلت پر کسی طرح سے آنچ آنے کو گورا نہیں کر سکتے لہذا اس امکان کو خاطر میں لا کر کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ علم کی اس بلندی پر فائز ہونے کے بعد ان کے دلوں میں کجی راہ پالے وہ خدا کی پناہ کے طلبگار ہوتے ہیں اور اپنے پروردگار سے یہ التماس و التجا کرتے ہیں کہ ہدایت سے بہرہ مند ہونے کے بعد ان کے دلوں میں کجی نہ آنے پائے

اور خدا انہیں اپنی طرف سے خاص رحمت سے نوازے تاکہ ان کی حاصل شدہ نعمت کو بھائل جائے اور ہدایت کی راہ پر چلنے اور قرب خداوندی کی اعلیٰ ترین منزلوں کو طے کرنے میں ان کی مدد ہو۔

## ایک سوال اور اس کا جواب

اس مقام پر ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ سوال آئے کہ جب انہوں نے یہ دعا کر لی تھی کہ خدایا، ان کے دلوں کو کچی سے بچانا، تو اس کے بعد اس دعا کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ انہیں رحمت خاص سے نوازے!

اس کا جواب یہ ہے کہ دلوں کا کچی سے محفوظ ہونا، ”رَأْسِخُونَ فِي الْعِلْمِ“ ہونے کی صفت پر باقی رہنے کا لازمی سبب نہیں ہے کیونکہ عین ممکن ہے کہ ان کے دلوں میں کوئی کچی پیدا نہ ہو جبکہ علم کی دولت سلب ہو جائے، جس کے نتیجے میں ان کی قدر و منزلت اور ان کی حیثیت و شخصیت چمنا چور ہو جائے، یعنی وہ نہ تو علم کی بناء پر سعادت سے بہرہ مند ہوں اور نہ ہی دلوں کی کچی کی بناء پر شقاوت و بدبختی سے دوچار ہوں بلکہ جہالت و بیچارگی کا شکار ہو جائیں حالانکہ انہیں علم کی اشد ضرورت ہوتی ہے، اس کے باوجود ان کی ضرورت کا سفر جاری و ساری رہتا ہے بلکہ وہ جس راہ پر گامزن ہوتے ہیں اس میں انہیں گونا گوں رحمتیں درکار ہوتی ہیں، ایسی رحمتیں کہ جن کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں اور نہ ہی اس کے علاوہ کوئی شخص ان کو شمار کر سکتا ہے البتہ وہ خود اپنی اس ضرورت کا شعور و احساس رکھتے ہیں اور وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ان کو ”راخ فی العلم“ ہونے کی جو صفت حاصل ہے اس کی بقا کے اسباب خداوند عالم کے دست قدرت میں ہیں چنانچہ اس کا ثبوت ان کے بیان کے ذیلی جملہ میں موجود ہے جس میں انہوں نے بارگاہ احدیت میں عرض کیا: ”رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ أَرَىٰ فِيهِ“ (اے ہمارے پروردگار، بے شک تو ہی لوگوں کو اس دن جمع کرنے والا ہے کہ جس میں کسی طرح کا شک نہیں)،

بنابراین ان کا یہ دعا مانگنا کہ ”رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا“ (اے ہمارے رب! ہمیں ہدایت کرنے کے بعد تو ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر،) درحقیقت ان کی طرف سے اپنے آپ کو خدا کی پناہ میں دے کر اس بات کا طلب کرنا ہے کہ ان کے دلوں میں کچی نہ آنے پائے اور وہ راخ فی العلم ہونے کے جس مقام پر فائز ہیں وہ ان کے ہاتھ سے نہ جائے، اور ان کا یہ دعا مانگنا کہ ”وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ“ (اور ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطا فرما، کہ بے شک تو ہی عطا کرنے والے ہے)، ابر رحمت سے طلب باران کرنے کی ایک صورت ہے تاکہ اس کے ذریعے ان کے دلوں کی حیات کو دوام حاصل ہو جائے، اس جملہ (وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً) میں لفظ ”رحمة“ نکرہ کی صورت

میں ذکر کیا گیا ہے (یعنی الف ولام کے بغیر..... الرحمة کے بجائے..... ”رحمة“ کہا گیا ہے) اور اس کے سرچشمہ فیض کا ذکر بھی اس کے ساتھ اس طرح کیا گیا ہے ”مِنْ لَدُنْكَ“ (اپنی طرف سے) تو یہ ان کی طرف سے مطلوبہ رحمت کی کیفیت سے نا آگاہی کے اظہار کے ساتھ ساتھ اس بات کا بیان بھی ہے کہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اگر ان کے پروردگار کی طرف سے خاص رحمت ان کے شامل حال نہ ہو اور اس رحمت کا سرچشمہ صرف اور صرف خدا کی ذات اقدس نہ ہو تو ان کی کسی ضرورت کی تکمیل نہ ہوگی اور نہ ہی ان کے کسی بھی مربوط امر کے پورا ہونے کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکے گا۔

بہر حال ان کا صرف اور صرف خدا کی پناہ طلب کرنا اور صرف اسی سے خاص رحمت کی استدعا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ہر چیز کی مالکیت کو خدا سے مخصوص و مختص سمجھتے ہیں اور اسے ہی ہر شے کا علی الاطلاق مالک مانتے ہیں اور اس حوالہ سے ظاہری اسباب کو درخور اتنا قرار نہیں دیتے۔

## قیامت کے دن کی حضوری

○ ”رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ أَلِيمٍ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخَلِّفُ فِي عِقَادٍ“  
(اے ہمارے پالنے والے یقیناً تو ہی لوگوں کو اس دن اکٹھا کرنے والا ہے جس میں کوئی شک نہیں، یقیناً اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا)

یہ جملہ ”رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ أَلِيمٍ“ کی طرف سے طلب رحمت کی وجہ کے بیان کے طور پر ہے کہ وہ خداوند عالم سے ”وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً“ (اور ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطا فرما) کے الفاظ میں اس لئے رحمت کی استدعا کرتے ہیں کہ انہیں اس بات کا علم ہے کہ نظام خلقت و تبلیغ دین اور انسان کا اپنی وجودی توانائیوں کو بروئے کار لانا سب کچھ قیامت کے دن بارگاہِ خداوندی میں پیش ہونے کا پیش خیمہ ہے، وہ دن کہ جب رحمت خداوندی کے علاوہ نہ تو کوئی چیز فائدہ مند و کافی ثابت ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کے بغیر کسی کی مدد ممکن ہوگی جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ دخان، آیت ۴۲:

○ ”إِنَّ يَوْمَ الْفُصْلِ مِيقَاتُهُمْ أَجْمَعِينَ ۗ لِيَوْمٍ لَا يُغْنِي مَوْلًى عَنْ مَوْلَى شَيْءٍ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ۗ“

إِلَّا مَنْ تَرَ حَمَلًا لِلَّهِ“

(بے شک قیامت کا دن، جو کہ حق و باطل کے درمیان جدائی و فاصلہ (فیصلہ) کا دن ہے تمام لوگ اس دن جمع ہوں گے، اس دن کوئی دوست کسی دوست کے کام نہ آئے گا اور نہ ہی کسی کی مدد ہوگی سوائے ان لوگوں کے کہ رحمت خداوندی جن کے شامل حال ہو جائے)

اسی وجہ سے راسخون فی العلم نے رحمت خداوندی کی درخواست کی اور اس کی نوعیت و کیفیت کا تعین خدا کے سپرد کر دیا تاکہ وہ انہیں ایسی رحمت عطا فرمائے کہ جو ان کے لئے فائدہ بخش ہو اور ان کے مربوطہ امور میں کفایت کرے۔

اور ”رَأْسُخُونَ فِي الْعِلْمِ“ نے اپنی دعا میں اس دن کی توصیف ان لفظوں میں کی کہ وہ دن ایسا ہے کہ جس کی بابت کوئی شک نہیں پایا جاتا (لَيْسَ وَرَآئِهِ رَيْبٌ فَيُبَيِّنُ) تاکہ اپنی دعا و طلب کی بابت اپنے قلبی جذبات و تائیدی رجحانات کو آشکار کر سکیں، اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے جملہ ”إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْوَعْدَ“ کے ذریعے بھی اپنے احساسات اور روز قیامت کی توصیف کے مخصوص انداز کی بنیادی وجہ کو بیان کیا کیونکہ وہ حضرات، علم میں رسوخ کے حامل ہیں اور کسی چیز کی بابت علم و آگاہی کی گہرائیوں سے آشنا ہونا اور اس کی کامل تصدیق اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اس کی نتیجہ بخش بنیادی علت و سبب کا علم حاصل نہ ہو اور ان کا قیامت کے دن کی بابت کسی طرح کے شک و شبہ کا شکار نہ ہونا اس بناء پر ہے کہ خداوند عالم نے اس کے وجود پذیر ہونے کا وعدہ کیا ہے..... اور خدا اپنے وعدوں کی خلاف ورزی نہیں کرتا..... لہذا ان حضرات نے جب ”لَيْسَ وَرَآئِهِ رَيْبٌ فَيُبَيِّنُ“ کہا تو اس کے فوراً بعد یہ الفاظ ورد زبان کئے: ”إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْوَعْدَ“ (بے شک خدا، اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا)، ان کا اس طرح اظہار اور قیامت کے دن کی ”لَا رَيْبَ فِيهِ“ سے توصیف کرنا خدا کے وعدہ حق کی بناء پر ہے کیونکہ خدا نے اس دن کے بارے میں وعدہ کیا ہے اور وہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی ہرگز نہیں کرتا.....، لیکن یہ صورت و انداز ان کے پہلے دعائیہ جملے میں پایا جاتا ہے کہ جب انہوں نے کہا: ”وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً“ (اور ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطا فرما) تو فوراً اس کے بعد اس طرح طلب رحمت کی وجہ بیان کی کہ ”إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ“ (بھئی تو ہی عطا کرنے والا)، یعنی ان کے طلب رحمت کرنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ خدا ہی عطا کرنے والا ہے۔

سورہ آل عمران آیت ۷ تا ۹

ایک نہایت لطیف ادبی نکتہ

یہاں ایک نہایت لطیف ادبی نکتہ ملحوظ ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے ”إِنَّكَ“ (بے شک تو) کے بعد ”أَنْتَ“ (تو) کا

لفظ ذکر کیا ہے اور ”اِنَّ“ کی خبر ”وَهَابٌ“ پر الف و لام لگا کر ”اِنَّوَهَابٌ“ اسے معارفہ بنا دیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے قول ”مِنْ لَّدُنْكَ“ (تو اپنی طرف سے) کا بنیادی سبب بیان کرنا چاہتے ہیں اور یہ کہنا چاہتے ہیں کہ رحمت کا عطا کرنا خدا ہی سے مخصوص ہے یعنی عطائے رحمت کی صفت اسی سے مختص ہے..... تیرے سوا کوئی بھی رحمت عطا نہیں کر سکتا.....، اسی کی مانند ان کی دعا ”رَبَّنَا لَا تُزِمْ قُلُوبَنَا“ میں بھی یہی انداز کہ انہوں نے دلوں کے ٹیڑھا ہونے سے بچنے کی دعا کے بعد یہ الفاظ کہے: ”بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا“ (اس کے بعد کہ تو نے ہماری ہدایت فرمائی ہے) گویا وہ کہنا چاہتے ہیں کہ تجھ سے دلوں کے ٹیڑھا نہ کئے جانے کی دعا اس بناء پر کر رہے ہیں کہ تو نے ہمیں ہدایت کی نعمت سے نوازا ہے، بنا برائیں ان کی اس دعا کہ اے ہمارے رب! تو ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر، اس سبب سے ہے کہ خدا ہی نے ان کے دلوں کو ہدایت عطا کی ہے، لہذا انہوں نے کہا کہ تو نے ہی تو ہمیں ہدایت عطا فرمائی ہے! اسی طرح جملہ ”اٰمَنَّا بِهٖ“ (ہم اس..... قرآن..... پر ایمان لائے ہیں) کے بعد ان کا یہ الفاظ کہنا ”كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا“ (سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے) بھی قرآن پر ایمان لانے کی وجہ و بنیادی سبب کو بیان کرنے کے طور پر ہے،

بہر حال ”رَبَّنَا اسْخُونِ فِي الْعِلْمِ“ وہ افراد ہیں کہ جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے اور اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے تو خداوند عالم نے انہیں ہدایت کی نعمت سے نوازا اور ان کی عقلوں کو کمال بخشا، جس کے نتیجے میں وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ صرف علم کی بنا پر کہتے ہیں، علم کے بغیر کوئی بات نہیں کرتے اور نہ ہی کوئی کام بغیر علم کے کرتے ہیں، ان کا قول و فعل علم پر مبنی ہوتا ہے، اسی وجہ سے خداوند عالم نے انہیں ”رَبَّنَا اسْخُونِ فِي الْعِلْمِ“ سے موسوم کیا ہے اور انہیں ”اُولُو الْاَلْبَابِ“ کی کنیت عطا فرمائی ہے۔

اگر آپ اس امر پر غور کریں کہ خداوند عالم نے کس طرح اولوالالباب کی توصیف فرمائی ہے تو آپ کو بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ جو صفات خداوند عالم نے ان کے بارے میں ان آیات مبارکہ میں ذکر کی ہیں وہ سب ان پر پوری طرح منطبق ہوتی ہیں اور وہی حضرات ہیں جن کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا:

سورہ زمر، آیت ۱۷-۱۸:

○ ”وَالَّذِينَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوتَ اَنْ يَّعْبُدُوهَا وَاَنْ يَّبْزُوا اِلَى اللّٰهِ لِيُنشِئَهُمْ فِىْ نَجْوٰى رَبِّهِمْ يَنْسِفُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ اَحْسَنَهُ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰى اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْاُولُو الْاَلْبَابِ ﴿۱۷﴾“  
(وہ طاغوت کی پرستش سے دوری اختیار کرتے ہیں اور اللہ کی طرف ہی کابل رجوع و توجہ کرتے ہیں، انہی کے لئے خوشخبری ہے۔ تو میرے ان بندوں کو بشارت دیجئے کہ جو ہر بات کو غور سے سنتے ہیں اور جو اچھی بات ہو اس پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں وہی ہیں کہ اللہ نے جن کو ہدایت کی نعمت عطا کی اور وہی عقل والے ہیں) تو اس طرح خداوند عالم نے ان کی یہ صفات



بیان فرمائی ہیں: ایمان، اچھی بات کی پیروی کرنا، خدا کی طرف کامل توجہ و رجوع کرنا، خداوند عالم نے زیر بحث آیات مبارکہ میں یہی صفات ”رَسَا سَخُوْنَ فِي الْعِلْمِ“ کے بارے میں بیان فرمائی ہیں۔

## ایک ادبی سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک ادبی سوال ممکن ہے اور وہ یہ کہ ”رَسَا سَخُوْنَ فِي الْعِلْمِ“ نے اپنے بیانات میں پہلے جو انداز سخن اپنایا وہ مخاطب کا تھا مگر بعد والے جملہ میں غائب کے صیغہ کے ساتھ بات کی، اور وہ اس طرح کہ پہلے یہ الفاظ کہے: اے ہمارے پروردگار! تو ہی تمام لوگوں کو اس دن جمع کرنے والا ہے کہ جس میں کوئی شک نہیں پایا جاتا (رَسَا سَخُوْنَا اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ الْوَيْعَادَ)، اس میں مخاطب قرار دے کے بات کی، اس کے بعد یوں کہا: یقیناً خدا اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا (اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ الْوَيْعَادَ) اس میں مخاطب کی بجائے غائب کا صیغہ استعمال کیا، اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ وعدہ آخرت، راتخین فی العلم کے لئے مخصوص نہیں بلکہ ان کے لئے اور دیگر تمام افراد بشر کے لئے عمومیت اور وسعت کا حامل ہے لہذا اس مقام پر یہی موزوں تھا کہ ”رَسَا سَخُوْنَا“ کی بجائے لفظ ”اللّٰه“ ذکر کریں کیونکہ الوہیت ہر شے پر حاوی، قائم، محیط اور وسعت رکھتی ہے..... اسے نہ تو زمانی، نہ مکانی اور نہ ہی افرادی محدودیت کا شکار کیا جاسکتا ہے بلکہ خداوند عالم کی خدائی کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ کائنات کی ہر چیز اس میں شامل ہے، کوئی چیز اس سے باہر نہیں، اس لئے اسے راسخون فی العلم یا کسی خاص طبقہ کے ساتھ مخصوص قرار نہیں دیا جاسکتا، اسی نکتہ کے پیش نظر راسخون فی العلم نے اپنی خاص دعائیں کرنے کے بعد قیامت کے دن کے تذکرہ کے ذیل میں ”اے ہمارے رب“ کے الفاظ کی بجائے ”اللّٰه“ کا لفظ ذکر کیا تاکہ عقیدہ الوہیت کی حقیقی اساس پر ایمان کا اظہار ہو سکے۔

## محکم، متشابہ اور تائویل کی بابت تفصیلی بحث

محکم، متشابہ اور تائویل کی بابت جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے وہ کلام الہی میں غور و فکر کرنے کا نتیجہ اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی روایات سے حاصل ہونے والے مطالب کا خلاصہ ہے، اس سلسلہ میں ”روایات پر ایک نظر“ کے عنوان سے ذکر کئے

جانے والے مطالب میں عنقریب مزید تذکرہ ہوگا، لیکن اہل تفسیر حضرات اس بحث میں سخت اختلاف رائے رکھتے ہیں اور ان کی آراء کا اختلاف اس قدر وسیع و شدید ہوا کہ ان کے درمیان انحرافی نظریات پیدا ہو گئے اور وہ حقیقت الامر سے کوسوں دور ہو گئے، مفسرین کے درمیان پائے جانے والے اس اختلاف رائے کی چھان بین اور تحقیق عمیق کریں تو اس کا سلسلہ صدر اسلام کے ان مفسرین سے ملتا ہے جو صحابہ و تابعین میں سے تھے اور ان کے بیانات میں سے جو کچھ ہم تک پہنچا ہے وہ ہمارے مذکورہ مطالب سے کامل طور پر بجائے خود جزوی طور پر بھی بہت کم مطابقت رکھتا ہے، ان حضرات کے درمیان اس قدر شدید اختلاف آراء اور پھر انحرافی نظریات کے جنم لینے کا اصل سبب یہ ہے کہ محکم و متشابہ اور تاویل کے معنی کی بحث میں خلط ملط ہو گیا جس کے نتیجے میں اصل مسئلہ کی صورت نگری سمیت بحث کی کیفیت اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج کی بابت غیر معمولی و عجیب اختلاف پیدا ہو گیا، بنا براین ہم یہاں چند فصول کے ذیل میں اصل مسئلہ کی مربوط جہتوں اور موضوع کے متعلقہ پہلوؤں پر تفصیلی طور پر روشنی ڈالتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہو اس سلسلے میں سے ذکر کئے جانے والے اقوال و آراء اور دلائل کو ذکر کر کے اپنی تحقیقی رائے پیش کریں گے۔

### ۱۔ محکم اور متشابہ

”احکام“ (الف کے نیچے زیر کے ساتھ، باب افعال)..... کہ جس سے صیغہ اسم مفعول ”محکم“ (کاف پر زیر کے ساتھ) بنا ہے اور ”متشابہ“ (باب تفاعل)..... کہ جس سے اسم فاعل ”متشابہ“ ہے..... دونوں الفاظ کے لغوی معانی واضح و آشکار ہیں اور قرآن مجید میں ان کا استعمال یوں ہوا کہ خداوند عالم نے اسی کو (قرآن کو) ان دو سے متصف کیا ہے چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہ ہود، آیت ۱:

○ ”كِتَابٌ اُحْكِمَتِ الْاٰیٰتُ“

(کتاب، کہ جس کی آیات کو محکم کر دیا گیا ہے)

سورہ زمر، آیت ۲۳:

○ ”كِتَابًا مَّتَشَابِهًا مَّثَانِي“

(کتاب، کہ جو متشابہ اور دہرائی جانے والی ہے)

ان آیتوں میں واضح طور پر پوری کتاب کو ان دو صفتوں سے متصف کیا گیا ہے تو اب دیکھنا یہ ہے کہ ان سے مراد کیا

ہے؟ احکام، سے مراد یہ ہے کہ اس کی آیات مخصوص ترتیب و بیان کی پختگی کی حامل ہیں اور ”تشابہ“ سے مراد یہ ہے کہ ادائے معنی و بیان مقصود میں پختگی و مضبوطی کے حوالہ سے ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہے، البتہ جو اہم مطلب قابل توجہ ہے وہ یہ کہ مذکورہ بالا دو آیتوں میں ”محکم“ اور ”تشابہ“ ہونے کی نسبت پورے قرآن مجید کی طرف دی گئی ہے جبکہ یہاں زیر بحث آیہ مبارکہ میں خداوند عالم نے اس کی آیات کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا ہے: ”هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ“ (اللہ ہی ہے کہ جس نے آپ پر کتاب نازل کی ہے کہ جس کی بعض آیات محکم ہیں جو کہ اصل کتاب میں اور بعض تشابہ ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت میں ”محکم“ اور ”تشابہ“ کا جو معنی مراد ہے وہ مذکورہ دو آیتوں میں کہ جن میں پوری کتاب کو ”محکم“ و ”تشابہ“ کہا گیا ہے، سے مختلف ہے، لہذا ضروری ہے کہ ان دونوں (محکم اور تشابہ) کے معانی پر بحث کی جائے اور آیات مبارکہ میں سے ان کے مصداق کا تشخص و تعین کرتے ہوئے یہ دیکھا جائے کہ کونسی آیت محکم اور کونسی تشابہ ہے؟

”محکم“ اور ”تشابہ“ کے معانی کی بابت دس سے زیادہ اقوال پائے جاتے ہیں، ذیل میں ان کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہیں:

### پہلا قول:

آیات محکمات سے مراد سورۃ النعام کی وہ چند آیات مبارکہ ہیں جن میں یوں ارشاد الہی ہوا:

○ ”قُلْ نَعَالُوا أَسْلُ مَا حَرَّمَ رَبِّي عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۖ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِمَّنْ إِمْلَاقٍ ۖ نَحْنُ نَرِزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ۖ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَّنَ ۖ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۖ ذَلِكُمْ وَصَّكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۗ وَلَا تَقْرَبُوا أَمْوَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۖ وَأَوْفُوا بِالْعَيْلِ وَالْيَتِيمَانَ بِالْقِسْطِ ۖ لَا تَكْفُفْ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۖ وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۖ وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا ۖ ذَلِكُمْ وَصَّكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۗ وَإِنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ فَاتَّبِعُوهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ۖ ذَلِكُمْ وَصَّكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۗ“

(کہہ دیجئے کہ آؤ، میں تمہارے سامنے اس حکم کو پڑھوں جس میں تمہارے رب نے تم پر کوئی چیز حرام قرار دی ہے (شرک) اور وہ یہ ہے کہ تم اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار نہ دو، ○ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اپنی اولاد کو نفرت کے خوف میں قتل نہ کرو، ہم تمہیں رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی رزق دیتے ہیں، اور تم کسی برائی کے نزدیک نہ جاؤ خواہ وہ ظاہری ہو

یا باطنی، اور تم اس جان کو قتل نہ کرو کہ جسے خدا نے حرمت کا حامل قرار دیا ہے سوائے استحقاق کے، یہ وہ حکم ہے جس کی خدا نے تمہیں سخت تاکید کی ہے تاکہ تم قوتِ عقل سے کام لے سکو (اور اس حکم پر عمل کر سکو) O اور یتیم کے مال کے نزدیک نہ جانا مگر احسن طور سے، یہاں تک کہ وہ سوچ بوجھ کی عمر تک پہنچ جائے، اور تم ناپ تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو، ہم کسی بندے کو اس کی طاقت سے زیادہ کوئی ذمہ داری نہیں سونپتے، اور تم جب کوئی بات کرو تو عدل کے ساتھ کرو خواہ کسی قرابتدار کے بارے میں کیوں نہ ہو، اور اللہ سے کئے ہوئے وعدہ کو پورا کرو، یہ وہ حکم ہے جس کی بابت خدا تمہیں تاکید کرتا ہے تاکہ تم اسے یاد رکھو (اور زندگی میں اسے عملی جامہ پہناؤ) O اور یہ ہی میرا سیدھا راستہ ہے تم اس پر گامزن ہو جاؤ (اس حکم کی پیروی کرو) اور دیگر راستوں کی پیروی نہ کرو ورنہ وہ تمہیں خدا کی راہ سے ہٹادیں گے، یہی وہ حکم ہے جس کی وہ تمہیں تاکید کرتا ہے تاکہ متقی بن جاؤ O

اور آیات متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جن کی بابت یہودیوں کو شبہ لاحق ہوا اور وہ حروف مقطعه ہیں جو چند سورتوں کے اوائل میں ذکر ہوئے ہیں مثلاً آلم، تم، آلر وغیرہ، یہودیوں نے جملوں کے حوالہ سے ان حروف کی تاویلیں کیں اور اس بناء پر امت مسلمہ کی زندگی کے دن گنتا چاہے، مگر ان کے محاسبات درست ثابت نہ ہوئے اور وہ غلط اندازوں کے نتیجہ میں شبہ کا شکار ہو گئے۔

اس قول کی نسبت صحابہ کرام میں سے صرف ابن عباس کی طرف دی گئی ہے۔

جواب:

یہ ادعاء بلا دلیل ہے اور اگر اسے مقرون بہ صحت تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی محکم اور متشابہ کا انہی دونوں میں منحصر و محدود ہونا ثابت نہیں ہوتا اور اس کے علاوہ یہ کہ اس سے یہ بات لازم آئے گی کہ محکم اور متشابہ کے علاوہ تیسری قسم کو تسلیم کرنا پڑے گا جبکہ ظاہر آیات سے کسی بھی تیسری قسم کے وجود کی نفی ہوتی ہے۔

البتہ حق بات یہ ہے کہ اس طرح کے قول کی نسبت جناب ابن عباس کی طرف درست نہیں اور ان کی علمی شخصیت کے منافی ہے، جو بات ان کی طرف سے منقول ہے وہ یہ کہ انہوں نے کہا ہے کہ یہ تین آیات، محکمات میں سے ہیں نہ یہ کہ صرف یہی تین محکمات ہیں چنانچہ اصل روایت یوں ہے کہ تفسیر ”درمنثور“ میں مذکور ہے کہ سعید بن منصور، ابن ابی حاتم، حاکم (انہوں نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے) اور ابن مردویہ نے عبد اللہ بن قیس سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا میں نے ابن عباس سے سنا ہے انہوں نے آیہ مبارکہ ”وَمِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ“ کی تفسیر میں کہا کہ سورہ انعام کی تین آیتیں کہ جن کی ابتداء ”فُلٌ تَعَالٰوْا“ کے الفاظ سے ہوتی ہے اور اس کے بعد والی دو آیتیں، محکمات میں سے ہیں۔

اس حدیث کی تائید و تصدیق جناب ابن عباس ہی سے مروی اس بیان سے ہوتی ہے جو اسی آیت مبارکہ

(وَمِنْهُ آيَةٌ مُّحْكَمَتٌ) کی تفسیر میں مذکور ہے کہ انہوں نے کہا: انہی آیات میں سے ”قُلْ تَعَالَوْا.....“ سے ”لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ“ (سورہ انعام) تک تین آیتیں، اور ”وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَمْرًا أَن لَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ.....“ سے ”كَانَ لِلرَّابِعِينَ غَفُورًا“ تک تین آیتیں (سورہ اعراف) بھی ہیں۔

ان دو روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ جناب ابن عباس نے جن آیات کو ذکر کیا ہے وہ آیات حکمت ہیں چند مثالوں کے طور پر ہے نہ یہ کہ صرف یہی آیتیں حکمت سے ہیں اور ان کے علاوہ کوئی نہیں، یعنی ابن عباس کا بیان بطور مثال تھا نہ کہ حکمت کی تحدید کے طور پر!

### دوسرا قول:

یہ پہلے قول کے برعکس ہے اور وہ یہ کہ جو حروف مقطعات سورتوں کی ابتداء میں ذکر ہوئے ہیں وہ آیات حکمت ہیں اور ان کے علاوہ دیگر تمام آیات تشابہات ہیں، اس قول کی نسبت ابی فاختر کی طرف دی گئی ہے کہ انہوں نے ”هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ“ کی تفسیر میں کہا کہ ”أُمُّ الْكِتَابِ“ سے مراد سورتوں کے ابتدائی حروف ہیں کہ جن کے ذریعے قرآن ماخوذ ہے (جن کے ذریعے قرآن تک پہنچنے کی راہ نکلتی ہے) مثلاً سورہ بقرہ، الْحَمْدُ ذٰلِكَ الْكِتَابُ سے اور سورہ آل عمران اَللّٰهُمَّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ سے استخراج ہوا ہے،

سعد بن جبیر سے منقول ہے کہ انہوں نے بھی ”ام الكتاب“ سے اسی طرح کا معنی مراد لیا ہے اور کہا ہے کہ یہی حروف مقطعات اصل کتاب ہے کیونکہ وہ سب کے سب پورے قرآن میں مرقوم ہیں، مذکورہ بالا دونوں روایتوں سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ ابی فاختر اور سعید بن جبیر کا حروف مقطعات کے بارے میں نظریہ یہ ہے کہ ان سے مراد الفاظ حروف ہیں اور وہ اس طرح کہ خداوند عالم نے جو کتاب تم پر نازل کی ہے وہ یہی حروف مقطعات ہیں کہ جن سے کلمات اور جملے بنتے ہیں، (اس حوالہ سے یہی حروف اصل الكتاب ہے اور انہی سے آیات کی ترکیب ہوتی ہے)

### جواب:

پہلی بات تو یہ ہے کہ حروف مقطعات کے بارے میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے وہ دعویٰ بلا دلیل ہے اور اس کی صحت پر کوئی ثبوت موجود نہیں، اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ یہ نظریہ، آیہ مبارکہ سے مطابقت ہی نہیں رکھتا کیونکہ اس سے یہ بات لازم آئے گی کہ ان حروف مقطعات کے علاوہ باقی پورا قرآن تشابہ ہو، حالانکہ اسی آیہ مبارکہ ”مِنْهُ آيَةٌ مُّحْكَمَتٌ هُنَّ أُمُّ“

الکِتَابِ.....“ میں خداوند عالم نے تشابہات کی پیروی کرنے کی مذمت کی ہے اور اسے دلوں کے ٹیڑھے پن سے تعبیر فرمایا ہے جبکہ اس کے ساتھ ساتھ اتباع القرآن کی مدح و ستائش کرتے ہوئے اسے اوجب الواجبات (سب سے بڑا واجب العمل امر) قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۃ اعراف، آیت ۱۵۷:

○ ”وَاتَّبِعُوا التَّوْرَةَ الَّتِي أَنْزَلْنَا مَعَهُ“

(اور انہوں نے پیروی کی اس نور کی جو اس (رسول) کے ساتھ نازل کیا گیا ہے)

اس کے علاوہ دیگر آیات مبارکہ میں بھی اسی مطلب کو بیان کیا گیا ہے کہ قرآن کا اتباع کریں،..... اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر حروف مقطعات ہی کو اصل الکتاب اور محکمات قرار دیا جائے تو باقی پورا قرآن تشابہات کا مصداق ہوگا کہ جس کی پیروی نہ کرنے کا حکم ہے، لہذا یہ قول درست نہیں.....

### تیسرا قول:

”تشابہ“ آیت سے مراد وہی ہے جسے مجمل کہا جاتا ہے (یعنی جس کا معنی واضح نہ ہو) اور ”محکم“ سے مراد مبین ہے (جس کا معنی واضح و آشکار ہے)

جواب:

یہ قول صحیح نہیں کیونکہ آیت مبارکہ میں تشابہ اور محکم کی جو صفات و خصوصیات ذکر کی گئی ہیں وہ ”مجمل“ اور ”مبین“ پر منطبق نہیں ہوتیں۔

اس کی وضاحت یوں ہے کہ کسی لفظ کے مجمل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کیفیت میں ہو کہ اس کے معنی کے بعض پہلو دوسرے بعض پہلوؤں سے اس طرح مخلوط ہو جائیں کہ اس سے اصل مراد واضح نہ ہو سکے اور سننے والے یا اس کے مخاطب کو کلام کرنے والے کے حقیقی مقصد سے آگاہی حاصل نہ ہو سکے، اسی لئے اہل زبان حضرات کے ہاں تفہیم و تفہیم کے اصول و آداب اس طرح قرار پائے ہیں کہ مجمل الفاظ کے استعمال سے اجتناب کیا جائے اور غیر واضح المعنی لفظوں کو کلام میں شامل نہ کیا جائے بلکہ اس طرح کے الفاظ کو بے معنی قرار دے دیا جائے اور اگر اس طرح کے الفاظ کلام میں آجائیں تو ان کے ساتھ مبین الفاظ کی طرف رجوع کر کے ان کے معانی سے آگاہی حاصل کی جائے اور پھر اس کا اتباع کیا جائے، کیونکہ مجمل کے معنی کا تعین مبین کے ذریعے ہونے کے بعد مجمل بھی مبین کی طرح ہو جائے گا اس صورت میں اصل اتباع مجمل کا ہوا، بنا بریں اگر محکم و تشابہ کو بھی یعنی مجمل و مبین کی طرح قرار دیں تو اس صورت میں اصل اتباع تشابہ کا ہوگا یعنی اس کے معنی کو

سمجھنے کے لئے محکم کی طرف رجوع کر کے اس کی پیروی کی جائے گی تو وہ محکم کی پیروی ہوگی بلکہ محکم کے ذریعے معنی کی آگاہی حاصل ہونے کے بعد تشابہ کا اتباع ہوگا اور اس طرح کے اتباع کو طبع تکلم و مزاج تقاہم سے ہم رنگی حاصل نہ ہوگی اور اصول البیان میں اس طرح کے اتباع کو رد نہیں سمجھا جاتا لہذا کوئی اہل زبان خواہ وہ بیمار دل ہو یا راخون فی العلم میں سے ہو اس طرح کے اتباع و استعمال کا اقدام نہیں کرتا کہ نتیجتاً تشابہ کا اتباع باعث مذمت اور زلیغ القلب کا موجب نہ رہے گا..... جبکہ قرآن مجید میں تشابہ کے اتباع کو مورد مذمت قرار دیا گیا ہے اور اسے بیماری دل کا سبب و موجب بتایا گیا ہے۔

### چوتھا قول:

متشابہات سے مراد، وہ آیات ہیں جو منسوخ ہو چکی ہیں کہ جن پر ایمان لانا ضروری ہے مگر ان پر عمل نہیں کی جاسکتا اور حکمت سے مراد وہ آیات ہیں جو ناسخ کہلاتی ہیں کہ جن پر ایمان لانا اور عمل کرنا دونوں ضروری ہیں، اس قول کی نسبت ابن عباس، ابن مسعود اور چند صحابہ کی طرف دی گئی ہے، اسی وجہ سے ابن عباس اپنے آپ کو تائیل القرآن کا عالم سمجھتے تھے۔

### جواب:

اگر بالفرض اس قول کو درست تسلیم کر لیا جائے تو اس سے یہ ثبوت ہرگز نہیں ملتا کہ آیات متشابہات صرف منسوخ شدہ آیات ہی ہیں کیونکہ خداوند عالم نے زیر نظر آیہ مبارکہ میں اتباع المتشابہ کو فتنہ پروری و تائیل جوئی قرار دیا ہے جو کہ کثیر غیر منسوخ آیات مثلاً صفات و افعال خدا کے بیان پر مشتمل آیات میں بھی موجود ہے۔ کہ ان کا اتباع بھی فتنہ و تائیل پر دازی قرار دیا جاتا ہے جبکہ وہ آیات منسوخ نہیں ہوئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر اس قول کو درست قرار دیا جائے تو اس سے یہ بات لازم آئے گی کہ آیات کو محکم اور تشابہ کے علاوہ کوئی تیسرا عنوان بھی حاصل ہو جو کہ محکم و تشابہ کی درمیانی قسم قرار پائے۔ حالانکہ قرآن مجید میں واضح طور پر ارشاد ہوا ہے کہ ”مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتَابِ وَاُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ“

جہاں تک ابن عباس کے نظریہ کا تعلق ہے تو جو بات ان سے منسوب ہے اور محکم و تشابہ کی بابت ان کا نقطہ نظر ذکر کیا گیا ہے وہ ناسخ و منسوخ سمیت زیادہ وسیع معنی کا حامل ہے اور انہوں نے ناسخ و منسوخ کا ذکر بطور مثال کیا ہے نہ یہ کہ ان کی مراد محکم و تشابہ کے مصداق کا تعین تھا، چنانچہ ان کے حوالہ سے تفسیر ”درمنثور“ میں اس طرح مذکور ہے کہ ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم نے حضرت علیؓ کے حوالہ سے ابن عباس کا قول بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حکمت سے مراد قرآن کی ناسخ آیات اور حلال و حرام و حدود و فرائض پر مشتمل آیات اور وہ سب آیات ہیں کہ جن پر ایمان لانا ضروری ہے، جبکہ متشابہات سے منسوخ شدہ آیات، مقدم و مؤخر، امثال و اقسام اور وہ آیات مراد ہیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے مگر ان پر عمل نہیں کیا جا

سکتا (منسوخ شدہ)

### پانچواں قول:

محکمات سے وہ آیات مراد ہیں کہ جن کے معانی و مطالب پر واضح و روشن عقلی دلائل موجود ہیں مثلاً وحدانیت، قدرت و حکمت خداوندی کی دلیلیں، اور تشابہات سے وہ آیات مراد ہیں کہ جن کے معانی و مغایم کا سمجھنا نہایت غور و فکر اور تدبر پر موقوف ہے۔

### جواب:

اگر دلیل کے واضح و روشن ہونے یا نہایت غور و فکر اور تدبر کا محتاج ہونے سے مراد یہ ہے کہ آیت کی عبارت ایسی عقلی دلیل کی حامل ہے کہ جو بداهت کے قریب ہے یا خود بدیہی ہے اور یا یہ کہ اس طرح کی نہ ہو تو اس سے یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ احکام و فرائض وغیرہ پر مشتمل آیات تشابہات قرار پائیں کیونکہ ان کی کوئی واضح و روشن عقلی دلیل موجود نہیں بلکہ وہ اس طرح کی دلیلوں کی ناقد ہیں، تو اس صورت میں ان کا اتباع مذموم قرار پائے گا جبکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ وہ واجب الاتباع ہیں، اور اگر دلیل کے واضح و روشن ہونے یا نہایت غور و فکر اور تدبر کا محتاج ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ کتاب ہی سے واضح دلیل کی حامل ہیں یا اس طرح کی دلیل کے نہ ہونے کی وجہ سے تفکر و تدبر کی محتاج ہیں تو اس حوالہ سے تمام آیات مبارکہ یکساں ہیں، اور ایسی کیوں نہ ہوں؟ آخر یہ کتاب ہی ایسی ہے کہ جس کی صفت تشابہ مثنائی، نور اور بین ہے کہ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ پورا قرآن محکم ہو اور کوئی آیت تشابہ نہ ہو جبکہ یہ بات واقع الامر اور نص قرآن؟ قرآنی تصریح کے بالکل برعکس ہے کیونکہ تمام آیات، محکمات نہیں بلکہ تشابہات بھی ان میں موجود ہیں۔

### چھٹا قول:

”محکم“ سے مراد وہ آیات ہیں جن کے معانی و مقاصد سے آگاہی کا حصول کسی روشن یا غیر روشن دلیل کے ذریعے ممکن ہو اور ”تشابہ“ سے وہ آیات مراد ہیں کہ جن کے مطالب سے آگاہی حاصل کرنا کسی بھی دلیل سے ممکن نہ ہو مثلاً قیامت کے دن کا تعین کہ وہ کب ہوگا، وغیرہ۔

### جواب:

یہ قول اس لحاظ سے درست نہیں قرار پاتا کہ محکم اور تشابہ ہونا، دو ایسی صفتیں ہیں کہ جو قرآنی آیات سے ان کے قرآنی آیات ہونے کی حیثیت سے تعلق رکھتی ہیں یعنی اس بناء پر کہ وہ معارف الہیہ میں سے کسی مطلب پر دلالت کرتی ہیں



(ان سے معارف الہیہ کا ثبوت ملتا ہے)، اور قرآنی آیات میں سے کوئی آیت جس معنی و مقصود کو بیان کرتی ہے وہ ہرگز ایسا نہیں کہ لوگ اس کے سمجھنے سے کلی طور پر قاصر اور اس کے ادراک سے عاجز ہوں یعنی ایسا ممکن نہیں کہ آیت کے الفاظ ہی ایسے ہوں کہ جن کے معانی کا سمجھنا خود انہی لفظوں کے ذریعے یا کسی دوسری آیت سے مدد لے کر بھی ممکن نہ ہو، یہ کیونکر قابل تصور ہے کہ آیت کے الفاظ سے کسی معنی کا سمجھنا مراد و مقصود ہو جبکہ اس کے الفاظ سے وہ معنی سمجھ میں ہی نہ آسکیں؟ یہ بات خداوند دانا و قادر کی نسبت سے ناقابل فہم ہے کہ وہ آیات کے ذریعے کوئی بات لوگوں کو سمجھانا چاہے مگر الفاظ سے اس بات کا سمجھنا لوگوں کے بس میں نہ ہو اور اس کے سمجھنے کی کوئی راہ بھی نہ پائی جائے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی توصیف میں فرمایا ہے کہ وہ سرچشمہ ہدایت ہے، نور ہے، ہر بات کو واضح طور پر بیان کرنے والی ہے اور اس سے بالاتر یہ کہ اسے اس طرح نازل کیا گیا ہے کہ مومنین تو بجائے خود، کفار بھی اس کے معانی کو سمجھ سکتے ہیں چنانچہ ارشاد الہی ہوا:

سورہ حم سجدہ آیت ۲-۳

﴿ تَنْزِيلٌ مِنَ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ﴿۱﴾ كِتَابٌ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿۲﴾ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۚ فَأَعْرَضَ أَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿۳﴾ ﴾

(رحمان و رحیم کی طرف سے نازل کی گئی ہے، ایسی کتاب ہے جس کی آیات الگ الگ کر کے اتاری گئی ہیں قرآن ہے جو عربی زبان میں ہے ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں، خوشخبری دینے والا اور عذاب الہی سے ڈرانے والا ہے، مگر لوگوں کی اکثریت نے اس سے روگردانی کی ہے اور وہ اسے سنتے ہی نہیں ہیں)

اسی طرح ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہ نساء، آیت ۸۲:

﴿ أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ ۗ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ﴿۱۰﴾ ﴾

(آیادہ قرآن میں غور و فکر اور تدبر نہیں کرتے، اگر وہ غیر خدا کی طرف سے نازل ہوا ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ

اختلاف پاتے)

بتا برائیں قرآن مجید کی جو آیت بھی کسی مطلب کو بیان کرتی ہے وہ عمومی طور پر قابل فہم ہے اور اس کا فہم و ادراک اس کے مفہوم سے آگاہ ہونا ہرگز محال و ناممکن نہیں، اور جہاں تک ان مطالب کا تعلق ہے کہ جن کا ادراک بشری قوت فکر کی دسترس سے باہر ہے مثلاً قیامت برپا ہونے کا وقت اور غیب کی خبریں وغیرہ تو ایسے مطالب قرآن میں کسی بھی آیت میں مذکور نہیں کہ جن کی بناء پر اسے آیت متشابہ قرار دیا جائے۔

اس کے علاوہ یہ قول اس حوالہ سے بھی نادرست قرار پاتا ہے کہ اس کے قائل نے ”متشابہ“ اور ”تأویل“ کے معانی

میں خلط ملط کر دیا ہے،..... جبکہ ان دونوں میں فرق ہے..... چنانچہ اس حوالہ سے پہلے بھی مطالب ذکر کئے جا چکے ہیں۔

### ساتواں قول:

آیات محکمات سے مراد آیات الاحکام ہیں اور ان کے علاوہ دیگر آیات، تشابہات ہیں کہ جو ایک دوسری سے ہم رنگی و ہم آہنگی نہیں رکھتیں بلکہ ایک دوسری سے اجنبی ہیں، اس قول کی نسبت مجاہد اور دیگر محدثین کی طرف دی گئی ہے۔

### جواب:

اگر ایک دوسری سے عدم ہم رنگی و عدم ہم آہنگی سے مراد ہر وہ شے ہے کہ جو لفظ سے مراد ہی معنی کے تعین میں مدد دے یہاں تک کہ تخصیص کے ذریعے تخصیص اور مقید کے ذریعے تھنید جیسے موارد اور قرآنِ حالیہ و مقامیہ وغیرہ بھی اس میں شامل ہوں تو آیات الاحکام بھی دیگر آیات کی مانند، تشابہات میں قرار پائیں گی..... کیونکہ ان میں بھی عام و خاص اور مطلق و مقید پائی جاتی ہیں.....، اور اگر اس سے مراد ان میں پائے جانے والے ابہام کا حوالہ ہو اور وہ یوں کہ ابہام اس کے مراد ہی معنی کے تعین میں رکاوٹ ثابت ہو اور اجمالات کی کثرت اس کے مدلول سے آگاہی کے حصول میں مانع ہو کہ جس کی وجہ سے نہ تو آیت اپنے مراد ہی معنی کا تعین کر سکے اور نہ ہی دیگر آیات کے ذریعے اس کے معنی کے تعین کا مسئلہ حل ہو سکے تو اس صورت میں نتیجہ یہ ہوگا کہ آیات الاحکام کے علاوہ دیگر تمام آیات، تشابہات قرار پائیں اور احکام کے سوا معارف القرآن میں سے کسی بھی چیز کا علم حاصل نہ ہو سکے کیونکہ مذکورہ بالا فرضیہ کی بناء پر آیات الاحکام کے علاوہ کوئی آیت محکمات میں سے نہیں کہ تشابہات میں اس کی طرف رجوع کیا جائے اور اس کے ذریعے تشابہات کے معانی کا تعین اور ان سے آگاہی حاصل ہو سکے..... دونوں صورتوں میں اس قول کی عدم صحت کا ثبوت ملتا ہے اور یہ کہنا قطعی درست قرار نہیں پاتا کہ آیات الاحکام کے علاوہ دیگر تمام آیات، تشابہات ہیں کیونکہ اس سے معارف القرآن پر مشتمل آیات بے معنی و بے نتیجہ ہو جائیں گی۔

### آٹھواں قول:

آیات محکمات سے مراد وہ آیات ہیں جن کی تاویل صرف ایک صورت کی حامل ہو اور آیات تشابہات سے گونا گوں تاویلات یا تاویل کی متعدد صورتوں کی حامل آیات مراد ہیں،

اس قول کی نسبت امام شافعی کی طرف دی گئی ہے، گویا اس نقطہ نظر سے مراد یہ ہے کہ ”محکم“ اس آیت کو کہتے ہیں جو صرف ایک معنی میں ظہور رکھتی ہو مثلاً نص (جو کہ اپنے معنی میں واضح و صریح ہو) اور اپنے معنی میں قوی ظہور کی حامل ہو جبکہ ”تشابہ“ اسے کہتے ہیں کہ نہ تو اپنے معنی مراد پر نص قرار پائے اور نہ ہی اس میں قوی ظہور کی حامل ہو۔

## جواب:

اس قول میں ”محکم“ اور ”متشابہ“ کی جگہ دیگر الفاظ تبدیل کئے گئے ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں اور وہ اس طرح کہ ”محکم“ کی جگہ یہ الفاظ ذکر کئے گئے: ”مالیس لہ الا معنی واحد“ (وہ کہ جس کا صرف ایک معنی ہو) اور ”متشابہ“ کی جگہ یہ الفاظ ذکر کئے گئے: ”مایحتمل معانی کثیرة“ (جو کثیر معانی رکھتا ہو)، اس کے علاوہ اس قول میں لفظ ”تأویل“ کا معنی ”تفسیر“ کیا گیا ہے اور یوں کہا گیا کہ ”محکم“ سے مراد وہ آیات ہیں کہ جن کی تأویل صرف ایک صورت کی حامل ہو (مالا یحتمل من التأویل الا وجہاً واحداً) اور ”متشابہ“ سے مراد وہ آیات ہیں جو متحدتاً و یلات کی حامل ہوں (مایحتمل معانی کثیرة) جبکہ یہ درست نہیں اور تأویل و تفسیر میں بہت فرق ہے کیونکہ اگر دونوں کا معنی ایک ہوتا اور تأویل بعینہ تفسیر ہوتی تو تأویل کا علم خدا یا خدا اور راخون فی العلم کے ساتھ مختص نہ ہوتا۔ اور اس کی بابت یہ الفاظ ذکر نہ کئے جاتے: ”وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ“ کہ اس کی تأویل سوائے خدا اور راخون فی العلم کے، کوئی نہیں جانتا۔۔۔۔۔ حالانکہ قرآن کی بعض آیات دوسری بعض کی تفسیر کرتی ہیں (القرآن یفسر بعضہ بعضاً) اور اس حوالہ سے کہ قرآنی آیات کے معانی بذریعہ تفسیر واضح ہو جاتے ہیں تمام مومنین، کفار، راخون فی العلم اور اہل الزلیغ (وہ کہ جن کے دلوں میں ٹیڑھا پن پایا جاتا ہے) سب برابر ہیں اور وہ بعض آیات کو دیگر بعض کے ذریعے تفسیر کر کے آیات کے معانی کو سمجھ سکتے ہیں۔۔۔۔۔ جبکہ تأویل ال آیات اس سے مختلف ہے۔

## نواں قول:

”محکم“ سے مراد وہ آیات ہیں جن میں انبیاء الہی اور ان کی امتوں کے حالات و واقعات واضح و تفصیلی طور پر بیان کئے گئے ہیں، اور ”متشابہ“ سے مراد وہ آیات ہیں کہ جن کے الفاظ میں یکسانیت نہیں پائی جاتی بلکہ انبیاء اور ان کی امتوں کے واقعات متعدد سورتوں میں مکرر ذکر کئے گئے ہیں اور ہر سورت میں مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اس بناء پر یہ بات تسلیم کرنی ہوگی کہ آیات کا ”محکم“ اور ”متشابہ“ دو قسموں میں تقسیم کیا جانا دراصل انہی قصص و واقعات کی بناء پر ہوا ہے۔

## جواب:

محکم اور متشابہ کا انبیاء اور ان کی امتوں کے حالات و واقعات کے ساتھ مختص قرار دینا بلا دلیل ہے اور اس کی بابت کوئی ٹھوس ثبوت نہیں پایا جاتا، اس کے علاوہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں ”محکم“ اور ”متشابہ“ کی جو خصوصیات ذکر کی گئی ہیں ان کی رو سے ”محکم“ کی پیروی میں ہدایت اور ”متشابہ“ کی پیروی میں فتنہ پروری اور تأویل جوئی کا ہدف پایا جاتا

ہے، اور یہ بات انبیاء اور ان کی امتوں کے واقعات و حالات پر مشتمل آیات میں ہی نہیں بلکہ ان کے علاوہ دیگر آیات میں بھی پائی جاتی ہے اور صرف ان واقعات میں ہی نہیں پائی جاتی کہ جو متعدد آیات میں ذکر کئے گئے ہیں بلکہ اس واقعہ میں بھی پائی جاتی ہے جو صرف ایک بار ذکر ہوا ہے مثلاً زمین میں خلیفہ بنائے جانے کا واقعہ، بنا برائیں آیات کی ”محکم“ اور ”متشابہ“ میں تقسیم کو آیات القصص سے مختص قرار دینا درست نہیں۔

### دسواں قول:

”متشابہ“ اس آیت کو کہتے ہیں جو وضاحت و بیان کی محتاج ہو۔ یعنی اس کا معنی مزید توضیحی بیان کے بغیر سمجھ میں نہ آسکے۔ اور ”محکم“ سے وہ آیت مراد ہے جس کے لئے کسی توضیحی بیان کی ضرورت نہ ہو، اس قول کی نسبت امام احمد بن حنبل کی طرف دی گئی ہے۔

### جواب:

یہ قول اس لحاظ سے قرین صحت نہیں کہ تمام آیات الاحکام میں حضرت پیغمبر اسلام کی طرف سے وضاحت و تشریح کی ضرورت ہوتی ہے خواہ وہ آیات محکمات ہی کیوں نہ ہوں، کوئی آیت ایسی نہیں جس کا معنی آنحضرت کی طرف سے وضاحت کا محتاج نہ ہو، اس سلسلہ میں متعدد بار مطالب ذکر کئے جا چکے ہیں، یہ بات ان آیات میں بھی پائی جاتی ہے جو منسوخ ہو چکی ہیں جبکہ منسوخ شدہ آیات بھی آیات متشابہات میں شمار ہوتی ہیں جیسا کہ اس سلسلہ میں پہلے بیان ہو چکا ہے حالانکہ منسوخ شدہ آیات کی بابت کسی وضاحت اور توضیح و تشریح کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن چونکہ ان کا درجہ دیگر آیات الاحکام جیسا ہے لہذا ان میں بھی آیات الاحکام کے معانی کو سمجھنے کا اصول اور قاعدہ کلیہ جاری ہوتا ہے۔

### گیارہواں قول:

”محکم“ اس آیت کو کہتے ہیں جس پر ایمان لانا اور عمل کرنا دونوں واجب ہیں جبکہ ”متشابہ“ پر ایمان لانا واجب مگر اس پر عمل نہیں کیا جاسکتا، اس قول کی نسبت ابن تیمیہ کی طرف دی گئی ہے، ممکن ہے کہ اس کی مراد یہ ہو کہ جو آیات کسی حکم و فرمان پر مشتمل ہوں وہ محکمات ہیں اور جن آیات میں صرف واقعات ذکر کئے گئے ہیں وہ متشابہات کہلاتی ہیں، جیسا کہ بعض اہل علم حضرات نے بھی ابن تیمیہ کے قول سے مذکورہ بالا مطلب کا احتمال ذکر کیا ہے، ورنہ اس قول کو مستقل قول قرار دینے میں کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کیونکہ اس سے پہلے جو اقوال ذکر کئے گئے ہیں ان میں سے ہی بعض اس سے مطابقت رکھتے ہیں۔

## جواب:

اس قول سے یہ بات لازم آتی ہے کہ آیات الاحکام کے علاوہ دیگر آیات بھی تشابہات ہوں کہ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ احکام کے علاوہ دیگر معارف الہیہ میں سے کسی چیز کا علم حاصل نہ ہو سکے کیونکہ دیگر معارف میں عمل کا پہلو نہیں پایا جاتا، اس کے علاوہ یہ کہ ان آیات میں کوئی آیت، محکم نہ ہوگی کہ جس کی طرف رجوع کر کے تشابہ آیت کا معنی معلوم کیا جاسکے، اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی لازم آئے گی کہ منسوخ شدہ آیات جو کہ سب کی سب انشاء اور حکم و فرمان پر مشتمل ہیں وہ ”محکمات“ قرار پائیں جبکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ قطعی طور پر وہ آیات تشابہات ہیں۔

البتہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن تیمیہ کے اس قول سے کہ ”جس آیت پر ایمان لانا اور عمل کرنا ضروری ہو وہ ”محکم“ اور جس پر صرف ایمان لانا ضروری ہو وہ ”تشابہ“ ہے مراد وہ معنی و مفہوم ہے کہ جس کا ثبوت زیر بحث آئے مبارکہ میں ملتا ہے چنانچہ ارشاد الہی ہوا: ”فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ“.....، ”وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ اهْتَابَ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا“.....، (وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں کجی پائی جاتی ہے وہ ان آیات کی پیروی کرتے ہیں جو تشابہ ہیں) (اور جو لوگ راسخون فی العلم ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے ہیں سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے)، تاہم جو بات لائق توجہ ہے وہ یہ کہ اس قول میں کہا گیا ہے کہ ”محکمات“ وہ ہیں کہ جن پر ایمان لانا اور ان پر عمل کرنا ضروری ہے اور ”تشابہات“ وہ ہیں کہ جن پر صرف ایمان لانا ضروری ہے ان پر عمل نہیں کیا جاسکتا، تو اس حوالہ سے قرآن پر ایمان لانے والے ہر شخص کے لئے پہلے یہ بات ضروری ہوگی کہ ”محکمات“ اور ”تشابہات“ کی درست پہچان کرے اور یہ واضح ہو کہ کون سی آیات محکم اور کون سی تشابہ ہے تاکہ جو ”محکم“ ہو اس پر ایمان اور عمل کو یقینی بنائے اور جو تشابہ ہو اس پر صرف ایمان کے کافی ہونے کا یقین حاصل کرے، بنا برائیں، ”محکم“ اور ”تشابہ“ سے ان کے مصداق کی پہچان کی بناء پر آگاہی حاصل کرنا کافی نہیں ہو سکتا جو کہ ایک واضح مسئلہ ہے۔

## بارہواں قول:

”تشابہات“ سے بالخصوص وہ آیات مراد ہیں جن میں صفات بیان کی گئی ہیں خواہ وہ صفات خداوند متعال کی ہوں جیسے ”علیم“، ”قدیر“، ”حکیم“، ”خبیر“ یا صفات انبیاء الہی ہوں جیسا کہ خداوند عالم نے حضرت عیسیٰ بن مریم کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

سورہ نساء، آیت ۱۷۱:

﴿وَكَلَّمَتْهُ الْعُقُبَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرَأَوْهَا مِمَّنْهُ﴾

(اور وہ کلمہ تھا کہ جسے خدا نے مریم کو القاء کیا اور وہ اس کی طرف سے روح تھی)

یہ اور اس طرح کی دیگر آیات، اس قول کی نسبت بھی ابن تیمیہ کی طرف دی گئی ہے۔

جواب:

اگر بالفرض یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ صفات کے ذکر پر مشتمل آیات، تشابہات ہیں لیکن ان کے انہی آیات میں منحصر و محدود ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں، یعنی عین ممکن ہے کہ ان کے علاوہ دیگر آیات بھی تشابہات ہوں، ابن تیمیہ کے بعض طولانی بیانات سے کہ جو اس کی طرف سے منقول ہیں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے ”محکم“ اور ”تشابہ“ سے ان کے لغوی معانی مراد لئے ہیں اور وہ یہ کہ ”محکم“ اسے کہتے ہیں جس کے الفاظ اس کے معانی پر ٹھوس دلالت کرتے ہوں اور ”تشابہ“ اسے کہتے ہیں کہ جس کے الفاظ سے متعدد معانی کا احتمال پایا جائے، اور وہ احتمالات ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہوں، ابن تیمیہ کا کہنا ہے کہ محکم اور تشابہ کے مذکورہ دو معانی نسبت کی بناء پر ہیں اور وہ اس طرح کہ گاہے ایسا ہوتا ہے کہ ایک آیت بعض لوگوں کے لئے تشابہ ہوتی ہے اور وہ اس کی بابت گونا گوں احتمالات دیتے ہیں جیسا کہ عوام الناس اکثر اسی طرح کرتے ہیں لیکن وہی آیت دوسرے لوگوں کے لئے محکم ہوتی ہے مثلاً علماء جو کہ بحث و تحقیق کے مراحل طے کر کے اس کا معنی سمجھ لیتے ہیں، تو یہ صورت حال صفات کے ذکر پر مشتمل آیات مبارکہ میں واضح طور پر پائی جاتی ہے کیونکہ عوام الناس کی اکثریت ان کے معانی و مراد کی بابت درست ادراک نہیں رکھتی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی قوت فکر و فہم، ماوراء حس کی بلندی کو چھو ہی نہیں سکتی لہذا وہ ان صفات کی بابت کہ خداوند عالم نے اپنے لئے جن کا اثبات کیا ہے مثلاً علم، قدرت، سمع (سننا)، بصر (دیکھنا)، رضا (خوش ہونا)، غضب (ناراض ہونا)، ید (ہاتھ)، عین (آنکھ) وغیرہ، ان کے وہی معانی سمجھتے ہیں جو ان کے ہاں متعارف ہیں یعنی مادی و جسمانی امور، یا ایسے غلط و ناسخ معانی کرتے ہیں کہ جن کی وجہ سے فنون کا بازار گرم ہو جاتا ہے، بدعتیں جنم لیتی ہیں اور مذاہب و مسالک وجود میں آ جاتے ہیں، یہ ہے محکم اور تشابہ کے معانی کا اجمالی ذکر، اور وہ دونوں معانی نسبت کے حوالے سے ہیں اور ان دونوں کا علم ممکن الحصول ہے لیکن جس چیز کا ادراک اور علم و آگاہی ناممکن ہے وہ تشابہات کی تائید و تائیل ہے یعنی آیات الصفات اور ان کی مانند دیگر آیات کے حقیقی معانی کا علم کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا..... ”تائیل المتشابہات“ سے ان کے حقیقی معانی کے علم و ادراک کے حصول کی کوشش مراد ہے..... یہ بات صحیح ہے کہ ہم آیہ مبارکہ ”إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“ (خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے) اور ”إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ“ (خدا ہر چیز کا علم رکھتا ہے) اور اس طرح کی دیگر آیات کریمہ سے قدرت کی حقیقت اور اسی طرح خدا کی دیگر صفات اور خاص و مخصوص افعال کی کیفیتوں کو ہرگز نہیں سمجھ سکتے اور یہی وہ ”تائیل المتشابہات“ ہے کہ جس کا علم خداوند عالم کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔

یہ ہے ابن تیمیہ کے طولانی بیان کا خلاصہ، ہم ان کے بیان کی بابت تفصیلی تذکرہ ”تائیل“ کی بحث میں کریں گے

جو کہ عنقریب ہوگی انشاء اللہ۔

### تیر ہواں قول:

”محکم“ سے مراد وہ آیت ہے کہ جس کے معنی کا ادراک، عقل کی دسترس میں ہو اور ”متشابہ“ اس کے برعکس ہے یعنی عقل اس کے معنی کو سمجھنے سے قاصر ہو۔

### جواب:

یہ قول بلا دلیل ہے اور قرآنی آیات اگرچہ دو قسموں میں تقسیم ہوئی ہیں کہ ان میں سے ایک وہ قسم ہے کہ جس کا فہم المعنی عقل کی دسترس میں ہے اور دوسری وہ قسم ہے کہ جس کے فہم المعنی تک قوت عقل کی رسائی نہیں لیکن اس تقسیم سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ زیر بحث آیہ مبارکہ میں ”محکم“ اور ”متشابہ“ سے مراد بھی یہی ترتیب ہے کہ پہلی قسم کی آیات کو ”محکمات“ اور دوسری قسم کی آیات کو ”متشابہات“ قرار دیا جائے کیونکہ اس آیہ مبارکہ میں ”محکم“ اور ”متشابہ“ کی جو صفات و خصوصیات ذکر کی گئی ہیں وہ مذکورہ بالا قول سے صحیح مطابقت نہیں رکھتیں، اس کے علاوہ یہ کہ مذکورہ بالا قول آیات الاحکام کے تناظر میں بے اساس ہو جاتا ہے کیونکہ آیات الاحکام یقینی طور پر ”محکمات“ میں سے ہیں جبکہ عقل ان کے فہم المعنی کی بابت قاصر ہے۔

### چودھواں قول:

”محکم“ سے مراد وہ آیات ہیں جن کے ظواہر مقصود ہوں اور ”متشابہ“ سے مراد وہ آیات ہیں کہ جن کے ظواہر کے برعکس معانی مقصود ہوں،..... ”محکم“ یعنی وہ کہ جس کا ظاہر مقصود ہو اور متشابہ وہ کہ جس کا خلاف الظاہر مقصود ہو، یہ قول بعد میں آنے والے دانشوروں و محققین کے درمیان مشہور ہوا اور اسی نظریہ کی بناء پر انہوں نے ”تأویل“ کی اصطلاح کا یہ معنی کیا کہ اس سے کلام کا خلاف الظاہر معنی مراد ہے، گویا جس دانشور نے محکم اور متشابہ کے بارے میں یہ کہا کہ ”محکم“ اسے کہتے ہیں کہ جس کی تأویل، اس کی تزیل ہی ہے اور ”متشابہ“ اسے کہتے ہیں کہ جس کا معنی تأویل کے بغیر سمجھ میں نہ آسکے، یعنی جس آیت کا معنی اس کے ظاہری الفاظ ہی سے سمجھ میں آجائے اسے محکم اور جس کا معنی تأویل کے بغیر سمجھ میں نہ آئے اسے متشابہ کہتے ہیں۔

### جواب:

یہ قول صرف ایک طرح کی اصطلاح ہے اور آیہ مبارکہ میں ”محکم“ و ”متشابہ“ کی بابت جو اوصاف ذکر ہوئے

ہیں وہ اس پر منطبق نہیں ہوتے کیونکہ ”متشابہ“ کو اس لئے متشابہ کہا جاتا ہے کہ اس کا مرادی معنی ومدلول (وہ امر کہ جو اس کے الفاظ سے ثابت ہو) واضح نہیں ہوتا، اور ”تاویل“ سے مراد وہ معنی نہیں جو متشابہ سے مراد لیا گیا ہے کہ جس کی بناء پر اسے محکم سے جدا کر سکیں اور اس طرح کہیں کہ متشابہ وہ ہے کہ جس کی تاویل موجود ہو اور محکم وہ ہے کہ جس کی تاویل نہ ہو،..... جس کی تاویل کی ضرورت نہ ہو وہ محکم اور جس کی تاویل کی ضرورت ہو وہ متشابہ قرار پائے..... بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آیہ مبارکہ میں ”تاویل“ سے وہ معنی مراد ہے جو تمام قرآنی آیات کی بابت پایا جاتا ہے خواہ وہ محکم ہوں یا متشابہ ہوں جیسا کہ اس سلسلہ میں پہلے بیان ہو چکا ہے، اس کے علاوہ یہ ہم بات قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں کہ جس کا خلاف الظاہ مراد ہو اور جہاں تک ان آیات کا تعلق ہے کہ جن سے اس طرح کی بات کا احتمال پیدا ہوتا ہے تو دراصل وہاں ان کا خلاف الظاہ مقصود و مراد نہیں بلکہ ان سے ان معانی کو مراد لیا گیا ہے جو دیگر آیات محکمات کی مدد سے حاصل ہوتے ہیں کیونکہ ”القرآن یفسر بعضہ بعضاً“ ایک مسلمہ اصول ہے کہ قرآن کا بعض حصہ دوسرے بعض کی تفسیر کرتا ہے،..... کسی آیت کا معنی دوسری آیت سے سمجھا جاسکتا ہے.....، اور یہ ایک واضح امر ہے کہ کسی لفظ کا وہ معنی جو قرآن و شواہد..... خواہ وہ قرآن متصل ہوں یعنی اس لفظ کے ساتھ جڑے ہوئے ہوں یا منفصل ہوں یعنی اس سے الگ کسی جگہ مذکور ہوں کہ جن کے تاظر میں اس آیت کا معنی واضح ہو جائے کہ جس کے ظاہری الفاظ سے معنی نہ سمجھا جاسکتا ہو..... کے ذریعے معلوم ہو جائے اسے خلاف الظاہ قرار نہیں دیا جاسکتا بالخصوص اس کلام میں کہ جس کا متکلم صریح و واضح طور پر کہہ دے کہ اس کی روش و طرز تکلم ہی ایسا ہے کہ اس میں کلام کا بعض حصہ دوسرے بعض حصہ سے متصل ہوتا ہے اور اس کا بعض حصہ دوسرے بعض کا شاہد و گواہ ہوتا ہے بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ اس میں بظاہر دکھائی دیا جانے والا فرق و اختلاف اس میں اچھی طرح غور و فکر اور تدبر کرنے سے خود بخود دور ہو جاتا ہے یعنی اگر اس کا قاری اس کے معانی میں غور کرے تو اسے اس کے الفاظ سے جو فرق و اختلاف دکھائی دیتا ہو وہ دور ہو جائے گا جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورۃ نساء، آیت ۸۲:

○ ”أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ ۗ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ إِخْتِلَافًا كَثِيرًا“ (۸۲)

(وہ قرآن میں تدبر اور غور و فکر کیوں نہیں کرتے کہ اگر وہ خدا کے علاوہ کسی کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت

زیادہ اختلاف پاتے)

پندرہواں قول:

یہ قول ”اصم“ کی طرف نسبت سے ذکر کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ ”محکم“ سے وہ آیت مراد ہے جس کی تاویل پر تمام



اہل علم حضرات کا اجماع اور اتفاق رائے ہو اور ”تشابہ“ سے وہ آیت مراد ہے جس کی تاویل میں اختلاف رائے پایا جائے، گویا اجماع سے مراد یہ ہے کہ اس کی بابت کوئی اختلاف رائے نہ پایا جاتا ہو بلکہ سب کی آراء متفق ہوں اور اختلاف سے مراد یہ ہے کہ اس کی بابت اختلاف رائے پایا جاتا ہو، پہلی قسم کو ”محکم“ اور دوسری قسم کو ”تشابہ“ کہتے ہیں۔

جواب:

یہ قول اس بناء پر قرین صحت نہیں کہ اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ پورا قرآن تشابہ ہو جو کہ قرآنی آیات کے محکم و تشابہ دو قسموں میں تقسیم ہونے سے مطابقت نہیں رکھتی، کیونکہ قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں کہ جس میں کسی طرح سے کوئی اختلاف رائے نہ پایا جاتا ہو بلکہ یا تو اس کے الفاظ میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے اور یا اس کے معانی کی بابت مختلف آراء سامنے آتی ہیں، یا پھر یہ کہ وہ کسی معنی میں ظہور رکھتی ہے یا نہیں رکھتی، اسی طرح دیگر جہتوں اور پہلوؤں سے اہل علم حضرات اختلاف رائے کرتے ہیں، یہاں تک کہ بعض حضرات نے پورے قرآن مجید کے ”تشابہ“ ہونے پر اس آیت سے استدلال پیش کیا ہے کہ جس میں اس طرح ارشاد حق تعالیٰ ہے: ”كُنُوبًا مُّشْتَابِهًا“..... سورۃ زمر، آیت ۲۳۔ (وہ کتاب ہے تشابہ)، لیکن وہ اس بات سے غفلت میں رہے کہ یہ آیت اس صورت میں ان کے استدلال کی صحت کو یقینی بنا سکتی ہے جب خود اسے ”محکم“ قرار دیا جائے جبکہ یہ بات خود ان کے اپنے استدلال کے منافی ہے کہ جس میں وہ پورے قرآن کو ”تشابہ“ مانتے اور ثابت کرنا چاہتے ہیں، ان کے علاوہ کچھ حضرات کا نظریہ یہ ہے کہ ظاہر القرآن حجت ہی نہیں ہے یعنی آیات قرآنیہ اپنے معانی میں ظہور ہی نہیں رکھتیں۔

سبیل سکینہ

حیدرآباد لطیف آباد، پونٹ نمبر C1-A

سولہواں قول:

”تشابہات“ سے وہ آیات مراد ہیں کہ جن کی تفسیر اس وجہ سے مشکل ہو کہ وہ دیگر آیات سے مشابہت رکھتی ہیں خواہ ان کی تفسیر کا مشکل ہونا الفاظ کی بناء پر ہو یا معانی کی بناء پر ہو، اس قول کو مشہور ماہر لغت، راغب اصفہانی نے ذکر کیا ہے، انہوں نے اپنی کتاب مفردات میں لکھا ہے کہ ”آیات تشابہات“ سے مراد وہ آیات ہیں جن کی تفسیر دیگر آیات سے مشابہت و ہم رنگی کی وجہ سے مشکل ہو جائے خواہ الفاظ کے حوالہ سے ہو یا معانی کے حوالہ سے ہو، اسی وجہ سے فقہاء کا کہنا ہے کہ ”تشابہ“ اس آیت کو کہتے ہیں کہ جس کا ظاہر اس کے مرادی معنی کو واضح نہ کرے، حقیقت یہ ہے کہ قرآنی آیات کی ایک دوسری سے وابستگی کی بناء پر تین قسمیں ہیں:

پہلی قسم: محکم علی الاطلاق، یعنی ہر لحاظ سے محکم، اور ہر طرح کی قید و شرط سے خالی۔

دوسری قسم: تشابہ علی الاطلاق، یعنی ہر لحاظ سے تشابہ۔

تیسری قسم: محکم من وجہ و تشابہ من وجہ، یعنی ایک لحاظ سے محکم اور ایک لحاظ سے تشابہ، بنا بریں ”تشابہ“ کوئی الجملہ تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) صرف الفاظ کے حوالہ سے تشابہ

(۲) معانی کے حوالہ سے تشابہ

(۳) الفاظ و معانی دونوں حوالوں سے تشابہ

اور پھر الفاظ کے حوالہ سے تشابہ کی دو قسمیں ہیں:

(۱) اس کے مفردات تشابہ ہیں یعنی اس کا تشابہ ہونا اس کے مفرد الفاظ کے تشابہ ہونے کی وجہ سے ہے اور وہ اس

طرح کہ یا اس کے الفاظ غیر مانوس واجنبی ہیں مثلاً ”اب“، ”یزفون“، یا اس کے الفاظ متعدد معانی رکھتے ہیں مثلاً ”ید“، ”عین“..... یذ یعنی ہاتھ، قدرت، سمت وغیرہ، اور عین بمعنی آنکھ، چشمہ، پتھر وغیرہ

(۲) اس کے جملہ و کلامی ترکیبات، تشابہ ہیں۔

اس دوسری قسم کی تین قسمیں ہیں:

(۱) کلامی ترکیب کا تشابہ ہونا اس بناء پر ہے کہ کلام میں اختصار پایا جاتا ہے مثلاً:

سورہ نساء آیت ۳:

”وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَمِينِ فَأَنْكِحُوا أَمْهَاتِكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ“

(اگر تمہیں یہ اندیشہ لاحق ہو کہ تم یتیموں کے بارے میں عدل قائم نہ رکھ سکو گے تو پھر جو خواتین تمہیں پاکیزہ لگیں

ان سے نکاح کرو)

(۲) کلام کا تشابہ ہونا اس میں پائے جانے والے اضافہ کی وجہ ہو کہ جس کے نتیجے میں کلام میں وسعت و گسترہ گی

پیدا ہو جائے مثلاً: ”لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ“..... سورہ شوریٰ آیت ۱۱..... (اس جیسی کوئی چیز نہیں)، اگر یہ جملہ اس طرح ہوتا:

”لیس مثلہ شیء“ تو اس کا معنی سننے والے پر زیادہ واضح و روشن ہو جاتا،..... ایک حرف (کاف) کے اضافہ سے اس

میں تشابہ پیدا ہو گیا۔

(۳) کلام کا تشابہ ہونا اس کی جملہ بندی کی وجہ سے ہو، مثلاً:

سورہ کہف، آیت ۱:

”أَنْزَلَ عَلَى عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجًا ۖ قَيِّمًا“

(اس نے اپنے عبد پر کتاب نازل کی اور اس میں کوئی کجی قرار نہیں دی، مضبوط و پائیدار کتاب ہے)

جبکہ اصل میں یوں ہے: ”اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهٖ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَهٗ عِوَجًا“ (اس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی جو کہ مضبوط و پائیدار ہے اور اس نے اسے کج قرار نہیں دیا)، اسی طرح ایک آیت مبارکہ میں یوں ارشاد ہوا:

سورہ فتح، آیت ۲۵:

○ ”وَلَوْلَا رِجَالُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَنِسَاؤُهُمْ لَمَّ تَغْلَبُوْهُمۡ اَنْ تَكُوْنُوْهُمْ قَتٰبِيْنَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعْرُوْثًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ۗ لَوْ تَرَىٰٓ اَنَّ الْعَدُوَّ يَنْۢبَأُ الْاِيْمٰنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَدَاۗءًا اِلَيْسَ ۙ“  
 (اور اگر مومن مرد اور مومنہ عورتیں ایسی نہ ہوتیں کہ جنہیں تم بے خبری میں پاؤں تلے روند دو گے کہ پھر لاشعوری طور پر ایک عار و عیب تم پر لگ جائے گا۔ تو خدا تمہیں اس جنگ سے نہ روکتا۔ ورنہ مقصد یہ ہے کہ خداوند عالم جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کر دے، اگر مومنین و کفار ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے تو ہم کافروں پر دردناک عذاب نازل کرتے)

ان دو آیتوں (کہف، ۱، فتح ۲۵) میں جملہ بندی اس طرح ہوئی ہے کہ سماع کو فہم المعنی میں دشواری لاحق ہوتی ہے، اسی وجہ سے ان آیات کو متشابہ قرار دیا جاتا ہے۔

یہ تھیں وہ آیات کہ جن کا متشابہات ہونا ان کے الفاظ کی بناء پر ہے، اور معانی کے حوالہ سے وہ آیات، تشابہات ہیں جن میں خداوند عالم کی صفات و اوصاف اور قیامت کے دن کے اوصاف بیان ہوئے ہیں کیونکہ اس طرح کی صفات و اوصاف کا تصور ہمارے بس میں نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم صرف انہی صورتوں کا ادراک کر سکتے ہیں جو ہماری قوتِ حس و احساس کی دسترس میں ہوں اور جو صورتیں ہماری قوتِ حس کی دسترس سے باہر ہوں وہ ہماری لوحِ فکر و ذہن پر ثبت ہی نہیں ہوتیں، یا کم از کم وہ ایسی صورتیں ہوں کہ جو ہماری قوتِ حس کے دائرے میں آسکنے والی چیزوں میں سے ہوں ورنہ ان کا ادراک ناممکن ہوگا۔ جبکہ خداوند عالم کی صفات اور قیامت کے دن کی خصوصیات نہ تو ہماری قوتِ حس کی دسترس میں ہیں اور نہ ہی قوتِ حس کے دائرے میں آسکنے والی چیزوں میں سے ہیں،

اور وہ آیات کہ جو الفاظ و معانی دونوں حوالوں سے متشابہ ہیں ان کی پانچ قسمیں ہیں:

(۱) کیمت و مقدار کے حوالہ سے! جیسا کہ عموم و خصوص کا واضح نہ ہونا، مثلاً آیہ مبارکہ ”فَاَقْتُلُوْا الْمُشْرِكِيْنَ“ توبہ آیت ۵۔ (مشرکوں کو قتل کر دو)، اس جملے میں قتل کرنے کا حکم مشرکین کی تعداد کے ذکر سے خالی ہے اور آیا ہر مشرک کو قتل کرنے کا حکم ہے یا مشرکین کے مخصوص گروہ کو، اس کے بیان سے بھی خالی ہے، اس وجہ سے یہ آیت، تشابہات میں سے ہے۔

(۲) کیفیت کے حوالہ سے! جیسا کہ وجوب و استحباب کا واضح نہ ہونا، یعنی جو حکم دیا گیا ہے وہ واجب العمل ہے

کہ جس کا ترک جائز نہیں یا مستحب ہے؟ اس کی بابت آیت سے کچھ ظاہر نہیں ہوتا مثلاً ارشاد ہوا: "فَأَنذَرْتُكُمْ مِّنَ النَّسَاءِ" (نساء ۳)۔ تم ان عورتوں سے نکاح کرو جو تمہارے لئے پاکیزہ و پسندیدہ ہوں..... حکم کے واجب یا مستحب ہونے کے حوالہ سے یہ آیت تشابہات میں سے ہے،

(۳) وقت اور مدت کے حوالہ سے! جیسا کہ ناخ و منسوخ میں قابل تصور ہے، مثلاً: "اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ"۔۔۔۔۔ سورۃ آل عمران ۱۰۲..... (اور تم تقوای الہی اختیار کرو جیسا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے)، اس آیت میں یہ احتمال پایا جاتا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے اور یہ بھی احتمال موجود ہے کہ منسوخ نہ ہوئی ہو، گویا منسوخ ہونے اور منسوخ نہ ہونے کے حوالہ سے یہ آیت تشابہات میں قرار پاتی ہے۔ اس احتمال کی وجہ یہ ہے کہ اس میں تقویٰ اختیار کرنے کا حکم مطلق ہے جبکہ ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا: "فَأَتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ"۔۔۔۔۔ سورۃ تغابن آیت ۱۶..... (تم جس قدر طاقت رکھتے ہو تقوای الہی اختیار کرو) گویا اس آیت میں "مقدور بھر" کے الفاظ سے یہ شبہ لاحق ہوتا ہے کہ شاید پہلی آیت میں جو عام اور مطلق حکم دیا گیا ہے اسے اس دوسری آیت کے ذریعے منسوخ کر دیا گیا ہو، اس حوالہ سے پہلی آیت کو تشابہات میں شمار کیا جاتا ہے۔

(۴) جگہ و مکان یا ان امور کے حوالہ سے کہ جن کی بابت آیت نازل ہوئی ہو مثلاً "وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا" (سورۃ بقرہ، آیت ۱۸۹)۔ نیکی یہ نہیں کہ تم گھروں میں ان کے پیچھے کی طرف سے آؤ..... اس آیت میں "گھروں کے پیچھے" کے الفاظ سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ اس سے مراد گھر کی کون سی جگہ ہے..... کیونکہ عین ممکن ہے کہ چھپی دیوار مقصود ہو، یا چھت مقصود ہو یا دائیں بائیں کی دیواریں مقصود ہوں یا کوئی ایسی جگہ کہ عام طور پر اس سے گھر میں نہیں داخل ہوا جاتا، تو اس احتمالات کی بناء پر آیت کو تشابہات میں قرار دیا جاتا ہے..... اسی طرح ارشاد الہی ہے: "إِنَّمَا النَّسِيءُ عَزِيَاذٌ لِّذِي الْاَلْكَفْرِ" (سورۃ توبہ، آیت ۷۳)۔۔۔۔۔ "نسی" کفر میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔

اس آیت میں لفظ "نسی" ذکر کیا گیا ہے تو جو شخص زمانہ جاہلیت کے عربوں کی عادات سے نا آگاہ ہو وہ اس آیت کی تفسیر آسانی سے نہیں کر سکتا۔ اس لفظ کا معنی "حرام کئے گئے مہینوں میں تقدم و تاخر کرنا" کیا گیا ہے.....

(۵) ان شروط کی بناء پر کہ جو کسی عمل کی صحت و درستی اور عدم درستی میں دخل ہوں! مثلاً نماز اور نکاح میں جو شروط

مطوط و دخل ہیں ان کے حوالہ سے مربوط آیات، تشابہات قرار پاتی ہیں۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مفسرین نے "تشابہ" کا جو معنی ذکر کیا ہے وہ انہی اقسام میں سے

کسی ایک پر منطبق ہوتا ہے، ان کے علاوہ نہیں ہے مثلاً جس نے کہا کہ "تشابہ" سے مراد حروف مقطعات (آم، اعر، ایں، کھلیص.....) ہیں، وہ قنادہ کا قول کہ "محکم" سے مراد وہ آیت ہے جو ناخ ہو اور تشابہ سے مراد وہ آیت ہے جو منسوخ ہو، اور

اصم کا قول کہ ”محکم“ وہ آیات ہیں جن کی تفسیر متفق علیہ ہو اور ”متشابہ“ سے مراد وہ آیات ہیں جن کی تفسیر کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہو، تو یہ سب اقوال و آراء مذکورہ پانچ قسموں سے باہر نہیں بلکہ انہی میں سے کسی ایک سے مطابقت رکھتی ہیں،

ان مطالب کے تناظر میں ”متشابہ“ کو تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) وہ آیات کہ جن کی تاویل اور حقیقت الامر کا علم کسی انسان کے بس کا روگ نہیں مثلاً قیامت کا وقت، زمینی

مخلوق کا باہر نکلنا اور اس کی کیفیت وغیرہ

(۲) وہ آیات کہ جن کے الفاظ کے معانی سے آگاہی کا حصول نوع انسانی کے لئے ممکن ہو مثلاً اجنبی و نامانوس

الفاظ اور پیچیدہ احکام و دستورات وغیرہ

(۳) وہ آیات کہ جو پہلی دو قسموں کے مابین ہیں یعنی ان کے بارے میں یہ احتمال پایا جاتا ہے کہ ان کی تفسیر عام

انسانوں کے لئے مقدور ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ صرف رَاِیْسُوْنَ فِي الْعِلْمِ ان کی تاویل و حقیقت الامر سے آگاہی رکھتے ہوں اور عام افراد بشر کی ان تک رسائی نہیں، اس تیسری قسم کی مثال حضرت پیغمبر اسلام کا ارشاد گرامی ہے کہ جو آپ نے حضرت علیؑ کے بارے میں اس طرح دعا کی: ”اللھم فقہہ فی الدین و علمہ التأویل“ (اے اللہ! اسے دین میں فقیہ بنا اور اسے تاویل سے آگاہ فرما)، اسی طرح کی دعا جناب عبداللہ بن عباس کے بارے میں بھی موجود ہے۔

یہ تھامشہور لغت دان اور راغب اصفہانی کا بیان کہ جس میں انہوں نے ”محکم“ اور ”متشابہ“ کے معانی کو ذکر کیا ہے

اور یہ ”متشابہ“ کے معنی کی بابت سابق الذکر اقوال کا جامع ترین بیان ہے،

لیکن راغب کے بیان پر دو حوالوں سے اعتراض ہو سکتا ہے:

(۱) انہوں نے ”متشابہ“ کے معنی کا دائرہ وسیع کر دیا ہے کہ جس میں الفاظ کا اجنبی و نامانوس ہونا، جملوں کی

ترکیبات کا پیچیدہ وغیر واضح ہونا اور ان میں عموم و خصوص کی جہتوں کا پایا جانا بھی شامل ہے تو یہ بات ظاہر الایہ سے مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ آیت مبارکہ میں ”محکمات“ کو ”متشابہات“ کی تفسیر کرنے والی آیات کے طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ جب

”آیات متشابہات“ میں سے کسی آیت کا معنی معلوم کرنا ہو تو ”آیات محکمات“ کی طرف رجوع کر کے ایسا کیا جاسکتا ہے جبکہ

یہ بات واضح و معلوم ہے کہ الفاظ کا اجنبی وغیر مانوس ہونا اور ترکیبات کا پیچیدہ ہونا، آیات محکمات کے واضح الدلالہ ہونے سے قطعی کوئی ربط نہیں رکھتا، اور نہ ہی ان کی طرف رجوع کر کے ان مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے بلکہ ان مسائل کے حل کے لئے

دیگر امور و اصول موجود ہیں کہ الفاظ و ترکیبات کی پیچیدگیوں کو دور کرنے میں ان کی طرف رجوع کیا جاتا ہے مثلاً لغت اور علم

صرف و نحو وغیرہ، اس کے علاوہ وہ آیت مبارکہ میں ”متشابہات“ کے بارے میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ان کی نشانی ہی یہ ہے کہ

ان کی پیروی صرف فتنہ انگیزی کی غرض سے کی جاتی ہے، جبکہ یہ بات واضح ہے کہ خاص کی طرف رجوع کئے بغیر عام کی پیروی کرنا، ”مقید“ کی طرف رجوع کئے بغیر ”مطلق“ کی پیروی کرنا اور علم لغت کی وضاحت کو درخور اثناء قرار دیئے بغیر اجنبی وغیر مانوس الفاظ کے معانی کا تعین کرنا اہل زبان کے مروجہ طریقوں کے منافی ہے اور کوئی اہل زبان اس طرح کے کاموں کو درست قرار نہیں دیتا بلکہ اس طرح کے کاموں کو غلط قرار دے کر اس کے مرتکب کی سرزنش کی جاتی ہے لہذا وہ شخص فتنہ انگیزی کا ہدف ہرگز نہیں حاصل کر سکتا کیونکہ کوئی اہل زبان اس سلسلہ میں اس کا ہدم و مددگار نہیں ہوتا۔

(۲) انہوں نے ”متشابہ“ کو تین قسموں میں تقسیم کر دیا ہے یعنی ایک وہ کہ جسے عوام الناس نہیں سمجھ سکتے، دوسری وہ کہ جسے کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا خواہ وہ عوام ہیں یا خواص، اور تیسری وہ کہ جس کا فہم المعنی بعض کے لئے ممکن اور بعض کے لئے ناممکن ہے، اس تقسیم سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی رائے میں ”تاویل“ صرف ”متشابہ“ سے مخصوص و مختص ہے، جبکہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ نظریہ صحیح نہیں۔

مذکورہ بالا تمام مطالب، ”محکم“ اور ”متشابہ“ کے معانی کی بابت مفسرین کرام و اہل علم و دانش کے اقوال و آراء اور نظریات ہیں کہ جو انہوں نے آیات و حکمت اور آیات متشابہات اور ان کے موارد کی تشخیص و تمیز کے حوالہ سے پیش کئے، قارئین کرام ان آراء و اقوال کی کمزور جہتوں سے آگاہ ہو چکے ہیں اور اس امر سے بھی آگاہ ہو چکے ہیں کہ وہ آیہ مبارکہ سے ظاہر و آشکار ہونے والے مطالب سے مطابقت نہیں رکھتے بلکہ ان میں سے کوئی قول بھی ایسا نہیں جسے آیہ مبارکہ سے سمجھے جانے والے حقائق و معارف سے ہم رنگ قرار دیا جائے کیونکہ آیہ مبارکہ سے ”متشابہ“ کا یہ معنی معلوم و ظاہر ہوتا ہے کہ متشابہ اس آیت کو کہتے ہیں جو معنی کے حوالہ سے واضح نہ ہو، نہ کہ الفاظ کے حوالہ سے، یعنی اس سے جو معانی سمجھے جاتے ہوں وہ یقینی نہ ہوں بلکہ ان کے متعلق دیگر احتمالات پائے جائیں کہ جن کی وجہ سے اصل مقصد آشکار نہ ہو سکے کیونکہ اگر الفاظ کے حوالہ سے فہم المعنی میں دشواری پیدا ہوتی ہو تو اسے ان طریقوں سے استفادہ کرتے ہوئے حل کیا جاسکتا ہے جو اہل زبان حضرات کے ہاں رائج ہوں مثلاً جب کوئی لفظ ”عام“ یا ”مطلق“ ہو تو اس کا معنی جاننے کے لئے ”مختص“ اور ”مقید“ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں مقصود معلوم ہو جاتا ہے، اسی طرح دیگر وہ اصول جو کسی کلام سے فہم المعنی کی بابت وضع کئے گئے ہیں تو ان کی طرف رجوع کر کے الفاظ سے معانی کا ادراک ممکن ہو جاتا ہے، گویا آیت کا متشابہ ہونا اس کے معنی کے حوالہ سے ہوتا ہے جو کہ کسی دوسری آیت جو کہ ”محکم“ ہو اور اس کے معنی میں کوئی شک و شبہ نہ پایا جاتا ہو، سے ہم رنگ نہ ہو کہ جس کے ذریعے متشابہ کی وضاحت و تفسیر ممکن ہو سکے۔ کیونکہ آیات و حکمت کو یہ رتبہ حاصل ہے کہ وہ آیات متشابہات کی تفسیر کرتی ہیں۔

اور یہ بات معلوم و آشکار ہے کہ کسی آیت کا معنی، مذکورہ وصف کا اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب اس کا فہم و

ادراک عام افراد بشر کے لئے آسان اور وہ معنی ہر فرد کی طبع فکر سے ہم رنگ ہو کہ جسے سادہ ترین افراد بھی اپنی لوح فکر و فہم میں ثبت کر سکتے ہیں یا اس کی تاویل اس طرح سے کی جائے کہ کمزور فہم و فکر اور ضعیف ادراک و تعقل کے حامل افراد کے اذہان میں سما سکے۔

اگر آپ ان بدعتوں اور غلط و فاسد نظریات و مذاہب اور مسالک کی تاریخ کا مطالعہ کریں کہ جو حضرت پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد حق کے مضبوط راستے سے انحراف کے نتیجے میں مسلمان گروہوں میں رونما ہوئے، خواہ وہ اعتقادات و معارف سے تعلق رکھتے ہوں یا احکام و دستورات سے مربوط ہوں آپ خود آگاہ ہو جائیں گے کہ ان کے اکثر موارد میں ”تشابہ“ کی پیروی اور آیات قرآنی کو مرضی خداوندی کے برخلاف تاویل کرنا ہی بنیادی سبب بنا ہے، چنانچہ اس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں کہ بعض گروہوں نے تشابہ آیات سے تمسک و استدلال کرتے ہوئے خداوند عالم کے جسم ہونے کا عقیدہ قائم کر لیا، بعض گروہ ”جبر“ کے قائل ہو گئے اور بعض ”تفویض“ کے معتقد ہوئے، بعض گروہوں نے انبیاء الہی کے ارتکاب معصیت کا عقیدہ رکھ کر انہیں غیر معصوم مان لیا، اور بعض گروہوں نے یہ عقیدہ قائم کر لیا کہ خداوند عالم چونکہ ہر حال سے منزہ ہے لہذا اس میں کوئی ”صفت“ نہیں پائی جاتی گویا انہوں نے خداوند عالم کا منزہ ہونا، صفات کی نفی کر کے مانا اور بعض گروہوں نے کامل تشبیہ کا عقیدہ رکھتے ہوئے خدا کی صفات کو انسانی صفات کی مانند قرار دے کر ان کے زائد برذات ہونے کا عقیدہ قائم کر لیا، ان کے علاوہ دیگر متعدد گروہ وجود میں آئے کہ جنہوں نے بدعتی نظریات قائم کئے اور ان میں بنیادی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ انہوں نے تشابہات کی پیروی کی اور محکمات کی طرف رجوع کئے بغیر ان کے معانی کا تعین کیا۔ جس کے نتیجے میں بھٹک گئے۔ جبکہ تشابہات کے معانی کے تعین میں محکمات کی طرف رجوع کرنا ہی اصل و اصول اور قاعدہ و دستور ہے، بعض گروہ ایسے بھی سامنے آئے جنہوں نے کہا کہ دینی احکامات و دستورات اس لئے صادر کئے گئے ہیں کہ ان کے ذریعے خدا تک پہنچنا ممکن ہو سکے، لہذا اگر ان سے زیادہ نزدیک راستہ مل جائے کہ جو خدا تک پہنچا دے تو اسے اختیار کرنا چاہیے کیونکہ مقصد و مقصود صرف اور صرف خدا تک پہنچنا اور حق تک رسائی ہے خواہ جس ذریعے سے کیوں نہ ہو اور جس راستہ پر چل کر ممکن ہو، بعض گروہوں نے کہا کہ واجبات و فرائض کا اصل مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کے ذریعے ”کمال“ تک رسائی یقینی ہو لہذا جو شخص کمال کو پالے اور کامل ہو جائے تو اس کے بعد اس پر کوئی ذمہ داری اور فریضہ عائد کرنا بے معنی ہے، جبکہ حقیقت الامر یہ ہے اور تاریخ اس کی گواہی دیتی ہے کہ تمام احکام و فرائض اور دستورات و اسلامی سیاست کے امور حضرت پیغمبر اسلامؐ کے عہد مبارک میں بھی اپنی اصل حیثیت کے ساتھ باقی تھے اور ان میں سے کوئی حکم و فریضہ ایسا نہ تھا جسے ختم کر دیا گیا ہو۔ کسی مسلمان نے یہ نہیں کہا اب چونکہ ہم کمال تک پہنچ چکے ہیں لہذا اب ان احکامات کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ مگر آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد رفتہ رفتہ بلکہ روز بروز ان میں کمی لائی جاتی رہی اور ان کی اصل حیثیت ختم کرنے کی راہیں اختیار کی گئیں، یہ

سب کچھ ان حکومتوں و حکمرانوں نے کیا جو اپنے آپ کو اسلامی کہلاتے تھے اور اسلام کے نام پر قائم ہوئے تھے، ان نام نہادوں خود ساختہ حکمرانوں نے جب بھی کسی حکم الہی یا فریضہ خداوندی کو ختم کرنا چاہا یا کسی قانون کی اصل حقیقت کو بے وقعت کیا تو یہی کہا کہ دین و قانون الہی صرف اس لئے بنا کہ اس کے ذریعے دنیا میں صلاح و بہتری پیدا ہو اور لوگوں کے امور زندگی اچھی طرح انجام پائیں اور جو قوانین و ضوابط ہم نے مقرر و طے کئے ہیں وہ موجودہ زمانہ میں لوگوں کی بہتری کے لئے زیادہ مفید و موثر ہیں اور ان میں بنی نوع انسان کے لئے رفاه و فلاح کی زیادہ ضمانت پائی جاتی ہے، بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ ان نام نہاد حکمرانوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ دینی دستورات کی غرض اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ ان پر عمل کر کے دنیاوی زندگی کو بہتر و آسودہ بنایا جائے اور عصر حاضر میں دینی سیاست ناقابل قبول ہو چکی ہے اور کوئی اسے درخور اعتناء قرار نہیں دیتا بلکہ موجودہ زمانہ جدید قوانین کا متقاضی ہے کہ جن کی تدوین عصری تقاضوں اور تمدن کے مطابق ہو اور ان کے نفاذ و اجراء کے ذریعے اپنی ضرورتوں کو پورا کیا جائے، اس سے بالاتر یہ کہا گیا کہ دینی اعمال انجام دینے کی اصل غرض یہ ہے کہ ان کے ذریعے دلوں کو پاک کیا جائے اور نیک و پاکیزہ فکر و ارادہ کی راہ پائی جائے لہذا موجودہ زمانہ میں جبکہ معاشرتی تربیت کی بنیاد پر دلوں کو پاکیزگی اور فکر و نظر کی توتوں کو خدمت خلق کی راہ مل چکی ہے تو اب ان کے پاک کرنے میں وضو، غسل اور نماز و روزہ وغیرہ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

اگر آپ مذکورہ بالا اقوال و آراء پر ... کہ جو اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کو شمار نہیں کیا جاسکتا اور ان جیسے دیگر اقوال پر اچھی طرح غور کریں اور اس آیه مبارکہ پر تدبر کریں ”فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَاءُ وَهُوَ إِبْتِغَاءُ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءُ تَأْوِيلِهِ...“ تو آپ کو ہمارے بیان کردہ مطالب کی صحت کی بابت ہرگز کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے گا اور آپ یقینی طور پر یہ فیصلہ کریں گے کہ یہ تمام فتنے اور مصائب و مشکلات کہ اسلام و اہل اسلام جن سے دوچار ہیں ان کی اصل وجہ آیات مشابہات کی پیروی اور قرآن کی تاویل کرنے کے سوا کچھ نہیں، شاید اسی بناء پر ... واللہ اعلم ... قرآن مجید میں اس موضوع کی بابت نہایت شدت کے ساتھ مطالب ذکر کئے گئے ہیں اور سخت ترین لہجہ میں آیات مشابہات کی پیروی سے، فتنہ پردازی و تاویل جوئی سے، آیات الہی میں الحاد و غلط اندیشی اور ان کی بابت جہالت و لاعلمی کی بنیاد پر اظہار خیالی کرنے اور شیطان کے نقش قدم پر چلنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ قرآنی روش ہی یہ ہے کہ انہی امور میں سخت انداز اختیار کیا جاتا ہے کہ جن کے سبب ارکان دین میں سے کسی رکن کا وجود خطرے میں پڑ جائے اور دین کی بنیاد متزلزل اور اس کی اساس منہدم ہو جائے جیسا کہ کفار سے دوستی کے بارے میں شدید التحسن بیانات صادر ہوئے، اور مودت فی القرنی کی بابت خاص انداز اختیار کر کے اس کی اہمیت سے آگاہی دلائی گئی کہ اس کے بغیر دین باقی نہ رہے گا، ازواج النبیؐ کو گھروں میں بیٹھے رہنے (وقون فسی بیوتکن) کا سخت حکم دیا گیا، سودی معاملات سے نہیں میں شدت اختیار کی گئی اور دین میں وحدت القول کی سخت تاکید



کی گئی اور اس طرح کے دیگر امور کو جن کی بابت قرآنی آیات میں تشدید و تاکید نظر آتی ہے۔

بہر حال دلوں کی کجی اور فتنہ جوئی کہ جن کی بنیادی وجہ دنیا پرستی، مادی لذتوں پر مرثنا اور نفسانی خواہشات کی پیروی ہے کا ازالہ و مقابلہ صرف اور صرف اس ذریعہ سے ممکن ہے کہ قیامت کے دن کی یاد تازہ رکھی جائے جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے:

سورہ ص، آیت ۲۶:

○ ”وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۗ إِنَّ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ لِّمَا نَسُوا يَوْمَهُمُ الْحِسَابَ“

(نفسانی خواہشوں کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہیں خدا کی راہ سے گمراہ کر دیں گی، بیشک جو لوگ خدا کی راہ سے بھٹک جائیں ان کے لئے سخت عذاب مقرر ہے کیونکہ انہوں نے یوم حساب کو بھلا دیا)

یہی وجہ ہے کہ راسخون فی العلم حضرات قرآن مجید کی تاویل میں ہرگز ایسی روش اختیار نہیں کرتے جس میں ان کے پروردگار کی رضائے ہو یا ان کے رب کی رضا کے منافی ہو۔ اور وہ اپنے اظہارات کے ذیل میں یہ کہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں:

”رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ أَرَادَ فِيهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْوَعْدَ“ ..... اے ہمارے پروردگار! تو ہی لوگوں کو اس دن اکٹھا کرنے والا ہے کہ جس میں کوئی شک نہیں پایا جاتا، بے شک اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

## ۲۔ محکمات کو ام الکتاب قرار دینے سے کیا مراد ہے؟

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آیات محکمات کا ام الکتاب ہونا اس بناء پر ہے کہ وہ اصل الکتاب ہیں اور انہی پر دین کے ان اصول و احکام کی بنیاد قائم و استوار ہے کہ جن پر ایمان لانا اور عمل کرنا لازم و ضروری ہے اور دین انہی دو اصولوں یعنی عقیدہ و عمل ہی کے مجموعہ کا نام ہے، اور جہاں تک آیات متشابہات کا تعلق ہے تو ان کے معانی و مراد کے غیر واضح و غیر یقینی ہونے کی وجہ سے ان پر عمل نہیں کیا جاسکتا بلکہ ان پر صرف ایمان لانا ضروری ہوتا ہے۔

اس تفسیری قول کے حوالہ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو اقوال پہلے ذکر کئے جا چکے ہیں ان میں غور و فکر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تفسیری قول انہی اقوال میں سے بعض کا لازمی نتیجہ بنتا ہے اور وہ یوں کہ ان اقوال میں سے ایک قول یہ تھا کہ متشابہ کو اس لئے متشابہ کہا جاتا ہے کہ اس کی تاویل نہایت دشوار اور اس کا فہم لامعنی بہت مشکل ہے، اور ایک قول یہ تھا کہ متشابہ کے معنی و

مراد سے آگاہی کا حصول اور اس کے الفاظ میں پائے جانے والے تشابہ کو کامل طور پر یا جزوی طور پر اس طرح دور کیا جاسکتا ہے کہ عقل و لغت یا اس عقلی طریقہ و روش کی طرف رجوع کیا جائے کہ جس سے لفظی شبہات کو دور کرنے میں مدد ملتی ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ محکمات کو اس لئے ام الکتاب کہا جاتا ہے کہ تشابہات کے فہم المعانی کے لئے ان کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور ان کے ذریعے تشابہات کے معانی واضح ہوتے ہیں، البتہ اس قول میں محکمات کی طرف ”رجوع کرنے“ کی جو بات کی گئی ہے اس کی بابت مفسرین کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ اس سے مراد کیا ہے؟ بعض حضرات کے کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تشابہات پر صرف ایمان لایا جائے اور ان کے موارد و موضوعات میں عملی اقدام کے لئے محکمات کو بنیاد قرار دیا جائے جیسا کہ منسوخ شدہ آیات میں ہوتا ہے کہ ان پر ایمان لایا جاتا ہے اور ان کے موارد میں عملی اقدام کرنے کے لئے ان کی تائید آیات کو بنیاد قرار دیا جاتا ہے، لیکن یہ قول پہلے قول سے زیادہ مختلف نہیں۔

بعض حضرات نے اس کا معنی یہ کیا ہے کہ محکمات کو اس لئے ام الکتاب کہا گیا ہے کہ وہ تشابہات کے معانی کی وضاحت کرتی ہیں اور ان میں پائے جانے والے تشابہات اور لفظی غیر واضح صورتوں کو آشکار کرتی ہیں کہ پھر تشابہات کا تشابہ باقی نہیں رہتا۔

مذکورہ بالا تین اقوال میں سے تیسرا قول صحیح و درست ہے کیونکہ آیت مبارکہ میں ”هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ“ کے الفاظ ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں ”اصل الکتاب“ ہونے سے زیادہ عمیق معنی و مفہوم ملحوظ ہے ورنہ ”أُمُّ الْكِتَابِ“ کی بجائے ”اصول الکتاب“ کہا جاتا، یہ بات مسلم ہے کہ لفظ ”أُمُّ“..... کہ جس کا لفظی ترجمہ ”ماں“ ہے..... ”رجوع“ و بازگشت کی اس حقیقت اور لطیف مفہوم کا حامل ہے کہ جس میں نشوونما، اشتقاق اور تبصیر کے معانی پائے جاتے ہیں (بچہ کی نشوونما کا مرکز ”ماں“ ہے، اشتقاق یعنی اس کے لباس و وجود میں آنے کا سبب ”ماں“ ہے، تبصیر یعنی بچہ، ماں کا جزء، حصہ و کلڑا ہوتا ہے) لہذا اس لفظ (ام الکتاب) سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ آیات تشابہات بھی اپنے مخصوص معانی پر دلالت کرتی ہیں البتہ ان کے معانی، آیات محکمات کی پیداوار ہیں اور ان کی فروع و شاخیں اور حصے و کلڑے ہیں اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آیات محکمات، تشابہات کے معانی کو واضح و آشکار کرنے والی ہیں، یعنی ان کا وجودی رتبہ ہی یہ ہے کہ وہ تشابہات کی توضیح و تشریح کرنے والی ہیں۔

اس کے علاوہ یہ امر قابل توجہ ہے کہ تشابہات کو اس بناء پر تشابہات کہا جاتا ہے کہ ان کے مرادی معانی غیر واضح ہوتے ہیں اور یہ بات آشکار نہیں ہوتی کہ وہ کن معانی پر دلالت کرتی ہیں، انہیں تاویل کی حامل ہونے کی بناء پر تشابہات سے موسوم نہیں کیا جاتا کیونکہ یہ بات تو آیات محکمات میں بھی پائی جاتی ہے کہ وہ بھی تاویل کی حامل ہیں، اور اس حوالہ سے

دونوں میں اشتراک پایا جاتا ہے یعنی تاویل کا حامل ہونا دونوں میں قدر مشترک ہے اور ایسا نہیں کہ صرف تشابہات میں یہ بات پائی جاتی ہو، اور قرآن مجید کی آیات کے درمیان باہمی ربط کی بنیاد ہی یہ ہے کہ وہ ایک دوسری کی تفسیر کرتی ہیں لہذا تشابہات کی تفسیر کرنے والی آیتیں بھی یقینی طور پر موجود ہیں اور وہ ”محکمات“ ہی ہیں ان کے علاوہ دیگر آیات اس صفت کی حامل نہیں ہو سکتیں چنانچہ اس کی ایک مثال یہ ہے:

سورہ عقیامت، آیت ۲۳:

○ ”إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ“

(اس دن چہرے اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے)

یہ آیت مشابہہ ہے کیونکہ اس میں اس امر کی وضاحت موجود نہیں کہ لوگوں کا خدا کو دیکھنا کیونکر ہوگا؟ لیکن جب اس آیت کو دیگر آیات کی طرف لوٹایا جائے تو اس کا معنی واضح ہو جائے گا مثلاً ان آیات کو مد نظر قرار دیا جائے:

سورہ شوریٰ، آیت ۱۱:

○ ”لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ“

(اس جیسی کوئی چیز نہیں)

سورہ انعام، آیت ۱۰۳:

○ ”لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ“

(آنکھیں اس کو درک نہیں کر سکتیں)

تو واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا کو دیکھنے سے مراد کیا ہے، یعنی اس کا دیکھا جانا بصری وحسی رویت کے باب سے نہیں اور اسے مادی جسمانی آنکھیں ہرگز نہیں دیکھ سکتیں، کیونکہ خداوند عالم نے دیکھنے کی نسبت دل کی طرف بھی دی ہے چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہ نجم، آیت ۱۸:

○ ”وَمَا كَذَّبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ ۖ أَفَتُنَبِّئُونَ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ ۖ ..... لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ

الْكُبْرَىٰ“

(اور دل نے جھوٹ نہیں کہا اس شے کی بابت کہ جسے اس نے دیکھا، کیا تم اس چیز کے بارے میں شک کرتے ہو جو

اس نے دیکھی..... اس نے اپنے رب کی بہت بڑی نشانیاں دیکھیں.....)

اس میں دل کی مخصوص رویت کا واضح ثبوت ملتا ہے اور اس سے غور و فکر اور سوچ مراد لینا ہرگز درست نہیں کیونکہ فکر کا

تعلق کسی چیز کے وجود کی صحت کے اثبات و تصدیق اور اشیاء کی ذہنی ترکیبات سے ہے جبکہ رویت کا تعلق وجود کی حامل مفرد چیز سے ہوتا ہے، بنا براین دل کی رویت سے مراد خاص قلبی توجہ ہے کہ جو نہ تو حسی و مادی ہے اور نہ ہی عقل و ذہن تک محدود ہے۔ بلکہ قلبی التفات کی ایک خاص صورت ہے۔۔۔۔۔۔ یہ مثال بلکہ اصول تمام تشابہات میں حکم فرما ہے (اور اسی کے تناظر میں تشابہات کی حکمت کی طرف بازگشت کا مسئلہ واضح ہو جاتا ہے اور حکمت کا نام الکتاب ہونا بھی معلوم ہو جاتا ہے)۔

### ۳۔ تاویل کا معنی کیا ہے؟

”تاویل“ کے متعدد معانی ذکر کئے گئے ہیں:

۱۔ کچھ مفسرین نے اس کا معنی ”تفسیر“ کیا ہے یعنی وہ معنی کہ جس کا ارادہ متکلم نے کیا ہو، (کلام کے مرادی معنی کو تاویل کہتے ہیں)، اور چونکہ بعض آیات کا معنی واضح و روشن ہے اور ان سے مقصود معنی ظاہر و آشکار ہے لہذا آیہ مبارکہ ”وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ“ میں تاویل سے مراد، تشابہ آیات کا مرادی معنی ہے بنا براین یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آیات تشابہات کے مرادی معانی سوائے خداوند عالم، یا خدا اور راسخون فی العلم کے، کوئی شخص نہیں جانتا،

۲۔ کچھ مفسرین نے کہا ہے ”تاویل“ سے مراد وہ معنی ہے جو ظاہر اللفظ سے مطابقت نہ رکھتا ہو (اس کے برعکس و مخالف ہو)، یہ قول اس قدر عام ہوا کہ لفظ ”تاویل“ اسی معنی میں حقیقت قرار پا گیا البتہ حقیقت ثانیہ! جبکہ لغت کے حوالہ سے اس کا معنی لوٹانا، رجوع کرنا یا لوٹایا گیا اور مرجع۔۔۔۔۔۔ جس کی طرف رجوع و بازگشت ہوئی ہو۔۔۔۔۔۔ ہے۔

بہر حال متاخرین۔۔۔۔۔۔ علماء و مفسرین۔۔۔۔۔۔ کے درمیان دوسرا معنی ہی مشہور ہے جیسا کہ قدام مفسرین کے درمیان پہلا معنی مشہور تھا۔۔۔۔۔۔ پہلا معنی سابقہ مفسرین نے اختیار کیا اور دوسرا معنی بعد میں آنے والے اہل علم حضرات نے اختیار کیا۔۔۔۔۔۔ البتہ قدیم مفسرین حضرات میں سے بعض اس بات کے قائل ہوئے کہ تاویل کا علم خداوند عالم کے سوا کسی کو حاصل نہیں اور بعض حضرات نے کہا کہ راسخون فی العلم بھی اس کا علم رکھتے ہیں چنانچہ جناب عبداللہ ابن عباس کے بارے میں منقول ہے کہ وہ کہا کرتے تھے: ”انما من الراسخين في العلم وانا اعلم تأويله“، (میں راسخون فی العلم میں سے ہوں اور میں قرآن کی تاویل کا علم رکھتا ہوں)

۳۔ کچھ حضرات نے یہ رائے پیش کی ہے کہ ”تاویل“ دراصل آیت کے معانی ہی میں سے ایک معنی ہے کہ جسے یا تو صرف خداوند عالم جانتا ہے اور یا خداوند عالم اور راسخون فی العلم جانتے ہیں ان کے سوا کوئی اس کا علم نہیں رکھتا وہ معنی ظاہر

اللفظ سے متضاد، مخالف و منافی نہیں یعنی ایسا نہیں کہ آیت کے ظاہری الفاظ سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔

اس قول کی بناء پر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ متشابہ آیت کے متعدد معانی ہیں جو ایک دوسرے سے ملے جلتے ہیں اور ان میں سے بعض معانی، ظاہر الالفاظ ہی سے سمجھے جاسکتے ہیں اور ہر شخص ان کا فہم و ادراک رکھتا ہے اور بعض معانی ظاہر الالفاظ سے کوسوں دور ہیں کہ جن کا سمجھنا ہر شخص کے بس میں نہیں اور ان تک رسائی عام انسان کی قدرت فکری سے خارج ہے ان کا علم خداوند عالم یا خدا کے علاوہ راسخون فی العلم ہی رکھتے ہیں، اس مقام پر مفسرین کرام کے درمیان ان معانی کے ظاہر الالفاظ سے ربط کی کیفیت کے بارے میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا کہ جو معانی عام انسان کی قوت فکری کی دسترس سے باہر ہیں اور خداوند عالم و راسخون فی العلم کے سوا کوئی بھی ان کا فہم و ادراک نہیں رکھتا ان کا آیت کے ظاہری لفظوں یا الفاظ کے ظواہر سے ربط کیونکر ہے؟ کیونکہ یہ بات تو یقینی ہے کہ وہ تمام معانی... الفاظ کے مرادی معانی ہونے کے حوالے سے ایک ہی جہت میں واقع نہیں یعنی ایک ہی جہت میں ایک دوسرے کے مد مقابل قرار نہیں پاسکتے ورنہ ایک لفظ کا ایک سے زیادہ معنی میں استعمال کیا جانا لازم آئے گا جو کہ صحیح نہیں اور اس کی عدم صحت بلکہ عدم جواز اپنے مقام پر واضح ہو چکا ہے (یعنی ایسا ممکن نہیں کہ متکلم اپنے بیان میں ایک لفظ سے متعدد معانی مراد لے)۔ بنا براین لامحالہ وہ معانی سلسلہ طویلہ میں قرار پائیں گے یعنی یکے بعد دیگرے قابل تصور ہوں گے لہذا ان کی بابت یوں کہا گیا کہ وہ معانی، ظاہری معانی کے لوازم (ان سے جڑے ہوئے) ہیں اور ان کے لوازم اور جڑے ہوئے ہونے کی کیفیت یہ ہے کہ ہر لفظ ایک معنی رکھتا ہے کہ جسے اس کا لازم المعنی کہا جاتا ہے اور پھر اس لازم المعنی سے ایک اور معنی جزا ہوا ہوتا ہے کہ جسے اس کا لازم المعنی کہا جاتا ہے اور پھر اس لازم المعنی سے ایک اور معنی جزا ہوا ہوتا ہے کہ جسے اس کا لازم المعنی کہتے ہیں جو کہ ”لازم لازم المعنی“ کہلاتا ہے اور اسی طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، (تو اس حوالہ سے جو معانی تاویل کہلاتے ہیں اور خدا و راسخون فی العلم کے علاوہ کوئی ان کا علم نہیں رکھتا وہ دراصل ظاہری معانی کے لوازم یعنی ان سے وابستہ ہیں)۔ بعض حضرات نے اس کیفیت کے بارے میں اس طرح کہا ہے کہ ان معانی کا باہمی ربط اس طرح سے ہے جیسے باطن کا ظاہر سے ہوتا ہے کہ جب ظاہری الفاظ سے ان کے ظاہری معروف معانی کا ارادہ کیا جاتا ہے تو وہ جہاں ظاہری معانی کا ارادہ ہوتا ہے وہاں بطنی معانی کا ارادہ بھی ہوتا ہے اس کی مثال یوں پیش کی جاسکتی ہے کہ جب آپ کسی سے کہیں کہ مجھے پانی پلاؤ، تو آپ بظاہر اس سے یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ آپ کو پانی پلائے جبکہ اس کے باطنی معانی یہ ہیں کہ گویا آپ نے اسے کہا ہے کہ:

(۱) وہ آپ کو پانی پلائے،

(۲) وہ آپ کو سیراب کرے،

(۳) آپ کے وجود کی ضرورت کو پورا کرے،

(۳) وہ آپ کو ایک وجودی کمال سے بہرہ ور کرے،

مگر آپ نے اپنے جملہ ”مجھے پانی پلاؤ“ میں بظاہر یہی بات طلب کی ہے کہ وہ آپ کو پانی لا کر دے جبکہ دیگر تین معانی باطنی طور پر آپ کا مطلوب ہے جو کہ لفظوں میں مذکور نہیں اور ایسا نہیں کہ الفاظ کو ان چار معنوں میں استعمال کیا گیا ہو اور چار چیزیں طلب کی گئی ہوں یا چار دستورات صادر کئے گئے ہوں بلکہ ایک ہی طلب درحقیقت چاروں معانی کی طلب کی حامل ہے اور وہ معانی ایک دوسرے کے باطن میں ایک دوسرے سے مرتبط ہیں اور ”پانی پلانا“ ان سب سے ربط و تعلق کا حامل اور ان پر مبنی ہے،..... یہی صورت حال آیت متشابہہ کی ہے کہ اس کے باطنی معانی اس کے ظاہری الفاظ ہی میں متکلم کی مراد ہیں اور ان سے کامل وابستگی رکھتے ہیں کہ جسے تاویل سے تعبیر کیا جاتا ہے،.....

(۴) تاویل کی بابت چوتھا قول یہ ہے کہ وہ الفاظ کے مرادی معانی کے باب سے نہیں بلکہ وہ اس حقیقت سے عبارت ہے جو کلام کی اصل و اساس ہے اور اس پر کلام قائم و استوار ہے لہذا اگر کلام انشائی ہو یعنی کسی حکم و فرمان (امر یا نہی) پر مشتمل ہو تو اس کی تاویل سے مراد وہ مصلحت و حکمت ہوگی کہ جس کی بناء پر وہ حکم و فرمان جاری کیا گیا اور اسے دستور و قانون کی شکل دی گئی، مثلاً آیت مبارکہ: ”اقیموا الصلوة“ (نماز پڑھو، نماز قائم کرو) میں اس مخصوص عمل کی انجام دہی کا جو فرمان جاری کیا گیا ہے اس کی اصل حقیقت (تاویل) نماز گزار کی وہ ظاہری نورانی حالت و کیفیت اور صورت ہے جو ظاہر بظاہر اس ایک وجود میں سمٹ کر اس کے باطن کا مظہر اور اس کی روحانی حیثیت کی عکاس کرتی ہے اور اسے برائی و منکرات سے روکتی ہے..... شاید اس وجہ سے لفظ ”قائم کرنا“ استعمال ہوا، واللہ العالم.....

یہ ہے کلام کے انشائی یعنی حکم و فرمان پر مشتمل ہونے کی صورت میں تاویل کا معنی، اور اگر کلام خبری ہو یعنی اس میں کسی گذشتہ واقعہ کی خبر دی گئی ہو تو اس کی تاویل سے مراد وہی اصل واقعہ ہوگا جو گذشتہ دور میں رونما ہوا، اس کی مثال وہ آیات مبارکہ ہیں جن میں سابقہ انبیاء علیہم السلام اور پہلی قوموں کی سرگذشت بیان ہوئی ہے تو ان آیات کی تاویل سے مراد وہ اصل واقعات ہیں جو سابقہ زمانہ میں وجود پذیر و رونما ہوئے، اگر ان حالات و واقعات کہ جن کی خبر دی گئی ہو، کا تعلق زمانہ ماضی سے نہ ہو بلکہ ان کا تعلق زمانہ حال و مستقبل سے ہو تو اس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) جن امور کی خبر دی گئی ہے وہ ظاہری حواس یا عقلی فہم و ادراک کی دسترس میں ہیں (انہیں ظاہری حواس یا عقل و فکر کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے) تو ان کی تاویل وہی امور ہیں جو ظاہر بہ ظاہر وجود میں آئے یا آئیں گے جیسا کہ ماضی میں رونما ہونے والے واقعات کی بابت ذکر کیا گیا ہے، مثلاً آیت مبارکہ: ”وَفِيكُمْ سَمْعُونُ لُؤْمُ“ (سورہ توبہ، آیت ۷۴) اور تم میں ان کے جاسوس موجود ہیں..... اس آیت میں زمانہ حال میں پائے جانے والے امر کا ذکر ہوا ہے اور اس

کی تاویل وہاں موجود ان افراد سے عبارت ہے جو مومنین کے درمیان پائے جاتے ہیں جبکہ وہ ان کے دشمنوں کے لئے جاسوسی کا کام کرتے ہیں، یا آیه شریفہ: ” غَلَبَتِ الرُّؤْمُ الْفِئَةِ اَذْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَعْلَبُونَ ﴿۶۵۱﴾ ” (سورہ روم، آیات ۲، ۳، ۴)..... رومیوں نے شکست کھائی، قریب ترین علاقہ میں، اور وہ شکست کھانے کے بعد بہت جلد پھر غالب آجائیں گے، چند ہی سالوں میں!

اس آیت میں مستقبل کی خبر دی گئی اور پیش گوئی کی گئی ہے، تو اس کی تاویل وہ اصل واقعات ہیں جو مستقبل میں رونما ہوں گے۔

(۲) جن امور کی خبر دی گئی ہے وہ ان غیر امور میں سے ہیں جو آئندہ وجود پائیں گے کہ جو نہ تو ہمارے حواس کی دسترس میں ہیں اور نہ ہی ہماری عقلیں ان کی اصل و حقیقت کو سمجھ سکتی ہیں مثلاً وہ امور جن کا تعلق روز قیامت سے ہے یعنی اس کا دن اور وقت، مردوں کے زندہ ہو کر دوبارہ اٹھائے جانے کی کیفیت اور ان سب کا ایک جگہ اکٹھا ہونا، سوال و جواب اور حساب و کتاب اور اعمال ناموں کا سامنے آنا وغیرہ، اسی طرح وہ امور کہ جن کا تعلق کسی وقت و زمانہ سے نہیں اور نہ وہ زمانی و مکانی اشیاء و امور کی سطح سے ہیں مثلاً صفات و افعال خداوندی کی حقیقت، تو ان کی تاویل بھی وہی حقائق ہیں، البتہ ان آیات میں کہ جو صفات و افعال خداوندی اور قیامت کے دن اور اس کے مربوطہ احوال جیسے امور کے ذکر پر مشتمل ہیں دیگر آیات تشابہات سے مختلف صورتحال پائی جاتی ہے اور ان کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ دیگر آیات میں جن امور کا تذکرہ ہوا ہے ان کی تاویل سے آگاہ ہونا ممکن ہے جبکہ غیر امور اور صفات و افعال خداوندی و روز قیامت سے مربوطہ امور اس طرح نہیں اور ان سے آگاہ ہونا ممکن نہیں کیونکہ ان کا علم اور ان کی تاویل سے آگاہی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اس کے سوا کوئی ان کی حقیقی تاویل یا حقیقت التاویل سے آگاہ نہیں، البتہ ”رَأْسُ حُوتٍ فِي الْعِلْمِ“ اسی حد تک اس سے آگاہ ہو سکتے ہیں جس حد تک خداوند عالم انہیں علم دے اور ان کی عقلی توانائی و توانمندی کے مطابق انہیں کچھ عطا کرے، لیکن ان امور کی اصل حقیقت جو کہ ان کی حقیقی تاویل ہے وہ بنیادی طور پر علم خداوندی ہی سے مختص ہے۔

یہ ہیں وہ چار اقوال و آراء جو تاویل کے معنی کی بابت ارباب فکر و نظر نے پیش اور ذکر کی ہیں، ان کے علاوہ بھی متعدد دیگر اقوال موجود ہیں جو ان اہل فن حضرات نے ذکر کئے ہیں جو کہ درحقیقت مذکورہ بالا اقوال میں سے پہلے قول ہی کی شاخیں ہیں اگرچہ ان کے قائل حضرات پہلے قول کو درست تسلیم کرنے سے وحشت زدہ ہیں، وہ اقوال سات ہیں اور ان کی تفصیل یوں ہے:

## تفسیر وتاویل کی بابت سات اقوال

- (۱) ”تفسیر“ اور ”تاویل“ میں یہ فرق ہے کہ تفسیر، تاویل سے زیادہ عمومیت رکھتی ہے..... اس کا دائرہ تاویل سے زیادہ وسیع ہے..... اور اسے الفاظ اور ان کے مفردات و حروف میں استعمال کیا جاتا ہے جبکہ ”تاویل“ کا زیادہ تر استعمال معانی اور جملوں میں ہوتا ہے، اس کے علاوہ لفظ ”تاویل“ عام طور پر آسانی کتب کی بابت استعمال ہوتا ہے جبکہ لفظ ”تفسیر“ آسانی کتب کے علاوہ دیگر کتب کی بابت بھی استعمال کیا جاتا ہے۔
- (۲) ”تفسیر“ کا معنی یہ ہے کہ لفظ سے اس کے اس معنی کو بیان کیا جائے کہ جس میں ایک ہی جہت کا احتمال پایا جاتا ہو جبکہ ”تاویل“ سے مراد لفظ کے چند احتمالی معانی میں سے کسی ایک معنی کو مشخص کرنا ہے کہ جو بذریعہ استنباط اور دلیل کی بنیاد پر ہوتا ہے۔
- (۳) ”تفسیر“ سے مراد، لفظ سے اس کے قطعی و یقینی معنی کو بیان کرنا ہے جبکہ ”تاویل“ سے مراد، لفظ کے چند احتمالی معانی میں سے کسی ایک معنی کو ترجیح دینا ہے بشرطیکہ وہ معانی غیر قطعی و غیر یقینی ہوں، یہ قول دوسرے قول سے قریب تر ہے۔
- (۴) ”تفسیر“ کا معنی، مرادی معانی کی دلیل کو بیان کرنا ہے جبکہ ”تاویل“ کا مطلب حقیقت المراد کو بیان کرنا ہے، چنانچہ اس کی مثال یوں ہے: خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ”إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ“ (سورہ فجر، آیت ۱۴)۔ تیرا رب، گھات میں ہے..... اس کی تفسیر یہ ہے کہ لفظ ”مرصاد“ بروزن مفعال (میم کے نیچے زیر کے ساتھ) ”رصد“ سے مشتق ہے جس کا معنی گھات میں ہونا اور نگرانی کرنا ہے، اور اس کی ”تاویل“ یہ ہے کہ آیت مبارکہ میں لوگوں کو خدائی احکام و دستورات کی بابت بے توجہی و غفلت برتنے سے دور رہنے کی تاکید کی ہے۔ اور انہیں خبردار کیا ہے، کہ وہ تمہاری کمین اور گھات میں ہے لہذا اس کے فرامین کی بجا آوری میں کسی طرح سے سستی و کوتاہی سے کام نہ لیں.....
- (۵) ”تفسیر“ سے مراد، لفظ کے ظاہری معنی کو بیان کرنا ہے جبکہ ”تاویل“ اس کے مشکل معنی کے بیان سے عبارت ہے۔
- (۶) ”تفسیر“ کا تعلق روایت سے ہے یعنی روایت کے ذریعے آیت کا معنی سمجھا جائے جبکہ ”تاویل“ سے مراد یہ ہے کہ آیت کا معنی درایت اور غور و فکر کے ذریعے سمجھا جائے۔
- (۷) ”تفسیر“ کا تعلق آیت کے معنی پر کان دھرنے اور اس پر عمل کرنے سے ہے جبکہ ”تاویل“ غور و فکر اور استنباط کے ذریعے آیت کے معنی کو سمجھنے سے زیادہ کسی چیز کا نام نہیں۔



مذکورہ بالا اسات اقوال درحقیقت مقدم الذکر چار اقوال میں سے پہلے قول ہی کے شعبے اور اس کی شاخیں ہیں لہذا جو اشکال و اعتراض اس قول پر وارد ہوا تھا وہ یقیناً ان سب پر وارد ہوتا ہے، بہر حال نہ تو ان چار اقوال کو درخور اعتناء قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی ان سے مربوط آراء و اقوال کو کسی اہمیت کی نظر سے دیکھا جاسکتا ہے کیونکہ:

### (۱) اجمالی جواب:

قارئین کرام بخوبی آگاہ ہیں کہ آیت کی تاویل سے وہ مفہوم مراد نہیں جس پر آیت دلالت کرتی ہو کہ خواہ ظاہر الّا یہ سے عدم مطابقت کا حامل ہو یا مطابقت کا حامل ہو، بلکہ ”تاویل“ دراصل عالم الخارج میں پائے جانے والے حقیقی امور میں سے ایک ہے لیکن اس سے یہ غلط فہمی پیدا نہ ہو کہ عالم الخارج میں وجود پذیر ہونے والا ہر امر اس کا مصداق بن سکتا ہے اور اسے ”تاویل“ سے موسوم کیا جاسکتا ہے، ہرگز ایسا نہیں بلکہ عالم الخارج میں پائے جانے والے اس خاص و مخصوص امر کو ”تاویل“ کا مصداق قرار دیا جاسکتا ہے کہ جو کلام سے اس طرح کی نسبت رکھتا ہو جو مثل کی مثال سے اور باطن کی ظاہر سے ہوتی ہے، (مثل یعنی جس کی مثال دی گئی ہو اور مثل (م اورث پر زبر کے ساتھ) سے مراد وہ چیز جو کسی شے کا مظہر ہو)۔

### (۲) تفصیلی جواب:

پہلے قول پر ہی ایک بنیادی اعتراض وارد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس سے کم از کم یہ غلط نتیجہ ظاہر ہوگا کہ قرآن مجید کی بعض آیات ایسی ہیں کہ ان کی تاویل یعنی تفسیر اور الفاظ سے سمجھے جانے والے مرادی معانی عامۃ الناس کی قوت فہم و ادراک کی دسترس سے باہر ہوں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید میں اس طرح کی کوئی آیت یا آیات موجود نہیں کیونکہ قرآن ایسی عظیم کتاب ہے جس کا واضح لفظوں میں یہ اعلان ہے کہ اسے اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ فہم و ادراک کی قوتیں اسے پاسکیں اور ہر شخص اس کے معانی و مراد سے آگاہی کی نعمت سے بہرہ ور ہو سکے، بنا براین مذکورہ رائے کے قائل کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہ جاتا کہ وہ اس نظریہ کو اختیار کر لے کہ آیات تشابہات صرف اور صرف وہ حروف مقطعه ہیں جو سورتوں کی ابتداء میں ذکر ہوئے ہیں کیونکہ ان کے معانی کا ادراک عام فہم نہیں اور عمومی قوت فہم کو ان تک دسترس حاصل نہیں، لیکن اس نظریہ کی صحت پر کوئی دلیل موجود نہیں اور صرف یہ بات کافی نہیں کہ دونوں لفظوں یعنی ”تاویل“ اور ”تفسیر“ میں چونکہ رجوع اور بازگشت کا معنی پایا جاتا ہے لہذا دونوں کی حقیقت ایک ہے اور ”تاویل“ ہی تفسیر ہے، ایسا ہرگز نہیں کیونکہ اس طرح ہر لفظ کے بارے میں کہا جانے لگے گا کہ جو کہ درست نہیں مثلاً لفظ ”ام“ جس کا ترجمہ ”ماں“ ہے اور وہ اپنی اولاد کی جائے رجوع ہوتی ہے یعنی اولاد کی بازگشت ماں کی طرف ہوتی ہے جبکہ اسے اولاد کی تاویل قرار نہیں دیا جاسکتا، اسی طرح ”رئیس“ و سردار اپنے مروض و رعیت کی جائے رجوع ہوتا ہے اور اس کی طرف ان کی بازگشت ہوتی ہے لیکن وہ ان کی ”تاویل“ نہیں کہلاتا، اس کے علاوہ یہ امر قابل توجہ ہے کہ آیہ مبارکہ میں جملہ ”ابتغاء الفتنة“ آیا ہے یعنی وہ لوگ فتنہ پروری کے

لئے آیات تشابہات کی پیروی کرتے ہیں، تو اس میں آیات تشابہات کو فتنہ جوئی کے لئے استعمال کیا جانے والا ذریعہ قرار دیا گیا ہے جبکہ فتنہ جوئی کے لئے حروف مقطعه کی بجائے دیگر آیات کی پیروی کو اختیار کیا گیا ہے اور کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی نے حروف مقطعه کی پیروی کو ذریعہ فتنہ پروری قرار دیا ہو بلکہ عام مشاہدہ میں یہ بات آئی ہے کہ اسلام میں فتنہ پروری کا بازار گرم کرنے میں صفات خداوندی پر مشتمل آیات اور احکام کے علل و اسباب کی مہم جوئی کو ذریعہ قرار دیا گیا ہے..... جبکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ صفات خداوندی پر مشتمل آیات کے معانی و مفہیم کا ادراک اور احکام الہیہ کی علل و اسباب سے آگاہی کا مسئلہ آسان نہیں اور اسی وجہ سے ان آیات کو تشابہات سے موسوم کیا جاتا ہے کہ جن کا علم خداوند عالم کے علاوہ ان راسخون فی العلم کو ہے جو خدا کی طرف سے اس مقدس عطیہ سے بہرہ ور ہوئے ہوں، م.....

یہ تھا پہلا قول اور اس کا جواب!

جہاں تک دوسرے قول کا تعلق ہے تو اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ:

اس سے یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ قرآن مجید میں کچھ آیات ایسی موجود ہیں کہ جن سے ان کے ظاہری معانی کے برعکس معانی مراد لئے گئے ہیں کہ جن سے دین میں فتنہ پروری کی راہ ہموار ہوتی ہے، انہی کی وجہ سے آیات حکمت سے ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے، تو نتیجتاً قرآنی آیات کے درمیان اختلاف و ناہم آہنگی کا پایا جانا مسلم ہو جائے گا کہ جس کا دور کرنا صرف اسی صورت میں ممکن ہوگا کہ بعض آیات سے ان کے ظاہری معانی مراد نہ لئے جائیں اور ان کی بجائے ایسے معانی کا تصوراتی تعین کیا جائے جو عام فہم نہ ہوں اور عمومی قوت فہم و ادراک کی دسترس سے باہر ہوں، جبکہ یہ بات اس قرآنی حجت و استدلال اور مدلل اظہار و اعلان سے متضاد ہی نہیں بلکہ اس کو غلط و نادرست قرار دیئے جانے کی ایک صورت ہوگی کہ جس میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ نساء، آیت ۸۲:

○ ” أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ ۗ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا“

(کیا وہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے کہ اگر وہ اللہ کے علاوہ کسی اور شخص کی طرف سے ہوتا تو وہ لوگ اس میں

بہت زیادہ اختلاف پاتے)

اس آیت میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ قرآن مجید میں کسی طرح کا کوئی اختلاف و دورنگی اور ناہم آہنگی نہیں پائی جاتی اور آیت کے الفاظ صراحت کے ساتھ اس حقیقت پر دلالت کرتے ہیں کہ قرآن مجید ہر طرح کے اختلاف سے مبرا ہے، اور اگر دو آدمیوں کے درمیان عدم اختلاف کا مسئلہ اس طرح حل کیا جائے کہ ان میں سے کسی ایک یا دونوں سے ان کے ظاہری معانی کے علاوہ معانی مراد لئے جائیں بلکہ وہ تاویلی معانی مراد لئے جائیں کہ جن کا علم خداوند عالم کے سوا کسی کو

حاصل نہیں تو اس صورت میں آیہ مبارکہ (سورہ نساء، ۸۲) میں ذکر کئے جانے والے استدلال و حجت کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں رہتی کیونکہ کسی بھی کلام میں خواہ وہ غیر خدا کا ہی کیوں نہ ہو اس طرح تا ویلی معانی مراد لے کر اختلافی صورت کو ختم کرنا آسان و ممکن امر ہے اور کسی کلام میں عدم اختلاف سے مراد ہرگز یہ نہیں لیا جاسکتا کہ جہاں کہیں اختلافی صورت نظر آئے وہاں کلام کو اس کے ظاہری معانی سے پھیر کر اس سے دیگر معانی مراد لئے جائیں تاکہ یہ نہ کہا جاسکے کہ اس میں اختلاف پایا جاتا ہے بلکہ تا ویلی معانی مراد لے کر اختلاف کی نفی کر دی جائے، اس طرح کلام الہی کی عظمت متزلزل ہو جائے گی کیونکہ اس کا دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف و ناہم آہنگی نہیں پائی جاتی اور اگر عدم اختلاف کے حوالہ سے مذکورہ طریقہ اپنایا جائے تو اختلاف سے مبرا و منزہ ہونے کی جو صفت و خصوصیت کلام خدا میں پائی جاتی ہے وہ اس کا امتیازی حوالہ نہ رہے گا اور اس کے غیر بشر کا کلام ہونے کا ثبوت ہی باقی نہ رہے گا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا عدم اختلاف ہی اس کے غیر بشر کا کلام ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے بلکہ کہا جاسکے گا کہ جس طرح ہر کلام اور کلام کے الفاظ میں بظاہر دکھائی دینے والا اختلاف تا ویلی معانی مراد لے کر دور کیا جاسکتا ہے اسی طرح قرآنی آیات میں بھی ممکن ہے کیونکہ جس کتاب و کلام کا مطالعہ کریں اس میں یہ صورت نظر آتی ہے یہاں تک کہ یقینی طور پر جھوٹ و لغو پر مشتمل کلام میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے کہ تا ویلی معانی لے کر اسے سچ و حق سے مطابقت کا حامل قرار دیا جاسکتا ہے اور اس کے ظاہری الفاظ سے مختلف معانی مراد لے کر اس کی اصل حقیقت و صورت پر پردہ ڈالا جاسکتا ہے، بنا بر این مذکورہ بالا طریقہ سے عدم اختلافات کا دعویٰ کرنا قرآن مجید کی امتیازی عظمت کو ثابت نہیں کر سکتا اور نہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ کلام اپنی مجموعی صورت میں اس طرح ہے کہ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ اس اس ہستی کا کلام ہے جو زمانی و مکانی حالات و کیفیات سے مبرا، آراء و نظریات کے تناقض سے منزہ، سہو و نسیان و خطا سے پاک اور گردش لیل و نہار و رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ تدریجی طور پر روبہ کمال نہیں۔ جبکہ آیہ مبارکہ (سورہ نساء، ۸۲) اس حقیقت کے بیان اور اس استدلال پر مشتمل ہے کہ قرآن مجید بشر کا کلام نہیں کہ جس میں اختلاف پایا جاتا ہو..... بلکہ وہ اس ہستی کا کلام ہے جو کسی طرح کے تغیر و تبدل سے دو چار نہیں ہوتی، اس کی آراء میں دورگی و تناقض نہیں پایا جاتا، اس پر سہو و نسیان و خطا کا غلبہ نہیں ہوتا اور اس کا کمال رفتار زمانہ کا مرہون منت نہیں..... لہذا یہ آیت مبارکہ اپنے خاص انداز بیان و مخصوص طرز اظہار کی بناء پر صراحت کے ساتھ اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ قرآن مجید عام فہم معانی رکھتا ہے اور اس کے الفاظ سے مراد معانی کا ادراک عمومی قوت فہم سے خارج نہیں اور اس کے الفاظ و معانی بحث و تحقیق اور غور و فکر و تدبر کے متقاضی ہیں، اس میں کوئی آیت ایسی نہیں پائی جاتی جس کے الفاظ سے ایسے معانی مراد لئے گئے ہوں جو عربی کلام کے ظواہر سے منافی و متصادم ہوں یا ان میں معممہ سازی اور بیان کے سچ و خم پائے جاتے ہوں۔

اب تیسرے قول کی بابت عرض ہے کہ اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ قرآنی

آیات مبارکہ ایسے معانی پر مشتمل ہیں کہ جن میں سے بعض دوسرے بعض سے وابستہ اور وہ ایک دوسرے پر فوقانی و تحتانی درجات میں ہیں تو اس سے سوائے اس کے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جو قوت تفکر و تدبیر سے محروم ہو لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ تمام معانی..... بالخصوص وہ معانی کہ جو تحت اللفظی معانی سے جڑے ہوئے ہیں اور ان کے لوازم المعنی کہلاتے ہیں..... قرآنی الفاظ ہی کے معانی ہیں البتہ ان کے سمجھنے میں جو فرق و اختلاف پایا جاتا ہے اس کی وجہ سمجھنے والے شخص اور سننے والے فرد کی قوت فکر و ذکاوت ذہن یا ضعف و ناتوانی فکر اور کندی ذہن ہے کہ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام لوگ ان تمام معانی کو پورے طور پر ذرک نہ کر سکیں، لہذا اس بات کا تعلق ”تاویل“ سے نہیں کہ جس کے بارے میں خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے: ”وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ“، (اس کی تاویل خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا)، کیونکہ بلند پایہ معارف و حقائق اور گہرائی و گیرائی کے حامل مسائل کی بابت اذہان و افکار کا فرق افراد کے تقویٰ و پاکیزگی نفس کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ تیزی و تندگی فکر و نظر اور سستی و کندی فہم و درک کا نتیجہ ہوتا ہے البتہ تقویٰ و پاکیزگی نفس، پاکیزہ معارف و خدائی مقدس علوم و حقائق کے ادراک میں ملحوظ و مقصود اور موثر واقع ہونے والی اعلیٰ ترین صفات ہیں کہ خدائی پاکیزہ معارف یقیناً پاکیزہ ظرف چاہتے ہیں لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ تقویٰ و پاکیزگی نفس ہی ان کے ادراک کا کامل و واحد سبب ہے جیسا کہ آیت کے ظاہری الفاظ ہی سے واضح ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ”وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ“..... اس کی تاویل سوائے خداوند عالم کے کوئی نہیں جانتا.....

اب رہا جو تھا قول، تو اس کی بابت یہ اعتراض سامنے آتا ہے کہ اگرچہ اس کی بعض شقیں درست ہیں لیکن دیگر بعض شقیں میں نادرستی پائی جاتی ہے، اور وہ یوں کہ اس میں یہ بات تو صحیح ہے کہ تاویل کا دائرہ، آیات و تشابہات تک محدود نہیں بلکہ پورا قرآن تاویل کا حامل ہے اور یہ کہ تاویل سے مراد وہ معانی نہیں کہ جن پر الفاظ دلالت کرتے ہیں بلکہ وہ ان سے باہر اور عالم الخارج میں پائے جانے والے حقیقی امور ہیں کہ جن پر کلام کی بنیاد قائم و استوار ہے، لیکن اس قول کے قائل سے یہ غلطی سرزد ہوگی کہ اس نے عالم الخارج میں وجود پانے والے ہر امر کو مضمون کلام سے مربوط قرار دے دیا ہے یہاں تک کہ ان روایات کو بھی تاویل کا مصداق مان لیا جن میں سابقہ زمانوں اور گذشتہ اقوام کی داستانیں مذکور ہیں اور پچھلے ادوار میں رونما ہونے والے واقعات کا تذکرہ ہے، اور اس نے اس سلسلہ میں بھی غلطی کا ارتکاب کیا کہ آیات و تشابہات کو انہی آیات میں منحصر قرار دے دیا جن میں صفات خداوندی اور روز قیامت کے حالات ذکر کئے گئے ہیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ: اس قول کی بناء پر لفظ ”تاویل“ کی بابت بحث ہوگی کہ آیت میں اس کا تعلق و اشارہ کس طرف ہے، اگر یہ کہا جائے کہ جملہ ”وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ“ میں ضمیر (ہ) کی بازگشت پورے قرآن کی طرف ہے اور اس کا مرجع ”الکتاب“ ہے تو اس صورت میں جملہ ”وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ“ اس سے ہم آہنگ نہ رہے گا کیونکہ تاویل قرآن

کا کثیر حصہ ایسا ہے کہ جسے غیر خدا اور غیر راہِ حق فی العلم اور عوام الناس بلکہ دلوں کی کجی کی بیماری میں مبتلا افراد بھی سمجھ سکتے ہیں اور ان سے آگاہ ہو سکتے ہیں مثلاً داستانیں و واقعات، احکام و دستورات اور اخلاقی ارشادات پر مشتمل آیات، تو جو آیات رونما ہونے والے واقعات پر مشتمل ہیں ان میں مذکور باتوں کو سمجھنا تمام لوگوں کے دائرہ فہم و ادراک میں آتا ہے اور کوئی ان سے آگاہی حاصل کرنے سے محروم نہیں ہوتا، نہ ہی ان سے عدم آگاہی کسی ٹھوس و مفید نتیجہ کا سبب بن سکتی ہے بلکہ اس کی کوئی وجہ بھی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اخلاقی حقائق اور خدائی احکام و دستورات مثلاً عبادات و معاملات اور دیگر شرعی فرامین سے حاصل ہونے والے فوائد بھی ایسے ہیں کہ ان کا ادراک تمام افراد بشر کر سکتے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ لوگ اس سے محروم ہوں، اور اگر یہ کہا جائے کہ آیت میں تاویل سے مراد فقط آیات تشابہات کی تاویل ہے تو اس صورت میں ان کی ”تاویل“ کے علم کا خداوند عالم کی ذات اقدس سے اختصاص و حصر درست پائے گا کہ جس کا ذکر اس جملہ میں ہوا ہے ”وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ“، اور یہ بات ثابت ہوگی کہ خداوند عالم اور راہِ حق فی العلم کے علاوہ کسی کو ہرگز روا نہیں کہ آیات تشابہات کی تاویل ڈھونڈنے نکلے کیونکہ ان کے ایسا کرنے سے فتنہ کو ہوا ملے گی اور ضلالت و گمراہی پھیلے گی، لیکن اس قول سے ایک خرابی لازم آتی ہے اور وہ یہ کہ آیات تشابہات کو صرف انہیں آیات سے مختص و محدود قرار دینا کہ جو خداوند عالم کی صفات، اور روز قیامت کے حالات کے ذکر پر مشتمل ہیں بلا دلیل ہے کیونکہ جس طرح اس طرح کی آیات کی تاویل جوئی سے فتنہ و گمراہی کو ہوا ملتی ہے اسی طرح دیگر آیات تشابہات کی تاویل جوئی کا نتیجہ بھی یہی ہے مثلاً آیات احکام و آیات القصص وغیرہ، کہ ان میں سے تشابہات کی تاویل جوئی سے بھی فتنہ و گمراہی کے اسباب فراہم ہوتے ہیں، چونکہ آیات الاحکام ہی کے حوالہ سے اگر یہ کہا جائے (جیسا کہ کہا گیا ہے) کہ دین و شریعت اور احکام و دستورات الہی کا اصل مقصد انسانی معاشرہ کا احیاء ہے کہ جو اس کے امور میں اصلاحی عمل کے ذریعے اس طرح ممکن ہے کہ ان احکام کو معاشرہ پر منطبق کیا جائے اور معاشرتی حالات و امور سے ہم رنگ کیا جائے لہذا جب مقصد و مقصود ہی یہ ہے کہ معاشرہ میں بہتری برقرار ہو تو اگر ایسا ہونا شرعی حکم کی عملداری و نفاذ کے بغیر ممکن ہو جائے یا ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ شرعی حکم کی تطبیق میں معاشرہ کی بہتری نہ ہو تو ضروری ہوگا کہ شرعی حکم کے علاوہ دوسرے کسی حکم و اصول کو اپنایا جائے اور دینی شرعی حکم کو چھوڑ دیا جائے، یہ بات اس طرح سے ہے جیسے کوئی شخص یوں کہے (جیسا کہ کہا بھی گیا ہے) کہ قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کی جن کرامات کا تذکرہ ہوا وہ سب عام امور ہیں مگر انہیں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ عام و عادی امور نہیں بلکہ معجزات وغیرہ ہیں۔ تاکہ عوام الناس کی توجہات ان کی طرف جذب کی جائیں اور ان کے دلوں کو ان کی طرف کھینچا جائے کہ وہ حقیقتاً قرآن ہوں اور عام و عادی امور کو خارق العادت اور مانوق الطبیعیہ سمجھیں، اس طرح کے اقوال و نظموں اور اسلامی مذاہب میں کثرت سے پائے جاتے ہیں اور اسلام کے نام پر وجود میں آنے والے مسالکت نے اس طرح کے نظریات کو خوب ہوا دی

ہے جبکہ وہ سب کے سب قرآن کی تاویل کے نام پر فتنہ جوئی کی مذموم غرض کے حصول کے لئے ہیں اور اس میں کسی طرح کا کوئی شک و شبہ نہیں پایا جاتا کہ اس طرح کی باتیں کرنے والوں کا مقصد لوگوں میں فتنہ پردازی اور غلط عقائد کی ترویج کے سوا کچھ نہیں، بنا براین آیات تشابہات کو آیات الصفات اور آیات القیامت تک محدود اور انہی سے مختص قرار دینا بلاوجہ ہے اور اسے قرین صحت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

قارئین کرام! مذکورہ بالا مطالب سے آگاہی کے بعد آپ کو یہ بات معلوم ہو چکی ہوگی کہ ”تاویل“ کی بابت حق و بجا قول یہ ہے کہ وہ ایک واقعی حقیقت ہے کہ جس پر تمام قرآنی بیانات خواہ ان کا تعلق احکام سے ہو یا اخلاقیات سے اور موعظہ و نصیحت سے ہو، قائم و استوار ہیں اور وہ تمام آیات کی اصل و اساس ہے، خواہ وہ آیات حکمت ہوں یا آیات تشابہات ہوں، ان سب میں ”تاویل“ کو بنیادی روح کی حیثیت حاصل ہے اور وہ ”مفہم“ کے باب سے بھی نہیں کہ جن پر الفاظ دلالت کرتے ہیں (یعنی ان امور میں سے نہیں جو الفاظ کے ذریعے ذہنوں تک پہنچتے ہیں) بلکہ وہ ان بلند پایہ حقیقی امور سے عبارت ہیں کہ لفظوں کو ان تک رسائی حاصل ہی نہیں، الفاظ اپنی تنگ دامنگی کی وجہ سے ان کے پانے سے قاصر ہیں، جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ خداوند عالم نے ان حقیقتوں کو الفاظ کے قالب میں ڈھالا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ذہنوں کو ان سے قریب تر کرنے کا یہی طریقہ ہے، گویا خدا کا کلام اور آیات کے الفاظ ان مثالوں کی طرح ہیں جو مقاصد کی تفہیم کے لئے پیش کی جاتی ہیں اور ان کے ذریعے متکلم اپنے مطلوبہ معانی کو سننے والے کے ذہن سے قریب تر کرتا ہے تاکہ وہ اپنی قوت فہم سے ان کو سمجھ سکے..... اور متکلم، اپنی بات سامع کو با آسانی سمجھا سکے.....، جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ زخرف، آیت ۴:

○ ” وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ ۙ إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ وَإِنَّ فِي أُمِّ الْكِتَابِ لَدَلِيلًا لِّعَلَّكُمْ تُحْكِمُونَ ۙ“

(کتاب مبین کی قسم! ہم نے اسے عربی زبان کی عام پڑھی جانے والے کتاب بنایا ہے تاکہ تم سمجھ سکو، درحقیقت وہ ہمارے پاس ام الکتاب نہایت بلند مرتبہ و عظیم دانائی کی حامل ہے)

یہی بات قرآن مجید میں مختلف مقامات پر صراحت و اشارہ دونوں صورتوں میں بیان کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ آپ سابقہ بیانات سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ قرآن مجید نے لفظ ”تاویل“ کو جہاں جہاں استعمال کیا ہے..... اور جیسا کہ شمار کیا گیا ہے وہ ۱۶ مقامات ہیں..... تو ہر جگہ اس کا یہی معنی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔

## ۴۔ کیا خدا کے علاوہ کوئی شخص تاویل قرآن کا علم رکھتا ہے؟

یہ مسئلہ بھی مفسرین کرام کے درمیان سخت اختلافی ہے اور اس کی بابت ان کی آراء بہت مختلف ہیں، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انہوں نے جملہ ”وَالرَّسُخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا.....“ کی مختلف تفسیریں کیں اور ہر شخص نے اپنے ذوق علمی کے مطابق اس کا معنی پیش کیا اور اس سلسلہ میں کسی نتیجہ تک نہ پہنچے کہ آیا اس میں حروف ”واو“ عاطفہ ہے یا مستأنفہ؟ (اگر عاطفہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح خداوند عالم تاویل قرآن کا علم رکھتا ہے اس کے ساتھ ساتھ ”رَا سِخُونَ فِي الْعِلْمِ“ بھی اس کا علم رکھتے ہیں یعنی جملہ ”رَا سِخُونَ فِي الْعِلْمِ“ کا عطف ”اللہ“ کی طرف ہے اور وہ بھی ”یعلّمہ“ کا فاعل ہے۔ جیسا کہ عام جملوں میں کہا جاتا ہے کہ ”یہ کام میں نے کیا ہے اور زید نے“ تو اس میں ایک کام کے دو فاعل لفظ ”اور“ کے ذریعے ذکر کئے جاتے ہیں، اور اگر مستأنفہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حرف واو کے ذریعے نئے جملہ کا آغاز ہوا ہے اور اس کا پہلے جملہ سے لفظی تعلق نہیں، م) عاطفہ قرار دینے کی صورت میں معنی یوں ہوگا کہ تشابہات کی تاویل کا علم خدا اور راسخون فی العلم کو ہے، اس رائے و قول کو بعض قدماء مفسرین، شافعی مسلک سے تعلق رکھنے والے اہل علم و فن اور اکثر شیعہ مفسرین نے اختیار کیا ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ حرف واو، عاطفہ ہے اور راسخون فی العلم تشابہات قرآن کا علم رکھتے ہیں،

دیگر متعدد قدماء اور اہل سنت میں سے حنفی مسلک کے پیروکار مفسرین نے کہا ہے کہ حرف واو، مستأنفہ ہے اور یہاں سے نیا جملہ شروع ہوتا ہے لہذا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی شخص تاویل کا علم نہیں رکھتا اور وہ صرف اور صرف علم الہی کا خاصہ ہے۔ دونوں آراء کے حامل مفسرین نے اپنے اپنے دعویٰ و نظریہ اور تفسیری مسلک کی صحت پر دلائل قائم کئے ہیں چنانچہ مقدم الذکر قول کو اختیار کرنے والوں نے کثیر استدلالی صورتیں ذکر کیں اور بعض روایات کو بھی اپنی صحت گفتار کی تائیدی دلیل قرار دیا، اسی طرح مؤخر الذکر مفسرین نے بھی کئی دیگر دلائل کے ساتھ ساتھ ان متعدد روایات کے بارے میں استدلال کیا جن میں یہ مطلب بیان کیا گیا ہے کہ تشابہات کی تاویل کا علم خداوند عالم کے ساتھ مختص ہے۔

دونوں مسلک کے پیروکار، مفسرین عرصہ دراز تک اپنے اپنے نظریات کی صحت اور دوسروں کو باطل قرار دینے میں مصروف رہے اور سالہا سال اس کام میں گزار دیئے۔

اس مقام پر جو اہم نکتہ قابل ذکر ہے وہ یہ کہ اس موضوع کی بابت علمی تحقیق کے مراحل طے کرنے والے اہل علم و دانش پر لازم ہے کہ وہ اس مطلب کی طرف توجہ رکھیں کہ یہ مسئلہ جب سے شروع ہوا اختلافی رہا اور اس کی بابت ارباب تحقیق

کی آراء و نظریات کے مختلف ہونے کے باوجود اس کی اصل حقیقت کے بارے میں غلط فہمی ہوئی اور مربوط مطالب خلط ملط ہو گئے، چنانچہ یہ بات ہی واضح نہ ہوئی کہ تشابہ کو محکم کی طرف پلٹانے سے کیا مراد ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تشابہ اور محکم کے درمیان پائے جانے والے ربط و تعلق اور مسئلہء تاویل کے درمیان خلط ملط پیدا ہو گئی، دوسرے لفظوں میں یہ کہ آیت مبارکہ میں ”تاویل“ کے حوالہ سے آیات متشابہات سے مرادی معانی کے فہم و ادراک کی صورت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں ہمارے ادعاء کی صحت کا واضح ثبوت ہمارے عنوان کردہ موضوع کے الفاظ اور اس پر اختلافی آراء کے بیان و ذکر کے ساتھ ساتھ فریقین کی طرف سے پیش کردہ دلائل کے تذکرہ ہی سے ملتا ہے۔ اسی بناء پر ہم نے فریقین کے دلائل کو ذکر کرنے سے اجتناب کیا کیونکہ جب ان کے درمیان پائے جانے والے علمی نزاع کی اصل بنیاد ہی ایسی ہے کہ اس میں مطالب خلط ملط ہو چکے ہیں اور غلط فہمی و اشتباہ واقع ہوا ہے تو ان کی دلیلیں جو کہ اسی بنیاد کے گرد گھومتی ہیں ان کا تذکرہ اثبات و نفی دونوں صورتوں میں غیر مفید ہوگا۔ اس کے علاوہ فریقین نے جن روایات کے ذریعے استدلال کیا ہے وہ چونکہ ظاہر القرآن سے ناہم آہنگ ہیں لہذا ہمیں ان سے کوئی سروکار نہیں، کیونکہ ان روایات کی دو قسمیں ہیں:

(۱) وہ روایات کہ جو اثباتی حوالہ رکھتی ہیں یعنی ان میں اس بات کا ثبوت پایا جاتا ہے کہ ”مَا اسْحُونُ فِي الْعِلْمِ“ تاویل سے آگاہی رکھتے ہیں، ایسی روایات اس حوالہ سے قابل اعتناء نہیں کہ ان میں ”تاویل“ کو تشابہ الفاظ کے مرادی معنی کے برابر معنی سے تعبیر کیا گیا ہے جبکہ قرآن مجید میں تاویل کا یہ معنی کہیں بھی ملحوظ و مقصود نہیں، جیسا کہ اہل سنت کے اسناد و حوالوں سے یہ روایت ذکر کی گئی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام نے جناب ابن عباس کے لئے دعا کی اور یہ الفاظ استعمال فرمائے: ”اللهم فقهه في الدين و علمه التاويل“ اسے اللہ! اسے دین میں فقہ و فہم عطا فرما اور اسے تاویل کا علم عطا کر! (ملاحظہ ہو: صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۴۸)، اور حضرت ابن عباس نے بھی اس طرح ادعاء و اظہار فرمایا: ”انما من الراشخين في العلم وانا اعلم تاويله“ (میں راہنمون فی العلم میں سے ہوں اور میں قرآن کی تاویل جانتا ہوں)۔ ملاحظہ ہو: تفسیر ”درمنثور“ جلد ۲ صفحہ ۷۔ اس کے علاوہ انہوں نے فرمایا: ”ان المحكمات هي الآيات الناسخة و المتشابہات هي المنسوخة“ کہ آیات محکمات سے مراد ناسخ آیات اور آیات متشابہات سے مراد منسوخ آیات ہیں، (ملاحظہ ہو: تفسیر ”درمنثور“ جلد ۲ صفحہ ۴)۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی رائے میں آیات محکمات کا معنی ہی دراصل آیات متشابہات کی تاویل کہلاتا ہے، جبکہ اس سلسلہ میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ تاویل کا یہ معنی، آیت مبارکہ سے ثابت نہیں ہوتا اور قرآن مجید میں تاویل کا یہ معنی مقصود نہیں۔

(۲) وہ روایات کہ جن میں نفی کا پہلو پایا جاتا ہے یعنی وہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ خداوند عالم کے علاوہ کوئی شخص متشابہات کی تاویل کا علم نہیں رکھتا جیسا کہ حضرت ابن عباس سے روایت کی گئی ہے کہ وہ اس آیت مبارکہ کی تلاوت اس



طرح کرتے تھے: ”وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ“ (اور اس کی تاویل خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور راسخون فی العلم کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے ہیں)، ابی ابن کعب بھی اسی طرح پڑھتے تھے، اور حضرت ابن شعوبہ کے بارے میں روایت کی گئی ہے کہ وہ اس طرح قرأت کرتے تھے: ”وَأَنْ تَأْوِيلُهُ أَلَا عِنْدَ اللَّهِ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ“ (اور اس کی تاویل خدا کے علاوہ کسی کے پاس نہیں، اور راسخون فی العلم کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں)، لیکن ان دور روایات سے کوئی مطلب ثابت نہیں ہوتا کیونکہ: پہلی بات تو یہ ہے کہ ان قرأتوں کو دلیل قرار نہیں دیا جاسکتا اور دوسری بات یہ کہ ان سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ صرف یہ کہ آیت، راسخون فی العلم کا تاویل سے آگاہ ہونا ثابت نہیں کرتی، جبکہ آیت کا ان کے علم کو ثابت نہ کرنا اور ان کے عدم علم کی دلیل ہونا دو الگ الگ مسئلے ہیں اور مؤخر الذکر مفسرین کا دعویٰ یہ ہے کہ آیت مبارکہ ان کے عدم علم پر دلالت کرتی ہے، حالانکہ ایسا نہیں بلکہ ممکن ہے کہ کسی دوسری دلیل سے ان کے عدم علم کا ثبوت ملے۔

اسی کی مانند ایک روایت تفسیر درمنثور میں طبرانی کے حوالہ سے مذکور ہے کہ ابو مالک اشعری نے کہا کہ انہوں نے حضرت رسول خدا سے سنا ہے، آنحضرت نے ارشاد فرمایا:

”انني لا اخاف علي امتي الا ثلاث خصال: ان يكثروا المال فيتحا سدوا فيقتلوا، وان يفتح لهم الكتاب فيأخذوه المؤمن يبتغي تأويله وما يعلم تأويله الا الله والراسخون في العلم يقولون امانا به كل من عند ربنا وما يذكر الا اولوا الالباب، وان يكثروا علمهم فيضيعوه ولا يباليون به“

مجھے اپنی امت سے صرف ان تین چیزوں کے بارے میں خوف لاحق ہے:

(۱) ان کا مال اور دولت زیادہ ہو جائے اور وہ اس کی بابت ایک دوسرے سے حسد کرنے لگیں اور ایک دوسرے کی جانوں کے دشمن بن جائیں۔

(۲) قرآن ان کے سامنے کھلے تو اس پر ایمان لانے والا ہی اس سے تاویل جوئی کرنے لگے، جبکہ اس کی تاویل کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ اور راسخون فی العلم کے، کہ جو کہتے ہیں ہم قرآن پر ایمان لائے ہیں سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور صاحبان عقل کے سوا کوئی نصیحت نہیں پاسکتا ”وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ“

(۳) ان کا علم زیادہ ہو مگر وہ اس کو ضائع کر دیں اور اس کی پرواہ ہی نہ کریں۔

(ملاحظہ ہو: ”درمنثور“ جلد ۲ ص ۵)

اس حدیث سے اگر یہ بات ثابت بھی ہو جائے کہ خدا کے علاوہ کوئی تائید و تکیہ کا علم نہیں رکھتا لیکن اس سے قرآن پر ایمان لانے والے ہر شخص کے علم کی نفی ہوتی ہے نہ کہ صرف راہنوں فی العلم حضرات کے علم کی، لہذا یہ حدیث ان حضرات کا ہدف پورا نہیں کر سکتی جنہوں نے اس کے ذریعے استدلال کیا اور اسے اپنے دعویٰ کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے، اسی طرح وہ روایات کہ جو آیات محکمات کی پیروی اور آیات تشابہات پر ایمان لانے کے واجب و ضروری ہونے پر دلالت کرتی ہیں، تو ان سے بھی غیر خدا کے علم کی نفی کا ثبوت یقیناً نہیں ملتا۔

اسی کے مانند ایک روایت تفسیر آلوسی میں ابن جریر کے حوالہ سے ابن عباس سے منقول ہے (یہ حدیث مرفوع ہے یعنی اس کے سلسلہ سند میں آخری حوالہ مذکور نہیں) کہ انہوں نے کہا:

”انزل القرآن علی اربعة احرف: حلال و حرام لا یعذر احد بجهالته، و تفسیر تفسره العلماء، و متشابه لا یعلمه الا اللہ، و من ادعی علمه سوی اللہ تعالیٰ فهو کاذب“  
(تفسیر آلوسی، جلد ۳ صفحہ ۸۵)

قرآن مجید کو چار حروف پر مشتمل نازل کیا گیا ہے:

- (۱) حلال (وہ آیات کہ جن میں حلال چیزوں کا ذکر ہے)
- (۲) حرام (وہ آیات کہ جن میں حرام اشیاء و امور مذکور ہیں)
- (۳) علوم و معارف (وہ آیات کہ جن میں حقائق الامور و حقائق الاشیاء مذکور ہیں اور علماء ان کی تفسیر کرتے ہیں)
- (۴) تشابہ کہ جس کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں اور جو شخص اس کا عالم ہونے کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے۔

یہ روایت جہاں مرفوع ہے (یعنی اس کے سلسلہ سند کی آخری کڑی مذکور نہیں) وہاں ان روایات سے تعارض و تصادم رکھتی ہے جن میں ابن عباس نے یہ بات ذکر کی کہ حضرت پیغمبر اسلام نے ان کے لئے دعا کی اور ابن عباس نے خود عالم بالتأویل ہونے کا دعویٰ کیا، اس کے علاوہ یہ کہ اس میں ظاہر القرآن سے عدم مطابقت بلکہ مخالفت پائی جاتی ہے کیونکہ ظاہر القرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ تأویل سے مراد وہ معنی نہیں جو تشابہ کا ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں آپ سابقہ مطالب سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ تأویل اور تشابہ دو مختلف معانی رکھتے ہیں۔

بہر حال اس مقام پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ غیر خدا کا عالم بالتأویل ہونا ممکن ہے البتہ زیر بحث آئیے مبارکہ اس پر دلالت نہیں کرتی کیونکہ اس سلسلہ میں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس آیت کے صدر و ذیل اور بعد والی آیات کے تناظر میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس میں دو چیزیں بیان کی گئی ہیں، ایک یہ کہ آیات دو قسموں پر مشتمل ہیں، محکم اور تشابہ، اور دوسری یہ کہ ان کے فہم المعنی کی بابت لوگ دو طرح کے ہیں، ایک وہ کہ جن کے دلوں میں بیماری

دیکھی ہے اور وہ تشابہات کی پیروی کرتے ہیں، دوسرے وہ لوگ کہ جو تشابہات کی پیروی نہیں کرتے بلکہ صرف ان پر ایمان لاتے ہیں اور محکمت کی پیروی کرتے ہیں، بنا براین ”سَاِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ“ کا تذکرہ ان کے قرآن فہمی کی بابت اختیار کئے جانے والے طرز عمل کے حوالہ سے ان کی مدح و ستائش کے طور پر ہوا ہے جبکہ اس کے مقابل میں ان لوگوں کا تذکرہ ہے کہ جن کے دلوں میں کجی و پیمادی ہے اور وہ فہم الآیات کی بابت جو طرز فکر اختیار کرتے ہیں وہ مذموم ہے، گویا راسخون فی العلم کی مدح اور بیمار دل افراد کی مذمت کے طور پر ان کا تذکرہ ہوا ہے، اس سے زیادہ کوئی بات زیر نظر آئیے مبارکہ سے نہ تو ثابت ہوتی ہے اور نہ ہی اس کا مقصد و مقصود ہے، اور کسی دلیل سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ راسخون فی العلم، تأویل الآیات کا علم ہونے میں خدا کے شریک ہیں سوائے ان مطالب کے کہ جو اس سلسلہ میں پہلے ذکر کئے جا چکے ہیں لیکن وہ ناقص اور زیر نظر موضوع کے اثبات میں ناکافی و قاصر ہیں اور ان سے ہرگز یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ راسخون فی العلم بھی اللہ تعالیٰ کی طرح آیات کی تأویل کا علم رکھتے ہیں، لہذا آیہ شریفہ میں جملہ ”وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ“ صرف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی شخص تأویل کا علم نہیں رکھتا، اس بات کو نہ تو ”وَالرَّاسِخُونَ“ کی واو کو حافظہ قرار دینے اور نہ ہی استثناء کے حوالہ سے نفی کیا جاسکتا ہے، بلکہ اس آیت سے واضح طور پر اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ تأویل کا علم خدا کے ساتھ مختص ہے اس کے علاوہ کوئی اس کا حامل نہیں، البتہ اگر کسی دوسری مستقل دلیل سے یہ بات ثابت ہو جائے کہ غیر خدا، باذن خدا، تأویل کا عالم ہو سکتا ہے تو اس میں علم بالثاویل کے خدا کے ساتھ مختص ہونے کی نفی نہیں ہوتی جیسا کہ علم بالثاویل کی مانند علم بالغیب کا مسئلہ ہے کہ وہ خدا کے ساتھ مختص ہے اس کے علاوہ کوئی غیب کا عالم نہیں اور اس کے باوجود قرآنی آیات سے غیر اللہ کا باذن خدا، عالم الغیب ہونا ثابت ہوتا ہے، آیات مبارکہ ملاحظہ ہوں:

سورہ نمل، آیت ۶۵:

○ ”قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ“

(کہہ دیجئے کہ آسمانوں اور زمین میں بسنے والا کوئی شخص غیب کا علم نہیں رکھتا سوائے اللہ کے،)

سورہ یونس، آیت ۲۰:

○ ”اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ“

(غیب صرف اللہ کے لئے ہے..... اس سے مختص ہے.....)

سورہ انعام، آیت ۵۹:

○ ”وَعِنْدَ كَمَا تَتِمُّ الْغَيْبُ لَا يَعْلَمُهَا اِلَّا هُوَ“

(اور اس کے پاس غیب کی سمجھیاں ہیں کہ جن کا علم صرف خداوند عالم کو حاصل ہے اس کے علاوہ کوئی اس کا حامل

(نہیں)

علمی اصطلاح میں اسے ”حصر“ کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ موضوع اور مورد کے درمیان اختصاصی تعلق ہے) اس کے باوجود علم غیب کی بابت خداوند عالم نے یوں ارشاد فرمایا:

سورہ جن، آیت ۲۷:

○ ”عِلْمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ۖ إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ“

(خدا، عالم الغیب ہے، وہ اپنے غیب کا کسی کے سامنے اظہار نہیں کرتا سوائے اس رسول کے کہ جسے پسند کرے) اس آیت میں خداوند عالم نے اپنے علاوہ بعض افراد کے لئے علم بہ غیب کا اثبات کیا ہے اور وہ افراد اس کے پسندیدہ رسول ہیں۔

بہر حال قرآن مجید میں علم غیب کی مانند بعض دیگر امور میں بھی اس طرح کی مثالیں موجود ہیں کہ وہ خدا کے ساتھ مخصوص ہونے کے باوجود خدا کی طرف سے اس کی برگزیدہ ہستیاں بھی ان کے حامل ہونے کا اعزاز رکھتی ہیں، جہاں تک زیر نظر موضوع کی پہلی شق کا تعلق ہے یعنی یہ کہ قرآن مجید میں غیر خدا کے عالم تاویل ہونے کا ثبوت موجود ہے اور آیات مبارکہ اس پر دلالت کرتی ہیں کہ خداوند عالم کے علاوہ دیگر افراد بھی تاویل کا علم رکھتے ہیں، تو اس کی وضاحت یہ ہے کہ: جیسا کہ آپ آگاہ ہو چکے ہیں کہ تاویل سے مربوط آیات مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ تاویل، آیت کے ظاہری معانی سے باہر کی ایک حقیقت کا نام ہے کہ جسے آیت کے مدلول (وہ معنی کہ جس پر آیت دلالت کرتی ہے) سے وہی نسبت ہے جو مثل کو مثال سے ہوتی ہے..... یا ترجمان کو اس حقیقت سے ہوتی ہے جس کا وہ ترجمان ہوتا ہے.....، بنا بریں وہ مثل یا ترجمان اگرچہ آیت کا مدلول نہیں ہوتا یعنی آیت کے الفاظ اس کے وجود پر دلالت نہیں کرتے لیکن ایک خاص انداز میں اس کی ترجمانی کرتے ہیں اور وہ مخصوص کیفیت کے ساتھ الفاظ میں محفوظ ہوتا ہے، اس کی مثال عربوں کے ہاں استعمال کئے جانے والے اس جملہ سے دی جاسکتی ہے کہ جس میں وہ کہتے ہیں: ”فِي الصَّنِيفِ ضَيْعَتِ اللَّبَنِ“ (تو نے گرمیوں میں دودھ ضائع کر دیا)، یہ ضرب المثل اس شخص کے لئے ہوتی ہے جو کسی کام کا ارادہ رکھتا ہو یا کسی مقصد تک پہنچنا چاہتا ہو مگر اس کے اسباب کو اس تک پہنچنے سے پہلے ہی کھو دے، اس مثال کے الفاظ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کسی عورت نے گرمیوں کے موسم میں ایسا کام کیا جس سے دودھ ضائع ہو گیا، یہ مثال اگرچہ ہمارے زیر نظر موضوع سے مطابقت نہیں رکھتی لیکن اس سے مخاطب کے ذہن میں اس مثال کی مربوط و متعلقہ صورتیں مجسم ہو جاتی ہیں جس کے نتیجے میں کلام کے ظاہری الفاظ کے ذریعے اس کے مقصود کے ادراک کی راہ ہموار ہو سکتی ہے، یہی صورت حال تاویل کی ہے کہ جو اصل حقیقت کسی حکم کی تشریح و قانونی حیثیت میں آنے کا موجب بنی یا معارف الہیہ میں سے کسی مطلب کے بیان کا سبب ہوئی یا قرآن مجید

میں مذکور کسی واقعہ و داستان کے وقوع پذیر ہونے کا باعث ہوئی، اگرچہ الفاظ اس پر دلالت نہیں کرتے مگر ان کا ان امور کی اصل حقیقت ہونا اور اس کا ان امور کے وجود میں آنے یا وقوع پذیر ہونے کا موجب و سبب ہونا ہی اس سلسلہ میں کافی ہے کہ ان امور میں ہر ایک کو اس کا ترجمان و عکاس قرار دیا جائے اور کہا جائے کہ فلاں چیز آیت کی تاویل ہے، اس کی مثال یوں ہے کہ کوئی شخص اپنے نوکر سے کہے کہ ”مجھے پانی پلاؤ“ تو اس کا یہ کہنا درحقیقت اس کی طبع انسانی کے تقاضائے کمال پر مبنی ہے کیونکہ عالم الخارج میں پانی جانے والی وہی حقیقت ہے کہ جو وجود ہستی کی حفاظت و بقا چاہتی ہے اور وہ یعنی حفظ و بقائے ہستی بدن میں پیدا ہونے والی کمی کو دور کرنے کی خواہاں ہوتی ہے اور وہ یعنی کمی کو دور کرنے کی خواہش ضروری غذا چاہتی ہے تاکہ سیر ہو سکے اور سیر ہونے کی طلب پانی مانگنے کی راہ پر لاتی ہے، تو یہ تمام مطالب ”مجھے پانی پلاؤ“ کے جملہ میں پوشیدہ ہیں لہذا ”استقنی“ (مجھے پانی پلاؤ) کی تاویل وہی طبع انسانی کا اپنے وجود و ہستی اور اس کی بقا کا تقاضائے کمال ہے۔ کہ جس کی تکمیل پانی پی کر سیراب ہونے کی صورت میں ممکن ہوتی ہے..... اور اگر یہ وجودی اور عالم الخارج میں پانی جانے والے حقیقت کسی دوسری حقیقت میں تبدیل ہو جائے (یعنی وجود و ہستی کی بقا پانی کی بجائے کسی دوسری چیز کے ذریعے ممکن ہو) تو جملہ بھی بدل جائے گا اور ”پانی پلاؤ“ کی بجائے کسی دوسری شے کی طلب مثلاً کھانا لاء میں تبدیل ہو جائے گا۔ یہی حال ان افعال کا ہے جو معاشرہ میں پسندیدہ و ناپسندیدہ ہوتے ہیں کہ پسندیدہ امور کے کرنے اور ناپسندیدہ امور کے نہ کرنے کی طرف رغبت ہوتی ہے اور ہر معاشرہ دوسرے معاشروں سے مختلف اور گہرے فرق کے باوجود اپنے آداب زندگی و رسم و عادات کے مطابق پسندیدہ و ناپسندیدہ امور و اعمال کی تشخیص و تمیز کرتا ہے اور اس تشخیص کا اصل معیار ان کے ہاں اچھائی و برائی کے مروجہ اصولوں، گونا گوں زمانی و مکانی علل و اسباب اور عوائل کے ساتھ ساتھ بزرگان قوم و ملت کے ہاں رائج طریقوں اور ان کے اپنائے ہوئے سلیقوں اور علاقائی رسم و رواج اور بار بار کے عملی مشاہدات پر استوار ہوتا ہے اور یہی وہ امر ہے جو مختلف اجزاء سے ترکیب یافتہ حقیقت ہے جو کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا اصل سبب ہے کہ جسے اصل عمل نہیں قرار دیا جاسکتا بلکہ وہ اصل فعل یا ترک فعل سے مختلف ہوتا ہے لیکن فعل یا ترک فعل کے ذریعے اس کا سراغ ملتا ہے کیونکہ فعل یا ترک فعل کے ضمن میں اور ان کے حوالہ سے اس کا تحفظ ہوتا ہے اسی وجہ سے اسے تاویل سے موسوم کیا جاتا ہے، لہذا گونا گوں اجزاء سے مرکب اس حقیقت کا نام ”تاویل“ ہے کہ جس پر فعل یا ترک فعل کی اساس قائم ہوتی ہے، اس سے یہ نتیجہ ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرتی رسوم و آداب کے مختلف ہو جانے سے فعل یا ترک فعل کی کیفیات میں بھی تبدیلی پیدا ہونا ناگزیر ہے، اور ہر وہ چیز خواہ اس کا تعلق احکام سے ہو یا کسی داستان و واقعہ سے ہو وہ تاویل کی تبدیلی کی وجہ سے تبدیل ہو جائے گی، اسی حوالہ سے آپ دیکھتے ہیں کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ”فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ ۗ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ“ (وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ مشابہات کی پیروی کرتے ہیں وہ فتنہ

پروری کے درپے ہیں اور تشابہات کی تاویل جوئی کرتے ہیں جبکہ ان کی تاویل خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔  
اس آیت میں پہلے یہ اردل افراد کا تذکرہ ہوا کہ وہ فتنہ انگیزی کی غرض سے آیات تشابہات کی پیروی کرتے ہوئے ان سے وہ معانی مراد لیتے ہیں جو ان کے حقیقی معانی نہیں، اور اس کے بعد ارشاد ہوا کہ وہ ان آیات سے ایسی تاویلیں ڈھونڈتے ہیں جو حقیقت میں ان کی تاویلیں نہیں اور وہ جس تاویل کا سہارا لے کر آیات تشابہات کی پیروی کرتے ہیں اگر وہ حقیقی تاویل ہوتی تو ان کا تشابہات کی پیروی کرنا بجا و برحق ہوتا اور اس پر ان کی مذمت نہ ہوتی اور تشابہ کا وہ معنی کہ جو محکم کے ذریعے ثابت ہوتا ہے وہ اس معنی میں تبدیل ہو جاتا جو تشابہ کا مراد معنی نہیں لیکن ان لوگوں نے اسے مراد معنی سمجھ کر اس کی پیروی کی۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ بات واضح ہو گئی کہ تاویل القرآن ان حقائق خارجیہ سے عبارت ہے جو آیات قرآنیہ کی اصل و اساس ہے یعنی قرآنی آیات خواہ ان کا تعلق علوم و معارف سے ہو یا احکام و دستورات یا دیگر امور سے ہوں سب کی بنیاد انہی حقائق پر قائم ہے کہ اگر بالفرض ان حقائق میں سے کسی ایک میں کوئی تبدیلی پیدا ہو تو متعلقہ آیات کے مضامین بھی بدل جائیں گے (گویا ان حقائق اور آیات کے درمیان ایک طرح سے روح و بدن کا رشتہ قائم ہے کہ جس طرح بدن کی اصل و اساس روح ہے اسی طرح آیات کی اصل و اساس کہ جس پر ان کی وجودی شناخت قائم ہے وہ انہی حقائق سے عبارت ہے لہذا ان میں ذرا سی تبدیلی کا اثر آیات پر پڑ سکتا ہے، م)

اگر آپ گہری نظر سے ان مطالب پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ تاویل کی بحث میں جو آیہ مبارکہ ہمارے پیش نگاہ ہے وہ سورۃ زخرف کی آیت ۴ سے کمال مطابقت رکھتی ہے کہ جس میں خداوند عالم نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے:

” وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ ﴿۱﴾ اِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْءَانًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۲﴾ وَ اِنَّهُ فِي الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلٰى حَكِيْمٌ ﴿۳﴾“

(اور اس واضح و روشن کتاب کی قسم! ہم نے اسے عربی زبان والا قرآن قرار دیا ہے تاکہ تم سمجھ سکو، اور وہ اصل کتاب میں ہمارے پاس موجود ہے کہ جو بلند مرتبہ کا حامل اور حکمت سے بھر ہوا ہے)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ قرآن کہ جو نازل ہوا ہے وہ خداوند عالم کے ہاں ایک نہایت بلند مرتبہ والا اور دانائیوں کا خزانہ تھا کہ جس کا سمجھنا ہماری عقلوں کے بس کا روگ نہ تھا اور اسے حصہ حصہ و جزء جزء کر کے اس سے فیض یاب ہونا ہماری طاقت و قدرت سے باہر تھا لیکن خداوند عالم نے اپنے بندوں پر نظر کرم کرتے ہوئے اسے پڑھی جانے والی کتاب بنا دیا اور اسے عربی زبان میں ملبوس کر دیا تاکہ لوگ اسے سمجھ سکیں اور آسانی سے اس کے معانی کا ادراک کر سکیں، کیونکہ جب تک وہ

ام الکتاب میں ہوتا وہ اس کے فہم و ادراک سے عاجز ہوتے اور ان کے پاس اس خزانہ علم و حکمت تک رسائی کا کوئی ذریعہ ہی نہ ہوتا، اور ”ام الکتاب“ کہ جو خداوند عالم کے ہاں بلند رتبہ اور حکمت و دانائی کی حامل ہے اس کا ذکر قرآن مجید میں یوں ہوا:

سورہ ۶۶ عدد، آیت ۳۹:

”يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ ۙ وَعِنْدَآءُ أُمْرِ الْكِتَابِ ﴿۳۹﴾“

(خدا جو چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے، اس کے پاس ام الکتاب ہے)

سورہ ۶۶ بروج، آیت ۲۲:

”بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ﴿۲۲﴾ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ ﴿۲۳﴾“

(بلکہ وہ قرآن مجید ہے جو لوح محفوظ میں ہے.....)

اسی طرح سورہ ہود کی آیت ۱ بھی اجمالی طور پر پیش نظر آیہ مبارکہ کے مضمون پر دلالت کرتی ہے جس میں ارشاد الہی ہے:

”كِتَابٌ أَحْكَمْتُ الْآيَاتُ ثُمَّ فَصَّلْتُ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ“

(یہ کتاب ہے کہ جس کی آیات محکم و مضبوط کی گئی ہیں پھر انہیں دانا و آشنائے کل کی طرف سے تفصیل سے بیان کیا

گیا ہے)

اس آیت میں آیات کے بارے میں دو چیزیں بیان کی گئی ہیں:

(۱) ان کا محکم ہونا

(۲) ان کا مفصل ہونا

محکم ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ خداوند عالم کے پاس اس حقیقت میں تھیں کہ ان میں کوئی حصہ و جزء اور تقسیم بندی نہ تھی بلکہ وہ یکجا تھیں، اور مفصل ہونے سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے انہیں جزء جزء اور حصہ حصہ میں تقسیم کر کے نازل کیا؟ ”احکام“ (ہمزہ کے نیچے زیر کے ساتھ) کا معنی یکجا کرنا اور ”تفصیل“ کا معنی فصل فصل یعنی جزء جزء، حصہ حصہ اور آیت آیت کرنا ہے لہذا آیت کا معنی یہ ہوگا کہ قرآن مجید خداوند عالم کے ہاں یکجا صورت میں تھا پھر خداوند عالم نے اسے حصہ حصہ اور آیت آیت کر کے حضرت پیغمبر اسلامؐ پر نازل فرمایا،

قرآن مجید کے جزء جزء اور حصہ حصہ کر کے نازل کئے جانے پر ایک اور آیت بھی موجود ہے جس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ان دونوں صفتوں یعنی محکم ہونے اور مفصل ہونے کے درمیان بنیادی تعلق پایا جاتا ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

سورہ اسراء، آیت ۱۰۶:

” وَ قُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَ عَلَى النَّاسِ عَلَى الْمُكْتَبِ وَ نَزَّلْنَاهُ تَنْزِيلًا ﴿۱۰۶﴾“

(اور قرآن کو ہم نے حصہ حصہ کر دیا تاکہ آپ اسے لوگوں کے سامنے آرام سے قرأت کریں اور ہم نے اسے تدریجی طور پر نازل کیا ہے)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید آجوں میں بنا ہوا نہ تھا بلکہ سبجا تھا پھر اسے آیت آیت کر کے حضرت پیغمبر اسلام پر تدریجاً نازل کیا گیا اور جزء جزء کر کے آپ پر وحی کی گئی تاکہ آنحضرت آرام آرام سے تدریجی طور پر لوگوں کے سامنے پڑھیں، البتہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن مجید خداوند عالم کے پاس اسی طرح کتاب کی صورت میں تھا کہ جواب ہمارے پاس آیات کا مجموعہ و سورتوں کی مخصوص ترتیب کا حامل مجلد صورت میں ہے اور اسے حصہ حصہ و جزء جزء کر کے تدریجی طور پر حضرت پیغمبر اسلام پر نازل کیا گیا ہوتا کہ آپ ٹھہر ٹھہر کر لوگوں کے سامنے اسے پڑھیں جیسا کہ کوئی استاد ہر روز کتاب کا کچھ حصہ متعلمین کی استعداد و ذہنی قوت و صلاحیت کے مطابق ان کے سامنے پڑھتا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں کیونکہ ان دونوں باتوں میں بہت فرق ہے یعنی کسی استاد کا اپنے شاگردوں کو ان کی ذہنی صلاحیت کے مطابق کتاب کے حصہ حصہ کی تدریس اور آنحضرت پر قرآن کے تدریجی طور پر نزول کے درمیان فرق پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ آنحضرت پر قرآن کے تدریجی طور پر نازل ہونے کا سبب تشریح کے اسباب کا عمل دخل ہے یعنی اسباب نزول کے مختلف ہونے اور زمانی و مکانی حوالوں سے فرق پائے جانے کی وجہ سے آیات کے نزول کو کسی استاد کی تدریس سے مشابہت نہیں دیا جاسکتی، کیونکہ ہر آیت کا نزول اس سے مربوط امر پر موقوف ہے جبکہ کسی استاد کا اپنے شاگردوں کو ان کی ذہنی و فکری توانائی و صلاحیت کے مطابق کتاب کے بعض حصوں کی تدریس کا مسئلہ ایسا نہیں لہذا ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ان کے درمیان مشابہت و مماثلت کا کوئی پہلو پایا جاتا ہے، اس کے علاوہ ایک واضح فرق یہ بھی ہے کہ کتاب کے مختلف حصے کہ جن کی تدریس مختلف اوقات میں معلم اپنے شاگردوں کو کرتا ہے ان کی بابت یہ امکان پایا جاتا ہے کہ ان کو ایک ہی وقت میں اکٹھا کر دیا جائے اور وہ سب ایک ہی دورانیہ میں پڑھائیے جائیں جبکہ یہ بات قرآنی آیات کی بابت ممکن نہیں مثلاً آیہ مبارکہ: ” فَاعْتَبِرْ عَثَمًا وَ اصْفَحًا ۗ“ (سورہ مائدہ، آیت ۱۳)۔ ان سے درگزر کرو اور روگردانی کر لو، اور آیہ مبارکہ: ” قَاتِلُوا الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِكُفْرَانِهِمْ إِنَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا“ (سورہ توبہ، آیت ۱۲۳)۔ جنگ کرو ان کافروں سے جو تمہارے نزدیک ہیں.....، پہلی آیت میں مخوف و درگزر کرنے اور دوسری آیت میں جنگ و قتال کا حکم دیا گیا ہے (تو یہ بات ممکن نہیں کہ دونوں آیتیں ایک ہی زمان میں آنحضرت پر نازل ہوں اور آپ ایک ہی وقت میں لوگوں کے سامنے پڑھیں کیونکہ دونوں میں متضاد فرامین صادر کئے گئے ہیں۔ م) اسی طرح آیہ مبارکہ: ” قَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّتِي تُجَادِلُكَ فِي زَوْجِهَا“ (سورہ مجادلہ،



آیت ۱)..... خدا نے اس عورت کی بات سنی ہے جو تم سے اپنے شوہر کے بارے میں جھگڑا کر رہی تھی..... اور آیہ مبارکہ: ” خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً“ (سورہ توبہ، آیت ۱۰۳)..... ان کے اموال میں سے صدقہ (زکوٰۃ) لو..... تو ان آیتوں میں سے ہر ایک کا موضوع مختلف ہے لہذا ان دونوں اور ان جیسی دیگر آیات کا ایک ہی مرتبہ نازل ہونا ممکن نہیں ورنہ اسباب نزول اور زمانہ نزول کے حوالے بے اثر ہو جائیں گے اور یہ کہا جائے گا کہ قرآن مجید ایک بار آغاز بعثت میں نازل ہوایا آنحضرت کی حیات طیبہ کے آخری ایام میں نازل ہوا اور لفظ قرآن کہ جو آیہ مبارکہ: ” وَقرْنَا نَا فَرَقْنَاهُ“ (سورہ اسرئیل، آیت ۱۰۶) میں ذکر ہوا ہے اس سے مراد وہ قرآن نہ ہو جو ہمارے پاس موجود ہے جو تالیف شدہ آیات کے معنی میں آتا ہے۔

خلاصہء کلام یہ کہ مذکورہ بالا آیات مبارکہ سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ ہم جس قرآن کی تلاوت کرتے ہیں اور اس کے معانی و مطالب کا ادراک کرتے ہیں اس سے ماوراء ایک ایسا امر و حقیقت ہے کہ جس کی نسبت قرآن سے وہی ہے جو روح کی جسم سے ہوتی ہے اور متحمل (جس کی مثال دی گئی ہو) کی مثال سے ہوتی ہے اور اسے ہی خداوند عالم نے ”الکتاب الحکیم“ سے موسوم کیا ہے، اسی پر قرآنی معارف و مطالب اور مضامین کا دار و مدار ہے، وہ الفاظ کی سچ سے نہیں کہ جنہیں حصہ حصہ اور جملہ جملہ کر کے پیش کیا جاتا ہے اور نہ ہی ان معانی کے باب سے ہے کہ جن پر الفاظ دلالت کرتے ہیں، اور وہ بعینہ اسی تاویل سے عبارت ہے کہ جس کا ذکر مربوط آیات مبارکہ میں کیا گیا ہے، کیونکہ ان آیات میں تاویل کی جو اوصاف و صفات بیان کی گئی ہیں وہ سب مذکورہ امر و حقیقت سے پوری مطابقت و انطباق رکھتی ہیں، اس بیان سے تاویل کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور یہ وجہ بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ جس کی بنیاد پر کہا گیا ہے کہ معمولی افہام اور ناپاک نفوس اسے چھو ہی نہیں سکتے، چنانچہ خداوند عالم نے اس سلسلہ میں ارشاد فرمایا ہے:

سورہ واقفہ، آیت ۷۹:

○ ” إِنَّهُ لَنَشْرِحُ لَكُمْ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ ۖ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الَّذِينَ هُمُؤْن ۖ“

(یقیناً وہ عزت والا قرآن ہے کہ جو پوشیدہ کتاب میں ہے کہ جسے پاک لوگوں کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا)

اس آیہ مبارکہ میں ”مطہرون“ اور ”کِتَابٍ مَّكْنُونٍ“ کے الفاظ سے بلاشبہ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خدا کے مطہر بندے ہی ہیں جو اس قرآن کریم کو چھو سکتے ہیں جو کتاب کنون میں ہے (ان کی دسترس و رسائی اس قرآن تک ہے جو کتاب کنون میں ہے) کہ جو تغیر و تبدیلی سے محفوظ ہے، اور تغیر و تبدیلی کی ایک صورت یہ ہے کہ عام اذہان کو اس میں تصرف حاصل ہو کہ وہ جس طرح چاہیں اس کے معانی و مفاہیم کا تعین کر سکیں اور ”لَا يَمَسُّهُ“ میں لفظ ”مس“ (چھونا) سے مراد اسی فہم و علم کے سوا کچھ نہیں، اور یہ بات بھی معلوم و واضح ہے کہ اس آیت مبارکہ میں ”کِتَابٍ مَّكْنُونٍ“ سے مراد وہ ”أُمُّ الْكِتَابِ“ ہے جس کا ذکر آیہ مبارکہ ”يُنحُوا لِلَّهِ مَا يَشَاءُونَ وَيُشِيتُ وَعَنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ“ (سورہ عدد، آیت ۳۹)

اور آیہ مبارکہ ”وَإِنَّهُ فِي أُمِّ الْكِتَابِ لَدَيَّنَا لَعَلِّي حَكِيمٌ“ (سورہ زخرف، آیت ۴) میں ہوا ہے اور ”مطہرین“ وہ افراد و شخصیات ہیں کہ طہارت و پاکیزگی ان کے دلوں میں اتر چکی ہے اور اس کا ان کے دلوں میں اتارنا خدا کے سوا کسی کا کام نہیں کیونکہ خداوند عالم نے جہاں بھی ان کا تذکرہ کیا ہے ان کے پاک و مطہر ہونے کے حوالہ سے اس عمل کی نسبت اپنی طرف دی ہے جیسا کہ ارشاد ہوا:

سورہ احزاب، آیت ۳۳:

○ ”إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا“

(خدا تو صرف یہ چاہتا ہے کہ گندگی کو تم سے دور رکھے اے اہل بیت! اور تمہیں پاک رکھے جس طرح پاک رکھنے کا

حق ہے)

سورہ مائدہ، آیت ۶:

○ ”وَالَّذِينَ يُرِيدُ لِيُطَهَّرَكُمْ“

(لیکن وہ تمہیں پاک رکھنا چاہتا ہے)

اور قرآن مجید میں جہاں بھی معنوی و روحانی طہارت و پاکیزگی کا تذکرہ ہوا ہے وہاں اس کی نسبت خداوند عالم یا اس کے اذن کی طرف دی گئی ہے، اور اس طہارت و پاکیزگی سے مراد دل سے ہر طرح کی پلیدی کے زائل ہونے کے سوا کچھ نہیں اور دل سے مراد اس قوت کے سوا کچھ نہیں کہ جو سرچشمہ ادراک و ارادہ ہے، بنا بریں دل کی طہارت سے مراد نفس انسانی کی وہ پاکیزگی ہے جو اس کے اعتقاد و ارادہ میں پائی جاتی ہے کہ اس میں ان دونوں حوالوں سے گندگی دور ہوتی ہے اور اس قلبی پاکیزگی کی بازگشت اس بات کی طرف ہوتی ہے کہ انسان کا دل حق و حقیقت پر اعتقاد کی بابت ثبات و پختگی کا حامل ہوتا ہے کہ نہ تو اس میں کسی طرح سے شک کی گنجائش پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی حق و باطل کے درمیان تزلزل کی صورت و راہیں نکلتی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ اس قلبی پختگی کا نتیجہ علم و ادراک کے تقاضوں یعنی عملی اقدامات کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے اور انسان حق سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد عملی مراحل میں نہ تو اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کرتا ہے اور نہ ہی علمی عہد شکنی کا مرتکب ہوتا ہے، یہی بات یعنی علمی عہد و پیمانہ پر پورا اترنا اور اس کے عملی تقاضوں کی تکمیل ہی دراصل ”رِسْوَخٌ فِي الْعِلْمِ“ کہلاتا ہے کہ خداوند عالم نے ان (رَا سِخْوٰنٌ فِي الْعِلْمِ) کی توصیف میں یہی بات کی ہے کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں، اپنے علم پر ثابت و قائم ہیں اور ان کے دل فتنہ انگیزی کی غرض سے حق سے منحرف نہیں ہوتے، تو اس سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی ہے کہ

”مطہرین“ ہی ”رَا سِخْوٰنٌ فِي الْعِلْمِ“ ہیں۔

لیکن مذکورہ بالا بیان سے جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے اس سے کوئی غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیے کیونکہ اس سے صرف اس

قدر ثابت ہوتا ہے کہ ”مطہرین“ پاک دل افراد... تاویل کا علم رکھتے ہیں اور ان کے مطہر ہونے کا لازمی امر یہ ہے کہ وہ اپنے علوم میں راسخ ہوں کیونکہ ان کے دلوں کی تطہیر کا عمل خداوند عالم سے منسوب ہے اور خداوند عالم ایسا سبب ہے جس پر کسی کا غلبہ نہیں ہو سکتا، لہذا یہ کہنا و سمجھنا درست نہ ہوگا کہ رَاِیْسُخُوْنَ فِي الْعِلْمِ حضرات اس بناء پر تاویل کا علم رکھتے ہیں کہ وہ راسخون فی العلم ہیں یعنی ان کا راسخ فی العلم ہونا ان کے عالم بہ تاویل ہونے کا سبب ہو ایسا ہرگز نہیں اور آ یہ مبارکہ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا، بلکہ یقیناً ممکن ہے کہ آیت کے سیاق سے یہ بات ظاہر ہو کہ رَاِیْسُخُوْنَ فِي الْعِلْمِ تاویل سے جاہل ہیں کیونکہ ارشاد خداوندی ہے کہ ”يَقُولُونَ اٰمَنَّا بِالْحَقِّ لَمَّا اُنزِلَ عَلَيْنَا وَمَا اُنزِلَ مِنْ قَبْلِكَ...“ (سورہ نساء، آیت ۱۶۲) طرف سے ہے... اس کے علاوہ خداوند عالم نے اہل کتاب میں سے ان لوگوں کی تعریف کی جو راسخون فی العلم ہیں اور ان کی اس صفت کو بیان کیا اور ان کے ایمان و عمل صالح پر ان کی شکرگزاری کا تذکرہ کیا چنانچہ ارشاد ہوا: ”لٰكِنَّ الرَّسُوْلَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُونَ يُوْمِنُونَ بِمَا اُنزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنزِلَ مِنْ قَبْلِكَ...“ (سورہ نساء، آیت ۱۶۲) لیکن ان میں سے جو رَاِیْسُخُوْنَ فِي الْعِلْمِ ہیں اور وہ لوگ جو ایمان لائے، وہ آپ پر اور آپ سے قبل نازل کی جانے والی ہر شے پر ایمان رکھتے ہیں... ان توصیفی اظہارات کے باوجود خداوند عالم کے کلام میں ان کا عالم بہ تاویل ہونا ثابت نہیں ہوتا، اسی طرح آ یہ مبارکہ ”اَلَا يَسْتَسْتَفِئُونَ اِلَّا الْتَهْتَهُوْنَ“ میں مطہرین و پاک دل افراد کی بابت صرف یہی ثبوت ملتا ہے کہ وہ فی الجملہ اور ایک حد تک کتاب سے مس یعنی اس کے حقائق تک دسترس رکھتے ہیں، لیکن جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ وہ پوری تاویل کا علم رکھتے ہیں اور اس سے ذرہ بھر نا آگاہ نہیں اور نہ ہی کسی زمانہ میں اس سے عدم آگاہی سے دوچار ہوں، تو اس سلسلہ میں یہ آیت (اَلَا يَسْتَسْتَفِئُونَ اِلَّا الْتَهْتَهُوْنَ) ساکت و خاموش ہے اور اس سے ان حضرات کا کل تاویل سے آگاہ ہونا ثابت نہیں ہوتا، البتہ اگر یہ مطلب ثابت ہو تو کسی دوسری دلیل سے ثابت ہوگا۔

## ۵۔ کتاب خدا میں تشابہات کیوں ہیں؟

قرآن مجید پر عموماً جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں تشابہات پائے جاتے ہیں جبکہ مسلمانوں کا عقیدہ و دعویٰ ہے کہ اس میں قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے فرائض و واجبات بیان کر دیئے گئے ہیں اور یہ کہ قرآن ایسا کلام ہے جو حق و باطل کے درمیان تمیز کرتا ہے اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر کے واضح کرنے والا ہے حالانکہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے تمام مذاہب و مسالک اپنے درمیان تمام تر اختلافات کے باوجود اپنے اپنے عقیدہ و نظریہ کی صحت و درستی پر قرآن سے استدلال کرتے ہیں، ان کا ایسا کرنا صرف اس وجہ سے ہے کہ

قرآن کی آیات میں تشابہ پایا جاتا ہے (یعنی وہ اپنے مقصود کے بیان میں واضح نہیں) تو کیا یہ بہتر نہ تھا کہ وہ تشابہات سے پاک مبرا ہوتا اور اپنی مطلوبہ غرض سے قریب تر ہو جاتا اور اختلاف و انحراف کا مکمل سدباب کر دیتا؟

اس اعتراض کے جواب میں متعدد حوالوں سے اظہار خیال کیا گیا ہے کہ جن میں سے بعض نہایت کمزور ہیں مثلاً:

(۱) بعض مفسرین نے کہا کہ تشابہات کا وجود، حق تک رسائی کو مشکل بناتا ہے کہ جس کے لئے سخت محنت و تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے اور حق تک رسائی کی بابت جس قدر زیادہ محنت کی جائے اس کا اجر و ثواب زیادہ ہوتا ہے (گویا آیات تشابہات اس لئے شامل کی گئی ہیں کہ لوگ حق کی پہچان اور اس تک رسائی کی بابت زیادہ محنت کریں تاکہ زیادہ سے زیادہ اجر و ثواب کے حقدار ہوں)۔

(۲) بعض اہل نظر نے یہ جواب دیا ہے کہ اگر قرآن مجید صرف ایک مذہب کی بابت واضح و صریح آیات پر مشتمل ہوتا تو دیگر مذاہب کے پیروکار اس سے دور بھاگتے اور اس میں غور و فکر سے کام نہ لیتے لیکن تشابہات کی وجہ سے انہیں اپنے مذہب کی حقانیت کے اثبات کے لئے قرآن مجید میں غور و فکر کرنے کا لالچ پیدا ہوتا ہے اور ان کے اس میں غور و فکر اور تفکر و تدبر کرنے کی وجہ سے یہ امید پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ حق کو پہچان لیں اور اس پر ایمان لے آئیں۔

(۳) بعض ارباب دانش نے یہ کہا کہ تشابہات کا ہونا دراصل اس غرض کے تحت ہے کہ لوگ عقل کی رہنمائی حاصل کریں کہ جس میں ان کے لئے اندھی تقلید کی ظلمت سے باہر آنے اور تحقیق و اجتہاد کی نورانی وادی میں داخل ہونے کی راہیں کھل سکتی ہیں۔

(۴) بعض حضرات کا کہنا ہے کہ قرآن مجید کا تشابہات پر مشتمل ہونا اس بات کا سبب ہوا کہ اہل علم افراد اس میں گونا گوں طریقوں سے تاویلات کی راہیں نکالیں اور اس طرح مختلف علوم و فنون مثلاً علم لغت، علم صرف، علم نحو اور اصول الفقہ میں مہارت حاصل کر سکیں۔

مذکورہ بالا چار جوابات اس قدر ضعیف و کمزور بلکہ بے اساس و غیر منطقی ہیں کہ ذرا سی توجہ و التفات کرنے سے ان کی ناپختگی آشکار ہو جاتی ہے اور دیگر وہ جوابات کہ جن کی بابت بحث و اظہار خیال کرنا مناسب و بجا ہے وہ تین طرح کے ہیں:

(۱) قرآن مجید کا تشابہات پر مشتمل ہونا لوگوں کے دلوں کا امتحان لینے کے لئے ہے کیونکہ اگر اس مقدس کتاب میں ذکر کئے جانے والے تمام مطالب واضح و آشکار اور نہایت آسانی سے سمجھ میں آنے والے ہوتے کہ جن میں کسی کو کسی طرح کا شبہ لاحق نہ ہوتا تو ان پر ایمان لانا کوئی کمال نہ تھا کیونکہ اس میں خداوند عالم کے فرامین کی اطاعت اور اس کے پیغمبروں کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی بابت خضوع کی حیثیت ہی باقی نہ رہتی، (جبکہ خضوع کا تقاضہ یہ ہے کہ خدا اور رسول کے فرامین و دستورات پر کسی بحث و تحقیق اور تاامل کے بغیر سر اطاعت خم کر دیا جائے اور اسے ہی ایمانی کمال کہا جاسکتا ہے)۔

اس جواب کا کمزور پہلو یہ ہے کہ اس میں خضوع کو معیار ہدف اور مقصد قرار دیا گیا ہے جبکہ ”خضوع“ (فروتنی کرنا، سرکلندہ ہونا، بے چون و چرا سر تسلیم خم کرنا) ایک طرح کی انفعالی کیفیت کا نام ہے کہ جو کسی کمزور شخص میں اپنے سے قوی و طاقتور کے مقابلے میں پیدا ہوتی ہے، اور انسان کا کسی چیز کے سامنے خضوع کرنا تو اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ اس کی عظمت کا ادراک کر لیتا ہے یا یہ کہ اس کی عظمت اس کے ادراک سے مانع ہوتی ہے جیسا کہ خداوند عالم کی غیر متناہی و غیر محدود قدرت و عظمت اور اس کی دیگر صفات عالیہ و متعالیہ ہیں کہ جب عقل ان کی طرف بڑھتی اور ان کے فہم و ادراک کی جانب رخ کرتی ہے تو واپس لوٹ آتی ہے کیونکہ وہ ان تک رسائی سے قاصر ہے، اور وہ چیزیں کہ جن تک عقل کی دسترس ہی نہیں لیکن اس خیال کی بناء پر کہ وہ ان کے ادراک پر قادر ہے دھوکہ کا شکار ہو جاتی ہے اور پھر ان سے دوری اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے تو ان کے سامنے ”خضوع“ کرنے کا تصور ہی بے معنی ہے جیسا کہ آیات تشابہات کی بابت عقل کی غلط فہمی اس طرح ہوتی ہے کہ وہ ان کو اپنی دسترس میں سمجھتی ہے اور یہ خیال کرتی ہے کہ ان کا فہم رکھتی ہے جبکہ حقیقت میں وہ ان کو سمجھ ہی نہیں سکتی۔

(۲) قرآن مجید اس لئے تشابہات پر مشتمل ہے کہ عقل کو ان کے بارے میں بحث و تحقیق اور غور و فکر پر آمادہ کرے تاکہ اس کا نہمل چھوڑ دینا اس کی موت کا سبب نہ بن جائے اور وہ ہمیشہ واضح و روشن امور سے سروکار کی وجہ سے اس حد تک بے اثر نہ ہو جائے کہ اس میں غور و فکر کی صلاحیت ہی باقی نہ رہے اور تفکر و تدبر کے عوامل کام کرنا ہی چھوڑ دیں جبکہ عقل انسانی وجود میں پائی جانے والی قوتوں میں سے سب سے زیادہ عزت و عظمت کی حامل قوت ہے کہ جس کی دیکھ بھال انسان کی وجودی قوتوں کی دیکھ بھال کی طرح لازم و ضروری ہے۔

یہ جواب بھی قرین صحت معلوم نہیں ہوتا کیونکہ خداوند عالم اپنے عہد میں کلام میں بعض موارد و مقامات پر انسانی و کلی طور پر افراد بشر کو حکم دیتا ہے کہ وہ آفاق و عالم الطبیعہ اور موجودات کہ جس میں انسان خود بھی شامل ہے۔ سے مربوط آیات مبارکہ کی بابت عقل و فکر کی قوتوں کو کام میں لائیں، اور دیگر موارد میں تفصیلی تذکرہ کے ساتھ تفکر و تدبر کی دعوت دی ہے مثلاً آسمانوں اور زمین کی تخلیق، پہاڑوں، درختوں، چوپایوں اور انسان کے پیدا کرنے اور زبانوں و رنگوں کے مختلف ہونے کی بابت غور و فکر کرنے کا کہا، اسی طرح ”سیر و افعی اللار عن“ اور کائنات ارضی میں گھوم پھر کر سابقہ اقوام کے حالات سے باخبر ہونے کا حکم دیا اور اس کے ساتھ ساتھ عقل و فکر سے استفادہ کرنے کے عمل کی بھرپور تاکید کی اور علم کی مدح و تعریف نہایت عمدہ و اعلیٰ الفاظ و انداز میں کی، تو اس سب کچھ کے بعد اس بات کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی کہ تشابہات کے ذریعے ایسے امور میں بحث و تحقیق پر آمادہ کیا جائے جن سے فکری لغزشوں اور نظریاتی انحرافات کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۳) قرآن مجید میں تشابہات کا پایا جانا اس وجہ سے ہے کہ انبیاء علیہم السلام تمام افراد بشر کے لئے مبعوث ہوئے کہ جن میں عوام اور خواص، ذکی و ہوشمند اور کند ذہن و کم فہم اور عالم و جاہل سب شامل ہیں، اور جو مطالب و معارف

خداوند عالم نے اپنے مقدس کلام میں نازل فرمائے ہیں ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ ان کا بیان کرنا عام فہم لفظوں اور ایسی سادہ و سلیس عبارتوں کے ذریعے ممکن نہیں کہ تمام افراد بشر ان مطالب و معارف سے آگاہ ہو سکیں اور ان کی حقیقتوں کے ادراک کو ان الفاظ کے توسط سے یقینی بنا سکیں لہذا مناسب ہے کہ اس طرح کے عظیم معارف کو اس طرح بیان کیا جائے کہ خواص ہی جس کا فہم و ادراک کر سکیں خواہ کتنا یہ واشارہ کے ذریعے کیوں نہ ہو، اور عوام الناس کو حکم دیا جائے کہ وہ ان پر ایمان لا کر ان کا معاملہ خدا کے سپرد کر دیں۔

یہ جواب بھی خالی از اشکال نہیں کیونکہ قرآن مجید جہاں تشابہات پر مشتمل ہے وہاں محکمات بھی اس میں پائے جاتے ہیں کہ جن کے ذریعے تشابہات کا فہم المعانی ممکن ہوتا ہے اور ان کی طرف رجوع کر کے تشابہات کے معانی واضح طور پر معلوم ہو سکتے ہیں اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تشابہات میں اس مقدار سے زیادہ معانی نہ پائے جائیں کہ جو محکمات کے ذریعے ظاہر ہوتے ہوں، تو اس صورت میں یہ سوال اپنی جگہ باقی رہے گا کہ قرآن مجید میں تشابہات کے لانے کا کیا فائدہ ہے اور محکمات کے ہوتے ہوئے ان کی ضرورت ہی کیا ہے؟ دراصل بات یہ ہے کہ جواب دینے والے حضرات کی غلط فہمی اس طرح پیدا ہوئی کہ انہوں نے آیات کے معانی کو دو مختلف قسموں میں تقسیم کر دیا:

(۱) وہ معانی کہ جن کا فہم و ادراک تمام مخاطبین خواہ عوام الناس ہوں یا خواص ہوں کر سکتے ہیں اور وہ انہی معانی

سے عبارت ہیں جن پر محکمات دلالت کرتی ہیں۔

(۲) وہ معانی کہ جن کی سچ ہی ایسی ہے کہ خواص کے علاوہ کوئی انہیں سمجھ نہیں سکتا، کیونکہ وہ نہایت بلند پایہ معارف اور نہایت دقیق و گہرے مطالب پر پراز حکمت حقائق ہیں، اس تقسیم کا نتیجہ یہ ہے کہ تشابہات کے معانی کو سمجھنے کے لئے محکمات کی طرف رجوع نہ کیا جائے جبکہ یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ اس طرح کی تقسیم اور اس سے حاصلہ نتیجہ ان آیات مبارکہ کے صریح الفاظ کے منافی ہے کہ جن میں قرآن مجید کی آیات کا ایک دوسری کی تفسیر کرنا ثابت ہوتا ہے، اور اس کے علاوہ دیگر دلائل سے بھی اس طرح کی تقسیم بندی و نتیجہ گیری کی نفی ہوتی ہے۔

بہر حال اس مقام پر جو بات لائق ذکر ہے وہ یہ کہ: قرآن مجید میں تشابہات کا ہونا ضروری ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن میں ”تاویل“ موجود ہے کہ جو آیات مبارکہ کے ایک دوسری کی تفسیر کرنے کا باعث ہوئی ہے البتہ یہاں ”تاویل“ کا وہ معنی ملحوظ ہے جو ہم واضح طور پر بیان کر چکے ہیں، تاہم یہ مطلب اس وقت مزید واضح ہوگا جب قرآنی بیانات اور خدائی تعلیمات کی مختلف جہتوں و پہلوؤں پر اچھی طرح غور و فکر اور تدبر سے کام لیا جائے اور ان امور پر توجہ و التفات کیا جائے کہ جن پر قرآنی معارف و مقاصد کی اصل و اساس قائم ہے اور وہ درج ذیل امور ہیں:

(۱) خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کی کتاب ”تاویل“ کی حامل ہے اور قرآن کے تمام معارف، احکام،

قوانین اور دیگر تمام مندرجات و خدائی تعلیمات کا دار و مدار اسی تاویل پر ہے اور وہ تاویل کہ جس پر تمام قرآنی بیانات مبنی ہیں اس کا فہم و ادراک عام افراد کے بس کا روگ نہیں اور عقلمیں اس کی بلندی کو نہیں پاسکتیں بلکہ اس کی طرف بڑھنے سے عاجز و قاصر ہیں، کسی کو اس تک رسائی حاصل نہیں سوائے ان ہستیوں کے کہ جنہیں خداوند عالم نے پاک قرار دیا ہے اور ہر طرح کی پلیدی و نجاست کو ان سے دور رکھا ہے اور انہیں اس خصوصیت سے نوازا ہے کہ وہ اصل الکتاب کو چھو سکیں (اس کی حقیقت و تاویل کا ادراک کر سکیں)، اور یہی وہ مقصد ہے کہ جو خداوند عالم نے انسان کی بابت طے کیا ہے اور علم و آگاہی کے بارے میں اس کی دعا و طلب کو پورا کرتے ہوئے یہ ارادہ فرمایا ہے کہ اسے اپنی کتاب کے علم سے نوازے، وہ کتاب کہ جو ہر چیز کا واضح بیان ہے، اور عطائے علم کا راستہ کہ جسے مفاح اور کلید سے تعبیر کیا گیا ہے خداوند عالم کی طرف سے حاصل ہونے والی پاکیزگی ہے کہ جس کا تذکرہ اس آیت مبارکہ میں ہوا ہے:

سورہ مائدہ، آیت ۷:

○ ”مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَلَا لَكُنْ بِرِيْدٍ لِيُطَهَّرَكُمْ“

(خدا تمہیں دین کی بابت کسی طرح سے بھی پریشانی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا بلکہ وہ تمہیں پاک رکھنا چاہتا ہے)

اس آیت میں احکام دین کی قانون سازی کا اصل مقصد خدا کی طرف سے عطا کی جانے والی پاکیزگی کو قرار دیا گیا ہے، اور یہ انسانی کمال انہی دیگر کمالات کی مانند کہ جن کے حصول کی دعوت دی گئی ہے اور اسے آراستہ ہونے کے اسباب فراہم کرنے کی تاکید کی گئی ہے صرف خاص افراد کو حاصل ہوتا ہے اور وہی اس سے آراستہ ہونے کا شرف پاتے ہیں اگرچہ تمام افراد بشر کو اس کے حصول کی کوشش کرنے کی دعوت عام دی گئی ہے، البتہ لوگوں کا دینی تربیت کے مراحل طے کرنا خاص افراد ہی کے لئے نتیجہ بخش ثابت ہوتا ہے اور انہیں پاکیزگی کے کمالی درجہ پر فائز کر دیتا ہے، اور ان کے علاوہ دیگر افراد کو پاکیزگی کے بعض مراتب و درجات سے بہرہ مند کرتا ہے البتہ پاکیزگی کے درجات کا حامل ہونا افراد بشر کی ذاتی خصوصیات کے مطابق ہوتا ہے، اس کی مثال اس طرح دی جاسکتی ہے کہ اسلام نے تمام افراد بشر کو عمل میں تقویٰ اختیار کرنے کی دعوت عام دی اور فرمایا: ”اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ“ (سورہ آل عمران، آیت ۱۰۲)۔ اور تم تقوائے الہی اختیار کرو جس طرح پر اس کا حق ہے، لیکن تقویٰ کا کمال معدودے چند افراد کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہوتا اور ان کے علاوہ دیگر افراد تقویٰ کے کمتر درجہ کو پاتے ہیں اور الامثل فالامثل کی بناء پر ہر شخص اپنی ایمانی و عملی صلاحیت کے مطابق تقویٰ کی نعمت سے سرشار ہوتا ہے، اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ افراد بشر کی طبع و فہم مختلف ہوتی ہے چنانچہ یہی صورت حال معاشرتی کمالات کی ہے کہ تربیت اور دینی شعور کی بنیاد پر ان میں فرق پایا جاتا ہے جبکہ معاشرہ کی تشکیل اور اسے قائم کرنے والا شخص تمام افراد کو ہر کمال مثلاً علم، صنعت، ثروت و دولت مند، راحت و آرام وغیرہ کے بلند ترین مقام تک پہنچنے کی دعوت دیتا ہے لیکن ان کمالات کے اعلیٰ ترین

درجہ کو چند افراد ہی پاتے ہیں اور ان کے علاوہ دیگر حضرات کو اپنی اپنی صلاحیتوں اور استعدادات کے مطابق کمالات حاصل ہوتے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے مقاصد و بلند پایہ کمالات یا کمالات کی بلندیوں ہر ہر فرد کے بجائے مجموعی طور پر معاشرہ کو حاصل ہوتی ہیں یعنی عمومی و مجموعی طور پر معاشرہ ان کمالات کا حامل ہوتا ہے کہ جس کے تمام افراد ان سے متصف ہوتے ہیں اور کوئی ان سے عاری نہیں رہتا البتہ ہر شخص اپنی صلاحیت و استعداد کے مطابق کمالات کی درجات پاتا ہے۔

(۲) قرآن مجید نے بھرپور صراحت و چٹنگی کے ساتھ اس بات کو بیان کیا ہے کہ اس غرض و مقصد کے حصول کے لئے صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنے آپ کو پہچانے جو کہ علمی و عملی تربیت کے ذریعے امکان پذیر ہے، علمی تربیت کے ذریعے اس طرح سے کہ ان حقائق کی تعلیم دی جائے جن کا تعلق مبداء و معاد اور ان دنوں کے درمیان پائے جانے والے عالم سے ہے تاکہ وہ اپنے آپ سے آگاہی حاصل کرتے ہوئے مربوطہ حقائق کی بابت حقیقی معرفت حاصل کر سکے اور عملی طور پر تربیت اس طرح ممکن ہے کہ اسے معاشرتی قوانین کی پاسداری کا پابند کیا جائے تاکہ اس کی معاشرتی زندگی کے امور درست انجام پذیر ہوں اور وہ اسے علم و معرفت کی دنیا سے دور نہ کر سکیں، پھر اس پر عبادتی اعمال واجب و لازم کر دیئے جائیں تاکہ وہ ان اعمال کے بار بار انجام دینے کے نتیجے میں اپنے آپ سے آگاہی، مبداء و معاد کی طرف قلبی جھکاؤ، روحانیت و پاکیزگی کی حسین وادی میں قدم قدم رکھنا اور مادی امور کی گندگی و سنگینی سے دوری جیسی کمالات حاصل کر سکے،

اگر آپ اس آیت مبارکہ میں غور و فکر اور اچھی طرح تدبر کریں کہ جس میں ارشاد خداوندی ہے: ” اَلَيْسَ يَضَعُ اَلِكَلِمَ الطَّيِّبَ وَ اَلْعَمَلُ الصَّالِحَ يَرْفَعُهُ “ (سورہ فاطر، آیت ۱۰)..... اسی کی طرف پاکیزہ باتیں (صحیح و برحق عقائد) صعود کرتی ہیں (اور پر کی طرف بلند ہوتی ہیں) اور اعمال صالحہ انہیں مزید بلند کر دیتے ہیں..... اور اس کے ساتھ ساتھ آیت شریفہ ” وَ لَكِن يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ “ کی تفسیر میں ہم نے جو مطالب ذکر کئے ہیں اور آیت مبارکہ ” عَلَيْكُمْ اَنْفُسُكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَن ضَلَّ اِذَا هَتَمْتُمْ اِلَيْهَا “ (سورہ مائدہ، آیت ۱۰۵)..... تم اپنا خیال رکھو تاکہ گمراہ ہونے والا شخص تمہیں نقصان نہ پہنچا سکے جبکہ تم ہدایت پا چکے ہو..... اور آیت مبارکہ ” يَرْفَعِ اللهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اٰوْتُوْا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ “ (سورہ مجادلہ، آیت ۱۱) خدا تم میں سے ایمان والوں اور ان لوگوں کو کہ جنہیں علم عطا کیا گیا ہے بلند درجے عطا کرتا ہے۔ اور اس طرح کی دیگر آیات کے معانی کو مد نظر قرار دیں تو آپ کو وہ غرض و مقصد اعلیٰ واضح طور پر معلوم ہو جائے گا جس کے تحت خداوند عالم نے دینی قوانین وضع کئے اور احکام و دستورات صادر فرمائے اور انسان کو حق کی ہدایت کے راستے بتائے، اور اس مقصد تک پہنچنے کا جو راستہ اختیار کیا (مزید غور کریں)۔

مذکورہ بالا بیان سے یہاں ہم ترین نتیجے سامنے آتا ہے کہ اسلام کے معاشرتی قوانین ان عبادتی اعمال و فرائض کے لئے مقدمہ و تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں کہ جن کے لئے ان کو وضع کیا گیا ہے اور عبادتی فرائض خداوند عالم کی ذات اور اس کی آیات



کی معرفت کا مقدمہ ہیں، یعنی معاشرتی قوانین و دستورات کی اصل غرض عبادتی اعمال و فرائض ہیں اور عبادتی اعمال و فرائض کی اصل غرض معرفتِ خدا ہے، لہذا معاشرتی احکام و دستورات میں ذرہ بھر تبدیلی یا تحریف و خلل اندازی عبادتی اعمال کے فاسد ہونے کا سبب ہوگی اور عبادتی اعمال کے خراب ہونے کا نتیجہ معرفتِ خدا کے سلسلہ کو درہم برہم کر دے گا۔

مذکورہ بالا نتیجہ جو کہ اپنی اصل و اساس کے حوالہ سے واضح و روشن ہے اس کی تائید و تصدیق عملی تجربات سے بھی ہوتی ہے اور وہ یوں کہ: اگر آپ امتِ اسلامیہ میں دینی امور و اسلامی معارف کی بابت پیدا ہونے والی خرابیوں اور بحرانی حالات کا جائزہ لیں اور ان کے بارے میں اچھی طرح غور و فکر کر کے یہ بات سوچیں کہ یہ سب کچھ کہاں سے شروع ہوا اور کہاں تک جا پہنچا تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس سارے فتنے کی ابتداء معاشرتی دستورات و قوانین سے روگردانی کا باعث ہوئی اور پھر وہ عبادات تک سرایت کر گیا یہاں تک کہ اس کا سلسلہ معارف و حقائق اور عقائد تک جا پہنچا (گویا معاشرتی قوانین کی خلاف ورزی اس کی اصل و اساس اور پہلا آغاز تھا اور عبادات میں بدعتوں کے ذریعے اس فتنہ کو ہوا ملی جو کہ اس کا درمیانی مرحلہ تھا اور اعتقادات و معارف تک سرایت کرنا اس کا آخری مرحلہ تھا) چنانچہ ہم آپ کو پہلے آگاہ کر چکے ہیں کہ دنیا سے اسلام بلکہ دین اسلام میں فتنوں کا آغاز مشابہات کی پیروی اور ان کی تاویل جوئی کے ذریعے ہوئی اور یہ سلسلہ عصر حاضر تک جاری و ساری ہے۔

(۳) دینی ہدایت کی بنیاد کسی کی اندھی تقلید نہ کرنے اور حتی الامکان علم و دانش کے سہارے اعتقادی و عملی مراحل طے کرنے پر استوار ہے کیونکہ یہی بات دینی احکام و قوانین کے مقصدِ اعلیٰ یعنی معرفت سے ہم آہنگی و ہم رنگی رکھتی ہے، اور ایسا کیوں نہ ہو؟ کیونکہ آسمانی کتب میں سے کوئی کتاب اور ادیانِ الہی میں سے کوئی دین ایسا نہیں کہ جس میں اس حد تک علم کی عظمت و اہمیت کو واضح کر کے اس کے حصول کی ترغیب دلائی گئی ہو جتنی قرآن مجید اور اسلامی تعلیمات میں ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے انسان کو پہلے اعتقادی معارف و حقائق سے بھرپور آگاہی دلائی اور واضح طور پر ان کو بیان کیا اور پھر ان حقائق کا عملی احکام و دستورات اور شرعی قوانین سے ربط واضح کیا، دوسرے لفظوں میں یہ کہ اسے سمجھایا کہ وہ خدا کی مخلوق ہے، خدا نے اسے اپنے دستِ قدرت سے خلق کیا ہے اور اس کی تخلیق و بقاء میں اپنے فرشتوں اور آسمان و زمین و نباتات و حیوانات و مکان و زمان اور اپنی دیگر مخلوقات کو آمادہ خدمت قرار دیا، اور یہ کہ وہ خواہ و ناخواہ اپنی جائے بازگشت و حقیقی وعدہ گاہ کی طرف رواں دواں ہے اور اپنے پروردگار کے حضور پہنچنے میں کوشاں ہے کہ بالآخر اس تک جا پہنچے گا، پھر اسے اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا کہ یا وہ بہشت میں جگہ پائے گا یا دوزخ اس کا ٹھکانہ ہوگا، یہ وہ مطالب ہیں جو عقائد کے حوالہ سے قرآن مجید میں مذکور ہیں، اس کے بعد قرآن مجید نے انسان کو اس کے اعمال کی بابت آگاہ کیا کہ وہ کون سے اعمال ہیں جن کا انجام دینا بہشت میں جانے کی سعادت کے حصول کا سبب بنتا ہے اور وہ کون سے اعمال ہیں جن کے ارتکاب کا نتیجہ دوزخ میں چلنے کی

بدبختی کے سوا کچھ نہیں، یعنی قرآن مجید نے عبادتی احکام و معاشرتی قوانین کو واضح طور پر بیان کیا ہے تو یہ وہ مطالب ہیں جنہیں اعتقادات کے بیان کے بعد دوسرے مرحلہ میں بیان کیا گیا ہے، پھر قرآن مجید انسان کو اس حقیقت سے آگاہی دلاتا ہے کہ احکام و قوانین اسے سعادت و خوشنہی کی منزل تک پہنچا سکتے ہیں، یعنی اسے سمجھاتا ہے کہ دوسرے مرحلہ میں بیان کئے گئے مطالب دراصل پہلے مرحلہ میں بیان کئے گئے مطالب سے مرتبط و وابستہ ہیں اور ان کی انسان کے لئے تشریح و قانون سازی کی بنیاد و مقصد اس کی سعادت و خوشنہی ہے کیونکہ ان میں انسان کی دنیوی و اخروی بہتری کا راز پوشیدہ ہے، تو یہ مطالب تیسرے مرحلہ میں قرآن مجید نے انسان کے لئے ذکر کئے ہیں۔

مذکورہ بالا بیانات سے یہ بات آپ کے سامنے واضح ہو چکی ہوگی کہ دوسرے مرحلہ میں مذکور مطالب، پہلے مرحلہ میں بیان کئے گئے مطالب کی نسبت، مقدمہ و تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں اور دوسرے مرحلہ میں بیان کئے گئے مطالب ان کے نتیجہ کے طور پر ہیں اور تیسرے مرحلہ میں ذکر کئے گئے مطالب رابطہ اور باہمی پونجی ایجاد کرنے والی شے کی حیثیت رکھتے ہیں کہ جس سے دوسرے مرحلہ کے مطالب کا پہلے مرحلہ کے مطالب سے ربط قائم ہوتا ہے، بہر حال ان تمام مطالب کے بارے میں قرآنی آیات مبارکہ واضح دلالت کی حامل ہیں یعنی آیات شریفہ سے ان مطالب کی بابت واضح ثبوت ملتے ہیں لہذا ان سب کے تفصیلی تذکرہ کی ضرورت نہیں۔

(۴) عمومی طور پر لوگوں کے فہم و ادراک کی دسترس محسوسات تک محدود ہوتی ہے اور وہ صرف انہی امور کو سمجھ سکتے ہیں جن تک ان کے حواس خمسہ کی رسائی ممکن ہوتی ہے اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں سمجھ سکتے اور ان کی عقلیں مافوق الطبیعہ عالم تک جا ہی نہیں سکتی، وہ مادی جہان سے ماوراء کی اشیاء و امور کے ادراک سے قاصر ہیں، اور لوگوں میں سے جو افراد علمی کاوشوں و فکری ریاضتوں کے ذریعے فہم و ادراک کی بلندیوں پر فائز ہو کر حقائق و مفاہیم اور اصول عقائد و قوانین کو سمجھنے میں کامیاب ہوئے وہ سب یکساں و مساوی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ان کے درمیان درجات و مراتب کے لحاظ سے فرق پایا جاتا ہے اور اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ جن وسائل کے ذریعے وہ افراد حقائق و مفاہیم کے ادراک میں کامیاب ہوئے وہ ایک جیسے نہیں بلکہ ان میں فرق پایا جاتا ہے اور اسی کے سبب عالم محسوسات سے باہر کے مطالب کے سمجھنے میں برابری نہیں رہی بلکہ اس حوالہ سے لوگ مختلف مراتب کے حامل ہو گئے اور ان کے درمیان پائے جانے والے فہم و ادراک کے شدت سے مختلف ہونے کا مسئلہ اس قدر وسیع و عریض ہے کہ کوئی شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا۔

یہ بات بھی واضح و مسلم اور ناقابل انکار ہے کہ کسی بھی شخص کو کسی معنی و حقیقت سے آگاہی دلانے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ان ذہنی معلومات سے عبارت ہے جو اسے زندگی کے گونا گوں مراحل میں حاصل ہوتی ہیں، پس اگر وہ شخص حس و حیات سے ذہنی انس رکھتا ہو تو اسے محسوسات کے ذریعے اسی حد تک مافوق المادہ مطالب و معانی سے آگاہی دلانا ممکن

ہوگا جتنا اس کی قوتِ حس کے مراتب میں بلندی ہوگی جیسا کہ کم سن بچے کو شادی کی لذت و مٹھاس سے آشنا کرنے کے لئے حلوے کی مٹھاس سے مثال دی جائے اور کہا جائے کہ اس کی مٹھاس حلوہ کی مٹھاس جیسی ہے، اور اگر وہ کلیات کے ادراک اور حس و حیات سے بالاتر معانی و حقائق تک رسائی حاصل کر چکا ہو تو جس ذریعہ سے اور جس حد تک اسے رسائی حاصل ہوئی ہو اسے اس کے مطابق مطلب سمجھایا جائے گا لہذا وہ ہر بیان کے ذریعے خواہ حس ہو یا عقلی، معانی کا ادراک کر سکتا ہے یعنی اس کے لئے دونوں قسم کے بیانات یکساں ہیں جبکہ حس و حیات سے ذہنی انس رکھنے والا شخص ایسا نہیں بلکہ وہ صرف اور صرف حسِ بیان کے ذریعے معانی کو سمجھ سکتا ہے،

اور جہاں تک دینی ہدایت کا تعلق ہے تو وہ لوگوں میں سے کسی خاص طبقہ سے مختص نہیں بلکہ تمام افرادِ بشر اور ہر طبقہ کے لئے ہے، اور یہ ایک واضح و روشن حقیقت ہے،

بنامبر ایس لوگوں کے فہم و ادراک کا مختلف ہونا اور دینی ہدایت کا تمام افرادِ بشر کے لئے عام و وسیع ہونا اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کا تاویل پر مشتمل ہونا ہی اس بات کا موجب ہوا کہ قرآنی بیانات مثالوں کی حیثیت و صورت میں ہوں اور وہ اس طرح کہ انسان جن معانی سے آشنا ہے اور ان سے ذہنی انس رکھتا ہے ان کی بناء پر قرآن مجید سے اپنے بیانات کے ذریعے وہ معانی و مطالب واضح کرتا ہے جن سے وہ آگاہ و آشنا نہیں کیونکہ ان دونوں کے درمیان ہم رنگی پائی جاتی ہے یعنی جن معانی و حقائق سے انسان آشنا ہے اور جن سے نا آشنا ہے ان دونوں کے درمیان مناسبت و ہم رنگی کی وجہ سے قرآن مجید اپنے بیانات کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہر فرد اپنی قوتِ فہم و ادراک کے مطابق ان سے استفادہ کر سکے، اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ جس طرح ہم اشیاء کا وزن لوہا و پتھر وغیرہ سے کرتے ہیں جبکہ ان دونوں کے درمیان کسی بھی حوالہ سے سختی نہیں ہوتی نہ شکل و صورت میں، نہ حجم میں اور نہ ہی نوع میں، بلکہ جن چیزوں کے ذریعے اشیاء کو تولد جاتا ہے وہ ان اشیاء سے سوائے وزن کے کسی بھی حوالہ سے ہم رنگی نہیں رکھتیں..... مثلاً پتھر کے ذریعے مٹھائی کو تولد جاتا ہے کہ ایک کلو کا پتھر ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ کر اس کے برابر وزن میں ایک کلو مٹھائی رکھی جاتی ہے اس طرح دونوں کا وزن یکساں ہو جاتا ہے جبکہ ان دونوں کے درمیان کوئی سختیت و مناسبت نہیں پائی جاتی بلکہ صرف وزن معیار و ملحوظ ہوتا ہے یہی بات قرآنی بیان کی تمثیلی حیثیت کے حوالہ سے ہے، م.....

سابق الذکر قرآنی آیات مبارکہ میں سے ایک یہ ہے: ” اِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۷﴾ وَ اِنَّهٗ فِي الْكِتٰبِ لَدَلِيْلًا لِّعَلٰی حٰكِمِيْنَ ﴿۸﴾ “ (سورہ زخرف، آیت ۴)..... بے شک ہم نے قرآن کو عربی زبان میں قرار دیا تاکہ تم سمجھ سکو اور وہ ام الکتاب میں ہمارے پاس ہے جو کہ بلند مرتبہ اور پراز حکمت و دانائی ہے..... اور اس طرح کی دیگر آیات اگرچہ اشارہ و کنایہ کے ذریعے زیر بحث موضوع کو بیان کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود قرآن مجید نے اشارہ و کنایہ پر

انکشاف نہیں کیا بلکہ اسے حق و باطل کی بابت مثال دے کر واضح کیا چنانچہ ارشاد ہوا:

سورہ عہد، آیت ۷۷:

” أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَابِيًا ۗ وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حُلِيَّةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِثْلَهُ ۗ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۗ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۗ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۗ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ۗ“

(اس نے آسمان سے پانی اتارا پھر ندی نالے اپنی گنجائش کے مطابق بنے لگے، پھر پانی کے ریلے پر پھولا ہوا جھاگ آ گیا اور اس چیز (دھات) سے بھی کہ جسے لوگ زیورات یا دیگر اسباب بنانے کے لئے آگ میں تپاتے ہیں، اسی طرح خدا حق و باطل کی مثال بیان کرتا ہے، پھر وہ جھاگ خشک ہو کر نیست و نابود ہو جاتا ہے اور وہ چیز کہ جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے وہ زمین میں برقرار رہتی ہے، اسی طرح اللہ مثالیں دیتا ہے۔)

اس آیت مبارکہ کے ذریعے خداوند عالم نے اس امر کی وضاحت فرمائی ہے کہ اس کے افعال میں تمثیلی ضابطہ کا حکم فرما جا رہی ہونا اسی طرح سے ہے جیسے اس کے اقوال میں ہوتا ہے، لہذا اس کا فعل بھی اس کے قول کی مانند حق ہے اور اس کے قول و فعل کا مقصد و مقصود بھی حق ہے البتہ ان دونوں (قول و فعل) میں سے ہر ایک کے ساتھ کچھ ایسے امور بھی ہوتے ہیں جو اصل میں مقصود نہیں ہوتے بلکہ مفید بھی نہیں ہوتے لیکن عام طور پر ان کی طرف توجہات مبذول ہوتی ہیں اور وہی سب کی نگاہوں میں سماتے ہیں جبکہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے زوال پذیر ہو جاتے ہیں اور ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا اور جو چیز باقی رہتی ہے اور اسے دوام حاصل ہوتا ہے وہ ”حق“ ہے کہ جو ہر حال میں قائم و ثابت رہتا ہے اور وہی تمام افراد بشر کے لئے فائدہ مند ہوتا ہے، لیکن وہ ”حق“ بھی کسی دوسرے حق..... کہ جو اس سے زیادہ اہم و فائدہ بخش ہو..... کے ذریعے محو ہو جاتا ہے اس کی مثال آئیہ تشابہ ہے کہ جو ایک ”حق“ اور مقصود معنی کی حامل ہوتی ہے جبکہ اس کے ساتھ بلکہ اس سے نمایاں تر اس کا ایک معنی ذہنوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہے جو کہ حق و مقصود نہیں ہوتا بلکہ وہ باطل و غیر مقصود معنی ہوتا ہے کہ جو دوسرے حق کے ذریعے (یعنی آئیہ محکم کے ذریعے) محو ہو جاتا ہے اور جو معنی ”حق“ ہے وہی ثابت و قائم رہتا ہے اور وہ باطل معنی پر غالب آ جاتا ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

سورہ انفال، آیت ۸:

” لِيُحِقَّ الْحَقُّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ“

(..... تاکہ وہ (خدا) حق کو ثابت و قائم رکھے اور باطل کو مٹا دے خواہ مجرم لوگ اسے ناپسند ہی کیوں نہ کریں)

اس آیت مبارکہ سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم کے کلام کا دورخوں کا حامل ہونا اس غرض سے ہے کہ حق قائم رہے

اور باطل محو ہو جائے۔

بہر حال مذکورہ بالا مثال کی تطبیق کے حوالہ سے ہماری بحث اور نقطہ نظر خداوند عالم کے کائنات میں ظاہر بہ ظاہر انجام دیئے جانے والے افعال کی بابت اسی طرح سے ہے جیسے اس کے اقوال کی بابت ہوتی ہے ان دونوں میں اس حوالہ سے کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ آیہ مبارکہ سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ خدائی حقائق و معارف اس پانی کی مانند ہیں جسے خداوند عالم آسمان سے نازل کرتا ہے جو کہ اپنی طبعی حیثیت میں صرف پانی ہے اور اس میں کوئی شرط و صنعت مثلاً مقدار و کیفیت ملحوظ و مقصود نہیں ہوتی بلکہ ہر طرح کی قید و شرط سے خالی، اسے پانی کہا جاتا ہے کہ جو بعد میں سیلاب کی طرح ندیوں نالوں میں رواں دواں ہوتا ہے اور ہر جگہ کی وسعت و تنگی کے مطابق اس کی مقدار متعین ہو جاتی ہے اور یہ مقدار و اندازے ہر جگہ میں اس کے مقام و مورد کے مطابق برقرار ہوتے ہیں یعنی جس جگہ پانی گرتا ہے اس کی ظرفیت کے عین مطابق پانی کی مقدار واضح ہوتی ہے اور جگہ کی وسعت و تنگی کے حوالہ سے پانی کی مقدار سے آگاہی حاصل ہوتی رہتی ہے یہی صورت حال اصول المعارف اور تشریحی احکام اور احکام کی ان حکمتوں و فوائد کی ہے جن کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں اور بیان کر چکے ہیں کہ وہ حکمتیں و فوائد و حقیقت احکام اور معارف کے درمیان ربط و تعلق قائم کرنے والے امور ہیں کہ جو احکام کو برحق معارف سے مربوط کر دیتے ہیں، تو یہ ہے ان حکمتوں، مصلحتوں اور حقیقی فوائد کی اصل صورت کہ جو الفاظ کے قالب میں ڈھلنے سے قطع نظر مورد توجہ ہے اور جب وہ لفظوں کے قالب میں ڈھلتے ہیں تو گاہے کچھ ایسی زائد و اضافی چیزوں کے ہمراہ ہوتے ہیں کہ جن کی حیثیت سیلاب کے پانی پر تیرتے ہوئے جھاگ کی طرح ہوتی ہے کہ جو ابھرتا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو جاتا ہے لیکن اصل شے باقی رہ جاتی ہے، اس کی مثال ان احکام جیسی ہے جو ناسخ آیات کے ذریعے منسوخ ہو جاتے ہیں کیونکہ جو احکام منسوخ ہوتے ہیں ان کے ظاہری الفاظ سے ان کے دائمی ہونے کا عندیہ ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ وہ احکام ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں لیکن ناسخ احکام ان کے دائمی و ہمیشہ باقی ہونے کی صفت کو محو کر دیتے ہیں اور دیگر احکام ان کی جگہ لے لیتے ہیں کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ منسوخ ہونے والے احکام ناسخ احکام کے نزول تک کے زمانہ کے لئے صادر ہوئے تھے اور اس کے بعد ناسخ احکام واجب الاتباع ہیں اور جو مصلحتیں منسوخ شدہ احکام میں ملحوظ و مقصود تھیں ان کی جگہ دیگر امور مورد توجہ ہیں۔

یہ تھے وہ مطالب کہ جن کا تعلق مذکورہ قرآنی اصل حقائق و معارف سے ہے کہ جن میں ان حقائق و معارف کا الفاظ کی صورت میں وارد ہونا ملحوظ نہیں بلکہ الفاظ و عبارتوں سے قطع نظر اصل معارف مد نظر تھے، لیکن جہاں تک ان کے الفاظ کی صورت میں نازل ہونے کا تعلق ہے کہ وہ الفاظ مخصوص معانی پر دلالت کرتے ہیں تو اس صورت میں (ان کی حیثیت اس پانی کی مانند ہے جو مختلف زمینوں پر گرتا ہے اور ہر زمین سے اس کے ظرف کی وسعت کے مطابق ثمر و نتیجہ حاصل ہوتا ہے، گویا

اس طرح ہر زمین اپنی صلاحیت و خصوصیت کے مطابق اس پانی کی مقدار کے تعین کا مظہر ہوتی ہے اسی طرح قرآنی حقائق و معارف جب لفظوں کی صورت میں نازل ہوتے ہیں تو ان کے معانی کا تعین و ان کے دائرہ کار کی وسعت و عدم وسعت انہی الفاظ کی بنیاد پر ہوتی ہے اور لفظوں ہی سے ان معارف کی حدود و قیود کا اندازہ ہوتا ہے اور وہ الفاظ ان معانی و حقائق اور معارف کے آئینے میں منکلم کے مقصود و مراد کے حوالہ سے مورد توجہ قرار پاتے ہیں کہ وہ ان کے ظرف کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے مقصودہ معانی سے آگاہی حاصل ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود کہ وہ الفاظ منکلم کے کلام میں مقصود اور بنیادی طور پر ملحوظ ہوتے ہیں مگر حقیقت میں وہ مثال کی طرح ہوتے ہیں کہ جن سے مطلق معنی کی تمثیل کا کام لیا جاتا ہے اور اس قالب کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں اصل اشیاء کو ڈھالا جاتا ہے تو اس میں حقیقی مقصودہ اشیاء ہوتی ہیں کہ جنہیں قالب میں رکھ کر ان کے اندازوں کا تعین کیا جاتا ہے، پھر وہ الفاظ مختلف اذہان میں وارد ہونے کے سبب غیر مقصودہ معانی کے حامل ہو جاتے ہیں جیسا کہ سیلاب میں پانی پر تیرتا ہوا جھاگ ہوتا ہے، کیونکہ ذہنوں میں جو معانی و مفاہم گھر کرتے رہتے ہیں وروہ (اذہان) ان سے مانوس ہو جاتے ہیں ان کی وجہ سے نئے آنے والے معانی میں تصرف کی راہ کھل جاتی ہے (تصرف سے مراد ان معانی میں کمی و بیشی اور ان کے تعین میں مخصوص رجحانات کی دخل اندازی و عملداری ہے) اور اس طرح کا تصرف عموماً غیر مانوس معانی میں ہوتا ہے مثلاً بنیادی اعتقادی معارف، احکام کی حکمتیں و مصلحتیں اور ان کے معیار وغیرہ کہ جن کی بابت وضاحت ہو چکی ہیں، لیکن جہاں تک اصل احکام اور عملی دستورات کا تعلق ہے تو ان کے معیاروں و حکمتوں سے قطع نظر ان میں تصرف کی نوبت اس لئے نہیں آتی کہ ذہنوں کو ان سے مانوسیت ہوتی ہے اور اس مانوسیت کی وجہ سے اذہان ان میں تصرف نہیں کرتے، اسی بیان سے تشابہات کا مسئلہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ ایسی آیات ہیں جو احکام اور دینی قوانین و دستورات کی بجائے بنیادی اعتقادی معارف اور احکام کے معیاروں و حکمتوں پر مشتمل ہیں کہ جن سے عدم مانوسیت ان میں تصرف کی راہ کھلتی ہے۔

(۵) مذکورہ تمام مطالب سے یہ بات معلوم و واضح ہو گئی کہ قرآنی عبارت و لفظی بیانات دراصل خدائی حقائق و معارف کی تمثیلی صورتیں ہیں اور وہ حقائق ان آیات میں عامتہ الناس کی سطح فہم کے مطابق اترے ہیں کیونکہ عامتہ الناس کی قوت فہم کی رسائی حسی امور تک ہے اس سے زیادہ نہیں اور وہ روحانی حقائق و معارف کا ادراک صرف اسی صورت میں کر سکتی ہے جب ان کو جسمانیات کے قالب میں ڈھال دیا جائے۔ لیکن روحانی حقائق و معارف کو جسمانی و مادی قالب میں ڈھال کر بیان کرنے میں دو مشکلوں میں سے کسی ایک سے دوچار ہونا ناگزیر ہوگا جبکہ وہ دونوں خطرناک صورتیں ہیں۔

## روایات پر ایک نظر

### محکم اور متشابہ کا فرق

تفسیر العیاشی میں مذکور ہے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے محکم و متشابہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا:

”المحکم ما يعمل به والمتشابہ ما اشتبه علی جاهلہ“،

محکم اس آیت کو کہتے ہیں جس پر عمل کیا جاتا ہو اور متشابہ سے مراد وہ آیت ہے جس کا مفہوم اس کے معنی سے نا آگاہ شخص پر واضح نہ ہو۔ (تفسیر العیاشی، ج ۱، ص ۱۶۲)

مؤلف: اس روایت میں امام علیہ السلام کے ارشاد گرامی سے اس مطلب کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ متشابہ کے معنی سے آگاہی پانا ممکن ہے۔

اسی کتاب (تفسیر العیاشی) میں انہی حضرت سے منقول ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

”ان القرآن محکم و متشابہ، فاما المحکم فتؤمن به و تعمل به، وهو قول اللہ عزو

جل: ﴿و اما الذین فی قلوبہم زیغ فیتبعون ما تشابہ منه ابتغاء الفتنة و ابتغاء تأویلہ و ما یعلم تأویلہ، الا اللہ و الراسخون فی العلم یقولون 'امنا بہ کل من عند ربنا'﴾ و الراسخون فی العلم ہم آل محمد“،

قرآن مجید محکم اور متشابہ آیات پر مشتمل ہے، محکم سے مراد وہ آیت ہے جس پر ایمان لانا اور عمل کرنا ضروری ہے، اور متشابہ اس آیت کو کہتے ہیں جس پر صرف ایمان لانا ضروری ہوتا ہے مگر اس پر عمل نہیں کیا جاتا، اسی مطلب کو قرآن مجید میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے (اور وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہ آیات کی پیروی قتنہ پردازی اور تاویل جوئی کی غرض سے کرتے ہیں، حالانکہ اس کی تاویل (اصل حقیقت) کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ اور راسخون فی العلم کے، کہ جو کہتے ہیں کہ ہم اس (قرآن) پر ایمان لائے ہیں، سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے) اور ”راسخون فی العلم“ سے مراد ہم آل محمد ہیں۔

مؤلف: امام کے فرمان کہ ”رَأَيْسُخُونَ فِي الْعِلْمِ“ سے ہم آل محمد مراد ہیں“ کی وضاحت عنقریب ذکر کی جائے گی، انشاء اللہ تعالیٰ۔

## ناسخ اور منسوخ کا فرق

تفسیر العیاشی میں مسعد بن صدقہ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت امام ابو عبد اللہ جعفر صادق علیہ السلام سے ناخ و منسوخ اور محکم و متشابہ کے بارے میں پوچھا تو امام نے ارشاد فرمایا:

”الناسخ الثابت المعمول بہ والمنسوخ ما قد کان یعمل بہ ثم جاء ما نسخه، والمتشابہ ما اشتبه علی جاهلہ“،

ناخ اس آیت کو کہتے ہیں جو ثابت (قائم و باقی) ہو کہ جس پر عمل کرنا ضروری ہے اور منسوخ اس آیت کو کہتے ہیں جس پر عمل کیا جاتا رہا ہو اور بعد میں کوئی دوسری آیت اسے منسوخ کر دے، اور متشابہ سے مراد وہ آیت ہے جس کا معنی اس شخص پر واضح نہ ہو جو اس سے نا آگاہ ہو،

(تفسیر العیاشی جلد ۱ ص ۱۱)

ایک روایت میں اس طرح مذکور ہے:

”الناسخ الثابت والمنسوخ ما مضی والمحكم ما یعمل بہ والمتشابہ ما یشبه بعضہ

بعض“،

(ناخ سے مراد ثابت و باقی اور منسوخ سے مراد سابق حکم ہے، محکم سے مراد وہ حکم ہے کہ جس پر عمل کیا جائے

اور متشابہ سے مراد وہ آیت ہے جو ایک دوسری سے ملتی جلتی ہو) (تفسیر العیاشی جلد ۱ صفحہ ۱۰)

کتاب کافی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے ایک حدیث کے ضمن میں ارشاد فرمایا: منسوخ

(کافی، جلد ۲ ص ۲۸)

آیات، متشابہات میں سے ہیں۔

## متشابہ و محکم کی بابت رہنمائی

کتاب عیون اخبار الرضا میں مذکور ہے کہ امام علی رضا علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:



”من رد متشابه القرآن الی محکمہ ہدی الی صراط مستقیم، (ثم قال:) ان فی اخبارنا متشابهاً کمتشابه القرآن، فردوا متشابهها الی محکمها، ولا تتبعوا متشابهها فتضلوا“،

(جو شخص قرآن کی تشابہ آیات کو اس کی محکم آیات کی طرف پلٹائے وہ سیدھی راہ کی طرف ہدایت پا گیا، پھر ارشاد فرمایا) ہماری روایات میں بھی قرآنی آیات کی مانند تشابہات ہیں لہذا تم تشابہ روایات کو محکم روایات کی طرف پلٹاؤ، اور تشابہ روایات کی پیروی نہ کرو ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے،

حیدرآباد، سندھ، پاکستان (عیون اخبار الرضا، جلد ۱ ص ۲۹۰)

مذکورہ بالا روایات جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں تشابہات کی تفسیر و توضیح میں قریب المعنی ہیں اور ان سے اس سابقہ بیان کی تائید و تصدیق ہوتی ہے جس میں ہم نے ذکر کیا کہ تشابہ کا دور ہونا ممکن ہے اور وہ اس طرح کہ تشابہ کو محکم کی طرف پلٹایا جائے تو اس کا معنی واضح ہو سکتا ہے۔ گویا محکم سے تشابہ کی تفسیر ملتی ہے، اور جہاں تک منسوخ آیات کے تشابہات سے ہونے کا تعلق ہے تو وہ بھی اسی طرح سے ہے چنانچہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ تشابہ کو اس لحاظ سے تشابہ کہا جاتا ہے کہ اس سے بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اس میں مذکور حکم ابھی تک باقی و قائم ہے اور ہمیشہ نافذ العمل رہے گا جبکہ ناح آیت کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ تشابہ آیت میں پایا جانے والا حکم ہمیشہ کے لئے نہ تھا بلکہ اس کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ اور جہاں تک امام رضا کے اس ارشاد گرامی کا تعلق ہے کہ ”ہماری روایات میں بھی قرآنی آیات کی مانند تشابہات پائی جاتی ہیں اور قرآنی محکمات کی طرح محکم روایات بھی موجود ہیں“ تو اس سلسلہ میں آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے کثیر روایات منقول ہیں کہ جن میں اسی مطلب کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عقلی تائید بھی موجود ہے کیونکہ روایات شریفہ دراصل قرآنی آیات مبارکہ میں ذکر کئے گئے مطالب ہی پر مشتمل ہیں اور وہ قرآنی معارف و مطالب کے علاوہ کسی چیز کو بیان ہی نہیں کرتیں، تشابہات کی وضاحت کے ضمن میں ہم نے اس بات کو واضح طور پر بیان کیا ہے کہ ”تشابہ“ اس معنی کے اوصاف میں سے ہے جس پر لفظ دلالت کرتا ہے اور وہ اس طرح کہ اس کی صورت ایسی ہو جس سے مقصودہ معنی اور غیر مقصودہ معنی دونوں سمجھے جاسکتے ہوں۔ وہ معنی مقصود اور غیر مقصود دونوں پر منطبق ہو سکتا ہو.....، لہذا تشابہ، لفظ کے اوصاف میں سے نہیں کہ اس کی حیثیت غرابت و اجمال جیسی ہو کہ جس سے لفظ کی دلالت ہی واضح طور پر معلوم نہیں ہوتی، ایسا ہرگز نہیں، اور نہ ہی لفظ و معنی دونوں سے بالاتر و وسیع تر امر کے اوصاف میں سے ہے کہ جسے اوصاف الاعم من اللفظ والمعنی کہا جاتا ہے۔

اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ جن آیات کو تشابہات کہا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے بیانات معارف حقہ الہیہ کی نسبت مثالوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہی بات بعینہ روایات میں بھی پائی جاتی ہے لہذا ان میں بھی اسی طرح محکم اور تشابہ روایتیں موجود ہیں جس طرح قرآن مجید میں ہیں، چنانچہ حضرت پیغمبر اسلام سے مروی

ہے آپ نے ارشاد فرمایا: (انا معاشر الانبیاء نكلم الناس علی قدر عقولهم) ہم گروہ انبیاء، لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق کلام کرتے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## قرآن اور معرفت الہی

تفسیر العیاشی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت مذکور ہے کہ آپ نے اپنے پدر بزرگوار حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے حوالہ سے بیان فرمایا کہ کسی شخص نے حضرت امیر المؤمنین سے گزارش کی کہ آیا ممکن ہے کہ آپ ہمارے سامنے ہمارے رب کی اس طرح توصیف کریں کہ اس کی بابت ہماری محبت و معرفت میں اضافہ ہو جائے؟ امیر المؤمنین سخت غضبناک ہوئے اور لوگوں سے مخاطب ہوئے اور اس شخص کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے ارشاد فرمایا:

”علیک یا عبداللہ بما دلک علیہ القرآن من صفتہ، و تقدّمک فیہ الرسول من معرفتہ، و استضعی من نور ہدایتہ فانما ہی نعمۃ اوتیتہا، فخذما اوتیت و کن من الشاکرین، و ما کلفک الشیطان علیہ مما لیس علیک فی الکتاب فرضہ، و لا فی سنۃ الرسول و ائمة الہدی امرہ فکل علمہ الی اللہ، و لا تقدر عظمۃ اللہ، و اعلم یا عبداللہ: ان الراسخین فی العلم الذین اختارہم اللہ عن الاقتحام فی السدد المضروبة دون الغیوب فلزموا الاقرار بجملۃ ما جہلوا تفسیرہ من الغیب المحجوب، فقالوا 'امنا بہ کل من عند ربنا، و قد مدح اللہ اعترافہم بالعجز عن تناول ما لم یحیطوا بہ علماً، و سمی ترکہم التعمق فیما لم یکلفہم البحث عنہ منهم رسوخاً فاقصر علی ذلک و لا تقدر عظمۃ اللہ علی قدر عقلک فتكون من الہالکین“،

اے بندۂ خدا! تو انہی مطالب کی طرف توجہ رکھ جو قرآن مجید نے تیرے لئے خدا کی صفات کی بابت واضح طور پر بیان کئے ہیں اور تجھ سے پہلے حضرت پیغمبر اسلام نے معرفت پروردگار کے سلسلہ میں پیش کئے ہیں (آنحضرت اس حوالہ سے تجھ سے مقدم ہیں) اور تو آنحضرت کے نور ہدایت کی ضیاء پاشیوں سے بہرہ ور ہو کہ ان کی رہنمائی ایک نعمت اور خزانہ حکمت و دانائی ہے جو تجھے عطا کیا گیا ہے، تو جو کچھ عطا کیا جا چکا ہے اسے کافی سمجھ اور اس پر شکر گزاری کا فریضہ ادا کر، اور شیطان نے تجھے جس بات پر لگا دیا ہے اس کی بابت قرآن مجید نے تجھ پر کوئی فریضہ عائد نہیں کیا اور نہ ہی سنت نبوی و سیرت آئمہ ہدیٰ میں اس کی بابت کوئی حکم یا فرمان موجود ہے لہذا شیطان کے دھوکے میں نہ آ، اور اس سلسلہ میں حقیقی علم خود خدا ہی پر واگر کر دے اور خدا کی عظمت کے بارے میں کسی قسم کی اندازہ گیری کرنے کا اقدام نہ کر، اور آگاہ رہ اے بندۂ خدا! کہ ہر اسخون فی

الْعِلْمُ وہ ہستیاں ہیں کہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ماورائے پردہ غیب امور کی گہرائیوں میں پڑنے سے بے نیاز کر دیا ہے لہذا وہ غیب کے دبیز حجابوں میں چھپی حقیقتوں کی تفسیر سے نا آگاہی پر اپنی لاعلمی کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے بارے میں برملا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے ہیں، سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے آیا ہے ( اَمَّا اِيَّاهُ فَكُلٌّ فَمِنْ عِنْدِ رَبِّنَا )، خداوند عالم نے ان کے اس فضیلتی کمال کی تعریف و ستائش کی اور اسے سراہا کہ انہوں نے اپنے دائرہ علم سے باہر کے امور پر عدم دسترس کا اعتراف کیا ہے اور غیر متعلقہ امور کی گہرائی میں جانے سے اجتناب برتنے کو سراہتے ہوئے اسے ”رسوخ“ یعنی علمی گہرائی سے موسوم کیا ہے بنا براین تو بھی اسی پر اکتفا کرو اور اس سلسلہ میں اپنی عقل کے گھوڑے دوڑا کر عظمت خداوندی کی بلندیوں کو پانے کی کوشش نہ کرو ورنہ تباہ و برباد ہونے والوں میں قرار پائے گا۔

(تفسیر العیاشی جلد ۱ ص ۱۶۳)

## روایت کی تشریح

امام کا ارشاد گرامی: ”واعلم یا عبد اللہ ان الراسخین فی العلم“ اس امر کا عکاس ہے کہ آیہ مبارکہ میں خداوند عالم کے فرمان: ”وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ...“ میں حرف وادعطف کے لئے نہیں بلکہ استیناف یعنی نئے جملہ کی ابتداء کا معنی دیتا ہے جیسا کہ ہم نے آیہ مبارکہ کے بیان میں اسی معنی کا استظہار کیا ہے، اور حرف ”واو“ کا مسأئقہ ہونا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ آیت کے ظاہری الفاظ سے اس مطلب کی تائید نہیں ہوتی کہ راسخون فی العلم تاویل الکتب کا علم رکھتے ہیں نہ یہ کہ ان سے اس مطلب کا اشارہ ملتا ہے کہ ان کی بابت تاویل الکتب کا عالم ہونا ممکن ہی نہیں، بنا براین اگر کوئی دوسری دلیل راسخین فی العلم کے بارے میں ان کا تاویل الکتب... یا تاویل متشابہات... سے آگاہ ہونا ثابت کر دے تو اس سے آیہ مبارکہ کی نفی کا پہلو پیدا نہ ہوگا، جیسا کہ آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ راسخون فی العلم، تاویل الکتب سے آگاہی رکھتے ہیں.....

اور امام کا ارشاد گرامی: ”الذین اختارهم اللہ... اغناهم اللہ... عن الاقتام فی السدد المضروبة دون الغیب“ (راسخون فی العلم وہ ہستیاں ہیں کہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ماوراء پردہ غیب امور کی گہرائیوں میں پڑنے سے بے نیاز کر دیتا ہے) دراصل جملہ کی ابتداء میں ذکر کئے جانے والے حرف ”ان“ کی خبر ہے (”ان“ مبتداء اور یہ جملہ اس کی خبر ہے)، اور پورا کلام بظاہر اس طرح ہے کہ اس میں مخاطب کو ترغیب دلائی جا رہی ہے کہ وہ بھی راسخون فی العلم کی روش کو اپناتے ہوئے ان امور کی بابت اپنی نا آگاہی کا اعتراف کرے جن کا اسے علم حاصل نہیں تاکہ اس کا شمار بھی راسخون فی

الْعِلْمِ ہستیوں میں ہو، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ نے ”راسخون فی العلم“ کی تفسیر اس طرح کی کہ اس سے ہر وہ شخص مراد ہے جو ہر اس چیز کی پیروی کرے جس سے آگاہ ہو اور جس چیز سے نا آگاہ ہو اس کی طرف دست دراز کرنے سے اجتناب کرے،

اور امامؑ کے ارشاد گرامی میں ”ماورائے پردہ غیب امور“ سے تشابہات کے وہ معانی و مفاہیم مراد ہیں جو عام افراد کی نگاہِ فہم و ادراک سے پوشیدہ ہیں اسی وجہ سے امامؑ نے اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ”فلزموا الاقرار بجملة ما جهلوا تفسیرہ“ کہ وہ جس چیز کی تفسیر سے نا آگاہ ہیں اس کی بابت اپنی لاعلمی کا اقرار کرتے ہیں، اس جملہ میں امامؑ نے تفسیر کا لفظ ذکر فرمایا تاویل کا لفظ ذکر نہیں کیا یعنی یوں نہیں کہا کہ وہ جس چیز کی تاویل سے آگاہی نہیں رکھتے اس کی بابت اپنی لاعلمی کا اقرار کرتے ہیں۔

## تاویل الکتاب سے آگاہ ہستیاں

کتاب کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

”نحن الراسخون فی العلم و نحن نعلم تأویله“

ہم راسخون فی العلم ہیں اور ہم ہی تاویل الکتاب کا علم رکھتے ہیں، (کافی، جلد ۱ ص ۲۱۳)

اگرچہ اس روایت سے بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ آیہ مبارکہ میں جملہ ”و الراسخون فی العلم“ کا عطف، مستثنیٰ پر ہے کہ جو جملہ ”وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ“ میں مذکور ہے،..... یعنی آیت کا معنی یوں ہے: اور کوئی اس کی تاویل کا علم نہیں رکھتا سوائے اللہ کے اور راسخون فی العلم کے،..... لیکن سابقہ ذکر کئے گئے مطالب اور ان سے مربوط روایات کے تناظر میں اس خیال کی نفی ہوتی ہے۔ اور یہ بات قطعی بعید نہیں کہ ”تاویل“ سے وہی معنی مراد ہو جو تشابہ کا کیا جاتا ہے کیونکہ تاویل کا یہ معنی کہ جو تشابہ کے معنی سے ہمرنگ اور گویا اس کی تفسیر ہے وہ صدر اسلام میں لوگوں کے درمیان عام رائج تھا۔

اور جہاں تک امامؑ کے اس فرمان کا تعلق ہے کہ ”نحن الراسخون فی العلم“ (ہم راسخون فی العلم ہیں) تو اس حوالہ سے تفسیر العیاشی کی سابق الذکر روایت میں بھی امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: ”و الراسخون فی العلم ہم ال محمد“ (راسخون فی العلم، آل محمد ہی ہیں)۔ اس طرح کی دیگر روایات کہ جو اس باب میں منقول ہیں ان میں بھی اس طرح کے الفاظ مذکور ہیں اور وہ تمام روایات دراصل جری و تطبیق کے باب سے ہیں یعنی کلی

معنی کی اس کے مصداق پر تطبیق کی ایک صورت ہے، چنانچہ اس کے شواہد سابق الذکر روایات میں موجود ہیں اور آئندہ ذکر کی جانے والی روایات میں بھی واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

### امام موسیٰ کاظمؑ کا عالمانہ و عارفانہ ارشاد

کتاب کافی میں ہشام بن حکم سے روایت کی گئی ہے انہوں نے کہا کہ امام ابو الحسن موسیٰ بن جعفر نے اپنے ایک بیان کے ضمن میں ارشاد فرمایا: اے ہشام! اللہ تعالیٰ نے ایک نیک و صالح قوم کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اس قوم کے افراد نے کہا: ”رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ سِرْحَمَةً ۗ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ“ (اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں میں کجی نہ آنے دے بعد اس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت کی ہے اور ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطا فرما کہ بے شک تو ہی عطا کرنے والا ہے)، ان کی اس دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس امر سے آگاہ ہو گئے تھے کہ دلوں میں کجی پیدا ہونے کا امکان پایا جاتا ہے اور یہ بات ممکن ہوتی ہے کہ وہ اپنے اندھے پن اور ہلاکت کی راہ پر پلٹ جائیں۔ یہ بات یقینی ہے کہ وہ شخص خدا سے ہرگز خوف نہیں کھاتا جس کا دل خدا کی طرف سے مہارنہ ہوا ہو، اور جس کا دل خدائی توفیق سے مہارنہ ہوا ہو وہ معرفت کی مضبوط منزل کو نہ پاسکے گا اور معرفت کے جس مقام کا مشاہدہ کرے گا اسے اپنے دل میں نہ اتار پائے گا۔ یعنی جس قدر بھی معرفت حاصل کرے گا وہ ناکافی و بے اثر و بے نتیجہ ہوگی کیونکہ وہ اسے اپنے دل کی گہرائی میں نہ اتار سکے گا، اور کوئی شخص اس طرح معرفت کی بلندی و بلند مرتبہ و مقام کو اپنے دل کی گہرائی میں نہ اتار سکے گا سوائے اس کے کہ جس کا قول اس کے عمل کی تصدیق کرتا ہو اور اس کا باطن اس کے ظاہر سے مطابقت و ہم رنگی رکھتا ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کی عقل کے باطنی مدارج و درجات کو صرف اسی حد تک آشکار کرتا ہے جس قدر اس کے ظاہر سے اس کی ترجمانی ہوتی ہو، گویا کسی شخص کے ظاہر سے اس کے باطن کی نشاندہی ہوتی ہے اور اس کے ظاہر کے مراتب و درجات ہی اس کے باطنی مدارج و درجات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

(کافی ج ۱۷ حدیث ۱۲)

امام کا ارشاد گرامی ”وہ شخص خدا سے ہرگز خوف نہیں کھاتا جس کا دل خدا کی طرف سے مہارنہ ہوا ہو“ دراصل اس آیت مبارکہ کا معنی و تفسیر ہے جس میں ارشاد الہی ہے: ”إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ“ (سورہ فاطر آیت ۲۸) کہ اس کے بندوں میں سے صرف وہی خشیت الہی دل میں رکھتے ہیں جو علماء ہیں،

اور امام کا ارشاد گرامی ”جس کا دل خدائی توفیق سے مہارنہ ہوا ہو“ دراصل ”مَرَّاسِحُونَ فِي الْعِلْمِ“ کا نہایت

خوبصورت معنی و تفسیر ہے کیونکہ جو بات صحیح اور پورے طور پر لوح عقل پر ثبت نہ ہو جائے اس کی بابت ہر طرح کے احتمال کی گنجائش باقی رہتی ہے اور اس کے بارے میں دل اضطراب و عدم اطمینان سے دوچار رہتا ہے لیکن اگر وہ لوح عقل پر ثبت ہو جائے جس طرح نقش بر سنگ ہوتا ہے۔ اور چشم دل اس کے جمال حقیقت پر جم جائے تو پھر اس کی بابت عملی پیروی کا جذبہ عروج و کمال کو پہنچ جاتا ہے کہ نفسانی خواہشیں اس کے برعکس کسی راہ پر لانا چاہیں تو نہیں لاسکتیں بلکہ جو کچھ دل میں ہوتا ہے وہی عملی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے اور زبان پر جو کچھ آتا ہے وہ دل میں موجود حقیقت ہی کا ترجمان ہوتا ہے، گویا قول و فعل میں کامل مطابقت پائی جاتی ہے،

اور امام کا ارشاد گرامی ”کوئی شخص اس طرح معرفت کی بلندی کو اپنے دل کی گہرائی میں نہ اتار سکے گا“ دراصل ”رسوخ فی العلم“ کی علامت و نشانی کے معنی کی وضاحت ہے۔

### ”رَا سِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ“ کے بارے میں حدیثِ نبویؐ

تفسیر درمنثور میں مذکور ہے کہ ابن جریر، ابن ابی حاتم، طبرانی بحوالہ انس، ابوامامہ، واخلة بن اسقف اور ابودرداء سے مروی ہے کہ ایک شخص نے حضرت پیغمبر اسلامؐ سے ”رَا سِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ“ کے بارے میں سوال کیا تو آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا جو شخص اپنی قسم پر پورا اترتا ہو، اس کی زبان پر ہمیشہ سچ آتا ہو، اس کا دل مضبوط و استقامت آشا ہو (ہر طرح کی کجی سے پاک و ماوراء ہو) اس کا شکم اور شرمگاہ عفت شعار ہو تو اس طرح کے افراد ”راسخون فی العلم“ میں شمار ہوتے ہیں۔

(تفسیر درمنثور ج ۲ ص ۷)

اس حدیث کی توجیہ و تاویل سابق الذکر حدیث کے معنی کی طرف بازگشت کے ذریعے ممکن ہے، یعنی اگر اس حدیث سے مراد ہی معنی کو سمجھنا ہو تو سابقہ حدیث کے معنی کی طرف رجوع کر کے اس کے تناظر میں اس کا معنی واضح ہو سکتا ہے۔

### ”رَا سِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ“ کی پہچان

کافی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

”ان الراسخین فی العلم من لا یختلف فی علمہ“  
(راخون فی العلم وہ ہیں جن کے علم میں اختلاف پیدا نہیں ہوتا)۔

(کافی، جلد اول، ص ۲۴۵)

یہ روایت، زیر نظر آیہ مبارکہ پر منطبق ہوتی ہے۔ اس کے معنی سے مطابقت کی حامل ہے۔۔۔۔۔ کیونکہ آیت میں ”رَاٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ“ کا ذکر ان افراد سے تقابلی صورت میں ہوا ہے جن کے بارے میں ارشاد ہوا: ”الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ.....“ (وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں کجی ہے۔۔۔۔۔) بنا بریں رسوخ فی العلم سے مراد یہ ہوگا کہ کوئی اہل علم، اختلاف اور تردد کا شکار نہیں ہوتا۔

## پیغمبر اسلام کی دعا

تفسیر درمنثور میں مذکور ہے کہ ابن ابی شیبہ، احمد، ترمذی، ابن جریر، طبرانی اور ابن مردویہ نے ام سلمہ سے روایت بیان کی کہ حضرت پیغمبر اسلام اکثر اس طرح دعا کرتے تھے:

اللہم مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک:

(اے اللہ، اے دلوں کو پھیر دینے والے! میرے دل کو اپنے دین پر قائم رکھ)۔

ام سلمہ نے کہا کہ میں نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کی:

یا رسول اللہ وان القلوب لتتقلب؟

اے رسول خدا! کیا دل بھی متقلب ہوتے ہیں؟

حضرت پیغمبر اسلام نے ارشاد فرمایا:

نعم، ما خلق اللہ من بشر من بنی ام الا وقلبة بین الاصبغین من اصابع اللہ فان شاء اقامہ وان

شاء ازاعہ،

ہاں، خداوند عالم نے بنی نوع آدم میں جس بشر کو بھی پیدا کیا اس کا دل اپنی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان

قرار دیا کہ اگر چاہے تو اسے سیدھا رکھے اور اگر چاہے تو اسے ٹیڑھا کر دے،

(تفسیر درمنثور جلد ۲ ص ۸)

مذکورہ بالا مطلب متعدد روایات میں متعدد صحابہ کرام کے حوالوں سے ذکر ہوا ہے کہ جن میں جابر، نواس ابن

شمعان، عبد اللہ بن عمر اور ابو ہریرہ شامل ہیں، اس سلسلہ میں مشہور بات وہی ہے جو نو اس ابن شمعان کی روایت میں مذکور ہے کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: قلب ابن ادم بین اصبعین من اصابع الرحمن، (ابن آدم کا دل رحمان کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان قرار دیا گیا ہے)۔ انہی الفاظ پر مشتمل ایک روایت (جہاں تک مجھے یاد ہے) شریف رضی مرحوم نے کتاب ”المجازات النبویہ“ میں ذکر کی ہے۔

## وحی کے بارے میں حضرت علیؑ کا فرمان

حضرت امیر المؤمنین علیؑ علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ سے پوچھا گیا:

هل عندكم شئ من الوحي؟

کیا آپ کے پاس وحی میں سے کچھ ہے؟

امامؑ نے ارشاد فرمایا:

لا، والذي فلق الحبة و برء النسمة الا ان يعطى الله عبداً فهماً في كتابه؟

نہیں، مجھے قسم ہے اس ذات کی جس نے دانہ کو شگافتہ کیا، لوگوں کو خلق فرمایا کہ اللہ ہی ہے جو کسی بندے کو اپنی کتاب

کا فہم عطا کرتا ہے۔

(کتاب صفائی جلد اول ص ۱۹)۔

یہ حدیث، مبارک و مقدس احادیث شریفہ میں ایک گویا پیش بہا کی حیثیت رکھتی ہے اور اس سے کم از کم یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے جن بلند پایہ علوم و معارف کے دریا بہائے اور جن محیر العقول مطالب کے جواہر، عالم انسانی کے سامنے پیش کئے ان سب کا سرچشمہ قرآن کریم ہے اور آپؑ نے قرآن ہی سے وہ سب کچھ حاصل کیا ہے۔

## ارشادات نبویؐ، ہدایت و رہنمائی کی قد بلیں!

کتاب کافی میں مذکور ہے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے پدربزرگوار کے حوالہ سے ذکر کیا کہ انہوں نے اپنے آباء کرام کے حوالہ سے بیان فرمایا کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا ہے:



”یا ایہا الناس، انکم فی دار ہدنة، وانتم علی ظہر سفر، والسیر بکم سریع، وقد رأیتم اللیل والنہار والشمس والقمر یلیان کل جدید، یقربان کل بعید، ویأتیان بکل موعود، فاعدوا للجہاز لبعد المجاز“

اے لوگو! تم دار الہدنة میں ہو، اور تم عالم سفر میں ہو، تمہارا سفر نہایت تیزی سے طے ہو رہا ہے، اور تم رات دن، سورج اور چاند کو دیکھ رہے ہو کہ وہ ہر جدید و تازہ کو کہنے و بوسیدہ کر رہے ہیں اور ہر دور کو نزدیک کر رہے ہیں اور جس چیز کا وعدہ ہو چکا ہے اسے پورا کر رہے ہیں لہذا اس طولانی سفر کے جس کی منزل بہت دور ہے اپنے آپ کو متاع سفر سے لیس کرو، (کافی، جلد ۲ حدیث ۲)

راوی کا کہنا ہے کہ جب آنحضرتؐ نے مذکورہ بالا مطلب بیان فرمائے تو جناب مقداد بن اسود کھڑے ہو گئے اور پوچھا: یا رسول اللہ! وما دار الہدنة؟ دار الہدنة سے کیا مراد ہے؟

فقال: ”دار بلاغ و انقطاع، فاذا التبست علیکم الفتن کقطع اللیل المظلم فعلیکم بالقرآن فانہ شافع مشفع، وما حل مصدق، ومن جعلہ امامہ قاده الی الجنة، ومن جعلہ خلفہ ساقہ الی النار، وهو الدلیل یدل علی خیر سبیل، وهو کتاب فیہ تفصیل و بیان و تحصیل، وهو الفصل لیس بالہزل، ولہ ظہر و بطن، فظاہرہ حکم و باطنہ علم، ظاہرہ انیق و باطنہ عمیق، لہ تخوم و علی تخومہ تخوم، لا تحصی عجائبہ، ولا تبلی غرائبہ، فیہ مصابیح الہدیٰ و منار الحکمۃ، و دلیل علی المعرفۃ لمن عرف الصفة، فلیجل جال بصرہ، و لیبلغ الصفة نظراً، ینج من عطب و یخلص من نشب، فان التفکر حیوۃ قلب البصیر کما یمشی المستنیر فی الظلمات، فعلیکم بحسن التخلص و قلة التربص،.....“

حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ صرف پہنچنے اور چھوڑ جانے کا گھر ہے (وہاں پہنچو اور پھر وہاں سے چلے جاؤ)، پس جب فتنے تاریک رات کے ٹکڑوں کی طرح تم پر ٹوٹ پڑیں تو اس وقت تم قرآن سے تمسک اختیار کرو کہ وہ شفاعت کرنے والا ہے کہ جس کی شفاعت قبول ہوگی، وہ اس قدر مضبوط بنیاد پر قائم ہے کہ جس کی تصدیق کئے بغیر رہا نہیں جاسکتا، جس نے اسے اپنا امام و پیشوا قرار دیا تو وہ اسے بہشت کی راہ پر لاکھڑا کرے گا اور جس نے اسے پس پشت ڈال دیا تو وہ اسے جہنم میں دھکیل دے گا۔ وہ ایسا رہنما ہے جو بہترین راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ ایسی کتاب ہے کہ جس میں حق اور باطل کے درمیان تمیز کر دی گئی ہے، اس میں سب کچھ بیان کر دیا گیا ہے اور سب کچھ اس سے حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ حق و باطل کے درمیان جدائی کرنے والا ہے (حق کو باطل سے الگ کرنے والا ہے) اس میں کوئی بات بے مقصد نہیں، اس کا

ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، اس کا ظاہر حکم و فرمان اور اس کا باطن علم و عرفان ہے، اس کا ظاہر نہایت خوبصورت و دلربا اور اس کا باطن نہایت عمیق ہے، اس کی حدیں ہیں اور پھر ہر حد کی کئی حدیں ہیں، اس کی شگفت انگیزیاں قابل شمار نہیں اور اس کے گراں قدر حقائق کبھی پرانے نہیں ہوتے، اس میں ہدایت کی قدیلیں ہیں اور حکمت و دانائی کے روشن مینار ہیں۔ وہ ہر نکتہ سنج کے لئے رہنمائے معرفت ہے، بنا برائیں ہر با بصیرت شخص کو چاہیے کہ اس کے معارف و حقائق حاصل کرنے کے لئے اپنی نگاہ حق شناس اس پر جمادے اور اس سے کسب فیض کرنے کی آخری حد کو پہنچ جائے، وہ ہر پاک دل و پاک دامن شخص کا نجات دہندہ ہے اور فکر و نظر کے نشیبوں میں گھرے شخص کا چارہ گر ہے، غور و فکر کی قوتوں سے کام لینا ہی ہر با بصیرت انسان کے دل کی حیات ہے، ظلمتوں اور تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے اس شخص کو نشان منزل بتاتا ہے جو روشنی کی تلاش میں محو و منہمک ہو، لہذا تم پر لازم ہے کہ حسن اخلاص کو اپناتے ہوئے قرآن سے تمسک اختیار کر کے ظلمتوں سے چھٹکارا پاؤ اور خیالات کی دنیا میں گھومنا کم کر دو، اس روایت کو تفسیر العیاشی میں بھی ذکر کیا گیا ہے البتہ صرف جملہ ”فلیجل جلال“ تک! (ملاحظہ ہو: تفسیر العیاشی جلد اول حدیث ۱)

## قرآن کی صفات و فضائل

کتاب کافی اور تفسیر عیاشی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپ نے بیان کیا کہ حضرت پیغمبر اسلام نے ارشاد فرمایا ہے:

”القرآن ہدی من الضلالة، وتبیان من العمی، واستقالة من العثرة، ونور من الظلمة، وضیاء من السحاث، وعصمة من الهلکة، ورشد من الغواية، وبيان من الفتن، وبلاغ من الدنيا الى الآخرة، وفيه کمال دینکم، وما عدل احد من القرآن الا الى النار“، قرآن، ضلالت و گمراہی سے نجات دلانے والا ہادی و رہنما ہے، باطل کے اندھیرے سے نکال کر حق کی راہ دکھانے والا ہے، لغزشوں سے بچا کر سہارا دینے والا ہے، ظلمتوں میں نور، حوادث روزگار میں مینار و روشنی، ہلاکتوں و جہاہوں میں نجات کا واحد مرکز، گمراہی و کجروی میں سیدھی راہ دکھانے والا، فتنوں میں بچاؤ کے طریقے بتانے والا، دنیا سے، صحیح طور پر اور سیدھی راہ پر لاکھڑا کر کے۔۔۔ آخرت تک پہنچانے والا ہے، اس میں تمہارے دین کا کمال پایا جاتا ہے، جو شخص قرآن سے روگردانی کرے اس کا ٹھکانہ جہنم کی آگ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

(کافی، جلد ۲ ص ۶۰۰ حدیث ۸، تفسیر العیاشی جلد ۱ ص ۵ حدیث ۸)

مذکورہ بالا مطالب پر مشتمل روایات و احادیث کثرت کے ساتھ وارد ہوئی ہیں اور حضرت پیغمبر اسلامؐ اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے ارشادات میں اس طرح کے معارف بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔

### حدیث نبویؐ کی تشریح بزبان امام محمد باقرؑ

تفسیر العیاشی میں فضیل بن یسار سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت امام ابو جعفر محمد باقر علیہ السلام سے حضرت پیغمبر اسلامؐ کے ارشاد گرامی: ”ما فی القرآن آیۃ الا ولہا ظہر و بطن، و ما فیہ حرف الا ولہ حد و لکل حد مطلع“ کا مطلب دریافت کیا (یعنی: قرآن مجید کی ہر آیت کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے، اور اس کے ہر حرف کی ایک حد ہے اور ہر حد کا مطلع و جلوہ گاہ ہے) اس میں آنحضرتؐ نے قرآن مجید کے ظاہر و باطن سے کیا مراد لیا ہے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا:

”ظہرہ تنزیلہ و بطنہ تأویلہ، منہ ما مضی و منہ ما لم یکن بعدہ، یجری کما یجری الشمس و القمر، کما جاء منہ شیء وقع، قال اللہ: وما یعلم تأویلہ الا اللہ و الراسخون فی العلم، نحن نعلمہ“

اس کے ظاہر سے مراد اس کے وہ الفاظ ہیں جو نازل ہوئے ہیں اور اس کے باطن سے مراد اس کے حقیقی معانی ہیں کہ جن میں سے کچھ وجود پذیر ہو چکے ہیں اور بعض کا وجود پذیر ہونا ابھی باقی ہے۔ وہ سورج اور چاند کی گردشوں کی طرح رواں دواں رہتا ہے کہ اس کی ہر چیز وقوع پذیر ہو جاتی ہے۔ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ”اس کے حقیقی معانی سے کوئی آگاہی نہیں رکھتا سوائے اللہ اور راسخون فی العلم کے“۔ اور وہ ہم (اہل بیتؑ) ہیں جو اس سے آگاہی رکھتے ہیں،

(تفسیر العیاشی جلد اول ص ۱۱ حدیث ۵)

اس روایت میں انہی مطالب کو ذکر کیا گیا ہے جو اہل سنت کی کتب میں حضرت پیغمبر اسلامؐ کی بیان کردہ حدیث شریف میں مذکور ہیں لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اس حدیث اور اس روایت کے الفاظ مختلف ہیں جبکہ معنی ایک ہے جیسا کہ تفسیر صافی جلد اول ص ۱۸ میں حضرت پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے آپؐ نے ارشاد فرمایا: ان للقرآن ظہراً و بطناً و حداً و مطلعاً،..... قرآن کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، اور اس کی حد بھی ہے اور مطلع بھی (انتہاء بھی ہے اور ابتداء بھی)، اسی کتاب میں..... یا اسی سلسلہ بیان میں..... آنحضرتؐ سے یہ کلمات بھی منقول ہیں: ان للقرآن ظہراً و بطناً الی سبعة

باطن، قرآن کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے اور اس کے باطن کا بھی ایک باطن اور یہ سلسلہ سات باطنوں تک جاتا ہے، آنحضرتؐ کے ارشاد گرامی ”منہ ما مضی و منہ ما یاتی“ میں ضمیر ”ہ“ کی بازگشت قرآن کی طرف ہے کیونکہ وہ تنزیل اور تاویل پر مشتمل ہے۔ (تنزیل یعنی ظاہری الفاظ اور تاویل یعنی حقیقی معانی) بناء براس آنحضرتؐ کا ارشاد گرامی: (یجرى کما یجرى الشمس والقمر) .... وہ سورج اور چاند کی گردشوں کی طرح رواں دواں رہتا ہے۔ ان دونوں یعنی تنزیل و تاویل میں بھی یکساں و باہم جاری ہوتا ہے اور وہ اس طرح کہ تنزیل میں اس کا انطباق، ”جرى“ کی بنیاد پر ہوتا ہے کہ جس کا معنی روایات کی اصطلاح میں یہ ہے کہ کسی کلمی معنی کو اس کے مصداق میں سے کسی ایک مصداق پر منطبق کیا جائے مثلاً سورۃ توبہ کی آیت ۱۱۹ (يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ) میں جملہ ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ (مؤمنین) کو ہر دور کے مؤمنین پر منطبق کرتے ہوئے کہا جائے کہ اس سے آئیے مبارک کے نزول کے زمانہ کے مؤمنین اور بعد میں آنے والے ہر زمانہ کے مؤمنین مراد ہیں، تو یہ ایک قسم انطباق کی ہے، اور انطباق کی دوسری قسم کی مثال جہاد کے حکم پر مشتمل آیات کا جہاد بانفس پر منطبق کرنا اور منافقین کے تذکرے پر مشتمل آیات کا مؤمنین سے فاسق افراد پر انطباق، (جہاد بانفس مراد لینا اور منافقین سے فاسق مؤمنین مراد لینا) تو یہ بھی انطباق کی ایک قسم ہے جو کہ پہلی قسم سے زیادہ دقیق و باریک معنی کی حامل ہے۔ اور اس دوسری قسم سے زیادہ دقیق و گہرے معنی کی حامل قسم کی مثال یہ ہے کہ منافقین کے تذکرے پر مشتمل آیات اور گناہگاروں کے تذکرے پر مشتمل آیات کو ان لوگوں پر منطبق کیا جائے (ان سے وہ لوگ مراد لئے جائیں) جو مراقبہ، ذکر اور حضور القلب کے ساتھ خدا کو یاد کرتے ہیں کہ اگر وہ مراقبہ، ذکر اور حضور القلب کے ساتھ انجام دیئے جانے والے اعمال میں کوتاہی اور ذکر الہی میں تساہل و بے توجہی سے کام لیں تو گویا وہ گناہ و نفاق کے مرتکب ہوئے ہیں..... اور اس وجہ سے ”منافقین“ اور ”مذنبین“ (گناہگاروں) کا ایک مصداق کہلائیں گے.....، اور اگر وہ افراد (اہل مراقبہ و ذکر وغیرہ) ذکر الہی میں کوتاہی و تساہل اور بے توجہی کا ارتکاب حق ربوبیت کی ادائیگی میں اپنی ذاتی خامی کی بناء پر کریں تو اس صورت میں آیات المنافقین اور آیات المذنبین (منافقوں اور گناہگاروں کے تذکرے پر مشتمل آیات) کا ان پر انطباق، سابق الذکر تمام اقسام سے زیادہ دقیق و گہرے معنی کا حامل ہوگا۔

(انطباق کی مذکورہ بالا چاروں قسمیں ”جرى“ کہلاتی ہیں کہ جس سے آنحضرتؐ کے ارشاد گرامی (یجرى کما

یجرى الشمس والقمر) کا معنی واضح طور معلوم ہو جاتا ہے۔

## دواہم نکلتے

مذکورہ بالا تمام مطالب سے دواہم نکلتے ظاہر ہوتے ہیں:

(۱) قرآن مجید اپنے مرادی معانی کے گونا گوں مراتب و درجات کا حامل ہے اور وہ درجات و مراتب افراد کے مقام و منزلت کی بنیاد پر اور اس کے حوالہ سے مختلف ہیں، اسی بناء پر ارباب فکر و نظر نے ایمان اور ولایت کے معانی کی بابت جو بحثیں کی ہیں ان میں ان کے گونا گوں مراتب و درجات کی تصویر کشی ہمارے ذکر کردہ مطالب سے کہیں زیادہ باریکیوں پر مشتمل ہے۔

(۲) ظاہر اور باطن دو ایسے امور ہیں جو نسبت و حوالہ کے حامل ہیں اور وہ اس طرح کہ ہر ظاہر اپنے ظاہر کی نسبت، باطن ہے اور اپنے باطن کی نسبت ظاہر ہے، گویا نسبت کے لحاظ سے اس کی حیثیت کا تعین ہو سکتا ہے، چنانچہ یہی بات درج ذیل روایت سے بھی ظاہر ہوتی ہے، ملاحظہ ہو:

تفسیر العیاشی میں جابر سے روایت کی گئی ہے انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت امام ابو جعفر محمد باقر علیہ السلام سے بعض آیات قرآنیہ کی تفسیر دریافت کی تو امام نے مجھے اپنے ارشادات سے فیض یاب فرمایا، اور پھر جب دوبارہ انہی آیات کے بارے میں تفسیر پوچھی تو امام نے جو جواب دیا وہ پہلے جواب سے مختلف تھا، تو میں نے امام کی خدمت میں عرض کی کہ میں آپ پر قربان جاؤں، آپ نے اسی سوال کے جواب میں اس سے پہلے جو کچھ ارشاد فرمایا تھا وہ اس سے مختلف تھا جو آج آپ نے فرمایا ہے؟ تو امام نے ارشاد فرمایا:

یا جابر ان للقرآن بطناً وللبطن بطن، و ظہراً وللظہر ظہر، یا جابر ولیس شیئ ابعدا من عقول الرجال من تفسیر القرآن، ان الآیة تکون اولها فی شیئ و اوسطها فی شیئ و آخرها فی شیئ و هو کلام متصل ینصرف علی وجوہ،

اے جابر! قرآن مجید کا ایک باطن ہے اور اس باطن کا بھی ایک باطن ہے، اور قرآن کا ایک ظاہر ہے اور اس ظاہر کا بھی ایک ظاہر ہے۔ اے جابر! تفسیر قرآن میں سے کوئی چیز بھی لوگوں کی عقولوں سے زیادہ دور نہیں، کیونکہ عین ممکن ہے کہ کسی آیت کا پہلا حصہ کسی چیز کے بارے میں ہو جبکہ درمیانی حصہ کسی دوسری چیز کے بارے میں ہو اور آخری حصہ کسی تیسری چیز کی بابت ہو، حالانکہ وہ سب کا سب ایک ہی کلام ہے کہ جس کے مختلف حصے ایک دوسرے سے متصل اور جڑے ہوئے ہیں اور ان کی بازگشت گونا گوں صورتوں کی طرف ہوتی ہے۔

(تفسیر العیاشی جلد اول ص ۱۲ حدیث ۸)

## قرآن کی دائمی ہدایت

تفسیر العیاشی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک حدیث کے ضمن میں منقول ہے آپ نے ارشاد فرمایا:

”ولو ان الآیة اذا نزلت فی قوم ثم مات اولئک القوم ماتت الآیة لما بقی من القران شیئ، ولكن القران یجری اولہ علیٰ اخرہ ما دامت السماوات والارض، ولكل قوم ایة یتلونہا ہم منها من خیر اوشر“،

قرآن مجید کی کوئی آیت کسی قوم کے بارے میں نازل ہو اور اس قوم کے مرجانے کے بعد اگر وہ آیت بھی باقی نہ رہے تو قرآن میں سے کچھ بھی باقی نہ رہے گا، لیکن قرآن مجید تو ایسی کتاب ہے کہ جس کا پہلا حصہ اس کے آخری حصہ تک (اور عصر نزول سے لے کر بعد میں آنے والے ہر زمانہ تک) اس وقت تک قائم و دائم اور باقی رہنے والی ہے جب تک آسمانوں اور زمین کو بقاء حاصل ہے۔ اور قوم کے بارے میں ایک یا کئی آیات موجود ہیں کہ جن کی وہ تلاوت کرتے ہیں خواہ وہ ان کے خیر کا تذکرہ کرتی ہوں یا ان کے شر کو بیان کرتی ہوں۔

(تفسیر العیاشی جلد اول ص ۱۰ حدیث ۷)

## قرآن کے ظاہر و باطن سے کون مراد ہیں ؟

کتاب معانی الاخبار میں حمران بن اعین سے روایت کی گئی ہے انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے قرآن کے ظاہر اور باطن کے بارے میں پوچھا تو امام نے ارشاد فرمایا:

”ظہرہ السدین نزل فیہم القران، و بطنہ الذین عملوا باعمالہم، یجری فیہم ما نزل فی اولئک“،

قرآن کے ظاہر سے وہ لوگ مراد ہیں جن کے بارے میں قرآن نازل ہوا ہے اور اس کے باطن سے مراد وہ لوگ ہیں جو انہی لوگوں کے اعمال جیسے اعمال بجالائیں کہ قرآن ان کے بارے میں بھی اسی حیثیت کا حامل ہوگا جو ان لوگوں کی

بابت ہے جن کے بارے میں نازل ہوا ہے،..... گویا دونوں کی بابت یکساں ہوگا،.....

(معانی الاخبار ص ۲۵۹ حدیث ۱)

## ہر آیت کے چار معانی

تفسیر صافی میں حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

” ما من اية الا ولها اربعة معان: ظاهر و باطن و حد و مطلع، فالظاهر التلاوة، والباطن

الفهم، والحد هو احكام الحلال و الحلال، والمطلع هو مراد الله من العبد بها“،

ہر آیت کے چار معانی ہیں: (۱) ظاہر (۲) باطن (۳) حد (۴) مطلع، ظاہر وہی الفاظ ہیں جن کی

تلاوت کی جاتی ہے، باطن ان کا فہم اور سمجھنا ہے، حد سے مراد حلال و حرام کے احکام ہیں اور مطلع سے مراد وہ چیز ہے جسے خداوند عالم نے آیت کے ذریعے اپنے بندے سے چاہا ہے۔

(تفسیر صافی جلد اول ص ۱۸)

## تشریح و توضیح

امامؑ کے ارشاد گرامی کہ ”ظاہر سے مراد وہ الفاظ ہیں جن کی تلاوت کی جاتی ہے“ سے مراد الفاظ کے ظاہری معنی

ہیں کیونکہ امام علیہ السلام نے انہیں ”معانی“ میں شمار کیا ہے،

اور امامؑ کے اس فرمان کہ باطن سے مراد اس کا فہم اور سمجھنا ہے، اس سے مراد وہ معانی ہیں جو ظاہری معانی کے اندر

پوشیدہ ہیں،

اور امامؑ کے فرمان کہ ”حد“ سے مراد حلال و حرام کے احکام ہیں، سے مراد وہ ظاہری معارف ہیں جو قرآن مجید سے

عمومی طور پر سمجھے جاتے ہیں خواہ ابتدائی سطح فکر کے حامل افراد کے لئے ہوں یا درمیانی سطح فکر کے حامل افراد کے لئے ہوں،

البتہ اس سے بالاتر و بلند ترین سطح فکر کے افراد کے لئے جو مقام و مرتبہ ہے اسے ”مطلع“ سے تعبیر و موسوم کیا گیا ہے کہ وہ

اپنی بلندی فکر کی بنیاد پر قرآنی آیات سے عظیم ترین معارف کا ادراک کرتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ”حد“ اور ”مطلع“ کے معانی

کی بابت یوں کہا جائے کہ وہ نسبت کے حامل افراد ہیں اور ان کا حال اسی طرح ہے جیسے ”ظاہر“ اور ”باطن“ کا ہے یعنی جس طرح ظاہر و باطن، نسبت کے حامل دو امور ہیں اسی طرح ”حد“ اور ”مطلع“ بھی نسبت کے حامل ہیں جیسا کہ اس سلسلہ میں پہلے ذکر کئے گئے مطالب سے واضح ہو چکا ہے، بنا براین ہر بلند مرتبہ اپنے سے کم اور نچلے مرتبہ کی نسبت ”مطلع“ ہے، اس طرح ہر نچلا مرتبہ اپنے سے بلند مرتبہ کی نسبت ”حد“ کہلائے گا.....

”مطلع“ م پر پیش، ط پر شدہ اور لام پر زیر کے ساتھ ”اطلاع“ سے اسم مکان ہے، یا اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ م اور ل پر زیر اور ط پر سکون کے ساتھ ”طلوع“ سے اسم مکان ہے۔ (اطلاع کی جگہ یا طلوع کی جگہ)، امام کے ارشاد گرامی کے مطابق اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت کے ذریعے اپنے بندے سے جس چیز کا ارادہ کیا ہے اور اسے اس سے چاہا ہے اسے ”مطلع“ کہتے ہیں۔

مذکورہ بالا چار امور کی بابت حضرت پیغمبر اسلام کی مشہور و معروف حدیث میں بھی تذکرہ ہوا ہے چنانچہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا:

”ان القر ان انزل علی سبعة احرف، لكل آية منها ظهر و بطن و لكل حد مطلع“۔  
قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے اور ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن، اور ہر آیت کی حد مطلع ہے،  
ایک روایت میں اس طرح ذکر ہوا ہے ”و لكل حد و مطلع“ اور ہر آیت کی ایک حد اور ایک مطلع ہے۔  
آنحضرتؐ کے ارشاد گرامی ”و لكل حد و مطلع“ کا معنی یہ ہے کہ آیت کے ظاہر و باطن میں سے ہر ایک کی ایک حد جو کہ مطلع بھی ہے کہ تلاوت کرنے والا اس پر نظر رکھتا ہے۔

یہ تو ہے حدیث کا ظاہری معنی، اور عین ممکن ہے کہ دوسری حدیث میں جو الفاظ ذکر کئے گئے ہیں یعنی ”وان لكل حد و مطلع“ ان کے معنی کی بازگشت بھی اسی ظاہری معنی کی طرف ہو اور اس طرح معنی کیا جائے کہ ان میں سے ہر ایک کی فی نفسہ ایک حد ہے اور ایک مطلع ہے کہ جو اس حد کا نقطہ انجاء ہے لہذا وہ آیت کی تاویل..... حقیقی معنی..... پر ناظر ہے، لیکن یہ معنی حضرت علیؑ کے ارشاد گرامی کہ جس میں آپؐ نے فرمایا ”مامن آية الا ولها اربعة معان.....“ سے حاصلہ ظاہری معنی سے ہمرنگی و مطابقت نہیں رکھتا، البتہ ان دو معانی کے درمیان ہمرنگی صرف اس صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ امام کے ارشاد گرامی سے یہ مراد لیا جائے کہ ہر آیت کے چار لحاظ و حوالے ہیں کہ جن میں بعض کی دوسرے بعض کی طرف بازگشت بھی ممکن



ہے یعنی ایسا ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک، دوسرے پر منطبق ہو جائے۔

بہر حال مذکورہ چار امور کے معانی کا خلاصہ یہ ہے کہ: ظہر القرآن سے مراد آیت کا وہ ظاہری معنی ہے جو بادی النظر میں سامنے آتا ہے (معلوم ہوتا ہے)، اور بطن القرآن سے مراد وہ معنی ہے جو ظاہری معنی کے اندر چھپا ہوا ہے خواہ وہ ایک معنی ہو یا زیادہ معانی ہوں اور خواہ ظاہری معنی سے قریب ہو یا دور ہو کہ اس ظاہری معنی اور باطنی معنی کے درمیان دیگر معانی بھی پائے جاتے ہوں اور ”حد“ سے مراد آیت کا اصل معنی ہے خواہ ظاہری ہو یا باطنی، اور ”مطلع“ سے مراد وہ معنی ہے جس سے ”حد“ نمودار ہو اور وہ (مطلع) اس حد سے متصل اور جڑا ہوا ہے، (ان مطالب کی باریکیوں پر غور کریں)

## قرآن اور سات حروف

فریقین شیعہ و سنی سے مروی ایک حدیث میں حضرت پیغمبر اسلام کا یہ ارشاد گرامی مذکور ہے: ”انزل القرآن علی سبعة احرف“، کہ قرآن مجید سات حرفوں پر نازل ہوا ہے، ... ملاحظہ ہو تفسیر صافی جلد اول ص ۳۸ تفسیر درمنثور جلد دوم ص ۷، سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۷۵ حدیث (۱۴۷۵)

اگرچہ یہ حدیث الفاظ میں مختصر فرق کے ساتھ ذکر کی گئی ہے لیکن اس کا معنی و مقصود پیشتر کتب میں منقول ہے اور جن روایات میں اسے ذکر کیا گیا ہے وہ سب قریب المعنی ہیں اور شیعہ و سنی دونوں مکاتب فکر کے علماء نے اس کو ذکر کیا ہے؟ تاہم اس کے معنی کی بابت اہل علم حضرات کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کے بارے میں پیش کئے جانے والے اقوال کی تعداد چالیس تک پہنچتی ہے۔ لیکن جو بات اس سلسلہ میں مسئلہ کو آسان کرتی ہے وہ یہ ہے کہ جو روایات ذکر کی گئی ہیں خود انہی میں ”سات حروف“ (السبعة الاحرف) کی تفسیر موجود ہے اور ہم نے اسی کے سہارے اظہار خیال کیا ہے (ہمارے بیانات کی بنیاد اسی پر قائم ہوئی ہے) چنانچہ بعض روایات میں اس طرح ذکر ہوا ہے:

”نزل القرآن علی سبعة احرف: امر/وز جرو/ترغیب و ترہیب و جلدل و قصص و

مثل“

قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے: (۱) امر (۲) نبی (۳) ترغیب (کسی کام کی طرف رغبت و توجہ

دلانا)، (۴) تہیب (گناہ کے ارتکاب پر دی جانے والی سزا سے ڈرانا)، (۵) جدل (مطلوب و مدعا کے اثبات کے لئے ٹھوس دلائل پیش کرنا)، (۶) قصص (سابقہ امتوں کے واقعات و حالات کا تذکرہ)، (۷) مثالیں (کسی مطلب کی وضاحت کے لئے مثال و شاہد ذکر کرنا.....)

(تفسیر صافی جداول ص ۳۹)

بعض روایات میں یہ الفاظ مذکور ہیں: نزل القرآن علی سبعة احرف: زجر، و امر و حلال و حرام و محکم و متشابہ و امثال..... قرآن سات حرفوں پر مشتمل ہو کر نازل ہوا ہے: (۱) نبی، (۲) امر، (۳) حلال، (۴) حرام، (۵) محکم، (۶) تشابہ، (۷) امثال، (یہ روایت بھی تفسیر صافی جداول ص ۳۹ میں مذکور ہے)۔

حضرت علی سے منقول ہے آپ نے ارشاد فرمایا: ان اللہ انزل القرآن علی سبعة اقسام، کل منها کاف و شاف، وہی امر و زجر و ترغیب و تہیب و جدل و مثل و قصص..... خداوند عالم نے قرآن مجید کو سات قسموں پر مشتمل نازل کیا ہے اور ان میں سے ہر قسم ہدایت کے لئے کافی اور شافی ہے۔ اور وہ قسمیں یہ ہیں: (۱) امر، (۲) نبی، (۳) ترغیب، (۴) تہیب، (۵) جدل، (۶) مثالیں، (۷) قصص..... (صافی ج ۱ ص ۳۹) (یہ روایت سابق الذکر حدیث نبوی سے تشابہ ہے کہ جس کے الفاظ کی تشریح ذکر کی جا چکی ہے)

بہر حال تمام روایات کو مد نظر رکھتے ہوئے جو یقینی نتیجہ حاصل ہوتا ہے وہ یہ کہ ان میں مذکورہ ”سات حروف“ سے خطاب و بیان کی سات قسمیں مراد ہیں..... یعنی سات انداز ہائے بیان، سات لہجے، مطلب کے اظہار کی سات روشیں وغیرہ..... اور وہ اس طرح کہ تمام قرآنی آیات ایک ہی مطلب و مقصود کو بیان کرتی ہیں جو کہ عبارت ہے اللہ کی طرف بلانے اور صراط مستقیم کو اپنانے کی دعوت دینے سے، لیکن اس مطلب کو سات مختلف انداز ہائے بیان کے ذریعے پیش کیا گیا ہے، (یعنی کبھی امر کی شکل میں، کبھی نبی کی صورت میں، کبھی ترغیب و تشویق کے انداز میں، کبھی تہیب و انذار کے لہجے میں، کبھی جدل و بحث کی روش میں، کبھی مثالیں ذکر کر کے اور کبھی واقعات بیان کر کے، م)،

یہ بات بھی ممکن ہے کہ اس روایت سے یہ سمجھا جائے کہ تمام اصولی معارف الہیہ ”امثال“ میں سمٹے ہوئے ہیں کیونکہ ان کے علاوہ دیگر مطالب ”معارف الہیہ“ نہیں کہلاتے بلکہ ان کا معارف الہیہ ہونا اضافی حوالہ کا محتاج ہے۔

## روایات پر دوسری نظر

تفسیر بالرائے کے بارے میں!

تفسیر صافی میں حضرت پیغمبر اسلامؐ کا ارشاد گرامی منقول ہے آپؐ نے ارشاد فرمایا:

”من فسر القرآن برأیه فلیتبوأ مقعدہ من النار“

جو شخص اپنی رائے کی بنیاد پر قرآن کی تفسیر کرے تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں قرار دے،

(تفسیر صافی جلد اول ص ۲۱)

اس مطلب کو شیعہ و سنی فریقین نے ذکر کیا ہے اور اسی مطلب پر مبنی دیگر احادیث بھی موجود ہیں جو حضرت پیغمبر اسلامؐ اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے منقول ہیں۔

## واضح و صریح ارشاد نبویؐ

کتاب ”منیۃ المرید“ میں حضرت پیغمبر اسلامؐ سے روایت مذکور ہے، آپؐ نے ارشاد فرمایا:

”من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوأ مقعدہ من النار“

(جو شخص قرآن کے بارے میں بغیر علم کے کوئی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ کی آگ میں قرار دے،

(منیۃ المرید ص ۱۹۱)

اسی روایت کو ابوداؤد نے بھی اپنی کتاب ”السنن“ میں ذکر کیا ہے۔

کتاب منیۃ المرید ہی میں حضرت پیغمبر اسلامؐ کی دیگر دو حدیثیں بھی ذکر کی گئی ہیں جن میں آپؐ نے ارشاد فرمایا:

(۱) ”من قال فی القرآن بغیر علم جاء یوم القيامة ملجماً بلجام من نار“

(جو شخص علم کے بغیر قرآن کے بارے میں اظہار خیال کرے وہ قیامت کے دن دوزخ کی آگ کے شعلوں سے

لگام لگایا ہوا آئے گا)۔

(۲) ”من تكلم فى القرآن برأيه فاصاب فقد اخطاء“

(جو شخص اپنی رائے سے قرآن کے بارے میں بات کرے تو اگر اس کی بات درست ہی کیوں نہ ہوتا ہم وہ غلطی کا

(مدنیۃ المرید ص ۱۹۱)

مرتبک ہوا)۔

اس روایت کو ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے بھی ذکر کیا ہے۔

مذکورہ کتاب (مدنیۃ المرید) ہی میں حضرت پیغمبر اسلام کا ایک ارشاد گرامی مذکور ہے جس میں آپ نے فرمایا:

”اکثر ما اخاف على امتى من بعدى رجل يناول القرآن يضعه على غير موضعه“

(مجھے اپنے بعد اپنی امت کے بارے میں زیادہ خوف اس بات کا ہے کہ وہ قرآن کو اس کے اصل مقام کے علاوہ

رکھے۔ اس کی غلط تفسیر و معنی کرے)

## تفسیر بالرائے کے مرتبک کا انجام

تفسیر العیاشی میں ابوبصیر کے حوالہ سے منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا:

”من فسر القرآن برأيه ان اصاب لم يؤجر وان اخطاء فهو ابعد من السماء“

(جو شخص اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر کرے اگر وہ صحیح بھی نکلے تب بھی اسے کوئی اجر نہیں دیا جائے گا، اور اگر

درست نہ ہو تو وہ آسمان سے بہت دور ہوگی)

(تفسیر العیاشی جلد اول ص ۱۷ حدیث ۴)

اسی کتاب میں یعقوب بن یزید کے حوالہ سے یا سر کی روایت مذکور ہے کہ حضرت امام رضا علیہ السلام نے ارشاد

فرمایا: ”الرأى فى كتب الله كفر“

(اللہ کی کتاب کے بارے میں اپنی رائے دینا کفر ہے)

(تفسیر العیاشی جلد اول ص ۱۸ حدیث ۶)

اسی معنی و مضمون پر مشتمل دیگر روایات بھی کتاب ”کمال الدین و تمام النعمۃ“، کتاب ”التوحید“ اور تفسیر العیاشی

وغیرہ میں مذکور ہیں۔

## رائے اور تفسیر بالرائے کی بابت تفصیلی بحث

حضرت پیغمبر اسلام کے ارشاد گرامی ”من فسر القرآن برأیه“ میں لفظ ”رأی“ ذکر ہوا ہے اس کا معنی یہ ہے: هو الاعتقاد عن اجتهاد، وہ عقیدہ وہ نظریہ جو اجتهاد یعنی فکری قوت کو استعمال میں لانے سے حاصل و پیدا ہو۔ لفظ ”رأی“ کبھی اس قول پر بھی استعمال ہوتا ہے جس کا سرچشمہ نفسانی خواہش (ہوائے نفس) اور استحسان (من پسندی) ہو۔ یعنی وہ بات کہ جسے دل اچھا سمجھے اور طبعی میلان و رجحان بھی اس کی طرف ہو۔

بہر حال رأی کو ضمیر سے مضاف کر کے ”برایہ“ ذکر کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام نے تفسیر قرآن کی بابت مطلق اجتهاد سے منع نہیں فرمایا کہ جس کے حوالہ سے یہ کہا جائے کہ تفسیر کے باب میں صرف انہی ظاہری الفاظ پر اکتفاء اور ان کا اتباع کیا جائے جو حضرت پیغمبر اسلام اور آپ کے اہل بیت اطہار علیہم السلام نے بیان فرمائے ہیں جیسا کہ اہل حدیث حضرات (جو صرف حدیث کے ظاہری الفاظ پر اکتفاء کا نظریہ رکھتے ہیں) کا عقیدہ ہے، اس کے علاوہ یہ کہ اس طرح کی ممانعت کا حکم ان کثیر روایات کے منافی ہے جن میں قرآن مجید کو عربی واضح قرار دیا گیا ہے اور اس میں تدبر و تفکر کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح ان کثیر روایات کے بھی منافی ہے جن میں تفسیر قرآن کی بابت قرآن کی طرف رجوع کرنے اور قرآن ہی کے تناظر میں روایات سے استفادہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

بلکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ تفسیر قرآن کی بابت من پسندی کو بنیاد قرار دینے کی ممانعت کی گئی ہے چنانچہ ”رأی“ کو اضافت کے ساتھ ذکر کیا گیا (برایہ) کہ جس کا معنی ”اپنی رائے“ ہے کہ جس سے ذاتی رجحان، طبعی میلان، من پسندی اور فکری انفرادیت و استقلال سمجھا جاتا ہے یعنی اس بات کی ممانعت کی گئی ہے کہ کوئی شخص تفسیر قرآن کی بابت اور کلام الہی کے معانی کو سمجھنے کے لئے صرف انہی اسباب پر اکتفاء نہ کرے جن سے عام عربی کلام کے سمجھنے میں استفادہ کیا جاتا ہے کہ اس سے کلام الہی اور لوگوں کے کلام کی حیثیت یکساں ہو جائے گی اور کلام خدا کا قیاس کلام مخلوق سے ہونے لگے گا جو کہ کسی صورت میں درست نہیں،..... خالق کے کلام کا قیاس مخلوق کے کلام سے نہیں ہو سکتا، جبکہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب بھی کسی متکلم کے کلام کا کوئی جملہ ہمارے سامنے آتا ہے تو ہم فوراً اس کا معنی و مقصود سمجھنے کے لئے انہی عمومی قواعد اور اصولوں کی عملداری کے ذریعے متعین طور پر کہہ دیتے ہیں کہ متکلم نے فلاں معنی کا ارادہ کیا ہے یعنی اس جملہ سے اس کا مقصد و مراد یہ ہے!، اسی روش اور طرز عمل کو دیگر امور میں بھی اپناتے ہیں مثلاً اقرار نامے، گواہی نامے وغیرہ، یہ سب اس لئے ہوتا ہے کہ عام طور پر ہمارے بیانات انہی قواعد پر مبنی ہوتے ہیں اور ہم الفاظ سے جو معانی مراد لیتے ہیں ان کی بنیاد وہی لغوی معانی اور ہمارے روزمرہ کے

استعمال میں آنے والے الفاظ کے مصداق ہیں خواہ وہ حقیقی مصداق ہوں یا مجازی، ہمارا بیان انہی پر مبنی ہوتا ہے، جبکہ قرآنی بیان اور کلام الہی اس طرح نہیں اور اسے ان عام قواعد کے تابع قرار نہیں دیا جاسکتا چنانچہ اس سلسلہ میں سابقہ بحثوں میں واضح ہو چکا ہے بلکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ قرآن مجید وہ عظیم کلام ہے جس کی آیات ایک دوسرے سے جدا و منفصل ہونے کے باوجود باہم اور متصل ہیں، ان کے درمیان پائے جانے والے لفظی فاصلے ان کے معانی میں فاصلے ایجاد نہیں کرتے بلکہ وہ معانی میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور ان میں سے بعض، دوسرے بعض کی ترجمانی کرتے ہیں۔ قرآن کی بعض آیات، دوسری بعض آیات کی تفسیر و توضیح کرتی ہیں۔ اور بقول حضرت امیر المومنین علیہ علیہ السلام اس کا بعض حصہ دوسرے بعض حصہ پر گواہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ (بشہد بعضہ علی بعض)۔ بنا برآں کسی آیت کے ظاہری الفاظ سے سمجھے جانے والے مطالب پر صرف اسی وجہ سے اکتفاء کرنا درست نہیں کہ لغت اور مربوطہ علوم کے مقررہ قواعد کی رو سے وہی مطالب سمجھے جاتے ہیں، گویا وہ علوم جو الفاظ سے ان کے معانی تک رسائی میں مدد دیتے ہیں اور ان میں اس حوالہ سے جو قواعد و اصول وضع و مقرر کئے گئے ہیں انہی پر تکیہ کرتے ہوئے دیگر تمام آیات سے کہ جو موضوع سے موزونیت کی حامل ہوں کسی طرح کا استفادہ نہ کر کے اور ان میں غور و فکر اور اجتہاد و تدبر کئے بغیر آیات کے معانی کا تعین صحیح نہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں واضح قرآنی ارشاد موجود ہے:

”أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ ۗ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ۝“

”کہ وہ قرآن میں غور و فکر اور تدبر کیوں نہیں کرتے کہ اگر وہ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف سے ہوتا تو لوگ

اس میں کثیر اختلاف پاتے“ (سورہ نساء، آیت ۸۲)

اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی تمام آیات ایک دوسرے سے معانی کے لحاظ سے وابستگی و پیوستگی رکھتی ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں سابقہ مباحث میں وضاحت ہو چکی ہے۔

مذکورہ بالا مطالب سے واضح ہوا کہ تفسیر بالرائے کہ جس کی ممانعت ہوئی ہے اس کی بازگشت الفاظ سے متصوہ معانی کے سمجھنے کے طریقہ کی طرف ہوتی ہے نہ کہ اس سے حاصلہ معانی کی طرف! یعنی مخصوص طریقہ کشف المعنی کو ممنوع قرار دیا گیا ہے نہ کہ معنی مشکوف کو!، دوسرے لفظوں میں یہ کہ کلام الہی کے سمجھنے میں اس طریقہ کو اپنانے سے منع کیا گیا ہے جو غیر خدا کے کلام کو سمجھنے میں اپنایا جاتا ہے، یعنی خالق اور مخلوق کے کلام کے سمجھنے میں یکساں معیار اپنانا صحیح نہیں خواہ اس معیار کو اپنانے کا نتیجہ بعض اوقات اصل معانی سے عین مطابقت کیوں نہ رکھتا ہو، یعنی اتفاقہ طور پر وہ طریقہء کار صحیح نتیجہ بخش ثابت کیوں نہ ہو لیکن چونکہ اس کا اپنانا بنیادی طور پر صحیح و درست نہ تھا لہذا ایسا کرنے والا غلطی کا مرتکب ہو گا جیسا کہ ایک حدیث نبویؐ میں ارشاد ہوا: (من تکلم فی القرآن بروایہ فاصاب فقد اخطاء)۔ جو شخص اپنی رائے کی بنیاد پر قرآن کے بارے میں

بات کرے کہ اگر اس کی بات صحیح بھی ہو تب بھی وہ خطا کا مرتکب ہوا، اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ طریقہء کار خود ساختہ ہے، کلام الہی کو سمجھنے کے لئے اسی روش و طریقہ کار کو اپنانا ضروری ہے جو خود خداوند عالم نے مقرر فرمایا ہے اور حضرت پیغمبر اسلام و آئمہ اہل بیت علیہم السلام نے اس کی نشاندہی فرمائی ہے۔ چنانچہ تفسیر العیاشی میں جو حدیث مذکور ہے اس میں یہ الفاظ ذکر ہوئے ہیں: (ان اصاب لم یوجس) کہ اس کی بات درست ہی کیوں نہ ہو تب بھی وہ اجر نہیں پائے گا۔

مذکورہ بالا مطالب کی تائید و تصدیق عہد نبوی کے حالات سے ہوتی ہے کیونکہ اس وقت قرآن مجید موجودہ صورت میں مرتب نہ تھا بلکہ سورتیں اور آیتیں متفرق صورت میں لوگوں کے پاس تھیں لہذا وہ ان کی تفسیر نہ کر سکتے تھے کیونکہ حصہ حصہ کی تفسیر کرنے میں اس بات کا خطرہ موجود تھا کہ کہیں اصل مقصود کے برخلاف اظہار خیال نہ ہو جائے۔

خلاصہء کلام یہ کہ تفسیر قرآن کی بابت جس چیز سے نہی کی گئی ہے وہ یہ کہ اس سلسلہ میں صرف اپنی رائے و خیال پر تکیہ نہ کیا جائے اور کسی دوسرے کی طرف رجوع کئے بغیر صرف اپنی فکر و فہم کی بنیاد پر تفسیر نہ کی جائے گویا تفسیر کرنے والے کو اس بات کا پابند بنا دیا گیا کہ وہ اس سلسلہ میں کسی دوسرے کی طرف رجوع کرے اور اس سے مدد لئے بغیر تفسیر کی بابت ہرگز اقدام نہ کرے،

اب سوال یہ ہے کہ وہ دوسرا کہ جس کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا اور اس کی طرف رجوع کئے بغیر تفسیر کا عمل ہرگز درست و روا نہیں وہ کون ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ لامحالہ وہ دوسرا یا تو خود قرآن مجید ہوگا کہ اس کی آیات کی طرف رجوع کر کے اور ان سے استمداد کرتے ہوئے تفسیر کی جائے، یا سنت یعنی احادیث ہوں گی، جہاں تک سنت کا تعلق ہے تو اس کا مراد لیا جانا اس لئے صحیح نہیں کہ یہ بات قرآنی دستور کے منافی ہے بلکہ خود سنت و احادیث کے بھی منافی ہے کیونکہ سنت و احادیث میں یہ حکم موجود ہے کہ تفسیر کی بابت قرآن کی طرف رجوع کریں اور روایات و احادیث کو پیش نظر رکھتے ہوئے آیات کی تفسیر کریں، لہذا اب صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ تفسیر القرآن میں خود قرآن کی طرف رجوع کریں اس کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف رجوع نہ کریں۔

اس بیان سے ”تفسیر بالرأی“ کی بابت جو آراء ذکر کی گئی ہیں ان کی اصل حقیقت واضح ہو جاتی ہے، اہل علم و صاحبان فکر نے اس سلسلہ میں مختلف آراء و اقوال پیش کئے ہیں ذیل میں صرف دس اقوال ذکر کئے جاتے ہیں تاکہ قارئین کرام تفسیر بالرأی کے اصل معنی و مفہوم سے آگاہی حاصل کرتے ہوئے تمام پہلوؤں سے آشنا ہوں۔

## تفسیر بالرائے کی بابت دس اقوال

”تفسیر بالرائے“ سے کیا مراد ہے؟ اس کی بابت دس اقوال ملاحظہ ہوں:

پہلا قول:

تفسیر بالرائے سے مراد یہ ہے کہ تفسیر کی بابت جو علوم بنیادی حیثیت رکھتے ہیں ان سے بہرہ مند ہوئے بغیر تفسیر کا عمل کیا جائے، یعنی جن علوم کے ذریعے تفسیر قرآن آسان و ممکن ہوتی ہے ان کو حاصل کئے بغیر یہ کام کیا جائے، ان علوم کے بارے میں جلال الدین سیوطی نے ”الاتقان“ میں لکھا ہے کہ وہ پندرہ ہیں، یعنی: (۱) علم لغت، (۲) علم نحو، (۳) علم صرف، (۴) علم الاشتقاق، (۵) علم معانی، (۶) علم بیان، (۷) علم بدیع، (۸) علم قرأت، (۹) علم اصول دین، (۱۰) علم اصول فقہ، (۱۱) اسباب نزول، (۱۲) قصص (تاریخ)، (۱۳) ناخ و منسوخ، (۱۴) علم فقہ، (۱۵) علم الحدیث یعنی ان احادیث کا علم جو مجمل و مبہم الفاظ کی تفسیر و تشریح کرتی ہیں، اس کے علاوہ علم الموہبت ہے کہ جس کا اشارہ حضرت پیغمبر اسلام کے اس ارشاد گرامی میں ہوا ہے: (من عمل بما علم ورثه الله علم ما لم يعلم) جو شخص اس چیز پر عمل کرے جس کا اسے علم حاصل ہے خداوند عالم اسے اس چیز کے علم سے نوازے گا جو اسے حاصل نہ ہو۔ (اپنے علم پر عمل کرنے کے نتیجے میں خداوند وہ علم عطا فرماتا ہے جو پہلے حاصل نہیں ہوتا)۔

دوسرا قول:

تفسیر بالرائے سے مراد آیات تشابہات کی تفسیر کرنا ہے کہ جن کا علم خداوند کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔

تیسرا قول:

تفسیر بالرائے کا مطلب یہ ہے کہ کسی نادرست و غلط نظریہ کو تفسیر کی بنیاد قرار دیا جائے اور وہ اس طرح کہ کسی عقیدہ و نظریہ کو بنیادی حیثیت قرار دے کر آیات کی تفسیر میں ہر ممکن طریقہ اپنایا جائے خواہ وہ ضعیف و کمزور ہی کیوں نہ ہو (گویا مخصوص نظریہ کو اصل اور حقیقی حیثیت حاصل ہو اور تفسیر کو تبعی و ثانوی حیثیت ملے کہ اس طرح قرآن کو اپنے نظریات سے ہم آہنگ کرنا مطلوب ہو گا نہ یہ کہ قرآن کی بنیاد پر نظریہ قائم کرنا مقصود قرار پائے گا)۔

چوتھا قول:

تفسیر بالرائے سے مراد یہ ہے کہ کسی محکم و مضبوط دلیل کا سہارا لئے بغیر قطعی و یقینی طور پر آیت کے معنی کا تعین کرتے ہوئے کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے یہ مراد لیا ہے۔



## پانچواں قول :

تفسیر بالرائے سے مراد یہ ہے کہ من پسند و دلخواہ معنی کی بنیاد پر تفسیر کی جائے اور شخصی ترجیحات کو تفسیر کی بنیاد بنایا جائے۔  
یہ پانچ اقوال و آراء جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب ”الاتقان“ میں ابن نقیب کے حوالہ سے ذکر کی ہیں، ان کے علاوہ دیگر پانچ آراء کو ہم یہاں ذکر کر رہے ہیں، ملاحظہ ہو :

## چھٹا قول :

تفسیر بالرائے سے مراد یہ ہے کہ جو آیات مشکل اور صعب المعنی ہیں ان کی بابت اظہار خیال کرتے ہوئے ایسے مطالب پیش کئے جائیں جن کا کوئی اشارہ صحابہ و تابعین میں سے کسی کے بیانات میں نہ پایا جاتا ہو۔ ایسا کرنا خداوند عالم کی ناراضگی مول لینے اور غضب الہی کو دعوت دینے کے برابر ہے۔

## ساتواں قول :

تفسیر بالرائے سے مراد یہ ہے کہ آیات کے معانی کا تعین کرتے ہوئے ایسے مطالب ذکر کئے جائیں جو قطعی طور پر نادرست ہوں، یعنی یہ جانتے ہوئے کہ یہ بات امر واقعہ اور حق سے مطابقت نہیں رکھتی بلکہ اس سے منافی ہے اس کی بناء پر آیت کی تفسیر کی جائے، (دو آراء یعنی چھٹی اور ساتویں رائے ابن الانباری سے منقول ہیں)۔

## آٹھواں قول :

تفسیر بالرائے سے مراد یہ ہے کہ علم و یقین کے بغیر آیات قرآنیہ کے بارے میں اظہار خیال کیا جائے، یعنی غیر علمی و غیر یقینی صورت کے ساتھ اس طرح تفسیر کی جائے کہ جو معنی کیا جا رہا ہو اس کے بارے میں معلوم ہی نہ ہو کہ وہ حق سے منافی ہے یا نہیں۔

## نواں قول :

تفسیر بالرائے سے مراد یہ ہے کہ ظاہر القرآن سے تمسک کیا جائے جبکہ تمسک کرنے والا شخص یہ نظریہ رکھتا ہو کہ قرآن ظواہر سے عاری ہے اور تفسیر القرآن میں صرف ان روایات کی پیروی کی جائے جو معصوم سے منقول ہوں اور اس طرح واضح و صریح ہوں کہ انہیں ”فص“ کہا جائے، حالانکہ ایسا کرنا آیت کی تفسیر کی بجائے نص کی پیروی کہلاتا ہے اور تفسیر کی یہ روش صرف معصومین علیہم السلام سے مختص و مخصوص ہے۔ کوئی غیر معصوم اس روش کو نہیں اپنا سکتا۔

## دسواں قول :

تفسیر بالرائے سے مراد یہ ہے کہ ظاہر القرآن سے اس نظریہ کے ساتھ تمسک کیا جائے کہ قرآن اگرچہ ظواہر کا حامل ہے لیکن ہم ان ظواہر کو سمجھنے سے قاصر ہیں بلکہ تفسیر القرآن میں صرف معصوم سے واردہ صریح بیان (نص) ہی لازم الاتباع ہے۔

یہ ہیں وہ دس اقوال و آراء کہ جنہیں تفسیر بالرائے کے معنی کی بابت پیش کیا گیا ہے، اگرچہ ان میں سے بعض ایسی آراء ہیں جن کی بازگشت دوسری بعض کی طرف خارج از امکان نہیں، تاہم یہ آراء و اقوال مدلل نہیں بلکہ ان میں سے بعض ظاہر البطلان ہیں اور بعض کا نادرست ہونا سابقہ مباحث میں ذکر کئے گئے مطالب کے حوالہ سے ظاہر و ثابت ہو جاتا ہے لہذا ہم ان کو دوبارہ ذکر کر کے طول دینا نہیں چاہتے۔

خلاصہ کلام یہ کہ روایات شریفہ اور آیات مبارکہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ احادیث میں تفسیر کی جو نہی و ممانعت کا حکم مذکور ہے اس کا تعلق طریقہ تفسیر سے ہے اصل تفسیر سے نہیں اور اس کا مطلب یہ ہے کہ خالق کے کلام کی تفسیر میں اس طریقہ و روش کو اختیار نہ کیا جائے جسے مخلوق کے کلام کی تفسیر میں اختیار کیا جاتا ہے چنانچہ اس سلسلہ کی بعض آیات میں اس طرح ارشاد ہوا ہے:

سورہ نساء، آیت ۸۲:

○ " أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ "

(آیا وہ قرآن میں غور و فکر اور تدبیر سے کام نہیں لیتے۔۔۔؟)

سورہ حجر، آیت ۹۱:

○ " الَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِينَ ۝ "

(وہ لوگ کہ جنہوں نے قرآن کو تقسیم کر دیا ...)

سورہ حم سجدہ، آیت ۴۰:

○ " إِنَّ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي آيَاتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْهَا أَفَمَنْ يُلْقِي فِي السَّمَاءِ حَبًّا مِمَّنْ يَأْتِيهِمْ أَمْنَا

يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ ... "

(جو لوگ ہماری آیات میں الحاد (تحریف) کرتے ہیں وہ ہم سے چھپ نہیں سکتے، آیا وہ شخص بہتر ہے جسے

آگ میں ڈالا جائے گا یا وہ کہ جو قیامت کے دن آرام و سکون کے ساتھ آئے گا؟ )

سورہ نساء، آیت ۴۶:

○ " يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ "

(وہ کلمات کو ان کے مقامات سے ہٹا دیتے ہیں۔۔۔ تحریف کرتے ہیں ...)

سورہ اسراء، آیت ۳۶:

○ " وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ "

(جس کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ جاؤ)  
اس کے علاوہ دیگر آیات میں بھی اسی مطلب کے اشارے پائے جاتے ہیں۔

## خدا اور مخلوق کے کلام کا فرق

حقیقت یہ ہے کہ خداوند عالم کے کلام کا غیر خدا کے کلام سے الفاظ کے استعمال میں اپنائی گئی روش، جملہ بندی میں اختیار کئے گئے انداز اور ادبی محاوروں کے انتخاب کے حوالہ سے مختلف ہونا مراد و ملحوظ نہیں کیونکہ قرآن مجید بھی عربی زبان میں ہے اور اس میں کلام کے وہ تمام اصول اور خصوصیات ملحوظ رکھی گئی ہیں جو کسی بھی عربی کلام میں ملحوظ رکھی جاتی ہیں چنانچہ اس کا ثبوت خداوند عالم کے اس ارشاد گرامی میں موجود ہے:

سورہ ابراہیم، آیت ۴:

” وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ“

(ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر اس کی اپنی قوم کی زبان کے ساتھ، تاکہ انہیں وضاحت کر ساتھ احکام بیان کر

سکے)

ایک آیت میں یوں ارشاد ہوا:

سورہ نحل، آیت ۱۰۳:

” وَهَذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُبِينٌ“

(اور یہ قرآن واضح و آشکار عربی زبان ہے)

ایک مقام پر یوں فرمایا:

سورہ زخرف، آیت ۳:

” إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ“

(بے شک ہم نے اسے پڑھی جانے والی عربی کتاب قرار دیا تاکہ تم سمجھ سکو)

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ کلام الہی اور کلام خلق میں الفاظ کی ترتیب و ترکیب کا فرق ملحوظ نہیں بلکہ اصل میں ان دونوں کے درمیان فرق مراد اور اس مصداق کی بنیاد پر ہے جس پر کلام کا مفہوم منطبق ہوتا ہے، یعنی مرادی معنی اور اس کے مفہوم کی تطبیق کے حوالہ سے فرق پایا جاتا ہے۔

اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ ہمارا تعلق بالعموم چونکہ عالم طبیعہ سے ہے اور ہم افراد بشر کے درمیان باہمی وجودی ربط و ارتباط کا نظام جسمانی و مادی بنیادوں پر قائم ہے کیونکہ ہم مادی دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں لہذا ہم ہر لفظ سے وہی معنی مراد لیتے ہیں جو ہماری مادی زندگی میں عموماً مراد لیا جاتا ہے اور پھر اس کا مصداق بھی وہی ذہن میں آتا ہے جس کا تعلق مادہ و مادیات سے ہوتا ہے اور ہم ہر مفہوم کو اس کے مادی مصداق پر منطبق کرتے ہیں چنانچہ ہم جب اپنے ہی جیسے کسی شخص کا کلام سنتے ہیں کہ جس میں کسی چیز کو بیان کیا جاتا ہے یا کسی شے کی خبر دی گئی ہوتی ہے تو ہم اس کے ظاہری الفاظ سے ان کے معانی کے ادراک کے بعد اسے اس مصداق پر محمول کرتے ہیں جو ہمارے ہاں متعارف ہوتا ہے اور انہی کلامی اصولوں پر منطبق کرتے ہیں جو ہمارے ہاں رائج ہیں کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ متکلم نے اس کے علاوہ کسی مصداق کا ارادہ نہیں کیا یعنی وہ اس کے سوا کسی دوسرے مصداق کو مراد لے ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ ہم جیسا ہے اور اس کا زاویہء فکر و فہم ہم سے مختلف نہیں بلکہ جو کچھ اور جس طرح ہم الفاظ سے معانی و مفاہیم اور ان کے مصداق کا تعین کرتے ہیں وہ (متکلم) بھی انہی کا تعین کرتا ہے، گویا الفاظ سے معانی کے تعین میں جو اصول حکم فرما ہیں وہی مفہوم و مصداق کے تعین میں جاری ہوتے ہیں البتہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ متکلم مصداق کے تعین کے عام و رائج نظام میں استثناء کرتے ہوئے ”عام“ سے ”خاص“ اور ”خاص“ سے ”عام“ مراد لیتا ہے یا ”مفہوم“ میں دخل و تصرف کرتے ہوئے الفاظ کے دائرہ سے باہر کسی دوسرے حوالہ سے مصداق کا قصد کرتا ہے کہ اس طرح کے تصرفاتی عمل کو علمی اصطلاح میں ”تصرف القرائن العقلیہ غیر اللفظیہ“ کہا جاتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جب ہم اپنے بزرگوں میں سے کسی بزرگ یا اثر و تہمتی سے یہ الفاظ سنیں ”وَ اِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ“ کوئی چیز بھی ہو اس کے خزانے و خزانے ہمارے پاس ہیں.....، تو سب سے پہلے ان الفاظ کے مفہوم اور پھر ہر لفظ سے اس کے معنی کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے اور اس کے بعد ان الفاظ و معانی کو ان کے مصداق پر منطبق کرنے کے مرحلہ میں ہم اس امر پر یقین کر لیتے ہیں کہ متکلم کے پاس متعدد محفوظ مخازن موجود ہیں کہ جن میں کثیر گرا نقدر اشیاء رکھی ہوئی ہیں کیونکہ مخازن و خزینوں کی تشکیل اسی غرض کے تحت عمل میں لائی جاتی ہے کہ ان میں قیمتی چیزیں محفوظ کی جائیں مثلاً سونا، چاندی، نقدی، زیورات، گھریلو ساز و سامان اور اسلحہ وغیرہ، اور عموماً انہی اشیاء کی حفاظت و اکٹھا رکھنے کے لئے خزینوں و مخازن کو بنایا جاتا ہے لیکن جہاں تک آسمان، زمین، صحرا، دریا، ستاروں اور انسانوں کا تعلق ہے تو اگرچہ وہ بھی ”اشیاء“ کہلاتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ذخیرہ کرنے یا مخازن میں محفوظ کرنے والی اشیاء کے باب سے نہیں اور ان کو ایک دوسرے پر چھنے کا عمل نہیں ہو سکتا بنا برائیں ہم واضح و صریح الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ متکلم کے الفاظ ”وَ اِنْ مِنْ شَيْءٍ“ سے مراد ہر شے نہیں بلکہ ”شئی“ کے وسیع معنی میں شامل بعض چیزیں ہیں اور وہ بھی ایسی کہ جو مخزن میں ذخیرہ نہیں ہوتیں، (انہیں گوداموں اور سٹوروں میں محفوظ نہیں کیا جاتا)، اس طرح الفاظ سے ان کے معانی و مفاہیم کی تطبیق کا عمل محدود ہو جاتا ہے اور مصداق کے تعین کا دائرہ اپنی عمومی وسعت

پر باقی نہیں رہتا، گویا لفظ ”شئی“ اور لفظ ”خزائن“ سے ان کے وسیع مصداق کے مراد لینے کی بجائے ان کے مغایم نہایت مخصوص مصداق پر منطبق کر کے کلامی اطلاق میں تفسیر کا حیرت انگیز سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔

اور پھر جب ہم یہ سنتے ہیں کہ خداوند عالم نے اپنے نبی پر یہ آیت نازل فرمائی، {وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ}..... سورۃ حجر، آیت ۲۱..... تو اگر ہمارا ذہن عام و معمولی سطح سے بلند نہ ہو تو ہم ان الفاظ کی تفسیر بھی اسی طرح کریں گے جس طرح کسی عام انسان کے کلام کی بابت تفسیر کرتے ہیں جبکہ اس طرح تفسیر کرنے کی کوئی دلیل ہمارے پاس موجود نہیں ہوتی اور ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے کہ ان الفاظ کو ان معانی میں استعمال کیا جاتا ہے، بنا براین ہمارا ایسا کرنا علم و آگاہی سے عاری ہماری اپنی رائے پر مبنی ہوگا۔

لیکن اگر ہم اپنی سطح فکر کو تھوڑا سا بلند کریں اور اس امر پر پختہ یقین حاصل ہو جائے کہ خداوند متعال مال کو ذخیرہ کرنے کا محتاج نہیں بالخصوص جب ہم یہ سنیں کہ اس نے اسی آیت کے ذیل میں ارشاد فرمایا ہے، ﴿وَمَا نَزَّلْنَا إِلَّا بَقْدَرٍ مَّعْلُومٍ﴾ (اور ہم اس سے معلوم اندازے کے مطابق ہی نازل کرتے ہیں)..... سورۃ حجر ۲۱..... اور سورۃ جاثیہ آیت ۵ میں اس نے یوں ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا أَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مِّنْ مَّرْقُوقٍ فَا حَيَّا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾..... اور خدا نے آسمان سے جو رزق نازل کیا اس سے زمین کو زندہ کر دیا جبکہ وہ مر چکی تھی..... تو یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ لفظ ”شئی“ سے مراد روٹی اور پانی والا رزق ہے اور اس کے آسمان سے نازل ہونے سے مراد بارش کا برسنا ہے کیونکہ ہم آسمان سے نازل ہونے کے الفاظ سے بارش برسنے کے علاوہ ہم کچھ نہیں سمجھتے، لہذا ان الفاظ و عبارات سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہر شے کا خداوند عالم کے پاس ذخیرہ ہونے اور اندازہ و مقدار کے ساتھ اس کے نازل ہونے سے مراد دراصل بارش کے پانی کا ذخیرہ کیا جانا اور پھر اس کا غذاؤں اور اشیاء خورد و نوش کے اگنے کی غرض سے آسمان سے نازل ہونا (برسنا) ہے کہ جسے کنایۃً ذخیرہ کرنے اور نازل کرنے کے الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے..... اس طرح کی تفسیر بھی تفسیر بالرائے ہے کہ جو جہالت و عدم آگاہی پر مبنی ہے، کیونکہ اس میں ہماری بنیاد صرف یہ ہے کہ ہم بارش کے علاوہ آسمان سے کسی چیز کے نازل ہونے کا علم ہی نہیں رکھتے، گویا ہماری دلیل اور نظریہ کی بنیاد یہ ہے کہ ہمیں اس کے سوا کسی چیز کا علم نہیں ہوتا، یعنی علم نہ ہونا اصل وجہ ہے نہ کہ اس کے علاوہ کسی چیز کے نازل نہ ہونے کا علم ہونا ہے۔ اسے علمی اصطلاح میں عدم العلم دو ان العلم بالعدم کہا جاتا ہے۔

اور اگر ہم اپنی سطح فکری کو بلند کریں اور مذکورہ معیار سے کہیں اونچا ہو کر سوچیں اور قرآن کی بابت بغیر علم کے ہر طرح کے اظہار خیال سے اجتناب کریں اور کلام الہی کو اس کے کامل اطلاق پر باقی رکھتے ہوئے آیہ مبارکہ ”وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ“ کے بارے میں یہ نظریہ قائم کریں کہ اس میں مسئلہ خلقت کو بیان و واضح کیا گیا ہے البتہ اس حقیقت کو ملحوظ و مد نظر رکھیں کہ کائنات میں جو چیز بھی وجود پذیر ہوتی ہے مثلاً انسان، حیوان، نباتات وغیرہ، وہ آسمان سے نازل نہیں

ہوتی بلکہ زمین ہی میں اپنے وجودی مراحل طے کر کے جدید الحدوث موجودات میں شمار ہوتی ہے۔ تو ہم اس نتیجہ تک پہنچ سکتے ہیں کہ آیہ مبارکہ ﴿وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِرُهُ﴾ (سورہ حجر، آیت ۲۱) کنایۃً اس مطلب کو بیان کرتی ہے کہ تمام موجودات اپنے وجود پانے میں ارادہ خداوندی کے تابع ہیں اور ارادہ الہی بمنزلہ مخزن ہے کہ جس میں تمام جدید الحدوث اشیاء و موجودات مخزون و محفوظ ہیں اور ان میں سے وہی چیز اس خزانہ سے باہر آتی ہے اور خدا کی طرف سے نازل ہوتی ہے جس کو وجود عطا کرنے میں خدا کی مشیت ہو جائے، (یعنی جس کو وجود دینے کا ارادہ خدا کر لے)، لیکن آیت کی یہ تفسیر بھی جس طرح کہ آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں ہماری رائے و خیال پر مبنی ہے کہ جو بغیر علم کے ہم قائم کرتے ہیں (یعنی تفسیر بالرائے ہے) کیونکہ اس سلسلہ میں ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی دلیل نہیں کہ زمینی موجودات خدا کی طرف سے آسمان سے نازل نہیں ہوتیں اور ہم نازل ہونے کا معنی اوپر سے نیچے آنا کرتے ہیں اس کے علاوہ اس کا کوئی معنی ہم نہیں جانتے۔ (یعنی جب ہم ”نازل ہونے“ کا معنی آسمان سے زمین پر آنا یعنی اوپر سے نیچے آنا کریں تو زمینی موجودات کے بارے میں یہی کہیں گے کہ وہ آسمان سے نیچے نہیں آئیں کیونکہ اس کے علاوہ نازل ہونے کا کوئی معنی ہمیں معلوم ہی نہیں)۔

اور اگر آپ ان چیزوں کے بارے میں غور و فکر کریں جن کی توصیف خداوند عالم نے اپنی مقدس کتاب میں کی ہے مثلاً اپنے اسماء ذات، اپنی صفات، اپنے افعال، اپنے فرشتے، اپنی کتابیں، اپنے رسول، قیامت اور اس سے تعلق رکھنے والے امور، اپنے احکامات اور ان کے معیار وغیرہ، اور پھر ان چیزوں کے بارے میں ہم عقلی قرآن کی بنیاد پر جو تفسیر کرتے ہیں اس پر بخوبی غور کریں تو آپ اس حقیقت سے آگاہ و آشنا ہو جائیں گے کہ یہ سب کچھ تفسیر بالرائے ہی کے باب سے ہے کہ جس کی اصل بنیاد ہماری لاعلمی ہے، اور یہ سب کچھ کلام خداوندی کو اس کے اصل مقام سے دور کرنے اور پھیر دینے کی ایک صورت ہے، یعنی ”تخریف“ کی ایک قسم ہے۔

ہم پانچویں فصل میں حکم و تشابہ کی بحث کے ضمن میں اس مطلب کو بیان کر چکے ہیں کہ معارف الہیہ کی بابت قرآنی بیانات کی حیثیت مثالوں جیسی ہے یا خود مثالیں ہیں جو اپنے امثالات (جن کی مثالیں قرار پاتی ہیں) کی عکاسی کرتی ہیں، یعنی آیات قرآنیہ کی حیثیت وہی ہے جو مثالوں کی اصل موجودات و حقائق سے ہوتی ہے، خدائی معارف و حقائق مختلف و متفرق آیات کے قالب میں ڈھل گئے ہیں اور دامن قرآن میں بکھرے ہوئے ان معانی و مفہیم اور حقائق و معارف کا ادراک اس طرح ممکن قرار پایا ہے کہ بعض آیات کے ذریعے دیگر بعض آیات کے معانی کو سمجھا جاسکتا ہے اور جو مفہیم و معارف قرآنی بیانات کے دامن میں پوشیدہ ہیں ان سے آگاہی حاصل کرنے میں انہی آیات میں سے ایک دوسرے کی وضاحت کے حوالے موجود ہیں اسی وجہ سے بعض آیات کو دوسری بعض آیات کے لئے شاہد و مفسر کا درجہ دیا جاتا ہے یعنی بعض آیتیں دوسری بعض آیتوں کے معانی کی تفسیر کرتی ہیں اور ان کے تعین میں شاہد قرار پاتی ہیں کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا یعنی آیات ایک دوسری کی

تفسیر نہ کرتیں تو معارف الہیہ اپنے حقائق میں اس طرح پوشیدہ رہتے کہ ان سے آگاہی حاصل کرنے کا نظام ہی درہم برہم اور مختل ہو جاتا اور پھر کسی بھی آیت کا معنی سمجھنے کے لئے لاعلمی پر مبنی اس تفسیر بالرائے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا کہ جس کی بابت واضح طور پر مطالب ذکر ہو چکے ہیں۔

نتیجہ کلام: مذکورہ بالا مطالب سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تفسیر بالرائے اسی ”قول بغیر علم“ کا مصداق ہے جس کے بارے میں سابق الذکر حدیث نبویؐ میں ارشاد ہوا ہے کہ ”جس نے قرآن کے بارے میں بغیر علم کے بات کی (اظہار خیال کیا) تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم کی آگ ہی سمجھے“ (من قال فی القرآن بغیر علم فلیتوبوا مقعدہ من النار)۔

اس کے علاوہ یہ مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ تفسیر بالرائے کا نتیجہ قرآنی آیات کے درمیان تناقی (ایک دوسرے کی نفی پر مبنی ہونے) کے غلط نظریہ کو جنم دینا ہے کیونکہ اس سے قرآنی مضامین و موضوعات میں پائی جانے والی معنوی ترتیب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے کہ جس سے آیات کا جا بجا ہونا اور کلمات کا اپنے اصل مقامات کی بجائے دوسری جگہوں میں قرار پانا لازم آتا ہے (یعنی تحریف کی راہ ہموار ہو جاتی ہے) اور پھر آیات کی غلط تاویلوں کا باب کھل جاتا ہے کہ بعض یا اکثر آیات سے ان کے اصل معانی کی بجائے دوسرے معانی مراد لئے جاتے ہیں جیسا کہ جبر اور تفویض کا عقیدہ رکھنے والے حضرات نے آیات کی تاویل اپنے نظریات کے مطابق کی، مثلاً جبر کا عقیدہ رکھنے والوں نے آیات الاختیار یعنی وہ آیات کہ جن میں انسان کے بااختیار ہونے کا واضح ذکر ہوا ہے ان کی تاویل اس طرح سے کی کہ جبر کا عقیدہ درست قرار پائے اور ان کے مقابلے میں تفویض کا عقیدہ رکھنے والوں نے آیات القدر یعنی وہ آیات کہ جن میں انسان کے اختیار کی محدودیت مذکور ہے ان کی تاویل اس انداز میں کی کہ جس سے تفویض کا نظریہ درست قرار پائے، بلکہ اکثر اسلامی مسالک قرآنی آیات کی تاویلوں کے مرتکب ہو گئے اور انہوں نے ہر اس آیت کی تاویل کر دی (یعنی اس کے ظاہری معنی سے موڑ کر دوسرے معنی مراد لئے) جو بظاہر ان کے نظریہ و مسلک سے موافق نہ تھی اور انہوں نے اپنے اس عمل کو صحیح قرار دینے میں عقلی قرآن کا سہارا لیتے ہوئے اس طرح اظہار سخن کیا کہ جب کس کلام کا ظاہر، عقلی اصولوں سے مطابقت نہ رکھتا ہو تو ضروری ہے کہ کلام کو اس کے ظاہر سے پھیر کر اس سے دوسرا معنی مراد لیا جائے جبکہ یہ وہی تاویل ہے کہ جس کا سرچشمہ قول بغیر علم ہے۔

خلاصہء بیان یہ کہ تفسیر بالرائے سے آیات کی ترتیب کے درہم برہم ہونے کے نتیجے میں ان کے درمیان اختلاف اور ایک دوسرے کی نفی کرنے کا پہلو جنم لیتا ہے کہ جس سے آیتوں کا مقصود و مطلوب مفقود ہو جاتا ہے اور پھر قرآن کے اس دعوے کی نفی ہوتی ہے کہ اس کی آیات میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا، تو معلوم ہوا کہ آیات میں اختلاف کا پایا جانا اور ایک دوسری کی نفی کے پہلو کا حامل ہونا ان کے درمیان پائے جانے والے حقیقی ارتباط کے مضبوط سلسلے کے مختلف ہونے اور ان کے مرادوی معنی کے اختلاط کا نتیجہ ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں اور یہ وہی مطلب ہے جسے روایات میں ”ضرب بعض القرآن بعض“

سے تفسیر کیا گیا ہے: روایات ملاحظہ ہوں:

○ ”عن الصادق عن ابیہ علیہما السلام قال: ما ضرب رجل من القرآن بعض

الاکفر“،

(نہیں مارے گا کوئی شخص قرآن کے بعض حصہ کو دوسرے بعض پر، مگر یہ کہ وہ کافر ہو جائے گا)

(ملاحظہ ہو: کافی ج ۳ ص ۶۳۲ حدیث ۱۷۔ تفسیر العیاشی ج ۱ ص ۱۸ حدیث ۲)

○ ”عن الصادق علیہ السلام: ما ضرب رجل من القرآن بعضه ببعض الاکفر“،

(نہیں مارے گا کوئی شخص قرآن کے بعد حصہ کو دوسرے بعض پر، مگر وہ کافر ہو جائیگا)

(معانی الاخبار ص ۱۹۰ حدیث ۱۔ المحاسن البرقی ص ۲۱۲ حدیث ۸۶، تفسیر العیاشی ص ۱۸ حدیث ۲)

شیخ صدوق علیہ الرحمۃ نے کہا کہ میں نے ابن الولید سے اس حدیث کا معنی پوچھا تو انہوں نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ جب آپ سے کسی آیت کی تفسیر پوچھی جائے تو آپ اس کی بجائے کسی دوسری آیت کی تفسیر کے ذریعے جواب دیں (یعنی کسی اور آیت کی تفسیر بتائیں)

ابن الولید نے شیخ صدوق علیہ الرحمۃ کو جو جواب دیا وہ مبہم ہے اور اس میں دو پہلو ممکن و قابل تصور ہیں: ایک یہ کہ ان کا اشارہ اس عام روش و طرز بحث کی طرف ہو جو عموماً اہل علم حضرات کے درمیان رائج و معمول ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے مناظروں و مباحثوں میں ایک آیت کو دوسری آیت سے متصادم قرار دے کر ان میں سے ایک سے تمسک اختیار کر کے دوسری کی تاویل کر دیتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ ان کا مقصد یہ ہو کہ ایک آیت کا معنی سمجھنے کے لئے دوسری آیت سے استناد و استفادہ کرتے ہوئے ان میں سے ایک کو دوسری پر بطور شاہد پیش کرے (یعنی ایک آیت کے ذریعے دوسری آیت کی تفسیر کرے اور ایک آیت کے معنی کے تعین میں دوسری آیت کو شاہد و مؤید قرار دے)۔ اگر ابن الولید کا مقصد پہلا معنی ہو تو بات درست بنتی ہے اور اگر ان کا مقصد دوسرا پہلو ہو تو قطعاً درست نہیں اور ان دو روایتوں سے اس دوسرے پہلو کی صریح نفی ہوتی ہے۔

## امام جعفر صادقؑ کا ارشاد گرامی

تفسیر نعمانی میں مؤلف نے اپنے اسناد سے اسماعیل بن جابر سے روایت کی ہے انہوں نے کہا: میں نے ابو عبد اللہ جعفر بن محمد الصادق علیہ السلام سے سنا ہے امام نے ارشاد فرمایا:



” ان الله تبارك وتعالى بعث محمداً ففتحتم به الانبياء فلانبي بعدة، وانزل عليه كتاباً ففتحتم به الكتب فلا كتاب بعده، احل فيه حلالاً وحرم حراماً، فحلاله حلال الى يوم القيامة وحرامه حرام الى يوم القيامة، فيه شرعكم وخبر من قبلكم وبعدكم، وجعله النبي صلى الله عليه وآله علماً باقياً في اوصيائه، فتركهم الناس وهم الشهداء على اهل كل زمان، وعدلوا عنهم ثم قتلوهم، واتبعوا غيرهم ثم اخلصوا لهم الطاعة حتى عاندوا من اظهر ولاية ولاة الامر وطاب علموهم، قال الله سبحانه: ” وَسَوْأَ حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ ۗ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَى خَآئِنٍ مِّنْهُمْ “... سورة المائدة الآية ۱۳ ” وذلك انهم ضربوا بعض القرآن ببعض واحتجوا بالمنسوخ وهم يظنون انه الناسخ، واحتجوا بالمتشابه وهم يرون انه المحكم، واحتجوا بالخاص وهم يقدرون انه العام، واحتجوا باول الآية وتركوا السبب في تأويلها، ولم ينظروا الى ما يفتح الكلام والى ما يختمه، ولم يعرفوا موارده ومصادره اذ لم يأخذوه عن اهلهم فضلوا واضلوا، واعلموا رحمكم الله ! انه من لم يعرف من كتاب الله عز وجل الناسخ من المنسوخ والخاص من العام والمحكم من المتشابه، والرخص من العزائم، والملكي والمدني، واسباب التنزيل، والمبهم من القرآن في الفاظه المنقطعة والمؤلفة، وما فيه من علم القضاء والقدر، والتقديم والتأخير، والمبين والعميق، والظاهر والباطن، والابتداء والانتهاء، والسؤال والجواب، والقطع والوصل، والمستثنى منه والجار فيه، فالصفة لما قبل مما يدل على ما بعد، والمؤكد منه والمفصل، وعزائمه، ورخصه، ومواضع فرائضه واحكامه، ومعنى حلاله وحرامه الذي هلك فيه الملحدون، والموصول من الالفاظ والمحمول، على ما قبله وعلى ما بعده فليس بعالم بالقرآن ولما هو من اهلها، ومتى ما ادعى معرفة هذه الاقسام مدع بغير دليل فهو كاذب مرتاب مفتر على الله الكذب ورسوله وماواه جهنم وبئس المصير، “

(خداوند عالم نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا (مبعوث پر رسالت فرمایا) اور انہی پر سلسلہ نبوت اختتام کو پہنچا (ختم نبوت ہوئی) لہذا ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، اور ان پر کتاب نازل کی اور اس کتاب کے ذریعے کتابیں نازل کرنے کا سلسلہ اختتام پذیر ہوا، لہذا اس کے بعد کوئی کتاب نازل نہ ہوگی، اس کتاب میں خداوند عالم نے کچھ چیزیں حلال اور کچھ چیزیں حرام کئے جانے کو ذکر فرمایا (اس میں تمام حلال و حرام اشیاء کو بیان کر دیا) جو چیز اس کتاب میں (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حلال قرار دی گئی وہ قیامت تک حلال رہے گی اور جو چیز اس میں حرام قرار دی گئی وہ قیامت حرام رہے گی۔

اس کتاب میں تمہارے تمام احکام دین مذکور ہیں، اور اس میں تم سے پہلے اور بعد میں آنے والوں کو خبریں ہیں۔ حضرت پیغمبر اسلام نے اسے ایسا سرچشمہ علم قرار دیا جو آنحضرت کے اوصیاء (آئمہ معصومین) میں ہمیشہ باقی رہنے والا ہے لیکن عامۃ الناس نے ان اوصیاء و آئمہ معصومین کو چھوڑ دیا حالانکہ وہ ہر زمانہ کے لوگوں پر گواہ بنائے گئے ہیں مگر لوگوں نے ان سے روگردانی کی اور پھر انہیں قتل کر دیا، ان کے علاوہ دوسروں کی پیروی کی اور اعیانہ کی مکمل و خالص اطاعت کرنے لگے، یہاں تک کہ انہوں نے اوصیاء برحق کی ولایت و محبت کا اظہار کرنے والوں اور ان کے علوم و معارف طلب کرنے والوں سے عناد و دشمنی مول لے لی، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: (وَنَسُوا حَظًّا فَمَا بُدِّدُوا وَإِنَّا لَنَنظُرُهُمْ عَلَىٰ خَآئِنَةٍ فَنَبْتِلِيهِمْ) انہوں نے وہ سب کچھ بھلا دیا جس کی انہیں یاد دلائی گئی اور آپ ہمیشہ ان کی خیانت کاری سے آگاہ ہوتے رہیں گے۔ ان کے اس حالت سے دو چار ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کے بعض حصہ کو دوسرے بعض پر مارا (غلط تفسیر و تاویل کی)، انہوں نے منسوخ شدہ آیت کو ناسخ سمجھ کر اس سے استدلال و استناد کیا، اور تشابہ آیت کو محکم سمجھتے ہوئے اس سے استدلال کیا، اور خاص آیت کو عام قرار دے کر اسے اپنے مدعا کی دلیل کے طور پر پیش کیا، انہوں نے کسی آیت کے ابتدائی جملوں سے تمسک اختیار کیا مگر اس کی تاویل کے سبب کو ترک کر دیا، انہوں نے اپنے استدلال میں آیت کے ابتدائی جملوں اور آخری جملوں میں توجہ و غور کئے بغیر اس سے اپنے مقصود کے اثبات میں استفادہ کی کوشش کی، انہوں نے کلام الہی کے موارد و مصادر کو بچا بچا ہی نہیں کیونکہ انہوں نے اسے اس کے اہل سے نہیں لیا (قرآن کو قرآن و اولوں سے نہیں لیا) جس کے نتیجہ میں خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دیا، اور تم جان لو! اللہ تم پر رحم فرمائے، کہ جو شخص کتاب خدا کے ناسخ و منسوخ، خاص و عام، محکم و متشابہ، جائز و واجب احکام، مباح و لازمی دستورات و اعمال، مکی آیات و مدنی آیات، اسباب تنزیل، قرآن کے منقطع و متصل اور غیر مرتب و مرتب الفاظ میں سے مبہم، قضاء و قدر سے مربوط آیات کا علم، مقدم و مؤخر، مبین و واضح اور عمیق، ظاہر و باطن، ابتداء و انتہاء، سوال و جواب، قطع و وصل، مستثنیٰ اور مستثنیٰ منہ، ماقبل اور مابعد سے مربوط صفات، مؤکد و مفصل، واجبات و محرمات اور مستحبات و مکروہات، فرائض و احکام سے مربوط مقامات، معافی حلال و حرام کہ جن میں تمیز کئے بغیر طردین ہلاکت کا شکار ہو گئے، الفاظ کے مصدق و موارد اور آیت کے اپنے ماقبل و مابعد سے ربط و تعلق سے آگاہی نہ رکھتا ہو وہ نہ تو قرآن کا عالم ہے اور نہ ہی اس کا اہل ہے۔ اور جب کوئی شخص مذکورہ اقسام کی معرفت و آگاہی کا حامل ہونے کا دعویٰ کرے تو اس کا دعویٰ بلا دلیل ہوگا اور وہ جھوٹا و فریبی ہے کہ جو چاہتا ہے کہ خدا اور رسول خدا پر افتراء پرداز کرے، اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے کہ جو بہت برا ٹھکانہ ہے۔ (تفسیر نعمانی ص ۵)

## امیر المؤمنینؑ کا ارشاد گرامی

نیج البلاغہ اور کتاب الاحتجاج (طبریؒ) میں مذکور ہے کہ حضرت امام امیر المؤمنینؑ نے ارشاد فرمایا:

”تردد علی احدہم القضية فی حکم من الاحکام فی حکم برأیہ، ثم تردد تلك القضية بعینہا علی غیرہ فی حکم فیہا بخلاف قولہ، ثم تجتمع القضاة بذالك عند الامام الذي استقضاهم فیصوب ارائهم جميعاً والهم واحد، ونبیہم واحد، وکتابہم واحد، أفامرهم الله سبحانه بالاختلاف فاطاعوه؟ ام نھامهم عنه فیعضوه؟ ام انزل الله دیناً ناقصاً فاستعان بهم علی اتمامہ؟ ام كانوا شركاء فلهم ان يقولوا وعليه ان یرضی؟ ام انزل الله دیناً تاماً فقصر الرسول صلی الله علیه وآله وسلم عن تبليغہ وادائہ؟ واللہ سبحانه یقول: (ما فرطنا فی الكتاب من شیء وفيہ تبيان كل شیء)، و ذکر ان الكتاب یصدق بعضه بعضاً وانہ لا اختلاف فیہ، فقال سبحانه: (ولو كان من عند غیر الله لوجدوا فیہ اختلافاً كثيراً)، وان القرآن ظاہرہ انیق وباطنہ عمیق، لا تحصى عجائبہ ولا تنقضى غرائبہ ولا تكشف الظلمات الایہ“،

(جب ان میں سے کسی ایک کے پاس شرعی احکام میں سے کسی حکم کے بارے میں کوئی مسئلہ پیش ہوتا ہے تو وہ اس کی بابت اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کر دیتا ہے، پھر جب وہی مسئلہ یعنی کسی دوسرے کے پاس آتا ہے تو وہ اس کے برعکس فیصلہ صادر کرتا ہے، پھر جب وہ سب مفتی حضرات اور فیصلہ کرنے والے اپنے اس امام کے پاس اکٹھے ہوتے ہیں جس نے انہیں منصب قضاوت عطا کیا اور حکم و فیصلہ صادر کرنے کا اختیار و ذمہ داری دی تو وہ ان سب کی آراء و فیصلوں کی توثیق اور انہیں درست قرار دیتا ہے، جبکہ ان کا معبود ایک، ان کا نبی ایک اور ان کی کتاب ایک ہے، تو کیا خدا نے انہیں آپس میں اختلاف سے منع کیا اور انہوں نے اس کی نافرمانی کی؟ یا خداوند عالم نے ناقص و نامکمل دین نازل کیا اور اس کی تکمیل اور پورا کرنے میں ان سے مدد مانگی؟ یا وہ خدا کے شریک کار ہیں لہذا وہ جو کچھ کہہ دیں خدا کا فرض ہے کہ اس پر راضی ہو؟ یا خداوند عالم نے تو دین مکمل نازل کیا مگر رسول خدا نے اس کی تبلیغ اور اسے پہنچانے میں کوتاہی کی؟ جبکہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: (سورہ انعام آیت ۳۸) ”مَا فَرَّقْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ“ (و فیہ تبيان كل شیء) ہم نے قرآن میں کوئی فروگزاشت نہیں کی، (اور اس میں ہر چیز کا واضح بیان ہے) اور قرآن ہی میں مذکور ہے کہ اس کی آیات ایک دوسری کی تصدیق کرتی ہیں اور اس میں کسی طرح کا اختلاف نہیں پایا جاتا چنانچہ ارشاد الہی ہے: ﴿لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ

لَوْ جَدَّوْا فَيَبْئِخْتَلِفًا كَثِيرًا)..... اگر وہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے (سورۃ نساء، آیت ۸۲)۔ یاد رکھو! قرآن کا ظاہر دلکش و دلربا ہے اور اس کا باطن عمیق ہے، اس کے عجائبات (اسرار و رموز اور حقائق و معارف) شمار نہیں کئے جاسکتے اور اس کے غرائب و منفر د مطالب انتہاء پذیر نہیں، ظلمات (گمراہی و جہالت کے اندھیرے اور تاریکیاں) اس کے علاوہ کسی دوسرے ذریعے سے چھٹ نہیں سکتیں۔

(نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۔ الاحتجاج ج ۱ ص ۳۸۹)

اس روایت میں..... جیسا کہ آپ خود ملاحظہ کر رہے ہیں..... واضح و صریح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ ضروری ہے ہر دینی نظریہ کا منتهی قرآن ہو، اور حضرت امیر المومنینؑ نے اپنے ارشاد میں آیت کے ساتھ جو الفاظ ذکر کئے ہیں یعنی ”وفیہ تیسان کل شیء“ اور اس میں ہر شے کا واضح بیان موجود ہے..... تو یہ ایک قرآنی آیت کے معنی کی طرف اشارہ ہے۔ اس سے استناد ہے، آیت کا نقل بالمعنی ہے۔

## غلط تفسیریں کرنے کا نتیجہ

تفسیر درمنثور میں مذکور ہے کہ ابن سعد سے مروی ہے، اور ابن ضریس نے اپنی کتاب ”الفضائل“ میں لکھا ہے، اور ابن مردویہ نے عمرو بن شعیب، ان کے والد اور دادا کے حوالہ سے روایت بیان کی ہے کہ: ایک دن حضرت پیغمبر اسلامؐ نہایت غضبناک حالت میں ان لوگوں کے پاس آئے جو قرآنی آیات کے بارے میں ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے، آنحضرتؐ نے ان سے ارشاد فرمایا:

(بهذا ضلت الامم قبلکم باختلافہم علی انبیائہم و ضرب الکتاب بعضہ ببعض، وان القرآن لم ینزل لیکذب بعضہ بعضاً ولكن نزل ینصدق بعضہ بعضاً، فما عرفتم فاعملوا بہ وما تشابہ علیکم فامنوا بہ)

اسی روش کی وجہ سے تم سے پہلی امتیں گمراہ ہوئیں کہ انہوں نے اپنے انبیاء سے اختلاف کیا، اور کتاب خدا کی غلط تفسیریں کیں، جہاں تک قرآن کی بات ہے تو وہ اس لئے نازل نہیں ہوا کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تکذیب کرے بلکہ وہ ایک حصہ دوسرے حصہ کی تصدیق کرتا ہوا نازل ہوا، لہذا تم جس سے آگاہ ہو جاؤ اس پر عمل کرو اور جو تم پر واضح نہ ہو سکے تو اس پر ایمان لاؤ۔ (تفسیر ”درمنثور“ جلد ۱ ص ۶)

## آیات کی تعبیر و تکذیب کی ممانعت

تفسیر درمنثور ہی میں مذکور ہے کہ احمد نے دوسرے اسناد سے عمرو بن شعیب سے ان کے والد اور دادا کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام نے سنا کہ کچھ لوگ قرآنی آیات کے بارے میں آپس میں الجھ رہے ہیں تو آپ نے ان سے ارشاد فرمایا:

”انما هلك من كان قبلکم بهذا ضربوا کتاب اللہ بعضه ببعض، وانما نزل کتاب اللہ یصدق بعضه بعضاً فلا تکذبوا بعضه ببعض، فما علمتم منه فقولوا، وما جهلتم فکلوه الی عالمہ“

”جو لوگ تم سے پہلے تھے وہ بھی اسی طرح بحث کرنے کے نتیجے میں تباہ ہوئے، انہوں نے کتاب خدا کی غلط انداز میں تفسیریں کیں، خدا کی کتاب اس طرح نازل ہوئی ہے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تصدیق کرتا ہے لہذا تم اس کی کسی آیت کے ذریعے دوسری کسی آیت کی تکذیب نہ کرو، اس سے جو کچھ جان لو وہ بیان کرو اور جس سے نا آگاہ ہو اسے اس کے عالم پر چھوڑ دو“

مذکورہ بالا روایت میں جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا ہے ”ضرب القرآن بعضه بعضاً“ (قرآن کے بعد بعض حصہ کو دوسرے بعض پر مارنا) کو ”تصدیق بعض القرآن بعضاً“ (قرآن کے بعد بعض حصہ کا دوسرے بعض کی تصدیق کرنا) کے مقابل قرار دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ”ضرب القرآن بعضه بعضاً“ سے مراد معانی و موارد کے حوالہ سے آیات کو غلط ملط کر دینا اور ان کے مقاصد کی ترتیب میں خلل ڈالنا ہے مثلاً محکم کو تشابہ اور تشابہ کو محکم قرار دینا اور اس طرح کے دیگر اعمال!

بنا بریں قرآن کی بابت اپنی رائے کی بنیاد پر اظہارِ سخن (تفسیر بالرأی) اور آیات کے معانی میں علم و آگاہی کے بغیر اظہارِ خیال کرنا، جیسا کہ سابق الذکر روایات میں بیان کیا گیا ہے اور ”ضرب القرآن بعضه بعضاً“ (قرآن کے بعض حصہ کو دوسرے بعض حصہ پر مارنا) جو کہ حالیہ ذکر کی گئی روایات میں وارد ہوا ہے ان سب کا محور ایک ہی معنی ہے اور وہ یہ کہ تفسیر القرآن میں قرآن کے علاوہ کسی سے مدد لینا، (اور یہی امر مذموم، باطل اور موجب ہلاکت ہے)

## ایک سوال اور اس کا جواب

سوال:

ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ قرآن اس لئے نازل ہوا ہے کہ لوگ اسے سمجھیں اور اس کا فہم و ادراک حاصل کریں جیسا کہ ارشاد الہی ہے:

سورۃ زمر، آیت: ۴۱

○ ” اِنَّا اَنْزَلْنٰا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ

(بے شک ہم نے آپ پر کتاب نازل کی لوگوں کے لئے)

سورۃ آل عمران، آیت: ۱۳۸

○ ” هٰذَا بَيٰانٌ لِّلنَّاسِ

(یہ لوگوں کے لئے بیان و وضاحت ہے)

اور اس طرح کی دیگر متعدد آیات مبارکہ میں اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے کہ قرآن لوگوں کے سمجھنے کے لئے نازل کیا گیا ہے، اور اس امر میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کی وضاحت کرنے والے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، جیسا کہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورۃ نحل، آیت: ۴۴

○ ” وَاَنْزَلْنٰا اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ

(اور ہم نے آپ پر ذکر (قرآن) نازل کیا ہے تاکہ آپ واضح طور پر لوگوں کو بتائیں کہ ان کے لئے کیا نازل

کیا گیا ہے)

آنحضرتؐ نے صحابہ کرام کو قرآن کی تبیین و توضیح کی اور انہیں خدا کی نازل کردہ کتاب کے معانی سے واضح طور پر آگاہ فرمایا، پھر تابعین نے صحابہ کرام سے وہ مطالب حاصل کئے، اور صحابہ کرام و تابعین حضرات نے جو کچھ آنحضرتؐ کے حوالہ سے ہم تک پہنچا یا وہ بیان نبویؐ ہے کہ صریح قرآنی حکم کی بناء پر اس سے چشم پوشی و بے اعتنائی ہرگز روا نہیں۔

اور جہاں تک صحابہ کرام و تابعین حضرات کے ان بیانات کا تعلق ہے جن میں انہوں نے آنحضرتؐ کے ارشادات سے استفادہ نہیں کیا اور آپ کے فرمودات کا حوالہ نہیں دیا تو اگرچہ وہ حدیث نبویؐ کا درجہ نہیں رکھتے اور نہ ہی اس

کی مانند حجت قرر پاتے ہیں لیکن ان بیانات سے قلبی اطمینان حاصل ہوتا ہے (اور وہ فہم القرآن میں غیر معمولی کردار ادا کرتے ہیں) کیونکہ انہوں نے آیات کی تفسیر میں جو کچھ بیان کیا وہ دو حال سے خالی نہیں: یا انہوں نے آنحضرتؐ سے سنا ہے یا آنحضرتؐ کے بیان و تعلیم سے حاصل ہونے والے قرآن فہمی کے خاص ذوق کا نتیجہ ہے، اسی طرح ان کے شاگردوں میں سے تابعین و تبع تابعین اور ان کے بعد آنے والے اہل علم حضرات نے جو کچھ ذکر کیا اس کا مقام و درجہ بھی وہی ہے جو صحابہ و تابعین کے بیانات کا ہے، اور یہ بات کیونکر درست ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں کو قرآن کے معانی سے آگاہی حاصل نہ ہو جبکہ وہ عربی زبان پر کمال مہارت اور اس کی بابت کھل آشنائی رکھتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ہمیشہ کوشاں رہے کہ قرآنی آیات کے معانی سرچشمہ رسالت (حضرت پیغمبر اسلامؐ) سے کسب کریں اور تاریخ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ صدر اسلام میں علماء دین نے اپنی پوری توجہات دین فہمی میں مبذول رکھیں، بنا براین یہ امر واضح و آشکار ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے طریقہ و روش سے روگردانی، اور ان کے گروہ و جماعت سے باہر نکل کر کسی قرآنی آیت کی تفسیر کرنا بدعت ہے، اور جن آیات کی تفسیر میں ان کی طرف سے کوئی بیان موجود نہ ہو اور انہوں نے اس کی بابت اظہار خیال نہ کیا ہو تو اس کے بارے میں سکوت اختیار کرنا ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو مطالب ان کی طرف سے منقول ہوئے ہیں وہ قرآن فہمی کے لئے کافی و روانی ہیں کیونکہ ان کے بیانات ہزاروں روایات پر مشتمل ہیں، چنانچہ سیوطی نے ان کی تعداد سترہ ہزار تک بتائی ہے کہ جو یا حضرت پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہیں یا صحابہ کرام و تابعین سے منقول ہیں۔

### جواب:

ہم اپنے سابقہ ذکر کئے گئے مطالب میں یہ نکتہ بیان کر چکے ہیں کہ جو آیات مبارکہ عامۃ الناس خواہ وہ کافر ہوں یا مومن اور خواہ انہوں نے عصر نبویؐ کو پایا ہو یا نزول قرآن کے بعد کے ادوار میں آئے ہوں، سب کو قرآن فہمی اور اس میں غور و فکر اور تدبر و تعقل کی دعوت دیتی ہیں بالخصوص آیت مبارکہ ”أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ ۗ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا“ (سورۃ نساء، آیت ۸۲) (وہ قرآن میں غور و فکر اور تدبر کیوں نہیں کرتے کہ اگر وہ اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے آیا ہوتا تو لوگ اس میں کثیر اختلاف پاتے) اس طرح کی آیات سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ قرآنی معارف ہر تدبر اور بحث و فکر کرنے والے شخص کے لئے قابل فہم ہیں یعنی جو شخص آیات میں غور و فکر سے کام لے ورنہ ان کے معانی کے سمجھنے کی کوشش کرے وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو سکتا ہے اور اس کے غور و فکر کے نتیجے میں آیات کے درمیان ظاہری طور پر دکھائی دینے والا اختلاف خود بہ خود دور ہو جائے گا۔ اور مذکورہ بالا آیت مبارکہ عمومی اعلان کر رہی ہے (کہ قرآن میں کوئی اختلاف نہیں) جو کہ ایک چیلنج ہے لہذا اس طرح کے مقام میں ہونے والی آیت کے باوجود آیات کے

معانی کا سمجھنا صحابہ و تابعین سے مخصوص کیا جائے اور فہم الآیات کی بابت ان کی طرف رجوع کرنا مراد لیا جائے؟ بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ اس سے حضرت پیغمبر اسلام کے بیانات و ارشادات کی طرف رجوع کرنا بھی مراد نہیں لیا جاسکتا کیونکہ فرمودات نبویؐ یا تو اس معنی سے مطابقت کے حامل ہوں گے جو ظاہر الکلام سے سمجھا جاتا ہے یا اس سے مطابقت نہ رکھتے ہوں گے، پہلی صورت میں ان کی طرف رجوع کرنا اس لئے ناگزیر نہیں کہ خود ظاہر الکلام اور الفاظ آیات... خواہ تدریجاً اور بحث و غور و فکر کرنے کے بعد ہی کیوں نہ ہو... اس پر دلالت کرتے ہیں، اور دوسری صورت میں آیت کا عمومی اعلان اور چیلنج بے معنی ہو جاتا ہے اور اس طرح کے اظہار کا مقصد ہی باقی نہیں رہتا۔ البتہ جہاں تک احکام الہی کی تفصیل اور جزئیات کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں آنحضرتؐ کے ارشادات عالیہ کی طرف رجوع کرنا ناگزیر ہے اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں جیسا کہ خود قرآن مجید نے ان کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا ہے چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہ حشر، آیت : ۷

○ ” وَمَا أَسْأَلُكَ الرَّسُولُ فَخُذْهُ وَمَا نَهَيْكَ عَنْهُ فَأَنْتَهُوَ ”

(جو کچھ رسول تمہیں دیں اسے لے لو اور جس چیز سے تمہیں منع کریں اس سے رک جاؤ)

اس آیت مبارکہ میں آنحضرتؐ کے فرمودات پر عمل کرنے کا صریح حکم موجود ہے... تو اس سے مراد یہ ہے کہ احکامات خداوندی کی تفصیلات و جزئیات کے بارے میں آنحضرتؐ کا فرمان حرف آخر ہے اور اس کا اتباع ضروری ہے... اس مطلب پر مبنی دیگر آیات بھی موجود ہیں جن میں ارشاد نبویؐ کی پیروی کرنے اور آپؐ کے بیان کردہ احکام پر عمل کرنے کا حکم مذکور ہے۔ احکام کے علاوہ سابقہ امتوں کی داستانوں اور قیامت سے مربوط معارف و مسائل کی بابت بھی یہی قرآنی دستور ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان امور میں آنحضرتؐ کا مقام و منصب تعلیم الکتاب ہی ہے، اور تعلیم سے مراد یہ ہے کہ قابل و ماہر معلم، معلم کے ذہن کو ان مطالب تک رسائی کی رہنمائی کرے جن کا فہم و ادراک دشوار ہو اور معلم آسانی سے ان کو حاصل نہ کر سکتا ہو نہ یہ کہ ان کا سمجھنا تعلیم کے بغیر محال و ناممکن ہو کیونکہ تعلیم دینا مطالب تک رسائی کے آسان طریقہ سے آشنا کرنے اور معلم کے ذہن کو مقاصد و مفاہیم سے قریب تر کر دینے کا دوسرا نام ہے۔ تعلیم دینے سے مراد ہرگز یہ نہیں کہ مطالب تک رسائی کا نیا راستہ بنائے یا نیا مقصد و مفہوم ایجاد کرے، معلم کوشش کرتا ہے کہ علمی مطالب کو اس طرح مرتب و منظم کرے کہ معلم کا ذہن نہایت آسانی کے ساتھ انہیں سمجھ لے اور ان سے فکری قرب و مانوسیت حاصل کر لے تاکہ اسے ان کے فہم و ادراک میں ان کے مرتب و منظم کرنے کی تکلیف و زحمت نہ اٹھانی پڑے کہ جس سے اس کی زندگی کے قیمتی اوقات ضائع ہوں اور اس کی فکری توانائیاں رائیگاں جائیں، یا یہ کہ وہ فہم المعانی میں کسی غلطی کا مرتکب ہو جائے اور اصل مقاصد و مفاہیم کے علاوہ کچھ اور ہی سمجھنے لگے۔ یہ وہ مطلب ہے جس کا ثبوت متعدد قرآنی آیات میں پایا جاتا ہے مثلاً:



سورہ نحل، آیت: ۲۴

○ ” وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ “

(اور ہم نے آپ کی طرف ذکر (قرآن) نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کو واضح کر کے بتائیں کہ ان کے لئے کیا نازل کیا گیا ہے)

سورہ جحد، آیت: ۲

○ ” وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ “

(اور وہ انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے)

بنا برائیں حضرت پیغمبر اسلامؐ لوگوں کو احکام خداوندی کی تعلیم دینے والے اور انہیں واضح طور پر اس معنی و مفہوم سے آگاہی دلانے والے ہیں جس پر خود قرآن دلالت کرتا ہے اور خداوند عالم جسے اپنے کلام کے ذریعے بیان کرنا چاہتا ہے۔ لہذا ان معانی و مفہیم کا ادراک بالآخر لوگوں کے لئے ممکن ہے کیونکہ آنحضرتؐ انہیں ان معانی و مفہیم سے آگاہی دلاتے ہیں، ایسا نہیں کہ آنحضرتؐ انہیں ان معانی سے آگاہی دلاتے ہیں جن تک رسائی لوگوں کے لئے ممکن نہیں اور لوگ کلام الہی کے سمجھنے سے قاصر ہیں کیونکہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں اور یہ بات قرآنی آیات کی تفسیرات کے منافی ہے اور کسی طرح سے ظاہر الکلام سے مطابقت نہیں رکھتی مثلاً ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہ حم سجدہ، آیت: ۳

○ ” كِتَابٌ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ “

(وہ کتاب کہ جس کی آیات کھول کھول کر نازل کی گئی ہیں، عربی زبان میں نازل ہونے والا قرآن ہے تاکہ لوگ آگاہ ہوں)

سورہ نحل، آیت: ۱۰۳

○ ” وَهَذِهِ السَّانُ عَرَبِيٌّ مُبِينٌ “

(اور یہ واضح عربی زبان ہے)

لہذا یہ کہنا کہ لوگ اس کے فہم و ادراک سے قاصر و عاجز ہیں درست نہیں۔

اس کے علاوہ متعدد روایات ایسی موجود ہیں جن میں حضرت پیغمبر اسلامؐ نے قرآن سے تمسک اختیار کرنے اور اس سے معارف الہیہ حاصل کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ اور وہ روایات تو اتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔ اور ان روایات میں آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو روایات آنجنابؐ کے حوالہ سے لوگوں تک پہنچیں تو وہ ان روایات کو قرآن کے خاطر میں

پرکھیں اور قرآنی آیات کی بناء پر ان کی صحت و عدم صحت کا تعین کریں، یہ بات اسی صورت میں درست ہو سکتی ہے جب آنحضرتؐ سے منقول تمام روایات کی بابت قرآن سے استفادہ اور رہنمائی حاصل کرنا ممکن ہو، لیکن اگر قرآن سے استفادہ کرنا آنحضرتؐ کے بیانات پر موقوف ہو..... اس کے سوا قرآن فہمی ممکن ہی نہ ہو..... اور آنحضرتؐ کے بیانات کا سمجھنا قرآن پر موقوف ہو تو یہ ایک محال..... وغیر معقول..... بات ہو جائے گی کہ جسے علمی اصطلاح میں ”دور“ (دال پرزیر کے ساتھ) کہتے ہیں..... اس سے مراد یہ ہے کہ مثلاً الف کا وجود، ب پر اور با کا وجود، الف پر موقوف ہو، یہ عقلی طور پر محال و ناممکن ہے..... ”دور“ کا بطلان و عدم درستی ظاہر و واضح ہے۔

اس کے علاوہ یہ کہ جو احادیث صحابہ کرام کے حوالہ سے منقول ہیں..... ان کے سلسلہ رسد سے قطع نظر..... ان میں صحابہ کرام ہی کے بیانات ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ ان میں سے کسی ایک صحابی سے منقول روایات و احادیث میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے چنانچہ یہ مطلب ہر اس حدیث شناس دانشور پر واضح ہے جو صحابہ کرام کی بیان کردہ اور ان سے منقول روایات سے آگاہی رکھتا ہے اور ان کا تتبع اور ان میں تفکر و تدبر کرتا ہے۔

اور یہ بات بھی درست نہیں کہ صحابہ کرام سے منقول ان روایات میں سے کسی ایک کا انتخاب و تعین ضروری ہے جو کسی آیت کی تفسیر میں مختلف بیانات پر مشتمل ہیں یعنی اگرچہ روایات کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود ان میں سے کسی ایک کا انتخاب ناگزیر ہے تاکہ اجماع ٹوٹنے نہ پائے اور صحابہ کرام کی جماعت سے باہر نہ نکلیں..... اس بات کی نادرستی اس طرح ہے کہ..... وہ خود اس راہ پر نہیں چلے اور انہوں نے اس طریقہ و روش کو نہیں اپنایا اور نہ ہی اس طرح کے راہ حل کو اختیار کرنا ضروری سمجھا بلکہ انہوں نے اپنے درمیان پائے جانے والے اختلاف کی پرواہ ہی نہیں کی..... اور ہر ایک نے دوسرے کے بیان کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اظہارِ سخن کیا..... تو ان کے علاوہ دوسروں پر یہ بات کیونکر ضروری قرار پا گئی ہے کہ وہ صحابہ کرام کے بیانات کو حرف آخر قرار دیں اور اجماع کا تحفظ کرتے ہوئے ان کی ہر بات کو حجت قرار دیں اور ان میں سے کسی ایک کے قول و نظریہ کی مخالفت کو حرام سمجھیں جبکہ یہ کام یعنی کسی ایک کے قول و نظریہ کی مخالفت کرنا خود ان کے لئے جائز ہو۔

صدر اسلام کے مفسرین کرام صحابہ و تابعین کے اقوال اور ان سے منقول بیانات ہی پر اکتفاء و انحصار کرنا اور آیات قرآنیہ کے معانی سمجھنے کے لئے صرف انہی کے بیان کردہ مطالب کا سہارا لینا علمی ترقی کے سفر کو متوقف کر دینے کا سبب بنے گا اور نتیجتاً بحث و تحقیق اور تفکر و تدبر کی راہیں بند ہو جائیں گی جیسا کہ ہم خود اس امر کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ صدر اسلام کے علماء و دانشوروں کے اقوال اور قرون اولیٰ میں لکھی جانے والی کتب تفسیر میں نہایت معمولی اور علمی و تحقیقی باریک بینی سے خالی و عاری معانی و مطالب کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ تو اس صورت میں ان قرآنی معارف کی باریکیوں اور نہایت عمیق حقائق کا

پر کہیں اور قرآنی آیات کی بناء پر ان کی صحت و عدم صحت کا تعین کریں، یہ بات اسی صورت میں درست ہو سکتی ہے جب آنحضرتؐ سے منقول تمام روایات کی بابت قرآن سے استفادہ اور رہنمائی حاصل کرنا ممکن ہو، لیکن اگر قرآن سے استفادہ کرنا آنحضرتؐ کے بیانات پر موقوف ہو..... اس کے سوا قرآن فہمی ممکن ہی نہ ہو..... اور آنحضرتؐ کے بیانات کا سمجھنا قرآن پر موقوف ہو تو یہ ایک محال..... وغیر معقول..... بات ہو جائے گی کہ جسے علمی اصطلاح میں ”دور“ (دال پر زبر کے ساتھ) کہتے ہیں..... اس سے مراد یہ ہے کہ مثلاً الف کا وجود، ب پر اور با کا وجود، الف پر موقوف ہو، یہ عقلی طور پر محال و ناممکن ہے..... ”دور“ کا بطلان و عدم درستی ظاہر و واضح ہے۔

اس کے علاوہ یہ کہ جو احادیث صحابہ کرام کے حوالہ سے منقول ہیں..... ان کے سلسلہ سند سے قطع نظر..... ان میں صحابہ کرام ہی کے بیانات ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ ان میں سے کسی ایک صحابی سے منقول روایات و احادیث میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے چنانچہ یہ مطلب ہر اس حدیث شناس دانشور پر واضح ہے جو صحابہ کرام کی بیان کردہ اور ان سے منقول روایات سے آگاہی رکھتا ہے اور ان کا تتبع اور ان میں تفکر و تدبر کرتا ہے۔

اور یہ بات بھی درست نہیں کہ صحابہ کرام سے منقول ان روایات میں سے کسی ایک کا انتخاب و تعین ضروری ہے جو کسی آیت کی تفسیر میں مختلف بیانات پر مشتمل ہیں یعنی اگرچہ روایات کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود ان میں سے کسی ایک کا انتخاب ناگزیر ہے تاکہ اجماع ٹوٹنے نہ پائے اور صحابہ کرام کی جماعت سے باہر نہ نکلیں۔..... اس بات کی نادرستی اس طرح ہے کہ..... وہ خود اس راہ پر نہیں چلے اور انہوں نے اس طریقہ و روش کو نہیں اپنایا اور نہ ہی اس طرح کے راہ حل کو اختیار کرنا ضروری سمجھا بلکہ انہوں نے اپنے درمیان پائے جانے والے اختلاف کی پرواہ ہی نہیں کی..... اور ہر ایک نے دوسرے کے بیان کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اظہارِ سخن کیا..... تو ان کے علاوہ دوسروں پر یہ بات کیونکر ضروری قرار پائی ہے کہ وہ صحابہ کرام کے بیانات کو حرفِ آخر قرار دیں اور اجماع کا تحفظ کرتے ہوئے ان کی ہر بات کو حجت قرار دیں اور ان میں سے کسی ایک کے قول و نظریہ کی مخالفت کو حرام سمجھیں جبکہ یہ کام یعنی کسی ایک کے قول و نظریہ کی مخالفت کرنا خود ان کے لئے جائز ہو۔

صدر اسلام کے مفسرین کرام صحابہ و تابعین کے اقوال اور ان سے منقول بیانات ہی پر اکتفاء و انحصار کرنا اور آیات قرآنیہ کے معانی سمجھنے کے لئے صرف انہی کے بیان کردہ مطالب کا سہارا لینا علمی ترقی کے سفر کو متوقف کر دینے کا سبب بنے گا اور نتیجتاً بحث و تحقیق اور تفکر و تدبر کی راہیں بند ہو جائیں گی جیسا کہ ہم خود اس امر کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ صدر اسلام کے علماء و دانشوروں کے اقوال اور قرونِ اولیٰ میں لکھی جانے والی کتب تفسیر میں نہایت معمولی اور علمی و تحقیقی باریک بینی سے خالی و عاری معانی و مطالب کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ تو اس صورت میں ان قرآنی معارف کی باریکیوں اور نہایت عمیق حقائق کا

مقام کہاں ہوگا جن کا تذکرہ درج ذیل آیت مبارکہ میں ہوا ہے؟

سورہ نحل، آیت: ۸۹

○ ” وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّحُكْمٍ شَيْءٍ ”

(اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے جو ہر چیز کے واضح بیان پر مشتمل ہے)

اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ صحابہ کرام و تابعین حضرات کا فہم القرآن و معانی آیات سے نا آگاہ ہونا کیونکر ممکن ہے جبکہ وہ نہایت علمی و فکری بلندی پر فائز تھے۔ اور عربی زبان میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ تو اس کا جواب خود انہی کے بیانات میں پائے جانے والے اختلاف اور آیات مبارکہ کے معانی کے تعین میں ان سے منقول متناقض آراء ہی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ انہوں نے تفسیر الآیات میں کس قدر اختلاف رائے کیا۔ اور ان کے اقوال و بیانات اور آراء میں اختلاف و تناقض کا پایا جانا اس عمومی قاعدہ و کلیہ کا ایک مصداق ہے کہ اختلاف و تناقض اسی صورت میں قابل تصور ہے جب حق و واقع الامر مخفی و پوشیدہ ہو اور اصل حقیقت معلوم نہ ہو بلکہ حق و غیر حق کی راہیں واضح نہ ہوں اور ان میں خلط ملط پیدا ہو جائے۔

بنا بر ایک حق تو یہ ہے کہ فہم القرآن کی راہیں ہرگز مسدود نہیں بلکہ بیان الہی اور ذکر حکیم خود ہی اپنی حقیقت اور حقیقی معانی و مفہیم سے آگاہی دلانے میں بہترین رہنما ہے (اور وہ خود فہم الآیات کا سیدھا راستہ ہے) یعنی وہ اپنے مقاصد کی وضاحت کے لئے کسی دوسرے راستہ و سبب کا محتاج نہیں اور یہ تصور کیونکر ممکن ہے کہ جس کتاب کی توصیف میں خداوند عالم اسے ”ہادی“ و ”رہنما“، ”نور“ اور ہر چیز کا واضح بیان قرار دے وہ اپنے علاوہ کسی دوسرے ہادی و رہنما کا محتاج ہو اور اپنے علاوہ کسی دوسرے کے نور سے روشنی طلب کرے اور اپنے علاوہ کسی دوسرے سبب سے اپنے مقاصد کی وضاحت کرے؟

## ظاہر القرآن اور ظاہر البیان کی وضاحت

مذکورہ بالا مطالب کے تناظر میں ممکن ہے آپ سوال کریں کہ حضرت پیغمبر اسلام سے صحیح السند روایت منقول ہے آپ نے اپنے ایک آخری خطاب میں ارشاد فرمایا:

” انی تارک فیکم الثقلین، الثقل الاکبر والثقل الاصغر، فاما الاکبر فکتاب ربی، واما

الاصغر فعترتی اهل بیتی، فاحفظونی فیہما فلن تضلوا ما تمسکتکم بہما“

(میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں۔ ایک بڑی اور ایک چھوٹی، جو بڑی ہے وہ میرے پروردگار کی کتاب

ہے اور جو چھوٹی ہے وہ میری عمرت اہل بیت ہے، تم ان دونوں میں مجھے یاد رکھو (ان کی بابت میری نصیحتوں و تاکیدات کو ملحوظ خاطر و مد نظر قرار دو)۔ جب تک تم ان دونوں سے تمسک رکھو گے (ان سے وابستہ رہو گے) تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔

اس حدیث کو فریقین شیعہ و سنی محدثین نے تو اتر کے ساتھ متعدد و کثیر صحابہ کرام کے حوالے سے آنحضرت کا ارشاد گرامی ذکر کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: کتاب وسائل الشیعہ جلد ۱۸ ص ۱۹ حدیث ۹۔ صحیح مسلم مع شرح نوی ج ۱۵ ص ۱۸۰ باب فضائل علی ابن ابی طالب)۔ جن صحابہ کرام نے یہ روایت بیان کی ان کی تعداد علمائے علم حدیث نے پینتیس (۳۵) تک لکھی ہے۔ بعض اسناد میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں: ”ولن یفتقر قاحتی یردا علی الحوض“ (اور وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر آ جائیں گے)۔ اس حدیث میں حضرات اہل بیت علیہم السلام کے ارشادات کے حجت و حرف آخر ہونے کا ثبوت ملتا ہے لہذا تفسیر القرآن کی بابت جو کچھ ان کی طرف سے منقول ہو اس کا اتباع واجب ہے اور معانی آیات میں صرف انہی حضرات کے فرمودات پر اقتصار و انحصار ضروری ہے ورنہ ان کے اور قرآن کے درمیان جدائی تسلیم کرنی پڑے گی جبکہ صریح حدیث نبوی میں ان کے درمیان جدائی نہ ہونے کا ذکر ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ سطور بالا میں ہم نے اتباع رسول کا جو معنی ذکر کیا ہے وہ بعینہ یہاں بھی پایا جاتا ہے اور اہل بیت کے اتباع کا معنی بھی وہی ہے۔ اس حدیث میں ہرگز یہ مقصود نہیں کہ ظاہر القرآن کے حجت ہونے کی نفی کی جائے اور اہل بیت کے ظاہر البیان کے سوا کسی چیز کو حجت نہ سمجھا جائے (یعنی تفسیر القرآن میں ان حضرات کے ظاہر البیان ہی کو حرف آخر قرار دے کر دوسری ہر چیز کی نفی کی جائے) اور یہ کیونکر ممکن ہے جبکہ حضرت پیغمبر اسلام نے ارشاد فرمایا ہے: ”لن یفتقر قاحتی“ (وہ ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہوں گے) آپ نے اپنے فرمان میں دونوں کو حجت قرار دیا ہے، اور وہ اس طرح کہ قرآن اپنے معانی پر دلالت کرتا ہے اور معارف الہیہ کو آشکار کرتا ہے اور اہل بیت قرآنی دلالت کا راستہ بتاتے ہیں اور لوگوں کو اس کے اغراض و مقاصد کی رہنمائی کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جس طرح پیغمبر اسلام سے منقول ہے کہ آپ نے لوگوں کو قرآن سے تمسک اختیار کرنے اور اس سے معارف و حقائق حاصل کرنے کے لئے اس میں تفکر و تدبر کرنے کی دعوت دی اور احادیث کی صحت کا معیار ان کا قرآن سے مطابقت رکھنا قرار دیا، اسی طرح حضرات اہل بیت علیہم السلام سے بھی روایات منقول ہیں جن میں انہوں نے آنحضرت کے بتائے ہوئے رہنما اصول کو اختیار کرنے کی دعوت دی اور لوگوں کو معانی قرآن کے فہم و ادراک کے لئے خود قرآن سے استفادہ کرنے اور جو روایات ان حضرات سے منقول ہوں ان کی صحت قرآنی آیات کے تناظر میں طے کرنے کی دعوت و حکم دیا گیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان حضرات سے تفسیر القرآن کی بابت جو روایات منقول ہیں ان میں بہت زیادہ روایات ایسی ہیں جن میں ایک آیت کے ذریعے دوسری آیت پر استدلال کیا گیا ہے اور ایک معنی سے دوسرے معنی

پر استشہاد ہوا ہے اور ایسا کرنا تبھی ممکن ہے جب معنی، مخاطب کے لئے قابل فہم ہو اور سننے والے کا ذہن اپنے متعین راستہ سے ہوتا ہوا اس سے انس و قرب پاسکتا ہو۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعض روایات کہ جو آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے منقول ہیں ان میں مذکورہ بالا مطلب کو صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جیسا کہ برقی نے اپنی کتاب ”محاسن“ میں اپنے اسناد سے ابو عبیدہ جحرانی کے حوالہ سے امام ابو جعفر علیہ السلام کا ارشاد گرامی ذکر کیا ہے جس میں امامؑ نے فرمایا:

”فمن زعم ان كتاب الله مبهم فقد هلك و اهلك“

(جس نے گمان کیا کہ اللہ کی کتاب میں ابہام پایا جاتا ہے وہ خود بھی تباہ ہوا اور اس نے دوسروں کو تباہ کیا)

(الحجاسن، ص ۲۷۰ حدیث ۳۶۰)

اسی روایت سے قریب المعنی ایک اور روایت اسی کتاب ”محاسن“ میں اور کتاب ”احتجاج“ (طبرسی) میں انہی حضرت سے منقول ہے جس میں آپؑ نے ارشاد فرمایا: ”اذا حدثتکم بشیء فاستلونی عنہ من کتاب اللہ“ (جب میں تم سے کچھ بیان کروں تو تم مجھ سے اس کی بابت کتاب اللہ کا حوالہ پوچھ لو)۔ (الاحتجاج، جلد ۲ ص ۵۵)

مذکورہ بالا بیان سے احادیث و روایات کے درمیان دکھائی دینے والے ظاہری اختلاف کا جامع حل معلوم ہو جاتا ہے اور وہ اس طرح کہ بعض روایات اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ قرآنی معارف کا فہم و ادراک خود قرآن ہی کے ذریعے ممکن ہے اور وہ معارف عقول سے پوشیدہ نہیں۔ اور بعض روایات اس سے مختلف مطلب پر دلالت کرتی ہیں مثلاً تفسیر العیاشی (جلد ۱ ص ۲۱۱) میں جابر کے حوالہ سے منقول ہے انہوں نے کہا کہ امام ابو عبد اللہ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ”ان للقرآن بطناً وللبطن ظہراً“ قرآن کا ایک باطن ہے اور باطن کا ایک ظاہر ہے۔ پھر امامؑ نے ارشاد فرمایا: (یا جابر! ولیس شیء ابعد من عقول الرجال منه، ان الآیة تنزل اولها فی شیء و اوسطها فی شیء و اخرها فی شیء، وهو کلام متصل ینصرف علی وجوه) اے جابر! قرآن سے زیادہ کوئی چیز عقول سے دور نہیں کیونکہ ایسی آیات بھی موجود ہیں جن کی ابتداء کسی چیز کے بارے میں ہے اور جن کا وسط و درمیانی حصہ کسی دوسری چیز کے بارے میں ہے اور جن کا آخر ان دو کے علاوہ کسی تیسری چیز کے بارے میں ہے، اگرچہ وہ متصل اور جزا ہوا کلام ہے لیکن کئی معانی پر محمول کیا جا سکتا ہے.... اس سے کئی معانی مراد لئے جاسکتے ہیں ،

یہ مطلب متعدد روایات میں ذکر کیا گیا ہے اور اس روایت میں جملہ ”ولیس شیء ابعد من عقول الرجال منه“ (کوئی چیز قرآن سے زیادہ عقول سے دور نہیں) حضرت پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث میں بھی ذکر ہوا ہے اور حضرت

علی علیہ السلام سے منقول ہے آپ نے ارشاد فرمایا: (ان القرآن حمال ذو وجوہ)۔ قرآن کئی معانی کا حامل ہے۔ (نسخ البلاغہ، وصیت ۷۷)

بہر حال تفسیر قرآن کی بابت جس طریقہ و روش کے اپنانے کی تاکید کی گئی ہے وہ یہ کہ قرآن کی تفسیر خود اس کے طریقہ و روش کے مطابق کی جائے اور جس طریقہ و روش کے اپنانے سے منع کیا گیا ہے وہ یہ کہ اس کی تفسیر اس کی اصل راہ کے علاوہ کے ذریعے کی جائے۔ اور یہ امر واضح و روشن ہے کہ تفسیر کی بابت متعین طریقہ و روش یہ ہے کہ قرآن ہی سے قرآن فہمی کی مدد لی جائے اور ایک آیت کی تفسیر دوسری آیت سے کی جائے، اور ایسا کرنا اسی صورت میں ممکن ہے جب حضرت پیغمبر اسلامؐ اور اہل بیت علیہم السلام سے منقول احادیث و روایات کی جمع آوری، ان میں غور و فکر اور بحث و تحقیق کی بابت تمام تر کاوشیں بروئے کار لائی جائیں اور اس کے نتیجے میں جو علمی، فکری، تحقیقی و تفسیری ذوق حاصل ہو اس کی بناء پر تفسیر کی وادی میں قدم رکھا جائے، (اور خدا ہدایت کرنے والا ہے)

## آیات ۱۰ تا ۱۸

- إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِي عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ سَيِّئًا  
وَأُولَئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ ۝
- كَذَابٍ أَلْفِرْعَوْنَ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَآخَذَهُمُ اللَّهُ  
بِذُنُوبِهِمْ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝
- قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا سَتُغْلَبُونَ وَتُحْشَرُونَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ ۖ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝
- قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِتْنَتِ الَّذِينَ اتَّقَوْا فَمَثَلٌ تَقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ  
يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأَى الْعَيْنُ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَن يَشَاءُ ۖ إِنَّ فِي ذَلِكَ  
لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ ۝
- زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ  
الذَّهَبِ وَالْفِصَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۗ ذَلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ  
الدُّنْيَا ۗ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حَسَنُ الْمَآبِ ۝
- قُلْ أُوْنِيْبِكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذَلِكُمْ ۗ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا  
الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَأَرْوَاحٌ مُّطَهَّرَةٌ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ۝



- الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّنَا مَنَافِقٌ غَفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَتَنَاوَعَدَابِ النَّارِ ۝
- الصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ وَالْقَنِتَّةِينَ وَالْمُتَّقِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْإِسْحَارِ ۝
- شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ ۗ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

## ترجمہ

- یہ بات یقینی ہے کہ کفر اختیار کرنے والوں کو ان کے اموال و اولاد خدا سے ہرگز بے نیاز نہیں کر سکتے اور وہ لوگ آگ (آتشِ جہنم) کا ایندھن ہی ہیں۔ ⑩
- ان کا طرزِ عمل فرعونوں اور ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں جیسا ہے کہ جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی، پھر اللہ نے ان کے گناہوں کے نتیجے میں انہیں گرفت میں لے لیا اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ ⑪
- ان کفر اختیار کرنے والوں سے کہہ دیجئے کہ بہت جلد تم پر غلبہ پالیا جائے گا اور تمہیں دوزخ کی طرف لے جایا جائے گا اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔ ⑫
- جو دو گروہ میدانِ جنگ میں ایک دوسرے کے مد مقابل آئے ان کے حالات میں تمہارے لئے (حق و باطل کی پہچان و تمیز کی) واضح نشانی موجود تھی، ان میں سے ایک گروہ خدا کی راہ میں نبرد آزما تھا اور دوسرا کافر تھا، وہ (کافر فوجی) ان (مجاہدینِ اسلام) کو اپنے سے دگنا دیکھ (اور سمجھ) رہے تھے (یہی چیز کافروں کی شکست کا سبب بنی) درحقیقت خدا جس کے بارے میں چاہتا ہے اسے اپنی مدد و نصرت کے لئے تائید و حمایت عطا کرتا ہے، اس ماجرے میں بصیرت و سوچ بوجھ رکھنے والوں کے لئے درسِ عبرت ہے۔ ⑬

- لوگوں کے لئے عورتوں، بیٹوں، سونا و چاندی کے خزانوں و خزینوں، نشاندہ گھوڑوں، مویشیوں اور کھیتوں جیسی پرکشش چیزوں سے محبت کرنے کو زینت بنا دیا گیا ہے جبکہ یہ سب کچھ دنیاوی زندگی کا سا زوسامان ہے جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ نیک انجام ہے۔ (۱۳)
- ان سے کہیے کہ میں تمہیں ان سب چیزوں سے بہتر سے آگاہ کروں! (اور وہ یہ کہ) تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرنے والوں کے لئے ان کے پروردگار کے پاس وہ جنتیں ہیں جن کے نیچے سے نہریں رواں دواں ہیں۔ انہیں ان (باغبائے بہشت) میں ہمیشہ کی زندگی (ابدی حیات) اور پاک و مطہر بیویاں اور اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل ہوگی، اور خدا بندوں سے بخوبی آگاہ ہے۔ (۱۵)
- یہی لوگ کہتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے، تو ہمارے گناہ معاف کر دے اور ہمیں دوزخ کی آگ کے عذاب سے محفوظ فرما۔ (۱۶)
- یہی لوگ صبر کرنے والے، سچ بولنے والے، عبادتیں کرنے والے، انفاق (خدا کی رضا کے لئے) خرچ کرنے والے اور رات کی آخری گھڑیوں میں مغفرت طلب کرنے والے ہیں۔ (۱۷)
- خدا خود شاہد و گواہ ہے کہ اس کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں، اور فرشتے و صاحبانِ علم یہی گواہی دیتے ہیں کہ وہی یکتا برحق معبود ہے، وہ عدل پر قائم ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ غلبہ و طاقت والا، دانا ہے۔ (۱۸)

## تفسیر و بیان

یہ بات پہلے ذکر ہو چکی ہے کہ جس دور میں یہ سورہ مبارکہ نازل ہو رہا تھا اس میں امت مسلمہ داخلی و خارجی دونوں اطراف سے ایک خاص بحران کا شکار تھی داخلی طور پر اس طرح کہ ان کی صفوں میں منافقین رخنہ کر چکے تھے اور منافقوں و دشمنان اسلام کی مشترکہ سازشوں، فتنہ پردازیوں اور دعوتِ اسلامیہ کو بے اثر کرنے کی کاوشوں کے نتیجے میں کچھ اہل اسلام اپنے عقیدہ میں تزلزل کا شکار ہونے لگے تھے، اور خارجی طور پر اس طرح کہ پوری دنیا میں ان کے خلاف بغاوت و دشمنی کا ایک طوفان اٹھا ہوا تھا، مشرکین اور یہود و نصاریٰ اسلام کے آفاقی پیغام کاراستہ روکنے کے لئے کھڑے ہو گئے تھے، ان سب کی تمام تر توانائیاں لوگوں کے دلوں میں ایمانی حرارت کو ختم کرنے اور دین کی روشن شمع کو بجھا دینے پر صرف ہو رہی تھیں چنانچہ اس مقصد کے لئے وہ ہر ممکن ذریعہ اختیار کر رہے تھے اور زبان و ہاتھ دونوں طاقتوں سے کام لے رہے تھے۔

اور اس سورہ مبارکہ میں مسلمانوں کو وحدت و اتحاد اور یکجہتی، صبر اور ثابت قدمی کی دعوت دی گئی ہے تاکہ ان کے امور کی اصلاح یقینی ہو جائے اور ان کی صفوں میں جو انتشار پھیل چکا ہے اور بحرانی کیفیت پیدا ہو چکی ہے وہ ختم ہو جائے، اس کے ساتھ ساتھ بیرونی سازشیں دم توڑ لیں اور دشمنوں کی طرف سے ہونے والی ہر کوشش ناکامی سے دوچار ہو۔

سابقہ آیات مبارکہ ”هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ.....“ تا ”إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْعِثَادَ“ (یعنی آیات ۷، ۸، ۹) میں منافقین اور ان لوگوں کا اشاراتی تذکرہ کیا گیا تھا جن کے دل کجی و انحراف کا شکار ہوئے، اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ جس قدر دینی معارف سے آگاہی حاصل کر چکے ہیں اس پر ثابت قدم رہیں اور دینی حقائق و احکام اور علوم و معارف میں سے جو کچھ ابھی تک ان پر واضح و آشکار نہیں ہوا اور اس کی کنہ حقیقت سے آگاہی حاصل نہیں ہوئی اس کی بابت ایمان لا کر اس پر سر تسلیم خم کئے رہیں اور اس بات سے ہرگز غافل نہ ہوں کہ دینی امور میں خرابی پیدا ہونے اور اہل اسلام کے درمیان فتنوں کی آگ کے شعلہ در ہونے اور ان کے نظامِ سعادت کے درہم برہم ہو جانے کا اصل سبب مشابہات کی پیروی کرنا اور آیات کی تاویل میں کرنا ہے کہ جس کے نتیجے میں دین ہی نہیں ضلالت و گمراہی اور تباہی کے گہرے کھڑ میں ڈال دے گا اور ان کا اجتماع افتراق میں اور اتحاد و یکجہتی تفرقہ میں بدل جائے گی۔

اس کے بعد زیر نظر آیات مبارکہ میں کفار و مشرکین کی حالت بیان کی گئی ہے اور ان کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ بہت جلد شکست سے دوچار ہوں گے اور وہ خدا کو ہرگز بے بس نہیں کر سکتے اور نہ ہی اپنی سرکشی میں کامیاب ہوں گے، اس کے ساتھ ساتھ ان کے گمراہ ہونے اور حق کی بابت غیر یقینی کیفیت کا شکار ہونے کی اصل وجہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ارشاد ہوا کہ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ ان کے لئے دنیاوی لذتوں کو زینت بنا دیا گیا جس سے انہوں نے گمان کر لیا کہ انہیں جو مال و اولاد عطا ہوئی ہے وہ انہیں خداوند عالم سے کلی طور پر بے نیاز کر دینے والی ہے، جبکہ ان کا اس طرح گمان و خیال کرنا غلط و نادرست ہے کیونکہ خداوند عالم غالب علی الاطلاق ہے اور اپنے امر پر حاوی ہے، اگر مال و اولاد اور ان جیسی چیزیں خدا سے بے نیاز کرنے والی ہوتیں تو فرعونوں اور ان سے پہلے گزری ہوئی ظالم و ستمگروں کو خدا سے بے نیاز کر دیتیں کہ جو بہت طاقتور و قوی تھیں لیکن یہ سب کچھ انہیں خدا سے بے نیاز نہ کر سکا اور خدا نے انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے گرفت میں لے لیا، اسی طرح یہ لوگ (کفار و مشرکین) بھی بہت جلد مغلوب ہوں گے اور انہیں گرفت میں لے لیا جائے گا، لہذا اہل ایمان پر واجب و لازم ہے کہ وہ دنیاوی لذتوں میں تقوائے الہی اختیار کریں تاکہ اس طرح دنیا میں سعادت و خوش بختی، آخرت میں اجر و ثواب اور اپنے پروردگار کی رضا و خوشنودی انہیں نصیب ہو۔

بنا بریں زیر نظر آیات مبارکہ جیسا کہ ان کے مطالب و مضامین سے ظاہر ہوتا ہے، کفار کی حالت و انجام کار کو بیان کرتی ہیں، جبکہ ان کے بعد والی آیات اہل کتاب یہود و نصاریٰ کے حال و اعمال کے تذکرے پر مشتمل ہیں کہ بہت جلد اس کی تفصیلاً ذکر ہوگی۔

## کافروں کی بے بسی و بد انجامی کا تذکرہ

○ ”إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِي عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا“  
(جن لوگوں نے کفر اختیار کیا انہیں ان کے اموال و اولاد خدا سے ہرگز بے نیاز نہیں کر سکتے)

اس آیت مبارکہ میں لفظ ”تُغْنِي عَنْهُمْ“ ذکر ہوا ہے۔ جو باب افعال ”اغناء“ سے ہے، اور جب کہا جاتا ہے: ”اغْنِي عَنْهُ مَالُهُ مِنْ فُلَانٍ“ اسے اس کے مال نے فلاں شخص سے بے نیاز کر دیا تو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اس کے مال نے اسے بے نیازی عطا کر دی اور اس کی ضرورت پوری ہو گئی لہذا اب اسے اس کی احتیاج نہیں رہی۔  
حقیقت یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں آنے کے ابتدائی دنوں میں اور اپنے بارے میں شعور و ادراک کی نعمت سے

بہرہ مند ہونے کے ایام ہی میں اپنے آپ کو دوسروں کا محتاج اور اپنے علاوہ دوسروں سے مدد لینے میں ناچار پاتا ہے، اور یہ انسان کی سب سے پہلی فطری آگاہی اور اس حقیقت کی معرفت کا پہلا زینہ ہے کہ وہ اپنے وجود میں آنے کے لئے ایک مدبر صالح و خالق کا محتاج ہے یعنی وہ ایسی ہستی کا محتاج ہے جس نے اسے وجود عطا فرمایا اور اس کے امور کی تدبیر کرنے والا ہے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ جب وہ زندگی کے ارتقائی مراحل طے کرنے کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے اور اسباب و وسائل سے استفادہ کرنے اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کا احساس اس کے دامن گیر ہو جاتا ہے تو اسے اپنے مادی جسمانی کمال کی ضرورت کا احساس پیدا ہوتا ہے کہ جو غذا و اولاد وغیرہ سے عبارت ہے، اس کے بعد وہ اپنے تئیں دیگر کمالات حیوانیہ سے آگاہی حاصل کرنے لگتا ہے اور وہ کمالات عبارت میں ان چیزوں سے جنہیں اس کی خیالی قوت نے اس کے سامنے جلوہ گر کر کے مزین کیا مثلاً دنیا کی چمک دمک درگینیاں، مالداروں و دولت مندوں، عمدہ و فاخرہ لباس اور عالی شان مکان، ازدواجی زندگی کی لطیف کیفیتیں وغیرہ، اس وقت غذا کی طلب، مال و دولت کی طلب میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ اس لئے کہ وہ گمان کرنے لگتا ہے کہ زندگی کی تمام تر مشکلات کا واحد حل مال و دولت میں ہے اور وہی تمام امور کی کنجی ہے کیونکہ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے اور مال و دولت ہی کے ذریعے مشکلات پر قابو پایا جاتا ہے اور ضرورتیں پوری کی جاتی ہیں، تو وہ اپنی سعادتمند زندگی کا راز مال و اولاد میں مضمر سمجھنے لگتا ہے جبکہ وہ غذا و اولاد کو اپنی خوش بختی کا ضامن سمجھتا تھا، اس بناء پر وہ اپنی نفسانی خواہشوں کا اسیر ہو جاتا ہے اور اپنی تمام تر توجہات و توانائیاں ان کی تکمیل پر مرکوز و متمرکز کر دیتا ہے، وہ اسباب ہی کو اپنی توجہات کا مرکز بنا لیتا ہے یہاں تک کہ اس کا ایسا کرنا اس کے دل کو اسباب سے اس قدر جوڑ دیتا ہے کہ وہ انہی اسباب کی استقلالی حیثیت کا قائل ہو جاتا ہے یعنی وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ یہ اسباب ہی ہیں جو اس کی تمام تمنائوں و خواہشوں کو پورا کرنے کی کامل و مستقل صلاحیت رکھتے ہیں، ظاہر ہے کہ جب اس طرح کی سوچ پیدا ہو جائے اور آدمی ظاہری اسباب ہی کو سب کچھ سمجھنے لگے تو اس کا نتیجہ خدا فراموشی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ لہذا ایسا شخص خدا کو بھول جاتا ہے اور انہی اسباب یعنی اموال و اولاد ہی کا دامن تھامنے لگتا ہے، یقیناً اسی جہالت میں اس کی ہلاکت و تباہی کے اسباب جنم لیتے ہیں کیونکہ یہ جہالت اس کے سامنے آیات الہی پر پردہ ڈال دیتی ہے اور وہ ان کا انکار کرنے لگتا ہے۔ درحقیقت وہ غفلت کا شکار ہو چکا ہوتا ہے اور حقیقت الامر کو درک ہی نہیں کر پاتا، جبکہ واقع الامر یہ ہے کہ اس کا پروردگار وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ و جاوید اور پائندہ ہے، کوئی چیز اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتی اور کوئی شے کسی حال و صورت میں انسان کو خدا سے ہرگز مستغنی نہیں کر سکتی۔

اس بیان سے یہ نکتہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ آیہ مبارکہ میں اموال کا اولاد سے پہلے کیوں ذکر کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ مال و دولت سے دل لگی جیسا کہ آپ جان چکے ہیں کہ اس کی اصل و اساس غذا و خورد و نوش ہے وہ اولاد سے دل لگی پر بھی مقدم ہوتی ہے چنانچہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ انسان مال و دولت کے نشہ میں اسی طرح غرق و مست ہو جاتا ہے کہ اسے اولاد

سمیت کسی بھی چیز کی طرف کوئی توجہ دھیان نہیں ہوتا، اگرچہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات اولاد کی محبت، مال و دولت کی محبت پر غالب آ جاتی ہے۔

بہر حال آیت مبارکہ میں ایک خاص طرح کی اختصار گوئی سے کام لیا گیا ہے، گویا ایک غلط فہمی کو نہایت اشاراتی طور پر رد کر دیا گیا ہے لہذا آیت کو ان لفظوں کے ساتھ ملا کر پڑھیں تو مطلب واضح ہو جائے گا: ”ان السدین کفروا وکذبوا بآیاتنا وزعموا ان اموالہم واولادہم تغنیہم من اللہ وقد اخطاوا فلاغنی من اللہ سبحانہ فی وقت و لافی شیء“ (کہ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیات کو جھٹلادیا اور گمان کرنے لگے کہ ان کے اموال اور ان کی اولاد انہیں اللہ سے بے نیاز کر دیں گے جبکہ وہ ایسا سوچنے میں غلطی پر ہیں (یہ ان کی غلط سوچ ہے) کیونکہ کوئی چیز کبھی بھی انہیں اللہ سے بے نیاز نہیں کر سکتی) بعد میں آنے والی آیت مبارکہ اس مطلب کو مزید واضح کرتی ہے۔

### جہنم کا ایندھن

○ ”وَأُولَٰئِكَ هُمُوقُودُ النَّارِ“  
(اور وہی ہیں دوزخ کی آگ کا ایندھن)

لفظ ”وقود“ (واؤ پر زبر کے ساتھ) ہر اس شے کے لئے استعمال ہوتا ہے جس سے آگ جلائی و بھڑکائی جائے (ایندھن)

یہ آیت درج ذیل آیتوں جیسی ہے:

سورۃ بقرہ، آیت: ۲۴

○ ”فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ“  
(ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں)

سورۃ انبیاء، آیت: ۹۸

○ ”إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ“

(تم اور خدا کے سوا جس کی تم عبادت کرتے ہو دوزخ کا ایندھن ہے)

سورۃ بقرہ آیت ۲۴ کی تفسیر میں اس موضوع کی بابت بعض مطالب ذکر کئے جا چکے ہیں۔

## ایک ادبی نکتہ

زیر نظر آیت مبارکہ میں ادبی حوالہ سے چند اہم امور قابل توجہ ہیں:

۱۔ آیت کو جملہ اسمیہ کی صورت میں لایا گیا ہے۔

۲۔ جملہ اسمیہ کی ابتداء اسم اشارہ سے کی گئی ہے۔

۳۔ اسم اشارہ بھی وہ لایا گیا ہے جو دور کا معنی دیتا ہے (أُولَئِكَ)

۴۔ مبتداء اور خبر کے درمیان ضمیر ”ہم“ ذکر کی گئی ہے جو أُولَئِكَ (مبتداء) اور وَقُوْدُ النَّارِ (خبر)

کے درمیان فاصلہ ایجاد کرتی ہے۔ (اسے ضمیر انفصل کہتے ہیں)

۵۔ لفظ ”وَقُوْدُ“ کو اضافت کے بغیر ”وَأُولَئِكَ هُمْ وَقُوْدُ“ کی بجائے لفظ ”النَّارِ“ کی طرف اضافت

کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ (وَقُوْدُ النَّارِ)

ان سب امور کی وجہ یہ ہے کہ کلام میں حصر کا اظہار مقصود ہے کہ جس کا لازمی امر یہ ہے کہ جن کافروں نے آیات کی

تکذیب کی وہی دوزخ کے عذاب کی اصل بنیاد اور جہنم کی آگ کے شعلہ ور ہونے کا ذریعہ ہیں (اینڈھن) اور دوسرے لوگ

انہیں کی بھڑکانی ہوئی آگ میں جلیں گے۔

اس نکتہ کی تائید و تصدیق درج ذیل آیت میں بھی موجود ہے جس کی تفصیل اس کی تفسیر کے مقام میں پیش ہوگی:

سورۃ انفال، آیت: ۳۷

○ ”لِيَسْبِرَنَّ اللَّهُ الْعَنِيَّةَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْعَنِيَّةَ بَعْضَهُ عَلَى بَعْضٍ.....“

(یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ خدا ناپاک کو پاک سے الگ کر دے، اور خبیثوں کو ایک دوسرے پر قرار دے۔)

## فرعونیوں کے طرز عمل سے تمثیل

○ ”كَذَّابٍ اِلٰ فِرْعَوْنَ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ.....“

(فرعونیوں اور ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کے طرز عمل کی طرح.....)

اس آیت مبارکہ میں لفظ ”ذئاب“ استعمال ہوا ہے، اس کے معنی میں اہل لغت نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب ”ہمیشہ



کی روش اور طرزِ عمل“ ہے، اس معنی کی صحت کا ثبوت قرآن مجید میں درج ذیل آیت میں پایا جاتا ہے:

سورہ ابراہیم، آیت: ۳۳

○ ”وَسَخَّرْنَا لَكُمْ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ“

(اور اس نے تمہارے لئے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا جو مسلسل چلتے رہتے ہیں)

اسی بناء پر عادت کو بھی ”دائِب“ کہا جاتا ہے یعنی ہمیشہ کا طرزِ عمل اور جاری و ساری روش! آیت مبارکہ میں بھی یہی

معنی مراد ہے۔

ادبی حوالہ سے اس آیت کا تجزیہ و تحلیل کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جملہ ”كَذَّابٍ“ کا ایک تقدیری جملہ (تصویر و فرض کئے ہوئے پوشیدہ جملہ) سے تعلق ہے کہ سابقہ آیت ”لَنْ نُغْنِيَ عَنْهُمْ“ جس پر دلالت کرتی ہے اور جملہ ”وَكَاذِبُونَ“ یا ”يَايِتْنَا“ اس جملہ (كَذَّابٍ اِلِ فِرْعَوْنَ) کی تفسیر کرتا ہے۔ درحقیقت یہ جملہ (وَكَاذِبُونَ يَايِتْنَا) ”كَذَّابٍ.....“ کی بابت بمنزلہ ”حال“ ہے لہذا کلام کا معنی سمجھنے کے لئے عبارت کو اسی طرح فرض کرنا پڑے گا جیسا کہ پہلے بھی اس کی طرف اشارہ ہو چکا ہے: ”ان الذین کفروا وکذبوا بآیاتنا واستمروا علیہا دانبین فرعموا ان فی اموالہم واولادہم غنی لہم من اللہ کذاب آل فرعون ومن قبلہم وقد کذبوا بآیاتنا“۔ (جن لوگوں نے کفر اختیار کیا انہوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی اور مسلسل اسی طرزِ عمل کو اپناتے رہے (اسے اپنی عادت و معمول بنا لیا) انہوں نے گمان کر لیا کہ ان کے اموال و اولاد انہیں خدا سے بے نیاز کر دیں گے، ان کی یہ عادت فرعونوں اور ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں جیسی ہے کہ جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی.....)

اور جملہ ”فَاَحَدَهُمُ اللّٰهُ يَنْتَوِيحُهُمْ“ میں حرف ب سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس سے سمیت کا معنی مراد ہے، چنانچہ جب یہ کہا جاتا ہے: ”اخذتہ بذنبہ“ میں نے اس کے گناہ پر اس کو پکڑ لیا (اس کا مواخذہ کیا) تو اس سے مراد یہی ہوتا ہے کہ اس کے گناہ کے سبب گناہ کی وجہ سے اس کا مواخذہ کیا، اسے گرفت میں لے لیا، لیکن زیر نظر دو آیتوں کے درمیان جو تقابلی تذکرہ ہوا ہے اور عہد رسالت میں موجود کفار کی تمثیل کفار آل فرعون اور ان سے پہلے گزرے ہوئے کافروں سے ہوئی ہے اس کے پیش نظر یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہاں حرف ب سبب کی بجائے آل کے معنی میں ہے کیونکہ پہلی آیت میں کفار کو ”وَفُجُوْا النَّاسَ“ کہا گیا یعنی آگ کا ایندھن، گویا وہ خود آتش جہنم کے شعلہ ور ہونے کا سبب ہیں کہ اپنی ہی جلائی بڑھکانی ہوئی آگ میں جلنے کے عذاب میں مبتلا ہوں گے جیسا کہ فرعونوں اور ان سے پہلے گزرے ہوئے کافروں کا حال ہوا کہ وہ اپنے گناہوں کی بھینٹ چڑھے اور ان کے وہ گناہ ہی ان کے لئے عذاب کی صورت اختیار کر گئے جن کا انہوں نے ارتکاب کیا اور انہوں نے جو مکرو فریب کیا وہی ان کی گردن کا طوق بن گیا اور اس نے انہیں جکڑ کر رکھ دیا اور ان کے مظالم

خود انہی پر پلٹ آئے اور وہ اپنے ہی کئے ہوئے ظلم و جور کا شکار ہو گئے، اسی سلسلہ میں واضح قرآنی بیان موجود ہے جس میں مکروظلم کی بازگشت مکر کرنے والوں اور ظلم کا ارتکاب کرنے والوں کی طرف ذکر کی گئی ہے:

سورۃ فاطر، آیت: ۴۳

○ ” وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ“

(بری چال، چال چلنے والے کے سوا کسی کو اپنی پلٹ میں نہیں لیتی)

سورۃ بقرہ، آیت: ۵۷

○ ” وَمَا ظَلَمُونَا وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ“

(اور انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ صرف اپنے اوپر ہی ظلم کرتے رہے)

مذکورہ بالا مطالب سے خداوند عالم کے ”شدید العقاب“ ہونے کا معنی بھی واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ خدا کا عتاب اس طرح نہیں کہ کسی مخصوص طرف سے انسان پر آ پڑے اور کسی معین جگہ پر اسے گھیر لے اور مخصوص حالات میں اس پر ٹوٹ پڑے، اس طرح کا عتاب تو غیر خدا کی طرف سے ہوتا ہے کہ جو ایک انسان دوسرے ہمنوع کے ساتھ انجام دیتا ہے مثلاً یا وہ اوپر سے آتا ہے یا نیچے سے، اور وہ بھی کسی ایک جگہ پر اٹھتا ہے کہ ہر جگہ پر، یہی وجہ ہے کہ اس سے بچاؤ کی تدبیریں بھی ممکن ہوتی ہیں اور اس سے بچنے کے لئے کسی دوسری جگہ جا کر یا کسی سے پناہ لے کر اپنا تحفظ کر لیا جاتا ہے یا ایسا کرنا ممکن ہوتا ہے جبکہ خدائی عتاب ایسا نہیں، وہ انسان کو اس کے عمل و گناہ کے ساتھ ہی گرفت میں لے لیتا ہے اور چونکہ انسان کا عمل اس کے باطن و ظاہر دونوں میں اس کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے اور اس سے جدا نہیں ہوتا لہذا خدائی عتاب بھی اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور اس سے جدا نہیں ہوتا، نتیجتاً انسان خود ہی آتش جہنم کا ایندھن بن جاتا ہے یعنی اپنے ہی ہاتھوں دوزخ کی آگ اپنے اندر شعلہ ور کر دیتا ہے کہ جو اسے گھیر لیتی ہے، اس لئے اس سے فرار و چھٹکارا کی گنجائش و تصور ہی باقی نہیں ہوتا بلکہ اس سے بچاؤ کی تدبیر کرنا ہی بے معنی ہے اور فرار و قرار اس کی بابت یکساں ہیں، کسی صورت میں انسان اس سے بچ نہیں سکتا اور اس سے خلاصی پانے کی کوئی راہ ہی نہیں ہوتی، اس حوالہ سے خداوند عالم ”شدید العقاب“ ہے۔ (خدا کے ”شدید العقاب؟“ ہونے کا یہی معنی ہے)۔

اور جملہ ”كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَاخَذَهُمُ اللَّهُ“ میں دوبار انداز سخن میں تبدیلی واقع ہوئی ہے یعنی غائب سے حاضر اور

حاضر سے غائب کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلی آیت میں ارشاد ہوا ہے:

○ ” لَنْ نُنْفِخَهُنَّ عَنْهُمْ أَمْوَالَهُمْ وَلَا أَوْلَادَهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا“ کہ انہیں ان کے اموال و اولاد اللہ سے ہرگز

بے نیا نہیں کر سکتے، اس میں غائب کا انداز ہے، جبکہ زیر نظر جملہ میں ارشاد ہوا: ” كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا“ انہوں نے ہماری

آیتوں کو جھٹلایا، اس میں حاضر کا صیغہ (ہماری آیات) استعمال ہوا، پھر دوبارہ غائب کا انداز اختیار کر کے یوں ارشاد ہوا: "فَاَحْذَهِمُ اللّٰهُ" پھر خدا نے انہیں گرفت میں لے لیا، اب دیکھنا یہ ہے کہ انداز بیان کی اس تبدیلی میں کیا راز مضمّر ہے؟ جہاں تک پہلی تبدیلی کا تعلق ہے یعنی غائب سے حاضر کا انداز اختیار کیا گیا (كَلِمًا بَدِیًّا) انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا.....، تو اس سے سننے والے کو قلبی و فکری نشاط و سرور پہنچانا اور خبر کے قرین صحت و مقرون بہ صدق ہونے کا مقصد ملحوظ ہے، اس کی مزید وضاحت و تفسیم کے لئے یہ مثال دی جاسکتی ہے کہ جس طرح کوئی شخص کہے کہ "فلاں شخص بد زبان و بد کلام اور نہایت بری صحبت والا ہے اور میں اس کے ساتھ مجالست و معاشرت کرنے میں مبتلا ہو گیا ہوں لہذا اس کے ساتھ تعلق رکھنا اور اٹھ بیٹھ کر نا واجب و ضروری ہے"۔ تو اس میں جملہ: "میں اس میں مبتلا ہو گیا ہوں" (پھنس گیا ہوں) اصل خبر کو قرین صحت قرار دیتا ہے اور اس کی صداقت کو یقینی بناتا ہے کیونکہ اس کو باگزشت تفکر اور ایک طرح کی گواہی کی طرف ہوتی ہے۔ (گویا شکم خود اس کا معنی شاہد ہے)۔

بنابراین آیت مبارکہ کا معنی... واللہ اعلم... یہ ہوگا کہ فرعونیوں کی عادت کفر و تکذیب آیات میں انہی کفار کی عادت جیسی تھی، اور یہ ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کیونکہ ہم خود ان (فرعونیوں) پر حاضر و ناظر اور انہیں دیکھ رہے تھے (یعنی شاہد تھے) کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تو ہم نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا (ان کا مواخذہ کیا)۔

اور جہاں تک دوسری تبدیلی کا تعلق ہے یعنی حاضر سے دوبارہ غائب کے انداز کی طرف پلٹا گیا اور "پھر ہم نے انہیں گرفت میں لے لیا" کی بجائے یوں کہا گیا کہ "اللہ نے انہیں گرفت میں لے لیا" (فَاَحْذَهِمُ اللّٰهُ) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مقصود حاصل ہونے اور بیان کا مقصد پورا ہونے کے بعد دوبارہ اصل کلام کی طرف لوٹا گیا جو کہ غائب کا انداز سخن ہے۔ اس کے علاوہ یہ نکتہ بھی ملحوظ ہے کہ اس تبدیلی میں دوبارہ مقام الوہیت کی طرف توجہات کو مرکوز کرنا مقصود ہے کہ جو پوری کائنات کے تمام امور کی تدبیر و تنظیم کا سرچشمہ ہے اور ہر چھوٹی بڑی چیز پر اسی کا تسلط و حاکمیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لفظ جلالہ (اللہ) دو مرتبہ ذکر کیا گیا، یعنی "فَاَحْذَهِمُ اللّٰهُ" کے بعد "وَهُوَ شَدِيدُ الْعِقَابِ" (اور وہ سخت عقاب کرنے والا ہے) کے بجائے یوں کہا گیا: "وَاللّٰهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ" (اور اللہ سخت عقاب والا ہے) تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ ان کا کفر اختیار کرنا اور آیات کو جھٹلانا درحقیقت اس ہستی کے ساتھ نزاع و جھگڑا اور جنگ کرنا ہے جو الوہیت و خدائی کے جلال و عظمت کی مالک ہے اور اس کے لئے گناہگار کو اس کے گناہ کے سبب اپنی گرفت میں لینا آسان ہے، وہ شدید العقاب ہے کیونکہ وہی معبود برحق (اللہ) ہے، جل اسمہ (بزرگ و عظیم ہے اس کا نام)۔

## کافروں کے مغلوب ہونے کی اطلاع

○ ” قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا سَعْتٌ بَلْ يَرَوْنَ كَثِيرًا مِّمَّا يَسْتَعْلَبُونَ وَتُحْشَرُونَ.....“

(کہہ دو ان لوگوں سے جنہوں نے کفر اختیار کر لیا کہ تم بہت جلد مغلوب ہو گے اور تمہیں لے جایا جائے گا.....)

اس آیت میں جملہ ”تُحْشَرُونَ“ ذکر ہوا ہے، حشر کا معنی لوگوں کو ان کے ٹھکانوں سے زبردستی باہر نکلانا ہے، یہ لفظ ایک فرد کے زبردستی اخراج پر استعمال نہیں ہوتا، قرآن مجید میں اس طرح ارشاد ہوا:

سورۃ کہف، آیت: ۴۷

○ ” وَحَشَرْنَاهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ لَهُمْ مِنْهُمْ أَحَدًا“

(اور ہم نے انہیں کوچ کرایا، یہاں تک کہ ان کا کوئی ایک فرد بھی باقی نہ چھوڑا)

زیر نظر آیت مبارکہ میں لفظ ”الْمُهَادُ“ ذکر ہوا ہے ”وَبَشَّرْنَا الْمُهَادُ“ مہاد کا معنی بستر ہے (فرش کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے)، آیت کے ظاہر السیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ”الَّذِينَ كَفَرُوا“ سے مراد مشرکین ہی ہیں جیسا کہ سابقہ آیت (إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَالَّذِينَ تُشْعَبُونَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ.....) میں مشرکین مراد تھے نہ کہ یہودی! یہ بات دونوں آیتوں کے باہمی ربط و پیوستگی کو یقینی بنانے میں نہایت موزوں ہے کیونکہ زیر نظر آیت مبارکہ ان پر غلبہ پائے جانے اور انہیں دوزخ کی طرف لے جانے کا تذکرہ کرتی ہے جبکہ سابقہ آیت میں ان کے اس انجام کار کا سبب مذکور ہے یعنی انہوں نے اپنے اموال و اولاد پر گھمنڈ و تکبر اور اپنی بڑائی کا احساس و اظہار کیا۔

## جنگِ بدر میں خدائی نشانی

○ ” قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي وُجُوهِ النَّاسِ.....“

(ان دو گروہوں میں جو ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوئے تمہارے لئے نشانی ہے۔)

آیت کے ظاہر السیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ ”لَكُمْ“ کا مخاطب ”الَّذِينَ كَفَرُوا“ (وہ لوگ جنہوں نے کفر

اختیار کیا) ہیں، یہ آیت درحقیقت آنحضرتؐ کے ارشاد گرامی ”سَتُعَلِّبُونَ وَنُحَسِّرُونَ.....“ (تم بہت جلد مغلوب ہو گے اور تمہیں زبردستی باہر نکال کر لے جایا جائے گا.....) کا تتمہ ہے۔

یہاں یہ امکان بھی پایا جاتا ہے کہ اس کا مخاطب اہل ایمان ہوں اور وہ اس طرح کہ انہیں جنگ بدر کے دن نصرت کی صورت میں خدائی عنایت و احسان کی طرف توجہ دلا کر غور و فکر کرنے اور عبرت گیری کی دعوت دی گئی ہے کہ کس طرح خداوند عالم نے ان کی تائید و حمایت کی اور اس طرح ان کا ساتھ دیا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں چندھیاں گئیں۔ اس بنا پر کلام الہی ایک طرح کے اتفاقی طرز سخن یعنی تبدیلی کا حامل قرار پاتا ہے کیونکہ اس سے پہلے صرف آنحضرتؐ سے خطاب ہوا (قُلْ لِّلَّذِينَ.....) کہہ دو.....، جبکہ ”قَدْ كَانَ لَكُمْ.....“ میں آنحضرتؐ اور مومنین دونوں مخاطب قرار پاتے ہیں۔ لیکن جس طرح آپ نے ملاحظہ کیا ہے سیاق کلام کے تناظر میں پہلا امکانی پہلو اور احتمال زیادہ مناسب لگتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ آیت کس واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جس میں دو گروہ ایک دوسرے کے مد مقابل قرار پائے اور خداوند عالم نے اس گروہ کی حمایت و نصرت کی جو قتال فی سبیل اللہ کر رہا تھا، تو اس سلسلہ میں آیت نے واضح طور پر کسی واقعہ کی نشاندہی نہیں کی اور نہ ہی اس کا نام ذکر کیا البتہ واقعہ بدر پر اس کی تطبیق ممکن دکھائی دیتی ہے۔ اور یہ سورہ مبارکہ (آل عمران) واقعہ بدر بلکہ واقعہ احد کے بعد نازل ہوا،

اس کے علاوہ یہ بات قرین قیاس ہے کہ واقعہ کو جس انداز میں بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مخاطبین کے اذہان میں موجود تھا اور وہ اس سے آگاہ اور اس کو یاد رکھے ہوئے تھے (ابھی تک اس کی یاد ان کے دلوں و ذہنوں میں باقی و تازہ تھی) چنانچہ ارشاد ہوا: ”قَدْ كَانَ لَكُمْ.....“ کہ اس کا مطلب و معنی یہ ہے کہ ”کیا تمہیں یاد نہیں کہ ایسا ہوا اور ایسا ہو.....“

اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں جنگ بدر کے واقعہ کے علاوہ کسی واقعہ و جنگ کے تذکرہ میں جنگجوؤں کی آنکھوں میں خدائی تصرف مذکور نہیں..... کہ ایک دوسرے کے مد مقابل قرار پانے والے فوجی اپنے دشمن کو اندک و ناچیز سمجھنے لگے.....، اور جنگ بدر کے بارے میں قرآنی تذکرہ درج ذیل آیت میں یوں ہوا:

سورہ انفال، آیت: ۴۴

○ ”وَ اِذْ يُرِيكُمُوهُمْ اِذِ التَّقِيْتُمْ فِيْ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَيَقَلِّلْكُمْ فِيْ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۗ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ“

(اور یاد کرو اس وقت کو جب تمہارا آنا سامنا ہوا تو خدا نے انہیں تمہاری آنکھوں میں نہایت کم اور ان کی آنکھوں میں تمہیں کم دکھایا تاکہ وہ کام پورا ہو جائے جس کی انجام دہی مطلوب تھی، اور تمام امور کی بازگشت خدا کی طرف ہے)۔

اگرچہ اس میں بظاہر مد مقابل فوج کے تھوڑے دکھائی دینے کے عمل کا ذکر ہے نہ کہ اس کے زیادہ کے دکھلانے کا! لیکن بعید نہیں کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ پہلے مشرکوں کی نگاہوں میں مومنین کی تعداد کا کم ہونا اس لئے ظاہر کیا گیا تاکہ وہ (مشرکین) ان پر حملہ کرنے کی جرأت پائیں اور مومنین کی کثرت و قوت کے خوف سے مقابلہ کرنے سے منہ نہ موڑیں۔ اور جب جنگ شروع ہو گئی تو خدا نے مشرکین کی نگاہوں میں مومنین کی کثرت و قوت ظاہر کر دی تاکہ وہ میدان سے بھاگ جانے اور شکست سے دوچار ہونے پر مجبور ہوں۔

بہر حال جنگ بدر کے تذکرہ میں جو اہم نکتہ ملحوظ ہے وہ مد مقابل فوج کی کثرت کا اظہار ہے اور ایک دوسرے کی نظروں میں زیادہ تعداد معلوم ہونا ہے۔ تاہم اگر یہ امکانی پہلو درست بھی قرار دیا جائے کہ آیت میں اصل خطاب مشرکین سے ہے اور وہی ”لَنَكْفُرَنَّكُمْ“ کا مصداق ہیں تب بھی اس کی تطبیق جنگ بدر کے علاوہ کسی دوسرے واقعہ پر نہیں ہوتی، اس کے علاوہ اس قرأت کی بناء پر کہ جس میں ”يُرْوَدُوْنَهُمْ“ کے بجائے ”سَرَوْنَهُمْ“ پڑھا گیا ہے (یعنی تاء خطاب کے ساتھ) جس کا معنی ہے: تم انہیں دیکھتے تھے، اس سے بھی ہمارے مذکورہ بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ آیت مبارکہ کا معنی و مقصود یہ ہے: اے گروہ مشرکین! اگر تم با بصیرت اور منطقی سوچ رکھنے والے افراد ہوتے تو تمہاری عبرت اور اس امر کی حقانیت سے آگاہ ہونے کے لئے یہ کافی تھا کہ ہمیشہ حق ہی غالب ہے اور خدا جسے چاہتا ہے اپنی مدد و نصرت سے اس کی تائید و حمایت کرتا ہے اور مال و اولاد جیسا کہ تم نے بدر کے دن دیکھ لیا ہرگز غلبہ و فتح نہیں دلا سکتے۔ بلکہ یہ خدا ہی ہے جو حقیقی معنی میں غلبہ دلاتا ہے اور فتح و کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے۔ اور جنگ بدر میں وہ مومنین جو خدا کی راہ میں قتال کر رہے تھے اور دشمن کے سامنے ڈٹے ہوئے تھے۔ تو خدا ان کی پشت پناہی و نصرت کر رہا تھا۔ جبکہ وہ اس قدر کم اور کمزور افراد تھے کہ ان کی تعداد کافروں کے مقابلے میں ایک تہائی بھی نہ تھی اور قوت و طاقت کے حوالہ سے بھی کافروں سے قابل قیاس نہ تھے کیونکہ ان کی کل تعداد تین سو تیرہ افراد تھی اور ان کے پاس چھ زره، آٹھ تلواروں اور دو گھوڑوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا جبکہ مشرکین کا لشکر تقریباً ایک ہزار افراد پر مشتمل تھا اور وہ سب تعداد، طاقت، گھوڑوں، اونٹوں اور جنگی ساز و سامان سے لیس تھے، اس کے باوجود خداوند عالم نے مومنین کی نصرت کی اور ان کی قلیل تعداد اور اپنے دشمن کے مقابلے میں نہایت کمزور ہونے کے باوجود اس طرح ان کی مدد کی کہ وہ کافروں کی نگاہوں میں بہت زیادہ دکھائی دیئے اور وہ (مومنین) انہیں (مشرکین کو) اپنے سے دگنا نظر آنے لگے، خداوند عالم نے فرشتوں کو مومنین کی مدد کے لئے بھیجا لہذا مشرکین کو ان چیزوں سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا جس پر وہ نازاں تھے یعنی مال و اولاد، اور نہ ہی افرادی قوت و تعداد کی کثرت ان کے کام آئی اور نہ جنگی ساز و سامان انہیں خدا سے بے نیاز کر سکا۔

خداوند عالم نے سورۃ انفال میں بھی دو مرتبہ جنگ بدر کے تذکرے میں اسی طرح فرعونوں اور ان سے پہلے لوگوں

کی طرف سے آیات الہی کی تکذیب کے مرتکب ہونے اور ان کے گناہوں کے سبب خدائی گرفت میں آنے کو بیان کیا جس طرح یہاں زیر نظر آیات مبارکہ میں مذکور ہے، یہاں یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ خداوند عالم نے مشرکین کو نصیحت کرنے کے ضمن میں انہیں جنگ بدر کی جو یاد دلائی ہے اس سے اس امر کا اشارہ مطلوب ہے کہ سابقہ آیات میں جس غلبہ کا تذکرہ ہوا ہے اس سے جنگی غلبہ مراد ہے کہ جس میں قتل کرنا اور تباہ و برباد کر دینا ہوتا ہے، بنا بریں ان آیات میں جو واقعہ بدر کے تذکرہ پر مشتمل ہیں قتال کے حوالہ سے دھمکی دے کر خبردار کیا گیا ہے۔

### دو دم مقابل لشکروں کا تذکرہ

○ ”وَمَنْ تَقَاتَلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَى كَافِرًا.....“  
(ایک گروہ خدا کی راہ میں لڑتا تھا اور دوسرا کافر تھا.....)

اس آیت مبارکہ میں دو دم مقابل گروہوں کا تذکرہ ہوا ہے جو میدان کارزار میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے قرار پائے، ایک گروہ کے بارے میں کہا گیا کہ وہ اللہ کی راہ میں قتال کر رہا تھا جبکہ دوسرا گروہ کافر تھا، تقابل اس بات کا متقاضی ہے کہ اللہ کی راہ میں قتال کرنے والوں کے مقابلے میں آنے والے لشکر کے بارے میں یوں کہا جاتا کہ وہ شیطان یا طاغوت کی راہ میں قتال کر رہا تھا لیکن اس طرح نہیں کہا گیا اور نہ ہی اس سے مشابہ الفاظ استعمال کئے گئے بلکہ کہا گیا کہ دوسرا گروہ کافر تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کلام میں دو راستوں کے درمیان تقابل وغیرہ کے بیان کا مقام نہیں بلکہ صرف اس مطلب کا اظہار مقصود و مطلوب ہے کہ ”اللہ تعالیٰ سے بے نیازی ممکن نہیں اور یہ کہ غلبہ و کامیابی صرف خدا کے لئے ہے“، اس بناء پر یہاں درحقیقت خداوند عالم پر ایمان اور اس کی راہ میں جہاد کرنے، اور خدا کا انکار کرنے کے درمیان تقابل کا تذکرہ مقصود ہے۔

### ایک ادبی بحث

آیت مبارکہ کے ظاہر لسیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جمع کی دو ضمیروں (يُرَوُّنَهُمْ) (مِثْلَيْهِمْ) کی بازگشت جملہ ”وَمَنْ تَقَاتَلَ“ کی طرف ہوتی ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ کافروں کا گروہ (لشکر) مؤمنین کو ان کی اصل تعداد سے دگنا دیکھتا

تھالی یعنی وہ انہیں ۶۲۶ افراد دکھائی دے رہے تھے جبکہ حقیقت میں ان کی تعداد تین سو تیرہ (۳۱۳) تھی، یہاں ایک احتمال یہ بھی دیا جاسکتا ہے کہ پہلی ضمیر (یرونہم) کی بازگشت دوسری ضمیر (مشیم) سے مختلف ہے، اس بناء پر آیت کا معنی یوں ہوگا: کفار، مؤمنین کو اپنے سے دگنا دیکھ رہے تھے۔  
لیکن یہ احتمال بعید ہے اور الفاظ کی ترتیب سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

ایک احتمال یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں ضمیروں کی بازگشت ”واخرى كافرة“ کی طرف ہو، اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہوگا: کفار، اپنے آپ کو مؤمنین سے دگنا دیکھنے لگے مثلاً ایک ہزار افراد کو دو ہزار دیکھنے لگے، اس احتمال کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کی نگاہوں میں مؤمنین ان کی نسبت بہت کم دکھائی دیئے، گویا وہ انہیں اپنی نسبت 1/6 دیکھ رہے تھے جبکہ مؤمنین کی تعداد ان کی نسبت 1/3 تھی۔

اس احتمال کی وجہ یہ ہے کہ جنگ بدر کے تذکرہ میں سورہ انفال آیت ۴۴ میں اس طرح ارشاد ہوا: ”وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ اتَّقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ“ (اس وقت کو یاد کرو جب تم آمنے سامنے آگئے تو خدا نے انہیں تمہاری نگاہوں میں کم دکھایا اور تمہیں ان کی نظروں میں کم دکھایا) اس طرح یہ آیت ہماری زیر نظر آیت کے منافی ہوگی، (لہذا ضروری ہے کہ دونوں ضمیروں کی بازگشت کفار کی طرف ہوتا کہ دو آیتوں کے درمیان ایک دوسرے کے منافی ہونے کی نوبت نہ آئے۔

اس احتمال کا جواب اس طرح دیا گیا ہے کہ اگر دونوں ضمیروں کی بازگشت کفار کی طرف ہو تو اس سے بیان میں عدم وضاحت اور معانی کا خلط ملط ہونا لازم آئے گا جو کہ قرآن مجید کہ جو سب سے زیادہ بلیغ کلام ہے کے شایان شان نہیں، اور اگر یہی مقصود تھا تو اس طرح کے الفاظ استعمال کئے جاتے: ”یرون انفسہم مغلیہم“ (وہ اپنے آپ کو اپنی اصل تعداد سے دگنا دیکھنے لگے) یا اس سے مشابہ عبارت ذکر کی جاتی۔

اور جہاں تک دونوں آیتوں کے ایک دوسرے کے منافی ہونے کی بات کا تعلق ہے تو وہ اس لئے درست نہیں کہ ایک دوسرے کے منافی ہونا اس وقت واقع ہوتا ہے جب دونوں کا مقام بیان ایک ہو، جبکہ ان دو آیتوں میں ایسا نہیں اور ان دونوں کے مقام بیان کے ایک ہونے کا کوئی ثبوت و دلیل موجود نہیں کیونکہ عین ممکن ہے کہ خداوند عالم نے دونوں لشکروں کو ایک دوسرے کی نظروں میں اس وقت کم دکھایا ہو جب وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے قرار پارہے تھے تاکہ اس طرح ان کے دل مضبوط ہوں اور ان کی جرأت بڑھ جائے لیکن جب جنگ کا آغاز ہو جائے اور دونوں لشکر ایک دوسرے پر تازہ توڑ حملے شروع کر دیں تو اس وقت کفار، مؤمنین کو ان کی اصل تعداد سے دگنا دیکھنے لگیں اور خوفزدہ ہو کر میدان جنگ سے بھاگنے پر مجبور ہو جائیں اور شکست سے دوچار ہوں، تو ان دو آیتوں میں بظاہر جو اختلاف دکھائی دیتا ہے وہ درج ذیل ان دو آیتوں میں



پائے جانے والے..... یا دکھائی دیئے جانے والے۔ اختلاف کی طرح ہے جن میں قیامت کے دن کا تذکرہ ہوا ہے:  
سورۃ الرحمن، آیت ۳۹:

○ ”لَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوبِهِ إِنْسٌ وَلَا جَانٌّ“

(اس دن نہ انسانوں سے اور نہ جنوں سے، ان کے گناہوں کے بارے میں پوچھ گچھ نہیں ہوگی)

سورۃ صافات، آیت ۲۴:

○ ”وَقَفُّوْهُمْ إِنَّهُمْ مَسْئُوْلُوْنَ“

(انہیں روکو، کہ ان سے پوچھ گچھ کی جانی ہے)

تو ان دونوں کے مقام بیان کے مختلف ہونے کی وجہ سے ان میں بظاہر اختلاف دکھائی دیتا ہے جبکہ ان کے درمیان ایک دوسرے کے منافی ہونے کی نسبت نہیں پائی جاتی، (وہ ایک دوسرے کے منافی نہیں)۔

بہر حال ان دو ضمیروں (يَرَوْنَهُمْ) (مِثْلَهُمْ) کی بازگشت کے بارے میں مفسرین کرام نے متعدد دیگر احتمالات بھی ذکر کئے ہیں لیکن ان سب میں ایک مشترکہ نقص پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ وہ آیت کے ظاہری الفاظ سے مطابقت نہیں رکھتے، بلکہ ان سے قطعی مختلف ہیں لہذا ہم نے ان کو ذکر کرنے سے اجتناب کیا ہے، (خدا ہی اصل حقیقت سے آگاہ ہے)۔

### خدائی نصرت کا اظہار

○ ”وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَن يَّشَاءُ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ“  
(اور اللہ اپنی نصرت کے ذریعے تائید کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اس میں صاحبان بصیرت کے لئے عبرت و نصیحت ہے)

”يُؤَيِّدُ“ کہ جس کا مصدر ”تائید“ (باب تفعیل) ہے وہ ”اید“ سے مشتق ہے کہ جس کا معنی ”قوت“ ہے۔  
”اُولٰٓئِہٖمُ الْاَبْصَارِ“ کے بارے میں دو قول ذکر کئے گئے ہیں:

(۱) اس سے مراد ظاہری آنکھیں ہیں،

اس کی دلیل یہ ہے کہ آیت مبارکہ میں خدا کی طرف سے آنکھوں میں تصرف کرنے اور ان پر اثر انداز ہو کر ان کے

دیکھنے کے عمل کی کیفیت بدل دینے کا ذکر ہے۔

(۲) اس سے مراد بصیرتیں ہیں،

اس کی دلیل یہ ہے کہ عبرت و نصیحت قلبی بصیرت سے ہوتی ہے ظاہری بصارت سے نہیں ہوتی، البتہ دونوں لحاظ سے فہم المراد آسان ہے کیونکہ خداوند عالم اپنے کلام میں عبرت حاصل نہ کرنے والوں اور حالات و واقعات سے نصیحت نہ پانے والوں کو اندھا قرار دیتا ہے اور یہ مطلب بھی بیان کرتا ہے کہ آنکھوں کا کام ہی یہ ہے (بلکہ اس پر لازم و واجب ہے) کہ وہ دیکھے اور حق و باطل کے درمیان تمیز دے، اس بیان میں گویا یہ ادعا بھی ہے کہ وہ دین حق کہ جس کی طرف خدا تمہیں بلاتا ہے وہ ظاہر و آشکار ہے بلکہ وہ قابل احساس ہے..... اسے ظاہر بظاہر دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے..... لہذا ظاہری نگاہوں پر لازم ہے کہ اسے دیکھیں اور اس کا مشاہدہ کریں، اس حوالہ سے بصیرت اور بصارت ایک طرح کے استعارہ کی بناء پر معارف الہیہ کی بابت ایک ہی معنی رکھتے ہیں کیونکہ وہ نہایت واضح و آشکار ہیں، اس سلسلہ میں کثیر آیات موجود ہیں..... کہ جن میں بصیرت و بصارت کو یکجا قرار دیا گیا ہے اور ابصار سے ظاہری آنکھیں مراد لی گئی ہیں..... ان میں سے درج ذیل آیات میں نہایت واضح طور پر مطلوب و مقصود کا ثبوت ملتا ہے:

سورۃ حج، آیت ۴۶:

○ ” فَإِنَّهَا لَا تَعْمَىٰ الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَىٰ الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ“  
(آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں لیکن وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں)  
اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل آنکھیں دلوں میں ہیں سروں میں نہیں۔

سورۃ اعراف، آیت ۱۷۹:

○ ” وَأَلْهَمَّا أَكْثَرَ الْبَصَرِ لَا يَبْصُرُونَ بِهَا“  
(اور ان کی آنکھیں ہیں کہ جن سے وہ دیکھتے نہیں)

سورۃ جاثیہ، آیت ۲۳:

○ ” وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً“  
(اور اس نے اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا)

بہر حال زیر نظر آیت مبارکہ میں ”ابصار“ سے مراد ظاہری آنکھیں ہیں اور وہ اس بناء پر کہ وہی ذریعہ عبرت ہیں اور انہی کے ذریعے حقائق سے آگاہی و آشنائی حاصل ہوتی ہے۔ تو یہاں کلام میں استعارہ بالکنایہ استعمال ہوا ہے،..... استعارہ بالکنایہ سے مراد یہ ہے کہ ایک چیز کو دوسری چیز سے تشبیہ دیں اور جس چیز سے تشبیہ دی گئی ہو اس کی کسی عملی علامت و خصوصیت کو اس چیز کے لئے ذکر کیا جائے جس کے لئے تشبیہ دی گئی تھی، آیت مبارکہ میں ظاہری آنکھ کو چشم باطن سے تشبیہ

دے کر عبرت پانے کے عمل کو ظاہری آنکھ کے لئے ذکر کیا گیا ہے جبکہ اس کا تعلق باطنی نگاہ اور چشم قلب سے ہے..... اور اس لئے ایسا کیا گیا تاکہ اس نکتہ سے آگاہی دلائی جاسکے کہ یہ مطلب اس قدر واضح و روشن اور ظاہر و آشکار ہے کہ گویا قوتِ حس بھی اس تک پہنچ سکتی ہے اور ظاہری نگاہوں سے اس کا مشاہدہ ہو سکتا ہے۔ یہاں استعارہ بالکنایہ کے استعمال کی لطافت میں اس حوالہ سے بھی اضافہ ہو جاتا ہے کہ کلام ظاہری آنکھوں میں تصرف کے خدائی عمل کے ذکر پر مشتمل ہے..... اس سے اس قول کو قوت ملتی ہے کہ ابصار سے مراد ظاہری آنکھیں ہیں.....

جملہ ” اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ.....“ بظاہر اس کلام الہی کا تتمہ ہے جس میں خداوند عالم نے حضرت پیغمبر اسلام سے خطاب فرمایا اور انہیں مخاطب قرار دیا، اور اس کلام نبوی کا تتمہ نہیں ہے جس پر آیت مبارکہ ” قُلْ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا.....“ دلالت کرتی ہے، اس کی دلیل وہ ”ک“ ہے جو ”ذٰلِكَ“ میں ہے کہ جس کا مخاطب حضرت پیغمبر اسلام ہیں۔ انحضرت کو خاص طور پر مخاطب قرار دینے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ عام افراد کم فہم اور کوردل (دل کے اندھے) ہیں کہ وہ اس طرح کے مقامہائے عبرت سے درس عبرت حاصل نہیں کر سکتے۔

## دنیاوی زندگی کی مادی لذتیں

○ ”رُئِيَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ.....“  
(لوگوں کے لئے زینت بنا دیا گیا ہے خواہشات کی محبت کو، عورتیں.....)

یہ آیت مبارکہ اور اس کے بعد والی آیت اس آیت شریفہ کی تفسیر و بیان اور اس میں مذکور مطلب کی حقیقت حال کی وضاحت و تشریح کی حیثیت رکھتی ہیں کہ جو اس سے قبل ذکر ہوئی ہے جس میں ارشاد الہی ہے: ” اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّعْطِيَنَّهُمْ اَمْوَالَهُمْ وَلَا اَوْلَادَهُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا“ (جن لوگوں نے کفر اختیار کیا انہیں انکے اموال اور اولاد اللہ سے ذرہ بھر بے نیاز نہیں کر سکتے)، اس سے کفار کے اس عقیدہ کی نشاندہی ہوتی ہے کہ ان کے خیال میں ان کے اموال و اولاد انہیں اللہ سے بے نیاز کر سکتے ہیں۔ اس آیت میں ان کے اس عقیدہ و نظریہ کا سبب واضح کیا گیا ہے کہ وہ نفسانی خواہشات کے دلدل میں پھنس چکے ہیں اور مادی لذتوں پر مر مٹنے نے انہیں آخرت کے امور میں دلچسپی لینے اور اخروی حیات کے لئے بہتر زاد راہ اکٹھا کرنے سے باز رکھا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ غلط فہمی کا شکار ہو گئے اور حقیقت الامر ان پر واضح نہ ہوئی اور وہ یہ بات سمجھ نہ سکے کہ یہ سب کچھ اسی فانی دنیا کا زوال پذیر مال و متاع ہے اور اس کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ آخرت اور

خدا کے ہاں بہترین مقام و منزلت اور نیک انجام پانے کا وسیلہ و ذریعہ ہے (اس مطلب کو ان لفظوں میں بیان کیا جاسکتا ہے کہ دنیا آخرت کی کھتی ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے ”الدنيا مزرع الآخرة“، م)، اس کے باوجود انہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ خود دنیا کی محبت اور مادی لذتوں سے دل لگی کے موجود نہیں اور نہ ہی وہ اس سلسلہ میں ابتداء و ابتکار کرنے والے ہیں بلکہ خداوند عالم نے ان کی طبع و جودی ہی ایسی قرار دی ہے کہ اس میں اس محبت و چاہت کا فطری جذبہ پایا جاتا ہے تاکہ وہ اس کے ذریعے مادی دنیا کی مادی زندگی سے بھرپور لطف اندوز ہو سکیں اور اس سے پوری طرح استفادہ کر سکیں کیونکہ اگر یہ طبعی و فطری جذبہ نہ ہوتا تو نوع انسانی کی زندگی اور اس کی بقاء کی صورت ہی پیدا نہ ہوتی جبکہ خداوند عالم نے اس کی تقدیر ہی میں اس کے لئے دنیاوی زندگی کی فانی لذتوں سے استفادہ کرنا قرار دیا اور دنیا کو اس کے لئے مقررہ مدت تک متاع حیات سے لطف اندوز ہونے کا ٹھکانہ قرار دیا چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۃ بقرہ: آیت ۳۶:

○ ”وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ“

(اور تمہارے لئے زمین میں ٹھہرنے کی جگہ اور ایک مقررہ وقت تک کی متاع ہے)

خداوند عالم نے نوع انسانی کو دنیاوی زندگی کی مادی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع اس لئے فراہم کیا کہ وہ اسے آخرت کے ابدی ٹھکانہ کا ذریعہ و وسیلہ قرار دیں اور اس عارضی زندگی کی متاع ناچیز سے بھرپور استفادہ کر کے اسے اخروی حیات کی بقا شعار لذتوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے ذخیرہ کریں، نہ یہ کہ دنیا ہی سے دل لگا کر اس کی زیب و زینت اور چمک دک کو اصل مقصد قرار دیتے ہوئے اس کے بعد والی ابدی حیات کو سرے سے ہی بھلا دیں اور راہ کو مقصد و منزل بنا لیں جبکہ وہ اپنے پروردگار کی جانب رواں دواں ہیں اور ان کے سفر کی آخری منزل ان کا رب ہے، خداوند عالم نے دنیا کی حیثیت کے بارے میں اس طرح ارشاد فرمایا:

سورۃ کہف، آیت: ۸:

○ ”إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لِّهَا لِيَبْئُوكُمْ أَنَّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا“ ○ وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا

عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرًّا ○

(ہم ہی نے روئے زمین پر موجود اشیاء کو اس کی زینت قرار دیا ہے تاکہ انہیں (روئے زمین پر رہنے والوں کو) آزمائیں کہ ان میں سب سے خوبصورت عمل کرنے والا کون ہے؟ اور ہم ہی روئے زمین پر موجود ہر شے کو خاک بنا دے گا زمین کو صاف و ہموار میدان بنا دیں گے)

لیکن غفلت کا شکار ان لوگوں نے خدا کے عطا کردہ ان ظاہری وسائل کو کہ جن کی حیثیت رضائے الہی کے حصول کی

نسبت وسیلہ و ذریعہ سے زیادہ نہیں مستقل حیثیت دے کر انہی سے اپنی قلبی وابستگی قائم کر لی اور انہی کو سب کچھ سمجھنے لگے، اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ گمان بھی کر لیا کہ یہ وسائل اور ظاہری ذرائع انہیں خدا سے بے نیاز کر سکتے ہیں، ان کے اس زعم باطل کے نتیجہ میں یہ سب نعمتیں ان کے لئے وبال و عذاب بن گئیں جبکہ ان سب چیزوں کو ان کے بہترین اخروی مقام و منزلت اور قرب خداوندی کے حصول کا ذریعہ قرار دیا گیا تھا جیسا کہ قرآن مجید میں واضح طور پر ارشاد الہی ہے:

سورہ یونس، آیت: ۳۰

” اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتٌ الْاَرْضِ وَمِمَّا يَآكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ حَتّٰى اِذَا اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَاثْرَٰيْتَهَا وَظَلَّتْ اَهْلُهَا اَنْهٰهُمْ قَدِرًا مَّرُوْنَ عَلَيْهِمْ اَلْتَهٰمْ اَمْرًا لَّيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَسِيْدًا اِذَا كَانَتْ لَمْ تَعْنِ بِاِلَآمِسِ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَبَبًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَاَسْرٰكُكُمْ ؕ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَاَرْسَلْنَا اِلٰى اللّٰهِ مَوْلٰهُمُ الْحَقِّ وَصَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ“

(دنیاوی زندگی کی مثال اس پانی جیسی ہے جسے ہم نے آسمان سے نازل کیا (برسایا) ہے پھر اس سے مل کر زمین سے وہ نباتات (آگ) آئیں جو انسانوں اور چوپایوں کی خوراک ہے یہاں تک کہ جب زمین شاداب و سرسبز اور خوشنما و دیدہ زیب ہو گئی اور زمین کے باسیوں نے گمان کر لیا کہ اب وہ اس پر پورا قبضہ و قدرت رکھتے ہیں تو یکا یک اس پر رات یادن میں ہمارا حکم (عذاب) آ پڑا اور ہم نے اسے کٹی ہوئی کھتی بنا دیا کہ گویا کل وہاں کوئی چیز ہی نہ تھی..... اور جس دن ہم سب کو اکٹھا کریں گے پھر شرک کرنے والوں سے کہیں گے تم اور تمہارے شرکاء سب اپنی جگہ پر رک جاؤ اور ہم ان کے درمیان جدائی ڈال دیں گے..... اور وہ اللہ کی طرف پلٹا دیئے جائیں گے جو کہ ان کا حقیقی مولا و حاکم ہے اور وہ جو افتراء اور بہتان باندھتے تھے وہ اسے کھودیں گے)

ان آیات مبارکہ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ زندگی اور اس کی زیب و زینت خداوند عالم کے دست قدرت میں ہے، خدا کے سوا اس کا حاکم و چارہ گر کوئی نہیں لیکن بنی نوع انسان ظاہری زندگی کی دلفریبیوں کے دھوکے میں آ کر اس کے باطن سے غافل ہوئے اور یہ گمان کرنے لگے کہ زندگی کا سب کچھ انہی کے ہاتھ میں ہے اور وہ خود اس کی تدبیر و تنظیم پر قادر ہیں، اسی بناء پر حضرت انسان نے دنیا میں اپنے ساتھی و شرکاء مثلاً، توں اور ان جیسی..... بے اختیار..... چیزوں مثلاً مال و اولاد کا سہارا لینے کی راہ لے لی، مگر خداوند عالم بہت جلد اسے اس غلط فہمی سے آگاہ کر دے گا کہ پھر یہ زیب و زینت باقی رہے گا اور نہ اس کے اور اس کے شرکاء کے درمیان کسی طرح کا ربط و تعلق قائم رہے گا بلکہ یہ سب کچھ زوال و نابودی سے دوچار ہو جائے گا، اس

وقت انسان اس چیز سے ہاتھ دھو بیٹھے گا جسے اس نے بہتان و افتراء کی بناء پر خدا کا شریک اور زندگی میں مؤثر سمجھ رکھا تھا اور اپنے عم اور اس کی حقیقت کا اصل معنی و مفہوم بھی ظاہر ہو جائے گا جو دنیا میں اسے حاصل ہوا تھا (یعنی وہ جس غلط و نادرست مطلب کو صحیح و درست اور برحق تصور کر چکا تھا اس کی حقیقت کھل کر اس کے سامنے آ جائے گی)، اور اسے اپنے مولائے برحق، اللہ کی طرف پلٹا یا جائے گا۔

### ایک اہم نکتہ کی وضاحت

زیر بحث موضوع کی بابت ایک نہایت اہم مطلب قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ آیت مبارکہ میں ارشاد ہوا ہے کہ ”لوگوں کے لئے زینت بنا دیا گیا نفسانی خواہشوں کی محبت کو مثلاً عورتیں، اولاد، سونا چاندی وغیرہ،“ تو اس میں زینت بنا دیئے جانے کو خدا کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ خدا نے ان چیزوں پر اس طرح انسان کی نظریں جما دی ہیں کہ ان کی جلوہ سامانیاں اسے خیرہ کرنے لگیں اور وہ انہی کو غرض و مقصد حیات قرار دینے لگے، کیونکہ عظیم و حکیم اور آگاہ و دانا پروردگار کی ذات اقدس اس سے کہیں بالاتر ہے کہ اپنی مخلوق کے امور کی تدبیر اس طرح سے کرے کہ وہ اپنی تخلیق کے پاکیزہ مقصد تک پہنچنے ہی نہ پائے، خداوند عالم نے خود ہی ارشاد فرمایا ہے:

سورہ طلاق، آیت: ۳

○ ”إِنَّ اللَّهَ بِأَمْرِهِ“

(خدا، یقیناً اپنے کام کو پورا کرنے والا ہے)

اس سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم اپنے امور و نظام کو مقررہ مقصد تک پہنچایا دیتا ہے۔

سورہ یوسف، آیت: ۲۱

○ ”وَاللَّهُ عَلِيمٌ عَلِيمٌ“

(اور خدا اپنے امر (فرمان و نظام) پر غالب و حاوی ہے)

یعنی ایسا ممکن ہی نہیں کہ خداوند عالم دنیاوی ساز و سامان کو انسان کی نظروں میں اس طرح جلوہ گر کرے کہ وہ انہی چیزوں کی مستقل اثرگزاری کا معتقد ہو جائے اور یہ سمجھ لے کہ اس کی زندگی کا بنیادی مقصد یہی لذتیں اور خواہشیں ہیں۔

بلکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ دنیا کی مادی لذتوں و زیب و زینت کی جلوہ گری کا مذکورہ عمل اگر کسی کی طرف منسوب کیا جائے تو وہ شیطان ملعون ہے کہ جس کے بارے میں خداوند عالم نے بھی ارشاد فرمایا ہے:

سورۃ انعام، آیت: ۳۳

○ ” وَذَرَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ“

(اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لئے زینت بنا دیا)

سورۃ انفال، آیت: ۳۸

” وَإِذْ ذَرَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ“

(اور جب شیطان نے ان کے اعمال ان کے لئے زینت بنا دیئے)

ان دونوں آیتوں میں دنیا کی دفر بیوں کو شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے، البتہ جو بات اس حوالہ سے خداوند عالم کی بابت صحیح و درست ہے وہ یہ کہ اس نے اسے (شیطان کو) ایسا کرنے کی اجازت و آزادی دی ہے تاکہ بندوں کی آزمائش و امتحان کے مراحل پورے ہوں اور ان کے آزمانے میں کوئی پہلو تشنہ تکمیل نہ رہ جائے، اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت کے امور بھی صحیح سمت میں قرار پا کر موثر ثابت ہوں، چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورۃ عنکبوت، آیت: ۳

○ ” أَحْسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ○ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ

قَبْلِهِمْ فَبَيَعَلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَبَيَعَلَمَنَّ الْكٰذِبِينَ ○ أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ أَنْ يَسْبِقُونَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ○“

(کیا لوگوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ انہیں صرف زبانی طور پر یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہم ایمان لائے ہیں، چھوڑ دیا جائے گا اور ان کی آزمائش نہ ہوگی؟ جبکہ ہم نے ان سے پہلے لوگوں کا بھی امتحان لیا ہے، خدا ہر صورت میں یہ جاننا چاہتا ہے کہ سچ بولنے والے کون ہیں اور جھوٹ بولنے والے کون ہیں؟ یا برے اعمال انجام دینے والوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ وہ ہم پر سبقت لے جائیں گے، کس قدر بری سوچ ہے ان کی!)

اسی طرح درج ذیل آیت کو بھی اسی اجازت و اذن پر محمول کرنا ممکن ہے:

سورۃ انعام، آیت: ۱۰۸

○ ” كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِيٰسٰٓرَٓةِٓ اٰمَّةٍۭ عَمَّا هُمْ“

(اسی طرح ہم نے ہر امت کے لئے ان کے اعمال کو زینت بنا دیا)

بظاہر اس سے بھی یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ دراصل شیطان کو ان کے عمل کی تزئین کی اجازت و آزادی دی گئی ہو، اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ اسے اس معنی پر محمول کیا جائے جو ہم نے درج ذیل آیت مبارکہ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے:

سورۃ کہف، آیت: ۷

○ ” اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلٰى الْاَرْضِ زِينَةً لِّهَا لِيَنْبَلُوهُمْ اَلَيْسَ لَهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝“

(بے شک ہم ہی نے روئے زمین پر جو کچھ موجود ہے اسے زمین کی زینت قرار دیا ہے تاکہ لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں سے اچھا عمل کرنے والا کون ہے؟)

بہر حال تزئین اور دنیا کی جلوہ گری دو طرح سے قابل تصور ہے:

(۱) آخرت سنوارنے کے وسیلہ و ذریعہ کے طور پر!

یعنی دنیا کی چمک دمک اور اس کی زیب و زینت کا انسان کی نظروں میں جمانا اس غرض سے ہو کہ وہ اس کے ذریعے اپنی آخرت سنوارے اور اپنے اخروی ابدی مقام تک پہنچ جائے اور مال و دولت، جاہ و جلال، اولاد اور افرادی قوت سے استفادہ کرتے ہوئے زندگی کے گونا گوں عملی اقدامات میں رضائے الہی کے حصول کو یقینی بنائے اس طرح کی جلوہ گری مستحسن، خدا پسند اور دینی قدروں کا حامل عمل ہے، اسے خداوند کریم نے اپنی مقدس ذات کی طرف منسوب کیا ہے جیسا کہ سورۃ کہف کی آیت ” اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلٰى الْاَرْضِ زِينَةً لِّهَا.....“ اور دیگر سابق الذکر آیات مبارکہ کے حوالہ سے بیان کیا جا چکا ہے اور درج ذیل آیت سے بھی اس کی تائید و تصدیق ہوتی ہے:

سورۃ اعراف، آیت: ۳۲

○ ” قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ اَخْرَجَ لِعِبَادِهِۦمُ الطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ ۗ“

(کہہ دیجئے کہ کس نے دنیاوی زندگی کی اس زینت کو کہ جسے خدا نے اپنے بندوں کے لئے بنایا ہے اور پاکیزہ رزق کو حرام قرار دیا ہے!)

(۲) دنیا سے دل بستگی اور ذکر الہی سے روگردانی کی غرض سے!

یعنی دلوں میں دنیا کی چمک و دمک سے وابستگی اور فریبگی پیدا کر کے انہیں اس کی زیب و زیبائش کے نشہ میں سر مست کرتے ہوئے خدا کے ذکر اور اس کی یاد سے غافل کر دینا، تو یہ ایک شیطانی مذموم عمل ہے، ایسا کرنے کو خداوند عالم نے شیطان کی طرف منسوب کیا ہے اور اپنے بندوں کو اس سے بچ کر رہنے کی تاکید کرتے ہوئے اس کے تباہ کن نتائج و آثار سے متنبہ کیا ہے جیسا کہ سابق الذکر آیت مبارکہ ” وَذَرَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ،“ ..... سورۃ النعام، ۴۳..... (اور شیطان نے ان کے سامنے ان کے اعمال کو زینت بنا دیا) کے حوالہ میں یہ مطلب بیان کیا جا چکا ہے، اسی طرح ایک اور



مقام پر خداوند عالم نے شیطان کا بیان ذکر کیا ہے جس میں اس نے خدا سے واضح الفاظ میں یوں کہا:

سورہ حجر، آیت: ۳۹

○ ” قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَالْأَعْيُنُ يَرُؤُهُمْ أَجْمَعِينَ“

(اس نے کہا اے پروردگار! چونکہ تو نے مجھے بہکا دیا ہے لہذا میں ضرور ان کے لئے زمین میں زیب و زینت کا سامنا

فراہم کروں گا اور ان سب کو ضرور با ضرور بہکا دوں گا)

ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا:

سورہ توبہ، آیت: ۳۷

○ ” زُيِّنَ لَهُمْ سُوءُ أَعْمَالِهِمْ“

(ان کے لئے ان کے برے اعمال کو زینت و عمدہ بنا دیا گیا)

اس طرح کی دیگر آیات میں بھی مذکورہ مطلب بیان ہوا ہے۔

البتہ اس میں دوسری قسم کی نسبت اس حوالہ سے خدا کی طرف دی جاتی ہے کہ شیطان اور تمام اسباب خواہ ان کا تعلق

خیر سے ہو یا شر سے، سب ہی اپنی عملداری میں خدا کے اذن..... اور اجازت و عطا کردہ عملی آزادی..... کے دست نگر ہیں۔

(اسی مطلب کو اردو زبان میں یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ”خدا کی اجازت و حکم کے بغیر کوئی پتہ بھی حرکت نہیں کر سکتا) اور یہ اس

لئے ہے تاکہ خداوند عالم کا ارادہ نافذ ہو اور اس کی مشیت کو عملی صورت ملے اور تخلیق و ایجاد کا سلسلہ منظم رہے، اور نتیجتاً فوز و

فلاح پانے والے افراد اپنے ارادہ و اختیار کی درست و صحیح سمت میں عملداری کے ساتھ اپنی کامیابی کو یقینی بنا سکیں اور اپنے

ارادہ و اختیار کو غلط و نادرست سمت میں لے جانے والے مجرم و گناہگار عناصر بے نقاب اور کھل کر سامنے آجائیں اور ان کی

کامیابی لوگوں سے تمیز ممکن ہو۔

خلاصہ کلام یہ کہ اب تک ذکر کئے گئے مطالب سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ آیہ مبارکہ ”وَزُيِّنَ لِلنَّاسِ.....“

(اور ایگوں کے لئے زینت بنا دیا گیا.....) میں تزئین و زینت بنانے کے عمل کا فاعل خداوند عالم نہیں کیونکہ اس تزئین کی

نسبت کہ جسے آیت میں ذکر کیا گیا ہے اگرچہ خداوند عالم کی طرف اس حوالہ سے دی جاتی ہے کہ اگر اس کا مورد و مصداق

درست و بجا ہو کہ جس میں خدا کی عبادت و بندگی کی دعوت ہوتی ہے تو وہ براہ راست خدا کی طرف منسوب ہوتی ہے اور اگر اس

کا مورد و مصداق خدا کے ذکر و یاد سے دور کر دینے والا ہو تو اس کی نسبت خدا کے اذن کے حوالہ سے اس کی طرف ہوتی ہے

لیکن اس کے باوجود چونکہ آیت میں جن امور کو ذکر کیا گیا ہے اور جن چیزوں کے انتساب و استناد کا حوالہ دیا گیا ہے وہ ہرگز

براہ راست خدا کی طرف منسوب نہیں ہو سکتیں کہ اس سلسلہ میں مزید وضاحت آئندہ سطور میں آئے گی لہذا ادب القرآن اس

بات کا متقاضی ہے کہ اس عمل کی نسبت خداوند عالم کی ذات اقدس کے علاوہ دیگر کی طرف دی جائے مثلاً شیطان یا نفس (نفسانی قوتیں)۔

اس بیان سے بعض مفسرین کے اس قول و نظریہ کی صحت آشکار ہو جاتی ہے جنہوں نے کہا کہ ”زین“ (فعل مجہول الفاعل) کا فاعل، شیطان ہے، یعنی شیطان نے ان چیزوں کو لوگوں کے لئے زینت بنا دیا ہے کیونکہ نفسانی خواہشوں کی محبت ایک مذموم چیز ہے اور اسی طرح مال و دولت کی محبت بھی ایک مذموم چیز ہے، جبکہ خداوند عالم نے اپنے آپ کو جن چیزوں سے مختص ..... یا جو چیزیں اپنے ساتھ مخصوص ..... قرار دی ہیں ان کا ذکر آیت کے آخری جملوں میں اور اس کے بعد والی آیت میں کیا ہے۔ (اس آیت میں ارشاد فرمایا: ”وَ اللّٰهُ عِنْدَ كَسْبِ النَّاسِ“ (اور اللہ کے پاس بہترین انجام کار ہے) اور بعد والی آیت میں بہشت کے باغات وغیرہ کا تذکرہ ہے۔

اسی طرح اس بیان سے اس مفسر کے قول و نظریہ کی عدم درستی بھی واضح ہو جاتی ہے جس نے کہا کہ آیت مبارکہ میں طبع بشری کی بابت بحث و گفتگو ہو رہی ہے لہذا جس محبت و چاہت اور اس طرح کے دیگر امور کا سرچشمہ اور اصل و اساس طبع بشری ہو ان کی نسبت کسی صورت میں شیطان کی طرف نہیں دی جاسکتی، بلکہ صرف ”وسوسہ“ اور اس جیسے دیگر امور کہ جو برے اعمال کو انسان کی نظر میں اچھا دکھاتے ہیں ان کی نسبت شیطان کی طرف ہوتی ہے۔ کہ وہ اس طرح لوگوں کو درغلا تا ہے اور ان کی نگاہوں میں برے اعمال کو مزین کرتا ہے جس کے نتیجے میں لوگ ان اعمال کی انجام دہی و ارتکاب کی راہ پر چل پڑتے ہیں.....

اس مفسر نے اپنے نظریہ کی صحت پر استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ اسی وجہ سے قرآن مجید نے صرف اعمال کی تزئین یعنی ان کے ظاہری طور پر مزین کرنے کے عمل کو شیطان کی طرف منسوب کیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۃ انفال، آیت ۴۸:

○ ”وَ اِذْ زَيَّنَّا لَهُمُ الشَّيْطٰنَ اَعْبَابَهُمْ“

(اور جب شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لئے مزین کر دیا)

سورۃ النعام، آیت: ۲۳

○ ”وَ زَيَّنَّا لَهُمُ الشَّيْطٰنَ مَا كَانُوْا يَعْصُوْنَ“

(اور شیطان نے ان کے کاموں کو ان کے لئے مزین کر دیا)

لیکن جہاں تک حقائق اور طبائع اشیاء کا تعلق ہے تو ان کی نسبت صرف سوائے خدائے حکیم و دانایا اور واحد و یکتائے لا شریک کے سوا کسی کی طرف نہیں دی جاسکتی، چنانچہ اس کا ارشاد گرامی ہے:

سورۃ کہف، آیت: ۷

” اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زَيْنَةً لِّهَا لِيَبْكُوهُمُ الَّذِي هُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝“

(ہم ہی نے روئے زمین پر پائی جانے والی چیزوں کو زمین کی زینت قرار دیا ہے تاکہ انہیں آزمائیں کہ ان میں

اچھا عمل کرنے والا کون ہے؟)

سورۃ انعام، آیت: ۱۰۸

” كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۝“

(اسی طرح ہم نے ہر امت کے لئے ان کے عمل کو زینت بنا دیا)

ان آیتوں میں امتوں کے بارے میں بات ہوئی ہے جو کہ معاشرہ کی طبائع کے بارے میں بات کرنے سے

عبارت ہے۔

مذکورہ بالا نظریہ و قول کی عدم درستی کی تفصیل یہ ہے کہ :

ان کا یہ کہنا کہ حقائق و طبائع اشیاء خدائے حکیم و لاشریک کی طرف منسوب ہوتی ہیں بالکل درست ہے لیکن ان کا یہ کہنا درست نہیں کہ آئیہ مبارکہ میں طبع بشری اور اس کے آثار کے بارے میں بات ہوئی ہے، وہ اس سلسلہ میں غلط فہمی میں مبتلا ہوئے ہیں کیونکہ جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا کہ اس سورۃ مبارکہ میں صرف اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ خداوند عالم اپنی تمام مخلوق پر قومیت رکھتا ہے (ان کے تمام امور کا ذمہ دار ہے، مخلوق کے تمام امور اس کے ہاتھ میں ہیں، وہ مخلوق کے تمام امور پر نظر رکھتا ہے اور ان کا نگران ہے..... م) ان کے تمام امور یعنی ان کی تدبیر، ایمان و کفر اور اطاعت و نافرمانی سب اس کی نظر میں ہیں اور اس کے احاطہ قدرت و دائرہ تسلط میں ہیں، اس نے تمام مخلوق کو پیدا کیا اور انہیں ان کی سعادت و خوش بختی کی راہیں دکھائیں، اور جن لوگوں نے دین خداوندی میں نفاق سے کام لیا یا اس کی آیات کا انکار کر کے کافروں میں سے ہو گئے یا اہل کتاب میں سے وہ لوگ کہ جنہوں نے خدا کی کتاب میں اختلاف کر کے بغاوت کا ارتکاب کیا اور خلاصہ یہ کہ وہ سب لوگ کہ جنہوں نے شیطان کی اطاعت کی اور نفسانی خواہشوں کا اتباع و پیروی کی وہ ہرگز خدا کو بے بس نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس پر غلبہ پاسکتے ہیں اور نہ اسے مغلوب کر کے اس کی قومیت کے عظیم و مضبوط سلسلہ کو کمزور کر سکتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پوری کائنات اور عالم ہستی کی تمام موجودات تقدیر الہی و تدبیر خداوندی سے وابستہ ہیں کہ خداوند عالم نے اپنی مخلوق کے تمام امور کو نظام الاسباب سے جوڑ دیا ہے تاکہ امتحان و آزمائش کا قانون مضبوط و مستحکم بنیاد پر قائم و نافذ ہو، بنا برائیں وہ خالق ہے اور اس ہی نے موجودات کی طبیعتوں..... طبائع اشیاء..... اور ان کی قوتوں، ان کی چاہتوں اور ان کے افعال کو خلق فرمایا تاکہ

وہ ان کے ذریعے اپنے پروردگار کے مقدس جوار کہ جو اس کے قرب و بزرگی کا مقام ہے کی طرف رواں دواں ہوں، اور یہ خدا ہی ہے جس نے ابلیس کو اذن و آزادی دی ہے اور اسے لوگوں کو دوسوسوں کا شکار کرنے سے..... جبراً..... نہیں روکا ہے اور نہ ہی انسان کو شیطانی دوسوسوں کی پیروی کرنے سے..... جبراً..... روکا ہے..... بلکہ انسان اور اس کے دشمن ابلیس دونوں کو آزاد چھوڑ دیا ہے اور انہیں کسی حوالہ سے بھی اپنی طرف سے مجبور و بے بس نہیں کیا..... تاکہ امتحان و آزمائش کا سلسلہ و نظام قائم و جاری ہو اور اللہ تعالیٰ یہ جان لے کہ ایمان لانے والے افراد کون ہیں اور پھر نامیوں سے کچھ کو گواہ قرار دے۔ اور اس مطلب کو زیر نظر سورۃ مبارکہ میں خداوند عالم نے اس لئے ذکر کیا تاکہ اس طرح مومنین کے نفوس کو تسلی اور ان کے دلوں کو اطمینان حاصل ہو کیونکہ اس سورۃ مبارکہ کے زمانہ نزول میں اہل ایمان نہایت تنگی و سختی اور اندرونی طور پر شدید ترین بحران و کڑی آزمائش کا شکار تھے، اس صورتحال کی وجوہات یہ تھیں:

(۱) منافقوں کی نفاق آمیز چالیں و حرکتیں،

(۲) مریض دل افراد کی جہالت، کہ جس کے باعث انہوں نے امور زندگی کو درہم برہم کر کے ہر چیز کو الٹ پلٹ کر دیا،..... حقائق کو غلط رنگ دے کر اذہان و افکار کو سیدھی راہ سے دور کر دیا،.....

(۳) اطاعت خدا اور رسولؐ کی بابت کوتاہی،

یہ تو تھے داخلی اسباب، اس کے علاوہ بیرونی عوامل بھی کافر تھے کہ جن میں درج ذیل امور سرفہرست ہیں:

(۱) دعوت اسلام کی دشوار ترین صورتحال اور تبلیغ دین کی راہ میں رکاوٹیں۔

(۲) کفار عرب کی وسیع اور ہمہ پہلو سازشیں اور عملی طور پر تخریبی اقدامات،

(۳) اہل کتاب بالخصوص یہودیوں کی معاندانہ کاروائیاں۔

(۴) روم و عجم کے کافروں کی طرف سے طاقت کے استعمال اور عسکری اقدامات کی دھمکیاں۔

یہ تمام کفار اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے افراد، دنیا اور اس کی زیب و زینت کے دھوکے میں آ کر اس غلط فہمی میں

بتلا ہو گئے کہ یہی چیزیں ان کی زندگی کا مقصد اعلیٰ ہیں، دراصل وہ راہ کو منزل اور راستہ کو مقصد سمجھ بیٹھے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اصل منزل و مقصد تو اس دنیا کے بعد اور اس سے کہیں بالاتر ہے۔

بہر حال اس سورۃ مبارکہ میں جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں امتوں کی طبائع..... اور وجودی قوتوں و فطری

مزاجوں..... کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے البتہ اس کا دائرہ طبائع تک محدود نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے کہ جس میں

لوگوں کی خلقت و آفرینش اور ان کی وجودی نکتوں کے مراحل سمیت ان کی زندگی کی تمام جہات و صفات اور خصائیس و

عادات، سعادت بخش و شقاوت آفرین اعمال اور اطاعت و معصیت پر مبنی افعال سب شامل ہیں، اس قرآنی بیان سے یہ امر

واضح ہوتا ہے کہ انسان اپنی ذات و صفات اور اعمال و عادات سب میں خداوند عالم کی قیومت میں ہے، خدا اپنی قدرت میں کسی کے زیر دست نہیں ہو سکتا..... وہ قاهر ہے مقہور نہیں..... وہ اپنے امر و نظام میں کسی سے مغلوب واقع نہیں ہو سکتا..... وہ غالب ہے مغلوب نہیں..... نہ دنیا میں مقہور و مغلوب ہو سکتا ہے اور نہ ہی آخرت میں! دنیا میں اس طرح کہ سب کچھ اس کے اذن و اجازت اور اس کی عطا کردہ آزادی عمل سے ممکن الوقوع ہوتا ہے اور اس نے لوگوں کی آزمائش و امتحان کے لئے ایسا کیا ہے، اور آخرت میں اس طرح کہ وہ جزا و سزا کا عالم ہے کہ جس نے نیک عمل انجام دیا اسے جزا ملے گی اور جس نے برا عمل انجام دیا اسے سزا ملے گی..... لہذا وہاں کسی کا خدا پر غلبہ پانا قابل تصور ہی نہیں.....

اسی طرح زیر نظر آیات مبارکہ (۱۸ تا ۱۰) یعنی ”إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِي عَنْهُمْ آهْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا.....“ تا ”شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ.....“ اس مطلب کو بیان کرتی ہیں کہ کفار نے اگرچہ اپنے رب کی آیات و نشانیوں کو جھٹلا دیا اور خدا کی ان نعمتوں کو بدل دیا جو اس نے انہیں عطا کیں تاکہ وہ ان نعمتوں کے ذریعے رضائے الہی اور اس کی بہشت کے حصول کو یقینی بنا سکیں لیکن انہوں نے انہی نعمتوں کو سب کچھ سمجھ لیا اور اپنے آپ کو اپنے پروردگار سے بے نیاز جاننے لگے اور اپنے رب کے مقام و منزلت کو بھول گئے، اس کے باوجود وہ خدا کو بے بس نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس پر غلبہ پا سکتے ہیں، خداوند عالم بہت جلد انہیں ان کے انہی اعمال کو ان کے گلے کا طوق بنا دے گا اور ان کے مقابلے میں اپنے مومن بندوں کی حمایت و تائید اور نصرت و تقویت کرے گا اور ان کافروں کو دوزخ کی طرف ڈھکیل دے گا جو کہ بہت برا ٹھکانہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ جس چیز کا سہارا لئے ہوئے ہیں اور اسے ہی سب کچھ سمجھ رہے ہیں وہ دنیاوی زندگی کا نہایت معمولی سا زوسامان اور متاع ناچیز ہے جبکہ خدا کے پاس بہترین ٹھکانہ اور عمدہ مقام ہے، بنا بریں یہ امر واضح ہو گیا کہ ان آیات مبارکہ میں کافروں کی طماع کے بارے میں بحث و گفتگو ہوئی ہے لیکن نہایت وسیع انداز میں! کہ جس میں ان کے اعمالی صالحہ و غیر صالحہ سب شامل ہوں۔

ان تمام مطالب سے قطع نظر اگر صرف اسی آیت ”كذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ“ پر غور کریں کہ جسے مذکورہ بالا مفسر نے بطور شاہد پیش کیا ہے اور اس کے ذریعے اس امر پر استدلال کیا ہے کہ حقائق خدا کی طرف جبکہ اعمال شیطان کی طرف منسوب ہوتے ہیں تب بھی اس سے اس مفسر کے نظریہ کی صحت و درستی ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس کے برعکس مطلب کا ثبوت ملتا ہے اور جو کچھ ہم نے ذکر کیا اس کی تائید ہوتی ہے، اصل آیت ملاحظہ کریں:

سورہ انعام، آیت ۱۰۸:

”وَلَا تَسْبُوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسْبُوا اللَّهَ عَدُوًّا بَعِيدٍ عَلِيمٌ ۗ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰﴾“

(اور تم برانہ کہو ان کو جنہیں وہ خدا کے علاوہ پکارتے ہیں ورنہ وہ دشمنی و جہالت کی بناء پر خدا کو برا کہنے لگیں گے، اس طرح ہم نے ہر امت کے لئے ان کے اعمال کو زینت بنایا۔ پھر ان کی بازگشت ان کے پروردگار کی طرف ہوگی، وہ انہیں ان کے اعمال سے باخبر کرے گا)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں اعمال سے مراد ان کے برے اعمال ہیں۔

اس بیان و وضاحت کے بعد اس مفسر کے قول کا باطل ہونا ثابت ہو جاتا ہے جس نے کہا کہ اعمال کو زینت دینا دو طرح کا ہے، ایک پسندیدہ اور دوسرا مذموم و ناپسندیدہ، اور اعمال بھی دو طرح کے ہیں، ایک اچھے اور دوسرے برے، اور ان میں سے جو پسندیدہ، قابل تعریف اور اچھے ہیں وہ خدا کی طرف منسوب ہوتے ہیں اور باقی شیطان کی طرف! یہ قول اگرچہ ایک حوالہ سے بعض جہات میں قرین صحت ہے لیکن اس کی صحت مستقیم و بلا واسطہ نسبت کے دائرے میں محدود ہے کہ جسے ”فعل“ اور اس طرح کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور اس بناء پر کہا جاتا ہے کہ خداوند عالم کوئی فعل سوائے اچھے و خوبصورت کے، انجام ہی نہیں دیتا اور وہ برائی و گندے کام کا حکم نہیں دیتا۔ لیکن جہاں تک غیر مستقیم اور بالواسطہ نسبت کا تعلق ہے جسے ”اذن“ (عملی آزادی دینے) اور اس طرح کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس حوالہ سے تمام اعمال کی نسبت اس کی طرف دی جاسکتی ہے اس میں کوئی مانع نہیں کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو اس کا ہر چیز کا رب، خالق اور مالک ہونا بے معنی ہو جائے گا اور ان امور میں ہر طرح کے شریک کی نفی کرنا صحیح قرار نہ پائے گا جبکہ قرآن مجید اس طرح کی نسبت سے بھرا ہوا ہے، مثلاً:

سورۃ رعد، آیت: ۲۷

○ ”يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ“

(وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے)

سورۃ صف، آیت: ۵

○ ”أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ“

(خدا نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا)

سورۃ بقرہ، آیت: ۱۵

○ ”اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي ضَعْيَانِهِمْ“

(اللہ ان کا استہزاء کرتا ہے اور انہیں ان کی سرکشی میں چھوڑ دیتا ہے)

سورۃ اسراء، آیت: ۱۴

○ ” اَمْرًا مُّشْتَرَفٍ فِيهَا فَفَسَقُوا“

(ہم نے ان کے مالدار لوگوں کو حکم دیا تو انہوں نے فسق کیا)

اس مطلب پر مشتمل دیگر متعدد آیات موجود ہیں۔

ان مفسرین کرام کی غلط فہمی کا اصل سبب یہ ہے کہ انہوں نے اشیاء و موجودات عالم ہستی اور ان کے آثار و افعال کے درمیان پائے جانے والے ربط و تعلق کی بابت اچھی طرح بحث و تحقیق نہیں کی اور یہ گمان کر بیٹھے کہ ان اشیاء و امور میں سے ہر ایک کو اپنی مستقل حیثیت حاصل ہے اور کوئی کسی دوسرے سے ربط و تعلق نہیں رکھتا بلکہ ہر شے موجودات عالم میں پائے جانے کے باوجود ان سے الگ و مستقل حیثیت رکھتی ہے اور اسے اپنے ماقبل اور مابعد کی اشیاء و موجودات سے ہرگز کوئی ربط و تعلق نہیں۔

مذکورہ بالا غلط فہمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اسباب و علل کی کارگزاری کے نتیجہ میں وجود میں آنے والی ہر چیز کو مستقل حیثیت دے کر مربوط سبب و علت کے اسی نظام کا حصہ اور اس سے وابستہ قرار دیا جسے خداوند عالم نے موجودات عالم کے لئے مقرر فرمایا ہے لیکن اس طرح کہ کسی چیز کا وجود میں آنا کسی بھی دوسری چیز سے کوئی ربط و تعلق نہیں رکھتا اور کوئی شے کسی شے سے وابستگی نہیں رکھتی بلکہ ہر چیز اپنی استقلالی حیثیت میں اپنے ہی سبب و علت سے تعلق رکھتی ہے کسی دوسرے سبب و علت سے یا کسی دوسری چیز کے سبب و علت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں رکھتی لہذا ہر واقعہ اور وجود میں آنے والا امر اپنے ہی اسباب کی بدولت وجود میں آیا اور ہر فعل اپنے فاعل ہی کی عملداری کا نتیجہ ہے اور اس کے علاوہ ہر ایک سے کٹا ہوا ہے یعنی منقطع الوجود ہے لہذا کوئی دوسرا سبب و عامل اس کے وجود میں آنے میں دخل نہیں اور نہ ہی اس کی وجود پذیری میں اس سے متصل سبب کے علاوہ کسی سبب کا کوئی حصہ و کردار ہے، بنا بریں ستارے و سیارے اپنی گردش میں، دریا و سمندر اپنی روانی میں، کشتیاں اپنے چلنے میں، زمین اپنے اوپر چلنے والوں کا بوجھ اٹھانے میں، نباتات اپنی نشوونما میں، حیوانات اپنے چلنے پھرنے میں اور انسان اپنی زندگی بسر کرنے اور کام کاج میں، کوئی کسی سے نہ کوئی روحانی تعلق رکھتا ہے اور نہ ہی جسمانی، اور نہ ہی ان کے درمیان کسی طرح کی مادی و جسمانی وحدت پائی جاتی ہے اور نہ قوت و صلاحیت کے حوالہ سے ان کے درمیان کوئی ہم آہنگی و یکجہتی موجود ہے۔

اس غلط نتیجہ گری کا طبعی اثر یہ ہوا کہ انہوں نے اشیاء و موجودات کی وجود پذیری میں ایک دوسرے سے لا تعلق ہونے کے نظریہ کو وسعت دے کر اعمال کے عناوین اور افعال کی صورتوں میں بھی عدم وحدت و ناہم آہنگی کا گمان کر لیا اور یہ خیال کرنے لگے کہ خیر و شر، سعادت و شقاوت، ہدایت و گمراہی، اطاعت و منہیت، کسی سے نیکی و اچھا سلوک کرنا اور برائی یا

برابر تاؤ کرنا اور عدل و ظلم وغیرہ کے درمیان اصل وجود پذیری میں ایک دوسرے سے کوئی ربط و تعلق نہیں بلکہ وہ سب ایک دوسرے سے منقطع، متفرق، غیر متصل اور غیر مربوط وغیر مربوط ہیں، ان میں سے کوئی، دوسرے کے وجود میں آنے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

یہ حضرات اپنے اس نظریہ میں اس حقیقت سے غفلت کا شکار ہو گئے کہ یہ عالم گونا گوں موجودات اور مختلف مخلوقات کے ساتھ اس طرح سے ہے کہ اس کے اجزاء ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور اس میں پائی جانے والی اشیاء ایک دوسرے سے پیوستہ و وابستہ ہیں، اس کی کوئی ایک چیز، دوسری چیز میں بدلتی رہتی ہے اور اس کا ایک حصہ، دوسرے حصہ میں تبدیل ہو جاتا ہے، مثلاً ایک دن انسان ہے تو دوسرے دن گھاس و نبات، پھر تیسرے دن جماد و خاک ہو جاتا ہے۔ کسی دن یکجا ہے تو کسی دن متفرق، اک دن زندہ ہے تو دوسرے دن مردہ، اور اس کی زندگی بچینہ دوسرے کی موت ہے، ایک دن نیا ہے تو ب دوسرے دن پرانا، اور اس کا نیا ہونا بچینہ دوسرے کا پرانا ہونا ہے۔ اسی طرح جو واقعات رونما ہوتے ہیں وہ سب حلقہ ہائے زنجیر کی طرح ایک دوسرے سے مربوط اور وابستہ و پیوستہ ہیں کہ ان میں سے جس واقعہ کا تصور کریں وہ اپنے مقارن اور نزدیک ترین واقعہ و واقعات میں مؤثر دکھائی دیتا ہے بلکہ اپنے سے پہلے رونما ہونے والے اور قدیم ترین واقعات میں بھی اس کی اثر گزاری کا مشاہدہ ہوتا ہے اور یہ تمام واقعات کہ جو عالم طبیعت میں رونما و وقوع پذیر ہوتے ہیں ان کی حیثیت زنجیر کے ان حلقوں جیسی ہے کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو کھینچیں تو گویا آپ نے پوری زنجیر کو اس کے تمام حلقوں کے ساتھ کھینچا ہے، اس نسبت سے اس عالم مادی میں بھی اگر ایک ذرہ میں تبدیلی کا تصور کریں تو پورے عالم میں تبدیلی کا تصور پیدا ہو جائے گا خواہ وہ تبدیلی ہمارے علم و ادراک کے دائرے سے باہر اور ہمارے احساس سے مخفی و پوشیدہ ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ کسی چیز کو نہ جاننا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا اور یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ جو صدیوں سے علمی، بحثوں اور علم و تحقیق کے حلقوں میں مسلم الثبوت قرار پا چکا ہے اور جدید طبعی و سائنسی علوم نے بھی اس کی حقانیت کو ثابت کر دیا ہے اور ریاضیات کی ترقی یافتہ تحقیق نے بھی اسے نہایت واضح حقیقت کے طور پر تسلیم کیا ہے، اور ان تمام علمی و فلسفی اور ریاضی و سائنسی تحقیقات سے بہت پہلے اور اس سے پہلے کہ ہم ان تحقیقات اور دوسروں کی کتب کا مطالعہ کر کے اس حقیقت کے بارے میں استقلالی نظریہ قائم کریں قرآن مجید نے ہمیں اس قاعدہ کلیہ کی بابت نہایت خوبصورت انداز میں آگاہ و مطلع کیا ہے اور ارشاد فرمایا کہ عالم طبیعت میں جاری و ساری نظام ایک مضبوط سلسلہ و پیوستگی کا حامل ہے اور آسمانوں اور زمین میں موجود جاری نظاموں کے درمیان ایک مربوط سلسلہ قائم ہے کہ ان میں سے ہر ایک، دوسرے سے وابستہ اور اس میں مؤثر ہے، اس طرح وہ سب تخلیق عالم کی غرض اعلیٰ کی تکمیل میں برابر کے شریک ہیں، ان سب میں تقدیر الہی نافذ ہے جو انہیں معاد اور قیامت کے دن کی طرف لئے جا رہی ہے..... یہ سب اشتراک عمل کے ساتھ خدا کے مقرر نظام کے سایہ میں بسوئے محشر سفر کر رہے ہیں.....، کہ بلا آخر سب کی بازگشت

صحیح سیکینسٹان  
حیدرآباد، سندھ، پاکستان



تیرے پروردگار کی طرف ہے (وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنْتَهَىٰ)..... سورہ غم، آیت ۲۲..... **پہر دریا پادہ سکتہ، پکاسیاب**  
 اشیاء و موجودات عالم کے ساتھ ساتھ افعال کے اوصاف اور اعمال کے عناوین میں بھی ارتباط و وابستگی اور پونجی کا  
 رشتہ پایا جاتا ہے اور وہ رشتہ ارتباط اس طرح سے ہے جیسے دو متناقض و متقابل امور کے درمیان ہوتا ہے کہ ان میں سے اگر  
 ایک موجود نہ ہو تو دوسرے کا تصور ہی درست نہ ہوگا جیسا کہ تخلیق و ایجاد کے حوالہ سے مشاہدہ ہوتا ہے کہ ایک چیز کا وجود میں  
 آنا کسی دوسری چیز کے نابود ہونے پر موقوف ہوتا ہے اور سابق کی پہچان، لاحق ہی کے ذریعے ممکن ہوتی ہے۔ اسی طرح اعمال  
 میں سے اگر ایک وصف وجود میں نہ آئے تو دوسرے وصف کا وجود میں آنا قابل تصور ہی نہیں اور جب تک کسی ایک عمل کی  
 وجودی صورت گری کھل نہ ہو دوسرے عمل کے وجودی آثار انسانی طبیعتی و مادی معاشرے میں ظاہر ہی نہیں ہوتے، یہی حال  
 خدائی معاشرہ کا ہے کہ جو ”دین حق“ سے عبارت ہے کہ اس میں بھی دو مد مقابل امور و اعمال میں سے ہر ایک، دوسرے کی  
 پہچان کر داتا ہے چنانچہ اطاعت الہی جو کہ ایک حسن و نیکی ہے اور اس کا نیکی ہونا اس بناء پر ہے کہ اس کے مد مقابل معصیت و  
 نافرمانی ایک سیئہ و برائی ہے۔ اور حسن و نیکی..... یا نیک عمل..... اس لئے موجب اجر و ثواب ہے کہ اس کے مقابل سیئہ و  
 برائی..... یا برائے عمل..... سزا و عقاب کا باعث ہے۔ اور اجر و ثواب کا نیک عمل انجام دینے والے کے لئے محبوب و پسندیدہ اور  
 لذت بخش ہونا اس لیے ہے کہ سزا و عقاب برائے عمل انجام دینے والے کے لئے تکلیف دہ و دردناک ہے، اور ثواب کی لذت  
 ایک سعادت ہے کہ جس سے بہرہ ور ہونے کی خواہش ہر دل میں ہوتی ہے اور وہ اس لئے ہے کہ عقاب کی تکلیف و درد ایک  
 شقاوت و بدبختی ہے کہ جس سے ہر شخص دوری اختیار کرتا ہے، اور سعادت ایک ایسی پاکیزہ شے ہے جس کا حصول ہر شخص بلکہ  
 تمام موجودات کی تخلیق کا بنیادی مقصد و مقصود ہے جبکہ شقاوت ایسی شے ہے جس سے تمام موجودات روگردانی کرتی ہیں، اگر  
 سعادت کی مطلوبیت، محبوبیت و مرغوبیت اور شقاوت سے دوری و روگردانی نہ ہوتی تو موجودات کا وجودی تشخص ہی باقی نہ رہتا  
 اور عالم طبیعت میں کوئی وجود ہی نہ ہوتا۔

بنا برائے اطاعت، پھر حسن و نیکی، پھر لذت اور پھر سعادت معصیت، پھر عقاب، پھر درد و الم اور پھر شقاوت کے  
 بالمقابل قرار پاتے ہیں، ان میں سے جب بھی کوئی ایک چیز ظہور پذیر ہوتی ہے تو اس کے مد مقابل شے پڑے میں چلی جاتی  
 ہے اور جب وہ پہلی شے مرجاتی ہے تو دوسری زندہ ہو جاتی ہے۔ تو اس صورت میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ ان میں سے کسی چیز کے  
 اپنانے و اختیار کرنے کی دعوت دی جائے جبکہ اس کے مد مقابل شے سے باز رہنے کا نہ کہا جائے؟ اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ مادی  
 اغراض اور نفسانی خواہشوں کی طرف بلایا جائے جبکہ اس کے مخالف و مد مقابل امر کا اپنانا بھی ممکن و روا ہو؟

مذکورہ بالا مطالب سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حکمت و دانائی اس بات کی متقاضی ہے کہ یہ عالم جس طرح  
 صلاح و اچھائی پر مشتمل ہے اسی طرح فساد و برائی بھی اس میں پائی جانی چاہیے اور جس طرح اطاعت و فرمان برداری کے

مظاہر اس میں پائے جاتے ہیں اسی طرح معصیت و نافرمانی بھی اس میں پائی جائے اور ایسا ہونا خداوند عالم کے اس نظام خلقت و آفرینش اور تخلیق و ایجاد کے بنیادی ضابطوں کے عین مطابق ہے جو اس نے عالم ہستی اور اس کی موجودات کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ البتہ اس فرق کے ساتھ کہ اعمال اور ان کے اوصاف و خصوصیات کے علاوہ دیگر تمام امور و اشیاء اور حقائق و وجودات میں ہر طرح کی نسبت خداوند عالم کی طرف ہے کیونکہ خلق و امر صرف اسی کے لئے ہے اور اس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ وہی پورے عالم اور موجودات جہان ہستی کا یکتا خالق و مالک اور مختار ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ سعادت بخش اعمال بھی اس کی طرف منسوب ہوتے ہیں کیونکہ ہدایت و رہنمائی کی نسبت مستقیم و بلا واسطہ اسی کی طرف ہے اور وہ بھی اس لئے کہ اس کی عطا کردہ ہدایت ہی سرچشمہ سعادت ہے۔ اور جہاں تک شقاوت آمیز اعمال اور ان جیسے دیگر امور کا تعلق ہے مثلاً شیطانی وسوسے، نفسانی خواہشوں کا انسان پر تسلط اور ظالم و مستغمر افراد کا لوگوں پر حاکم و فرمانروا ہونا وغیرہ تو ان امور کی نسبت خداوند عالم کی طرف بالواسطہ ہے اور وہ اس طرح کہ خداوند عالم نے لوگوں کو اذن و آزادی عمل عطا کی اور لوگوں نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ہدایت کے راستہ کو چھوڑ دیا تو اس کے نتیجے میں خداوند عالم نے انہیں حق سے محروم کر دیا اور رسوائی و ذلت اور نرزالان سے دوچار کر دیا..... گویا اس کا سبب لوگوں کا سوء اختیار اور غلط انتخاب ہے جس کی سزا کے طور پر گمراہی و رسوائی ان کا مقدر بن گئی اور خدا کی طرف سے انہیں حق سے دوری و محرومی کا سامنا کرنا پڑا..... اسی حوالہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ خداوند عالم نے شیطان کو اذن و اجازت..... اور آزادی عمل..... دی کہ وہ لوگوں کو وسوسوں کا شکار کر سکے اور ان کے دلوں کو اپنی طرف موڑ سکے، اسی طرح خدا نے انسان کو نفسانی خواہشوں کی پیروی سے اجتناب پر مجبور نہیں کیا اور نہ ہی وہ ظالم اور اس کے ظلم کے سامنے دیوار بنایا یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ سعادت و شقاوت دونوں ہی اختیاری اور لوگوں کے اپنے ہی انتخاب پر موقوف ہیں۔ لہذا جو شخص سعادت مند ہو وہ اپنے اختیار کردہ راستہ پر چلنے کی وجہ سے ہوا اور جو شقاوت و بدبختی سے دوچار ہو وہ بھی اپنے ہی اختیار کے ساتھ ہوا کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو حجت ہی پوری نہ ہوتی اور اختیار و انتخاب اور امتحان و آزمائش کا نظام ہی قائم نہ ہوتا۔

اس مقام پر یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ ان دانشوروں اور محققین کے لئے مذکورہ بالا موضوعات و مباحث میں کھل کر بحث و گفتگو کرنے میں جو چیز مانع ہوئی وہ (ان کے اپنے گمان کے مطابق) ان بحثوں سے ظاہر ہونے والے نہایت سنگین نتائج کے سوا کچھ نہ تھی، اور وہ ان نتائج سے نہایت خوفزدہ ہو گئے مثلاً ان دانشوروں میں سے جبر کا عقیدہ رکھنے والے حضرات نے یہ گمان کیا کہ اگر وہ اشیاء عالم اور موجودات جہان ہستی کی بابت ان کے ایک دوسرے سے مربوط و وابستہ ہونے اور ان میں اسباب کی لازمی اثرگزاری کے قائل ہو جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خداوند عالم کو ان چیزوں سے لاتعلقی اور ان کی بابت بے بس جانیں اور اس کا اپنی مخلوقات ہی کی بابت بے اختیار ہونا تسلیم کر کے اس کی قدرت مطلقہ کا انکار کریں، اور ان

کے علاوہ دیگر دانشوروں... تفویض کا عقیدہ رکھنے والوں... نے یہ گمان کیا کہ اگر وہ مذکورہ مطلب کو تسلیم کریں اور اعمال کی بابت یہ نظریہ قائم کریں کہ ان کی نسبت و اسناد خداوند عالم کے ارادہ و قدرت کی طرف ہے اور وہی ان میں مؤثر اور اصل بنیاد ہے تو وہ لازمی طور پر خدا کی مخلوق یعنی انسان کے بے اختیار ہونے کے قائل ہوں گے اور انسان کے بے اختیار ہونے کے نتیجہ میں ثواب و عقاب کا نظام اور شرعی احکام و عملی دستورات کا خدا کی سلسلہ ختم و بے اساس ہو کر رہ جائے گا۔

جبر و تفویض کا عقیدہ رکھنے والے حضرات کا مذکورہ بالا نتائج سے خوفزدہ ہونا بیجا و نادرست ہے کیونکہ ان کے لئے یہ بات ممکن تھی کہ وہ کسی خوف و وحشت کا شکار ہونے کی بجائے کلام الہی سے دل لگاتے اور اس سے حقیقت الامر سے آگاہی کی نعمت حاصل کرتے چنانچہ خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے:

سورۃ یوسف، آیت: ۲۱

○ ” وَاللّٰهُ عَلِيْبٌ عَلٰی اَمْرٍہَا“

(اور اللہ اپنے امر پر غلبہ رکھتا ہے)

سورۃ اعراف، آیت: ۵۴

○ ” اَلَا لَہُ الْحَقُّ وَالْاَمْرُہَا“

(یاد رکھو، اسی کے لئے ہے خلق اور امر،) یعنی تخلیق اور نظام ہستی کا اختیار اسی کے پاس ہے.....

سورۃ یونس، آیت: ۵۵

○ ” لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِہَا“

(خدا ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے)

یہ آیات مبارکہ اور ان سے مشابہ دیگر آیات و شریفہ زیر بحث موضوع کی بابت واضح دلیل و برہان کی نشاندہی کرتی ہیں (اور اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ اشیاء و موجودات عالم کے درمیان ایک مضبوط اور ارتباطی سلسلہ قائم ہے اور اس سے نہ تو خدا کی قدرت و اختیار سلب ہوتا ہے اور نہ ہی انسان کا بے بس و مجبور ہونا ثابت ہوتا ہے) البتہ اس موضوع کی بابت بعض مربوطہ مطالب سورۃ بقرہ کی آیت ۲۶ ” اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَعِیْجُ اَنْ یُّقَرِّبَ مَثَلًا .....“ کی تفسیر میں بیان ہو چکے ہیں۔

بہر حال اب ہم اپنی زیر بحث آیت مبارکہ ”رُزِیْنَا لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّہَوٰتِ“ کی بابت جاری سلسلہ گفتگو کی طرف واپس آتے ہیں اور واضح طور پر بیان کرتے ہیں کہ بظاہر فعل ”زین“ کا قائل خدا نہیں بلکہ شیطان ہے یا نفس ہے کیونکہ:

(۱) اس مقام پر کفار کی مذمت کی گئی ہے اور مال و اولاد جیسی مادی لذتوں سے دل لگانے اور ان چیزوں کو ان کی نظروں میں زینت دے کر انہیں خدا سے بے نیاز ہونے کا احساس دلانے کو نہایت بری اور تھارت کی نظر سے دیکھا گیا ہے، تو ظاہر ہے کہ اس طرح کی زینت جو کہ خدا کے ذکر سے غافل کر دیتی ہے اس کی نسبت خداوند عالم کی طرف ہرگز نہیں دی جاسکتی کہ اس کی شان و عظمت اس طرح کی نسبتوں سے بالاتر ہے۔

(۲) اگر زینت دینے کی نسبت خدا کی طرف ہو تو یقیناً اس سے ان فطری چاہتوں کا عطا کیا جانا مراد ہوگا جو انسان کے وجود میں پائی جاتی ہیں، اس صورت میں مناسب و موزوں یہ تھا کہ آیت میں ”لِلنَّاسِ“ کے بجائے ”لِلانسان“ کا لفظ استعمال کیا جاتا ”بنی آدم“ اور اس طرح کے الفاظ ذکر کئے جاتے جیسا کہ دیگر مقامات میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں، ملاحظہ ہو:

سورۃ تین، آیت: ۵

○ ”لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَفَلَيْنَ ۝“

(ہم نے انسان کو نہایت عمدہ بنیاد پر خلق کیا ہے، پھر ہم نے اسے پست ترین مقام پر پلٹا دیا)

سورۃ اسرئ، آیت: ۷۰

○ ”وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ“

(اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور انہیں میدان میں اور دریا میں سواری دی)

پہلی آیت میں لفظ ”انسان“ جبکہ دوسری آیت میں لفظ ”بنی آدم“ ذکر کیا گیا ہے اور جہاں تک لفظ ”ناس“ کا تعلق ہے تو عام طور پر اسے ان موارد و مقامات میں استعمال کیا جاتا ہے جہاں کوئی امتیاز یا خصوصیت ملحوظ نہ ہو بلکہ تمام امتیازات و امتیازی خصوصیات ختم کر کے بات کی جائے، یا کسی شخص کی تحقیر اور فکری پستی و انحطاط کا اظہار مقصود ہو، مثلاً:

سورۃ اسراء، آیت: ۸۹

○ ”فَأَبَىٰ أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُورًا“

(اکثر لوگ ناشکری و کفران نعمت کے سوا کچھ نہیں کرتے)

سورۃ حجرات، آیت: ۱۳

○ ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ“

(اے لوگو! ہم ہی نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے)

مذکورہ بالا دو آیتوں اور ان جیسی دیگر متعدد آیات میں لفظ ”ناس“ استعمال ہوا ہے جس سے ہر طرح کی

خصوصیات و امتیازات سے خالی بیان کا ثبوت ملتا ہے۔

(۳) جو امور اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے نفسانی خواہشوں کی وضاحت و بیان میں ذکر کئے ہیں وہ فطری ترین اور تخلیقی طور پر وجود میں قرار دی جانے والی چاہتوں سے موزونیت نہیں رکھتے کیونکہ اگر فطری چاہتیں مقصود و ملحوظ ہوتیں تو لفظ ”نساء“ کے بجائے ایسا لفظ ذکر کیا جاتا جو زوجیت کے عام و وسیع معنی پر مشتمل ہوتا اور لفظ ”بنین“ کی بجائے لفظ ”اولاد“ ذکر کیا جاتا اور لفظ ”الْفَنَاءُ لِلْبَنَاتِ الْمَقْنَطِرَةِ“ کی بجائے لفظ ”الاموال“ ذکر کیا جاتا، کیونکہ طبعی و فطری محبت و چاہت عورتوں میں بھی اپنے مردوں کے ساتھ اسی طرح پائی جاتی ہے جس طرح مردوں میں اپنی عورتوں کے ساتھ پائی جاتی ہے یعنی دونوں میں محبت و چاہت کے جذبات یکساں ہیں، جس طرح مرد اپنی عورتوں سے فطری طور پر محبت و چاہت رکھتے ہیں بعینہ عورتیں بھی اپنے مردوں کے ساتھ اسی طرح کے فطری احساسات و جذبات رکھتی ہیں، لہذا لفظ ”نساء“ کی بجائے ایسا عام لفظ استعمال کیا جانا چاہیے تھا جس میں دونوں شامل ہو سکیں، اسی طرح جو جذبہ محبت بنین یعنی لڑکوں کی بابت انسان کی فطرت کا حصہ ہے وہ صرف لڑکوں تک محدود نہیں بلکہ تمام اولاد کی بابت یکساں پایا جاتا ہے۔۔۔۔۔ خواہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں، یہی حال اموال کا ہے کہ اس کی چاہت بھی ہر شے سے تعلق رکھتی ہے صرف ”قناطر المقنطرة“ سے مخصوص نہیں، اسی بناء پر جس مفسر نے فعل ”زین“ (زینت دی گئی) کا فاعل خدا کو قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ خداوند عالم نے ان چیزوں کو لوگوں کے لئے زینت بنایا ہے وہ بیجا رحمت میں مبتلا ہوا اور اپنے نظریہ کی صحت و درستی کو یقینی بنانے کے لئے یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ آیت میں لفظ ”نساء“، ”بنین“ اور ”قناطر“ کا ذکر خصوصیت کے ساتھ صرف اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ چیزیں اپنے موضوع کے واضح مصداق ہیں اور عام طور پر لوگ انہی سے آگاہی رکھتے ہیں۔۔۔۔۔ ورنہ ”نساء“ سے مراد میاں بیوی دونوں، لفظ ”بنین“ سے مراد تمام اولاد اور قناطر سے تمام اموال کی طرف اشارہ ہے۔۔۔۔۔

(۴) اگر ترین کی نسبت خدا کی طرف ہو تو آیت کے آخری جملے اس سے مطابقت نہیں رکھتے، یعنی آیت کے آخری جملوں سے ترین کے عمل کا خدا سے منسوب کرنا بے ربط و بے معنی ہو جاتا ہے کیونکہ ان میں ارشاد ہوا: ”ذٰلِكَ مَتَابُ الْحَيٰوَةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَآ حُسْنِ النَّبَابِ ۝ قُلْ اَوْ تَسْتَكْبِرُوْنَ بِحَيٰوَتِكُمْ دٰلِكُمْ“۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ دنیاوی زندگی کا ساز و سامان ہے جبکہ خدا کے پاس بہتر ٹھکانہ ہے، کہہ دیجئے کہ آیا میں تمہیں اس سے بہتر کی نشاندہی کروں؟، تو ان جملوں سے اِنٹا ہر یہ مقصود ہے کہ لوگوں کو دنیاوی چاہتوں و نفسانی لذتوں سے دل لگانے سے باز رکھا جائے اور ان کے دلوں میں خدائی نعمتوں یعنی باغھمائے بہشت، پاکیزہ ازواج اور رضائے ربانی کی چاہت و رغبت پیدا کیا جائے کہ ان سب کو خداوند عالم نے لوگوں کے لئے مقرر کر رکھا ہے۔ اور یہ بات قطعی طور پر بے معنی ہے کہ مقدمہ سے روگردانی کروا کر ذوالمقدمہ کی طرف توجہ کروائی جائے کیونکہ اس میں تناقض پایا جاتا ہے اور اس سے دونوں یعنی مقدمہ اور ذوالمقدمہ کا ایک ساتھ ابطال ہو

جائے گا (دنیا، مقدمہ اور آخرت ذی المقدمہ ہے، تو اگر مقدمہ ہی نہ ہو تو ذی المقدمہ کی نوبت ہی کب آئے گی؟ اور مقدمہ کے بغیر ذی المقدمہ تک رسائی اور اس کا حصول کیونکر ممکن ہے؟) اس کی مثال اس شخص جیسی ہے جو سیر ہونا چاہے اور کھانے پینے سے اجتناب کرے (سیر ہونا ذی المقدمہ جبکہ کھانا پینا مقدمہ ہے تو کچھ کھائے پیئے بغیر سیر ہونے کی خواہش بے ربط قرار پائے گی)

### ایک سوال اور اس کا جواب

ممکن ہے اس مقام پر آپ کہیں کہ آیت مبارکہ ”زَيْنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ.....“ سے جو معنی سمجھا جاتا ہے اس کا خلاصہ درج ذیل آیت شریفہ میں بھی پایا جاتا ہے:

سورہ اعراف، آیت: ۳۲

○ ” قُلْ هُنَّ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ “

(کہہ دیجئے کہ کس نے اس زینت کو جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لئے مقرر کیا ہے اور پاکیزہ رزق کو حرام قرار دیا ہے، کہہ دیجئے کہ یہ سب کچھ ان لوگوں کے لئے ہے (دنیاوی زندگی کا ساز و سامان ہے) جو ایمان لائے ہیں کہ اس کا خالص قیامت کے دن انہیں ملے گا)۔

اس آیت کے تناظر میں واضح طور پر معلوم و ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح مؤخر الذکر آیت (اعراف ۳۲) میں تزئین کا فاعل خداوند عالم ہے اس طرح زیر بحث آیت مبارکہ ”زَيْنَ لِلنَّاسِ.....“ میں بھی خدائے قدوس ہی اس کا فاعل ہے۔

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ ان دو آیتوں میں مقام و مورد کے حوالہ سے فرق پایا جاتا ہے کیونکہ زیر بحث آیت مبارکہ میں لوگوں کی ان دلفریب چاہتوں اور نفسانی خواہشوں کی مذمت وارد ہوئی ہے جو لوگوں کو خداوند عالم سے دور کر دیتی ہیں اور انہیں خدا کی یاد سے غافل کر کے ان دائمی و حقیقی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کا اہل بننے ہی نہیں دیتیں جو خداوند عالم کے ہاں اپنے بندوں کے لئے مقرر ہیں، اس کے ساتھ ساتھ یہ آیت مبارکہ لوگوں کو ان تباہ کن نفسانی خواہشوں اور دنیا کی زوال پذیر مادی لذتوں سے منہ موڑنے کی ترغیب دلا کر انہیں خدا کے ہاں موجود حقیقی اور ہمیشہ باقی رہنے والی لذتوں سے آشنا ہونے کی راہ دکھاتی ہے، لیکن سورہ اعراف کی آیت (۳۲) میں ایسا نہیں ہوا بلکہ اس میں یہ مطلب بیان کیا گیا ہے کہ دنیاوی مادی نعمتیں بنی نوع انسان کے لئے زینت بنائی گئی ہیں اور ان سے استفادہ کرنے میں مؤمنین و غیر مؤمنین

اس دنیاوی زندگی میں برابر کے شریک ہیں جبکہ آخرت میں وہ سب مؤمنین کو حاصل ہوں گی اور صرف وہی ان سے استفادہ کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ زیر بحث آیت مبارکہ میں لفظ ”الناس“ ذکر ہوا جبکہ دوسری آیت (اعراف ۳۲) میں اسے تبدیل کر کے لفظ ”العباد“ ذکر کیا گیا۔ اسی طرح پہلی آیت میں لفظ ”زین“ (زینت دیا گیا) کو تبدیل کر کے دوسری آیت میں لفظ الطبیات من الرزق“ (پاکیزہ روزی) استعمال کیا گیا۔

### ”زینت“ کس نے دی اور کیوں دی؟

ممکن ہے آپ سوال کریں کہ آیت مبارکہ میں تزئین کے عمل کو اصل چاہتوں و خواہشوں کے بجائے ”حُبُّ الشَّهَوَاتِ“ (چاہتوں اور خواہشوں کی محبت) سے وابستہ کیا گیا ہے اور یہ بات واضح طور پر معلوم ہے کہ انسانی وجود میں ”محبت“ سے سرشار ہونا اور اس کے دل میں ”محبت“ کا گھر کرنا ایک طبعی و فطری امر ہے اور انسان کی ذات کی مخصوص صفات و خصوصیات میں شامل ہے اور چونکہ خداوند عالم انسان اور اس کی وجودی قوتوں کا خالق ہے لہذا اس پورے نظام کی بازگشت اس بات کی طرف ہے کہ خداوند عالم نے ہی نبی نوع انسان کے دلوں میں ”محبت“ قرار دی ہے یعنی اس نے ان کے دلوں میں ”محبت“ کو خلق کیا ہے، اور چونکہ خلق کرنے کی نسبت خداوند عالم کے سوا کسی کی طرف نہیں ہو سکتی لہذا تسلیم کرنا ہوگا کہ فعل ”زین“ کا قائل خدا ہے۔

اس سوال کے جواب میں عرض ہے کہ اس سلسلہ میں جو قرآن ہم نے ذکر کئے ہیں اس سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ محبت کے زینت قرار دیئے جانے سے مراد محبت کا اس طرح قرار دیا جانا ہے کہ لوگوں کو اپنی طرف جذب کرے اور اپنے علاوہ دوسروں سے روکے، کیونکہ زینت و زیبائش ایسا مطلوب و پسندیدہ اور پرکشش امر ہے جو اپنے غیر سے منظم ہوتا ہے تاکہ انسان اس غیر کی طرف توجہ و التفات کرے اور اسے اپنی طرف جلب و جذب کرے اس کی مثال اس عورت سے دی جا سکتی ہے جو اپنے آپ کو ایسے امور سے مزین کرتی ہے جو اسے حسین و جمیل بنادیں تاکہ ان کی وجہ سے جو حسن و جمال اسے حاصل ہو وہ مرد کو اس کی طرف مائل کر دے، بنا براین درحقیقت وہی امور اصل مقصود اور منظور نظر ہوتے ہیں اور عورت ان سے استفادہ کرتی ہے،..... کہ اگر وہ امور نہ ہوں تو عورت مرد کو اپنی طرف جلب ہی نہ کر سکے..... خلاصہ کلام یہ کہ جملہ ”ذُیِّنَ لِنِّسَائِمْ حُبُّ الشَّهَوَاتِ.....“ (چاہتوں کی محبت لوگوں کے لئے زینت بنائی گئی ہے) کے معنی کی بازگشت اس امر کی طرف ہے کہ ان کی نظروں میں اسے اس طرح جلوہ گر کیا گیا کہ ان کے دل اس کی طرف جھک جائیں اور وہ اس کے شیدائی ہو جائیں اور ان کی تمام تر توجہات اسی کی طرف مبذول ہوں، لہذا یہاں محبت کی اثرگزاری مقصود نہیں یعنی آیت کے معنی کی بازگشت

محبت کی تاثیر کی طرف نہیں، جیسا کہ سورۃ مریم کی آیت ۵۹ کے معنی سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس میں ارشاد الہی ہے: ”فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهْوَاتِ فَسُوفَ يَلْقَوْنَ عَذَابًا“ (پھر ان کے بعد ایسے لوگ آئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور چاہتوں کی پیروی کی، وہ بہت جلد اپنے کیفر کردار کو پہنچ جائیں گے)۔ اس کی تصدیق و تائید ان مطالب سے بھی ہوتی ہے جو آئندہ سطور میں پیش کئے جائیں گے اور ان میں بیان کیا جائے گا کہ زینت کے موارد میں سے نساء (عورتیں) بنین (بیٹے) اور قناطیر کو کیوں ذکر کیا گیا، اس کے علاوہ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ لفظ ”شہوات“ سے دل لگی و دل بستگی، شیفنگی و فریفتگی، انتہائی محبت، قلبی جھکاؤ اور گرویدہ ہونے کے معانی کا ثبوت ملتا ہے جبکہ اس کا اصل معنی وہ چیزیں ہیں جن سے محبت و چاہت وابستہ ہوتی ہے۔

### محبت و چاہت کے موارد

○ ” مِنَ النِّسَاءِ وَ النَّبَاتِ وَالْمَقْنَطَرِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ.....“  
(عورتیں، بیٹے اور سونے و چاندی سے بھری ہوئی مشکیں۔۔۔۔۔)

اس جملہ میں جو الفاظ ذکر کئے گئے ہیں سب سے پہلے ان کے لغوی و استعمالی معانی بیان کئے جاتے ہیں، اس کے بعد ان کی تفصیلات ذکر ہوں گی۔

(۱) ”نساء“ (عورتیں)

یہ جمع کا صیغہ ہے لیکن لفظوں میں اس کا مفرد کوئی نہیں آتا،

(۲) ”بنین“ (بیٹے)

یہ جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد ”ابن“ ہے۔ یہ لفظ اولاد میں سے لڑکوں کے لئے استعمال ہوتا ہے خواہ وہ بالواسطہ اولاد نہ ہو یا بلا واسطہ، یعنی خواہ اپنے لڑکے ہوں یا اپنی اولاد کے لڑکے یعنی پوتے ہوں۔ سب پر لفظ ”بنین“ اطلاق ہوتا ہے۔

(۳) ”مقنطرة“

یہ ”قنطار“ کی جمع کا صیغہ ہے۔ اس کا معنی ایک مشک کی مقدار کے مطابق سونا یا سونے سے بھری ہوئی مشک

ہے۔



## (۴) ”مقنطرة“

یہ اسم مفعول لفظ ”قنطار“ ہی سے مشتق ہے جو کہ جامد ہے۔ (جامد یعنی جس سے کوئی چیز مشتق نہ ہو سکے) اور عربوں کی عادت ہے کہ وہ جامد الفاظ میں کسی نسبت کو ملحوظ قرار دیتے ہوئے ان الفاظ کو مصدری معانی کا حامل بنا دیتے ہیں اور پھر مصدری معنی کے تناظر میں اس کی بنیاد پر دیگر مشتقات کی تشکیل کا کام لیتے ہیں چنانچہ اس کی مثالیں درج ذیل الفاظ میں ملتی ہیں:

(۱) باقل۔ (۲) تامر۔ (۳) عطار۔ ان الفاظ کو ”بقل“، ”تمر“ اور ”عطر“ سے مشتق کر کے ان اشیاء کے بیچنے والوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے یعنی باقل، جو کہ بقل (سبزیاں) سے مشتق ہے اسے سبزی بیچنے والے اور تامر، جو کہ تمر (کھجور) سے مشتق ہے اسے کھجور بیچنے والے اور عطار، جو کہ عطر (خوشبو جات) سے مشتق ہے اسے عطر بیچنے والے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طرح کے اشتقاقی عمل کا فائدہ و غرض یہ ہے کہ جس چیز یا شخص کی کسی ایسے وصف سے توصیف کی جائے جو اس کے اپنے ہی لفظ سے لیا گیا ہو (مشتق کیا گیا ہو) اس چیز یا شخص میں اس وصف کی تثبیت ہو جاتی ہے اور اس میں اس وصف کا پایا جانا یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اس مطلب کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے کہ وہ چیز یا شخص اس لفظ کے معنی کا حامل ہے اس کا فائدہ گز نہیں، مثلاً کہا جاتا ہے: ”دنانیر مدنرة“، ”دواوین مدونة“، ”حجاب محبوب“، ”ستر مستور“، تو ان میں ”مدنرة“ دانیر کے وجود کو یقینی بناتا ہے، مدوینہ، دواوین کا اثبات کرتا ہے۔ محبوب، حجاب اور مستور، ستر کو یقینی طور پر ثابت کرتا ہے، اسی طرح ”مقنطرة“ میں قناطر کے یقینی ہونے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

(۵) ”الخیل“ کا معنی گھوڑے ہے۔

(۶) ”المسومة“ جو کہ ”سوم“ سے مشتق ہے اس کا معنی حیوان کا چرنا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: ”سامت الابل مسوماً“ یعنی اونٹ چرنے کے لئے نکل پڑا کہ وہ اب چرنے لگا ہے۔ یاد رہے کہ جو حیوان اپنا چارہ گھر سے نہیں لیتے بلکہ گھوم پھر کر اور ادھر ادھر سے چر کر اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں انہیں عربی زبان میں ”سامتہ“ کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ”مسومة“ اس حوالہ سے کہا جاتا ہو کہ انہیں چراگاہ میں نشانی لگا کر مشخص کر دیا جاتا ہے تاکہ ان کی پہچان ہو سکے تو اس بناء پر ”مسومة“ کا اشتقاق ”سامت“ کی بجائے ”سمت الابل فی المرعى“ سے ہوگا جو کہ ”سمتہ“ یعنی نشانی و علامت سے ہے، اسی وجہ سے کہا جاتا ہے: ”اسمتھا“، ”سومتھا“ (میں نے اسے نشانی لگائی) (میں نے اسے داغ دیا) عام طور پر حیوان پر داغ لگانے سے بھی اس کی پہچان و تمیز ممکن ہوتی ہے اس لئے ”سمتہ“ داغنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ بنا براین لفظ ”الخیل المسومة“ سے یا تو چراگاہ کی طرف چرنے کے لئے بھیجے گئے جانور مراد ہوں گے یا نشانی

لگائے ہوئے مراد ہوں گے، یعنی وہ گھوڑے جن کو چراگا ہوں میں آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی مرضی سے اپنا چارہ لیس یا وہ گھوڑے جنہیں چراگا ہوں میں مخصوص نشانی لگا دی جاتی ہے تاکہ ان کی پہچان آسانی کے ساتھ ہو سکے۔

(۷) ”الانعام“ حج کا صیغہ ہے اس کا مفرد ”نعم“ (نون پرزیر اور عین پر بھی زیر کے ساتھ) ہے۔ اس کا معنی اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری ہے یہاں یہ بات قابل ذکر و لائق توجہ ہے کہ چوپایوں کے لئے لفظ ”بہائم“ بھی استعمال ہوتا ہے لیکن وہ مذکورہ بالا چوپایوں (اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری) کے علاوہ دیگر حیوانات کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے البتہ وحشی جانوروں، پرندوں اور کیڑوں کوڑوں (حشرات الارض) کے لئے لفظ بہائم استعمال نہیں ہوتا۔

(۸) ”حرف“ کا معنی زراعت و کھیتی باڑی ہے، اس میں کسب و کار کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ اس کا معنی نباتات کی تربیت و دیکھ بھال یا وہ تربیت شدہ و دیکھ بھال شدہ نباتات ہے تاکہ زندگی بسر کرنے میں ان سے استفادہ کیا جاسکے۔

### ایک اہم نکتہ

آیت مبارکہ میں چاہتوں (شہوات) کی جو تعداد ذکر کی گئی ہے وہ اس بناء پر نہیں کہ مشہیات (جن چیزوں کی چاہت ہوتی ہے، یا جن چیزوں سے چاہت تعلق پکڑتی ہے) کی کثرت، شہوات سے محبت کی کثرت کا سبب بنتی ہے اور وہ اس طرح کہ انسان طبعی و فطری طور پر ازواج و اولاد اور مال کی طرف مائل ہوتا ہے، کیونکہ اگر اس بات کو درست قرار دیا جائے کہ مشہیات کی کثرت سے شہوات سے محبت کی کثرت پیدا ہوتی ہے تو آیت مبارکہ میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور جو تعبیرات ذکر ہوئی ہیں ان کی توجیہ و تاویل کرنی پڑے گی مثلاً انسان کی بجائے ”ناس“ کیوں کہا گیا، اولاد کی بجائے ”بنین“ کیوں کہا گیا اور مال کی بجائے ”قناطر المقنطرة“ کے الفاظ کیوں ذکر کئے گئے۔ چنانچہ کئی مفسرین نے اس طرح کی توجیہات و تاویلات کی زحمت کا بوجھ اپنے اوپر ڈالا ہے۔

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ متعدد چاہتوں کا شمار کیا جانا اس بناء پر ہے کہ دنیاوی مشہیات سے دل بستگی و فریفتگی کے حوالہ سے لوگوں کی کئی قسمیں ہیں چنانچہ کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی چاہتوں کا محور اور کعبہ عشق صنف نازک کے سوا کچھ نہیں اور وہ عورتوں سے دل لگی، ان کی ہم نشینی، ان کا قرب و انس اور ان سے محبت و پیار کے اندھے تعلق کے سوا اپنی زندگی اور وجود ہستی کا کوئی مقصد ہی نہیں رکھتے، ان کی اس درجہ عاشقانہ روش انہیں بد اعمالیوں اور اخلاقی پستیوں کا شکار کر دیتی ہے اور وہ خداوند عالم کی مصیبتوں و نافرمانیوں کے مرتکب ہو جاتے ہیں مثلاً رقص و سرور اور ساز و آواز کی محفلیں گرم کرنا اور شراب نوشی و

نشیات کا استعمال اور اس طرح کے دیگر امور ان کی عادات اور روزمرہ کے معمولات بن جاتے ہیں۔ البتہ اس طرح کے اعمال و نازیبا وغیر شائستہ حرکات عام طور پر مرد حضرات ہی سے مخصوص ہے، خواتین میں اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو بیٹوں کے دلدادہ ہیں اور وہ ان کی کثرت کے خواہاں ہوتے ہیں اور بیٹوں کی کثرت کی بناء پر اپنے آپ کو طاقتور سمجھتے ہیں، اس طرح کے افراد زیادہ تر دیہاتوں کے باسی ہیں اور وہ اولاد میں سے صرف بیٹوں کی کثرت چاہتے ہیں۔ بیٹیوں کی نہیں، ان دو گروہوں کے علاوہ کچھ لوگ مال و دولت پرستی کا شکار ہوتے ہیں اور ان کی تمام تر کاوشیں اس بات پر مرکوز ہوتی ہیں کہ جس قدر ممکن ہو اپنی تجوریاں بھر دیں اور اپنے خزانوں کو سرمایہ و ثروت سے پر کر دیں، اس طرح کا دیوانہ پن اور مال جمع کرنے کا جنون سونا چاندی اور نقد مال کی بابت پیدا ہوتا ہے یا ان چیزوں کی بابت ہوتا ہے جو نقد مال کی طرح اور اس کے برابر ہو، عام استعمال میں آنے والے ساز و سامان کی جمع آوری بھی صرف اسی صورت میں ان کی توجہات کا مرکز قرار پاتی ہے جب اس ساز و سامان کی حیثیت نقد سرمایہ جیسی ہو یعنی جب چاہیں اسے نقد مال میں تبدیل کر سکیں، اس طرح کے لوگ عموماً دیہاتوں کے باسی نہیں بلکہ شہروں میں زندگی بسر کرنے والے ہوتے ہیں اور وہی اس طرح کے دیوانہ پن میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان تین گروہوں کے علاوہ کچھ افراد طاقتور گھوڑوں کا مالک بننے کو سب سے بڑا اعزاز سمجھتے ہیں اور ان کی نظروں میں اصل دولتندگی یہی ہوتی ہے۔ کچھ لوگ چوپایوں کی کثرت سے محبت کرتے ہیں اور ان کے ہاں اس سے زیادہ محبوب و پسندیدہ چیز کوئی نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ زراعت و کھیتی باڑی..... یا زمینداری..... کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ لوگ مذکورہ بالا چیزوں میں سے بالترتیب دو یا زیادہ کے دلدادہ ہوں یا بالترتیب مذکورہ اشیاء کی محبت ان کے دلوں میں گھر کر چکی ہو۔

یہ ہیں شہوات اور چاہتوں کی وہ اقسام کہ جن کے حوالہ سے لوگ مختلف و متعدد گروہوں میں منقسم ہیں اور ہر گروہ ان اشیاء میں سے کسی ایک کو اپنا مقصد اعلیٰ اور زندگی کی گونا گوں نعمتوں سے بہرہ ور ہونے میں اصل ہدف و مقصد قرار دیتا ہے اور اس کے علاوہ دیگر اشیاء کو فروغی حیثیت کا حامل سمجھتے ہوئے ثانوی مقام دیتا ہے، اور بہت کم ایسے افراد پائے جاتے ہیں (یا عین ممکن ہے کہ سرے سے پائے ہی نہ جاتے ہوں) جو مذکورہ تمام اشیاء کو مساوی درجہ و حیثیت دیں اور ان سب کو زندگی کا مقصد و مقصود اعلیٰ قرار دے کر سب کو یکساں مقام دیں۔

جہاں تک جاہ و مقام اور منصب اور صدارت وغیرہ کا تعلق ہے تو وہ سب درحقیقت خیالی امور ہیں اور ان سے محبت و دلگہی کا رشتہ ثانوی بنیاد پر استوار ہوتا ہے لہذا اسے شہوات کی فہرست میں شمار نہیں کیا جاتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ آیت مبارکہ تمام شہوات کے جامع تذکرہ و شمار کرنے کے مقام میں نہیں۔

مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں اس موضوع کی تائید ملتی ہے جس کا اشاراتی تذکرہ ابتدائے بحث میں ہو چکا ہے

”حُبُّ الشَّهَوَاتِ“ سے مراد، ان سے دل بستہ و فریفتہ اور شیدائی و ہرجائی ہونا ہے (اسی حوالہ سے اس کی نسبت شیطان کی طرف دی جاتی ہے) ان کی اس سے وہ اصلی و حقیقی محبت مراد نہیں جو فطری طور پر انسان میں ودیعت کی گئی ہے (اور وہی فطری چاہت ہے جو خداوند عالم کی طرف منسوب ہوتی ہے)۔

## دنیاوی زندگی کا ساز و سامان

○ ”ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا“  
(وہ سب دنیاوی زندگی کا ساز و سامان ہے)

اس جملہ میں دنیاوی زندگی کے ساز و سامان کا تذکرہ مخصوص انداز میں ہوا ہے اور وہ یوں کہ پہلے ان کی فہرست ذکر کی گئی اور پھر ”ذٰلِكَ“ کے لفظ سے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا گیا کہ وہ شہوات اور نفسانی خواہشات و چاہتیں ایسے امور ہیں جن سے اس دنیاوی زندگی میں استفادہ کیا جاتا ہے اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کی غرض سے ان کا سہارا لیا جاتا ہے اور یہ دنیاوی زندگی تمہاری اخروی زندگی سے بہت نزدیک ہے، اور یہ دنیاوی زندگی اور اسی طرح وہ متاع کہ جسے اس زندگی کے نئے استعمال میں لایا جاتا ہے فانی امور میں سے ہیں اور انہیں ہرگز بقاء حاصل نہیں، نہ دنیا کا اچھا انجام ہے اور نہ اس کی متاع اور ساز و سامان کو نیک بقاء میسر ہے۔ جبکہ نیک انجام اور بقاء شعار زندگی وہ ہے جو خداوند عالم کے پاس ہے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ”وَ اللّٰهُ عِنْدَآ حَسُنَ الْبَابِ“ (اور ہی ہے کہ جس کے پاس اچھا ٹھکانا ہے)

## بہتر اور بقاء شعار زندگی کی نشاندہی

○ ”قُلْ اَوْ تَبْتَغُوْنَكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۗ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّتْ.....“  
(کہہ دو کہ آیا میں تمہیں اس سب کچھ سے بہتر کی نشاندہی کروں، جو لوگ متقی ہیں ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس باغات ہیں.....)  
یہ آیت مبارکہ، جملہ ”وَ اللّٰهُ عِنْدَآ حَسُنَ الْبَابِ“ کی وضاحت کر رہی ہے، اس میں سابق الذکر فنا پذیر و

زوال آشنا شہوات و چاہتوں کی جگہ ایسے امور کا تذکرہ ہوا ہے جو انسان کے لئے ”خیر“ ہیں اور ان کا ”خیر“ ہونا اس بناء پر ہے کہ وہ ہمیشہ باقی رہنے والے اور حقیقی معنی میں حسن اور اچھے ہیں کہ جنہیں فنا ہرگز مغلوب نہیں کر سکتی، اور وہ ایسے امور ہیں جو مذکورہ شہوات ہی کی مانند ہیں کہ جنہیں انسان لطف اندوز ہونے کے لئے چاہتا ہے اور ان سے حاصل ہونے والے آثار کا طلبگار اور ان کا دلدادہ ہوتا ہے البتہ اس فرق کے ساتھ کہ ان امور میں ان شہوات جیسی قبیح و بری صورتیں نہیں پائی جاتیں اور وہ انسان کو ان اعلیٰ مراتب و منازل سے محروم کرنے کا سبب نہیں ہوتے جو اس کے لئے خیر اور بہتری کے حامل ہیں۔ وہ امور بہشت، پاکیزہ ازدواج اور رضائے پروردگار سے عبارت ہیں۔

## دواہم نکات

(۱) آیہ مبارکہ میں بہشت کہ جس میں تمام لذائذ بشمول ازدواج موجود ہیں کے ذکر کے ساتھ ساتھ ازدواج کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی نظر میں ہم بستری سب سے بڑی جسمانی لذت ہے، اسی بناء پر ما قبل آیت میں بھی عورتوں کا نام سب سے پہلے دیا گیا اور ارشاد ہوا: ”مِنَ النِّسَاءِ وَ الْبَنَاتِ وَ الْقَنَاطِیْرِ الْمُنْقَطِرَةِ.....“۔

(۲) ”رضوان“ (اسے حرف ”ر“ کے نیچے زیر اور پیش دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے) اس کا معنی رضایت و خوشنودی ہے اس سے مراد وہ نفسانی حالت ہے جو کسی ایسی شے کے ملنے اور سامنے آنے سے پیدا ہوتی ہے جسے طبع انسانی پسند کرتی ہے اور اس سے مانوس ہوتی ہے، یا یوں کہا جائے کہ رضایت اس کیفیت کا نام ہے جو کسی من پسند و طبع قبول چیز کے ملنے سے انسانی وجود میں پیدا ہوتی ہے اور طبع انسانی اسے خود سے دور رکھنا پسند نہیں کرتی اور نہ ہی اسے اپنے آپ سے دور کرتی ہے۔ اس حالت و کیفیت کے مقابل میں ”مخط“ و نارضایتی ہے۔ کہ جو کسی ناپسندیدہ چیز کی وجہ سے طبع انسانی میں جنم لیتی ہے اور انسان اسے خود سے دور رکھنے کا خواہاں اور کوشاں ہوتا ہے۔

جہاں تک رضائے خداوندی کا تعلق ہے تو اس کا ذکر قرآن مجید میں کئی بار ہوا ہے اور وہ افعال و صفات دونوں میں قابل تصور ہے یعنی جس طرح اطاعت الہی کے باب میں بندوں کے افعال کی بابت خداوند عالم کی رضایت کی بات ہوتی ہے اسی طرح غیر اطاعتی امور مثلاً اوصاف و صفات اور احوال وغیرہ میں بھی رضائے پروردگار تصور کی جاسکتی ہے البتہ قرآن مجید میں جہاں بھی رضائے خداوندی کا تذکرہ ہوا ہے وہ اکثر اطاعتی امور ہیں، اسی بناء پر خدا کی رضا اور بندوں کی رضا کا تقابلی حوالہ سامنے آتا ہے اور وہ اس طرح کہ خدا کی بندوں سے رضایت ان کی اطاعت کی وجہ سے ہوتی ہے اور بندوں کی خدا سے رضایت، اطاعتی اعمال پر خدا کی طرف سے بہتر جزاء عطا کئے جانے اور اطاعت گزار بندوں کے بارے میں اچھا فیصلہ کرنے

کی بناء پر ہوتی ہے، چنانچہ درج ذیل آیات مبارکہ میں دونوں رضائیوں کا تذکرہ ہوا ہے:

سورۃ بینہ، آیت: ۸

○ ”رَاضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ“

(اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے)

سورۃ فجر، آیت: ۲۸

○ ”يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۖ ارجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً“

(اے نفس مطمئنہ! تو اپنے رب کی طرف واپس آ جا، رضایت کے ساتھ اور رضایت یافتہ ہو کر)

سورۃ برائتہ، آیت: ۱۰۰

○ ”وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ

عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ.....“

(اور مہاجرین و انصار میں سے..... اسلام لانے میں..... سبقت لینے والے پہلے لوگ اور وہ کہ جنہوں نے ان کے

بعد نیکی و اچھے انداز میں اس راہ کو اختیار کیا اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے اور اس نے ان کے لئے باغبائے

بہشت مقرر کئے ہیں.....)

زیر نظر آیت مبارکہ میں ”رضوان من اللہ“ (رضائے خداوندی) کا تذکرہ ان امور کی فہرست میں کیا گیا ہے

جو دنیاوی زندگی کی پسندیدہ چاہتوں میں سے انسان کے لئے ”خیر“ اور بہتر ہیں تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ خود (رضائے

الہی) انسان کی پسندیدہ چاہتوں میں سے ایک ہے یا کسی ایسی شے کا سبب ہے جو انسان کی پسندیدہ چاہت ہے یعنی اس کا

ذریعہ و وسیلہ ہے اور اس کے ذریعے پسندیدہ چاہتوں تک دستیابی کی راہ ہموار ہوتی ہے اسی وجہ سے آیت مبارکہ میں اس کا

ذکر باغبائے بہشت اور پاکیزہ ازواج کے مقابل میں ہوا ہے۔ اسی طرح اسے فضل، مغفرت اور رحمت کے مقابل میں بھی

ذکر کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۃ مائدہ، آیت: ۲

○ ”فَضْلًا مِّن رَّبِّهِمْ وَسُؤًا“

(ان کے رب کی طرف سے فضل اور رضا)

سورۃ حدید، آیت: ۲۹

○ ” وَمَغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِ وَرِضْوَانًا “

(اور اللہ کی طرف سے مغفرت و بخشش اور رضایت)

سورۃ برائت، آیت: ۲۱

○ ” بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ “

(اس کی رحمت اور رضایت)

مذکورہ بالا مطالب میں تذبذب اور اچھی طرح غور و فکر کرنے سے اس ابہام سے بھی پردہ اٹھ جاتا ہے جو زیر بحث آیت مبارکہ میں رضایت کی بابت پیدا ہوا اور وہ اس طرح کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ”رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ“ (خدا ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے) اور ”رَضِيَةُ هِرَضِيَةُ“ (رضایت کے ساتھ اور رضایت یافتہ ہو کر) ان آیتوں میں اپنی رضایت کو خود ان کے ساتھ قرار دے کر فرمایا ”عَنْهُمْ“ یعنی خود ان سے راضی ہوا، جبکہ واضح ہے کہ ان سے راضی ہونے اور ان کے افعال سے راضی ہونے میں فرق ہے، اس بناء پر معنی یہ ہوگا کہ وہ اپنی طرف سے انہیں ان چیزوں کی بابت نہیں دھتکارتا جو وہ اس سے مانگتے ہیں، تو نتیجتاً اس کا معنی وہ ہوگا کہ جو اس آیت مبارکہ میں ہے، ”لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ فِيهَا“ ..... سورۃ ق، آیت ۳۵..... (ان کے لئے ہے جو وہ اس میں چاہیں گے)۔ یعنی وہ بہشت میں جو کچھ چاہیں گے اللہ انہیں عطا کر دے گا۔ بنا بر این خدا کی انسان سے رضایت میں انسان کی مطلق مشیت۔۔ اور وسیع چاہت۔۔ پائی جاتی ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اس آیت میں رضائے الہی کا ذکر ماقبل آیت مبارکہ میں مذکور شہوات کے مقابل میں ہوا ہے اور یہ اس لئے ہوا تاکہ انسان کو آگاہی دلائی جائے کہ اس نے دنیا کا مال و دولت اور سونے چاندی کے ذخائر جمع کرنے میں اپنی بابت جو گمان کر لیا ہے کہ اس طرح اسے مطلق مشیت اور چاہت کا کھلا اختیار حاصل ہو جائے گا کہ وہ جو چاہے اسے مل جائے گا اور جس چیز کا ارادہ کرے وہ اسے دستیاب ہوگی لیکن وہ غلط فہمی کا شکار ہوا ہے کیونکہ یہ سب کچھ اسے رضائے خداوندی کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے کہ خدا ہی وہ ذات ہے جس کے دست قدرت میں ہر شے کا اختیار و اقتدار ہے۔

## بندوں سے کامل آگاہی

○ "وَاللّٰهُ بِصَيْرٍ بِالْعِبَادِ"

(اور اللہ بندوں سے بخوبی آگاہ ہے)

چونکہ زیر بحث آیت مبارکہ اور اس سے ما قبل آیت سے یہ مطلب واضح و معلوم ہو چکا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے دو جہانوں (دنیا اور آخرت) میں ایسی نعمتیں مقرر کر دی ہیں جن سے وہ لطف اندوز و بہرہ ور ہو اور اس کے علاوہ دیگر منافع و لذت بخش امور بھی اس کے لئے مخصوص کر دیئے ہیں جن سے اس کی طبع و جود لذت پائے مثلاً ازواج، کھانے پینے کی چیزیں، حکومت و اقتدار وغیرہ، اور وہ دونوں جہانوں میں ایک جیسی ہیں صرف اس فرق کے ساتھ کہ وہ سب ایسی ہیں جو دنیا و آخرت میں مومن و کافر دونوں کے لئے مشترک ہیں اور وہ دونوں ان سے استفادہ کرتے ہیں لیکن اخروی نعمتیں صرف مومن سے مختص ہیں ان میں کافر کا کوئی حصہ نہیں اور وہ ان نعمتوں سے استفادہ نہیں کرے گا، تو اس حوالہ سے یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ آخر ایسا کیوں؟ اور وہ کیا مصلحت ہے جس کی بناء پر خداوند عالم نے دنیاوی نعمتوں کو تو مومن و کافر دونوں کے لئے مشترک قرار دیا ہے جبکہ اخروی نعمتیں مومن سے مخصوص کر دیں؟ تو اس کا جواب خداوند عالم نے اس طرح دیا کہ "اللہ بندوں سے بخوبی آگاہ ہے"۔ اس کا معنی یہ ہے کہ خداوند عالم نے مومن و کافر کے درمیان دنیاوی و اخروی نعمتوں کے حوالہ سے جو فرق رکھا ہے وہ عبث و بے مقصد نہیں اور خدا عبث و بے مقصد امور و افعال سے منزہ و بالاتر ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں (مومن و کافر) میں ایک بنیادی امر ہے جو اس فرق و امتیاز کا سبب و باعث ہے اور اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں بخوبی آگاہی رکھتا ہے، اور وہ امر "تقویٰ و پرہیزگاری" ہے جو مومن میں پائی جاتی ہے کافر میں نہیں۔ خداوند عالم نے اس امر (تقویٰ) کی وضاحت کرتے ہوئے زیر بحث آیت مبارکہ کے بعد اور اس سے متصل آیت میں یوں ارشاد فرمایا: "الَّذِينَ قَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَمَتْنَا غُفْرًا لَّنَا وَتُبْنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ" (انہوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے، تو ہمارے گناہوں کو معاف کر دے اور ہمیں دوزخ کی آگ سے بچالے)۔ یہ مطلب بعد والی دو آیتوں کے آخری جملوں تک مذکور ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ اپنی احتیاج اور اپنے پروردگار سے بے نیاز و مستغنی نہ ہونے کا کھلا اظہار کرتے ہیں اور اس مطلب کو اپنے اعمال صالحہ کے ذریعے ثابت بھی کرتے ہیں۔ یعنی اپنے زبانی دعوے کی تصدیق اپنے نیک و صالح عمل سے کرتے ہیں۔ لیکن کافر اپنے پروردگار سے بے نیازی کے احساس و عقیدہ کے ساتھ زندگی گزارتا ہے چنانچہ وہ دنیوی خواہشات و شہوات میں سرمست رہتا ہے اور اپنی آخرت و انجام کار کو بھلا دیتا ہے۔



## ایک لطیف نکتہ

یہ دو آیتیں یعنی: ”ذَلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِنْدَ حُسْنِ الْمَبَإِ“، ”قُلْ أَوْفَيْتُكُمْ بِحَيْثُ مَنَ دُلَّيْكُمْ.....“ اور ان سے مشابہ دیگر آیات مبارکہ مثلاً: ”قُلْ مَنْ حَزَمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَ الطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ“ كَذَلِكَ نَقْصِلُ الْأَيَّاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝“ ... سورہ اعراف، آیت ۳۲... ان سے پوچھئے کہ کس نے اس خدائی نعمت کو حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی اور پاکیزہ رزق کو؟ کہہ دو کہ وہ سب کچھ دنیاوی زندگی کا ساز و سامان ہے کہ جو قیامت کے دن اہل ایمان کے لئے خاص ہوگا۔ اسی طرح ہم علم رکھنے والوں کے لئے آیات کی وضاحت کرتے ہیں.....، اس اشکال و اعتراض کا جواب دیتی ہیں جو بہشت کی نعمتوں کے تذکرہ و توصیف پر مشتمل آیات مبارکہ کے ظواہر پر متعدد بحث کرنے والے حضرات پیش کرتے ہیں، ذیل میں اس اشکال و اعتراض اور اس کے جواب کی تفصیلات ذکر کی جاتی ہیں:

## اشکال و اعتراض:

جو شخص عالم ہستی میں پائی و دیکھی جانے والی موجودات اور گونا گوں اشیاء کے بارے میں بخوبی غور و فکر کرے اور گہری نگاہ سے ان کی کیفیتوں کو دیکھے تو اسے اس حقیقت کی بابت کوئی شک لاحق نہ ہوگا کہ جو افعال و اعمال ان موجودات سے اپنے تحفظ کے لئے انجام پذیر ہوتے ہیں ان کا سرچشمہ وہ تو تیں و وسائل ہیں جن سے ہر مخلوق لیس ہے، اسی طرح یہ حقیقت بھی آشکار ہو جائے گی کہ لمحات کا وجود پذیر ہونا نہ تو اتفاقی امر ہے اور نہ ہی عبث و بے فائدہ اور بے مقصد ہے بلکہ اس میں اہم اغراض و اہداف ملحوظ ہیں اور موجودات کی تخلیق عظیم مقاصد کے لئے انجام پائی ہے۔

ان موجودات میں سے ایک، انسان ہے کہ جو اپنے پورے جسم میں عجیب و غریب اور محیر العقول نظم و نظام رکھتا ہے، اس کا بدن گونا گوں آلات کا مجموعہ ہے مثلاً تغذیاتی آلات کہ جن کے ذریعے اس کے غذائی نظام کا سلسلہ وابستہ ہے اور یہ بات کسی وضاحت و دلیل کی محتاج نہیں کہ اس کا غذائی نظام بے مقصد و عبث نہیں بلکہ وہ غذائی مواد کی خشک و ریخت کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی جسمانی حالت و بدنی کیفیت کی درستی و درستگی اور بقاء و سلامتی کو یقینی بناتا ہے۔ گویا وہ اس لئے غذا کھاتا ہے کہ زندہ و باقی اور سلامت رہے، اسی طرح اس کا تناسلی نظام اپنے مربوط آلات و قوتوں اور فعال و متحرک اور ایک دوسرے

سے وابستہ و پیوستہ اشیاء کے ذریعے اس کی بقاء نسل و تحفظ نوع انسانی کو یقینی بناتا ہے، نباتات و حیوانات میں بھی انسان ہی کی طرح کا وجودی سلسلہ و نظام پایا جاتا ہے اور وہ بھی اپنے موزوں و مناسب آلات و قوتوں سے لیس و آراستہ ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی قابل التفات ہے کہ کارخانہ تخلیق نے موجودات کی تسخیر اور ان میں سے ذی شعور

مخلوق کو اپنے امر و ارادہ کے ماتحت رکھنے کے لئے ان کے افعال میں لذت آمیزی کا جو نظام قائم کیا ہے اور جانداروں یعنی

حیوانات و انسان کی وجودی قوتوں کی کار آرائی میں لطف اندوزی کا جو سلسلہ جاری کیا ہے کہ جو اسے..... یعنی حیوان و انسان

کو..... ان لذائذ سے بہرہ ور ہونے کے عملی اقدام کی راہ پر لاتا ہے جبکہ وہ خود بھی اس امر کی طرف متوجہ نہیں ہوتا کہ سرچشمہ

تخلیق اسے کس منزل کی طرف لے جانا چاہتا ہے، وہ گمان کرتا ہے کہ اس کا جسمانی نظام اس کی لذت اندوزی کے لئے ہے

جبکہ اس کے فعل و افعال کی اصل غرض اس کی وجودی بقاء ہوتی ہے اور وہ بے توجہی و لاشعوری طور پر اس غرض کے تکمیلی

تقاضوں کو پورا کرنے میں مصروف ہوتا ہے، اگرچہ وہ ان افعال سے لطف اندوز اور محظوظ ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ

تخلیق کی غرض و غایت بھی پوری ہوتی چلی جاتی ہے، گویا ان لذائذ سے دو نتیجے حاصل ہوتے ہیں: ایک ان افعال کے انجام

دینے والے کا طبعی سرور حاصل کرنا اور دوسرا کارخانہ تخلیق کا اپنی مقصود غرض کو پالینا، انجام دینے والا ان لذتوں کی کشش و

جاذبت کی وجہ سے ان کی طرف مائل ہوتا ہے اور سرچشمہ تخلیق اس کی وجودی بقاء کا سامان کرتا ہے، بنا بریں یہ کہنا بجا ہے کہ

اگر تغذیاتی و تناسلی نظام میں لذت بخش جہتیں نہ ہوتیں تو کوئی شخص ان کی طرف مائل نہ ہوتا اور نہ ہی ان کی طرف توجہ و التفات

کرتا اور صرف اس لئے کہ اس کی وجودی بقاء اس میں مضمر ہے اس کی انجام دہی کو ہرگز اہمیت نہ دیتا، تو اس طرح اس کی تخلیق کی

اصل غرض ختم ہو جاتی اور اس کا وجود میں آنا بے مقصد و بے نتیجہ قرار پاتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے وجود میں غذا و مباشرت کی

لذتیں قرار دے دیں کہ وہ ان دولتوں سے بہرہ ور و لطف اندوز ہونے میں کوئی کسر اٹھائیں رکھتا بلکہ ہر طرح کی سختی و تکلیف

برداشت کرنے اور ہر قسم کی مصیبت و رنج اپنے اوپر لینے پر بھی تیار ہو جاتا ہے تاکہ جس طرح بھی ممکن ہو ان دولتوں سے

بہرہ ور ہو جائے۔ وہ اس مقصد کے لئے سب کچھ کر گزرنے پر تیار ہو جاتا ہے اور اس حوالہ سے اپنی کسی بھی حیثیت کو خاطر میں

نہیں لاتا بلکہ دیوانگی و غرور اور اپنے آپ کو دھوکہ میں ڈالتے ہوئے اپنی عزت نفس کی پرواہ بھی نہیں کرتا اور تصورات کی

دنیا میں کھو کر اور ہمہ تن اسی مقصد کے حصول میں سرگرم و سرگرداں رہتا ہے، لیکن اس دوران کارخانہ خلق و ایجاد اپنے ہدف کو پا

لیتا ہے اور اپنی مقصودہ غرض و غایت کو حاصل کر لیتا ہے کیونکہ اسے اس نظم و نظام اور تدبیر سے فرد و نسل بشر کی بقاء کے علاوہ کچھ

بھی مطلوب نہ تھا جو کہ اسے حاصل ہو جاتا ہے چنانچہ تغذیاتی نظام سے فرد کی بقاء اور مباشرت و جنسی عمل و تناسلی نظام سے نسل

کی بقاء یقینی ہو جاتی ہے، یہ تو ہے نظام خلقت کی غرض و مقصد اور مطلوبہ ہدف کے حصول کا حوالہ! لیکن انسان کو اس سب کچھ

میں کیا ملتا ہے؟ تو یہ واضح ہے کہ اسے اپنے ارادوں میں اپنے خیال و تصور کی تکمیل کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا (یعنی وہ غذا و جنسی عمل سے

لاشعوری طور پر کارخانہ خلقت کے اصلی مقصد کو پورا کر رہا ہوتا ہے لیکن خود اس کے لئے اس کے تصوراتی اہداف کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہتا۔

مذکورہ بالا مطالب سے واضح ہوا کہ دنیاوی لذتیں ایک محدود غرض اور عارضی مقصد کے لئے مقرر کی گئی ہیں، تو اس صورت میں اس جہان میں یہ لذتیں بے معنی ہیں جہاں وہ غرض و مقصد ملحوظ ہی نہیں۔ یعنی جب دنیاوی لذتیں فرد و نسل کی بقاء کے لئے قرار دی گئی ہیں تو اخروی زندگی میں ان کا حصول و دستیابی بے معنی ہوگی کیونکہ اس زندگی کی بقاء غذا و جنسی عمل کی محتاج نہیں، کیونکہ کھانے پینے اور تمام غذائی لذتوں میں بدن کی سلامتی اور اسے وجودی اعضاء و وجوہ کی تکوینی ترتیب و ترکیب میں ہر طرح کی خرابی و فنا یعنی موت سے بچانے کا ہدف ملحوظ ہے، اور جنسی عمل اور اس سے تعلق رکھنے والی متعدد و بیشتر لذتیں نوع و نسل کو فنا و نابودی اور کلی طور پر محو و ختم ہونے سے بچانے کے لئے ہیں، لہذا اگر انسان کے لئے ایسے وجود و ہستی کا تصور کریں جس میں نہ موت ہے اور نہ ہی فنا و نابودی بلکہ ایسی زندگی ہے جو ہر طرح کے شر اور ناگوار و ناپسند امر سے محفوظ ہے تو پھر وہاں ان بدنی قوتوں کے پائے جانے کا کیا فائدہ کہ جن کی عملداری کی غرض فردی و نوعی بقاء کے سوا کچھ نہیں؟ اور پھر بدن کو اس قدر وسیع اعضاء و وجوہ اور آلات و وسائل مثلاً قوت ہاضمہ، تنفس، پھیپھڑے، جگر، تلی اور ان جیسی چیزوں سے لیس کرنے سے کیا حاصل؟ جبکہ یہ سب کچھ عارضی و محدود بقاء کو یقینی بنانے کے لئے پیدا کیا گیا ہے نہ کہ ابدی و ہمیشہ باقی رہنے والی بقاء کے لئے!

..... تو جب ان تمام اعضاء و اشیاء کی تخلیق و ایجاد ہی فانی زندگی کے لئے ہے تو پھر اتنے وسیع نظام و اہتمام کی کیا

ضرورت ہے؟.....

جواب:

خداوند عالم نے دنیاوی لذتوں اور ان سے تعلق رکھنے والی نعمتوں کو زمین میں زینت قرار دیا اور ان سب کو اس لئے پیدا کیا تاکہ انسان ان سے دل لگائے اور زندگی سے لطف اندوز ہو کر ان نعمتوں سے پیوستہ و وابستہ ہو، چنانچہ ارشاد الہی ہوا:

سورہ کہف، آیت: ۷

○ ” اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِينَةً لِّهَا“

(ہم ہی نے روئے زمین پر موجود جو کچھ ہے اسے اس کے لئے زینت قرار دیا ہے)

سورہ کہف، آیت: ۴۶

○ ” اَلْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا “

(مال اور اولاد دنیاوی زندگی کی زینت ہے)

سورہ نساء، آیت: ۹۴

○ ” تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا “

(تم دنیاوی زندگی کا ساز و سامان چاہتے ہو)

اس کے علاوہ ایک آیت ایسی ہے جس میں جامع صورت میں دنیاوی زندگی کی نعمتوں کے بارے میں ارشاد ہوا:

(ملاحظہ ہو)

سورہ طہ، آیت ۱۳۱ :

○ ” وَلَا تَسْتَدَنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهَا اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زُخْرًا لِّلْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفِثَنَّهُمْ فِیْهِ وَاُوْرٰقُ سٰبِغٍ حٰیضٍ وَّ اَبْقٰی ﴿۱۳۱﴾ “

(اپنی دو آنکھوں کو اس متاعِ ناچیز کی طرف نہ بڑھاؤ جو ہم نے بعض لوگوں کو دی ہے کہ جو دنیاوی زندگی کی ظاہری چمک دمک ہے، ہم نے انہیں یہ اس لئے دی تاکہ اس میں انہیں آزمائیں، جبکہ تیرے پروردگار کی روزمی (رزقِ آخرت) بہتر اور باقی رہنے والا ہے)

سورہ قصص، آیت: ۶۰

○ ” وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَّاعٌ اَلْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِیْنَتُهَا ۗ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی ۗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ “

(جو کچھ تمہیں عطا کیا گیا ہے وہ دنیاوی زندگی کا ساز و سامان اور اس کی زینت ہے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ

بہتر اور باقی رہنے والا ہے، کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟)

یہ اور ان کے علاوہ دیگر آیات میں بھی اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے کہ دنیا میں پائی جانے والی نعمتیں اور ان سے تعلق رکھنے والی لذتیں سبھی اس دنیاوی زندگی کے لئے مقرر کی گئی ہیں اور یہ اسی محدود اور چند روزہ زندگی کا ساز و سامان ہے کہ جس سے نہایت قلیل دنوں میں استفادہ کیا جاتا ہے، اگر یہ زندگی نہ ہوتی تو یہ نعمتیں نہ تو پیدا کی جاتیں اور نہ ہی ان کی کوئی قدر و قیمت ہوتی، بلکہ کوئی ان پر توجہ ہی نہ دیتا۔

یہ وہ حقائق ہیں جن سے انکار نہیں ہو سکتا، لیکن اس کے باوجود یہ جاننا ضروری ہے کہ یہی وجود ہے جو انسان کے

لئے باقی رہنے والا ہے اس کے سوا کچھ بھی نہیں، یعنی یہی وجود کہ جو اس دنیا میں چند روز ٹھہرا اور ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلتا رہا، اور یہ وہی روح ہے جس کی۔۔ حاکمیت کی۔۔ اصل و اساس بدن ہے اور بدن ہی پر اس کی حاکمیت ہوتی ہے جو کہ زمینی عناصر سے لئے گئے اجزاء کا مجموعہ و مرکب اور اس میں پائی جانی والی فعال و متحرک قوتیں ہیں کہ اگر ان امور کا باقی نہ رہنا فرض کر لیا جائے جو کہ انسان کی بقا کے بنیادی ارکان ہیں تو نہ وجود باقی رہے گا اور نہ ہی بقاء حاصل ہوگی یعنی ان کا نہ ہونا درحقیقت انسان ہی کا نہ ہونا قرار پائے گا نہ یہ کہ اس کے وجود کو استمرار و تسلسل حاصل نہ ہوگا بلکہ اصل ہی باقی نہ ہوگا، (اس مطلب پر اچھی طرح غور کریں)

یہاں انسان درحقیقت وہی ہے جو افراد کی صورت میں وجود پذیر ہوتا ہے..... ایک فرد سے دوسرا فرد بنتا ہے..... کھاتا ہے، پیتا ہے، مناکت و مباشرت کرتا ہے، ہر چیز میں تصرف کرتا ہے، لیتا ہے اور دیتا ہے، قوت حس و خیال کو کام میں لاتا ہے، سوچتا سمجھتا ہے، فرح و سرور اور مسرت و خوشی پاتا ہے، اور اس طرح کے دیگر امور یہ سب کچھ اس کی ذات سے موزونیت و ہمہنگی کا حامل ہے اور اس کی ذات انہی امور کے مجموعہ کی ایک صورت ہے کہ جن میں سے بعض امور دوسرے بعض کے لئے مقدمہ قرار پاتے ہیں یعنی ان کا وجود دوسرے بعض کے وجود سے مقدماتی وابستگی رکھتا ہے اور وہ ایک دوسرے پر موقوف ہوتے ہیں، گویا ایک دائرے کی طرح ہے جو ایک دوسرے کے سہارے گھومتا ہے کہ ایک جز دوسرے جز سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔

پس جب خداوند عالم اسے اس فانی دنیا سے ہمیشہ باقی رہنے والے جہان میں منتقل کر دیتا ہے اور اس کے لئے خلود و دوام اور ہمیشہ رہنا مقرر کر دیتا ہے خواہ ہمیشہ کا ثواب ہو یا ہمیشہ کا عذاب ہو تو اس سے اس کے حالیہ وجود کا ابطال اور ہمیشہ باقی رہنے والے وجود کی صورت گری نہیں ہوتی..... یعنی ایسا نہیں کہ اس کا یہ وجود دوسرے ہی سے ختم ہو جاتا ہے اور ایک نیا دائمی وجود اسے عطا کیا جاتا ہے..... بلکہ اس کے اسی وجود کو ثبات عطا کیا جاتا ہے اور وہ جو کچھ اب ہے وہی رہے گا لیکن اس فرق کے ساتھ کہ پہلے زوال و تغیر سے دوچار ہوتا تھا مگر اب ایسا نہیں اور اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوگی، تو لامحالہ یا دنیاوی نعمتوں جیسی نعمتوں سے منعم و بہرہ ور ہوگا جو کہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہوں گی یا دنیاوی نعمتوں و نعمتوں اور تکلیفوں و مصیبتوں سے دوچار و ہمتلا ہوگا جو کہ ہمیشہ اس پر چھائی رہیں گی۔ وہ خواہ مباشرت و مناکت سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہوں یا کھائی اور پی جانے والی اشیاء ہوں، لباس و مسکن ہو یا دوست و ساتھی اور خوشی و مسرت ہو، یا اس طرح کے امور و اشیاء، تو یہ سب کچھ اخروی زندگی میں پایا جائے گا البتہ زوال و دوام کے فرق کے ساتھ! نتیجتاً اخروی انسان وہی انسان ہے جو اس دنیا میں ہے اور اس کی اخروی ضرورتیں وہی ہیں جو اس دنیا میں ہیں اور جو کچھ اس دنیا میں اس کے لئے وسیلہ کمال ہے آخرت میں بھی وہی سبب کمال ہوگا، دنیاوی زندگی میں جو امور و اشیاء اس کا مطلوب و مقصود تھے اخروی زندگی میں بھی وہی اس کا مطلوب و مقصود ہوں گے البتہ

دونوں جہانوں کا فرق اور ماہہ الاتمیز زوال و دوام اور فناء و بقاء ہے..... دنیا زوال پذیر و فنا آشنا ہے جبکہ آخرت دوام شعار و بقا صفت ہے، دنیا ختم ہو جانے والی ہے اور آخرت ہمیشہ باقی رہنے والی ہے، دنیا دار الفناء اور آخرت دار البقاء ہے..... چنانچہ اسی حقیقت کا اظہار خداوند عالم کے مقدس کلام سے ہوتا ہے کہ جس میں انسان کی وجودی ساخت اور تکوین و تخلیق کے مراحل و مراتب کو بیان کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو:

سورہ مؤمنون، آیت: ۱۶:

○ ” وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَكِينٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظْمًا فَنَسَبْنَا الْعِظْمَ لَحْمًا ۝ ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۝ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ۝ ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذَلِكَ لَكَيْتُونَ ۝ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ ۝“

(اور ہم نے انسان کو گندھی ہوئی مٹی کے جوہر سے پیدا کیا، پھر ہم نے اسے ایک ٹھکانے میں نطفہ بنا دیا، پھر ہم نے نطفہ کو جما ہوا خون بنایا، پھر ہم نے جسے ہوئے خون کو گوشت کا لوتھڑا بنایا، پھر ہم نے لوتھڑے کو ہڈیاں بنا دیا، پھر ہم نے ہڈیوں کو گوشت کا لباس پہنایا، پھر ہم ہی نے اسے ایک دوسری صورت میں خلق کر دیا، پس خدا برکت والا، بہترین خلق کرنے والا ہے، پھر اس کے بعد تم سب کو مرنا ہے، پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے)۔

اس آیت مبارکہ میں تین جملے غور طلب ہیں:

” لَقَدْ خَلَقْنَا “ (ہم نے پیدا کیا)

” ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ “ (پھر ہم نے اسے بنایا)

” ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ..... “ (پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے)

پہلے جملہ ” لَقَدْ خَلَقْنَا “ میں لفظ ”خلق“ پر غور کریں، اس سے مراد کچا کرنا اور اجزاء کو ترکیب دینا ہے۔

دوسرے جملہ ” ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ “ میں ”أَنشَأَ“ پر توجہ کریں اس سے خلق و ایجاد میں تبدیلی کا ثبوت ملتا ہے۔

تیسرے جملہ ” ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ “ میں ”إِنَّكُمْ“ پر غور کریں، اس کا مخاطب وہی ہے جسے

نیا وجود عطا کیا گیا جو اس آیت میں ”خَلَقْنَا آخَرَ“ کا مصداق ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

سورہ اعراف، آیت: ۲۵

○ ” قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ “

(اس نے کہا کہ تم اسی میں (زمین میں) زندہ رہو گے اور اسی میں مرو گے اور اسی سے باہر نکلو گے) اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی، زمینی زندگی ہے کہ جو زمینی نعمتوں و قسموں سے ترکیب یافتہ ہے، اس موضوع کی بابت سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۳ ” كَانِ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً ..... “ کی تفسیر میں بعض مطالب بیان کئے جا چکے ہیں۔ زمینی نعمتوں کے بارے میں خداوند عالم نے یوں ارشاد فرمایا:

○ ” ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا “

(یہ دنیاوی زندگی کا ساز و سامان ہے)

اور پھر ارشاد فرمایا:

سورہ رعد، آیت: ۳۶

○ ” وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ “

(دنیاوی زندگی، آخرت میں ایک متاع و ساز و سامان کے سوا کچھ نہیں)

ان دو آیتوں میں دنیاوی زندگی ہی کو آخرت کی متاع اور ساز و سامان قرار دیا گیا ہے کہ جس سے انسان بہرہ مند و لطف اندوز ہوگا، اور اس موضوع کی بابت یہ نہایت بدیع و عمدہ ترین بیان ہے اور ایک ایسا دروازہ ہے جس سے ہزاروں دروازے کھلتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ایک حدیث نبویؐ کی تصدیق کا واضح اشارہ بھی اس میں پایا جاتا ہے کہ جس میں آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: ” کما تعیشون تموتون، و کما تموتون تبعثون “ (تم جس طرح زندگی گزارتے ہو اسی طرح مرو گے اور جس طرح مرو گے اسی طرح اٹھائے جاؤ گے)۔

خلاصہ کلام یہ کہ دنیاوی زندگی انسان کے اسی وجود کا نام ہے جو اس دنیا میں اپنے اچھے یا برے اعمال کے نتیجہ میں پاتا ہے اور وہ خود اس سے آخرت میں بہرہ ور ہوگا، اگر اس نے نیکیاں کمائی ہوں گی تو سعادت مندی سے لطف اندوز ہوگا اور اگر برائیوں کا ارتکاب کیا ہوگا تو اس کا مزہ اچھے گا، یعنی وہ اپنے کئے کے عین مطابق جزا و سزا پائے گا کہ اس کی فوز و فلاح اور ناکامی و خسران کا ترازو اس کی اختیار کردہ راہ و روش ہے، لہذا وہ اپنے اچھے اعمال کے نتیجہ میں سعادت و خوش بختی سے بہرہ ور ہو کر اخروی نعمتوں کی لذتوں سے مالا مال ہوگا یا ان سے محرومی اس کا مقدر بن جائے گا، انہیں دو کو بہشت کی نعمتوں اور دوزخ کے عذاب سے موسوم کیا گیا ہے۔

اس سے واضح تر الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ انسان طبعاً سعادت و شقاوت کا حامل ہے کہ جو اس کی فردی و نوعی

بقاء سے وابستہ و محیط ہے، اور یہ سعادت و شقاوت اس کے طبعی افعال یعنی کھانا، پینا اور مناکحت و مباشرت وغیرہ پر موقوف اور ان سے جڑی ہوئی ہیں اور اس کی طبع و جودی کو ایسی لذتوں سے مزین و آراستہ کر دیا گیا ہے جو مقدمہ و تمہید کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ تو ہے اس کی طبعی صورت حال، پھر جب وہ طلب کمال کی راہ پر گامزن ہوتا ہے اور اپنے شعور و ارادہ کے ساتھ سرگرم عمل ہو جاتا ہے تو اپنا نوعی تشخص پالیتا ہے اور اس کا کمال اس کے شعور و ارادہ ہی کا اختیار و انتخاب کردہ ہوتا ہے یعنی وہ جس کمال کو اپنے ارادہ و اختیار سے چن لیتا ہے وہی اس کی پہچان کرواتا ہے لہذا وہ کمال کہ جس کا اس کے شعور و ارادہ سے تعلق اور وابستگی نہیں ہوتی اگرچہ وہ اس کا وجودی، طبعی، فطری و نکوینی کمال تو ہوتا ہے مگر اس کا مخصوص فردی، شخصی اور کسی کمال نہیں کہلاتا کیونکہ وہ ایک شعور و ارادہ کا حامل فرد ہوتا ہے جس کا اکتسابی کمال ہی حقیقی معنی میں اس کی پہچان و تشخص کی علامت ہوتا ہے، یہی صورت حال اس کے مقابل کی ہے یعنی جو نقص طبعی و فطری طور پر اس میں موجود ہو اسے اس کے لئے حقیقی نقص قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ حقیقی نقص اس کے شعور و ارادہ کے نادرست اختیار و انتخاب سے پیدا ہوتا ہے چنانچہ اس کی مثال اس طرح دی جاسکتی ہے کہ جن چیزوں کا تعلق ہماری چاہت سے نہیں ہوتا یعنی وہ ہماری چاہت پر موقوف و منحصر نہیں ہوتیں ہم ان سے لطف اندوز نہیں ہوتے خواہ وہ طبعی سعادت سے عبارت کیوں نہ ہوں مثلاً بدن کی صحت و تندرستی، مال و اولاد وغیرہ، جبکہ ہم ان چیزوں سے لذت اٹھاتے ہیں جن سے ہمارا شعور و چاہت وابستہ ہوتی ہے خواہ وہ صرف تصور کی حد تک محدود ہی کیوں نہ ہوں اور انہیں مصداقی وجود حاصل نہ ہو مثلاً ایک بیمار شخص صحت و تندرستی کا تصور کر کے اس سے لطف اندوز ہوتا ہے جبکہ وہ اسے ابھی حاصل نہیں ہوتی، تو یہ مقدماتی لذتیں ہی ہیں جو انسان کے لئے حقیقی کمال بنتی ہیں اگرچہ وہ طبعی حوالہ سے حقیقی کی بجائے مقدماتی کمالات ہوتی ہیں، بنا بریں اگر خداوند عالم اس انسان کو ہمیشہ کی بقاء عطا کرے تو اس کی سعادت و خوش بختی انہی لذتوں سے عبارت ہوگی جن کو اس نے چاہا..... اور اپنے شعور و ارادہ سے ان کا عملی انتخاب کیا..... اور اس کی شقاوت و بد بختی انہی چیزوں سے عبارت ہوگی جن کو اس نے نہیں چاہا اور عملی طور پر ان کی بابت شعوری اقدام نہیں کیا..... خواہ طبعی حوالہ سے وہ مقدماتی لذت ہو یا نہ ہو، کیونکہ یہ ایک واضح و بدیہی امر ہے کہ کسی شخص یا شعور و ارادہ رکھنے والی قوت کی خیر و بہتری صرف اسی چیز میں ہوتی ہے جسے وہ جانتا ہے اور چاہتا ہو یعنی جسے جانے اور چاہے، جبکہ اس کے برعکس اس کے لئے "شر" اور برائی اس چیز میں ہوتی ہے جسے وہ جانے اور نہ چاہے۔ یعنی جاننے کا باوجود اس کا ارادہ نہ کرے۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ نتیجہ حاصل ہوا کہ انسان کی سعادت یہ ہے کہ آخرت میں زندگی کی اسے وہ تمام لذتیں مل جائیں جن سے بہرہ ور ہونا دنیا میں اس کا مقصود و مطلوب تھا خواہ ان کا تعلق کھانے، پینے اور مناکحت و مباشرت سے ہو یا ان سے بالاتر لذتیں ہوں، کہ وہ سب کچھ بہشت ہی کا دوسرا نام ہے، اور اس کی شقاوت ان لذتوں تک عدم رسائی اور ان کے حصول میں ناکامی ہے کہ اس کا نام دوزخ ہے چنانچہ اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد الہی ہے:



○ ”لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ“

(ان کے لئے اس میں وہی ہے جو وہ چاہتے ہیں..... سورۃ نحل، آیت ۳۱.....)

## متقین کی دعا

○ ”أَلَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ“

(وہ کہتے ہیں اے ہمارے پالنے والے! ہم ایمان لائے، تو ہمارے گناہ معاف فرما اور ہمیں جہنم کی آگ سے بچالے)

اس آیت مبارکہ میں ان ”متقین“ کی توصیف ہوئی ہے کہ سابقہ آیت میں جن کا تذکرہ ان الفاظ میں ہوا: ”لِلَّذِينَ اتَّقَوْا“ یہاں انہی کی توصیف میں ان کے اپنے الفاظ ذکر کئے گئے کہ وہ کہتے ہیں: ”رَبَّنَا“ (اے ہمارے پروردگار) اس میں خدا کی ربوبیت کے ذکر کے ذریعے اپنی عبودیت و عبودیت کا اظہار کیا گیا ہے، اور اس سے طلب رحم و درخواست رحمت کرتے ہوئے اپنی دعا کی قبولیت کا عاجزانہ سوال ان لفظوں میں کیا گیا ہے: ”إِنَّا آمَنَّا“ (ہم ہی تو ایمان لائے ہیں)، اس جملے میں ان کا مقصد خداوند عالم کو احسان جتلا نا نہیں کیونکہ احسان تو خدا کی طرف سے ہے کہ اس نے انہیں ایمان کی توفیق و عزت عطا کی ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے:

سورۃ حجرات، آیت: ۱۷

○ ”بَلِ اللّٰهُ يُمْسِكُ عَلَيْكُمْ كُمُوتَكُمْ لِكَلَّا يَآئِنَ“

(بلکہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت..... اور توفیق..... سے نوازا ہے) بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس جملے میں ان کا مقصد و مقصود اس وعدہ الہی کی تکمیل کی استدعا ہے جو خداوند عالم نے اپنے بندوں سے کیا ہے کہ جو شخص اس پر ایمان لائے خدا اس کے گناہوں و خطاؤں کو معاف کر دے گا، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۃ احقاف، آیت ۳۱:

○ ”وَإِذْ نَادَىٰ يَعْزُبُ لَكُمْ“

(اور تم اس پر ایمان لاؤ وہ تمہاری مغفرت کرے گا)..... (اس پر ایمان لاؤ تاکہ وہ تمہاری مغفرت کرے.....)

یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ”رَبَّنَا إِنَّنَا آمَنَّا“ (اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے ہیں) کے فوراً بعد یوں کہا:

”فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا“ (پس تو ہمارے گناہ معاف کر دے) اس جملے پر حرف ”ف“ (فاغفر) لگا کر اسے ماقبل سے جوڑ دیا گیا ہے (اسے فاء تفریح کہتے ہیں اور یہ ماقبل کی فرع کے اظہار کے لئے ہوتا ہے، یعنی جس جملہ پر یہ حرف لگایا جائے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کا تعلق ماقبل جملے سے ویسا ہے جیسے فرع کا اصل سے ہوتا ہے، م)، اور ان کے بیان... یاد دعا... میں حرف ”ان“ (اننا) درحقیقت اپنے ایمان میں سچائی و ثابت قدمی کے اظہار و ثبوت اور تاکید کے لئے ہے،

### ایک سوال اور اس کا جواب

اس مقام پر ممکن ہے یہ سوال پیدا ہو کہ متقین نے اپنی دعا میں ”فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا“ (تو ہمارے گناہوں کو معاف کر دے) کے بعد ”وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ“ (اور ہمیں دوزخ کی آگ سے بچا) کیوں کہا؟ گناہوں کی بخشش کے بعد دوزخ کی آگ کا مورد ہی باقی نہیں رہتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ گناہوں کی بخشش عذاب سے چھٹکارے کا لازمی سبب نہیں، اور وہ یوں کہ دوزخ کی آگ سے بچاؤ خدا کی طرف سے اپنے مومنین و عبادت گزار بندے پر خاص عنایت سے عبارت ہے، ایسا نہیں کہ بندے کا خدا پر حق بن جاتا ہے کہ وہ اسے ایمان و عبادت کے بدلے میں دوزخ کی آگ سے بچائے یا بہشت کی نعمتوں سے نوازنے پر مجبور ہو کیونکہ ایمان و اطاعت بھی خدا کی عطا کردہ نعمتوں میں سے ہیں کہ خدا اپنے بندے کو ان سے نوازتا ہے اور کوئی بندہ خود سے کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا بلکہ یہ خدا ہی ہے جو کوئی حق اپنے اوپر لے لیتا ہے، یعنی کسی بندے کا خدا پر کوئی حق نہیں بنتا سوائے اس حق کے کہ جو خدا خود اپنے اوپر قرار دیتا ہے، اور اسی طرح کے حقوق میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے مومن و عبادت گزار بندے کے گناہوں کو معاف کرے اور اسے دوزخ کی آگ سے بچائے، اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورۃ احقاف، آیت: ۳۱

○ ”وَأَمْثَلُوا بِهِ يُغْفِرْ لَكُمْ مِمَّنْ ذُنُوبِكُمْ وَيُجِزْكُمْ مِمَّنْ عَذَابِ آلِيمٍ“

(اور اس پر ایمان لاؤ تا کہ وہ تمہارے گناہوں کو معاف کرے اور تمہیں دوزخ کے عذاب سے بچالے)

بعض آیات مبارکہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کی آگ سے بچانے کا مطلب مغفرت اور بہشت عطا کرنا

ہی ہے، جیسا کہ ارشاد ہوا:

سورۃ صف، آیت: ۱۲

○ ” هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِّنْ عَذَابِ أَلِيمٍ ۖ تَوَّابُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۗ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ۗ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۗ يُعْفِرُ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَيُدْخِلُكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسْكِنٍ طَيِّبَةٍ فِي جَنَّاتٍ عَدْنٍ“

(کیا میں تمہیں ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دلائے، تم خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ، کہ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جان لو، وہ تمہارے گناہوں کو معاف کرے گا اور تمہیں باغبانے بہشت میں داخل کرے گا کہ جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں اور عدن کے باغات میں پاکیزہ محلات دے گا۔)

تو آخری دو آیتوں میں پہلی آیت کے جملہ ”هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِّنْ عَذَابِ أَلِيمٍ“ (کیا میں تمہیں ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دلائے) میں بیان کردہ اجمالی مطالب کی تفصیل ذکر کی ہے، بہر حال یہ ایک نہایت دقیق و عمیق مطلب ہے کہ انشاء اللہ اگر توفیق حاصل ہوئی تو بہت جلد کسی مناسب و موزوں مقام پر اس کی وضاحت کریں گے۔

### متقین کی پانچ صفات

○ ”الضَّٰبِرِينَ وَالصَّٰدِقِينَ.....“  
(وہ صبر کرنے والے ہیں اور سچ بولنے والے ہیں.....)

اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے متقین کی پانچ مخصوص و امتیازی صفات ذکر کی ہیں کہ کوئی متقی ان کے بغیر تقویٰ کی پاکیزہ و عظیم صفت سے متصف نہیں ہو سکتا، وہ پانچ اوصاف یہ ہیں:

(۱) صبر، ”الضَّٰبِرِينَ“

(۲) صداقت، ”الصَّٰدِقِينَ“

(۳) خضوع، ”الْقٰنِتِينَ“

(۴) انفاق، ”الْمُنْفِقِينَ“

(۵) استغفار، ”السَّغْفُورِ بِالْأَسْحَابِ“

پہلی صفت :

سب سے پہلے صبر کو ذکر کیا گیا جو کہ ہر صفت سے مقدم ہے، یہاں صبر کو مطلق اور ہر طرح کی قید و اضافت سے خالی ذکر کیا گیا ہے لہذا صبر کی تینوں اقسام اس میں شامل ہیں:

(۱) اطاعت پر صبر

(۲) معصیت پر صبر

(۳) مصیبت پر صبر

دوسری صفت :

صبر کے بعد متقین کی دوسری صفت صدق و صداقت ذکر ہوئی ہے کہ جس کی حقیقت کی بابت تجزیہ و تحلیل اور باریک بینی سے یہ معنی بنتا ہے: انسان کے قول و فعل سے اس کے ظاہر کی باطن سے مطابقت! لیکن یہ معنی آیت میں مذکور دیگر تمام فضیلتوں مثلاً صبر و خضوع وغیرہ کا جامع ہے کہ اس کے بعد کسی دوسری فضیلت کے ذکر کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی لہذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس سے مراد یہ جامع معنی نہیں بلکہ اس مقام پر صدق سے مراد (واللہ اعلم) صرف گفتار میں صداقت ہے یعنی سچ بولنا۔

تیسری صفت :

خضوع: قنوت یعنی خضوع اللہ تعالیٰ، اس سے مراد خدا کے حضور عاجزی اور تقاضائے بندگی کی تکمیل ہے، اس میں عبادات و اطاعتی اعمال کی تمام اقسام شامل ہیں۔

چوتھی صفت :

انفاق: اس سے مراد مستحق کی مالی مدد کرنا ہے۔

پانچویں صفت :

استغفار: الاستغفار بالاسحار سے مراد سحر خیزی اور رات کے پچھلے پہر خدا کی عبادت کے لئے کھڑا ہونا اور اس میں اس سے طلب مغفرت کرنا ہے۔ روایات میں استغفار بالاسحار سے نماز تہجد اور اس میں وتر کے قنوت میں استغفار کرنا مراد لیا گیا ہے اسی کو خداوند عالم نے ”انسان کا خدا تک پہنچنے کا راستہ“ قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۃ نزل، آیت: ۱۹

○ ” إِنَّ هَذِهِ تَذْكَرٌ ۖ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ سَابِغِهَا “  
(یہ ایک نصیحت ہے، جو شخص چاہے وہ اپنے رب کی طرف راستہ بنالے)  
یہی الفاظ سورۃ دہر کی آیت ۲۹ میں بھی ذکر ہوئے ہیں۔

## توحید کی گواہی

○ ” شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالنُّسُخِطِ “  
(گواہی دی ہے اللہ نے کہ نہیں کوئی معبود سوائے اس کے، اور فرشتوں نے اور عدل پر قائم صاحبان علم نے  
گواہی دی)

”شہادت“ کا اصل معنی آنکھ سے دیکھنا ہے، یعنی کسی چیز کو آمنے سامنے دیکھنے اور جو اس سے اس کو جاننے کے معنی کے لئے لفظ ”شہادت“ وضع کیا گیا ہے لیکن پھر اسے ادائے شہادت یعنی گواہی دینے کے معنی میں استعمال کیا جانے لگا اور اس سے شاہد و گواہ کا اپنی معلوم و چشم دید چیز یا واقعہ کا اظہار مراد لیا گیا، پھر رفتہ رفتہ یہ لفظ گواہی اور گواہی دینے..... گواہ بننے اور گواہی دینے..... دونوں میں مشترک ہو گیا کہ دونوں کی غرض ایک ہے کیونکہ کسی چیز یا واقعہ کی گواہی کا حقیقی مقصد یہ ہوتا ہے کہ کوئی حق و واقعہ الامرافراد کے باہمی نزاع، غلبہ، نسیان یا غشی رہنے کی وجہ سے ضائع نہ ہو بلکہ جیسا ہے ویسا ہی محفوظ رہے، تو گویا شہادت حق و حقیقت کے تحفظ اور اسے ضائع ہونے سے بچانے کا دوسرا نام ہے۔ اس حوالہ سے گواہی کو قبول کرنا اور اسے ادا کرنا دونوں کے لئے لفظ ”شہادت“ کا استعمال درست ہے یعنی حق کی حفاظت اور اسے قائم رکھنا ہی ”شہادت“ ہے۔ (علمی زبان میں اسے تحمل شہادت و ادائے شہادت کہا جاتا ہے)

” قسط “ سے مراد عدل ہے۔

..... بنا بریں اس صفت کا مطلب یہ ہے کہ متقین حق و حقیقت کو محفوظ رکھتے ہیں اور عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے حق کی گواہی دیتے ہیں.....

چونکہ سابقہ آیات یعنی : ” إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسُنَّعْنِي عَنْهُمْ آصْوَابَهُمْ وَلَا أُولَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا..... ” السُّعْفَرِيْنَ بِأَزْلَسْحَابِهَا “، اس مطلب کو بیان کرتی تھیں کہ خداوند عالم کے سوا کوئی معبود نہیں اور کوئی

چیز اس سے بے نیاز نہیں کر سکتی اور یہ کہ انسان جس چیز کو خدا سے بے نیاز کر دینے والی سمجھتا ہے اور اسی وجہ سے زندگی میں اس کا سہارا لیتا ہے وہ زیب و زینت اور ایسا ساز و سامان ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے پیدا کیا ہے تاکہ وہ اس سے استفادہ کر کے اور زندگی میں اس سے لطف اندوز ہو کر اپنے لئے خیر و بہتری کو یقینی بنا سکے، اور وہ تقوائے الہی کے بغیر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا اور تقویٰ ہی ہے جو اس کی مطلوبہ خیر و بہتری کا واحد ذریعہ ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہ جو نعمتیں انسان کو مرغوب و مطلوب ہیں وہ دنیا میں کافر و مومن دونوں کے لئے ہیں اور دونوں ان سے استفادہ کرنے میں برابر کے شریک ہیں لیکن آخرت میں یہ سب مومن کے لئے مخصوص و مختص قرار دی گئی ہیں، تو اس آیت مبارکہ میں یہ گواہی دی گئی ہے کہ جو کچھ ان آیات میں ذکر کیا گیا ہے وہ حق ہے اس میں کسی طرح سے شک کی گنجائش نہیں،

اور خداوند عالم نے خود ہی اس امر کی گواہی دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو چونکہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں لہذا کوئی چیز ایسی نہیں جو اس سے بے نیاز کر سکے، نہ مال، نہ اولاد اور نہ ہی ان کے علاوہ زندگی کی زیب و زینت یا کوئی سبب اس سے بے نیاز نہیں کر سکتا کیونکہ اگر اس دنیا میں کوئی چیز ایسی ہوتی جو خدا سے بے نیاز کرے تو وہ خدا کے علاوہ کوئی معبود ہوتا یا کسی معبود کا سہارا لینے والا ہوتا کہ جس کی طرف اس کی بازگشت ہوتی جبکہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں،

خداوند عالم نے توحید اور اپنی یکتائی کی گواہی قسط و عدل پر قائم ہو کر دی کہ وہ ایسا ہی ہے، وہ اپنے ہر کام میں قائم بالقسط ہے اور اپنی مخلوق میں حاکم بالعدل ہے کیونکہ اس نے کائنات میں نظام الاسباب جاری و نافذ کیا ہے اور اسباب و مسببات کے درمیان ربط و تعلق اور باہمی وابستگی و پیوستگی قائم کر کے موجودات جہان ہستی کے امور کی تدبیر کا مضبوط سلسلہ استوار فرمایا اور سب کو ایسی راہ پر لگایا ہے کہ ہر فرد اپنی وجودی قوتوں کو کام میں لا کر کوشش و عمل پیہم کے ساتھ اور سختیوں کو جھیلتا ہوا کمالات کی منزل بہ منزل رسائی کو یقینی بناتے ہوئے بالا خراس کی طرف لوٹ آئے، اور اس مقصد کی راہ میں اس نے ایسی نعمتیں قرار دیں کہ جن سے انسان اس دنیا میں استفادہ کر کے انہیں اپنی آخرت کے لئے ذخیرہ کرے اور اس راہ پر چل کر اپنے مقصد اور منزل مقصود تک پہنچ جائے نہ یہ کہ انہی کو اپنی منزل قرار دے اور انہی پر تکیہ لگا کر اپنے سفر کی راہیں و مرحلے طے کرنے سے رک جائے، اس مطلب کی گواہی خود خدا نے دی اور وہی عادل گواہ ہے، اس کی گواہی عدل پر مبنی اور سرِ پا عدل ہے۔

## سبیل سکینہ

حیدرآباد لطیف آباد، پونٹ نمبر ۸-۱۱

ایک لطیف نکتہ

یہاں ایک نہایت لطیف نکتہ قابل توجہ ہے کہ خدا کا عدل ہی اس کے عدل اور اس کی الوہیت میں یکتائی کی گواہی دیتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا عدل ہنفسہ و بذاتہ ثابت ہے اور وہ اس کی وحدانیت و یکتائی کو ثابت کرتا ہے۔ اس کی مزید

وضاحت یوں ہے کہ: ہم گواہ میں عدل کو شرط و معیار قرار دیتے ہیں تاکہ وہ زندگی میں درست راہ و روش اپنائے اور اپنے سیر و سلوک میں فطرت کی سیدھی راہ پر چلے اور ہر طرح کے افراط و تفریط سے دور رہے ورنہ وہ سیدھی راہ سے ہٹ جائے گا اور غلط روش اپنائے گا جس کے نتیجے میں وہ کچھ کر لے گا جو اسے نہیں کرنا چاہیے تھا، اور افراط و تفریط کی ہر صورت سے دوری اختیار کرنا اس کی گواہی کو جھوٹ اور غلط بیانی سے محفوظ کر دے گا، لہذا صدق و صداقت اور فطرت کی سیدھی راہ اپنانا انسان کو عادل بنا دیتا ہے، لہذا عالم ہستی میں جو نظام حکم فرما اور اس کے اجزاء کے درمیان جاری و نافذ ہے جو کہ فعل خداوندی ہے وہ عدل ہی عدل ہے۔ عدل محض ہے۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ عالم طبیعت و جہان ہستی میں رونما ہونے والے وہ تمام واقعات جو ہماری طبائع کو ناپسند و ناگوار ہوتے ہیں یا ہم انہیں اپنے طبعی میلان و رجحان کے برخلاف پاتے ہیں..... یا ہماری توقعات کے برعکس ہوتے ہیں..... پھر ہم ان پر اعتراض کرتے ہوئے ان کے وقوع پذیر ہونے کو شدید انداز میں زیر بحث لاتے ہیں تو ان پر اعتراض کے حوالہ سے ہم وہی کچھ کرتے ہیں جو ہماری عقلوں کے درپوں سے باہر آتا ہے یا ہماری طبائع و غرائز نفسانی ان کی طرف مائل ہوتی ہیں، جبکہ وہ سب کچھ عالم طبیعت ہی پر حاکم نظام سے ماخوذ ہوتا ہے یعنی ہماری عقلوں کے تراشے اور غرائز و چاہتوں کے میلان و رجحان کا سرچشمہ نظام ہستی ہی ہے، پھر ہم ان حوادث و واقعات کی بابت مزید بحث کرتے ہیں تو واقعات کے اسباب ہم پر ظاہر و آشکار ہو جاتے ہیں اور ہم رونما ہونے والے واقعہ کے اصل سبب سے آگاہی حاصل کر لیتے ہیں، اس صورت میں یا تو ہمارا شبہ دور ہو جاتا ہے اور یا ہم سبب سے آگاہی کے حصول سے عاجز و ناتواں ہو جاتے ہیں کہ پھر ہمارے ہاتھوں میں سبب سے نا آگاہی و جہل کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا یعنی اس وقت ہمیں سبب کا علم نہیں ہوتا نہ یہ کہ سبب کے نہ ہونے کا علم ہوتا ہے (اسے علمی اصطلاح میں عدم العلم دون العلم بالعدم کہا جاتا ہے) بنا براین جہان ہستی کا نظام..... جو کہ فعل خداوندی ہے..... وہی عدل ہے، (اس مطلب پر اچھی طرح غور کریں اور اسے سمجھنے کی کوشش کریں)

اگر اس جہان ہستی میں کوئی دوسرا معبود ہوتا کہ جو ہمیں خدا سے بے نیاز کرتا تو نظام کائنات عدل مطلق نہ ہوتا بلکہ ہر معبود کا فعل اسی کے حوالہ و نسبت سے اور اسی کے دائرہ عمل و حاکمیت میں عدل ہوتا، (یعنی پوری کائنات پر ایک ہی عدل حکم فرما نہ ہوتا)۔

خلاصہ کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ خود گواہی دیتا ہے۔ اور وہ شاہد عدل ہے، عادل گواہ ہے..... کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یہ گواہی اپنے کلام و گفتار کے ذریعے دیتا ہے چنانچہ اس کا واضح ارشاد ہے کہ جو زیر بحث آیت مبارکہ میں اس طرح ذکر ہوا ہے، ”شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ“، تو یہ آیت خداوند عالم کی اپنی توحید و یکمائی کی شہادت پر مشتمل ہے یعنی اس میں اس نے خود ہی اپنی یکمائی کی گواہی دی ہے، اس حوالہ سے یہ آیت درج آیت کے مثل ہے:



سورۃ نساء، آیت ۱۶۶ :

○ ”لَكِنَّ اللّٰهَ يَشْهَدُ بِمَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ بِالْعِلْمِ ۗ وَاللّٰلِئْلِكُمْ يَشْهَدُونَ ۗ وَكَفَىٰ بِاللّٰهِ شَهِيدًا“

(لیکن اللہ گواہی دیتا ہے اس چیز کے بارے میں جو اس نے حیرت کی طرف نازل کی ہے کہ اسی نے اسے اپنے علم کے ساتھ نازل کیا ہے اور فرشتے گواہی دیتے ہیں اور خدا شہادت و گواہی دینے میں کافی ہے)۔

اور فرشتوں کی گواہی کے بارے میں ارشاد ہوا کہ وہ بھی گواہی دیتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو اس سلسلہ میں ان آیات سے پہلے نازل ہونے والی کئی آیات مبارکہ میں فرشتوں کے بارے میں اس طرح آگاہ فرمایا کہ وہ خدا کے مکرم و بااحترام بندے ہیں اور وہ اپنے پروردگار کی معصیت و نافرمانی کے مرتکب نہیں ہوتے، وہ اس کے امر و فرمان کے مطابق عمل کرتے ہیں اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور ان کی تسبیح میں یہ گواہی ہوتی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، چنانچہ ارشاد ہوا :

سورۃ انبیاء، آیت ۲۷ :

○ ”بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ ۗ لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرِهِ يُعْمَلُونَ“

(بلکہ وہ مکرم و بااحترام بندے ہیں، وہ خدا کے فرمان پر سبقت نہیں لیتے، اور وہ اس کے حکم کے مطابق عمل کرتے

ہیں)

سورۃ شوریٰ، آیت ۵ :

○ ” وَاللّٰلِئْلِكُمْ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ“

(اور فرشتے اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں)

## صاحبان علم کی گواہی

اس آیت مبارکہ میں خدا اور فرشتوں کی گواہی کے ذکر کے بعد صاحبان علم کی گواہی کو ذکر کیا گیا ہے کہ وہ گواہی دیتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحبان علم آفاقی اور انفسی آیات کا مشاہدہ کرتے ہیں جو کہ ان کے انگ پر چھائی ہوئی ہیں اور ان کی قوت فکر و نظر کی وسعتوں پر محیط اور عقل و شعور کی تہوں میں گھر کر چکی ہیں، جس کے نتیجہ میں وہ خدا کی وحدانیت کی گواہی دیتے ہیں۔



## دواہم نکات کا بیان

مذکورہ بالا مطالب سے دواہم نکات واضح ہوتے ہیں:

(۱) ”شہادت“ و گواہی سے مراد..... جیسا کہ آیت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے..... قولی گواہی ہے عملی گواہی نہیں، اگرچہ عملی گواہی اپنے طور پر درست و حق ہے کیونکہ عالم وجود ہستی اپنے جاری نظام کی وحدت سے خداوند عالم کی وحدانیت کی وجودی و عملی گواہی دے رہا ہے اور اپنے ہر فرد کے وجود کے ذریعے..... جس میں تمام موجودات شامل ہیں..... اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ خدا ایک ہے (اگر اس کے علاوہ بھی کوئی معبود ہوتا تو عالم وجود ہستی میں اس طرح کا واحد و باہم پیوستہ نظام نہ پایا جاتا)

(۲) جملہ ”قَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ“ ادبی اصطلاح کے مطابق..... جملہ ”شَهِدَ اللّٰهُ“ کے فاعل کا ”حال“ ہے اور اس کا عامل ”شہد“ ہے، اس کی وضاحت کے لئے دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ”قَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ“ کو جملہ حالیہ قرار دینے سے آیت کا معنی یہ ہوگا کہ خدا کے ”قائم بالقسط“ ہونے کی گواہی نہیں دی گئی یعنی ایسا نہیں کہ اس سلسلہ میں خدا، فرشتوں اور صاحبان علم نے گواہی دی ہو بلکہ یہ خدا ہے کہ جس نے قائم بالقسط ہوتے ہوئے گواہی دی کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور صاحبان علم خدا کی وحدانیت کی گواہی دیتے ہیں، یہی بات ظاہر الّا یہ سے معلوم ہوتی ہے کیونکہ جملہ ”لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ“ اور جملہ ”قَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ“ کے درمیان جملہ ”وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُو الْعِلْمِ“ ذکر ہوا ہے، اگر خدا کا قائم بالقسط ہونا گواہی میں شامل ہوتا تو آیت کے الفاظ اس طرح ہونے چاہئیں تھے: ”اِنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ قَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُو الْعِلْمِ“ (خدا گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں قائم بالقسط ہے، اور فرشتے اور صاحبان علم گواہی دیتے ہیں)۔

مذکورہ بالا بیان سے ان مفسرین حضرات کے اظہارات کی نادرستی ظاہر و واضح ہو جاتی ہے جنہوں نے آیت مبارکہ کی تفسیر میں دونوں امور کا نظریہ پیش کیا ہے (یعنی انہوں نے کہا کہ شہادت و گواہی سے مراد عملی شہادت ہے اور خدا کا قائم بالقسط ہونا بھی اسی شہادت میں شامل ہے) قارئین کرام ان حضرات کے اظہارات کا مطالعہ کر کے ان پر وارد ہونے والے اشکال سے بخوبی آگاہ ہو سکتے ہیں۔

## ایک نہایت کمزور رائے

زیر بحث موضوع کی بابت نہایت کمزور بلکہ ردی ترین بات ان بعض مفسرین کی ہے جنہوں نے ہمارے مذکورہ بالا

مطالب پر اعتراض کی صورت میں کہا ہے کہ شہادت و گواہی کو قوی و کلامی شہادت (یعنی زبان سے اظہار) قرار دینا اس بات کو لازم قرار دے گا کہ توحید اور خداوند عالم کی یکتائی کا اثبات عقل کی بجائے ”نقل“ کے سہارے پر ہو (نقل سے یہاں قرآن مجید مراد ہے) اور ”نقل“ کے حجت اور قابل قبول ہونے کے لئے وحی کا اثبات ناگزیر ہوگا کیونکہ اس صورت میں شہادت و گواہی کا قرین صحت ہونا قرآن کے وحی ہونے کے اثبات پر موقوف ہوگا جبکہ وہ خود اس پر موقوف ہے تو اس طرح بیان میں ”دور“ لازم آئے گا جو کہ قطعاً درست نہیں (”دور“ وال پر زبر کے ساتھ) سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کا وجود خود اسی کے وجود یا کسی قول کی درستی خود اس کے درست ہونے پر موقوف ہو، اسے علمی اصطلاح میں ”توقف الشیء علی نفسہ“ کہتے ہیں یعنی کسی چیز کا وجود خود اس کے وجود پر موقوف ہو اور پلٹ پلٹ کر بات و ہیں کی وہیں رہ جائے، اسی اعتراض بیان کی بناء پر بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں شہادت و گواہی سے ایک استعاری معنی مراد ہے یعنی گواہی کا لفظ استعاراً استعمال ہوا ہے نہ کہ حقیقی معنی میں! اور وہ اس طرح کہ خداوند عالم نے جو کچھ بھی خلق فرمایا ہے وہ سب وجودی احتیاج اور متصل و پیوستہ نظام کا حامل ہونے کی وجہ سے اپنے صانع و خالق کی وحدت و یکتائی کا ثبوت پیش کرتا ہے، ان کا اس طرح خدا کی وحدانیت کا ثبوت دینا ایسا ہے جیسے وہ اپنی زبان و بیان سے اس امر کی گواہی دے رہے ہوں کہ خدا ایک ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں، گویا وہ اپنی زبان حال سے توحید کی گواہی دیتے ہیں اس لئے قرآن مجید میں اسے لفظ ”شہادت“ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسے خدا کی شہادت دینا قرار دیا گیا ہے، اسی طرح ملائکہ کی عبادت اور خدا کے اوامر و فرامین کی اطاعت و فرماں برداری درحقیقت خدا کی وحدانیت کی عملی شہادت ہے اور یہی حال صاحبان علم کا ہے کہ ان کا خدا کی یکتائی کی نشانیوں کا مشاہدہ کرنا اور ان کی طرف سے خدا کی وحدانیت کی گواہی دینے کے برابر ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ وہ حضرات اپنے بیان میں خلط ملط اور مغالطہ کا شکار ہوئے ہیں کیونکہ ”نقل“ (یا مقولات) پر اس صورت میں اعتماد نہیں کیا جاتا یعنی ان کا سہارا نہیں لیا جاتا جب عقل (قوت عقل یا مقولات) اور حس (قوت حس یا محسوسات) سے استفادہ کی راہ موجود نہ ہو اور ان (عقل و حس) سے موضوع کا اثبات ممکن و مقدور اور میسر نہ ہو کیونکہ ”نقل“ (یا مقولات) سے ان چیزوں اور امور میں علم و یقین حاصل نہیں ہوتا جن کی بابت علم و یقین کا حصول لازمی ہوتا ہے۔ لیکن اگر کسی منقولی دلیل کے بارے میں یہ فرض کر لیں کہ اس سے علم و یقین حاصل ہوتا ہے اور وہ وہی کام کرتی ہے جو عقل و عقلی دلیل کرتی ہے یا اس سے بھی زیادہ قوی، تو اس صورت میں اس پر اعتماد کرنا اور اس کا سہارا لینا عقل و عقلی دلیل پر سہارا لینے کے برابر یا اس سے بھی زیادہ قوی ہوگا، جیسا کہ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض اوقات تو اتر سے حاصل ہونے والی خبر عقلی دلیل سے بھی زیادہ مضبوط سمجھی جاتی ہے اور اس کا اثر و نتیجہ اس موضوع و مطلب سے کہیں زیادہ واضح و روشن ہوتا ہے جس پر عقلی دلیل قائم کی گئی ہو خواہ اس کے مقدماتی امور عقلی و یقینی ہوں اور ان سے یقین حاصل کیوں نہ ہوتا ہو۔ بنا بریں جب کوئی شاہد و گواہ

ایسا ہو کہ اس کی بابت جھوٹ اور غلط بیانی کا قطعی اندیشہ و تصور ہی نہ ہو اور وہ ایسی صریح و کھلی دلیل پیش کرے جو حقیقت الامر کے عین مطابق اور اس کی کامل عکاسی کرتی ہو تو اس کی گواہی اس طرح یقین کا فائدہ دے گی جس طرح کوئی عقلی و یقینی دلیل و برہان یقین کا فائدہ دیتی ہے، اور خداوند عالم کی ذات ایسی ہے (جس میں نقص و باطل اور کمزوری و غلطی کی قطعاً کوئی گنجائش و راہ نہیں پائی جاتی) کہ اس کے بارے میں کذب و غلط بیانی قابل تصور ہی نہیں، لہذا اس کا اپنی وحدانیت کی گواہی دینا حق اور مطابق واقع ہے جیسا کہ اس کا فرشتوں اور صاحبان علم کی گواہی کے بارے میں خبر دینا اور مطلع کرنا ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ جو خدا کے لئے شریک یا شریکاء ماننا اور ثابت کرتا ہے مثلاً بت و صاحبان بت، تو درحقیقت وہ انہیں خدا کی بارگاہ میں شفاعت کرنے والے اور خدا اور مخلوق کے درمیان وساطت کی حقیقت میں اثبات کرتا ہے جیسا کہ ان کے بارے میں خداوند عالم نے بیان فرمایا ہے کہ وہ کہتے ہیں: ”مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ“ (سورہ زمر، آیت ۳)۔ ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر صرف اس لئے کہ وہ ہمیں اللہ کا تقرب اور اس سے قریب تر کر دیں.....، یہاں تک کہ وہ شخص جو خفی و پوشیدہ شرک کرتے ہوئے خدا کا شریک بناتا ہے مثلاً اپنی عبادات میں ہوائے نفس و ذاتی خواہشوں، یا حاکم کی اطاعت و فرماں برداری، یا مال و دولت، یا اولاد کو ملحوظ و دخل قرار دیتا ہے وہ بھی اسے خدا کا بنایا ہوا سبب ماننا ہے البتہ اس کی بابت مستقل تاثر کا عقیدہ قائم کر لیتا ہے۔ بہر حال وہ جسے بھی خدا کا شریک قرار دیتا ہے وہ اسے شریک ہی سمجھتا ہے اور اس کی شراکت در عبودیت کا دعویٰ شریک کی ذات نہیں بلکہ شریک کرنے والے شخص کی طرف سے شرک کا ارتکاب کہلاتا ہے، اور جب خداوند عالم نے گواہی دے دی کہ اس نے اپنے لئے کوئی شریک نہیں بنایا..... یا کسی کو شریک قرار نہیں دیا..... تو ہر اس شخص کا ادعاء باطل و بے بنیاد ہو جائے گا جو خدا کا شریک بناتا ہے، چنانچہ اسی مطلب سے ہم رنگ و ہم معنی مطالب درج ذیل آیہ مبارکہ میں مذکور ہیں:

سورہ یونس، آیت ۱۸:

○ ”قُلْ أَتَنْتَبِهُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْزُبُ عَنْهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ“

(کہہ دیجئے کہ آیا تم خدا کو اس چیز سے باخبر کرتے ہو جسے وہ نہیں جانتا، نہ آسمانوں میں اور نہ ہی زمین میں؟)

اس سے مشرکین کے ادعاء شرک کی بنیاد ختم ہو جاتی ہے کہ جس میں وہ آسمان و زمین کی موجودات میں اپنے شریک سے لاعلم قرار پاتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آسمان اور زمین میں کوئی اس کا شریک نہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس سے مخفی و پوشیدہ ہو، درحقیقت یہ شہادت و گواہی ایک خبر اور اطلاع ہے اور ان خبروں اور اطلاعات میں سے ہے جو سرچشمہ ربوبیت و مرکز عظمت سے آتی ہیں مثلاً اس کا ارشاد ہے:

سورۃ یونس، آیت ۱۸ :

○ ”سُبْحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ“

(وہ پاک اور بلند و بالا تر ہے اس سے جو وہ شرک کرتے ہیں)

البتہ زیر بحث خدائی خبر میں شہادت کے معنی کا منطبق ہونا ملحوظ ہے کیونکہ وہ ایسی شہادت ہے جو ایک دعویٰ و ادعاء کے بارے میں ہے اور وہ خبر دینے والا قائم بالقسط ہے لہذا اسے ”شہادت“ و گواہی کہا جائے گا..... کیونکہ گواہی سے مراد دعوے میں عادل شخص کا بیان ہوتا ہے، اس بناء پر خدائے عادل کی خبر اور بیان کو شہادت و گواہی کہا بالکل درست ہے..... اور آیت مبارکہ میں ”شہادت“ کا لفظ ذکر کرنا دراصل بیان و سخن میں تفسن کے طور پر ہے کہ اس سے متکلم کے سخنوری میں کمال اور سخن سنجی کی بلندی کا ثبوت ملتا ہے..... نتیجتاً آیت مبارکہ کے معنی کی بازگشت اس امر کی طرف ہوگی کہ اگر عالم ہستی میں خدا کے علاوہ دیگر معبود ہوتے کہ جو کائنات کی تخلیق و تدبیر کے امور میں موثر ہوتے اور خدا کے ساتھ ان امور میں شریک ہوتے یا کم از کم اس حوالہ سے شفاعت کرنے والے ہوتے تو خداوند عالم ان سے آگاہ ہوتا اور ان کے بارے میں شہادت و گواہی دیتا لیکن اس کے برعکس اس نے خبر دی ہے کہ اس کا کوئی شریک نہیں لہذا ماننا ہوگا کہ کوئی اس کا شریک نہیں، اور اگر اس کا کوئی شریک ہوتا تو فرشتوں کو بھی اس کا علم ہوتا وہ کہ جو کرم و با احترام ہیں اور خدا و خلق کے درمیان وساطت اور خلقت و تدبیر میں خدا کے اوامر کو جاری کرنے والے ہیں مگر وہ بھی گواہی دیتے ہیں کہ اس کا کوئی شریک نہیں، اسی طرح صاحبان علم بھی اس سے آگاہ ہوتے اور اس کی نشانیوں سے باخبر ہوتے مگر وہ بھی آفاق و انفس میں پائی جانے والی نشانیوں کے مشاہدہ کے بعد شہادت و گواہی دیتے ہیں کہ خدا کا کوئی شریک نہیں۔

خدا کے شریک نہ ہونے کے حوالہ سے ہمارے بیان کی مثال یوں ہے کہ جیسے کہا جائے: اگر فلاں ملک میں اس کے موجودہ بادشاہ کہ جسے ہم سب جانتے اور پہچانتے ہیں کے علاوہ کوئی دوسرا بادشاہ بھی ہوتا کہ جو امور مملکت داری میں اس کا شریک ہوتا تو موجودہ بادشاہ کو اس کا علم ہوتا کیونکہ یہ بات محال و ناممکن ہے کہ کسی ایک مملکت میں دو بادشاہ حکومت کرتے ہوں اور انہیں ایک دوسرے کا علم نہ ہو، اسی طرح وہ ادارے و محکمے جو بادشاہ کے فرما میں کو جاری و نافذ کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور وہ افراد و کارندے جو مرکز اور عوام کے درمیان واسطہ بنتے ہیں..... کہ جنہیں آج کی زبان میں وزراء کہا جاتا ہے..... وہ اس بادشاہ کو ضرور جانتے اور پہچانتے کیونکہ وہ اس سے احکامات لیتے ہیں، تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ اس وجود سے نا آگاہ ہوں اور انہیں اس کا علم ہی نہ ہو جبکہ وہ اس کے فرمانی وصول کرنے والے اور اس کے دستورات کے نفاذ و عملداری کو یقینی بنانے والے ہیں یہی حال ملک کے صاحبان عقل و علم کا ہے کہ انہیں بھی اس دوسرے حاکم و بادشاہ کا علم ہوتا اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ عوام و رعایا میں عقل و دانش سے بہرہ ور افراد اپنے حاکم و بادشاہ اور فرمانروائے مملکت کے اوامر و دستورات کی پیروی کرتے

ہیں اور اس کے ملک و سلطنت میں زندگی گزارتے ہیں تو یقیناً انہیں دوسرے بادشاہ کا علم ہوتا اور وہ اس سے پوری طرح آگاہ ہوتے، لیکن موجودہ بادشاہ اس کے وجود کی نفی و انکار کرتا ہے اور حکومت کے کارندے اسے نہیں پہچانتے اور عقلائے مملکت اس کے وجود کی کوئی ایسی نشانی نہیں دیکھتے جس کی بناء پر اس کے وجود کی تصدیق کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہے ہی نہیں!

## خدائے واحد کی قوت و حکمت

○ ”لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ“  
(اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ قوی و غالب اور حکیم و دانایا ہے)

یہ جملہ اس جملہ مقترضہ کے مانند ہے جو کلام کے درمیان میں آتا ہے، اور یہ اس حق کے اظہار و یادآوری اور پورا کرنے کے لئے ہے کہ اگر اسے یہاں ذکر نہ کیا جاتا تو اس حق کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ تھا جبکہ یہ جملہ کلام میں اصل مقصود نہیں، یہ بات ادب القرآن سے ہے کہ جہاں خداوند عالم کا تذکرہ ہو اور اس کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہو اور سننے والے کی لوح ذہن پر ایسے نقوش ثبت ہونے کا اشارہ ملنے لگے جو ذات باری تعالیٰ کے شایان شان اور زیبا نہ ہوں تو فوراً ان کا مداوا کیا جاتا ہے اور ایسے الفاظ ذکر کر دیئے جاتے ہیں جن سے مقام ربوبیت کی تعظیم و ادائے احترام ہو مثلاً:

سورۃ یونس، آیت ۶۸ میں ارشاد ہوا:

○ ”قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهُ“

(انہوں نے کہا کہ خدا نے بیٹا بنایا ہوا ہے، اس کی ذات پاک ہے)

اس میں لفظ ”سبحانہ“ اس لئے لایا گیا ہے کہ یہاں ایسی بات ہو رہی تھی اور ایک ایسے قول و نظریہ کو ذکر کیا جا رہا تھا کہ جو ذات باری تعالیٰ کے شایان شان نہیں لہذا اس کی عظمت اس کی متقاضی تھی کہ فوراً ایسا جملہ ذکر کیا جائے جس سے خدا کے اس قول و نظریہ سے منزہ ہونے کا اظہار ہو، تو لفظ ”سُبْحٰنَهُ“ اس ہدف و مقصد کو پورا کرتا ہے۔

ایک حوالہ سے درج ذیل آیت مبارکہ میں بھی یہی امر ملحوظ ہے:

سورۃ مائدہ، آیت: ۶۴

○ ”وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُوْلَةٌ غَلَّتْ أَيْدِيهِمْ“

(یہودیوں نے کہا کہ خدا کا ہاتھ بندھا ہوا ہے، ان کے اپنے ہاتھ بندھے ہوں!)

تو اس آیت میں یہودیوں کے قول و نظریہ کے رد میں فوراً ”عَلَّمْتُ أَيُّدِيهِمْ“ کہا گیا تاکہ اس کی ذات مقدسہ کی طرف دی جانے والی غلط نسبت کے مقابلے میں اس کی عظمت کا دفاع ہو،

خلاصہ بحث یہ کہ زیر نظر آیہ مبارکہ کی ابتداء چونکہ خدا، فرشتوں اور صاحبان علم کی اس کے شریک کی نفی کی گواہی پر مشتمل تھی اور اس میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ وہ سب اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ خدا کا کوئی شریک نہیں، تو یہ ضروری بلکہ خدا کا حق تھا کہ جو خود اس گواہی کو بیان کرنے والا ہے (اس آیت میں متکلم خود خدا ہے) اور اسی طرح اس بیان کا سننے والا خدا سے اس کے شریک کی نفی کرتے ہوئے اس کی وحدانیت و یکتائی کا اظہار کرے اور صریح الفاظ میں کہہ دے: ”لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ“ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کی ایک مثال درج ذیل آیہ مبارکہ میں ملتی ہے جو کہ ایک تہمت کے ازالہ کی بابت نازل ہوئی:

سورہ نور، آیت ۱۶:

○ ”وَلَوْلَا إِدْسِعْتُمْوَلَا قُلْتُمْ مَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَتَكَلَّمَ بِهَذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ“  
(تم نے جب اسے سنا تو کیوں نہیں کہا کہ ہمیں ایسی بات نہیں کرنی چاہیے، تیری ذات پاک و منزہ ہے، یہ بہت بڑا بہتان ہے)

اس میں ایک تہمت و بہتان کے ازالہ کے حوالہ سے ”سُبْحٰنَكَ“ اس لئے کہا گیا کہ لوگوں پر خدا کا حق ہے کہ جب وہ کوئی تہمت و بہتان سنیں اور جس پر وہ الزام لگایا گیا ہو اس کا اس سے منزہ و پاک ہونا بیان کرنا چاہیں تو پہلے ذات خداوندی کا منزہ و پاک ہونا ذکر کریں کیونکہ خداوند عالم کی ذات سب سے زیادہ اس بات کی حقدار ہے کہ اس کی پاکیزگی اور ہر طرح کی تہمت و بہتان سے منزہ ہونا بیان کیا جائے، اس بناء پر خداوند عالم نے مذکورہ بالا آیت میں ایک طرح سے شکوہ کیا ہے کہ جب تم نے تہمت و بہتان کو سنا تو ضروری تھا کہ سب سے پہلے خدا کا منزہ و پاک ہونا بیان کرتے کیونکہ وہ ہر شخص سے زیادہ اس کا حقدار ہے اور اس کی تنزیہ و پاکیزگی کو بیان کرنا واجب ہے۔

بنابراین اس جملہ ”لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ“ کا مقام دراصل خداوند عالم کی ثناء کا مقام ہے تاکہ اس کی تعظیم و تکریم کا حق ادا کئے جانے کی راہ ہموار ہو، اسی لئے اس جملہ کی تکمیل اس کے دو عظیم ناموں ”عزیز“ اور ”حکیم“ سے ہوئی ہے، اگر یہاں شہادت و گواہی کا نتیجہ بیان کرنا مقصود ہوتا تو جملہ کی تکمیل میں خدا کے دو اوصاف یعنی وحدانیت اور قائم بالقرط ہونا، ذکر کئے جاتے۔ لہذا جب خدا کی وحدانیت و یکتائی کی گواہی کا بیان ہو تو اس کی توحید کا ذکر ہی اس کے ثنائیان شان اور اس کا حق ہے کیونکہ وہ عزت میں یکتا ہے اور اس کی یکتائی اس سے مانع ہے کہ الوہیت میں اس کا شریک قرار دے کر اس کی تذلیل کی جائے لہذا ”لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ“ کے بعد ”عزیز“ کہا گیا اور وہ حکمت و دانائی میں متفرد و یکتا ہے

اور اس کا ایسا ہونا اس سے مانع ہے کہ کوئی اس کے کسی فیصلہ کو نقض و کالعدم نہیں کر سکتا اور نہ ہی خلق و تدبیر میں اس کے طے کردہ امور میں رکاوٹ ڈال سکتا ہے اور نہ اس کے قائم کردہ نظام کائنات کو توڑ مروڑ اور خراب کر سکتا ہے۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ نکتہ بھی واضح ہو گیا کہ آیت مبارکہ میں کلمہ توحید ”لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ“ دوبار کیوں ذکر کیا گیا ہے اور یہ بات بھی واضح و روشن ہو گئی کہ آیت کے آخر میں تکمیلی حوالہ سے خداوند عالم کے دو نام ”عزیز“ اور ”حکیم“ ذکر کرنے میں کیا راز ہے؟ (واللہ العالم).... حقائق الامور کا علم تو خدا کو ہے.....

## روایات پر ایک نظر

### قریش کے برے انجام کا حوالہ

تفسیر مجمع البیان (جلد دوم ص ۴۱۳) میں آیت مبارکہ ”قُلْ لِلَّهِ الْإِثْمَانُ كَمَا لِلنَّاسِ الْبِرُّ“ کی تفسیر میں محمد بن اسحاق کی اپنے اسناد سے بیان کردہ روایت ذکر کی گئی ہے جس میں انہوں نے کہا کہ جب حضرت پیغمبر اسلام جنگ بدر کے بعد فاتحانہ انداز میں مدینہ منورہ تشریف لائے تو مدینہ کے یہودیوں کو بازار قبیلہ قحاف میں جمع کیا اور ان سے فرمایا:

”يا معشر اليهود احذروا من الله مثل ما نزل بقریش يوم بدر، واسلموا قبل ان ينزل بكم ما نزل بهم وقد عرفتم انى نبي مرسل تجدون ذلك فى كتابكم“،

اے یہودیو! اس دن سے ڈرو جب خدا تمہیں اسی طرح کے انجام سے دوچار کرے جیسا اس نے بدر میں قریش کو کیا ہے اور اس سے پہلے کہ تم پر وہ خدائی قہر نازل ہو جو قریش پر نازل ہوا ہے تم اسلام لے آؤ جبکہ تم نے جان لیا ہے کہ میں خدا کا بھیجا ہوا نبی ہوں اور تم میرے بارے میں اپنی دینی کتاب میں مرقوم واضح بیانات و مطالب پڑھ چکے ہو، یہودیوں نے آنحضرتؐ سے کہا:

”يا محمد! لا يغرنك انك لقيت قوما اغمارا لا علم لهم بالحرب فاصبت منهم فرصة انا والله لو قاتلناك لعرفت انا نحن الناس“،

اے محمد! جنگ بدر میں قریش پر فتح پانے پر غرور نہ کریں، کیونکہ وہاں آپ کے مقابلے میں وہ لوگ تھے جو جنگ کے طور طریقوں سے آشنایں نہیں تو آپ کو ان پر غلبہ پانے کا موقع مل گیا لیکن جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو خدا کی قسم! اگر ہم آپ

سے جنگ کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم مرد میدان ہیں ..... اور جنگ کرنا جانتے ہیں .....  
ان کے اس اظہار کے بعد یہ آیت نازل ہوئی: ”قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا سَعْتٌ لَّيْسَ لَهُمْ شُرَكَاءُ فِيهَا يُحِبُّونَ.....“ ان کافروں سے کہہ دو کہ تم بہت جلد مغلوب ہو گے.....

مؤلف: اس روایت کو تفسیر درمنثور میں بھی محمد بن اسحاق کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے، اور ابن جریر اور بیہقی نے کتاب ”دلائل“ میں ابن عباس کے حوالہ سے یہ روایت ذکر کی ہے۔ اس سے قریب المعنی روایت تفسیر قمی میں بھی مذکور ہے، اس کے باوجود قارئین کرام ہمارے سابقہ ذکر کئے گئے مطالب کے تناظر میں اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ ان آیات مبارکہ کے سیاق سے ان کے یہودیوں کے بارے میں نازل ہونے کی مناسبت ظاہر نہیں ہوتی اور قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں بلکہ آیات مبارکہ کے سیاق سے مناسبت کے لحاظ رکھتے ہوئے یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ یہ جنگ احد کے بعد نازل ہوئیں (واللہ اعلم)..... حقیقت الامر کا علم خدا کو ہے.....

### امام جعفر صادقؑ کا ارشاد گرامی

کتاب کافی (جلد ۵ ص ۳۲۱ اور تفسیر العیاشی (جلد اول ص ۱۶۳) میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے روایت ذکر کی گئی ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا:

” ما تلذذ الناس فی الدنيا والآخرة بلذّة اکبر لهم من لذّة النساء.....“

لوگ دنیا و آخرت میں کسی چیز سے اتنی لذت نہ پائیں گے جو صنف نازک سے حال ہونے والی لذت و سروس سے زیادہ ہو، اسی کے بارے میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے: ”رُزِقَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ.....“ (لوگوں کے لئے عورتوں اور بیٹوں کی محبت لذت یزیدنا دی گئی ہے.....)

(امامؑ نے آیت کی تلاوت کے بعد ارشاد فرمایا):

” وان اهل الجنة ما يتلذذون بشيء من الجنة اشهى عندهم من النكاح لا طعام ولا شراب“

اہل بہشت بھی بہشت کی کسی چیز سے اس قدر لطف اندوز نہ ہوں گے جس قدر مناکحت سے لطف اندوز ہوں گے

اور انہیں اس سے زیادہ لذت بخش کوئی شے نہ ملے گی نہ کھانے والی اشیاء میں اور نہ پینے والی چیزوں میں سے!

مؤلف: اس روایت میں مذکور مطالب دراصل آیہ مبارکہ میں لذتوں کی جو ترحیب مذکور ہے اسی پر مبنی ہیں کیونکہ

اس میں عورتوں کی محبت کو دیگر تمام محبتوں و لذائذ پر مقدم کیا گیا اور سب سے پہلے ذکر کیا گیا ہے اور جب تمام لذائذ کو ذکر دیا



گیا تو ان سب کو متاع دنیا..... دنیاوی زندگی کا ساز و سامان اور زیب و زینت..... قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ بہشت کی لذتیں ان سے کہیں بہتر ہیں،

امام علیہ السلام کا لذت و مناکحت کو سب سے بڑی لذت قرار دینا اور اسے ہی لوگوں کی سب سے زیادہ پسندیدہ لذت سے تعبیر کرنا دوسری لذتوں سے اور ان کے تقابلی تناظر کی بنیاد پر ہے، یعنی امام کا مقصد یہ ہے کہ مناکحت و مباشرت انسانی جسم سے تعلق رکھنے والی تمام لذتوں سے زیادہ بڑی ہے لیکن جہاں تک غیر جسمانی لذتوں کا تعلق ہے تو وہ امام علیہ السلام کے ارشاد گرامی میں تقابلی فہرست میں شامل ہی نہیں مثلاً انسان کا اپنے وجود ہستی سے لطف اندوز ہونا یا اولیائے الہی و خدا کے مقرب بندوں میں سے کسی کا اپنے پروردگار کے قرب و تقرب اور اس کی بزرگ ترین نشانیوں، اس کے رضوان و اکرام اور نوازشات و عنایات کے مظاہر کے مشاہدہ سے لطف اندوز ہونا وغیرہ، تو امام نے ان لذائذ کی تقابلی ترتیب کو مورد توجہ قرار نہیں دیا، ابن حقائق پر تو ٹھوس علمی دلائل قائم ہو چکے ہیں کہ سب سے بڑی لذت کسی چیز کا اپنے وجود ہستی کی نعمت سے لذت پانا اور لطف اندوز ہونا ہے۔ اور دیگر علمی مضبوط دلائل سے یہ ثابت ہوا ہے کہ اشیاء و موجودات عالم کا اپنے وجود ہستی کی نعمت سے زیادہ اپنے پروردگار کے وجود ہستی سے لطف اندوز ہونا اور لذت پانا ہے۔ اور کثیر روایات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بندہ کا اپنے رب و خالق کے حضور و تقرب سے لذت پانا اسے ہر لذت سے زیادہ اور بڑا لگتا ہے، (گو یا بارگاہ الہی میں شرفیابی کی لذت ہر لذت سے عظیم بلکہ ناقابل قیاس ہے) چنانچہ ان میں سے ایک روایت کتاب اصول کافی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے جس میں آپ نے ارشاد فرمایا: حضرت علی بن الحسین علیہما السلام (امام زین العابدین) فرمایا کرتے تھے کہ قرآن مجید کی ایک آیت ایسی ہے جس کی تلاوت کے بعد موت کا جلدی آنا اور قتل کیا جانا مجھے مرغوب لگتا ہے اور وہ آیت یہ ہے:

سورۃ رعد، آیت ۴۱:

○ ” اَوْلٰئِكَ يَرْوٰۤا اَنْۡلَاقِي الْاَرْضِ نَنْقُصُهَا مِنْۢ اَطْرَافِهَا ”

(آیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے کم کر رہے ہیں)

یہاں کناروں سے کم کرنے کا مطلب علماء کا وفات پانا ہے، عنقریب اس سلسلے میں مربوط روایات اس کتاب میں

موزوں مقامات پر ذکر کی جائیں گی، (کتاب کافی۔ جلد اول ص ۳۰ حدیث ۶)

## دواموں کا بیان

آیہ مبارکہ میں ”وَاقْنَأَطِيْرًا مِّنْقَطْرَةً“ کی تفسیر میں کتاب مجمع البیان میں ایک روایت امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے منقول ہے جس میں انہوں نے ارشاد فرمایا کہ ”قنطار“ سے سونے سے بھری ہوئی گائے کی کھال مراد ہے۔

اسی حوالہ سے تفسیر قمی میں ایک روایت مذکور ہے جس میں امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ ”الْحَيَلِ الْمَسْوَمَةِ“ سے گھاس پھوس چرنے والے گھوڑے مراد ہیں۔ (تفسیر قمی جلد اول ص ۹۷)

## استغفار کی اہمیت اور آثار

کتاب ”من لایحضرہ الفقیہ“ اور کتاب ”خصال“ میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ذکر کی گئی ہے جس میں آپؑ نے ارشاد فرمایا:

”من قال فی وترہ اذا اوتر ” استغفر اللہ و اتوب الیہ سبعین مرة “ و هو قائم فواظب علی ذلک حتی تمضی سنة کتبہ اللہ عنده من المستغفرین بالاسحار و وجبت له المغفرة من اللہ تعالیٰ“

جو شخص نماز وتر میں کہ جو نماز شب کی آخری رکعت ہے کھڑے ہوئی حالت میں ستر مرتبہ ” استغفر اللہ و اتوب الیہ “ کہے اور اس عمل کو لگا تار ایک سال تک انجام دیتا رہے تو خداوند عالم اسے ”مستغفرین بالاسحار“ (راتوں کو جاگ جاگ کر استغفار کرنے والوں) میں شمار کرے گا اور خداوند عالم کی طرف سے مغفرت و بخشش کا لازمی حقدار بن جائے گا۔

ملاحظہ ہو: کتاب ”من لایحضرہ الفقیہ“ جلد اول ص ۳۰۹ اور کتاب الخصال ص ۵۸۱)

یہ مطلب آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے منقول دیگر روایات میں بھی ذکر ہوا ہے اور یہ عمل حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معمولات میں سے تھا۔ اس سے قریب المعنی روایت تفسیر ”درمنثور“ (جلد دوم ص ۱۲) میں ابن جریر کے حوالہ سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے جس میں آپؑ نے ارشاد فرمایا: ”من صلی من اللیل ثم استغفر فی آخر اللیل سبعین مرة کتب من المستغفرین“ جو شخص نماز شب پڑھے اور پھر رات کی آخری گھڑیوں میں

سز مرتبہ استغفار کا ورد کرے تو اس کا نام ”مستغفرین“ کی فہرست میں لکھا جائے گا۔  
 امام کا ارشاد گرامی : ”وجبت له المغفرة من الله“ (اللہ کی طرف سے مغفرت و بخشش کا لازمی حقدار بن جائے گا) دراصل قرآن مجید میں شب زندہ داروں کی جو دعا ذکر ہوئی ہے اس سے ماخوذ ہے جس میں انہوں نے بارگاہ رب العزت میں عرض کی : ”فاغفر لنا ذنوبنا“ (ہمارے گناہ معاف فرما) چونکہ خداوند عالم نے ان کی دعا ذکر کرنے کے بعد اسے رد نہیں کیا لہذا اس سے ان کی دعا کے مستجاب ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

## آیات ۱۹ تا ۲۵

- إِنَّ الَّذِينَ عِنْدَ اللَّهِ الْأَسْلَامُ ۖ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَعِيًّا ۚ بَيْنَهُمْ ۖ وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعٌ الْحِسَابِ ۝۱۹
- فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسَلْتُ وَجْهِي بِاللَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۖ وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ ۖ أَسَلْتُكُمْ فَإِنْ أَسَلْتُمْ فَقَدْ أَهْتَدُوا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَدْعُ ۖ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ۝۲۰
- إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيَّيْنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۖ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۖ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝۲۱
- أُولَئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَاتُ ۚ إِنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ۝۲۲
- أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَى كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ فَرِيقًا ۖ مِنْهُمْ وَهُمْ مُعْرِضُونَ ۝۲۳

○ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوا لَنْ نَسْئَلَنَّ النَّاسَ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۗ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا

يَقْتَرُونَ ﴿۳۹﴾

○ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْتُهُمْ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ ۗ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا

يُظْلَمُونَ ﴿۴۰﴾

## ترجمہ

- ” یقیناً، اللہ کے نزدیک اسلام ہی دین ہے، اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی انہوں نے باہمی دشمنی کی وجہ سے اختلاف کیا، جو شخص خدا کی آیات کا انکار کرے تو خدا بہت جلد مجاہدہ کرنے والا ہے“ ①۹
- ” پس اگر وہ آپ سے مجاہد اور کج بختی کریں تو ان سے کہہ دیجئے کہ میں نے اپنا سر خدا کے حضور خم کر دیا ہے اور اسی طرح اس نے بھی جس نے میری پیروی کی، اور (اے رسول!) ان لوگوں سے کہ جنہیں کتاب دی گئی ہے اور امین سے پوچھئے کہ کیا تم نے حق کو تسلیم کر لیا ہے، اگر وہ حق کو تسلیم کر لیں تو وہ ہدایت یافتہ ہو جائیں گے اور اگر انہوں نے روگردانی کی تو آپ کی ذمہ داری صرف پیغام پہنچا دینا ہے، اور خدا بندوں سے بخوبی آگاہ ہے“ ⑲
- ” جو لوگ خدا کی آیات کا انکار کرتے ہیں اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ان لوگوں کو بھی قتل کرتے ہیں جو لوگوں میں انصاف کا حکم دیتے ہیں تو انہیں دردناک عذاب کی خبر دے دیجئے“ ⑲
- ” انہی لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں ضائع ہو گئے اور ان کی مدد کرنے والا کوئی نہیں“ ⑲

- ” کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب میں سے تھوڑا سا حصہ دیا گیا ہے کہ انہیں خدا کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، پھر ان میں سے ایک گروہ روگردانی کر لیتا ہے جبکہ وہ حق کو پس پشت ڈالنے والے ہیں “ (۲۳)
- ” ان کے اس طرح کرنے کا سبب یہ ہے کہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ ہمیں دوزخ کی آگ چند دنوں سے زیادہ ہرگز لپیٹ میں نہ لے گی، دراصل دین کی بابت ان کی افترا پرداز یوں نے انہیں دھوکہ دیا ہے “ (۲۴)
- ” پھر ان کا انجام کیا ہوگا جب ہم انہیں اس دن اکٹھا کریں گے جس کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں پایا جاتا، اور اس دن ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم و زیادتی نہیں ہوگی “ (۲۵)

## تفسیر و بیان

ان آیات مبارکہ میں اہل کتاب کے بارے میں مطالب ذکر کئے گئے ہیں اور وہ ان تین گروہوں میں سے آخری گروہ ہے جن کے بارے میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس سورہ مبارکہ میں ان کی بابت مطالب مذکور ہیں اور یہی گروہ (اہل کتاب) ان تینوں میں زیادہ اہمیت کے ساتھ مورد توجہ قرار پایا ہے کہ کلام الہی میں اکثر آیات یہودیوں اور نصرانیوں سے متعلق امور کے بیان پر مشتمل ہیں چنانچہ بعض آیات براہ راست اور بعض ان کے حوالہ سے مربوط مطالب کی حامل ہیں اور بعض آیات میں مذکور مطالب کی بازگشت ان کی طرف ہوتی ہے۔

### خدائی دین کا تعارف

○ ” إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ “  
(اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے)

” اسلام “ کا لغوی معنی پہلے ذکر کیا جا چکا ہے اور شاید یہاں بھی وہی معنی مراد ہے کیونکہ اس آیت میں اہل کتاب کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ اسلام کے بارے میں علم و آگاہی کے باوجود آپس میں پائی جانے والی دشمنی کی وجہ سے اس سے روگرداں ہو گئے اور اس کی بابت ایک دوسرے سے الجھ گئے، بنا بریں آیہ مبارکہ ” إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ “ (اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے) کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ کے نزدیک دین ایک ہی ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا اور خدا نے اپنے بندوں کو اس کے علاوہ کسی دین کی پیروی کرنے کا حکم نہیں دیا اور اس نے اپنے انبیاء پر جو کتابیں نازل کیں ان میں بھی اسی دین کی پیروی کے سوا کسی دوسرے دین کی پیروی یا اس سے مربوط احکام کے علاوہ کسی دوسرے دین سے تعلق رکھنے والے دستورات نازل نہیں کئے، بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ جو بھی مجرہ قائم و رونما ہو اس کا تعلق اس دین کے علاوہ کسی دوسرے دین سے نہ تھا اور وہ دین، اسلام ہے کہ جس کا مطلب حق کو تسلیم کرنا اور اعتقادی و عملی دونوں صورتوں میں



اس کی حقانیت کا اقرار کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس واحد دین سے مراد اس کے سوا کچھ نہیں کہ بارگاہ رب العزت کی طرف سے جو حقائق و معارف اور احکام و فرامین صادر ہوئے ہیں ان کو دل و جان سے قبول کیا جائے، اور وہ خدائی بیانات جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے اگرچہ نبیوں و پیغمبروں کی شریعتوں کے حوالہ سے کمیت و کیفیت میں قدرے مختلف ہے لیکن وہ حقیقت اور اصل و اساس کے حوالہ سے ایک ہی ہے اور اگر مختلف شریعتوں میں خدائی معارف و احکام میں فرق پایا جاتا ہے تو وہ کمال و نقص کی بنیاد پر ہے تضاد و تصادم اور ایک دوسرے کی نفی کی بنیاد پر نہیں ہے اور جہاں تک شریعتوں کے درمیان ایک دوسرے پر برتری کا تعلق ہے تو وہ انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے درجات و مراتب کی بنیاد پر ہے ورنہ ان تمام شریعتوں کی روح ایک ہی امر ہے کہ جو ان سب میں مشترک ہے اور وہ یہ کہ خداوند عالم نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے جو احکامات اپنے بندوں تک پہنچائے ہیں ان کو تسلیم و قبول کرتے ہوئے عملی طور پر ان کی پیروی کی جائے۔ اس کے سوا کچھ نہیں، اور یہ وہ دین ہے جس کی اطاعت و فرمانبرداری اور اس پر اعتقادی و عملی طور پر تسلیم خم کر دینا خداوند عالم نے اپنے بندوں سے چاہا ہے اور لوگوں کو پوری طرح اس سے آگاہی بھی دلا دی۔ تو اس کا بنیادی و لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان ان تمام مطالب کو قبول کر لے جن کی بابت اسے پورے طور پر آگاہی حاصل ہو چکی ہو اور جو امور واضح و روشن نہ ہوئے ہوں بلکہ ان کے بارے میں غیر یقینی صورت پیدا ہو جائے ان میں اپنی طرف سے کسی طرح سے بھی کوئی نظریاتی موقف یا عملی رائے قائم کرنے کے بجائے انہیں خدائی دستورات تسلیم کرنے پر اکتفاء کرے۔

## اہل کتاب کا اختلاف کیوں؟

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب خداوند عالم نے اپنے دین کی بابت اپنے بندوں کو کمال آگاہی دلا دی اور تمام امور و مطالب واضح و روشن کر دیئے تو پھر اہل کتاب نے اس کی بابت آپس میں اختلاف کیوں کیا جبکہ ان پر خدائی کتاب نازل ہو چکی تھی اور خدا نے واضح کر دیا تھا کہ اس کے نزدیک دین صرف اسلام اور اس کی مکمل پیروی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ کا دین کی بابت اختلاف رائے و اختلاف عمل کا شکار ہونا اس وجہ سے نہ تھا کہ وہ دین سے جہل و نا آگاہی رکھتے تھے اور حقیقت الامران پر آشکار نہ تھی اور وہ یہ بات نہ جانتے تھے کہ خدا نے جو دین نازل کیا ہے وہ ایک ہی ہے بلکہ ان کا دین اسلام کو قبول نہ کرنا درحقیقت باہمی دشمنی، سرکشی و تکبر اور ظالمانہ طرز عمل اختیار کرنے کی وجہ سے تھا۔ ورنہ وہ تمام حقائق سے آگاہ ہو چکے تھے اور اسلام کی حقانیت و صداقت سے انکار کی کوئی گنجائش ان کے لئے باقی نہ تھی، ان کا ایسا کرنا خداوند عالم کی ان آیات و واضح نشانیوں کا انکار تھا جن میں دین کی حقیقت اور اسلام کی حقانیت کا

کھلا ثبوت پایا جاتا ہے ورنہ وہ لوگ ذات خداوند کے منکر نہ تھے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا اقرار کرنے والے ہیں اور جو شخص اللہ کی آیات کا انکار کرے تو خدا اس کا محاسبہ کرتا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی! کہ وہ سربلح الحساب ہے، وہ ایسے لوگوں کو دنیا میں ذلت و رسوائی سے دوچار کر کے انہیں سعادت مند زندگی سے محروم کر دیتا ہے اور آخرت میں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا جیسا کہ کلام الہی میں اس کا ثبوت پایا جاتا ہے کہ وہ دنیا و آخرت میں سربلح الحساب ہے چنانچہ زیر نظر آیات مبارکہ (۱۹ و ۲۰) کے بعد آیت ۲۱ میں یوں ارشاد خداوندی ہوا: ”أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ“ کہ یہی لوگ ہیں کہ جن کے اعمال ضائع ہو گئے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور کوئی ان کا مددگار نہ ہوگا۔

### دوا ہم نکات

مذکورہ بالا مطالب سے دوا ہم نکات واضح ہوتے ہیں:

(۱) آیت مبارکہ میں کہا گیا ہے کہ ”دین، خدا کے نزدیک اسلام ہے“ اس میں ”خدا کے نزدیک اور اس کے سامنے و حضور بارگاہ ہونے“ سے مراد تشریحی طور پر نزدیک ہوتا ہے۔ تشریحی و قانون گزاری کا حوالہ ملحوظ ہے۔ یعنی یہ کہ وہ ایک ہی آئین اور ایک ہی دستور العمل ہے کہ جس میں درجات اور مختلف امتوں کی صلاحیتوں و استعدادات کی بنیاد پر فرق پایا جاتا ہے اس کے سوا کچھ نہیں، نہ یہ کہ اسے تکوینی وحدت کا حامل قرار دیا جائے اور کہا جائے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے انسانی فطرت میں اسے ایک ہی صورت میں ودیعت کر دیا ہے اور اس حوالہ سے اس میں یکانیت و یک رنگی پائی جاتی ہے۔ ہرگز ایسا نہیں۔

(۲) ”وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ“ میں آیات خدا سے مراد، آیات وحی اور وہ خدائی بیانات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء پر نازل اور انہیں القاء کئے ہیں نہ یہ کہ وہ آیات یعنی کائنات کی وجودی نشانیاں مراد ہیں جو اپنی ہستی کے ذریعے خدا کی وحدانیت و یکتائی پر دلالت کرتی ہیں اور نہ ہی وہ معارف الہیہ مراد ہیں جو اپنی وجودی حیثیت میں خدا کی یکتائی کا ثبوت پیش کرتے ہیں،

بہر حال زیر بحث آیت مبارکہ میں اہل کتاب کو ان کی سرکشی کے بدلہ و انتقام کی دھمکی دی گئی ہے اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے اس سے قبل آیات مبارکہ میں مشرکین و کفار کو دی جانے والی دھمکی اور برے انجام کی خبر دی گئی تھی اور کہا گیا تھا: ”قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا وَسُوءُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ“ (کہہ دیجئے کافروں سے، کہ بہت جلد تم مغلوب واقع ہو

گے اور دوزخ کی طرف اٹھا کر لے جائے جاؤ گے.....) شاید اسی بنیاد پر اس کے بعد والی آیت میں اہل کتاب و مشرکین کو یکجا مخاطب قرار دے کر یوں کہا گیا: ”قُلْ لِلّٰہِ یٰۤاٰوْتُوْا الْکِتٰبَ وَالْاُمّٰیّٰنَ ؕ اَسْلَمْتُمْ.....“ (کہہ دیجئے ان لوگوں سے جنہیں کتاب دی گئی اور جو امی (مکہ والے مشرکین) ہیں کہ آیا تم اسلام لائے؟.....) اس میں بھی تہدید اور دھمکی آمیز لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔

## محاہجہ کی صورت میں خدائی فرمان

○ ”فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْہِیْ لِلّٰہِ وَ مَنِ اتَّبَعَنِ.....“

(اگر وہ آپ سے محاہجہ کریں تو کہہ دیجئے کہ میں اور جس نے میری پیروی کی اپنا رخ اللہ کی طرف کر لیا.....)

اس آیت مبارکہ میں جملہ ”حَآجُّوْكَ“ (وہ آپ سے محاہجہ و بحث کریں) میں ضمیر مستتر ”ہم“ (وہ) کی بازگشت اہل کتاب کی طرف ہے اور یہ ایک نہایت واضح و روشن مسئلہ ہے اور ان کے محاہجہ اور نزاعی بحث کرنے سے مراد یہ ہے کہ وہ اختلاف کرنے کی بابت کہتے ہیں کہ ہمارا اختلاف کرنا واضح خدائی بیان آنے کے بعد سرکشی و طغیان کی بناء پر نہیں بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ ہماری عقول و افہام..... عقلیں اور فہم و ادراک کی قوتیں..... اور دینی حقائق سے آگاہ ہونے کے لئے کئے جانے والے ہمارے اجتہاد نے ہمیں اختلاف کرنے کی راہ پر لگا دیا ہے اور ہماری عقل و فہم اور اجتہاد نے ہمیں جس دین و مسلک سے روشناس کرایا ہے ہم اس کی بناء پر خدا کے حضور سر تسلیم خم کرتے ہیں اور اے محمد! جس چیز کو آپ درست قرار دیتے ہیں اور اس کی طرف آنے کی دعوت دے رہے ہیں وہ بھی اسی باب سے ہے..... یعنی ہم نے جسے درست سمجھا ہم اس کی پیروی کرتے اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں اور آپ جس راہ کو درست سمجھتے ہیں اس کی طرف دعوت دیتے ہیں..... (گویا وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ ہم دونوں ایک ہی خدا کو ماننے ہیں البتہ راہ و روش اور طریقہ فہم میں فرق کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں)۔ ان کے بیان سے ہم نے جو مطلب سمجھا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ خداوند عالم نے ان کے جواب میں آنحضرتؐ کو ارشاد فرمایا: ”فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْہِیْ لِلّٰہِ“ کہہ دیجئے کہ میں نے اپنا رخ اللہ کی طرف کر لیا ہے..... اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا، خدا کے حضور سر تسلیم خم کر دیا ہے..... اور ”قُلْ لِلّٰہِ یٰۤاٰوْتُوْا الْکِتٰبَ وَالْاُمّٰیّٰنَ ؕ اَسْلَمْتُمْ“ (اور کہہ دیجئے اہل کتاب اور امیین و مشرکین مکہ) سے کہ آیا تم اسلام لائے ہو تم نے اپنا رخ اللہ کی طرف کر لیا

ہے؟..... تم نے خدا کے حضور سر تسلیم خم کر دیا ہے؟.....) ان دو جملوں میں ان کا محاجہ اور نزاعی بحث کرنے کی بنیاد ہی توڑ دی گئی ہے نہ یہ کہ ان سے بحث کرنے سے روگردانی کی گئی ہو،

بہر حال آیت کا معنی، اس کے ماقبل آیات سے ربط کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ ہوگا کہ: اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے، خدا نے جو کتابیں نازل فرمائی ہیں ان میں اس حوالہ سے کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا اور نہ ہی عقل سلیم اس کی بابت کسی طرح سے شک کرتی ہے، اس مسلمہ حقیقت کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ (اے رسول!) تیرے اسلام اور دین خداوندی پر عمل کرنے والا ہونے کے خلاف کوئی ثبوت موجود نہیں، اس کے باوجود اگر وہ آپ سے بحث و نزاع اور محاجہ کریں تو کہہ دیجئے کہ میں نے اپنا رخ اللہ کی طرف کر لیا ہے اور اس نے بھی جس نے میری پیروی کی! (فَقُلْ أَصَلَّمْتُ وَجِہِیَ لِلَّهِ وَصَحْنِ الثَّابِتِ) اور یہی دین خداوندی ہے اور اس کے بعد اس کی بابت بحث و نزاع کی کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی۔ اس کے بعد ان لوگوں سے پوچھیے کہ کیا تم اسلام لائے ہو (ءَأَسَلَّمْتُمْ؟) اگر وہ اسلام لاکچھے ہوں تو وہ ہدایت یافتہ ہیں اور انہیں چاہیے کہ وہ اسے قبول و تسلیم کریں جو آپ پر اور آپ سے پہلے انبیاء پر نازل کیا گیا ہے کہ اس کے بعد نہ تو ان کے خلاف کوئی حجت قائم ہو گی اور نہ ہی آپ کے اور ان کے درمیان کسی بحث و نزاع کی ضرورت باقی رہے گی، لیکن اگر وہ اسلام نہ لائیں اور دین خداوندی کی پیروی سے روگردانی کریں تو ان سے نزاع و بحث نہ کرو اور نہ ہی ان سے محاجہ و مناظرہ کرو کیونکہ ایک واضح و روشن اور ناقابل انکار مسلم الثبوت امر کی بابت بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں، اور وہ امر یہ ہے کہ دین، خدا کے حضور سر تسلیم خم کر دینے اور اپنے آپ کو سزا پا اس کے سپرد کر دینے ہی سے عبارت ہے۔ اور اس مطلب سے آگاہی دلانے اور بات پہنچا دینے کے علاوہ آپ پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ (وَمَا عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ)

### ایک اہم نکتہ

اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے اہل کتاب اور امین (مشرکین مکہ) دونوں کو یکجا طور پر مخاطب قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ”وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَاسَلَّمْتُمْ“ (اور اہل کتاب اور امین سے کہہ دو کہ آیا تم اسلام لائے ہو؟)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدائی دین سب کے لئے یکساں ہے اس میں مشرکین و غیر مشرکین سب اشتراک رکھتے ہیں اور ان کا توحید و تشریک کے حوالہ سے مختلف ہونا اصل دین میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا، لہذا سب کو چاہیے کہ وہ دین خداوندی کو تسلیم کریں اور اس کے سامنے سر خم ہو جائیں۔

## دوسرا ہم نکتہ

آیت مبارکہ میں ایک اور اہم نکتہ قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ اس میں اسلام کو ”وجہ“ یعنی چہرہ یا رخ و سمت کے ساتھ متصل و مرتبط قرار دے کر ذکر کیا گیا ہے، ”وجہ“ کسی چیز کی اس سمت کو کہتے ہیں جو آپ کے سامنے اور روبرو ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں ”وجہ“ سے اس کا خاص معنی یعنی چہرہ مراد ہو، کیونکہ رخ اور چہرے کا یہ سوائے خدا ہونا گویا تمام حواس اور اعضاء و جوارح کا یہ سوائے خدا ہونا ہے اور اس سے پورے بدن کا اسلام مراد ہوگا، اور چہرہ کا خدا کے حضور ہو جانا دراصل رب تعالیٰ کے اوامر پر پوری طرح تسلیم خم ہو جانا ہے۔

(رخ کا کسی سمت ہونا ایک محاورہ ہے جس سے عموماً پوری توجہ و کامل التفات مراد لیا جاتا ہے، اس طرح کے محاورے عرب زبان میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ م)

## تیسرا ہم نکتہ

آیت مبارکہ میں تیسرا ہم نکتہ یہ ہے کہ ”أَسَلَّمْتُ وَجْهِي لِلَّهِ“ (میں نے اپنا رخ اللہ کی طرف کر لیا ہے) کے بعد حرف عطف کے ساتھ یوں کہا گیا: ”وَهَنِ اتَّبَعْنِ“ (اور جس نے میرا اتباع کیا)، یعنی میں نے اور اس نے کہ جس نے میرا اتباع کیا اپنا رخ اللہ کی طرف کر لیا ہے (اسلام)، اس میں یہ نکتہ ملحوظ ہے کہ آنحضرتؐ کی پیروی کے خدائی نظام کی عملی پاسداری ہو اور آپؐ کی عظمت و احترام کا اعتقادی و عملی مظہر سامنے آئے۔

## دعوتِ اسلام کی ایک مخصوص صورت!

○ ” وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ ءَاسَلَّمْتُكُمْ.....“

(اور کہہ دیجئے ان سے کہ جنہیں کتاب دی گئی اور امیہین سے، کیا تم اسلام لائے ہو.....)

اس آیت میں ”امیہین“ سے مراد مشرکین ہیں۔ انہیں ”امیہین“ کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ان کے مقابلے میں جن کا تذکرہ ہوا ہے انہیں ”اہل کتاب“ سے موسوم کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اہل کتاب خود بھی انہیں (مشرکین کو) اسی نام سے موسوم کرتے تھے جیسا کہ درج ذیل آیت مجیدہ میں خداوند عالم

نے اہل کتاب کا بیان ذکر فرمایا ہے:

سورۃ آل عمران، آیت: ۷۵

○ ”لَيْسَ عَلَيْكُمْ فِي الْأَمِّينَ سَبِيلٌ“

(ہمارے لئے امینین کی بابت کوئی باز پرس نہیں ہو سکتی)

یہاں ”امی“ سے ان کی مراد وہ شخص ہے جو لکھنا اور پڑھنا نہ جانتا ہو۔

(بظاہر اہل کتاب کا مشرکین کو اس نام سے موسوم کرنا طنز اور حقارت کی بنیاد پر تھا اور اس سے ان کی مراد اہل مکہ

تھے) م۔

اس آیت شریفہ میں خداوند عالم کا ارشاد گرامی: ”فَإِن تَوَلَّوْا فَمَا عَلَيْنَا الْبَلَاءُ وَاللَّهُ بِصَيْرُورِكُمْ بِالْعِبَادِ“

درج ذیل چند اہم نکات کی نشاندہی کرتا ہے:

(۱) مشرکین کے ساتھ بحث و مباحثہ میں سخت گیری اور لجاجت اور تندہی و شدت اختیار نہ کی جائے کیونکہ بدیہی و مسلم الثبوت (ضروری) امور کا انکار کرنے والے شخص کے ساتھ مباحثہ و مناظرہ لجاجت و بے نتیجہ بحث کے سوا کچھ نہیں۔

(۲) لوگوں کے بارے میں فیصلہ و اظہار رائے کا علی الاطلاق حق صرف خداوند عالم کو حاصل ہے اور حضرت پیغمبر

اسلام کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ خدا کے احکام و پیغامات لوگوں تک پہنچائیں۔ آپ لوگوں پر مسلط و نگران اور استقلالی حیثیت میں حکمران نہیں ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں ارشاد خداوندی ہے:

سورۃ آل عمران، آیت: ۱۲۸

○ ”لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ“

(آپ کو..... استقلالی طور پر..... کوئی حاکمانہ اختیار حاصل نہیں ہے)

○ ”لست عليهم بمسيطر“

(تو ان پر مسلط و نگران نہیں ہے)

(۳) اس آیت میں اہل کتاب اور مشرکین کو انتباہ و تہدید ہوئی ہے کیونکہ آیت کا اختتامی جملہ یہ ہے: ”وَاللَّهُ

بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ“ (اور اللہ بندوں سے پوری طرح آگاہ و باخبر ہے) جبکہ اس سے پہلے یہ فقرہ ذکر ہوا ہے: ”وَإِنَّمَا

عَلَيْكَ الْبَلَاءُ“ (آپ پر تو صرف پہنچا دینا ہے)..... اس کے علاوہ آپ کی ذمہ داری کچھ نہیں..... ان دونوں جملوں

کے یکے بعد دیگرے ذکر کرنے سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ خداوند عالم اہل کتاب اور مشرکین کو خبردار کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح کے

انتباہ و تہدید کی ایک مثال درج ذیل آیت شریفہ میں بھی ملتی ہے:

سورہ بقرہ، آیت: ۱۳

○ ” قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ ۖ (تا) وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝ فَإِنِ امْتُوا بِشَيْءٍ مَّا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا ۗ وَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۗ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ “

(ان سے کہہ دو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر..... اور ہم اس کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں، اگر وہ اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم اس پر ایمان لائے ہو تو پس وہ ہدایت یافتہ ہو گئے، اگر وہ روگردانی کریں تو وہ خود ہی بدبختی میں مبتلا ہوئے، بہت جلد خدا تمہیں ان کے مقابلے میں کفایت کرے گا اور وہ سننے والا اور دانا آگاہ ہے)۔

اس آیت میں اہل کتاب کے بارے میں متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ اگر اسلام سے روگردانی کریں تو وہ اپنی مخالفانہ روش پر مصرانہ طور پر باقی رہیں گے۔ اس کے بعد خداوند عالم ان اہل کتاب سے تہدید و انتباہ کی صورت میں اس طرح خطاب کرتا ہے جس سے حضرت رسول خداؐ کے دل کو تسلی و اطمینان نفس حاصل ہو جائے، بنا بریں آئیے مبارکہ میں فقرہ: ”وَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاءُ“ آنحضرتؐ سے فرمایا گیا کہ آپ ان کا معاملہ خدا کے سپرد کر دیں کہ وہ اپنے بندوں کے بارے میں زیادہ آگاہی رکھتا ہے۔ وہ ہر شخص کے بارے میں وہی حکم و فیصلہ کرتا ہے جس کا وہ حقدار ہوتا ہے اور اس کی طبع و جود عملی حوالہ سے اس کی متقاضی ہوتی ہے۔

اس بیان سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ بعض مفسرین کا یہ قول قرین صحت نہیں کہ یہ آیت دین میں آزادی عقیدہ پر دلالت کرتی ہے اور یہ کہ دین میں اکراہ و جبر کی نفی کا ثبوت فراہم کرتی ہے کیونکہ اس آیت شریفہ میں اس موضوع کے علاوہ دیگر امور کا بیان مطلوب و مقصود قرار پایا ہے۔

آئیے مبارکہ میں فقرہ ”بَصِيرًا بِالْعِبَادِ“ میں ”بصير بهم“ (ان سے آگاہ ہے) یا ”بصير بالناس“ (لوگوں سے آگاہ ہے) کی بجائے بندوں سے آگاہ ہونے کا بیان اس امر کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ خدا کا حکم و فیصلہ لوگوں پر نافذ العمل و لازم الاجراء ہے کیونکہ وہ اس بندے ہیں اور اس کی درگاہ فطرت کے پروردہ و تربیت یافتہ ہیں خواہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کریں یا روگردانی کریں۔

## آیات الہی کا انکار کرنے والے

○ ” إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ.....“

(جو لوگ آیات خداوندی کا انکار کرتے ہیں۔۔۔)

اس آیت مبارکہ میں اگرچہ ایک نئے موضوع کا بیان مقصود و ملحوظ ہے اور اس کا تعلق ایک جدید و مستقل مطلب سے ہے لیکن اس کے باوجود اس میں سابقہ آیت مبارکہ کے آخری فقرے میں مذکور انتباہ و تہدید کی طرف اشارہ و توجہ بھی دلائی گئی ہے کیونکہ اس آیت شریفہ کا مضمون اہل کتاب بالخصوص یہودیوں پر منطبق ہوتا ہے اور واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس میں انہی کے بارے میں مطالب ذکر کئے گئے ہیں۔

اس آیت مبارکہ میں دو جملے ذکر کئے گئے ہیں: ”يَكْفُرُونَ“ (انکار کرتے ہیں)، ”يَقْتُلُونَ“ (قتل کرتے ہیں) اور یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ دونوں اعمال یعنی واضح بیان آجانے کے بعد دشمنی و بغاوت کی بناء پر آیات خداوندی کا انکار اور انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا جو کہ بلاشبہ ناحق قتل ہے اور اسی طرح ان لوگوں کو قتل کرنا جو عدل و انصاف اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور ظلم و بغاوت اور دشمنی سے روکتے ہیں ان (اہل کتاب بالخصوص یہودیوں) کی دیرینہ عادت ہے چنانچہ یہودی تاریخ اس طرح کے خونین جرائم سے بھری ہوئی ہے کہ انہوں نے کثیر تعداد میں اپنے نبیوں اور ان نیک و صالح عبادت گزاروں کو قتل کیا جو انہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے..... نیکی اور نیک اعمال بجالانے کا حکم دیتے تھے اور برائی و برے اعمال انجام دینے سے روکتے تھے..... یہی حال نصاریٰ کا تھا کہ وہ بھی یہودیوں کے نقش قدم پر چل کر اس طرح کے گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کرتے تھے۔

اس آیت کے آخری جملہ ”فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ“ (انہیں دردناک عذاب کی خبر دو) میں ان پر خدا کے غضب کا چھا جانا اور خدا کی ناراضگی کا ان کے دامن گیر ہونا واضح طور پر ثابت و معلوم ہوتا ہے، اور اس سے صرف اخروی عذاب ہی مقصود نہیں ہے بلکہ دنیا و آخرت دونوں کا عذاب ملحوظ و مقصود ہے چنانچہ اس کا ثبوت بعد والے فقروں میں ملتا ہے جس میں یہ الفاظ ذکر کئے گئے ہیں: ”أُولَئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ.....“ (یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا و آخرت میں ضائع ہو گئے.....) تو انہیں دنیا اور آخرت دونوں جہانوں کے عذاب کی خبر دی گئی ہے، آخرت کے عذاب سے مراد جہنم کی آگ کا دردناک عذاب ہے اور دنیا کے عذاب سے مراد باہمی قتل و عارت گری، در بدر ہونا اور جان و مال سے محرومی ہے۔ اور یہ بھی ان پر خدا کے عذاب کی ایک صورت ہے کہ خداوند عالم نے ان سے اپنی ناراضگی کی



وجہ سے ان کے درمیان قیامت تک باہمی عداوت و دشمنی کی راہیں کھول دیں، ان تمام امور کا واضح تذکرہ کتاب الہی میں متعدد آیات کے ضمن میں ہوا ہے۔

اور آیت مبارکہ کے فقرہ ”أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نَّصِيرٍ“ (یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا و آخرت میں ضائع ہو گئے اور کوئی ان کی مدد کرنے والا نہیں) میں دو امور کا ثبوت پایا جاتا ہے:

- (۱) جو شخص کسی کو اس بنا پر قتل کرے کہ وہ امر بالمعروف کرتا ہے اور نہی عن المنکر کرتا ہے..... نیکی اور نیک کام بجا لانے کا حکم دیتا ہے یا برائی اور برے اعمال کے ارتکاب سے روکتا ہے..... تو اس کے تمام اعمال برباد ہو جائیں گے،
- (۲) وہ قیامت کے دن شفاعت سے محروم ہوگا کیونکہ خداوند عالم نے واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے: ”وَمَا لَهُمْ مِّنْ نَّصِيرٍ“ (اور ان کا مددگار کوئی نہیں)۔

### اہل کتاب کے بارے میں خصوصی بیان

○ ”أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ.....“  
(کیا تو نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جنہیں کتاب میں سے کچھ حصہ دیا گیا.....)

اس آیت مبارکہ میں اہل کتاب کے بارے میں تاکید کی طور پر بیان کیا گیا ہے کہ وہ دین حق سے دشمنی پرستی سے قائم ہیں اور اس سے باز آنے والے نہیں، اسی بناء پر خداوند عالم نے انہیں اہل النبی قرار دیا ہے کہ وہ مخالفت کی راہ اپنا کر دین میں تفرقہ پر دازی کے مرتکب ہوتے ہیں اور اختلافات کی آگ بھڑکانے میں مصروف رہتے ہیں، چنانچہ جب انہیں کتاب الہی کے فیصلہ کو تسلیم کرنے کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ ماننے پر تیار نہیں ہوتے بلکہ انکار اور روگردانی کرنے لگتے ہیں، اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ:

- (۱) وہ اپنے اس نظریہ کی بناء پر دھوکہ میں آئے ہوئے ہیں کہ جس کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں: ”لَنْ نَمَسَّنَا النَّارَ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ“ (ہمیں دوزخ کی آگ چند دنوں سے زیادہ ہرگز چھو نہیں سکتی)
  - (۲) اور وہ اپنے دین میں خدا پر تہمت لگانے کے مرتکب ہوئے ہیں۔
- اس آیت میں فقرہ ”الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ“ (وہ کہ جنہیں کتاب سے کچھ دیا گیا) سے مراد اہل

کتاب ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ خداوند عالم نے یہ کیوں نہیں فرمایا: ”الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ“ (وہ کہ جنہیں کتاب دی گئی) بلکہ یہ کہا: ”الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتَابِ“ (وہ کہ جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا)؟  
اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے پاس کتاب میں سے جتنا کچھ ہے وہ ساری کتاب نہیں بلکہ کتاب کا کچھ حصہ ہے کیونکہ انہوں نے کتاب الہی میں اس قدر تحریف کی اور اس میں تبدیلیاں لاکر ردوبدل کیا کہ اس کے کثیر حصے ضائع ہو گئے جیسا کہ اس کا اشارہ ذیلی آیت کے آخری فقرے میں اس طرح ہوا: ”وَعَزَّوْهُمْ فِي دِينِهِمْ مَّا كَانُوا يَعْتَرُونَ“ (اور انہوں نے دھوکہ دیا ان کے دین میں اس چیز نے جو افتراء پر دازی کرتے تھے)۔

بہر حال مقصود یہ ہے..... واللہ اعلم..... کہ وہ (اہل کتاب) خدا کی کتاب کے فیصلہ سے اس لئے روگردانی کرتے ہیں کہ وہ جس چیز کے قائل ہیں اس نے انہیں دھوکہ میں ڈال دیا ہے، وہ اس من گھڑت و خود ساختہ نظریہ کی وجہ سے مغرور ہو چکے ہیں اور پھر اسی کی بناء پر اپنے آپ کو کتاب الہی سے بے نیاز سمجھنے لگے۔

### اہل کتاب کا غلط نظریہ

○ ”ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ نَّمَسَّنَا النَّارُ.....“

(یہ سب اس لئے ہے کہ وہ کہتے ہیں ہمیں آگ نہیں چھوئے گی.....)

آیت کا معنی واضح ہے، اور یہاں اہل کتاب کا خود اپنے افتراء و جھوٹ اور غلط بیان ہی سے دھوکہ میں آجانا مذکور ہے کہ جس چیز کو خود ہی انہوں نے اپنے لئے نظریہ و عقیدہ کی حیثیت دی اسی کے سبب وہ دھوکہ کا شکار ہوئے جبکہ عام طور پر کوئی شخص خود اپنے آپ سے دھوکہ نہیں کھاتا بالخصوص جب وہ یہ جانتا بھی ہو کہ اس کا نظریہ، دھوکہ و باطل اور جھوٹ کے سوا کچھ نہیں، تو آیت مبارکہ میں اس سے مراد یہ ہے کہ دھوکہ کھانے والے افراد، جھوٹ و افتراء پر دازی کرنے والوں سے مختلف ہیں، جن لوگوں نے دھوکہ کھایا وہ ان لوگوں کی نسل و قوم کے افراد ہیں جنہوں نے جھوٹ، دھوکہ اور باطل نظریہ قائم کیا لیکن آیت میں صرف دھوکہ کھانے والوں کے حوالہ سے اہل کتاب کا قول اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ وہ سب یعنی اسلاف اور ان کی نسلیں دراصل ایک ہی امت و ملت قرار پائے اور بعد میں آنے والی نسلیں اپنے اسلاف کے اعمال پر راضی ہوئیں، خداوند عالم نے دونوں فریقوں کو اہل کتاب کے عنوان سے یاد کیا اور ان کے اپنے ہی من گھڑت نظریہ سے دھوکہ میں

آجانے کا مشترکہ ذکر کیا، اس بناء پر افتراء پر داز افراد اور ان کی نسل سے وہ لوگ جو ان کے نقش قدم پر چلے اور ان کے عقائد و نظریات سے پورا پورا اتفاق کیا اور راضی ہوئے سب کی حیثیت یکساں ہے اور سب ایک ہی امت کہلاتے ہیں.....، اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کوئی شخص خود اپنے آپ سے دھوکہ کھائے اور وہ بھی ایک غلط و نادرست مطلب سے کہ جسے وہ خود بھی جانتا ہو کہ یہ غلط، جھوٹ، من گھڑت اور باطل ہے اور اس غلط بیان کی بابت خود اعتراف و اقرار بھی کرتا ہو کہ اس نے خود سے گھڑا ہے، تو اس طرح کے امور اہل کتاب بالخصوص یہودیوں سے ہرگز بعید و غیر متوقع نہیں، اور انہی کے متعلق خداوند عالم نے اس طرح کے نظریات و اعمال بلکہ ان سے بھی زیادہ عجیب امور کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

سورۃ بقرہ، آیت: ۷۷

”وَإِذْ الْقَوَّالِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَا بِبَعْضِهِمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاطَ بِكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۗ فَلَا تَعْقِلُونَ ۝ أَوْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ صَائِرُونَ وَمَا يَعْلَمُونَ ۝“

(اور جب وہ ایمان لانے والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لائے ہیں، اور جب ایک دوسرے سے خلوت میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تم کیوں ایمان لانے والوں کو اس چیز سے آگاہ کرتے ہو جسے خدا نے تمہارے لئے کھول کر بیان کیا ہے وہ تو اس کے حوالہ سے تمہارے رب کے پاس تمہارے خلاف بیان دیں گے، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ آیا وہ (اہل کتاب) یہ نہیں جانتے کہ خدا اس چیز سے باخبر ہے جسے وہ چھپاتے ہیں اور جسے وہ ظاہر کرتے ہیں (خدا ان کے ظاہری اظہار اور باطنی نظریات سے آگاہ ہے)۔

اس کے علاوہ جو ہم نکتہ قابل توجہ ہے وہ یہ کہ عام طور پر انسان کے اعمال و افعال کی بنیاد اس کی لوحِ نفس پر ثبت ہونے والے وہ ملکاتِ نفسانیہ اور خاص رجحانات پر مبنی صورتیں و کیفیات ہوتی ہیں کہ جو اس کی نگاہِ نفس کو خیرہ کر چکی ہوتی ہیں، نہ کہ وہ امور کہ جن کی بابت اسے علم و آگاہی حاصل ہوتی ہے اس کی مثال اس شخص سے دی جاسکتی ہے جو مضمر صحت اور نقصان وہ اشیاء استعمال کرتا ہے مثلاً بھنگ پیتا ہے، تمباکو نوشی کرتا ہے، مٹی کھاتا ہے اور اس طرح کی دیگر چیزیں جیسے چرس وغیرہ استعمال کرتا ہے، وہ ان اشیاء کے مضر ہونے سے آگاہ ہوتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ مضر اور نقصان وہ اشیاء کے استعمال سے اجتناب کرنا چاہیے لیکن اس کے باوجود وہ ان اشیاء کو استعمال میں لاتا ہے تو اس کی وجہ اس کے نفس اور باطن میں پیدا ہو جانے والی لذت بخش و پرکشش صورتیں ہیں جو اسے ان اشیاء کی طرف رغبت دلاتی ہیں اور اسے ان سے اجتناب و دوری اختیار کرنے کی بابت سوچنے بھی نہیں دیتیں۔ اس طرح کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔

مذکورہ بالا مثال کے تناظر میں اہل کتاب کے اعمال کو دیکھیں تو صورت حال پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ وہ تکبر، ظلم اور نفسانی خواہشوں کی زنجیروں میں جکڑے ہوں گے کی وجہ سے ہر وہ کام انجام دینے کی جرأت کر لیتے ہیں جس کی دعوت و ترغیب انہیں ان کا نفس دلاتا ہے اور ان کی جھوٹی انا انہیں اس کام کی انجام دہی کی راہ دکھاتی ہے۔ تو دراصل ان کے غلط و نادرست نظریات اور خود ساختہ و خود بافتہ افکار ہی ہیں جو ان کی دینی تباہی کا باعث ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے جھوٹ و افتراء اور خداوند عالم پر دینے والی ناروا نسبتوں کے بار بار انجام دینے کے مرتکب ہوئے اور اب تک ہو رہے ہیں اور صرف اپنی غلط و نادرست روش پر قائم ہی نہیں بلکہ اس کی صحت و درستی کے بارے میں اپنے آپ کو سمجھاتے اور یقین دلاتے رہتے ہیں کہ ان کا اس طرح اپنے آپ کو تائید کی توجہ دلا نا علم البقین کی منزل تک پہنچا دیتا ہے چنانچہ علم النفس کے ماہرین بھی اسی طرح کی تائیدی و مکرر دکر تو جہات کو علمی آثار کا موجب قرار دیتے ہیں، بنا بریں افتراء پر دازی جو کہ ایک ناحق و باطل عمل ہے اس کا بار بار انجام دینا اور اس کے بارے میں اپنے آپ کو تائید کی توجہ دلا نا اس امر کا سبب بنا کہ وہ اس کے دھوکے میں آ گئے اور اپنے دین میں کجی و کجروی اختیار کر گئے اور صرف یہی نہیں بلکہ ان کی افتراء پر دازی انہیں خداوند عالم کے حضور سر تسلیم خم کرنے اور اس حق کی عملی اطاعت سے مانع ہوئی جسے خداوند عالم نے اپنی کتاب میں نازل فرمایا۔ (اہل کتاب بالخصوص یہود کی دینی تباہی خود ان کے اپنے ہاتھوں ہوئی اور وہ من گھڑت اور خود ساختہ نظریات و عقائد کی بناء پر حق کی راہ سے دور ہو گئے اور پھر دین الہی و احکام خداوندی کی پیروی سے منہ موڑنا ان کی عادت ہو گئی)۔

## قیامت کے دن کی یاد دہانی

○ ”فَكَيْفَ إِذَا جُمِعْتُمْ لِيَوْمٍ أَلَمٍ...“

(تو ان کا کیا حال ہوگا اس دن جب ہم انہیں اکٹھا کریں گے کہ جس میں کوئی شک نہیں...)

اس آیت مبارکہ میں حرف ”کیف“ (کیا، کس طرح، کیسے) ذکر ہوا ہے جو بعد والے حرف ”اذا“ کے ساتھ دراصل اس طرح ہے: ”فکیف یصنعون“ (وہ کیا کریں گے، کس طرح کریں گے، کیسے کریں گے)؟ اور جملہ ”یصنعون“ کلام میں مذکور نہیں بلکہ تفہیم معنی کے لئے فرض کیا جاتا ہے۔

آیت میں ان لوگوں کو انتباہ کیا گیا ہے جو حق کی پیروی سے روگردانی کرتے ہیں اور جب انہیں اس بات کی دعوت دی جاتی ہے کہ کتاب الہی کی تعلیمات و دستورات کو اپنائیں اور اسے ہی عقیدہ و عمل کا معیار قرار دیں تو وہ منہ پھیر لیتے ہیں،

البتہ یہاں چونکہ اصل بیان یہ مقصود ہے کہ وہ خداوند عالم کو ہرگز بے بس و عاجز نہیں کر سکتے، اور نہ ہی اپنے اس دعوے میں سچے ہیں کہ انہیں دوزخ کی آگ چند دنوں سے زیادہ چھو نہیں سکتی، لہذا کلام میں ان کی اس حالت کا تذکرہ ہوا ہے جس سے قیامت کے دن وہ دوچار ہوں گے اور وہ اس دن نہایت ذلت کے ساتھ حکم و فیصلہ خداوندی کے سامنے سرخم ہوں گے، جبکہ دنیا میں جب انہیں کتاب اللہ کے حکم و فیصلہ کی طرف بلایا جاتا تھا تو وہ اس سے روگردانی کرتے تھے اور غرور و تکبر اختیار کرتے ہوئے حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے سرتابی کرتے تھے۔ اس بناء پر کلام میں تقابلی لطافت ملحوظ رکھی گئی اور قیامت کے دن ان پر طاری ہونے والی حالت و کیفیت کے بیان میں یوں کہنے کی بجائے: ”اِذَا احْسَبْنَاهُمْ اَوْ بَعَثْنَاهُمْ“ (جب ہم انہیں زندہ کریں گے، یا جب ہم انہیں قبروں سے اٹھائیں گے اس طرح کہا گیا: ”اِذَا جَعَلْنَاهُمْ لِيَوْمِ لَآسَايِبٍ فِيْهِ.....“ (جب ہم انہیں اٹھا کریں گے اس دن جس میں کوئی شک نہیں تو فقرہ ”جب ہم انہیں اٹھا کریں گے“ سے اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ وہ یعنی اہل کتاب خدا کو عاجز و بے بس نہیں کر سکتے بلکہ خدا انہیں عاجز و بے بس کر دے گا۔

بہر حال آیت مبارکہ کا معنی..... واللہ اعلم..... یہ ہے کہ ”جب کفار کو کتاب الہی سے رجوع کرنے کی دعوت دی جاتی تاکہ وہ ان کے درمیان حکم و فیصلہ کرے تو انہوں نے منہ موڑا کیونکہ وہ اس چیز کے ذریعے دھوکہ میں آگئے جس کا انہوں نے اپنے دین میں افتراء کیا (غلط طور پر اسے دین قرار دیا) اور حق کو تسلیم کرنے سے سرتابی کی تو اس دن وہ کیا کریں گے جب ہم انہیں اٹھا کریں گے کیونکہ وہ دن ایسا ہے جس کی بابت کوئی شک و شبہ نہیں پایا جاتا، وہ دن حتیٰ فیصلہ کا دن ہے، وہ دن حق کی حاکمیت کا دن ہے، اس دن ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ..... جزا و سزا..... دیا جائے گا، اس دن عدل و انصاف پر مبنی فیصلہ ہوگا، اس دن کسی پر کوئی زیادتی اور ناروا سلوک نہیں کیا جائے گا، تو جب اس دن کی کیفیت اس طرح ہوگی تو ان لوگوں کو چاہیے کہ حق سے روگردانی نہ کریں اور نہ ہی حقیقت و کتاب الہی سے منہ موڑیں اور اس طرح کے اظہارات سے اجتناب کریں کہ وہ خدا کو بے بس کر سکتے ہیں اور اس کے حکم و فیصلہ پر غلبہ پاسکتے ہیں۔ بلکہ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہر طرح کی طاقت و قدرت خدا سے مخصوص ہے، وہی قدرت و غلبہ کا سرچشمہ و محور ہے، اور یہ دنیاوی زندگی دراصل چند دنوں کی مہلت اور آزمائش و امتحان کے سوا کچھ نہیں۔

## روایات پر ایک نظر

### دین کی حقیقت

تفسیر العیاشیؒ میں مذکور ہے محمد بن مسلم نے امامؑ سے دریافت کیا کہ اس آیت سے کیا مراد ہے؟ ” إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ “ (اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے) امامؑ نے ارشاد فرمایا: ” الَّذِي فِيهِ الْإِيمَانُ “ اس سے مراد وہ اسلام ہے جس میں ایمان ہو۔  
ملاحظہ ہو: (تفسیر العیاشیؒ جلد ۱ صفحہ ۱۶۶ حدیث ۲۲)

### ولایت علی ابن ابی طالبؑ

ابن شہر آشوب نے اپنی کتاب ” المناقب “ میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد گرامی ذکر کیا ہے کہ آپؑ نے آیہ مبارکہ ” إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ “ (اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے) کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: ” التَّسْلِيمَ لِعَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ بِالْوَلَايَةِ “ اس سے مراد علی بن ابی طالبؑ کی ولایت کو تسلیم کرنا ہے۔

(مناقب شہر ابن آشوب جلد ۳ صفحہ ۹۵)

امامؑ کا فرمان کہ اسلام سے مراد علی بن ابی طالبؑ کی ولایت کو تسلیم کرنا ہے، دراصل موضوع کے ایک تطبیقی مصداق کا اظہار ہے اور اس کے ایک واضح مصداق کی نشاندہی کی ایک صورت ہے، شاید ما قبل روایت کہ جس میں امامؑ نے محمد بن مسلم کے سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اسلام سے مراد وہ ہے کہ جس میں ایمان ہو، وہ بھی ” الجری “ یعنی ایک واضح مصداق کی تطبیقی نشاندہی کے طور پر ہو۔

## امام علیؑ کے ارشاد گرامی کا التفاتی ذکر

ایک روایت ہے کہ میں امام محمد باقر علیہ السلام نے امام علیؑ کے ارشاد گرامی کا حوالہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ انہوں نے اسلام کی وضاحت میں یوں کہا:

”لانسبن الاسلام نسبة لم ينسبها احد قبلي ولا ينسبها احد بعدي: الاسلام هو التسليم، والتسليم هو اليقين، واليقين هو التصديق، والتصديق هو الاقرار، والاقرار هو الاداء، والاداء هو العمل، المؤمن اخذ دينه عن ربه، ان المؤمن يعرف ايمانه في عمله، وان الكافر يعرف كفره بانكاره، ايها الناس! دينكم دينكم فان السيئة فيه خير من الحسنه في غيره، ان السيئة فيه تغفر، وان الحسنه في غيره لاتقبل“ (اصول کافی، ج ۲، ص ۲۵)

”میں اسلام کی طرف ایسی نسبت دیتا ہوں (ایسا تعارف کرواتا ہوں) جو مجھ سے پہلے کسی نے نہیں دی اور نہ میرے بعد کوئی دے گا، اسلام عین تسلیم ہے، تسلیم عین یقین ہے، یقین عین تصدیق ہے، تصدیق عین اقرار ہے، اقرار عین اداء ہے، اداء عین عمل ہے، مؤمن اپنا دین اپنے پروردگار سے لیتا ہے، مؤمن کا ایمان اس کے عمل میں دیکھا جاتا ہے اور کافر کا کفر اس کے انکار سے دکھائی دیتا ہے۔ اے لوگو! اپنے دین پر عمل کرو، اپنے دین کا خیال کرو، دین کے دائرہ میں رہ کر گناہ کرنا بے دینی میں رہ کر نیکی کرنے سے بہتر ہے کیونکہ اگر دیدار ہوتے ہوئے گناہ سرزد ہو جائے تو اس کی معافی کا امکان موجود ہوتا ہے جبکہ بے دینی کے ساتھ نیکی کرنا قابل قبول نہیں ہوتا۔“

وضاحت: امام علیؑ کے فرمان ”میں اسلام کی طرف ایسی نسبت دیتا ہوں“ میں نسبت سے مراد تعریف و پہچان کروانا ہے۔ جیسا کہ سورۃ اخلاص ”قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ.....“ کو بعض روایات میں ”سورۃ نسبة الرب“ رب کی نسبت کی سورت کا نام دیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں رب یعنی خدا کی تعریف اور اس کی پہچان کروائی گئی ہے، امام نے اسلام کی تعریف یعنی تعارف میں جو فقرے ذکر کئے ہیں ان میں سے پہلے فقرہ (الاسلام هو التسليم، اسلام عین تسلیم ہے) میں اسلام کی لفظی تشریح و توضیح ہے اور ایک لفظ کی پہچان دوسرے اس لفظ سے کروائی گئی ہے جو اس سے زیادہ واضح ہے، اور دوسرے فقروں میں اسلام کی تعریف و تعارف اور اس کی پہچان اس کے لازمی امور کے ذریعے کروائی گئی ہے..... کیونکہ یقین، تصدیق، اقرار، اداء اور عمل درحقیقت اسلام کے لازمی اور ناقابل جدائی امور ہیں، جیسے آگ کے لئے حرارت و گرمی، اور برف کے لئے برودت و ٹھنڈک..... یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ اسلام سے اس کا لفظی و لغوی معنی مراد نہ ہو بلکہ اصطلاحی معنی

مراد ہو یعنی وہ دین کہ جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لے کر آئے کہ جس کا اشارہ اس آیت مبارکہ ” اِنَّ الْمَدِيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاَسْلٰمُ “ میں ہوا ہے۔ اور امامؑ کے فرمان میں ”تسلیم“ سے خدا کے مقرر کردہ آئین زندگی پر ظاہر و باطناً اور قول و فعل دونوں میں اطاعت و فرما برداری مراد ہو، تو اس طرح امام علیؑ کے بیان کردہ تمام فقرہوں میں اسلام کا تعارف اس کے لازمی امور کے ذریعے قرار پائے گا۔

اس بیان کی بنا پر حدیث کا معنی یہ ہوگا: یہ دین کہ جسے اسلام کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اس بات کا متقاضی ہے کہ انسان خداوند عالم کے حضور ظاہر و باطناً اور گفتار و کردار دونوں میں سر تسلیم خم کر دے اور خود اور اپنے اعمال کو خدا کے امر و ارادہ کے ماتحت و تابع بنا دے کہ یہی ”تسلیم“ ہے، ”تسلیم“ اور ہر حوالہ سے اپنے آپ کو خدا سے وابستہ کرنے کا نتیجہ یا لازمی امر اللہ پر یقین رکھنا اور اس کی بابت ہر طرح کے شک کا دل سے دور کرنا ہے، اور یقین، تصدیق کی راہ پر لاکھڑا کرتا ہے کہ انسان دین کی صداقت کا اظہار کرتا ہے، تصدیق، اقرار کا پیش خیمہ بنتی ہے کہ جس کا معنی دین کے استحکام اور قررو ثبات پر کامل یقین اور پختہ اعتقاد رکھنا ہے کہ اس میں کسی طرح کی غیر مستحکم و غیر یقینی صورت نہیں پائی جاتی بلکہ وہ اپنے اصل ٹھکانہ و سرچشمہ سے وابستہ و پیوستہ ہے اور اس سے ہرگز الگ و جدا نہیں ہو سکتا، اس طرح کا اقرار، اداء کی بنیاد فراہم کرتا ہے اور اداء کا لازمی نتیجہ عمل ہے،

اور جہاں تک امامؑ کے اس فرمان کا تعلق ہے کہ ”بے دینی کے دائرہ میں رہ کر نیکی کرنا قابل قبول نہیں“، تو اس میں عدم قبولیت سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں اس پر کوئی اجر و جزا اور ثواب نہیں ملے گا، یا اس سے مراد یہ ہے کہ اس کی اللہ کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں نہ دنیا میں اور نہ ہی آخرت میں اس کا کوئی اچھا اثر ظاہر ہوگا کہ دنیا میں خدا اس کی وجہ سے اس کی زندگی کو سعادت مندی کی نعمت عطا نہیں کرے گا اور آخرت میں بہشت کی نعمت سے نہیں نوازے گا، بنا برائیں یہ حدیث کفار کے بارے میں وارد ہونے والی ان احادیث سے متضاد و منافی نہیں جن میں کفار کو ان کی نیکیوں اور اچھے اعمال کی انجام دہی پر دنیاوی جزا و اجر دیئے جانے کا تذکرہ ہوا ہے اور نہ ہی اس قرآنی آیت مبارکہ میں مذکور مطلب سے کسی طرح کی نفی کا پہلو پایا جاتا ہے جس میں عمومی ضابطہ اعمال و جزاء کا بیان ہے (آیت ملاحظہ ہو):

سورۃ زلزال، آیت: ۷

○ ”فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ“

(تو جو شخص ذرہ بھرنیک عمل انجام دے وہ اسے دیکھے گا)



## بنی اسرائیل کے جرائم کا تذکرہ

تفسیر مجمع البیان میں ابی عبیدہ جراح سے ایک روایت ذکر کی گئی ہے انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کیا:

یا رسول اللہ! ”ای الناس اشد عذاباً یوم القيامة“

اے اللہ کے رسول! قیامت کے دن کونسا شخص سب سے زیادہ سخت عذاب میں مبتلا ہوگا؟

قال (ص): ”رجل قتل نبیاً و رجلاً امر بالمعروف او نهی عن المنکر، ثم قرء: ”الذین

یقتلون النبیین بغیر حق و یقتلون الذین یأمرون بالقسط من الناس“

حضرت پیغمبر اسلام نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب میں وہ شخص مبتلا ہوگا جس نے کسی

نبی کو قتل کیا یا اس شخص کو قتل کیا جس نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا، اس کے بعد آنحضرت نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

”الذین یقتلون النبیین بعیر حق و یقتلون الذین یأمرون بالقسط من الناس“ (جو لوگ نبیوں کو ناحق)

قتل کرتے ہیں اور ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو لوگوں میں عدل کا حکم دیتے ہیں)۔

ثم قال (ص): یا ابا عبیدة! قتلت بنو اسرائیل ثلثة واربعین نبیاً فی ساعة فقام مائة رجل

واننا عشر رجلاً من عباد بنی اسرائیل فامروا من قتلهم بالمعروف و نهوهم عن المنکر فقتلوا

جميعنا آخر النهار من ذلك الیوم وهو الذی ذکره الله“

پھر آنحضرت نے ارشاد فرمایا: اے ابو عبیدہ! بنی اسرائیل نے ایک ہی گھنٹہ میں ۴۳ نبیوں کو قتل کیا، جب بنی

اسرائیل کے عابدوں نے اس خونین واقعہ کو دیکھا تو ان کے ۱۱۲ افراد کھڑے ہو گئے اور قاتلوں کو امر بالمعروف اور نہی عن

المنکر کیا مگر ان لوگوں نے اس دن کے آخری لمحوں تک سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا، اسی کا ذکر خداوند عالم نے مذکورہ آیت

میں فرمایا ہے۔ (تفسیر مجمع البیان جلد ۲ صفحہ ۴۲۳)

مؤلف: اسی مضمون کی حدیث تفسیر درمنثور (جلد ۲ صفحہ ۱۳) میں ابن جریر ہی سے ابن ابی حاتم کے حوالہ سے

ابو عبیدہ سے منقول ہے۔

## حق کی پیروی کی دعوت

تفسیر ”درمنثور“ میں ابن اسحاق، ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم کے اسناد سے جناب عبداللہ بن عباس کی روایت منقول ہے جس میں انہوں نے کہا، ایک دن حضرت پیغمبر اسلامؐ یہودیوں کی درسگاہ بیت المدارس تشریف لے گئے جہاں یہودیوں کی کثیر تعداد موجود تھی، آپؐ نے انہیں دعوت الی اللہ دی (حق کی پیروی کی دعوت دی) تو نعمان بن عمرو اور حرث بن زید نے آنحضرتؐ سے پوچھا:

”علی ای دین انت یا محمد“ اے محمد! آپ کس دین پر ہیں؟

آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: ”علی ملۃ ابراہیم و دینہ“ میں ابراہیم کے دین و ملت پر ہوں،

یہ سن کر ان دونوں نے کہا: ”ان ابراہیم کان یہودیاً“ ابراہیم تو یہودیت کے دین پر تھے،

آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: ”فہلما الی التورۃ فہی بیننا و بینکم“، اگر ایسا ہی ہے تو پھر میرے

سامنے تورات لاؤ وہی ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کر دے گی۔

آنحضرتؐ کی بات سن کر انہوں نے تورات پیش کرنے سے انکار کر دیا، اس وقت خداوند عالم نے یہ آیت نازل

فرمائی: ”اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یُذْعَوْنَ اِلٰی کِتٰبِ اللّٰهِ لِیَحْکُمَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقًا

مِنْهُمْ وَهُم مُّعْرِضُوْنَ ۝ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ نَّسْمَعَ النَّاسَ اِلَّا اٰیًا مَّا مَعْدُوْدٰتٍ وَّعَرَّهْمُ فِیْ دِیْنِهِمْ مَّا

کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ۝“ (کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا کہ وہ کتاب اللہ کی طرف بلائے

جاتے ہیں تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، پھر ان میں سے ایک گروہ روگردانی کرتا ہے جبکہ وہ حق سے منہ موڑنے والے

ہیں، وہ اس لئے ایسا کرتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں ہمیں دوزخ کی آگ ہرگز نہیں چھوئے گی سوائے گنتی کے چند دنوں کے، اور

انہیں ان کی افتراء پر دازی نے انہیں ان کے دین کی بابت دھوکہ میں ڈال دیا ہے)۔

(ملاحظہ ہو: تفسیر درمنثور، ج ۲ ص ۱۴)

اس آیت کی تفسیر میں بعض محدثین نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت دراصل رحم کے ایک واقعہ کی بابت نازل ہوئی

ہے۔ اس واقعہ کا تذکرہ آیت مبارکہ ”یٰۤاَہْلَ الْکِتٰبِ قَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمْ کَثِیْرًا مِّمَّا کُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ

الْکِتٰبِ.....“ (اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آ گیا ہے جو ان کثیر مطالب کو تمہارے سامنے واضح کرتا ہے جسے

تم کتاب الہی سے چھپاتے ہو) (سورہ مائدہ، آیت ۱۵) میں تفصیل سے ذکر ہوگا۔

بہر حال مذکورہ بالا دونوں روایتیں ”خبر واحد“ کے باب سے ہیں کہ جن میں معتبر و قابل قبول ہونے کی قوت و

صلاحیت نہیں پائی جاتی۔

## آیات ۲۶، ۲۷

قُلِ اللَّهُمَّ مَلِكُ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعْزِزُ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِإِذْنِكَ الْغَيْرُ إِلَّا عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۶﴾

تُوَلِّجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوَلِّجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾

## ترجمہ

”کہیے، اے اللہ! اے کائنات کے مالک! تو جسے چاہتا ہے حکومت و اقتدار عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت و اقتدار چھین لیتا ہے، اور تو جسے چاہتا ہے عزت عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت سے دوچار کرتا ہے، تیرے ہی ہاتھ میں خیر ہے، تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے“

(۲۶)

”تورات کو دن میں چھپا لیتا ہے اور دن کو رات میں چھپا لیتا ہے، اور تو مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے، اور تو جسے چاہتا ہے بغیر حساب روزی عطا کرتا ہے“

(۲۷)

## تفسیر و بیان

ان دو آیتوں (۲۶ و ۲۷) میں مذکور مطالب سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ما قبل آیت مبارکہ سے کہ جن میں اہل کتاب بالخصوص یہودیوں کے بارے میں مطالب ذکر کئے گئے ہیں بے ربط قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ وہ آیات یہودیوں کو دنیا و آخرت کے عذاب کی وعید اور انتباہ پر مشتمل ہیں اور یہ بھی عذاب کی ایک صورت ہے کہ خدا نے انہیں حکمرانی و اقتدار سے محروم کر دیا اور انہیں قیامت تک ذلت و بیچارگی سے دوچار کر دیا، ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا اور انہیں زندگی میں بے بسی و عجز اور بے اختیاری و عدم استقلال میں مبتلا کر کے انہیں سیادت و سرداری سے محروم کر دیا۔

اس کے علاوہ یہ نکتہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اس سورہ مبارکہ کی تنزیل کا مقصد اعلیٰ اس امر کا بیان ہے کہ پورے عالم کی تخلیق و تدبیر خداوند عالم کے دست قدرت میں ہے، وہی حقیقی اقتدار و حاکمیت کا مالک ہے، وہی جسے چاہتا ہے حکومت و اقتدار عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے عزت سے نوازتا ہے، خلاصہ کلام یہ کہ وہی ہے جو جسے چاہے خیر عطا کرتا ہے اور وہی جو جسے چاہے حکومت و اقتدار، عزت و وقار اور ہر طرح کی خیر سے محروم کر دے، بنا براین زیر نظر دو آیتوں (۲۶، ۲۷) اپنے مضمون و موضوع اور متن کے حوالہ سے سورہ مبارکہ کی غرض و مقصود کے دائرہ سے باہر نہیں۔

بارگاہِ ربوبی میں طلب خیر کی التجاء

○ ”قُلِ اللَّهُمَّ مَلِكُ الْمَلِكِ.....“

(کہیے کہ اے اللہ! اے حکومت و اقتدار کے مالک!)

اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے اپنے رسول حضرت محمدؐ کو حکم دیا کہ وہ حوادث روزگار اور ناگواری حالات میں

اس سے استجاء کرتے ہوئے اور اس کی پناہ طلب کرتے ہوئے اس کی حاکمیت مطلقہ کا اظہار کریں، وہ خدا کہ جس کے ہاتھ میں خیر ہی خیر ہے، اور علی الاطلاق خیر و قدرت کا مالک ہے تاکہ ان موہوم و مذموم خیالات کے آثار سے نجات پائیں۔ اور محفوظ رہیں۔۔ جو اہل کتاب اور مشرکین میں حق سے روگردانی کرنے والوں اور منافقوں کے دلوں میں موجزن ہیں کہ وہ انہی نظریات و بے بنیاد افکار کی وجہ سے گمراہ و تباہ ہو گئے اور ان کے انہی غلط و ناحق عقائد نے انہیں حق و حقیقت کی راہ سے دور کر دیا کہ انہوں نے اپنے تئیں حاکمیت و عزت اور خداوند عالم سے بے نیازی کے باطل تصورات کو اپنالیا، وہ اپنے آپ کو ہر چیز کا مالک، ہر چیز پر حاکم، ہر ایک سے زیادہ عزت دار اور خدا سے بے نیاز ہونے کو خود اپنے ساتھ مخصوص قرار دینے لگے، لہذا خداوند عالم نے حضرت پیغمبر اسلامؐ کو مخاطب قرار دے کر تمام افراد بشر کو فرمان جاری کیا کہ اپنے آپ کو خدا کی پناہ میں قرار دیتے ہوئے اس سرچشمہ فیض سے طلب خیر کریں اور اس کی حاکمیت مطلقہ کے سایہ میں رہیں جو جسے چاہے بے حساب رزق عطا کرنے والا ہے۔

## ملکیت و مالکیت کی بحث

لفظ ”ملک“ (م کے نیچے زیر کے ساتھ) کا معنی مشہور ہے جسے ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے اور ہم اپنے روز مرہ کے استعمالات میں اس سے بخوبی آگاہ ہیں بلکہ اس کے اصل معنی و حقیقت کے بارے میں ہم میں سے کسی کو کوئی شک لاحق نہیں ہوتا، البتہ اس کی بابت جو اہم ترین نکتہ قابل توجہ ہے وہ یہ کہ ملکیت و مالکیت کی دو قسمیں ہیں: ایک حقیقی اور دوسری مجازی، حقیقی ملکیت سے مراد یہ ہے کہ کوئی چیز مثلاً انسان دوسری چیز میں جس طرح چاہے تصرف کر سکے اور اس سے وجودی طور پر جس طرح بھی ممکن ہو استفادہ کر سکتا ہو، یعنی مالک اپنی مملوکہ شے کو جس طرح چاہے اس کی وجودی صلاحیتوں کے مطابق اس سے کام لے جیسا کہ انسان اپنی قوت مینائی سے جہاں چاہتا ہے کام لیتا ہے اور جہاں چاہتا ہے اس کو کام میں نہیں لاتا، گویا اس کا کام میں لانا اور نہ لانا اس کے اختیار میں ہے، اسی طرح وہ اپنے ہاتھ کے بارے میں جس طرح اور جہاں چاہتا ہے اپنی مرضی و اختیار کے مطابق فیصلہ کرتا ہے، اسی کے ذریعے لین دین کرتا ہے اور لین دین سے ہاتھ روکنے کا اختیار بھی اسے ہی حاصل ہے تو لامحالہ مالک اور اس کی مملوکہ اشیاء کے درمیان اس طرح کا ربط و تعلق حقیقی ملکیت کہلاتا ہے کہ اس میں کسی طرح کی تبدیلی کی ہرگز گنجائش نہیں پائی جاتی، اور اس معنی میں مالک اور اس کی ملکیت کے درمیان پایا جانے والا حقیقی رشتہ نہ تو کبھی ختم ہوتا ہے اور نہ ہی وہ اس سے بے نیاز ہوتا ہے بلکہ ہمیشہ اس کے ساتھ قائم و باقی ہوتا ہے جب تک وہ خود زندہ و موجود اور باقی ہوتا ہے اس کی ملکیت بھی باقی رہتی ہے اور جب وہ دنیا سے چلا جاتا ہے یعنی مرجاتا ہے تو اس کی ملکیت کا رشتہ بھی ختم ہو

جاتا ہے، ایسا نہیں کہ وہ مر جائے اور اس کی وجودی قوتیں اس کی ملکیت میں باقی رہیں، بلکہ اس کی موت ہی سے ان کے درمیان پایا جانے والا تعلق ورشتہ اور مالکانہ حقوق کا رابطہ منقطع ہو جاتا ہے، یا یہ کہ وہ ابھی زندہ ہو مگر اس کی قوت بینائی و شنوائی ختم ہو جائے یا اس کی آنکھ نکال دی جائے یا ہاتھ کاٹ دیا جائے تو اس صورت میں حقیقی مالکانہ رشتہ کی بنیاد ہی باقی نہ رہی تو اس کے استعمال کا تصور ہی ممکن نہیں ہوگا، تو معلوم ہوا کہ حقیقی ملکیت اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک مالک موجود ہو اور وہ شے بھی موجود ہو جس کا وہ مالک ہے، خداوند عالم کی مالکیت بھی اسی طرح کی ہے کہ وہ پوری کائنات کا علی الاطلاق مالک ہے اور عالم ہستی کے ذرہ ذرہ پر اس کی مالکانہ حاکمیت ہے، وہ تمام جہان کی ہر چیز اور اس سے مربوط امور کا بلا شرکت غیرے اور ہر لحاظ سے مالک ہے، اسے حق حاصل ہے کہ اپنی مملوکہ اشیاء (موجودات عالم) میں سے جس میں جس طرح چاہے تصرف کرے۔

یہ تو ہے ”ہلک“ (م کے نیچے زیر کے ساتھ) بمعنی مالکیت کی پہلی قسم، جہاں تک اس کی دوسری قسم کا تعلق ہے یعنی مجازی مالکیت تو اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی شے کسی کے اختیار میں قرار پائے اور وہ اس سے استفادہ کرنے کا حق رکھتا ہو، (اسے علمی اصطلاح میں وضعی و اعتباری مالکیت کہا جاتا ہے یعنی قراردی گئی مالکیت!) اس کا معنی یہ ہوا کہ کوئی چیز مثلاً انسان اس تعلق اور مالکانہ حقوق کے رشتہ کی بنیاد پر کسی چیز سے جس طرح چاہے اور جہاں چاہے استفادہ کر سکے کہ جسے معاشرہ کے عقلاء نے معاشرتی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے قائم و تجویز کیا ہو، اس طرح مالکیت دراصل اس حقیقی مالکیت کے تناظر میں قراردی گئی ہے جو اصل وجود اور اس کے آثار کی بابت پائی جاتی ہے تو عقلاء نے اسی کو ملحوظ رکھتے ہوئے معاشرتی امور میں بھی ایسی مالکیت قراردی جس کی بنیاد پر عالم ہستی میں پائی جانے والی موجودات سے استفادہ کرتے ہوئے زندگی کی ضرورتوں کی تکمیل ممکن ہو اور انسان اشیاء عالم سے اس طرح کام لے سکے جس طرح اپنے وجود کے اعضاء سے کام لیتا ہے، اور چونکہ اس طرح کا مالکانہ تعلق معاشرتی زندگی کے مسائل حال کرنے کی غرض سے قرار دیا گیا ہے لہذا اس کا دائرہ اس حقیقی مالکیت کے دائرہ کی طرح وسیع نہیں جو وجودی اعضاء میں پائی جاتی ہے بلکہ اس میں تبدیلی کا امکان پایا جاتا ہے اور اس کے کسی دوسرے شخص کو منتقل ہونے کی گنجائش موجود ہوتی ہے مثلاً اس میں یہ بات روا ہوتی ہے کہ مالک اپنی مملوکہ اشیاء کو کسی دوسرے کی ملکیت میں قرار دے یعنی اسے بیچ دے، ہبہ بخشش کر دے، یا دوسرے ایسے سبب کے ذریعے اپنے مالکانہ حقوق و اختیار دوسرے شخص کو دے دے، ..... جبکہ حقیقی ملکیت میں ایسا ہونا ممکن نہیں مثلاً کوئی شخص اپنی قوت بینائی بیچ نہیں سکتا اور نہ ہی اس کی ملکیت کسی بھی حوالہ سے کسی دوسرے شخص کو منتقل کر سکتا ہے م.....)

اب رہی ”ہلک“ (م پر پیش کے ساتھ) والی مالکیت، تو اگرچہ وہ بھی ”ہلک“ (م کے نیچے زیر کے ساتھ) والی ملکیت و مالکیت کے باب سے ہے لیکن اس میں مالکیت کا تعلق ان اشیاء سے ہوتا ہے جس کے مالک چند لوگ ہوتے

ہیں، (اس طرح کے مالکانہ اختیار کو حکمرانی، سلطنت، بادشاہت و حکومت وغیرہ سے موسوم کیا جاتا ہے) کیونکہ اس میں مالک ہر اس چیز کا مالک ہوتا ہے جو اس کی رعایا کی ملکیت میں ہو، یعنی وہ اپنی رعایا کی مملوکہ اشیاء کا مالک ہوتا ہے اور اسے حق حاصل ہوتا ہے کہ اپنی رعایا کی مملوکہ اشیاء میں جس طرح تصرف کرے کہ اس کا تصور کرنا رعایا کے تصرف کرنے میں رکاوٹ نہ بنے اور نہ ہی ان کے تصرف کے حق کو ختم یا پامال کر دے، گویا رعایا کی چاہتوں و حاکم کی چاہتوں میں دورنگی نہ پائی جائے، کیونکہ حقیقت میں اس کی مالکیت، ایک مخصوص مالکیت پر قائم ہوتی ہے اور اس طرح کی مالکیت کو اصطلاحی طور پر ”طولی مالکیت“ کہا جاتا ہے، اس کی مثال اس شخص کی ہے جو کسی غلام کا مالک ہوتا ہے تو وہ ہر اس چیز کا مالک بھی ہوتا ہے جو غلام کی ملکیت میں ہو، یعنی مولا اپنے عبد کا اور عبد کی تمام مملوکہ چیزوں کا مالک ہوتا ہے، بنا بریں ”مُملک“ (م پر پیش کے ساتھ) کی بھی اسی طرح قسمیں ہوں گی جس طرح ”مملک“ (م کے نیچے زیر کے ساتھ) کی قسمیں ذکر کی گئی ہیں۔

### خداوند عالم کی مالکیت مطلقہ

ملکیت و مالکیت کی بابت مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خداوند عالم مالک بھی ہے اور حاکم بھی! وہ ہر چیز کا علی الاطلاق مالک ہے اور وہ اس طرح سے کہ ربوبیت مطلقہ اور قیومیت مطلقہ اس کا حق اور اس سے مختص ہے یعنی وہ ہر چیز کا علی الاطلاق رب ہے، ہر لحاظ سے ہر شے کا پروردگار ہے۔ ہر چیز کے امور اسی کے ہاتھ میں ہیں، ہر شے کے وجود و بقا کی ذمہ داری اس کے پاس ہے، عالم ہستی کی تمام موجودات پر اس کا تسلط ہے، ہر شے اسی کے قبضہ قدرت و دائرہ اختیار و اقتدار میں ہے کیونکہ وہ ہر شے کا خالق و آفریدگار ہے اور ہر چیز کا وہی معبود ہے چنانچہ اس کا ارشاد ہے:

۰ سورہ مومن، آیت: ۶۲

○ ”ذُلِّمْتُكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۗ لَآ إِلَهَ إِلَّا هُوَ“

(وہ تمہارا رب ہے، ہر شے کا پیدا کرنے والا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں)

سورہ بقرہ، آیت: ۲۵۵

○ ”لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ“

(اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے)

اس کے علاوہ دیگر متعدد آیات مبارکہ سے اس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے کہ ہر وہ جسے ”شیئی“ (چیز) کہا جاتا ہے یا

کہا جاسکتا ہے وہ خدا کی ذات سے وابستہ اور اس کی محتاج و دست نگر ہے کوئی شے اپنے وجود میں خدا سے بے نیاز اور ذاتی

استقلال نہیں رکھتی۔ خدا جس چیز کے بارے میں جو کچھ چاہے اسے کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی اور نہ ہی کسی چیز کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر سکتا ہے۔ یہی معنی ہے ”ملک“ (م کے پھر زیر کے ساتھ) کا، کہ جس کا تذکرہ ہو چکا ہے۔

اور جہاں تک اس کے علی الاطلاق حاکم و فرمانروا ہونے کا تعلق ہے تو اس کی دلیل اس کا تمام موجودات کا علی الاطلاق مالک ہونا ہے، اس کی وضاحت یوں ہے کہ عالم ہستی کی موجودات میں سے بعض دوسری بعض کی مالک ہیں، یعنی ان میں سے کچھ موجودات ایسی ہیں جو دوسری بعض موجودات کی ملکیت میں قرار پاتی ہیں مثلاً اسباب اپنے مسببات کے مالک ہوتے ہیں اور اشیاء ان قوتوں کی مالک ہوتی ہیں جن سے استفادہ کرتی ہیں، اور وہ قوتیں اپنے افعال کی مالک ہوتی ہیں جیسے انسان اپنے اعضاء و جوارح کا مالک ہے اور اپنی وجودی قوتوں یعنی قوت سماعت، قوت بصارت اور دیگر ان تمام قوتوں کا مالک ہے جن سے اپنی ضروریات زندگی میں کام لیتا ہے اور وہ قوتیں اپنے افعال کی مالک ہوتی ہیں تو جب خداوند عالم تمام موجودات کا مالک ہے اور ہر چیز اس کی ملکیت میں ہے لہذا وہ ہر مالک کا مالک اور ہر مالک کی مملوکہ اشیاء کا مالک بھی ہے، یہی معنی ہے ”ملک“ کا، کہ جس سے ”ملیک“ بنتا ہے، تو اس معنی میں خداوند عالم مالیک علی الاطلاق (حاکم مطلق) ہے چنانچہ اس حوالہ سے اس کا ارشاد ہے:

سورہ تغابن، آیت ۱:

○ ”لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ“

(اسی کے لئے ہے ملک (اقتدار) اور اسی کے لئے ہے حمد)

سورہ قمر، آیت ۵۵:

○ ”عِنْدَ مَلِيكَ مُقْتَدِرًا“

(مقتدر حاکم کے پاس)

تو یہ ہیں خداوند عالم کے مالک ”ملک“ م کے نیچے زیر کے ساتھ) اور ”ملک“ (ملک) م پر پیش کے ساتھ) کی مثالیں اور حقیقی معانی!

اور جہاں تک خداوند عالم کے مجازی مالک و حاکم ہونے کا تعلق ہے تو وہ بھی صحیح و ثابت ہے کیونکہ وہ مالک ہے اور وہ ملکیت عطا کرنے والا ہے، اسی نے ہر چیز کو ملکیت عطا کی ہے یعنی موجودات عالم ہستی میں سے جو چیز بھی کسی چیز کی مالک ہے وہ دراصل خدا کی عطا کردہ ملکیت کی وجہ سے ہے کہ اگر خدا اس کا مالک نہ ہوتا تو وہ کسی چیز کو کسی چیز کا مالک کیونکر بنا سکتا تھا اور یہ بات لازم آتی کہ اس نے وہ چیز کسی کی ملکیت میں دی کہ جس کا وہ مالک نہیں تھا جبکہ ایسا ہونا ممکن نہیں، اس نے مالک



ہونے کی بناء پر سب کو مالک بنایا ہے چنانچہ اس کا ارشاد گرامی قدر ہے :

سورۃ نور، آیت ۳۳ :

○ ” وَأَتَوْهُم مِّن مَّالِ اللَّهِ الَّذِي بَرَئْتُمْ لَهُمْ “

(اور تم انہیں اللہ کے اس مال سے دو جو اس نے تمہیں دیا ہے)

اور وہ ”ملیک“ کے دوسرے معنی کی بناء پر بھی ہر اس چیز کا مالک ہے جو لوگوں کے ہاتھوں میں ہے یعنی جس چیز کے وہ مالک ہیں، کیونکہ وہ شارع اور قانون بنانے والا ہے، وہ اپنے بندوں کے لئے احکام صادر کرتا ہے اور وہ ہر اس چیز کے بارے میں قانون گزاری کرتا اور فرمان جاری کرتا ہے جو لوگوں کی ملکیت میں ہے تو گویا لوگوں اور ان کی مملوکہ اشیاء کے بارے میں فیصلہ کرنا اسی کا کام ہے اور وہ اسی طرح بندوں اور ان کی مملوکہ اشیاء کی بابت حاکمانہ فیصلہ کرتا ہے جس طرح بادشاہ و فرمانروا حضرات اپنی رعایا و عوام کے پاس موجود اشیاء کے بارے میں اپنا قانونی حق استعمال کرتے ہوئے احکامات جاری کرتے ہیں، اس موضوع سے مربوط آیات ملاحظہ ہوں :

سورۃ ناس، آیت ۲ :

○ ” قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ “

(کہہ دو کہ میں پناہ چاہتا ہوں لوگوں کے پروردگار کی، لوگوں کے مالک کی)

سورۃ ابراہیم، آیت ۳۴ :

○ ” وَأَشْكُم مِّن كَلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ ۗ وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَتِ اللَّهِ لَا تَحْصُوهَا ۗ “

(اور اس نے وہ سب کچھ تمہیں عطا کیا جو تم نے اس سے مانگا، اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو تو تم ان کا احصاء نہیں

کر سکتے)

سورۃ حدید، آیت ۷ :

○ ” وَأَنْفَقُوا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلِفِينَ فِيهِ “

(اور تم اس میں سے انفاق (اللہ کی راہ میں خرچ) کرو جو اس نے تمہیں دوسروں کا قائم مقام بنا کر عطا کی ہے)

سورۃ حدید، آیت ۱۰ :

○ ” وَمَالِكُمْ آلَا تَتَفَقَّوْا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَ لِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۗ “

(اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں انفاق نہیں کرتے جبکہ اللہ کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی

وراثت۔۔ مالکیت۔۔)

سورۃ مومن، آیت ۱۶ :

○ ” لَيْسَ الْمُلْكُ لِلْيَوْمِطِ ۖ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ”

(آج کے دن کس کی حکومت ہے، اللہ کی ہے جو یکتا ہے غلبہ والا ہے)

بنائے اس خداوند عالم ہر اس چیز کا مالک ہے جو ہم سے پہلے لوگوں کے پاس تھی (وہ جس کے مالک تھے) اور وہ ہر اس شے کا مالک ہے جو ہمارے پاس ہے (جس کے ہم مالک ہیں) اور وہ ہر اس شے کی میراث پائے گا (مالک ہوگا) جو ہمارے بعد ہوگی، اور اس کی ملکیت و مالکیت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

### تین اہم نکات!

مذکورہ بالا تمام مطالب سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آیت مبارکہ ” اللَّهُمَّ مَلِكِ الْمُلْكِ ” (اے اللہ! اے مَلِكِ الْمُلْكِ!) میں تین اہم نکات کا بیان مقصود و ملحوظ ہے :

(۱) خداوند عالم ہر ” مُلْك ” (م پر پیش کے ساتھ) حاکمیت و فرمانروائی..... اور ہر ” مُلْك ” (حکومت و اقتدار) کے ” مُلْك ” (م کے نیچے زیر کے ساتھ)..... ملکیت و مالکیت کے معنی ہیں..... کا مالک ہے، تو اس طرح اس کی مالکیت دراصل ” الملک علی الملک ” (م پر پیش کے ساتھ) حاکمیت پر حاکمیت کے معنی میں ہوگی دراصل ” مُلْكِ الْمُلْكِ ” (بادشاہوں کا بادشاہ، حاکموں کا حاکم، فرمانرواؤں کا فرمانروا) ہے کہ وہی جو ہر حاکم و فرمانروا کو حاکمیت و فرمانروائی عطا کرنے والا ہے، چنانچہ اس کا ارشاد گرامی ہے :

سورۃ بقرہ، آیت ۲۵۸ :

○ ” أَنْ أُنشِئُ اللَّهُ الْمُلْكَ ”

(کہ اللہ نے اسے مُلْك و اقتدار عطا کیا ہے)

سورۃ نساء، آیت ۵۴ :

○ ” وَأَتَيْنَهُمْ قُلُوبًا عَظِيمًا ”

(اور ہم نے اسے عظیم بادشاہی عطا کی)

(۲) آیت میں لفظ ” مُلْكِ الْمُلْكِ ” سے پہلے لفظ ” اللَّهُ ” (اسم جلالہ) ذکر کر کے خداوند عالم کے

مالک الملک ہونے کے سبب سے آگاہی دلانا مقصود ہے اور وہ یہ کہ وہ مالک الملک ہے کیونکہ وہ خدا ہے اس کی کبریائی و بزرگی سب سے مافوق ہے، یہ ایک نہایت واضح امر ہے۔

(۳) آیت مبارکہ میں ”مُلک“ سے مراد (واللہ اعلم) اس کا وہ معنی ہے جس میں ”مُلک“ کی دونوں قسمیں یعنی حقیقی اور مجازی شامل ہیں کیونکہ پہلی آیت میں یوں ارشاد ہوا: ”تُوْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعْزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُنْزِلُ مَنْ تَشَاءُ“ (تو ملک دیتا ہے جسے تو چاہتا ہے اور تو ملک چھین لیتا ہے جس سے تو چاہتا ہے، تو جسے چاہتا ہے عزت عطا کرتا ہے اور تو سے چاہتا ہے ذلت سے دوچار کرتا ہے) اس کی توضیح و تفسیر میں عنقریب مربوطہ مطالب ذکر کئے جائیں گے جن سے یہ امر واضح ہو جائے گا کہ یہ سب کچھ مجازی مُلک و اقتدار سے تعلق رکھنے والا ہے، اور جو الفاظ دوسری آیت میں ذکر ہوئے ہیں ان سے ان امور کی نشاندہی ہوتی ہے جن کا تعلق حقیقی مُلک و ملکیت سے ہے، بنا برائیں خداوند عالم علی الاطلاق مالک الملک ہے..... یعنی وہ حقیقی اور مجازی دونوں معنوں میں مالک الملک ہے، گویا جس یعنی میں مالکیت کا تصور کریں وہ اس لحاظ سے مالک الملک ہے.....

عطا کرنا اور محروم کرنا سب خدا کے ہاتھ میں ہے

○ ”تُوْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ“

(تو جسے چاہتا ہے ملک و اقتدار عطا کرتا ہے اور جس سے تو چاہتا ہے اقتدار چھین لیتا ہے)

اس آیت مبارکہ میں لفظ ”مُلک“ چونکہ مطلق اور کسی اضافت کے بغیر ذکر ہوا ہے لہذا اس سے اس کا عام معنی مراد لیا جائے گا کہ جس میں ہر حاکمیت و اقتدار شامل ہو خواہ برحق حاکمیت و اقتدار ہو یا باطل و ناحق، خواہ مبنی بر عدل ہو یا مبنی بر ظلم ہو، کیونکہ ”مُلک“ (حکومت و اقتدار) جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت مبارکہ ۲۵۸ ”أَنَّ اللَّهَ الْمُلْكَ“ کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے بذات خود خدائی عنایات میں سے ایک عطیہ و عنایت ہے اور ایسی نعمت ہے جو انسانی معاشرہ میں اچھے آثار ظاہر کر سکتی ہے شاید اسی وجہ سے خداوند عالم نے اقتدار و حاکمیت کی محبت اور رغبت لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دی ہے اور وہ فطری طور پر اس کے دلدادہ ہوتے ہیں، اس لحاظ سے وہ اقتدار و فرمانروائی کہ جو اس کے نااہل کے پاس ہوتی ہے وہ اصل اقتدار و حکمرانی کی حیثیت میں مذموم نہیں ہوتی بلکہ یا تو اس حوالہ و بنیاد پر مذموم ہوتی ہے کہ اسے نااہل نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے مثلاً وہ شخص جو جوہر اور عنصی طور پر اقتدار پر قبضہ کرتا ہے، تو چونکہ وہ اس کا اہل و حقدار نہیں ہوتا لہذا اس کی مذمت

کی جاتی ہے، یا اس وجہ سے وہ حکومت و اقتدار اور حکمرانی مذموم ہوتی ہے کہ وہ جس کے ہاتھوں میں ہے وہ ناپاک کردار کا مالک ہے جبکہ وہ اچھا اور پاکیزہ کردار اپنانے کی قدرت و صلاحیت رکھتا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے غلط و باطل راہ اختیار کی لہذا اس حوالہ سے اس کی حاکمیت بھی مذموم ہوگی، بہر حال اس دوسری وجہ کی بازگشت بھی پہلی وجہ کی طرف ہوتی ہے۔ حکومت و اقتدار کی بابت ایک اور حوالہ بھی ملحوظ ہے اور وہ یہ کہ اگر وہ اس شخص کے پاس ہو جو اس کا اہل ہے تو وہ اس کے لئے خدا کی نعمت قرار پائے گی اور جو شخص اس کا اہل نہیں اس کی نسبت سے وہ اس پر خدائی سزا ہوگی، بہر حال دونوں حوالوں اور نسبتوں سے اس کا سرچشمہ خداوند عالم ہے کہ وہ نعمت کے طور پر یا نعمت و سزا کی صورت میں اس کے ذریعے بندوں کا امتحان لیتا ہے اور انہیں اس کے ذریعے آزماتا ہے۔

### ایک اہم نکتہ

آیت مبارکہ میں اقتدار دینے اور واپس لینے اور اسی طرح عزت عطا کرنے اور ذلت سے دوچار کرنے کو خدا کی مشیت و ارادہ سے مقید کیا گیا ہے ”تَشَاءُ“ (تو جو چاہتا ہے) تو اس سے مراد ہرگز یہ نہیں کہ خداوند عالم کوئی کام صرف اپنی چاہت کی بناء پر اور کسی غرض و مقصد کے بغیر بھی انجام دیتا ہے، اس کی ذات اس طرح افعال کی انجام دہی سے پاک و منزہ اور بالاتر ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے کسی کام میں مجبور نہیں اور کوئی اس پر اس کی بابت جبر نہیں کر سکتا، بلکہ وہ جو کام کرنا ہے اپنی مشیت مطلقہ کے ساتھ انجام دیتا ہے کہ جس میں نہ تو کوئی شخص اور نہ کوئی مقصد اسے اس کی انجام دہی پر مجبور نہیں کر سکتا البتہ اس کا ہر کام ہمیشہ اچھی و پاکیزہ مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔

### عزت و ذلت خدا کے ہاتھ میں ہے

○ ”وَتُعْزِّمُنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ“

(اور تو جسے چاہتا ہے عزت عطا کرتا ہے اور تو جسے چاہتا ہے ذلت سے دوچار کرتا ہے)

لفظ ”عزت“ کا معنی کسی چیز کا اس طرح ہونا ہے کہ اس تک رسائی اور اس کا حصول دشوار ہو، (ناایاب ہونا یا کمیاب ہونا) اسی بناء پر کمیاب چیز کو ”عزیز الوجود“ کہتے ہیں یعنی اس تک پہنچنا یا اسے پانا دشوار ہے، ”نادر الوجود“ اس چیز کو کہتے ہیں

جو کمیا ب ہو، اس طرح ”عزیز القوم“ اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی قوم میں سے قوی و طاقتور ہو کہ اس پر غلبہ پانا اور اسے شکست دینا آسان نہ ہو بلکہ اس کو شکست سے دوچار کرنا اور اس پر غالب آنا نہایت دشوار ہو، اور ”عزیز القوم“ اپنے مقام و منزلت اور قومی و معاشرتی رتبہ و عظمت کے حوالہ سے بھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کی برابری و ہمسری آسان نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنی قوم کی تمام تر قوت کا تنہا حامل ہوتا ہے، گویا جو مقام و مرتبہ اور قوت و عظمت پوری قوم کو حاصل ہے اس سے کہیں زیادہ اسے تنہا حاصل ہوتی ہے جبکہ اس کی قوم میں سے کوئی اس کا ہمتا نہیں ہوتا، اس معنی کے تناظر میں لفظ ”عزت“ کا استعمال عام ہوا یہاں تک کہ پھر اسے ہر مشکل و دشوار چیز کے بارے میں استعمال کیا جانے لگا مثلاً ”یعزز علی کذا“ فلاں چیز مجھ پر گراں بار ہے۔ خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے:

سورہ توبہ آیت ۱۲۸ :

○ ”عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ“

(اس پر تمہارا پریشان ہونا گراں بار ہے)

یعنی اس پر سخت دشوار ہے کہ وہ تمہیں پریشان دیکھے، رفتہ رفتہ اسے ہر غلبہ کے لئے استعمال کیا جانے لگا، چنانچہ کہا جاتا ہے: ”من عز بئ“ (جو غالب آیا اس نے مغلوب کو تنہا نہیں کر دیا) خداوند عالم نے ایک آیت میں یوں ارشاد فرمایا:

سورہ ص، آیت: ۲۳

○ ”وَعَزَّيْنِي فِي الْخِطَابِ“

(اور اس نے مجھے گفتگو میں مغلوب کر لیا)

بہر حال یہ ہیں اس کے استعمالی معانی و موارد، البتہ اس کا اصل معنی وہی ہے جو ذکر کیا جا چکا ہے، لفظ ”عزت“ کے مقابل میں لفظ ”ذلت“ آتا ہے کہ جس کا معنی آسانی سے پالینا ہے خواہ حقیقی معنی میں ہو یا فرضی و تصوراتی معنی میں ہو، آیت شریفہ ملاحظہ ہوں:

سورہ بقرہ، آیت: ۶۱

○ ”ضَرَبَتْ عَلَيْهِمُ الذَّلِيلَةَ وَالْمَسْكَنَةَ“

(ان پر ذلت و بیچارگی ڈال دی گئی)..... ان کا مقدر بن گئی.....

سورہ اسراء، آیت ۲۴:

○ ”وَ اَخْفِضْ لَهَا جَنَاحَ الدُّلِّ“

(ان دونوں (ماں، باپ) کے سامنے نہایت عاجزی کے ساتھ جھک جا)

سورہ مائدہ، آیت: ۵۴

○ ”اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ“

(وہ مؤمنین پر نہایت نرمی کرنے والے ہیں)

عزت، فرمانروائی و اقتدار اور علی الاطلاق حاکمیت کے لوازم یعنی ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ ہونے والے امور میں سے ہیں، کبھی اس سے جدا قابل تصور نہیں، اور چونکہ خداوند عالم حاکم علی الاطلاق ہے لہذا اسے ہی عزت علی الاطلاق حاصل ہے، اس کے علاوہ جو شخص بھی حاکمیت و عزت میں جس قدر بھی مقام و مرتبہ رکھتا ہو وہ درحقیقت عطاء ربانی ہے اور خداوند عالم ہی کی عنایت ہے کہ اس نے اسے اقتدار و عزت سے نوازا ہے۔ اور اگر کوئی شخص کسی قوم کا حاکم و بادشاہ ہو تو گویا اس کی بادشاہی و حاکمیت خدا کی عطا کردہ ہے اور خالص و حقیقی عزت صرف اور صرف خداوند عالم سے مختص و مخصوص ہے اور جو عزت اس کے علاوہ کسی کو حاصل ہے وہ خدا کی دی ہوئی اور عنایت کی ہوئی ہے، ارشاد خداوندی ہے:

سورہ نساء، آیت ۱۳۹:

○ ”اَيَّبْتَعُونَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا“

(آیا وہ اپنے پاس عزت تلاش کرتے ہیں، عزت تو ساری کی ساری خدا کے لئے مخصوص ہے)

سورہ منافقون، آیت: ۸

○ ”وَاللَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ“

(اور اللہ کے لئے ہے عزت اور اس کے رسول کے لئے اور مؤمنین کے لئے!)

ان آیات میں عزت اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوئی ہے، یعنی اس سے مراد حقیقی عزت ہے اور جہاں تک غیر حقیقی عزت کا تعلق ہے تو وہ دراصل ذلت ہے کہ جو عزت کی شکل میں ہوتی ہے، چنانچہ ارشاد الہی ہے:

سورہ ص، آیت ۲:

○ ”بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي عِزَّةٍ وَشِقَاقٍ ○“

(بلکہ کافر لوگ عزت اور دشمنی میں گھرے ہوئے ہیں)

یہاں عزت سے مراد غیر حقیقی اور خیالی و موهوم ہے، اسی وجہ سے اس کے بعد والی آیت میں فوراً یوں ارشاد ہوا:

سورہ ص: آیت ۳:

○ ” كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ مَنَادَ ذَاذِلَاتٍ حِينَ مَنَاصٍ“

(ان میں سے کتنوں کو ہم نے ان سے پہلے ہلاک کر دیا کہ وہ فریادیں کرتے رہے مگر فریادری کا وقت گزر چکا

(تھا)

یہاں یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ جس طرح ”عزت“ اپنے مخصوص احکام رکھتی ہے اسی طرح اس کے نقطہء مقابل میں ”ذلت“ بھی مخصوص احکام کی حامل ہے۔ بنا برائیں خداوند عالم کی ذات اقدس کے علاوہ ہر شے فی نفسہ ذلت کی حامل ہے سوائے اس کے کہ جسے خداوند عالم عزت سے نوازے۔ (نَعَزُّ مَنْ نَشَاءُ وَنُذِلُّ مَنْ نَشَاءُ)..... اے خدا! تو ہی جسے چاہتا ہے عزت عطا کرتا ہے ورتو ہی جسے چاہتا ہے ذلت سے دوچار کرتا ہے.....

## خدا کی قدرت مطلقہ

○ ”بِيَدِكَ الْغَيْبُ إِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“

(تیرے ہاتھ میں ہے خیر، بے شک تو ہی ہر چیز پر قادر ہے)

لفظ ”خیر“ کا لغوی معنی انتخاب و اختیار کرنا اور چن لینا ہے، اور کسی چیز کو ”خیر“ اس لئے کہا جاتا ہے کہ جب ہم دو چیزوں کا ایک دوسرے سے موازنہ کرتے ہیں تو ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا چاہتے ہیں تو جسے ہم چن لیتے ہیں وہ ”خیر“ کہلاتی ہے یعنی چنی ہوئی، اختیار کی ہوئی، منتخب کی ہوئی، پسند کی ہوئی، اور ہم اسے اس لئے چننے اور اختیار کرتے ہیں کہ اس سے ہمارے مطلوب و مقصود کے حصول کی ضمانت ملتی ہے اور جو کام ہم اس سے لینا چاہتے ہیں وہ اس کے ذریعے ممکن دکھائی دیتا ہے، بنا برائیں جسے ہم چاہتے اور اس کا انتخاب کرتے ہیں وہی حقیقت میں ”خیر“ ہے، اور اگر ہم اسے کسی دوسری چیز کے لئے چاہیں تو وہ دوسری چیز اس کی وجہ سے ہمارا مقصود قرار پائی وہ اسی نسبت سے ”خیر“ کہلائی، تو ”خیر“ درحقیقت وہی شے ہے جو ہمارا مطلوب و مقصود بنی اور ہمارا مطلوب و مقصود ہونے کی وجہ سے ہی وہ ”خیر“ سے موسوم ہوئی کہ ہم نے اسے دوسری چیز یا چیزوں کے مقابلے میں اپنا مقصود قرار دیا، اس طرح ہر وہ چیز جسے ہم کئی چیزوں میں سے چن لیں اور منتخب کر لیں وہ ”خیر“ ہوگی۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی چیز کو ”خیر“ سے موسوم کرنے میں اس کا دوسری شے سے

مقایسہ و موازنہ اور اس کا دوسری شے میں موثر ہونا ضروری ہے، اس لحاظ سے اس کے معنی میں ”دوسری شے سے تقابلی نسبت“ بنیادی امر ہے، شاید اسی تقابلی نسبت کے حوالہ سے بعض حضرات اس غلط فہمی میں مبتلا ہوئے ہیں کہ یہ فعل تفضیل کا صیغہ ہے یعنی اصل میں ”خیر“ (بروزن فعل) ہے کہ جس میں تقابلی نسبت سے برتری پائی جاتی ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ فعل تفضیل کا صیغہ نہیں ہے البتہ اس کا معنی اسم تفضیل کے معنی پر منطبق ہوتا ہے کیونکہ فعل تفضیل میں ہمیشہ تقابلی برتری ملحوظ ہوتی ہے اور ”خیر“ میں بھی تقابلی نسبت پائی جاتی ہے چنانچہ فعل تفضیل میں اس طرح کہا جاتا ہے: ”زید افضل عن عمرو“ (زید عمرو سے افضل ہے) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زید اور عمرو دونوں میں سے زید افضل ہے (زید افضلہما) یا کہا جاتا ہے: ”زید خیر من عمرو“ (زید عمرو سے بہتر ہے) یعنی زید اور عمرو دونوں میں سے زید بہتر ہے (زید خیرہما)۔

اگر لفظ ”خیر“ اسم تفضیل ”خیر“ کا مخفف ہوتا (یعنی اصل میں ”اخیسُر“ ہوتا تو اسم تفضیل کے تمام قواعد اس پر جاری ہوتے اور جو مشتقات فعل تفضیل کے ہیں وہ اس کے بھی ہوتے مثلاً ”فعل“ کی جمع ”افضل“ اور تانبیٹ ”فضلی“ اور اس کی جمع ”فضلیات“ بنتی ہے اسی طرح لفظ ”خیر“ سے بھی یہ تمام صیغے بنائے جاتے جبکہ اس کے مشتقات فعل تفضیل جیسے نہیں بلکہ اس طرح آتے ہیں:

”خیر“ (مذکر) ”خیرۃ“ (مؤنث) ”اخیار“ (خیر کی جمع مذکر) ”خیرات“ (خیرۃ کی جمع مؤنث)، چنانچہ اس کی مثال اس سے مشابہ لفظ ”شیخ“ سے دی جاسکتی ہے کہ جس کے مشتقات اس طرح آتے ہیں: ”شیخ“ (واحد مذکر) سے ”شیخۃ“ (واحد مؤنث)۔ ”اشیاء“ (جمع مذکر)۔ ”شیئات“ (جمع مؤنث)۔ بنا بریں لفظ ”خیر“ اسم تفضیل کا صیغہ نہیں بلکہ صفت مشبہ ہے، اور اس کے اسم تفضیل کا صیغہ نہ ہونے کی ایک دلیل بلکہ واضح ثبوت یہ ہے کہ اسے ان موارد میں استعمال کیا جاتا ہے، جہاں اسم تفضیل کا معنی ہرگز نہیں پاجا جاتا، اس کی قرآنی مثال ملاحظہ ہو:

سورۃ جمعہ، آیت: ۱۱

○ ”قُلْ مَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهِ“

(کہہ دیجئے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر ہے، بہتر ہے)

اس میں لہو و لہب کے مقابلے میں ”خیر“ کا استعمال اس امر کا بین ثبوت فراہم کرتا ہے کہ یہاں تقابلی برتری ملحوظ نہیں کیونکہ ”لہو“ میں خیر کا کوئی بھی پہلو پایا نہیں جاتا کہ جس کی بناء پر فعل تفضیل کا معنی درست ہو سکے، (کیونکہ اسم تفضیل میں قدر مشترک کا پایا جانا ضروری ہے تاکہ موازنہ و تقابلی نسبت درست قرار پائے)، اور بعض حضرات کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ”خیر“ اور اس جیسے الفاظ سے اسم تفضیل کا معنی الگ کر دیا گیا ہے، چنانچہ آپ خود اس کی بابت ملاحظہ کر چکے ہیں۔ بہر حال اس سلسلہ



میں حق بات تو وہی ہے جو ہم ذکر کر چکے ہیں کہ لفظ ”خیر“ کا معنی انتخاب و اختیار اور چن لینا ہے، اور کسی مقام پر اس کے مقابل امر میں کہ جس سے اس کا قیاس و موازنہ ہوا ہو کوئی خوبی پائی جائے تو وہ اسی مورد کی مخصوص صفت ہوگی، اسے تمام تقابلی موارد میں وسعت نہیں دی جاسکتی۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ خداوند عالم خیر مطلق ہے کیونکہ ہر چیز کا منتهی وہی ہے اور ہر شے کی بازگشت اسی کی طرف ہوتی ہے اور ہر چیز کا مطلوب و مقصود اسی کی ذات ہے لیکن اس کے باوجود قرآن مجید نے لفظ ”خیر“ کو خداوند عالم کے دیگر مقدس اسماء مبارکہ کی طرح ان میں سے ایک اسم کے طور پر ذکر نہیں کیا، بلکہ اسے خداوند عالم کی ایک صفت کے طور پر ذکر کیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورہ طہ، آیت ۷۳:

○ ” وَاللَّهُ خَيْرٌ وَأَبْلَغُ “

(اور اللہ خیر اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے)

سورہ یوسف، آیت ۳۹:

○ ” عَٰسَىٰ بَابٌ مُّنتَقِدٌ فَوَن خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ “

(کیا گونا گوں اور طرح طرح کے رب بہتر ہیں یا اللہ کہ جو یکتا و غالب ہے)

البتہ جہاں اسم کے طور پر ذکر کیا گیا ہے وہاں کسی دوسرے لفظ سے اضافت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے مثلاً:

سورہ جمعہ، آیت ۱۱:

○ ” وَاللَّهُ خَيْرٌ الرَّزِقِينَ “

(اور اللہ بہتر رزق دینے والا ہے)

سورہ اعراف، آیت ۸۷:

○ ” وَهُوَ خَيْرٌ الْحَكِيمِينَ “

(اور وہ بہتر حکم کرنے والا ہے)

سورہ انعام، آیت ۵۷:

○ ” وَهُوَ خَيْرٌ الْفَصِلِينَ “

(اور وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے)

سورۃ آل عمران، آیت: ۱۵۰

○ ” وَهُوَ خَيْرٌ النَّاصِرِينَ ”

(اور وہ بہتر مدد کرنے والا ہے)

سورۃ آل عمران، آیت: ۵۴

○ ” وَاللَّهُ خَيْرٌ الْمُنِيرِينَ ”

(اور اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے)

سورۃ اعراف، آیت: ۸۹

○ ” وَأَنْتَ خَيْرٌ الْفَاتِحِينَ ”

(اور تو بہتر فتح کرنے والا ہے)

سورۃ اعراف، آیت: ۱۵۵

○ ” وَأَنْتَ خَيْرٌ الْغُفْرِينَ ”

(اور تو بہتر معاف کرنے والا ہے)

سورۃ انبیاء، آیت: ۸۹

○ ” وَأَنْتَ خَيْرٌ الْوَارِثِينَ ”

(اور تو بہتر وارث ہے)

سورۃ مؤمنون، آیت: ۲۹

○ ” وَأَنْتَ خَيْرٌ الْمُنزِلِينَ ”

(اور تو بہتر نازل کرنے والا ہے)

سورۃ مؤمنون، آیت: ۱۰۹

○ ” وَأَنْتَ خَيْرٌ الرَّاحِمِينَ ”

(اور تو بہتر رحم کرنے والا ہے)

شاید ان تمام موارد میں لفظ ”خیبر“ میں انتخاب کا معنی ملحوظ ہو، اسی لئے ”خیبر“ کو خداوند عالم کے اسم کے طور پر ذکر نہیں کیا گیا تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی مقدس ذات کا قیاس و موازنہ اس کے غیر سے ہونے لگے، اور ”خیبر“ مطلق ہونے کی بابت کوئی دوسرا بھی مقابل کے طور پر قرار پائے، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، اور اس کی ذات اس سے بالاتر

ہے کہ اس کا موازنہ و مقایسہ کسی سے کیا جاسکے اور پھر اس تقابل میں خدا کو ”خیسر“ (بہتر) قرار دیا جائے، ہر شے اس کی بارگاہ میں عاجزی کے ساتھ سرختم ہے، اور جہاں تک اضافت اور نسبت کے ساتھ لفظ ”خیسر“ کو خدا کا اسم قرار دینے اور اسی طرح اس کی صفت کے طور پر ذکر کرنے کا تعلق ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، اضافتی و توصیفی اسم قرار دینے میں کوئی محدود لازم نہیں آتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ آیت مبارکہ ”بَيِّنِكَ الْخَيْرُ“ سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ خیر صرف اور صرف خداوند عالم سے مخصوص و مختص ہے کیونکہ یہاں ”خیسر“ پر الف و لام ہے (الخیر) اور وہ جملہ میں ”مبتداء“ ہے کہ جسے اس کی خبر یعنی ”بَيِّنِكَ“ سے پہلے ذکر کیا گیا ہے اور جب ایسا ہو یعنی مبتداء کو خبر سے مقدم کر کے ذکر کیا جائے اور اس پر الف و لام بھی لگایا جائے تو اس سے مراد اس کے معنی کا اختصاص ظاہر کرنا ہوتا ہے، لہذا آیت مبارکہ کا معنی یہ ہوگا کہ ہر مطلوب خیر صرف تیرے ہاتھ میں ہے اور تو ہی ہر خیر کا سرچشمہ و منجہا ہے، اور تو ہی ہر خیر کا عطا کرنے والا اور فیض رساں ہے۔

آیت مبارکہ کا یہ فقرہ ”بَيِّنِكَ الْخَيْرُ.....“ سابقہ ذکر شدہ مطالب کی علت و سبب کے بیان کے طور پر ہے، یعنی فقرہ ”تُوْتِي الْمَلِكَ مَنْ تَشَاءُ..... الخ“ میں اقتدار و عزت عطا کرنا خدا سے مخصوص قرار دیا گیا ہے تو اس کی علت و سبب یہ ہے کہ ”خیسر“ خدا کے ہاتھ میں ہے ”بَيِّنِكَ الْخَيْرُ“ تو اس میں خاص چیز (ملک و عزت) عطا کرنے کی علت و سبب ”خیسر“ کا خدا کے ہاتھ میں ہونا قرار دی گیا ہے جو کہ ملک و اقتدار و عزت سمیت وسیع معنی کی حامل ہے، (”خیر“ صرف انہیں دو امور میں محدود نہیں بلکہ ان سمیت دیگر امور بھی اس کا مصداق قرار پاتے ہیں کیونکہ اس کا سرچشمہ خداوند عالم ہے)

یہ تو ہے عطا کرنے کا بیان، تو جب اقتدار و عزت کا عطا کرنا ”خیر“ سے وابستہ ہے جو خدا کے ہاتھ میں ہے اسی طرح اقتدار سے محروم کرنا اور ذلت سے دوچار کرنا اگرچہ ”شر“ کا مصداق ہیں لیکن ”شر“ ”عدم الخیر“ کا دوسرا نام ہے لہذا اقتدار چھین لینا عزت نہ دینے ہی سے عبارت ہے، بنا بریں ہر ”خیر“ کا معنی خداوند کریم کی ذات ہے جو کہ اس بات کا سبب ہے کہ ”خیسر“ سے ہر محرومی کسی حوالہ سے خدا ہی کی طرف منتہی ہو، البتہ جو بات اہمیت کی حامل ہے وہ یہ کہ ہر اس چیز کی خداوند عالم سے نفی کرنا ضروری ہے جس سے متصف ہونا ذات احدیت کے شایان شان نہیں مثلاً بندوں کے افعال میں پائی جانے والی خامیاں و نقائص اور گناہوں و معاصی میں پائی جانے والی گندگیاں و قبائح وغیرہ، تو ان امور کی نسبت خداوند عالم کی طرف دینا درست نہیں البتہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ خداوند عالم نے فلاں شخص یا قوم کو معصیت و نافرمانی کا مرتکب ہونے کی وجہ سے ذلت و رسوائی سے دوچار کر دیا یا ان سے توفیق خیر سلب کر لی یا انہیں اطاعت و فرمان برداری کی توفیق ہی نہیں دی،

خلاصہ کلام یہ کہ خیر و شر کی دو قسمیں ہیں: تکوینی و تخلیقی اور شرعی و قانونی، پہلی قسم یعنی تکوینی و تخلیقی خیر اور شر، تو اس کا

مثال اقتدار و عزت عطا کرنا (خیر) اور اقتدار چھین لینا اور ذلت سے دوچار کرنا (شر) ہے، اور دوسری قسم یعنی تشریحی و قانونی خیر اور شر، تو اس کی مثال اطاعت و فرماں برداری (خیر) اور معصیت و نافرمانی (شر) کی تمام صورتیں ہیں۔

## مزید وضاحت!

تکوینی خیر ایک وجودی امر ہے کہ جو عطاء الہی سے وابستہ ہے یعنی اس کی فیض رسانی کا سرچشمہ ذات خداوندی ہے، اور تکوینی شر سے مراد ”خیر“ کا عطا نہ کرنا ہے، اس معنی میں تکوینی شر کی نسبت خدا کی طرف دینا غلط نہیں کیونکہ وہ ”خیر“ کا مالک ہے اس کے علاوہ کوئی اس کا مالک نہیں ہو سکتا، لہذا اگر وہ کسی کو اس سے نوازے اور کچھ ”خیر“ عطا کرے تو یہ اس کی عطا و عنایت ہے اور وہ اس پر لائق حمد و ستائش ہے اور اگر وہ کسی کو ”خیر“ عطا نہ کرے یا کسی کو اس سے محروم کر دے تو کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس پر اعتراض کرے کہ وہ اس کا حق تھا اور اسے کیوں نہیں دیا گیا یا اس سے اس کا حق کیوں چھین لیا گیا کہ ایسا کرنا ظلم ہے یعنی کسی کو اس کا حق نہ دینا یا اس کے مسلم حق سے محروم کرنا ظلم ہے جبکہ خداوند عالم کی ذات اس طرح کے اعمال سے منزہ و پاک ہے، اس کے علاوہ اس کا کسی کو کچھ عطا کرنا اور محروم کرنا دونوں ان عمومی مصلحتوں سے وابستہ ہیں جو عالم ہستی میں جاری و ساری نظام کی بہتری میں دخیل ہیں، یعنی خداوند عالم کسی کو کچھ عطا کرتا ہے تو اس میں وہ عمومی فائدہ ملحوظ و مقصود ہوتا ہے جس کا کائنات پر حاکم نظام کی بہتری میں دخل ہوتا ہے اور اگر کسی کو محروم کرتا ہے تو اس میں بھی وہی عمومی مصلحت و فائدہ ملحوظ و مقصود قرار پاتا ہے۔

اور اس کے مقابل میں تشریحی و قانونی خیر اور شر، درحقیقت انسان سے سرزد ہونے والے افعال و اعمال ہیں جو اس کے اپنے اختیار و انتخاب کی طرف منسوب ہوتے ہیں یعنی جس کا انجام دینا انسان خود اختیار کرتا ہے اور اس حوالہ سے انسان کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف ان کی نسبت ہرگز نہیں دی جاتی، اور یہی اختیاری نسبت ان افعال کے اچھا یا برا اور خوب و بد ہونے کا اصل معیار ہے کہ اگر ان کا انجام پانا انسان کے اپنے اختیار و انتخاب پر مبنی نہ ہو تو وہ اچھے یا برے نہیں کہلا سکتے اور اس حوالہ ان کی نسبت خداوند عالم کی طرف بھی نہیں دی جاسکتی سوائے اس کی طرف سے حاصل ہونے والی توفیق (اطاعت میں) اور عدم توفیق (معصیت میں) کے کہ جو ان عمومی مصلحتوں کی بناء پر ہوتی ہے جو ان دونوں (توفیق اور عدم توفیق) میں سے کسی ایک کی متقاضی ہوتی ہیں۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ تمام کی تمام خیر خداوند عالم کے ہاتھ میں ہے اور اسی پر پورے عالم ہستی کا نظم و نظام قائم ہے کہ جس میں عطا و محرومی اور خیر و شر سب پائے جاتے ہیں۔

## ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ

آیہ مبارکہ ”بِيَدِكَ الْخَيْرُ“ کی بابت بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس میں عبارت کے اختصار سے کام لیا گیا ہے ورنہ اصل میں یوں ہے: ”بِيَدِكَ الْخَيْرِ وَالشَّرِّ“ (تیرے ہی ہاتھ میں ہے خیر اور شر) اور اس کی قرآنی مثال یہ ہے، ”وَجَعَلْ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْنَكُمْ الْحَرَّ“ ..... سورۃ نحل، آیت ۸۱۔۔۔ (اور اس نے تمہارے لئے پوشاکیں بنائیں جو تمہیں گرمی سے بچاتی ہیں) اس میں بھی اختصار سے کام لیا گیا ہے ورنہ اصل میں یوں ہے ”وَجَعَلْ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ الْحَرَّ وَالْبُرْدَ“ (اس نے تمہارے لئے پوشاکیں بنائیں جو تمہیں گرمی اور سردی سے بچاتی ہیں) اس میں ”البرد“ (سردی) ذکر نہیں کیا گیا، اسی طرح زیر نظر آیہ مبارکہ میں ”الخير“ کے ساتھ ”الشّر“ ذکر نہیں کیا گیا۔

اس غلط فہمی کا ازالہ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ دراصل اس نظریہ کے قائل حضرات نے فرقہ معترکہ کے عقیدہ سے کنارہ کشی کرتے ہوئے عبارت میں حذف و اختصار کا مفروضہ پیش کر دیا کیونکہ فرقہ معترکہ کے افراد ہر طرح کے ”شّر“ کی نسبت کی خدا سے نفی کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ کسی بھی ”شّر“ کی نسبت خدا کی طرف نہیں دی جاسکتی۔ لیکن اس سلسلہ میں حذف و اختصار کے قائل حضرات کا کلام الہی کی بابت اس طرح جرات سے کام لینا نہایت تعجب آور ہے، اگرچہ فرقہ معترکہ کا ”شّر“ کے حوالہ سے مطلق نفی کا نظریہ کہ جس میں بالواسطہ استناد بھی شامل ہے، قرین صحت نہیں مگر اس کے باوجود عبارت میں حذف و اختصار کا قول بھی ہرگز درست قرار نہیں دی جاسکتا بلکہ ایسا کرنا جائز ہی نہیں، چونکہ فرقہ معترکہ کے نظریہ کی بابت تفصیلی بحث پہلے ہو چکی ہے اور حقیقت الامر کی وضاحت بھی ہو گئی ہے لہذا دوبارہ اس حوالہ سے مزید اظہار خیال ضروری نہیں۔

خدا ہر چیز پر قادر ہے

○ ” اِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ “

(بے شک تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے)

یہ فقرہ، ”بِيَدِكَ الْخَيْرُ“ (تیرے ہاتھ میں ہے خیر) کی علت و وجہ کے ذکر کے طور پر ہے کہ ہر خیر اس لئے

خدا کے ہاتھ میں ہے کہ وہ ہر شے پر قادر مطلق ہے کیونکہ ہر شے پر قادر مطلق ہونا اس بات کا متقاضی ہے کہ کوئی شخص کسی چیز پر قادر نہ ہو سوائے اس کے کہ خدا اسے اس پر قادر بنائے اور قدرت و توانائی عطا کرے، لہذا اگر کسی شخص کا کسی چیز یا کام پر قادر ہونا خدا کی طرف سے عطا کی قدرت سے منسوب و مستند نہ ہو تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ جس چیز پر قادر ہے وہ خدا کی قدرت مطلقہ کے دائرہ سے باہر ہے جبکہ ایسا ممکن نہیں کیونکہ اس سے خدا کا ہر چیز پر قادر ہونا ثابت نہ ہوگا حالانکہ آیت مبارکہ میں واضح طور پر ارشاد ہوا ہے کہ خدا ہر شے پر قادر ہے ”إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“۔ اور اس آیت کی رو سے ہر چیز خداوند عالم کی قدرت مطلقہ و کاملہ کے دائرے میں آتی ہے لہذا جس ”خیر“ کا بھی تصور کریں اس پر خدا کی علی الاطلاق قدرت ثابت و یقینی ہوگی، بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ اگر کوئی شخص کسی کو کوئی ”خیر“ عطا کرے وہ بھی خدا کی طرف منسوب ہوگی اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے اس خیر کی فیض رسائی اس شخص کے ہاتھ سے کروائی ہے تو خدا ”خیر“ کا سرچشمہ اور وہ شخص واسطہ و وسیلہ خیر کہلائے گا۔ بنا بریں تمام ”خیر“ اور ”خیر“ کی ہر قسم کی اصل و اساس، سرچشمہ و بنیاد اور محور و مرکز ذات خداوندی ہے اور بغیر کسی استثناء کے ہر خیر اور اس کی عطاء کا تعلق خدا سے ہے، اور اسی حصر اور اختصاص پر یہ فقرہ دلالت کرتا ہے: ”بیدک النخیر“ (تیرے ہاتھ میں ہے ہر خیر)..... (یا، تیرے ہی ہاتھ میں ہے ہر خیر)!

## شب و روز کا محیر العقول نظم و نظام

○ ”تَوَلَّجَ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتَوَلَّجَ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ“  
(تورات کودن میں داخل کرتا ہے اور دن کورات میں داخل کرتا ہے)

”تولج“ فعل مضارع ہے، اس کا مصدر ”ایلاج“ ہے جس کا معنی داخل کرنا ہے کہ جو ”ولوج“ سے مشتق ہے جس کا معنی داخل ہونا ہے۔ یہاں رات کودن میں اور دن کورات میں داخل کرنے سے مراد..... جیسا کہ کہا گیا ہے اور ظاہر بھی یہی ہے..... وہی ہے جس کا مشاہدہ ہم ہر روز کرتے ہیں یعنی رات اور دن کا آنا جانا، کہ جو سال بھر جاری رہتا ہے، اور جغرافیائی حوالہ سے ملکوں و شہروں میں شب و روز کی گردش اور سورج کے اتار چڑھاؤ کا جو سلسلہ قائم ہے اس کے نتیجہ میں رات اور دن کے زمانی دورانیہ میں کمی و بیشی ہوتی رہتی ہے کہ اسی کو شب کے دن میں داخل ہونے اور دن کے رات میں داخل ہونے سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ اس کی مصداقی صورت موسم سرما کے ابتدائی ایام سے موسم گرما کے ابتدائی دنوں تک اور پھر موسم کی تبدیلی کے نتیجہ میں موسم گرما کے ابتدائی ایام سے موسم سرما کے ابتدائی دنوں تک واضح طور پر سامنے آتی ہے، یعنی سردیوں کے

موسم کے ابتدائی ایام میں دن، رات میں داخل ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ گرمیوں کے موسم شروع ہونے تک جاری رہتا ہے اور پھر گرمیوں کی ابتداء میں رات دن میں داخل ہونا شروع ہوتی ہے اور یہ سلسلہ موسم خزاں کے شروع ہونے تک جاری رہتا ہے (شاید اسی وجہ سے موسم خزاں کو موسم سرما اور موسم گرما کا درمیانی زمانہ کہتے ہیں کہ اس میں موسمی اعتدال ہوتا ہے۔ م۔) یہ تبدیلیاں کرہ ارض کے شمالی علاقوں (وہ ممالک جو خط استواء پر واقع ہیں) رونما ہوتی ہیں جبکہ جنوبی ممالک میں صورتحال اس کے برعکس ہوتی ہے (وہ ممالک جو خط استواء کے نیچے واقع ہیں) یعنی جب کرہ شمالی میں دن کا دورانیہ کم ہوتا ہے تو کرہ جنوبی میں زیادہ ہوتا ہے اور جب کرہ جنوبی میں زیادہ ہوتا ہے تو کرہ شمالی میں دن کا دورانیہ کم ہوتا ہے اور یہ سلسلہ دائمی ہے دوسری جانب دورانیہ کم ہوتا ہے تو اس طرح خداوند عالم رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور یہ سلسلہ دائمی ہے اور جہاں تک خود خط استواء اور قطب شمالی و قطب جنوبی میں رات اور دن کے دورانیہ کا تعلق ہے (چھ ماہ رات اور چھ ماہ دن ہوتا ہے) تو وہ ہمیں ایسا دکھائی دیتا ہے ورنہ حقیقت میں تبدیلی کا عمومی نظام دائمی ہے اور ان علاقوں میں بھی جاری و ساری ہوتا ہے۔

## زندگی اور موت کا نظم و نظام

○ ” وَنُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَنُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ “  
(اور تو مردہ سے زندہ کو اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے)

یہاں مردہ سے زندہ کو نکالنے اور زندہ کو مردہ سے نکالنے سے مراد مومن کو کافر کی صلب سے اور کافر کو مومن کی صلب سے نکالنا ہے کیونکہ خداوند عالم نے ایمان کو زندگی اور روشنی سے موسوم کیا ہے اور کفر کو موت اور تاریکی کا نام دیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا :

سورہ النعام، آیت ۲۲:

○ ” أَوْ مَنْ كَانَ مَيِّتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا أَيْسَرُ بِهِ فِي النَّاسِ كَسَنَ مَثَلَهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا “

(آبادہ شخص کہ جو مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لئے روشنی قرار دی جس کے ذریعے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے وہ اس شخص جیسا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہے کہ ان سے باہر آنے والا نہیں؟)

اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد صرف ایمان و کفر نہ ہو بلکہ اس سے وسیع معنی مراد ہو کہ جس میں ان دونوں (ایمان و کفر) سمیت نباتات کا احیاء اور شعور و احساس سے محروم زمین سے حیوانات کا احیاء بلکہ خود مردہ زمین کا احیاء (زندہ کرنا) اور اسے دوبارہ زندگی عطا کرنا بھی شامل ہے کیونکہ کلام الہی میں ایک طرح سے صراحت پائی جاتی ہے کہ خداوند عالم مردہ کو زندہ اور زندہ کو مردہ بنا دیتا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۃ مؤمنون، آیت: ۱۵

○ ”ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۖ فَتَلَبَّوْا لِلَّهِ أَحْسَنَ الْخُلُقَيْنِ ۖ ﴿١٥﴾ ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعُدُّوْا لَكُمْ لَكَيْبَتُونَ“

(پھر ہم نے اسے نئی مخلوق بنا دیا، کہ اللہ بہتر خلق کرنے والا ہے پھر اس کے بعد تم مر جاؤ گے)

اس موضوع سے مربوط دیگر آیات مبارکہ سے بھی مذکورہ مطالب سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

## ایک نظریہ کی وضاحت

یہاں علم الطبیعہ کے ایک ماہر کے نظریہ کی وضاحت ضروری ہے، انہوں نے کہا ہے کہ یہ سلسلہ حیات کہ جس کی منہا اس کے اپنے جڑوے ہیں اس کا نظام کچھ اس طرح ہے کہ ایک زندہ جڑوہ اپنے جیسے دوسرے زندہ جڑوہ میں منتقل ہوتا رہتا ہے جس سے زندگی کا تسلسل قائم ہو جاتا ہے اور ان جڑوہوں کے حیاتی نقل و انتقال کے جاری سلسلہ کا منہا کوئی ایسا مادہ نہیں ہوتا جو شعور سے محروم ہو، یعنی ہر زندہ جڑوہ کی انتہاء اور آخری نقطہ ایک زندہ جڑوہ ہی ہوتا ہے کیونکہ مردہ جڑوہ اور شعور سے محروم مادہ سے کسی زندہ جڑوہ کا جنم لینا درست قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اس ماہر علم الطبیعہ کا مذکورہ بالا نظریہ دراصل دنیا میں کسی بھی ”حادث“ اور نوپیدا کے وجود کے انکار پر مبنی ہے جبکہ ان کا یہ خیال صحیح نہیں کیونکہ مشاہدہ و تجربہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حیاتی جڑوہ پر موت واقع ہوتی ہے کہ جس سے حیات کے موت میں تبدیل ہو جانے کی ناقابل انکار حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور پھر ان دونوں یعنی زندگی اور موت کے درمیان ربط و تعلق کے مضبوط سلسلہ سے آگاہی کا حصول بھی یقینی ہو جاتا ہے اور یہ مسئلہ ہر طرح کے شبہ سے بالاتر ہو جاتا ہے کہ جڑوہوں کے درمیان جاری و قائم سلسلہ حیات و موت ایک دوسرے مربوط و وابستہ ہے۔ بہر حال یہ ایک عمیق موضوع ہے اس کی وضاحت کسی موزوں مقام پر کی جائے گی۔



## خداوند عالم کا اپنے حقیقی مالکانہ حق کا استعمال

زیر نظر آیت مبارکہ ”تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ“ خداوند عالم کی طرف سے اپنے حقیقی مالکانہ حقوق کے استعمال کی نشاندہی کرتی ہے اور اس امر کا واضح ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سرچشمہ فیض وجود اور مرکز تخلیق و تکوین ہونے کے ناطے اپنی مخلوق و مملوک اشیاء میں تصرف کرتا ہے اور خالق و مالک حقیقی ہونے کے حوالہ سے اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس طرح طرح چاہے ان کے بارے میں فیصلہ کرے اور ان کی بابت نظم و نظام قائم کرے جبکہ سابقہ آیت ”تُوْفِيَ الْمَلِكُ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمَلِكَ مَنْ تَشَاءُ“ خداوند عالم کے اس مالکانہ حق کے استعمال کی نشاندہی کرتی ہے جو اسے طے کردہ حاکمیت سے حاصل ہے۔

اگر مذکورہ بالا دو آیتوں کے معانی پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک میں چار طرح کے تصرف کا تقابلی تذکرہ ہوا ہے، چنانچہ پہلی آیت میں حکومت و اقتدار کا عطا کرنا اور چھین لینا مذکور ہے (تُوْفِيَ الْمَلِكُ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمَلِكَ مَنْ تَشَاءُ) اور اس کے مقابل میں دوسری آیت میں رات کا دن میں داخل کرنا اور دن کا رات میں داخل کرنا مذکور ہے (تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ) اسی طرح پہلی آیت میں عزت عطا کرنا اور ذلت سے دوچار کرنا مذکور ہے (تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ) جبکہ دوسری آیت میں مردہ سے زندہ کا نکالنا اور زندہ سے مردہ کا نکالنا مذکور ہے (تُحْيِي الْمَيِّتَ وَتُحْيِي الْمَيِّتَ مِنَ النَّحْيِ) تو یہ سب نہایت دلچسپ اور لطیف مناسبت کے حامل امور ہیں کہ جن کے لئے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں کیونکہ اقتدار کا عطا کرنا درحقیقت بعض افراد کو دوسروں پر حاکم بنانا اور ان کے امور ان کے ہاتھوں میں دینا ہے (مسلط کرنا) کہ حاکم بنائے جانے والے افراد کے مقابلے میں دوسروں یعنی محکوم بنائے جانے والوں کی انسانی و معاشرتی اور طبعی و فطری آزادی کو محدود بلکہ سرے سے ختم کر دیا جاتا ہے، یعنی ان کا وجودی مسلم الثبوت حق آزادی ان سے لے لیا جاتا ہے اور یہ اسی طرح ہے جیسے رات کا دن پر مسلط کر دینا ہے کہ رات، دن کے مسلم الثبوت حصہ میں سے کچھ لے جاتی ہے اور نتیجتاً وہ چیزیں کہ جن پر دن اپنی روشنی ڈالتا تھا اور انہیں ظاہر کرتا تھا وہ ان کی روشنی سے محروم ہو کر پوشیدہ ہو جاتی ہیں، اور اقتدار کا واپس لے لینا اس کے برعکس صورت کا حامل ہے۔ اسی طرح عزت عطا کرنا ایک طرح سے اسے زندہ کرنا ہے کیونکہ جو شخص عزت سے محروم ہو وہ مردہ سے زیادہ کچھ نہیں کہ نہ تو کوئی اس کا نام لیتا ہے اور نہ ہی اس کے وجودی آثار دکھائی دیتے ہیں لیکن جوں ہی اسے عزت حاصل ہوتی ہے تو وہ شہرت پالیتا ہے اور ہر زبان پر اس کا تذکرہ ہوتا ہے اور اس کے وجودی آثار نمایاں سے نمایاں تر ہو جاتے ہیں۔ یہی صورت حال مردہ سے زندہ کو نکالنے کی ہے اور اس کے برعکس کسی کو ذلت سے دوچار کر دینا ہے، تو گویا عزت میں ایک طرح کی زندگی اور ذلت میں ایک طرح کی

موت ہے۔

## آیت کے معنی کا ایک اور پہلو

زیر نظر آیت مبارکہ کے معنی کی بابت ایک اور پہلو قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ خداوند عالم نے اپنے مقدس کلام میں دن کو روشن کرنے والا اور رات کو محو کرنے والی قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورۃ اسراء، آیت: ۱۲

○ ”فَمَحَوْنَا آيَةَ اللَّيْلِ وَجَعَلْنَا آيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً“

(ہم نے رات کی نشانی کو محو کر دیا اور دن کی نشانی کو روشن کرنے والا بنا دیا)

اس آیت کے تناظر میں روشن کرنے اور محو کرنے کا مظہر انسانی معاشرہ میں کسی کو حکومت و اقتدار سے نوازنا اور اس سے محروم کرنا ہے، (اقتدار عطا کرنا گویا روشن کرنا اور اقتدار سے محروم کرنا گویا محو کر دینا ہے)۔

اسی طرح خداوند عالم نے زندگی کو علم و قدرت کے اظہار کا سرچشمہ اور موت کو جہل و عجز کا سبب قرار دیا ہے چنانچہ

ارشاد ہوا:

سورۃ نحل، آیت: ۲۱

○ ”أَمْوَاتٌ غَيْرٌ أَحْيَاءَ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ“

(وہ مردہ ہیں زندہ نہیں ہیں اور وہ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے)

اسی طرح خداوند عالم نے عزت کو خود اپنے لئے اور اپنے رسول اور مومنین کے لئے مخصوص قرار دیا ہے، چنانچہ

ارشاد ہوا:

سورۃ منافقون، آیت: ۸

○ ”وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ“

(اور اللہ کے لئے ہے عزت اور اس کے رسول اور مومنین کے لئے ہے)

اس بناء پر عزت اور ذلت ہی انسانی معاشرہ میں زندگی اور موت کا مظہر قرار پاتے ہیں، (جسے عزت حاصل ہو گویا وہ زندہ ہے اور جو ذلت سے دوچار ہو گویا وہ مردہ ہے) یہی وجہ ہے کہ پہلی آیت میں اقتدار عطا کرنے، اقتدار سے محروم کرنے، عزت دینے اور ذلت سے دوچار کرنے کے مقابلے میں دوسری آیت میں رات کو دن میں داخل کرنے، دن کو رات

میں داخل کرنے، مردہ سے زندہ کو نکالنے اور زندہ سے مردہ کو نکالنے کا تذکرہ ہوا ہے، جس سے ان کے تقابلی معانی و موارد واضح ہو جاتے ہیں اور تطبیقی مثالیں بھی سامنے آ جاتی ہیں۔

ان دو آیتوں میں ایک اور حوالہ سے تقابلی صورت بھی سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ دوسری آیت میں ارشاد ہوا: ”وَتَزُوقُ مَن تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ“ (اور تو جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق دیتا ہے) جبکہ پہلی آیت میں ارشاد ہوا: ”بِيَدِكَ الْخَيْرُ“ (تیرے ہی ہاتھ میں ہے خیر)، اس سلسلہ میں عنقریب وضاحت کی جائے گی۔

### بغیر حساب رزق کا عطا کرنا

○ ”وَتَزُوقُ مَن تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ“  
(اور تو جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے عطا کرتا ہے)

سطور بالا میں دو آیتوں کے درمیان پائی جانے والی تقابلی صورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس امر کی نشاندہی ہوئی ہے کہ فقرہ ”وَتَزُوقُ مَن تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ“ دراصل سابقہ ذکر شدہ مطالب یعنی اقتدار عطا کرنا، عزت دینا اور رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرنا وغیرہ کی وضاحت کے طور پر ہے۔ لہذا یہاں عطف (کہ جو واو عاطفہ کے ساتھ ہوا ہے) عطف تفسیر قرار پائے گا یعنی اس فقرہ کے ذریعے سابقہ مطالب کی تفسیر و توضیح ہوئی ہے، اس طرح یہ فقرہ ایک خاص حکم کو اس سے عام و وسیع حکم کے ذریعے بیان کرنے کی ایک صورت قرار پائے گا۔ اور یہ اسی طرح ہوگا جیسے فقرہ ”بِيَدِكَ الْخَيْرُ“ اپنے ما قبل جملوں میں مذکور مطالب کے لئے تھا۔

بہر حال اس جملہ ”وَتَزُوقُ مَن تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ“ کا معنی یہ ہوگا کہ تو ہی ہے اپنی مخلوق کے بارے میں ان تمام تصرفات کا حقیقی حقدار اور ان کے بارے میں ہر طرح کا فیصلہ کرنے والا، کیونکہ تو ہی ہے کہ جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق عطا کرتا ہے۔

### رزق کا قرآنی معنی

”رزق“ کا معنی واضح و مشہور ہے اور اس کے استعمالی موارد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنی میں ایک طرح کی

بخشش و عطاء کا حوالہ بھی پایا جاتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے کہ بادشاہ اپنی فوج کو رزق دیتا ہے، اور یہ بات اس وقت کی جاتی ہے جب بادشاہ اپنی فوج کے لئے کھانے پینے کی اشیاء کی فراہمی کا بندوبست کرے، تو اس میں صرف غذائی اشیاء ہی مقصود ہوتی ہیں ان کے علاوہ کچھ نہیں، جیسا کہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہ بقرہ، آیت ۲۳۳:

○ ” وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ”

(اور جس کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے (والد) اس پر اپنی بیویوں کا موزوں و مناسب صورت میں رزق (کھانا پینا) اور لباس فراہم کرنا ضروری ہے)

اس آیت میں لباس کو ”رزق“ میں شامل قرار نہیں دیا گیا..... بلکہ علیحدہ ذکر کیا گیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ رزق سے مراد صرف کھانے پینے کی اشیاء ہیں.....

پھر ”رزق“ کے معنی میں وسعت ہوئی اور ہر اس غذا پر اس کا اطلاق ہوا جو انسان کو اس کے مقدر و حصہ کے مطابق اور کوشش کے ساتھ حاصل ہو خواہ اس کا عطا کرنے والا معلوم ہو یا معلوم نہ ہو، اور پھر اس کے معنی میں عمومیت و وسعت دی گئی اور حاصل ہونے والے ہر نفع و فائدہ کو ”رزق“ سے موسوم کیا گیا ہے خواہ وہ غذائی اشیاء نہ بھی ہوں مثلاً زندگی کی آسائشوں کے تمام اسباب یعنی مال و دولت، جاہ و عزت، خاندان و ساتھی، حسن و جمال اور علم و دانش وغیرہ..... کہ ان میں سے ہر ایک زندگی کی آسائش و آسودگی کا سبب بنتا ہے..... اس حوالہ سے قرآن مجید میں ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہ مؤمنون، آیت ۷۲:

○ ” تَسْكُنُهُمُ فِئَ الْجَنَّةِ جَنَّاتٌ مِّنْ دُونِ أُخْرَىٰ لَّهُمْ فِيهَا مَنَاقِبُ مَّا نَكْتُمُ لَكَ رَبِّكَ خَيْرٌ ۗ وَهُوَ خَيْرٌ لِّلرَّزِقِينَ ”

(کیا تم ان سے خرچہ مانگتے ہو، تیرے رب کا عطا کردہ رزق بہتر ہے کہ وہ بہتر رزق دینے والا ہے)

اسی طرح حضرت شعیب کا قول ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا کہ انہوں نے کہا:

سورہ ہود، آیت ۸۸:

○ ” يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِن كُنتُمْ عَلَىٰ بَيْتِنَا مِّنْ شَيْءٍ مِّنْ شَيْءٍ مِّنْ رَبِّنَا لَرِزْقِنَا مِنهُ رِزْقًا حَسَنًا ”

(اے میری قوم! تم نے دیکھا ہے کہ میں اپنے رب کی طرف سے مضبوط دلیل رکھتا ہوں اور اس نے مجھے

بہترین رزق عطا کیا ہے)

اس آیت میں ”رزق“ سے مراد نبوت اور علم ہے، اس کے علاوہ دیگر آیات میں بھی موجود ہیں جن میں اسی طرح

کے معانی مقصود ہیں۔

اور جہاں تک درج ذیل آیت مبارکہ کا تعلق ہے:

سورۃ ذاریات، آیت ۵۸:

○ ” إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ “

(بے شک اللہ ہی رزق دینے والا ہے جو زبردست طاقت والا ہے)

تو اس میں اگرچہ رزق عطا کرنے کو خدا سے مختص و مخصوص قرار دیا گیا ہے کہ یہ مقام، مقام حصر ہے یعنی یہ مقام ہی اس بات کا متقاضی تھا کہ یہاں انہی الفاظ میں رزق عطا کرنا ذکر کیا جائے، لیکن اس سے درج ذیل چند اہم نکات معلوم ہوتے ہیں:

(۱) حقیقی معنی میں ”رزق“ کی نسبت صرف خداوند عالم کی طرف ہوتی ہے اور جہاں بھی اسے خدا کے علاوہ کسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو وہ خدائی عمل کو غیر خدا سے منسوب کرنے کے طور پر ہوتا ہے کہ جس کا سرچشمہ ذات پروردگار کی عطا و اذن ہے، چنانچہ اس کی ایک مصداقی مثال درج ذیل آیت مبارکہ میں پائی جاتی ہے:

سورۃ جمعہ، آیت ۱۱:

○ ” وَاللَّهُ خَيْرُ الرَّزَّاقِينَ “

(اور اللہ بہتر رزق عطا کرنے والا ہے)

اس آیت میں رزق دینے والے دیگر افراد کا ثبوت ملتا ہے اور خداوند عالم کو ان سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔

اور سورۃ نساء، آیت ۵ میں اس طرح ارشاد ہوا:

○ ” وَإِن رزقوہم فیہا واکسوہم “

(اور انہیں رزق دو اور لباس دو)

”رزق“ کی طرح اقتدار اور عزت جو کہ ذات الہی سے مختص و مخصوص ہے اور اس کی ”ذاتی“ ہے وہ اس کے علاوہ دوسروں کے لئے اس کی عطا و اذن سے ہوتی ہے کہ غیر اللہ کی عزت اور اقتدار خدا کے اذن و عطا کا مرہون منت اور اس سے وابستہ ہوتا ہے، بنا براین حقیقت میں وہی رازق ہے نہ کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا،

(۲) مخلوق اپنے وجود میں جس چیز سے بہرہ ور ہوتی ہے وہ ان کا رزق ہے اور خدا وہ رزق عطا کرنے والا ہے

چنانچہ اس مطلب کا ثبوت رزق کے ذکر و بیان پر مشتمل کثیر آیات کے ساتھ دیگر کثیر آیات میں بھی پایا جاتا ہے مثلاً وہ آیات جن سے اس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے کہ خلق، امر، اقتدار، مالکیت، مشیت، تدبیر اور خیر خالصتاً خدائے عزوجل سے مختص و مخصوص ہے۔

(۳) انسان جس حرام سے بہرہ ور ہوتا ہے وہ معصیت کا سبب ہونے کی وجہ سے خدا کی طرف منسوب نہیں ہوتا کیونکہ خداوند عالم نے ہر طرح کے فعل حرام اور معصیت و گناہ کی نسبت کی اپنی ذات سے نفی کی ہے کہ وہ ہرگز برے کام کو روا قرار نہیں دیتا چنانچہ اس کا ارشاد گرامی ہے:

سورہ اعراف، آیت: ۲۸

○ ” قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۗ اتَّقُوا اللَّهَ مَا لَا تَعْلَمُونَ “

(کہہ دیجئے کہ اللہ برے کام کا حکم نہیں دیتا، کیا تم خدا کے بارے میں وہ کچھ کہتے ہو جس کا تمہیں علم ہی نہیں)

سورہ نحل، آیت: ۹۰

○ ” إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ ..... وَيَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ “

(بے شک، اللہ عدل اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے..... اور برائی اور بدی سے روکتا ہے)

تو یہ بات ذات احدیت سے ہرگز ممکن نہیں بلکہ وہ اس سے پاک و بالاتر ہے کہ وہ کسی کام سے روکے اور پھر اسی کا حکم دے یا کسی کو کسی کام سے روکے اور پھر اس کے رزق و روزی کو اسی میں منحصر کر دے۔

### تکوین و تشریح کے حوالوں سے !

اس مقام پر ایک اہم نکتہ کی وضاحت خالی از فائدہ نہ ہوگی کہ عین ممکن ہے کوئی چیز عالم تکوین میں ”رزق“ کا مصداق ہو جبکہ عالم تشریح میں ”رزق“ نہ ہو یعنی اسے حرام قرار دیا گیا ہو اور حرام قرار دیئے جانے کی بناء پر ”رزق“ کا مصداق نہ بنے، ان دو مطالب کے درمیان منافات یعنی ایک دوسرے کی نفی کا پہلو نہیں پایا جاتا کیونکہ عالم تکوین میں کوئی حکم ہی نہیں ہوتا کہ جس کی بناء پر کوئی چیز یا کام برقرار پائے،..... لہذا کسی چیز کی تخلیق اور اس کے بارے میں حکم صادر کرنے میں تضاد نہیں پایا جاتا اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جب فلاں چیز حرام ہے تو اسے خلق ہی کیوں کیا گیا ہے کیونکہ تکوین و تخلیق کا عالم کچھ اور ہے اور تشریح کا عالم کچھ اور!.....، اور قرآن مجید میں رزق کی بابت جو عمومیت و وسعت مذکور ہے اور رزق و عطائے رزق کی نسبت خدا کی طرف علی الاطلاق دی گئی ہے تو اس کا تعلق عالم تکوین سے ہے اور جہاں کسی رزق سے منع کیا گیا ہے تو اس کا تعلق عالم تشریح سے ہے۔

## قرآنی معارف سے غلط فہمی کیوں؟

ممکن ہے کوئی شخص سوال کرے کہ آیا بہتر نہیں کہ جو معارف عامتہ الناس کے ذہنوں میں غلط فہمی کا سبب بنتے ہیں ان کے ذکر و بیان سے پرہیز کیا جاتا اور قرآن مجید میں ان کا تذکرہ ہی نہ ہوتا تاکہ کوئی شخص ان سے غلط معنی مراد نہ لے سکتا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ کلام الہی صرف عوام الناس اور سادہ لوح افراد کے لئے نازل نہیں ہوا کہ ان کی وجہ سے حقیقی معارف کو بیان کرنے سے گریز و احتراز کیا جائے بلکہ قرآن مجید میں تمام دلوں کے لئے شفاء ہے اور اس مقدس کلام الہی سے صرف وہی لوگ نقصان اٹھاتے ہیں جو حق کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہوں اور حقیقت کی روشنی سے محروم ہوں، چنانچہ اس سلسلہ میں خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے:

سورہ اسراء، آیت: ۸۲

○ ” وَنَزَّلْنَا مِنَ الْقُرْآنِ مَاهُو شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَذُرُ الظَّالِمِينَ إِلَّا حَسْرًا “

(اور ہم قرآن سے جو کچھ بھی نازل کرتے ہیں وہ مؤمنین کے لئے شفاء اور رحمت ہے اور ظالموں کو زیادہ سے زیادہ خسارہ و نقصان کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوگا)۔

اس کے علاوہ قرآن مجید کی آیات مبارکہ میں واضح طور پر دکھائی دیتا ہے کہ ان میں نمرود و فرعون جیسوں کو حکمرانی و اقتدار عطا کئے جانے اور قارون جیسوں کو مال و دولت کے وسیع خزانے و خزینے عطا کئے جانے کی نسبت خداوند عالم کی طرف دی گئی ہے کہ یہ سب کچھ اسی نے انہیں دیا ہے، تو اس نسبت کی اصل بنیاد اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ سب کچھ خدا کے اذن سے ہے اور اس نے انہیں یہ نعمتیں ان کی آزمائش و امتحان کی غرض سے اور ان پر اپنی حجت تمام کرنے کے لئے دیں کہ ان نعمتوں کی بے قدری کی صورت میں انہیں ذلت و رسوائی اور خواری و بیچارگی سے دوچار کرنے کا جواز پیدا ہو سکے، تو یہ تمام نسبتیں تشریحی حیثیت میں ہیں اور جب تشریحی نسبتیں صحیح ہوں اور ان سے کوئی قباحت لازم نہ آتی ہو تو تکوینی نسبتوں کا صحیح ہونا بطریق اولیٰ واضح ہے کیونکہ ان میں عقلی حسن و قبح کی گنجائش ہی نہیں پائی جاتی۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ہر چیز اس کی مخلوق اور پیدا کی ہوئی اور اس کے خزانہ ہائے رحمت میں سے نازل کی ہوئی ہے چنانچہ درج ذیل آیت میں اس سلسلہ میں واضح بیان مذکور ہے:

سورہ حجر، آیت: ۲۱

○ ”وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنزِّلُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَعْلُومٍ ۝“

(کوئی چیز ایسی نہیں مگر اس کے خزانے ہمارے پاس ہیں (ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس ہیں) اور ہم اسے نازل نہیں کرتے مگر معلوم اندازہ کے ساتھ!)

اور خداوند عالم نے یہ بھی ذکر فرمایا کہ جو کچھ بھی اس کے پاس ہے وہ ”خیر“ ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورہ قصص، آیت: ۶۰

○ ”وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ“

(اور جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ ”خیر“ ہے)

ان دو آیتوں اور ان کے ہم معنی دیگر آیات مبارکہ کو ایک دوسرے سے ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ موجودات عالم میں سے جو چیز بھی جو کچھ حاصل کرتی ہے اور اپنے وجود و ہستی کے حوالہ سے جس شے سے بھی بہرہ ور ہوتی ہے اس کا سرچشمہ ذات خداوندی ہے اور وہ اس کے لئے ”خیر“ ہوتی ہے کہ وہ اس سے استفادہ کرے، لطف اندوز ہو اور اس سے اپنی ضرورتوں کو پورا کرے چنانچہ درج ذیل دو آیتوں کو باہم ملا کر دیکھیں تو یہ مطلب واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے:

سورہ الم بقرہ، آیت: ۷

○ ”الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ“

(وہ کہ جس نے ہر چیز کی تخلیق نہایت خوبصورت بنائی) **حیدرآباد سنہ ۱۳۸۰ھ**

سورہ مؤمن، آیت: ۶۲

○ ”ذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۗ مَلَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ“

(وہ خدا ہے تمہارا پروردگار، جو ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں)

بعض اشیاء مضر کیوں؟

اس مقام پر ایک سوال ممکن ہے اور وہ یہ کہ جب ہر شے خدا کی مخلوق اور اس کی عطا کردہ ہے تو جو چیزیں بعض لوگوں کے لئے مضر ثابت ہوتی ہیں ان کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ خداوند عالم کی عطا کردہ ہر شے ”خیر“ اور سراپا خیر ہے اور جہاں تک کسی چیز کے برا اور ”شر“



ہونے کا تعلق ہے تو اس کا ضرر رساں و نقصان دہ ہونا اسی شخص سے مخصوص ہوتا ہے جسے وہ لاحق ہوتی ہے ہر شخص کے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے وہ اپنی اصل یعنی ”خیر“ اور مفید ہونے کی صفت و حالت کی حامل ہوتی ہے اور وہ عالم ہستی میں جاری و ساری نظام میں اپنے وجود میں آنے کے علل و اسباب کے حوالہ سے ”خیر“ کا مصداق ہوتی ہے، چنانچہ اس مطلب کی طرف درج ذیل آیت مبارکہ میں ارشاد ہوا ہے:

سورہ نساء، آیت: ۷۹

○ ”وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَبِيَةٍ قَبْلَ نَفْسِكَ“

(اور تمہیں جو تکلیف پہنچے وہ تمہاری اپنی طرف سے ہوتی ہے)

اس موضوع کی بابت پہلے پہلی بحث ہو چکی ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ خداوند عالم جو کچھ بھی اپنی مخلوق کو عطا کرتا ہے وہ ”خیر“ اور فوائد کا سرچشمہ ہے اور وہ ”رزق“ کا واضح مصداق ہے کہ جس پر ”رزق“ دروزی ہونے کا معنی پوری طرح صادق آتا ہے کیونکہ ”رزق“ اس عطا و عطیہ کا نام ہے جو اس چیز کے لئے نفع بخش و فائدہ مند ہو جسے عطا کیا گیا ہو، عین ممکن ہے درج ذیل آیت مبارکہ کا اشارہ بھی اسی مطلب کی طرف ہو:

سورہ طہ، آیت: ۱۳۱

○ ”وَمَا رَزَقْنِي رَبِّي خَيْرًا“

(اور تیرے رب کا رزق خیر ہے)

مذکورہ بالا مطالب سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآنی بیانات کی روشنی میں رزق، اور خلق سب مساوی امور ہیں، بنا بریں ہر رزق خیر اور مخلوق ہے اور ہر مخلوق رزق اور خیر ہے، ان میں فرق اس حوالہ سے ہے کہ رزق، مرزوق (جسے رزق دیا جائے) چاہتا ہے جو رزق سے استفادہ کرے..... مرزوق کے تصور کے بغیر رزق کا تصور ہی بے معنی ہے.....، چنانچہ غذا، قوت، غازیہ (وہ بدلتی قوت جو غذا چاہتی ہے اور اس کا تعلق غذا سے ہوتا ہے) کے لئے رزق ہے کیونکہ وہ قوت اس کی محتاج ہوتی ہے، اور قوت غازیہ انسان کے لئے رزق ہے کیونکہ وہ اس کا محتاج ہے، اور انسان اپنے والدین کے لئے رزق ہے کیونکہ انہیں اس کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح انسان کا وجود اس کے لئے خیر ہے کیونکہ ایسی مخلوق بھی قابل تصور ہے جو اس نعمت خداوندی سے محروم ہے چنانچہ ارشاد الہی ہے:

سبیل یکینہ پاکستان  
بیدراہادہ سندھ، پاکستان

سورۃ طہ، آیت: ۵۰

○ ”الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ حَلْقَهُ“

(اور وہ کہ جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت (وجود و ہستی) عطا کی)

یہ تو ہے رزق اور خلق و خیر کے فرق کی بات، اور جہاں تک ”خیر“ کا تعلق ہے تو اس کے لئے بھی کسی ایسے کا تصور ضروری ہے جو اس کا محتاج (یعنی اسے اس کی ضرورت ہو) اور اس کا طلبگار ہو کہ جو کچھ اس کے سامنے آئے وہ اس میں سے اسے اختیار کرے جس کا وہ طلبگار ہو مثلاً غذا، قوت، غازیہ کے لئے خیر ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جو قوت غازیہ کو اس کا محتاج و طلبگار تصور کریں کہ وہ خود غذاؤں میں سے کسی غذا کا انتخاب کرتی ہے اور اسے اپنے لئے پسند کرتی ہے، اور قوت غازیہ انسان کے لئے خیر ہے اور انسان کا وجود اس کے لئے یوں خیر ہے کہ اسے اس کی احتیاج اور طلب ہو، (گویا وہ ایک دوسرے کے محتاج و ضرورت مند اور طلبگار ہونے کی بناء پر ایک دوسرے کے لئے خیر کہلاتے ہیں)۔

اور اب خلق و ایجاد کی بات، تو اس کے لئے کسی حقیقی یا فرضی چیز کی ضرورت نہیں جس سے اس کا معنی متحقق پذیر ہو چنانچہ غذا، جو کہ ایک مخلوق ہے وہ اپنے طور پر وجود رکھتی ہے..... خواہ اسے کھانے والا ہو یا نہ ہو..... اسی طرح قوت غازیہ مخلوق ہے اور انسان مخلوق ہے۔

اور چونکہ ہر رزق کا سرچشمہ فیض خدا ہے اور ہر خیر خالصتاً اللہ کے لئے ہے لہذا وہ جو کچھ عطا کرے اور جس خیر اور رزق سے نوازے وہ اس کا بلا عوض عطیہ ہے کہ وہ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں لیتا اور نہ ہی اس کے عوض میں کوئی چیز قرار پا سکتی ہے کیونکہ ہم جس چیز کا بھی فرض و تصور کریں وہ حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ کے لئے ہے یعنی اسکے عطیہ کے عوض کے طور پر جو چیز بھی فرض کریں وہ بھی اس کے عطیہ ہی کی طرح اس کا مال ہے اور حقیقی معنی میں اس کی ہے، مخلوق کا اس پر کوئی حق بنتا ہی نہیں ہے سوائے اس حق کے کہ جسے اس نے خود اپنی مخلوق کے لئے اپنے اوپر قرار دیا ہے جیسا کہ اس نے رزق عطا کرنے کی بابت قرار دیا ہے چنانچہ اس کا ارشاد ہے:

سورۃ ہود، آیت: ۶

○ ”وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا“

(اور زمین میں کوئی جاندار نہیں مگر یہ کہ اللہ پر ہے اس کا رزق و روزی!)

سورۃ ذاریات، آیت: ۲۳

○ ”فَوَسَّاتِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنْطِقُونَ“

(آسمان و زمین کے رب کی قسم کہ وہ (وعدہ رزق) اسی طرح حق ہے جس طرح تمہارا بات کرنا!)

بنا بر اس رزق جو کہ اللہ پر ایک ثابت و مسلم حق ہے چونکہ اس نے یہ حق خود اپنے اوپر ثابت و لازم قرار دیا ہے اس کا بندوں پر عطیہ ہے کہ جو مردوق (جسے رزق دیا گیا ہے) کی طرف سے خدا پر حق کی صورت میں نہیں بلکہ خود اللہ کی طرف سے اپنے اوپر قرار دیئے جانے والا حق ہے۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو شخص حرام رزق کھاتا ہے وہ اپنے حلال رزق کے حصہ سے کھاتا ہے کہ جو خدا نے اسے عطا کیا ہے کیونکہ یہ بات ذات اقدس خداوند عالم کے شایان شان نہیں بلکہ وہ اس سے کہیں بالاتر اور ماوراء ہے کہ کسی انسان کا رزق و روزی اپنے اوپر ایک ثابت و مسلم حق قرار دے پھر اسے حرام طریقہ سے رزق عطا کرے اور پھر اسے اس رزق میں تصرف کرنے اور اسے کام میں لانے سے منع کر کے اس پر اس کا مواخذہ کرے اور سزا دے۔

### مزید وضاحت

رزق، خلق اور خیر کے مساوی امور ہونے کی بابت مزید وضاحت یہ ہے کہ: رزق چونکہ خیر کے ساتھ عطیہ الہی ہے لہذا اس حوالہ سے وہ خلق پر خدا کی رحمت ہے اور جس طرح رحمت کی دو قسمیں ہیں: (۱) رحمت عام (۲) رحمت خاص، عام رحمت جو کہ تمام مخلوق کو حاصل ہوتی ہے خواہ وہ مؤمن ہو یا کافر، متقی ہو یا فاجر و بدکار اور انسان ہو یا غیر انسان، سب اس رحمت کے سایے میں آتے ہیں، اور خاص رحمت جو کہ سعادت کی راہ میں آتی ہے جیسے ایمان، تقویٰ، بہشت، تو رحمت کی ان دو قسموں کی طرح رزق کی بھی دو قسمیں ہیں: عام رزق اور خاص رزق: عام رزق وہ عطیہ الہی ہے جو ہر وجود رکھنے والی چیز کو حاصل ہوتا ہے کہ اس کی بقائے وجود و ہستی میں مددگار ثابت ہوتا ہے اور خاص رزق وہ ہے جو بذریعہ حلال حاصل ہوتا ہے، اور جس طرح عام رحمت اور عام رزق لوح تقدیر میں لکھا جا چکا ہے کہ جس کی بابت ارشاد الہی ہے:

سورۃ فرقان، آیت: ۲

”وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدْ رَاهُ تَقْدِيرًا“

(اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کا اندازہ و تقدیر مقرر کر دی)

اسی طرح خاص رحمت اور خاص رزق بھی لوح تقدیر میں لکھے جا چکے ہیں، اور اسی طرح خاص رحمت اور خاص رزق کی دوسری صورت ہے یعنی ہدایت جو کہ خاص رحمت ہے وہ لوح تقدیر میں لکھی ہوئی ہے اور تشریحی طور پر ہر انسان کے لیے خواہ وہ مؤمن ہو یا کافر ہو مقدر و مقرر ہو چکی ہے چنانچہ اسی مقصد کے لئے خداوند عالم نے پیغمبروں کو بھیجا اور کتابیں نازل کیں، اس حوالہ سے ارشاد خداوندی ہے:

سورۃ ذاریات، آیت: ۵۸:

○ ” وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعَمُوا ۝ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ۝“

(اور میں نے جنوں اور انسانوں کو، مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں، میں ان سے کوئی روزی نہیں چاہتا اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھانا کھلائیں، بے شک اللہ ہی ہے جو رزق دینے والا ہے اور وہ ٹھوس طاقت کا مالک ہے)

سورۃ اسراء، آیت: ۲۳:

○ ” وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدَ إِلَّا إِلَٰهًا“

(اور تیرے رب نے فیصلہ..... وحکم..... کیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو) تو عبادت جو کہ ہدایت چاہتی ہے اور ہدایت ہی پر موقوف ہے وہ تشریحی طور پر مقرر و مقرر کی جا چکی ہے، اسی طرح خاص رزق جو کہ راہِ حلال سے حاصل ہو وہ بھی مقرر و مقرر ہو چکا ہے چنانچہ ارشادِ حق تعالیٰ ہے:

سورۃ انعام، آیت: ۱۳۰:

○ ” قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَحَزَمُوا مَا رَزَقَهُمُ اللَّهُ افْتِرَاءً عَلَى اللَّهِ ۖ قَدْ ضَلُّوا وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ“

(یقیناً نقصان اٹھایا ان لوگوں نے جنہوں نے بے وقوفی و جہالت کی بناء پر اپنی اولاد کو قتل کیا اور خدا پر بہتان و تہمت لگاتے ہوئے اس رزق کو حرام کیا جو انہیں اللہ نے دیا، وہ گمراہ ہوئے اور وہ ہدایت پانے والے نہیں) سورۃ نحل، آیت: ۷۱:

○ ” وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۖ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرِزْقِهِمْ عَلَىٰ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ“

(خدا نے تم میں سے بعض کو دوسرے بعض پر رزق میں برتری دی اور وہ کہ جنہیں برتری دی گئی وہ اپنے زر خرید غلاموں کو ان کا رزق نہیں دیتے کہ وہ اس میں ان کے برابر نہ ہو جائیں)

مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں..... جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں..... اطلاق و عمومیت پائی جاتی ہے جس میں کافر، مومن، حلال ذریعہ سے رزق پانے والا اور حرام ذریعہ سے رزق پانے والا سب شامل ہیں، یعنی ان سب کو رزق حاصل ہوتا ہے اس حوالہ سے کسی طرح کی قید و شرط نہیں پائی جاتی کہ جس سے کسی خاص گروہ کا اختصاص ظاہر و ثابت ہو بلکہ آیتوں کا

اطلاق ان سب کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

## رزق کی وسعت و تنگی

اس مقام پر ایک اہم مطلب سے آگاہی پانا واجب و ضروری ہے کہ رزق جیسا کہ اس کا معنی ذکر ہو چکا ہے اس سے مراد وہ شے ہے جس سے مرزوق (جسے رزق دیا گیا ہو) استفادہ کر سکے، ظاہر ہے کہ دیئے جانے والے مال میں سے اسی مقدار کو رزق کہا جائے گا جس سے استفادہ ہوا ہو چنانچہ وہ شخص کہ جسے کثیر مال دیا گیا ہو وہ اس میں سے کم مقدار میں استعمال کرتا ہے، تو جس مقدار کو وہ استعمال کرتا ہے وہی اس کا رزق کہلاتا ہے، اور جو اس سے زائد ہو وہ استعمال نہ ہونے کی بناء پر رزق نہیں کہلاتا، اگرچہ وہ اس کو دیا جانے والا مال ضرور کہلاتا ہے لیکن اس سے استفادہ کی بناء پر صرف اسی مقدار کو رزق سے موسوم کیا جاتا ہے جسے وہ اپنے استعمال میں لا کر اس سے نفع پاتا ہے۔ بنا بریں رزق کی وسعت و تنگی، مال کے زیادہ یا کم ہونے سے کوئی تعلق نہیں رکھتی..... عین ممکن ہے کہ کسی کے پاس مال زیادہ ہو مگر وہ اس سے نہایت کم مقدار میں استفادہ کرے کہ جو اس کا رزق کہلاتا ہے، اور اس کے برعکس وہ شخص کہ جس کے پاس مال کم ہو مگر وہ اس مقدار سے زیادہ استعمال میں لاتا ہو، لہذا مال کا زیادہ یا کم ہونا رزق کی وسعت و تنگی سے مربوط نہیں.....

رزق کی بحث میں مزید مطالب درج ذیل آیت مبارکہ کی تفسیر میں ذکر کئے جائیں گے :

سورہ ہود، آیت : ۶

○ ” وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا رِزْقُهَا وَاللَّهُ بِرِزْقِهَا عَلِيمٌ مُّذْتَمِرٌ هَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتَابٍ

صَبِيحِينَ ①“

(زمین میں کوئی جاندار نہیں مگر اللہ پر ہے اس کا رزق، اور وہ اس کے قرار پانے اور چھوڑنے کی جگہوں سے آگاہ ہے، سب کچھ واضح و کھلی ہوئی کتاب میں مرقوم ہے)

اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں اور آیت مبارکہ ”وَتُرْزَقُ مِنْ تَشَاءِ بِغَيْرِ حِسَابٍ“ (اور تو رزق دیتا ہے جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے) کی بابت مربوطہ مطالب ذکر کرتے ہیں :

اس آیت میں رزق کو بلا حساب ہونے کی صفت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ رزق کا عطا کیا جانا خداوند عالم کی طرف سے ہے اور وہ جنہیں رزق عطا کرتا ہے ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیتا ہے، اسے رزق عطا کرنے میں کسی مرزوق سے نہ تو کسی عوض و معاوضہ کی طلب ہوتی ہے اور نہ ہی مرزوق کے استحقاق یا طلب کا اس میں کوئی دخل ہوتا ہے

اور نہ ہی کوئی ایسی دوسری وجہ و سبب کہ جس کی بناء پر خدا کسی کو رزق دیتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ رزق خود خدا کا ملوک ہوتا ہے اور اس کی ذات اور ذات کی تمام تعلقات کا مالک خدا ہے لہذا خدا کا عطیہ، مرزوق سے کسی معاوضہ سے وابستہ نہیں ہوتا، اسی وجہ سے وہ بلا حساب ہوتا ہے، (کیونکہ حساب و کتاب کا مسئلہ وہاں آتا ہے جہاں عوض و معاوضہ مطلوب و مقصود یا ملحوظ ہو، جہاں معاوضہ وغیرہ کی بات ہی نہ ہو وہاں عطیہ کا حساب و کتاب کیسا؟)

اس مقام پر اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ رزق کے بلا حساب ہونے (یعنی اس سے حساب کی نفی کرنے) سے یہ مراد لینا کہ اس کی کوئی حد و اندازہ مقرر نہیں، غلط و نادرست ہے کیونکہ آیات القدر یعنی وہ آیات مبارکہ جن میں رزق کے مقدر اور اندازہ شدہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے اس نظریہ کی نفی کرتی ہیں، ملاحظہ ہو:

سورۃ قمر، آیت: ۴۹

○ ” اِنَّ اَكْلَ شَيْءٍ خَلْقَهُ رِقْدًا ۝“

(بے شک ہم نے ہر چیز کو اندازے کے مطابق پیدا کیا ہے)

سورۃ طلاق، آیت: ۳

○ ” وَ مَن يَشِقِ اللّٰهُ يَجْعَلْ لّٰهُ مَخْرَجًا ۝ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَن يَسُوْكَرْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بِالْاٰمْرِ ۙ لَّخَبِيْرٌ ۙ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝“

(اور جو شخص تقوائے الہی اختیار کرے تو خدا اس کے لئے راہ نکال دیتا ہے اور اسے اس طرح سے رزق دیتا ہے جس کا وہ گمان بھی نہیں کرتا، اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے تو خدا اس کی کفایت کرتا ہے، بے شک اللہ اپنے کام کو پورا کرنے والا ہے، اللہ نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کیا ہے)

بنا بریں رزق، اللہ تعالیٰ کا بلا عوض عطیہ ہے لیکن اس کے باوجود اس کا اندازہ و مقدر خدا کے ارادہ سے معین کی گئی ہے، وہ جتنا جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

بہر حال مذکورہ بالا دو آیتوں سے چار اہم مطالب بطور نتیجہ معلوم ہوتے ہیں:

(۱) ” مُلْكٌ “ (م پرورش کے ساتھ) یعنی حاکمیت و اقتدار اعلیٰ، سب کا سبب اللہ کے لئے ہے، وہی اس کا سرچشمہ اور محور و مرکز ہے، اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے ”مِلْكٌ“ (م کے نیچے زیر کے ساتھ) یعنی مالکیت سب کی سب اللہ کے لئے ہے اور وہی ہر شے کا مالک علی الاطلاق ہے۔

(۲) ہر طرح کی ”خیر“ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہی اس کا سرچشمہ فیض ہے۔

(۳) رزق خدائی عطیہ ہے جو وہ مخلوق کو کسی عوض اور استحقاق کے بغیر عطا کرتا ہے یعنی نہ تو اس کے بدلے میں ان

سے کسی معاوضہ کا مطالبہ کرتا ہے اور نہ ہی کسی ایسے حق کے بدلے میں عطا کرتا ہے جو مخلوق کا خالق کے ذمہ میں بنتا ہو۔  
 (۴) حاکمیت و مالکیت، عزت اور معاشرتی حوالہ سے حاصل ہونے والی ہر ”خیر“ مثلاً مال و دولت، جاہ و جلال اور قوت وغیرہ سب کچھ ایک طرح کا رزق ہے جس سے مرزوق (جسے رزق عطا کیا گیا ہو) استفادہ کرتا اور کر سکتا ہے۔

## روایات پر ایک نظر

### مالک الملک سے کیا مراد ہے؟

کتاب کافی میں آل سام کے غلام، عبدالاعلیٰ سے مروی ہے انہوں نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا کہ آیت مبارکہ ”اللَّهُمَّ مَلِكِ الْمَلِكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ“ (اے اللہ! اے مالک الملک، تو ملک و اقتدار عطا کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور حکومت و اقتدار چھین لیتا ہے جس سے چاہتا ہے) میں حکومت و اقتدار عطا کرنے سے مراد بنی امیہ کو عطا کیا جانے والا اقتدار نہیں ہے؟ (قد آتی اللہ بنی امیہ الملک؟)  
 امام نے جواب دیا:

” لیس حیث تذهب ، ان اللہ عزوجل آتانا الملک و اخذته بنی امیہ بمنزلة الرجل یکون له الثوب فیأخذہ الآخر فلیس هو للذی اخذه “

ایسا نہیں جو تو نے سوچا ہے، حقیقت یہ ہے کہ خداوند عالم نے ملک و اقتدار ہمیں عطا کیا اور بنی امیہ نے اس پر اس طرح عاصبانہ قبضہ کر لیا جیسے کسی شخص کے پاس کپڑے ہوں اور کوئی دوسرا اس سے چھین لے تو وہ حقیقی معنی میں اس کے نہ ہوں گے جس نے ناجائز طور پر ان پر قبضہ جمایا ہو، (اور ایسا نہیں کہا جاسکتا کہ خدا نے وہ کپڑے اسے عطا کئے ہیں کیونکہ ان کا اصل مالک کوئی اور ہے، اسی طرح اگر بنی امیہ نے ہماری خداداد حاکمیت پر قبضہ کر لیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا نے انہیں عطا کیا ہے۔) (روضۃ الکافی جلد ۸ حدیث ۳۸۹)

وضاحت: اسی طرح کی ایک روایت تفسیر العیاشی میں داؤد بن فرقہ کے حوالہ سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے ذکر کی گئی ہے، اور ”تُؤْتِي الْمُلْكَ“ (تو حکومت دیتا ہے جسے چاہتا ہے) میں حکومت دینے کا جو ذکر ہے اس سلسلے

میں پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) تکوینی طور پر عطا کرنا

(۲) تشریحی طور پر عطا کرنا

تکوینی عطیہ سے مراد تخلیقی طور پر سلطنت اور لوگوں پر حاکمیت کا پھیلاؤ اور ان میں اپنی قدرت و اقتدار کا نفاذ کرنا ہے، خواہ وہ عدل پر مبنی ہو یا ظلم کے ساتھ ہو (عادلانہ طور پر ہو یا ظالمانہ طور پر) جیسا کہ خداوند عالم نے نمرود کے بارے میں ارشاد فرمایا:

سورہ بقرہ، آیت: ۲۵۸

○ ” اِنَّ اللّٰهَ اللّٰهُ الْمَلِكُ “

(خدا نے اسے حکمرانی عطا کی)

اس آیت میں نمرود کی جاہلانہ سلطنت کو خدا نے اپنی عطا کردہ قرار دیا ہے، سلطنت و حاکمیت سے مراد یہ ہے کہ حاکم کا فرمان و دستور نافذ العمل ہو اور وہ جو چاہے اس کی اطاعت و فرمان برداری ہو۔

حاکمیت کے تکوینی عطیہ ہونے کی بابت ہم عنقریب مزید بحث و مطالبہ ذکر کریں گے۔

تشریحی عطیہ سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم کسی کو حاکم قرار دے کر اس کی اطاعت و فرمانبرداری کو واجب و لازم کرے، جیسا کہ ارشاد الہی ہے:

سورہ بقرہ، آیت: ۲۴۷

○ ” اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا “

(بے شک اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ بنا کر بھیجا ہے)

تشریحی حاکمیت کا اثر و نتیجہ اطاعت و فرمانبرداری کا واجب و لازمی ہونا، ولایت و حکمرانی کا قطعی و یقینی ہونا ہے اور وہ عدل پر مبنی ہونے کے سوا ممکن نہیں اور وہ ایسا مقام و منزلت ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت پسندیدہ و لائق ستائش ہے اور جہاں تک اس اقتدار و حکمرانی کا تعلق ہے جو بنی امیہ کو حاصل تھی تو وہ حاکمیت و اقتدار (ملک، مہم پر پیش کے ساتھ) کے مذکورہ بالا پہلے معنی کی بناء پر تھی اور اسی کا نتیجہ و اثر تھا، دراصل اس کی بابت راوی حدیث کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ اس نے ان کے اقتدار کو تو پہلے معنی کے ساتھ سمجھا ہے مگر اس کا نتیجہ و اثر دوسرے معنی کے ساتھ خیال کیا جو کہ تشریحی حاکمیت کا مقام ہے یعنی اس نے یہ سمجھا کہ جب تکوینی طور پر اقتدار انہیں حاصل ہوا ہے تو تشریحی طور پر بھی وہ حاکم ہیں اور ان کی اطاعت واجب و لازم ہے جبکہ حقیقت الامر اس کے مطابق نہیں اسی وجہ سے امام علیہ السلام نے اسے متوجہ و باخبر کیا کہ بنی امیہ کو تشریحی حاکمیت حاصل



نہیں بلکہ وہ صرف انہی کو (امام علیہ السلام کو) حاصل ہے اور وہی اس کے اثر و نتیجہ یعنی واجب الطاعتہ ہونے کے حقدار ہیں، ان کے علاوہ کسی کو وہ حاکمیت یعنی خدا کی عطا کردہ حکمرانی حاصل نہیں جس کی بناء پر حاکم کی اطاعت و پیروی اور فرمانبرداری واجب و لازم ہوتی ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ جو حکمرانی بنی امیہ کو حاصل تھی وہ اس صورت میں پسندیدہ و لائق ستائش ہوتی جب وہ آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے پاس ہوتی اور چونکہ اس پر بنی امیہ نے قبضہ کیا لہذا وہ مذموم کہلائی کیونکہ نااہل اور غیر حقدار کے پاس ہونے کی وجہ سے لائق ستائش و قابل تعریف ہونے کی بجائے لائق مذمت ہو گئی، بنا بریں اسے خدا کا عطیہ قرار دینا ہرگز درست نہیں بلکہ اس کی حیثیت نمرود و فرعون کو حاصل اقتدار و حکمرانی جیسی ہے کہ جو مکروفریب اور استحصال پر مبنی تھی۔

جو غلط فہمی راوی حدیث کو ہوئی ہے بوجہ وہ غلط فہمی خود بنی امیہ کو ہوئی اور وہ بھی آیت مبارکہ کے فہم المعنی میں غلطی کا شکار ہوئے، چنانچہ کتاب الارشاد (جلد اول ص ۲۴۶) میں یہ واقعہ درج ہے کہ یزید بن معاویہ علیہا اللہا یہ نے شہدائے کربلا کے سرہائے مقدسہ کو دربار میں لانے کا حکم دیا (شیخ مفید اس کے بابت فرماتے ہیں) جب تمام سرہائے مقدسہ کہ جن میں حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کا سراقہس بھی تھا یزید کے سامنے رکھے گئے تو اس ملعون نے کہا:

فلحق ہاتام من رجال اعزۃ علینا وہم کانوا اعق اظلماء

(جو لوگ ہم پر بزرگی و سرداری رکھتے تھے ہم نے ان کی گردنیں کاٹ دی ہیں اور وہ ہمارے مقابلے میں زیادہ عاق

و بے نسب اور زیادہ مستحکم تھے)

پھر یزید نے دربار میں حاضر لوگوں کی طرف رخ کر کے ان سے کہا کہ یہ شخص (حضرت امام حسین علیہ السلام) مجھ پر فخر کرتا تھا اور کہتا تھا کہ میرا باپ تیرے باپ سے بہتر ہے، اور میری ماں تیری ماں سے بہتر ہے اور میرا نانا تیرے نانا سے بہتر ہے اور میں خود تجھ سے بہتر ہوں، اس کی انہی باتوں نے اسے یہ دن دکھایا اور وہ قتل ہوا، تو جہاں تک اس کی اس بات کا تعلق ہے کہ اس کا باپ میرے باپ سے بہتر ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ میرے باپ اور اس کے باپ کے درمیان خلافت کے مسئلہ پر اختلاف و نزاع ہوا تو خدا نے میرے باپ کو اس کے باپ پر فوقیت دے کر خلافت میرے باپ کو دے دی، اور اس کا یہ کہنا کہ اس کی ماں میری ماں سے بہتر ہے تو مجھے میری جان کی قسم! اس کی یہ بات بالکل درست ہے کیونکہ حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ یقیناً میری ماں سے افضل تھیں، اور جہاں تک اس کا یہ قول کہ اس کا جد میرے جد سے افضل ہے تو اس بات کا درست ہونا ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر ہے اور ہر وہ شخص جو خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ ہرگز یہ کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا کہ میرا جد (ابوسفیان) اس کے جد (محمدؐ) سے افضل ہے، اور جو اس نے یہ کہا ہے کہ وہ خود مجھ سے بہتر و افضل ہے تو شاید اس نے قرآن مجید کی یہ آیت نہیں پڑھی جس میں خدا نے ارشاد فرمایا ہے: ”قُلِ اللّٰهُمَّ مَلِکَ الْمَلِکِ.....“ (کہہ دو، اے اللہ، اے مالک الملک! تو ملک و اقتدار عطا کرتا ہے جسے تو چاہتا ہے۔)

یزید کی بات سن کر حضرت زینبؓ بنت علیؓ سے رہانہ گیا، سیدہؓ نے اس کے دعوے کی نفی ورد میں وہی جواب دیا جسے سید ابن طاووسؒ نے (کتاب اللہوف میں) اور دیگر محدثین و مؤرخین نے امام جعفر صادق علیہ السلام کے بیان کی صورت میں ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ حضرت زینبؓ نے ارشاد فرمایا :

”اظننت یا یزید حیث اخذت علینا اقطار الارض و آفاق السماء فاصبحنا نسا ق کما تساق الساری ان بنا علی اللہ هو انا و بک علیہ کرامة، وان ذلک لعظم خطرک عندہ فشمخت بانفک و نظرت فی عطفک جدلان مسروراً حین رأیت الدنیا لک مستوسقة و الامور متسقة، و حین صفالک ملکنا و سلطاننا، مهلاً مهلاً، انسیت قول اللہ: ”وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِینَ کَفَرُوا اَنَّہُمْ لَیْسَ لَہُمْ حَیْزٌ لَّا نَفْسِہِمُ ۗ اِنَّمَا لَیْسَ لَہُمْ لَیْزٌ اِذْ اِشَاءَ وَ لَہُمْ عَذَابٌ مُّہِینٌ ﴿۲۶﴾“..... آل عمران، ۱۷۸.....

(اے یزید! کیا تو سمجھتا ہے کہ تو نے ہم پر زمین کے گوشے اور آسمان کے کنارے تنگ کر دیئے ہیں اور کیا ہمیں رسیوں اور زنجیروں میں جکڑ کر در بدر پھرانے سے تو خدا کی بارگاہ میں سرفراز اور ہم رسوا ہو گئے ہیں؟ تیرے خیال میں کیا ہم مظلوم ہو کر ذلیل ہو گئے اور تو ظالم بن کر سر بلند ہوا ہے، کیا تو سمجھتا ہے کہ ہم پر ظلم کر کے خدا کی بارگاہ میں تجھے شان و مقام حاصل ہو گیا ہے، آج تو اپنی ظاہری فتح کی خوشی میں سرمست ہے اور ناک بھول چڑھاتا ہوا مسرت و شادمانی سے سرشار ہو کر اپنے غالب ہونے پر اتر رہا ہے اور حاکمیت کے ہمارے مسلمہ حق کو غصب کر کے خوشی و سرور کا جشن منانے میں مصروف ہے، اپنی غلط سوچ پر مغرور نہ ہو اور ذرا دم لے، کیا تو نے خدا کا یہ فرمان بھلا دیا ہے جس میں اس نے ارشاد فرمایا: ”کافر اور حق کا انکار کرنے والے یہ گمان نہ کریں کہ ہم نے جو مہلت انہیں دی ہے وہ ان کے لئے بہتر ہے بلکہ ہم نے اس لئے انہیں ڈھیل دے رکھی ہے تاکہ وہ جی بھر کے اپنے گناہوں میں اضافہ کر لیں اور ان کے لئے خوفناک عذاب معین ہے۔)

### مومن سے کافر اور کافر سے مومن

آیت مبارکہ ”وَتُخْرِجُ الْاِحْيٰی مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْاِحْيٰی.....“ کی تفسیر میں کتاب مجمع البیان میں مذکور ہے کہ بعض حضرات نے اس کا یوں معنی کیا ہے: ”وتخرج المؤمن من الکافر و تخرج الکافر من المؤمن“ (تو مومن کو کافر کی صلب سے اور کافر کو مومن کی صلب سے پیدا کرتا ہے) مولف نے اس قول کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ مطلب حضرت امام محمد باقرؑ اور حضرت امام جعفر صادقؑ سے بھی منقول ہے (مجمع البیان ج ۲ ص ۴۲۸)

اس سے قریب المعنی شیخ صدوق نے امام حسن عسکریؑ کی ایک روایت ذکر کی ہے۔

## ایک حدیث نبویؐ

تفسیر ”درمنثور“ میں ابن مردویہ کے حوالہ سے ابو عثمان فہدی کے اسناد سے ابن مسعود یا سلمان کی بیان کردہ روایت ذکر کی گئی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: ”یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی“ سے مراد یہ ہے کہ خدا مومن کو کافر کے صلب سے اور کافر کو مومن کے صلب سے پیدا کرتا ہے (المؤمن من الکافر والکافر من المؤمن) (تفسیر درمنثور، جلد ۲ صفحہ ۱۵)

## سلمان فارسیؓ کی ایک روایت

تفسیر ”درمنثور“ ہی میں ابو عثمان فہدی کے اسناد سے جناب سلمان فارسیؓ کی روایت مذکور ہے، انہوں نے کہا کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا:

”لما خلق اللہ ادم اخرج ذریئہ، فقبض قبضۃ بيمينہ فقال: هؤلاء اهل الجنة ولا ابالی، و قبض بالآخری قبضۃ فجاء فیها کل ردی، فقال: هؤلاء اهل النار، ولا ابالی، فخلط بعضهم ببعض فینخرج الکافر من المؤمن و ینخرج المؤمن من الکافر، فذلک قوله: ”تخرج الحی من المیت و تخرج المیت من الحی“،

(جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کی ذریت میں سے کچھ افراد کو اپنے مقام مقدس کے دائیں جانب قرار دے کر فرمایا: یہ بہشت والے ہیں (اور مجھے کوئی پرواہ نہیں) اور کچھ دیگر افراد کو الگ کیا تو ان میں ہر طرح کی برائی موجود تھی، تو ارشاد فرمایا: یہ دوزخی ہیں (اور مجھے کوئی پرواہ نہیں)، پھر ان دونوں گروہوں کے افراد کو آپس میں ملا دیا اور مخلوط کر دیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کافر سے مومن پیدا ہوتا ہے اور مومن سے کافر پیدا ہوتا ہے، اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید میں ارشاد ہوا: ”توزندہ کومردہ سے اور مردہ کوزندہ سے باہر نکالتا ہے“، (ملاحظہ ہو تفسیر درمنثور جلد ۲ ص ۱۵)

اسی معنی و مضمون پر مشتمل روایات کو متعدد مفسرین کرام نے سلمان ہی کے حوالہ سے ذکر کیا ہے مگر اس کے اسناد کا سلسلہ مقطوع ہے۔ یعنی سلسلہ روایت میں کئی راویوں کے نام مذکور نہیں.....، اور یہ روایت ان روایات میں سے ایک ہے

جو عالم ذر و یثاق سے مربوط ہیں کہ اس موضوع کی بابت اس کے موزوں مقام پر بہت جلد بحث کی جائے گی، انشاء اللہ،

## خطبہ جمعۃ الوداع کا حوالہ

کافی میں محمد بن یحییٰ، احمد بن محمد اور ہمارے متعدد دروایان حدیث کے حوالہ سے سہل بن زیاد سے مروی ہے، انہوں نے ابن محبوب کے حوالہ سے ابو حمزہ ثمالی کا بیان ذکر کیا ہے کہ انہوں نے امام ابو جعفر محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد گرامی ذکر کیا کہ آپؑ نے فرمایا: حضرت پیغمبر اسلامؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا:

”الان الروح السامین نفث فی روعی انه لا تموت نفس حتی تستكمل رزقها، فاتقوا اللہ و اجملوا فی الطلب، ولا یحملنکم استبطاء شیء من الرزق ان تطلبوه بشیء من معصیة اللہ، فان اللہ تعالیٰ قسم الارزاق بین خلقه حلالاً، ولم یقسمها حراماً، فمن اتقى اللہ و صبر اتاه رزقه من حله، و من هتک حجاب ستر اللہ عزوجل و اخذہ من غیر حله قص به من رزقه الحلال و حوسب علیہ“

(آگاہ رہو کہ، روح الامین (جبرائیلؑ) نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی ہے کہ کوئی شخص پورے طور پر اپنا رزق حاصل کئے بغیر موت کا شکار نہیں ہوگا، (دنیا سے جانے سے قبل جو رزق خدا نے اس کے لئے مقرر کیا ہے وہ پورا پائے گا)، بنا بریں تم تقوائے الہی اختیار کرو اور طلب رزق میں صحیح راستہ اختیار کرو، اگر تمہیں رزق ملنے میں تاخیر ہو جائے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اسے خدا کی معصیت و نافرمانی کی راہ پر چل کر طلب کرنے لگو، کیونکہ خداوند عالم نے اپنی مخلوق میں رزق حلال کو تقسیم کیا ہے اور اسے بطور حرام تقسیم نہیں کیا (خدا نے جو رزق تقسیم کیا ہے وہ حلال ہے حرام نہیں) لہذا جو شخص تقوائے الہی اختیار کرتے ہوئے صبر سے کام لے تو اس کا رزق حلال طریقہ سے اسے مل جائے گا، اور جو شخص مشیت الہی کے تقدس کو پامال کرے تو وہ اپنا رزق بذریعہ حرام پائے گا کہ جس کا پورا پورا بدلہ اس سے لیا جائے گا اور جس مقدر میں اس نے اپنے رزق کو حرام طریقہ سے حاصل کیا ہوگا اتنا ہی اس سے اس کا محاسبہ ہوگا۔ (کافی۔ ج ۵۔ حدیث ۱)

رزق کے بارے میں امام علیؑ کا فرمان

نہج البلاغہ میں ہے حضرت امام علیؑ نے ارشاد فرمایا:

”الرزق رزقان: رزق تطلبہ و رزق یطلبک فان لم تأتہ اناک فلا تحمل ہم سنتک یومک، کفاک کل یوم ما فیہ، فان تکن السنۃ من عمرک فان اللہ تعالیٰ جدہ سیؤتیک فی کل غد جدید ما قسم لک، وان لم تکن السنۃ من عمرک فما تصنع بالہم لما لیس لک ولن یسبکک الی رزق طالب، ولن یغلبک علیہ غالب، ولن یبطی عنک ما قد قدر لک“

(رزق کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ رزق جسے تو طلب کرتا ہے اور دوسرا وہ رزق جو تجھے طلب کرتا ہے اگر تو اس کے پاس نہ جائے تو وہ تیرے پاس آتا ہے، تو سال بھر کے لئے اپنی تمام تر کاوش آج ہی صرف نہ کرو، جو کچھ جس دن تجھے حاصل ہو وہ تیرے لئے کافی ہے، اگر تیری عمر ایک سال باقی ہے تو خداوند عالم تجھے ہر نئے دن تیرا مقدر کیا ہو رزق عطا کرے گا اور اگر تیری عمر ایک سال بھی باقی نہیں تو جو چیز تیرے لئے ہے ہی نہیں اس کی طلب و تلاش سے تجھے کیا حاصل؟ کوئی دوسرا طلبگار تیرے رزق پر تجھ سے سبقت لے کر اسے نہیں پاسکتا اور نہ ہی کوئی شخص طاقت و قوت سے تجھے مغلوب کر کے اس پر قبضہ جما سکتا ہے اور نہ ہی اس رزق میں تاخیر واقع ہو سکتی ہے جو تیرا مقدر ہو چکا ہے، (نج البلاغہ، کلمات قصار، ۳۷۲)

## رزق کا آسمان سے نازل ہونا

کتاب قرب الاسناد میں ابن طریف کے حوالہ سے مذکور ہے کہ ابن علوان نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے پدر بزرگوار امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی کہ انہوں نے ارشاد فرمایا: حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

”ان الرزق لیسنزل من السماء الی الارض علی عدد قطر المطر الی کل نفس بما قدر لها، ولكن لله فضول فاسألوا الله من فضله“

(رزق، بارش کی طرح اور اس کے قطروں کی مقدار کے مطابق آسمان سے ہر شخص کے لئے اس مقدار میں نازل ہوتا ہے جو اس کے مقدر و مقرر ہوئی ہے، لیکن خداوند عالم کا خزانہ فضل و عنایت بہت وسیع ہے لہذا اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل و عنایت کے طلبگار بنو۔ (ملاحظہ ہو: کتاب قرب الاسناد صفحہ ۵۵)

رزق کے آسمان سے نازل ہونے کی بابت کثرت سے روایات وارد ہوئی ہیں، اس طرح کی احادیث و روایات کے بارے میں تفصیلی بحث سورہ ہود کی تفسیر میں ہوگی، انشاء اللہ تعالیٰ۔

## ایک علمی بحث

سابقہ ذکر کی جانے والی بحثوں میں سے بعض میں یہ مطلب بیان ہو چکا ہے کہ مسئلہ ملکیت و مالکیت ایک ایسا ناقابل انکار اور مسلم الثبوت امر ہے جس کی واقعیت و اعتباری حیثیت کسی بحث و دلیل کی محتاج نہیں اور وہ ان لازمی و ٹھوس حقائق میں سے ایک ہے جس سے کوئی انسان بے نیاز نہیں بنا اپنی انفرادی زندگی میں اور نہ ہی اجتماعی و معاشرتی زندگی میں اس کی ضرورت سے دامن بچا سکتا ہے اور اس کی اصل و اساس کا محور و منہا کسی چیز کا کسی چیز سے منحصر ہونے یا منحصر کئے جانے کا وہ اصول ہے جو اپنی اعتباری حیثیت میں یقینی و قطعی مقام رکھتا ہے۔

یہ تو ہے ”ملک“ (آم کے نیچے زیر کے ساتھ) بمعنی مالکیت کی بابت، جہاں تک ”ملک“ (آم پر پیش کے ساتھ) بمعنی حاکمیت و سلطنت اور دوسروں پر حکمرانی کا مسئلہ ہے تو وہ بھی انہی مسلم الثبوت امور میں سے ہے جن سے انسان بے نیاز نہیں لیکن اس حوالہ سے جو اہم مطلب قابل توجہ ہے وہ یہ کہ سب سے پہلے تو انسان کو ایک معاشرہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور معاشرہ مختلف و متعدد اجزاء کے مجموعہ سے بنتا ہے کہ جس میں سے ہر جزء (فرد) اپنا مخصوص و معین مقصد رکھتا ہے، البتہ ہماری مراد یہاں معاشرہ کے ہر فرد کی مخصوص ترجیحات نہیں بلکہ معاشرہ بحیثیت معاشرہ اور مجموعہ افراد ہمارے مد نظر ہے کیونکہ تمام افراد، معاشرہ کے اجزاء ہونے کے حوالہ سے اپنے گونا گوں ارادوں اور مختلف مقاصد کی بناء پر ہمیشہ اختلافات سے دوچار رہتے ہیں، سب کی یہ خواہش و کوشش ہوتی ہے کہ دوسروں پر فوقیت حاصل کرے اور جو کچھ دوسروں کے پاس ہے اسے ہتھیالے، دوسروں کی حدود پھلانگ کر ان کے حقوق پر ڈاکہ ڈالے، تو اس کے نتیجے میں انسانی معاشرہ ہرج و مرج اور خلفشار کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ معاشرہ جسے سعادت و خوش بختی کی حامل زندگی کا بہترین وسیلہ قرار دیا گیا تھا بدبختی و تباہی کا ذریعہ و سبب بن جاتا ہے، گویا دو ایبوری بن جاتی ہے، تو اس خطرناک و وحشت ناک اور تباہ کن صورتحال سے چھٹکارا پانے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا کہ ایک ایسی قوی و غالب مرکزیت قائم کی جائے جو تمام قوتوں سے بالاتر اور معاشرہ کے تمام افراد پر کامل اختیار و بالادستی رکھتی ہو تاکہ سرکش قوتوں کو لگام دے کر انہیں درمیانی راہ پر لاکھڑا کرے اور محروم و کمزور افراد کی دادرسی و دستگیری کرے کہ نتیجتاً معاشرہ کی تمام قوتیں یکجا ہوں اور برابری کی بنیاد پر اپنی کار آرائی سے معاشرہ کو استحکام بخشیں، اور وہ مرکزی قوت تمام افراد کو ان کا اصل مقام دلائے اور ہر ایک کو اس کی مخصوص معاشرتی منزلت سے نواز کر ہر حقدار کو اپنے مسلم حق سے بہرہ ور ہونے کا موقع فراہم کرے۔

تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ دنیائے انسانیت کسی دور میں بھی استعماری فکر سے خالی و مبرا نہیں رہی بلکہ ہمیشہ

دوسروں سے خدمت لینے کا ایک وسیع سلسلہ افراد کے درمیان قائم رہا، چنانچہ اس حوالہ سے سابقہ اشارہ ہو چکا ہے اور یہ مطلب بیان ہو چکا ہے کہ انسانی تاریخ میں کوئی ایسا معاشرہ دکھائی نہیں دیتا جس میں ایسے افراد موجود نہ ہوں جو مسند اقتدار پر قبضہ کر کے معاشرہ کے دیگر افراد پر مسلط نہ ہوئے ہوں اور ان کے اموال و نفوس کے مالک بن کر انہیں غلاموں کی زنجیروں میں جکڑ دینے کے مرتکب نہ ہوئے ہوں، اور معاشرہ کی مرکزی قوت کی تشکیل کے فوائد میں سے کہ جو ہم نے ذکر کئے ہیں کہ اس کے ذریعے بعض افراد کی دوسرے بعض پر سرکشی کا راستہ روکا جاسکتا ہے اس میں وہ افراد بھی لپیٹ میں آتے ہیں جو ناجائز طور پر دوسروں پر غلبہ و حکمرانی کرتے ہوئے معاشرہ کو اپنی آمریت کا شکار کرتے ہیں اور خود کو ”بادشاہ“ کہلاتے ہیں لیکن اس کے باوجود کہ وہ خود اور ان سے وابستہ افراد اور ان کے ہی خواہ سب کے سب سرکش قوتیں اور ناحق حکمرانی کے حامل ہوتے ہیں مگر وہ خواہ و ناخواہ اپنی حکومت و اقتدار خواہ ناجائز و ناروا ہی کیوں نہ ہو، کے ساتھ ان افراد پر عرصہ حیات تنگ کر دیتے ہیں جو دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کے مرتکب ہوتے ہیں اگرچہ ان کا ہدف عوام پر تسلط کو مضبوط کرنا ہوتا ہے لیکن نتیجتاً ان افراد کی مجرمانہ حرکتوں کا سدباب ہوتا ہے جو اپنے سوا کسی کو زندگی سے لطف اندوز ہونے کا حقدار نہیں سمجھتے، یہ اور بات ہے کہ بادشاہوں کو ان افراد کا راستہ روکنے میں یہ مقصد ملحوظ ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ان پر بھی دھاوا بول دیں اور ان کی حکومت و اقتدار کی بساط الٹ دیں جیسا کہ خود انہوں نے دوسروں کے ساتھ برتاؤ کیا اور ان کے مال و جان پر قبضہ جما کر بادشاہی کے تخت نشین بن بیٹھے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ انسانی معاشرے، اغیار کے ناروا تسلط کے خوف میں اپنے قابض و آمر حکمرانوں کی حمایت پر مجبور ہوئے اور ان کے خلاف قیام کرنے کے بجائے ان کی تعریف و مدح سرائی میں مصروف ہو گئے اور مجبوراً اپنے ظالم و مستحکم بادشاہوں کی قصیدہ خوانیاں کر کے اپنے آپ کو معاشرہ کے ان مجرموں کے شر سے محفوظ رکھیں جو دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ زنی کرتے ہیں، لیکن یہ سب کچھ اس وقت تک ہوا جب تک بادشاہوں کا ظلم و جور اپنی حد سے نہ گزرا اور عوام کے استقلال و آزادی اور مسلمہ حقوق پر شب خون مارنے کی نوبت نہ آئی، اور اگر بادشاہ اپنی حدود سے آگے بڑھنے لگے اور افراد معاشرہ پر ظلم و ستم کا سلسلہ وسعت اختیار کر گیا تو پھر وہ بادشاہ بھی عوامی احتجاج سے نہ بچ سکے اور قوموں کی صدائے زنجیر شکن سے ایوان ہائے سلطنت کے دروہام ہلا دیئے، چنانچہ تاریخ اس امر کی گواہی دیتی ہے کہ جب بادشاہوں اور آمر حکمرانوں کے مظالم حد سے تجاوز کر گئے اور افراد معاشرہ نے ان کے خلاف بھرپور قیام کیا تو ان مستحکم سلطانوں اور نام نہاد بادشاہوں کو ذلت آمیز انجام سے دوچار ہونا پڑا اور وہ محروم و ستم دیدہ عوام کے ہاتھوں قتل و ہلاک کر دیئے گئے۔ کہ تاریخ میں ان کا نام عبرت کا نشان بن گیا، لیکن عوام الناس پھر کسی دوسرے آمر کو زمام حکومت سپرد کرنے پر مجبور ہوئے تاکہ معاشرے میں فتنہ و فساد اور ہرج و مرج و انتشار کی طوفانی موجوں کو روکا جاسکے اور معاشرہ کو مزید تباہی و بربادی سے بچایا جاسکے، نتیجتاً وہ آمر بھی خود کو بادشاہ کہلانے لگا

اور تخت نشین ہو کر اسی طرح ظلم و جور کا بازار گرم کرنے لگا جو اس سے پہلے حکمرانوں نے کیا تھا، لوگوں کے جان و مال کو تحفظ حاصل نہ ہوا بلکہ ہر حوالہ سے عدم تحفظ کا شکار افراد معاشرہ ایک بار پھر ظلم کی چکی میں پسنے لگے اور آمریت کی سیاہ رات ان پر چھا گئی، یہ صورتحال انسانی معاشروں میں یکے بعد دیگرے سامنے آتی رہی یہاں تک کہ مطلق العنان بادشاہوں اور آمریت کے دلدادہ حکمرانوں کے مظالم سے تنگ آ کر لوگوں نے حکام کے لئے قواعد و ضوابط وضع کرنے کی راہ اپنائی اور بادشاہوں کو ان قواعد و ضوابط اور وضع کئے گئے قوانین کی پابندی پر مجبور کیا، جس کے نتیجہ میں بادشاہ کو آئینی طور پر مشروط حاکمیت حاصل ہوئی اور عوام الناس امور مملکت سے لاتعلقی نہ رہے، البتہ بادشاہت کا نظام موروثی ہو گیا یعنی خاندانی بادشاہت کا نظام قائم ہو گیا اور تاج سلطنت یکے بعد دیگرے ایک ہی خاندان کے افراد کو منتقل ہوتا رہا۔

اس کے بعد معاشرہ کی صورتحال میں مطلوبہ اہداف حاصل نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں نے مملکت پر حاکم نظام میں تبدیلی ناگزیر سمجھی کیونکہ سلاطین کی طرف سے عوامی حقوق کی عدم پاسداری اور سلطنت کے موروثی ہونے کے نتیجہ میں ہرنے آنے والے تخت نشین کے ناروا سلوک اور مظالم کے باعث حکمرانی کے خاندانی وراثت کی بابت نظام میں بنیادی رد و بدل ضروری ہو گیا چنانچہ ناقابل تبدیلی سلطنتی نظام کو جمہوری حکمرانی میں بدل دیا گیا، جس کے بعد مطلق العنان اور تاحیات موروثی بادشاہت کی حیثیت رائے عامہ کی بنیاد پر مقررہ وقت تک معین کئے گئے حاکم کی ہو گئی، تو یہ سب کچھ معاشرہ میں رونما ہونے والے ان تلخ و ناگوار حالات کے نتیجہ میں ہوا جو بادشاہوں اور حکام کے مظالم کی وجہ سے پیدا ہوئے، عین ممکن ہے کہ معاشرتی مظالم سے چھٹکارا پانے کے لئے اقوام عالم نے کئی دیگر نظامہائے حکومت وضع کئے ہوں کہ ان کے سہارے معاشرہ کی ابتر حالت کو بہتر کرنے میں مدد مل سکے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ مستقبل میں ایسے نظامہائے حکومت وضع کئے جائیں کہ جن کے بارے میں ہمارے ذہنوں میں ابھی کوئی خاکہ موجود نہیں اور وہ نظام اسی مقصد و ہدف کے حصول کو یقینی بنانے میں مؤثر واقع ہوں جو سابقہ یا موجودہ جمہوری نظاموں میں ملحوظ ہے یعنی یہ کہ معاشرہ میں قانون کی حکمرانی ہو اور شخصی و فردی آمریت قائم نہ ہو کیونکہ اس سے عوامی حقوق پامال ہوتے ہیں اور افراد بشر کو فطری آزادی حاصل نہیں ہوتی جبکہ حکمران طبقہ ہر طرح کی آزادی اور تمام تر معاشرتی حقوق سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

بہر حال مذکورہ بالا تمام معاشرتی حالات اور نظامہائے حکومت میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے مجموعی تجزیہ سے یہ بات یقینی طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ قوموں نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ معاشرے کا اختیار و اقتدار اس کے سپرد کیا جائے جو تمام امور کو احسن طور چلانے کی اہلیت رکھتا ہو اور اپنی ٹھوس صلاحیت اور حکمرانی کے اعلیٰ معیار پر پورا اترنے کے ساتھ معاشرہ میں موجود گونا گوں قوتوں اور مختلف و متضاد ارادوں کو یکسوئی، یک جہتی اور ایک ہی سمت میں لا کر افراد کے حقوق کی پاسداری، رفاہ و سلامتی کو یقینی بنائے، اس سے یہ قطعی نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ انسانی معاشرہ اس طرح کے مقام و منصب اور اقتدار کے مرکز



سے بے نیاز نہیں، اب اس شخص کا نام کیا ہو اور اس میں کیا صفات و شرائط پائی جانی چاہئیں اس کا فیصلہ قوموں کی صوابدید اور اجتماعی سوچ پر موقوف ہے اور رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں کیا تبدیلیاں ممکن و ضروری ہیں اس کے بارے میں ہر معاشرہ اپنے حالات کے تقاضوں کے پیش نظر رائے قائم کرتا ہے اور ایسا کرنے کا حق بھی رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قوم اپنے لئے ایک معاشرتی نظام وضع کر کے حکمران طبقہ کے لئے ضروری شرائط خود طے کرتی ہے اور ایسا کرنا ہر قوم کے لئے اس لئے ناگزیر ہوتا ہے کہ معاشرہ میں پیدا ہونیوالا انتشار اور افراتفری، ہرج و مرج اور عدم تحفظ معاشرہ میں کسی ایک ایسے شخص یا مرکز کے نہ ہونے کا نتیجہ ہوتا ہے جو طاقت کا محور اور معاشرتی مقاصد کی تکمیل کا ضامن یا اس میں مؤثر ہو، گویا تمام افراد کی خواہشوں، چاہتوں، حقوق اور ضروری امور کا ترجمان ہو۔

یہ تمام مطالب وہی ہیں جن کے بارے میں ابتدائے سخن میں بیان ہو چکا ہے کہ حاکمیت ایک ایسی ناقابل انکار اعتباری حقیقت ہے جو انسانی معاشرہ کے لئے ناگزیر ہے۔ اور وہ انہی اعتباری حقیقتوں کی مانند ہے جو انسانی معاشرے میں ضروری ہوتی ہیں اور جن کے تقاضوں کی تکمیل، بہتری، ان میں واقع ہونے والی خامیوں کی دوری اور انسانی سعادت کی راہ میں رکاوٹ بننے والے ان کے ناگوار آثار کو مٹانا ہی معاشرہ کے کرنے کا اصل کام ہے۔

تو یہ بات ثابت ہوگئی کہ معاشرہ کی تشکیل ان اعتباری حقیقتوں کے تقاضوں کی تکمیل و اصلاح امور میں مؤثر کردار ادا کرنے کی غرض پر مبنی ہے لہذا اس حوالہ سے ”نبوت“ کا کردار بہت پختہ اور اصلاح معاشرہ میں اس کا حصہ کامل و فراواں ہے کیونکہ علم الاجتماع میں یہ مسئلہ مسلم الثبوت ہے کہ جو قول و نظریہ عوام و خواص کے درمیان مور و توجہ قرار پائے جبکہ وہ طبع انسانی کے وابستہ، مزاج بشریت کا پسندیدہ اور دلوں کی متوقع آرزوؤں پر پورا اترنے والا ہو تو وہ گونا گوں ترجیحات کو یکجا کرنے، متفرق و پراکندہ افراد و اقوام کو متحد کر کے ایک پلیٹ فارم پر لانے میں مؤثر ترین عامل بن سکتا ہے کہ جس کی بدولت معاشرہ کی تمام بکھری ہوئی قوتیں ایک ہی محور پر اکٹھی ہوں اور پورا معاشرہ ایک ایسے گھرانہ کی طرح ہو جائے جس کے تمام افراد کی آواز و آرزو ایک، چاہت ایک، راہ ایک اور منزل ایک ہو، اور پھر دنیا کی کوئی طاقت اس متحد قوت کا مقابلہ نہ کر سکے۔

اس مقام پر یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ یہ امر تاریخ کی مسلمہ حقیقتوں میں سے ایک ہے کہ جب سے سلسلہ نبوت ظہور پذیر ہوا تو اس کی عملداری کا محور یہ تھا کہ لوگوں کو عدل کی دعوت دیں اور ظلم سے دوری اختیار کرنے کا حکم دیں، خدا کی عبادت و بندگی کی ترغیب دلائیں، احکام الہی کی اطاعت و پیروی اختیار کرنے کی طرف بلائیں اور اس کے ساتھ ساتھ معاشرے کے فرعونوں، سرکشوں، آمروں، غاصبوں اور جاہر لوگوں کی پیروی کرنے سے روکیں، چنانچہ یہ سلسلہ صدیوں در صدیوں سے جاری و ساری ہے اور اقوام عالم کے درمیان نسل در نسل چل رہا ہے، ہر ملت و امت اس کے سایے میں اپنا نظام زندگی چلا رہی ہے اگرچہ اس میں زمان و مکان اور افراد کے حوالہ سے وسعت و محدودیت پائی جاتی ہے لیکن یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ

انسانی معاشرے میں صدیوں پر محیط اس طرح کے قوی ترین عامل و سبب کا بے اثر و بے نتیجہ ہونا محال و ناممکن ہے اور ایسا ہرگز قابل تصور نہیں کہ اس وسیع و عظیم سلسلہ کا معاشرہ میں کوئی مثبت نتیجہ نہ پایا جائے۔

اس تناظر میں قرآن مجید نے متعدد مقامات پر خداوند عالم کی طرف سے انبیاء علیہم السلام پر نازل کی جانے والی وحی میں ان کی امتوں کے برتاؤ کا تذکرہ فرمایا ہے مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کے شکوہ کو ان لفظوں میں ذکر کیا کہ انہوں نے کہا:

سورہ نوح، آیت: ۲۳

○ ” رَبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِي وَاتَّبَعُوا مَنْ لَّمْ يَزِدْكَ مَالًا وَّوَلَدًا اِلَّا خَسَارًا ﴿۲۳﴾ وَكَرُّوا مُكْرًا كِبٰرًا ﴿۲۴﴾ وَقَالُوْا لَا تَدْرُسْ اِنَّ اِلٰهَتَكُمْ “

(پروردگارا! انہوں نے میری نافرمانی کی ہے اور انہوں نے ایسے کی پیروی کی ہے جس کے مال اور اولاد نے سوائے خسارہ و نقصان کے، کچھ اضافہ نہیں دیا، اور انہوں نے میرے ساتھ بہت بڑی چال چلی ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ اپنے خداؤں کو تہانہ چھوڑو)

اسی طرح آجناب اور ان کی قوم کے بزرگوں کے درمیان جو زاعی بحث و جدال ہوا اس کا تذکرہ قرآن مجید نے اس طرح کیا:

سورہ شعراء، آیت: ۱۱۳

○ ” قَالُوْا اَاَنْتُمْ مِنْ لَدُنْكَ وَاَتَّبَعْتَكِ الْاَسْرَادُ لَوْ نَوْنُ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ وَاَعْلٰیٰ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنْ جَسَابٌ بِهُمْ اِلَّا عَلٰی رَاۤیٍ لَّوَسَّعُ وْنَ ﴿۱۱۵﴾ “

(انہوں نے کہا کہ کیا تم تھے پر ایمان لائیں جبکہ چند پست و حقیر لوگوں نے تیری پیروی کی ہے، اس نے جواب میں کہا، مجھے کیا معلوم کہ وہ کیا کرتے ہیں، اگر تمہیں شعور ہو تو سمجھ جاؤ گے کہ ان کا حساب کتاب میرے پروردگار کے ہاتھ میں ہے)

حضرت ہود علیہ السلام کا وہ قول بھی قرآن مجید میں مذکور ہے جو انہوں نے اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہا:

سورہ شعراء، آیت: ۱۳۰

○ ” اَتَّبِعُوْنَ بِحُلِّ رَاۤیِیۡہٗ اٰیۃً تَعْبَثُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصٰنِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیۡنَ ﴿۱۳۲﴾ “

(کیا تم ہر بلند جگہ پر بے مقصد نشانیاں بناتے رہتے ہو اور بڑے بڑے محلات تعمیر کرتے رہتے ہو جیسے تمہیں ہمیشہ ان میں رہنا ہو)

حضرت صالح کا وہ قول کہ جو انہوں نے قوم سے مخاطب ہو کر کہا:

سورہ شعراء، آیت ۱۵۰، ۱۵۲:

” فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا ۖ وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ السُّرِفِينَ ۗ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿۱۵۱﴾ “

(تم تقوائے الہی اختیار کرو اور میری اطاعت کرو، اور حد سے گزرنے والوں کی اطاعت نہ کرو کہ وہ زمین میں فساد

پھیلاتے ہیں اصلاح ہرگز نہیں چاہتے)

اس کے علاوہ تاریخ کی ناقابل انکار حقیقتوں میں سے یہ بھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم بنی اسرائیل کے دفاع میں قیام کیا اور فرعون کی بد اعمالی اور ظالمانہ و جاہلانہ طرز عمل کے مقابلے میں میدان عمل میں کود پڑے، اور ان سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے وقت کے آمر نمود کے مقابلے میں کھڑے ہوئے اور انقلابی تحریک کی قیادت کی، پھر حضرت عیسیٰ بن مریم علیہا السلام اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام اپنے دور کے جاہر حکمرانوں، بد کردار سردارانِ قبائل اور مال و دولت کے سہارے لوگوں کا استحصال کرنے والوں کے خلاف برسر پیکار ہوئے اور ان کی بد اعمالیوں کو بے نقاب کرتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو فسادِ عناصر کی اطاعت اور سرکشِ افرادی پیروی سے منع کرتے رہے۔

یہ تو ہے انبیاء الہی کی عملی سیرت کا حوالہ، اور جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے تو یہ حقیقت کسی سے مخفی نہیں کہ اس مقدس کتاب میں لوگوں کو فساد پھیلانے والوں کی اطاعت و فرمانبرداری اور سرکشی کے پھیلنے اور ان کے سنگین نتائج ظاہر ہونے کی خبریں دی گئیں، اس سے قرآن مجید کی اصلاحی کاوشیں کھل کر سامنے آتی ہیں اور دین مقدس اسلام کے بلند پایہ اصولوں کی بابت کوئی چیز پردہ ابہام میں باقی نہیں رہتی، انہی موارد میں سے ایک درج ذیل آیت مبارکہ ہے:

سورہ فجر، آیت: ۱۴:

” أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۗ إِرْمَذَاتِ الْعِمَادِ ۗ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۗ وَشِمُودَ ۗ الَّتِي بَيْنَ جَابِوَا الصُّخْرِ بِالْوَادِ ۗ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ۗ الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۗ فَآكُرُوا فِيهَا الْفَسَادَ ۗ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۗ إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْأَعْيُنِ ۗ ﴿۱۴﴾ “

(کیا تو نے نہیں دیکھا جو تیرے پروردگار نے قوم عاد کے ساتھ کیا سلوک کیا، وہ کہ جو بلند پایہ ستونوں (اوپنی اوپنی

عمارتوں و محلات) والے تھے کہ ان جیسی عمارتیں کہیں بھی نہیں بنائی گئیں، اور شمود کے ساتھ کیا سلوک کیا کہ جنہوں نے وادی میں پتھر تراش کر مکانات بنائے، اور فرعون کے ساتھ، کہ جو میٹھوں والے تھے، وہ کہ جنہوں نے سرکشی کا بازار گرم کر رکھا تھا اور انہوں نے بہت زیادہ فساد پھیلا یا، تو تیرے رب نے ان پر عذاب کے کوڑے برسائے، بے شک تیرا پروردگار گھات میں

(ہے)

اس طرح کی آیات قرآن مجید میں کثرت سے موجود ہیں۔

یہ تمام مطالب ”مِلک“ (م کے نیچے زیر کے ساتھ) سے مربوط ہیں اور جہاں تک ”مِلک“ (م پر پیش کے ساتھ)..... یعنی حاکمیت و اقتدار..... کا تعلق ہے تو وہ انسانی معاشرے کی ناقابل انکار اعتباری حقیقت ہے کہ معاشرہ جس سے بے نیاز نہیں، چنانچہ اس کا ثبوت اس کا مل و جامع ترین قرآنی بیان سے ملتا ہے جو طالوت کے واقعہ کے ذکر کے بعد مذکور ہے جس میں ارشاد الہی ہوا:

سورۃ بقرہ، آیت: ۲۵۱

○ ” وَ لَوْلَا دَفَعُ اللّٰهُ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللّٰهَ ذُو فَضْلٍ عَلٰی الْعٰلَمِيْنَ “  
(اگر خدا بعض لوگوں کو دوسرے بعض کے ذریعے نہ روکتا تو زمین تباہ ہو چکی ہوتی، لیکن اللہ کائنات پر فضل و عنایت کرنے والا ہے)

اس آیت کی بابت سورۃ بقرہ میں تفصیلی تذکرہ ہو چکا ہے اور اس سے مربوط پہلوؤں کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ اور قرآن مجید میں کثیر آیات ایسی موجود ہیں جن میں حاکمیت و اقتدار، ولایت و حکمرانی اور والی کی اطاعت و فرمانبرداری کا واجب و لازم ہونا بیان کیا گیا ہے، بعض آیات میں اسے عطائے ربانی اور نعمت سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۃ نساء، آیت: ۵۴

○ ” وَاٰتَيْنَاهُم مَّلٰكًا عَظِيْمًا “  
(اور ہم نے انہیں عظیم اقتدار عطا کیا)

سورۃ مائدہ، آیت: ۲۰

○ ” وَ جَعَلْنٰكُمْ مُّمْلُوْكًَا وَاَنْتُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ “  
(اور اس نے تمہیں بادشاہ بنایا اور تمہیں وہ کچھ عطا کیا جو کائنات میں کسی کو بھی عطا نہیں کیا گیا)

سورۃ بقرہ، آیت: ۲۴۷

○ ” وَاَللّٰهُ يُؤْتِيْ مٰلِكَةً مِّنْ يَّسَّآءٍ “  
(اور اللہ اپنا اقتدار جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے)

اس طرح کی دیگر آیات بھی موجود ہیں جن میں اقتدار و سلطنت کو عطیہ الہی اور خداوند نعمت قرار دیا گیا ہے، یہ بات یاد رہے کہ قرآن مجید سلطنت و اقتدار اور حکمرانی کو تقویٰ پر مبنی ہونے کی بناء پر ایک شرف و بزرگی قرار دیتا ہے کیونکہ تقویٰ ہی وہ حقیقت ہے جسے انسانی حیات کی عظیم ترین و پاکیزہ صفات میں سے کرامت و بزرگی اور شرف و عزت کا واحد ذریعہ و سبب قرار دیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۃ حجرات، آیت: ۱۳

○ ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۗ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَىٰ“

(اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہیں گروہ گروہ اور قبیلہ قبیلہ بنایا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بے شک تم میں سے سب سے زیادہ عزت و بزرگی اسے حاصل ہے جو تم سے زیادہ تقویٰ والا ہو)

تقویٰ چونکہ ایک ایسی قلبی صفت ہے جس کا تمام معاملہ خدا کے ہاتھ میں ہے لہذا اس کی بناء پر کوئی کسی پر برتری کا اظہار نہیں کر سکتا، اسی لئے کوئی کسی پر اپنی بزرگی نہیں جتلا سکتا کیونکہ اگر کسی دنیاوی چیز کی بناء پر فخر و مباہات کی جائے تو وہ اس لئے صحیح نہیں کہ دنیاوی امور کی کوئی حیثیت اور قدر و منزلت ہی نہیں، اور اگر کسی اخروی چیز کو جو افتخار قرار دیا جائے تو ہر اخروی امر کا حساب و کتاب خدا کے ہاتھ میں ہے، جہاں تک قدر و منزلت کا تعلق ہے تو وہ صرف دین کو حاصل ہے، بنا بریں کوئی چیز ایسی ہے ہی نہیں جس کی بناء پر فخر اور برتری کا اظہار کیا جائے، لہذا جو شخص سلطنت و اقتدار کی نعمت سے بہرہ ور ہو وہ ایک مسلمان کی نگاہ میں نہایت سنگین بوجھ اپنے اوپر لادنے والا اور سختی و مشقت بھری زندگی گزارنے والا شخص ہوتا ہے، البتہ اس کا مقام و مرتبہ بارگاہ خداوندی میں بہت بلند اور وہ عظیم اجر و ثواب کا حقدار ہوتا ہے بشرطیکہ وہ عدل و تقویٰ کی راہ پر چلے، اور یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جسے اولیائے دین نے اپنایا اور اس سلسلہ میں ہم سیر حاصل بحث اور تفصیلی مطالب مستقل موضوع کی صورت میں حضرت پیغمبر اسلام اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت طیبہ کے تذکرے میں کریں گے اور یہ بیان کریں گے کہ اس مقدس کردار کے ثبوت و دور رس آثار و نتائج انسانی معاشرہ میں بھرپور صورت میں ظاہر ہوئے، جبکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ان عظیم ہستیوں کو اپنی حکمرانی و اقتدار سے سوائے اس کے کچھ نہ ملا کہ وہ اپنے زمانے کے جابروں و آمروں سے نیر و آزا رہے اور زمین میں فساد پھیلانے والے عناصر کے مقابلے میں میدان عمل میں نکلے، انہوں نے اپنے دور کے سرکشوں اور متکبرین کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

بنا بریں قرآن مجید نے لوگوں کو سلطنت و اقتدار کی مسندیں سجانے کے لئے معاشرہ کی تشکیل کی دعوت نہیں دی اور نہ ہی قیصریت و کسرویت کی بنیادیں مضبوط کرنے کی راہ پر لگایا بلکہ اس نے حکمرانی و اقتدار کو انسانی معاشرہ کے ان لازمی اور

نہایت ضروری امور میں سے قرار دیا جس پر معاشرتی زندگی کی سعادت و خوش بختی موقوف ہے مثلاً تعلیم اور دشمنانِ دین کو مرعوب کرنے کے لئے عسکری قوت تیار کرنا وغیرہ، بلکہ قرآن مجید نے لوگوں کو اجتماعی زندگی اور دین پر مبنی یکجہتی اور اتحاد و اتفاق کی دعوت دی، اور انہیں تفرقہ و دشمنی سے منع کیا، اور انہی امور کو حکومت داری و معاشرتی زندگی کی اصل و اساس قرار دیا چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۃ النعام، آیت: ۱۵۳

○ ” وَأَنْ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السَّبِيلَ فَتَقَرَّبَ إِلَيْكُمْ مِنْ سَبِيلِهِ“

(اور یہ ہے میرا سیدھا راستہ، پس تم اس کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں کی پیروی نہ کرو ورنہ وہ تمہیں خدا کی

راہ سے دور اور پراکندہ و متفرق کر دیں گے)

ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا:

سورۃ آل عمران، آیت: ۶۴

○ ” قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا

نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿۶۴﴾“

(کہہ دیجئے، اے اہل کتاب! آؤ اور اس بات پر اتفاق کرو جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے اور وہ یہ

کہ ہم خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی چیز کو اس کا شریک قرار نہ دیں اور نہ ہی ہم میں سے کوئی شخص دوسرے کو خدا کے علاوہ رب قرار دے، لیکن اگر وہ اس سے روگردانی کریں تو کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم تسلیم کرنے والے ہیں)

تو قرآن مجید، جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا، لوگوں کو اس کے علاوہ کسی چیز کی دعوت نہیں دیتا کہ وہ خدائے یکتا کے حضور سر تسلیم خم کریں، اور وہ دینی معاشرہ کے علاوہ کسی بھی معاشرہ کو اعتباری نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ اس کے علاوہ ہر چیز کو مسترد کرتا ہے کہ جس میں خدا کے مقابل قرار دیئے جانے والوں کی عبادت و بندگی، ہر طاقتور و آمر کے سامنے سر نیا زخم کرنا، نام نہاد معیاروں پر مبنی عظمتوں و رفعتوں سے دل بستگی، قیصری و کسروی سلطنت و حاکمیت سے دلداری و فرماں برداری، جغرافیائی حدود اور گونا گوں اوطان کی تشکیل جیسے موہوم و باطل امور شامل ہیں۔

## ایک فلسفیانہ بحث

یہ بات ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ ذات باری تعالیٰ ہی عالم ہستی میں پائے جانے والے سلسلہ علیت (علت و معلوم کا نظام) کا منتہا ہے اور اس کے اور عالم ہستی کے درمیان جزئی و کلی ہر طرح سے ایسا رابطہ قائم ہے جو سلسلہ علیت کی اصل و اساس سے عبارت ہے (یعنی وہ موجودات عالم کی علت العلل ہے اور وجود میں آنے والی ہر شے کا سبب اسی پر منتہی ہوتا ہے)، چنانچہ علت و معلول سے مربوط تمام بحثوں میں یہ مطلب واضح و روشن اور مرحلہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ علیت کا نظام صرف وجود ہستی میں پایا جاتا ہے یعنی کائنات میں جو چیز بھی وجود رکھتی ہے اس کا وجود حقیقت میں اپنی علت (وجود میں آنے کا اصل سبب) کے وجود کا پر تو اور جھلک ہے، اور جہاں تک حقیقی وجود کے علاوہ کا تعلق ہے مثلاً ماہیت وغیرہ تو ان میں وجودی تشریح کا تصور ہی نہیں پایا جاتا اور نہ ہی کسی سرچشمہ وجود سے ان کا ربط بنتا ہے بلکہ انہیں کسی علت کی ضرورت ہی نہیں، اس مطلب کو دوسرے رخ سے دیکھیں..... یعنی عکس نقیض کے آئینہ میں دیکھیں..... تو یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ جو چیز حقیقی وجود نہیں رکھتی وہ ”معلول“ نہیں (اپنے وجود میں آنے کے لئے کسی علت سے وابستہ نہیں) اور چونکہ ”معلول“ نہیں لہذا واجب الوجود ذات باری تعالیٰ تک منتہی نہیں ہوتی۔

مذکورہ بالا مطلب کی بناء پر ایک مشکل صورت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ جو چیز بھی حقیقی وجود نہیں رکھتی وہ معلول نہیں کہلاتی اور جو معلول نہیں اس کا منتہا ذات باری تعالیٰ نہیں، تو ان امور کی نسبت کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو صرف اعتباری حیثیت رکھتے ہیں؟ کیونکہ اعتباری امور کا حقیقی وجود ہوتا ہی نہیں بلکہ وہ بنیادی طور پر ہی حقیقی وجود سے عاری ہوتے ہیں اور ان کا وجود ثبوت اعتباری حدود سے باہر نہیں جاتا بلکہ ان کا محور اعتباری حوالہ اور معرضی جہت و وضعی پہلو کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اور شریعت الہیہ جن چیزوں پر مشتمل ہے یعنی امر، نہی، احکام اور دیگر قرار دیے جانے والے امور تو وہ سب اعتباری ہیں لہذا خدا کی طرف ان کی نسبت کا مسئلہ مشکل ہے، یہی بات مالکیت، عزت و رزق وغیرہ کی بابت ہے کہ وہ بھی اعتباری و قرارداری امور ہیں لہذا انہیں کس حوالہ سے خدا کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے؟

اس مشکل اور پیچیدگی کا حل صرف اس صورت میں ممکن و قابل تصور ہے کہ اگر چہ وہ امور جن کا ذکر ہوا ہے حقیقی وجود سے جاری ہیں لیکن ان کے کچھ ایسے آثار ہیں جو ان کے ناموں کو باقی رکھے ہوئے ہیں جیسا کہ اس مطلب کو متعدد بار پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، اور وہ آثار حقیقی امور ہیں کہ جو اعتباری بنیاد پر تصور واقع ہوتے ہیں اور انہیں خداوند عالم سے نسبت حاصل ہوتی ہے، تو انہی آثار کا خدا تعالیٰ سے منسوب ہونا ان کے امور اعتباریہ کے خدا سے منسوب ہونے کو درست قرار دیتا ہے،

یعنی اعتباری امور کے آثار کا چونکہ خدا سے انتساب درست ہے لہذا اس حوالہ و بنیاد پر اصل امور اعتباریہ کا استناد و انتساب بھی خدا کی طرف درست قرار پاتا ہے۔ اس کی وضاحت اس طرح سے ہو سکتی ہے کہ حاکمیت جو کہ ہمارے درمیان معاشرتی زندگی کے حوالہ سے ایک اعتباری و قرارداری امر ہے اور اس میں حقیقی جوود کے معنی کا کوئی پہلو نہیں پایا جاتا بلکہ وہ سراسر ایک خیالی و موہوم معنی ہے کہ جسے ہم اس کے حقیقی آثار تک پہنچنے کے لئے وسیلہ قرار دیتے ہیں کیونکہ اس موہوم حقیقت کے بغیر ان حقیقی آثار کا حصول ممکن نہیں ہوتا بلکہ وہ آثار اسی پر موقوف ہوتے ہیں اور اسی کو حقیقی تصور کرنے سے وابستہ ہیں جبکہ وہ ہمارے ہی اعتبار کردہ ہیں لیکن ان کے حقیقی آثار سے بہرہ وہ ہونا ہمارا مقصد اعلیٰ ہوتا ہے اس لئے ہم ان اعتباری امور کا سہارا لیتے ہیں اور انہیں وسیلہ و ذریعہ قرار دے کر ان کے حقیقی آثار کو حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ آثار جو عالم خارج میں ہمارے سامنے ہیں اور ہم ان کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ طاقتور افراد اسی موہوم اعتباری حقیقت کی بناء پر رعب و طاقت کے استعمال سے کمزور و ضعیف اور معاشرے کے ناتواں لوگوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتے ہیں اور ان کا استحصال کرتے ہیں جس کے نتیجے میں اس اعتباری حقیقت سے محروم افراد ذلت و بیچارگی سے دوچار ہو جاتے ہیں، اسی طرح اس اعتباری حقیقت کے سہارے پر ہر حقدار کو اس کا حق دلانا اور معاشرہ کے ہر فرد کو اس کا جائز مقام عطا کرنا ممکن و یقینی ہوتا ہے، گویا اس کے ذریعے مثبت و منفی دونوں پہلو امکان پذیر ہوتے ہیں۔

لیکن چونکہ حاکمیت کی حقیقت اور اس کا نام اس وقت تک باقی ہوتا ہے جب تک اس کے آثار خارجہ اس پر مترتب ہوتے ہوں لہذا ان آثار خارجہ کا ان کی علتوں اور وجود میں آنے کے حقیقی اسباب کی طرف منسوب ہونا بعینہ اصل مالکیت کا ان علت کی طرف منسوب ہونا ہے، دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہی حال ”عزت“ کا ہے کہ جو اعتباری امور میں سے ایک ہے یعنی اس کا اور اس کے آثار خارجہ کا اپنی حقیقی علت کی طرف منسوب ہونا مالکیت و حاکمیت کی طرح ہے، بلکہ اس سے وسیع تر یہ کہ تمام اعتباری امور کا استناد و انتساب اسی طرح سے ہے مثلاً امر و نہی، حکم اور وضع وغیرہ، ان تمام امور کے آثار خارجہ کی نسبت ان کی علت کی طرف دی جاتی ہے اور خود ان امور کی نسبت بھی ان کی علت کی طرف دی جاتی ہے۔

اسی بیان سے یہ حقیقت واضح و روشن ہو جاتی ہے کہ چونکہ تمام اعتباری امور کے آثار خداوند عالم کی طرف منسوب ہوتے ہیں لہذا خود ان کی نسبت بھی ذات باری تعالیٰ کی طرف درست ہے البتہ اس معنی و حیثیت میں کہ جو خداوند قدوس کی ذات والا صفات کے شایان شان اور اس کی عزت و عظمت کے زیبا ہے۔



## آیات ۲۸ تا ۳۲

- لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰتًا ۗ وَيَحٰذِرْكُمْ اللّٰهُ نَفْسَهُ ۗ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾
- قُلْ اِنْ تَحْفَظُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبَدُّوْهُ لَا يَعْلَمُهٗ اللّٰهُ ۗ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾
- يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۗ وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ تُوَدِّ اَنْ يَّبِيْهَا وَيُبَيِّنَهٗ اَمَدًا بَعِيْدًا ۗ وَيَحٰذِرْكُمْ اللّٰهُ نَفْسَهُ ۗ وَاللّٰهُ رَعُوْفٌ بِالْعٰبِدِيْنَ ﴿۳۰﴾
- قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحِبِّكُمْ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾
- قُلْ اَطِيعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

## ترجمہ

”مؤمنین، مؤمنین کے مقابلے میں کافروں کو اپنا دوست و حاکم نہ بنائیں، جو شخص ایسا کرے گا تو اس کا خدا سے کوئی تعلق نہ ہوگا، البتہ اگر ان سے ڈر کی وجہ سے ایسا ہو تو (اسی حد تک رہنا چاہیے) اور خدا تمہیں اپنی مخالفت سے بچنے کا حکم دیتا ہے، اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے“

(۲۸)

”کہہ دیجئے کہ اگر تم اپنے دل کی بات چھپائے رکھو یا اسے ظاہر کرو اللہ اسے جانتا ہے، اور وہ اس سب کچھ کو جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ ہر شے پر قادر ہے“

(۲۹)

”اس دن ہر شخص اپنے ہر نیک اور برے عمل کو اپنے سامنے پائے گا اور جب برے عمل کو دیکھے گا تو چاہے گا کہ کاش اس کے اور اس عمل کے درمیان بہت دور کا فاصلہ ہوتا، اور اللہ تمہیں اپنی مخالفت سے ڈراتا ہے، اور اللہ بندوں پر نہایت مہربان ہے“

(۳۰)

”کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا کہ اللہ معاف کرنے والا نہایت مہربان ہے“

(۳۱)

”کہہ دیجئے، تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، اگر تم روگردانی کرو تو یاد رکھو کہ اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا“

(۳۲)

## تفسیر و بیان

سابقہ آیات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ حقیقت واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ زیر نظر آیات مبارکہ (۳۲ تا ۲۸) ما قبل آیات سے ربط و تعلق سے خالی نہیں، کیونکہ ہم نے سابقہ آیات کی تفسیر میں ذکر کیا تھا کہ ان میں اہل کتاب اور مشرکین کے بارے میں مطالب ذکر کئے گئے ہیں اور چونکہ یہ مقام ہی ان لوگوں کے بارے میں تذکرہ کا ہے لہذا یہاں بھی انہی کی بابت مطالب ذکر کئے گئے ہیں، اور ان مطالب سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان میں ”کافرین“ سے یا تو اہل کتاب اور ان کے علاوہ دیگر منکرین سب مراد ہیں یا صرف مشرکین مراد ہیں، اگر پہلی صورت ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ زیر نظر آیات مبارکہ (۳۲ تا ۲۸) میں جن سے دوستی قائم کرنے سے روکا گیا ہے ان میں اہل کتاب اور مشرکین وغیرہ سب شامل ہیں، اور اگر دوسری صورت ہو یعنی صرف مشرکین مراد ہوں تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ مشرکین سے دوستی کا رشتہ استوار نہ کرو بلکہ ان سے قطع تعلق کر لو اور خدا والوں کے گروہ میں شامل ہو جاؤ اور خدا کی محبت کا چراغ کا شانہ دل کے دروہام پر روشن کر کے رسول اللہ کی اطاعت و فرماں برداری کا عملی دم بھرو۔

### کافروں سے دوستی کی ممانعت

○ ”لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكُفْرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ“  
(مؤمنین، مؤمنین کو چھوڑ کر کافروں کو دوست و حاکم نہ بنائیں)

اس آیت مبارکہ میں لفظ ”أَوْلِيَاءَ“ ذکر ہوا ہے، یہ جمع کا صیغہ ہے، اس کا مفرد ”ولی“ ہے جو کہ ”ولایت“ سے مشتق ہے ولایت کا معنی دراصل کسی چیز کے امور کا مالک ہونا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے: ”ولسى الصغير“، ”ولسى المجنون“ ”ولسى المعنوه“ یعنی بچہ کا ولی، دیوانہ کا ولی، نادان کا ولی، تو ان میں ولی سے مراد ان کے امور و اموال کی

تدبیر کا کامل اختیار رکھنے والا ہے، اگرچہ وہ سب اپنے اموال کے خود ہی مالک ہوتے ہیں لیکن ان اموال کے خرچ و حفاظت اور دیگر متعلقہ امور کی تدبیر کا مالک ان کا ولی ہوتا ہے جو ان کے بارے میں فیصلہ کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔

یہ تو ہے لفظ ”ولسی“ کا اصل معنی، لیکن کثرت استعمال سے اسے محبت اور دوستی کے معنی میں استعمال کیا جانے لگا یہاں تک کہ اسی معنی میں اس کا استعمال زیادہ ہو گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس میں دو دستوں کا ایک دوسرے کے امور میں تصرف کرنا ملحوظ ہو کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محبت اپنے محبوب کے ارادہ و چاہت اور خواہش کے مطابق اس کے متعلقہ و پسندیدہ امور میں دخل ہوتا ہے اور محبوب اپنے محبت کو اپنے امور میں دخل ہونے کا حق دیتا ہے، اور اس کا اس کے متعلقہ امور میں تصرف کرنا دراصل دل کی وابستگی کا مظہر و ذریعہ ہوتا ہے کہ جس سے قلبی و روحانی رشتہ کا ثبوت ملتا ہے، بنا برائیں محبوب کا محبت کی زندگی میں اس کے امور میں تصرف کرنا محبت کے رشتہ سے ہرگز خالی نہیں ہو سکتا۔

مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں کافروں کو اپنا ولی و دوست بنانے سے مراد ان سے روحانی رشتہ قائم کرنا ہے کہ جس کا نتیجہ ان سے قریبی میل جول رکھنا، ان کی خوشی و خوشنودی کے لئے ان کی مرضی پر چلنا، ان کے اخلاق و عادات کو اپنانا اور زندگی کے دیگر امور میں اس طرح ان سے گھل مل جانا ہے کہ وہ مؤمنین کے امور میں دخل ہوں، چنانچہ ان سے اس قدر قریبی تعلق قائم کرنے کی ممانعت کے حکم کو ”مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ“ کے الفاظ سے مقید کر کے ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ ان الفاظ میں اس امر کی طرف واضح اشارہ بلکہ صریح دلالت پائی جاتی ہے کہ ”مؤمنین کے علاوہ“ یا ”مؤمنین کو چھوڑ کر“ یا ”مؤمنین کے مقابلے میں“ کافروں کو مؤمنین سے دوستی و محبت کو مؤمنین سے دوستی پر ترجیح دینے کا معنی دیتے ہیں کہ جس کی ممانعت کی گئی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مؤمنین کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی کا رشتہ اس قدر محکم و مضبوط کر لیا جائے کہ مؤمنین کی بجائے کافروں کے ہاتھوں میں اپنی زندگی کی زمام امور سپرد کر دیں کہ جس کا نتیجہ کافروں کا سہارا لینا اور مؤمنین سے دوری اختیار کر کے کافروں سے قریب ہونا ہے۔

قرآنی آیات مبارکہ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان میں کافروں، یہودیوں اور نصاریٰ سے دوستی و محبت اور انہیں اولیاء بنانے کی ممانعت کی گئی ہے، لیکن ہر آیت میں دوستی و ولایت کے موارد دوسری آیت سے مختلف ہیں اور ان موارد کی تفسیر اسی آیت میں مذکور الفاظ سے ہو جاتی ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں نبی کا معنی کیا ہے؟ اور منوعہ دوستی و ولایت کی کیفیت اور حدود و قیود کیا ہیں جیسا کہ زیر نظر آیت مبارکہ میں الفاظ ”مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ“ کہ جو ”لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكُفْرَانَ أَوْلِيَاءَ“ کے فوراً بعد ذکر ہوئے ہیں ان سے کافروں سے رشتہ محبت و ولایت کی کیفیت اور معیار و بنیاد سے آگاہی دلائی گئی ہے، اور اسی طرح درج ذیل آیت مبارکہ میں بھی یہی صورت دکھائی دیتی ہے:

سورۃ مائدہ، آیت: ۵۱:

○ ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ“

(اے ایمان والو! تم یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ)

اس آیت میں الفاظ ”بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ“ (کہ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں) بھی مذکور ہیں جو

ممانعت کی وجہ کو بیان کرتے ہیں۔

ایک اور آیت میں ان سے دوستی کی ممانعت اور اس کی کیفیت و وجہ اس طرح ذکر کی گئی ہے جس سے واضح طور پر

اس حکم کا بنیادی فلسفہ اور مصلحت و حکمت سے آگاہی حاصل ہو جاتی ہے (ملاحظہ ہو)

سورۃ ممتحنہ، آیات ۸۲ تا ۸۳:

○ ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ.....“

(اے ایمان والو! تم میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔۔۔۔۔)

اس کے تسلسل میں ارشاد ہوا:

”لَا يَنْهٰكُمْ اللّٰهُ عَنِ الذِّينَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ.....“

(اللہ تمہیں ان سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں کرتے)

تو اس جملہ میں پہلے جملہ کی تفسیر مذکور ہے اور دوستی و ولایت کی حدود کا تعین ہوتا ہے۔

بنا برائیں زیر نظر آیت مبارکہ میں جو اوصاف ذکر کئے گئے ہیں اور کہا گیا ہے ”لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكُفْرِيْنَ

أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِيْنَ“ (مؤمنین، مؤمنین کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست و حاکم نہ بنائیں) تو اس میں حکم کی علت

و سبب کا بیان مقصود ہے اور وہ یہ کہ ان دو صفتوں یعنی کفر اور ایمان کے درمیان جو دوری و بعد اور تضاد و جدائی پائی جاتی ہے وہ لا

محالہ ان دو صفتوں کے حامل افراد کے درمیان بھی سرایت کرتی ہے کہ جس کے نتیجہ میں وہ دو یعنی اہل کفر اور اہل ایمان تمام

متعلقہ امور میں ایک دوسرے سے مختلف و جدا ہوتے ہیں مثلاً علوم و معارف، اخلاق و عادات، عبادات و خدا کے تقرب کے

لئے اختیار کئے جانے والے طرز عمل اور زندگی کے دیگر امور و مسائل میں ان کے درمیان واضح اختلاف و فرق ہوتا ہے اور وہ

فرق بھی اس حد تک کہ ان کے درمیان دوستی و ولایت کا رشتہ قائم ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ ولایت و دوستی فکری و عقیدتی اور ذہنی

امتزاج و ہم آہنگی چاہتی ہے جبکہ وہ دو صفتیں یعنی کفر و ایمان کہ جو ان افراد میں پائی جاتی ہیں وہ ایک دوسرے سے جدائی و

بینونت کا باعث بنتی ہیں، لہذا اگر کسی مؤمن کے دل میں کافر کے بارے میں دوستی و محبت کے جذبات گھر کر جائیں اور ان میں

قوت و شدت پیدا ہو جائے تو جتنی مقدار میں اس میں اضافہ ہوگا اتنی مقدار میں ایمان کے آثار و خصوصیات میں کمی آجائے گی یہاں

تک کہ رفتہ رفتہ وہ (ایمان) ختم ہو جائے گا اور اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہے گا، یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے کافروں سے دوستی و محبت کے رشتہ کو مستحکم کرنے کی ممانعت کا حکم صادر کرنے کے بعد فوراً ارشاد فرمایا: ”الان تتقوا منهم تقیة“ (مگر یہ کہ تم ان سے خوفزدہ ہو) تو اس میں تقیہ کے مورد کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے کیونکہ تقیہ کا مطلب یہ ہے کہ ظاہری طور پر ان سے اظہار و ولایت کیا جائے جبکہ حقیقت میں ولایت و دوستی نہ ہو، (دل و باطن اور حقیقت میں ان سے ولایت و محبت کا کوئی رشتہ نہ ہو بلکہ صرف ڈر اور ان کے شر سے بچنے کے لئے ظاہری و زبانی طور پر اس کا اظہار کیا جائے)۔

## قرآنی ادب کا ایک نمونہ

زیر نظر آیت مبارکہ میں ارشاد ہوا ”مَنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ“، اس میں حرف ”دُونِ“ (علاوہ) ذکر ہوا ہے جو کہ ظرف کی طرح ”عند“ (پاس) کا معنی دیتا ہے، البتہ اس میں کمتری و ناچیزی کا معنی بھی قابل تصور ہے، اس بناء پر آیت کا معنی یوں ہوگا: مؤمنین، مؤمنین کے علاوہ کافروں کو اپنا دوست و ولی نہ بنائیں اور انہیں (کافروں کو) مؤمنین کی جگہ پر نہ لائیں کیونکہ کافرین کا مقام و رتبہ مؤمنین کے مقابلے میں کمتر و ناچیز ہے اور مؤمنین ان سے بہت بلند مقام و منزلت کے مال ہیں۔

بظاہر حرف ”دُونِ“ کا اصل معنی یہی ہے جو ذکر کیا گیا ہے کہ اس میں پستی کی حامل نزدیکی کا مفہوم پایا جاتا ہے، چنانچہ عربوں کا قول ”دونک زید“ یہ معنی دیتا ہے کہ زید تیرے پاس یا تیرے مقام و رتبہ سے نیچے درجہ پر ہے جیسے ایک درجہ دوسرے درجہ سے نیچے ہوتا ہے (یا ایک سیڑھی دوسری سیڑھی کے نیچے ہوتی ہے) لیکن اسے حرف ”غیر“ کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوا:

سورۃ مائدہ، آیت: ۱۱۶

○ ”إِلٰهَيْنِ مِنْ دُونِ اللّٰهِ“

(خدا کے علاوہ دو خدا)

سورۃ نساء، آیت: ۳۸

○ ”وَيَعْفِرْ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ“

(اور وہ اس کے علاوہ جسے چاہتا ہے معاف کرتا ہے)

اس آیت (نساء، ۳۸) میں ”علاوہ“ اور ”کتر و پست تر“ کا معنی بھی کیا جاسکتا ہے یعنی دونوں معنی ممکن ہیں۔

حرف ”دون“ کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ اسے اسم فعل میں استعمال کیا جاتا ہے مثلاً یوں کہا جاتا ہے: ”دونک زیدا“ یعنی زید کا خیال رکھنا، اس کے ساتھ ساتھ رہنا، نہ یہ کہ وہ ان تمام معانی میں مشترک لفظی ہے، یعنی ایسا نہیں کہ ہر معنی کے لئے یہی ایک لفظ بنایا گیا ہو اور ان سب میں برابر حیثیت رکھتا ہو بلکہ مختلف موارد میں منطبق ہونے کی بناء پر اسے مختلف معانی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

### کافروں کو اولیاء بنانے والوں کی حیثیت

○ ”وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِي شَيْءٍ“  
(اور جو شخص ایسا کرے تو اس کا خدا سے کوئی تعلق نہ ہوگا)

یعنی جو شخص مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بنائے اس کا خدا سے کوئی تعلق نہ رہے گا، اس جملہ میں لفظ ”ذٰلِكَ“ استعمال ہوا ہے جو کہ عام ہے یعنی کسی بھی دور کی طرف اشارہ کے لئے آتا ہے، یہاں اسے اس لئے استعمال کیا گیا کہ اس امر کی طرف اشارہ کیا جاسکے کہ متکلم کو اس کام سے کہ جس کی طرف اشارہ ہوا ہے اس قدر سخت نفرت ہے کہ وہ اس کا ذکر زبان پر لانا ہی نہیں چاہتا بلکہ عمومی لفظ کے ذریعے اس کی طرف ملتفت و متوجہ کرنا چاہتا ہے یعنی خداوند عالم کو یہ بات اس قدر ناگوار ہے کہ مؤمنین، مؤمنین کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بنائیں کہ اس عمل کا زبان پر لانا ہی اسے گوارا نہیں لہذا اس نے اسے حرف ”ذٰلِكَ“ (وہ، ایسا) کے ذریعے بیان کیا، یہ اسی طرح ہے جیسے کسی قبیح و برے کام کا ذکر کرنا یہ کیا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ اس برے عمل سے شدید نفرت ہے اور اس کا زبان پر لانا ہی گوارا نہیں سمجھا جاتا، اس کے علاوہ یہ بات بھی اسی حوالہ سے ہے کہ خداوند عالم نے اس جملہ میں مؤمنین کا لفظ بھی ذکر نہیں کیا اور یوں نہیں فرمایا: ”وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ“ (اور جو کوئی مؤمن ایسا کرے) بلکہ فرمایا: ”وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ“ (اور جو شخص ایسا کرے.....) تو اس سے بھی اس امر کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ مؤمنین کی شان اس سے کہیں بالاتر ہے اور وہ اس سے برابر ہیں کہ ان کی طرف اس طرح کے قبیح عمل کی نسبت دی جائے..... کہ وہ مؤمنین کو چھوڑ کر کافروں کو اپنے دوست بنائیں.....

## ادبی ظرافت کی ایک مثال

آیت مبارکہ میں ارشاد ہوا: ”فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ.....“ تو یہاں حرف ”مِنَ“ ابتداء کے لئے ہے اور عام طور پر اس طرح کے موارد میں اس کا معنی ”گروہ“ اور ”جماعت“ میں سے ہوتا ہے یعنی ”لیس من اللہ“ (اور اللہ سے نہیں) کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے گروہ میں سے نہیں، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

سورۃ مائدہ، آیت: ۵۶:

” وَمَنْ يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ“

(اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول اور ایمان والوں سے دوستی و محبت کرے اور ان کی ولایت کا دم بھرے تو یقیناً اللہ کا گروہ ہی غلبہ والا ہے)

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوا کہ انہوں نے کہا:

سورۃ ابراہیم، آیت: ۳۶:

” فَمَنْ يَتَّبِعْنِي فَإِنَّهُ مِنِّي“

(تو جو شخص میری پیروی کرے گا وہ مجھ سے ہوگا)

یعنی میرے گروہ میں شمار ہوگا،

بہر حال یہاں حرف ”مِنَ“ کے حوالہ سے آیت کا معنی (واللہ اعلم) یہ ہوگا: ”لیس من حزب اللہ مستقراً فی شیء من الاحوال و الآثار“ کہ وہ شخص کسی بھی حال و صورت میں ہرگز خدا کے گروہ میں قرار پانے والا نہیں۔

## تقیہ کا استثناء

” إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً“

(مگر یہ کہ تم ان سے سخت خوفزدہ ہو)

”تتقوا“ ”اتقاء“ سے ہے، اس کا اصل معنی خوف سے بچنا ہے، اور چہ بسا اسے خود خوف کے معنی میں بھی ذکر کیا



جاتا ہے جو کہ مسبب کو سبب کے مورد و مقام میں استعمال کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے، شاید یہاں آیت مبارکہ میں تقیہ کا لفظ اسی طرح کے استعمال کی صورت میں ہو۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ استثناء، استثناء منقطع ہے کیونکہ خوف کی وجہ سے ظاہری طور پر دوستی و محبت کا اظہار دل سے محبت و ولایت کا رشتہ جوڑنے سے قطعی مختلف ہے اور اسے حقیقی معنی میں دوستی و محبت اور ولایت قرار نہیں دیا جا سکتا، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ خوف اور محبت دو ایسے امور ہیں جن کا تعلق دل سے ہوتا ہے اور وہ دونوں متضاد صفتیں ہیں کہ جن میں سے ہر ایک، دوسری سے قطعی مختلف آثار رکھتی ہے اور دونوں کے آثار لوہجہ دل پر ایک دوسری کے مقابل صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں، تو یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ وہ دونوں اکٹھی ہو جائیں اور ایک دل میں دونوں ایک ہی وقت میں یکجا ہوں؟ ایسا ہونا ہرگز ممکن نہیں، بنا بریں آیت مبارکہ میں تقیہ استثناء منقطع ہوگا، یعنی جس سے اس کا استثناء ہوا ہے یہ اس کی جنس سے نہیں۔

یہ آیت مبارکہ واضح طور پر تقیہ کے جواز پر دلالت کرتی ہے اور اسی کی بابت حضرات آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی روایات وارد ہوئی ہیں، جیسا کہ اس آیت مبارکہ میں تقیہ کا تذکرہ ہوا ہے جو حضرت عمار یا سر اور ان کے والدین یا سر اور سمیہ کے بارے میں نازل ہوئی جس میں یوں ارشاد الہی ہوا:

سورہ نحل، آیت: ۱۰۶

○ ” مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أَكْرَهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ وَلَكِنْ مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِنَ اللَّهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○“

(جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرے، مگر وہ کہ جسے مجبور کیا جائے جبکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو، لیکن جو شخص کفر کے لئے اپنا سیدہ کھول دے تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب نازل ہوگا اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے)

الخصر یہ کہ کتاب و سنت سے تقیہ کا جواز اجمالی طور پر ثابت ہے اور اس کے فی الحکمہ جواز پر دونوں میں واضح ثبوت پائے جاتے ہیں اور اس کی تائید عقلی اصولوں سے بھی ہوتی ہے کیونکہ دین کا مقصد اور شارع مقدس کی کاوشوں کا ہدف اس کے سوا کچھ نہیں کہ حق ظاہر ہو اور زندہ و تابندہ رہے، اور چہ بسا ایسا ہوتا ہے کہ تقیہ اور دشمنان دین و مخالفین حق کے ساتھ ظاہری طور پر ہم صدا ہونا دین کے تحفظ، خدائی مصلحتوں کی پاسداری اور حق کو زندہ رکھنے کی بابت تقیہ کو ترک کرنے کے مقابلے میں زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے، اور یہ بات زمینی حقائق کے ناظر میں ناقابل تردید ہے، اس کے باوجود کوئی اس کا انکار کرے تو اس کا عمل ڈھٹائی اور واضح امور کو رد کر دینے کے باب سے ہوگا، اس کی بابت تکمیلی سلسلہ بحث ”روایات پر ایک نظر“ میں ہوگا اور سورہ نحل کی تفسیر میں اس کی مذکورہ آیت (۱۰۶) ”مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أَكْرَهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ“

بِالْإِنِّیَانِ“ کے بیان میں مزید وضاحت ہوگی۔ انشاء اللہ،

خدا کا اپنے آپ سے خبردار کرنا

○ ”وَيَحْذَرُكُمْ اللَّهُ نَفْسَهُ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ“  
(اور خدا تمہیں اپنے آپ سے خبردار کرتا ہے، اور اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے)

”يَحْذَرُكُمْ“، حذر سے باب تفعیل ”تحذیر“ کا فعل مضارع ہے، ”تحذیر“ کا معنی خوفناک چیز سے بچ کر رہنا ہے۔ اس آیت میں خداوند عالم کا یہ کہنا کہ وہ اپنے بندوں کو اپنے آپ سے بچ کر رہنے کا حکم دیتا ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ وہ انہیں اپنے عذاب سے بچ کر رہنے کی تاکید کرتا ہے جیسا کہ ارشاد ہوا:

سورۃ اسرئٰی، آیت: ۵۷

○ ”إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا“

(بے شک تیرے رب کا عذاب ایسا ہے کہ اس سے بچنا ضروری ہے)

اسی طرح خداوند عالم نے اپنے رسولؐ کو منافقوں اور کافروں کی شرانگیزیوں سے بچ کر رہنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

سورۃ منافقین، آیت: ۳

”هُمُ الْعَدُوُّ وَقَدْ حَذَّرَهُمْ“

(وہ دشمن ہیں ان سے بچ کے رہو)

سورۃ مائدہ، آیت: ۳۹

○ ”وَاحْذَرُكُمْ أَنْ يَقْتُلُوكَ“

(اور ان سے بچ کے رہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تجھے اپنی فتنہ انگیزی کا شکار کر لیں)

اور زیر نظر آیہ مبارکہ اور اس کے دو آیتوں کے بعد والی آیت میں خداوند عالم نے اپنے مومن بندوں کو خود اپنی ذات سے بچ کر رہنے کا حکم دیا..... کہ جس کے بارے میں بیان ہو چکا ہے کہ اس سے مراد عذاب خدا سے بچ کر رہنا ہے..... تو اس واضح و صریح بیان میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ خدا خود ہی خوفناک ہے کہ جس سے بچ کر رہنا ضروری ہے کہ کہیں اس کی

نافرمانی کے مرتکب نہ ہوں، ..... وہ اپنی نافرمانی سے بچ کر رہنے کا خوف خود دلاتا ہے..... یعنی خدا کی نافرمانی کرنے والے مجرم اور خود خدا کے درمیان کوئی دوسری خوف آور چیز نہیں کہ جس سے بچنا کسی چیز کے ذریعے ممکن ہو یا کسی مضبوط قلعہ میں پناہ لی جاسکے بلکہ وہ خود خدا ہے کہ جس کی نافرمانی کی صورت میں اس کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں اور نہ ہی نافرمانی کرنے والے شخص اور خدا کے درمیان کوئی ایسی چیز ہے جس کے ذریعے نافرمان شخص کو آنے والی سختی سے بچنے کی توقع کی جاسکے یعنی کوئی ولی اور نہ ہی کوئی شفیع ایسا ہے جو نافرمان شخص کو عذاب الہی سے بچاسکے۔ بنا براین اس حوالہ سے کلام الہی میں شدید ترین اعتبار پایا جاتا ہے اور اس کا ایک ہی مقام میں بار بار ذکر کیا جاتا اس کی شدت میں اضافہ کی نشاندہی کرتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ مزید تاکیدان ذیلی دو جملوں کے ذریعے ہوئی ہے جن میں کہا گیا:

(۱) ”وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ“

(اور اللہ کی طرف ہی ہے بازگشت اور لوٹ کر جانا !)

(۲) ”وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ“

(اور اللہ بندوں پر نہایت مہربان ہے)

اس سلسلہ میں مزید تفصیل عنقریب بیان کی جائے گی۔

اس کے علاوہ زیر نظر آیہ مبارکہ اور دیگر وہ آیات شریفہ کہ جن میں غیر مومنین سے دوستی و محبت کا رشتہ قائم کرنے کی ممانعت کی گئی ہے مجموعی طور پر اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ ایسا کرنا خدا کی بندگی کے دائرے سے باہر نکل جانے کا سبب بنتا ہے اور ولایت الہیہ کو ترک کر کے دشمنان خدا کے گروہ میں شامل ہو کر دینی امور میں خرابی و فساد پھیلانے کی عملی کوشش کہلاتا ہے، خلاصہ یہ کہ وہ ظغیان و سرکشی اور دینی نظام کو تباہ و برباد کرنے کی ایک ایسی شدید ترین صورت ہے جو کافروں کے کفر اور مشرکوں کے شرک سے کہیں زیادہ دین کو نقصان پہنچانے کا باعث ہے کیونکہ ظاہر بظاہر دشمن کا خصمانہ عمل سامنے ہوتا ہے کہ جس کا مقابلہ آسان اور اس سے نمٹنا سہل ہوتا ہے اور اس کے شر سے بچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی لیکن دوستی و محبت کا دم بھرنے والا شخص جب دشمنوں سے دل لگی کرنے لگے اور ان کے اخلاق و آداب اور طور طریقوں کو اپنالے تو وہ دین اور اہل دین کے لئے غیر ارادی طور پر ہی سبھی نہایت نقصان دہ ثابت ہوتا ہے بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ وہ خود بھی تباہ و برباد ہو جاتا ہے اور دوسروں کی تباہی کے دروازے بھی کھول دیتا ہے کہ پھر نہ تو زندہ رہنے کی کوئی امید باقی رہتی ہے اور نہ ہی بقا و سلامتی کا کوئی راستہ دکھائی دیتا ہے۔

بہر حال یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مومنوں کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی و محبت اور ولایت کا رشتہ جوڑنا ظغیان و سرکشی اور دین سے بغاوت کی عملی صورت ہے، اور سرکش و باغی کا معاملہ خود خداوند عالم کے ہاتھ میں ہے، اس ضمن میں قوم عاد

کے بارے میں قرآنی بیان ملاحظہ ہو جس میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورۃ فجر، آیات ۱۳ تا ۶ :

○ ” اَلْحَرَّتْ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۗ اِِرامَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۗ الَّتِي لَمْ يُخَلِّسْ مِنْهَا فِي الْاِلْبَادِ ۗ وَشَبَدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۗ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ۗ الَّذِيْنَ ظَنَعُوْا فِي الْاِلْبَادِ ۗ فَاکْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ۗ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۗ اِنَّ رَبَّكَ لَبِاْلْاَبْرَصَادِ ۗ “

(کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے قوم عاد کے ساتھ کیا سلوک کیا، ستونوں والے ارم کے ساتھ، وہ کہ جن کی مثل کہیں بھی نہیں بنائی گئی، اور قوم ثمود کے ساتھ کیا سلوک کیا... کہ جنہوں نے وادیوں میں چٹانیں تراش کر گھر بنائے ہوئے تھے، اور فرعون کے ساتھ کیا سلوک کیا کہ جو منخوں والا تھا، وہ کہ جنہوں نے لکڑیوں میں سرکشی کی راہ اپنائی، اور ان میں کثرت سے فساد پھیلا یا، تو تیرے پروردگار نے ان پر کڑوں کا عذاب نازل کیا، بے شک تیرا رب گھات میں ہے۔) ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکشی کی سرکشی اسے اس حد تک لے جاتی ہے جہاں خداوند عالم گھات میں ہے کہ پھر سوائے خداوند قدوس کے کوئی دوسرا نہیں، تو خدا اس پر عذاب کے کوڑے برساتا ہے کہ کوئی اس کو روک نہیں سکتا۔

ان مطالب سے ظاہر ہوتا ہے کہ خداوند عالم کا لوگوں کو متنبہ و آگاہ اور خبردار کرنا اور اپنے آپ سے ڈرانا (وَيُحَذِّرُكُمْ اللهُ نَفْسَهُ..... اور اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے.....) اس وجہ سے ہے کہ کافروں و مشرکوں سے دوستی و محبت کا رشتہ جوڑنا خدا سے بغاوت اور اس کے دین میں رخنہ و فتنہ اندازی کر کے اسے تباہ کرنے کی ایک واضح صورت اور کھلا مصداق ہے... لہذا خداوند عالم مؤمنین کو خبردار کرتا ہے کہ سرکشی کی اس مکروہ صورت کو نہ اپنائیں ورنہ انہیں میرے سخت عذاب کا سامنا ہوگا اور کوئی انہیں اس سے بچا نہیں سکتا ،

مذکورہ بالا مطالب کہ جو نتیجہ کے طور پر ہم نے پیش کئے ہیں ان کی صحت پر واضح دلیل یہ ہے :

سورۃ ہود، آیت ۱۱۳ :

○ ” فَاسْتَقْبِحْ كَمَا اٰمَرْتْ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۗ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۗ وَلَا تَتَّكِبُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَنْسِكُمُ النَّارَ ۗ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاءَ ۗ ثُمَّ لَا تُنصَرُوْنَ ۗ “

(پس تم استقامت اختیار کرو (اپنے موقف پر ڈٹے رہو) اور وہ بھی جس نے تیرے ساتھ توبہ کی، اور تم طغیان و سرکشی نہ کرو کہ یقیناً وہ تمہارے اعمال سے بخوبی آگاہ ہے، اور تم ان لوگوں کا سہارا نہ لو جنہوں نے ظلم کیا ورنہ تمہیں آگ پکڑ لے گی اور خدا کے علاوہ جن کو اولیاء سمجھے ہو وہ تمہارے کسی کام نہ آئیں گے پھر تمہاری مدد نہ کی جائے گی)

یہ وہی آیت ہے جس کے بارے میں حدیث نبوی میں وارد ہوا ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اس نے مجھے بوڑھا

کر دیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دو آیتیں جیسا کہ ان میں غور و فکر اور تدبیر سے کام لینے والے ہر شخص پر واضح ہے کہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کافروں میں سے ظالموں کا سہارا لینا طغیان و سرکشی ہے کہ جس کا نتیجہ اس آگ میں جلنا ہے جس سے کوئی بھی بچا نہیں سکتا اور وہ خدائی انتقام ہے کہ جس سے چھٹکارا ممکن نہیں اور نہ ہی کوئی مجرم اس سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے جیسا کہ اس سلسلہ میں مطالب پہلے ذکر ہو چکے ہیں۔

ان مطالب سے یہ نکتہ بھی معلوم و واضح ہو جاتا ہے کہ یہ فقرہ ”وَيُحَدِّثُكُمْ اللَّهُ نَفْسَهُ“ اس امر کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ خداوند عالم کا اس انداز میں خبردار کرنا درحقیقت ایک ایسے عذاب کے بارے میں متنبہ کرنا ہے جو یقینی طور پر طے شدہ ہے کیونکہ اس فقرے میں خداوند عالم نے خود اپنے آپ سے خبردار رہنے کا کہا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ درمیان میں کوئی شے حائل نہیں ہو سکتی اور کوئی چیز خدا سے بچا نہیں سکتی کیونکہ اس نے خود عذاب کی وعید دی ہے، تو اس سے عذاب کا قطعی و یقینی طور پر واقع ہونا ثابت ہوتا ہے جیسا کہ اس کی مانند سورہ ہود کی مذکورہ بالا دو آیتوں میں ذکر ہوا ہے کہ ”ورنہ تمہیں آگ پکڑ لے گی اور تمہیں کوئی بھی مدد دینے والا نہیں ہوگا“ (فتمسکم النار وما لكم من ناصرین)

اور آ یہ مبارکہ کا فقرہ ”وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ“ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ تمہارے لئے عذاب الہی سے بچنے کا کوئی راستہ موجود نہیں اور نہ ہی کوئی ایسی وجہ دکھائی دیتی ہے جس کی بنیاد پر خداوند عالم اسے نظر انداز کر دے، اس سے خدائی انتباہ میں تاکید کا ثبوت ملتا ہے۔

بہر حال ان آیات مبارکہ یعنی ”لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ“ اور اس کے بعد والی آیات کا قرآن مجید میں دی جانے والی غیبی خبروں پر مشتمل آیت میں شمار ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں مزید وضاحت سورہ مائدہ کی تفسیر میں پیش ہوگی، انشاء اللہ تعالیٰ،

## خدا کی ظاہر و باطن سے آگاہی

○ ”قُلْ إِنْ تُحْفُوا مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْدُوا مَا يَكْتُمُ اللَّهُ“  
(کہہ دیجئے کہ تم اپنے دل کی بات چھپاؤ یا ظاہر کرو خدا اس سے آگاہ ہے)  
یہ آیت مبارکہ درج ذیل آیت کے مانند ہے :

سورہ بقرہ، آیت : ۲۸۴

○ ”وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوا مَا يُحَاسِبُكُمْ بِهِ اللَّهُ“

(اور اگر تم اسے ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا اسے چھپائے رکھو خدا اس کی بابت تمہارا محاسبہ کرے گا) ان دو آیتوں میں الفاظ کی ترتیب کا جو فرق ہے اس کی بابت یہ کہا گیا ہے کہ زیر بحث آیت مبارکہ میں چھپانے کا ذکر پہلے اور ظاہر کرنے کا ذکر بعد میں ہے ”تُخْفُوا مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْدُوهُ“ جبکہ سورہ بقرہ کی آیت میں ظاہر کرنے کا ذکر پہلے اور چھپانے کا ذکر بعد میں ہوا ہے: ”تبدوا ما فی انفسکم او تخفوه“، اس حوالہ سے دونوں میں آگاہی اور محاسبہ کے مختلف الفاظ استعمال کئے گئے ہیں کیونکہ علم و آگاہی کا تعلق مخفی و پوشیدہ ہونے سے موزوں جبکہ محاسبہ کا تعلق ظاہر و آشکار ہونے سے موزوں ہے لہذا زیر نظر آیت مبارکہ میں چھپانے کا ذکر ظاہر کرنے سے پہلے کیا گیا جبکہ سورہ بقرہ میں اس کے برعکس ہوا یعنی ظاہر کرنے کا ذکر مخفی کرنے سے پہلے ہوا۔

زیر بحث آیہ مبارکہ میں خداوند عالم نے اپنے رسولؐ کو حکم دیا کہ اس حقیقت کو لوگوں تک پہنچادیں کہ جو کچھ ان کے دلوں میں ہے خواہ اسے چھپائیں یا ظاہر کریں خدا اس سے آگاہ ہے، اس بات کو بلا واسطہ بیان نہیں کیا بلکہ اپنے رسولؐ کے ذریعے پہنچایا جبکہ سابقہ آیات میں خود اس بات کو بیان کیا اور اس کے پہنچانے میں رسولؐ کو ذریعہ نہیں بنایا، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کی ذات اس سے کہیں بالاتر ہے کہ ان لوگوں سے ہمکلام ہو جن کے بارے میں اسے معلوم ہے کہ وہ اس کے احکامات کی نافرمانی کے مرتکب ہوں گے، چنانچہ اس کی مثال فقرہ ”وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ“ میں بھی پائی جاتی ہے۔

اور آیت کے جملہ ”وَيَعْلَمُ مَا فِي السُّبُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“ میں سورہ بقرہ کی مذکورہ آیت سے شباهت و مماثلت پائی جاتی ہے، کہ اس حوالہ سے مربوط مطالب پہلے ذکر ہو چکے ہیں۔

## قیامت کے دن اعمال کا ظاہر بظاہر دکھائی دینا (تجسم اعمال)

○ ”يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ“  
(جس دن ہر شخص اپنے اعمال کو اپنے رو برو پائے گا خواہ اچھا عمل کیا ہو گا یا برا عمل کیا ہوگا)

سیاق کلام کی پیوستگی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت، ما قبل آیت میں جاری سلسلہ گفتگو کا تتمہ ہے کہ جس میں حضرت پیغمبر اسلامؐ کو حرف ”قل“ کے ذریعے پیغام رسانی کا حکم دیا گیا تھا، آیت میں ”يَوْمَ“ ظرف زمان ہے (دن) تو جملہ کی تکمیل کے لئے اس سے پہلے ”اذکرو“ (یاد کرو) فرض کرنا ہوگا تاکہ معنی واضح ہو سکے (اذکر یوم تجدد...) یاد کرو اس دن کو جب ہر شخص پائے گا، یا اس کا تعلق جملہ ”يعلم الله ويعلم.....“ سے جوڑنا پڑے گا تو اس صورت میں

آیت کا معنی یہ ہوگا کہ خدا اس دن جان لے گا جبکہ وہ جانتا ہے، تاہم اس حوالہ سے کوئی حرج نہیں کہ اس دن کا تعلق خدا کے علم و آگاہی سے اس بنیاد پر جوڑا جائے کہ اس دن ہم قیامت کے دن کی صورت حال اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے کیونکہ وہ دن اس نسبت سے علم الہی کا ظرف واقع ہوگا کہ اس میں تمام صورت حال ہمارے سامنے آجائے گی اور سب کچھ ظاہر ہو جائے گا نہ یہ کہ اس دن خدا کو علم حاصل ہوگا، اور یہ یعنی اسی طرح سے ہے جیسے اس دن اس کی حاکمیت اعلیٰ اور قدرت و قوت ظاہر ہوگی چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

سورہ مؤمن، آیت: ۱۶:

”يَوْمَ هُمْ بَرْذُونَ لَآ يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ لِّمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۗ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ“

(اس دن وہ باہر آجائیں گے، ان کی کوئی شے اللہ سے مخفی و پوشیدہ نہ ہوگی، آج کس کی حاکمیت ہے، اللہ کی جو کہ یکتا و غالب ہے)

سورہ ہود، آیت ۴۳:

”لَا عِوَجَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ“  
(آج کوئی بھی خدا سے بچانے والا نہیں)

سورہ بقرہ، آیت ۱۶۵:

”وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرُونَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا“  
(اگر ظلم کرنے والوں کو معلوم ہو کہ جب وہ عذاب کا مشاہدہ کریں گے کہ سب کی سب طاقت خدا کے پاس ہے)

سورہ انفطار، آیت ۱۹:

”وَإِلَّا مَرْيَمَ ابْنَتَ اللَّهِ“

(آج حاکمیت صرف اللہ سے مخصوص ہے)

ان آیات مبارکہ میں حاکمیت، قدرت، قوت و سلطنت کو خدا سے مخصوص قرار دے کر کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن یہ سب کچھ خدا کے پاس ہوگا جبکہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ہر طرح کی مالکیت و حاکمیت، قدرت و توانائی اور قوت و سلطنت ہمیشہ خدا سے مخصوص ہے۔۔۔ قیامت سے پہلے اور قیامت کے بعد۔۔۔ اور ان امور کو قیامت کے دن خدا سے مخصوص کر کے ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ تمام امور قیامت کے دن ہم سب پر ظاہر و آشکار ہوں گے کہ جس میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں پایا جاتا۔

اس بیان سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ اگر ”یَوْمَ“ (ظرف زمان) کو جملہ ”يَعْلَمُهُ اللَّهُ“ سے متعلق قرار دیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ خدا کو صرف قیامت کے دن بندوں کے اسرار اور اچھے و برے اعمال سے آگاہی حاصل ہو گی بلکہ اس سے ہمارے مشاہدے کا ثبوت فراہم ہوگا۔

## ایک ادبی اور علمی نکتہ

آیت مبارکہ میں لفظ ”حاضرا“ کی بجائے ”محضرا“ ذکر ہوا ہے اس کی وجہ وہی ہے جو علم خدا کی بابت بیان کی جا چکی ہے کیونکہ ”محضرا“ جو کہ ”احضار“ (باب افعال) سے مفعول بہ کا صیغہ ہے اس کا معنی ”حاضر کیا گیا“ یا ”حاضر کی گئی چیز“ ہے۔ ”احضار“ کا اطلاق اسی مورد پر ہوتا ہے جہاں کوئی ایسی چیز لائی جائے جو موجود ہو مگر آنے سے پہلے نہ ہو یعنی مخفی و پوشیدہ شے کے بارے میں ”احضار“ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، تو چونکہ بندوں کے اعمال موجود ہیں اور انہیں ضائع ہونے سے محفوظ کر لیا گیا ہے اور خدا ان سے آگاہ ہے وہ ان اعمال کو قیامت کے دن اپنی مخلوق کے سامنے حاضر کرے گا اور خدا کے علاوہ کوئی بھی ان کی حفاظت کرنے والا نہیں، چنانچہ اس کا ارشاد گرامی ہے :

سورہ عسراء، آیت ۲۱ :

○ ”وَسَبَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ“

(اور تیرا پروردگار ہر چیز پر نگران و محافظ ہے)

سورہ ق، آیت ۴ :

○ ”وَعِنْدَنَا كِتَابٌ حَفِيظٌ“

(اور ہمارے پاس محفوظ کرنے والی کتاب ہے)

آیت میں جملہ ”تجدد“ استعمال ہوا ہے، یہ لفظ ”وجلدان“ سے بنا ہے جس کا معنی ”پانا“ ہے کہ جس کا مد مقابل ”فقدان“ ہے یعنی ”کھودینا“، ”محرومیت“،

اور حرف ”من“ جو جملہ ”مِنْ خَيْرٍ مِنْ سُوءٍ“ میں استعمال ہوا ہے وہ بیان ہے یعنی ”مَا عَمِلْتُمْ“ کو بیان کرتا ہے، اور لفظ ”خَيْرٍ“ اور ”سُوءٍ“ کو نکرہ کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے ”السَّخِيرُ“ یا ”السُّوءُ“ نہیں کہا گیا تو اس میں تعمیم مقصود ہے یعنی ہر خیر اور اچھا کام، اور ہر برا (سوء) کام اس میں شامل ہے، تو آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ہر شخص اپنے سامنے پائے گا ہر وہ نیک و اچھا کام جو اس نے انجام دیا ہوگا خواہ وہ کم ہی کیوں نہ ہو اور اسی طرح ہر وہ برا کام جو اس نے کیا ہو خواہ وہ



جس قدر بھی ہو، اور ظاہر السیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ جملہ ”وَمَا عَمِلْتُمْ مِنْ سُوءٍ“ اپنے ما قبل جملہ ”وَمَا عَمِلْتُمْ مِنْ خَيْرٍ“ پر عطف ہوا ہے۔

یہ آیت مبارکہ ان آیات میں سے ایک ہے جو اعمال کے محسوس ہونے پر دلالت کرتی ہیں، اس موضوع کی بابت سورۃ بقرہ میں بحث ہو چکی ہے۔

## ایک ناقابل عمل تمنا کا ذکر

○ ”تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ أَمَدًا بَعِيدًا“  
(ہر شخص چاہے گا کہ اس کے برے اعمال اور اس کے درمیان بہت دوری ہوتی!)

بظاہر یہ جملہ ایک مخدوف خبر کا مبتداء ہے جو کہ وہ ضمیر ہے جس کی بازگشت ”نفس“ کی طرف ہوتی ہے، حرف ”لو“ تمنا کے لئے استعمال ہوتا ہے اور قرآن مجید میں حرف ”ان“ مفتوحہ مشدودہ سے پہلے کثرت کے ساتھ استعمال ہوا ہے، بنا براین یہ بات قرین صحت نہیں کہ اس طرح کا استعمال غلط ہے اور قرآن میں جہاں بھی استعمال ہوا ہے اس کی تاویل کرنی چاہیے۔

لفظ ”امد“ زمانی فاصلہ کا معنی دیتا ہے، چنانچہ معروف لغت دان راغب اصفہانی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب المفردات میں اس حوالہ سے بھرپور وضاحت کے ساتھ اس طرح لکھا ہے:

”الامد والابد يتقاربان، لكن الابد عبارة عن مدة الزمان التي ليس لها حد محدود ولا يتقيد، لا يقال: ابد كذا، والامد مدة لها حد مجهول اذا اطلق، وقد ينحصر، نحو ان يقال: امد كذا، كما يقال: زمان كذا، والفرق بين الزمان والامد ان الامد يقال باعتبار الغاية، والزمان عام في المبدء والغاية، ولذا قال بعضهم: الامد والمدى يتقاربان“

امد اور ابد، قریب المعنی الفاظ ہیں لیکن ابد سے مراد وہ زمانی مدت ہے جس کی کوئی حد معین نہ ہو اور نہ ہی اس میں کوئی نید پائی جاتی ہو یعنی اسے مقید نہ کیا جاسکتا ہو، چنانچہ ”ابد کذا“ (ایسا ابد) کے الفاظ استعمال نہیں ہوتے، اور امد اس مدت کو کہتے ہیں جس کی حد معین ہو لیکن مطلق اور کسی قید و شرط سے خالی ذکر کرنے میں وہ حد نامعلوم رہتی ہے۔ البتہ کبھی اسے مقید و منحصر صورت میں بھی ذکر کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: ”امد کذا“، فلاں امد یعنی معین مدت، یہی اسی طرح ہے جیسے

کہا جاتا ہے ”زمان کذا“ یعنی اتنا عرصہ، زمان اور آمد کے درمیان فرق یہ ہے کہ آمد صرف انتہاء کے حوالہ سے استعمال ہوتا ہے جبکہ زمان ابتداء و انتہاء دونوں کے حوالہ سے استعمال ہوتا ہے۔ اسی بناء پر بعض حضرات نے کہا ہے کہ ”آمد“ اور ”مدئی“ دونوں قریب المعنی الفاظ ہیں۔

اور خداوند عالم کے ارشاد گرامی ”تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ أَمَدًا بَعِيدًا“ سے مراد یہ ہے کہ برے اعمال کا ظاہر ہونا نفس کے لئے تکلیف و اذیت کا باعث ہوتا ہے جیسا کہ اس کے بالقابل اچھے اعمال کا ظاہر ہونا خوشی و مسرت کا سبب بنتا ہے۔

اس مقام پر ایک نکتہ قابل توجہ یہ ہے کہ خداوند عالم نے فرمایا ہے ”تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ أَمَدًا بَعِيدًا“ کہ نفس چاہے گا کہ اس کے برے اعمال اور اس کے درمیان بہت زیادہ دوری ہوتی، اور یہ نہیں فرمایا: ”تَوَدُّ أَنَّهُ لَمْ يَكُنْ مِنْ أَصْلِهِ“ کہ وہ چاہے گا کہ اے کاش! یہ کام انجام پذیر ہی نہ ہوتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر رہا ہوگا کہ خداوند عالم نے اسے محفوظ کر لیا ہے اور اب اس کے سوا کوئی چارہ کار اور گنجائش باقی ہی نہیں کہ وہ اس سے دوری کا خواہاں ہو اور یہ چاہے کہ اے کاش، اس دشوار ترین وقت اور ہولناک ترین حالت میں وہ اس عمل کو ظاہر بظاہر نہ دیکھتا اور اس کے درمیان بہت زیادہ دوری واقع ہوتی، اور وہ اپنے برے ہم نشین سے بھی اسی طرح کے الفاظ کہے گا، چنانچہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

○ ”نُقِصُ لَهُ شَيْطَانًا فَمَوْلَاهُ قَرِينٌ إِذَا جَاءَ نَأَقَالَ يَلِيَّتْ بَيْنِي وَبَيْنَكَ بَعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِينٌ“ ... سورۃ زخرف، آیت ۳۸ ...

(ہم اس کے لئے ایک شیطان قرار دیں گے جو اس کا ہم نشین ہوگا ... کہ جب ہمارے پاس آئے تو کہے اس سے کہ اے کاش! میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب کے درمیان کا فاصلہ ہوتا، کہ تو کس قدر برا ساتھی و ہم نشین ہے)۔

خدا کا متنبہ و خبردار کرنا

○ ”وَيَحَذِّرُكُمْ اللَّهُ نَفْسَهُ ۗ وَاللَّهُ سَمْعٌ وَبَصِيرٌ“

(اور اللہ تمہیں اپنے آپ سے خبردار رہنے کا کہتا ہے، خدا بندوں پر بہت مہربان ہے)

یہاں دوسری مرتبہ خبردار کیا گیا ہے، اس سے پہلے ارشاد ہوا: ”وَيَحَذِّرُكُمْ اللَّهُ نَفْسَهُ ۗ وَاللَّهُ سَمْعٌ وَبَصِيرٌ“

الْمَصِيْرُ“ (اور اللہ تمہیں اپنے آپ سے خبردار کرتا ہے اور اللہ کی طرف ہی بازگشت ہے) تو دوبارہ خبردار کرنا مطلب و موضوع کی اہمیت کو ثابت کرتا ہے اور اس سے خبردار کرنے کی انتہائی صورت ظاہر ہوتی ہے جو کہ ایک واضح حقیقت ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دوبارہ خبردار کرنا معصیت و گناہ کے اخروی نتائج کے تناظر میں ہو جیسا کہ آیت مبارکہ کا مورد ہی ایسا ہے، جبکہ پہلا خبردار کرنا صرف دنیائی وبال کو ملحوظ رکھتے ہوئے یا ایسا معنی ہو جو دنیا و آخرت دونوں میں حاصل ہونے والے نتائج کے حوالہ سے ہو۔

اور جہاں تک ان الفاظ کا تعلق ہے: ”وَاللّٰهُ سَرَّوْفٌ بِالْعِبَادِ“ (اور اللہ بندوں پر مہربان ہے) تو اگر چہ ان سے خداوند عالم کی رافت و رحمت اور بندوں پر مہربان ہونا ثابت ہوتا ہے جیسا کہ لفظ ”عباد“ سے بندگی اور کامل وابستگی کا اشارہ ملتا ہے لیکن اس کے باوجود ان لفظوں سے خبردار کئے جانے کی بابت شدت بھی ثابت ہوتی ہے کیونکہ خبردار کرنے اور ہوشیار باش دینے کے موارد میں اس طرح کے الفاظ کا استعمال نافرمانی کے سنگین نتائج کا خوف دلانے اور یہ باور کرانے کے لئے ہوتا ہے کہ منکلم ناصح و خیر خواہ ہے اور اسے اپنے مخاطب کی خیر و بہتری کے سوا کوئی چیز مطلوب و مراد نہیں، چنانچہ آپ جس کے خیر خواہ ہوں اس سے کہتے ہیں کہ خبردار فلاں کام میں میرے ساتھ تنگی و ترشی سے پیش نہ آنا کیونکہ میں نے عہد کیا ہے..... یا قسم کھائی ہے کہ جو شخص اس کام میں میرے ساتھ بد رفتاری کرے گا میں اس سے درگزر نہیں کروں گا اور میں اس کے کئے کو نظر انداز نہیں کروں گا اور میں تجھے اس سے تیرے ساتھ اپنی رافت و شفقت کی بناء پر خبردار کر رہا ہوں۔

بنا بریں آت کا معنی یہ ہوگا..... واللہ اعلم کہ گویا یوں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہونے کی بناء پر انہیں پہلے ہی اس بات سے منع کرتا ہے کہ وہ کہیں اس طرح کی نافرمانی کے مرتکب نہ ہو جائیں کہ جن کا سنگین نتیجہ اور سخت عذاب ہر صورت میں ظاہر و رونما ہوگا اور اس میں نہ شفاعت کرنے والے کی شفاعت کا رگر ثابت ہوگی اور نہ ہی کوئی روکنے والا اسے روک سکے گا۔

## محبتِ خدا اور اطاعتِ رسول

○ ” قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ “  
(کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا تم سے محبت کرے گا)

اس سے پہلے سورہ بقرہ کی آیت ۱۶۵ ”وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ“ کی تفسیر میں ”محبت“ کے معنی کی بابت

مطالب ذکر ہو چکے ہیں اور یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ محبت اپنے حقیقی معنی کے ساتھ خداوند عالم سے اسی طرح قائم ہوتی ہے جیسے غیر خدا کے ساتھ !

اور اب اس مقام پر مزید یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں پایا جاتا... جیسا کہ قرآن مجید میں واضح طور پر مذکور ہے... کہ خداوند عالم اپنے بندے کو ایمان، اپنی مخلصانہ عبادت و پرستش اور شرک سے اجتناب و دوری اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہ زمر، آیت ۳:

○ ” اَللّٰهُمَّ الَّذِيْنَ الْخَالِصُ ”

(یا درکھو کہ اللہ کے لئے ہی ہے خالص دین)

سورہ پدینہ، آیت ۵:

○ ” وَمَا أَمْرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوْا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ”

(اور انہیں نہیں حکم دیا گیا مگر یہ کہ وہ اللہ کی عبادت کریں دین کو اس کے لئے خالص و مختص کر کے)

سورہ مؤمن، آیت ۱۴:

○ ” فَادْعُوْا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَكُوْفِرُوْا بِالْكَافِرِيْنَ ”

(پس تم اللہ کو پکارو دین کو اس کے لئے خالص و خاص کر کے، خواہ کافروں کو ناپسند ہی کیوں نہ ہو)

یہ اور اس طرح کی دیگر آیات مبارکہ !

اور اس حقیقت میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں پایا جاتا کہ دین میں اخلاص اسی صورت میں حقیقی طور پر صورت گیر ہوتا ہے جب اس انسان کا دل کہ جو کسی چیز کو صرف اپنی باطنی محبت اور قلبی لگاؤ کے ساتھ چاہتا ہو، خدا کے علاوہ کسی دوسرے معبود و مطلوب سے کسی طرح کے تعلق کا حامل نہ ہو مثلاً بت، مد مقابل یا کوئی دنیاوی غرض و مقصد اس کے دل کی چاہت کا مرکز قرار نہ پائے بلکہ اس سے بھی بالاتر یہ کہ اس کے علاوہ بھی کوئی چیز مطلوب و مراد واقع نہ ہو مثلاً بہشت کے حصول کی کوشش میں کامیابی یا دوزخ کی آگ سے چھٹکارا پانے میں کامیابی وغیرہ، بلکہ اس کا دل صرف اور صرف خدا کی بندگی سے وابستہ ہو، تو دین میں اخلاص خدا کی محبت اور اس کے علاوہ کسی کو دل میں نہ لانے ہی کا دوسرا نام ہے۔

**محبت کی حقیقت !**

اب دیکھنا یہ ہے کہ محبت کی حقیقت کیا ہے اور اس کے آثار و نتائج کیا ہیں ؟

محبت درحقیقت طالب و مطلوب کے درمیان رابطہ کا واحد ذریعہ ہے اور ہر چاہنے والے کو اپنے مقصود و مراد تک پہنچنے کا وسیلہ ہے، اس کا کام محبت کو اس کے محبوب سے ملا دینا اس غرض کی تکمیل کے لئے ہوتا ہے کہ محبت جس نقص و کمی سے دوچار ہے وہ محبوب کے ذریعے پوری ہو جائے اور محبوب کے حصول سے اپنی تکمیل کا سامان کر سکے، تو محبت کے لئے اس سے بڑی کوئی خوشی و مسرت کی بات نہ ہوگی کہ اسے بتایا جائے کہ اس کا محبوب اس سے محبت کرتا ہے، اس صورت میں دو محبتیں یکجا ہو جاتی ہیں اور دونوں طرف سے جذبات و احساسات کا تبادلہ ہوتا ہے۔ اس کی عام مثال یوں ہے کہ انسان غذا چاہتا ہے اور اس کے حصول کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا ہے تو وہ اس لئے ہے کہ اس کے ذریعے اپنے اندر پائی جانے والی کمی یعنی بھوک کو دور کرنا چاہتا ہے، اسی طرح مناکحت و جنسی عمل کا خواہاں ہوتا ہے تو وہ بھی اس لئے تاکہ اس کے ذریعے اپنی نفسانی خواہش یعنی شہوت کو پورا کر سکے..... اور وہ ایک طرح کی کمی کو پورا کرنے سے عبارت ہے..... اور اپنے دوست کی ملاقات و دیدار کی چاہت بھی اس بنیاد پر پیدا ہوتی ہے کہ اسے حاصل کر کے اس کے ذریعے اپنا من راضی کرے اور اپنی دل تنگی کی حالت پر قابو پا لے، اسی طرح اگر غلام اپنے آقا سے محبت کرتا ہے اور خادم اپنے خمدوم سے محبت کرتا ہے تو وہ بھی صرف اس لئے کہ اپنے آقا و مولانا کا حق اپنے ذمہ سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو اس کی خمدومی کے بوجھ تلے دبا ہوا پاتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس بوجھ کو دور کرے اور اپنے اوپر ثابت و مسلم ہونے والی ذمہ داری کو ادا کر سکے، بہر حال آپ اگر محبت اور قلبی چاہت و لگاؤ کے موارد میں غور کریں یا عشق و محبت کرنے والے مختلف افراد کی گونا گوں داستانیں پڑھیں تو آپ کو ہمارے ذکر کئے ہوئے مطالب کے بارے میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے گا۔

بنا بریں جو بندہ مخلص خدا کے ساتھ اپنی محبت کا دم بھرتا ہے اس کا اس سے بڑا کوئی مقصد ہی نہیں ہوتا کہ خدا اسی طرح اس سے محبت کرے جیسا کہ وہ خدا سے محبت کرتا ہے، اور خدا بھی اسی طرح اس کا ہو جس طرح وہ خدا کا ہو گیا ہے، حقیقت الامر تو یہی ہے لیکن خداوند عالم اپنے کلام مقدس میں ہر محبت کو ”محبت“ قرار نہیں دیتا (درحقیقت محبت ایک ایسے گہرے تعلق کا نام ہے جو دو چیزوں کو ایک دوسرے سے ملا دیتا ہے اور ان کے درمیان ربط کا مضبوط رشتہ قائم کر دیتا ہے) اور محبت کی روح اس بات کی متقاضی ہے کہ عالم الوجود پر حکم فرماہستی سے حقیقی لگاؤ پیدا ہو، یعنی اس کی محبت ہی اصل و اساس قرار پائے، کیونکہ کسی چیز سے محبت اس سے تعلق رکھنے والی ہر شے سے محبت کا تقاضا کرتی ہے اور اس بات کو واجب و لازم قرار دیتی ہے کہ محبوب کی رضا و خوشنودی کو یقینی بنانے والے تمام امور کے سامنے سر تسلیم خم کر کے اس کا عملی ثبوت فراہم کیا جائے، بنا بریں جہاں تک خدا سے محبت کا تعلق ہے تو چونکہ وہ واحد و یکتا معبود ہے کہ ہر چیز اپنے تمام وجودی امور اور اپنی ہستی سے تعلق رکھنے والے مسائل میں اس کا سہارا لیتی ہے اور اس تک پہنچنے کا وسیلہ ڈھونڈتی ہے، اور کائنات کی ہر چھوٹی، بڑی چیز اسی کی طرف لوٹتی ہے، لہذا ضروری ہے کہ اس سے محبت اور اخلاص کا ثبوت اس کی وحدانیت کے عقیدہ پر پختہ ایمان اور جس قدر

بھی انسانی ادراک و شعور کے بس میں ہو اس کے مطابق دین اسلام کی عملی پیروی کے ذریعے دیا جائے اور چونکہ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے اور یہ وہی آئین زندگی ہے جس کی طرف خدا کے نمائندے لوگوں کو بلاتے ہیں اور اس کے انبیاء پیغمبر اس کی تعلیمات و اصولوں پر عقیدہ و عمل کی تاکید کی دعوت دیتے ہیں، اور اس خدائی دین میں اخلاص کا جو حوالہ پایا جاتا ہے وہ سب سے بلند ہے کہ اس سے بلند تر اخلاص کہیں موجود نہیں، وہی فطری دین ہے کہ جس پر تمام شریعتوں اور نبوتوں کا اختتام ہوا جیسا کہ آنحضرت پر نبوت کے سلسلہ الہیہ کی انتہاء ہوئی، یہ نقطہ کہ جسے ہم نے ذکر کیا ہے اس کی بابت کلام الہی میں تدبر و تفکر کرنے والا کوئی شخص بھی کسی طرح کا شک نہیں کر سکتا، اور شک کی گنجائش اس لئے نہیں پائی جاتی کہ حضرت پیغمبر اسلام نے اس راہ پر کہ جسے انہوں نے خود اپنا یا (دین اسلام) اسے توحید کا راستہ اور اخلاص کا اصول قرار دیا اور اسی حوالہ سے اس کی پہچان کروائی کیونکہ خداوند عالم نے آپ کو اسی دین و آئین اور راہ و روش حیات کی تبلیغ اور اس کی پہچان کروانے کا حکم دیا، چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہوا:

سورۃ یوسف، آیت: ۱۰۸

○ ” قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي ۖ وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ “

(کہہ دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے، میں بصیرت و آگاہی کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں اور وہ کہ جس نے میرا اتباع کیا، اور اللہ پاک و منزہ ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں)

اس آیت مبارکہ میں واضح طور پر بیان ہوا کہ آپ کا راستہ بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف بلانا اور اللہ سے اخلاص قائم رکھنا ہے کہ جس میں شرک کی کوئی صورت نہ پائی جاتی ہو، بنا براین یہ بات آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ آنحضرت کا راستہ دعوت و اخلاص سے عبارت ہے اور اس کی پیروی یعنی فکری و عملی طور پر اس راستہ کو اختیار کرنا اور آنحضرت کے نقش قدم پر چلنا آپ کا اتباع کرنے والوں کی صفت و پہچان ہے،

اس کے بعد خداوند عالم نے بیان فرمایا کہ اس نے جو شریعت حضرت ختمی مرتبت کے لئے مقرر کی وہ اس راستہ یعنی راہ دعوت و اخلاص کی کامل ترجمانی کرتی ہے، چنانچہ ارشاد الہی ہوا:

سورۃ جاثیہ، آیت: ۱۸

○ ” ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا “

(پھر ہم نے آپ کو دین کے راستہ پر قرار دیا، تو آپ اسی کا اتباع کرتے رہیں)

اور درج ذیل آیت میں اس راستہ کی پیروی کو خدا کے حضور سر تسلیم خم کرنے سے تعبیر کرتے ہوئے یوں ارشاد ہوا:

سورۃ آل عمران، آیت: ۲۰

○ ” فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ “

(پس اگر وہ آپ سے جھگڑا کریں تو کہہ دیجئے کہ میں نے اپنا رخ اللہ کی طرف کیا ہے اور وہ بھی جس نے میری

پیروی کی)

اس کے بعد اس راستہ کو اپنی طرف منسوب کر کے اس مطلب کو واضح کیا کہ وہ اس کا سیدھا راستہ ہے، چنانچہ ارشاد

ہوا:

سورۃ النعام، آیت: ۱۵۲

○ ” وَأَنْ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ فَأَتَّبِعُوا “

(اور بے شک یہ میرا راستہ ہے جو سیدھا ہے، پس تم اس کا اتباع کرو)

مذکورہ بالا مطالب سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ اسلام جو کہ حضرت پیغمبر اسلام کے لئے مقرر کی گئی وہ شریعت و راہ عمل ہے جو کہ دین کے بنیادی اصولوں، اخلاقی اقدار، عملی دستورات اور آنحضرت کی پاکیزہ سیرت اور طرز زندگی کا مجموعہ ہے وہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک اخلاص کا رشتہ ہے کہ جو محبت پر مبنی اور محبت پر ہی قائم ہے، لہذا وہی اخلاص کا دین اور وہی محبت کا دین ہے۔

اب تک ذکر کئے گئے تمام مطالب سے زیر بحث آیہ مبارکہ کا معنی واضح و روشن ہو جاتا ہے یعنی ” قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ “ (کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو) سے مراد اللہ اعلم یہ ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ کی خالص بندگی کا حق ادا کرو جو کہ اس سے حقیقی محبت پر مبنی ہے تو اس شریعت اور راہ و روش کو اختیار کرو جس کی اصل و اساس ہی محبت ہے کہ وہ محبت کہ جس کی عکاسی اخلاص اور اسلام سے ہوتی ہے اور وہ اللہ کا سیدھا راستہ ہے جو اپنے اوپر چلنے والے کو خدا تک لے جاتا ہے، لہذا اگر تم میری پیروی کرو اور میرے راستہ پر چلو جو کہ مذکورہ صفات کا حامل ہے تو اللہ تم سے محبت کرے گا، یہ بات محبت کرنے والے کے لئے سب سے بڑی خوشخبری ہے، اور جب ایسا ہو جائے تو تم جو چاہو گے وہ پاؤ گے، اور یہی وہ بلند پایہ مقصد ہے جو محبت اپنی محبت سے پانا چاہتا ہے۔

تو یہ ہے آیت مبارکہ کے ظاہر سے سمجھا جانے والا مطلب! لیکن جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ آیت ان آیات مبارکہ کے بعد آئی ہے جن میں کفار کو دوست قرار دینے سے منع کیا گیا ہے تو اس کا اپنی ماقبل آیات سے ربط و تعلق اس بات کا متقاضی ہے کہ اس حوالہ سے یہ کہا جائے کہ دوستی چونکہ حقیقی معنوں میں تب ہی ہوتی ہے جب کسی انسان اور جسے وہ

دوست رکھتا ہو کے درمیان محبت کا حقیقی رشتہ قائم ہو..... جیسا کہ اس موضوع کی بابت پہلے بیان ہو چکا ہے..... لہذا یہ آیہ مبارکہ لوگوں سے کہہ رہی ہے کہ اگر وہ اللہ سے اپنی دوستی کے دعوے میں سچے ہیں اور اپنے آپ کو اس کے گروہ میں شمار کرتے ہیں تو انہیں پیغمبر اسلام کی پیروی کرنی چاہیے کیونکہ خدا سے دوستی کافروں کی خواہشوں کی پیروی کرنے کے ساتھ ممکن نہیں (دوستی، اتباع کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی، بلکہ دوستی کا محور ہی اتباع ہے) اور نہ ہی کافروں کے پاس جو دنیاوی عزت و اقبال اور مال و دولت ہے اس کے حصول کی چاہت اور عملی کوشش کے ساتھ، خدا سے دوستی کا رشتہ قائم ہو سکتا ہے بلکہ خدا کی دوستی اس کے دین میں اس کے نبی کی پیروی چاہتی ہے چنانچہ ارشاد الہی ہے:

سورۃ جاثیہ، آیت ۱۸، ۱۹:

” ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيحَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۸﴾ إِنَّهُمْ لَن يَخْتَفُوا عَنْكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۗ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَبَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِينَ ﴿۱۹﴾“

(پھر ہم نے آپ کو دین کے راستہ پر قرار دیا تو آپ اسی پر چلتے رہیں اور جاہل و بے خبر لوگوں کی پیروی نہ کریں کہ وہ آپ کو ذرہ بھر بھی خدا سے بے نیاز نہیں کر سکتے، اور (یاد رکھیں) کہ ظالمین ایک دوسرے کے دوست ہیں جبکہ اللہ تقویٰ والوں کا دوست و حاکم ہے)

ان دو آیتوں میں غور کریں کہ پہلی آیت میں اتباع کا ذکر ہے اور دوسری آیت میں اتباع سے بالاتر دوستی و ولایت کا تذکرہ ہوا ہے، تو اس تناظر میں یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ جو شخص خدا سے محبت کی بناء پر اس سے ولایت اور اس کی حاکمیت پر ایمان کا دعویٰ دار ہو اس پر لازم و واجب ہے کہ وہ رسول خدا کی پیروی کرے تاکہ رسول کی پیروی خدا سے محبت پر مبنی حقیقی دوستی پر منتہی ہو۔

یہاں ایک قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ آیت مبارکہ میں اللہ سے ولایت کی بجائے اللہ سے محبت کا ذکر اس لئے ہوا ہے کہ وہ اصل و اساس ہے کہ جس پر ولایت قائم ہے، اور اس کے علاوہ یہ نکتہ بھی لائق توجہ ہے کہ خدا سے محبت کے ذکر پر اکتفاء کی گئی ہے نبی اور مومنین سے محبت کو ذکر نہیں کیا گیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کی ولایت و دوستی اور مومنین کی ولایت و دوستی حقیقت میں خدا کی ولایت و دوستی ہے اور ان سے دوستی کی بازگشت اللہ سے دوستی کی طرف ہوتی ہے لہذا خدا سے دوستی کے ذکر میں نبی و مومنین سے دوستی کا ذکر خود بخود ہو جاتا ہے۔



## گناہوں کی بخشش کا وعدہ و اعلان

○ ”وَيَعْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللَّهُ عَفُوفٌ رَّحِيمٌ“

(اور وہ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور اللہ معاف کرنے والا، نہایت مہربان ہے)

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خدا کی وسیع رحمت و راس کے روحانی و مادی فیوضات کا لامتناہی سلسلہ کسی شخص یا اس کے بندوں میں سے چند افراد اور خاص طبقہ سے تعلق رکھنے والوں سے مختص و مخصوص نہیں اور نہ ہی اس کی طرف سے مطلق فیض رسانی میں کوئی استثنائی صورت پائی جاتی ہے، جس سے فیوضات کا دائرہ محدود ہو جائے اور نہ کوئی چیز اسے فیض رسانی سے رکے پر مجبور کر سکتی ہے سوائے اس محرومی کے جو خود بندوں کے فیض پانے کی استعداد و لیاقت کے فقدان کی بناء پر ہو یا کسی ایسی رکاوٹ کے کہ جسے بندے خود اپنی اختیار کردہ غلط راہ و روش سے پیدا کر لیں، چنانچہ خداوند عالم نے اپنے فیوضات و عطائے نعمات کے بارے میں واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے:

سورہ اسرئ، آیت: ۲۰

○ ”وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا“

(اور تیرے پروردگار کا عطیہ روکا نہیں جاسکتا)

تو اب دیکھنا یہ ہے کہ جو چیز عطیہ الہی کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہے وہ کیا ہے؟ وہ گناہ ہیں جو خداوند عالم کے افاضہ نعمات میں مانع ہو سکتے ہیں اور خداوند قدوس کے قرب و تقرب کی عظیم نعمت اور اس سے مربوط تمام امور مثلاً بہشت اور جو کچھ اس میں ہے سے محرومی کا سبب بن سکتے ہیں، جبکہ لوح دل سے گناہوں کی گندگی کو دور کرنا اور ان کی مغفرت و بخشش اور ان کی پردہ پوشی ہی وہ واحد ذریعہ ہے جسے سعادت و خوش بختی کا دروازہ کھلنے اور کاشانہ عظمت و عزت میں داخل ہونے میں کلیدی حیثیت حاصل ہے، اسی وجہ سے خداوند عالم نے ”يُحِبُّبِكُمْ اللَّهُ“ کے فوراً بعد ”وَيَعْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ“ فرمایا کیونکہ محبت..... جیسا کہ بیان ہو چکا ہے..... محبت کو محبوب سے ملا دیتی ہے، تو جس طرح بندے کی اپنے پروردگار سے محبت اس بات کی متقاضی ہے کہ بندہ اس سے کامل اخلاص کے ساتھ اس کا قرب اختیار کرے اور بندگی کا تعلق صرف اسی سے استوار رکھے بلکہ اس کے علاوہ کسی کو بندگی کا حقدار نہ سمجھے اسی طرح خدا کی اپنے بندے سے محبت بھی اس بات کی متقاضی ہے کہ خدا اپنے عہد سے قریب ہو اور دوری کے تمام پردے چاک کر دے اور غیبت کے سیاہ بادل ہٹا دے، کہ گناہ کے سوا کوئی چیز حجاب نہ بن سکے تو اس صورت میں خدا کا تقرب گناہوں کی بخشش کا پیش خیمہ ثابت ہوگا اور پھر گناہوں کی بخشش کے بعد والی بزرگی و عزت

اور فیوض الہیہ کی ارزانی کی بابت عطاء ربانی و سخائے سبحانی کی روانی و فراوانی ہی کافی و روانی ہوگی، جیسا کہ اس مطلب کا اجمالی تذکرہ سطور بالا میں ہو چکا ہے۔

## اطاعت خدا و رسول

○ ”قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ۔۔۔“  
(کہہ دیجئے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔۔۔)

اس سے ما قبل آیت مبارکہ میں رسول اللہ کی پیروی کی دعوت دی گئی اور لوگوں سے کہا گیا کہ رسول کا اتباع کرو، ”اتباع“ و پیروی کا اصل معنی نقش قدم پر چلنا یعنی نشان قدم دیکھ کر پیچھے پیچھے چلتے رہنا ہے جو کہ اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ شخص کہ جس کے نقش قدم پر چلیں کسی راستہ پر چل رہا ہو اور وہ راستہ کہ جس پر رسول اللہ چلتے ہیں وہ صراط مستقیم ہے جو کہ راہ خدا ہے، اور وہ شریعت و راہ عمل ہے جو خدا نے اپنے نبی کے لئے مقرر کی ہے کہ اس میں نبی کی اطاعت و فرمانبرداری کو واجب و لازم قرار دیا ہے، تو اب اس آیت میں ایک بار پھر نبی کے اتباع و پیروی اور نقش قدم پر چلنے کو اطاعت و فرمانبرداری کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا اور وہ اس لئے تاکہ اس امر کی طرف توجہ دلائی جائے کہ خدا سے خلوص و اخلاص کا راستہ وہی ہے جو نبی کا راستہ ہے جو کہ بعینہ اوامر و نواہی اور دعوت و ارشاد کے مجموعہ سے عبارت ہے لہذا رسول کا اتباع اور ان کے راستہ پر چلتے ہوئے ان کے نقش قدم پر چلنا زندگی کی متعین راہ و روش میں اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت کا نام ہے، یعنی جو شریعت اور قانون حیات خداوند عالم نے حضرت پیغمبر اسلام کے لئے مقرر فرمایا ہے اس کے تمام احکام میں اللہ و رسول کی عملی فرمانبرداری ہی رسول اللہ کا اتباع اور ان کے نقش قدم پر چلنا کہلاتا ہے، بنا بریں رسول کے ساتھ خدا نے اپنا نام اس لئے ذکر کیا تاکہ اس حقیقت کی طرف التفات دلا یا جائے کہ دونوں کی اطاعت دراصل ایک ہی اطاعت ہے، اور رسول کا ذکر اپنے ساتھ اس لئے فرمایا کیونکہ گفتگو اطاعت رسول کے بارے میں ہو رہی تھی۔

## ایک غلط فہمی کا ازالہ

مذکورہ بالا مطالب سے اس غلط فہمی کا ازالہ بھی ہو جاتا ہے کہ آیت مبارکہ کے معنی کی بابت کہا گیا ہے کہ ”اطیعوا

اللہ“ سے مراد یہ ہے کہ ”اطیعوا اللہ فی کتابہ“ اللہ کی اطاعت قرآن میں کرو، اور ”اطیعوا الرسول“ سے مراد یہ ہے کہ ”اطیعوا الرسول فی سنتہ“ رسول کی اطاعت ان کی سنت میں کرو، یہ معنی ہرگز درست نہیں کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ آیت کے الفاظ جس مطلب کو ظاہر کرتے ہیں وہ یہ کہ جملہ ”قل اطیعوا اللہ و الرسول“ دراصل جملہ ”قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِي“ کی وضاحت کے مقام میں ہے گویا جو بات جملہ ”قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ.....“ میں مقصود تھی اسے اس جملہ ”قُلْ اطِيعُوا.....“ کے ذریعے واضح کر دیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ آیت مبارکہ اس امر کی طرف توجہ دلاتی ہے کہ اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت دراصل ایک ہی اطاعت ہے، اسی وجہ سے لفظ ”اطِيعُوا“ کو مکرر ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ اگر اللہ اور رسول کی اطاعت کا مورد مختلف ہوتا تو اس طرح کہنا زیادہ موزوں تھا، ”اطِيعُوا اللّٰهَ وَاطِيعُوا الرَّسُوْلَ“ (اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو) جیسا کہ درج ذیل آیت مبارکہ میں مذکور ہے:

سورۃ نساء، آیت: ۵۹

○ ”اطِيعُوا اللّٰهَ وَاطِيعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ“

(اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسول کی اور اولوالامر کی،)

تو معلوم ہوا کہ یہاں مقام سخن اس بات کا متقاضی تھا کہ ”اطِيعُوا“ کو صرف ایک بار ذکر کیا جائے، یہاں اس امر سے آگاہ رہنا ضروری ہے کہ زیر نظر آیت مبارکہ (قل اطیعوا اللہ و الرسول.....) کے اطلاق اور انطباقی موارد کے حوالہ سے جو مطلب ذکر ہوا ہے وہ اسی کے مانند ہے جو ما قبل آیت مبارکہ (قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ.....) میں ذکر ہو چکا ہے۔

روگردانی کرنے کا نتیجہ

○ ”فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ“  
(پس اگر تم روگردانی کرو تو اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا)

اس آیت مبارکہ میں ”اطیعوا اللہ و الرسول“ کی حکم عدولی کرنے والے کے کفر کا ثبوت پایا جاتا ہے یعنی جو شخص خدا و رسول کی اطاعت و فرمانبرداری سے انکار و سرتابی کرے وہ کافر ہے جیسا کہ کفار سے دوستی کی ممانعت کے حکم پر

مشتمل دیگر آیات مبارکہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے، تو گویا اس میں اس مطلب کی طرف اشارہ بھی ہے کہ یہ آیت مبارکہ (فان تولوا.....) ماقبل آیات کی وضاحت و تشریح کے طور پر ہے کیونکہ اس کا اختتام اطاعت کے حکم کا انکار کرنے والوں سے محبت کی نفی کے بیان پر ہو رہا ہے جبکہ پہلی آیت اتباع و پیروی کے حکم کی فرمانبرداری کرنے والے مومنین کے لئے محبت کے اثبات پر مشتمل تھی، (غور کریں)۔

مذکورہ بالا آیات مبارکہ کی تفسیر میں جو مطالب ذکر کئے گئے ہیں ان سے درج ذیل امور سے آگاہی حاصل ہوتی ہے:

(۱) تقیہ، فی الجملہ ایک جائز عمل ہے۔

(۲) کفار سے دوستی و محبت کا رشتہ قائم کرنا اور اس سلسلہ میں خدائی ممانعت کی پرواہ نہ کرنا قابل مواخذہ گناہ ہے اور ایسا کرنے والا شخص خدائی گرفت سے بچ نہیں سکتا، اور یہ بات یقینی اور ناقابل تغیر ہے بلکہ خدا کے حتمی فیصلوں میں سے ہے۔

(۳) شریعت الہیہ دراصل اللہ سے اخلاص کی صورتگیری کو یقینی بناتی ہے جبکہ اللہ سے اخلاص اس کی محبت کو ظاہر کرتا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ دین جو کہ معارف الہیہ، دستورات اخلاقیہ اور احکامات عملیہ کا مجموعہ ہے وہ اپنی تمام تر وسعتوں اور طول و تفصیل کے ساتھ خدا سے اخلاص کے علاوہ کسی مطلب پر منتہی نہیں ہوتا، یعنی اس کا محور اخلاص ہے کہ جس کا مطلب و معنی یہ ہے کہ انسان اپنی ذات، اپنی صفات (اخلاق و عادات) اور اپنے ذاتی اعمال و افعال کو صرف اور صرف اللہ کے لئے قرار دے جو کہ واحد و قہار ہے، یکتا و غالب ہے، اور اس طرح کے اخلاص کا محور، محبت ہے، یہ تو ہے اخلاص کی تحلیل و تجزیہ کا حوالہ! اور جہاں تک اس کی ترکیب کا تعلق ہے تو وہ اس طرح سے ہے کہ محبت کا منہا اخلاص ہے اور اخلاص کا منہا پوری کی پوری شریعت ہے، یہ یعنی اسی طرح ہے جیسے دین کو ایک حوالہ سے تجزیہ و تحلیل کی بناء پر تسلیم پر منتہی قرار دیا جاتا ہے اور تسلیم تو حید پر منتہی ہوتی ہے۔

(۴) کافروں سے دوستی کرنا کفر ہے، اس کفر سے مراد فروع دین میں کفر کا مرتکب ہونا ہے نہ کہ اصول دین میں! جیسا کہ مانع زکوٰۃ (زکوٰۃ ادا نہ کرنے والا) اور تارک الصلوٰۃ (نماز کو ترک کرنے والا) کفر کا مرتکب ہوتا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ کافروں سے دوستی کرنا اس لئے کفر قرار دیا گیا ہو کہ دوستی کرنے والا شخص بالآخر اصول دین میں کفر کا مرتکب ہو جاتا ہے، اس سلسلہ میں تفصیلی بیان سورہ مائدہ کی تفسیر میں ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ،

## روایات پر ایک نظر

### کفار کی سازش کا واقعہ

تفسیر ”درمنثور“ میں آیت مبارکہ ”لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَاءَ.....“ کی تفسیر میں مذکور ہے کہ ابن اسحاق، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: حجاج بن عمرو اور کعب بن اشرف کے حلیف، ابن ابی حقیق اور قیس بن زید نے مخفی طور پر مشرک کہ فیصلہ کیا تھا کہ مدینہ کے چند مسلمانوں کو ان کے دین سے منحرف کر دیں، اس بات سے رفاعہ بن منذر، عبداللہ بن جبیر اور سعد بن خثیمہ بھی آگاہ تھے انہوں نے ان مسلمانوں کو خبردار کر دیا کہ ان لوگوں کے ساتھ ملنا جلنا چھوڑ دیں اور ان سے دور رہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں تمہارے دین سے منحرف کر دیں، لیکن ان مسلمانوں نے ان کی نصیحت پر کان نہ دھرے تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: ”لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَاءَ.....“ تا ”وَاللّٰهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ“، (درمنثور جلد ۲ صفحہ ۱۶)

میرے خیال میں یہ روایت، ظاہر الآیۃ سے مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ سابقاً بیان ہو چکا ہے کہ قرآن مجید میں ”کافرین“ کا لفظ اہل کتاب کے لئے استعمال نہیں ہوا لہذا مذکورہ واقعہ کے حوالہ سے یہ کہنا بہتر ہوگا کہ یہ ان آیات کے نزول کا سبب ہے جن میں یہود و نصاریٰ سے دوستی کرنے کی ممانعت کی گئی ہے نہ یہ کہ زیر نظر آیات (لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ.....) کا سبب ہے۔

### تقیہ کے بارے میں واضح بیان

تفسیر صافی میں آیت مبارکہ ” اِلَّا اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰتًا.....“ کی تفسیر میں کتاب ”الاحتجاج“ کے حوالہ سے مذکور ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:

”وامرک ان تستعمل التقیة فی دینک فان الله یقول : وایاک ثم وایاک ان تعرض الہلاک وان تصرک التقیة التی امرتک فانک شائط بدمک ودماء اخوانک ، معرض لزوال

نعمک ونعمهم ، مزلهم فی ایدی اعداء دین اللہ وقد امرک اللہ باعزازہم ،  
 (خداوند عالم نے تجھے حکم دیا ہے کہ اپنے دین میں تقیہ کرو، کیونکہ خدا بار بار کہتا ہے: خیردار، خیردار، کہیں اپنے آپ  
 کو ہلاکت میں نہ ڈالنا، اور کہیں ایسا نہ ہو کہ تقیہ کو ترک کر دو کہ جس کام میں نے تجھے حکم دیا ہے کیونکہ تقیہ کو ترک کرنے سے تو اپنا  
 اور اپنے بھائیوں کا خون بہا دے گا اور اپنی اور ان کی نعمتوں کے برباد ہونے کا خطرہ مول لے گا اور انہیں دشمنان دین الہی کے  
 ہاتھوں ذلیل و خوار کر دے گا جبکہ خدا نے تجھے ان کی عزت و تکریم کا حکم دیا ہے)

(تفسیر صافی جلد ۱ صفحہ ۲۵۳)

### دین اور تقیہ کا ربط

تفسیر العیاشی میں مذکورہ ہے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ حضرت پیغمبر اسلام  
 ارشاد فرماتے تھے: ” لا دین لمن لا تقیة لہ “ جو شخص تقیہ اختیار نہ کرے وہ دیندار نہیں۔ کیونکہ خداوند عالم کا ارشاد  
 ہے: ” الا ان تتقوا منهم تقاة “ (تفسیر العیاشی جلد ۱ صفحہ ۱۶۶ حدیث ۲۳)

### تقیہ کے موارد کی وسعت

کتاب ” کافی “ میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے آپ نے ارشاد فرمایا:  
 ” التقیة فی کل شیء یضطر الیہ ابن آدم و قد احل اللہ لہ “  
 (ہر اس چیز میں تقیہ روا ہے جس کی بابت فرزند آدم مضطر و مجبور ہو جائے کہ اس صورت میں خدا نے اس کے لیے  
 تقیہ جائز قرار دیا ہے) (ملاحظہ ہو: کافی جلد ۲ صفحہ ۲۲۰ حدیث ۱۸)  
 تقیہ کے جواز پر آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے کثرت کے ساتھ روایات منقول ہیں بلکہ وہ تو اتر کی حد  
 تک پہنچی ہوئی ہیں چنانچہ آپ زیر نظر آیت مبارکہ سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ اس میں تقیہ کے جواز پر ناقابل انکار ثبوت پایا  
 جاتا ہے۔

### محبت اور دین

کتاب ” معانی الاخبار “ میں سعید بن یسار سے روایت مذکور ہے انہوں نے کہا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے

ارشاد فرمایا: ”هل الدين الا الحب“، کیا دین محبت کے سوا کسی چیز کا نام ہے؟ (امام نے اپنے ارشاد گرامی پر استدلال کرتے ہوئے فرمایا) خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے ”قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ“ کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

اسی روایت کو کتاب کافی میں امام محمد باقر علیہ السلام کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: کتاب روضہ کافی صفحہ ۶۷ حدیث ۳۵) اسی طرح تفسیر قمی (جلد ۱ صفحہ ۱۰۰) اور تفسیر العیاشی (جلد ۱ صفحہ ۱۶۷ حدیث ۲۵) میں حذاء کے اسناد سے امام محمد باقر علیہ السلام کا مذکورہ فرمان ذکر کیا گیا ہے اور ربیع کے حوالہ سے امام صادق علیہ السلام سے یہی الفاظ منقول ہیں، بہر حال یہ روایت ان مطالب کی تائید کرتی ہے جو پہلے بیان ہو چکے ہیں۔

### امام صادقؑ کا ایک شعر سے استناد

کتاب معانی الاخبار میں ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ما احب الله من عصابه، جو شخص خدا کی نافرمانی کرے خدا سے دوست نہیں رکھتا، پھر امام نے اس شعر کی مثال پیش کی:

تعصى الاله و انت تظهر حبه  
هذا لعمرى فى الفعال بدیع

لو كان حبك صادقاً لاطعته  
ان المحب لمن يحب مطيع

(تو خدا کی نافرمانی کرتا ہے اور اس سے محبت کا اظہار بھی کرتا ہے! مجھے اپنی زندگی کی قسم، یہ تو انوکھا عمل ہے، اگر خدا سے تیری دوستی و محبت سچی ہوتی تو تو اس کی فرمانبرداری و اطاعت کرتا کیونکہ دوست تو وہ ہوتا ہے جو اپنے محبوب کا فرمانبردار ہو۔)

یاد رہے کہ تفسیر برہان جلد ۱ صفحہ ۶۷۶ حدیث ۶ میں بھی امام جعفر صادقؑ کا یہی ارشاد مذکور ہے۔

### محبت خدا کی شان

کتاب کافی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:

”من سره ان يعلم ان الله يحبه فليعمل بطاعة الله وليتبعنا“

جو شخص چاہے کہ یہ جانے کہ خدا اس سے محبت کرتا ہے تو وہ اللہ کی اطاعت اور ہماری پیروی کا عملی ثبوت دے،

(اس کے بعد امام نے استدلال کے طور پر یوں ارشاد فرمایا) ”الم یسمع قول اللہ عز و جل لنبیہ: ”قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحبکم اللہ و یغفر لکم ذنوبکم“ کیا اس نے یہ نہیں سنا کہ خداوند عالم نے اپنے نبی سے فرمایا: کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو خدا تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا۔ (کافی جلد ۸ صفحہ ۱۳ حدیث ۱)۔

انشاء اللہ سورۃ نساء آیت ۵۹ ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ“ کی تفسیر میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے گا کہ آئمہ اہل بیت کا اتباع و پیروی دراصل حضرت پیغمبر اسلام کا اتباع و پیروی ہے۔

### سنت نبوی سے روگردانی کا انجام

تفسیر ”درمنثور“ میں ہے کہ عبد بن حمید نے حسن سے روایت کی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام نے ارشاد فرمایا: ”من رغب عن سنتی فلیس منی“ جو شخص میری سنت سے منہ موڑے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں، (اس کے بعد آنحضرت نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ”قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي.....“ (کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو.....) (تفسیر درمنثور ج ۲ ص ۱۷)

### محبت کا حقیقی معیار

تفسیر ”درمنثور“ ہی میں ہے کہ ابن ابی حاتم اور ابو نعیم نے کتاب حلیہ میں اور حاکم نے عائشہ سے روایت کی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام نے ارشاد فرمایا:

”الشرك اخفى من ديب الدر على الصفا في الليلة المظلمة و ادناه ان يحب علي شيعى من السجور و يبغض على شىء من العدل، وهل الدين الا الحب والبغض في الله؟ قال الله تعالى: ”قل ان كنتم تحبون الله فاتبعوني يحبكم الله“،

(شرك شب تاريك ميں صاف و شفاف پتھر پر ذرے کی معمولی سی حرکت سے بھی زيادہ پوشيدہ ہے اور اس کا كترين درجہ يہ ہے کہ ذرہ بھر ظلم کو پسند كيا جائے اور ذرہ بھر عدل سے نفرت كى جائے، اور دين، اللہ کے حوالہ سے محبت و نفرت



کے سوا کسی چیز کا نام ہے؟ خدا نے ارشاد فرمایا ہے : اے رسول! کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا، (تفسیر درمنثور جلد ۲ صفحہ ۱۷)۔

### آنحضرتؐ کا اہم ترین فرمان

کتاب ”تفسیر درمنثور“ میں مذکور ہے کہ احمد، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان اور حاکم نے ابورافع کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ حضرت رسولؐ نے ارشاد فرمایا:

”لَا الْقَيْنَ أَحَدَكُمْ مَتَكْتَأَ عَلَيَّ أَرْبَعَةَ يَوْمٍ أَوْ تِيَهُ الْأَمْرُ مِنْ أَمْرِي مِمَّا أَمَرْتُ بِهِ أَوْ نَهَيْتُ عَنْهُ فَيَقُولُ: لَأَنْدَرِي، مَا وَجَدْنَا فِي كِتَابِ اللَّهِ اتَّبِعْنَاهُ“

کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تم میں سے کسی کو مسند اقتدار پر براجمان دیکھوں کہ جب اس کے پاس میرا کوئی حکم یا نبی پہنچے تو وہ کہے کہ ہم اسے نہیں جانتے اور ہم تو صرف اسی چیز کی پیروی کریں گے جو کہ کتاب خدا میں ہے۔

(ملاحظہ ہو: تفسیر درمنثور جلد ۲ صفحہ ۱۷)

## آیات ۳۳ ، ۳۴

○ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۳۳﴾

○ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۳۴﴾

## ترجمہ

○ ”خدا نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو پوری کائنات پر منتخب کر لیا“ (۳۳)

○ ”یہ سب ایک ہی نسل ہے جو ایک دوسرے سے وابستہ سلسلہ ہے،

(۳۴) اور اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے“

## تفسیر و بیان

ان آیات سے حضرت عیسیٰ بن مریم علیہا السلام سے تعلق رکھنے والے حالات و واقعات اور ان سے مربوط و مرتبط امور کے تذکرہ کا آغاز ہوتا ہے اور ان قصص و واقعات میں جو بات صحیح اور حق ہے اسے بھی ذکر کر دیا گیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ ان آیات میں اہل کتاب پر اتمام حجت کرتے ہوئے ان کے موقف کی بابت اظہار رائے کیا گیا ہے..... تاکہ صحیح و غلط اور حق و باطل کے درمیان تمیز ممکن ہو سکے..... ان دو آیتوں کے ذریعے ان سے ماقبل اور مابعد کی ان آیات کے درمیان ربط و تعلق کو بھی واضح کیا گیا ہے جن میں اہل کتاب کی بابت مطالب مذکور ہیں۔

### انتخاب خداوندی کا صریح اعلان

○ ” إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ “  
(بے شک اللہ نے منتخب کر لیا آدم کو، اور نوح کو، اور آل ابراہیم کو اور آل عمران کو پوری کائنات پر!.....)

اس آیت میں لفظ ”اصْطَفَىٰ“ ذکر ہوا ہے جس کی بابت سورہ بقرہ کی آیت ۱۳۰ (لَقَدْ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا..... ہم نے اسے دنیا میں چن لیا.....) کی تفسیر میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس کا لغوی معنی کسی چیز سے اس کا خالص نکالنا اور جو چیز اسے آلودہ کر رہی ہو اسے اس سے دور کرنا ہے، یہ معنی ”اختیار“ یعنی چن لینے اور منتخب کرنے سے قریب تر ہے۔ اور یہ معنی ولایت و محبت کے ان اعلیٰ ترین درجات پر منطبق ہوتا ہے جو اسلام کا اصل و حقیقی معنی ہے یعنی عبد کا اس مقام و منزلت پر فائز ہونا کہ اپنے آپ کو اپنے پروردگار کی کامل فرمانبرداری کی اس حد تک لے جائے کہ ہر اس کام کو انجام دے جس میں اس کی رضا و خوشنودی کا حصول یقینی ہو، لیکن یہ معنی زیر نظر آیت مبارکہ پر منطبق نہیں ہوتا کیونکہ اس میں صرف ”اصطفاء“ ذکر نہیں ہوا بلکہ ”اصطفاء علی العالمین“ ذکر ہوا ہے یعنی عالمین پر! اگر یہاں بھی اس کا مذکورہ بالا لغوی معنی مراد ہوتا تو ”عَلَىٰ“

الْعَلَمِيْنَ“ کی بجائے ”من العالمين“ (عالمین میں سے) کے الفاظ ہوتے، اس صورت میں اسلام انہی افراد سے مختص ہو جاتا اور پھر پورے کلام کا معنی درہم برہم ہو جاتا، لہذا ارشاد ہوا: ”عَلَى الْعَلَمِيْنَ“ جو کہ ایک طرح کا انتخاب و چن لینا اور انہیں ایک یا چند امور میں دوسروں پر مقدم قرار دینا ہے کہ جن میں ان کے علاوہ کوئی ان کا شریک نہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں اسی سورۃ مبارکہ (آل عمران) کی درج ذیل آیت کو بطور دلیل پیش کیا جاسکتا ہے:

آیت: ۳۲

○ ”وَإِذْ قَالَتِ الْمَلِكَةُ يٰرَبِّمِ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ“

(اور جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! اللہ نے تجھے چن لیا اور تجھے پاک بنایا اور تجھے منتخب کیا عالمین کی عورتوں

پر)

اس آیت میں لفظ ”اصطفیٰ“ دو بار ذکر ہوا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا معنی مستقل اور دوسرے سے مختلف و جدا ہے، اور ”اصطفیٰ“ میں ”اصطفیٰ علی نساء العالمین“ سے مختلف معنی پایا جاتا ہے۔..... کیونکہ اگر دونوں میں ایک ہی معنی مقصود ہوتا ہے تو دوبارہ ”اصطفیٰ“ ذکر کرنے کی ضرورت نہ ہوتی.....

### برگزیدگانِ الہی کا تذکرہ!

اس آیت مبارکہ میں جن برگزیدگانِ الہی کا تذکرہ ہوا ہے ان میں سب سے پہلے حضرت آدم اور حضرت نوح کے اسماء گرامی ذکر ہوئے ہیں، اس سلسلہ میں توضیحی بیان یہ ہے کہ جہاں تک حضرت آدم علیہ السلام کے برگزیدہ قرار دیئے جانے کا تعلق ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نوع انسانی میں سے سب سے پہلی شخصیت ہیں جنہیں خداوند عالم نے روئے زمین پر خلیفہ مقرر فرمایا۔ چنانچہ اس حوالہ سے ارشاد رب العزت ہوا:

سورۃ بقرہ، آیت: ۳۰

○ ”وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً.....“

(اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا: میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں.....)

تو سب سے پہلے خلیفہ ہونے کا اعزاز حضرت آدم علیہ السلام کو حاصل ہوا جس کا تذکرہ اس آیت میں صریح الفاظ

میں ہوا ہے،

اور حضرت آدم علیہ السلام ہی وہ پہلے فرد ہیں جن کے ذریعے خداوند عالم نے توبہ کا دروازہ کھولا، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورہ طہ، آیت: ۱۲۲

○ ” ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ “

(پھر اسے اس کے رب نے چن لیا، پھر اس کی توبہ قبول کی اور اسے رہنمائی کی)

اور وہ پہلی ہستی ہیں جن کے لئے دین و شریعت کی تدوین ہوئی، چنانچہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ طہ، آیت: ۱۲۳

○ ” فَمَا يَأْتِيَنَّكَ مِنْ بَيِّنَاتٍ هُدًى لِّقَوْمٍ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشُوعُ “

(پس جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا اور

نہ ہستی ہوگا)

تو یہ وہ امور ہیں جن میں کوئی دوسرا شخص حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ شریک نہیں، اور یہ آنجناب ہی کی مخصوص

صفات ہیں، تو یہ کس قدر عظیم فضیلتیں ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام کو عطا ہوئی ہیں!

اور جہاں تک حضرت نوح علیہ السلام کا تعلق ہے تو آپ ان پانچ اولوالعزم پیغمبروں میں سے سب سے پہلی

شخصیت ہیں جنہیں کتاب اور شریعت عطا کی گئی، کہ اس سلسلہ میں درج ذیل آیت مبارکہ میں تفصیلی تذکرہ ہو چکا ہے:

سورہ بقرہ، آیت: ۲۱۳

○ ” كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً قَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ..... “

(لوگ ایک امت تھے، پھر خدا نے نبیوں کو بھیجا.....)

گویا حضرت نوحؑ بنی نوع انسان کے دوسرے باپ کی حیثیت رکھتے ہیں، کیونکہ جب کشتی نوحؑ طوفان کی

زد میں آئی تو سوائے ان کے اور ان کے افرادِ خاندان کے، کوئی شخص باقی نہ بچا،

اور حضرت نوحؑ وہ جلیل القدر ہستی ہیں جن پر خداوند عالم نے سلام بھیجا، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورہ صافات، آیت: ۷۹

○ ” وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ ۖ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ۗ سَلَّمَ عَلٰى نُوْحٍ فِي

الْعَالَمِينَ “

(اور ہم اس کی اولاد کو ہی روئے زمین میں باقی رہنے والے قرار دیا، اور ہم نے اس کی یاد بعد میں آنے والوں میں

محفوظ کر دی، سلام ہو نوح پر عالمین میں!

حضرت آدم اور حضرت نوح کے بعد خداوند عالم نے برگزیدگان میں آل ابراہیم اور آل عمران کا تذکرہ کیا، لفظ ”آل“ کا معنی ”خاصۃ الشیعی“ کسی چیز کا خاص، نچوڑ، مختص امر ہے، مشہور لغت دان راغب اصفہانی نے المفردات میں لکھا ہے کہ ”آل“ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ ”اہل“ سے تبدیل شدہ ہے کیونکہ اس کا اسم تفسیر ”اہیل“ آتا ہے، البتہ ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ لفظ ”آل“ کی اضافت ہمیشہ باشعور اہل نطق شخصیات کی طرف ہوتی ہے اور کسی صورت میں اسم نکرہ یا زمان و مکان کی طرف اس کی اضافت نہیں ہوتی، چنانچہ کہا جاتا ہے: آل فلاں (فلاں شخص کی آل)، لیکن یوں ہرگز نہیں کہا جاتا ”آل رجل“ (مرد کی آل) ”آل زمان کذا“ (فلاں وقت کی آل)، ”آل موضع کذا“ (فلاں جگہ کی آل) اور یہ بھی نہیں کہا جاتا، ”آل خیاط“ (درزی کی آل) بلکہ اس کی اضافت با عظمت و بافضیلت فرد کی طرف ہوتی ہے مثلاً یوں کہا جاتا ہے، ”آل اللہ“ (اللہ کی آل)، ”آل السلطان“ (بادشاہ کی آل)، لیکن جہاں تک لفظ ”اہل“ کا تعلق ہے تو اس کی اضافت سب کی طرف ہوتی ہے چنانچہ کہا جاتا ہے، ”اہل اللہ“ (اللہ کے اہل..... اللہ والے.....)، ”اہل الخیاط“ (درزی کے اہل)، ”اہل زمن کذا“ (فلاں زمانہ والے)، ”اہل بلد کذا“ (فلاں ملک والے)، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ لفظ ”آل“ دراصل اسم الشخص ہے، اس کا اسم تفسیر ”اویسل“ آتا ہے اور اسے ان چیزوں میں استعمال کیا جاتا ہے جو انسان کی ذات سے مختص ہوں خواہ نزدیک ترین قرابتداری کی وجہ سے ہوں یا موالات اور صمیمی دوستی کے سبب ہوں۔

یہاں ”آل ابراہیم“ اور ”آل عمران“ سے ان دو ہستیوں کے خاندان سے خاص و مخصوص افراد اور ان سے ملحق و مربوط نزدیک ترین افراد مراد ہیں..... جیسا کہ اس سلسلہ میں پہلے مذکورہ مطالب سے آپ مطلع ہو چکے ہیں..... تو جہاں تک ”آل ابراہیم“ کا تعلق ہے تو اس لفظ ہی سے ظاہر ہے کہ اس سے مراد آنجناب کی نسل سے پاک افراد مراد ہیں مثلاً حضرت اسحاق و حضرت اسرائیل، اور بنی اسرائیل میں مبعوث کئے جانے والے انبیاء، حضرت اسماعیل اور ان کی نسل سے پاک ہستیاں، کہ جن کے سردار اور افضل ترین شخصیت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، اور وہ مقدس ہستیاں جو ان شخصیات کے ساتھ مقامات ولایت میں ملحق ہیں، البتہ آیت مبارکہ میں آل ابراہیم کے ساتھ صرف آل عمران کو ذکر کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مذکورہ بالا افرادی وسعت مقصود نہیں کیونکہ لفظ عمران جو کہ اس آیت میں ذکر ہوا ہے اس سے مراد یا حضرت مریم کے والد گرامی ہیں یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پدر بزرگوار ہیں، دونوں صورتوں میں ان کا تعلق نسل ابراہیم سے ہے اور وہ ”آل ابراہیم“ کے دائرہ میں آتے ہیں، اور آل ابراہیم کے بعد آل عمران کا ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے تمام افراد نسل مراد نہیں بلکہ ان کی ذریت میں سے ظاہرین مقصود ہیں (یعنی وہ ہستیاں جو خدا کی

برگزیدہ ہیں)، چنانچہ خداوند عالم نے اس سلسلہ میں اس طرح ارشاد فرمایا:

سورۃ نساء، آیت: ۵۴

○ ” أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَى مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُمْ مُلْكًا عَظِيمًا“

(یادہ لوگوں سے حسد کرتے ہیں بوجہ اس کے کہ خدا نے ان لوگوں کو اپنے فضل و کرم میں سے عطا فرمایا ہے، اور ہم نے آل ابراہیم کو کتاب و حکمت دی اور انہیں عظیم ملک و اقتدار عطا کیا ہے)،

یہ آیت مبارکہ بنی اسرائیل پر اعتراض کے طور پر ہے جیسا کہ اس کے سیاق اور اس سے ماقبل اور مابعد آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں آل ابراہیم سے مراد بنی اسرائیل نہیں یعنی حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب اور حضرت یعقوب کی ذریت و اولاد مراد نہیں کیونکہ اولاد یعقوب بھی بنی اسرائیل ہیں، لہذا آل ابراہیم میں صرف حضرت اسماعیل کی نسل سے ظاہر و مطہر نسل ہی باقی رہ جاتی ہے کہ جو حضرت پیغمبر اسلام اور ان کی آل ہے، اس کے ساتھ ساتھ ہم عنقریب اس امر کی وضاحت کریں گے کہ سورۃ نساء کی مذکورہ بالا آیت میں لفظ ”الناس“ سے مراد حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی قدر ہے کہ جو آیت مبارکہ کی واضح دلالت کی بناء پر آل ابراہیم میں شامل ہیں۔

اس کے علاوہ درج ذیل آیات مبارکہ کے ذیلی جملوں سے بھی ہمارے مذکورہ بالا مطلوب کا ثبوت ملتا ہے، ملاحظہ

:۶۷

سورۃ آل عمران، آیت: ۶۸

○ ” إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِي نَبَّأَهُ وَهُدَى النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا.....“

(بے شک ابراہیم سے قرب کے سب سے زیادہ حقدار وہ ہیں جنہوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ لوگ جو

ایمان لائے ہیں.....)

سورۃ بقرہ، آیت: ۱۲۹

○ ” وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۱۲۹﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا..... رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ.....“

(اور جب گھر کی دیواریں کھڑی کر رہے تھے ابراہیم اور اسماعیل (تو انہوں نے کہا) اے ہمارے پروردگار! تو ہم

سے قبول فرما، کہ بے شک تو خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے ۵ اے ہمارے پروردگار! اور تو ہمیں اپنا مسلمان..... فرماں بردار و سر تسلیم خم کرنے والا..... بنا، اور ہمیں ہمارے اعمال کا مشاہدہ کرو!..... اے ہمارے رب! اور تو انہی میں سے ان میں ایک پیغمبر مجوس فرما جو ان میں تیری آیات کی تلاوت کرتا ہو اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہو اور ان کا تذکیہ نفس کرتا ہو.....)

تو معلوم ہوا کہ آل ابراہیم سے ان کی ذریت و نسل سے وہ پاک ہستیاں مردا ہیں جو حضرت اسماعیل کی اولاد سے

ہیں۔

یہاں یہ نکتہ قابل ذکر و لائق توجہ ہے کہ آیت مبارکہ چونکہ برگزیدگان الہی کے حصر کے مقام میں نہیں (یعنی اس مطلب کے بیان پر مشتمل نہیں کہ صرف یہی افراد برگزیدگان خدا ہیں) لہذا اس سے خود حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور نسل ابراہیم سے ظاہر و مطہر انبیاء علیہم السلام کے برگزیدہ ہونے سے کسی طرح کا تعارض و تضاد یا نفی کا پہلو ظاہر نہیں ہوتا، زیر نظر آیات مبارکہ میں حضرت آدم، حضرت نوح اور آل ابراہیم و آل عمران کے برگزیدہ ہونے کا تذکرہ ہوا ہے اس میں دوسروں کے برگزیدہ ہونے کی نفی کا کوئی پہلو یا اشارہ نہیں پایا جاتا لہذا اس میں اور ان آیات میں کوئی تعارض و تنافی نہیں پائی جاتی جن میں ان کے فضائل و مناقب اور عظمت شان و بزرگی مقام و منزلت مذکور ہے اور ان میں ان ہستیوں کے برگزیدہ ہونے کا واضح اشاراتی ثبوت پایا جاتا ہے، اس طرح کی آیات مبارکہ بہت زیادہ ہیں اور ان کے تفصیلی ذکر کی یہاں ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ کسی چیز کا اثبات اس کے علاوہ کسی کی نفی کی دلیل نہیں بن سکتا، اس بناء پر زیر نظر آیت مبارکہ سے جن ہستیوں کے برگزیدہ الہی ہونے کا ثبوت ملتا ہے اس سے ان کے علاوہ دوسروں کے برگزیدہ خدا ہونے کے نفی ظاہر نہیں ہوتی، اور نہ ہی اس آیت سے کسی طرح کا تعارض یا کسی کے برگزیدہ ہونے کی نفی ثابت ہوتی ہے کہ جس میں خداوند عالم نے بنی اسرائیل کی تعریف کی اور ان کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا:

سورۃ جاثیہ، آیت: ۱۶:

” وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيۤ اِسْرٰٓءِیْلَ الْكِتٰبَ وَالْحٰكِمَۃَ وَ النَّبُوۃَ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی

الْعٰلَمِیْنَ

(اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب، حکومت و اقتدار اور نبوت عطا کی اور انہیں پاکیزہ چیزوں میں سے رزق عطا کیا ورا انہیں عالمین پر برتری دی)

بہر حال یہ تمام مطالب واضح و روشن ہیں اور ان سے ہمارے مطلوب کا بخوبی ادراک حاصل ہوتا ہے۔

بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ بنی اسرائیل کو عالمین پر برتری دینا ان کے علاوہ کسی کو عالمین پر برتری دینے سے ہرگز



منافقات نہیں رکھتا، یعنی ایسا نہیں کہ بنی اسرائیل کو برتری دیا جانا کسی دوسرے کو برتری دیئے جانے سے مانع ہو، اور نہ ہی یہ کہ خود ان پر کسی کو برتری دینے سے مانع ہو کیونکہ کسی قوم یا چند قوموں کا دوسروں پر برتری سے نوازا جانا ان کے کسی دینی یا دنیوی فضیلت میں دوسروں پر مقدم ہونے کا مستوجب ہوتا ہے لہذا اگر ان کا دوسروں پر برتری پانا دوسروں کے برتری پانے سے منافی ہو یا زیر نظر آیت مبارکہ میں جن ہستیوں یعنی حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ اور آل ابراہیمؑ و آل عمرانؑ کا عالمین پر برتری پانا ان کے علاوہ دوسروں کے عالمین پر برتری پانے کے منافی ہو تو آیت میں مذکور افراد کا بھی ایک دوسرے پر برتری پانا بھی ناقابل قبول اور نادرست قرار پائے گا، جبکہ یہ صحیح نہیں اور یہ واضح و روشن ہے کہ وہ حضرات آپس میں ایک دوسرے پر بھی بعض حوالوں سے برتری رکھتے ہیں۔ بنابراین ان کا عالمین پر برتری کا حامل قرار دیا جانا ان کے آپس میں ایک دوسرے سے برتر ہونے کے منافی نہیں جیسا کہ درج ذیل آیتوں میں انبیاء الہی کا ایک دوسرے پر برتری کا حامل ہونا اور اسی طرح ان کا عالمین پر برتری کا حامل قرار دیا جانا مذکور ہے:

سورۃ النعام، آیت: ۸۶

○ ” وَكَلَّا فَضَّلْنَا عَلَيَّ الْعَالَمِينَ ”

(اور ہم نے سب کو عالمین پر فضیلت و برتری عطا کی)

سورۃ اسرئٰی، آیت: ۵۵

○ ” وَكَذَٰلِكَ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَىٰ بَعْضٍ ”

(اور ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر برتری و فضیلت دی ہے)

یہ تو ہے آل ابراہیم کے برگزیدہ الہی ہونے کا بیان، اور جہاں تک آل عمران کی بات ہے تو اس میں عمران سے بظاہر حضرت مریمؑ کے والد گرامی قدر مراد ہیں اور آل عمران سے ان کی ذریت و نسل مراد ہے، چنانچہ اس کا اشاراتی ثبوت یہ ہے کہ ان دو آیتوں (۳۳، ۳۴) کے بعد وہ آیات ذکر ہوئی ہیں جن میں ”امراة عمران“ (عمران کی زوجہ) اور ”مریم ابنة عمران“ (عمران کی بیٹی مریم) کے بارے میں مطالب درج ہیں۔ اور حضرت مریمؑ کے والد گرامی قدر جناب عمران کا ذکر قرآن مجید میں ان کے نام کے ساتھ بارہا ہوا ہے جبکہ حضرت موسیٰؑ کے والد گرامی قدر جناب عمران کا تذکرہ ایک بار بھی قرآن مجید میں کہیں نہیں ہوا جس سے سمجھا جاسکے کہ اس میں اس سے مراد وہی ہیں، تو اس سے مزید واضح ہوتا ہے کہ زیر نظر آیت مبارکہ میں آل عمران سے مراد حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ یا وہ دونوں اور زوجہ عمران مراد ہیں۔

اب رہی نصاریٰ کی یہ بات کہ حضرت مریمؑ کے والد گرامی قدر کا نام عمران نہیں، تو یہ ان کی رائے و عقیدہ ہے اور قرآن ان کی آراء و خواہشات کے تابع نہیں۔

## ذریت و نسل کا تذکرہ

○ ”ذُرِّيَّةٌ بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ“  
(وہ ایک دوسرے کی ذریت و نسل سے ہیں)

لفظ ”ذریت“ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اصل میں اس سے مراد چھوٹی اولاد لی جاتی تھی پھر اسے چھوٹی اور بڑی تمام اولاد کے لئے استعمال کیا جانے لگا اور یہی معنی زیر نظر آیت مبارکہ میں مقصود ہے۔

لفظ ”ذرية“ اعراب کے لحاظ سے منصوب ہے کیونکہ یہاں عطف بیان ہے (جملے میں ال ابراہیم وال عمران کی وضاحت کے طور پر ذکر ہوا ہے)

آیت میں جملہ ”بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ“ اس امر کی دلیل ہے کہ ”ذریت“ میں سے جس کسی کا بھی تصور کریں یقیناً اس کی ابتداء یا انتہاء اسی میں سے کسی دوسرے بعض پر ہوتی ہے یعنی وہ سب ابتداء و انتہاء دونوں حوالوں سے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، تو اس کا لازمی امر اور قطعی نتیجہ یہ ہے کہ وہ سب ایک ایسے مجموعہ کی طرح ہیں جو متشابہ الاجزاء ہے کہ جس میں سے بعض اجزاء دوسرے بعض سے اوصاف و حالات میں جدا نہیں، اور ہماری گفتگو چونکہ ان کے برگزیدہ الہی ہونے کی بابت ہے لہذا اس سے یہ حقیقت سمجھی جاسکتی ہے کہ وہ سب ایک ذریت و نسل ہے جو ان فضیلتی صفات میں ہرگز ایک دوسرے سے متفرق نہیں جن کی بناء پر خداوند عالم نے انہیں عالمین پر برتری عطا فرمائی ہے کیونکہ خداوند عالم کے افعال ہر طرح کی عدم مقصدیت سے مبرا ہیں اور اس کے افعال میں سے ایک اصطفاء یعنی چننا، برگزیدہ کرنا ہے جو کہ کائنات ہستی میں ہر قسم کی خیر و نیکی کا سرچشمہ ہے اور ہر اچھائی اسی کے فیضان اثر کی عکاس ہے۔

## خدا کا سننا اور جاننا

○ ”وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ“  
(اور اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے)

”سَمِيعٌ“ یعنی خوب سننے والا سے مراد یہ ہے کہ وہ ان کے ان تمام اقوال کو سنتا ہے جو ان کے باطن اور ضمیر کی

ترجمانی کرتے ہیں۔

”عَلَيْهِمْ“ یعنی خوب جاننے والا سے مراد یہ ہے کہ وہ ان کے باطن و ضمیر اور دلوں میں چھپی ہوئی ہر بات سے پوری آگاہی رکھتا ہے،

یہ جملہ ”وَاللّٰهُ سَبِيحٌ عَلَيْهِمْ“ گویا ان کے برگزیدہ ہونے کی علت و سبب کے بیان پر مشتمل ہے یعنی اس امر کو واضح کرتا ہے کہ وہ خدا کی نگاہ و انتخاب کا مرکز کیوں قرار پائے؟ جیسا کہ جملہ ”ذُرِّيَّةً بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ“ بھی ان کے برگزیدہ ہونے کی وجہ بیان کرتا ہے کہ خداوند عالم نے انہیں اس عظیم و جلیل القدر عطیہ سے کیوں نوازا ہے؟

خلاصہ کلام یہ کہ خداوند عالم نے ان ہستیوں کو عالمین پر منتخب کیا اور یہ عظیم عنایت خداوندی اس لئے ان کے شامل حال ہوئی کہ وہ سب ایک ذریت و نسل ہے جس کے افراد فضیلتی صفات میں ایک دوسرے کے متشابہ ہیں اور وہ سب اپنے پروردگار کے حضور سر تسلیم خم کرنے اور دل کی گہرائی سے بارگاہ ربوبی میں اپنے آپ کو پورے طور پر اپنے مولا کے سپرد کر دینے کے ساتھ ساتھ حق پر ثابت قدم رہنے میں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اور خداوند عالم نے انہیں عالمین پر برگزیدہ کرنے کی نعمت سے اس لئے نوازا کہ وہ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے وہ ان کی ہر بات کو سنتا ہے اور جو کچھ ان کے دلوں میں ہے اس سے بخوبی آگاہ ہے۔

## روایات پر ایک نظر

### اہل بیت کی فضیلت پر امام رضا کا بیان

کتاب عیون اخبار الرضا میں امام رضا علیہ السلام اور مامون رشید عباسی کے درمیان ہونے والے مکالمہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مامون سے امام رضا علیہ السلام سے پوچھا:

”هل فضل الله العترة علي سائر الناس؟“

(کیا خدا نے عترت (اہل بیت نبی) کو تمام لوگوں پر برتری عطا کی ہے؟)

امام نے ارشاد فرمایا:

”ان الله ابان فضل العترة علي سائر الناس في محكم كتابه“

(خداوند عالم نے اپنی مقدس کتاب میں عترت کی تمام افراد بشر پر برتری کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔)

امام کا جواب سن کر مومن نے پوچھا :

”این ذلک فی کتاب اللہ ؟“

(اللہ کی کتاب میں کہاں یہ بات لکھی ہوئی ہے؟)

تو امام رضا علیہ السلام نے اس سے ارشاد فرمایا:

”فی قولہ: ان اللہ اصطفیٰ ادم و نوحاً و آل ابراہیم و آل عمران علی العالمین ذریۃ

بعضہا من بعض“،

(اس آیت مبارکہ میں: خدا نے جن لیا آدم کو، نوح کو، آل ابراہیم کو اور آل عمران کو تمام عالمین پر، وہ ایک نسل

(کتاب عیون اخبار الرضا جلد ۱ صفحہ ۲۳۰ حدیث ۱ باب ۲۳)

ہے جو ایک دوسرے سے ہے)

## خدا کا ارادہ و عمل

تفسیر العیاشی میں احمد بن محمد کے حوالہ سے امام رضا علیہ السلام سے منقول ہے آپ نے امام ابو جعفر محمد باقر علیہ

السلام کا ارشاد گرامی ذکر کیا کہ انہوں نے فرمایا:

”من زعم انه فرغ من الامر فقد كذب لان المشية لله في خلقه، يريد ما يشاء ويفعل ما

يريد، قال الله: ذرية بعضها من بعض واللہ سمیع علیہم، آخرها من اولها و اولها من آخرها،

فاذا اخبرتم بشيء منها بعينه انه كائن و كان في غيره منه فقد وقع الخبير على ما اخبرتم عنه “

(جو شخص یہ گمان کرے کہ اب خدا مخلوق کے امور سے فارغ ہو گیا ہے..... اب اسے مخلوق کے امور سے کوئی سروکار

نہیں..... وہ جھوٹا ہے، کیونکہ خدا کی مشیت اس کی مخلوق میں جاری و نافذ ہے، وہ جو چاہتا ہے اس کا ارادہ کرتا ہے اور جس کا

ارادہ کر لیتا ہے اسے انجام دیتا ہے، اسی لئے خدا نے ارشاد فرمایا ہے کہ وہ ذریت و نسل اول سے آخر تک ایک دوسرے سے

پیوستہ و وابستہ ہے، اگر تم خدا کی مشیت کے بارے میں کوئی بات سنو کہ اس نے فلاں چیز کا وعدہ کیا اور وہ وعدہ کسی دوسری چیز

میں پورا ہوا تو دراصل تم نے جو کچھ سنا وہی اپنی عملی صورت پایا ہے (یعنی اگر اس نے عمران کو بیٹا عطا کرنے کا وعدہ کیا اور وہ

وعدہ حضرت مریم سے حضرت عیسیٰ کی ولادت کی صورت میں پورا ہوا تو اسے خدا کے وعدہ کی تکمیل سمجھیں، اس کی تکذیب

نہ کریں۔) (تفسیر العیاشی جلد ۱ صفحہ ۱۶۹ حدیث ۲۳)

اس روایت میں بھی اسی مطلب کا ثبوت ملتا ہے جو ہم نے جملہ ”ذُرِّيَّةٌ بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ“ کے معنی کی

وضاحت میں ذکر کیا ہے۔

## ذریت کی حقیقت

تفسیر العیاشی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک روایت مذکور ہے کہ آپ نے آیت مبارکہ ” إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةً بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ “ کی تلاوت کی اور ارشاد فرمایا:

” نحن منهم و نحن بقية تلك العترة “

( ہم اسی ذریت میں سے ہیں اور ہم ہی اس عترت کے افراد ہیں )

امام کا ارشاد گرامی ہے : ” ونحن بقية تلك العترة “ اور ہم اس عترت کے باقی افراد ہیں۔ ”عترت“ سے یہاں اس کا اصل لغوی معنی مراد ہے اس کا اصل معنی کسی چیز کی بنیاد و اساس ہے کہ جس پر وہ چیز قائم ہوتی ہے۔ اسی معنی میں لفظ عترت کسی گزرے ہوئے شخص کی اولاد اور نزدیک ترین قرابتداروں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں لفظ ”عترت“ خاندان کے تمام افراد میں ایک محفوظ عمود کا نام ہے جس سے وہ سب ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام علیہ السلام نے آیت مبارکہ کے جملہ ” ذُرِّيَّةً بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ “ سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس سلسلہ کی کڑی قرار دیا جو آدم سے نوح اور نوح سے آل ابراہیم و آل عمران تک قائم و جاری ہے، اور اس سے یہ نکتہ بھی ظاہر و واضح ہوتا ہے کہ آدم و نوح کو آل ابراہیم اور آل عمران کے ساتھ یکجا کیوں ذکر کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اصطفاء اور خدا کی طرف سے منتخب ہونے میں ایک سلسلہ کے تمام افراد ایک دوسرے سے متصل و وابستہ اور پستہ ہیں۔

## آیات ۳۵ تا ۴۱

- اذ قالت امرات عمران رب اني نذرت لك ما في بطني محررا فتقبل مني <sup>ع</sup>  
انك انت السميع العليم <sup>٣٥</sup>
- فلما وضعتها قالت رب اني وضعتها انثى <sup>ط</sup> والله اعلم بما وضعت <sup>ط</sup>  
وليس الذكور الا انثى <sup>ع</sup> واني سويتها مريم <sup>ع</sup> واني اعيد هابك  
وذريتها من الشيطان الرجيم <sup>٣٦</sup>
- فتقبلها ربها بقبول حسن وانبتها نباتا حسنا <sup>لا</sup> وكفلها زكريا <sup>ع</sup> كلما دخل  
عليها زكريا الى المحراب <sup>لا</sup> وجد عندها رزقا <sup>ع</sup> قال يريم اني لك هذا <sup>ط</sup> قالت  
هو من عند الله <sup>ط</sup> ان الله يرزق من يشاء <sup>ع</sup> بغير حساب <sup>٣٧</sup>
- هنالك دعا زكريا ربه <sup>ع</sup> قال رب هب لي من لدنك ذرية طيبة <sup>ع</sup> انك  
سميع الدعاء <sup>٣٨</sup>

- فَتَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْحَرَابِ أَنْ اللَّهَ يَشْرِكَ بِبِحَبْلِي مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ  
مِّنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا أَوْ حُصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ﴿۳۵﴾
- قَالَ رَبِّ أَلَيْسَ لِي عِلْمٌ وَقَدْ بَلَّغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَأَتِي عَاقِرٌ قَالَ كَذَلِكِ اللَّهُ يُفَعِّلُ مَا  
يَشَاءُ ﴿۳۶﴾
- قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً قَالَ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمْرًا وَاذْكُرْ  
رَبَّكَ كَثِيرًا وَسِحِّحْ بِالنَّعْشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ﴿۳۷﴾

## ترجمہ

○ ”جب عمران کی زوجہ نے کہا: پروردگارا! میں اس بچہ کو جو میرے شکم میں ہے آزاد کر کے تیرے لئے نذر کرتی ہوں، تو میری طرف سے قبول فرمائے، کہ تو خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے“

(۳۵)

○ ”پھر جب اس نے بچہ جنا تو کہنے لگی: پروردگارا! میں نے تو لڑکی جنی ہے، اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس نے کیا جنا ہے، اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا، میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اسے اور اس کی ذریت کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں“

(۳۶)

○ ”تو اس کے پروردگار نے اس کی نذر کو احسن طور پر قبول کر لیا اور اس کی نشوونما کا بہترین بندوبست کیا اور اس کی کفالت زکریا نے کی، جب زکریا اس کے مقام عبادت میں جاتے تو اس کے پاس کھانے کی چیزیں دیکھتے اور پوچھتے کہ اے مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آیا ہے؟ تو وہ کہتیں کہ یہ اللہ کی طرف سے آیا ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق عطا کرتا ہے“

(۳۷)

○ ”اس وقت زکریا نے اپنے پروردگار سے دعا کی اور کہا: اے میرے رب! مجھے بھی اپنی طرف سے پاکیزہ اولاد عطا فرما کہ تو دعاؤں کا خوب سننے والا ہے“

(۳۸)



” ابھی وہ اسی مقام عبادت میں نماز ادا کر رہے تھے کہ فرشتوں نے آواز دی کہ اللہ تعالیٰ تجھے  
 یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے جو اللہ کے کلمہ کی تصدیق کرنے والا ہوگا اور سید و سردار، انتہائی ضبط  
 نفس رکھنے والا اور صالحین میں سے نبی ہوگا“

(۳۹)

” زکریا نے کہا: میرے ہاں لڑکا کیونکر پیدا ہوگا میں تو بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری زوجہ بانجھ  
 ہے، اللہ نے کہا: ایسا ہی ہے، اللہ جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے“

(۴۰)

” زکریا نے کہا: پروردگارا! میرے لئے کوئی نشانی قرار دے، خدا نے کہا: تیری نشانی یہ ہے کہ تم  
 تین دن تک لوگوں سے صرف اشارے سے بات کرو اور اپنے رب کا ذکر کثرت کے ساتھ کرو،  
 اور صبح و شام تسبیح کرتے رہو“

(۴۱)

## تفسیر و بیان

## زوجہ عمران کی منت

○ ” اِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِی بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۗ اِنَّكَ اَنْتَ السَّیِّعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۵﴾ “

(جب زوجہ عمران نے کہا: پروردگارا! میں نے تیرے لئے نذر کر دیا ہے اس کو جو میرے شکم میں ہے آزاد صورت میں! تو میری نذر قبول فرما کہ بے شک تو ہی خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے)

” نذر “ (منت) کا معنی یہ ہے کہ انسان اپنے اوپر کسی اس چیز یا کام کو واجب کرے جو اس پر واجب نہ ہو ، ” محرراً “، تحریر سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، تحریر کا معنی کسی چیز کو بندھن سے آزاد کر دینا ہے، اسی بناء پر غلام آزاد کرنے کو ” تحریر “ کہتے ہیں (بحر سیرہ رقبۃ)، اور لکھنے کو بھی ” تحریر “ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے معافی کو ذہن و فکر کے نہاں خانہ کی قید سے آزاد کیا جاتا ہے۔

” تقبیل “ کسی چیز کو رضا و خوشی کے ساتھ قبول کرنے کے معنی میں آتا ہے مثلاً ہدیہ قبول کرنا، دعا قبول کرنا اور اس طرح کے دیگر امور۔

اور آیت مبارکہ کے جملہ ” قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِی بَطْنِیْ “ سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ بات اس وقت کہی جب وہ حاملہ تھیں اور یہ کہ ان کا حمل جناب عمران سے تھا، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس دعا سے نذر کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب انہوں نے یہ دعا کی تو اس وقت ان کے شوہر عمران زندہ نہ تھے ورنہ انہیں (زوجہ عمران کو) یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ اپنے طور پر اپنے شکم میں موجود بچہ کو آزاد کریں، چنانچہ اس کا ثبوت آیت ۴۴ ” وَمَا كُنْتُمْ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُونَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ صَرِيْمٌ ..... “ میں بھی موجود ہے کہ اس کی تفصیل عنقریب ذکر کی جائے گی کہ جب وہ مریم کی کفالت کے بارے میں قرعہ اندازی کر رہے تھے تو اس وقت جناب عمران زندہ نہ تھے۔

## آزاد کرنے کا مرادی معنی

آیت مبارکہ میں ”محرراً“ کا لفظ ذکر ہوا ہے یعنی زوجہ عمران نے اپنے شکم میں موجود بچہ کو آزاد کیا، تو اس آزاد کرنے سے مراد غلام آزاد کرنے والا معنی نہیں کیونکہ باپ یا ماں کا بچہ کو آزاد کرنا غلام آزاد کرنے کے باب سے نہیں ہوتا بلکہ اس حاکمیت یا سرپرستی کی قید سے آزاد کرنا ہوتا ہے جو والدین کو بچہ پر حاصل ہوتی ہے کہ اس کی تربیت کے تمام امور کا اہتمام کریں، اپنے مقاصد اور ضروری امور کی تکمیل میں اس سے استفادہ کریں کہ اس بناء پر والدین کی اطاعت و فرمانبرداری واجب قرار دی گئی ہے۔ تو اس سرپرستی و ذمہ داری کی قید سے آزاد کرنے سے بچہ والدین کی بالادستی کے دائرہ سے باہر نکل جاتا ہے اور وہ اس سے کوئی کام نہیں لے سکتے، اب اگر آزاد کرنا خدا کے لئے نذر کی صورت میں ہو تو وہ بچہ خدا کی ولایت و ذمہ داری کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے کہ پھر صرف خدا کی عبادت و بندگی انجام دے اور اس کی خدمت گزاری کا حق ادا کرے، خدا کی خدمت گزاری سے مراد یہ ہے کہ مساجد و عبادت گاہوں اور خدا کی عبادت سے مختص مراکز میں خدمت کرے اور یہ اس وقت تک ہو کہ اگر اس طرح آزاد نہ ہوتا تو والدین کی خدمت گزاری میں مشغول ہوتا۔ یعنی جتنی مدت والدین کی خدمت گزاری میں مشغول رہتا اس پر واجب و لازم تھا اتنی مدت تک خدا کی خدمت گزاری میں مشغول رہے۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ عربوں کے ہاں عام رسم تھی کہ وہ اپنے بچہ کو اللہ کے لئے آزاد کرتے تھے کہ پھر اس سے اپنے لئے کوئی کام نہیں لیتے تھے اور اپنے متعلقہ امور میں اس سے استفادہ نہیں کرتے تھے بلکہ اسے کلیسا میں لے جاتے تاکہ وہ صفائی وغیرہ کرے اور کلیسا کے کام انجام دے، وہ بچہ بالغ ہونے تک کلیسا میں خدمت گزاری میں مشغول رہتا اور جب بالغ ہو جاتا تو وہ خود فیصلہ کرتا کہ کلیسا کی خدمت گزاری کو جاری رکھے یا اسے چھوڑ دے، اگر وہ اس خدمت گزاری کو پسند کرتا تو وہیں قیام پذیر ہو جاتا اور کلیسا کے امور انجام دیتا رہتا، اور اگر وہاں سے باہر آنا پسند کرتا تو ایسا کرنے کا اختیار اسے حاصل ہوتا تھا۔

زوجہ عمران کی دعا کے الفاظ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ یقینی طور پر یہ سمجھ رہی تھی کہ اس کے شکم میں جو بچہ ہے وہ لڑکا ہے لڑکی نہیں ہے کیونکہ وہ بارگاہ رب العزت میں پورے یقین و اعتماد کے ساتھ دعا کر رہی تھیں اور ان کی دعائیں کوئی مشروط الفاظ بھی نہیں تھے کہ وہ کہہ رہی ہوں کہ اگر مجھے لڑکا عطا ہوا تو میں اسے آزاد کر کے اس کی نذر کرتی ہوں بلکہ وہ صریح لفظوں میں اس طرح کہہ رہی تھیں: ”نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا“ اس میں انہوں نے اس بچہ کے لڑکا ہونے کی کوئی شرط وغیرہ ذکر نہیں کی۔

## ادب القرآن کا خوبصورت حوالہ

آیت مبارکہ میں لفظ ”محرراً“ مذکر ہے جس سے یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ وہ جملہ ”مَا فِي بَطْنِي“ میں حرف ”ما“ سے حال ہے کیونکہ حرف ”ما“ مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اور آیت کا معنی اس طرح ہے: ”میں تیرے لئے نذر کرتی ہوں اسے جو میرے شکم میں ہے“۔ اس میں مذکر مؤنث یعنی لڑکا اور لڑکی کا خاص طور پر ذکر نہیں،

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ گمان درست نہیں کیونکہ اگر زوجہ عمران نے اس طرح مطلق اور عام نذر کی ہوتی اور شکم میں موجود بچہ کے بارے میں یہ نہ سوچا ہوتا کہ وہ لڑکا ہے بلکہ لڑکا اور لڑکی دونوں میں سے کسی ایک کا تعین نہ کیا ہوتا تو بچہ کی ولادت کے بعد حزن و حسرت اور افسوس کے ساتھ ہرگز یہ نہ کہتیں: ”سَرَّابِ اِنِّي وَضَعْتُهَا اُنْثَىٰ“ پروردگار! میں نے لڑکی جنی ہے، اور یہ بھی نہ کہا جاتا: ”وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۗ وَ كَيْسَ الَّذِیْ كَرَّ كَالْاُنْثَىٰ“ اور اللہ خوب آگاہ ہے کہ اس نے کیا جنما ہے اور لڑکا لڑکی جیسا نہیں۔ عنقریب اس سلسلہ میں مزید مطالب ذکر کئے جائیں گے۔

کلام الہی میں حضرت مریمؑ کی والدہ گرامی قدر کے دعائیہ اظہارات کا تذکرہ جن الفاظ میں ہوا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہیں اپنے شکم میں لڑکا ہونے کا پختہ یقین تھا اور ان کا یقین نا پختہ بنیاد پر مبنی نہیں تھا اور نہ ہی ان ظاہری قرائن کی بناء پر تھا جو عام طور پر خواتین کو تجربات کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں کیونکہ وہ سب ظن و گمان سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور انہیں یقین سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ ظن و گمان سے نہ تو حق کا اثبات ہو سکتا ہے اور نہ ہی وہ حق و حقیقت سے بے نیاز کر سکتا ہے، ویسے بھی کلام الہی باطل و ناحق پر مشتمل نہیں اور اگر کسی مقام پر باطل و ناحق کا تذکرہ ہوا ہے تو اس کے ساتھ اس کے ابطال اور نادرست ہونے کو بھی ذکر کر دیا گیا ہے بلکہ جہاں بھی باطل کا نام لیا گیا ہے وہاں اس کا غلط ثابت کرنا مقصود ہے اور اسے غلط ثابت کر بھی دیا گیا ہے۔ جیسا کہ درج ذیل آیت مبارکہ میں حاملہ عورت کے شکم میں موجود بچہ کے بارے میں آگاہی کی بابت ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہ رعد، آیت: ۸

○ ” اَللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَحْبِلُ كُلُّ اُنْثَىٰ ۗ وَمَا تَخْفِیْضُ الَّا رَحَامٌ وَمَا تَزِدُ ۗ“

(اللہ ہی ہر عورت کے حمل سے آگاہ ہے اور اس سے بھی آگاہ ہے کہ رحموں میں کیا کمی اور کیا زیادتی ہوتی

رہتی ہے)

ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا:

سورہ لقمان، آیت: ۳۴

○ ”عِنْدَكَ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنزَّلُ الْغَيْبَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَلْحَامِ“

(اس کے پاس ہی ہے قیامت کا علم، اور وہ بارش نازل کرتا ہے اور جو کچھ رحموں میں ہے اسے جانتا ہے) تو خداوند عالم نے جو کچھ رحموں میں ہے اس سے آگاہی کو غیب کی وہ حقیقت قرار دیا ہے جو اسی سے مختص ہے۔ علم غیب کے بارے میں ارشاد ہوا:

سورہ جن، آیت: ۲۷

○ ”عِلْمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ۖ إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ“

(وہ عالم الغیب ہے، وہ کسی کو اپنے غیب تک رسائی نہیں دیتا سوائے اس کے کہ جسے وہ پسند کر لے) اس آیت میں خداوند عالم نے غیر اللہ کی علم غیب تک رسائی کو اپنی وحی سے وابستہ قرار دیا ہے۔

ان تمام مطالب سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم کا زوجہ عمران کے ان مطالب کے اظہارات کو یقین پر مبنی ہونے کی صورت میں ذکر کرنا جن کا علم خدا سے مخصوص و مختص ہے اس امر کا ثبوت ہے کہ والدہ مریمؑ کا اپنے شکم میں لڑکا ہونے سے آگاہ ہونا کسی حوالہ و بنیاد پر وحی سے وابستہ تھا، یہی وجہ ہے کہ جب انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ بچہ لڑکا نہیں بلکہ لڑکی ہے تو وہ اپنے ہاں لڑکے کی ولادت سے مایوس و نا امید نہیں ہوئیں اور دوبارہ پورے یقین و اعتماد کے ساتھ کہنے لگیں، ”وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهُمَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ“ کہ میں اسے اور اس کی ذریت و اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ تو ان الفاظ سے انہوں نے اپنی بیٹی کے ہاں اولاد ہونے سے آگاہی کا اثباتی اشارہ کیا جبکہ ظاہری طور پر انہیں اس کا علم نہ تھا۔

زوجہ عمران کی دعا کے آخری لفظوں میں طلب قبولیت کی بابت ذکر کئے گئے جملہ ”فَتَقَبَّلْنِي“ (تو مجھ سے قبول کر) میں اس کا مفعول محذوف ہے یعنی انہوں نے یہ ذکر نہیں کیا کہ کیا قبول کر، تو اس سے یہ احتمال دیا جاسکتا تھا کہ ان کی مراد یہ ہو کہ خدایا، میری نذر کو قبول کر، کہ وہ عمل صالح ہے، یا میرے آزاد کئے ہوئے فرزند کو قبول کر، لیکن خدا کی طرف سے اس کی دعا کو شرف قبولیت عطا کئے جانے کی بابت یہ جملہ ”فَتَقَبَّلْنَاهَا سَرَابًا يَقْبُولُ حَسَنٍ“ (اسے اس کے پروردگار نے اچھے طور پر قبول کر لیا) اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ یا دلیل ہے کہ ان کا مقصد آزاد کئے ہوئے فرزند کو مقبول بارگاہ خداوندی قرار دینا تھا، یعنی انہوں نے خدا سے دعا کی کہ میرے آزاد کئے ہوئے فرزند کو اپنی بارگاہ میں قبول کر لے۔

## زوجہ عمران کا اظہارِ حزن

○ ” فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّي وَضَعْتُهَا اُنْثٰى “  
(پھر جب اس نے اسے جنا تو کہا: پروردگارا! میں نے تو لڑکی جنی ہے)

اس جملے میں ایک نہایت لطیف اختصار گوئی کی صورت پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ ” فلما وضعت ما فی بطنها “ (پھر جب اس نے اسے جنا جو اس کے شکم میں تھا) کے بجائے ” فَلَمَّا وَضَعَتْهَا “ (پھر جب اس نے اسے جنا) کہا گیا یعنی جملہ ” ما فی بطنها “ کی جگہ ضمیر ”ها“ ذکر کر کے کلام کو مختصر طور پر پیش کیا گیا، جبکہ اصل میں ” ما فی بطنها “ کے الفاظ کے ساتھ پورے جملہ کا معنی واضح ہوتا ہے، تو آیت کا معنی یہ ہے کہ ” جب اس نے اسے جنا جو اس کے شکم میں تھا اور واضح ہوا کہ وہ لڑکی ہے تو اس نے کہا: پروردگارا! میں نے تو لڑکی جنی ہے “! ان کے یہ الفاظ خدا کو باخبر و مطلع کرنے کے لئے نہ تھے بلکہ افسوس و حزن کے اظہار کے لئے تھے،..... کیونکہ خدا تو ہر شے سے آگاہ ہے.....

خدا کا علم و آگاہی!

○ ” وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعْتَ وَلَيَسَّ الذِّكْرُ كَالْاُنْثٰى “  
(اور اللہ بخوبی آگاہ ہے اس سے جو اس نے جنا، اور لڑکا لڑکی جیسا نہیں ہوتا)

یہ دونوں جملے معترضہ ہیں اور یہ خدا کا کلام ہے زوجہ عمران کے الفاظ نہیں، اور نہ ہی یہ بات درست ہے کہ دوسرا جملہ زوجہ عمران کا ہے جبکہ پہلا جملہ خدا کا بیان ہے، بلکہ دونوں جملے کلام خداوندی ہے۔ جہاں تک پہلے جملہ کا تعلق ہے تو وہ واضح ہے لیکن زوجہ عمران نے چونکہ اپنے قلبی دکھ کا اظہار ان لفظوں میں کیا: ” رَبِّ اِنِّي وَضَعْتُهَا اُنْثٰى “ (پروردگارا! میں نے تو لڑکی جنی ہے) لہذا خدا کے اس بیان ” وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعْتَ “ (خدا خوب آگاہ ہے اس سے جو اس نے جنا) سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس امر کو بیان کرنا چاہتا ہے کہ ہم یہ بات جانتے ہیں کہ وہ لڑکی ہے لیکن ہم اس کی آرزو کو احسن طور پر اور اس کی دل پسند صورت میں پورا کرنا چاہتے ہیں لہذا اگر اسے معلوم ہوتا ہے ہم نے اس کے شکم میں لڑکی کیوں قرار دی ہے تو ہ اظہارِ افسوس نہ کرتی، اور اس طرح دکھی و مغموم نہ ہوتی کیونکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ وہ جس لڑکے کی امید رکھتی تھی وہ اس لڑکی

کے مقام و منزلت کا حامل ہرگز نہ ہوتا جو ہم نے اسے عطا کیا ہے اور جو کچھ اس لڑکی سے حاصل ہونا ہے وہ اس لڑکے سے قطعی طور پر حاصل نہ ہو سکتا تھا، اور وہ یہ کہ اس لڑکی سے عیسیٰ جیسی عظیم شخصیت کو جنم لینا تھا کہ جو خدا کا نبی، مادرزاد ناپینا کوشقیاب کرنے والا، برص کے مرض میں مبتلا شخص کو اس سے نجات دلانے والا اور مردوں کو زندہ کرنے والا ہے، مگر اس جنم پانے والی لڑکی ہی سے ایک بچہ پیدا ہوگا جس سے کلمتہ اللہ پورا ہو جائے گا اور وہ ایسا بچہ جنے گی جو بغیر باپ کے پیدا ہوگا جس کے نتیجہ میں وہ اور اس کا بچہ، عالمین کے لئے آیت اور خدا کی نشانی قرار پائیں گے۔ وہ بچہ گہوارہ میں لوگوں سے باتیں کرے گا اور وہ روح اللہ اور کلمتہ اللہ ہوگا اور اس کی مثال اللہ کے نزدیک آدم جیسی ہوگی، تو یہ ہیں وہ روشن و واضح نشانیاں جو اس پاک و مبارک بچی اور اس کے فرزند عیسیٰ علیہما السلام کی تخلیق میں پائی جاتی ہیں۔

اس بیان سے یہ بھی ظاہر و واضح ہوتا ہے کہ ”وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنثَى“ خدا ہی کا کلام ہے زوجہ عمران کے الفاظ نہیں، کیونکہ اگر زوجہ عمران کے الفاظ ہوتے تو اس طرح ہوتے: ”وَلَيْسَ السَّانِئِيُّ كَالذَّكَرِ“ (اور لڑکی تو لڑکے جیسی نہیں) جبکہ اس کے برعکس یوں کہا گیا: ”وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنثَى“ (اور لڑکا لڑکی جیسا نہیں) حالانکہ جو شخص کسی بلند مرتبت چیز یا مقام و منزلت کا خواہاں ہو اور اسے اس سے کمتر چیز یا کم درجہ مقام و منزلت دی جائے تو وہ کہتا ہے: یہ وہ نہیں جو مجھے مطلوب تھا، یا کہ جو کچھ مجھے دیا گیا ہے وہ اس جیسا نہیں جو میں چاہتا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ”الذَّكَرُ“ اور ”الْأُنثَى“ پر جو افعال و لام ہے وہ عہد کا معنی دیتا ہے، (یعنی جو کچھ ذہن میں تھا اس کی طرف اشارہ و توجہ دلانے کے لئے ہے) لیکن اکثر مفسرین حضرات نے جملہ ”وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنثَى“ کو زوجہ عمران کے بیان کا تتمہ قرار دیا ہے اور اس کی بابت غیر ضروری و بے نتیجہ زحمت و تکلف میں مبتلا ہو کر جملہ میں ”الذَّكَرُ“ کے ”الْأُنثَى“ پر مقدم ہونے کے بارے میں تاویلین کرنے میں مصروف ہو گئے جبکہ اس سے ہرگز کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں۔ جو شخص ان کے بیانات و اظہارات سے آگاہ ہونا چاہے وہ ان کی کتب کا مطالعہ کرے۔

## مریمؑ کی نام گزاری کا اظہار

○ ”وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهُمَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ“  
(اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں  
دیتی ہوں)

لفظ ”مریم“ عبرانیوں کی لغت میں ”عبادت گزار خاتون“ اور ”خدمت گزار خاتون“ کے معنی میں آتا ہے۔ اسی

سے اس راز کا پتہ چلتا ہے کہ زوجہ عمران نے اپنی نومولود بیٹی کا نام اس کی پیدائش کے وقت ہی فوراً ”مریم“ کیوں رکھا اور یہ کہ خداوند عالم نے بھی اس کی طرف سے نام گزاری کے اس فوری عمل کا تذکرہ کیوں کیا؟ کیونکہ جب وہ بچہ کے لڑکا ہونے سے مایوس ہوئیں کہ جو عبادت کے لئے کامل آزاد اور کلیسا کی خدمت گزاری کے لئے حاضر ہو تو انہوں نے فوراً اور کسی تاخیر کے بغیر نومولود کی نام گزاری کا اقدام کیا اور اسے ایسے نام سے موسوم کر دیا جو عبادت و خدمت گزاری کے لئے مخصوص ہے، لہذا ان کا یہ کہنا ”اِنِّی سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ“ کہ میں نے اس بچی کا نام مریم رکھ دیا ہے گویا ایسا ہے کہ انہوں نے کہا میں نے جو کچھ جتنا ہے اسے تیرے لئے آزاد قرار دے رہی ہوں۔ ان کے اس جملہ سے نذر کے اثبات کی دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد خداوند عالم نے ان کی نذر کو شرف قبولیت عطا کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ”فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَّ اُنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا“ کہ اسے اس کے پروردگار نے اچھی طرح قبول کر لیا اور اسے نشوونما کے بہترین سبب سے نوازا۔

اس کے بعد زوجہ عمران نے نومولود بچی اور اس کی اولاد نسل کو شیطان مردود سے خدا کی پناہ میں دیتے ہوئے کہا ”وَعِیْنُكَ هَآئِكَ وَذُرِّیَّتِهِمَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ“ (میں اسے اور اس کی نسل کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں)۔ انہوں نے اس لئے ایسا کیا تاکہ وہ عبادت و خدمت کی توفیق پائے اور اس کا نام اپنے منہ سے عین مطابق ہو۔

### زوجہ عمران کے یقین کا لطیف اشارہ

اس مقام پر ایک نہایت اہم مطلب قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ آیت میں لفظ ”ذُرِّیَّتِهِمَا“ ہر طرح کی قید و شرط کے بغیر ذکر ہوا ہے یعنی یہ نہیں کہا کہ اگر وہ صاحب اولاد ہوئی تو اس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتی ہوں بلکہ مطلق الفاظ استعمال کئے اور کہا کہ اسے اور اس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتی ہوں جبکہ اس طرح کے الفاظ کا ادا کرنا اس شخص سے ہرگز صحیح نہیں ہوتا جو آئندہ سے باخبر نہ ہو اور یہ بات واضح ہے کہ انسان کے مستقبل کے حالات کا تعلق علم غیب سے ہے کہ جو خداوند عالم کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں یعنی مستقبل کی باتیں غیب کے باب سے ہیں کہ جس کا علم صرف خدا کو ہے۔ یا ان ہستیوں کو ہے جنہیں خدا خود عطا کرے۔ م، تو ان کا اس طرح کہنا بعینہ اسی طرح ہے جیسے انہوں نے نذر کرتے ہوئے کہا تھا: ”رَبِّ اِنِّی نَذَرْتُ لَكَ مَا فِی بَطْنِی مُحَرَّرًا“ پروردگارا! میں تیرے لئے آزاد کر کے نذر کرتی ہوں اسے جو میرے شکم میں ہے، اس سلسلہ میں پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ان کے اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ انہیں معلوم تھا کہ عمران سے ایک نیک و صالح لڑکا پیدا ہوگا۔ پھر جب وہ حاملہ ہوئیں اور عمران انتقال کر گئے تو اب انہیں اس حوالہ سے کوئی شک باقی نہ رہا کہ ان کے شکم میں وہی بچہ ہے جس کا وعدہ کیا گیا ہے، اور پھر جب انہوں نے بچے کو جنا اور انہیں معلوم ہو گیا کہ ان کا اندازہ درست نہ تھا تو انہیں یقین حاصل ہو گیا کہ وہ لڑکا اسی نومولود بچی کی نسل سے ہوگا لہذا انہوں نے فوراً اپنی نذر میں ”بیٹے“ کی بجائے ”بیٹی“ ذکر کیا اور



اس کا نام ”مریم“ (یعنی عابدہ و خدمت گزار) رکھا، اور اسے اور اس کی ذریت و نسل کو شیطان مردود سے خدا کی پناہ میں دیا۔ یہ ہیں وہ مطالب جو کلام الہی میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتے ہیں۔

## نذر کی قبولیت کا خدائی اظہار

○ ” فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا “  
(تو اس کے پروردگار نے اسے اچھی طرح قبول کر لیا اور اس کی نشوونما کا اچھا بندوبست کر دیا)

اس جملہ میں دو الفاظ ذکر ہوئے ہیں: ایک ”تقبل“ اور دوسرا ”قبول“۔ جبکہ قاعدہ یہ ہے کہ جب لفظ ”قبول“ کو ”حسن“ کے ساتھ مقید کر کے ذکر کیا جائے تو اس میں ”تقبل“ کا معنی پایا جاتا ہے یعنی رضا و خوشی کے ساتھ قبول کرنا، بنا بریں اس جملے کا معنی یوں ہوگا: ”فقبلہا ربہا تقبلا“، (اس کے رب نے اسے قبول کر لیا جیسا کہ قبول کرنے کا حق ہے) تو یہاں آخر میں اس کے معنوی تجزیہ و تحلیل کے بعد اس کی جگہ ”بقبول حسن“ ذکر کیا گیا ہے جس سے اسی مطلب کا اثبات مطلوب ہے کہ یہاں حسن قبولیت کا اظہار مقصود ہے، اور صراحت کے ساتھ حسن قبولیت کا اظہار درحقیقت والدہ مریمؑ کے اعزاز و شرف کی غرض سے ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ یہاں دو جملے ایک دوسرے کے بالمقابل ذکر ہوئے ہیں: ایک ”فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا“ اور دوسرا ”وَإِنِّي سَمِّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهُمَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ“، تو ان دونوں جملوں کی درست تطبیق کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ کہا جائے کہ جملہ: ”وَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ“ اور اصل جملہ ”وَإِنِّي سَمِّيْتُهَا مَرْيَمَ“ کی قبولیت کا منظر ہے اور جملہ ”وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا“ جملہ ”وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهُمَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ“ کی قبولیت و استجابت کا عکاس ہے، بنا بریں اسے حسن قبولیت سے نوازا جانے کا مطلب یہ نہیں کہ نذر کی وجہ سے زوجہ عمران کا تقرب الی اللہ مورد قبول واقع ہوا اور انہیں اس عمل پر آخروی اجر و ثواب ملے گا کیونکہ قبولیت کی بابت یہ نہیں کہا گیا کہ اس کی نذر کو اس کے رب نے شرف قبولیت عطا کیا بلکہ ارشاد ہوا: ”فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا“ اسے اس کے رب نے قبول کر لیا، یعنی خود مریم کو اس کے رب نے قبول کر لیا، تو معلوم ہوا کہ زوجہ عمران سے ان کی بیٹی کو خدا نے اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا کیا کیونکہ اس کا نام ”مریم“ رکھا گیا اور اسے خدا کے لئے آزاد کر دیا گیا، اس بناء پر پورے جملہ کی بازگشت ”اصطفاء“ اور چن لینے کی طرف ہوگی اور

معنی یہ ہوگا کہ ہم نے اسے جن لیا، چنانچہ ”اصطفیٰ“ کا معنی ہی یہ ہے کہ جسے چنا گیا ہے وہ کامل طور پر اللہ تعالیٰ کے حضور سر تسلیم خم کر کے خود کو اپنے خالق کے سپرد کر چکا ہے، (مزید غور فرمائیں)۔

آیت میں ”وَ اَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا“ سے مراد اسے اور اس کی ذریت و نسل کو رشد و پاکیزگی کا عطا کیا جانا ہے اور اسے اور اس کی اولاد کو کہ جو اس کے شجر وجود کا ثمر ہے ایسی پاکیزہ زندگی سے فیض یاب کیا جو شیطانِ القاءات اور اس کی وسوسہ انگیزی و بدخواہی کی پلیدی کا شکار نہ ہو اور یہی حقیقی معنی میں پاک و طاہر ہونا ہے۔

تو یہی دو چیزیں یعنی ”قبول حسن“ اور ”نبت حسن“ ہیں کہ جن میں سے پہلی چیز یعنی قبول حسن (حسن قبولیت) کی بازگشت ”اصطفیٰ“ کی طرف ہے اور دوسری چیز یعنی ”نبت حسن“ کی بازگشت تطہیر و پاکیزگی کا عطا کرنے کی طرف ہے کہ ان دونوں امور کی طرف درج ذیل آیت مبارکہ میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے:

”وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ لَيَرِيْمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكَ وَ طَهَّرَكِ.....“ (اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ نے تجھے جن لیا ہے اور تجھے پاک بنایا ہے.....)،

اس سلسلہ میں مزید وضاحت عنقریب پیش کی جائے گی، انشاء اللہ تعالیٰ،  
مذکورہ بالا مطالب سے واضح ہوا کہ مریمؑ کا اصطفا و برگزیدہ ہونا اور ان کا پاک قرار دیا جانا دونوں دراصل ان کی والدہ گرامی قدر کی استجابت کے طور پر ہے جیسا کہ حضرت مریمؑ کا عالمین کی عورتوں پر برگزیدہ ہونا ان سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کی بناء پر ہے اور ان کا اور ان کے فرزند کا عالمین کے لئے خدا کی نشانی قرار دیا جانا دراصل خداوند عالم کے اس فرمان کی تصدیق کے طور پر ہے جس میں اس نے ارشاد فرمایا: ”وَلَيَسِّرَ اللّٰهُ كُفْرًا لَّنِيْٓحٰی“ کہ لڑکا لڑکی جیسا نہیں!

## مریم کی کفالت

○ ”وَ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا“

(اور اس کی کفالت کی ذمہ داری زکریا نے لے لی)

جناب زکریاؑ نے قرعہ اندازی کے ذریعے حضرت مریمؑ کی کفالت کی ذمہ داری سنبھالی کیونکہ لوگوں میں ان کی کفالت کی بابت تنازع پیدا ہو گیا تھا، پھر انہوں نے قرعہ کشی پر اتفاق کر لیا اور قرعہ جناب زکریاؑ کے نام پر نکلا، جیسا کہ آیت مبارکہ کے الفاظ سے اس کا ثبوت ملتا ہے: ”وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ لِيَكْفُلَ مَرْيَمَ ۗ وَ مَا كُنْتَ

لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُونَ“ (اور آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ اپنے قرعے ڈال رہے تھے کہ مریمؑ کی کفالت کون کرے گا اور آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ آپس میں لڑ بھگڑ رہے تھے)

## زکریا کا محراب میں آنا

○ ”كَلِمًا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا“  
(جب بھی زکریا محراب میں آئے تو انہوں نے اس (مریم) کے پاس رزق پایا)

”محراب“ اس جگہ کو کہتے ہیں جو عبادت کے لئے مختص کی گئی ہو خواہ وہ مسجد میں ہو یا گھر میں ہو۔ مشہور لغت دان راغب اصفہانی کا کہنا ہے کہ مسجد کے محراب کی وجہ تسمیہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اسے اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ شیطان اور نفسانی خواہشوں سے جنگ کرنے کی جگہ ہے، اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اسے اس نام سے موسوم کرنے کا اصل راز یہ ہے کہ حق یہ ہے کہ انسان وہاں دنیا کے امور اور ذہنی و فکری پراگندگی کا شکار ہونے سے محفوظ قرار پائے، بعض اہل دانش کا کہنا ہے کہ محراب اصل میں گھر کی اس جگہ کو کہا جاتا تھا جو بیٹھنے کا مرکزی مقام ہو، پھر جب مسجد بنائی گئیں تو ان کے مرکزی مقام کو اس نام سے موسوم کیا گیا، اس کے برعکس بعض ارباب فکر و تحقیق نے اس طرح کہا کہ لفظ ”محراب“ اصل میں مسجد کی مخصوص جگہ کے لئے رکھا گیا نام ہے اور یہ نام مسجد کی اس جگہ کے لئے مخصوص کیا گیا جو مسجدوں کے وسط و مرکزی مقام میں ہو اور اسی مناسبت سے یعنی محراب مسجد سے شباہت کی بناء پر گھر کے وسط و مرکز میں مقام کو محراب کہا جانے لگا، بظاہر یہی نظریہ درست ہے اور اس موضوع کی بابت جو اقوال ذکر کئے گئے ہیں ان میں صحیح ترین بھی یہی ہے چنانچہ اس کی تائید قرآنی حوالہ سے بھی ہوتی ہے جس میں ارشاد خداوندی ہے:

○ ”يَعْلَمُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ مَحَارِبٍ وَتَمَاثِيلٍ.....“ (سورۃ سباء، آیت ۱۳)..... وہ اس کے لئے جو وہ چاہتا تھا بنادیتے تھے یعنی محرابیں، مجسے.....،

(اس آیت میں جنات کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ وہ حضرت سلیمانؑ کی چاہت و مرضی سے یہ چیزیں بناتے تھے، تو اس میں محرابوں کا تذکرہ ہوا ہے)، یہ تھا راغب اصفہانی کا لفظ محراب کی وجہ تسمیہ کی بابت تفصیلی بیان !،

اس سلسلہ میں بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ آیت مبارکہ میں لفظ ”محراب“ سے مراد وہ جگہ ہے جسے اہل کتاب اپنے عبادت خانوں میں ”مذبح“ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اسے عبادتخانہ کی اگلی سمت میں بنایا جاتا ہے اور اس کا مخصوص دروازہ ہوتا ہے جس سے اس میں چند پایوں والی سیڑھی کے ذریعے داخل ہوتے ہیں اور جو شخص اس میں موجود ہوتا ہے وہ عبادت گاہ میں موجود لوگوں سے مخفی ہوتا ہے۔

یاد رہے کہ اسلام میں مساجد کے محرابوں کی تشکیل کا سلسلہ بھی کلیساؤں کے محرابوں سے ملتا ہے۔ گویا ان کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی مساجد میں اسی طرز کے محراب بنائے۔

آیت مبارکہ میں لفظ ”رزقاً“ مکرہ کی صورت میں ذکر ہوا ہے جس سے اس امر کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ وہ غیر معمولی رزق (طعام) تھا، چنانچہ اس سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ جناب زکریا جب بھی حضرت مریمؑ کے پاس جاتے تو ان کے پاس غیر موسمی میوے پاتے مثلاً سردیوں میں موسم گرما کے پھل اور گرمیوں میں موسم سرما کے پھل ہوتے، اس قول کی تائید و تصدیق اس طرح ہوتی ہے کہ اگر وہ معمول کا رزق ہوتا..... یا موسمی پھل وغیرہ ہوتے..... اور لفظ ”رِزْقًا“ کا مکرہ (الف و لام کے بغیر) ذکر کیا جانا اس بات کی دلیل ہوتا کہ جناب زکریا، حضرت مریمؑ کے محراب کو کبھی کھانے پینے کی چیزوں سے خالی نہ پاتے بلکہ ان کے پاس ہمیشہ رزق موجود پاتے تو جب انہوں نے مریمؑ سے پوچھا کہ یہ تیرے پاس کہاں سے آیا ہے ”يَسِّرِيْمُ اَنْى لَكَ هٰذَا“ اور حضرت مریمؑ نے جواب میں کہا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے کہ خدا جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق دیتا ہے ”هٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ“، تو ان کے اس جواب سے مطمئن واقع ہو جاتے کیونکہ عین ممکن تھا کہ وہ طعام بعض ان لوگوں کی طرف سے ہو جو وہاں آیا جایا کرتے تھے اور مسجد میں عبادت کی غرض آتے ہوئے مریمؑ کے لئے کچھ کھانے وغیرہ لاتے ہوں اس سے قطع نظر کہ ان کا مقصد ایسا کرنے میں کیا ہو یعنی نیک غرض کے تحت لاتے ہوں یا بری غرض سے، (تو حضرت زکریا کا ان کے جواب سے مطمئن ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ طعام معمول کا کھانا وغیرہ نہ تھا)۔

اس کے علاوہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ حضرت مریمؑ کا جواب سن کر جناب زکریا نے خدا کی بارگاہ میں جو دعا کی کہ پروردگار! مجھے اپنی عنایت سے پاکیزہ اولاد عطا فرما، تو اس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ حضرت مریمؑ کے پاس طعام کے پائے جانے کو خاص خدائی عنایت اور خادق العادت وغیر معمولی سمجھتے تھے لہذا ان کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ خدا سے دعا کریں کہ وہ انہیں اپنی خاص عنایت سے پاک اولاد عطا فرمائے، تو معلوم ہوا کہ حضرت مریمؑ کے پاس جو طعام موجود ہوتا تھا وہ آجانب پر خدا کی خاص عنایت و کرم نوازی کا مظہر تھا چنانچہ جملہ ”يَسِّرِيْمُ.....“ اس مطلب کی طرف توجہ دلاتا ہے۔

اور جملہ ”قَالَ يَسِّرِيْمُ اَنْى لَكَ هٰذَا“ میں ”وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا“ کے بعد حرف عطف (واو) ذکر

نہیں ہوا بلکہ اس کے بغیر ہی کلام کے جاری سلسلہ کو توڑ کر حضرت زکریا نے حضرت مریم سے پوچھا کہ ”یہ تیرے پاس کہاں سے آیا ہے“، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ ساری باتیں ایک ہی دفعہ تسلسل کے ساتھ کیں اور حضرت مریم نے جو جواب دیا وہ اس سے قانع و مطمئن ہو گئے اور انہیں یقین حاصل ہو گیا کہ یہ مریم پر خدائی خاص عنایت ہے، تو انہوں نے فوراً خدا کے حضور استدعا کی کہ انہیں بھی پاک اولاد و ذریت طیبہ عطا فرمائے۔

## حضرت زکریا کی دعا

○ ”هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ۖ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً.....“  
(اس وقت زکریا نے اپنے رب کے حضور دعا کی اور کہا پروردگار! مجھے اپنی طرف سے پاک اولاد عطا فرما)

کسی چیز کے اس فرد یا حصہ کو طیب کہا جاتا ہے جو اپنے مالک کے مقصود و مراد کی تکمیل میں موزوں ہو مثلاً: ”البلد الطیب“ یعنی طیب شہر اسے کہا جاتا ہے جو اپنے باسیوں کے لئے زندگی کی تمام تر آسائشوں کا حامل ہو یعنی آب و ہوا اور رزق و طعام وغیرہ کے حوالہ سے نہایت عمدہ ہو، طیب شہر کی بابت ایک قرآنی آیت ملاحظہ ہو:

سورۃ اعراف، آیت: ۵۸

○ ”وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرِجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ“

(اور پاکیزہ شہر کہ اس میں اگنے والی چیزیں اپنے پروردگار کے اذن سے اگتی ہیں)

پاکیزہ روزی و آسائش اور پاکیزہ زندگی اسے کہتے ہیں جس کے بعض اجزاء دوسرے بعض سے بھرپور موزونیت و مناسبت کے حامل ہوں یعنی ان میں ایسی ہم رنگی پائی جائے جس سے زندگی بسر کرنے والے افراد کو سکون قلب حاصل ہو، اسی حوالہ سے عمدہ اور دل فریب خوشبو (عطر) کو ”طیب“ کہا جاتا ہے، بنا براین ”ذریہ طیبہ“ (پاکیزہ اولاد) سے مراد وہ نیک و صالح اولاد ہے جو اپنی صفات و افعال میں اپنے باپ کی امیدوں پر پوری اترتی ہو، لہذا حضرت زکریا علیہ السلام کا بارگاہ خداوندی میں اس طرح دعا کرنا کہ پروردگار! مجھے اپنی طرف سے پاکیزہ اولاد عنایت فرما: (رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً) دراصل اس عظمت و شرف کے تناظر میں تھا جو انہوں نے حضرت مریم کی بابت خدا کی طرف سے حاصل ہونے والے اعزاز کا مشاہدہ کیا تھا تو اس کے بعد ان کے دل میں اس اعزاز کے حصول کی تمنا موجزن ہوئی اور وہ اپنے اوپر قابو نہ پا

سکے اور فوراً اللہ تعالیٰ کے حضور دست بہ دعا ہو گئے کہ انہیں بھی اس عظیم اعزاز و شرف سے نوازا جائے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ”ذریہ طیبہ“ سے ان کا مقصد یہ تھا کہ جو عزت و شرف اور عظمت حضرت مریمؑ کو عطا ہوئی ہے اور ان کی شخصیت جس خدائی عنایت کی سزا اور بنی ہے اسی طرح انہیں بھی عطا ہو اور ان کی اولاد اسی عزت و شرف کی حامل ہو، چنانچہ خداوند عالم نے ان کی دعا کو ان کے مطلوب کے عین مطابق شرف قبولیت عطا کیا اور جس طرح حضرت مریمؑ کو ایک عظیم و جلیل القدر فرزند سے نوازا اسی طرح حضرت زکریا علیہ السلام کو بھی حضرت یحییٰ جیسا عظیم و جلیل القدر فرزند عطا فرمایا کہ جو تمام انبیاء میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ مشابہت رکھتے تھے اور ان میں وہ تمام کمالی صفات اور عظمتیں موجود تھیں جو حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ حضرت مریمؑ کو حاصل تھیں، اور کمالی صفات و عظمتوں کی جامعیت کی صفت کا حامل ہونے کی وجہ سے خداوند عالم نے انہیں یحییٰ سے موسوم کیا اور ان کے بارے میں ارشاد فرمایا: ”مُصَدِّقًا بِكَلِمَاتِهِ مِنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحُصُورًا وَنَبِيًّا مِنَ الصَّالِحِينَ“ (وہ کلمتہ اللہ کی تصدیق کرنے والا، سید و سردار، پاکدامن اور صالحین میں سے ایک نبی ہے) تو یہ صفات ان عظیم و بلند پایہ کمالی اوصاف و امتیازات میں سے ہیں جن کا حامل ہونے کی بناء پر کوئی شخص حضرت مریمؑ اور ان کے فرزند حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے شبہت کی ممکنہ صورت پاسکتا ہے، اس سلسلہ میں ہم عنقریب مزید وضاحت پیش کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ،

## حضرت زکریا کو یحییٰ کی خوشخبری

○ ”فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ ۚ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيحْيَىٰ.....“

(تو انہیں فرشتوں نے آواز دی جبکہ وہ محراب عبادت میں نماز کے لئے کھڑے ہو چکے تھے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے.....)

اس آیت مبارکہ میں جو ضمیریں ذکر ہوئی ہیں مثلاً ”نَادَتْهُ“ (اسے آواز دی)۔ ”وَهُوَ قَائِمٌ“ (اور وہ کھڑے ہوئے تھے)، ”يُصَلِّي“ (وہ نماز پڑھ رہے تھے) ”وَيُبَشِّرُكَ“ (اور تجھے خوشخبری دیتا ہے) خواہ وہ غائب کی ضمیریں ہیں یا مخاطب کی، سب کی بازگشت حضرت زکریا کی طرف ہے۔

اور ”بَشَارَاتُ“، ”ابشار“ اور ”تبشیر“ سب کا معنی اس چیز کی خبر دینا ہے جس سے انسان خوش و مسرور ہو،

اور جملہ ”أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيحْيَىٰ“ (اللہ آپ کو یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے) اس امر کی دلیل ہے کہ یحییٰ کی

نام گزاری خداوند عالم کی طرف سے تھی، جیسا کہ ان آیات کی مانند دیگر آیات جو سورہ مریم میں ہیں ان سے بھی اسی حقیقت کا ثبوت ملتا ہے چنانچہ خداوند عالم کا ارشاد ہے:

سورہ مریم، آیت: ۷۷

○ ”يٰۤاَيُّهَا اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ اَسْمٰى يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا“

(اے زکریا، ہم تجھے ایسے فرزند کی خوشخبری دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہے اور ہم نے اس سے پہلے اس کا کوئی ہم نام قرار نہیں دیا)۔

تو یحییٰ کی نام گزاری اور اس نام گزاری کا من جانب اللہ ہونا اور یحییٰ کی ولادت سے پہلے ان کی آمد کی خوشخبری دیتے ہوئے زکریا کو اس نام سے آگاہ کیا جانا وغیرہ سب سے اس مطلب کی تائید ہوتی ہے جو ہم نے ابھی سطور بالا میں بیان کیا ہے اور وہ یہ کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے دعا کی تھی کہ انہیں ایسا فرزند عطا کرے جس کا مرتبہ و مقام حضرت مریم کے مقام و مرتبہ جیسا ہو، وہ مریم کہ جو خود اور ان کا فرزند (عیسیٰ علیہ السلام) دونوں عالمین میں خدا کی آیت و نشانی ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں ارشاد الہی ہے:

سورہ انبیاء، آیت: ۹۱

○ ”وَجَعَلْنٰهَا وَاٰبَتَهَا اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ“

(اور ہم نے اسے اور اس کے بیٹے کو عالمین کیلئے نشانی قرار دیا)

اس آیت مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کو جو کمالی صفات عطا کی گئیں اور جن امتیازی خصوصیات سے نوازا گیا وہ سب بدرجہ کمال حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں قرار دی گئیں، تو حضرت عیسیٰ کی ذات میں جو امتیازی اوصاف قرار دیئے گئے ان کی وجہ سے وہ حتی الامکان حضرت یحییٰ علیہ السلام سے کمال اور بھرپور مشابہت کے حامل ہو گئے، تاہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان تمام امتیازات و کمالی صفات میں ان پر کمال تقدم حاصل ہے کیونکہ ان کا خلعت وجود زیب تن کرنا اور امتیازی صفات کا حامل ہونا حضرت یحییٰ کی بابت حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کے شرف قبولیت پانے سے پہلے تھا، اسی سبقت و تقدم کی بناء پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اولوا العزم انبیاء میں قرار پائے اور انہیں کتاب و شریعت عطا ہوئی، لیکن ان دونوں پیغمبروں میں جہاں تک ممکن تھا کمالی صفات و امتیازی اوصاف میں شباهت پائی جاتی تھی۔

اگر آپ ہمارے بیان کردہ مطالب کی تصدیق چاہیں تو ان دونوں (حضرت عیسیٰ و یحییٰ) کے بارے میں سورہ مریم کی درج ذیل آیات میں غور و فکر اور تدبر کریں:

سورہ مریم، آیت: ۱۵:

”يُذَكِّرِيَا إِنَّا نَبَشْرُكَ بِعِلْمِ اسْمِهِ يَحْيَىٰ لَمْ نَجْعَلْ لَهُ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝ وَيَحْيَىٰ خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ ۖ وَاتَّبِعْهُ الْحَكْمَ صَبِيًّا ۝ وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَرُكُوعًا ۖ وَكَانَ تَقِيًّا ۝ وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۝ وَسَلَّمْ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۝“

(اے زکریا، ہم تجھے ایک فرزند کی خوشخبری دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہے، ہم نے اس سے پہلے کسی کو اس کا ہمنام نہیں بنایا..... اے یحییٰ، قوت سے کتاب کو لے لو، اور ہم نے اسے (یحییٰ کو) بچپن میں حکومت عطا کی، اور اپنی طرف سے محبت و پاکیزگی سے نوازا اور وہ پاک دل، پاک دامن ہے، اور اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا ہے، اور وہ ستمگار و گناہگار نہیں، اور سلام ہو اس پر جس دن وہ پیدا ہوا اور جس دن وہ مرے گا اور جس دن اسے زندہ اٹھایا جائے گا۔)

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یوں ارشاد ہوا:

سورہ مریم، آیت: ۳۳:

”فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا وَحَنَانًا..... إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ ۖ لِأَهَبَ لَكَ عُلْمًا ذِكْرًا..... قَالَ كَذَلِكَ ۖ قَالَ رَبُّنَا هُوَ عَلَيَّ هَيِّئْ ۖ وَنَجْعَلْهُ آيَةً لِلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِنَّا..... فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ ۖ قَالُوا كَيْفَ نَكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝ قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ ۖ آتَانِي الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ۖ وَجَعَلَنِي مُبْرَكًا مَّا كُنْتُ ۖ وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۖ وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ ۖ وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا ۖ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا“

”تو ہم نے اس کی طرف اپنی روح بھیجی ہے..... میں تیرے رب کا پیغام لایا ہوں تاکہ تجھے پاکیزہ فرزند عطا کروں..... اس نے کہا: تیرا پروردگار کہتا ہے یہ کام میرے لئے آسان ہے۔۔۔ کہ بغیر باپ کے بچہ پیدا کروں۔۔۔ اور ہم اسے لوگوں کے لئے آیت و نشانی قرار دیں اور اپنی طرف سے رحمت بنا دیں..... تو اس (مریم) نے اس بچے کی طرف اشارہ کیا، لوگوں نے کہا ہم کس طرح اس بچے سے گفتگو کریں جو ابھی گہوارہ میں ہے، تو وہ (بچہ) بول اٹھا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب عطا کی



ہے اور مجھے نبی بنایا ہے اور میں جہاں بھی ہوں مجھے مبارک قرار دیا ہے، اور مجھے زندگی بھر کے لئے نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا ہے اور اپنی والدہ کے ساتھ نیکی کرنے کی تاکید کی ہے اور اس نے مجھے ستمگار و شقی نہیں بنایا اور مجھے پر سلام ہو جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں گا اور جس دن میں زندہ اٹھایا جاؤں گا)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ دونوں (حضرت عیسیٰؑ و حضرت یحییٰؑ) کے بارے میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے اس میں بھرپور شہادت پائی جاتی ہے اور زیر بحث آیات مبارکہ کا سورۃ مریم کی مذکورہ بالا آیات سے موازنہ کیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ان دونوں میں تطبیقی حوالہ سے کس قدر ہم رنگی پائی جاتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ ان دونوں حضرات میں جو مشترک صفات اور ارتباطی جہات پائی جاتی ہیں وہ اس طرح ہیں:

(۱) خداوند عالم نے حضرت زکریاؑ کے فرزند کا نام ”یحییٰ“ رکھا اور حضرت مریمؑ کے فرزند کا نام ”عیسیٰ“ رکھا اور ان دونوں لفظوں کا معنی ”زندہ رہے گا“ ہے،

(۲) اسے (یحییٰ کو) اپنے نکلے یعنی عیسیٰؑ کا تصدیق کنندہ قرار دیا چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ارشاد ہوا: ”بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى“ (اپنا نکلے کہ جس کا نام مسیح عیسیٰ ہے)

(۳) اسے (یحییٰ کو) بچپن میں حکومت و اقتدار عطا کیا اور کتاب کی تعلیم دی جیسا کہ عیسیٰؑ کو بھی اسی طرح نوازا،

(۴) اسے (یحییٰ کو) اپنی طرف سے محبت و پاکیزگی سے نوازا اور اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا اور ستمگار نہیں بنایا جیسا کہ یہ سب کچھ عیسیٰؑ کو بھی عطا کیا،

(۵) اس پر (یحییٰ پر) تین مقامات (یوم ولادت، یوم وفات، یوم بعثت) میں سلام کہا جیسا کہ عیسیٰؑ علیہ السلام پر بھی انہی تین مقامات میں سلام کہا،

(۶) اسے (یحییٰ کو) سید و سردار قرار دیا جیسا کہ عیسیٰؑ کو ”وجیہ“ و مقبول بارگاہ قرار دیا،

(۷) اسے (یحییٰ کو) پاک دل و پاک دامن اور صالحین میں سے نبی قرار دیا جیسا کہ عیسیٰؑ علیہ السلام کو قرار دیا،

خداوند عالم نے یہ تمام خصوصیات حضرت یحییٰؑ کو عطا کیں تاکہ حضرت زکریاؑ علیہ السلام کی دعا اور اس تمنا کو پورا کرے جو انہوں نے ذریعہ طیبہ اور صالح و پسندیدہ فرزند کے لئے کی اور انہوں نے یہ آرزو اس وقت کی جب ان کے دل میں حضرت مریمؑ کو خدائی عطیہ و عظمت و اعزاز سے نوازا جانا دیکھا کہ ان کے دل میں اس اعزاز کے حصول کا شوق موجزن ہوا۔

اور جملہ ”مُصَدِّقًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّكَ مِنَ اللَّهِ“ میں اس امر کا ثبوت پایا جاتا ہے کہ حضرت یحییٰؑ کو حضرت عیسیٰؑ کی شریعت کا داعی قرار دیا گیا کیونکہ آیت میں ”بِكَلِمَةٍ مِّنْ رَبِّكَ“ سے مراد حضرت عیسیٰؑ مسیح ہیں جیسا کہ انہیں زیر بحث آیات مبارکہ

کے ذیل میں حضرت مریمؑ کو جو بشارت و خوشخبری دی گئی اس میں حضرت عیسیٰؑ کو ”کلمتہ اللہ“ سے تعبیر کیا گیا، لفظ ”سید“ اسے کہتے ہیں جو عوام الناس کے امور زندگی کا ذمہ دار ہو اور ان کے امر معاش وغیرہ کا اہتمام و انتظام کرنے والا ہو یا کم از کم ان کے ہاں پسندیدہ خصوصیات و فضیلتوں میں سے کسی ایک میں ان کی سرپرستی کرنے والا ہو، یہ ہے اس لفظ کا اصل معنی! مگر رفتہ رفتہ اسے کسی قوم کی بزرگ شخصیت کے بارے میں استعمال کیا جانے لگا اور ہر قوم کے بلند مرتبہ شخص کو ”سید“ سردار کہا جانے لگا کیونکہ مذکورہ بالا امور کی سرپرستی، اقتدار اور جاہ و جلال یا مال و دولت یا کسی فضیلتی صفت میں بزرگی کا موجب بنتی ہے..... جو شخص ان امور میں سرپرستی کرتا ہے وہ خواہ و ناخواہ قوم کا سردار، بزرگ اور قابل احترام فرد قرار پاتا ہے.....

”حصور“ (پاکدامن) اسے کہتے ہیں جو نفسانی خواہشوں کا اسیر ہو کر عورتوں سے آمیزش کا دلدادہ نہ ہو، آیت مبارکہ میں سیاق کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام زہد میں اس بلند ترین مقام پر فائز تھے کہ اس طرح کی نفسانی خواہشوں سے دوری اختیار کرتے تھے۔

## حضرت زکریا کا اظہار حیرت

○ ” قَالَ رَبِّ اَنْىٰ يَكُوْنُ لىٰ غُلْمٌ وَّ قَدْ بَلَغَتْنى الْكِبَرُ وَاَمْرًا لىٰ عَاقِرٌ.....“

(اس نے کہا: پروردگار! میرے ہاں لڑکا کیونکر پیدا ہوگا جبکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری زوجہ بانجھ ہے.....)

حضرت زکریا کے یہ الفاظ حیرت و تعجب پر مبنی استفہام کی صورت میں ہیں جو کہ حقیقت حال سے آگاہ ہونے کی غرض کی عکاسی کرتے ہیں، ایسا نہیں کہ انہوں نے اپنے صاحب اولاد ہونے کو بعید سمجھتے ہوئے اس طرح پوچھا اور نہ اس خیال سے ایسا جملہ کہا کہ جس سے ان کی نظر میں ان کے ہاں بچہ کا پیدا ہونا کوئی انہونی چیز ہو، کیونکہ جب خداوند عالم نے انہیں اس کی بشارت و خوشخبری دے دی اور یہ بھی بتا دیا کہ عنقریب خدا انہیں ان کی دعا و طلب کے مطابق فرزند عطا فرمائے گا تو اس کے باوجود حضرت زکریا جیسی شخصیت اس سلسلہ میں ناامیدی و مایوسی کا شکار کیونکر ہو سکتی ہے جبکہ انہوں نے خود ہی اپنی دعا میں انہی دو امور کو جن کا ذکر انہوں نے اپنے استفہامی الفاظ (وَقَدْ بَلَغَتْنى الْكِبَرُ وَاَمْرًا لىٰ عَاقِرٌ) میں کیا اور ان پر تعجب و حیرت کا اظہار کیا تو جب خدا کی طرف سے بشارت ملی تو وہ مایوسی و ناامیدی سے دوچار کیونکر ہو سکتے تھے، چنانچہ ان کے الفاظ اس

طرح تھے:

سورہ مریم، آیت: ۵

”رَبِّ إِنِّي وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّي وَاسْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا وَلَمْ أَكُنْ بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۝ وَإِنِّي خِفْتُ الْمَوَاتِيَ مِنْ وَرَأْيِكَ وَأَكَانْتُمُ الْمُرَاتِي ۚ عَاقِرًا فَهَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا“

(پروردگارا! میری ہڈیاں کمزور ہو چکی ہیں اور بڑھاپے کی وجہ سے میرے سر کے بال سفید ہو چکے ہیں اور پروردگارا! میں تیرے حضور کچھ مانگ کر کبھی محروم نہیں ہوا، البتہ میں اپنے بعد اپنے عزیزوں ورشتہ داروں سے خائف ہوں، اور میری بیوی بانجھ ہو چکی ہے، تو تو مجھے اپنی عنایت سے جائزین و وارث عطا فرما)

لیکن حضرت زکریا نے جس خاص وقت میں وہ الفاظ کہے اس سے ایک اور معنی کا پتہ چلتا ہے اور وہ یہ کہ گویا جب انہوں نے حضرت مریمؑ پر خاص خدا کی عنایت کا مشاہدہ کیا اور اپنے بے اولاد ہونے کو یاد کر کے اپنے اور اپنی نسل کے جاری سلسلہ کے منقطع ہو جانے کا احساس کیا تو انہیں اس کے سوا کچھ بھائی نہ دیا کہ وہ اپنے پروردگار کے حضور استدعا کریں، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اپنی دعائیں انہی دو باتوں کو ذکر کیا جو ان کے متاثر و مغموم ہونے کا زیادہ سبب بنے ہوئے تھے یعنی ان کا بڑھاپا اور اپنی بیوی کا بانجھ پن اور جب ان کی دعا کو شرف قبولیت عطا کیا گیا اور انہیں فرزند کی خوشخبری دی گئی تو اس وقت ان کی حالت ایسی تھی جیسے کوئی بیمار، صحت مند ہو جاتا ہے اور اسے آفاقہ ہو جاتا ہے، وہ بالکل تندرست و توانا سے ہو گئے اور اپنے صاحب اولاد ہونے پر اس لئے تعجب کرنے لگے کہ وہ تو بوڑھے ہیں اور ان کی زوجہ بھی بانجھ ہے تو فرزند کی خوشخبری سے ان کے چہرے پر پڑا ہوا ناامیدی و حزن کا غبار چھٹ گیا اور اس کی جگہ سرور آمیز تعجب نے لے لی، کہ وہ حیرت زدہ بھی تھے اور خوش بھی، جبکہ اس سے پہلے مایوس بھی تھے اور محزون و افسردہ بھی!

اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ انہوں نے صاحب اولاد ہونے کی خوشخبری سننے اور اپنی حاجت کے پورا ہو جانے کے بعد اس سلسلہ میں پائی جانے والی جسمانی رکاوٹوں..... بوڑھاپا اور بانجھ پن..... کا حوالہ کیوں دیا اور یہ کہ ان رکاوٹوں کے دور ہو جانے کی کیفیت سے آگاہ ہونے کی خواہش کا اظہار کیوں کیا؟ تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے اوپر خداوند عالم کی خاص عنایت اور فرزند کی نعمت سے بہرہ ور کئے جانے کے اسرار الہی کو سمجھنا چاہتے تھے تاکہ یکے بعد دیگرے نعمتوں کے فیضان سے لطف اندوز ہو سکیں، اور یہ اس طرح سے ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ذریت کی خوشخبری دی گئی تھی اور انہوں نے بھی سرور آمیز حیرت کا اظہار کیا تھا کہ جس کا تذکرہ قرآن مجید میں اس طرح ہوا:

سورہ حجر، آیت: ۵۶

”وَتَبَيَّنَهُمْ عَنْ صَبِيْفٍ اِبْرٰهِيْمَ ۝ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا اَسْلَبَا قَالِ اِنَّ اَمْنَكُمْ وَاَجَلُوْنَ ۝“

قَالُوا لَا تَوْجَلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ ﴿۳۵﴾ قَالَ أَبَشْرًا نَمُوْنِي عَلَىٰ أَنْ مَسَّنِيَ الْكِبَرُ فِيمِ  
 نُبُشْرًا وَن ﴿۳۶﴾ قَالُوا أَبَشْرًا لَّنِكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُن مِّنَ الْفٰنِطِينَ ﴿۳۷﴾ قَالَ وَمَنْ يَّقْنُظُ مِنْ شَرِّ حَمٰةٍ  
 رَبِّهٖٓ إِلَّا الضَّالُّونَ ﴿۳۸﴾“

(اور انہیں ابراہیم کے مہمانوں کا بتائیے جب وہ ان کے پاس آئے تو انہیں سلام کیا، ابراہیم نے کہا: ہمیں تم لوگوں سے ڈر لگ رہا ہے، انہوں نے کہا: آپ ڈریں نہیں، ہم آپ کو عظیم و دانافرزندگی خوشخبری دے رہے ہیں، ابراہیم نے کہا، کیا تم مجھے اس طرح کی خوشخبری دیتے ہو جبکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں تو تم مجھے کس چیز کی خوشخبری دو گے، انہوں نے کہا: ہم نے صحیح خوشخبری دی ہے آپ ناامید ہونے والوں میں سے نہ ہوں، ابراہیم نے کہا اپنے رب کی رحمت سے گمراہ لوگوں کے علاوہ کوئی بھی ناامید نہیں ہوتا)

تو معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں کی طرف سے انہیں ناامید ہونے سے منع کرنے کے جواب میں اس امر کا تذکرہ کیا کہ ان کا استفہام اور تعجب کا اظہار کرنا ناامیدی کی بناء پر نہیں تھا کیونکہ وہ گمراہ نہیں ہیں جبکہ ناامیدی گمراہی کے سوا کچھ نہیں بلکہ اس طرح ہے جیسے کوئی آقا و سردار جب اپنے غلام کے پاس آ کر اس سے قرب و انس اور اپنی خاص عنایت کا اظہار کرتا ہے تو اس غلام کی خوشی و مسرت کی کوئی انتہاء نہیں ہوتی اور وہ پھولے نہیں سماتا اور وہ اپنے اوپر اپنے آقا و سردار کی خاص کرم نوازی کو زبان پر لا کر اس سے لطف اندوز ہو چنانچہ وہ اس مقصد کے لئے ہر ممکن طریقہ اپناتا ہے اور ہر لحاظ سے اپنے دل کی سرور آمیز حیرت کو آشکار کرتا ہے۔

اور حضرت زکریا علیہ السلام کا یہ کہنا ”وَقَدْ بَلَغْتَ الْكِبَرِ“ کہ بڑھاپا مجھے لے گیا ہے، دراصل ادب و آداب اظہار کی عکاسی کرتا ہے کیونکہ یہ الفاظ اس مطلب کی طرف لطیف اشارہ کے طور پر ہیں کہ وہ بڑھاپا و سن رسیدہ ہونے کی وجہ سے اپنے اندر جنسی خواہش نہیں پاتے تھے، اور ان کی زوجہ بھی بڑھاپا اور بانجھ پن دونوں کا شکار ہو چکی تھیں مگر انہوں نے اس کے بارے میں صرف ان کے بانجھ پن کو ذکر کیا جبکہ ان کا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ وہ بھی میری طرح بوڑھی ہو چکی ہے اور بڑھاپے کے ساتھ ساتھ وہ بانجھ بھی ہے۔

خدا جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے

○ ” قَالَ كَذٰلِكَ اَللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ “

(اس نے کہا اسی طرح خدا جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے)

اس جملے میں فعل ”قال“ (اس نے کہا) کا فاعل یعنی کہنے والا اگرچہ خداوند عالم ہے خواہ بلا واسطہ ہو یا بالواسطہ اور ان فرشتوں کے ذریعے ہو جو حضرت زکریا سے گفتگو کر رہے تھے، تو بہر حال یہ قول و بیان خدا ہی کا ہے البتہ بظاہر فرشتہ کی وساطت سے خدا کی طرف منسوب ہے، تو کہنے والا فرشتہ ہے لیکن خدا کی طرف اس لئے منسوب ہے کہ اس کا حکم خدا نے دیا،..... فرشتے خدا کے حکم کے بغیر کچھ نہیں کہتے اور نہ ہی کچھ کرتے ہیں..... چنانچہ اس کا ثبوت درج ذیل آیت میں موجود ہے:

سورہ مریم، آیت: ۹

○ ” قَالَ كَذَلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّئٌ وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِن قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا ۙ“

(اس نے کہا ایسا ہی ہے، تیرے پروردگار نے کہا کہ یہ کام میرے لئے آسان ہے اور کیوں آسان نہ ہو جبکہ میں نے اس سے پہلے تجھے پیدا کیا اور تو کچھ نہ تھی)

اس میں فرشتے نے خدا کا بیان ذکر کیا، اس سے تین امور ثابت ہوتے ہیں :

(۱) حضرت زکریا نے یہ بات بھی اسی طرح اور وہیں سے سنی جیسے اس سے پہلے سن رہے تھے۔

(۲) لفظ ”كَذَلِكَ“ ادبی لحاظ سے ایک ”خبر“ ہے جس کا ”مبتدا“ حذف کیا گیا ہے، گویا جملہ اس طرح ہے:

”الامر كذلك“ (بات ایسی ہی ہے)، یعنی آپ کو جو خوشخبری دی گئی ہے وہ ہر صورت میں پوری ہونے والی ہے، اس میں اس مطلب کا اشارہ پایا جاتا ہے کہ انہیں جو خوشخبری دی گئی کہ انہیں فرزند عطا کیا گیا ہے وہ تقدیر کا حتمی فیصلہ ہے کہ جس کے وقوع پذیر ہونے میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ یہ اسی جواب کی طرح ہے جو روح الامین نے حضرت مریمؑ کو دیا کہ جس کا تذکرہ خداوند عالم نے ان لفظوں میں فرمایا: ”قَالَ كَذَلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّئٌ..... وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا“..... سورہ مریم، آیت ۲۱..... (اس نے کہا ایسا ہی ہے، تیرا رب کہتا ہے کہ وہ میرے لئے آسان ہے..... اور وہ خدا کا حتمی فیصلہ ہے)۔

(۳) جملہ ”اللَّهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ“ ایک مستقل جملہ ہے جو ”كَذَلِكَ“ کے مضمون و مفہوم کی علت و سبب کو بیان

کرتا ہے، یعنی یہ جو ہم نے کہا ہے کہ ”ایسا ہی ہوتا ہے“ (كَذَلِكَ) تو اس لئے ہے کہ خدا جو کچھ چاہتا ہے انجام دیتا ہے۔

## تین دن خاموش رہنے کی ہدایت

○ ” قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً ۚ قَالَ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا سَمْرًا.....“  
 (اس نے کہا: پروردگارا! میرے لئے کوئی نشانی قرار دے، خدا نے کہا تیری نشانی یہ ہے کہ تو تین دن تک لوگوں سے بات نہ کر مگر صرف اشارہ سے.....)

تفسیر مجمع البیان میں مذکور ہے کہ ”رمز“ کا معنی لبوں سے اشارہ کرنا ہے اور کبھی ابرو، آنکھ اور ہاتھ سے اشارہ کرنے کو بھی ”رمز“ کہا جاتا ہے البتہ زیادہ تر پہلے معنی یعنی لبوں سے اشارہ کرنے کو رمز کہتے ہیں۔  
 لفظ ”عشی“ سے دن کا آخری پہر مراد ہے، گویا اسے ”عشوة“ سے بنایا گیا ہے جس کا معنی وہ اندھیرا ہے جو آنکھ پر چھا جاتا ہے اور کسی چیز کے دکھائی دینے میں رکاوٹ بنتا ہے، اسی مناسبت سے اس وقت کو ”عشی“ کہا گیا جب وہ تاریکی کی طرف بڑھ رہا ہو۔

لفظ ”ابکار“ سے دن کا پہلا پہر یعنی اس کا ابتدائی حصہ مراد ہے، اس کا اصل معنی استعجال یعنی جلد بازی ہے۔  
 اس آیت مبارکہ میں حضرت یحییٰ کی ولادت کے حوالہ سے حضرت زکریا کے صاحب اولاد ہونے کی نشانی ان کا خاموش رہنا بتایا گیا، چنانچہ یہی صورت حال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت میں دکھائی دیتی ہے کہ ان کے پیدا ہونے کے بعد حضرت مریمؑ سے بھی یہی کہا گیا کہ جب وہ کسی شخص کو دیکھیں تو اس سے کہیں کہ میں نے خدا کے لئے منت مانی ہوئی ہے کہ کسی سے بھی بات نہ کروں گی، آیت ملاحظہ ہو،

سورۃ مریم، آیت: ۲۶

○ ” فَأَمَّا تَرِيحٌ مِنَ الْبَشَرِ أَحَدًا فَقَوْلِي إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ مَرَأْسِيًّا“  
 بہر حال زیر نظر آیت مبارکہ میں مذکور ہے کہ حضرت زکریا نے خدا کی بارگاہ میں درخواست کی کہ ان کے لئے کوئی نشانی قرار دی جائے (قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً) آیت کا معنی کسی چیز کے وجود پر دلالت کرنے والی نشانی ہے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ آیا ان کا نشانی طلب کرنا اس لئے تھا کہ انہیں جو آواز سنائی دی کہ اے زکریا ہم تجھے فرزند کی خوشخبری دیتے ہیں (یا زکریا اننا نبشرك بك بغلام.....) وہ خدا کی طرف ہی سے تھی نہ کہ شیطان کی وسوسہ انگیزی تھی؟ یا اس لئے تھی کہ انہیں اپنی زوجہ کے حاملہ ہونے کا وقت معلوم ہوتا کہ اس کی بنیاد پر اس کے حاملہ ہونے کی تصدیق ہو سکے، ان دونوں پہلوؤں کے

بارے میں مفسرین کرام کے اقوال مختلف ہیں، البتہ آیات کے سیاق اور واقعہ کی کیفیت سے دوسرے پہلو کا قرین صحت ہونا بعید نظر نہیں آتا لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ پہلے پہلو یعنی یہ کہ حضرت زکریا کا اس آواز کے رحمانی ہونے اور شیطانی نہ ہونے کے بارے میں تسلی و اطمینان کا خواہاں ہونا، کو اختیار نہ کرنے میں مفسرین کا احتیاطی رویہ اپنانا اس لئے ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا عصمت کے مقام پر فائز ہونا اس کا متقاضی ہے کہ وہ فرشتہ کے بیان اور شیطان کے وسوسہ کے درمیان تمیز کر لیتے ہوں یعنی انہیں اس سلسلہ میں کسی طرح کا شبہ ہرگز لاحق نہ ہو بلکہ یقینی طور پر وہ جاننے اور پہچانتے ہوں کہ یہ آواز کس کی ہے، ایسا نہیں کہ شیطان انہیں ورنہ اس کے ساتھ ایسی چال چلے کہ اصل حقیقت کا فہم و ادراک ان کے لئے دشوار ہو جائے، یہ مطلب تو حق اور قطعی طور پر صحیح ہے لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ ان کی معرفت و آگاہی کا یہ مقام و مرتبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آگاہی دلانے کی بناء پر ہے نہ کہ ان کی اپنی طرف سے اور ان کے ذاتی استقلال کی بنیاد پر ہے، تو اس صورت میں یہ کیوں کر جائز و درست نہ ہو کہ حضرت زکریا اپنے پروردگار سے اس آگاہی کے حصول کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے ان کے لئے کوئی نشانی قرار دینے کا کہیں؟ اس میں کیا حرج ہے؟ ہاں اگر ان کی دعا کو شرف قبولیت حاصل نہ ہوتا اور خداوند عالم ان کے لئے کوئی علامت و نشانی قرار نہ دیتا تو شاید اعتراض اپنی جگہ باقی رہ جاتا۔

اس کے علاوہ آیت مبارکہ کے متن سے..... یعنی تین دن تک خاموشی اختیار کرتا..... بھی اسی بات کی تائید و تصدیق بلکہ ثبوت ملتا ہے کیونکہ یہ بات مسلم ہے کہ اگرچہ شیطان کا انبیاء کے اجسام پر اثر انداز ہونا یا انبیاء کے اہداف و مقاصد یعنی دین کی ترویج کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنا تاکہ لوگ ان سے دور رہیں یا ان کی تبلیغ کے نتیجہ میں دشمنان دین کمزور پڑیں، یہ سب کچھ ممکن ہے جیسا کہ اس کا ثبوت درج ذیل آیت میں پایا جاتا ہے:

سورہ ص، آیت: ۴۱

○ "وَإِذْ كُنَّا عَبْدًا لَّيْلًا نَادَىٰ رَبَّهُ أَلَمْ نَسْتَعِذَّ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الْبُصْبِ وَعَدَّابٍ"

(اور یاد کرو ہمارے بندے ایوب کو، جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے شیطان نے چھو لیا ہے سخت تکلیف

اور اذیت کے ساتھ)

اس آیت میں شیطان کا حضرت ایوب کو جسمانی طور پر آزار دینا واضح طور پر مذکور ہے۔

سورہ حج، آیت: ۵۲

○ "وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى الْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنسُجُ

اللَّهُ مَا يَلْقَى الشَّيْطَانُ ثُمَّ يَحْكُمُ اللَّهُ إِلَيْهِ"

(اور ہم نے آپ سے پہلے جو رسول اور نبی بھیجا اس نے جب بھی کچھ چاہا تو شیطان نے اس کی چاہت

میں خلل اندازی کی، تو اللہ نے شیطان کی خلل اندازی اور القاءات کو محو کر دیا، پھر خدا اپنی آیات کو مضبوط کرتا رہا)

اس آیت میں انبیاء کی طرف سے ترویج دین کی بابت اٹھائے گئے اقدامات میں شیطان کی خلل اندازی کا تذکرہ ہوا ہے۔

سورۃ کہف، آیت: ۶۳

○ ”فَإِنِّي نَسِيتُ الْحَوْتَ وَمَا أَكْسَبْتَنِي إِلَّا الشَّيْطَانُ“

(میں مچھلی کو بھول گیا اور اسے نہیں بھلوا یا مگر شیطان نے)

اس آیت میں شیطان کا انبیاء کے حافظہ پر اثر انداز ہونا مذکور ہے۔

مذکورہ بالا موارد میں شیطان کی انبیاء علیہم السلام کے اجسام مبارکہ تک رسائی اور ان پر اثر انداز ہونا ذکر کیا گیا ہے کہ جس کا نتیجہ انہیں جسمانی اذیت و تکلیف دینے کے سوا کچھ نہیں لیکن جہاں تک ان ہستیوں کے نفوس قدسیہ تک رسائی کا تعلق ہے تو وہ ہرگز ممکن نہیں کیونکہ وہ معصوم ہیں اور اس طرح کے شیطانی حملوں و تسلط سے محفوظ قرار دیئے گئے ہیں کہ اس سلسلہ میں انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے اثبات کی بحث میں تفصیلی مطالب ذکر ہو چکے ہیں۔

اور جہاں تک حضرت زکریا کے صاحب اولاد ہونے کی بابت نشانی قرار دیئے جانے کا تعلق ہے کہ جس کے متعلق یوں ارشاد حق تعالیٰ ہے :

”إِنَّكَ أَلَّا تَكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمْزًا ۗ وَادْكُرْ مَرَبَّتَكَ كَثِيرًا ۗ وَسَبِّحْ بِالنَّعِشِيِّ وَالْإِنْبِكَارِ“ (کہ تیری نشانی یہ ہے کہ لوگوں سے تین دن تک کلام نہ کر سوائے اشارہ کے، اور اپنے رب کو کثرت سے یاد کر اور صبح و شام تسبیح کرتا رہے) تو وہ اس بناء پر تھا کہ آنجناب ان تین دنوں میں کسی سے بات نہ کر ہی نہیں سکتے تھے اور ان کی زبان پر ذکر و تسبیح الہی کے سوا کچھ آ ہی نہ سکتا تھا، تو یہ نشانی نبی اللہ کی جان اور زبان پر واقع ہونے والا امر ہے اور ان کی ذات پر خاص تصرف اور اثر انداز ہونے کی ایک صورت ہے کہ اس طرح کا تصرف و اثر اندازی شیطان کے بس میں نہیں اور وہ انبیاء کے نفوس قدسیہ تک اس طرح کی رسائی پر قادر ہی نہیں کیونکہ وہ ہستیاں معصوم ہیں..... اور انہیں خدائی حفاظت حاصل ہے..... لہذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت زکریا نے جو آواز سنی وہ شیطانی نہیں بلکہ خدائی و رحمانی تھی، اس بناء پر یہ آیت مبارکہ (وَقَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً..... السخ) جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں..... مذکورہ بالا دو پہلوؤں میں سے پہلے پہلو سے زیادہ موزونیت کی حامل ہے نہ کہ دوسرے پہلو سے!



## طلب اولاد کے حوالہ سے ایک سوال اور اس کا جواب

اس مقام پر ممکن ہے یہ سوال کیا جائے کہ اگر حضرت زکریا کا اپنے صاحب اولاد ہونے کے لئے کوئی نشانی طلب کرنا اس لئے تھا کہ مطمئن ہو جائیں کہ جو آواز انہوں نے سنی وہ شیطانی نہیں بلکہ خدائی تھی تو پھر انہوں نے فرزند کی خوشخبری سننے کے بعد تعجب کے ساتھ کیوں کہا: ”رَبِّ اَنْى يَكُوْنُ لى عَلْمٌ وَّ قَدْ بَلَغْنِى الْكِبَرَ وَاَمْرًا نى عَاقِبَةً“ (پروردگارا! میرے ہاں بچہ کیونکر پیدا ہوگا جبکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے) کہ جس کے جواب میں خدا نے کہا: ”كُنْ لَكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ“ (اسی طرح خدا جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے)، کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے پروردگار سے بات کی اور انہیں معلوم تھا کہ وہ خدا سے ہم کلام ہیں اور پھر انہوں نے جو کچھ مانگا اور اس کی بابت انہیں جو جواب ملا اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ خدا سے گفتگو کر رہے تھے، تو اگر انہیں شک تھا کہ جو آواز انہوں نے سنی ہے وہ کس کی ہے تو اس طرح گفتگو کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ اور اگر انہیں شک نہ تھا تو نشانی طلب کرنے کا کیا مطلب؟

اس کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ یہ جانتے تھے کہ کس سے مخاطب ہیں لیکن جاننے کے بھی مختلف درجات ہیں اور یہ ممکن ہے کہ انہیں اس آواز کے بارے میں بھرپور اعتماد و اطمینان ہو کہ وہ خدائی آواز ہے مگر اس کے باوجود وہ اپنے پروردگار سے بچے کی ولادت کی کیفیت کے بارے میں دریافت کرنا چاہتے ہوں کہ جس کی بابت انہیں تعجب لاحق ہوا کہ ان پر بڑھا پا طاری ہے اور ان کی زوجہ بانجھ ہو چکی ہے، اور انہیں اس اظہار تعجب کے جواب میں دوسری خدائی آواز کے ذریعے اطمینان دلایا گیا اور پھر وہ خدا سے درخواست کرنے لگے کہ ان کے لئے نشانی قرار دے جس سے ان کے اطمینان میں اضافہ ہو کہ جو آواز انہوں نے سنی وہ رحمانی تھی، اس مطلب کی تائید اس جملہ سے ہوتی ہے جس میں ارشاد ہوا: ”فَسَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ“ (پھر اسے فرشتوں نے آواز دی) کیونکہ لفظ ”فساداً“ عموماً دور سے سنی جانے والی آواز کو کہتے ہیں، اسی وجہ سے اونچی آواز کو بھی ”فساداً“ کہا جاتا ہے (اونچا بولنا، پکارنا)، اور ہم اپنے روزمرہ کے استعمالات میں اونچی آواز سے بولنے والے کا مکانی طور پر دور ہونا سمجھتے ہیں نہ یہ کہ اس کا لغوی معنی یہی ہو، بلکہ اس کا اصل معنی آواز دینا ہے خواہ نزدیک سے ہو یا دور سے، اونچا ہو یا آہستہ ہو، چنانچہ اس کی ثبوتی گواہی درج ذیل آیت سے ملتی ہے جس میں حضرت زکریا کے بارے میں ارشاد الہی ہے:

سورۃ مریم، آیت: ۳

” اِذْ نَادَى رَبَّهُ نِدًا خَفِيًّا“

(جب اس نے اپنے رب کو آواز دی، آہستہ آواز!)

اس آیت مبارکہ میں حضرت زکریا علیہ السلام کا اپنے پروردگار سے بات کرنے میں خدا کی بزرگی و رفعت شان اور عظمت مقام کے عملی احترام کا مظاہرہ خضوع و انکساری کے انداز میں ہونا مذکور ہے اور اس میں ”ندا“ کو ”خَفِيًّا“ کی صفت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے لہذا ”فنادته الملائكة“ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت زکریا نے جب وہ آواز سنی تو فرشتہ کو نہ دیکھ رہے تھے بلکہ ایک فیبی آواز سنی کہ کوئی ان سے بات کر رہا ہے۔

### تین دن خاموش رہنے کا راز؟

زیر بحث موضوع کی بابت بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ حضرت زکریا کو حضرت یحییٰ کی ولادت کی نشانی کے طور پر تین دن تک کسی سے اشارہ کے علاوہ بات کرنے سے روکا جانا اس لئے تھا کہ وہ سب سے الگ تھلگ ہو کر صرف خداوند عالم کے ذکر و تسبیح میں مصروف ہوں اور ایسا نہیں کہ ان کی زبان کو بند کر دیا گیا کہ وہ بول ہی نہ سکیں، (اس مفسر نے اپنے قول و نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: ) حق بات یہ ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کا نشانی طلب کرنا اس بنیاد پر تھا کہ طبع بشری اس امر کی متقاضی تھی کہ اپنے لئے اس خدائی عطیہ کے وقت سے آگاہ ہوں تاکہ وہ اطمینان قلب کے ساتھ اس کے بارے میں اپنے اہل خانہ کو خوشخبری دے سکیں لہذا انہوں نے اس کی کیفیت کے بارے میں پوچھا اور جب انہیں اس کا جواب دیا گیا تو انہوں نے اپنے پروردگار سے درخواست کی کہ ان کے لئے ایسی مخصوص عبادت قرار دیں جس سے وہ اس نعمت کا شکر ادا کر سکیں اور اس عبادت کا پورا ہونا مقصود کے حصول کی علامت و نشانی بن جائے، تو خداوند عالم نے انہیں حکم دیا کہ وہ تین دن تک لوگوں سے بات نہ کریں بلکہ اس مدت میں صبح و شام، ذکر و تسبیح خدا میں مصروف رہیں اور اگر لوگوں سے بات کرنا ناگزیر ہو تو اشاروں سے اپنا مقصود ظاہر کریں، چنانچہ انہوں نے اپنے اہل خانہ کو خدائی عطیہ کی خوشخبری تین دن گزرنے کے بعد دی۔

یہ تھا اس مفسر کا بیان! لیکن قارئین کرام! آپ بخوبی آگاہ ہیں کہ ان کے بیان میں مذکور مطالب کا زیر نظر آیت مبارکہ میں کہیں کوئی اشارہ تک نہیں ملتا، یعنی ان کا ادائے شکر کے لئے عبادت کی درخواست کرنا، تین دن کے بعد اس خدائی عنایت سے بہرہ ور ہونا، تین دنوں کے پورا ہونے کا نشانی و علامت ہونا، جملہ ”ان لا تكلم الناس.....“ (لوگوں سے بات نہ کرو.....) کا خدا کی طرف سے تشریحی نبی کی صورت میں ہونا اور ان کے اپنے اہل خانہ کو خوشخبری دینے کا ارادہ کرنا، ان میں سے کسی کا بھی کوئی تذکرہ و اشارہ آیت مبارکہ میں نہیں پایا جاتا۔

## غیبی الہامات اور شیطانی خیالات کی اصل حقیقت اور ان دونوں کی بابت اظہارات

پہلے بھی متعدد بار یہ مطلب بیان ہو چکا ہے کہ الفاظ جن معانی کے لئے بنائے جاتے ہیں ان میں وہ اغراض ملحوظ ہوتی ہیں جن سے اصل مقصود حاصل ہو سکے، چنانچہ لفظ ”قول“ اور ”کلام“ کو اس لئے آواز کہا جاتا ہے کہ وہ اس مقصد کو سننے والے تک پہنچا دیتا ہے جس کا متکلم نے ارادہ کیا ہو، اس بناء پر جو چیز بھی اس طرح کی خصوصیت و تاثیر کی حامل ہو اسے ”کلام“ اور ”قول“ کہا جائے گا خواہ وہ ایک آواز ہو یا کئی آوازیں ملی ہوئی ہوں اور یا آواز نہ ہو بلکہ اشارہ وغیرہ ہو، لہذا عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے کہ لوگ ہر اس آواز کو جس سے مقصود پوری طرح حاصل ہوتا ہو ”کلام“ کہنے میں دیر نہیں کرتے خواہ وہ آواز کسی کے بھی منہ سے نکلی ہو، اسی طرح اشارہ کو کلام سے موسوم کرتے ہیں خواہ وہ آواز پر مشتمل نہ بھی ہو۔

اسی معیار کے مطابق قرآن مجید بھی ان معانی کو جو شیطان، لوگوں کے دلوں میں ڈالتا ہے اس کا کلام و قول کہتے ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں خداوند عالم نے شیطان کا اپنا بیان اور اس کے اعمال کی بابت ارشاد فرمایا:

سورۃ نساء، آیت: ۱۱۹

○ ”وَلَا مَرِيئَتُمْ فَلَيْبَسُكُنَّ إِذْ أُنزِلَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ“

(اور میں ضرور انہیں حکم کروں گا تو وہ ضرور جانوروں کے کان چیر دیں گے)

اس میں ”امر“ یعنی حکم کا لفظ ذکر ہوا ہے۔

سورۃ حشر، آیت: ۱۶

○ ”كَمْثَلِ الشَّيْطَانِ إِذْ قَالَ لِلْإِنْسَانِ اكْفُرْ“

(شیطان کی مانند کہ جب اس نے انسان سے کہا تو کفر اختیار کر)

اس میں ”قول“ یعنی کہنا، بات کرنا کہا گیا ہے۔

سورۃ الناس، آیت: ۵

○ ”يُوسُوسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ“

(وہ لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے)

سورۃ النعام، آیت: ۱۱۲

○ ”يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ“  
(وہ ایک دوسرے کو دل پسند باتیں بتاتے رہتے ہیں)

اس میں لفظ ”یوحی“ (بات بتانا، بات پہنچانا)..... القاء..... مذکور ہے۔

سورۃ ابراہیم، آیت: ۲۲

○ ”إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعَدَ الْحَقِّ وَعَدْتُكُمْ“

(بے شک اللہ نے تمہارے ساتھ سچا وعدہ کیا ہے، اور میں نے بھی تمہارے ساتھ وعدہ کیا ہے)

اس میں شیطان کے اظہارات ذکر کئے گئے ہیں۔

سورۃ بقرہ، آیت: ۲۶۸

○ ”الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ وَاللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَقَصْلًا وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ“

(شیطان تم سے فقر کے وعدے کرتا ہے اور تمہیں برائی کا حکم دیتا ہے جبکہ اللہ تم سے اپنی مغفرت اور فضل و کرم کا وعدہ کرتا ہے، اور اللہ وسعت دینے والا، دانائے)

اس میں شیطان کے القاءات کو وعدہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اور یہ بات واضح ہے کہ وہ سب کچھ جو شیطان کی طرف منسوب ہوا ہے وہ دلوں پر وارد ہونے والے خیالات کے سوا کچھ نہیں کہ جنہیں ”امر“، ”قول“، ”وسوسہ“، ”وحی“ اور ”وعدہ“ سے موسوم کیا گیا ہے۔ تو یہ سب کچھ ”قول“ اور ”کلام“ ہے اگرچہ ان میں سے کوئی بھی منہ سے نکلا ہے نہ زبان ہلانے سے!

اسی بیان سے یہ مطلب بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ شیطان کے وعدہ فقر کے مقابلے میں خدا نے مغفرت و فضل کا جو وعدہ کیا ہے وہ بھی کلام ہے کہ جسے فرشتہ کے ذریعے پیش کیا گیا ہے..... جبکہ وہ بھی زبان کی حرکت کے ذریعے اور منہ سے نکلے ہوئے الفاظ نہیں..... اور خداوند عالم نے اسے ”حکمت“ سے موسوم فرمایا ہے۔ اسی سے مشابہ دیگر موارد بھی ہیں بطور مثال درج ذیل آیات مبارکہ ملاحظہ ہوں:

سورۃ حدید، آیت: ۲۸

○ ”وَيَجْعَلُ لَكُمْ نُورًا تَبْسُونَ بِهِ“

(اور وہ تمہارے لئے روشنی قرار دیتا ہے جس سے تم راستہ چلتے ہو)

سورۃ فتح، آیت: ۴:

○ ”هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيُذْذُوا وَإِنَّا أَنَا مَعَهُمْ وَإِنَّا لَنُجِوُدُ  
السَّلَاطِ وَالْأَمْرُضَ“

(وہ کہ جس نے مؤمنین کے دلوں میں سکون ڈالا تاکہ ان کے ایمان میں اضافہ ہو، اور اللہ کے لئے ہیں  
آسمانوں اور زمین میں خاص لشکر،)

لفظ ”سکینت“ کی بابت تفصیلی تذکرہ سورۃ بقرہ میں ہو چکا ہے، ملاحظہ ہو: سورۃ بقرہ، آیت ۲۴۸،  
سورۃ النعام، آیت: ۱۲۵

○ ”فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَهْدِهِ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ وَهَنْ يُرِيدُ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ كَصَدْرِ  
حَرَجٍ كَاتِبٍ يَصْعَدُ فِي السَّمَاءِ كَذَلِكَ يَجْعَلُ اللَّهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ“  
(پس اللہ جسے ہدایت کرنا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کا  
سینہ تنگ اور جکڑا ہوا کر دیتا ہے گویا کہ وہ آسمان کی طرف پرواز کر رہا ہے، اسی طرح اللہ ایمان نہ لانے والوں  
کے دلوں میں پلیدی ڈال دیتا ہے)

شیطانی دوسوسہ کو ”سراجز“ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۃ انفال، آیت: ۱۱:

○ ”سِرَاجُ الشَّيْطَانِ“

(شیطان کا رجز)

ان تمام آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیاطین اور ملائکہ انسان سے ہمکلام ہوتے ہیں تو اسکے دل میں معافی القاء کر  
کے انہ کہ زبان سے بول کر،

یہاں ہمکلام ہونے کی ایک قسم اور بھی ہے جو کہ خداوند عالم کے ساتھ مخصوص و مختص ہے کہ جس کا ذکر درج ذیل  
آیت مبارکہ میں ہوا ہے:

سورۃ شوریٰ، آیت: ۵۱:

○ ”وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ“

(کسی بشر کو یہ مقام حاصل نہیں کہ خدا اس سے ہمکلام ہو سوائے بذریعہ وحی کے یا پردے کے پیچھے سے!)

اس آیت میں ہمکلام ہونے کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں، ایک کو ”وحی“ سے موسوم کیا گیا ہے کہ جس میں خدا اور

بندے کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا، اور دوسری قسم یہ کہ جس میں بندے اور خدا کے درمیان حجاب ہوتا ہے۔

تو یہ ہیں ہمکلام ہونے کی قسمیں کہ جن میں سے بعض خداوند عالم سے مخصوص ہیں اور بعض فرشتوں سے اور بعض شیاطین سے !

اور خدا کا وہ کلام کہ جسے وحی سے موسوم کیا جاتا ہے وہ دیگر اقسام سے تمیز و ممتاز اور مشخص و متعین ہوتا ہے کہ جسے وہ بندہ کہ جس سے کلام ہوتا ہے جانتا و پہچانتا ہے کیونکہ خداوند عالم نے اپنے ہمکلام ہونے میں جو حجاب قرار دیا ہے اسے اٹھالیتا ہے اور پردے کے بغیر اپنے بندے سے ہمکلام ہوتا ہے لہذا یہ بات محال و ناممکن ہے کہ اس کی بابت کوئی غلط فہمی پیدا ہو یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی نبی و رسول اسے کسی دوسری چیز کے مشابہ سمجھنے لگے، لیکن جہاں تک خدا کے ہمکلام ہونے کی دوسری صورت کا تعلق ہے تو اس کی بابت دیگر قرآن کی ضرورت پڑتی ہے جس سے وحی کی درست شناخت ہو سکے۔

اور فرشتہ و شیطان کے ہمکلام ہونے کی بابت ہم نے جو آیات سطور بالا میں ذکر کی ہیں وہ ان کی پہچان و تشخیص میں کفایت کرتی ہیں، کیونکہ فرشتوں کے القاءات شرح صدر کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں اور ان میں مغفرت و عنایت خداوندی کی طرف دعوت ہوتی ہے کہ جس کی بازگشت بالآخران دینی حقائق و معارف کی طرف ہوتی ہے جو کتاب خدا اور سنت نبویؐ میں مذکور و موجود ہیں، جبکہ شیطانی القاءات ضیق الصدر (سینہ کی تنگی) اور نفس کے برے رجحان سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ جو انسان کو نفسانی خواہشات کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں، فقر و ناداری سے دوچار ہونے کا خوف دل میں پیدا کرتے ہیں اور برائی کا حکم دیتے ہیں کہ ان سب کی بازگشت بالآخران معیاروں کی طرف ہوتی ہے جو کتاب و سنت سے عدم مطابقت اور فطرت سے منافات و بیگانگت رکھتے ہیں۔

اس مقام پر ایک اہم مطلب کا تذکرہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ انبیاء اور ان کے ہم پلہ و مخلص ہر کاب افراد کو ایسے مواقع میسر آتے ہیں جن میں وہ فرشتہ اور شیطان دونوں کا مشاہدہ کرتے ہیں اور انہیں پہچانتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں حضرت آدمؑ، ابراہیمؑ اور لوطؑ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ انہیں تشخص میں کسی اضافی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی تھی لیکن عدم مشاہدہ کی صورت میں دیگر مؤمنین کی طرح انہیں بھی اضافی ثبوت و قرینہ کی ضرورت یعنی طور پر ہوتی ہے کہ بالآخر اس کی بازگشت وحی کی تمیز و تشخیص کی طرف ہوتی ہے، بہر حال یہ ایک واضح معنی اور روشن حقیقت ہے۔

## روایات پر ایک نظر

### دعائے عمران کی استجابت

تفسیر تہمتی میں آیت مبارکہ ”واذ قالت امرأة عمران.....“ کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی منقول ہے آپ نے فرمایا :

”ان اللہ او طی الی عمران انی و اہب لک ذکراً سوياً مبارکاً یبئری الاکمہ والابصر، ویحیی الموتی باذن اللہ، وجاعلہ رسولاً الی بنی اسرائیل، فحدث عمران امرأته حنة بذلك وهی ام مریم، فلما حملت کان حملها بها عند نفسها غلاماً، فلما وضعتها قالت رب انی وضعتها انثی، و لیس الذکر کالانثی لا تكون البنت رسولاً، یقول اللہ : واللہ اعلم بما وضعت فلما وهب اللہ لمریم عیسی کان هو الذی بشر به عمران و وعدة اياه فاذا قلنا فی الرجل منا شیئاً وکان فی ولده او ولد ولده فلا تنکروا ذلك“

خداوند عالم نے ن کو وحی کی کہ میں تجھے ایک فرزند عطا کرنے والا ہوں جو لڑکا ہوگا اور صحیح و سالم ہوگا اور بابرکت ہوگا جو مادر زاد نابینا کو اور برص کے مریض کو صحت یاب کر دے گا اور خدا کے اذن سے مردوں کو زندہ کرے گا اور اسے بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا دے گا، جناب عمران نے یہ بات اپنی ”حنة“ سے جو کہ مریم کی والدہ ہیں بیان کی، چنانچہ جب وہ حاملہ ہوئیں تو انہوں نے اپنے تئیں یہ سمجھا کہ ان کے شکم میں لڑکا ہے اور جب انہوں نے اسے جنا تو کہنے لگیں: پروردگارا! یہ تو میں نے لڑکی جنی ہے اور لڑکا لڑکی جیسا نہیں ہوتا اور لڑکی تو رسول نہیں بن سکتی، خداوند عالم نے ان کے جواب میں ارشاد فرمایا: خدا بہتر جانتا ہے کہ اس (حنة) نے کیا جنا ہے، اور پھر جب خداوند عالم نے حضرت مریم کو حضرت عیسیٰؑ سے نواز تو معلوم ہوا کہ جس بچہ کی خوشخبری جناب عمران کو دی گئی تھی اور انہیں اس سے نوازے جانے کا وعدہ کیا گیا تھا وہ عیسیٰ ابن مریم ہی تھے، لہذا اب بھی اگر کسی شخص کے بارے میں کوئی پیش گوئی کی جائے اور وہ اس کی اولاد دیا اولاد کی اولاد کی بابت ہو تو اس کا انکار یا اس پر تعجب نہ کیا جائے۔ (تفسیر تہمتی جلد ۱ ص ۱۰۱)

اس روایت سے قریب المعنی ایک روایت کافی میں امام جعفر صادقؑ سے اور تفسیر العیاشی میں امام محمد باقرؑ کے حوالہ سے ذکر کی گئی ہے۔

## کلیسا میں ”آزاد کئے گئے“ سے کیا مراد ہے ؟

تفسیر العیاشی میں آیت مبارکہ ”رب انی نذرت ما فی بطنی محرراً“ کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادقؑ کا ارشاد گرامی منقول ہے کہ ”محرر“ یعنی جسے کلیسا میں آزاد کر دیا جاتا ہے اس سے مراد وہ بچہ ہے جسے کلیسا سے باہر آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی اور جب زوجہ عمران نے بچی کو جتنا تو بارگاہ رب العزت میں عرض گزار ہوئیں کہ پروردگارا ! میں نے تو بچی جنی ہے اور بچہ بچی کی طرح نہیں ہوتا کیونکہ بچی کو حیض آتا ہے جس کی وجہ سے اس کا مسجد یعنی عبادگاہ سے باہر آنا ناگزیر ہوتا ہے جبکہ ”محرر“ کو عبادگاہ سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ نچتا بچی کو ”محرر“ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

(تفسیر العیاشی جلد ۱ ص ۱۷۱ ح ۳۹)

سبیل سکتہ

تفسیر العیاشی کی ایک روایت

حیر آباد لطف آباد پینڈو نمبر ۵۹

تفسیر العیاشی میں امام جعفر صادقؑ اور امام محمد باقرؑ میں سے ایک کے حوالہ سے یہ روایت ذکر کی گئی ہے کہ زوجہ عمران نے منت مانی تھی کہ کو میرے شکم میں ہے اسے کلیسا میں عبادت گزاروں کی خدمت گاری کے لئے وقف کرتی ہوں، اور لڑکا خدمت گزاری میں لڑکی جیسا نہیں ہوتا، چنانچہ حضرت مریمؑ بالغ ہونے سے پہلے تک کلیسا میں خدمت گزاری کرتی رہیں اور جب سن بلوغ کو پہنچیں تو حضرت زکریاؑ نے انہیں حکم دیا کہ وہ کلیسا میں آنے والے عبادت گزاروں سے حجاب کریں۔

(تفسیر العیاشی، ج ۱ ص ۱۷۱ ح ۳۷)

مذکورہ بالا روایت جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں ہمارے سابقہ بیانات سے عین مطابقت رکھتی ہیں، البتہ ان سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ”وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنثَى“ (اور لڑکا لڑکی جیسا نہیں ہوتا) زوجہ عمران کا بیان ہے نہ کہ خدا کا! لیکن اس صورت میں دو حوالوں سے اشکال باقی رہے گا: ایک یہ کہ اس میں لفظ ”الذَّكَرُ“ (لڑکا) کو لفظ ”الانثی“ (لڑکی) سے پہلے کیوں ذکر کیا گیا ہے جبکہ یہ عبری زبان کے قواعد کے خلاف ہے، اور دوسرا یہ کہ بچی کا نام ”مریم“ کیوں رکھا گیا؟ جبکہ ”مریم“ کا معنی آزاد کیا جانا ہے، البتہ اگر یہ کہا جائے کہ آزاد کئے جانے اور عبادگاہ میں خادمہ قرار دیئے جانے میں فرق ہے تو اس صورت میں اشکال دور ہو سکتا ہے۔



اور پہلی روایت (تفسیر قمی ج ۱ ص ۱۰۱) میں حضرت عمران کی طرف وحی کئے جانے کے الفاظ سے ان کے نبی ہونے کا ثبوتی اشارہ بھی پایا جاتا ہے، چنانچہ اس کی تائید درج ذیل روایت سے ہوتی ہے جس میں مذکورہ ہے کہ ابو بصیر نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ آیا عمران نبی تھے؟ تو امام نے ارشاد فرمایا: ہاں، وہ نبی تھے اور انہیں ان کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا تھا، (ملاحظہ ہو: بحار الانوار ج ۱۳ ص ۲۰۲ ح ۱۳)

(عن ابی بصیر قال سألت ابا جعفر علیہ السلام عن عمران اکان نبیاً، فقال: نعم، کان نبیاً مرسلاً الی قومہ.....)

اور اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ زوجہ عمران کا نام ”حنہ“ تھا اور یہی مشہور ہے، بعض روایات میں ان کا نام ”مورثار“ بھی ذکر ہوا ہے، تاہم اس سلسلہ میں مزید بحث ہمارے لئے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں، تفسیر قمی میں سابق الذکر روایت کے ذیل میں آیا ہے:

” فلما بلغت صارت فی المحراب، وارخت علی نفسها ستراً، وکان لا یراها احد، وکان یدخل علیها ذکر یا المحراب فیجد عندها فاکهة الصیف فی الشتاء و فاکهة الشتاء فی الصیف فکان یقول: انی لک هذا؟ فتقول: هو من عند اللہ یرزق من یشاء بغير حساب“

کہ جب مریمؑ سن بلوغ کو پہنچیں تو محراب عبادت میں آگئیں اور اپنے اوپر پردہ ڈال لیا (پردہ کرنے لگیں) کہ کوئی انہیں دیکھ نہیں سکتا تھا، اور صرف حضرت زکریاؑ ان کے پاس محراب میں آتے تھے اور وہ جب بھی ان کے پاس آتے تو وہاں موسم گرما کے میوے موسم سرما میں اور موسم سرما کے میوے موسم گرما میں ان کے پاس دیکھتے اور ان سے پوچھتے تھے کہ یہ تیرے پاس کہاں سے آئے ہیں؟ تو وہ ان سے کہتیں تھیں: یہ خداوند عالم کی طرف سے ہیں اور خدا جسے چاہتا ہے بے حساب روزی عطا کرتا ہے۔

(تفسیر قمی جلد ۱ صفحہ ۱۰۱)

سبیل سکینہ

محمد الطیف آباد، یونٹ نمبر ۸-۷۹

دعائے زکریا اور ندائے ملائکہ

تفسیر العیاشی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

” ان ذکر یا لما دعا ربہ، ان یهب لہ ولداً فنادتہ الملائکة بمانادتہ بہ احب ان یعلم ذلک الصوت من اللہ، فاوحی الیہ ان آیة ذلک ان یمسک لسانہ عن الکلام ثلاثة ایام، فلما

امسك لسانه ولم يتكلم علم انه لا يقدر على ذلك الا الله ، و ذلك قول الله عزوجل : رب اجعل لى اية “

حضرت زکریا نے اپنے پروردگار سے استدعا کی کہ وہ اسے فرزند عطا کرے، تو فرشتوں نے انہیں ندا دی کہ جس کا ذکر قرآن میں موجود ہے، حضرت زکریا نے چاہا کہ جانیں کہ وہ آواز خدا کی طرف سے ہے، تو خدا نے انہیں وحی کی کہ آپ کو جو خوشخبری دی گئی ہے اس کی خدا کی طرف سے ہونے کی نشانی یہ ہے کہ ان کی زبان تین دن تک بند ہو جائے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور انہوں نے تین دن تک کسی سے کلام نہ کیا تو انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ خوشخبری خدا کی طرف سے تھی کیونکہ ایسا کرنا خدا کے علاوہ کسی کے بس میں نہیں، یہ ہے خدا کے اس فرمان کا مطلب: ”رب اجعل لى اية“ (پروردگار! میرے لئے کوئی نشانی قرار دے)۔

اسی سے قریب المعنی روایت تفسیر قمی میں ذکر ہوئی ہے (ملاحظہ ہو: تفسیر قمی ج ۱ ص ۱۰۱) اور قارئین کرام اس امر سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ آیات مبارکہ کے سیاق سے ان مطالب کی نفی نہیں ہوتی۔

لیکن بعض مفسرین ان روایات میں مذکور مطالب کا شدت سے انکار کرتے ہیں یعنی عمران کو وحی ہونا، محراب میں مریم کے لئے غیر موسیٰ پھلوں کا پایا جانا اور زکریا کا نشانی کے بارے میں اس لئے درخواست کرنا تاکہ واضح ہو جائے کہ جو آواز سنائی دی وہ خدائی تھی، ان امور کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ ان کی بابت کوئی ٹھوس دلیل موجود نہیں، نہ خدا نے ان کے بارے میں کچھ ارشاد فرمایا ہے اور نہ ہی رسول خدا نے کچھ اظہار کیا ہے، اور وہ ایسے امور بھی نہیں ہیں جن کی تصدیق عقل کے ذریعے ہو اور نہ ہی کسی معتبر تاریخ میں ان کا ثبوت ملتا ہے، اور اس سلسلہ میں چند اسرائیلی و غیر اسرائیلی روایتوں کے سوا کچھ نہیں، اور معانی قرآن کے سمجھنے میں اس طرح کے ناقابل فہم امور کا سہارا لینے کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مفسر کی اپنی باتیں بلا دلیل ہیں، اور مذکورہ بالا روایات اگرچہ اخبارالآحاد ہیں اور سند کے حوالہ سے ضعف سے مبرا نہیں اور نہ ہی ارباب تحقیق کو اس طرح کی روایات کا سہارا لینا ناگزیر اور ان میں مذکورہ مطالب سے استدلال کرنا ضروری ہے لیکن قرآنی آیات میں غور و فکر اور تدبر کرنا ان مطالب کے قرین صحت ہونے کی راہ دکھاتا ہے اور ان کی بابت آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے جو بیانات وارد ہوئے ہیں ان میں کوئی بات ایسی نہیں جو عقل کے منافی یا عقلی اصولوں سے متصادم ہو، البتہ قدیم مفسرین میں سے بعض حضرات کی طرف سے کچھ مطالب ذکر کئے گئے ہیں جو کہ قرین قیاس نہیں بلکہ غیر معقول ہیں جیسا کہ قتادہ اور عکرمہ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا کہ شیطان حضرت زکریا کے پاس آیا اور انہیں اس خوشخبری کے بارے میں شک میں مبتلا کر دیا جو انہیں دی گئی تھی اور ان سے کہنے لگا کہ اگر یہ خوشخبری خدا کی طرف سے ہوتی تو جس طرح تو نے خدا سے مخفی و آہستہ آواز میں بات کی وہ بھی تجھ سے مخفی و آہستہ آواز میں بات کرتا، اس طرح شیطان نے

حضرت زکریا کو اس خدا کے بارے میں شک میں مبتلا کر دیا، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے مطالب ہرگز درست نہیں اور کسی نبی کی شان و مرتبہ اس سے کہیں بلند ہے کہ شیطان انہیں خدائی آواز کے بارے میں شک میں مبتلا کر دے، یہ اسی طرح ہے جیسے انجیل لوقا میں مذکور ہے کہ جبریل نے زکریا سے کہا کہ اب تو بول نہیں سکتا اور مقررہ وقت تک قوت گویائی سے محروم ہو گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نے میری اس بات کی تصدیق نہیں کی جس کی صداقت بہ جلد ثابت ہو جائے گی، (انجیل لوقا، ۲۰-۱)

## روایات پر ایک اور نظر

### دل کے دوکان

کتاب کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے منقول ہے آپ نے ارشاد فرمایا:

”ما من قلب الا وله اذنان، علی احدیہما ملک مرشد و علی الاخری شیطان مفتن :  
 هذه الشیطان یامرہ بالمعاصی، والملک یزجرہ عنہا، وذلک قول اللہ عزوجل: مَا یَنْفُظُ مِنْ  
 قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَاقِبٌ عَتِيدٌ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ“

ہر دل کے دوکان ہیں، ان میں سے ایک پر ہدایت کرنے والا فرشتہ بیٹھا ہوا ہے اور دوسرے پر فتنہ انگیز شیطان بیٹھا ہوا ہے، ایک اسے کچھ کرنے کا حکم دیتا ہے اور دوسرا اس سے منع کرتا ہے، شیطان اسے گناہوں کے ارتکاب کا حکم دیتا ہے جبکہ فرشتہ اسے ان سے منع کرتا ہے۔ تو یہی ہے اس آیت کا مطلب جس میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: انسان جب بھی کوئی بات کرتا ہے تو اس کے پاس ایک نگہبان اور ایک دشمن ہوتا ہے جو اس کے دائیں اور بائیں طرف بیٹھے ہوئے ہیں، سورہ ق، آیت ۱۸.....

(کافی، ج ۲ ص ۲۶۶ ح ۱۷)

مذکورہ بالا مطالب پر مشتمل کثیر روایات موجود ہیں جن میں سے بعض عنقریب پیش کی جائیں گی، اور اس روایت (کافی ج ۲ ص ۲۶۶ ح ۱۷) میں امام نے آیت مبارکہ کی تطبیق میں فرشتہ اور شیطان کا جو تذکرہ کیا ہے وہ ان روایات سے منافی نہیں جن میں ہر انسان کے ساتھ دو فرشتوں کا موجود ہونا مذکور ہے کہ جن میں ایک نیک اعمال اور دوسرا برے اعمال رقم کرتا

ہے کیونکہ آیت مبارکہ سے اس سے زیادہ کچھ ثابت نہیں ہوتا کہ ہر شخص کے ساتھ ایک رقیب اور ایک غمید موجود ہوتا ہے جو اس کی ہر بات پر کڑی نظر رکھتا ہے، اور وہ انسان کے دائیں اور بائیں جانب مستقر ہیں، اور یہ کہ وہ دونوں فرشتے ہیں یا ایک فرشتہ اور ایک شیطان ہے تو اس سلسلہ میں آیت میں صراحت و وضاحت نہیں پائی جاتی لہذا اسے دونوں پہلوؤں پر منطبق کیا جاسکتا ہے۔

## رسول اور نبی میں فرق

کتاب کافی میں زرارہ سے مروی ہے انہوں نے کہا:

”سألت ابا عبد اللہ علیہ السلام عن الرسول و عن النبی و عن المحدث، قال: الرسول الذی یعاین الملک یأتیہ بالرسالة من ربہ یقول: یا مریک کذا و کذا، و الرسول یكون نبیاً مع الرسالة، و النبی لا یعاین الملک ینزل علیہ الشیء النبأ علی قلبہ فیکون کالمغمی علیہ فیری فی منامہ، قلت: فما علمہ الذی فی منامہ حق؟ قال: بیسہ اللہ حتی یعلم ان ذلک حق، و لا یعاین الملک، الحدیث“

میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ ”رسول“، ”نبی“ اور ”محدث“ سے کیا مراد ہے؟ امام نے ارشاد فرمایا: رسول اسے کہتے ہیں جو وحی لانے والے فرشتے کو دیکھتا ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرشتہ اس کے پروردگار کی طرف سے اس کے لئے پیغام لایا ہے اور وہ فرشتہ اس سے گویا ہوتا ہے کہ تیرا پروردگار تجھے یہ حکم دیتا ہے اور یہ حکم دیتا ہے، تو رسول وہ نبی ہوتا ہے جس کے پاس رسالت کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے، اور ”نبی“ اس فرشتہ کا مشاہدہ نہیں کرتا جو اس پر وحی لے کر نازل ہوتا ہے بلکہ وہ خدا کی طرف سے ملنے والی خبر کو اس کے دل میں ڈال دیتا ہے، چنانچہ اس کی حالت اس طرح ہو جاتی ہے جیسے وہ شخص جس پر بہوشی طاری ہو، وہ اس حالت میں خواب میں وحی کا نظارہ کرتا ہے، (ابو بصیر نے کہا) میں نے پوچھا کہ اگر ایسا ہے تو اسے کس طرح معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ اس نے اپنے خواب میں دیکھا وہ حق ہے؟ امام نے ارشاد فرمایا کہ خداوند عالم اس پر واضح کر دیتا ہے کہ جو کچھ اس نے خواب میں دیکھا ہے وہ حق ہے، تاہم وہ فرشتہ کو نہیں دیکھتا، الخ۔

(کافی ج ۱ ص ۷۶ ح ۱-۴)

اس روایت میں امام جعفر صادق کا یہ فرمان کہ ”و الرسول یكون نبیاً مع الرسالة“ رسول وہ نبی ہوتا ہے جو رسالت کی ذمہ داری ساتھ لئے ہوتا ہے، اس میں اس مطلب کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ وہ دونوں صفتیں یکجا ہو سکتی

ہیں (یعنی ایک ہی شخص نبی اور رسول ہونے کے دونوں عہدوں کا حامل ہو سکتا ہے)، بہر حال سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۳ ”كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ..... النَّبِيَّ“ کی تفسیر میں رسالت و نبوت کی بابت تفصیلی تذکرہ ہو چکا ہے۔ اور امام کا یہ فرمان کہ نبی، وحی نازل ہونے کے وقت اس شخص کی طرح ہو جاتا ہے جس پر غشی طاری ہوئی ہو، دراصل نبی کے خواب کی تفسیر ہے اور اس کا مطلب غیبی ادراک ہے نہ کہ خواب کا وہ معنی جو عام مشہور ہے۔ اور امام کا یہ فرمان کہ ”خدا اسے آگاہ کر دیتا ہے اور اس پر واضح کر دیتا ہے“ تو اس سے مراد انبیاء کا اس مقام پر فائز ہونا ہے کہ وہ فرشتہ اور شیطان کے القاء میں فرق و تمیز کر سکتے ہیں اور خدا داد صلاحیت کی بناء پر حق کی تشفی کر سکتے ہیں۔

### بصائر الدرجات کی ایک روایت

کتاب بصائر الدرجات میں برید کے حوالہ سے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ علیہما السلام سے منقول ہے کہ برید نے پوچھا، ”فما الرسول والنبي والمحدث؟“ کہ رسول، نبی اور محدث کسے کہتے ہیں؟ تو امام نے ارشاد فرمایا: ”الرسول الذي يظهر الملك في كلمه، والنبي يرى في المنام، وربما اجتمعت النبوة والرسالة لواحد، والمحدث الذي يسمع الصوت ولا يرى الصورة“

رسول اسے کہتے ہیں جس کے سامنے فرشتہ ظاہر ہوتا ہے اور وہ اس سے ہمکلام ہوتا ہے، اور ”نبی“ اسے کہتے ہیں جو خواب میں فرشتہ کو دیکھتا ہے اور گاہے ایسا ہوتا ہے کہ نبوت و رسالت ایک ہی شخص میں اکٹھی ہو جاتی ہیں، اور ”محدث“ اسے کہتے ہیں جو فرشتہ کی آواز سنتا ہے، لیکن فرشتہ کو نہیں دیکھتا، (برید نے کہا) میں نے پوچھا:

”اصلحك الله، كيف يعلم ان الذي رأى في المنام هو الحق وانه من الملك؟“

خدا آپ کا بھلا کرے، وہ کس طرح جان لیتا ہے کہ جو کچھ اس نے خواب میں دیکھا ہے وہ حق ہے اور وہ کہ جس کی آواز سنی وہ فرشتہ ہے،

تو امام نے جواب دیا:

”يوفق لذلك حتى يعرفه، لقد ختم الله بكتابكم الكتب و بنبيكم الانبياء“

خداوند عالم اسے اس کی توفیق عطا کرتا ہے جس کی بدولت وہ پہچان حاصل کر لیتا ہے، خدا نے تمہاری کتاب (قرآن) کے ذریعے کتب آسمانی کے سلسلہ کو تمام کر دیا ہے اور تمہارے نبی (حضرت محمدؐ) کے ذریعے سلسلہ نبوت کو اختتام پذیر کر دیا، الخ، (بصائر الدرجات ص ۳۷۱ ح ۱۱۲)

یہ حدیث بھی سابق الذکر حدیث جیسی ہے اور اس میں امام نے محدث کی پہچان کرواتے ہوئے جو الفاظ ذکر فرمائے اس سے محدث کی مکمل پہچان ہو جاتی ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ محدث بھی غیبی آواز سن کر آواز دینے والے کو پہچان لیتا ہے،

اور امام کا یہ فرمان کہ خداوند عالم نے قرآن کے ذریعے سلسلہ کتب آسمانی کو اختتام پذیر کر دیا اور حضرت محمد کے ذریعے سلسلہ نبوت کو ختم کر دیا، اس سے اسی مطلب کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ قرآن و سنت تمام مطالب کے بیان و وضاحت کی بابت کفایت کرتے ہیں،

اور ”محدث“ کی بابت بعد میں ذکر کی جانے والی آیات مبارکہ کی تفسیر میں تفصیلی بحث ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ،

## آیات ۴۲ تا ۶۰

- وَإِذْ قَالَتِ الْمَلِكَةُ لَیْرِیْمُ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰی نِسَاءِ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۲﴾
- لَیْرِیْمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِیْ وَارْكَعِیْ مَعَ الرّٰكِعِیْنَ ﴿۴۳﴾
- ذٰلِكَ مِنْ اَنْبِیَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ ۗ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ ۗ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾
- اِذْ قَالَتِ الْمَلِكَةُ لَیْرِیْمُ اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۗ اَسْمُہُ السَّیِّئُ عِیْسٰی ابْنُ مَرْیَمَ وَجِیْہَا فِی الدُّنْیَا وَالْآخِرَةِ ۗ وَمَنْ الْمُتَقَرَّبِیْنَ ﴿۴۵﴾
- وَیُكَلِّمُ النَّاسَ فِی الْبَہْدِ وَكَهْلًا ۗ وَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۴۶﴾
- قَالَتْ رَبِّ اَنْیُّ یَكُوْنُ لِيْ وَلَدًا ۗ وَلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشْرٌ ۗ قَالَ كَذٰلِكَ اَللّٰهُ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۗ اِذَا قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فِیَكُوْنُ ﴿۴۷﴾
- وَیُعَلِّمُ الْکِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰتَہُ ۗ وَالْاِنْجِیْلَ ﴿۴۸﴾

- وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ إِنِّي أَخْلَقْتُ لَكُمْ  
 مِنَ الطَّيْرِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنْفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَةَ  
 وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ وَمِمَّا تَدَّخِرُونَ فِي  
 بُيُوتِكُمْ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّكُم إِن كُنتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٤٢﴾
- وَمَصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَةِ وَلَا حِجْلَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ  
 وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا ۗ ﴿٤٣﴾
- إِنَّ اللَّهَ رَأْيِي وَرَبُّكُمْ فَأَعْبُدُوهُ ۗ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ﴿٤٤﴾
- فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ ۗ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ  
 نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ ۗ آمَنَّا بِاللَّهِ ۗ وَأَشْهَدُ بِأَنَّكَ مُسْلِمُونَ ﴿٤٥﴾
- رَبَّنَا آمَنَّا بِهَا أَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ﴿٤٦﴾
- وَمَكْرُوهًا وَمَكْرًا لِلَّهِ ۗ وَاللَّهُ خَيْرُ الْكَافِرِينَ ﴿٤٧﴾
- إِذْ قَالَ اللَّهُ لِيَعْقِيبَ إِنِّي أَنزَلْتُ لِكَ وَرَافِعَكَ إِلَىٰ وَمَطْهَرَكُ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا  
 وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۗ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۗ ثُمَّ إِلَىٰ  
 مَرْجِعِكُمْ فَأَحْكُم بَيْنَكُمْ فِي مَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٤٨﴾



- فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَعُدَّ بِهُم مِّنَّا بِشَرِّ دِينِنَا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ  
مِّنْ نَّصِيرِينَ ﴿۵۱﴾
- وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ  
الظَّالِمِينَ ﴿۵۲﴾
- ذَٰلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ ﴿۵۳﴾
- إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ  
فَيَكُونُ ﴿۵۴﴾
- الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُن مِّنَ الْمُنْتَرِينَ ﴿۵۵﴾

## ترجمہ

- ” (اس وقت کو یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! اللہ نے تجھے چن لیا ہے اور تجھے
- (۴۲) پاک بنایا ہے اور تجھے تمام عالمین کی عورتوں پر منتخب کر لیا ہے “
- ” اے مریم! اپنے رب کے حضور خاکساری و فرمانبرداری کے ساتھ رہو، بجدہ ریز رہو اور
- (۴۳) رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرتی رہو “
- ” یہ غیبی خبریں ہیں جو ہم آپ پر وحی کر رہے ہیں، آپ تو اس وقت وہاں موجود نہ تھے جب وہ
- قلمیں..... دریا میں..... پھینک کر..... قرعہ اندازی..... کر رہے تھے کہ ان میں سے مریم کی کفالت
- کی ذمہ داری کسے ملتی ہے، اور نہ ہی آپ ان کے پاس اس وقت موجود تھے جب وہ اس سلسلہ
- (۴۴) میں آپس میں تنازع کر رہے تھے “
- ” (اور اس وقت کو یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک کلمہ
- (بچہ) عطا کئے جانے کی خوشخبری دیتا ہے جس کا نام عیسیٰ بن مریم ہوگا جو دنیا و آخرت میں عزت
- (۴۵) والا ہوگا اور مقرب بندوں میں سے ہوگا “
- ” اور وہ لوگوں سے باتیں کرے گا جب وہ جھولے میں ہوگا اور جب وہ بوڑھا ہو جائے گا،
- (۴۶) اور وہ نیک و صالح افراد میں سے ہوگا “

- ” مریم نے..... حیرت سے..... کہا: پروردگارا! میرے ہاں بچہ کیونکر پیدا ہوگا جبکہ مجھے تو کسی انسان نے چھوا تک نہیں ہے، خدا نے کہا، اسی طرح خدا جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، وہ جب کسی کام کا ارادہ کر لیتا ہے تو اسے کہتا ہے: ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے“ (۴۷)
- ” اور اللہ اسے کتاب و حکمت اور تورات و انجیل پڑھا دے گا“ (۴۸)
- ” اور اسے بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا دے گا اور وہ ان سے کہے گا کہ میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے خاص نشانی (معجزہ) لے کر آیا ہوں، اور وہ یہ کہ میں تمہارے لئے گندھی ہوئی مٹی سے پرندہ جیسی ایک صورت بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے اصل پرندہ بن جائے گا اور میں اللہ کے عطا کردہ اختیار کے ساتھ مادرزاد نابینا کو بینا اور برص میں مبتلا شخص کو صحت یاب اور مردوں کو زندہ کرتا ہوں، اور تمہیں بتا سکتا ہوں کہ تم کیا کچھ کھاتے ہو اور تم کیا کچھ اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو، ان سب چیزوں میں تمہارے لئے واضح نشانی ہے بشرطیکہ تم ایمان والے بنو“ (۴۹)
- ” اور میں اپنے سے پہلے آئی کتاب تورات کی تصدیق کرتا ہوں اور جو چیزیں تم پر حرام قرار دی گئی ہیں ان میں سے کچھ کو حلال کر دوں گا، اور میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی (اپنی نبوت کا معجزہ) لے کر آیا ہوں، لہذا تم تقوا لے الہی اختیار کرو اور میری اطاعت و فرمانبرداری کرو“ (۵۰)
- ” بے شک اللہ میرا پروردگار اور تمہارا پروردگار ہے، تم اسی کی عبادت کرو کہ یہی صراطِ مستقیم (حق کی سیدھی راہ) ہے“ (۵۱)

- ” پھر جب عیسیٰ نے ان لوگوں (اپنی قوم) کی طرف سے کفر کے آثار محسوس کئے تو اعلان کیا کہ کون ہے جو خدا کے دین میں میرا مددگار بنے؟ حواریوں (عیسیٰ کے مخلص صحابہ) نے کہا: ہم دین خدا کی مدد کرتے ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور آپ ہمارے خدا کے حضور سر تسلیم خم کر دینے پر گواہ ہوں“ (۵۲)
- ” (انہوں نے) اظہارِ ایمان و نصرت کے بعد دعا کی (پروردگارا! ہم تیرے بھیجے ہوئے دین پر ایمان لائے اور ہم نے رسول کی پیروی کی، اب ہمیں گواہی دینے والوں میں لکھ لے“ (۵۳)
- ” لوگوں نے اپنی تدبیریں کیں اور اللہ نے اپنی تدبیر کی، اور خدا سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے“ (۵۴)
- ” (اس وقت کو یاد کرو) جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ! اب میں تیری دنیاوی زندگی کی مدت پوری کر رہا ہوں اور تجھے اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور تمہیں ان کفر اختیار کرنے والوں کی آلودگی سے پاک کرنے والا ہوں اور میں تیرے پیروکاروں کو قیامت تک کافروں پر برتری دینے والا ہوں، پھر تم سب کی بازگشت میری طرف ہوگی اور میں ان چیزوں کے بارے میں فیصلہ کروں گا جن کی بابت تم آپس میں اختلاف رکھتے ہو“ (۵۵)
- ” اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا انہیں دنیا اور آخرت میں سخت عذاب میں مبتلا کروں گا کہ ان کا مددگار کوئی نہ ہوگا“ (۵۶)

- ” اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیئے تو اللہ انہیں پورے اجر و جزا سے نوازے گا کہ اللہ ظلم کرنے والوں کو ہرگز دوست نہیں رکھتا “ (۵۷)
- ” یہ سب جو ہم آپ کے سامنے پڑھتے ہیں واضح نشانیاں ہیں اور حکمت بھرا تذکرہ ہے “ (۵۸)
- ” یقیناً اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم جیسی ہے کہ جسے خدا نے خاک سے پیدا کیا پھر اس نے کہا: ہو جا، تو وہ ہو گیا (وجود میں آ گیا) “ (۵۹)
- ” یہ سب حق ہے جو تیرے پروردگار کی طرف سے ہے، تو ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہونا “ (۶۰)

## تفسیر و بیان

## فرشتوں کا حضرت مریم سے خطاب

○ ”وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ لَمَرِيْمُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ.....“  
(اور جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! اللہ تعالیٰ نے تجھے چن لیا ہے اور تجھے پاک بنایا ہے.....)

یہ آیت سابقہ آیت (۳۵) ”إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ.....“ پر عطف ہے، نتیجتاً یہ آیت بھی آیت (۳۵) کی طرح ان آیات کی شرح و وضاحت کرتی ہے جن میں آل عمران کے برگزیدہ خدا قرار دیئے جانے کا تذکرہ ہے یعنی آیات ۳۳: ۳۴ (إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَى..... الخ)۔

زیر نظر آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام ”محدثہ“ تھیں، فرشتے ان سے ہمکلام ہوتے تھے اور وہ ان کی باتیں سنتی تھیں جیسا کہ سورۃ مریم آیت ۱۷ ”فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا“ (ہم نے اس کی طرف اپنی روح..... روح القدس..... کو بھیجا، وہ اس کے سامنے کامل انسان کی شکل میں ظاہر ہوا)، اور اس کے بعد والی آیات سے بھی اس مطلب کا ثبوت ملتا ہے، انشاء اللہ عنقریب ”محدث“ کے بارے میں تفصیلی تذکرہ ہوگا۔

گذشتہ صفحات میں آیت مبارکہ ”فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ.....“ (اس کے پروردگار نے اس کی دعا قبولیت کے اچھے طور پر قبول کی) کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ اس میں حضرت مریم کی والدہ کی اس دعا کو شرف قبولیت عطا کئے جانے کا تذکرہ ہے جس میں انہوں نے کہا: ”وَإِنِّي سَوَّيْتُهُمَا مَرِيْمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهُمَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ.....“ (اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اسے اور اس کی نسل کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں) اور فرشتوں کا حضرت مریم سے یہ کہنا: ”إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ.....“ کہ اللہ نے تجھے چن لیا اور تجھے پاک بنایا) دراصل انہیں اس امر سے مطلع و آگاہ کرنے کے طور پر ہے کہ خداوند عالم کے نزدیک ان کی منزلت و

مقام کس قدر بلند ہے، (اس سلسلہ میں ان آیات کی تفسیر کی طرف رجوع کریں)۔

بہر حال حضرت مریمؑ کا اصطفاء اور ان کا خدا کی طرف سے چن لیا جانا دراصل ان کی عبادت الہی کی قبولیت سے عبارت ہے، اور ان کا پاک بنایا جانا ان کا خدا کی طرف عصمت کے مقام پر فائز ہونے کا دوسرا نام ہے، بنا بریں وہ اصطفاء اور عصمت دونوں خدائی اعزازات کی حامل ہیں، ”مصطفیٰ اور معصومہ ہیں“۔

حضرت مریمؑ کے پاک قرار دیئے جانے کی بابت ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خدا نے انہیں ”بتول“ بنایا ہے کہ جسے خون حیض نہیں آتا، اور یہ اس لئے ہے تاکہ وہ حیض کی وجہ سے عبادتگاہ سے باہر جانے پر مجبور نہ ہو، اگرچہ اس قول میں بھی کوئی حرج نہیں لیکن جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے وہ آیات کے سیاق سے زیادہ موزوں ہے۔

## نساء عالمین کی سرداری

○ ”وَاصْطَفٰىكَ عَلَى نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ“  
(اور تجھے تمام جہانوں کی عورتوں پر چن لیا ہے)

سابقہ بیانات میں ”إِنَّ اللَّهَ اصْطَفٰى..... تا..... عَلَى الْعٰلَمِيْنَ“ کی تفسیر میں یہ مطلب ذکر کیا جا چکا ہے کہ ”اصطفاء“ جب حرف ”عَلَى“ کے ساتھ متعدی ہو کر آئے تو تقدم کا معنی دیتا ہے، یعنی جسے چنا گیا ہے اسے دوسروں پر مقدم قرار دیا گیا ہے، اور وہ ”اصطفاء“ اس مطلق اصطفاء و برگزیدہ قرار دیئے جانے سے مختلف ہے کہ جسے حرف ”عَلَى“ کے بغیر ذکر کیا جاتا ہے کہ جس میں ”تسليم“ کا معنی پایا جاتا ہے، بنا بریں حضرت مریمؑ کا تمام جہانوں کی عورتوں پر چن لیا جانا (ان میں سے برگزیدہ و منتخب کیا جانا) انہیں ان پر مقدم کئے جانے سے عبارت ہے، یعنی انہیں عالمین کی عورتوں پر تقدم عطا کیا گیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ مقدم کیا جانا تمام جہات و ہر حالہ سے ہے یا بعض جہتوں اور حوالوں سے؟

اس سلسلہ میں اس آیت کے بعد والی آیت کے جملہ ”إِذْ قَالَتِ الْمَلِكَةُ لِيٰرِيْمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَيِّنُ لِكَ...“ (جب فرشتوں نے کہا اے مریم خدا تجھے خوشخبری دیتا ہے...)، اور سورہ انبیاء کی آیت ۹۱ کے الفاظ ”وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوحِنَا وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۹۱“ (اور وہ کہ جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی، پھر ہم نے اس میں اپنی روح پھونک دی اور ہم نے اسے اور اس کے بیٹے کو عالمین کیلئے نشانی بنا دیا) اور

سورہ تحریم کی آیت ۱۲: ”وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُوحِنَا وَصَدَقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكَتَبْنَا فِيهَا كُتُبًا وَكَلَّمْنَا مِنْ الْقُلُوبِ“ (اور یاد کرو مریم دختر عمران کو، کہ جس نے اپنی ناموس کی حفاظت کی (اپنی شرمگاہ کو پاکیزہ رکھا) تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی اور اس نے اپنے پروردگار کے کلمات اور کتابوں کی تصدیق کی اور وہ فرما تیر داری میں تھی) سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی مخصوص صفات میں سے جو چیز حضرت مریمؑ کی امتیازی صفت قرار دی گئی وہ ان کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو منفرد انداز میں جنم دینا ہے، اور یہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس کی بناء پر انہیں تمام جہانوں کی عورتوں پر تقدم عطا کیا گیا ہے، یعنی ان کا اصطفاء تمام جہات سے نہیں بلکہ صرف ولادت عیسیٰ کی مفرد صورت کی بناء پر ہے، اور جہاں تک ان کے تذکرہ میں اصطفاء کے علاوہ دیگر صفات کے ذکر کا تعلق ہے مثلاً انہیں پاک بنایا جانا، ان کا کلمات الہی و کتب سماوی کی تصدیق کرنا، انکا قاتلین و فرماں برداروں میں شمار ہونا، اور ان کا ”محدثہ“ ہونا، تو یہ امور صرف انہی سے مختص نہیں بلکہ ان کے علاوہ دوسری خواتین میں بھی پائے جاتے ہیں، اور بعض حضرات کا یہ کہنا کہ ”وَاصْطَفَيْنَاكَ عَلَى نِسَاءِ الْعَالَمِينَ“ سے ان کا اپنے زمانہ کی عورتوں میں سے منتخب و چنا جانا مراد ہے تو یہ آیت کے اطلاق کے منافی ہے لہذا اسے قرین صحت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

## حضرت مریمؑ کو فرماں برداری اور عبادت کا حکم

○ ”يَسِّرْ يَمَ اَقْتَبِي لِرَبِّكَ وَاسْجُدِي وَامْرُكِي مَعَ الرُّكُوعِينَ“

(اے مریم، اپنے پروردگار کی اطاعت و فرماں برداری کر، اور سجدہ ریزہ اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرتی رہ!)

لفظ ”قنوت“ کہ جس سے فعل امر ”اَقْتَبِي“ مشتق ہوا ہے اس کے معنی کی بابت کہا گیا ہے کہ اس سے مراد خضوع کے ساتھ فرماں برداری کرتے رہنا ہے۔

لفظ ”سجدہ“ کہ جس سے فعل امر ”وَاسْجُدِي“ بنا ہے اس کا معنی معروف اور سب کا جانا پہچانا ہے۔  
لفظ ”رکوع“ کہ جس سے فعل امر ”وَامْرُكِي“ بنا ہے اس سے مراد خم ہونا یا ہر طرح سے خاکساری و فروتنی اور تابعداری کا عملی دم بھرنا ہے۔

اس آیت مبارکہ میں حضرت مریمؑ کو ندادی گئی (یا مریم) اور چونکہ ندادا دینا ندادیے گئے شخص کی تمام تر توجہ ندادیے



والے کی طرف مرکوز کرنے کا موجب بنتا ہے لہذا جب بار بار ندادی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ندادینے گئے شخص کو اس امر کی طرف متوجہ کیا جائے کہ اسے ندادینے والے کی طرف سے کئی ایک امور سے باخبر کرنا مقصود ہے، آیت مبارکہ میں بھی یہی صورت پائی جاتی ہے ابور حضرت مریم کو دو بار ندادے کر اس امر کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے کہ ہمارے پاس تیرے لئے دو باتیں ہیں جن سے تجھے آگاہ کرنا ہے تو تو ان کو غور سے سن اور اپنی پوری توجہ ان کی طرف مبذول کر، وہ دو باتیں یہ ہیں:

(۱) خداوند عالم نے تجھے اس عظیم مقام و مرتبہ سے نوازا ہے جو تیرے لئے اس کے ہاں ہے۔

(۲) تجھ پر لازم ہے کہ اپنے فریضہٴ عبدیت کو ادا کرتی رہے تاکہ خدا کے عطا کردہ مقام و منزلت کی عملی پاس گزاری ہو، گویا بندگی کے فرائض کی ادائیگی (قنوت و سجدہ و رکوع) کا حکم جہاں عبدیت کے تقاضوں کو پورا کرنے سے تعلق رکھتا ہے وہاں خدا کی عطا کردہ منزلت و مرتبت کی نعمت کا شکر ادا کرنا بھی ہے۔

اس بناء پر آیت مبارکہ: ”يَسْزِيْمًا اِقْتَنِي لِرَبِّكَ وَاسْجُدْ بِنِي وَانْمَا كَعِي مَعَ الرَّكْعَيْنِ“ دراصل آیت مبارکہ: ”يَسْزِيْمًا اِنَّ اللّٰهَ اَصْطَفٰكَ وَطَهَّرَكَ وَاَصْطَفٰكَ عَلٰى نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ“ کی فرع اور مربوط نتیجہ کے طور پر ہوگی اور اس کا معنی یوں کیا جائے گا: اب جبکہ خداوند عالم نے تجھے جن لیا ہے اور پاک بنایا ہے اور تمام جہانوں کی خواتین پر تقدم بخشا ہے تو اب تو اس نعمت پر اپنے رب کے حضور فروتنی کے ساتھ فرمانبرداری اور سجدہ و رکوع کرتی رہے،

اور یہ بعید نہیں کہ زیر نظر آیت مبارکہ میں جو تین صفاتی امور ذکر کئے گئے ہیں یعنی قنوت، سجدہ، رکوع، وہ ان تین اعزازات کے ساتھ ترتیبی ربط رکھتے ہوں یعنی قنوت (اِقْتَنِي) اصطفاء کی فرع ہو (اَصْطَفٰكَ) سجدہ (وَاسْجُدْ بِنِي) پاک بنائے جانے کی فرع ہو (وَطَهَّرَكَ) اور رکوع (وَانْمَا كَعِي) دوسرے اصطفاء کی فرع ہو (وَاصْطَفٰكَ عَلٰى نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ)۔

البتہ یہ ربط نہایت خفی ہے اور اس کی بابت نہایت باریک بینی کی ضرورت ہے تاکہ ان میں سے ہر ایک کا دوسرے سے ربط واضح ہو سکے۔ (اس سلسلے میں تمام پہلوؤں سے آیات کی ترتیب و ترکیب اور جملہ بندی کی تمام کیفیتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے درمیان پائے جانے والے ربط سے ممکن حد تک آگاہی حاصل ہو سکتی ہے اور آیت مبارکہ میں پائی جانے والی نہایت خوبصورت ہمنگنی کے اسرار معلوم ہو سکتے ہیں)۔

## غیبی خبروں سے آگاہی دلانا

○ ” ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيْهِ اِلَيْكَ “  
(یہ غیبی خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں)

خداوند عالم نے اس تاریخی تذکرہ کو غیبی خبروں میں شمار کیا ہے اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے حضرت یوسفؑ کے واقعات کو غیبی خبروں کے طور پر حضرت پیغمبر اسلامؐ سے بیان کیا گیا، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۃ یوسف، آیت: ۱۰۲

○ ” ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اجْتَمَعُوا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْسِكُوْنَ “

(یہ سب غیبی خبریں ہیں جو ہم آپ پر وحی کرتے ہیں اور آپ تو اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ یوسف کے بارے میں فریب و سازش کر رہے تھے)

ان واقعات کی بابت جو مطالب اور معلومات اہل کتاب کے پاس ہیں وہ قابل اعتماد نہیں کیونکہ وہ تحریف کرنے والوں کی تحریفی کاروائیوں سے محفوظ نہیں رہیں جیسا کہ حضرت زکریاؑ کے تذکرہ میں جو تفصیلات اور اہم مطالب قرآن مجید میں مذکور ہیں وہ یہود و نصاریٰ کی کتب میں موجود نہیں۔ چنانچہ اس کا ثبوت آیت مبارکہ کے ذیلی جملہ ہی میں پایا جاتا ہے جس میں ارشاد خداوندی ہے: ” وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ ..... “ (اور آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ قرعہ اندازی کر رہے تھے.....)، اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ اور آپ کی قوم ان واقعات کا مشاہداتی علم نہ رکھتے تھے اور نہ ہی کتابوں میں ان کی تفصیل مذکور تھی جنہیں وہ پڑھتے، جیسا کہ حضرت نوحؑ کے واقعہ کا تذکرہ کرنے کے بعد خداوند عالم نے حضرت پیغمبر اسلامؐ سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا:

سورۃ ہود، آیت: ۴۹

○ ” تِلْكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيْهَا اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا “

(یہ غیبی خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں کہ آپ اور نہ ہی آپ کی قوم اس سے پہلے ان سے باخبر نہ تھی)

البتہ بظاہر پہلی وجہ (یعنی ان واقعات کو غیبی خبروں سے موسوم اور تعبیر کرنا) آیت کے سیاق سے زیادہ موزونیت رکھتی ہے..... کیونکہ اس میں یہ نکتہ ملحوظ ہے کہ خدا نے ارشاد فرمایا: آپ اس وقت موجود نہ تھے، یہ نہیں فرمایا کہ آپ نے ان واقعات کو پڑھا ہی نہیں ہے.....

## مریمؑ کی کفالت کی بابت قرعہ اندازی

○ ” وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذِ يُنْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ أَكْفُلٌ مَرْيَمَ.....“  
(اور آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ قرعہ اندازی کر رہے تھے کہ مریمؑ کی کفالت کون کرے)

آیت مبارکہ میں لفظ ”اقلام“ ذکر ہوا ہے (”أَقْلَامَهُمْ“)، یہ جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد ”قَلَمٌ“..... ق اور ل پر زبر کے ساتھ..... ہے، اس سے مراد وہ تیر ہے جو قرعہ اندازی میں استعمال ہوتا ہے، اسے عربی زبان میں ”سہم“ بھی کہتے ہیں، یہاں آیت میں ”يُنْقُونَ أَقْلَامَهُمْ“ کا معنی یہ ہے کہ وہ تیر پھینکتے تھے تاکہ ان کے ذریعہ قرعہ اندازی کر کے مریمؑ کی کفالت کرنے والے کا تعین کریں۔

اس آیت میں ان لوگوں کے درمیان باہمی نزاع و خصومت کہ جس کا تذکرہ جملہ ”وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذِ يُنْقُونَ“ میں ہوا ہے۔ اس سے مراد حضرت مریمؑ کی کفالت کی بابت ان کے درمیان پایا جانے والا اختلاف ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اس قدر نزاع کا شکار ہو گئے کہ بالآخر انہیں قرعہ اندازی کے ذریعے مسئلہ کو حل کرنے پر اتفاق کرنا پڑا، چنانچہ انہوں نے قرعہ اندازی کی اور قرعہ جناب زکریاؑ کے نام پر نکلا اور انہوں نے حضرت مریمؑ کی کفالت کی ذمہ داری سنبھالی، اسی کا تذکرہ اس جملہ میں ہوا: ”فكفلها زكريا.....“ (چنانچہ اس کی کفالت کی زکریا نے)۔

## ایک احتمالی نظریہ اور اس کا جواب

” إِذِ يُنْقُونَ“ میں جس خصومت و نزاع کا تذکرہ ہوا ہے اس کی بابت بعض مفسرین نے یہ رائے پیش کی ہے کہ عین ممکن ہے اس سے مراد یہ ہو کہ جب حضرت مریمؑ کا سن مبارک زیادہ ہو گیا اور وہ عالم طفولت سے تجاوز کر گئیں اور

حضرت زکریا ان کی مزید کفالت کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے سے ناتواں ہوئے تو لوگوں نے حضرت مریمؑ کی کفالت کی بابت شدید اختلاف سے دوچار ہونے کے بعد قرعہ اندازی کا فیصلہ کیا، اس احتمالی نظریہ کا سبب یہ ہے کہ لوگوں کے باہمی نزاع اور قرعہ اندازی کے فیصلہ کا ذکر حضرت مریمؑ کی ولادت اور انہیں خواتین عالم پرچن لئے جانے اور اس دوران حضرت زکریاؑ کی طرف سے ان کی کفالت کی ذمہ داری سنبھالنے کے تذکرہ کے بعد ہوا جس سے اس بات کا امکان نظر آتا ہے کہ کفالت کا مسئلہ دوبار پیش آیا، پہلی بار اس وقت جب وہ ایام طفولت میں عبادت خانہ میں آئیں اور دوسری بار جب وہ بڑی ہو گئیں تو حضرت زکریاؑ نے اس ذمہ داری سے فارغ ہونا چاہا، دوسری بار قرعہ کے ذریعے حضرت زکریاؑ ہی کا نام اس کام کے لئے سامنے آیا اور انہوں نے اس ذمہ داری کو سنبھالا۔

### جواب:

اس احتمالی نظریہ یا رائے کا جواب یہ ہے کہ کسی واقعہ کا ایک سورت میں دو مقامات پر ذکر کیا جانا اس امر کی دلیل نہیں بن سکتا کہ وہ واقعہ دوبار رونما ہوا ہے کیونکہ کسی واقعہ کی بعض خصوصیات کو دوبار ذکر کرنا یا اس سے متعلقہ کوئی بات دوسرے مقام پر بیان کرنا اس واقعہ کی مزید تاکید اور تاکید کی اثبات کے لئے بھی ہوتا ہے جیسا کہ حضرت یوسفؑ کے واقعہ کے تذکرہ میں ہوا ہے کہ اس کے کامل بیان کے بعد خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ”ذَلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْعَالَمِينَ نُوْحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ وَهُمْ يَكْتُمُونَ“ ..... سورہ یوسف، آیت ۱۰۲..... (یہ فیہی خبروں میں سے ہے جسے ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں، اور آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ باہم فیصلہ کر رہے تھے اور دھوکہ دہی میں مصروف تھے) جبکہ اس سے پہلے اس واقعہ کا تذکرہ آیات ۸، ۹ اور ۱۰ میں ہو چکا تھا۔ تو دوبارہ آیت ۱۰۲ میں اسے ذکر کرنا اس کی بعض خصوصیات کو بیان کرنے یا اصل واقعہ کی تاکید اور تاکید کی اثبات کی غرض سے ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریمؑ کے حوالہ سے ان کی کفالت کے تذکرہ میں واقعہ کی بابت بعض خصوصیات کا ذکر مقصود ہے اور حضرت یوسفؑ کے حوالہ سے ان کے واقعہ کا تاکید کی اثبات مطلوب ہے، حضرت یوسفؑ کے واقعہ کی بابت ابتدائی تذکرہ میں یوں ارشاد ہوا: سورہ یوسف، آیت ۱۰:

”إِذْ قَالُوا الْيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَيْنَا مِنَ أَخِيهِمَا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ..... لَا تَقْتُلُوا الْيُوسُفَ  
وَأَلْقُوهُ فِي غَيَابَتِ الْعَيْبَةِ يَلْتَمِظُهَا بَعْضُ السَّيَّارَةِ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ“

(جب انہوں نے کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی ہم میں سے ہمارے باپ کی نظر میں زیادہ عزیز و پسندیدہ ہیں جبکہ ہم سب ایک جیسے بھائی ہیں..... یوسف کو قتل نہ کرو بلکہ اسے کسی گہرے کنویں میں ڈال دو کہ اسے کوئی قافلہ نکال باہر کر کے

لے جائے گا اگر تمہیں کچھ کرنا ہے تو!)

## مریمؑ کو خدائی بشارت

○ ” اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ لَيٰرِيْمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ .....“  
(جب فرشتوں نے کہا: اے مریم، خدا تجھے بشارت دیتا ہے.....)

اس آیت میں حضرت مریمؑ کے لئے خدائی خوشخبری کا ذکر ہوا ہے، اور بظاہر اس سے مراد وہی خوشخبری ہے جس کا تذکرہ ایک اور مقام پر ان لفظوں میں ہوا:

سورہ مریم، آیت: ۱۹

○ ” فَارْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحًا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۙ اِذْ اَنْعَزْنَا عَلٰۤى مَرْيَمَ الْمَلٰٓئِكَةُ اَنْ كُنْتِ تَقِيًّا ۙ قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّكَ ۗ لَا هَبْ لَكَ عُلْمًا زَكِيًّا .....“

(تو ہم نے اس کی طرف اپنی روح بھیجی کہ جو مریم کے سامنے ایک کامل انسان کی صورت میں ظاہر ہوئی، مریم نے کہا کہ میں تجھ سے خدا کی پناہ چاہتی ہوں اگر تو متقی ہوتا تو یہاں نہ آتا، اس نے کہا (ہماری روح نے کہا) میں تیرے پروردگار کا پیام لایا ہوں تاکہ تجھے ایک پاکیزہ بچہ عطا کروں.....)

تو جو بشارت و خوشخبری زیر بحث آیت مبارکہ میں ذکر ہوئی ہے اور جس کی نسبت فرشتوں کی طرف دی گئی ہے (اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ.....) وہی بشارت و خوشخبری سورہ مریم کی آیت میں صرف ”روح“ کی طرف منسوب ہے۔

زیر نظر آیت مبارکہ میں فرشتوں (”ملائکہ“) کا لفظ کیوں ذکر ہوا، اس کی بابت مفسرین کرام نے مختلف آراء پیش کی ہیں، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اصل میں اس سے مراد جناب جبریلؑ ہیں اور ان کے لئے لفظ ”ملائکہ“ ان کی تعظیم و تکریم کی بناء پر استعمال ہوا ہے، اور یہ بعینہ اسی طرح سے ہے جیسے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص اپنے سفر میں کئی سواریوں پر سوار ہوا اور کئی کشتیوں پر سوار ہوا، جبکہ وہ صرف ایک سواری اور ایک کشتی پر سوار ہوا ہوتا ہے، یا عموماً یوں کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کے بارے میں لوگ اس طرح کہتے ہیں، جبکہ کہنے والا شخص ایک ہوتا ہے مگر اس کی نسبت تمام لوگوں کی طرف دی جاتی ہے، بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ اس طرح کی لفظی تعبیرات کے مختلف ہونے کی مثال سابق الذکر واقعہ میں بھی ملتی ہے جس میں حضرت زکریاؑ کے حوالہ سے مذکور ہے: ”فَتَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ“ (ملائکہ نے اسے آواز دی) پھر اس کے بعد ارشاد ہوا: ”كُنْ لَكَ“

اللَّهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ“ (اس نے کہا خدا اس طرح ہی کرتا ہے جو چاہتا ہے)۔

بعض مفسرین نے کہا کہ لفظ ملائکہ اس لئے ذکر ہوا ہے کہ حضرت مریمؑ کو بشارت دینے میں حضرت جبریلؑ کے ساتھ دیگر فرشتے بھی موجود تھے۔

لیکن ملائکہ کے بارے میں نازل ہونے والی آیات مبارکہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بارگاہ الہی میں قرب کے حوالہ سے ان کے درمیان فرق پایا جاتا ہے کہ ان میں کچھ مقدم ہیں اور کچھ مؤخر ہیں، جو مؤخر ہیں وہ مقدم فرشتوں کے اوامر کی پیروی اور سراپان کے پیچھے رہتے ہیں اور وہ اس طرح کہ مؤخر فرشتوں کا ہر کام بچینہ مقدم فرشتوں والا کام ہوتا ہے اور ان کی ہر بات مقدم فرشتوں والی بات ہی ہوتی ہے، گویا بچینہ اسی طرح سے جیسے ہم اپنے افعال کے بارے میں مشاہدہ کرتے ہیں اور یقین سے کہتے ہیں کہ یہ ہمارے افعال ہیں جبکہ وہ ہماری جسمانی قوتوں کے افعال تھے ہیں اور ہمارے اعضاء و جوارح کے افعال ہوتے ہیں اور ہم انہیں دو طرح کے افعال نہیں کہتے، یعنی ایسا نہیں کہ ہماری جسمانی قوتوں کے افعال اور ہمارے اعضاء و جوارح کے افعال کو الگ قسموں میں تقسیم کیا جائے، چنانچہ کہا جاتا ہے :

”رأيتہ عينای“ (میری آنکھوں نے اسے دیکھا)، اس میں دیکھنے کی نسبت آنکھوں کی طرف دی گئی ہے۔

”سمعتہ اذناى“ (میرے کانوں نے اسے سنا)، اس میں سننے کی نسبت کانوں کی طرف دی گئی ہے۔

ان نسبتوں کے ساتھ ساتھ یوں بھی کہا جاتا ہے:

”رأيتہ“ (میں نے اسے دیکھا)، اس میں دیکھنے کو خود اپنی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

”سمعتہ“ (میں نے اسے سنا)، اس میں سننے کو اپنی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

”فعلتہ جوارحى“ (میرے اعضاء نے وہ کام کیا)، اس میں انجام دینے کی نسبت اعضاء کی طرف دی گئی

ہے۔

”کتبتہ یدى“ (میرے ہاتھ نے اسے لکھا)، اس میں لکھنے کی نسبت ہاتھ کی طرف دی گئی ہے۔

”رسمتہ اناملى“ (میری انگلیوں نے اس پر نشان لگائے)، اس میں نشان لگانے کی نسبت کانوں کی طرف

دی گئی ہے۔ ان نسبتوں کے بارے میں یوں بھی کہا جاتا ہے:

”فعلتہ انا“ (میں نے اسے انجام دیا)،

”کتبتہ انا“ (میں نے اسے لکھا)۔

ان مثالوں میں اعضاء و جوارح کے افعال اور خود اپنے افعال کو دو طرح کے افعال نہیں کہا جاتا بلکہ وہ ایک ہی

ہر چشمہ سے مربوط ہوتے ہیں اور ایک ہی کہلاتے ہیں، اسی طرح مقدم فرشتوں کے افعال مؤخر فرشتوں سے مختلف نہیں

ہوتے بلکہ بعینہ وہی ہوتے ہیں ان کے درمیان کوئی تقسیمی فرق نہیں پایا جاتا اور نہ ہی ان کے اقوال کے درمیان کوئی تقسیمی فرق پایا جاتا ہے، گویا نہ تو مقدم فرشتوں کے افعال و اقوال و مؤخر فرشتوں سے مختلف ہوتے ہیں اور نہ ہی مؤخر فرشتوں کے افعال و اقوال مقدم فرشتوں کے افعال و اقوال سے مختلف ہوتے ہیں، اور یہ بعینہ اسی طرح سے ہے جیسے تمام فرشتوں کے افعال دراصل خدائی افعال کہلاتے ہیں اور ان کے اقوال خدائی اقوال کہلاتے ہیں اس کی قرآنی مثالیں ملاحظہ ہوں:

سورۃ زمر، آیت: ۴۲

○ ” اَللّٰهُ يَتَوَكَّلُ اِلَّا نَفْسٌ حَيِّنٌ مَّوْتِنًا“

(اللہ نفسوں کو پورا کرتا ہے۔۔ روحوں کو قبض کرتا ہے۔۔ ان کی موت کے وقت)

خدا نے اس آیت مبارکہ میں موت دینے کی نسبت خود اپنی طرف دی ہے۔

سورۃ سجدہ، آیت: ۱۱

○ ” قُلْ يَتَوَكَّلْكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ“

(کہہ دیجئے کہ تمہیں ملک الموت موت دیتا ہے وہ کہ جسے تم پر مقرر کیا گیا ہے)

اس آیت میں موت دینے کی نسبت ملک الموت کی طرف دی گئی ہے۔

سورۃ انعام، آیت: ۶۱

○ ” حَتّٰى اِذَا جَاءَ اَحَدَكُمْ الْمَوْتُ تَوَقَّفْتُمْ سُلْطٰنًا“

(یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی ایک کی موت کا وقت آ پہنچتا ہے تو اسے ہمارے فرشتے موت دیتے ہیں)

اس آیت میں موت دینے کی نسبت تمام فرشتوں کی طرف دی گئی ہے۔

وحی کی بابت بھی صورتحال اسی طرح کی ہے کہ کسی جگہ اپنی طرف منسوب کر کے ذکر کیا اور کسی جگہ فرشتوں کی طرف

نسبت دی، ملاحظہ ہو:

سورۃ نساء، آیت: ۱۶۳

○ ” اِنَّا اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ“

(ہم نے آپ کی طرف وحی کی) اس میں وحی کرنے کی نسبت خداوند عالم نے اپنی طرف دی ہے۔

سورۃ شعراء، آیت: ۱۹۴

○ ” نَزَّلْ بِهٖ الرُّوْحَ الْاَلَمِيْنُ ﴿۱۹۴﴾ عَلٰى قَلْبِكَ“

(اسے روح الامین نے میرے دل میں اتارا ہے) اس میں وحی کی نسبت حضرت جبریلؑ کی طرف دی

گئی ہے۔

سورۃ بقرہ، آیت: ۹۷

○ ” مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰی قَلْبِكَ

(کون ہے جو جبریل کا دشمن ہے، وہی تو ہے جس نے قرآن کو تیرے دل پر اتارا ہے)

سورۃ یحییٰ، آیت: ۱۶

○ ” كَلَّا اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۙ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرْهَا ۙ فِي صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۙ مَرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۙ لَا يُاَيِسُ مِنْ

سَفَرَةٍ ۙ كَمَا اُوْبِرَ سَاقٍ ۙ ”

(ایسا ہرگز نہیں، یہ تو کھلی نصیحت ہے، جو چاہے اسے ذکر کرے، یہ نصیحت پاکیزہ صحیفوں میں ہے، جو کہ بلند

مرتبہ و پاک ہیں، با عظمت و صالح نمائندوں کے ہاتھوں سے لکھی ہوئی ہے)

مذکورہ بالا آیات مبارکہ کے تناظر میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت جبریلؑ کا حضرت مریمؑ کو بشارت

دینا ان کے زیر دست ملائکہ کا بشارت دینا ہی کہلاتا ہے کیونکہ یہ سرداران ملائکہ اور ان میں سے مقرب ترین فرشتوں میں سے

ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ان کے بارے میں واضح الفاظ میں مذکور ہے:

سورۃ تکویر، آیت ۱۹ تا ۲۱

○ ” اِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۙ ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۙ مُّطَآءٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ”

(وہ بیان ہے ایک نمائندہ الہی کا، جو با عظمت ہے، قوی ہے، عرش والے کے ہاں بلند مرتبہ والا ہے، اس کی

فرماں برداری کی جاتی ہے اور وہ امانت دار ہے)

ہمارے مذکورہ بیان کی تائید زیر بحث آیہ مبارکہ کے بعد والی آیت سے ہوتی ہے جس میں ارشاد حق تعالیٰ ہے:

” قَالَ كَذٰلِكَ اَللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ” (اس نے کہا، اسی طرح خدا کرتا ہے جو چاہتا ہے) اس میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا

ہے کہ ”قَالَ“ (اس نے کہا) کا فاعل یعنی کہنے والا خداوند عالم ہے جبکہ یہی بات سورۃ مریم میں روح الامین کی طرف

منسوب ہے۔ (ملاحظہ ہو)۔

سورۃ مریم، آیت: ۲۱

○ ” قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلٌ رَّبِّكَ ۙ اِلَّا هَبْ لَكَ عَلَمًا زَكِيًّا ۙ قَالَتْ اَنْتَ اَنْتَ يٰكُوْنُ لِيْ عِلْمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ

بَشَرًا وَّلَمْ اَكْ بَغِيًّا ۙ قَالَ كَذٰلِكَ ۙ قَالَ رَبُّنَا هُوَ عَلٰى هٰٓهٖنَ ..... ”

(اس نے کہا میں تیرے رب کا بھیجا ہوا نمائندہ ہوں تاکہ تجھے ایک پاکیزہ بچہ عطا کروں، مریم نے کہا میرے



ہاں بچہ کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ مجھے کسی انسان نے چھوا ہی نہیں ہے اور نہ ہی میں معصیت کار ہوں، اس نے کہا ایسا ہی ہے، تیرا رب کہتا ہے کہ یہ کام میرے لئے آسان ہے)۔

فرشتوں اور روح الامین کا حضرت مریمؑ سے گفتگو کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ بی بی، محدثہ تھیں، بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ ان کے بارے میں سورہ مریم میں واضح الفاظ موجود ہیں جن میں کہا گیا ہے: "فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا" (سورہ مریم، آیت ۱۷)۔ ان لفظوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف فرشتوں کی آواز ہی نہیں سنتی تھیں بلکہ انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھتی بھی تھیں، اس موضوع کی بابت مزید مطالب عنقریب "روایات پر ایک نظر" میں پیش کئے جائیں گے، انشاء اللہ تعالیٰ،

### کلمہ خدا

○ "بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ"  
(اپنے کلمہ سے کہ جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہے)

خداوند عالم کے کلام کی بابت سورہ بقرہ، آیت ۲۵۳ (تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ) کی تفسیر میں مربوط مطالب بیان ہو چکے ہیں۔

الفاظ "کلمہ" اور "کلم"، "تمرہ" اور "تمر" کی طرح ہیں۔ پہلا لفظ "کلمہ، تمرہ" جنس کے لئے اور دوسرا لفظ "کلم، تمر" واحد مفرد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

لفظ "کلمہ" کبھی ایک یا معنی لفظ کے لئے استعمال ہوتا ہے اور کبھی پورے جملہ کو کلمہ کہا جاتا ہے خواہ وہ جملہ تامہ ہو یا ناقصہ، یعنی حکم کا ادائے جملہ کے بعد خاموش ہو جانا صحیح ہو جیسے "زید قائم"، خواہ صحیح نہ ہو جیسے "ان کان زید قائم"، یہ اس کی لغوی حیثیت ہے، اور جہاں تک اس کی قرآنی اصطلاح کا تعلق ہے یعنی وہ کلمہ جس کی نسبت خداوند عالم کی طرف ہے تو اس سے مراد ہر وہ شے ہے جس سے خدا کا ارادہ ظاہر ہو، یعنی ارادہ خداوندی کے مظہر کو "کلمہ" کہتے ہیں، خواہ وہ کلمہ ایجاد و تکوین سے تعلق رکھتا ہو جیسے خدا کا کسی چیز کو جو عطا کرنے میں "کن"، کہنا، یا وہ کلمہ وحی والہام وغیرہ ہو۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آیت مبارکہ میں "کلمہ" سے کیا مراد ہے؟ تو اس سلسلہ میں مختلف اقوال ہیں مثلاً:

(۱) اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں کیونکہ ان سے ما قبل انبیاء یا بالخصوص انبیاء بنی اسرائیل نے ان کے

بارے میں خوشخبری دی کہ وہ بنی اسرائیل کے نجات دہندہ بن کر آئیں گے، چنانچہ اس کے مشابہ مورد میں کہا جاتا ہے: ”ہلذہ کلمتی التی کنت اقولہا“ کہ یہ میرا کلمہ (کلام) ہے کہ جسے میں کہتا تھا، اور اس کی قرآنی مثال درج ذیل آیت میں بھی پائی جاتی ہے:

سورہ اعراف، آیت: ۱۳۷

○ ”وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا“

(اور تیرے پروردگار کا اچھا کلمہ پورا ہوا بنی اسرائیل کی بابت ان کے صبر کرنے کی وجہ سے!)

لیکن یہ قول درست نہیں کیونکہ اس کی تصدیق کتب عہدین سے تو ہو سکتی ہے مگر قرآن مجید میں اس حوالہ سے ثبوت فراہم نہیں ہوتا بلکہ قرآن مجید حضرت عیسیٰؑ کو خوشخبری دینے والا قرار دیتا ہے نہ کہ وہ جس کے بارے میں خوشخبری دی گئی ہو، اس کے علاوہ آیت کے الفاظ ”اَسْمَةُ الْمَسِيحِ“ بھی اس قول کی صحت کو یقینی نہیں بناتے کیونکہ ان الفاظ سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ”کلمہ“ اس عیسیٰؑ کے ظہور کا عنوان ہے جس کے بارے میں پہلے خبر دی گئی نہ کہ خود عیسیٰؑ مراد ہیں، اور لفظ ”اَسْمَةُ الْمَسِيحِ“ سے مراد یہ ہے کہ ”مسیح“ اس کلمہ کا نام ہے نہ کہ اس کا نام جس کے بارے میں لفظ ”کلمہ“ استعمال ہو چکا ہے۔

(۲) ”کلمہ“ سے مراد عیسیٰؑ ہیں کیونکہ وہی تورات کے ان معانی کو واضح طور پر بیان کرنے والے ہیں جو خداوند عالم نے اس میں مراد لئے ہیں، اور وہ ان حقائق کو آشکار کرنے والے ہیں جن کی بابت یہودیوں نے تحریفیں کیں اور دینی امور میں اختلاف پیدا کر دیا جیسا کہ اس سلسلہ میں خداوند عالم نے عیسیٰؑ کا قول ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے بنی اسرائیل سے مخاطب ہو کر کہا: ”وَلَا يَبَيِّنْ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلَفُونَ فِيهِ“ ..... سورہ زخرف، آیت ۶۳..... (اور میں ان چیزوں کو واضح کر دوں گا جن کی بابت تم آپس میں اختلاف رائے رکھتے ہو)۔

اس قول میں اگرچہ ”کلمہ“ کی بابت جو توجیہ و تاویل پائی جاتی ہے وہ درست نظر آتی ہے لیکن آیت مبارکہ میں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں جس سے اس توجیہ کی تصدیق و تائید ہو سکے۔

(۳) ”کلمہ“ سے مراد اصل خوشخبری ہے اور وہ یہ کہ حضرت مریمؑ کو بتایا گیا کہ وہ حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کی ماں بننے والی ہیں اور آنجنابؑ کی ولادت آپ کے بطن مبارک سے ہوگی، اس بناء پر جملہ ”بیشروک بکلمة منه“ (وہ تجھے اپنے کلمہ کی خوشخبری دیتا ہے) کا معنی یہ ہوگا کہ: ”بیشروک بيشارة هي انك ستلدین عیسیٰ من غیر دون مس بشر“ (وہ تجھے خوشخبری دیتا ہے کہ تو کسی بھی انسان سے مباشرت کے بغیر عیسیٰؑ کو جنم دے گی)۔

لیکن یہ قول بھی صحیح نہیں کیونکہ آیت کے ذیل میں ارشاد ہوا: ”اَسْمَةُ الْمَسِيحِ“ (اس کا نام مسیح ہے)، لہذا

اس سے اصل خوشخبری مراد لینا قرین صحت نہیں۔

(۴) ”کلمہ“ سے مراد حضرت عیسیٰ ہی ہیں کیونکہ وہی کلمہ ایجاد ہیں یعنی وہ کلمہ ”کن“ کا مصداق ہیں، اور انہیں ”کلمہ“ سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے ہر انسان بلکہ ہر ذی وجود (موجودات عالم کا ہر فرد کلمہ ”کن“ کا مصداق ہے اور اس کا وجود میں آنا خداوند عالم کے نظام تکوین کا مظہر بلکہ شاہکار ہے یعنی اسے لفظ ”کن“ کے ذریعے وجود عطا ہوا، اور چونکہ تمام موجودات اسی نظام سے وابستہ ہیں کہ ان کا وجود میں آنا ایک خاص کیفیت کے ساتھ ہوتا ہے، چنانچہ انسان کی پیدائش کی بابت جو عام طریقہ معین ہے وہ مرد و عورت کی مقابرت و مباشرت ہے جس کے ذریعے دونوں کے نطفوں کی آمیزش ہوتی ہے یعنی مرد کا نطفہ عورت کے نطفہ سے آمیختہ ہوتا ہے جس سے بچہ پیدا ہونے کی نسبت قائم ہوتی ہے، تو یہ اسی طرح سے ہے جیسے دیگر امور و اشیاء کی نسبت ان کے اسباب کی طرف ہوتی ہے، لیکن حضرت عیسیٰ کی بابت ایسا نہیں ہوا اور ان کی ولادت مرد و عورت کے نطفوں کی آمیزش کے نتیجہ میں نہیں ہوئی اور نہ ہی معمول کے دیگر اسباب کا اس میں عمل دخل تھا لہذا ان کا وجود پذیر ہونا ہر طرح کے عادی و مادی اسباب کی عملداری کے بغیر صرف اور صرف کلمہ تکوین یعنی ”کن“ کے ذریعے ہوا تو اس لحاظ سے انہیں اصل ”کلمہ“ (کن) کہنا درست ہے کہ وہ خود ہی ”کلمہ“ ہیں چنانچہ اس کی تائید درج ذیل آیت مبارکہ سے بھی ہوتی ہے:

سورہ نساء، آیت: ۱۷۱

○ ”وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرَمَتْهُ“

(اور وہ خدا کا کلمہ ہے جسے اس نے مریم پر القاء کیا ہے اور وہ اس کی روح ہے)

اس کے ساتھ ساتھ زیر بحث آیت مبارکہ کے تسلسل میں آخری آیت کے الفاظ سے بھی اس قول کی تائید ہوتی ہے جن میں کہا گیا ہے: ”إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ“ (خدا کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم جیسی ہے جسے خدا نے مٹی سے پیدا کیا پھر اس سے کہا: ہو جا، تو وہ ہو گیا)۔

یہ قول یا تو وجہ و تاویل بظاہر دیگر اقوال و توجیہات میں سب سے بہتر ہے۔

تاہم اس موضوع کی بابت مزید غور و فکر کی ضرورت ہے اور آیات مبارکہ کے صدر و ذیل کے تناظر میں اصل حقائق

سے آگاہی کا حصول ممکن ہے۔ م

## لفظ ”مسح“ کی بحث

لفظ ”مسح“ کا معنی ”ممسوح“ (چھوا ہوا) ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس نام سے موسوم کئے جانے کی بابت چند وجوہ قابل تصور ہیں:

(۱) وہ خیر و برکت کا مرقع تھے لہذا انہیں مسح کے نام سے موسوم کرنا موزوں ہے۔

(۲) وہ تمام گناہوں سے پاک ہونے کی صفت کے حامل قرار دیئے گئے، اس لئے انہیں ”مسح“، بمعنی ممسوح کہا

جاتا ہے۔

(۳) زیتون کا تیل ان کے پورے بدن پر ملا گیا جس سے وہ بابرکت ہو گئے جیسا کہ دیگر انبیاء علیہم السلام زیتون

کا تیل بدن پر لگاتے تھے۔

(۴) ان کی ولادت کے وقت حضرت جبریلؑ نے اپنا پران کے بدن سے مس کیا تاکہ وہ شیطان کے شر سے محفوظ

رہیں۔

(۵) وہ ہمیشہ یتیموں کے سروں پر ہاتھ پھیرتے تھے لہذا انہیں مسح کہا جاتا ہے۔

(۶) وہ نابینا افراد کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے تھے جس سے وہ بینا ہو جاتے تھے، اسی مناسبت سے انہیں مسح کہا

گیا۔

(۷) وہ جس بیمار شخص کے بدن پر ہاتھ پھیرتے تھے وہ شفا یاب ہو جاتا تھا لہذا انہیں ”مسح“ یا مسحا کہا جانے لگا۔

یہ سب تاویلیں لفظ ”مسح“ کی بابت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس لفظ سے موسوم کرنے کے حوالہ سے ذکر کی گئی ہیں اور ان کی بابت مختلف دلائل بھی پیش کئے گئے ہیں لیکن اس حوالہ سے جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ کہ یہ لفظ اس بشارت و خوشخبری کے ضمن میں موجود تھا جو حضرت جبریلؑ نے حضرت مریم علیہا السلام کو دی، چنانچہ قرآن مجید میں واضح الفاظ موجود ہیں: ”إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ“ (خدا تجھے اپنے کلمہ کی خوشخبری دیتا ہے کہ جس کا نام مسح عیسیٰ بن مریم ہے)۔ ان الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے قبل خداوند عالم نے انہیں ”مسح“ سے موسوم فرمایا، تو اس لفظ کا تعلق نابینا شخص کو بینا کرنے یا بیمار شخص کو شفا یاب کرنے سے نہیں.....

اور یہ لفظ (مسح) جو کہ عربی زبان میں ہے عبرانی زبان میں ”مشحا“ ہے، گویا عبرانی سے عربی میں مسح ہوا ہے

جیسا کہ کتب العہدین سے ثابت ہے، یعنی ان میں مہیجا ذکر ہوا ہے۔

اور تاریخ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے ہاں رسم تھی کہ جب بھی ان کے بادشاہ کی تاجپوشی ہوتی تھی تو ان کے علماء سے مقدس تیل لگاتے تھے (مسح کرتے تھے) تاکہ اس کی سلطنت بابرکت ہو، اس لحاظ سے اسے میجا (مہیجا) کہا جاتا تھا کہ جس کا معنی یا تو ”بادشاہ“ ہے یا ”برکت والا“ ہے۔

اور بنی اسرائیل کی کتب سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو اس لئے ”میجا“ سے موسوم کیا گیا کہ ان کی آمد کی خوشخبری میں ان کے حاکم ہونے کا حوالہ بھی موجود تھا اور یہ بھی مذکور تھا کہ عنقریب بنی اسرائیل میں ایک حاکم (بادشاہ) ظاہر ہوگا جو ان کا نجات دہندہ ہوگا، چنانچہ انجیل لوقا میں حضرت مریمؑ کی بشارت کے تذکرہ میں واضح طور پر بیان ہوا ہے کہ جب فرشتہ حضرت مریمؑ کے پاس آیا اور ان سے کہا: ”السلام علیک یا ممتلیة نعمة الرب معک مبارکة انت فی النساء“ سلام ہو آپ پر اے اپنے پروردگار کی نعمت سے سرشار ہستی، آپ خواتین میں برکت والی شخصیت ہیں، جب حضرت مریمؑ نے فرشتہ کو دیکھا تو اس کی بات سن کر ششدر رہ گئیں اور سوچ میں پڑ گئیں کہ اس سلام کا مطلب کیا ہے؟ فرشتہ نے کہا: ”لا تخافی یا مریم فقد ظفرت بنعمة من عند الله وانت تحبلین و تلدین ابناً وتدعین اسمہ یسوع، هذا یكون عظیماً وابن العلی یدعی و یعطیہ الرب لہ کرسی داود ابیہ و یملک علی بیت یعقوب الی الابد ولا یكون لملکہ انقضاء“ آپ گھبرائیں نہیں اے مریم! آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت سے بہرہ مند ہوئی ہیں، آپ حاملہ ہوں گی اور ایک بیٹا جنم دیں گی اور اس کا نام ”یسوع“ رکھیں گی، وہ بچہ عظیم ہستی بنے گا یہاں تک کہ اسے خدا کا بیٹا سمجھا جانے لگے گا اور اس کا پروردگار اسے اس کے باپ داؤد کی کرسی سلطنت عطا کرے گا، وہ ابد تک بیت یعقوب پر حکمرانی کرے گا اور اس کی سلطنت کبھی ختم نہ ہوگی، (لوقا، ۱-۳۴)

انجیل لوقا میں مذکور اس بشارت کی وجہ سے یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کو قبول کرنے میں لیت وعل سے کام لیا کیونکہ اس بشارت میں ان کی سلطنت و حکمرانی کا حوالہ تھا کہ جس کی تطبیق حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام پر نہ ہوتی تھی کیونکہ وہ اپنی دعوت الہی کے ایام میں اور اپنی زندگی بھر سلطنت و حکمرانی نہ پاسکے، (اس بناء پر یہودیوں نے کہا کہ خدائی بشارت میں جو بات ذکر ہوئی ہے وہ ان میں نہیں پائی جاتی لہذا یہ وہ شخص نہیں جس کے بارے میں بشارت آئی ہے)۔ چنانچہ اس بشارت کی توجیہ تاویل کرتے ہوئے نصاریٰ اور ان کی پیروی میں بعض مسلمان مفسرین نے بھی کہہ دیا کہ ان کی سلطنت و حاکمیت سے مراد ظاہری حکمرانی نہیں بلکہ معنوی و روحانی حاکمیت مقصود ہے۔

یہ توجیہ تاویل قرین صحت ہو سکتی ہے کیونکہ خدائی بشارت میں حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کو ”مسح“ سے موسوم کیا گیا ہے جس کا معنی ”برکت والا“ ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل کے ہاں مقدس تیل لگایا جاتا برکت کے حصول کے لئے ہوتا تھا، اور اس کی

تصدیق درج ذیل آیت مبارکہ سے بھی ہوتی ہے:

سورہ مریم، آیت: ۳۱

○ ” قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ ۖ آتَنِي الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ۖ وَجَعَلَنِي مُبْرَكًا ۖ آيِنَ مَا كُنْتُ “

(اس نے کہا میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب عطا کی اور مجھے نبی بنایا ہے اور میں جہاں بھی رہوں اس

نے مجھے بابرکت بنایا ہے)

### لفظ ”عیسیٰ“ کی وضاحت

آیت میں لفظ ”عیسیٰ“ ذکر ہوا ہے (اسْمُهُ الْمَسِيحُ عَيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ)، یہ اصل میں ”یشوع“ ہے، اس کا معنی مخلص و تجات دہندہ کیا گیا ہے، بعض روایات میں اسے ”یسعیس“ سے تفسیر کیا گیا ہے جس کا معنی ہے: زندہ رہے گا، اور یہ حضرت زکریا کے فرزند کے نام سے مشابہت رکھنے سے موزوں نظر آتا ہے کیونکہ ان کا نام ”یحییٰ“ ہے جس کا معنی: ”زندہ رہے گا“ ہے۔ اس حوالہ سے سابق الذکر مطالب میں بیان ہو چکا ہے کہ ان دونوں (حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ) کے درمیان کامل شباهت پائی جاتی ہے۔

اور آیت مبارکہ میں اگرچہ حضرت مریمؑ سے خطاب ہے اور انہیں ہی خدائی بشارت میں مخاطب قرار دیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ مریمؑ کا لفظ ذکر کیا گیا اور کہا گیا: اسْمُهُ الْمَسِيحُ عَيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ، (اس کا نام مسیح ہے جو عیسیٰ بن مریم ہے) تو اس کا مطلب اس امر سے آگاہی دلانا ہے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوا ہے اور وہ اسی نسبت سے پہچانا جائے گا، اور مریمؑ اس اعجازی امر میں اس کی شریک ہیں، چنانچہ درج ذیل آیت اس سلسلہ میں واضح سند ہے:

سورہ انبیاء، آیت: ۹۱

○ ” وَجَعَلْنَاهَا وَاٰبَنَهَا آيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ “

(اور ہم نے اسے اور اس کے بیٹے کو عالمین کے لئے نشانی بنا دیا)

اس آیت میں دونوں (ماں، بیٹا) کو کائنات میں خدا کی قدرت کی نشانی قرار دیا گیا ہے۔

## دنیا و آخرت میں عزت و تکریم

○ ”وَجِبَتْهَا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ“  
(دنیا اور آخرت میں با احترام، اور مقرب بندوں میں سے !)

وجاہت کا معنی مقبولیت ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دنیا میں مقبول ہونا ایک واضح امر ہے، اسی طرح آخرت میں بھی وہ مقبول ہوں گے چنانچہ اس سلسلہ میں قرآن مجید کی نص اور صریح بیان موجود ہے۔  
اور ان کا مقربین میں سے ہونا بھی واضح حقیقت ہے کہ وہ اللہ کے نزدیک مقرب ہیں کیونکہ وہ اولیاء الہی کی صف میں داخل ہیں اور تقرب کے حوالہ سے ملائکہ، مقربین کے ساتھ ان کا ذکر درج ذیل آیت میں ہوا ہے:

سورہ نساء، آیت: ۱۷۲

○ ”لَنْ نَسْتَنْفِكَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ“  
(مسیح خدا کا عبد ہونے سے ہرگز سرتابی نہ کرے گا اور نہ ہی ملائکہ، مقربین !)

اور تقرب کا معنی واضح کرتے ہوئے خداوند عالم نے سورہ واقعہ آیات ۱۱-۱۰ میں اس طرح ارشاد فرمایا:

○ ”إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ..... وَكُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً..... وَالسَّبِقُونَ السَّبِقُونَ ۗ أُولَٰئِكَ الْمُقَرَّبُونَ“

(جب قیامت آئے گی..... اور تم تین گروہ ہو گے..... اور جو سب سے پہلے ہیں وہی مقرب ہیں)

ان آیات مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ تقرب سے مراد تقرب الہی ہے یعنی بارگاہ رب العزت میں مقرب ہونا مقصود ہے اور اس کی حقیقت یوں ہے کہ کوئی شخص خدا کے راستہ کی طرف پلٹ جانے کے عمل میں اپنے دیگر ہم نوع افراد پر سبقت لے جائے کہ اس عمل کا اختیار کرنا ہر انسان بلکہ ہر چیز پر فطر تا لازم قرار دیا گیا ہے چنانچہ درج ذیل آیات مبارکہ میں اس حوالہ سے واضح اعلان موجود ہے:

سورہ الشقاق، آیت: ۶

○ ”يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدًّا حَافِئًا لِقِيَّهِ“

(اے انسان! تو اپنے پروردگار تک پہنچنے میں کوشاں ہے تو ضرور اس کے حضور شرفیاب ہوگا)

سورۃ شوری، آیت: ۵۳

○ ” اَلَا اِلٰى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْمِ ”

(یاد رکھو، تمام امور کی بازگشت اللہ کی طرف ہے)

اگر آپ مذکورہ بالا آیات میں بخوبی غور و فکر کریں اور ان میں مذکور مقربین کی بابت توجہ کریں جو کہ انسان اور افراد ملائکہ کی صفت ہے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ضروری نہیں کہ یہ صفت اکتسابی مقام و منزلت ہو کیونکہ فرشتوں کو خداوند عالم کے نزدیک جو مقام و منزلت اور مرتبت حاصل ہے وہ ان کی اکتسابی نہیں کہ جس کی بناء پر ان میں سے کچھ افراد مقرب اور کچھ غیر مقرب قرار پائیں، شاید اس حوالہ سے یہ کہا جاسکے کہ مقرب بارگاہ الہی ہونا فرشتوں کی بابت خدائی عطا و عنایت سے ہو جبکہ انسان کی بابت اس کے عمل کی بنیاد پر ہے۔

یہاں ایک ادبی نکتہ قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ اس آیت میں درج ذیل چند جملے حالیہ ہیں:

(۱) ” وَجِبْتَنِي فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ” (دنیا اور آخرت میں با احترام)

اور جو جملے اس کے بعد اس پر عطف ہوئے ہیں:

(۲) ” وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ” (اور مقرب بندوں میں سے)

(۳) ” وَيُكَلِّمُ ” (اور وہ کلام کرتا ہے)

(۴) ” وَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ” (اور نیک لوگوں میں سے)

(۵) ” وَيُعَلِّمُهُ ” (اور وہ اسے تعلیم دیتا ہے)

(۶) ” وَرَسُوْلًا ” (اور رسول بنا کر)

بچپن اور بڑھاپے میں گویائی کا بیان

○ ” وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ”

(اور وہ گہوارہ میں رہتے ہوئے اور بڑھاپے میں لوگوں سے باتیں کرے گا)

”مہد“ اس بستر کو کہتے ہیں جو شیر خوار بچہ کے لئے بنایا جاتا ہے (جھولا)

”کھال“ کہولت سے بنا ہے جس کا معنی بوڑھا پن ہے اور وہ جوانی و بڑھاپا کی درمیانی مدت کو کہتے ہیں (خستہ)



سنی)، اور اس میں انسان کامل و مکمل اور طاقتور مرد بن چکا ہوتا ہے، اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ”کھل“ اس شخص کو کہتے ہیں جس کی جوانی و پیری مخلوط ہو جائے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ ”کھل“ اسے کہتے ہیں جس کا سن ۳۳ سال کا ہو۔

بہر حال آیت مبارکہ میں یہ ثبوت پایا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہولت کے سن تک زندہ رہیں گے تو گویا یہ بات حضرت مریمؑ کے لئے دوسری خوشخبری تھی۔

اب جبکہ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سن کہولت تک پہنچنے کا صریح بیان موجود ہے لیکن تمام انجیلوں میں واضح طور پر مذکور ہے کہ آنجنابؑ ۳۳ برس سے زیادہ زندہ نہیں رہے تو اس میں مزید غور و فکر کی ضرورت ہے، چنانچہ اس حوالہ سے کہا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا سن کہولت میں لوگوں سے باتیں کرنا، آسمان سے واپس آنے کے بعد ہے کیونکہ وہ آسمان پر جانے سے پہلے سن کہولت کو پہنچ ہی نہ تھے۔ اس سلسلہ میں ایک قول یہ بھی ہے کہ تاریخ کی کتب میں اس حوالہ سے اچھی طرح چھان بین اور تحقیق کے بعد ثابت ہوتا ہے کہ انجیلوں کی تصریحات کے برعکس آنجنابؑ نے تقریباً ۶۴ برس زمین میں زندگی گزاری۔

البتہ آیت مبارکہ میں جملہ (فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا) کے سیاق سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آنجنابؑ بڑھاپا کے سن کو نہ پہنچیں گے بلکہ کہولت کے سن تک زمین میں زندہ رہیں گے اور لوگوں سے ہم کلام ہونے کا دوران یہ بچپن سے بڑھاپے تک پہنچنے سے پہلے تک ہوگا یعنی اس کی ابتداء بچپن کے ایام اور انتہاء کہولت کے ایام ہیں۔

عام طور پر ”بچہ کا گہوارہ میں ہونا“ کا معنی یہ سمجھا جاتا ہے کہ پیدائش کے بعد اور چلنے پھرنے کے قابل ہونے سے پہلے کے دوران یہ میں اسے جھولے میں رکھا جاتا ہے یعنی دو سال کے لگ بھگ وہ جھولے میں ہوتا ہے اور اس کے بعد درست بات کرنے کا سن شروع ہوتا ہے، بنا برائیں بچہ کا جھولا میں کلام اور درست باتیں کرنا اگرچہ خارق العادت یعنی معجزاتی امر نہیں لیکن آیت مبارکہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان کا جھولے میں رہنے کے دوران یہ میں مکمل کلام کرنا مذکور ہے کہ جسے عقلاء اسی طرح قابل اعتناء سمجھتے ہیں جس طرح سن کہولت میں کی جانے والی باتوں کو قابل اعتناء سمجھتے ہیں، دوسرے لفظوں میں یہ کہ آیت اس مطلب کو بیان کر رہی ہے کہ وہ لوگوں سے گہوارہ میں رہتے ہوئے اسی طرح باتیں کرے گا جس طرح سن کہولت میں ان سے باتیں کرے گا، اس کا جھولے میں رہتے ہوئے باتیں کرنا کہولت کے سن میں باتیں کرنے کی طرح ہوگا، تو ظاہر ہے کہ یہ بات معجزہ سے کم نہیں بلکہ یقیناً ایک خارق العادت امر ہے کہ بچہ دونوں دوران یہ میں یکساں صورت میں کلام کرے۔

اس کے علاوہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نازل ہونے والی وہ آیات مبارکہ جو سورۃ مریم میں ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنجنابؑ نے اپنی ولادت کے بعد پہلی گھڑیوں ہی میں لوگوں سے کامل و درست کلام کیا جبکہ آپؑ ابھی

جھولے میں تھے، تو کسی بچہ کا اس لمحہ کامل کلام کرنا یقینی طور پر معجزہ اور غیر معمولی و خارق العادت امر ہے، چنانچہ اس حوالہ سے درج ذیل آیات مبارکہ میں واضح و صریح لفظوں میں ان کالوگوں سے ہم کلام ہونا مذکور ہے:

سورہ مریم، آیات ۲۷ تا ۳۱:

○ ” فَاتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا خَبْلَهُ ۗ قَالَ اِلٰهِيَ رَبِّيَ ۗ اِنِّىۡٓ اَنْتَۢمُ الْمُرْسَلُوْنَ ۗ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا فَرِيًّا ۙ ﴿۳۱﴾ يَاۡحٰتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوۡلِكَ اَمْرًا سَوْءًا ۗ وَمَا كَانَتْ اُمَّلِكَ بِنَعِيَّا ۙ ﴿۳۲﴾ فَاَشَارَتْ اِلَيْهٖ ۗ قَالَ وَاكَيْفَ نَكْلِمُ مَنْ كَانَ فِىۡ الْاَهْمَدِ صَبِيًّا ۙ ﴿۳۳﴾ قَالَ اِنِّىۡٓ عَبْدُ اللّٰهِ ۙ اَتٰنِى الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِىۡ نَبِيًّا ۙ ﴿۳۴﴾ وَجَعَلَنِىۡ مُبْرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۙ ”

(وہ بچہ کو اٹھا کر اپنی قوم کے پاس آئی تو لوگوں نے کہا: اے مریم تو نے نہایت برا کام کیا ہے، اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ ہی تیری ماں بدکار تھی، تو مریم نے بچے کی طرف اشارہ کیا، انہوں نے کہا ہم اس بچہ سے کیونکر بات کریں جو ابھی جھولے میں ہے، بچہ بول پڑا اور کہنے لگا: میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا اور مجھے بابرکت قرار دیا میں جہاں کہیں بھی ہوں)

مریمؑ کا خوشخبری سننے کے بعد اظہار یہ

○ ” قَالَتْ رَبِّ اَنْىۡٓ يَكُوْنُ لىۡٓ وَ لَدٰىكَ وَاَنْتَۢمُ يَكْسِبُوْنَ اَبْسًا ۙ ”  
(اس نے کہا: پروردگارا! مجھے بیٹا کیونکر ہوگا جبکہ مجھے کسی انسان نے چھوا ہی نہیں)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مریمؑ نے خدا سے بات کی جبکہ ان سے روح الامین مخاطب وہم کلام ہوئے تھے اور انہوں نے بشارت دی تھی لیکن آپؑ نے روح الامین سے بات کرنے کی بجائے خدا سے براہ راست بات کی اور کہا: پروردگارا! میرے ہاں بیٹا کس طرح پیدا ہوگا جبکہ مجھے تو کسی بشر نے ہاتھ تک نہیں لگایا ہے، تو حضرت مریمؑ کا ایسا کرنا دراصل اسی بناء پر تھا جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ملائکہ اور روح الامین کا کلام کرنا حقیقت میں خدا کا کلام کرنا ہوتا ہے کیونکہ وہ خدا کے ترجمان ہیں اور حضرت مریمؑ اس امر سے پوری طرح آگاہ تھیں کہ حقیقت میں ان سے بات کرنے والا خدا ہے اور فرشتے یا روح الامین خدا کے نمائندے اور اس کے ترجمان کی حیثیت میں اس سے گویا ہوئے ہیں، لہذا حضرت مریمؑ نے ان کے جواب میں ان سے مخاطب ہونے کی بجائے ”رب“ کہہ کر خدا سے بات کی۔

تاہم اس سلسلہ میں ایک احتمالی رائے یہ بھی پیش کی گئی ہے کہ ممکن ہے حضرت مریمؑ کی بات اس استغاثہ و فریاد کی صورت میں ہو جو گفتگو و اظہارِ سخن کے درمیان میں ہوتی ہے جس طرح درج ذیل آیت میں ہے:

سورۃ مؤمنون، آیت: ۹۹

○ "قَالَ رَبِّ امْرِئُجُنُونٍ"

(وہ (کافر) کہے گا: پروردگار! مجھے دنیا میں لوٹا دے)

خداوند عالم کا مریمؑ کو جواب

○ "قَالَ كَذَلِكَ اللَّهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ"

(اس نے کہا کہ اسی طرح خدا جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے، جب وہ کسی چیز کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس سے کہتا ہے: ہو جا، وہ ہو جاتی ہے)

گذشتہ صفحات میں اس امر کی طرف اشارہ ہو چکا ہے کہ اس آیت کی، سورۃ مریم کی آیت ۲۱ پر تطبیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ لفظ "كَذَلِكَ" ایک مکمل جملہ ہے، کیونکہ سورۃ مریم میں ارشاد ہوا:

○ "قَالَ كَذَلِكَ ۚ قَالَ رَبِّ انصُرْنِي ۚ وَنَجْعَلَنَّ لَهُ آيَةً ۚ إِنَّ لِلنَّاسِ لَرَأْسًا ۚ وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا"

(اس نے کہا ایسا ہی ہے، تیرا رب کہتا ہے کہ وہ میرے لئے نہایت آسان کام ہے، اور وہ اس لئے بھی ہے کہ ہم اسے لوگوں کے لیے نشانی اور اپنی طرف سے رحمت بنائیں اور یہ کام فیصلہ شدہ ہے)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "كَذَلِكَ" دراصل "السامر كذلك" ہے جس کا معنی یہ ہے: (صورت حال یہی ہے، ایسا ہی ہے، ایسا ہی ہوگا، ایسا ہی ہوتا ہے)، بات بالکل یہی ہے اور جو تجھے خوشخبری دی گئی ہے وہ طے شدہ فیصلہ ہے کہ جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

اور جہاں تک اس کی بابت تعجب کا تعلق ہے تو وہ اس صورت میں درست قرار پائے گا جب خدا ایسا کرنے پر قادر نہ ہو یا اس کے لئے ایسا کرنا دشوار ہو، اور جہاں تک خدا کی قدرت کا تعلق ہے تو وہ لامحدود ہے اور وہ جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے، اور جہاں تک اس کام کے دشوار و مشکل ہونے کا تعلق ہے تو وہ اس صورت میں قابل تصور ہے جب وہ کام اسباب و

وسائل کا محتاج ہو اور جس قدر اسباب زیادہ ہوں اتنا ہی وہ کام دشوار ہوگا کیونکہ جب تک تمام اسباب مہیا و میسر نہ ہوں اس کام کی انجام پذیری کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا جبکہ خداوند عالم کی بابت اس طرح کی حالتیں و کیفیتیں تصور نہیں کی جا سکتیں کیونکہ وہ جو کچھ خلق کرتا ہے وہ اسباب و وسائل کے ذریعے خلق نہیں کرتا بلکہ اس کا نظام تخلیق ایسا ہے کہ وہ جس کی خلقت کا فیصلہ کر لیتا ہے اس سے کہتا ہے ”ہو جا“ تو وہ وجود پذیر ہو جاتی ہے (إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ) تو معلوم ہوا کہ لفظ ”كَذَلِكَ“ اصل میں مکمل کلام ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ حضرت مریمؑ کی اضطراری کیفیت اور ان کے دل میں پیدا ہونے والی حیرت آمیز صورت حال کو ختم کیا جائے چنانچہ جملہ ”اللَّهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ“ کے ذریعے بچہ کی پیدائش کی بابت حضرت مریمؑ کے دل میں تعجب و حیرت کی جو کیفیت پیدا ہوئی اس سے خدا کی قدرتِ تخلیق کی بابت کسی طرح کے عجز و ناتوانی کا تصور پیدا نہ ہونے پائے، اور جملہ ”إِذَا قَضَىٰ.....“ کے ذریعے بغیر باپ کے بیٹا پیدا کرنے کے دشوار و مشکل ہونے کے موہوم تصور کو دور کرنا مقصود ہے۔

### حضرت عیسیٰؑ کو خدائی تعلیم

○ ”وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ“  
(اور وہ اسے کتاب و حکمت اور تورات و انجیل کی تعلیم دے گا)

یہاں لفظ کتاب اور حکمت پر الف و لام (الْكِتَابَ، الْحِكْمَةَ) جنس کا معنی دیتا ہے، اور پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ”کتاب“ سے مراد وہ وحی ہے جو لوگوں کے درمیان پائے جانے والے اختلاف کو دور کرنے کے لئے نازل ہوئی، اور ”حکمت“ (دانائی) سے مراد وہ معرفت ہے جو لوگوں کے اعتقادات و اعمال میں مفید ہو۔  
بنا بریں آیت میں تورات و انجیل کو کتاب و حکمت کی طرف عطف کرنا اور کتاب و حکمت کے ذکر کے بعد ان دو کا صراحت کے ساتھ نام لینا جبکہ وہ دو کتابیں ہیں جو حکمت پر مشتمل ہیں دراصل جنس کے ذکر کے بعد اس کے افراد کے ذکر کے طور پر ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب کسی فرد یا افراد کا ذکر کرنا خاص اہمیت کا حامل ہو۔

یہ بات یاد رہے کہ لفظ ”الْكِتَابَ“ پر الف و لام، استغراق کے لئے نہیں (استغراق کا مطلب عمومیت اور تمام افراد و مصادیق کا اس کے دائرے میں قرار پانا ہے، اگر یہاں الف و لام کو استغراق کے معنی میں لیں تو اس کا مطلب تمام کتابوں کی تعلیم دینا ہوگا جبکہ یہاں یہ بات ملحوظ و مقصود نہیں) کیونکہ اس صورت میں درج ذیل آیات سے عدم مطابقت لازم

آئے گی جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اس طرح ارشاد ہوا :

سورۃ زخرف، آیت : ۶۳

○ ”وَلَمَّا جَاءَ عِيسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلَفُونَ فِيهِ ۗ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا“

(اور جب عیسیٰ واضح دلائل و نشانیوں کے ساتھ آئے تو انہوں نے کہا: میں تمہارے پاس حکمت لایا ہوں اور میرا مقصد یہ ہے کہ میں ان بعض امور کو واضح کر دوں جن کے بارے میں تم آپس میں اختلاف رکھتے ہو، پس تم تقوئے الہی اختیار کرو اور میری اطاعت کرو) اس موضوع کی بابت تفصیلی بحث پہلے ہو چکی ہے۔

## تورات کے بارے میں قرآنی بیان

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ تورات کے بارے میں قرآن کیا کہتا ہے اور اس سے کیا مراد لیتا ہے؟ تو اس سلسلہ میں آیات مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ تورات وہی ہے جسے خداوند عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر میقات میں الواح میں نازل فرمایا، چنانچہ اس کا تذکرہ سورۃ اعراف میں تفصیلی طور پر موجود ہے۔

اور جو تورات اس وقت یہودیوں کے پاس ہے کہ جو اسفار کی صورت میں معروف ہے اس کی تصدیق و تائید قرآن مجید سے نہیں ہوتی بلکہ وہ خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان اسفار کا سلسلہ، سند حضرت موسیٰ علیہ السلام تک نہیں پہنچتا اور وہ بائبل کے ایک بادشاہ ”بخت نصر“ اور فارس کے ایک بادشاہ کورش کی سلطنتوں کی درمیانی مدت ہی میں منقطع ہو گیا تھا، لیکن اس کے باوجود قرآن مجید اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ جو تورات یہودیوں کے پاس عصر نبویؐ میں تھی وہ اصل تورات سے مکمل طور پر مختلف نہیں، اگرچہ اس میں تحریف کاروں نے اپنے کارنامے دکھائے ہیں اور وہ ان کے تحریفی جملوں سے محفوظ نہیں رہ سکی لیکن اسے کلی طور پر اصل تورات سے فرق کا حامل قرار نہیں دیا جاسکتا، چنانچہ اس حوالہ سے قرآنی آیات مبارکہ میں واضح دلالت اور صریح بیان موجود ہے کہ موجودہ تورات میں تحریف ہوئی ہے۔

## انجیل کے بارے میں قرآنی موقف

انجیل کہ جس کا معنی بشارت و خوشخبری ہے اس کی بابت قرآنی آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی کتاب تھی جو حضرت عیسیٰ بن مریمؑ پر نازل ہوئی اور وہ وحی تھی جو انہی حضرت سے مختص تھی، چنانچہ درج ذیل آیت میں اس طرح ذکر ہوا:

سورہ آل عمران، آیت: ۴:

○ ” وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْتَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ ۚ مِنْ قَبْلِ هُدًى لِلنَّاسِ “

(اور اس نے نازل کی تورات اور انجیل اس سے پہلے، جو کہ لوگوں کے لئے سرچشمہ ہدایت ہے) اور جہاں تک ان چار انجیلوں کا تعلق ہے جو متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی طرف منسوب ہیں تو وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد تالیف کی جانے والی کتابیں ہیں۔

اور قرآنی آیات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دینی احکام صرف تورات میں مذکور ہیں اور انجیل میں صرف چند ناسخ احکام ذکر ہوئے ہیں، چنانچہ اس سلسلہ کی آیات میں سے ایک یہ ہے:

سورہ آل عمران، آیت: ۵۰:

○ ” مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَلَا جُلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ “

(میں اس لئے آیا ہوں تاکہ اپنے سے پہلے نازل ہونے والی کتاب، تورات کی تصدیق کروں اور تمہارے لئے بعض ان چیزوں کو حلال کروں جو تم پر حرام کی گئی ہیں)

اسی سلسلہ کی ایک آیت یہ ہے:

سورہ مائدہ، آیت: ۴۷:

○ ” وَأَتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ فِيهِ هُدًى وَتُورَةٌ ۚ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ۗ وَيُحْكَمُ أَهْلَ الْإِنْجِيلِ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فِيهِ “

(اور ہم نے اسے انجیل عطا کی، اس میں ہدایت اور نور ہے اور وہ اپنے سے پہلی کتاب، تورات کی تصدیق کرتی ہے اور پرہیزگاروں کے لئے سرچشمہ ہدایت و نصیحت ہے، اور ہم نے اسے انجیل اس لئے عطا کی تاکہ وہ انجیل والوں کے درمیان ان اصولوں کے مطابق فیصلے کرے جو انجیل میں مذکور ہیں)

اس آیت سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ انجیل میں صرف ناسخ احکام ہی نہیں ہیں بلکہ دیگر موضوعات کی بابت اثباتی

احکام بھی موجود ہیں۔

قرآنی آیات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انجیل میں بھی تورات کی طرح حضرت پیغمبر اسلام کی تشریف آوری کی خوشخبری دی گئی ہے چنانچہ اس سلسلہ میں ایک آیت یہ ہے :

سورۃ اعراف، آیت : ۱۵۷

○ ” اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاَوْحٰى الَّذِيْ يَجِدُوْنَكَ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْاِنْجِيْلِ “  
(وہ پیروی کرتے ہیں اس رسول نبی امی کی کہ جس کا نام تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں)

بنی اسرائیل کے لئے ہادی و رہنما

○ ” وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْ اِسْرٰءِيْلَ “

(اور وہ بنی اسرائیل کی طرف بھیجا گیا..... ہادی ہے.....)

اس آیت کے ظاہری الفاظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خاص طور پر بنی اسرائیل ہی کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نازل ہونے والی آیات مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انہیں بنی اسرائیل ہی کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا تھا، جبکہ ہم سورۃ بقرہ کی آیت ۲۱۳ (كَاْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً قَبْلَ الَّذِيْ بَدَا لَكَ الْاِسْلَامُ) کی تفسیر میں نبوت کی بابت تفصیلی بحث و تذکرہ کر کے اس امر کا اثبات کر چکے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح ان اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں جنہیں تمام اہل دنیا کے لئے ہادی و رہنما اور نبی بنا کر بھیجا گیا، تو اس پیچیدگی کا حل ان مطالب میں مل سکتا ہے جو ہم نے رسول اور نبی کے درمیان فرق کی بابت ذکر کئے ہیں اور یہ بیان کیا ہے کہ نبوت ایک عمومی منصب و عہدہ ہے جو احکام دین کی تبلیغ کے لئے مخصوص ہے جبکہ رسالت ایک خاص نمائندگی ہے جس میں لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرنے اور ان کی اصلاح امور و حوالہ کی ذمہ داری پائی جاتی ہے کہ جس کا نتیجہ ان کی بقا و دوام نعمت کی صورت میں یا ہلاکت و جہانمی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، جیسا کہ ایک مقام پر ارشاد حق تعالیٰ ہے :

سورۃ یونس، آیت : ۴۷

○ ” وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۗ فَاِذَا جَاءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ “

(اور ہر امت کے لئے ایک رسول ہے، پس جب ان کا رسول آجاتا ہے تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ

فیصلہ کر دیا جاتا ہے)

دوسرے لفظوں میں یہ کہ ”نبی“ وہ انسان ہے جسے اس لئے بھیجا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو دین سے آگاہی دلائے اور ”رسول“ وہ ہے جسے کسی خاص حکم و پیغام کے ساتھ بھیجا جاتا ہے کہ جس کا انکار ہلاکت و تباہی اور اسے قبول کرنا بقاء و سعادت کا باعث بنتا ہے، یعنی اگر لوگ اسے تسلیم کر لیں تو سعادت مند ہو جاتے ہیں اور اگر اس کا انکار کریں اور اسے ٹھکرا دیں تو ہلاکت و تباہی ان کا مقدر بن جاتی ہے، جیسا کہ اس مطلب کی تصدیق و تائید بلکہ ثبوت و دلیل بعض رسولوں کی اپنی امتوں سے کی جانے والی گفتگو اور ان بیانات میں موجود ہے جن کا تذکرہ خداوند عالم نے قرآن میں فرمایا کہ جن میں حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ اور حضرت شعیبؑ کے تذکرے واضح مثالیں ہیں۔

بنا بریں یہ ضروری نہیں کہ جس شخص کو کسی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہو وہ صرف اسی قوم کا نبی ہو بلکہ عین ممکن ہے کہ کسی شخص کو ایک خاص و معین قوم کا رسول بنا کر بھیجا جائے جبکہ اس کی نبوت کے منصب کا دائرہ وسیع ہو اور وہ تمام افراد بشر کے لئے نبی ہو یعنی اس قوم کے لئے بھی نبی ہو جس کے لئے اسے رسول بنایا گیا اور اس کے علاوہ دیگر اقوام کے لئے بھی نبی ہو جس کے لئے اسے رسول بنایا گیا اور اس کے علاوہ دیگر اقوام کے لئے بھی نبوت کی ذمہ داری رکھتا ہو جیسے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام، چنانچہ اس مطلب کی گواہی قرآن مجید میں کئی مقامات پر موجود ہے، مثلاً حضرت موسیٰؑ کو فرعون کی طرف بھیجا گیا تو ارشاد ہوا :

سورہ طہ، آیت: ۲۴

○ ” اِذْ هَبْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ اِنَّهُ طَغٰی“

(جاؤ فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہو گیا ہے)

اور جب جادوگر، حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کا کھلا اظہار کیا جبکہ وہ بنی اسرائیل میں سے نہ تھے، ان کے بیان کو درج ذیل آیت میں ذکر کیا گیا ہے :

سورہ طہ، آیت: ۷۰

○ ” قَالُوْا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰی“

(انہوں نے کہا: ہم ایمان لائے ہارون اور موسیٰ کے پروردگار پر)

اور قوم فرعون کو دعوت حق دی گئی جبکہ وہ بنی اسرائیل میں سے نہیں تھے، اس مطلب کو یوں بیان کیا گیا :

سورہ دخان، آیت: ۱۷

○ ” وَ لَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَ جَاءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ“



(ہم نے ان سے پہلے قوم فرعون کو آزما یا اور ان کے پاس ایک معزز رسول آیا)

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کے بارے میں ٹھوس شواہد موجود ہیں کہ بنی اسرائیل کے علاوہ متعدد قوموں نے آپ پر ایمان کا اظہار کیا مثلاً بعثت نبوی سے قبل رومیوں اور مغرب کی عظیم قوموں مثلاً فرانس، آسٹریا، بوسنیا اور انگلستان کے باشندوں اور مشرق کی قوموں مثلاً نجران کے رہنے والوں نے ان کی نبوت کا اقرار کیا جبکہ وہ سب بنی اسرائیل کے علاوہ تھے، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جب نصاریٰ یعنی حضرت عیسیٰ کے پیروکاروں کا تذکرہ ہوتا ہے تو کہیں بھی بنی اسرائیل کے نصاریٰ کا تعین نہیں ہوا بلکہ اگر ان کی مدح ہوئی تو تمام نصاریٰ کی عمومی طور پر مدح ہوئی اور اگر ان کی مذمت ہوئی تو عمومی طور پر نصاریٰ کے الفاظ استعمال ہوئے، (اگر حضرت عیسیٰ کی نبوت صرف بنی اسرائیل کے لئے ہوتی تو ان کے نام ہی تک بیانات محدود ہوتے جبکہ لفظ ”نصاریٰ“ سے بنی اسرائیل اور ان کے علاوہ دیگر وہ اقوام مقصود و مراد ہیں جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا اقرار کیا اور ان کی پیروی کا اظہار کیا)۔

## معجزات کے اظہارات

○ ” اَلَيْسَ قَدْ جِئْتَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِّن رَّبِّكُمْ ۗ اَلَيْسَ اَخْلَقْتُكُمْ مِّن الطِّينِ.....“

(میں تمہارے پاس تمہارے رب کی نشانی لے کر آیا ہوں، میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے بناتا ہوں.....)

اس آیت میں خلق کرنے کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف دی گئی ہے کہ انہوں نے کہا: ” اَلَيْسَ

اَخْلَقْتُ...“ میں خلق کرتا ہوں، تو اب دیکھنا یہ ہے کہ خلق کرنے کا معنی کیا ہے؟

”خلق“ کا معنی کسی چیز کے اجزاء کو یکجا کرنا ہے، اسی وجہ سے اس عمل کی نسبت غیر خدا کی طرف بھی دی جاتی ہے

(اگر اس سے مراد عدم سے وجود میں لانا ہوتا تو اس کی نسبت خدا کے علاوہ کسی کی طرف نہ دی جاسکتی کیونکہ اس معنی میں خدا کے

سوا کوئی دوسرا خالق نہیں) چنانچہ قرآن مجید میں اس حوالہ سے یوں ارشاد ہوا :

سورہ مؤمنون، آیت : ۱۴

○ ” فَتَلَوِكَ اللهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ “

(بارکرت ہے اللہ، جو خلق کرنے میں سب سے بہتر ہے)

آیت میں دوسرا جملہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

”وَأُبْرِيئُ الْاَكْمَةَ وَالْاَبْرَصَ“

(میں اکمہ اور ابرص کو شفا یاب کرتا ہوں)

”اکمہ“ کا معنی وہ بچہ ہے جو نابینا پیدا ہوا (مادر زاد اندھا)، اور کبھی یہ لفظ اس شخص پر اطلاق ہوتا ہے جو نابینا ہو جائے یعنی مادر زاد نابینا نہ ہو بلکہ بعد میں بصارت سے محروم ہو جائے، چنانچہ لغت کی مشہور کتاب ”المفردات“ میں راغب اصفہانی نے اس حوالہ سے لکھا ہے کہ نابینا ہو جانے والے شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے: ”کمہت عیناہ حتی ابیضتا“ (اس کی آنکھوں کی بینائی کم ہو گئی یہاں تک اس کی آنکھیں سفید ہو گئیں)۔

”اَبْرَصَ“ برص کے مریض کو کہتے ہیں، برص ایک مشہور جلدی بیماری کا نام ہے اور اس سے ”اَبْرَصَ“ (برص میں مبتلا شخص) بنا ہے۔

جملہ ”وَأُحْيِي الْمَوْتَى“ (میں مردوں کو زندہ کرتا ہوں) میں احیاء یعنی زندہ کرنے کو لفظ ”موتی“ (صیغہ جمع) کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جس سے کثرت و تعدد کا معنی سمجھا جاتا ہے۔

اور سیاق کلام سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جملہ ”يَاذُنِ اللّٰهِ“ اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں رونما ہونے والے معجزات کہ جن کا ذکر زیر نظر آیت مبارکہ میں ہوا وہ سب خداوند عالم کے اذن کے ساتھ تھے اور ان کا استناد و نسبت خدا کی طرف ہے کہ وہی ان کا سرچشمہ ہے اور آنجناب ان کی بابت مستقل یعنی خدا سے بے نیاز نہ تھے (بلکہ خدا کے اذن کے ساتھ وہ سب کچھ انجام دیتے تھے)، اور جملہ ”يَاذُنِ اللّٰهِ“ کا بار بار ذکر کیا جانا اس استناد و نسبت کی بابت تاکید کی توجہ دلانے کی غرض سے ہے کیونکہ اس سلسلہ میں لوگوں کا اصل حقیقت سے غافل ہونے اور ان کے گمراہی سے دوچار ہونے کا اندیشہ تھا کہ وہ ان معجزات کی بناء پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں خدائی کا عقیدہ اختیار کر سکتے ہیں، لہذا ان تمام معجزات کے بیان کے ساتھ ”يَاذُنِ اللّٰهِ“ (اللہ کے اذن کے ساتھ) کے الفاظ شامل کئے اور پھر بیان کا اختتام بھی ایسے جملہ پر کیا جس سے ہر طرح کی غلط فہمی دور ہو لہذا یوں ارشاد فرمایا: ” اِنَّ اللّٰهَ سَرِيٌّ وَّرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ“ (بے شک اللہ ہی میرا رب اور تمہارا رب ہے، تم اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے)

اور حضرت عیسیٰ کا یہ فرمانا ” اَتَىٰ اَخْلَقْتُ لَكُمْ.....“ (میں تمہارے لئے لے خلق کرتا ہوں.....) کسی چیلنج یا محض دعوے کے طور پر نہ تھا بلکہ ایک عملی حقیقت پر مبنی تھا اور آنجناب وہ سب معجزات انجام دیتے تھے، کیونکہ اگر صرف دعویٰ یا لوگوں کو مرعوب کرنے کی غرض وغیرہ کی بناء پر اس طرح کے الفاظ کہتے تو ان کے ساتھ قیہ نہ لگتے اور یوں کہتے کہ اگر تم

مجھ سے مطالبہ کرو گے یا پسند کرو گے تو میں مردوں کو زندہ کر دوں گا اور پیاروں کو شفا یاب کر دوں گا وغیرہ، لیکن انہوں نے اس طرح کے الفاظ سے خالی اعلان فرمایا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ان معجزات کو عملی طور پر انجام دیتے تھے اور ان کا اعلان خالی دعویٰ یا اتمام حجت وغیرہ کے لئے نہ تھا۔

اس کے علاوہ درج ذیل آیات مبارکہ میں بھی واضح طور پر اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ معجزات کو انجام دیتے تھے چنانچہ خداوند عالم کا قیامت کے دن عیسیٰؑ سے مخاطب ہو کر ان کا حوالہ دینا قرآن مجید میں اس طرح مذکور ہے :

سورۃ مائدہ، آیت : ۱۱۰

○ ” اِذْ قَالَ اللهُ لِيَعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ مِنْ  
الطَّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِي فَتَنْفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِاِذْنِي وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ  
الْاَبْرَصَ بِاِذْنِي ۗ وَ اِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ.....“

(قیامت کے دن) جب خدا کہے گا: اے عیسیٰ بن مریم! تو یاد کر، میری اس نعمت کو جس سے میں نے تجھے اور تیری والدہ کو نوازا..... اور جب تو میرے اذن سے مٹی سے پرندہ کی شکل بناتا تھا پھر اس میں پھونک مارتا تھا تو وہ میرے اذن سے پرندہ ہو جاتا تھا اور تو میرے اذن سے ماورزا دنا پینا اور برص کے مریض کو شفا یاب کرتا تھا اور جب تو میرے اذن سے مردوں کو قبروں سے باہر نکالتا تھا.....)۔

## ایک ضروری وضاحت

اس آیت اور اس موضوع سے مربوط ذکر کئے گئے مطالب سے بعض مفسرین کا یہ بیان غلط ثابت ہو جاتا ہے جس میں انہوں نے زیر بحث آیت کی بابت کہا ہے کہ: ”اس آیت سے زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کو ایک راز عطا فرمایا تھا اور آنجناب نے اسی کی بناء پر لوگوں کے سامنے کھلا اعلان کیا اور ان پر اتمام حجت کیا کہ اگر وہ ان سے ان امور میں سے کسی کا بھی مطالبہ کریں تو وہ ان کی انجام دہی پر قادر ہیں، لیکن آیادہ تمام امور یا ان میں سے بعض امور وجود پذیر ہونے بھی ہیں اس بات کا ثبوت آیت میں موجود نہیں۔“

## غیبی خبروں کا اعلان

○ ”وَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ“  
(اور میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں بچا کر رکھتے ہو)

یہ جملہ غیبی خبریں دینے کے اظہار پر مشتمل ہے جو کہ خداوند عالم اور ان رسولوں سے مختص و مخصوص ہے جنہیں خداوند عالم نے وحی کے ذریعے اس اعزاز سے نوازا ہے، اور یہ بذات خود ایک معجزہ ہے اور اس غیب کی خبر پر مشتمل ہے جس کا انجام پذیر ہونا صریح و واضح ہے کہ جس میں کسی طرح کے شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی کیونکہ عام طور پر کوئی شخص اس چیز کے بارے میں شک و شبہ کا شکار نہیں ہوتا جو اس نے کھایا ہو یا جو کچھ اپنے گھر میں ذخیرہ کیا ہو۔

## غیبی خبریں اور اذن الہی

اس مقام پر ایک سوال ممکن ہے اور وہ یہ کہ کسی بھی معجزہ کا رونما ہونا خدا کے اذن پر موقوف ہے اور کوئی معجزہ اذن الہی کے بغیر انجام پذیر نہیں ہو سکتا تو اس آیت میں غیبی خبریں دینے کو اذن الہی کے بغیر کیوں ذکر کیا گیا ہے بلکہ صریح لفظوں میں ارشاد ہوا (وَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ)..... میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا کچھ اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو.....، جبکہ درج ذیل آیت میں صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ ہر معجزہ خدا کے اذن کے ساتھ ہوتا ہے:

سورہ مؤمن، آیت: ۷۸

○ ”وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ“  
(کوئی رسول کوئی معجزہ نہیں لاسکتا مگر خدا کے اذن کے ساتھ!)

اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں جس معجزہ کا ذکر ہوا ہے اسے انبیا یعنی خبر دینے سے تعبیر کیا گیا ہے (أُنَبِّئُكُمْ) جو کہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلام ہے اور یہ کام خود انہی سے مخصوص ہے کہ جسے خدا کی طرف منسوب کرنا موزوں نہیں جبکہ سابقہ دو آیتوں میں صورتحال اس طرح کی نہیں کیونکہ خلق اور احیاء حقیقت میں خدا کے افعال ہیں اور ان کی نسبت غیر اللہ کی طرف صرف خدا کے اذن کے ساتھ دی جاسکتی ہے، اس کے اذن کے بغیر وہ نہیں۔

اس کے علاوہ یہ کہ سابقہ دو آیتوں میں غلق و احیاء کا تذکرہ ہوا ہے جو کہ اجباء یعنی خبر دینے سے قطعی مختلف ہیں کیونکہ ان میں لوگوں کے گمراہی سے دوچار ہونے کا خطرہ خبر دینے کی نسبت کہیں زیادہ وسیع ہے اور وہ اس طرح کہ سادہ لوح افراد کے دل ذرا سی بے توجہی و غلط فہمی کی بناء پر اس شخص کو خدا ماننے کی طرف جلدی مائل ہو سکتے ہیں جو مٹی سے پرندے کی شکل بنا کر اسے اصل پرندہ بنا دے اور مردوں کو زندہ کر دے جبکہ نبی خبریں دینے والے کے بارے میں اس قدر سرعت کے ساتھ اس کی خدائی کے معتقد نہیں ہوتے کیونکہ عامتہ الناس نبی خبریں دینے کو خداوند عالم کے ساتھ مخصوص نہیں سمجھتے بلکہ اسے ایک معمولی کام سمجھتے ہیں اور ہر کاہن و شعبدہ بازی کے ماہر شخص سے اس کا سرزد ہونا ممکن سمجھتے ہیں۔ بنا براین یہ ضروری تھا کہ سابق الذکر دو معجزوں یعنی غلق و احیاء کو خدا کے اذن کے ساتھ مقید کر کے ذکر کیا جائے جبکہ آخری معجزہ یعنی نبی خبریں دینے کو اس کے بغیر ذکر کیا جائے۔

اسی طرح ابراہ یعنی پیاروں کو شفا یاب کرنے کے تذکرہ میں بھی اس قدر کافی تھا کہ اس کی بابت یہ بیان کیا جائے کہ وہ معجزۃ الہی ہے، بالخصوص جبکہ اظہار سخن ان لوگوں سے تھا جو ایمان لانے کا دعویٰ کرتے تھے جیسا کہ آیت کے ذیل میں یوں ارشاد ہوا: ”إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّكُمۡ إِن كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ“ (اس میں نشانی (معجزہ) ہے تمہارے لئے، اگر تم مؤمن ہو) یعنی اگر اپنے دعوئے ایمان میں سچے ہو۔

## تورات کی تصدیق اور بعض احکام کا بیان

○ ”وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَلِأَجْلِ نَكْمَ بَعْضِ الَّذِي حَوَّصَ عَلَيْكُمْ“  
(اور تصدیق کرنے والا ہوں اس کا جو میرے سامنے (مجھ سے پہلے نازل ہوئی) ہے اور تاکہ میں ان بعض چیزوں کو حلال کروں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں)

یہ آیت سابق الذکر جملہ ”وَسَأَسْأَلُا اِلٰی بَنِي اِسْرَآءِیْلَ“ پر عطف ہے۔

اس مقام پر ایک ادبی مطلب قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ سابق الذکر جملہ یعنی معطوف علیہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو غائب فرض کیا گیا اور کہا گیا: ”وَسَأَسْأَلُا اِلٰی بَنِي اِسْرَآءِیْلَ“ (وہ بنی اسرائیل کی طرف بھیجا گیا پیغمبر ہے) جبکہ زیر نظر آیت میں جو کہ معطوف ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام متکلم کے مقام میں ہیں اور یہ جملہ ”وَمُصَدِّقًا.....“ خود انہی کا بیان ہے، تو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ میں کلائی حیثیت کے حوالہ سے یکسانیت ہونی چاہئے لیکن

یہاں غائب و متکلم کے فرق سے معطوف اور معطوف علیہ کے عمومی اصول کی نفی نہیں ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ زیر نظر آیت (معطوف) سے پہلے جملہ ”وَمَا سُوَّلًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ“ کی تفسیر جملہ ”أَنِّي قَدْ جِئْتُكُمْ“ کے ذریعے ہو چکی ہے اور کلام کا رخ غیبت سے تکلم کی طرف مڑ چکا ہے لہذا اس تبدیلی کی بناء پر عطف درست و صحیح اور بجا ہے کہ اس طرح متکلم کے سیاق کا عطف متکلم کے سیاق پر ہوگا۔

آیت مبارکہ میں ارشاد ہوا کہ ”میں تصدیق کرنے والا ہوں تو رات کی“، تو اس سے مراد اس تو رات کی تصدیق ہے جس کا علم خداوند عالم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمایا جیسا کہ سابقہ آیت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے اور وہ اصل تو رات تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی، بنا بریں اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس تو رات کی تصدیق کرتے تھے جو ان کے زمانہ میں موجود تھی کہ وہ تحریف سے مبرا تھی، اور یہ بعینہ اسی طرح ہے جیسے ہمارے نبی حضرت پیغمبر اسلام محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں قرآن مجید نے صریح لفظوں میں کہا ہے کہ وہ تو رات کی تصدیق کرنے والے ہیں کہ جو ان سے پہلے نازل ہوئی تھی، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو تو رات اس زمانہ میں یہودیوں کے ہاں رائج تھی وہ تحریف سے مبرا تھی..... بلکہ اس سے مراد بھی اصل تو رات ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور خداوند عالم نے اس کا علم حضرت محمدؐ کو عطا فرمایا کہ اس حوالہ سے آنحضرتؐ تو رات کی تصدیق کرنے والے قرار پائے.....

### بعض احکام شریعت کا حوالہ

○ ”وَلَا جُلٌّ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ“  
(اور تاکہ میں تم پر حلال کروں بعض وہ چیزیں جو تم پر حرام قرار دی گئیں)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے بعض پاکیزہ چیزوں کو بنی اسرائیل پر حرام قرار دیا تھا کہ جو حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کے ذریعے حلال کر دی گئیں چنانچہ اس کا ثبوت درج ذیل آیت میں بھی موجود ہے:

سورۃ نساء، آیت: ۱۶۰

○ ”فَوُطِّئِم مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا وَاحْرَمْنَا عَلَيْهِمْ طَيْبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ.....“

(یہودیوں کی طرف سے ان کتابِ ظلم کی وجہ سے ہم نے کچھ پاک چیزیں جو ان کے لئے حلال تھیں ان پر حرام

(کردیں.....)

بہر حال زیر بحث آیت مبارکہ سے اس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تورات کے تمام احکام پر مہر تصدیق ثبت کی سوائے ان چند احکام کے کہ جنہیں خداوند عالم نے ان کے ہاتھوں منسوخ کیا اور وہ احکام اس لئے منسوخ کئے گئے کہ وہ یہودیوں پر نہایت شدید اور گراں تھے، (یعنی ان پر زمی کی غرض سے ان احکام کو منسوخ کیا گیا) اسی وجہ سے یہ کہا گیا کہ انجیل شریعت و دستورات کی کتاب نہیں..... کیونکہ اس میں احکام موجود ہی نہیں.....

جملہ ”وَلَا جَلَّ“ کا عطف جملہ ”بِآيَةٍ مِّنْ سَرِّكُمْ“ پر ہے اور اس میں حرف لام غرض و غایت کے بیان کے لئے ہے، اس بناء پر آیت مبارکہ کا معنی یہ ہوگا: ”قد جنتکم لما نسخ بعض الاحکام لا لارمة المكتوبة علیکم“ میں تمہارے پاس اس لئے آیا ہوں تاکہ ان بعض احکام کو منسوخ کروں جن میں تم پر کچھ چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں۔

## پروردگار کی نشانی

○ ”وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِّنْ سَرِّكُمْ“

(اور میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لایا ہوں)

اس جملہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جملہ ”فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا“ اظہار معجزہ کی فرع و نتیجہ ہے اور اس کا حرام کردہ چیزوں کو حلال کرنے سے کوئی تعلق نہیں، یعنی تقویٰ اختیار کرنے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے کا حکم اظہار معجزہ کی وجہ سے ہے نہ یہ کہ اس وجہ سے کہ حضرت عیسیٰ نے بعض چیزوں کو حلال کیا، شاید اس مفسر کے بیان کا مقصد بھی یہی ہو جس نے کہا کہ جملہ ”وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِّنْ سَرِّكُمْ“ کا دوبارہ ذکر کیا جانا اس غرض سے ہے کہ اس سے پہلے ذکر کئے گئے مطالب اور اس کے بعد ذکر کئے جانے والے مطالب کے درمیان فرق واضح ہو، کیونکہ اگر یہ غرض مقصود و ملحوظ اور مراد نہ ہو تو ایک ہی جملہ کا دوبارہ ذکر کیا جانا ادبی حوالہ سے کلام کی خصوصیت و کمال قرار نہیں پاتا۔

## بندگی خدا کا واضح اعلان

○ ”إِنَّ اللَّهَ سَرَّيْ وَيَسَّرْ لَكُمْ مَا عِبُدُوا.....“

(بے شک، اللہ میرا پروردگار اور تمہارا پروردگار ہے پس تم اس کی عبادت کرو.....)

اس جملہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں خدائی کے باطل عقیدہ و خیال کی نفی مقصود ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی فراست یا بذریعہ وحی اس بات سے آگاہ ہو چکے تھے کہ کچھ نادان لوگ معجزات دیکھ کر گمراہ ہو جائیں گے اور ان کے بارے میں خدائی کا عقیدہ قائم کر لیں گے، چنانچہ اسی وجہ سے حضرت عیسیٰ نے معجزات کو ”بِإِذْنِ اللَّهِ“ کے الفاظ کے ساتھ مقید کیا مثلاً ”فَيَكُونُ طَبِيرًا بِإِذْنِ اللَّهِ“، ”وَ أَسْحَى الْمَوْتَى بِإِذْنِ اللَّهِ“، البتہ اس حوالہ سے درج ذیل آیت مبارکہ سے ظاہر و ثابت ہوتا ہے کہ آنجناب بذریعہ وحی اس طرح کے باطل عقیدہ سے آگاہ ہوئے تھے:

سورۃ مائدہ، آیت: ۱۱۷

○ ”مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنْ اعْبُدُوا اللَّهَ سَرَّيْ وَيَسَّرْ لَكُمْ“

(میں نے ان سے اس کے سوا کچھ نہیں کہا جو تو نے مجھے حکم دیا کہ اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا رب ہے)

## حضرت عیسیٰ کی پکار

○ ”فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَى مِنْهُمْ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ“

(پھر جب عیسیٰ نے ان سے کفر محسوس کیا تو کہا: کون ہے میرا مددگار خدا کی طرف!)

حضرت مریمؑ کو جو بشارت دی گئی تھی وہ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بابت اہم مطالب کے عنوانی ذکر پر مشتمل تھی کہ جس میں ولادت سے پہلے حضرت مریمؑ کے شکم میں ہونا (حمل)، ان کی رسالت اور دعوت توحید کا تذکرہ شامل تھا لہذا اس میں اجمالی بیان پر اکتفاء کی گئی اور پرتمہ کلام کے طور پر ان کے انصار و حواریوں کے چناؤ، ان کی قوم کا ان کے خلاف مکر کرنا اور خدا کا لوگوں کے مکر کو ناکام بنا کر عیسیٰؑ کو ان سے نجات دلانا اور انہیں آسمان پر لے جانا ذکر کیا گیا تاکہ سلسلہ بیان کی تکمیل ہو جائے۔



اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مربوط مطالب کے تذکرہ میں اسی مقدار کے ذکر پر اکتفاء کی گئی جن کا نجران کے نصاریٰ کے سامنے پیش کیا جانا ضروری و کافی تھا کیونکہ جب یہ آیات نازل ہو رہی تھیں انہی ایام میں وہ لوگ وفد کی صورت میں مدینہ منورہ آئے ہوئے تھے تاکہ حضرت پیغمبر اسلام سے بحث و گفتگو اور مناظرہ کریں، اسی وجہ سے آنجناب سے تعلق رکھنے والے دیگر ان امور کا تذکرہ اس مقام پر نہ کیا گیا جو دوسری قرآنی سورتوں مثلاً سورۃ نساء، سورۃ مائدہ، سورۃ انبیاء، سورۃ زخرف اور سورۃ صف میں مذکور ہیں۔

زیر بحث آیت مبارکہ میں لفظ ”احساس“ ذکر ہوا ہے (فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ) (جب اس نے ان لوگوں سے کفر محسوس کیا) جبکہ کفر ایک قلبی کیفیت ہے جسے محسوس نہیں کیا جاسکتا، تو یہاں اس کا ذکر اس بناء پر ہے کہ ان کا باطنی کفر ان کے اعمال سے اس قدر شدید صورت میں ظاہر ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے ارادوں اور قلبی کیفیتوں کو بھانپ گئے یا یہ کہ انہوں نے اپنے کفر کی وجہ سے آنجناب کو اذیت دینے اور ان کے قتل کی سازش و کوشش کی، جس سے حضرت عیسیٰ نے ان کے دل میں چھپے ہوئے کفر کو محسوس کر لیا، اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آیت میں ارشاد ہوا: ”فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ“ جب عیسیٰ نے محسوس کیا یعنی اسے بھانپ لیا، اور لفظ ”مِنْهُمْ“ (ان سے) سے مراد وہ بنی اسرائیل ہیں جن کا نام بشارت میں مذکور ہے، ان سے کفر کی بو آنے لگی تو حضرت عیسیٰ نے کہا: ”مَنْ أَحْصَا رِجْأِي إِلَى اللَّهِ“ (کون ہے جو خدا تک جانے والے راستہ میں میرا مددگار ہو)، اس سوال میں آنجناب کا مقصد یہ تھا کہ اپنی قوم کے ان مخلص بندوں کو جان لیں جو حق کے طرفدار ہیں تاکہ ان کی تعداد اور ہمت و قوت کی بناء پر اپنے توحیدی مشن کو فروغ دے سکیں اور ان کا سلسلہ تبلیغ دین افرادی قوت کے حوالہ سے واضح خطوط پر استوار ہو، دراصل یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جو ہر طبعی و اجتماعی قوت کی عملداری میں ملحوظ ہوتا ہے کہ اس کے ابتدائی مراحل ہی میں ایک مرکزی نکتہ کا تعین ضروری ہو جاتا ہے تاکہ اس پر تمام مربوط عملی اقدامات ترتیب پائیں اور وہی تمام مربوط سرگرمیوں کا محور ہو، کہ اس کے بغیر کوئی اقدام درست سمت میں واقع نہیں ہو پاتا بلکہ تمام کاوشیں بے نتیجہ رہ جاتی ہیں۔ چنانچہ اس کی ایک مثال دعوت اسلام میں بھی ملتی ہے کہ ایک بیعت عقبہ کا واقعہ ہے جب ہجرت نبوی سے پہلے مدینہ کے لوگ عقبہ منیٰ میں جمع ہوئے اور آنحضرت کی بیعت کی، اور دوسرا بیعت شجرہ کا واقعہ ہے کہ جسے بیعت رضوان بھی کہا جاتا ہے اور جو صلح حدیبیہ کے دوران ہوا اس میں پیغمبر اسلام نے لوگوں کو ایک نکتہ پر اکٹھا کرنے اور اہل اسلام کی طاقت کو متحرک کرنے کی کوشش کی تاکہ اس سے توحیدی مشن کو سر و سامان دے سکیں اور مربوط امور و اقدامات درست سمت میں نظم و نظام پائیں۔

بہر حال جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یقین ہوا کہ ان کی دعوت تمام بنی اسرائیل میں یا ان کی اکثریت میں کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو رہی اور وہ ہر صورت میں اپنے کفر پر باقی اور ڈٹے ہوئے ہیں کہ اگر انہیں مزید موقع مل جائے تو وہ آنجناب سے

کی دعوت توحید کو ہرگز آگے بڑھنے نہ دیں گے بلکہ مزید مشکلات پیدا کر کے حالات کو بگاڑ دیں گے اور صورت حال کو یکسر خراب کر دیں گے تو آنجنابؐ نے اپنے مشن کی بقا کے لئے یہ تجویز سوچی کہ لوگوں سے کھلے لفظوں میں مدد طلب کی جائے تاکہ اہل حق و اہل باطل کے درمیان تمیز کی واضح صورت سامنے آسکے چنانچہ انہوں نے اللہ تک پہنچنے کے راستہ میں ہمراہیوں کو پکارا اور کہا: کون ہے جو اس راہ میں میرا مددگار ہو، تو آنجنابؐ کی دعوت دیکار پر حواریوں نے لبیک کہا جس سے اہل حق کی پہچان ممکن ہوئی اور ایمان لانے والے مشخص و واضح ہو گئے، یہی وہ مرحلہ تھا جب ایمان اور کفر کے درمیان فرق کی بنیاد قائم ہو گئی اور دعوت دین اور غلبہ حق کی راہیں کھل گئیں، اسی مطلب کو درج ذیل آیت مبارکہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

سورہ صف، آیت: ۱۴

○ ” يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنْصَارًا لِلَّهِ فَإِنَّمَنْتُمْ طَائِفَةً مِّنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَكَفَرْتَ طَائِفَةٌ مِّنْهَا قَالُوا نَأْيُ الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْنَا إِنَّهُمْ فَأَصْحَابُ أَظْهَرِ بَيْنَ

(اے ایمان لانے والو! تم اللہ کے مددگار بنو، چنانچہ بنی اسرائیل کے ایک گروہ نے قبول کر لیا اور ایک گروہ نے انکار کر دیا، تو ہم نے قبول کرنے والوں (اہل ایمان) کی ان کے دشمن کے مقابلے میں مدد کی تو وہ غالب آ گئے)

آیت مبارکہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کلام میں لفظ ”انصاری“ (میرے مددگار) کو ”إِلَى اللَّهِ“ کے ساتھ مقید کر کے ذکر کیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا مقصد لوگوں کے دلوں میں خدا تک جانے کے جذبہ کو بیدار کرتے ہوئے انہیں عملی آمادگی دلانا تھا تاکہ وہ اس سلسلہ میں صدق دل کے ساتھ فوری اقدام کرنے کی طرف بڑھیں، اور یہی وہ غرض تھی جس کے لئے آنجنابؐ نے ان سے پوچھا کہ میرا مددگار کون ہوگا؟ یہ بعینہ اسی طرح سے ہے جیسے درج ذیل آیت میں قرض کی بات پوچھا گیا:

سورہ بقرہ، آیت: ۲۴۵

○ ” مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا.....“  
(کون ہے جو خدا کو اچھا قرض دے.....)

ایک ادبی نکتہ

لفظ ”إِلَى اللَّهِ“ جو کہ طرف ہے اس کا تعلق ”انصاری“ کے ساتھ ہے، اور ”انصاری“ (میری نصرت کرنے

والے) میں نصرت و مدد میں ساتھ چلنے، جانے اور ہمراہ ہونے جیسے معانی پائے جاتے ہیں اس لیے اسے لفظوں میں حرف ”الی“ کے ساتھ متعدی کہا گیا ہے۔ اس کی مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیان میں بھی ملتی ہے جس میں انہوں نے کہا:

سورۃ صافات، آیت: ۹۹

○ ”إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيِّئٌ بَيْنَ“

(میں اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہوں، وہ بہت جلد میری رہنمائی کرے گا)

بعض مفسرین نے حرف ”الی“ کے بارے میں کہا ہے کہ ممکن ہے یہاں ”مَعَ“ کے معنی میں استعمال ہوا ہو، لیکن یہ بات نہ تو کسی دلیل سے ثابت ہوتی ہے اور نہ ہی ادب القرآن سے اس کی بابت تصدیقی اشارہ ملتا ہے کہ حضرت ابراہیم خدا کو ایک عام انسان قرار دے کر غیر اللہ کے ساتھ ذکر کریں اور غیر اللہ کو اللہ کی طرح اپنا مددگار قرار دیں، اور نہ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالہ سے اس طرح کا تصور ممکن ہے کیونکہ آنجناب کے بارے میں جس طرح قرآن مجید نے تذکرہ کیا ہے اس کی روشنی میں یہ بات کیونکر درست ہو سکتی ہے کہ وہ غیر اللہ کو اللہ کی طرف اپنا مددگار قرار دیں،

اس کے علاوہ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اعلان کیا کہ ”مَنْ أَنْصَارُ اللَّهِ إِلَى اللَّهِ“ (کون ہے جو اللہ کی طرف جانے میں میری مدد کرے) تو حواریوں نے کہا: ”نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ“ (ہم اللہ کے مددگار ہیں)، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حرف ”الی“ بمعنی ”مَعَ“ نہیں ورنہ وہ اس طرح کہتے: ”نَحْنُ أَنْصَارُكَ مَعَ اللَّهِ“ (ہم بھی اللہ کے ساتھ آپ کے مددگار ہیں)۔ مزید غور کریں،

عیسیٰؑ کے اعلان پر حواریوں کا جواب

○ ” قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ أَمَّا بِاللَّهِ ۖ وَأَشْهَدُ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ“

(حواریوں نے کہا: ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے اور آپ گواہ ہوں کہ ہم مسلمان ہیں (آپ کے حکم پر سر تسلیم خم کرنے والے ہیں))

”حواری“ کسی شخص کے نزدیک ترین فرد کو کہا جاتا ہے، اس کی بابت کہا جاتا ہے کہ اس کا لفظی اشتقاق ”حور“ سے ہے جس کا معنی بہت زیادہ سفیدی ہے، لیکن قرآن مجید میں یہ لفظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خاص اصحاب و ساتھیوں کے علاوہ کسی کے لئے استعمال نہیں ہوا۔

اور ان کا کہنا: ”اٰمَنَّا بِاللّٰهِ“ (ہم اللہ پر ایمان لائے) دراصل ان کے قول ”نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ“ (ہم اللہ کے مددگار ہیں) کی تفسیر کے طور پر ہے، یعنی ہم نے جو کہا کہ ہم اللہ کے مددگار ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں۔

اس سے ہمارے اس بیان کی تصدیق بھی ہوتی ہے جو ہم نے جملہ ”اَنْصَارِہِیْ اِلٰی اللّٰهِ“ کی بابت پیش کیا کہ اس میں ساتھ چلنے اور راستہ طے کرنے کا معنی پایا جاتا ہے یعنی وہ راستہ جو خدا تک پہنچتا ہے اس پر چلنا مقصود ہے، اور ایمان ایک راستہ ہے جس پر چل کر بندہ اپنے رب تک پہنچتا ہے۔ تو جب ”ایمان“ نصرت و مدد کی تفسیر ہے تو نصرت بھی ایک راستہ کہلانے کا لہذا یہ کہنا درست ہوگا کہ خدا کی نصرت سے مراد خدا تک جانے میں نصرت ہے۔

یہاں ایک سوال ممکن ہے اور وہ یہ کہ حواریوں کا کہنا کہ ہم ایمان لائے ہیں ”اٰمَنَّا“، آیا پہلی مرتبہ ایمان لانے کو ثابت کرتا ہے یا یہ کہ وہ پہلے ایمان لا چکے تھے اور اب اس کا دوبارہ اظہار کیا؟ اس سلسلہ میں درج ذیل آیت مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلی مرتبہ والا ایمان نہ تھا بلکہ وہ لوگ اس سے پہلے ایمان لا چکے تھے اب اسی کا دوبارہ اظہار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اعلان کے بعد کیا:

سورہ صف، آیت: ۱۴

○ ” كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِّلْحَوَارِیِّنَ مَنْ اَنْصَارِہِیْ اِلٰی اللّٰهِ ۗ قَالَ الْحَوَارِیُّونَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاَمَنْتَ ظَآئِفَةً “

(جیسا کہ عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا کہ کون ہے جو خدا کی راہ میں میرا مددگار ہو، تو حواریوں نے کہا: ہم اللہ کے مددگار ہیں، بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا.....)

اس حوالہ سے بظاہر کوئی حرج لازم نہیں آتا کہ ان کا ”اٰمَنَّا“ کہنا سابقہ ایمان کے اظہار کے طور پر ہو جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ایمان اور اسلام کے کئی مراتب و درجات ہیں کہ جن میں سے بعض درجات دوسرے بعض سے بالاتر اور مافوق ہیں۔

بلکہ اس سلسلہ میں درج ذیل آیت مبارکہ سے بھی استفادہ و استدلال ہو سکتا ہے:

سورہ مائدہ، آیت: ۱۱۱

○ ” وَاِذْ اَوْحٰیثُ اِلٰی الْحَوَارِیِّنَ اَنْ اٰمَنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ ۗ قَالُوْا اٰمَنَّا وَاَشْهَدُ بِاَنْتَ مُسْلِمُوْنَ “ (اور جب میں نے حواریوں کو وحی کی کہ تم مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ تو انہوں نے کہا ہم ایمان لائے

اور تو گواہ رہے کہ ہم ہی اسلام لانے والے ہیں)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اعلان کے جواب میں انہوں نے جو ”اٰمَنَّا“ کہا وہ خدائی وحی پر مبنی تھا جو ان پر نازل ہوئی تھی، اور ان پر وحی کے نزول سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ انبیاء تھے اور انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے سوال کے جواب میں جس ایمان کا اظہار کیا وہ ایمان کے بعد ایمان تھا، (گویا ایمانی مراتب و درجات کے حوالہ سے ایک بالا تر صورت و مرحلہ تھا)

اور ان کے بیان میں جملہ ”وَ اَشْهَدُ بِاَنَّ اُمَّسْلِمُوْنَ ۝۵۱ رَبَّنَا اٰمَنَّا بِمَا اَنْزَلْتَ وَ اتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ.....“ سے بھی مذکورہ بالا مطلب یعنی ایمان کے بعد ایمان کا ثبوت ملتا ہے، اور یہاں ”اسلام“ سے ان تمام احکام و دستورات کی عملی پیروی اور ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا مراد ہے جو خداوند عالم نے ان کیلئے صادر فرمائے ہیں اور ان سے تعلق رکھتے ہیں کہ کسی بھی بحث اور چوں و چرا کے بغیر ان فرامین کو عملی جامہ پہنائیں، اسلام کا یہ بلند درجہ صرف انہی اہل ایمان کا حصہ و خاصہ ہے جو صدق دل سے حق کو تسلیم کر چکے ہیں اور اس پر کامل صورت میں عمل پیرا ہوں نہ یہ کہ جو شخص ظاہری و زبانی طور پر توحید و نبوت کی گواہی دے وہ اس مقام و درجہ ایمانی کا حامل ہوگا۔

### مزید وضاحت

سابقہ مباحث میں ایمان اور اسلام کے مراتب و درجات کے حوالہ سے تفصیلی تذکرہ ہو چکا ہے اور واضح طور پر یہ بات ذکر ہو چکی ہے کہ ایمان کے ہر درجہ و مقام سے پہلے اسلام کا ایک درجہ و مقام ہوتا ہے، یعنی جو شخص اسلام کے اعلیٰ درجہ و مقام کو حاصل کر لیتا ہے وہ ایمان کے درجہ و مقام کو پالیتا ہے، چنانچہ جملہ ”اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَ اَشْهَدُ بِاَنَّ اُمَّسْلِمُوْنَ“ سے بھی اس کی تائید و تصدیق ہوتی ہے کیونکہ اس میں ایمان کو فعل کے صیغہ ”اٰمَنَّا“ کے ساتھ اور اسلام کو صفت کے صیغہ ”مُسْلِمُوْنَ“ میں ذکر کیا گیا ہے۔

بنا بریں اسلام کے ابتدائی مراتب و درجات میں سب سے پہلا درجہ و مقام اصل دین کو صدق دل سے تسلیم کرنا اور اجمالی طور پر اس کی گواہی دینا ہے اور اس کے بعد اس زبانی و ظاہری گواہی کا دل میں فی الجملہ یقین پیدا کرنا ہے، اس کے بعد (اسلام کے تیسرے مرتبہ و درجہ میں) ایمان کے معنی و حقیقت کو دل سے تسلیم کرنا ہے، جو شخص اسلام کے اس درجہ کو پالیتا ہے اس کے دل میں خدائی دستورات کی بابت کسی طرح سے بھی کوئی وسوسہ وغیرہ پیدا نہیں ہوتا، اسی کو دین کی عملی پیروی اور احکام خداوندی کو عملی جامہ پہنانے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد (ایمان کے دوسرے مرحلہ و درجہ میں) عمل میں خلوص اور تمام اعمال و افعال میں عبدیت و بندگی کی صفت کا پیدا ہونا ہے، اس کے بعد (اسلام کے تیسرے مرحلہ و درجہ میں) اللہ کی

محبت اور اس کے ارادہ پر تسلیم خم کرنا ہے کہ اس مرحلہ و درجہ میں بندہ جو کچھ چاہتا ہے اور جس چیز کا ارادہ کرتا ہے وہ صرف خدا کیلئے کرتا ہے اسے کوئی چیز اور کوئی کام خدا کی محبت کے دائرہ سے باہر نہ تو پسند آتا ہے اور نہ ہی زیب دیتا ہے بلکہ اس کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہی خدا کی محبت اور ارادہ الہی کی عملی پیروی قرار پاتا ہے، وہ صرف وہی کچھ پسند کرتا ہے جو خدا کو پسند ہو اور وہی کچھ چاہتا ہے جو خدا چاہے، گویا اس کی پسند و چاہت کا معیار خدا کی پسند و چاہت کے سوا کچھ نہیں ہوتا، وہ اپنی ذاتی ترجیحات کو ہرگز خاطر میں نہیں لاتا اور نہ ہی انہیں اہمیت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اس کی چاہتوں اور خواہشوں کا محور خدا کی چاہت ہوتی ہے۔ اس کے بعد (ایمان کے تیسرے درجہ و مرحلہ میں) تمام اعمال کا بندگی خدا کے سانچے میں ڈھل جانا ہے کہ ہر عمل عبادت کی حقیقی روح کا مظہر و آئینہ دار ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا مطالب کو ملحوظ و مد نظر رکھتے ہوئے اگر آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بیان میں مذکور ان الفاظ پر غور کریں جن میں انہوں نے کہا: ”فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا ۝۱۰ إِنَّ اللَّهَ سَرِيبٌ وَسَرِيبٌ كَمَا عَبَدُوا ۝۱۱ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ“ (تقوئے الہی اختیار کرو اور میری اطاعت کرو، بے شک خدا میرا اور تمہارا پروردگار ہے تم اسی کی عبادت کرو کہ یہی سیدھا راستہ ہے) تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آنجناب نے سب سے پہلے تقوئے الہی اختیار کرنے اور اپنی اطاعت کا حکم دیا پھر اس حکم کی بنیاد اور وجہ کو بیان کیا کہ ”إِنَّ اللَّهَ سَرِيبٌ وَسَرِيبٌ“ کیونکہ خدا میرا اور تمہارا رب ہے، یعنی اللہ تم سب لوگوں کا پروردگار ہے اور اپنے اس رسول کا بھی پروردگار ہے جسے اس نے تمہاری طرف بھیجا ہے، لہذا تم پر واجب ہے کہ تم اس پر ایمان لاتے ہوئے اس کا تقویٰ اختیار کرو اور میری پیروی کرتے ہوئے میری اطاعت کا دم بھرو، خلاصہ یہ کہ تم اس کی عبادت و پرستش کرو تقویٰ اختیار کر کے، اور رسول کی اطاعت کر کے، یعنی ایمان لا کر اور اتباع و پیروی کر کے!

یہ ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بیان کی روشنی میں حاصل ہونے والے مطالب کا خلاصہ، اسی بناء پر تقویٰ اور اطاعت کے حکم کے بعد اس کی علت و سبب کے بیان میں اسے اس جملہ میں تبدیل کر دیا: ”فَاعْبُدُوا ۝۱۱“ (تم اس کی عبادت کرو)، انہوں نے اس لئے ایسا کیا تا کہ تقویٰ و اطاعت کا خدا سے مربوط ہونا واضح ہو جائے اور ان دو امور یعنی تقویٰ و اطاعت کا خدا کی بندگی سے ربط آشکار ہو، اس کے بعد آنجناب نے اس عبادت و بندگی کو صراط مستقیم سے تعبیر فرمایا، اور اسے ایسا راستہ قرار دیا جو اپنے چلنے والے کو خدائے قدوس تک پہنچا دیتا ہے۔

اس کے بعد جب آنجناب نے اپنی قوم کے افراد سے کفر محسوس کیا اور ان کے عام (اکثر) افراد کی بابت مایوسی ظاہر ہوئی تو فرمایا: ”مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ“ (کون ہے جو راہ خدا میں میرا مددگار ہو؟) یعنی اس سیدھے راستے پر چلنے والوں کو بلانا جس کی طرف انہیں بلا رہے تھے کہ جو عبودیت و بندگی سے عبارت ہے یعنی تقویٰ و اطاعت! تو آپ کے اعلان اور بلاوے کے جواب میں حواریوں نے کہا: ”نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ“ ہم اللہ کے مددگار ہیں، پھر حواریوں نے اپنے جواب کی

وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور آپ گواہ ہوں کہ ہم ہی مسلمان ہیں، (اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاَشْهَدُ بِاَنَّ مُسْلِمُوْنَ) اس میں ان کا مقصد اسلام لانے سے یہ تھا کہ اس کی اطاعت و اتباع کرتے ہیں، اسی وجہ سے انہوں نے اپنے پروردگار سے بات کرتے ہوئے انکساری و کتیری کا اظہار کیا اور جو وعدہ حضرت عیسیٰؑ سے کیا تھا اس کو ذکر کرتے ہوئے کہا: ”رَبَّنَا اٰمَنَّا بِهَا اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ“ (پروردگارا ! ہم ایمان لائے اس پر جو تو نے نازل کیا اور ہم نے رسول کی پیروی کی)

تو اس میں انہوں نے ”اسلام“ (مسلمون) کو ”اتباع“ (اتَّبَعْنَا) میں تبدیل کر دیا اور ”اٰمَنَّا“ یعنی ایمان لانے کی بابت وسعت کے ساتھ کہا کہ جو کچھ تو نے نازل کیا ہے (بِهَا اَنْزَلْتَ) یعنی اللہ نے جو کچھ نازل کیا اس سب پر ایمان لانے کا اظہار کیا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہر اس چیز پر ایمان لائے جو خداوند عالم نے نازل کی کہ جس کی تعلیم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دی یعنی کتاب و حکمت اور تورات و انجیل، اور انہوں نے ان سب میں رسول کی پیروی کی، تو یہ مرحلہ جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں ایمان کا پہلا درجہ نہیں بلکہ اس کے اعلیٰ و بلند ترین درجات میں سے ہے۔

حواریوں نے اپنے اسلام اور اتباع رسول پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گواہ بنایا اور یوں نہیں کہا: ”اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاَشْهَدُ بِاَنَّ مُسْلِمُوْنَ“ (ہم اللہ پر ایمان لائے اور ہم مسلمان ہیں) یا اس کے ہم معنی الفاظ ذکر نہیں کئے بلکہ آنجنابؑ کو گواہ بنا کر اپنے عقیدہ کا اظہار کیا تاکہ وہ اپنے پروردگار کے سامنے اپنے اعتقاد کی بابت پختہ دلیل قائم کر سکیں چنانچہ انہوں نے یہ الفاظ ورد زبان کئے: ”وَاَشْهَدُ بِاَنَّ مُسْلِمُوْنَ ۝ رَبَّنَا اٰمَنَّا بِهَا اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ“ (پروردگارا ! ہم اس پر ایمان لائے جو کچھ تو نے نازل کیا اور ہم نے رسول کی پیروی کی، تو گویا انہوں نے کہا کہ پروردگارا ! یہ ہے ہمارا حال کہ جس پر تیرا رسول گواہ ہے۔

### گواہوں میں شمار کرنے کی درخواست

○ ”رَبَّنَا اٰمَنَّا بِهَا اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ“

اے ہمارے پروردگار ! تو نے جو کچھ نازل کیا ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے رسول کی پیروی کی ہے لہذا ہمیں گواہوں میں لکھ دے

یہ آیت دراصل حواریوں کا بیان ہے اور اس سے پہلے ”قالوا“ (انہوں نے کہا) کے الفاظ اس لئے حذف کئے گئے

تاکہ بیان کا متن براہ راست سامنے آ جائے، اور یہ روش و انداز قرآن مجید کے اسلوب و طرز سخن کی خصوصیات میں شامل ہے کہ اس سلسلہ میں پہلے وضاحت ہو چکی ہے۔

اس بیان میں حواریوں نے اپنے پروردگار سے درخواست کی کہ انہیں گواہوں میں شمار کرے (فَاكْتُنِبْنَا مَعَ الشَّهِيدِينَ) (ہمیں گواہوں میں لکھ دے) انہوں نے اپنی اس درخواست کو فاء تفریح (ف) کے ساتھ پیش کیا یعنی اسے اپنے ایمان اور اسلام کی فرع اور اس سے وابستہ نتیجہ قرار دے کر ذکر کیا کیونکہ رسول کا اپنی رسالت کی ذمہ داریوں کو ادا کر دینا اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب وہ قول و فعل میں خداوند عالم کی طرف سے نازل ہونے والے احکام و دستورات کو بیان کر دے یعنی دینی حقائق و معارف سے لوگوں کو آگاہ کرے اور خود ان پر عمل پیرا ہو، تو لوگوں کا گواہی دینا اسی صورت میں درست قرار پاتا ہے جب رسول انہیں تمام خدائی احکامات سے آگاہی دلا کر ان سے عملی ثبوت دیکھے تاکہ ان کی بنیاد پر وہ گواہ ہو کہ جس چیز کی طرف اس نے انہیں بلایا تھا وہ اس کے عین مطابق عمل پیرا ہیں اور اسی طرح لوگ بھی اسی صورت میں گواہی دے سکیں گے جب وہ رسول کے قول و فعل میں ہم آہنگی و مطابقت دیکھیں اور جن دستورات پر عمل کرنے کی دعوت اس نے لوگوں کو دی ان پر اسے بھی عمل پیرا پائیں کہ جس میں کوئی کمی و کوتاہی اور حد سے تجاوز نہ ہو۔ گویا دونوں صورتوں میں قول و فعل کی مطابقت ضروری ہے، اور یہاں حواریوں کی اپنے رب سے درخواست میں انہوں نے گواہوں میں لکھنے کی خواہش اس بناء پر ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان تمام احکامات و دستورات پر خود عمل پیرا دیکھا جن سے انجناب نے انہیں آگاہ فرمایا تھا لہذا ان کا گواہوں میں شمار کرنے کی درخواست دینا درست و بجا قرار پاتا ہے۔

بظاہر یہ وہی شہادت و گواہی ہے جس کا ذکر درج ذیل آیت مبارکہ میں ہوا ہے:

سورہ اعراف، آیت: ۶:

○ "فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ"

(ہم یقیناً ان سے باز پرس کریں گے جس کی طرف رسولوں کو بھیجا گیا اور یقیناً رسولوں سے بھی باز پرس کریں گے)

یہی گواہی درحقیقت تبلیغ پر گواہی ہے۔ اور جہاں تک درج ذیل آیت میں گواہوں میں شامل کئے جانے کی درخواست کا تعلق ہے تو اس میں تبلیغ پر گواہی مقصود نہیں بلکہ رسول کی برحق رسالت پر گواہی مراد ہے:

سورہ مائدہ، آیت: ۸۳:

○ "وَإِذْ أَسْمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۚ

يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّهِيدِينَ"



(اور جب انہوں نے رسول پر وحی نازل ہونے کا سنا تو آپ نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں حق کی معرفت کی

شوق میں اشک ریز ہو گئیں اور وہ کہنے لگے: پروردگارا! ہم ایمان لائے ہیں، ہمیں گواہوں میں لکھ لے)

بہر حال یہ مطالب ہی آیت مبارکہ سے بظاہر معلوم ہوتے ہیں تاہم اصل حقیقت کا علم خدا کو ہے۔

حواریوں کی درخواست کہ ”ہمیں گواہوں میں شمار کر لے“ سے یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ انہوں نے یہ درخواست

چونکہ رسول سے اپنے اسلام پر گواہی دینے کی درخواست کے بعد پیش کی لہذا اس سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم انہیں اعمال

کے گواہ بنائے جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ کی دعا میں مذکور تھا کہ انہوں نے کہا: ”رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا“ (سورہ بقرہ، آیت ۱۲۸)..... پروردگارا! ہمیں اپنے لئے سر تسلیم

خم کرنے والا بنا اور ہماری ذریت و اولاد میں سے ایک امت کو اپنا تابع فرمان بنا، اور ہمیں ہمارے اعمال کا مشاہدہ کروا.....

اس آیت کی تفسیر میں جو مطالب ہم نے ذکر کئے ہیں ان کا مطالعہ کریں تو مقصود واضح ہو جائے گا۔

## دونوں طرف سے مکر؟

○ ”وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرٌ الْمَاكِرِينَ“

(اور انہوں نے مکر کیا اور خدا نے مکر کیا، اور خدا بہتر مکر کرنے والا ہے)

اس آیت میں ”وَمَكَرُوا“ (انہوں نے مکر کیا) سے مراد بنی اسرائیل ہیں کہ جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام

کے خلاف سازش کی اور دھوکہ دہی کی، اس کی دلیل یہ جملہ ہے: ”فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ“ (جب عیسیٰ نے ان

سے کفر محسوس کیا)۔

اور جہاں تک اللہ کے مکر کرنے کی بات ہے تو اس سلسلہ میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۶ (وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا

الْفٰسِقِيْنَ) کی تفسیر میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے..... اور بیان کیا جا چکا ہے کہ اللہ کا مکر کرنا دراصل لوگوں کے مکر اور سازش و

چال کو ناکام بنانے کا مستحق رکھتا ہے.....

## خدا کا عیسیٰ سے خطاب

○ ” اِذْ قَالَ اللَّهُ لِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ”

(جب خدا نے کہا اے عیسیٰ میں تیرا وقت پورا کرنے والا ہوں)

” توقفی ” کا معنی کسی چیز کو پورا پورا لے لینا ہے، اسی مناسبت سے موت کو وفات پانا کہا جاتا ہے کیونکہ خداوند عالم موت کے وقت انسان کی پوری جان لے لیتا ہے، چنانچہ اس حوالہ سے قرآن مجید میں مختلف الفاظ کے ساتھ اس موضوع کو بیان کیا گیا ہے مثلاً:

سورۃ انعام، آیت: ۶۱

○ ” تَوَفَّيْتَهُمُ ارْسُلْنَا ”

(اسے ہمارے بھیجے ہوئے لے لیتے ہیں..... موت دیتے ہیں.....)

سورۃ بقرہ، آیت: ۱۱

○ ” وَقَالُوا عِزًّا إِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ أَإِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ..... قُلْ يَتَوَفَّاكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ ”

(اور انہوں نے کہا: کیا جب ہم زمین میں بوسیدہ ہو جائیں گے تو پھر ہم نئی خلقت پائیں گے..... کہہ دیجئے کہ تمہیں موت کا فرشتہ لے لے گا وہ کہ جسے تم پر مقرر کیا گیا ہے)

اس میں ”لے لے گا“ سے مراد ”موت دے گا“ ہے۔

سورۃ زمر، آیت: ۴۲

○ ” اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَازِلِهَا فِيمُسِّكُ الَّتِي قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأَخْرَىٰ ”

(اللہ جانیں لیتا ہے جب ان کی موت کا وقت آ جاتا ہے اور اس کی بھی جان لیتا ہے جو مرانہ ہو بلکہ نیند کی حالت میں ہو کہ اگر اس کی موت کا فیصلہ ہو چکا ہو تو خدا سے روک لیتا ہے ورنہ اسے جانے دیتا ہے)

مذکورہ بالا آیات میں سے آخری دو آیتوں میں غور و فکر کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لفظ ”توقفی“

قرآن مجید میں بمعنی موت کے استعمال نہیں ہوا بلکہ ”اخذ“ یعنی لینے اور پکڑنے اور محفوظ کرنے کے حوالہ سے موت کا معنی مقصود لیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ”توفی“ کا لفظ اس لحہ کے لئے استعمال ہوا جب موت آتی ہے تو جان لے لی جاتی ہے تاکہ یہ حقیقت واضح رہے کہ نفس انسانی اس موت کے آنے سے محو و نابود اور فنا نہیں ہو جاتا جس کے بارے میں جاہل لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ فنا اور مرٹ جانا ہے اور ختم ہو جانا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جانوں کو اپنے قبضہ میں لے لیتا ہے اور انہیں محفوظ کر لیتا ہے تاکہ قیامت کے دن انہیں اٹھائے کہ وہ اس کی طرف لوٹ آئیں، البتہ جہاں لفظ ”توفی“ سے جان لینے کا حوالہ مقصود و ملحوظ نہ ہو تو وہاں موت کا لفظ ہی استعمال کیا جاتا ہے مثلاً:

سورۃ آل عمران، آیت: ۴۴

○ ”وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ“

(اور نہیں ہے محمد مگر اللہ کا رسول، اس سے پہلے کئی رسول گزر چکے ہیں، تو کیا اگر وہ مر جائے یا اسے قتل کر دیا جائے تو تم پھلے پاؤں پلٹ جاؤ گے (دوبارہ کفر اختیار کر لو گے))

سورۃ فاطر، آیت: ۳۶

○ ”لَا يُفْضَىٰ عَلَيْهِمْ فَيَمُوتُوا“

(ان کا عذاب ختم نہیں ہوگا کہ وہ مر جائیں)

اس کے علاوہ دیگر متعدد آیات اس موضوع کی بابت موجود ہیں یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو آیات وارد ہوئی ہیں ان میں بھی لفظ موت ذکر ہوا ہے، ملاحظہ ہو:

سورۃ مریم، آیت: ۳۳

○ ”وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا“

(اور سلام ہو مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں گا اور جس دن دوبارہ زندہ اٹھایا جاؤں گا)

سورۃ نساء، آیت: ۱۵۹

○ ”وَأَنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لِيُؤْمِنُوا بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِمْ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا“

(اہل کتاب میں سے کوئی نہیں مگر یہ کہ وہ اس پر اس کی موت سے پہلے ضرور ایمان لائے گا اور وہ

قیامت کے دن ان لوگوں پر گواہ ہوگا)

بنا بریں یہ بات ثابت ہوئی کہ لفظ ”توفی“ صریح طور پر موت کے معنی میں نہیں۔

اس کے علاوہ مذکورہ بالا آیت یعنی سورہ نساء، ۱۵۹ میں خداوند عالم نے یہودیوں کے اس دعوے کو رد کرتے ہوئے کہ انہوں نے عیسیٰ بن مریم کو قتل کر دیا ہے یوں ارشاد فرمایا:

” وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ۚ بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝ وَإِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لِيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ ۗ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا “

(اور ان کا کہنا کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم کو جو اللہ کا رسول ہے اسے قتل کیا (درست نہیں) حالانکہ انہوں نے اسے قتل نہیں کیا اور نہ ہی اسے سولی پر لٹکایا ہے لیکن وہ غلط فہمی میں مبتلا ہوئے ہیں، اور جن لوگوں نے اس کے بارے میں اختلاف رائے پیدا کیا وہ اس کی بابت شک کا شکار ہوئے ہیں، انہیں اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں، وہ صرف گمان کی پیروی کر رہے ہیں، جبکہ انہوں نے یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے اسے اپنی طرف اٹھالیا ہے اور اللہ غلبہ والا اور دانائی والا ہے، اور اہل کتاب میں سے کوئی نہیں مگر یہ کہ وہ ضرور اس پر اس کی موت سے پہلے ایمان لائے گا اور وہ ان لوگوں پر قیامت کے دن رواہ ہوگا)۔

اس میں بھی ہمارے مدعا کی تصدیق پائی جاتی ہے کیونکہ یہودی دعویٰ کرتے تھے کہ انہوں نے عیسیٰ بن مریم کو قتل کر دیا ہے اور اسی طرح نصاریٰ بھی گمان کرتے تھے کہ یہودیوں نے عیسیٰ بن مریم علیہا السلام کو پھانسی دے کر قتل کر دیا ہے البتہ وہ یعنی نصاریٰ کا عقیدہ یہ تھا کہ قتل کئے جانے کے بعد خداوند عالم انہیں قبر سے نکال کر آسمان پر لے گیا، جیسا کہ موجودہ انجیل میں مذکور ہے، لیکن جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا کہ آیات مبارکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کئے جانے اور سولی پر لٹکائے جانے کے واقعہ کی واضح و صریح لفظوں میں تکذیب کرتی ہیں، اور آیت مبارکہ، ”وَأَنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَمَن يُؤْمِنُ بِهِ.....“ سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خداوند عالم کے پاس زندہ ہیں اور اس وقت تک انہیں موت نہ آئے گی جب تک تمام اہل کتاب ان پر ایمان نہ لائیں گے، اس بناء پر آج جناب کی تو فی کا معنی انہیں یہودیوں کے ہاتھوں سے لے لینا ہوگا لیکن اس کے باوجود آیت مبارکہ اس معنی پر بھی صراحت کے ساتھ دلالت نہیں کرتی بلکہ صرف اس میں ظہور رکھتی ہے، تاہم اس موضوع کی بابت سورہ نساء کی آخری آیات کی تفسیر میں تفصیلی بحث کی جائے گی۔

## عیسیٰؑ کا آسمان کی طرف اٹھایا جانا ؟

○ ”وَرَأَيْتُكَ إِلَىٰ وَمُطَهَّرِكَ مِنَ الذَّنَبِ إِنَّكَ كَفَرٌ ذَا“  
(اور تجھے میری طرف اٹھانے والا اور تجھے کافروں سے پاک کرنے والا ہے.....)

”رَأَيْتُكَ“ میں ”رافع“ اسم فاعل کا صیغہ ہے، اس کا معنی اٹھانے والا، بلند کرنے والا ہے، عربی زبان میں ”رفع“ کا معنی اٹھانا، بلند کرنا ہے، یہ ”وضع“ کے مقابلے میں آتا ہے جس کا معنی رکھنا، نیچا کرنا ہے۔ ”مُطَهَّرِكَ“ میں ”مطہر“ اسم فاعل ہے، یہ ”طہارت“ سے مشتق ہے جس کا معنی پاک ہونا ہے، یہ ”قذارت“ کے مقابلے میں آتا ہے جس کا معنی ناپاکی ہے، ”طہارت“ کے معنی کی بابت ہم پہلے بحث کر چکے ہیں، اور یہاں ”رَأَيْتُكَ“ کے ساتھ ”إِلَىٰ“ (میری طرف) ذکر کیا گیا ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں ”رفع“ یعنی اٹھائے جانے سے مراد معنوی و روحانی اٹھایا جانا ہے نہ کہ ظاہری و جسمانی، کیونکہ خداوند عالم کسی بلند مکان و جگہ میں نہیں جو کہ جسمانی جگہوں میں شمار ہوتی ہو کہ جس میں اجسام قیام پذیر ہوتے ہیں، وہ نہ تو جسم و جسمانیات والی جگہوں میں ہے اور نہ ہی اس معنی میں اس کی بابت قرب و بعد یعنی نزدیک ہونا اور دور ہونا قابل تصور ہے بلکہ یہاں ”إِلَىٰ“ اس ”إِلَىٰ“ کے باب سے ہے جو آیت کے ذیلی جملہ میں یوں مذکور ہے: ”ثُمَّ إِلَىٰ مَرْجِعِكُمْ“ (پھر تمہاری بازگشت میری طرف ہوگی)، بالخصوص جب ”توفیقی“ سے مراد، روح کا قبض کیا جانا ہو تو مزید واضح ہو جائے گا کہ ”رفع“ سے مراد معنوی و روحانی بلندی ہے یعنی بلندی درجہ اور خدائے تعالیٰ کا قرب ! اس کی مثال درج ذیل آیتوں میں بھی پائی جاتی ہے :

سورہ آل عمران، آیت: ۱۶۹

○ ”أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ“

(وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس)

اس میں خدا کی راہ میں شہید ہونے والوں کی زندگی کا تذکرہ ہے اور یہ کہ وہ خدا کے پاس روزی پاتے ہیں تو یہاں

”خدا کے پاس“ کا مطلب مکانی طور پر پاس ہونا نہیں۔

اور حضرت ادریسؑ کے بارے میں یوں ارشاد ہوا:

سورۃ مریم، آیت: ۵۷

○ ”وَرَأَوْا فَعُنَّةٌ مَّكَانًا عَلِيًّا“

(اور ہم نے اسے بلند جگہ پر اٹھالیا)

اس میں بھی بلند جگہ سے مراد بلندی مرتبت و رفعتِ شان ہے نہ کہ مادی جگہ پر لے جانا!

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کی بابت ایک قول یہ ہے کہ انہیں بلند کئے جانے اور اٹھائے جانے سے مراد یہ ہے کہ انہیں روح و بدن دونوں کے ساتھ زندہ حالت میں آسمان کی طرف اٹھایا گیا کیونکہ قرآن مجید سے بظاہر یہی ثابت ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے آنجنابؑ کو زندہ حالت میں آسمان پر اٹھایا جو کہ مادی و جسمانی ہے اور وہی خداوند عالم کے قرب کا مقام، نزول برکات کی جگہ اور مکرم فرشتوں کا مسکن و قیام گاہ ہے، اگر ہمیں توفیق حاصل ہوئی تو ہم بہت جلد سماء (آسمان) کی حقیقت کے بارے میں تفصیلی ذکر کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔

آیت مبارکہ میں پہلے آنجنابؑ کی توفی، پھر ان کا آسمان کی طرف اٹھایا جانا اور پھر انہیں کافروں سے پاک کیا جانا مذکور ہے، گویا کافروں سے پاک کیا جانا آسمان کی طرف اٹھائے جانے کے بعد اور اس کی فرع و مربوط امر کی حیثیت رکھتا ہے اس سے بھی کافروں سے پاک کئے جانے کا معنوی و روحانی ہونا ثابت ہوتا ہے نہ کہ ظاہری و جسمانی پاک ہونا! اور اس سے مراد آنجنابؑ کی کافروں سے دوری، ان کے ساتھ مل جل کر رہنے سے بچنا اور ان کے کفر و الحاد سے بھرنے ہوئے معاشرہ کا فرد قرار نہ پانا ہے۔

## مؤمنین کی کافروں پر برتری

○ ”وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ“

(اور جن لوگوں نے تیری پیروی نہیں قیامت تک کافروں پر برتری دینے والا ہوں)

اس آیت میں خداوند عالم کا وعدہ ذکر کیا گیا ہے جو اس نے عیسیٰ علیہ السلام سے کیا کہ بہت جلد ان کے پیروکاروں کو ان کی نبوت کا انکار کرنے والوں پر برتری عطا کرے گا، اور یہ برتری قیامت کے دن تک باقی رہے گی، خداوند عالم نے برتری پانے والوں اور ان کے مد مقابل لوگوں کے تقابلی تذکرہ میں ان دونوں گروہوں کی علامات و نشانیاں اور صفات یہ ذکر کیں کہ برتری پانے والے وہ ہیں جنہوں نے عیسیٰؑ کی پیروی کی اور ان کے علاوہ وہ لوگ ہیں

جنہوں نے عیسیٰؑ کا انکار کر دیا یعنی انہیں اللہ کا نبی نہ مانا، یہاں اللہ تعالیٰ نے ان گروہوں میں سے کسی کا نام ذکر نہیں کیا یعنی بنی اسرائیل یا یہودیوں کا نام لئے بغیر صرف ”عیسیٰؑ کی پیروی کرنے والے“ اور ”اس کا انکار کرنے والے“ کے الفاظ ذکر کئے، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے برتری کے معیار اور اس سے محروم ہونے والوں کے سبب سے آگاہی دلانا چاہی، کہ جنہوں نے عیسیٰؑ کی مخالفت کی وہ کافر ہو گئے، اس سے ثابت ہوا کہ عیسیٰؑ کی پیروی کرنے سے مراد حق کی پیروی کرنا ہے یعنی خدا کی رضا و خوشنودی کی پیروی کرنا، بنا براین جملہ ”الَّذِينَ اتَّبَعُواكَ“ (وہ لوگ جنہوں نے تیری پیروی کی) صرف ان نصاریٰ پر صادق آئے گا۔ جنہوں نے ظہور اسلام سے پہلے اور اسلام کے ذریعے دین عیسیٰؑ کے منسوخ ہو جانے سے پہلے آجیناب کی پیروی کرتے رہے اور اس پر استقامت و پابنداری دکھائی، اور ان کے ساتھ ساتھ ان مسلمانوں پر بھی صادق آتا ہے جنہوں نے ظہور اسلام کے بعد اسلام کے سایہ میں حق کی پیروی کا دم بھرا اور اس پر قائم رہے کہ نتیجتاً وہ بھی حق کی پیروی کرنے کے حوالہ سے عیسیٰؑ علیہ السلام کے پیروکاروں میں شمار ہوں گے۔

اس سے ثابت ہوا کہ برتری سے مراد مادی طاقت و سلطنت کی بنیاد پر دوسروں سے مافوق ہونا نہیں بلکہ دلیل و منطق اور عقیدہ میں پختگی کی بناء پر برتری مقصود ہے، لہذا آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ”تیرے پیروکار خواہ وہ نصاریٰ میں سے ہوں یا مسلمانوں میں سے ہوں بہت جلد اپنی دلیل و منطق اور درست اعتقاد کی بنیاد پر ان یہودیوں پر برتری پائیں گے جنہوں نے تیرا انکار کیا اور یہ برتری قیامت تک باقی رہے گی۔“

یہ ہے وہ معنی جو آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین نے پیش کیا ہے اور اسے دیگر مفسرین نے بھی پسند کیا۔

لیکن میری نظر میں آیت مبارکہ کے الفاظ اور معانی دونوں سے اس رائے کی صحت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ آیت مبارکہ کے ظاہری الفاظ ”إِنِّي مُتَوَقِّئُكَ وَسَرَأْفَعُكَ إِلَىٰ وَمُطَهَّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ“ مستقبل کے حالات کی خبر دیتے ہیں کہ بہت جلد یعنی اب سے تھوڑے عرصہ کے بعد یہ تینوں امور واقع ہوں گے (توئی، آسمان پر اٹھایا جانا اور کافروں سے پاک کیا جانا) اور جملہ ”وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ.....“ ایک اچھے وعدہ اور خوشخبری پر مشتمل ہے جس کا بہت جلد وقوع پذیر ہونا یقینی امر ہے، اور یہ بات واضح ہے کہ حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کے پیروکاروں کی دلیل و حجت درحقیقت حضرت عیسیٰؑ ہی کی دلیل و حجت ہے اور وہ وہی ہے جس کا تذکرہ خداوند عالم نے ان آیات مبارکہ میں فرمایا ہے جن میں حضرت مریمؑ کو بشارت دی گئی اور وہ ایسی دلیل ہیں جو حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کے زمانہ حضور میں بھی برتری رکھتی تھیں اور ان کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے کے بعد بھی برتری کی حامل تھیں، بلکہ ان کے زمانہ حضور میں زیادہ مضبوط اور مخالفوں و کفار کا منہ توڑنے والی تھیں اور حق کے منکروں کے شبہات کو دور کرنے والی تھیں، اس بناء پر یہ معنی کیونکر درست قرار دیا جاسکتا ہے کہ مستقبل میں تیرے پیروکاروں کی

دلیل و حجت مخالفین پر فوقیت و غلبہ پالے گی؟ اور پھر اس فوقیت و غلبہ کو ”إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ“ کے الفاظ کے ساتھ ذکر کرنے کا کیا معنی ہے؟ جبکہ حجت و دلیل کے غلبہ کی بابت زمانی قید وغیرہ کے ذکر کی ضرورت ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کا کسی وقت سے مربوط قرار دیا جانا ہی بے معنی ہے، اور اس سے بالاتر یہ کہ دلیل و حجت کا غلبہ و برتری قیامت کے دن بھی اپنے حال پر باقی ہو گی جیسا کہ قیامت کے دن سے مربوط آیات مبارکہ میں اس دن کے حالات کے تذکرہ سے ثابت ہوتا ہے۔

## دلیل و حجت کی برتری؟

اس مقام پر ایک سوال ممکن ہے کہ دلیل و حجت کی برتری سے مراد شاید اس کے مقبول عام ہونے کے حوالہ سے ہے اور وہ اس طرح کہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کی دلیل و حجت پر زیادہ کان دھریں گے اور زیادہ اس کی اطاعت کریں گے کہ جس کے نتیجہ میں عیسیٰؑ کے پیروکاروں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا، ان کی بنیاد مضبوط ہوگی اور ان کی اجتماعی و ملی قوت بڑھ جائے گی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس امکانی و احتمالی رائے کی بازگشت یا تو اس بات کی طرف ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حقیقی پیروکاروں کو سلطنت و حاکمیت اور معاشرتی قوت کے حوالہ سے برتری حاصل ہوگی جو کہ امر واقعہ کے خلاف ہے، اور یہ احتمال کہ آیت مبارکہ میں مستقبل کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ آخر الزمان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں میں کچھ لوگ ایسے بھی آئیں گے جو مخالفین پر برتری و غلبہ پائیں گے، یہ وہ بات ہے جس کی تصدیق و تائید آیت کے الفاظ سے نہیں ہوتی، یا اس احتمالی رائے کی بازگشت اس بات کی طرف ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کی تعداد بڑھ جائے گی وہ کثیر تعداد میں ہوں گے اور آیت میں ان کی برتری سے مراد یہ ہے کہ وہ کافروں پر غلبہ پائیں گے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد حق والے افراد باطل والوں سے زیادہ ہو جائیں گے۔ لیکن یہ بات بھی امر واقعہ کے خلاف ہے اور میدانی حقائق سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد سے لے کر اب تک یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ اہل باطل کی تعداد بڑھ رہی ہے اور وہ اہل حق کے مقابلے میں زیادہ تعداد میں ہیں جبکہ آنجنابؑ کے بعد ہمارے زمانہ تک تقریباً بیس صدیاں گزر چکی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ آیت کے الفاظ سے بھی اس کی تائید نہیں ہوتی کیونکہ آیت مبارکہ میں فوقیت و برتری کا جو تذکرہ ہوا ہے اگر اسے اس تناظر میں دیکھا جائے کہ اس میں یہودیوں پر خداوند عالم کی ناراضگی اور غیض و غضب نازل ہونے کی خبر دی گئی ہے تو اس صورت میں فوقیت و برتری ان کے تسلط و غلبہ کے حوالہ سے متصور ہوگی خواہ وہ دلیل و حجت کی بنیاد پر حاصل ہو یا سلطنت و اقتدار کی حیثیت میں ہو، لیکن تعداد کی کثرت کی بنیاد پر برتری کا کوئی ثبوت آیت سے نہیں ملتا جیسا کہ اس کے



الفاظ اور سیاق و سباق سے ظاہر ہے۔

## ایک اہم نکتہ

آیت مبارکہ میں دونوں فریقوں کے بارے میں جو الفاظ ذکر ہوئے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) ”الَّذِينَ اتَّبَعُوا“

(۲) ”الَّذِينَ كَفَرُوا“

یعنی ”وہ لوگ جنہوں نے تیری پیروی کی“ اور ”وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا“۔

تو جملہ فعلیہ کسی کام کے واقع ہونے اور انجام پانے پر دلالت کرتا ہے نہ یہ کہ وہ کام صفت کی صورت میں ہے یہ ”متبعین“ اور ”کافرین“ کہ ان الفاظ سے اتباع اور کفر پر قائم ہونا سمجھا جاتا ہے: اور یہ بات واضح ہے کہ کسی امت کے بعض افراد کی طرف سے کسی کام کا کیا جانا جبکہ امت کے دیگر افراد اس پر راضی ہوں اور عملی طور پر اس کام کو انجام بھی دیں یعنی اسی طریقہ و روش کو اپنائیں جو ان بعض افراد نے اپنائی اس کام کی امت کے تمام افراد کی طرف نسبت کو درست قرار دینا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں یہودیوں کو ان کے اسلاف کے متعدد افعال کے حوالہ سے سرزنش ہوئی ہے مثلاً انبیاء کو قتل کرنا اور انہیں اذیت و تشدد کا نشانہ بنانا، خداوند عالم کے فرامین و دستورات پر عمل کرنے سے تکبر و مرتابی کرنا اور کتاب خدا کی آیات میں تحریف کرنا وغیرہ، تو ان اعمال کی وجہ سے جو ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں نے انجام دیئے ان کو مورد خطاب قرار دیا گیا، بنا بریں ”الَّذِينَ كَفَرُوا“ (وہ لوگ، جنہوں نے کفر اختیار کیا) سے یہودی اور ”الَّذِينَ اتَّبَعُوا“ (وہ لوگ جنہوں نے پیروی کی) سے نصاریٰ مراد لینا درست و صحیح ہے، اور نصاریٰ کے اسلاف کے اعمال کی بنیاد پر اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے اور آنجناب کی پیروی کے حوالہ سے سب کو ایک ہی نگاہ سے دیکھا جائے گا، البتہ ان کے ایمان سے مراد حقیقی و درست عقیدہ ہے کہ جو خدا کے نزدیک پسندیدہ اور مورد قبول ہے اسی کے حوالہ سے انہیں یہودیوں پر فوقیت و برتری عطا کرنے کا ذکر ہوا ہے، نہ کہ ان نصاریٰ کے عقیدہ کے حوالہ سے کہ جنہوں نے دعوت اسلام کے ظاہر ہونے سے پہلے تثلیث یعنی تین خداؤں کے نظریہ کی پیروی کی، لہذا آیت مبارکہ میں برتری و فوقیت سے مراد یہ ہے کہ نصاریٰ یعنی وہ لوگ جن کے اسلاف نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی کی انہیں یہودیوں یعنی ان لوگوں پر جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا اور آنجناب کے ساتھ مکرو فریب کے مرتکب ہوئے، برتری حاصل ہوگی، گویا اس مقام پر اصل مقصد یہ ہے کہ یہودیوں کا خدا کے غضب و ناراضگی سے دوچار ہونا، خدا کے مکر کا نشانہ بننا اور ان کی پوری قوم پر خدائی عذاب کا شدید ترین شکل میں نازل

ہونا بیان کیا جائے، اور ہم نے ابتدائے سخن میں جو ذکر کیا ہے کہ ان کے اتباع و پیروی کرنے سے مراد اتباع حق ہے کہ جس کی بناء پر انہیں فوقیت حاصل ہوگی اس سے یہودیوں پر خدائی غضب و ناراضگی وغیرہ کی بات سے کسی طرح کا بیانی تضاد لازم نہیں آتا اور نہ ہی معنی میں ایک دوسرے کی نفی کا پہلو پیدا ہوتا ہے، چنانچہ اس کی تائید و تصدیق بعد والی آیت مبارکہ میں اسلوب سخن کی تبدیلی سے ہوتی ہے کہ جس میں ارشاد ہوا: ”وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ .....“ (اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیئے.....)، کیونکہ اگر ”الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ“ (وہ لوگ جنہوں نے تیری پیروی کی) سے نصاریٰ میں سے اہل حق افراد اور مسلمان مراد ہوتے تو موزوں یہ تھا کہ یوں کہا جاتا: ”وَأَمَّا الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ“ (اور وہ لوگ جنہوں نے تیری پیروی کی انہیں ان کا پورا پورا اصلہ دیا جائے گا) اور سیاق کلام اور طرز بیان کو تبدیل نہ کیا جاتا، لہذا ”الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ“ کے بعد ”وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا.....“ کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ پیروی کرنے والوں سے حقیقی اور ظاہری دونوں طرح کے پیروی کرنے مراد ہیں کہ اگر صرف حقیقی پیروی کرنے والے مراد ہوتے تو بیان کے تسلسل میں یک رنگی برقرار رہتی۔

اس مقام پر ایک نظریہ یہ بھی موجود ہے کہ ”الَّذِينَ اتَّبَعُوا“ (وہ لوگ جنہوں نے پیروی کی) سے تمام نصاریٰ اور تمام مسلمان مراد لئے جائیں اور یہ کہا جائے کہ آیت مبارکہ اس بات کی خبر دے رہی ہے کہ یہودی قیامت تک ان لوگوں کے ہاتھوں ذلیل و خوار رہیں گے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی کو واجب و لازم سمجھتے ہیں، تو یہ بھی سابقہ بیان کی طرح ہے، اگر اس میں بخوبی غور و فکر کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ بات آیت کی تفسیر کے حوالہ سے سب سے بہترین ہے۔

## قیامت کے دن کا تذکرہ

○ ”ثُمَّ إِلَىٰ مَرْجِعِكُمْ فَأَخْلَمَ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ وَتَخْتَلِفُونَ“

(پھر تمہاری بازگشت میری طرف ہوگی تو میں اس کے بارے میں فیصلہ کروں گا جس کی بابت تم آپس میں اختلاف کرتے ہو)

اس آیت میں خداوند عالم نے عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں اور ان کا انکار کرنے والوں سے مجموعی طور پر خطاب کیا ہے اور فرمایا ہے کہ سب کی بازگشت قیامت کے دن میری طرف ہوگی، اس بیان سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ اختتام پذیر ہوا کہ جس میں ان کی والدہ کو ان کی ولادت کی خوشخبری دیئے جانے سے لے کر ان کی دعوت حق اور اس سے مربوط امور اور انجام کار تک مطالب شامل ہیں۔

## کافروں کا برا انجام

○ ” فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأَعَذَّبْنَا بَعْضَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَأَلَاخِرَةُ.....“  
(لیکن وہ لوگ جو کافر ہوئے تو میں انہیں سخت ترین عذاب میں مبتلا کروں گا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی.....)

بظاہر یہ آیت، جملہ ”فَأَحْكَمَ بَيْنَكُمْ“ کی فرع اور اس سے مربوط ہے، گویا اس جملہ کے اجمال کی تفصیل ہے، یعنی جو مطلب اس میں بطور اجمال ذکر کیا گیا تھا (کہ خدا قیامت کے دن فیصلہ کرے گا) یہ اس کی تفصیل ہے اور وہ یہ کہ خداوند عالم قیامت کے دن یہودیوں کو سخت عذاب میں مبتلا کر کے انہیں کیفر کردار تک پہنچائے گا اور ایمان والوں کو ان کا پورا پورا اجر عطا کرے گا۔

لیکن آیت میں عذاب کا دنیا میں ہونا بھی مذکور ہے ”فِي الدُّنْيَا“، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت مبارکہ، جملہ ”فَسَاخَمَ بَيْنَكُمْ“ کی فرع اور اس سے ہی مربوط نہیں بلکہ پورے جملہ ”وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ثُمَّ إِلَىٰ مَرْجِعِكُمْ فَأَحْكَمَ بَيْنَكُمْ.....“ کی فرع اور اس سے مربوط ہے، اس بناء پر یہ بات ثابت ہوگی کہ جعل (وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ) یعنی برتر و مافوق قرار دیا جانا اور رجوع یعنی سب کی خدا کی طرف بازگشت کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ کافر، دنیا میں ان لوگوں کے ہاتھوں شدید ترین عذاب کا شکار ہوں گے جنہیں خداوند عالم نے ان پر فوقیت دی اور برتری عطا فرمائی، اور آخرت میں جہنم کی آگ میں جلیں گے، اور کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ ہوگا۔

یہ مطلب اپنے مقام پر ان شواہد میں سے ایک ہے جن سے ثابت ثابت ہوتا ہے کہ آیت مبارکہ میں فوقیت و برتری سے مراد دلیل و حجت کے ذریعے برتری عطا کرنا نہیں بلکہ سلطنت و طاقت کے ذریعے بالادستی مراد ہے۔

اور جملہ ”وَمَا لَهُمْ مِّنْ نَّاصِرِينَ“ سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ لوگ قیامت کے دن شفاعت سے محروم ہوں گے کہ جو عذاب کو روک سکتی ہے، اور جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ بات یہودیوں کے بارے میں خدا کا حتمی و یقینی فیصلہ ہے۔

شفاعت کے حوالہ سے تفصیلی بحث اس سے مربوط آیات مبارکہ کی تفسیر میں ہو چکی ہے اور آئندہ مباحث میں بھی موضوع کی مناسبت سے مربوط مطالب بیان کئے جائیں گے انشاء اللہ، م

## ایمان والوں کا پورا پورا اجر

○ ” وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ.....“  
(اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیئے تو خدا انہیں ان کا پورا پورا صلہ و اجر دے گا.....)

اس آیت میں ان اہل ایمان کے ساتھ کیا جانے والا خدائی وعدہ مذکور ہے جنہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی پیروی کی، اس میں انہیں جزائے خیر کی خوشخبری دی گئی ہے، لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ صرف ظاہری طور پر پیروکار کہلانا عظیم اجر و ثواب کا سبب نہیں ہو سکتا کیونکہ سابق الذکر مطالب کی روشنی میں آپ اس امر سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ اجاب و پیروی ایک ایسی صفت ہے جو کسی امت پر اس کے ان افراد کے حوالہ سے صادق آتی ہے جو واقعی و حقیقی معنی میں اسے اپناتے ہیں البتہ اس کا اثر جمیل اور ثواب جزیل صرف اسے حاصل ہوتا ہے جو عملی طور پر حقیقی معنی میں اسے اپناتا اور اختیار کرتا ہے اور جو صرف ظاہری و زبانی طور پر پیروکار کہلائے وہ اس اجر و ثواب سے بہرہ ور نہیں ہوتا، اسی بناء پر اس آیت میں ” الَّذِينَ اتَّبَعُونَ“ (جنہوں نے تیری پیروی کی) کے الفاظ کو تبدیل کر کے ” الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ“ کہا گیا تاکہ اصل مقصد واضح وثابت اور ظاہر و آشکار ہو سکے کیونکہ سعادت و خوش بختی اور نیک انجام کا دار و مدار حقیقت پر ہوتا ہے صرف نام پر نہیں ہوتا، جیسا کہ درج ذیل آیت مبارکہ سے اس مسلمہ حقیقت کا ثبوت ملتا ہے:

سورۃ بقرہ، آیت: ۶۲

○ ” إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّبِيَّانَ مَنِ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ“

(وہ لوگ جو ایمان لائے اور وہ جو یہودی، نصرانی اور صابئین ہیں ان میں سے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے اور عمل صالح انجام دے تو ایسے لوگوں کے لئے ان کے رب کے پاس اجر ہے اور انہیں نہ تو کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے)

تو زیر نظر آیت مبارکہ میں جس اجر و ثواب کا ذکر ہوا ہے وہ حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کے ان پیروکاروں کے لئے مخصوص ہے جو ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیئے، ان لوگوں کو خداوند عالم ان کے اعمال کا پورا پورا صلہ عطا فرمائے گا، اور جو ان کے علاوہ ہیں یعنی صرف ظاہری طور پر پیروکار کہلانے والوں کو کچھ حاصل نہ ہوگا، چنانچہ اسی مطلب کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے آیت کے آخر میں یہ الفاظ ذکر ہوئے: ”وَاللّٰهُ لَا يَحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ“ (اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا)، انہی الفاظ سے آیت کے اختتام کا راز بھی ظاہر ہوتا ہے کیونکہ یہ آیت رحمت و جنت کی آیات میں سے ایک ہے اور عموماً اس طرح کی آیات کہ جو رحمت و نعمت کے ذکر پر مشتمل ہوتی ہیں ان کے اختتام میں رحمت و مغفرت کے اسماء ذکر کئے جاتے ہیں یا ان لوگوں کی مدح و تعریف ہوتی ہے جن کی شان میں آیت کا نزول ہوتا ہے، ملاحظہ ہو:

سورۃ حدید، آیت: ۱۰

○ ”وَكُلًّا وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْفٰى ۙ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ حٰبِيْرٌ“

(اور سب سے اللہ نے اچھا وعدہ کیا ہے، اور اللہ تمہارے اعمال سے بخوبی آگاہ ہے)

سورۃ تغابن، آیت: ۱۷

○ ”اِنْ تَقْرَضُوْا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لِّيُضْعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ شَكُوْرًا حَلِيْمٌ“

(اگر تم اللہ کو نیک قرض دو تو وہ تمہیں اس کا دو گنا دے گا اور وہ تمہاری مغفرت کرے گا، اور اللہ بڑا شکر گزار و

بردار ہے)

سورۃ تغابن، آیت: ۹

○ ”وَمَنْ يُؤْمَرْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صٰلِحًا يَّكْفُرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنَّتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ۗ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ“

(اور جو شخص اللہ پر ایمان لائے اور عمل صالح انجام دے تو خدا اس کی خطاؤں سے درگزر کرے گا اور

اسے ان باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں چلتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہی بہت

بڑی کامیابی ہے)

سورۃ جاثیہ، آیت: ۳۰

○ ”فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۗ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ

الْمُبِيْنُ“

(لیکن وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ انجام دیئے تو انہیں ان کا پروردگار اپنی رحمت میں داخل

کرے گا کہ یہ واضح کامیابی ہے)

اور اس طرح کی دیگر آیات میں عملی پیروی کا ذکر ہوا ہے، اور زیر نظر آیت مبارکہ میں جملہ ”وَاللّٰهُ لَا يَحِبُّ

الظّٰلِمِيْنَ“ دراصل انہی افراد کے بارے میں ہے جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی کا ظاہری دعویٰ کیا مگر عملی



جو وفد حضرت پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اس کا پس منظر و پیش منظر واضح ہو سکے، لہذا ضروری تھا کہ آنجنابؐ کے حوالہ سے تفصیلی بحث و گفتگو کے بعد ان کی خلقت کی طرف اجمالی اشارہ ہوتا کہ یہ حقیقت ثابت و آشکار ہو جائے کہ ان کی ولادت ایک انسان کی ولادت ہی کی طرح تھی اس کے علاوہ نہیں یعنی وہ بھی اسی طرح دنیا میں آئے جس طرح حضرت آدم علیہ السلام آئے اور ان کی تخلیق چونکہ حضرت آدمؑ جیسی تھی لہذا ان کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ کہنا صحیح نہیں جو حضرت آدمؑ کے بارے میں کہا جاتا ہے یعنی یہ کہ وہ ایک بشر ہیں جنہیں خداوند عالم نے باپ کے بغیر پیدا کیا۔

یہاں آیت مبارکہ کا معنی یوں ہوگا: عیسیٰؑ کی مثال اللہ کے نزدیک آدمؑ جیسی ہے یعنی خداوند عالم کے ہاں عیسیٰؑ کی تخلیق کی بنیاد اور کیفیت آدمؑ جیسی ہے کہ اس نے جس طرح آدمؑ کو پیدا کیا اسی طرح عیسیٰؑ کو پیدا کیا اور وہ یوں کہ اس کے اجزاء مٹی سے اکٹھے کئے پھر اس سے کہا: ”ہو جا“ تو وہ بغیر باپ کے بشر کی صورت میں وجود میں آ گیا۔

اس بیان سے حقیقی معنی میں دو مضبوط دلیلیں تشکیل پاتی ہیں کہ جن میں سے ہر ایک حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کی الوہیت کی نفی میں کفایت کرتی ہے:

### پہلی دلیل:

حضرت عیسیٰؑ خدا کی مخلوق ہیں اور چونکہ خداوند عالم ان کی خلقت سے پورے طور پر آگاہ ہے اور وہ اپنی آگاہی و علم میں ہرگز غلطی نہیں کر سکتا، اس نے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں بتایا ہے کہ اس نے اسے بشری خلقت عطا کی اور وہ میری مخلوق ہے اگرچہ اس کا باپ کوئی نہیں لیکن اس کا مخلوق ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ عبد ہے رب نہیں (بندہ ہے خدا نہیں)۔

### دوسری دلیل:

حضرت عیسیٰؑ کی خلقت میں حضرت آدمؑ کی خلقت سے زائد کچھ نہیں پایا جاتا کہ جس کی بناء پر انہیں بشریت سے ربوبیت کا مقام حاصل ہو، اگر حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کی خلقت کی کیفیت اس بات کی متقاضی ہو کہ انہیں خدائی کا مقام دیا جائے تو حضرت آدمؑ کی خلقت بھی اسی کی متقاضی ہوگی جبکہ حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کو خدا ماننے والے حضرات حضرت آدمؑ علیہ السلام کے بارے میں اس طرح کا عقیدہ نہیں رکھتے، لہذا واجب ہے کہ اس طرح کی بات یعنی خدائی کا عقیدہ حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کے بارے میں بھی نہ رکھیں کیونکہ دونوں کی تخلیقی مماثلت یہی تقاضا کرتی ہے۔

بہر حال آیت مبارکہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ عیسیٰؑ کی خلقت آدمؑ کی خلقت کی طرح طبعی و مادی خلقت تھی اگرچہ اس کی کیفیت اس طور و طریقہ سے قطعاً مختلف تھی جو بنی نوع آدم کے توالد و تناسل کی بابت جاری و ساری ہے کہ جس میں کسی

بچہ کا وجود میں آنا باپ کے ذریعے ہوتا ہے، اور جملہ ”فَبَيِّنُونَ“ گزرے ہوئے حال کو بیان کرتا ہے، اور اس سے جملہ ”ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ“ جو کہ فوریت اور عدم تدریج پر دلالت کرتا ہے سے نفی و تضاد کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہوتا کیونکہ نسبتیں مختلف ہیں اور یہ تمام موجودات خواہ تدریجی الوجود ہوں یا غیر تدریجی الوجود (یعنی ان کا وجود میں آنا تدریجی طور پر اور تخلیق و تکوین کے مراحل طے کرنے کے بعد ہو یا دفعتاً اور کسی طرح کے مراحل طے کرنے کے بغیر ہو) سب خداوند عالم کی مخلوق اور اس کے اس امر سے وجود میں آئی ہیں جسے کلمہ ”کن“ سے تعبیر کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد الہی ہے: ”إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذْ أَوْسَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ“ (سورہ یس، آیت ۸۲) اور جب ان موجودات کی بابت تجزیہ و تحلیل کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کثیر موجودات تدریجی صورت میں وجود میں آئی ہیں لیکن یہ اس حوالہ سے ہے کہ ان کا وجودی تجزیہ ان کے تدریجی اسباب کی بناء پر کیا جائے، اور اگر ان کی بابت خدا سے تعلق کے حوالہ سے تجزیہ کیا جائے تو اس میں تدریجی صورت یا زمانی فاصلہ ہرگز ملحوظ نہیں ہوتا جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے:

سورہ قمر، آیت: ۵۰

○ ”وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ“

(ہمارا امر صرف ایک ہے جو آنکھ جھپکنے جیسا ہے)

اس موضوع کی بابت مزید تفصیل اس کے مقام پر ذکر ہوگی، انشاء اللہ تعالیٰ،

مذکورہ بالا مطالب کے علاوہ جو نہایت اہم نکتہ اس مقام پر قابل ذکر و لائق بیان ہے وہ یہ کہ جملہ ”ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ“ سے اس حقیقت کا کھلا ثبوت ملتا ہے کہ خداوند عالم کسی چیز کی تخلیق میں اسباب کا محتاج نہیں کہ جن کی وجہ سے اس کی پیدا کردہ موجودات کی کئی قسمیں ہو جائیں کہ جن میں سے بعض کا پیدا کرنا ممکن اور بعض کا محال و ناممکن، بعض کا آسان اور بعض کا مشکل، بعض کا نزدیک اور بعض کا دور ہو، بلکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ اس کے نظام تخلیق میں اسباب کا مختلف ہونا موثر نہیں ہوتا بلکہ وہ جو کچھ چاہتا ہے اور جسے پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے اس سے کہتا ہے ”ہو جا“ تو وہ ہو جاتا ہے اور پھر اسے ان عام و معمول کے اسباب کی ضرورت نہیں ہوتی جو کسی چیز کے وجود میں آنے میں دخل ہوتے ہیں، (بلکہ اس کی قدرت کاملہ اور ارادہ ہی کافی ہوتا ہے اور اسی سے اس کی ارادہ کردہ شے وجود میں آ جاتی ہے)

تخلیق کے حوالہ سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں جو نظام قائم کیا ہے اس میں اصل و اساس اس کا ارادہ و مشیت ہے کہ جو ہر چیز پر غالب و حاکم ہے کوئی شے اسے مغلوب نہیں کر سکتی اور یہ کوئی چیز اس پر اثر انداز ہو کر اسے مقصد و مراد سے محروم کر سکتی ہے بلکہ وہ حتمی و یقینی نتیجہ کا سرچشمہ ہوتا ہے اس بناء پر اللہ کا ارادہ ہی حتمی بنیاد ہے اس کے سوا کوئی سبب کارگر ثابت نہیں ہو سکتا۔ م



## خدا، سرچشمہ حق و حقیقت

○ ” اَلْحَقُّ مِنْ سَرِّكَ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ”

(حق تیرے پروردگار کی طرف سے ہے لہذا تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو)

یہ آیت سابقہ آیت (اِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ.....) میں مذکور مطلب کی تاکید مزید پر مشتمل ہے حالانکہ سابقہ آیت میں حرف ”ان“ کے ساتھ موضوع کی تاکید وارد ہوئی تھی، اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے اصل واقعہ اور اس کی تفصیل کی بابت تاکید کرتے ہوئے ارشاد ہوا: ” ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰیٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ “، اس تاکید کے ساتھ ساتھ حضرت پیغمبر اسلامؐ کے قلب مبارک کی خوشی اور انہیں اس مطلب سے باخبر کر کے ان کی طیب خاطر کا سامان فراہم کرنا مقصود ہے کہ وہ حق پر ہیں اور نصاریٰ کے مقابلے میں مضبوط دلائل سے یس ہونے کی بناء پر اپنے موقف میں صحیح سمت پر قائم ہیں بلکہ اس سلسلہ میں ان کی حوصلہ افزائی بھی ہو جائے۔

یہ جملہ یعنی ” اَلْحَقُّ مِنْ سَرِّكَ “ قرآن مجید کے نہایت عمدہ و فصیح و بلیغ ترین بیانات میں سے ایک ہے کیونکہ اس میں ”حق“ کو صرف ”من“ کے ساتھ مقید کر کے ذکر کیا گیا ہے جو کہ ابتداء پر دلالت کرتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی حرف اس خصوصیت کا حامل نہیں، مثلاً اگر یوں کہا جاتا: ” المحق مع ربك “ (حق تیرے پروردگار کے ساتھ ہے) تو اس سے وہ معنی جو حرف ”من“ میں ملحوظ و ظاہر ہے ہرگز نہ سمجھا جاسکتا بلکہ اس کے برعکس اس میں شرک کا شائبہ پایا جاتا اور یہ سمجھا جاتا کہ حقیقت میں خدا نانا تو اہل ہے، جبکہ یہ دونوں نسبتیں یعنی شرک و عجز و ناتوانی، خداوند عالم کی بابت ناقابل تصور اور غلط و نادرست ہیں۔ اور اس میں ایک نہایت اہم نکتہ یہ ہے کہ ہر قول حق اور ہر وہ چیز جو اپنے آپ میں ایک مسلمہ حقیقت کی حامل ہے خواہ وہ جس قدر یقینی اور ناقابل انکار کیوں نہ ہو جیسے ”چار، دو کا، دگنا ہے“ اور ”ایک، دو کا آدھا ہے“ اور اس طرح کے دیگر امور، وہ سب ایسی چیزیں ہیں جو عالم موجودات میں پائی جاتی ہیں یعنی انسان انہیں وجود کے لباس میں ملبوس پاتا ہے اور جہاں تک وجود کا تعلق ہے تو اس کا سرچشمہ ذات خداوندی ہے یعنی ہر وجود اسی سے ہے لہذا سب کا سب حق اسی سے ہے اور وہی اس کا سرچشمہ اور اصل و اساس ہے اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے ہر طرح کی خیر کا سرچشمہ ذات خداوندی ہے، اسی بناء پر اس کی بابت یہ بات برحق ہے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے اس کے بارے میں اس سے باز پرس نہ ہوگی جبکہ لوگوں سے باز پرس ہوگی (لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ)، اس حوالہ سے غیر خدا کا کام اس صورت میں حق کے ساتھ کہلائے گا

جب وہ حق ہوگا لیکن خداوند عالم کا کام چونکہ سراپا وجود ہے لہذا اس کی عملی صورت حق ہی حق ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

## روایات پر ایک نظر

### حضرت مریمؑ کا خدائی انتخاب

تفسیر تہی میں آیت مبارکہ ”لِمَرْيَمَ إِذْ أَنْتَ اللَّهُ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلَى نِسَاءِ الْعَالَمِينَ“ کی تفسیر میں مذکور ہے کہ امام نے ارشاد فرمایا:

”اصطفاهَا مرتین، اما الاولیٰ فاصطفاهَا ای اختارہَا، واما الثانیة فانہَا حملت من غیر فحل فاصطفاهَا بذلک علی نساء العالمین“،

خداوند عالم نے انہیں دوبارہ چنا پہلی بار چنے کا ذکر ان لفظوں میں ہوا ہے: ”اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ“ کہ تجھے چن لیا اور پاک بنایا، اور دوسری بار چنے کا ذکر ان لفظوں میں ہوا: ”وَاصْطَفَاكِ عَلَى نِسَاءِ الْعَالَمِينَ“ اور تجھے تمام عورتوں میں سے چن لیا، یعنی بغیر شوہر کے حاملہ ہو جانے کے حوالہ سے تمام خواتین پر امتیاز بخشا،

(تفسیر تہی، جلد ۱، ص ۱۰۲)

### اصطفاء کا مخصوص معنی !

تفسیر مجمع البیان میں مذکور ہے کہ امام ابو جعفر محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

”معنی الآیة اصطفاک للذریة الانبیاء، و طہرک من السفاح، و اصطفاک لولادة عیسیٰ من غیر فحل“،

آیت کا معنی یہ ہے کہ خدا نے تجھے انبیاء کی ذریت و نسل کے لئے چن لیا، اور تجھے برائی (غیر شرعی جنسی تعلق) سے پاک رکھا، اور تجھے شوہر کے بغیر عیسیٰؑ کی ولادت کے لئے منتخب کیا،

(تفسیر مجمع البیان جلد ۲ صفحہ ۴۴۰)

امام کے ارشاد گرامی میں جملہ ”اصطفاک للذریۃ الانبیاء“ (تجھے انبیاء کی ذریت و نسل کے لئے چن لیا) کا مطلب یہ ہے کہ تجھے اس مقصد کے لئے چنا کہ تو نیک و صالح ذریت ہو جو انبیاء سے نسبت پانے کے لائق ہو، اور جملہ ”وطھسوک من السفاح“ کا معنی یہ ہے کہ تجھے برے عمل (زنا) سے عصمت عطا کی، اگرچہ حضرت مریمؑ ہر برائی و گناہ سے پاک و معصومہ بی بی تھیں لیکن بالخصوص زنا سے عصمت عطا کرنے کا ذکر اس وجہ سے ہوا کہ انہوں نے بغیر شوہر کے عیسیٰ علیہ السلام کو جنم دیا، بنا براین امام کا فرمان درحقیقت اصطفاء اور پاک قرار دیئے جانے کے بعض لوازم کے بیان پر مشتمل ہے، لہذا مذکورہ بالا دور و اہتوں کے درمیان تعارض و تضاد نہیں پایا جاتا جیسا کہ دونوں روایتوں کے الفاظ سے بخوبی عیاں ہے، اور اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ آیت مبارکہ سے بھی بظاہر اسی معنی و مطلب کا ثبوت ملتا ہے۔

## احادیث نبویہ سے اقتباس

### پہلی حدیث نبویؐ

تفسیر ”درمنثور“ میں مذکور ہے کہ احمد اور ترمذی (کہ انہوں نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے) اور ابن منذر، ابن حبان اور حاکم نے اس سے روایت کی ہے انہوں نے کہا کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا:

”حسبک من نساء العالمین مریم بنت عمران و خدیجۃ بنت خولید و فاطمة بنت

محمد و آسیۃ امراة فرعون“

عالمین کی عورتوں میں سے..... ان سے بڑھ کر کوئی نہیں.....: عمران کی بیٹی مریمؑ، خولید کی بیٹی خدیجہؑ، محمدؐ کی

دختر فاطمہؑ اور فرعون کی زوجہ آسیہؑ،

(تفسیر ”درمنثور“ جلد ۲ صفحہ ۲۳)

سیوطی نے لکھا ہے کہ اس روایت کو ابن ابی شیبہ نے حسن سے مرسل طور پر (یعنی سند و حوالہ کے ذکر کے بغیر) پیش

کیا ہے۔

### دوسری حدیث نبویؐ

تفسیر ”درمنثور“ ہی میں ہے کہ حاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیتے ہوئے جناب عبداللہ ابن عباس سے

روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: ”افضل نساء العالمین خدیجۃ و فاطمة و

مریم و آسیہ امراة فرعون،

(تمام جہانوں کی عورتوں سے افضل یہ چار ہیں: خدیجہ، فاطمہ، مریم اور آسیہ زوجہ فرعون)،

(ملاحظہ ہو، تفسیر درمنثور ج ۲ ص ۲۳)

### تیسری حدیث نبوی

اسی کتاب ”درمنثور“ میں ہے کہ ابن مردویہ نے حسن سے روایت کی کہ انہوں نے کہا: حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”ان اللہ اصطفیٰ علی نساء العالمین اربعة: آسیہ بنت مزاحم، مریم بنت عمران، خدیجہ بنت خویلد و فاطمة بنت محمد“

خداوند عالم نے کائنات کی تمام خواتین میں سے چار کو منتخب فرمایا ہے: (۱) آسیہ بنت مزاحم، (۲) مریم بنت عمران (۳) خدیجہ بنت خویلد (۴) فاطمہ بنت محمد،  
(بحوالہ مذکورہ بالا)

### چوتھی حدیث نبوی

تفسیر ”درمنثور“ ہی میں ابن ابی شیبہ اور ابن جریر سے منقول ہے انہوں نے حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کا ارشاد گرامی بیان کیا کہ آپ نے فرمایا: میرے والد گرامی قدر حضرت پیغمبر خدا نے مجھ سے ارشاد فرمایا: ”انت سيدة نساء اهل الجنة لا مریم البتول“

تو ہی بہشت کی خواتین کی سردار ہے نہ کہ حضرت مریمؑ عذراء!

### پانچویں حدیث نبوی

”درمنثور“ ہی میں ابن عساکر کے حوالہ سے جناب عبداللہ ابن عباس کی روایت مذکور ہے انہوں نے کہا کہ حضرت رسول خدا نے ارشاد فرمایا ہے:

”سيدة نساء اهل الجنة مریم بنت عمران ثم فاطمة ثم خدیجة ثم آسیة امراة فرعون“  
(جنت کی خواتین کی سردار یہ ہیں: مریم دختر عمران، پھر فاطمہ، پھر آسیہ، پھر زوجہ فرعون)

## چھٹی حدیث نبویؐ

اسی کتاب تفسیر ”درمنثور“ میں ابن عساکر کے حوالہ سے مقاتل کے اسناد سے ضحاک کی روایت ذکر کی گئی ہے انہوں نے کہا کہ جناب عبداللہ ابن عباس نے بیان کیا کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

” اربع نسوة سادات عالمہن: مریم بنت عمران و آسیہ بنت مزاحم و خدیجہ بنت خویلد و فاطمہ بنت محمد، و افضلہن عالمات فاطمہ “،

چار خواتین اپنے اپنے زمانہ کی عورتوں کی سردار ہیں: پہلی مریم بنت عمران، دوسری آسیہ بنت مزاحم، تیسری خدیجہ بنت خویلد اور چوتھی فاطمہ بنت محمد، اور ان سب میں سے فاطمہ کو اپنے دور کی بافضیلت ترین سردار ہونے کا مقام حاصل ہے۔

## ساتویں حدیث نبویؐ

تفسیر ”درمنثور“ ہی میں ابن ابی شیبہ کی ایک روایت مذکور ہے کہ انہوں نے عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ کے حوالہ سے بیان کیا کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا:

” فاطمہ سیدۃ نساء العالمین بعد مریم ابنة عمران و آسیہ امرأۃ فرعون و خدیجہ ابنة خویلد “،

فاطمہ تمام جہانوں کی عورتوں کی سردار ہے، اس سے پہلے مریم بنت عمران، آسیہ زوجہ فرعون اور خدیجہ بنت خویلد اس مقام پر فائز تھیں، (مذکورہ بالا تمام حدیثیں تفسیر درمنثور کے مندرجہ بالا حوالہ سے منقول ہیں)

## آٹھویں حدیث نبویؐ

کتاب ”خصال“ میں مؤلف نے اپنے اسناد سے عکرمہ کی روایت ذکر کی ہے کہ جناب ابن عباس نے کہا: حضرت رسول خداؐ نے زمین پر چار لکیریں کھینچیں اور فرمایا:

”خیر نساء الجنة مریم بنت عمران و خدیجہ بنت خویلد و فاطمہ بنت محمد و آسیہ بنت مزاحم امرأۃ فرعون“

بہشت کی خواتین کی سردار مریم دختر عمران اور خدیجہ دختر خویلد اور فاطمہ بنت محمد اور آسیہ بنت مزاحم زوجہ عمران ہے، (ملاحظہ ہو: کتاب خصال شیخ صدوق، صفحہ ۲۰۵ حدیث ۲۲)

## نویں حدیث نبویؐ

خصال ہی میں شیخ صدوقؒ نے اپنے اسناد سے ابوالحسن الاول یعنی حضرت علی علیہ السلام کا بیان ذکر کیا ہے انہوں نے کہا کہ حضرت رسول خداؐ نے ارشاد فرمایا:

”ان الله عزوجل اختار من النساء اربعاً: مريم و آسية و خديجة و فاطمة“  
خداوند عالم نے خواتین میں سے چار کو منتخب فرمایا: مریم، آسیہ، خدیجہ اور فاطمہ،

(بحوالہ کتاب خصال، صفحہ ۲۲۵ حدیث ۵۸)

مذکورہ بالا موضوع کی بابت فریقین یعنی شیعہ و سنی کے حوالوں سے کثیر قریب المعنی روایات موجود ہیں اور ان چاروں خواتین کا تمام جہانوں کی عورتوں کی سرداری کے مقام پر فائز ہونا اس لحاظ سے خالی از اشکال ہے کہ ان کے درمیان ایک دوسری پر برتری کے درجات پائے جاتے ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا چھٹی حدیث نبویؐ اور اسی طرح کی دیگر احادیث مبارکہ میں ذکر کردہ مطالب سے ثابت ہے، اس طرح کی ایک بحث اسی سورۃ مبارکہ کی آیت ۳۳ (ان الله اصطفى آدم و نوحاً.....) کی تفسیر میں گزر چکی ہے، البتہ جو اہم مطلب اس موضوع میں توجہ طلب ہے وہ یہ کہ آیت مبارکہ میں ”اصطفاء“ جبکہ روایات میں ”سیادت“ مذکور ہے اور ان دونوں میں فرق ہے، ”اصطفاء“ کے بارے میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس کا معنی چن لینا ہے..... جبکہ سیادت کا معنی سرداری ہے..... اور سرداری درحقیقت اصطفاء کے مراتب کمال میں سے ہے،..... اس بناء پر احادیث مبارکہ میں چار خواتین کی سرداری کا ذکر دراصل ان کے اصطفاء کے اعلیٰ ترین مراتب و درجات کے اظہار کی غرض سے ہے۔

## مریمؑ کی کفالت کا مسئلہ

تفسیر العیاشی میں آیت مبارکہ ” اذْیُنُقُونَ اَقْلَامَهُمْ اَیُّهُمْ یُکْفَلُ مَرْیَمَ “ کے ذیل میں امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد گرامی مذکور ہے جس میں آنجنابؑ نے ارشاد فرمایا: ”یقرعون بها حین ایتمت من ابیہا“ کہ وہ لوگ ان کے بارے میں اس وقت قرعہ اندازی کر رہے تھے جب ان کے والد گرامی قدر کا انتقال ہوا وہ یتیم ہو گئیں کہ اب ان کی کفالت و سرپرستی کون کرے؟

(تفسیر العیاشی جلد اول صفحہ ۱۷۳ حدیث ۴)

## حضرت مریمؑ کا دو مرتبہ اصطفاء

تفسیر قمی میں آیت مبارکہ ”وَإِذْ قَالَتِ الْمَلِكَةُ لَیْسَیْمُ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰکَ وَطَهَّرَکَ وَاصْطَفٰکَ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ“ کی تفسیر میں مذکور ہے کہ خداوند عالم نے حضرت مریمؑ کو دو مرتبہ اصطفاء سے نوازا، پہلی مرتبہ اس وقت انہیں اس مقام و مرتبہ پر فائز کیا جب، انہیں تمام خواتین عالم میں سے چن لیا، اور دوسری مرتبہ اس وقت جب وہ بغیر شوہر کے حاملہ ہوئیں تو اس حوالہ سے خداوند عالم نے انہیں تمام جہانوں کی خواتین پر امتیازی خصوصیت عطا کر کے چنا، (اس بیان کے تسلسل میں قمی مرحوم نے کہا) پھر خداوند عالم نے اپنے نبی (حضرت محمدؐ) سے فرمایا: ”ذٰلِکَ مِنْ اَنْبِیَآءِ الْعٰیْبِیْنَ نُوْحِیْوَ اِلَیْکَ ..... یَا مُحَمَّدُ ..... وَمَا کُنْتَ لَدَیْہِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَہُمْ اَلِیْہُمْ یَکْفُلُ مَرْیَمَ ۚ وَمَا کُنْتَ لَدَیْہِمْ اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ“ (یہ بھی خبریں ہیں جو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں..... اے محمد..... اور تو اس وقت ان کے پاس نہ تھا جب وہ اپنے قرعے ڈال رہے تھے کہ کون مریم کی کفالت کرے گا اور تو اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھا جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے)، اور جب حضرت مریم پیدا ہوئیں تو آل عمران ان کی بابت آپس میں گوگو کرنے لگے اور سب کہنے لگے کہ ہم اس کی کفالت کریں گے، یہاں تک کہ وہ عبادت گاہ گئے اور قرعہ اندازی کرنے لگے، بالآخر قرعہ حضرت زکریا کے نام پر نکلا، (تفسیر قمی، جلد اول، صفحہ ۱۰۲)

اس روایت اور اس سے ما قبل روایت کی صحت و درستی کی تائید ہمارے سابقہ بیان سے ہوتی ہے اور اس موضوع کے حوالہ سے یہ بات معلوم رہے کہ حضرت مریمؑ کو دی جانے والی بشارت اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور اسی طرح آنجنابؐ کے توحیدی مشن اور معجزات کی بابت کثیر روایات وارد ہوئی ہیں لیکن اس سلسلہ سے مربوط آیات مبارکہ کی تفسیر میں ہم نے جو مطالب ذکر کئے ہیں اور جن روایات سے استناد کی عزت حاصل کی ہے وہ تفسیری بیان و بحث میں کفایت کرتی ہیں لہذا ان کے علاوہ دیگر احادیث و روایات کے ذکر کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اس لئے ہم نے صرف انہی روایات کے ذکر پر اکتفاء کی ہے جن سے موضوع کے بنیادی پہلو واضح ہو جاتے ہیں۔

## حضرت عیسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے درمیان دلچسپ مکالمہ

تفسیر قمی میں آیت مبارکہ ”وَ اَنْتُمْ بِسَاتَاتَا کُلُوْنَ.....“ کی تفسیر میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد





گرامی مذکور ہے آپ نے ارشاد فرمایا:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل سے کہا کرتے تھے کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور مجھے تمہاری طرف بھیجا گیا ہے اور میں تمہارے لئے مٹی سے پرندہ کی شکل بناتا ہوں پھر اس میں پھونک ماروں گا تو اللہ کے حکم سے وہ حقیقی پرندہ بن جائے گا اور میں مادرزاد نابینا اور برص کے مریض کو تندرست کر دوں گا (انسی رسول اللہ الیکم وانی اخلق لکم من الطین کھینٹا الطیر فانفخ فیہ فیکون طیرا باذن اللہ و ابرء الاکمہ والابرص)..... یاد رہے کہ عربی زبان میں ”اکمہ“ کا معنی وہ بچہ ہے جو ماں کے شکم سے ناپید ہوا ہو.....

بنی اسرائیل حضرت عیسیٰؑ سے کہتے تھے کہ یہ جو کچھ آپ کرتے ہیں ہم اسے جادو کے سوا کچھ نہیں سمجھتے (ما لری الذی تصنع الاسحراً) اگر آپ اپنے دعووں میں سچے ہیں تو ہمیں کوئی نشانی دکھائیں جس سے ہمیں آپ کے سچا ہونے کا یقین ہو جائے، (فارنا ایۃ نعلم انک صادق)؛

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے جواب میں یوں کہتے: ”ارایتکم ان اخبرتکم بماتنا کلون و ما تدخرون فی بیوتکم“ کہ اگر میں تمہیں اس سے پہلے کہ تم باہر نکلیے بتا دوں کہ تم نے اپنے گھروں میں کیا کھایا اور تم نے رات کو کیا کچھ جمع کر کے رکھا ہوا ہے تو کیا تمہیں میرے سچا ہونے کا یقین حاصل ہو جائے گا؟ (تعلمون انی صادق؟) بنی اسرائیل کہتے: ہاں! تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے ہر ایک سے کہتے تھے کہ تو نے یہ کھایا، تو نے یہ پیا اور تو نے یہ چیز اٹھائی، ان میں سے کچھ افراد تصدیق کرتے تھے اور کہتے تھے کہ آپ نے بالکل درست کہا ہے تو وہ ایمان لے آئے تھے اور کچھ افراد انکار کرتے تھے اور اپنے کفر پر باقی رہ جاتے تھے۔ اور ان امور میں ان کے لئے واضح نشانی موجود تھی اگر وہ ایمان لانے والے ہوتے!

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے تذکرہ میں آیات کے سیاق کی تبدیلی سے مذکورہ بالا روایت کی صحت کا ثبوت ملتا ہے چنانچہ اس حوالہ سے پہلے اشارہ ہو چکا ہے۔

## انبیاء کی شریعتوں اور کتب کا تذکرہ

تفسیر العیاشی میں آیت مبارکہ ”وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَدَّيْنِي مِنَ التَّوْرَةِ وَلَا حِلَّ لَكُمْ.....“ کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی مذکور ہے جس میں آپ نے ارشاد فرمایا:

”کان بین داود و عیسیٰ اربع مائة سنة، و کانت شریعة عیسیٰ انہ بعث بالتوحید“

والاخلاص وبما اوصى به نوح و ابراهيم و موسى، وانزل عليه الانجيل، واخذ عليه الميثاق الذى اخذ على النبيين، و شرع له الكتاب: اقامة الصلوة مع الدين، والامر بالمعروف، والنهي عن المنكر، و تحريم الحرام، و تحليل الحلال، وانزل عليه فى الانجيل مواظ و امثال و حدود، ليس فيها قصاص و لا احكام حدود و لا فرض موارث، وانزل عليه تخفيف ما كان على موسى فى التوراة و هو قول الله فى الذى قال عيسى لبنى اسرائيل: و لاحل لكم بعض الذى حرم عليكم و امر عيسى من معه ممن اتبعه من المؤمنين ان يؤمنوا بشريعة التوراة و الانجيل“

حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان چار سو سال کا فاصلہ تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت یہ تھی کہ انہیں توحید، اخلاص اور وہ تمام احکام دے کر مبعوث کیا گیا تھا جن کی تبلیغ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امتوں کو کی تھی، اور ان پر انجیل نازل کی گئی، اور ان سے وہ ميثاق بھی لیا گیا جو تمام انبیاء سے لیا گیا تھا، اور ان کی کتاب میں جو احکام اور دستورات خداوندی ذکر کئے گئے ان میں دین پر عمل کرتے ہوئے اقامتِ صلوة اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور حرام سے اجتناب اور حلال کو اختیار کرنا شامل تھا، اور ان پر انجیل میں مواظ اور اخلاقی دستورات اور امثال و حدود نازل ہوئے لیکن اس میں نہ قصاص کا حکم تھا اور نہ حدود کے احکام تھے اور نہ ہی میراث کے مسائل تھے، بلکہ اس میں ان احکام کی بابت تخفیف کی گئی تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات میں نازل ہوئے تھے چنانچہ اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خداوند عالم نے حضرت عیسیٰؑ کا وہ قول ذکر کیا جو انہوں نے بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ میں تم پر وہ بعض چیزیں حلال کرتا ہوں جو تم پر حرام کی گئیں (وَلَا حِلَّ لَكُمْ بِعَصَى الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ)، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے ان ساتھیوں کو جو ان پر ایمان لائے تھے حکم دیا کہ وہ تورات اور انجیل میں ذکر کئے گئے احکام و دستورات اور شرعی ضوابط پر ایمان لائیں،

(تفسیر العیاشی، جلد اول، صفحہ ۱۷۵، حدیث ۵۲)

اس روایت کو کتاب ”قصص الانبیاء“ میں تفصیلی طور پر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے البتہ اس میں ہے کہ حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان چار سو (۳۸۰) سال کا فاصلہ تھا، لیکن ان دونوں روایتوں میں ذکر کئے گئے زمانی فاصلوں کی تصدیق اہل کتاب کی تاریخ سے نہیں ہوتی۔

حواریوں کی وجہ تسمیہ

کتاب عیون اخبار الرضا میں ایک روایت ذکر کی گئی ہے جس میں مرقوم ہے کہ ایک شخص نے حضرت امام رضا علیہ السلام سے کہا:

السلام سے پوچھا کہ حواریوں کو اس نام سے کیوں موسوم کیا گیا ہے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: اس سلسلہ میں عام لوگوں کا خیال یہ ہے کہ انہیں اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ دھویوں کا کام کرتے تھے اور لوگوں کے میلے کپڑے دھو کر صاف کرتے تھے اور یہ لفظ یعنی ”حوار“ دراصل ”خبز الحوار“ سے مشتق ہے، لیکن ہم اہل بیتؑ کی نظروں میں انہیں اس لئے اس نام سے موسوم کیا گیا کہ انہوں نے اپنے آپ کو بھی خلوص و اخلاص سے مالا مال کیا ہوا تھا اور دوسروں کو بھی وعظ و نصیحت اور خدا و قیامت کی یاد دلا دلا کر گناہوں کی گندگی و غلاظت سے پاک و صاف کیا ہوا تھا،

(کتاب عیون اخبار الرضا، جلد ۲ صفحہ ۷۹ حدیث ۱۰)

کتاب ”التوحید“ میں امام رضا علیہ السلام کے حوالہ سے روایت ذکر کی گئی ہے انہوں نے ارشاد فرمایا: ”انہم کانوا اثنا عشر رجلاً وکان افضلہم واعلمہم لوقا“ کہ وہ یعنی حضرت عیسیٰؑ کے حواری بارہ آدمی تھے اور ان سب میں سے افضل اور علم (زیادہ علم والے) جناب لوقا تھے،

(توحید، صدوق، صفحہ ۴۲۱)

## حضرت عیسیٰؑ کا تاریخی تذکرہ

کتاب اکمال الدین میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے آپؑ نے ایک حدیث کے ضمن میں ارشاد فرمایا:

”بعث اللہ عیسیٰ بن مریم و استودعہ النور و العلم و الحکم و جمیع علوم الانبیاء قبلہ، وزادہ الناجیل، و بعثہ الی بیت المقدس الی بنی اسرائیل یدعوہم الی کتابہ و حکمتہ والی الایمان باللہ و رسولہ، فابئی اکثرہم الا طغیاناً و کفراً، فلما لم یؤمنوا دعا ربہ، وعزم علیہ فمسخ منہم شیاطین لیریہم ایۃ فیعتبروا فلم یزدہم ذلک الا طغیاناً و کفراً، فاتی بیت المقدس فمکث یدعوہم و یرغبہم فیما عند اللہ ثلاثہ و ثلاثین سنۃ حتی طلبتہ الیہود و ادعت انها عدبتہ و دفنتہ فی الارض حیاً، و ادعی بعضہم انہم قتلوہ و صلبوہ، و ما کان اللہ لیجعل لہم سلطاناً علیہ و انما شبہ لہم، و ما قدروا علی عذابہ و قتلہ و لا علی قتلہ و صلبہ لانہم لو قدروا علی ذلک لکان تکذیباً لِقولہ: و لکن رفعہ اللہ بعد ان توفاه“

خداوند عالم نے حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ کو مبعوث بہ نبوت فرمایا اور انہیں نور، علم و حکمت اور ان سے پہلے گزرے



”اسی متوفیک ورافعک الی.....“ تو امام نے ان دو آیتوں کے تقدم و تاخر کی بناء پر پہلے آجنا ب کی توفی (وفات، وقت پورا ہو جانا) کو ذکر کیا پھر ان کے آسان پراٹھائے جانے کو ذکر کیا اور اس طرح فرمایا: ”ولکن رفعہ اللہ بعد ان توفاه“ کہ خدا نے انہیں وفات دینے کے بعد اٹھالیا۔

## ایک نوجوان حضرت عیسیٰ کی شبیہ بنا

تفسیر قمی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے آپ نے ارشاد فرمایا:

”ان عیسیٰ وعد اصحابہ لیلۃ رفعہ اللہ الیہ ، فاجتمعوا الیہ عند المساء وهم اثنا عشر رجلاً ، فادخلهم بیتاً ، ثم خرج الیہم من عین فی زاویۃ البیت وهو ینفض رأسہ عند الماء فقال: ان اللہ اوحی الی انہ رافعی الیہ الساعة و مطہری من الیہود فایکم یلقى علیہ شبیحی فیقتل ویصلب ویكون معی فی درجتی ؟ ، فقال شاب منهم: انا یا روح اللہ ا قال فانت هوذا ، فقال لهم عیسیٰ : اما ان منکم من یکفر بی قبل ان یصبح اثنی عشر کفراً ؟ فقال رجل منهم انا هو یا نبی اللہ ا فقال له عیسیٰ : اتحس بادلک فی نفسک ؟ فلتکن هو ، ثم قال لهم عیسیٰ : اما انکم ستفترقون بعدی ثلاث فرق: فرقتین مفتریتین علی اللہ فی النار ، وفرقة تتبع شمعون صادقہ علی اللہ فی الجنة ، ثم رفع اللہ عیسیٰ الیہ من زاویۃ البیت وهم ینظرون الیہ ، ثم قال: ان الیہود جائت فی طلب عیسیٰ من لیلتہم فاخذوا الرجل الذی قال له عیسیٰ: ان منکم لمن یکفر بی قبل ان یصبح اثنی عشر کفراً ، واخذوا الشبای الذی القی علیہ شبیح عیسیٰ فقتل وصلب ، وكفر الذی قال له عیسیٰ: یکفر قبل ان یصبح اثنی عشر کفراً“

حضرت عیسیٰ نے اس شب کو جس میں انہیں خداوند عالم نے اپنی طرف اٹھایا اپنے صحابہ کو بلایا، چنانچہ وہ ان کے پاس شام کے وقت اکٹھے ہوئے اور وہ بارہ افراد تھے، حضرت عیسیٰ نے انہیں ایک گھر میں لے گئے، پھر آپ اس چشمہ سے باہر نکلے جو گھر کے کونے میں تھا اور ان کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا، آپ نے فرمایا: خداوند عالم نے میری طرف وحی کی ہے کہ وہ ابھی ابھی مجھے اپنی طرف اٹھانے والا ہے اور مجھے یہودیوں سے پاک کرنے والا ہے، کیا تم میں سے کوئی ایسا ہے جو اس بات پر راضی ہو کہ اسے خدا میری شبیہ وہم شکل بنا دے اور میرے بجائے وہ قتل ہو جائے اور پھانسی چڑھ جائے کہ خدا اسے میرے ساتھ میرے مقام میں قرار دے؟ ان میں سے ایک جوان اٹھا اور کہنے لگا، میں حاضر ہوں اے روح اللہ! حضرت عیسیٰ

نے فرمایا: ہاں وہ تو ہی ہے، پھر حضرت عیسیٰؑ نے دیگر افراد کی طرف رخ کر کے فرمایا: تم میں سے ایک شخص صبح ہونے سے پہلے بارہ دفعہ میرا انکار کرے گا (کافر ہو جائے گا) لوگوں میں سے ایک شخص نے کہا: میں ہی وہ ہوں اے اللہ کے نبی! حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام نے اس سے فرمایا: کیا تو نے اپنے اندر اس بات کو محسوس کر لیا ہے؟ تو پھر تو ہی وہ ہو جا، پھر ان لوگوں سے مخاطب ہو کر حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا: میرے بعد تم بہت جلد تین گروہوں میں بٹ جاؤ گے، دو گروہ خدا پر افتراء و جھوٹی نسبت دیں گے وہ جہنم کی آگ میں جلیں گے، ایک گروہ شمعون کی سچے دل سے پیروی کریں گے اور خدا کے ہو کر رہیں گے وہ بہشت میں جائیں گے، حضرت عیسیٰؑ نے یہ کہا اور پھر خداوند عالم نے اسے لوگوں کے سامنے ہی گھر کے کونہ سے اپنی طرف اٹھالیا اور لوگ دیکھتے رہے، ادھر یہودی جو کہ حضرت عیسیٰؑ کے خون کے پیاسے تھے اسی رات کو ان کی تلاش میں نکل پڑے اور اسی گھر میں اس شخص کو پکڑ لیا جس سے حضرت عیسیٰؑ نے کہا تھا کہ وہ صبح ہونے سے پہلے بارہ دفعہ میرا منکر ہوگا اور اس نوجوان کو بھی پکڑ لیا جو حضرت عیسیٰؑ کی شبیہ و ہم شکل بن چکا تھا تو انہوں نے اسے قتل کر دیا اور پھانسی دے دی اور جس شخص کے کافر ہو جانے کے بارے میں حضرت عیسیٰؑ نے پیشگوئی کی تھی اس نے بارہ مرتبہ کفر اختیار کیا،

(عیون اخبار الرضا، جلد اول ص ۲۱۵)

اس سے قریب المعنی روایت جناب عبد اللہ ابن عباس، قتادہ اور دیگر راویوں کے اسناد سے بھی وارد ہوئی ہے، ان میں سے بعض حضرات نے کہا ہے کہ وہی نوجوان کہ جو حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کا ہم شکل بننے کو تیار ہوا تھا اسی نے یہودیوں کو اطلاع دی کہ حضرت عیسیٰؑ کہاں ہیں تاکہ انہیں پکڑ لیں اور قتل کر دیں، اور بعض راویوں نے اس کے علاوہ مطالب ذکر کئے ہیں، لیکن قرآن مجید ان باتوں کی بابت ساکت ہے اور کسی آیت میں اس حوالہ سے مطالب مذکور نہیں، ہم اس موضوع کی بابت آیت مبارکہ ”وما قتلوه وما صلبوه ولكن شبه لهم.....“ کی تفسیر میں تفصیلی بحث کریں گے، انشاء اللہ تعالیٰ

## حضرت عیسیٰؑ کی منفرد شخصیت

کتاب عیون اخبار الرضا، جلد اول، ص ۲۱۵ میں مذکور ہے کہ حضرت امام رضاؑ نے ارشاد فرمایا:

”انه ما شبه امر احد من انبياء الله وحججه على الناس الا امر عيسى وحده لانه رفع من الارض حياً و قبض روحه بين السماء والارض ثم رفع الى السماء، ورد عليه روحه، وذلك قوله تعالى: ”اذ قال الله يا عيسى اني متوفيك ورافعك الي و مطهرك“، وقال الله عز وجل حكاية لقول عيسى يوم القيامة ”و كنت شهيداً عليهم مادمت فيهم فلما توفيتني كنت انت

الرقیب علیہم وانت علی کل شیء شہید“

(انبیاء الہی اور لوگوں پر خدا کی حجت بنائے جانے والوں میں سے سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے، کسی کے بارے میں صورت حال غیر واضح نہیں ہوئی، ان کے بارے میں اس لئے ایسا ہوا کہ وہ زمین سے زندہ اٹھائے گئے اور ان کی روح آسمان وزمین کے درمیان قبض ہوئی، پھر انہیں آسمان کی طرف اٹھایا گیا اور انہیں ان کی روح پلٹا دی گئی، اسی مطلب کو بیان کرتے ہوئے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ”جب خدا نے کہا اے عیسیٰ! میں تیرا وقت پورا کرنے والا ہوں اور تجھے اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور تجھے پاک کرنے والا ہوں“، اور قیامت کے دن حضرت عیسیٰؑ کے بیان کا تذکرہ کرتے ہوئے خدا نے فرمایا کہ وہ قیامت کے دن یوں کہے گا: ”جب تو نے میرا وقت پورا کر دیا تو خود ان کا نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے۔“

## دنیا کی زینت

تفسیر العیاشی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا بیان مذکور ہے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا:

”رفع عیسیٰ بن مریم بمدرعة صوف من غزل مریم ومن نسج مریم ومن خیاطة مریم،

فلما انتهی الی السماء نودی یا عیسیٰ الق عنک زینة الدنيا“

جب حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ کو آسمان پر لے جایا گیا تو انہوں نے ہنسی لباس زیب تن کیا ہوا تھا جسے حضرت مریمؑ نے کاٹا تھا اور حضرت مریمؑ نے ہی اسے بنا اور سیا تھا، پھر جب وہ آسمان تک پہنچے تو آواز دی گئی: اے عیسیٰ دنیا کی زینت کو اتار دو، (تفسیر العیاشی، ص ۱۷۵، حدیث ۵۳)

## عیسیٰؑ کی مماثلت کے بارے میں!

تفسیر ”درمنثور“ میں آیت مبارکہ ”إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ .....“ کی تفسیر میں مذکور ہے کہ عبد بن حمید اور ابن جریر نے قنادہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: اہل نجران کے دو بزرگ عالم دین کہ جن میں سے ایک کا نام ”سید“ اور دوسرے کا نام ”عاقب“ تھا حضرت پیغمبر اسلامؐ کی خدمت اقدس میں آئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں دریافت کیا کہ ہر شخص ماں باپ کے ذریعے پیدا ہوتا ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ عیسیٰؑ کا باپ نہ ہو، اس وقت یہ آیت

مبارکہ نازل ہوئی: ” اِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ..... “ کہ عیسیٰ کی مثال خدا کے نزدیک آدم جیسی ہے..... (تفسیر ” درمنثور“، جلد ۲، صفحہ ۷۳)

اس سے قریب المعنی روایت سدی اور عکرمہ وغیرہ کے حوالوں سے بھی ذکر کی گئی ہے اور قتی مرحوم نے بھی اپنی تفسیر میں آیت کے شان نزول کے بارے میں نجران کے دو بزرگوں کا حوالہ دیا ہے۔

(ملاحظہ ہو: تفسیر قتی جلد ۱ صفحہ ۱۰۴)

## محدث کے معنی میں روایات پر ایک نظر!

### رسول، نبی اور محدث میں فرق

کتاب بصائر الدرجات میں زرارہ کے حوالہ سے روایت ذکر کی گئی ہے انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا کہ ”رسول“، ”نبی“ اور ”محدث“ کے درمیان کیا فرق ہے؟

امام نے ارشاد فرمایا: ”رسول“ اسے کہتے ہیں جو اس فرشتہ کو ظاہر بظاہر دیکھتا ہے جو اس کے پاس خدا کی طرف سے پیغامات لے کر آتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ تیرے رب نے یہ احکام تیرے لئے صادر فرمائے ہیں، رسول، پیغمبری کے ساتھ ساتھ نبوت کے منصب پر بھی فائز ہوتا ہے۔ اور ”نبی“ اسے کہتے ہیں جو فرشتہ کو ظاہر بظاہر نہیں دیکھتا بلکہ فرشتہ خدا کے پیغام کو اس کے دل میں ڈال دیتا ہے اور اس وقت نبی پر عیسیٰ حالت طاری ہو جاتی ہے اور وہ نیند کی حالت میں خدا کے فرامین کا مشاہدہ کرتا ہے،

میں نے پوچھا کہ اسے کس طرح معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ اس نے نیند کی حالت میں دیکھا ہے وہ خدائی پیغام اور حق ہے؟

امام نے ارشاد فرمایا: خداوند عالم اس پر آشکار و واضح کر دیتا ہے جس سے وہ آگاہ ہو جاتا ہے کہ جو کچھ اس نے مشاہدہ کیا ہے وہ خدائی فرمان اور حق ہے لیکن وہ فرشتہ کو نہیں دیکھتا۔



اور ”محدث“ اسے کہتے ہیں جو صرف آواز سنتا ہے مگر آواز دینے والے کا مشاہدہ نہیں کرتا۔  
روایت کی اصل عبارت ملاحظہ ہو :

”فی البصائر عن زرارة قال: سألت ابا عبد الله (ع) عن الرسول وعن النبي وعن المحدث قال: الرسول الذي يعاين الملك يأتيه بالرسالة من ربه يقول: يا مراك كذا وكذا، والرسول يكون نبياً مع الرسالة، والنبي لا يعاين الملك ينزل عليه الشئ النبأ على قلبه فيكون كالمغمى عليه فيرى في منامه، قلت: فما علمه ان الذي رأى في منامه حق؟ قال (ع): بينه الله حتى يعلم ان ذلك حق ولا يعاين الملك، والمحدث الذي يسمع الصوت ولا يرى شاهداً“

(کتاب بصائر الدرجات صفحہ ۳۷۱ حدیث ۱۲)

اس روایت کو کتاب ”کافی“ میں بھی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں امام کے ارشاد ”لا یرى شاهداً“ سے مراد ”صائناً حاضراً“ ہے یعنی وہ بولنے والے کو ظاہر بظاہر نہیں دیکھتا، ممکن ہے کہ لفظ ”شاهداً“ فعل ”لا یرى“ کے فاعل کا ”حال“ ہو اور اس کا معنی یہ ہو کہ محدث جبکہ خود شاہد ہے تو وہ کسی کو نہ دیکھتا ہو۔ (کتاب اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۱۳۵)

اسی کتاب میں برید کے حوالہ سے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کی حدیث ذکر کی گئی ہے جس میں مذکور ہے کہ برید نے پوچھا: رسول، نبی اور محدث کسے کہتے ہیں؟ امام نے ارشاد فرمایا:

”الرسول الذي يظهر الملك فيكلمه والنبي يرى في المنام وربما اجتمعت النبوة والرسالة لواحد، والمحدث الذي يسمع الصوت ولا يرى الصورة: قلت اصلحك الله! كيف يعلم ان الذي رأى في المنام هو الحق وانهُ من الملك؟ قال: يوفق لذلك حتى يعرفه لقد ختم الله بكتابكم الكتب وبنبيكم الانبياء، (الحديث)“

رسول وہ ہے جس پر فرشتہ ظاہر ہوتا ہے اور اس سے ہم کلام ہوتا ہے جبکہ نبی خواب میں دیکھتا ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دونوں عہدے یعنی نبوت و رسالت ایک ہی شخص میں اکٹھے ہو جاتے ہیں، اور محدث اسے کہتے ہیں جو آواز سنتا ہے مگر شکل نہیں دیکھتا، راوی کہتا ہے میں نے عرض کیا کہ خدا آپ کا بھلا کرے یہ فرمائیے کہ اسے کیونکر معلوم ہوتا ہے کہ جسے اس نے خواب میں دیکھا وہ حق ہے اور وہ فرشتہ ہے؟ امام نے ارشاد فرمایا: خداوند عالم اسے توفیق دیتا ہے جس سے وہ اسے پہچان لیتا ہے، خداوند عالم نے تمہاری کتاب (قرآن) کے ذریعے آسمانی کتب کا اختتام کیا اور تمہارے نبی کے ذریعے سلسلہ انبیاء

کا اختتام ہوا، (اصول کافی جلد ۱ ص ۱۳۵)

## محمد بن مسلم کی روایت

کتاب ”کافی“ میں محمد بن مسلم کے حوالہ سے ایک روایت درج ہے جس میں انہوں نے کہا میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں ”محدث“ کے بارے میں دریافت کیا تو امام نے ارشاد فرمایا: ”انہ یسمع الصوت ولا یروی الصورة“، وہ آواز سنتا ہے مگر شکل نہیں دیکھتا،

میں نے پوچھا: خدا آپ کا بھلا کرے یہ فرمائیے کہ اسے کس طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ فرشتہ کی آواز ہے؟ امام نے ارشاد فرمایا: ”انہ یعطی السکینة والوقار حتی یعلم انہ ملک“ خدا اسے سکینت و وقار اور ہمت و قوت قلب عطا کرتا ہے جس سے اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ فرشتہ ہے۔

(اصول کافی جلد اول ص ۲۷۱ حدیث ۴)

## محدث کی نشانی امام صادقؑ کی زبانی

کتاب کافی میں ابویصیر سے منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

”کان علی (ع) محدثاً وکان سلمان محدثاً“

حضرت علیؑ محدث تھے اور جناب سلمان بھی محدث تھے،

ابویصیر نے کہا: میں نے عرض کی کہ محدث کی کیا نشانی ہے؟ (فما آية المحدث؟)

امام نے ارشاد فرمایا: ”یاتیہ الملک فینکت فی قلبہ کیت وکیت“، فرشتہ اس کے پاس آتا ہے

اور اس کے دل میں مطالب ڈال دیتا ہے کہ فلاں بات یہ ہے اور فلاں حکم یہ ہے! (بحوالہ فوق الذکر)

خدا دوست بندے

کتاب ”کافی“ میں حمران بن اعین کے حوالہ سے مذکور ہے کہ حضرت امام ابو جعفر محمد باقر علیہ السلام نے مجھ سے

ارشاد فرمایا کہ حضرت علیؑ محدث تھے، حمران نے کہا کہ اس کے بعد ہمارے دوستوں نے کہا کہ اب جب بھی امام سے ملاقات ہو تو ہر سوال سے پہلے ان سے یہ پوچھنا کہ کون حضرت علیؑ سے بات کرتا تھا؟ پھر جو نبی مجھے امام سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو میں نے ان کی خدمت میں عرض کی کہ آپؑ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ حضرت علیؑ محدث تھے؟ امام نے ارشاد فرمایا: ہاں، میں نے کہا تھا، تو میں نے عرض کی: کون ان سے گفتگو کرتا تھا؟ امام نے ارشاد فرمایا: فرشتہ! میں نے عرض کی کہ اگر ایسا ہے تو پھر میں ان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھ سکتا ہوں کہ وہ (حضرت علیؑ) نبی یا رسول تھے؟ امام نے فرمایا: نہیں، بلکہ ان کے بارے میں وہی عقیدہ رکھو جو حضرت سلیمان کے ساتھی اور حضرت موسیٰؑ کے ساتھی کے بارے میں رکھتے ہو اور جو عقیدہ ذوالقرنین کے بارے میں رکھتے ہو، کیا تم نے نہیں سنا کہ حضرت علیؑ سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھا گیا کہ آیا وہ نبی تھے؟ تو حضرت علیؑ نے جواب دیا: نہیں، بلکہ وہ خدا کے ایسے بندے تھے جو خدا دوست تھے اور خدا بھی انہیں دوست رکھتا تھا اور وہ رضائے خدا کے لئے وعظ و نصیحت کرتے تھے اور خدا نے بھی انہیں اس کے شایان شان اجر ورتبہ عطا کیا، حضرت علیؑ بھی انہی کی طرح تھے۔ (اصول کافی ص ۲۷۱ ح ۵)

محدث کے معنی کی وضاحت میں کثیر روایات آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے وارد ہوئی ہیں کہ جنہیں کتاب بصائر الدرجات، کافی، کنز العمال اور الاختصاص وغیرہ میں ذکر کیا گیا ہے، اور اہل سنت کی کتب میں بھی اس طرح کی روایات موجود ہیں۔ اور ان روایات میں رسول، نبی اور محدث کے درمیان جو فرق ذکر کیا گیا ہے اسے ہم رسول اور نبی کے درمیان فرق کے تذکرے میں بیان کر چکے ہیں اور وحی کے بارے میں وضاحت کر چکے ہیں کہ اس سے مراد خدا کا اپنے بندوں میں سے کسی سے ہمکلام ہونا ہے جو کہ اس بندے کے لئے بذات خود علم البقین کا باعث بنتا ہے اور اس کے ساتھ مزید کسی دلیل و حجت کی ضرورت باقی نہیں رہتی، بنا برائیں خدائی القاءات ان بدیہی علوم کی طرح ہیں جن کے حصول کے لئے انسان کو علمی و منطقی اصولوں کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اور جہاں تک اولیائے الہی کے خواب دیکھنے کا تعلق ہے تو جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا کہ روایات میں اس سے خواب دیکھنے کا وہ عام معنی مراد نہیں لیا گیا جو عام افراد بشر کے خواب دیکھنے کا معنی مراد لیا جاتا ہے کہ جس میں شب و روز میں عام طور پر دیکھی جانے والی چیزیں دکھائی دیتی ہیں بلکہ اس سے مراد ایک ایسی حالت ہے جو غشی سے ملتی جلتی ہے کہ جس میں نبی کے حواس کو ٹھہراؤ حاصل ہوتا ہے اور وہ اس حالت میں اسی طرح دیکھتا ہے جس طرح ہم بیداری کی حالت میں چیزوں کو دیکھتے ہیں، اور جب وہ مشاہدہ کر لیتے ہیں..... جس چیز کا بھی مشاہدہ کریں..... تو خداوند عالم ان کے دل میں یقین پیدا کر دیتا ہے جس سے ان میں ایک خاص ہمت و قوت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اچھی طرح جان لیتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے مشاہدہ کیا ہے وہ سن جانب اللہ ہے نہ کہ شیطانی وسوسے ہیں۔

اور محدث جو کہ ”تحدیث“ سے بنا ہے اس کا معنی فرشتہ کی آواز سننا ہے البتہ ظاہری سماعت سے نہیں بلکہ قلبی سماعت سے! اور وہ اس ذہنی القاء کے باب سے نہیں کہ جسے مجاز بعید سے استفادہ کئے بغیر سنی جانے والی آواز یا آواز سننا نہیں کہا جا سکتا، اسی وجہ سے۔۔۔ جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا ہے کہ۔۔۔ روایت میں تحدیث کے معنی میں دونوں کو باہم ذکر کیا گیا ہے یعنی آواز سننا اور دل میں اترنا، لیکن اس کے باوجود ہم اسے تحدیث اور تکلم کہتے ہیں، اس بناء پر محدث فرشتہ کی آواز سننا ہے اور اسے اسی طرح اپنے خزانہ سماعت میں محفوظ کر لیتا ہے جس طرح ہم عام کلام اور مادی جہان میں سنی جانے والی آوازوں کو اپنے خزانہ سماعت میں محفوظ کرتے ہیں البتہ اس فرق کے ساتھ کہ محدث جو کچھ فرشتہ سے سنتا ہے وہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں سنتا، اسی حوالہ سے اسے قلبی کیفیت کہا جاتا ہے۔

اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اسے یعنی محدث کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ فرشتہ کی آواز ہے نہ کہ شیطان کا وسوسہ، تو یہ خدائی تائید اور توفیق کے ساتھ ہوتا ہے جیسا کہ محمد بن مسلم کی سابق الذکر روایت میں بیان ہو چکا ہے کہ اسے خدا کی طرف سے سکینت و وقار اور قوت و ہمت عطا ہوتی ہے جس سے وہ جان لیتا ہے کہ وہ فرشتہ ہے، کیونکہ شیطانی وسوسہ کی دو صورتیں ممکن ہیں: ایک یہ کہ وہ باطل کی شکل ہی میں مومن شخص کے سامنے ہوتا ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ اس صورت میں خدا کے مکرم فرشتوں کی بات نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ خدا کی نافرمانی کے مرتکب نہیں ہوتے، دوسری صورت یہ کہ وہ حق کی شکل میں سامنے آئے تو چونکہ وہ اصل میں باطل ہے لہذا اس کی باطل ادائیگی بھی اس کے ساتھ ساتھ ہوگی کہ اسے وہ نور الہی جو بندہ مومن کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے آشکار کر دیتا ہے، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

سورہ انعام، آیت ۱۲۲:

○ ”أَوْ مَنْ كَانَ مَيِّتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَّسِيرًا ۖ بِهِ فِي النَّاسِ“

(کیا وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اسکے لئے نور قرار دیا جس کے ذریعے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا

ہے)

لیکن اس کے باوجود شیطانی وسوسہ کے بارے میں یہ بات یاد رہے کہ وہ بے چینی اور اضطرابِ نفس و قلبی ہیجان سے خالی نہیں جیسا کہ ذکر خدا اور اس کا بندے سے کلام کرنا سکونِ قلب اور اطمینانِ باطن سے خالی نہیں ہوتا، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

سورہ آل عمران، آیت ۱۷۵:

○ ”ذُلِّكُمْ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ“

(یہ شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں کو خوف دلاتا رہتا ہے)

سورہ رعد، آیت ۲۸ :

○ ”أَلَا يَذْكُرُ اللَّهُ تَتَّظَمِينَ الْقُتُوبَ“

(یاد رکھو کہ خدا کے ذکر سے دل مطمئن ہوتے ہیں)

سورہ اعراف، آیت ۲۰۱ :

○ ”إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَٰئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَدَاكَّرُوا فَادَّهُمْ مَّبْصُرُونَ“

(یقیناً جو لوگ پرہیزگار ہیں جب کوئی شیطان ان پر مسلط ہونے لگتا ہے تو وہ خدا کو یاد کرتے ہیں اور حقیقت

الامر سے آگاہ ہو جاتے ہیں)

بنا برائیں سکینت و اطمینان قلب جو کسی آواز کے سننے یا کسی مطلب کے دل میں اترنے کے احساس سے حاصل ہوتا ہے وہ خدائی القاء کی دلیل قرار پاتا ہے جیسا کہ اس کے برعکس اضطراب و بے چینی شیطانی القاء کی دلیل بنتی ہے اور اسی سے جلد بازی، جزع و فرغ اور بیجا فریادیں اور نادانی و نا آگاہی کے آثار وغیرہ ظاہر ہوتے ہیں۔

اور محدث کے بارے میں روایات میں جو ذکر ہوا ہے کہ وہ آواز سنتا ہے مگر فرشتہ کو نہیں دیکھتا تو اس سے یہی مطلب سمجھا جاتا ہے نہ کہ دونوں معنوں کے یکجا ہونے کا ناممکن ہونا ! تو کسی انسان کا محدث ہونا اس حوالہ سے ہے کہ وہ آواز سنتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ وہ آواز دینے والے کا مشاہدہ کرے، تو اگر کبھی ایسا ہو کہ آواز سننے کے دوران فرشتہ کا مشاہدہ بھی کرے تو یہ اس کے محدث ہونے کی بناء پر نہیں ہوتا کیونکہ آیات مبارکہ میں صریح لفظوں میں ذکر ہوا ہے کہ بعض محدث افراد نے گفتگو کے دوران فرشتوں کا مشاہدہ کیا جیسا کہ حضرت مریمؑ کے بارے میں ارشاد الہی ہے :

سورہ مریم، آیت ۱۹ :

○ ”فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۗ قَالَتْ اإِنِّجِ اَعُوذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ

كُنْتَ تَقِيًّا ۗ قَالَ اِنَّمَا اَنَا رُسُوْلٌ مِّنْ رَبِّكَ ۗ لَا هَبْ لَكَ عِلْمًا اَرِيًّا“

(ہم نے اس کی طرف اپنی روح کو بھیجا کہ جو کامل انسان کی صورت میں اس کے سامنے آیا، اس (مریم) نے کہا:

میں تیرے شر سے خدا کی پناہ چاہتی ہوں، اگر تو پرہیزگار ہے تو مجھ سے دور ہو جا، اس نے کہا: میں تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں، تاکہ تجھے ایک پاک بچہ عطا کروں)

اور حضرت ابراہیمؑ کی زوجہ کے بارے میں بشارت دیئے جانے کے تذکرہ میں یوں ارشاد الہی ہے :

سورہ ہود، آیت ۷۳ :

○ ”وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا اِبْرٰهِيْمَ بِالْبَشٰرِ اِذْ قَالَ اَسْلَمْنَا ..... وَاْمْرَاَتُهٗ قَايِمَةٌ فَصَجَّحَتْ فَبَشَّرْنٰهَا

بِاسْحٰقٍ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يٰعَقُوْبُ ۝ قَالَتْ يٰوَيْلَيْكِيْ ءَاِلِدٌ وَّاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ۙ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝ قَالُوْا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكَتُهُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ۙ اِنَّهٗ حَبِيْبٌ مَّعْجِيْبٌ ۙ

(اور ہمارے پیغام رساں ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر پہنچے، انہوں نے انہیں سلام کہا، ابراہیم نے بھی سلام کیا..... اور ابراہیم کی زوجہ وہاں کھڑی ہوئی ہنستی رہی، پھر ہم نے اسے اسحاق کی خوشخبری دی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی خوشخبری دی، اس نے کہا: یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ کیا میں بچہ جنوں کی جبکہ میں بڑھیا ہوں اور یہ میرا شوہر بوڑھا ہو چکا ہے، یہ تو بڑی تعجب والی بات ہے، ہمارے پیغام رساںوں نے کہا: کیا تو اللہ کے فیصلہ پر تعجب کرتی ہے، اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں تم پر اے اہل بیت! یقیناً خدا ہر تعریف کا سزاوار اور بزرگی والا ہے)

اس مقام پر ایک اور احتمالی نظریہ بھی قابل تصور ہے اور وہ یہ کہ محدث کافرشتہ کا مشاہدہ نہ کرنا شاید اس معنی میں ہو کہ وہ فرشتہ کی حقیقت کا مشاہدہ و دیدار نہیں کرتا نہ یہ کہ اس کی مثالی صورت بھی نہیں دیکھ سکتا، کیونکہ آیات مبارکہ سے مثالی صورت کے مشاہدہ سے زیادہ کچھ ثابت نہیں ہوتا۔

یہاں ایک تیسری احتمالی رائے بھی پیش کی گئی ہے اور وہ یہ کہ محدث کے بارے میں جس مشاہدہ کی نفی کی گئی ہے وہ تشریحی وحی کا مشاہدہ ہے کیونکہ وہ صرف رسولوں و انبیاء سے مخصوص و مختص ہے اور خدا چاہتا ہے کہ اس مقام و منصب کو انہی تک محدود رکھے، لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے کہ فرشتہ کے مشاہدہ سے یہ مراد لیا جائے کہ اس پر شرعی احکام نازل نہیں ہوتے۔

## آیات ۶۱ تا ۶۳

- فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا  
وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ۗ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ  
اللَّهِ عَلَى الْكٰذِبِينَ ﴿٦١﴾
- إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۗ وَمَا مِنْ إِلَهٍ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ  
الْحَكِيمُ ﴿٦٢﴾
- فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ عَلَيْهِمُ بِالنُّفُوسِ الَّتِي كَفَرُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَدِيرًا  
وَاسِعًا ﴿٦٣﴾

## ترجمہ

” پس جو شخص اس سلسلہ میں آپ سے بحث کرے بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آچکا ہے تو کہہ دیجئے کہ تم آؤ ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو اور تم بلاؤ اپنے بیٹوں کو، ہم اپنی عورتوں کو اور تم اپنی عورتوں کو اور ہم اپنے بھائیوں کو اور تم اپنے بھائیوں کو، پھر ہم مبالغہ کریں اور اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت قرار دیں“

(۶۱)

” یہی سچے واقعات ہیں اور خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور خدا ہی غلبہ و حکمت والا ہے“

(۶۲)

” پس اگر وہ روگردانی کریں تو خدا فساد یوں کو بہتر جانتا ہے“

(۶۳)



## تفسیر و بیان

علم و آگاہی کے بعد نزاع کیوں؟

○ ”فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ...“  
(اور جو شخص آپ سے نزاع کرے بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آ گیا ہے۔۔۔)

ابتداءً آیت میں حرف ”ف“ تفریح کے لئے ہے یعنی اس سے مبالغہ کی دعوت دینے کے حکم کا خدا کی طرف سے عیسیٰؑ کے بارے میں واضح بیان کے ساتھ علم عطا کرنے کے بعد سے تعلق ثابت ہوتا ہے اور خدا کی طرف سے اس سلسلہ میں علم عطا کئے جانے کی تاکید اس اختتامی جملہ سے ہوتی ہے: ”الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُسْتَكْبِرِينَ“ (حق تیرے رب کی طرف سے ہے، پس تو شک کرنے والوں میں شامل نہ ہونا)،

آیت مبارکہ میں ”فِيهِ“ کی ضمیر کی بازگشت یا تو عیسیٰ کی طرف ہے یا سابقہ آیت میں مذکور ”حق“ کی طرف ہوتی ہے۔

سابقہ آیت میں مذکور مطلب جو کہ خداوند عالم کی طرف سے ہونے کی وجہ سے ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر تھا لیکن اس کے باوجود وہ ایک نہایت محکم دلیل اور واضح دھوس ثبوت پر مشتمل تھا جو اس جملہ سے ثابت ہے: ”إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ.....“ (اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم جیسی ہے)، بنا بریں اس موضوع کی بابت حاصل ہونے والا علم، دلیل و برہان پر مبنی علم بھی کہلائے گا، اسی وجہ سے اس کا اثر حضرت پیغمبر اسلامؐ اور ان کے علاوہ ہر سننے والے پر ظاہر ہو گا۔ لہذا اگر کوئی سننے والا اس سلسلہ میں صرف اس بناء پر شک کرے کہ وہ وحی الہی پر مبنی ہے لیکن وہ اس کے دلیل و برہان پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اس کی بابت ہرگز شک نہیں کر سکتا کیونکہ عقل سلیم اس کی صحت و درستی کی تصدیق و تائید کرتی ہے، شاید اسی بناء پر یہ الفاظ کہے گئے: ”مَنْ بَعْدَ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ“، اور یوں نہیں کہا: ”مَنْ بَعْدَ مَا بَيَّنَّاهُ لَهُمْ“..... اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی بابت صرف وحی نہیں بلکہ قطعی دلیل اور واضح برہان بھی موجود ہے۔

اس مقام پر ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ خداوند عالم کی طرف سے آنحضرتؐ کو جملہ ”مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ“ کے ذریعے جو یاد دہانی کروائی گئی ہے اس میں آپؐ کا سرور قلب مقصود ہے کہ آپؐ ہی خدا کی عنایت و اذن کے ساتھ غلبہ پائیں گے اور یہ کہ آپؐ کا پروردگار آپؐ کا ناصر و مددگار ہے اور وہ ہرگز آپؐ کو کسی کے سامنے رسوا نہ ہونے دے گا۔

### دعوت مباہلہ

○ ”فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ آبْنَاءَنَا وَآبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ“  
(تو کہہ دیجئے کہ آ جاؤ، ہم اپنے بیٹوں کو بلااتے ہیں اور تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی عورتوں کو بلااتے ہیں اور تم اپنی عورتوں کو بلاؤ، اور ہم اپنوں (بھائیوں) کو بلااتے ہیں اور تم اپنوں (بھائیوں) کو بلاؤ۔)

اس آیت مبارکہ میں جمع متکلم مع الغیر ”نَدْعُ“ کی ضمیر دوسرے جمع کے صیغوں مثلاً ”آبْنَاءَنَا“، ”نِسَاءَنَا“، ”أَنْفُسَنَا“ کی ضمیروں سے مختلف ہے یعنی ”نَدْعُ“ (ہم بلائیں) میں ”ہم“ سے مراد دونوں فریقین ہیں یعنی حضرت رسولؐ خدا اور نجران کے نصاریٰ کے بزرگ حضرات! جبکہ دیگر تین صیغوں ”آبْنَاءَنَا“، ”نِسَاءَنَا“ اور ”أَنْفُسَنَا“ میں صرف حضرت پیغمبر اسلامؐ مراد ہیں۔ بنا بریں آیت کا معنی یوں ہوگا: آئیے ہم بلائیں بیٹوں، عورتوں اور اپنوں کو، تو ہم اپنے بیٹوں کو، اپنی عورتوں کو اور اپنوں کو بلااتے ہیں اور تم اپنے بیٹوں کو، اپنی عورتوں کو اور اپنوں کو بلاؤ،..... اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کلام میں اختصار گوئی کی نہایت لطیف صورت اختیار کی گئی ہے۔

اور مباہلہ و ملاعنہ اگرچہ بظاہر صرف حضرت پیغمبر اسلامؐ اور نصاریٰ کے بزرگوں کے درمیان حجاجہ و مناظرہ کے معنی میں ہے لیکن اسے عمومیت و وسعت دے کر بیٹوں اور عورتوں کو اس میں شامل کرنا اس غرض سے ہے تاکہ دعوت دینے والے کے دعوے کی صداقت واضح و آشکار ہو اور اس کا برحق ہونا ثابت ہو جائے، کیونکہ بیٹوں اور عورتوں کی محبت اور ان پر شفقت ایسی فطری حقیقت ہے جسے خداوند عالم نے ہر انسان کے دل میں ودیعت کر دیا ہے چنانچہ یہ بات عام مشاہدہ میں آتی ہے کہ ہر شخص ان کی حفاظت کرتا ہے اور خود ہر طرح کے مسائل و مشکلات اور سختیوں کو برداشت کر کے انہیں تحفظ فراہم کرتا ہے اور ان کے بچاؤ اور غیرت و دفاع میں کسی بھی اقدام سے کوتاہی نہیں کرتا بلکہ اپنے تمام وسائل بروئے کار لا کر ان کے سکون و اطمینان اور حفاظت کو یقینی بنانے میں کوشاں رہتا ہے، اور لیکن اسی بناء پر پہلے بیٹوں کا ذکر ہوا ہے، اس کے بعد عورتوں کا اور پھر اپنوں

کا، کیونکہ بیٹوں کی محبت انسان کے دل میں سب سے زیادہ اور پائیدار ہوتی ہے۔

اس بیان سے وہ قول باطل و بے اساس ہو جاتا ہے جو بعض مفسرین حضرات نے پیش کیا ہے کہ ”نَدَّعُ أَبْنَاءَنَا وَابْنَاءَ كُمْ.....“ سے مراد یہ ہے کہ آؤ ہم تمہارے بیٹوں، تمہاری عورتوں اور تمہارے اپنوں کو بلا تے ہیں اور تم ہمارے بیٹوں، ہماری عورتوں اور ہمارے اپنوں کو بلاؤ، کیونکہ اس قول سے اس اہم مقصد کی نفی ہوتی ہے جو ان سب کو مباہلہ کے عمل میں شامل کرنے کی بابت ہم نے ذکر کی ہے۔

اور مباہلہ میں شامل افراد کا تفصیلی ذکر اس امر کی صحت پر مزید ثبوت فراہم کرتا ہے کہ دعوت دینے والا اپنے مشن پر اور اپنی بات کی صداقت و برحق ہونے پر کس قدر پختہ یقین رکھتا ہے، گویا وہ کہہ رہا ہے: آؤ تاکہ ہم سب مل کر (ہم سب اور تم سب) مباہلہ کریں یعنی ایک دوسرے کے خلاف بددعا کریں اور سب مل کر جھوٹوں پر خدا کی لعنت قرار دیں تاکہ لعنت و عذاب بیٹوں، عورتوں اور اپنوں سمیت سب پر آئے اور جھوٹوں کی بیخ کنی ہو اور باطل پرستوں کی بنیاد ہی اکھڑ جائے۔

اس وضاحت کے بعد یہ نکتہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کلام الہی کی مصداقی جہت کا درست ہونا بیٹوں کی کثرت پر موقوف نہیں اور نہ ہی عورتوں اور اپنوں کی کثرت پر موقوف ہے کیونکہ مباہلہ کے نتیجہ میں فریقین میں سے ایک کی ہلاکت و تباہی مقصود ہے خواہ اس میں چھوٹے اور بڑے، اور مرد و عورتیں جتنی بھی کیوں نہ ہوں، چنانچہ مفسرین کے متفقہ اظہارات اور روایات و تاریخ کی تصدیق و تائید سے یہ حقیقت پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ جب مباہلہ کے لئے سامنے آئے تو ان کے ساتھ علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ علیہم السلام کے علاوہ کوئی نہ تھا، یعنی دو نفس (بھائی، اپنے) دو بیٹے اور ایک خاتون کے سوا کوئی ہمراہ نہ تھا، اور آنحضرتؐ نے ان افراد کو ساتھ لے کر حکم خداوندی کا امتثال کیا۔

اس مقام پر یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ آیت کے الفاظ سے ”مراد“ ایک مسئلہ ہے اور اس کے ”مصداق“ کئی ہیں۔ دوسرا مسئلہ ہے، چنانچہ قرآن مجید میں کثرت سے مثالیں موجود ہیں کہ حکم یا وعدہ دو وعید تمام افراد کے لئے ہوتا ہے جبکہ شان نزول کے حوالہ سے ایک فرد اس کا مصداق ہوتا ہے مثلاً:

سورہ مجادلہ، آیت ۲:

○ ”الَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِنْكُمْ مِمَّنْ نَسَأَ بِهِمْ مَا لَهُنَّ آمَنَهُتِهِمْ“

(جو لوگ تم میں سے اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں۔۔ انہیں اپنی ماں کہتے ہیں۔۔ وہ حقیقت میں ان کی مائیں نہیں ہیں)

سورہ مجادلہ، آیت ۳:

○ ”وَالَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا“

(جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں پھر اپنی بات سے پلٹ جاتے ہیں)

سورہ آل عمران، آیت ۱۸۱:

○ ” لَقَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ “

(خدا نے ان لوگوں کی بات سن لی جنہوں نے کہا اللہ فقیر و نادار ہے اور ہم بے نیاز و مالدار ہیں)

سورہ بقرہ، آیت ۲۱۹:

○ ” وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ “

(وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا انفاق کریں، کہہ دیجئے کہ درگزر کرو)

اس کے علاوہ دیگر کثیر آیات ہیں جن میں جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے جبکہ ان کا شان نزول ایک شخص ہے۔

## آیت کے الفاظ کی تشریحات

آیت مبارکہ میں ارشاد ہوا:

” ثُمَّ نَبَّهْتَهُلُ فَجَعَلَ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكٰذِبِينَ “ (پھر ہم مباہلہ کریں تو اللہ کی لعنت قرار دیں جھوٹوں پر)

” نبہل “، ابہتال کا مصدر ”بہلے “ (ب پرزور اور پیش دونوں کے ساتھ) ہے اس کا معنی لعنت ہے، یہ ہے

اس کا اصل و لغوی معنی، پھر وہ کثرت استعمال سے دعا (بددعا) اور سوال یعنی مانگنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا البتہ اس دعا و سوال میں استعمال ہوا جس میں اصرار و ساجت شامل ہو،

اور جملہ ” فَجَعَلَ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكٰذِبِينَ “ دراصل ابہتال کی وضاحت کے طور پر ہے، اور یہاں

” نسال “ کی بجائے ”نجعل “ کہنے سے اس امر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ دعوت یعنی مباہلہ، رد نہیں ہوگی کیونکہ اس سے حق و باطل کے درمیان بنیادی امتیاز کا اظہار مقصود تھا اور حق کی حقیقت کا آشکار ہونا اسی پر متوقف و مبنی تھا،

اور لفظ ” الْكٰذِبِينَ “ پر الف و لام عہد کا معنی دیتا ہے یعنی وہ جھوٹے جن کے بارے میں معلوم ہے کیونکہ اس

میں ہر جھوٹا اور تمام جھوٹے مقصود نہیں بلکہ صرف وہی جھوٹے مقصود ہیں جو اس (مباہلہ) میں دو فریقوں میں سے ایک فریق

کے افراد ہیں کہ جن میں سے ایک حضرت محمد مصطفیٰ پیغمبر اسلام اور ان کے ساتھ آنے والے افراد ہیں کہ جو کہتے ہیں کہ خدا

ایک ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت عیسیٰ خدا کے عبد اور اس کے رسول ہیں، جبکہ دوسرا فریق نصاریٰ ہیں جو

کہتے ہیں کہ عیسیٰ ہی خدا ہیں یا وہ اللہ کے فرزند ہیں یا یہ کہ اللہ تین خداؤں میں سے تیسرا ہے۔

بنا برائیں یہ مطلب واضح ہے کہ اگر ادعاء اور اس پر ہونے والا مباہلہ صرف حضرت پیغمبر اسلام اور نصاریٰ کے

درمیان ہوتا یعنی فریقین میں سے ایک صرف آنحضرتؐ جبکہ دوسری طرف کثیر افراد ہوتے تو ضروری تھا کہ آیت مبارکہ میں ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے جو ایک فرد اور گروہ دونوں پر یکساں صادق آتے مثلاً یوں کہا جاتا: ”فَنَجْعَلُ لَعْنَةَ اللَّهِ عَلَىٰ مَنْ كَانَ كَاذِبًا“ کہ ہم اللہ کی لعنت اس پر قرار دیں جو جھوٹا ہو، لیکن عبارت یوں ہے: ”فَنَجْعَلُ لَعْنَةَ اللَّهِ عَلَىٰ الْكَاذِبِينَ“ کہ ہم اللہ کی لعنت قرار دیں جھوٹوں پر! تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مناظرہ و مباہلہ کے دو گروہوں یعنی فریقین میں سے ایک گروہ و فریق کے افراد ”کاذبین“ یعنی جھوٹے ہونے کا مصداق ہوں گے نہ کہ ایک فرد، خواہ وہ نبیؐ کے گروہ والے ہوں یا نصاریٰ کے گروہ والے!، اور اس سے یہ بھی معلوم و ثابت ہوتا ہے کہ جو افراد مباہلہ میں موجود تھے وہ سب اصل مسئلہ و موضوع میں شریک تھے کیونکہ جھوٹ، ادعاء ہی میں قابل تصور ہوتا ہے، لہذا جو بھی حضرت پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ تھا یعنی علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ، وہ سب اصل ادعاء میں بھی شریک تھے اور دعوت مباہلہ میں بھی برابر کے شریک تھے اور یہ بات ان فضائل و مناقب میں سے سب سے بڑی ہے جس سے خداوند عالم نے اہل بیت علیہم السلام کو نوازا ہے جیسا کہ امت کے تمام مردوں، عورتوں اور فرزندوں میں صرف انہی کو آنحضرتؐ کے نفس (اپنے)، نساء (خواتین) اور اہباء (بیٹے) ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔

### مفرد اور جمع کے صیغوں کا استعمالی فرق

مذکورہ بالا مطالب میں بیان کیا گیا ہے کہ قرآن مجید میں جمع کا صیغہ استعمال کر کے اس سے مفرد مراد لینا کثرت سے موجود ہے اور اسی آیت میں لفظ ”نِسَاءً“ (عورتیں) ذکر ہوا ہے جبکہ مباہلہ میں صرف حضرت سیدہ فاطمہ زہراءؑ علیہا السلام موجود تھیں، تو اس بناء پر اگر لفظ ”کاذبین“ (جھوٹے) بھی اسی طرح استعمال ہوا ہو کہ اس سے ایک فرد مراد ہو تو اس میں کیا حرج لازم آتا ہے؟ یعنی یوں کہا جائے کہ فریقین میں سے کاذبین کا مصداق اس طرح متعین کریں کہ ایک طرف نصاریٰ کے تمام افراد ہوں جبکہ ان کے مقابلہ میں صرف حضرت پیغمبر اسلامؐ ہوں، اور حضرت علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ اس میں شامل نہ ہوں اور نہ ہی اصل ادعاء اور دعوت مباہلہ میں شامل ہوں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں موارد میں فرق ہے اور وہ یوں کہ آیات میں جمع کا صیغہ مفرد کے لئے اس لئے استعمال ہوا ہے کہ وہاں ایک فرد مقصود نہیں بلکہ جو کام بیان ہوا ہے اس کا انجام پذیر ہونا کثیر افراد سے ممکن ہے لہذا اس سے ان سب کا اس میں شامل قرار پانا یکساں قابل تصور ہے، اسی لئے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے تاکہ اگر دیگر افراد سے انجام دینا چاہیں تو اس کی گنجائش موجود ہو، لیکن جہاں اس طرح کی گنجائش نہ پائی جاتی ہو بلکہ ایک فرد سے زیادہ کا انجام دینا ممکن نہ ہو اور آیت

ایک فرد سے زیادہ سے انجام پذیر نہ ہو سکنے والے عمل پر مشتمل ہو تو اس صورت میں جمع کا صیغہ استعمال کرنا ہرگز جائز نہ ہوگا جیسا کہ درج ذیل آیات مبارکہ میں مذکور ہے :

سورہ احزاب، آیت : ۳۷

○ ”وَأَذِّنْ لِلَّذِينَ آمَنُوا اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ“  
(اور جب تو اس شخص سے کہہ رہا تھا جس پر خدا نے انعام کیا اور تو نے بھی انعام کیا کہ اپنی بیوی کو روک لے اور اللہ سے خوف کھا.....)

سورہ نحل، آیت : ۱۰۳

○ ”لِسَانَ الَّذِي يُلْجِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجِبِي وَهَذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُبِينٌ“  
(اس کی زبان کہ جس کی طرف یہ لوگ قرآن کی ناحق نسبت دیتے ہیں وہ عجیبی ہے جبکہ یہ واضح عربی زبان ہے)

سورہ احزاب، آیت : ۵۰

○ ”إِنَّا آخِذْنَاكَ أَرْوَاجَكَ الَّتِي آتَيْتِ الْجُورَ هُنَّ..... وَأَمَّا أَلَامُ وَمَنَةٌ إِنْ وَهَبْتَ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ أَنْ يَسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَكَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ“  
(ہم نے تیرے لئے وہ ازواج حلال کر دیں ہیں جن کے مہر تو نے ادا کئے..... اور وہ مومنہ عورت جو اپنے آپ کو نبی کے لئے ہبہ کر دے اگر نبی اس سے نکاح کرنا چاہے تو وہ اس پر حلال ہوگی، یہ حکم صرف تیرے لئے خاص ہے دوسرے مومنین کے لئے نہیں)

مباہلہ کی آیت بھی ایسی ہی ہے کہ اس کے مورد میں وسعت نہیں پائی جاتی اور وہ مورد حضرت پیغمبر اسلام کا نصاریٰ سے مباہلہ ہے لہذا اگر اس میں فریقین سے کئی افراد موجود نہ ہوں تو جمع کا صیغہ ”الکاذبین“ لانا درست نہیں ہو سکتا،

## فریقین کے دعووں کی بابت ایک سوال

اگر یہ کہا جائے کہ جو نصاریٰ حضرت پیغمبر اسلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے وہ سب اپنے ادعاء میں برابر کے شریک تھے اور ان کا دعویٰ یہ تھا کہ عیسیٰ خدا ہے یا خدا کا بیٹا ہے یا تین خداؤں میں تیسرا ہے، اس دعوے میں ان کے درمیان ہرگز کوئی اختلاف نہ تھا بلکہ ان کے مرد بھی دعویٰ کرتے تھے اور ان کی عورتیں بھی یہی دعویٰ کرتی تھیں، ادھر دوسری جانب یعنی حضرت پیغمبر اسلام کی طرف سے بھی صورتحال ایسی ہی تھی کہ وہ جو دعویٰ کرتے تھے یعنی یہ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور

عیسیٰ بن مریم اللہ کے بندہ اور اس کے رسول ہیں، اس دعوے میں آنحضرتؐ اور تمام مومنین شامل تھے، سب یہی دعویٰ کرتے تھے اور یہ دعویٰ صرف ایک شخص سے مختص نہ تھا یہاں تک کہ آنحضرتؐ سے بھی مختص نہ تھا، لہذا آنحضرتؐ جن افراد کو اپنے ہمراہ لے گئے انہیں دیگر مومنین پر کوئی امتیازی برتری حاصل نہ تھی بلکہ صرف اتنی بات تھی کہ آنحضرتؐ انہیں مومنین کے نمونہ کے طور پر لے گئے تھے جیسا کہ آیت مبارکہ سے ظاہر ہے کہ ان میں ہر گروہ سے نمونہ کے طور پر چند افراد لانے کا حکم دیا گیا ہے یعنی بیٹوں، عورتوں اور انفس (اپنوں، بھائیوں) میں سے کچھ افراد ساتھ لائیں، اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ آیت میں مباہلہ کی دعوت کا تذکرہ ہے نہ کہ اصل ادعاء کا، جبکہ سطور بالا میں کہا گیا ہے کہ وہ سب دعویٰ و دعوت دونوں میں شریک تھے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر آنحضرتؐ کا ان افراد کو لانا مومنین میں سے نمونہ کے طور پر ہوتا تو ضروری تھا کہ کم از کم ہر طبقہ میں سے کچھ افراد لے جاتے یعنی کم از کم دو مرد، تین خواتین اور تین فرزند لے جاتے، لہذا جن افراد کو ہمراہ لے گئے دراصل انہی کا لے جانا ہی مقصود تھا اور وہی حکم خداوندی کے امتثال میں کافی تھے، انہی کے ذریعے خدا کے فرمان کی اطاعت متحقق ہوتی تھی دوسرے لفظوں میں یہ کہ ان کے علاوہ کوئی ایسا نہ تھا جس کے ساتھ لے جانے سے خدا کے حکم کا امتثال ہو جاتا اور وہ ایک مرد (حضرت علیؑ) ایک خاتون (حضرت فاطمہ زہراءؑ) اور دو بیٹے (حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ) تھے۔

اگر آپ اس واقعہ یعنی مباہلہ کی بابت بخوبی غور کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ نجران کے نصاریٰ کا ایک وفد مدینہ آیا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ بن مریم کے حوالہ سے حضرت پیغمبر اسلامؐ سے بحث و گفتگو اور مناظرہ و حجاجہ کریں کیونکہ آنحضرتؐ نے جو دعویٰ کیا تھا کہ وہ اللہ کے بندہ اور اس کے بھیجے ہوئے (رسول) ہیں وہ وحی پر مبنی تھا کہ جس کے بارے میں آنحضرتؐ مدعی تھے کہ وہ ان پر نازل ہوئی ہے، اور آنحضرتؐ کے علاوہ وہ افراد جو آپؐ پر ایمان لا کر آپؐ کی پیروی کا دم بھرتے تھے ان سے نصاریٰ کو کوئی کام نہ تھا اور نہ وہ ان سے ملاقات کے خواہاں و مشتاق تھے، جیسا کہ آیت مبارکہ کے ابتدائی الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ جن میں ارشاد الہی ہوا: ”فَمَنْ حَاجَّكَ فِيمَا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ.....“ (پس جو تجھ سے اس کے بارے میں بحث و مناظرہ کرے بعد اس کے کہ تیرے پاس علم آچکا ہے تو کہہ دیجئے.....“، اس میں صرف آنحضرتؐ مخاطب قرار پائے ہیں، اسی طرح اس سے ما قبل چند آیات میں خداوند عالم کا ارشاد ہے: ”فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسَلْتُكُمْ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ“ (پس اگر وہ آپ سے بحث و حجاجہ کریں تو کہہ دیجئے کہ میں نے اور میری پیروی کرنے والوں نے اپنا رخ اللہ کی طرف کر لیا ہے)۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ان افراد کو مباہلہ کے لئے اپنے ہمراہ لے جانا نمونہ کے طور پر نہ تھا کیونکہ مومنین کا مومنین ہونے کے حوالہ سے اس حجاجہ و مباہلہ میں کوئی دخل و حصہ ہی نہ تھا کہ جس کی بناء پر

اس لعنت و عذاب کے مستحق افراد میں قرار پائیں جو ان کے اور ان کے مد مقابل افراد کے درمیان تھا یعنی ان پر یا ان کے مقابل آنے والوں میں سے کسی ایک پر آنے والا تھا، اور آنحضرتؐ جن افراد کو اپنے ساتھ لے گئے انہیں اپنی مضمینی حیثیت میں لے گئے کیونکہ آپؐ خود اس بحث و مناظرہ اور ادعاء میں فریق تھے تو حق تو یہ تھا کہ خود ہی اس امتحان گاہ میں پیش ہوتے کہ جہاں جھوٹ ثابت ہونے کی صورت میں لعنت و عذاب ان کا انتظار کر رہا تھا، تو اسے برداشت کرتے، بنا بریں اگر وہ دعویٰ جو آنحضرتؐ نے کیا تھا اس میں وہ افراد اسی طرح شریک نہ ہوتے جس طرح خود آنحضرتؐ تھے تو انہیں ساتھ لے جانا بے مقصد و بے سود ہوتا، لہذا ثابت ہوا کہ ان ہستیوں کا ساتھ لے جانا اس بناء پر تھا کہ وہ اس دعویٰ میں برابر کے شریک تھے کہ جن میں بیٹے، خواتین اور انفس شامل تھے۔ اور انہیں بطور نمونہ ساتھ نہ لے گئے تھے، اس طرح یہ بات درست قرار پاتی ہے کہ جو دعویٰ آنحضرتؐ نے کیا تھا (کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور عیسیٰؑ بندۂ خدا اور خدا کے نبی ہیں) وہ ان افراد کے ساتھ اسی طرح قائم تھا جس طرح خود آنحضرتؐ کے ساتھ !

اور یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ نصاریٰ جو آنحضرتؐ سے ملنے اور بحث و مجاہدہ و مناظرہ کرنے آئے تھے وہ صرف اس بناء پر نہیں آئے تھے کہ صرف آنحضرتؐ کا عقیدہ ہے کہ عیسیٰؑ بن مریمؑ بندۂ خدا اور رسول خدا ہیں اور یہ آپؐ ہی کا ایمان و نظریہ ہے بلکہ اس بناء پر آئے تھے کہ آنحضرتؐ اس کے مدعی ہیں اور انہیں یعنی نصاریٰ کو بھی اس کی طرف بلاتے ہیں، لہذا یہ دعوت و بلاوا ہی اس بات کا سبب ہوا کہ وہ فوج بھیجیں اور بحث و مناظرہ کریں، اس حوالہ سے آنحضرتؐ اور جو ہستیاں آپؐ کے ہمراہ مباہلہ کے لئے آئیں وہ دعویٰ و دعوت دونوں کی طرف سے تھا اور وہ ہستیاں آپؐ کے ساتھ دعوت دین کے عمل میں اسی طرح شریک تھیں جس طرح کے اصل دعویٰ میں شریک تھیں۔

## ایک فنی و تکنیکی سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال ممکن ہے اور وہ یہ کہ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ ان ہستیوں کا مباہلہ کے لئے آنحضرتؐ کے ہمراہ آنا اس بناء پر تھا کہ وہ آنحضرتؐ ہی سے تھے اور یہ صفت انہی سے مخصوص تھی اور ان کے علاوہ کوئی بھی اس صفت و خصوصیت کا حامل نہ تھا لیکن عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے عزیز و نزدیک ترین افراد کو بظاہر خطرناک و خوفناک مقامات میں لاتا ہے تو اس کا یہی عمل اس حقیقت کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ ان کے بارے میں وثوق و اطمینان رکھتا ہے کہ وہ ہر طرح سے محفوظ رہیں گے اور انہیں کسی طرح سے کوئی خطرہ لاحق نہ ہوگا بلکہ پوری حفاظت کے ساتھ سلامتی و عافیت سے ہمکنار ہوں گے، اس بناء پر آنحضرتؐ کا ان ہستیوں کو اپنے ہمراہ لانا بھی اسی طور پر تھا، اس سے زیادہ کوئی چیز ملحوظ نہ تھی لہذا ان کا دعوت و مباہلہ میں



برابر کا شریک قرار پانا ان کے وہاں آنے سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کا ان کے وہاں آنے سے دور کا بھی ربط نہیں، گویا اس سے ان کی فضیلت و برتری وغیرہ ثابت نہیں ہوتی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت مبارکہ کے ابتدائی الفاظ سے تو یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ وہ دعوت میں برابر کے شریک تھے بلکہ اس سے اس مطلب سے زیادہ کچھ ثابت نہیں ہوتا جو ذکر کیا گیا ہے لیکن سوال یا اعتراض کرنے والے کو معلوم ہے کہ آیت کے ذیلی الفاظ یعنی ”عَلَى الْكُذِّبَيْنِ“ سے ثابت ہوتا ہے کہ مباہلہ و مناظرہ کے دو فریقوں میں سے ایک یقینی طور پر جھوٹا تھا بلکہ اسے جھوٹا ہونا بھی چاہیے کیونکہ مجاہد و مباہلہ میں فریقین میں سے کسی ایک کا برحق اور دوسرے کا ناحق ہونا ضروری ہوتا ہے، اور یہ تبھی درست ہوتا ہے جب دونوں طرفوں کے افراد اس عمل میں برابر کے شریک ہوں، خواہ سچوں کی طرف کے افراد ہوں یا جھوٹوں کی طرف کے افراد ہوں، بنا بریں اس جملہ سے ثابت ہوتا ہے کہ جو افراد حضرت پیغمبر اسلام کے ہمراہ آئے تھے وہ آپ کے ساتھ اصل ادعاء اور دعوت مباہلہ دونوں میں برابر کے شریک و حصہ دار تھے جیسا کہ پہلے یہ مطلب بیان ہو چکا ہے۔ اس حوالہ سے ان ہستیوں کے حصہ دار ہونے اور آنحضرت کے توحیدی مشن اور اثبات حق کے لئے مباہلہ کے عمل میں برابر کے شریک ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا۔

## ایک اہم اصولی سوال اور اس کا جواب

مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں ایک اہم بلکہ نہایت حساس مسئلہ سامنے آ سکتا ہے اور وہ یہ کہ اگر وہ افراد جو آنحضرت کے ساتھ مباہلہ میں آئے تھے اصل ادعاء و دعوت میں برابر کے شریک ہوں تو اس سے ان کی نبوت تسلیم کرنا پڑے گی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں جیسا کہ ہم سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۳ کی تفسیر میں واضح طور پر نبوت کی بابت مربوط مباحث میں بیان کر چکے ہیں کہ تبلیغ و دعوت نہ عین نبوت ہے اور نہ ہی عین بعثت ہے البتہ یقیناً ان کے لازمی امور میں شامل ہے بلکہ اس کے منہجی تقاضوں کا حصہ ہے یعنی تمام خدائی عہدوں اور منصوبوں کی بنیادی ذمہ داریوں میں سے ہے، اسی طرح سورہ بقرہ کی آیت ۱۲۳ کی تفسیر میں بھی امامت کی بحث میں یہ امر واضح طور پر بیان ہو چکا ہے کہ تبلیغ و دعوت عین امامت نہیں البتہ ایک حوالہ سے اس کے لازمی امور اور بنیادی تقاضوں کا حصہ ہے۔

## سچے واقعات

○ ” اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ “  
(یقیناً یہی سچے و برحق واقعات ہیں، اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں)

اس آیت میں لفظ ”ہَذَا“ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مربوط واقعات سے تعلق رکھنے والے مطالب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، عربی ادب کی اصطلاح میں یوں کہا جاتا ہے کہ یہ کلام قصر القلب پر مشتمل ہے اس کا معنی یہ ہے کہ عیسیٰ کے متعلق ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہی حق ہے نہ کہ وہ جو نصاریٰ نے عیسیٰ کے بارے میں دعویٰ کیا ہے!

اور یہاں حرف ”اِنَّ“ اور حرف لام اور ضمیر ”لَهُوَ“ اس لئے ذکر کی گئی ہے کہ اس جملہ میں جو مطلب بیان کیا گیا ہے اس کی تاکید مزید ہو جائے تاکہ آنحضرتؐ کی طیب خاطر اور مہلبہ کی بابت حوصلہ افزائی و تقویت قلب کا سامان ہو کہ آپ اپنے پختہ یقین، کامل بصیرت اور خدا کی طرف سے نازل ہونے والی وحی کی بابت اپنے بھرپور اعتماد کے ساتھ میدان میں اتریں، چنانچہ اس تاکید پر مزید تاکید اس حقیقت کے ذکر کے ذریعے ہوئی جو دعوت حق کا بنیادی تقاضہ و نتیجہ تھا یعنی ”وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ“ (اور کوئی معبود نہیں سوائے خدا کے!) کیونکہ یہ جملہ (توحید پر مشتمل ہونے کی وجہ سے) مذکورہ واقعات کے برحق ہونے کا لازمی نتیجہ ہے۔

## خدا کا غلبہ و دانائی

○ ” وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ “  
(اور یقیناً خدا ہی ہے جو غالب و دانای)

یہ جملہ ابتدائے آیت پر عطف ہے اور اس کا نہایت تاکید پر مشتمل ہونا آنحضرتؐ کے طیب خاطر اور تقویت قلب و حوصلہ افزائی کے خدائی حوالہ کا امین ہے کہ خدا حق کی نصرت و تائید سے عاجز و ناتواں نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس سلسلہ میں کسی بے توجہی و نادانی کے سبب غفلت و بے پرواہی کرتا ہے کیونکہ وہ غلبہ والا ہے (جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اس کے پورا کرنے میں ناتواں نہیں) اور وہ حکمت و دانائی والا ہے (وہ نا آگاہ و بے پرواہی کرنے والا نہیں)، لہذا وہی معبود برحق ہے نہ کہ وہ معبود

ہیں جنہیں دشمنان حق نے خدا کے مقابلے میں محبوب قرار دیا ہوا ہے۔

اس بیان سے یہاں ان دونوں (عزیز، حکیم) کے ذکر کی وجہ بھی واضح ہو جاتی ہے اور یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ کلام خداوندی قصر القلب کے لئے ہے یا قصر الافراد کے لئے ہے۔

## خدا فساد یوں سے آگاہ ہے

○ ”فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِالنَّفْسِ الْيَمِينِ“  
(خدا فساد پر پا کرنے والوں کو بخوبی جانتا ہے)

چونکہ محاجہ و مباہلہ کی اصل غرض اور حقیقی مقصد حق کا اظہار تھا لہذا یہ بات ہرگز معقول نہ تھی کہ اس عظیم غرض و مقصد کے حصول کا خواہاں اس راہ سے روگردانی کرے، پس اگر نصاریٰ مباہلہ و محاجہ کے ذریعے حق کا واضح و آشکار ہونا چاہیں جبکہ وہ بخوبی آگاہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ حق کے ساتھ ہے اور وہ حق کو مغلوب و بے نتیجہ ہوتا نہیں دیکھ سکتا تو وہ مباہلہ سے ہرگز روگردانی نہیں کریں گے، لیکن اگر وہ اس سے روگردانی کریں تو اس کا سبب و مطلب یہ ہوگا کہ وہ حق کا اظہار اور حقیقت کا آشکار ہونا چاہتے ہی نہیں بلکہ صرف ظاہری غلبہ کا حصول، دنیاوی نام و نمود کا تحفظ اور اپنی دیرینہ عادات و رسوم کی بقا کے خواہاں ہیں، بنا براین ان کا مقصد اپنی ہوا و ہوس سے آمیختہ اور نفسانی خواہشات سے آلودہ زندگی سے لطف اندوز ہونا ہے اور وہ صالح و پاکیزہ زندگی چاہتے ہی نہیں جو حق و سعادت سے ہمرنگ و ہم آہنگ ہو، درحقیقت وہ اصلاح نہیں چاہتے بلکہ اپنی سعادتمند زندگی کو تباہ و برباد کر کے دنیا کی تباہی و نابودی کے درپے ہیں، پس اگر وہ روگردانی کریں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فساد ی ہیں۔

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں جزاء میں سبب کو مسبب کی جگہ رکھ دیا گیا ہے یعنی فساد (فساد کی تباہی پھیلانے) کو حق کے عدم اظہار کے ارادہ کی جگہ ذکر کیا گیا ہے، اور جملہ میں جزاء کو وصف علم یعنی جاننے و آگاہ ہونے سے آمیختہ کر دیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا: ”فَإِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ“ (بے شک خدا آگاہ و باخبر ہے) پھر حرف ”اِنَّ“ کے ذریعے تاکید مزید کر دی گئی تاکہ یہ بات ثابت ہو کہ فساد اور تباہی پھیلانا ان کے نفوس میں رچ بس گیا ہے اور ان کے دلوں میں اس کی جڑیں مضبوط ہو چکی ہیں، اس سے ان کی مباہلہ سے یقینی روگردانی کا اشارہ ملتا ہے، چنانچہ عملی طور پر ان کا کردار کلام الہی کی صداقت کا ثبوت بن گیا اور انہوں نے اپنی فساد ی و فساد ی طبع کے آثار کے ذریعے خدا کے فرمان کی تصدیق کر دی۔

## روایات پر ایک نظر

### نجران کے نصاریٰ کا وفد، مدینہ میں!

تفسیر فی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی ذکر کیا گیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

جب نجران کے نصاریٰ کا وفد حضرت پیغمبر خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس کے سربراہ ”اہتم“، ”عاقب“ اور ”سید“ نامی افراد تھے، ان کی نماز کا وقت ہوا تو وہ کھنٹیاں بجانا شروع ہو گئے اور پھر نماز پڑھنے میں مصروف ہو گئے، آنحضرتؐ کے اصحاب نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ آپؐ کی مسجد میں ایسا ہو رہا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو، چنانچہ وہ اپنی نماز سے فارغ ہو گئے تو آنحضرتؐ کے قریب آئے اور آپؐ سے پوچھنے لگے کہ آپؐ لوگوں کو کس دین کی دعوت دے رہے ہیں؟ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: خدا کی توحید اور اپنی رسالت پر ایمان لانے اور حضرت عیسیٰؑ کو بندہ خدا تسلیم کرنے کی دعوت دے رہا ہوں کہ وہ خدا کی مخلوق تھے کھاتے، پیتے اور باتیں کرتے تھے، انہوں نے کہا: اگر ایسا ہے تو پھر یہ بتائیے کہ ان کا باپ کون ہے؟ اس وقت حضرت پیغمبر اسلامؐ پر وحی نازل ہوئی اور خدا نے ارشاد فرمایا: ان سے پوچھئے کہ تم آدمؑ کے بارے میں کیا کہتے ہو، کیا وہ خدا کا بندہ اور مخلوق خدا تھا جو کھاتا، پیتا، بولتا اور مناکحت کرتا تھا؟ آنحضرتؐ نے ان سے پوچھا تو وہ کہنے لگے، ہاں، آپؐ نے پوچھا: اس کا باپ کون تھا؟ تو وہ حیرت زدہ ہو گئے اور بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئے، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: ” اِنَّ مَثَلَ عِيسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۗ خَلَقْنٰهُ مِنْ تُرَابٍ .....“ اور یہ آیت ” فَسَنُحَاجُّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۗ فَقُلْ تَعَالَوْا اِنۡدَعِبۡنَا وَاٰبَآءَ كُمۡ وَاِنۡسَاۗءَ كُمۡ وَاِنۡفُسَنَا وَاِنۡفُسَكُمۡ ثُمَّ نَبۡتَهِلۡ فَنَجۡعَلۡ لِّلۡعَنۡتِ اللّٰهِ عَلٰى اٰلِكُنۡ يٰۤاٰمِنِۢنَّ“، تو حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ان سے فرمایا: آؤ تم مجھ سے مباہلہ کرو، اگر میں سچا ہوں تو تم پر خدا کی لعنت نازل ہوگی اور اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر نازل ہوگی، نصاریٰ نے کہا کہ آپؐ نے یہ انصاف کی بات کی، چنانچہ انہوں نے مباہلہ کا طے کر لیا، جب وہ اپنے گھروں کو واپس گئے تو ان کے بزرگوں اور وفد کے سربراہوں نے کہا کہ وہ خود اور اپنی قوم کے ساتھ مباہلہ کو آئے تو ہم ضرور مباہلہ کریں گے کیونکہ وہ نبی نہیں، اور اگر وہ خود اور اپنے اہل بیت کے ساتھ مباہلہ کے لئے آئے تو ہم مباہلہ نہیں کریں گے کیونکہ یہ بات مسلم ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک اپنے اہل بیت کو خطرے میں ڈالنے پر تیار نہیں ہوتا جب تک اسے اپنے سچا

ہونے کا یقین نہ ہو، جب صبح ہوئی تو وہ لوگ حضرت پیغمبر اسلام کے پاس آئے اور حسب وعدہ مباہلہ کے لئے پہنچ گئے، انہوں نے دیکھا کہ حضرت رسول خدا کے ساتھ امیر المومنین علیؑ، فاطمہ زہراءؑ، حسنؑ و حسینؑ ہیں تو انہوں نے پوچھا: یہ کون ہیں؟ انہیں بتایا گیا کہ وہ مرد آپ کے چچا زید بھائی، وصی اور داماد علیؑ بن ابی طالبؑ ہیں اور یہ خاتون آپ کی دختر فاطمہؑ اور یہ دو فرزند آپ کے نواسے حسنؑ و حسینؑ ہیں، یہ سن کر وہ پیچھے ہٹ گئے اور انہوں نے آنحضرتؐ سے کہا: ہم آپ پر راضی ہیں آپ ہمیں مباہلہ سے معاف کریں، تو آپ نے جزیہ پر ان سے مصالحت کر لی اور وہ واپس چلے گئے۔

(تفسیر قمی، جلد اول صفحہ ۱۰۴)

## عترت اور امت کے درمیان فرق

کتاب عیون اخبار الرضا (عیون اخبار الرضا، ج ۱، ص ۲۲۸، حدیث ۱، باب ۲۳) میں ریان بن صلت کے حوالہ سے مروی ہے کہ حضرت امام رضا علیہ السلام نے مامون عباسی اور اس کے بلائے ہوئے علماء سے طویل بحث و مباحثہ میں عترت اور امت کے درمیان فرق کو بیان کیا اور عترت کی امت پر فضیلت و برتری کو ثابت کیا، چنانچہ علماء نے امام سے پوچھا: ”هل فسر الله الاصطفاء في كتابه؟ کیا خداوند عالم نے اپنی کتاب میں اصطفاء کی تفسیر بیان کی ہے؟ امام نے ارشاد فرمایا: ”فسر الاصطفاء في الظاهر سوى الباطن في الثني عشر موضعا، خداوند عالم نے قرآن مجید میں بارہ مقامات پر اصطفاء کی ظاہری تفسیر بیان کی ہے جبکہ باطنی تفسیر کچھ اور ہے، پھر امام نے ان بارہ مقامات کو بیان کیا اور مربوط آیات پڑھیں، اپنے بیان میں امام نے ان مقامات میں سے تیسرے مقام کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا: تیسرا مقام وہ ہے جس میں خدا نے اپنے پاک بندوں کو دوسروں سے امتیاز بخشا اور اپنے نبی کو حکم دیا کہ نصاریٰ کے ساتھ مباہلہ کریں چنانچہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ”فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ آبَاءَنَا وَآبَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ“ (پس جب تجھ سے بحث و محاجہ کریں بعد اس کے کہ تیرے پاس علم آچکا ہے تو کہہ دو کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائے ہیں تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی عورتوں کو بلائے ہیں تم اپنی عورتوں کو بلاؤ اور ہم اپنوں کو بلائے ہیں تم اپنوں کو بلاؤ)، علماء نے کہا کہ یہاں ”انفس“ سے مراد خود آنحضرتؐ ہیں، امام نے فرمایا: تم غلط فہمی کہہ رہے ہو، اس سے مراد علیؑ بن ابی طالبؑ ہیں، اس کی دلیل آنحضرتؐ کا وہ فرمان ہے جو قبیلہ بنی ولیعہ کے بارے میں آپ نے فرمایا، اس میں یوں ارشاد ہوا: ”لينتهين بنوا وليعة او لابعثن اليهم رجلاً كنفسي“ بنو وليعہ اپنی حرکتوں سے باز آ جائیں ورنہ میں ان کی طرف ایسے شخص کو بھیجوں گا جو میری طرح ہے، اس میں لفظ ”کنفسی“ سے مراد

علی بن ابی طالب ہیں، اور ”ابناء“ (بیٹوں) سے مراد حسن و حسین ہیں اور ”نساء“ سے مراد قاطمہ ہیں، فہذہ خصوصیتہ لما يتقدمہم فیہا احد، وفضل لما يلحقہم فیہ بشر، و شرف لما يسبقہم الیہ خلق اذ جعل نفس علی (ع) کنفسہ یہ وہ خصوصیت اور امتیازی صفت ہے کہ پوری امت میں سے کوئی فرد اس میں ان ہستیوں پر تقدم نہیں رکھتا، اور ایسی فضیلت ہے کہ جسے ان کے سوا کوئی انسان نہیں پاسکتا اور ایسا شرف و اعزاز ہے کہ ان کے علاوہ کوئی اس کا حال نہیں ہو سکتا، کیونکہ آپ نے علیؑ کو اپنا ”نفس“ قرار دیا۔

### اولاد رسول سے کیا مراد ہے؟

کتاب عیون اخبار الرضا ہی میں مؤلف نے اپنے اسناد سے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا ارشاد گرامی ذکر کیا ہے کہ آپ نے رشید عباسی سے گفتگو اور بحث میں وضاحت فرمائی، رشید نے امام سے کہا: کیف قلتہم: انا ذریۃ النبی (ص) والنبی لم یعقب، وانما العقب للذکر لا للانثی، وانتم ولد البنت ولا یكون له عقب؟ آپ کس طرح دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نبیؐ کی ذریت و اولاد ہیں؟ جبکہ نبیؐ کا کوئی بیٹا نہ تھا اور ذریت و نسل کا سلسلہ مردوں سے چلتا ہے عورتوں سے نہیں، اور آپ نبیؐ کی بیٹی کی نسل سے ہیں لہذا آپ رسول اللہؐ کی اولاد و نسل نہیں کہلا سکتے، امام نے فرمایا کہ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اس سے کہوں کہ تجھے قرابت و قبر رسولؐ اور خود رسولؐ کا واسطہ دیتا ہوں کہ مجھے اس بحث سے دور رکھ، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا، رشید نے میری طرف اور وہاں موجود دیگر سادات کی طرف رخ کر کے کہا: تسخبرنی بحجتکم فیہ یا ولد علی و انت یا موسیٰ یعسوبہم و امام زمانہم، اے اولاد علیؑ اور اے موسیٰ کہ جو ان کا سردار اور ان کا امام زمانہ ہے، مجھے اس موضوع کا اثبات مطلوب ہے اور تم مجھے اپنے دعوے کی ٹھوس دلیل پیش کرو، رشید نے خاص طور پر میری طرف رخ کر کے کہا: ولست اعفیک فی کل ما استلک عنہ حتی تاتینی فیہ بحجۃ من کتاب اللہ وانتم تدعون معشر ولد علی انہ لا یسقط عنکم منہ شیء لا الف ولا واو الا تاویلہ عندکم واحص حجتہم بقولہ: ما فرطنا فی الكتاب من شیء، کہ میں آپ کو ہرگز معاف نہیں کروں گا جب تک کہ اس سلسلہ میں میرے ہر سوال کا ٹھوس جواب نہ دو اور کتاب اللہ سے واضح ثبوت پیش نہ کرو، اور تم اولاد علیؑ دعویٰ کرتے ہو کہ کتاب اللہ کی کوئی بات تم سے پوشیدہ نہیں، نہ اس کا الف اور نہ واو، بلکہ تم سب کی حقیقت سے آگاہ ہو اور تم اپنے ادعاء پر یہ دلیل پیش کرتے ہو کہ خدانے فرمایا ہے: ”ما فرطنا فی الكتاب من شیء“، اور تم اپنے آپ کو تمام علماء کے نظریہ اور قیاس سے بے نیاز سمجھتے ہو!

رشید کی یہ بات سن کر میں نے اس سے کہا: کیا مجھے جواب دینے کی اجازت ہے؟ اس نے کہا: ہاں، جو کچھ آپ کے پاس ہے پیش کریں، تو میں نے کہا: ”أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ، وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَى وَهَارُونَ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿۶۱﴾ وَذَكَرْنَا وَيْحَ نَبِيِّ وَعِيسَى وَالْيَاسَ“ تو اے ہارون (اپنے آپ کو امیر المؤمنین سمجھنے والے) یہ بتاؤ کہ عیسیٰ کا باپ کون تھا؟

ہارون رشید نے کہا: ان کا کوئی باپ نہ تھا، تو میں نے کہا: جبکہ عیسیٰ کا کوئی باپ نہ تھا تو خدا نے اسے اس کی والدہ حضرت مریم کے ذریعے انبیاء کی ذریت میں شامل کر دیا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہماری مادر گرامی قدر فاطمہ کے ذریعے نبی کی ذریت میں شامل کر لیا، کیا مزید کچھ کہوں اے وہ کہ جو خود کو مؤمنوں کا امیر کہلاتے ہو؟

رشید نے کہا: مزید کچھ پیش کریں، تو میں نے اس آیت کی تلاوت کی: ”فَمَنْ حَا جَبْتَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَىٰ أَنْدَعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ“، اور کہا کہ کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ آنحضرت نے نصاریٰ سے مباہلہ میں اسے چادر کے نیچے اپنے ساتھ رکھا ہو سو اے علی بن ابی طالب، فاطمہ اور حسن و حسین کے، لہذا کلام الہی کی تفسیر و تاویل یوں ہوگی: ”أَبْنَاءَنَا“ یعنی حسن و حسین، ”نِسَاءَنَا“ یعنی فاطمہ اور ”أَنْفُسَنَا“ یعنی علی بن ابی طالب،

(کتاب عیون اخبار الرضا، جلد اول صفحہ ۸۳، ۸۵)

اس کے علاوہ مامون نے حضرت امام رضا علیہ السلام سے جو سوالات کئے ان میں ایک سوال یہ تھا کہ آپ کے جد علی بن ابی طالب کی خلافت کی دلیل کیا ہے؟ تو امام نے جواب دیا: ”أَنْفُسَنَا“ کی آیت اس کی دلیل ہے، مامون نے کہا: ہاں اگر ”نِسَاءَنَا“ نہ ہوتا، امام نے فرمایا: ہاں، اگر ”أَبْنَاءَنَا“ نہ ہوتا۔

وضاحت: امام نے ”أَنْفُسَنَا“ سے استدلال کیا کہ اس میں حضرت علی بن ابی طالب مراد ہیں کہ خدا نے انہیں نفس نبی قرار دیا ہے، اس پر مامون نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ یہ بات تب درست تھی جب آیت میں لفظ ”نِسَاءَنَا“ نہ ہوتا کیونکہ اس لفظ کی بناء پر ”أَنْفُسَنَا“ سے مراد ہیں تو اس سے فضیلت کی کوئی بات ثابت ہوتی ہے؟ امام نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: تیری بات تب درست تھی جب اس میں لفظ ”أَبْنَاءَنَا“ نہ ہوتا اور یہ لفظ ”أَبْنَاءَنَا“ تیرے دعوے کی صریح نافی کرتا ہے کیونکہ اگر ”أَنْفُسَنَا“ سے عام مرد مراد ہوتے تو بیٹوں (أَبْنَاءَنَا) کے ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی بلکہ حسن و حسین کہ جو بیٹوں کی جگہ پر ساتھ تھے وہ بھی مردوں میں شامل ہونے کی وجہ سے ”أَبْنَاءَنَا“ کا مصداق نہ بنتے، تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لفظ ”أَنْفُسَنَا“ سے مراد عام مرد نہیں بلکہ خاص طور پر حضرت علی بن ابی طالب مراد ہیں۔

## فضائل علیؑ بزبان علیؑ

تفسیر العیاشی میں مؤلف نے اپنے اسناد سے حریری کی روایت ذکر کی ہے کہ اس نے بیان کیا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ایک شخص حضرت امیر المومنینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا کہ اپنے فضائل بیان کریں، امام نے اپنے کچھ فضائل بیان کئے تو لوگوں نے کہا: کچھ مزید بیان فرمائیں، امام نے ارشاد فرمایا:

”ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتاه حبران من احبار النصرانی من اهل نجران فتکلما فی امر عیسیٰ فانزل اللہ ہذہ الآیۃ: ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم..... الخ، فدخل رسول اللہ فاخذ بیدی والحسن والحسین وفاطمۃ ثم خرج ورفع کفہ الی السماء و فوج بین اصابعہ ودعاهم الی المباحلۃ“

نجران کے نصاریٰ کے علماء میں سے دو عالم حضرت پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں آئے اور آپ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں گفتگو کی، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: ”عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم جیسی ہے جسے خدا نے مٹی سے پیدا کیا.....“، چنانچہ رسول خداؐ گھر میں تشریف لائے اور میرا ہاتھ پکڑا اور حسنؑ و حسینؑ و فاطمہؑ کو ساتھ لیا اور باہر آگئے اور اپنی ہتھیلی آسمان کی طرف اٹھا کر جبکہ آپؐ کی انگلیاں کھلی ہوئی تھیں نصاریٰ کو مباحلہ کے لئے بلایا،..... جب ان دو عیسائی بزرگ علماء نے دیکھا تو ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: ”واللہ لئن کان نبیاً لنھکن و ان کان غیر نبی کفانا قومہ“ خدا کی قسم! اگر وہ نبی ہو تو ہم سب تباہ ہو جائیں گے اور اگر وہ نبی نہ ہو تو اس کی قوم ہماری مدد کو کانی ہوگی، چنانچہ انہوں نے مباحلہ نہ کیا اور واپس چلے گئے۔ (تفسیر العیاشی، جلد اول، صفحہ ۱۷۵، حدیث ۵۴)

## تحقیقی اظہار خیال

مذکورہ بالا یا ان سے قریب المعنی مطالب شیعہ محدثین نے اپنے حوالوں سے متعدد روایات میں ذکر کئے ہیں اور ان تمام روایات میں یہ بات درج ہے کہ جو ہستیاں حضرت پیغمبر اسلامؐ کے ہمراہ گئی تھیں وہ حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ زہراءؑ اور امام حسنؑ و امام حسینؑ تھے، چنانچہ شیخ طوسی نے اپنی کتاب ”امالی“ میں عامر بن سعد کے حوالہ سے روایت ذکر کی ہے کہ انہوں



نے اپنے والد کے اسناد اس مطلب کو بیان کیا (امالی شیخ طوسی جلد ۱ صفحہ ۳۱۳)، شیخ مرحوم ہی نے اپنے اسناد سے عبدالرحمن بن کثیر کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے امام جعفر صادقؑ کا ارشاد گرامی بیان کیا، اسی طرح شیخؒ نے دو روایتیں مزید ذکر کیں جن میں سے ایک سالم بن ابی جعد کے حوالہ سے ہے کہ انہوں نے اپنے اسناد سے حضرت ابو ذر غفاری رضوان اللہ علیہ کا بیان ذکر کیا ہے اور دوسری روایت میں ربیعہ بن ناجد کے سلسلہ سند سے حضرت امیر المومنین علیؑ کا ارشاد گرامی ذکر کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو: امالی، جلد ۲، ص ۱۷۷، اور جلد ۱ ص ۲۶۱) اور اسی روایت کو شیخ مفیدؒ نے کتاب الاختصاص میں اپنے حوالہ سے محمد بن زبرقان کی روایت ذکر کی کہ انہوں نے امام موسیٰ بن جعفر علیہما السلام کا ارشاد گرامی بیان کیا، (الاختصاص، صفحہ ۵۴) اور اسی روایت کو کتاب ”اختصاص“ ہی میں محمد بن منکر کے حوالہ سے ذکر کیا کہ انہوں نے اپنے والد اور دادا کے اسناد سے بیان کیا، (کتاب الاختصاص، ص ۱۱۲) اور عیاشیؒ نے اپنی تفسیر میں محمد بن سعید اردنی کے حوالہ سے موسیٰ بن جعفر بن محمد بن رضا کے اسناد سے بیان کیا کہ انہوں نے اپنے بھائی کے حوالہ سے ذکر کیا، (تفسیر العیاشی جلد اول صفحہ ۱۷۶ حدیث ۵۵) مرحوم عیاشیؒ ہی نے اپنی تفسیر میں ابو جعفر احول کے حوالہ سے امام جعفر صادقؑ کا ارشاد گرامی ذکر کیا اور اسی کتاب میں ایک اور روایت میں احول کے حوالہ سے امام جعفر صادقؑ کا فرمان ذکر کیا ہے، اور منذر کے حوالہ سے امام علیؑ کا ارشاد گرامی بھی ذکر کیا ہے اور ایک روایت اپنے اسناد سے عامر بن سعد کے حوالہ سے ذکر کی ہے، اور فرات بن ابراہیمؒ نے اپنی تفسیر میں پورے سلسلہ روایت کے ذکر کے ساتھ امام ابو جعفرؑ کا ارشاد اور ابورافع، شعی، امام علیؑ اور شہر بن حوشب کی روایات ذکر کی ہیں، (تفسیر فرات کوفی، صفحہ ۱۳ تا صفحہ ۱۷) اور اسی روایت کو کتاب روضۃ الواعظین صفحہ ۱۶۳، کتاب اعلام الوریٰ صفحہ ۱۳۵، کتاب خراج راوندی صفحہ ۱۲۶ اور دیگر کتب میں ذکر کیا گیا ہے۔

## نصاری کی مباہلہ سے روگردانی

تفسیر ثعلبی میں مجاہد اور کلبی کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے جب نجران کے نصاریٰ کو مباہلہ کی دعوت دی تو انہوں نے کہا: ہم واپس جا کر اس سلسلہ میں مشورہ کرتے ہیں اور اس پر غور کرتے ہیں، چنانچہ انہوں نے تجانی میں بیٹھ کر غور و خوض کے بعد عاقبہ... جو کہ ان میں سے زیادہ معتبر اہل نظر تھا... سے کہا ”یا عبد المسیح ماتری؟“ اے عبد اسح! تیری کیا رائے ہے؟ اس نے جواب دیا:

”واللہ لقد عرفتم یا معشر النصاری ان محمداً نبی مرسل ولقد جاءکم بالفصل من امر صاحبکم، واللہ ما باہل قوم نبیاً قط فعاش کبیرہم ولانبت صغیرہم، ولئن فعلتم لنہلکن

فان ابیتم الالف دینکم والقامة علی ما انتم علیہ فوادعوا الرجل وانصرفوا الی بلادکم  
خدا کی قسم اے گروہ نصاریٰ! تم بخوبی آگاہ ہو کہ محمدؐ نبی ہیں جنہیں خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے اور وہ تمہارے  
پاس حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں واضح دلیل لائے ہیں اور اس سلسلہ میں انہوں نے آپ کو کھلا چیلنج کیا ہے، قسم بخدا!  
جس قوم نے بھی کسی نبی سے مباہلہ کیا تو نہ ان کا بوڑھا بچا اور نہ ہی ان کے چھوٹے بچے..... بلکہ سب کے سب تباہ ہو گئے، اگر  
تم نے مباہلہ کیا تو ہم سب تباہ ہو جائیں گے، اگر تم اپنے پسندیدہ دین کو بچانا چاہتے ہو اور جس حال میں ہو اس پر باقی رہنا  
چاہتے ہو تو اس شخص (محمدؐ) سے معاہدہ کر لو اور اپنے دیار کو پلٹ جاؤ، چنانچہ وہ رسول اللہؐ کی طرف روانہ ہو گئے اور جب  
وہاں پہنچے تو دیکھا کہ:

”وقد غدا محتضناً بالحسین اخذاً بید الحسن وفاطمة تمشی خلفه و علی خلفها  
وهو يقول: اذا انا دعوت فامنوا، فقال اسقف نجران: يا معشر النصارى انى لارى وجوها  
لو سألوا الله ان يزيل جبلاً من مكانه لازال به فلا تباهلوا فتهلكوا ولا يبقى على وجه الارض  
نصرانى الی يوم القيامة“

حضرت رسول خداؐ نے حسینؑ کو آغوش میں لیا ہوا تھا اور حسنؑ کا ہاتھ پکڑ کر آ رہے تھے جبکہ فاطمہؑ ان کے پیچھے پیچھے  
چل رہی تھیں اور علیؑ فاطمہؑ کے پیچھے چلتے ہوئے آ رہے تھے، حضرت رسول خداؐ نے ان سے کہا: جب میں دعا کروں تو تم آمین  
کہنا، نجران کے پادری نے جب حضرت رسول خداؐ اور ان کے ساتھ آنے والوں کو دیکھا تو اپنے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہنے  
لگا: اے نصرانیو! یقیناً میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر وہ خدا سے چاہیں کہ پہاڑ کو اس کی جگہ سے ہٹا دے تو وہ ہٹا دے گا،  
ان سے مباہلہ ہرگز نہ کرنا ورنہ تباہ و ہلاک ہو جاؤ گے اور قیامت تک کوئی نصرانی روئے زمین پر باقی نہ رہے گا،  
اسقف کی بات سن کر نصرانیوں نے آنحضرتؐ سے کہا:

”يا ابا القاسم رأينا ان لا نباهلك و ان نفرک علی دینک و نثبت علی دیننا“  
اے ابو القاسم! ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ سے مباہلہ نہ کریں اور آپ کو اپنے دین پر رہنے دیں اور ہم اپنے  
دین پر باقی رہیں، آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا:

”فاذا ابیتم المباهلة فاسلموا یکن لکم ما للمسلمین و علیکم ما علیہم“  
اگر تم مباہلہ نہیں کرنا چاہتے تو اسلام قبول کر لو تا کہ تم مسلمانوں کے ساتھ ہر طرح کے نفع و نقصان میں برابر ہو جاؤ،  
لیکن انہوں نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا، تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا:  
”فانى انا جزکم“ تو پھر میں تم سے اعلان جنگ کرتا ہوں،

انہوں نے کہا: ” ما لنا بحرب العرب طاقة ولكن نصالحك علي ان لا تغزونا ولا تخيفنا  
ولا تردنا عن ديننا علي ان نؤدى اليك كل عام الفى حلة: الف فى صفر، الف فى رجب و  
ثلاثين درعاً عادية من حديد“

ہم عربوں کے ساتھ جنگ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے البتہ ہم آپ سے مصالحت و معاہدہ کرنا چاہتے ہیں کہ آپ  
ہم سے جنگ نہ کریں، ہمیں نہ ڈرائیں، اور ہمیں ہمارے دین سے روگردان نہ کریں، ہم اس کے مقابلے میں آپ کو ہر سال  
دو ہزار حلے (کپڑوں کے جوڑے) دیں گے، ایک ہزار صفر کے مہینے میں، ایک ہزار رجب کے مہینے میں دیں گے اور تیس  
لوہے کی بنی ہوئی زرہ بھی دیں گے۔

آنحضرتؐ نے اسی پران سے معاہدہ کر لیا اور فرمایا:

”والذى نفسى بيده ان الهلاك قد تدلى على اهل نجران ولو لا عنوا لمسخوا قرودة  
وخنازير، ولاضطرم عليهم الوادى ناراً، ولا ستاصل الله نجران واهله حتى الطير على رؤس  
الشجر، ولما حال الحول على النصارى كلهم حتى يهلكوا“

مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ ہلاکت نجران کے نصاریٰ پر چھا چکی تھی، اگر وہ  
مباہلہ کر لیتے تو بندر اور خنزیر کی شکلوں میں مسخ ہو جاتے اور زمین ان کے پاؤں کے نیچے آگ آگتی، بالآخر خداوند عالم نجران  
اور وہاں کے باسیوں کو تباہ و برباد کر دیتا یہاں تک کہ درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے بھی ہلاک ہو جاتے، اور ان کے علاوہ  
دیگر نصرانی سال بھر میں سب کے سب ہلاک ہو جاتے۔ (ملاحظہ ہو: تفسیر البرہان، جلد ۱ ص ۲۹۰ حدیث ۱۵)

اس سے ملتا جلتا واقعہ کتاب ”المغازی“ میں ابن اسحاق کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے اور ماہکی نے الفصول الہمہ  
فی معرفۃ الأئمۃ صفحہ ۲۳ میں اس روایت کو مفسرین کے حوالہ سے بیان کیا ہے اور اس سے قریب قریب ایک روایت حموی نے  
ابن جریر کے حوالہ سے ذکر کی ہے۔

اور روایت میں نصاریٰ کی طرف سے جزیہ کے اوقات میں سب سے پہلے ماہ صفر کا ذکر کیا گیا اور کہا گیا ” الف  
فى صفر“ یعنی ایک ہزار کپڑے صفر کے مہینے میں دیں گے، تو اس سے مراد ماہ محرم ہے کیونکہ عربوں کے نزدیک اسے ہی  
سال کا پہلا مہینہ قرار دیا جاتا ہے اور اسے زمانہ جاہلیت میں پہلا صفر کہا جاتا تھا اور صفر کے مہینے کو دوسرا صفر کہا جاتا تھا، اور ان  
کے ہاں رسم یہ تھی کہ اگر پہلے صفر یعنی ماہ محرم میں کوئی جنگ درپوش ہو جاتی تو اس میں چونکہ ان کے ہاں بھی جنگ کرنا حرام و  
ممنوع تھا جیسا کہ اسلام میں بھی ہے کہ محرم میں جنگ ممنوع ہے لہذا وہ اس حرمت و ممنوعیت کے حکم کو پہلے صفر کی بجائے  
دوسرے صفر میں منتقل کر دیتے تھے تاکہ پہلے صفر میں جنگ کر سکیں اور اس منتقل کرنے کو ”نسی“ کہتے تھے لیکن اسلام نے نسی کو

غلط قرار دیا اور پہلے صفر یعنی محرم ہی میں جنگ کی حرمت و ممنوعیت کے حکم کو برقرار رکھا اور اسی مناسبت سے اسے ”شہر اللہ المحرم“ یعنی خدا کا حرمت والا مہینہ (یعنی وہ کہ جس میں جنگ کرنا حرام قرار دیا گیا ہے) سے موسوم کیا گیا جو کہ بعد میں ”محرم“ کے لفظ سے مشہور ہو گیا۔

## اہل بیت کا تعارف

صحیح مسلم میں عامر بن سعد بن ابی وقاص کے حوالہ سے روایت ذکر کی گئی ہے کہ اس نے اپنے باپ یعنی سعد کے حوالہ سے بیان کیا کہ معاویہ بن ابی سفیان نے سعد کو حکم دیا کہ وہ ابو تراب علی بن ابی طالب کو گالیاں بکے، لیکن سعد نے اس حکم پر عمل کرنے سے انکار کیا تو معاویہ نے پوچھا کہ تم ایسا کرنے سے کیوں انکار کرتے ہو؟ (ما یمنعک ان تسب علیا؟) سعد نے جواب دیا: ”اما ما ذکرنا ثلاثاً قالہن رسول اللہ فلن اسبہ لان یکون لی واحدة منہن احب الی من حمر النعم“ مجھے حضرت پیغمبر اسلام کے تین ارشادات یاد ہیں لہذا میں علی کو ہرگز گالیاں نہیں بک سکتا، اگر ان تین باتوں میں سے کوئی ایک وہ میرے بارے میں ارشاد فرماتے تو وہ مجھے بڑی سے بڑی نعمت سے زیادہ عزیز و پسندیدہ ہوتی، اس کے بعد سعد نے وہ تین باتیں بیان کیں اور کہا:

”سمعت رسول اللہ (ص) یقول حین خلفہ فی بعض مغازیہ فقال لہ علی (ع): یا رسول اللہ (ص) اخلفتنی مع النساء والصبیان؟ فقال لہ رسول اللہ (ص): اما ترضی ان تکون منی بمنزلہ ہارون من موسیٰ الا انه لا نبی بعدی؟ وسمعتہ یقول یوم خیبر: لا عطین الراية غداً رجلاً یحب اللہ ورسولہ وحبہ اللہ ورسولہ، قال: فتطاولنا لها، فقال: ادعوا لی علیاً فاتی بہ ارمہ العین فبصق فی عینیہ، ودفع الراية الیہ ففتح اللہ علی یدہ، ولما نزلت ہذہ الآیۃ: قل تعالوا ندع ابنائنا وبنائکم ونسائنا ونسائکم وانفسنا وانفسکم ثم نبتهل، دعا رسول اللہ (ص) علیاً و فاطمۃ و حسنًا و حسیناً وقال: اللہم ہؤلاء اہل بیتی“

(میں نے حضرت پیغمبر اسلام سے سنا ہے کہ جب وہ ایک جنگ کو جاتے ہوئے علی بن ابی طالب کو مدینہ میں اپنا جانشین بنا کر جا رہے تھے تو علی نے آنحضرت کی خدمت میں عرض کی: اے اللہ کے رسول! کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ تو آنحضرت نے ارشاد فرمایا: کیا تو راضی نہیں کہ تیرا مقام میری نسبت سے وہ ہو جو ہارون کا موسیٰ کی نسبت سے تھا اس فرق کے ساتھ کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا، (یہ پہلی بات) اور میں نے آنحضرت سے سنا کہ خیبر کے دن

ارشاد فرمایا: کل میں پرچم اسلام اس شخص کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہے اور خدا اور اس کا رسول اسے دوست رکھتے ہیں، آنحضرتؐ کے فرمان کے بعد ہم سب پرچم اسلام پانے کے اعزاز کی بابت بحث اور انتظار کرتے رہے لیکن آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: علیؑ کو بلاؤ، چنانچہ علیؑ کو لایا گیا جبکہ ان کی آنکھوں میں تکلیف تھی، آنحضرتؐ نے ان کی آنکھوں میں اپنا لعاب دہن ڈالا تو وہ صحت یاب ہو گئے تو آنحضرتؐ نے انہیں پرچم اسلام عطا فرمایا اور خداوند عالم نے ان کے ہاتھوں اسلام کو فتح عطا کی، (یہ ہے دوسری بات) اور تیسری بات یہ کہ جب مہابہ کی آیت نازل ہوئی تو حضرت پیغمبر اسلامؐ نے علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کو بلایا اور کہا: اے اللہ! یہ ہیں میرے اہل بیت!

(صحیح مسلم مع شرح نووی، ج ۱۵، ص ۱۷۵)

اس روایت کو صحیح ترمذی (جلد ۵، صفحہ ۶۳۸، حدیث ۷۲۳۷) میں بھی ذکر کیا گیا ہے اور اسے ابو مؤید الموفق بن احمد نے کتاب ”فضائل علیؑ“ میں، ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء میں عامر بن ابی وقاص کے حوالہ سے اور حموی نے کتاب فرائد السمطين میں ذکر کیا ہے۔

حلیۃ الاولیاء میں ابو نعیم نے اپنے اسناد سے عامر بن ابی وقاص کے حوالہ سے ذکر کیا کہ اس نے اپنے والد کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ جب مہابہ کی آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کو بلایا اور کہا: ”اللہم هؤلاء اہل بیٹی“ اے اللہ! یہ ہیں میرے اہل بیت!

اسی کتاب میں مؤلف نے اپنے اسناد سے شعی کے حوالہ سے بیان کیا کہ جابر بن عبد اللہ انصاری نے کہا: عاقب اور طیب (انصاری کے دو بزرگ علماء) حضرت پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں آئے تو آنحضرتؐ نے انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی، انہوں نے کہا: ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے اے محمدؐ! آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: تم جھوٹ بولتے ہو، اگر تم چاہو تو میں تمہیں بتاؤں کہ کس چیز نے تمہیں اسلام لانے سے روکا ہوا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں، ہمیں بتائیے، آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: وہ تین چیزیں ہیں: (۱) صلیب کی محبت۔ (۲) شراب خوری۔ (۳) خنزیر کا گوشت کھانا، (جابر نے کہا) آنحضرتؐ نے علیؑ کا ہاتھ تھاما اور حسنؑ و حسینؑ و فاطمہؑ کو ساتھ لیا اور مقررہ جگہ پہنچ کر کسی کو ان دو یعنی عاقب و طیب کے پاس بھیجا تو انہوں نے انکار کر دیا اور مہابہ کرنے کی بجائے آنحضرتؐ کی حقانیت و صداقت کا اقرار کر لیا، اس وقت آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: ”والدی بعثنی بالحق لو فعلا لامطر علیہم الوادی ناراً“ مجھے اس ہستی کی قسم جس نے مجھے حق کے ساتھ مبعوث فرمایا کہ اگر وہ مہابہ کر لیتے تو پوری وادی ان پر آگ برساتی، (جابر نے کہا) ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ”نَدَّعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ“ (ہم اپنے بیٹے بلاتے ہیں تم اپنے بیٹے بلاؤ)..... جابر نے کہا:..... ”أَنْفُسَنَا“ سے مراد رسول اللہ اور علیؑ ہیں، ”أَبْنَاءَنَا“ سے مراد حسنؑ و حسینؑ ہیں اور ”بِنَاءَنَا“ سے مراد فاطمہؑ ہیں۔

اسی روایت کو ابن مغازلی نے اپنی کتاب ”المناقب“ (صفحہ ۳۶۳، حدیث ۳۱۰) میں اپنے اسناد سے بحوالہ شععی، جابر کی سند سے ذکر کیا ہے اور اسی روایت کو جموینی نے فرائد السمطين (جلد ۲ صفحہ ۲۳ حدیث ۳۶۵) میں اپنے اسناد سے جابر کے حوالہ سے ذکر کیا ہے اور مالکی نے کتاب فضول مہمہ (صفحہ ۲۵) میں اسناد کے ذکر کے بغیر جابر کے حوالہ سے ذکر کی ہے اور اسے ابو داؤد طیالسی کے حوالہ سے شعبہ شععی کی سند سے کسی دوسرے اسناد کے بغیر ذکر کیا ہے، تفسیر درمنثور (جلد ۲ صفحہ ۳۸) میں حاکم کے حوالہ سے (کہ اس نے اسے صحیح روایت قرار دیا ہے) اور ابن مردویہ کے حوالہ سے اور ابو نعیم کے اسناد سے بحوالہ جابر اس روایت کو ذکر کیا گیا ہے۔

### نصارئى کا چودہ رکنی وفد

تفسیر ”درمنثور“ میں ہے کہ ابو نعیم نے کتاب دلائل میں کلبی کے اسناد سے بحوالہ ابو صالح جناب ابن عباس سے روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا:

”ان وفد نجران من النصارى قدموا على رسول الله (ص) وهم اربعة عشر رجلاً من

اشرافهم منهم السيد وهو الكبير، والعاقب وهو الذي يكون بعده وصاحب رايهم“

نجران کے نصاریٰ کا جو وفد رسول اللہ کی خدمت میں آیا تھا وہ چودہ افراد پر مشتمل تھا جو نصاریٰ کے بزرگ تھے، ان میں سے ایک کا نام ”سید“ تھا جو ان سب سے بڑا تھا، اور ایک کا نام ”عاقب“ تھا جو مقام و رتبہ میں اس کے بعد تھا لیکن نصاریٰ کے ہاں اسے خاص مقام حاصل تھا کہ وہ اپنے تمام امور میں اس سے مشورہ کرتے اور اس کی رائے لیتے تھے، گویا وہ ان میں ایک مفکر کی حیثیت رکھتا تھا۔ (تفسیر درمنثور، جلد ۲، صفحہ ۳۹)

### نصارائے نجران کے نام مکتوب نبویؐ

تفسیر درمنثور میں ہے کہ بیہقی نے کتاب دلائل میں سلمہ بن عبدیشوع کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ اس نے اپنے والد اور دادا کے حوالہ سے بیان کیا کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے سورہ نمل کے نازل ہونے سے پہلے نجران کے نصاریٰ کے نام ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا:

”بسم الله ابراهيم و اسحاق و يعقوب، من محمد رسول الله الى اسقف نجران و

اهل نجران ان اسلتم فانی احمد الیکم اللہ الہ ابراہیم و اسحاق و یعقوب، اما بعد، فانی ادعوکم الی عبادۃ اللہ من عبادۃ العباد، و ادعوکم الی ولایۃ من اللہ من ولایۃ العباد، فان ابیتم فالجزیۃ، وان ابیتم فقد اذنتکم بالحرب والسلام“

اللہ کے نام سے، جو ابراہیم و اسحاق و یعقوب کا معبود ہے، یہ خط محمد رسول اللہ کی طرف سے نجران کے پادری دراہیل نجران کے نام ہے، اگر تم اسلام قبول کر لو تو میں تمہاری طرف خدا کی حمد کرتا ہوں کہ جو ابراہیم و اسحاق و یعقوب کا معبود ہے، اما بعد، میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ بندوں کی بندگی چھوڑ کر خدا کی بندگی اختیار کرو اور بندوں کی حاکمیت کے سایے میں رہنے کی بجائے اللہ کی حاکمیت کے سایے میں آ جاؤ، اگر تم میری دعوت کو قبول نہ کرو تو جزئیہ ادا کرو، اور اگر اس سے بھی انکار کرو تو میں تم سے اعلان جنگ کرتا ہوں، والسلام،

جب اسقف نے خط پڑھا تو سخت پریشان ہوا اور کاہنے لگا، پھر اس خط کو نجران کے ایک شخص جس کا نام شرحبیل بن وداع تھا کی طرف بھیجا، اس نے آنحضرتؐ کے خط کو پڑھا، اسقف نے اس سے پوچھا کہ اس سلسلہ میں تیری رائے کیا ہے؟ شرحبیل نے کہا:

”قد علمت ما وعد اللہ ابراہیم فی ذریۃ اسماعیل من النبوة فما یؤمن ان یکون هذا الرجل؟ لیس لی فی النبوة رای، لو کان رای من امر الدنیا ارت علیک فیہ و جہدت لک“

مجھے معلوم ہے کہ خدا نے ابراہیم سے وعدہ کیا ہے کہ اسماعیل کی نسل میں نبوت قرار دے گا، تو ممکن ہے یہی وہ شخص ہو جسے نبوت عطا ہوئی، البتہ میں نبوت کے بارے میں کوئی اظہار خیال نہیں کرتا، اگر تو کسی دنیاوی مسئلہ میں مجھ سے رائے پوچھتا تو میں ضرور اپنی رائے دیتا اور بھرپور طور پر اس میں تیری مدد کرتا،

اس کے بعد اسقف نے وہ خط اہل نجران کے تمام افراد کی طرف ایک ایک کو بھیجا، سب نے وہی جواب دیا جو شرحبیل نے دیا تھا، پھر انہوں نے طے کیا کہ شرحبیل بن وداع، عبد اللہ بن شرحبیل اور جبار بن فیض کو بھیجیں تاکہ وہ رسول اللہ کے بارے میں معلومات لے آئیں، چنانچہ وہ لوگ حضرت رسول خداؐ کے پاس آئے اور آنحضرتؐ سے گفت و شنید کی اور کچھ سوالات کئے، آنحضرتؐ نے ان کے تمام سوالوں کے جوابات دیئے، بالآخر انہوں نے آپؐ سے پوچھا:

”ما تقول فی عیسیٰ بن مریم“ آپؐ عیسیٰ بن مریم کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟

آنحضرتؐ نے جواب دیا:

”ما عنده فیہ شیء یومی هذا، فاقیموا حتی اخبرکم بما یقال فی عیسیٰ صبح الغد“

آج میں عیسیٰ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، تم مدینہ میں رہو اور میں کل صبح عیسیٰ کے بارے میں بتاؤں گا“،

اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی: ” اِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۗ خَلَقْنٰهُ مِنْ تُرَابٍ ..... (س) فَتَجْعَلُ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلٰى الْكٰذِبِيْنَ “ (عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی طرح ہے کہ خدا نے اسے مٹی سے پیدا کیا..... پھر ہم جھوٹوں پر اللہ کی لعنت قرار دیں)۔

یہ سن کر ان لوگوں نے کہا: ہم یہ بات نہیں مانتے، دوسرے دن آنحضرتؐ حسب معاہدہ مباہلہ کے لئے ان کی طرف روانہ ہوئے اور ایک چادر اپنے اور حسنؑ و حسینؑ پر تان لی جبکہ فاطمہؑ آپؐ کے پیچھے چل رہی تھیں، اس دن آنحضرتؐ کے خانہ اقدس میں متعدد خواتین موجود تھیں، شربیل نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

” انی ارى امراً مقبلاً ان كان هذا الرجل نبياً مرسلأ فلا عناه لا يبقی علی وجه الارض منا شعر ولا ظفر ولا هلك “

میں ایک بہت بڑی بات اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں، اگر یہ شخص خدا کا بھیجا ہوا برحق نبی ہے تو اس سے ملاعنہ و مباہلہ کرنے میں ہماری تباہی ہی تباہی ہوگی کہ روئے زمین پر ہمارا کچھ بھی باقی نہ رہے گا بلکہ ہمارے چھوٹے بڑے سب ہلاک ہو جائیں گے،

شربیل کے ساتھیوں نے کہا: اس صورت حال میں تیری رائے کیا ہے؟

اس نے کہا: میرے خیال میں یہ فیصلہ اسی پر چھوڑ دیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ہرگز غلط و نادرست فیصلہ نہیں کرے گا (رأی ان احکمہ فانی ارى رجلاً لا یحکم شططاً ابدآ)،

اس کے ساتھیوں نے کہا: ہم تجھے اختیار دیتے ہیں تو جو مناسب سمجھتا ہے انجام دے،

چنانچہ شربیل حضرت پیغمبر اسلامؐ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ” انی قدر ایت خیراً من ملاعتک “ میرے پاس ایک تجویز ہے جو آپ سے ملاعنہ و مباہلہ کرنے سے بہتر ہے،

آنحضرتؐ نے فرمایا: وہ کیا ہے؟

اس نے کہا: اب سے رات تک اور رات سے صبح تک آپ سوچیں اور پھر جو آپ کا فیصلہ ہوگا وہ ہمیں قابل قبول

ہوگا،

اس کے بعد رسول خداؐ ملاعنہ و مباہلہ کئے بغیر واپس چلے گئے اور ان سے جزیہ لینے پر مصالحت کر لی،

(تفسیر درمنثور، جلد ۲، ص ۳۸)

اسی کتاب (درمنثور) میں مذکور ہے کہ ابن جریر نے علماء بن احمد لشکری سے روایت کی ہے انہوں نے کہا:

” لما نزلت هذه الآية: ” قل تعالوا ندع ابنائنا و ابنائکم... الخ “ ارسل رسول الله (ص)



الی علی و فاطمة و ابنتیہما الحسن و الحسین، و دعا الیہود لیلاعنہم، فقال شاب من الیہود: و یحکم الیس عہدتم الایس اخوانکم الذین مسخوا قرۃ و خنازیر؟ لا تلاعنوا فانتمھوا“  
 جب یہ آیت نازل ہوئی: ”فَقُلْ تَعَالَوْا.....“ (آیت مباہلہ) تو حضرت رسول خدا نے علی و فاطمہ و حسن و حسین علیہم السلام کو بلوایا اور یہودیوں کو بلایا تاکہ ان سے ملاعنہ کریں، ایک یہودی نوجوان نے کہا: تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیا تم نے کل اپنے ان بھائیوں سے عہد و پیمانہ نہیں کیا ہے جو بعد میں بندر اور سوریہ کی شکلوں میں مسخ ہو گئے تھے کہ کبھی ملاعنہ نہ کرو گے؟ یہ سن کر یہودی ملاعنہ کرنے سے رک گئے، (تفسیر ”در منثور“، جلد ۲، صفحہ ۳۹)

یہ روایت اس مطلب کی تائید و تصدیق کرتی ہے کہ جملہ ”فَمَنْ حَاجَّكَ فِیْہِ“ میں ضمیر کی بازگشت لفظ ”الْحَقُّ“ کی طرف ہے جو پہلے ذکر ہوا ہے یعنی ”الْحَقُّ مِنْ شَرِّکَ“، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مباہلہ کا حکم صرف حضرت عیسیٰ بن مریم کے مسئلہ میں نصاریٰ ہی سے مخصوص نہ تھا بلکہ نجران کے نصرانیوں سے حضرت عیسیٰ بن مریم کے حوالہ سے مباہلہ کے واقعہ کے بعد یہودیوں سے بھی مباہلہ کا تذکرہ متعدد روایات میں موجود ہے کہ ان میں سے اکثر روایات کو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

### ابن طاووس کا بیان

ابن طاووس نے کتاب ”سعد السعد“ میں لکھا ہے کہ میں نے کتاب ”ما نزل من القرآن فی النبی و اہل بیتہ“ (تالیف: محمد بن عباس بن مروان) میں لکھا ہوا دیکھا ہے کہ انہوں نے مباہلہ کی روایت کو کیا وان (۵۱) اسناد سے ذکر کیا ہے اور ان میں صحابہ و دیگر افراد کے نام پیش کئے ہیں اور ان میں ان حضرات کو بھی شمار کیا ہے: حسن بن علی علیہما السلام، عثمان بن عفان، سعد بن ابی وقاص، بکر بن سالم، طلحہ، زبیر، عبدالرحمن بن عوف، عبداللہ بن عباس، ابورافع غلام رسول، جابر بن عبداللہ، براء بن عازب اور انس بن مالک۔

یہی بات کتاب ”المناقب“ میں متعدد روایوں اور مفسرین کے حوالہ سے ذکر کی گئی ہے اور سیوطی نے تفسیر در منثور میں بھی اسے ذکر کیا ہے۔

## ایک عجیب و غیر منطقی قول

مباہلہ کے حوالہ سے بعض مفسرین نے اپنی تحریروں میں ایک عجیب بات لکھی ہے اور وہ یہ کہ: تمام روایات اس موضوع پر متفق ہیں کہ حضرت رسول خداؐ نے مباہلہ کے لئے علیؑ و فاطمہؑ اور ان کے دو فرزندوں کو منتخب کیا اور لفظ ”نِسَاءً“ سے فاطمہؑ اور ”أَنْفُسًا“ سے صرف علیؑ کو مراد لیا ہے، اور ان روایات کے مصادر و مآخذ سب کے سب شیعہ ہیں اور اس طرح کے مطالب ذکر کرنے سے ان کا مقصد بھی معلوم و واضح ہے، اور شیعوں نے ان روایات کو ہر ممکن طریقہ و وسیلہ سے عام کرنے کی بھرپور کوشش کی یہاں تک کہ اکثر اہل سنت کے درمیان بھی اسے رائج و عام کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن اس طرح کی روایات جعل کرنے والے افراد مباہلہ کے واقعہ کو آیت پر اچھی طرح منطبق نہ کر سکے کیونکہ لفظ ”نِسَاءً“ جمع کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے ”عورتیں“ اور اسے ایک سے زیادہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور کوئی عرب اسے صرف ایک خاتون اور وہ بھی بیٹی کے لئے استعمال نہیں کرتا، بالخصوص جبکہ استعمال کرنے والے کی بیویاں بھی موجود ہوں لہذا ”ہماری عورتیں“ سے صرف بیٹی مراد لینا عربی زبان والوں کے ہاں ہرگز مفہوم نہیں رکھتا، اور اس سے زیادہ بعید از قیاس یہ کہ لفظ ”أَنْفُسًا“ سے صرف علیؑ کو مراد لیا گیا جو کہ کسی صورت میں درست نہیں کیونکہ یہ بھی جمع کا صیغہ ہے، اس کے علاوہ یہ کہ نجران کے وفد میں نہ ان کی عورتیں شامل تھیں اور نہ ہی ان کے بیٹے شامل تھے کہ جن کے مقابلے میں رسول اللہؐ اپنی خواتین اور بیٹے ساتھ لاتے، بنا بریں آیت مبارکہ سے صرف اتنا ہی سمجھا جاتا ہے کہ حضرت پیغمبر خداؐ کو حکم دیا گیا کہ وہ ان اہل کتاب کو جو حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں بحث و مباحثہ اور مناظرہ و مجادلہ کرتے ہیں دعوت دیں کہ اپنے مردوں، عورتوں اور بچوں کو اکٹھا کریں اور وہ (رسول اللہؐ) بھی مؤمنین کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو اکٹھا کر کے لاتے ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتے ہیں کہ وہ جو عیسیٰؑ کے بارے میں جھوٹا غلط عقیدہ رکھتا ہے اس پر لعنت بھیجے، اس طرح سے کھلی دعوت دینا اس حقیقت کی دلیل ہوتی ہے کہ دعوت دینے والا اپنے موقف و عقیدہ کی صحت پر پختہ یقین رکھتا ہے اور اسے اپنی بات اور دعا کی درستی پر کھل اعتماد ہے اور اس کے مقابلے میں اس کے مد مقابل فریق کا مباہلہ و ملاعنہ سے انکار و رد گردانی کرنا... خواہ وہ اہل کتاب میں سے نجران کے نصاریٰ ہوں یا ان کے علاوہ کوئی ہو..... اس امر کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنے مدعا پر کوئی ٹھوس ثبوت نہیں رکھتے بلکہ وہ اپنے موقف کی درستی و صحت کی بابت شک کا شکار ہیں اور انہیں اپنے برحق ہونے کا یقین نہیں، اور وہ اپنے دین کے بارے میں متزلزل نظر یہ رکھتے ہیں کہ جس کی پختہ دلیل ان کے پاس موجود نہیں ہے، اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ جو شخص خدا پر ایمان رکھتا ہو وہ اس بات پر راضی ہو جائے کہ اہل حق اور اہل باطل دونوں ایک جگہ اکٹھے ہو کر خدا کے حضور یہ دعا کریں

کہ جو حق پر نہیں وہ اس پر لعنت بھیجے اور اسے اپنی رحمت سے دور کرے؟ کہ اس سے بڑھ کر خدا کے حضور جرأت و جسارت اور اس کی قدرت کا مذاق اڑانے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

یہ بات واضح ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ اور مومنین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو عقیدہ رکھتے تھے اس میں ان کا یقین و پختہ نظر یہ کسی بحث و وضاحت کا محتاج نہیں کیونکہ ان کے یقین کی بابت خدا کا یہ ارشاد مضبوط دلیل کے حوالہ سے کافی ہے جس میں ارشاد ہوا: ”مَنْ بَعْدَ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ“ (تیرے پاس علم آ جانے کے بعد)، تو اس طرح کے اعتقادی مسائل میں ”علم“ سے مراد یقین ہی ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

اور جملہ ”نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ.....“ میں دو احتمال اور امکانی پہلو پائے جاتے ہیں :

(۱) فریقین میں سے ہر ایک دوسرے کے لئے بددعا کرے یعنی تم ہماری عورتیں اور بچوں کے لئے بددعا کرو اور ہم تمہاری عورتوں اور بیٹوں کے لئے بددعا کرتے ہیں۔

(۲) ہر گروہ اپنی عورتوں اور بیٹوں کے لئے بددعا کرے یعنی ہم مسلمان اپنی عورتوں اور بیٹوں کے لئے اور تم عیسائی اپنی عورتوں اور بیٹوں کے لئے بددعا کرو۔

ان دو احتمالی صورتوں میں سے کسی ایک پر بھی کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا بلکہ اشکال و اعتراض صرف اس بات پر ہوتا ہے کہ شیعہ اور ان کے ہم فکر افراد کا عقیدہ یہ ہے کہ آیت مبارکہ میں ”أَنْفُسَنَا“، ”نِسَاءَنَا“ اور ”أَبْنَاءَنَا“ سے مخصوص افراد یعنی علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ مراد ہیں، جو کہ درست نہیں۔ (ملاحظہ ہو: تفسیر المنار، ج ۳، ص ۳۲۲)

## مضبوط اور منطقی جواب

قارئین کرام خود ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ یہ قول کسی پڑھے لکھے شخص کا ہو سکتا ہے؟ اگر ہم اس کے بارے میں کوئی سخت جملہ کہیں تو اسے گستاخی نہ سمجھا جائے کیونکہ اس طرح کی باتیں کسی دانشور اور علمی شخصیت سے متوقع نہیں، ہم نے اسے یہاں اس لئے ذکر کیا ہے کہ قارئین ملاحظہ کریں کہ اس میں کس قدر کمزوری اور ناچنگلی بلکہ بے اساسی پائی جاتی ہے، اور انہیں معلوم ہو کہ نزاعی سوچ اور تعصب کسی شخص کو ناچنگی اور پست فکری کی کس حد تک لے جاتا ہے کہ وہ اپنے ہی ہاتھوں اپنی ہی تعمیر کردہ عمارت کو منہدم اور منہدم کردہ عمارت کو تعمیر کرنے لگتا ہے اور اپنے کئے کی درستی و نادرستی کو خاطر میں ہی نہیں لاتا، اور اسے اس بات کی پروا تک نہیں ہوتی کہ برائی سے آگاہ ہونا ضروری ہے تاکہ اس سے دوری اختیار کی جائے، اس کے بیان کے تناظر میں دو حوالوں سے بحث ممکن ہے:

(۱) آیت مبارکہ سے حضرت علی علیہ السلام کی افضلیت کا ثابت ہونا، یہ بحث خالصتاً علم کلام سے تعلق رکھتی ہے جو کہ ہماری اس کتاب جو کہ آیات قرآنیہ کے معانی میں غور کرنے سے تعلق رکھتی ہے کے دائرہ بحث سے خارج ہے، کیونکہ ہم صرف تفسیری حوالوں سے بحث کرتے ہیں۔

(۲) اس قول و بیان کا تعلق چونکہ آیت مبارکہ کے مدلول و مصداق کے تعین سے ہے اور ان روایات کی صحت و سقم سے ہے جن میں حضرت پیغمبر اسلام اور نجران کے وفد کے درمیان ہونے والی گفتگو اور واقعہ کو ذکر کیا گیا ہے لہذا یہ تفسیری بحث ہے جو کہ ہماری اس کتاب کی غرض کے دائرے میں آتی ہے۔

قارئین کرام! آپ اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ آیت مبارکہ کس مطلب پر دلالت کرتی ہے اور اس سے کن حقائق و امور کا ثبوت ملتا ہے؟ اور یہ کہ ہم نے جو متعدد و کثیر روایات و احادیث پیش کی ہیں وہ سب اسی مطلب سے مطابقت رکھتی ہیں جو آیت مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے، ان امور پر توجہ کرنے اور اچھی طرح غور کرنے سے مذکورہ بالا قول کی عدم صحت اور بے بنیاد ہونا کھل کر سامنے آ جاتا ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس قول کا سرپیر کوئی نہیں، ذیل میں تفصیلی بحث ملاحظہ ہو:

اس بحث میں سات نکات زیر نظر ہیں:

پہلا نکتہ:

اس قول میں کہا گیا ہے کہ ”جن روایات میں یہ بیان ہوا ہے کہ آیت مبارکہ میں آنحضرت کے ہمراہ مخصوص افراد یعنی علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ تھے وہ سب شیعہ راویوں اور انہی کی کتب میں پائی جاتی ہیں“، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ”شیعوں نے ان روایات کو عام کرنے میں بھرپور کوششیں کیں یہاں تک کہ اہل سنت کی کثیر تعداد ان کے ہم فکر ہو گئی“، جبکہ اس سے پہلے اس قول میں کہا گیا تھا کہ اس حوالہ سے تمام روایات یکساں ہیں اور سب اس پر متفق ہیں کہ جو افراد آنحضرت کے ہمراہ تھے وہ صرف علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ تھے، اب مجھے معلوم نہیں کہ اس نے وہ کونسی روایات مراد لی ہیں جو ان ہستیوں کے بارے میں یکساں ہیں اور ان سب میں ان حضرات کے حوالہ سے اتفاق رائے موجود ہے؟ آیا ان سے مراد وہی روایات ہیں جن کے بارے میں تمام محدثین نے اجماعی و متفقہ رائے دی ہے کہ وہ صحیح ہیں اور ان سے چشم پوشی نہیں ہو سکتی بلکہ ان کے معنی بر صحت ہونے کی وجہ سے انہیں ہر لحاظ سے قابل اعتماد قرار دیا جائے گا، اور وہ روایات تعداد کے حوالہ سے ایک، دو یا تین نہیں کہ جن کے تذکرے اور قابل قبول ہونے پر تمام محدثین کا اتفاق ہے اور ان روایات کو احادیث کی تمام جامع کتب میں مولفینا نے ذکر کیا ہے کہ جن میں صحیح مسلم اور صحیح ترمذی شامل ہیں اور مورخین نے بھی ان کی تائید و تصدیق کی ہے۔

اس کے علاوہ تمام مفسرین کرام نے بھی ان روایات کو اپنی کتب میں ذکر کیا ہے اور ان کی بابت کسی طرح کے شک و شبہ کا اظہار نہیں کیا، اور ان مفسرین میں ایسے حضرات بھی دکھائی دیتے ہیں جو خود محدثین میں بھی شمار ہوتے ہیں مثلاً طبری، ابوالفداء بن کثیر اور سیوطی اور ان جیسے دیگر حضرات! تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اس طرح کے بزرگ مفسرین و محدثین نے ان روایات کو ذکر کیا اور ان کے قابل اعتماد صحیح اور ہر طرح کے شک و شبہ سے مبرا ہونے کا متفقہ اظہار کیا تو پھر وہ ان روایات سے کون سی روایات مراد لیتے ہیں جو صرف شیعوں نے بیان کی ہیں؟ کیا ان کا اشارہ ان روایات کی طرف ہے جن کا سلسلہ سند سعد بن ابی وقاص، جابر بن عبد اللہ اور عبد اللہ بن عباس اور ان جیسے اکابر صحابہ کرام تک پہنچتا ہے؟ یا وہ روایات جو تابعین نے ان حضرات سے نقل کی ہیں کہ جن میں ابوصالح، بکلی، سدی اور شعبی جیسے حضرات شامل ہیں، ان حضرات کو صرف انہی روایات کے ذکر کرنے کی بناء پر شیعہ قرار دیا گیا چونکہ وہ روایات اس قول کے قائل کی پسندیدہ نہیں جبکہ یہ حضرات اور ان جیسے دیگر محدثین ہی ہیں جن کے توسط سے احادیث نبویؐ ہم تک پہنچی ہیں، اگر ان سب کو ترک اور نظر انداز کر دیا جائے تو نہ کوئی حدیث و روایت باقی رہے گی اور نہ ہی سیرت نبویؐ سے آگاہی حاصل ہوگی اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی مسلمان یا عالم دین بلکہ کوئی غیر مسلم محقق و دانشور سنت و سیرت نبویؐ کا کلی طور پر انکار کرے اور تمام احادیث و روایات کی نفی کرے اور پھر اسلام اور حضرت پیغمبر اسلامؐ کی تعلیمات و دستورات سے آگاہ ہونے کا خواہاں و درپے ہو؟ جبکہ قرآن مجید قول و سیرت نبویؐ کی حجیت کا منہ بولتا ثبوت ہے اور دین الہی کی بقا و دوام کا واضح و صریح اعلان کر رہا ہے، اگر سنت نبویؐ کا سرے ہی سے انکار کر دیا جائے اور اس کی بابت کسی ثبوت و سند کو اعتبار و اعتماد کی نظر سے نہ دیکھا جائے تو قرآن کا نام و نشان باقی رہے گا اور نہ اس کے نازل ہونے کا عملی نتیجہ و ثمر سامنے آئے گا۔

اور اگر وہ یہ کہیں کہ شیعوں نے ان احادیث کو جوامع الحدیث اور کتب تاریخ میں گھسیڑ دیا ہے تو اس سے بھی سنت نبویؐ کے سرے ہی سے ساقط ہو جانے اور شریعت کا نام و نشان مٹ جانے کی خطرناک صورت پیدا ہو جائے گی بلکہ اس کا نتیجہ عمومی تباہی اور دینی حوالہ سے وسیع تر خرابیوں کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

### دوسرا نکتہ :

اس قول میں کہا گیا ہے کہ ”شیعہ حضرات آیت میں لفظ ”نِسَاءً نَا“ کا مصداق فاطمہؑ کو اور لفظ ”أَنْفُسَنَا“ کا مصداق علیؑ کو قرار دیتے ہیں، یعنی شیعہ قائل ہیں کہ لفظ ”نِسَاءً نَا“ آیت میں صرف فاطمہؑ کیلئے اور لفظ ”أَنْفُسَنَا“ صرف علیؑ کے لئے استعمال ہوا ہے۔

شاید اس قول کے قائل نے یہ بات ان بعض روایات کے حوالہ سے ذکر کی ہے جو پہلے ذکر ہو چکی ہیں مثلاً ایک

روایت میں جابر بن عبد اللہ انصاری کا بیان مذکور ہے کہ انہوں نے کہا: ”نِسَاءً نَا“ یعنی فاطمہ اور ”أَنْفُسًا“ یعنی علی ہیں، دراصل یہ اس قائل کی نا فہمی کا ثبوت ہے کہ اس نے اس روایت کی بناء پر شیعوں پر الزام دھر دیا ہے کیونکہ روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آیت میں لفظ ”نِسَاءً نَا“ سے مراد فاطمہ اور لفظ ”أَنْفُسًا“ سے مراد علی ہیں بلکہ اس سے یہ مقصود ہے کہ چونکہ حضرت پیغمبر اسلام حکم الہی کی اطاعت و امتثال میں صرف حضرت فاطمہ اور حضرت علیؑ کو ساتھ لے گئے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لفظ ”نِسَاءً نَا“ کا واحد مصداق حضرت فاطمہ اور لفظ (أَنْفُسًا) کا واحد مصداق حضرت علیؑ اور لفظ ”أَبْنَاءً نَا“ کا مصداق حسن و حسینؑ ہیں، گویا آیت میں ”ابناء، نساء اور انفس“ سے مراد اہل بیت رسولؐ ہیں جیسا کہ بعض روایت میں ذکر ہوا ہے کہ آنحضرتؐ نے ان ہستیوں کو اپنے ہمراہ لانے کے بعد بارگاہ الہی میں عرض کی: ”اللہم هؤلاء اہل بیٹی“ اے میرے معبود! یہ ہیں میرے اہل بیت! اس جملہ کا معنی یہ ہے کہ میں نے ان کے سوا کسی کو نہ پایا جسے اپنے ساتھ مباہلہ کے لئے لے آتا۔

جابر کی روایت سے مراد ہی معنی کی بابت جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس کا ثبوت بعض روایات میں وارد ہونے والے ان الفاظ سے ملتا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ ”انفسنا“ سے مراد رسول اللہ اور علیؑ ہیں، اس عبارت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا مصداق بیان کیا گیا ہے الفاظ کے معانی بیان نہیں کئے گئے۔

### تیسرا نکتہ:

اس قول میں کہا گیا ہے کہ ”مباہلہ کی بابت روایات جعل کرنے والوں نے آیت پر ان کی تطبیق صحیح طور پر نہیں کی کیونکہ لفظ ”نساننا“ کہنے والا کوئی عرب اس سے اپنی بیٹی مراد نہیں لیتا بالخصوص جبکہ اس کے ہاں بیویاں بھی موجود ہوں، اور نہ ہی کوئی عربی زبان سے آگاہ شخص اس لفظ سے ”بیٹی“ سمجھتا ہے بلکہ اس سے زیادہ بعید از قیاس بات یہ کہ لفظ ”أَنْفُسًا“ سے علیؑ مراد لئے جائیں۔“

اس مفسر نے اپنی کج فہمی کی بناء پر جو عجیب و غریب معنی ذکر کیا ہے وہ اس کا سبب بنا کہ وہ مباہلہ کے واقعہ کے تذکرہ پر مبنی روایات کو ان کی کثرت کے باوجود رد کر دے اور پھر ان کے راویوں کی اعتباری حیثیت کو طعن و تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے ہر اس شخص کو غیر معتبر قرار دے جو ان روایات کو صحیح و مورد قبول قرار دے بلکہ ان روایات کے بیان کرنے والے ہر شخص کو غلط الزامات کے تیروں کا ہدف بنائے، جبکہ اس پر لازم و ضروری تھا کہ تفسیر قرآن لکھتے وقت اپنے موقف کو درست بنیادوں پر استوار کرتا اور اپنی کتاب میں آئمہ علم بلاغت اور اساتذہ علم البیان کے حوالہ جات پیش کرتا اور مفسرین کرام و محدثین عظام کی ذکر کردہ ان روایات کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھتا جو انہوں نے اپنی تفسیروں اور تالیفات میں کسی غیر یقینی صورت

یا اعتراض کے بغیر درج کی ہیں، چنانچہ اساتذہء فن میں سے ایک دستخوری ہیں جنہوں نے آئمہء قرأت کی قرأتوں میں پائی جانے والی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے وہ اپنی تفسیر ”کشاف“ میں مباہلہ کی آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

”وفیه دلیل لاشیئ اقویٰ منه علی فضل اصحاب الکساء علیہم السلام وفیہ برهان واضح علی صحۃ نبوة النبی لانه لم یرو احد من موافق ولا مخالف انہم اجابوا الی ذلک“

(یہ وہ دلیل ہے کہ اصحاب کساء علیہم السلام کی فضیلت پر اس سے زیادہ مضبوط دلیل کوئی نہیں اور یہ حضرت پیغمبر اسلام کی نبوت کی صحت پر واضح برہان و کھلا ثبوت ہے کیونکہ کسی بھی موافق و مخالف نے یہ نہیں لکھا کہ نجران کے نصاریٰ نے اصحاب کساء کے مقابلے میں مباہلہ کرنا قبول کیا۔

تو ان بزرگ علماء و علم بلاغت کے بلند پایہ ماہرین اور ادب کے سپوتوں پر یہ بات کس طرح پوشیدہ رہی کہ حدیث کی مشہور جامع کتب میں کثیر اور بار بار ذکر کی جانے والی روایات قرآن کی طرف غلط و غیر صحیح معنی کی نسبت دے رہی ہیں کہ اس میں لفظ ”نساء“ جو کہ جمع کا صیغہ ہے صرف ایک فرد کے لئے استعمال ہوا ہے؟

نہیں، ہرگز ایسا نہیں، مجھے اپنی جان کی قسم! ایسا نہیں ہو سکتا کہ تمام مفسرین و محدثین و اساتذہء فن پر اصل حقیقت پوشیدہ ہوئی ہو، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خود اسی مفسر اور اس قول کے قائل کو غلط فہمی ہوئی ہے اور وہ مصداق و مفہوم کے درمیان تمیز و فرق نہیں کر سکتا بلکہ ان دونوں کے درمیان خلط ملط میں مبتلا ہو گیا اور یہ گمان کر بیٹھا کہ خداوند عالم نے اپنے نبیؐ کو جو حکم دیا کہ ”فَمَنْ حَا جَبْتَ فَبِئْسَ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَ أَبْنَاءَكُمْ.....“ (پس جو شخص اس سلسلہ میں تجھ سے محاجہ و بحث کرے جبکہ تیرے پاس علم آچکا ہے تو کہہ دو کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں اور تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ.....) اور یہ بات صحیح ہے کہ آیت کے نزول کے وقت محاجہ و بحث کرنے کے لئے جو لوگ آئے وہ نجران کے نصاریٰ کا وفد تھا اور وہ چودہ آدمی تھے کہ جن میں عورتیں اور بیٹے شامل نہ تھے، اور یہ بھی درست ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ جب ان کے مقابلے میں مباہلہ کے لئے نکلے تو آپؐ کے ساتھ علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ ہی تھے ان کے علاوہ کوئی نہ تھا، لہذا اس سے یہ سمجھا جائے کہ ”فَمَنْ حَا جَبْتَ“ کا معنی نجران کا وفد، ”نِسَاءَنَا“ کا معنی ایک خاتون، ”أَنْفُسَنَا“ کا معنی ایک شخص ہے اور لفظ ”نِسَاءَكُمْ“ اور ”أَبْنَاءَكُمْ“ بے معنی ہیں کیونکہ وفد کے ساتھ عورتیں اور بیٹے نہ تھے!

اس مفسر پر یہ بھی لازم و ضروری تھا کہ اپنے اس نادرست موقف و نقطہ نظر میں اضافہ کرتے ہوئے یہ بھی کہتا کہ آیت میں لفظ ”أَبْنَاءَنَا“ جو کہ جمع کا صیغہ ہے اسے تثنیہ یعنی دو افراد (حسن و حسین) کے لئے کیوں استعمال کیا گیا ہے کیونکہ وہ استعمال جمع کے لفظ کو مفرد کے لئے استعمال کرنے سے زیادہ بیجا و نادرست ہے کیونکہ جمع کے صیغہ کے مفرد میں استعمال ہونے کی مثالیں گاہے غیر عرب جدت پسند اہل فن کے کلام میں مل جاتی ہیں جبکہ اصل عرب کے محاورات میں اس طرح

کا استعمال نہیں پایا جاتا سوائے اس کے کہ واحد متکلم بڑائی و تعظیم کی غرض سے کہے کہ ہم نے ایسا کیا اور ہم نے ایسا کہا، لیکن جمع کے صیغہ کا مشینہ میں استعمال ہونا ہرگز درست نہیں اور نہ ہی اس کی استعالی مثالیں و شواہد کسی کلام میں پائے جاتے ہیں۔

بہر حال یہ ہیں وہ اسباب جن کی بناء پر اس مفسر نے مباہلہ کی روایات کو ٹھکرایا ہے اور ان کے جعلی ہونے کا اظہار کیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا خیال بیجا و نادرست اور ایک موہوم سوچ سے زیادہ کچھ نہیں بلکہ حقیقت الامر وہی ہے جسے ہم نے بیان کیا ہے۔

### مزید وضاحت:

اس مطلب کی مزید وضاحت یہ ہے کہ بلخ کلام اسے کہتے ہیں جس میں مقتضائے مقام کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہو کہ جس سے متکلم کا مطلوبہ معنی و مقصود آشکار ہو جائے، یعنی اس کے الفاظ و عبارتیں ایسی ہوں جو کلام کر نیوالے کے مقصد کو اسی طرح ظاہر کریں جس طرح وہ چاہتا ہو اور مخاطب اس کے مفہوم و مراد کو سمجھ جائے، چنانچہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بیان و گفتگو دو افراد یا دو قبیلوں و گروہوں کے درمیان ہوتی ہے کہ جو ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے یا یہ کہ مصلحتاً ایک دوسرے کے بارے میں تجاہل عارفانہ کرتے ہیں (یعنی پہچاننے کے باوجود ظاہری طور پر نا آشنائی کا اظہار کرتے ہیں) تو اس صورت میں کلام کو حالات و ماحول کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اس طرح قرار دیا جاتا ہے جس سے بات پوری ہو جائے، لہذا جب دو متخاصم گروہ (کہ جن کے درمیان خصومت و جھگڑا ہو) ایک دوسرے کو اپنے عملی اقدامات سے آگاہ کرنا چاہیں تو ان میں سے ایک، دوسرے سے اس طرح کہتا ہے: ”ہم تم سے خصومت رکھتے ہیں اور ہماری جنگ تم سے ہے“ اور وہ اپنا بیان طبع حال اور عادت و معمول کے تقاضوں کے عین مطابق قرار دے کر پیش کرتا ہے، عام طور پر چونکہ ہر گروہ و قبیلہ کے ہاں عورتیں اور بچے بھی ہوتے ہیں تو مقتضائے حال یہ ہوتا ہے کہ متکلم اپنے بیان میں مد مقابل پر واضح کرے کہ وہ سب ایک ہیں اور دشمن کے مقابلے میں ہاتھ کی انگلیوں کی طرح ساتھ ساتھ ہیں یعنی ہم سب یکجا، یک زبان و یک دل ہیں کہ ہماری حیثیت ایک ہاتھ جیسی ہے، لیکن اگر اس طرح کہے: ہماری تم سے خصومت ہے اور ہم اپنے تمام مردوں، عورتوں اور بچوں کے ساتھ تم سے جنگ کرتے ہیں، تو اس صورت میں اسے اپنے مقصود کی وضاحت کے لئے اور اپنے افراد کی پہچان کروانے کے لئے مزید توضیحی الفاظ و انداز اختیار کرنا پڑے گا تا کہ معمول سے زائد مطلوبہ معانی و مطالب کا پورا پورا اظہار ہو سکے۔

یہ تو ہے دو ایسے متخاصم گروہوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کا مسئلہ جو ایک دوسرے سے نا آشنا و نا آگاہ ہوں (حقیقتاً یا ظاہراً)، لیکن جب دو گروہ ایسے ہوں جو ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں اور ان کے درمیان دوستی و صمیمانہ تعلقات ہوں اور ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ کو ضیافت و مہمانی یا خاص مراسم کی دعوت دے تو مقتضائے طبع و عادت کے مطابق اس طرح کہتا ہے: ہم سب مرد، عورتیں اور بچے آپ لوگوں کو دعوت دیتے ہیں، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دعوتی الفاظ میں اپنی



شناسائی کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے، چنانچہ اس طرح کہا جاتا ہے: ہم اپنے مردوں اور بیٹی اور دو کم سن نواسیوں کے ساتھ آپ کی خدمت گزاری کے لئے حاضر ہیں، اس صورت میں ایک اضافی بات کا اظہار ہو جاتا ہے۔

بنا بر ایں یہ مسئلہ واضح ہوا کہ طبع و عادت اور ظاہر الحال کی ایک مخصوص حیثیت ہے جبکہ واقع الامر اور اصل حقیقت کی حیثیت اپنی ہے! اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف اور قطعی طور پر الگ الگ ہوتی ہیں لہذا اگر متکلم اپنے بیان میں ظاہر الحال کو بنیاد قرار دے اور طبع و عادت اور معمول کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بات کرے لیکن اس کے بعد واقع الامر اور اصل حقیقت کو بنیاد بنا کر بات کرے تو اسے غلط قرار نہیں دیا جائے گا اور نہ ہی اسے جھوٹا اور فضول گو کہا جائے گا۔

ہماری زیر بحث آیت مبارکہ بھی کچھ اسی طرح کی صورت حال کی حامل ہے چنانچہ خدا کا ارشاد گرامی: ” فَكُنْ لَّعَالَمِآءٍ نَدْعُ آبْنَآءَنَا وَآبْنَآءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ.....“ اس مطلب و مقصود پر مبنی ہے کہ: ”اے پیغمبر! انہیں دعوت دیں کہ آپ خود اور اپنے اہل میں سے ان خاص افراد کے ساتھ جائیں جو اس دعوت و علم میں آپ کے ساتھ شراکت رکھتے ہیں اور وہ لوگ اپنے اہل میں سے اپنے خاص افراد کو لے آئیں، اور پھر دونوں مبالغہ کریں،“ تو یہ بیان ظاہر الحال اور عام حالات کے عین مطابق ہے کہ جس میں دونوں طرفوں سے مرد، عورتیں اور بچے شامل ہوتے ہیں یعنی اس سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول خدا کے اہل میں مرد، عورتیں اور بچے (بیٹے) ہیں اور مد مقابل لوگوں کے اہل میں بھی مرد، عورتیں اور بچے (بیٹے) ہیں کہ دونوں ان سب کو لائیں گے، جبکہ واقع الامر اور اصل حقیقت اس سے مختلف ہے اور وہ یہ کہ آنحضرت کے ساتھ مردوں میں صرف ایک فرد (حضرت علیؑ) اور عورتوں میں صرف ایک فرد (بیٹی، حضرت فاطمہؑ) اور بیٹوں میں دونوں (امام حسنؑ و امام حسینؑ) پیش ہوئے اور مد مقابل یعنی نصاریٰ میں سے صرف ان کے مرد آئے اور کوئی خاتون اور بچہ ان کے ہمراہ نہ تھا، تو جب آنحضرت اپنے ہمراہ ایک مرد، ایک عورت اور دو فرزند لائے تو نصاریٰ نے آپ پر اعتراض نہیں کیا اور نہ ہی آپ کی تکذیب کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے تو سب مردوں، عورتوں اور بیٹوں کو لانے کا کہا تھا جبکہ یہ تو مخصوص افراد ہیں اور نہ ہی یہ کہا کہ ہم اس لئے مبالغہ نہیں کرتے کہ ہمارے ساتھ عورتیں اور بچے نہیں ہیں جبکہ آپ نے عورتوں اور بچوں (بیٹوں) کو لانے کا کہا تھا، اس طرح کسی بھی محقق اور دانشور یا عام شخص نے مبالغہ کا تذکرہ روایات سن کر آیت سے عدم مطابقت اور روایات کے جعلی و من گھڑت ہونے کا اظہار نہیں کیا۔

اس توضیحی بیان سے اس مفسر کے اظہار کا غلط و نادرست ہونا واضح ہو جاتا ہے اور اس کے اس بیان کی قلعی کھل جاتی ہے جس میں اس نے روایات پر تنقید کرتے ہوئے ان کی آیت سے عدم مطابقت کا اظہار کیا اور کہا کہ شیعوں نے من گھڑت روایات میں اس بات کا خیال نہیں رکھا کہ اس سے آیت کے الفاظ سے عدم مطابقت لازم آتی ہے، کیونکہ آیت میں دونوں

جانب سے عورتوں اور بچوں (بیٹوں) کے لانے کی دعوت مذکور ہے جبکہ نجران کے وفد میں نہ عورتیں تھیں اور نہ بچے، حالانکہ شیعہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ آیت نجران کے نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اگر شیعوں کا ادعا صحیح ہو تو نجران کے وفد میں عورتوں اور بچوں کا شامل ہونا ضروری ہوگا جبکہ ایسا نہیں ہے۔

### چوتھا نکتہ :

اس مفسر نے کہا ہے کہ: ”آیت سے صرف یہی سمجھا جاتا ہے کہ خداوند عالم نے حضرت پیغمبر اسلامؐ کو حکم دیا کہ اہل کتاب میں سے جو لوگ عیسیٰؑ کے بارے میں آپ سے بحث و مجاہدہ اور مجاہدہ و جھگڑا کریں انہیں دعوت دو کہ وہ اپنے مردوں، عورتوں اور بچوں کے ساتھ ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں اور وہ (رسول خداؐ) بھی مؤمنین مردوں، عورتوں اور بچوں کو لے کر اکٹھے ہو جاتے ہیں اور بارگاہ خداوندی میں گڑگڑا کر دعا مانگتے ہیں کہ جو شخص عیسیٰؑ کے بارے میں غلط و جھوٹا عقیدہ رکھتا ہو خدا اس پر لعنت بھیجے، (اس مفسر نے اپنے بیان کے تسلسل میں کہا: تو جو شخص خدا پر ایمان رکھتا ہو وہ کیونکر اس بات پر راضی ہو سکتا ہے کہ اس طرح سے اہل حق و اہل باطل کے افراد ایک مقام پر اکٹھے ہو کر بارگاہ الہی میں لعنت اور رحمت سے دوری کی دعا کریں؟ اس طرح سے خدا کے حضور جرأت و جسارت اور اس کی عظیم قدرت و بزرگی کا مذاق اڑانے کا کون سوچ سکتا ہے؟“۔

اس مفسر کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ آیت مبارکہ میں فریقین میں سے مخصوص افراد ملحوظ نہیں بلکہ اس میں دونوں طرف سے دعوت عام دی گئی ہے کہ ہر گروہ اپنے مردوں، عورتوں اور بچوں کو ہمراہ لے آئے اور ایک جگہ اکٹھا ہو کر ایک دوسرے کے خلاف بددعا کریں۔

اب اس مفسر سے پوچھنا ہوگا کہ اس اجتماع اور اکٹھا ہونے سے مراد کیا ہے ؟

آیا اس سے مراد یہ ہے کہ فریقین کے تمام افراد اکٹھے ہوں؟ یعنی تمام مؤمنین اور تمام نصاریٰ، اور تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اہل ایمان میں عرب کے قبائل ربیعہ و مضر کے افراد کو سمجھا جاتا تھا کہ جو یمن و حجاز اور عراق و دیگر علاقوں میں آباد تھے اور نصاریٰ کے افراد کہ جو قبیلہ نجران (اہل یمن) اور شام، بحر الابیض، روم، فرانس، انگلینڈ اور نمسا اور دیگر علاقوں میں بسنے والے تھے سب مراد ہیں۔

(بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ مباہلہ کی آیت ۹ ہجری میں نازل ہوئی اور بعض کا کہنا ہے کہ دس ہجری میں مباہلہ کا حکم آیا، البتہ یہ دونوں اقوال قابل بحث ہیں بلکہ اشکال سے خالی نہیں، اس سلسلہ میں مزید تفصیلات زیر نظر آیات کے بعد والی آیات کی تفسیر میں ”روایات پر ایک نظر“ کے عنوان میں ذکر ہوں گی)

اس وقت ان تمام افراد کو شمار کرنا آسان نہ تھا کیونکہ مشرق و مغرب میں پھیلے ہوئے افراد بشر کہ جن میں مرد، عورتیں

اور بچے شامل تھے کروڑوں سے زائد تھے اور کوئی عقلمند اس سلسلہ میں شک نہیں کر سکتا کہ اتنی بڑی تعداد کا ایک جگہ اکٹھا ہونا ناممکن ہے اور عادی اسباب و وسائل اپنی تمام تر قوتوں اور دستوں کے ساتھ اسے عملی جامہ نہیں پہنا سکتے، تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ قرآن مجید نے لوگوں کو ایک محال و ناممکن کام کی دعوت دی ہے اور اس کی ناقابل انکار حقیقتوں کا ظاہر و آشکار ہونا اور حق کا واضح ہونا ایک ناممکن چیز پر موقوف و مبنی ہے، تو اس طرح نصاریٰ کی طرف سے پیغمبر اسلامؐ کی دعوت مباہلہ کو قبول نہ کرنے کا عذر بلکہ بہترین عذر بن سکتا تھا بلکہ اس سے آنحضرتؐ کی دعوت کو زبردست ٹھیس پہنچ سکتی تھی اور اس کا نقصان نصاریٰ سے زیادہ پیغمبر اسلامؐ کے مشن کو ہوتا۔

یافر یقین کے اجتماع اور اکٹھا ہونے سے مراد دونوں طرف کے ان افراد کا اکٹھا ہونا ہے جو وہاں موجود و حاضر تھے یعنی مدینہ اور قرب و جوار کے تمام اہل ایمان اور نجران اور قرب و جوار کے تمام نصاریٰ! اگرچہ اس بات میں پہلی بات کی نسبت نامتقویت کم پائی جاتی ہے لیکن عملی طور پر اس کا ناممکن ہونا بھی پہلی صورت جیسا ہی ہے کیونکہ یہ بات کس کے مقدور میں تھی کہ تمام اہل مدینہ اور تمام اہل نجران کو عورتوں و بچوں سمیت ایک میدان میں ملائے و مباہلہ کے لئے جمع کرے، کیا یہ اس طرح کی دعوت کو ایک محال و ناممکن امر سے وابستہ کرنا نہیں کہلاتا؟ اور کیا یہ اس بات کا عملی اعتراف نہیں کہ حق کا ظہور پذیر ہونا ناممکن نہیں؟

یا اس اجتماع سے مراد خصومت و جدال میں ملوث فریقین، یعنی پیغمبر اسلامؐ و آپؐ کے ساتھ موجود اہل ایمان اور نجران کے نصاریٰ کے وفد کے ارکان کا اکٹھا ہونا ہے، اگرچہ یہ اجتماع اور اکٹھا ہونا ممکن الوقوع ہے لیکن اگر اسے ہی آیت مبارکہ کا مقصود قرار دیا جائے تو اس پر وہ اعتراض وارد ہوگا جو اس مفسر نے اپنے بیان میں ذکر کیا ہے کہ ”نجران کے وفد میں کہ جن کے بارے میں آیت کے نزول کا دعویٰ کیا جاتا ہے ان کی عورتیں اور ان کے بچے شامل نہ تھے“، اس طرح اس اعتراض کو وقوعی صورت مل جائے گی۔

### پانچواں نکتہ:

اس مفسر نے کہا کہ ”جہاں تک حضرت پیغمبر اسلامؐ اور مؤمنین کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں عقیدہ کا تعلق ہے تو وہ جہتی بریقین تھا اور اس کے دلیل کے طور پر آیت کا یہ جملہ ”من بعد ما جاءک من العلم“ ہی کافی ہے کیونکہ اعتقادی مسائل میں علم سے یقین ہی مراد لیا جاتا ہے“،

اس کی یہ بات کہ اس طرح کے مسائل میں ”علم“ سے مراد یقین ہی ہوتا ہے حق و درست ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آیا آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مؤمنین، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یقین پر مبنی عقیدہ رکھتے تھے؟ میری نظر میں

یہ بات ثابت نہیں ہوتی، اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ (مفسر) کس طرح اسے آیت سے ثابت کر سکتا ہے؟ کیونکہ آیت مبارکہ کے الفاظ ”فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ“ سے صرف حضرت پیغمبر اسلامؐ کی ذاتی خصوصیت ثابت ہوتی ہے، اس میں مومنین کا تذکرہ و اشارہ تک موجود نہیں، اور وہ اس میں شامل ہو بھی نہیں سکتے کیونکہ خطاب و گفتگو کا مقام ہی ایسا ہے کہ اس میں آپؐ کے علاوہ دیگر مومنین کو شامل سمجھنا درست نہیں کیونکہ نجران کے نصاریٰ کا وفد صرف حضرت پیغمبر اسلامؐ سے بحث و مجاہد اور مناظرہ کرنے آیا تھا اور ان لوگوں کو مومنین سے ملنے تک کی کوئی خواہش نہ تھی بلکہ انہوں نے مومنین میں سے کسی سے بھی بات نہیں کی اور نہ ہی مومنین نے ان سے کوئی بات کی۔

ہاں، اگر آیت کے الفاظ ”مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ“ میں حضرت پیغمبر اسلامؐ کے علاوہ کسی کے شامل ہونے کا ثبوت پایا جائے تو وہی افراد ہو سکتے ہیں جنہیں آنحضرتؐ اپنے ہمراہ مہابہ کے لئے لائے تھے، چنانچہ اس سلسلہ میں ہم سابقہ بیانات میں لفظ ”مِنَ الْكَافِرِينَ“ سے آنحضرتؐ کے ہمراہ آنے والوں کی بابت اصل مقصود و واضح کر چکے ہیں۔

بلکہ قرآن مجید تمام مومنین کی بابت علم و یقین کی نفی پر دلالت کرتا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۃ یوسف، آیت: ۱۰۶

○ ”وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ“

(اور ان کی اکثریت اللہ پر ایمان نہیں رکھتی مگر شرک کے ساتھ!)

اس آیت میں ایمان والوں کے شرک کا ذکر ہوا ہے، تو شرک اور یقین کس طرح اکٹھے ہو سکتے ہیں؟

سورۃ احزاب، آیت: ۱۲

○ ”وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا“

(اور جب منافقین اور بیمار دل لوگوں نے کہا کہ جو وعدہ ہم سے خدا اور رسول خداؐ نے کیا ہے وہ دھوکہ و فریب

کے سوا کچھ نہیں)

سورۃ محمد، آیت: ۲۳

○ ”وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا نَزَّلَتْ سُورَةٌ فَإِذَا نَزَّلَتْ سُورَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ لَرَأَيْتِ

الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يُنظَرُونَ إِلَيْكَ تَنْظَرَ الْمَغْشَى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَأُولَئِكَ لَهُمْ ۖ طَاعَةٌ وَقَوْلٌ

مَعْرُوفٌ فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ فَلَمْ صَدَقُوا اللَّهَ لَكَانَ حَيْرًا لَهُمْ ..... أُولَئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ

فَأَصَابَهُمْ وَأَعْيَىٰ أَبْصَارُهُمْ“

(جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ کہتے ہیں کہ کوئی سورت کیوں نازل نہیں ہوتی، پھر جب کوئی حکم و واضح سورت

نازل ہوتی ہے اور اس میں قتال کا حکم ہوتا ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ بیمار دل افراد آپ کی طرف اس شخص کی طرح دیکھنے لگتے ہیں جن پر موت طاری ہو چکی ہو، تو ان کے لئے موت ہی بہتر ہے، ہمارا حکم اطاعت چاہتا ہے اور وہ بہترین بات ہے، اگر وہ خدا سے سچ بولتے تو ان کے لئے بہتر تھا..... یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت بھیجی اور انہیں گونگے واندھے بنا دیا)

اس سے معلوم ہوا کہ اہل ایمان میں سے صرف انہی افراد کو یقین حاصل ہوتا ہے جو بالبصیرت اور پیغمبر اسلام کے سچے پیروکار ہوں۔

سورۃ آل عمران، آیت: ۲۰

○ "فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسَلْتُ اللَّهَ وَهِيَ اللَّهُ وَهِيَ اللَّهُ"

(پس اگر وہ آپ سے حاجت و مناظرہ کریں تو کہہ دیجئے کہ میں نے اور میرے پیروکاروں نے اپنا رخ اللہ کی طرف کر لیا ہے)

سید علی سید  
حیدر آباد سندھ، پاکستان

سورۃ یوسف، آیت: ۱۰۸

○ "قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي"

(کہہ دیجئے کہ یہ ہے میرا راستہ! میں بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں اور میرے پیروکار!)

چھٹا نکتہ:

اس مفسر نے کہا کہ "نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ....." میں دو احتمالی معنی پائے جاتے ہیں: پہلا یہ کہ ہر فریق دوسرے کے لئے بددعا کرے..... (الخ)

اس پہلے معنی کا نادرست ہونا واضح ہو چکا ہے اور قارئین کرام آگاہ ہو چکے ہیں کہ یہ معنی آیت پر منطبق نہیں ہوتا کیونکہ مباہلہ کی غرض اسی جملہ سے حاصل ہو سکتی تھی: "تَعَالَوْا نَبْتَهَلْ فَجَعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَيَّ اِنْ كُنَّ بَيْنَنَا وَابْنَاءِكُمْ وَابْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَكُمْ وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ" (آؤ، ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو اور تم اپنے بیٹوں کو، اور ہم اپنی خواتین کو اور تم اپنی خواتین کو، اور ہم اپنوں کو اور تم اپنوں کو) یہ اضافہ اس لئے ہوا تاکہ اس سے ثابت ہو کہ فریقین میں سے ہر ایک پر لازم و ضروری ہے کہ وہ مباہلہ کے وقت اپنی سب سے زیادہ عزیز و پسندیدہ اور محبوب چیز پیش کرے اور وہ بیٹوں، عورتوں اور انفس (بھائیوں، اپنوں) سے عبارت ہے (اہل اور خواص) تو یہ اس صورت میں درست ہو سکتا ہے جب آیت کا

معنی یہ ہو: ”لندعو نحن ابنائنا و نسااننا و انفسنا و ندعون انتم ابنائکم و نساانکم و انفسکم، ثم نبتهل“ (ہم اپنے بیٹوں، اپنی عورتوں اور اپنے بھائیوں (اپنوں) کو بددعا کریں اور تم اپنے بیٹوں، اپنی عورتوں اور اپنے بھائیوں (اپنوں) کو بددعا کرو، پھر ہم مباہلہ کریں)، لیکن اگر آیت کا معنی یہ ہو: ”لندعو نحن ابنائکم و نساانکم و انفسکم و ندعون انتم ابنائنا و نسااننا و انفسنا ثم نبتهل“ (ہم تمہارے بیٹوں، تمہاری عورتوں اور تمہارے بھائیوں (اپنوں) کو بددعا کریں اور تم ہمارے بیٹوں، ہماری خواتین اور ہمارے بھائیوں (اپنوں) کو بددعا کرو، پھر ہم مباہلہ کریں) تو اس سے مطلوبہ غرض و مقصد حاصل نہ ہوگا۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یہ معنی خود ایسا ہے جسے طبع سلیم پسند نہیں کرتی کیونکہ یہ بات نہایت بے معنی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نصاریٰ کو اپنے بیٹوں (ابناء) اور اپنی خواتین (نساء) پر بددعا کرنے کی ہمت دیں اور اس کے مقابلہ میں ان سے درخواست کریں کہ وہ بھی آنحضرتؐ کو اپنے بچوں اور اپنی خواتین پر بددعا کرنے کی اجازت دیں تاکہ اس طرح دونوں جانب سے متعلقہ افراد کی موجودگی یقینی ہونے کے ساتھ ساتھ مباہلہ کے لازمی ارکان و تقاضے پورے ہو سکیں، جبکہ یہ بات ممکن تھی کہ دونوں فریق اپنے اپنے بچوں و عورتوں کے لئے بددعا کرتے تب بھی مباہلہ کی عملی صورت وجود پذیر ہو جاتی۔

اس کے علاوہ یہ پہلو نظر انداز نہیں ہو سکتا کہ اگر آیت مبارکہ سے مذکورہ معنی ہی سمجھا جائے تو اس سے وہی مسئلہ درپیش ہوگا جس کا اشارہ سطور بالا میں ہو چکا ہے اور وہ یہ کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ اپنے اہل بیتؑ پر بددعا کرنے کی ہمت و حق نصاریٰ کو دیں، جو کہ نہایت بے معنی بات ہے۔

لہذا ثابت ہوا کہ یہ احتمالی پہلو درست نہیں بلکہ وہی دوسرا معنی قرین صحت ہے کہ ملاعنہ سے مراد صرف یہ ہے کہ ہر فریق اپنے بچوں و عورتوں کے لئے جھوٹا ہونے کی صورت میں بددعا کرے۔

سبیلِ حیدر  
چدرابان سنہ پاکستان

ساتواں نکتہ:

اس مفسر نے کہا کہ ”اس میں کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا کہ خداوند عالم نے آنحضرتؐ کو حکم دیا کہ اپنے بچوں، عورتوں اور انفس (اپنوں) کو ہمراہ لے جائیں چنانچہ آنحضرتؐ نے خدا کے حکم پر عمل کرتے ہوئے مؤمنین میں سے ان تین صنفوں کا انتخاب کیا، لیکن اعتراض صرف یہ ہے کہ شیعوں اور ان کے ہم فکر حضرات نے ان افراد کے بارے میں تخصیص کر دی اور کہا کہ ان سے مراد علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ ہیں جبکہ یہ بات درست نہیں“،

اس اعتراض سے دراصل اس کا مقصد اسی سابق اعتراض کو دہرانا ہے جو اس نے آیت کے بارے میں کیا ہے اور

وہ یہ کہ اس سے یہ لازم آئے گا کہ انسان خود اپنے آپ کو بلائے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس اعتراض کا سابق الذکر دو احتمالی معانی سے کوئی تعلق و ربط ہی نہیں بلکہ اس کا اعتراض صرف یہ ہے کہ ”أَنْفُسَنَا“ میں انفس سے مراد خود رسول خدا ہیں جیسا کہ بعض مذہبی مناظرات سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ ایک فریق نے دعویٰ کیا کہ ”أَنْفُسَنَا“ سے مراد حضرت پیغمبر اسلام ہیں تو اس مفسر نے اس پر یہ اعتراض کر دیا کہ اگر یہی معنی مراد لیا جائے تو آیت میں ”نَدَّعُ أَنْفُسَنَا“ (ہم اپنے انفس کو بلاتے ہیں) کا مطلب یہ ہوگا کہ آنحضرت اپنے آپ کو بلائیں جبکہ یہ غلط و غیر معقول ہے اور اسی کی طرف اشارہ ہوا ہے اس دوسری روایت میں جو عیون اخبار الرضا سے ذکر کی گئی ہے۔

اس بیان سے اس مفسر کا شیعوں پر الزام عائد کرنا بے اساس ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ شیعہ قائل ہیں کہ ”أَنْفُسَنَا“ سے رسول اللہ کے اہل بیت سے مراد ہیں اور وہ مصداق کے تناظر میں حضرت رسول اللہ اور حضرت علی ہی قرار پاتے ہیں کیونکہ ”نِسَاءَنَا“ کا مصداق حضرت فاطمہ زہراء اور ”أَبْنَاءَنَا“ کا مصداق حضرت امام حسن و امام حسین ہیں اور ان کے علاوہ لفظ ”أَنْفُسَنَا“ باقی رہتا ہے کہ جو رسول اللہ اور حضرت علی پر منطبق ہوتا ہے اس بناء پر ان کا ایک دوسرے کو بلانا خالی از اشکال ہوگا۔ تو اس طرح شیعوں پر کیا جانے والا اشکال کہ وہ انفسنا سے حضرت علی مراد لیتے ہیں بھی باقی نہ رہے گا کیونکہ نبی کا علی کو بلانا قطعی طور پر درست و بجا ہے کہ جس کی بابت کسی طرح سے اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

اس مفسر کے شاگرد نے تفسیر المنار میں روایات کی طرف اشارہ کرنے کے بعد کہا ہے کہ ابن عساکر نے جعفر بن محمد (علیہما السلام) کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ ان کے والد گرامی قدر نے آیت مبارکہ ”فَقُلْ تَعَالَوْا نَدَّعُ أَنْفُسَنَا وَابْنَاءَنَا كُمْ.....“ کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: حضرت رسول خدا مباہلہ کے لئے ابوبکر اور ان کے صاحبزادہ، عمر اور ان کے صاحبزادہ اور عثمان اور ان کے صاحبزادہ کو ہمراہ لائے، بظاہر یہ بات اہل ایمان کے گروہ کے بارے میں ہے۔

اس کے بعد اس شاگرد نے اپنے استاد کے اس بیان کا حوالہ دینے کے بعد کہ جسے ہم سطور بالا میں ذکر کر چکے ہیں کہا: اس آیت میں جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں کہ معاشرتی امور میں عورتوں کو بھی شریک کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ قومی ہم آہنگی و ملی یکجہتی اور دینی یکجہتی کے تقاضوں کی تکمیل ہو، تو یہ حکم عورت کو مرد کے برابر لانے پر مبنی ہے کہ وہ چند معاملات کے علاوہ معاشرہ کے تمام عمومی امور میں اس کے ساتھ ہو، (اس کے بعد اس نے اپنے بیان کو طولانی کرتے ہوئے مزید مطالب ذکر کئے)۔

جہاں تک اس کی ذکر کردہ روایت کا تعلق ہے تو وہ غیر مستند ہونے کے ساتھ ساتھ ان تمام روایات سے معنی کے لحاظ سے متصادم ہے جو اس آیت کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں جبکہ وہ روایات کثرت و شہرت کی حامل ہیں، اس کے علاوہ یہ کہ مفسرین

نے مذکورہ بالا روایت کو نظر انداز کیا ہے، ان تمام باتوں سے قطع نظر اس روایت میں مذکور ایک مطلب ایسا ہے جو واقع الامر سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتا بلکہ میدانی حقائق اس کی نفی کرتے ہیں اور وہ یہ کہ اس میں مذکور تمام افراد کو صاحب فرزند ذکر کیا گیا ہے جبکہ اس دن ان میں سے کسی کے ہاں بیٹا نہ تھا (یعنی ابو بکر، عمر اور عثمان میں سے کسی کے ہاں فرزند نہ تھا)، اسی طرح اس مفسر کا یہ کہنا بھی خلاف واقع ہے کہ ”بظاہر یہ بات مؤمنین کے ایک گروہ کے بارے میں ہے“، کیونکہ وہ اپنے اس بیان سے شاید یہ بتانا چاہتا ہو کہ میرا خیال ہے کہ حضرت رسول خدا نے تمام مؤمنین اور ان کی اولاد کو اکٹھا کیا تھا، گویا ابو بکر اور ان کے فرزند، اور دیگر حضرات اور ان کے فرزندوں کے نام کنایہ کے طور پر لئے گئے کہ جن سے عام مؤمنین کو ہمراہ لانے کی طرف اشارہ ہے، دراصل اس شاگرد نے اپنے استاد کے ذکر کردہ مطلب کو درست ثابت کرنے کے لئے اس طرح کی بات کی ہے جبکہ قارئین کرام اس روایت کے بارے میں سند اور متن کے حوالہ سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اسے کوئی سند حیثیت حاصل نہیں اور نہ ہی مفسرین نے اسے کوئی اہمیت دی بلکہ انہوں نے اسے نظر انداز کر دیا، اور اس کے علاوہ یہ کہ اس مفسر نے جو معنی بیان کیا ہے وہ آیت کے الفاظ سے ہرگز ثابت نہیں تھا۔

اس کے علاوہ اس مفسر کا یہ کہنا بھی بے بنیاد ہے کہ آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں بھی معاشرتی امور میں مردوں کے ساتھ شریک ہیں، اگر اس کی یہ بات درست تسلیم کر لی جائے تو اس سے بچوں کا بھی معاشرتی عمومی مسائل و امور میں شریک ہونا تسلیم کرنا پڑے گا، جبکہ وہ ہرگز درست نہیں، بلکہ اسی سے اس کے دعوے کی قلعی کھل جاتی ہے اور اس کے پورے بیان کا بے اساس ہونا واضح ہو جاتا ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہم اپنی کتاب (المیزان) کی دوسری جلد میں طلاق کی آیت کی تفسیر میں عورتوں کے مردوں کے ساتھ معاشرتی امور میں شریک ہونے کی بابت مربوط مطالب ذکر کر چکے ہیں اور اس حوالہ سے دیگر آیات میں بھی موضوع کی مناسبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مربوط مطالب ذکر کئے جائیں گے کہ جن کی روشنی میں اس موضوع کی متعلقہ جہات واضح ہو جائیں گی اور اس مفسر نے آیت سے جس طرح استدلال پیش کیا ہے اس طرح کے استدلال کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔



## آیات ۶۳ تا ۷۸

- قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ ۗ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿۶۳﴾
- يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنزِلَتِ التَّوْرَةُ وَالْإِنْجِيلُ إِلَّا مِنْ بَعْدِهِ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۶۴﴾
- هَآأَنْتُمْ هَآؤِلَآءِ حَآجَجْتُمْ فِيمَآ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تَحَآجُّونَ فِيمَآ لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ ۗ وَاللَّهُ يُعَلِّمُ مَن يَشَاءُ وَلَا تَعْلَمُونَ ﴿۶۵﴾
- مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۶۶﴾
- إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۶۷﴾
- وَذَاتَ ظُلُمٍةٍ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّوكُمْ ۗ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿۶۸﴾

- يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَانْتُمْ تَشْهَدُونَ ﴿۶۳﴾
- يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَانْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۶۴﴾
- وَقَالَتْ طَآئِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ امْنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَيَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا الْآخِرَةَ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۶۵﴾
- وَلَا تَتُومِنُوا إِلَّا لِنِّسْبِ تَبِعَ دِينِكُمْ ۖ قُلْ إِنَّ الْهُدَىٰ هُدَىٰ اللَّهِ ۚ أَنْ يُؤْتَىٰ أَحَدٌ مِّثْلَ مَا أُوتِيْتُمْ أَوْ يُحَاجُّوكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۖ قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ ۚ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۶۶﴾
- يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿۶۷﴾
- وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنُ إِنْ تَأْمَنَهُ بِقِطَارٍ يُؤَدِّيهِ إِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَنُ إِنْ تَأْمَنَهُ بِدِينَارٍ إِلَّا يُؤَدِّيهِ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآبِئًا ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّينَ سَبِيلٌ ۚ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكِبْرَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۶۸﴾

- بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ⑥
- إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ ⑦ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ⑧
- وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلُومُونَ السُّنَّتَهُمْ بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ ⑨ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ⑩ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ⑪

## ترجمہ

- ”(اے نبی!) ان سے کہیے: اے اہل کتاب! اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے (کہ اس پر اتفاق کر لیں) کہ ہم اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ ہی اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیں اور نہ ہی خدا کے علاوہ ہم آپس میں سے کسی کو رب بنائیں، لیکن اگر وہ اس سے روگردانی کریں تو ان سے کہہ دیں کہ تم گواہ رہو کہ ہم اسلام پر ہیں“
- (۶۴)
- ”اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں بحث و نزاع کیوں کرتے ہو حالانکہ تورات و انجیل تو ان کے بعد نازل کی جانے والی کتابیں ہیں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے“
- (۶۵)
- ”اب تک تم انہی چیزوں کے بارے میں بحث و نزاع کرتے رہے جن کی بابت تمہیں کچھ علم تھا، تو ان چیزوں کے بارے میں کیوں بحث و نزاع کرتے ہو جن کی بابت کچھ بھی نہیں جانتے؟ (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ جانتا ہے جبکہ تم کچھ نہیں جانتے“
- (۶۶)
- ”(حق یہ ہے کہ) ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ ہی نصرانی تھے بلکہ وہ خالص مسلمان تھے اور وہ ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے“
- (۶۷)

” یقینی بات یہ ہے کہ ابراہیم کے حقدار تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور جو لوگ ایمان لائے (وہ ان کے حقدار ہیں) اور اللہ ایمان والوں کا حاکم و آقا ہے “

(۶۸)

” اہل کتاب کے ایک گروہ نے تمہیں گمراہ کرنے کی بھرپور تمنا کی مگر وہ اپنے آپ کو گمراہ کرتے رہے لیکن انہیں اس کا شعور ہی نہیں ہے “

(۶۹)

” اے اہل کتاب! تم خدا کی نشانیوں کا انکار کیوں کرتے ہو جبکہ تم گواہ ہو “

(۷۰)

” اے اہل کتاب! تم حق کو باطل کا اور باطل کو حق کا لباس کیوں پہناتے ہو جبکہ تم اچھی طرح آگاہی رکھتے ہو “

(۷۱)

” اہل کتاب کے ایک گروہ نے کہا کہ ایمان لانے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر دن کی ابتدائی گھڑیوں میں ایمان لاؤ اور دن کے آخری پہر میں اس کا انکار کر دو تاکہ وہ لوگ پلٹ آئیں (اپنے عقیدہ سے رجوع و روگرانی کر لیں) “

(۷۲)

” اور (وہ کہتے ہیں کہ) تم کسی کی بات نہ مانو سوائے اس شخص کے کہ جو تمہارے دین کی پیروی کرے، کہہ دیجئے کہ خدائی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے، (اور وہ آپس میں ایک دوسرے سے یہ بھی کہتے تھے کہ) کہیں ایسا نہ ہو کہ جو کچھ تمہیں عطا ہوا ہے اس جیسا کسی اور کو عطا ہو جائے یا وہ تمہارے رب کے حضور تمہارے خلاف دلیل پیش کر سکیں (اے رسول) ان سے کہیے کہ فضل و کرم خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ وسعت والا، بہت جاننے والا ہے“

(۷۳)

” خدا جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے خاص کر دیتا ہے کہ اللہ عظیم فضل و عنایت والا ہے“

(۷۴)

” اہل کتاب میں ایسے بھی ہیں کہ اگر آپ ان کے پاس مال کثیر امانت رکھیں تو وہ آپ کو واپس دے دیں گے اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ اگر آپ ایک دینار بھی ان کے پاس امانت رکھیں تو وہ آپ کو واپس نہیں کریں گے جب تک کہ آپ ان کے سر پر کھڑے نہ رہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا نظریہ یہ ہے کہ ہم پر (غیر یہودی) عربوں کی کوئی ذمہ داری نہیں، حالانکہ وہ خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں جبکہ انہیں (حقیقت حال) معلوم ہے“

(۷۵)

” ہاں، جو شخص اپنا وعدہ پورا کرے اور متقی ہو جائے تو یقیناً خدا متقی لوگوں سے محبت کرتا ہے“

(۷۶)

” جو لوگ خدائی عہد و پیمان اور اپنی قسموں کو نہایت کم قیمت پر بیچ دیتے ہیں یقیناً ایسے ہی لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، (بلکہ) قیامت کے دن خدا ان سے کلام کرے گا اور نہ ان کی طرف نظر کرے گا اور نہ ہی انہیں پاک کرے گا بلکہ ان کے لئے دردناک عذاب مقرر ہے “

(۷۷)

” اور ان (اہل کتاب) میں سے کچھ افراد ایسے ہیں جو کتاب کو پڑھتے پڑھتے اپنی زبانیں اس طرح گھماتے ہیں کہ آپ ان لفظوں کو کتاب ہی کا حصہ سمجھیں جبکہ وہ کتاب کا حصہ نہیں ہوتے، اور وہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا، (حقیقت یہ ہے کہ) وہ سب کچھ جاننے کے باوجود خدا پر جھوٹ باندھتے و تہمت لگاتے ہیں “

(۷۸)

## تفسیر و بیان

ان آیات میں تمام اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ کے بارے میں سلسلہ بیان اور اس سے ملحق و مربوط مطالب و موضوعات کے دوسرے مرحلہ کا آغاز ہوا ہے کیونکہ اس سے پہلے جو آیات گزری ہیں ان میں اس موضوع کے پہلے مرحلہ یعنی اہل کتاب کے بارے میں عمومی طور پر مطالب ذکر ہوئے اور وہ اس طرح سے کہ پہلے ارشاد ہوا:

”إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ“ (دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے)..... سورہ آل عمران، آیت ۱۹.....

اور فرمایا: ”أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِنَ الْكِتَابِ“ (کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں

کتاب میں سے کچھ حصہ دیا گیا)..... آل عمران، آیت ۲۳.....

اس کے بعد خطاب کا رخ نصاریٰ کی طرف کرتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا:

”إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا.....“ (خدا نے چن لیا آدم کو، اور نوح کو.....)..... آل عمران ۳۳.....

پھر اس سلسلہ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے اثناء گفتگو میں مؤمنین کی کافروں سے دوستی کے بارے میں یوں ارشاد ہوا:

”لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكُفْرِينَ أَوْلِيَاءَ“ (مؤمنین، کافروں کو دوست نہ بنائیں)..... آل عمران، آیت

۲۸.....

یہ تھے پہلے مرحلہ میں ذکر کئے گئے مطالب، اس کے بعد اس سلسلہ بیان میں دوبارہ ان مطالب کو ذکر کیا جو گزشتہ آیات میں ذکر ہو چکے تھے لیکن اس میں سابقہ اسلوب سخن اور ترتیب موضوعات سے مختلف روش اختیار کی گئی چنانچہ مذکورہ بالا آیات مبارکہ اور ان سے ملحق دیگر آیات میں موضوع کی مناسبت کے حامل گونا گوں مطالب کو ذکر کیا گیا اور ان سب میں آیات کے بیانات کی خصوصیات ملحوظ رہیں مثلاً یوں ارشاد ہوا: ”قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ“ (آل عمران، آیت ۹۸) (کہہ دیجئے! اے اہل کتاب! تم اللہ کی آیات کا انکار کیوں کرتے ہو)

اس کے بعد ارشاد ہوا:

○ ”قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ“

(کہہ دیجئے! اے اہل کتاب! تم اللہ کی راہ سے کیوں روکتے ہو)..... آل عمران، آیت ۹۹.....



اور نصاریٰ کی بابت اظہار مطالب میں حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ان کے عقیدہ کے حوالہ سے ارشاد ہوا :

○ ” مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّكُمْ عَلِيمِينَ إِنَّمَا أَنْتُم مُّذَمَّرُونَ ﴿٦٤﴾ “

(کسی بشر کے لئے روانہ نہیں کہ جسے خدا کتاب عطا کرے اور حکومت و نبوت دے پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے عبادت گزار بنو، بلکہ وہ کہے کہ تم اللہ والے بنو کیونکہ تم کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور تم اس سے درس حاصل کرتے ہو)..... آل عمران، آیت ۷۹.....

اور پھر متفرق و کثیر آیات میں مؤمنین سے مربوط مطالب کا تذکرہ ہوا: مثلاً اسلام پر قائم رہنے کی دعوت، اتحاد و یکجہتی کی دعوت، کفار کی دوستی سے بچنے کی دعوت، مؤمنین کے علاوہ دوسروں کو رازدار بنانے سے اجتناب برتنے کی دعوت، اور ان کے علاوہ دیگر مطالب و مضوعات وغیرہ،

## اہل کتاب کو دعوتِ حق

○ ” قُلْ يَا هَلْ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ “

(کہہ دیجئے، اے اہل کتاب! تم آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر..... مشترک ہے.....)

اس آیت مبارکہ میں عمومی طور پر اہل کتاب سے خطاب کیا گیا ہے، اور جملہ ”تعالوا اِلَى كَلِمَةٍ“ کے ذریعے جو دعوت دی گئی ہے وہ درحقیقت یکجا ہو کر ایک مشترک بات پر عمل کرنے کی دعوت ہے، اس جملہ میں کہا گیا ہے ”تعالوا اِلَى كَلِمَةٍ“ (تم آؤ اس کلمہ (بات) کی طرف) تو اس میں ”کَلِمَةٍ“ کی طرف بلائے جانے کی بات اس حوالہ سے ہوئی کہ عام طور پر یہی زبان زد عام و خاص ہوتا ہے کہ ”لوگ اس بات“ پر متفق ہو گئے کہ فلاں کام اس طرح ہوگا“، تو اس میں لفظ ”کَلِمَةٍ“ یقین و پختہ عزم، اعتقاد و قبولیت اور نشر و اشاعت کے معانی کا حامل ہوتا ہے، یعنی کہا جاتا ہے کہ لوگ اس امر پر پختہ یقین و عزم کے ساتھ اس کے مقبول خاص و عام ہونے پر اتفاق رائے رکھتے ہیں، تو ”کَلِمَةٍ“ بمعنی رائے و پختہ نظریہ ہے، بناءً براین آیت مبارکہ کا معنی یہ ہوگا: آؤ کہ ہم اس امر پر اتفاق رائے کرتے ہوئے باہمی تعاون اور یکجہتی کے ساتھ اس کے عام کرنے اور اس کے تقاضوں کی تکمیل پر عمل کرنا کریں۔

لفظ ”سَوَآءٍ“ اصل میں مصدر ہے لیکن بطور صفت بمعنی ”مساوی الطرفین“ (برابر) استعمال ہوتا ہے، لہذا جملہ ”سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ“ کا معنی یہ ہے کہ وہ ایسا کلمہ (بات) ہے جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک حیثیت رکھتا ہے اور ہمیں اور تمہیں دونوں کو اس پر عمل کرنا اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنا ضروری ہے،

بنا بریں آیت میں ”كَلِمَةٍ“ کی توصیف ”سَوَآءٍ“ کے ساتھ اس حوالہ سے ہوئی ہے کہ اس میں اس پر عمل کرنا اور اسے اختیار کرنا ملحوظ ہے، گویا یہ صفت خود کلمہ کی نہیں بلکہ اس سے تعلق رکھنے والے امر یا امور کی ہے، اور آپ اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ عمل کرنے کا تعلق ”كَلِمَةٍ“ کے معنی سے ہے نہ کہ خود ”كَلِمَةٍ“ سے، اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے اجتماع و اکٹھا ہونے کا تعلق ”كَلِمَةٍ“ کے معنی سے ہے خود ”كَلِمَةٍ“ سے نہیں، اور اس جملہ میں اجتماع یعنی دونوں گروہوں کے اکٹھا ہونے کا اظہار کلمہ کے معنی سے تعلق کے حوالہ سے جس طرح ہوا ہے اس میں مجازی حوالہ ملحوظ ہے، اس بناء پر کلام میں چند مجازی حوالے پائے جاتے ہیں:

(۱) اجتماع اور دونوں گروہوں کے اکٹھا ہونے کی نسبت کلمہ کے معنی کی بجائے خود کلمہ کی طرف دی گئی،

(۲) معنی کی جگہ خود ”كَلِمَةٍ“ کا لفظ ذکر کیا گیا،

(۳) ”كَلِمَةٍ“ کی توصیف ”سَوَآءٍ“ کے ساتھ کی گئی،

### ایک قول اور اس کی وضاحت

اس مقام پر ایک قول یہ ہے کہ آیت مبارکہ میں ”كَلِمَةٍ“ کے ”سَوَآءٍ“ ہونے سے مراد یہ ہے کہ قرآن، تورات اور انجیل تینوں کتب اس ”كَلِمَةٍ“ کی طرف دعوت کی بابت متفق و یکساں ہیں اور وہ کلمہ توحید ہے، اس بناء پر جملہ ”تَعَالَوْا اِلَى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ“ کے بعد جملہ ”اَلَا نَعْبُدُ اِلَّا اللّٰهَ“ دراصل اس کلمہ یعنی کلمہ توحید کی حقیقی و برحق تفسیر قرار پائے گا کہ جس پر تمام کتب آسمانی کا اتفاق ہے، اور وہ تقاسیر باطل و غلط ہیں جن میں ہوا و ہوس میں آلودہ اذہان نے کلمہ کی بابت اظہار معنی میں حلول (یعنی خدا کا حضرت مریمؑ کے بدن میں داخل ہو جانا) اور عیسیٰؑ کا بیٹا بنانا، تین خداؤں کا عقیدہ، علماء (احبار و قسیوں اور استغفوں کی عبادت و پرستش کو شامل کیا، لہذا آیت کا معنی یہ ہوگا: ”تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم وہی التوحید“، آؤ اس کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر و یکساں (مشترک) ہے اور وہ کلمہ توحید ہے، اور توحید کے عقیدہ کا لازمی امر یہ ہے کہ ہر طرح کے شرک و شرکاء کو مسترد کر دیا جائے اور اللہ تعالیٰ کے

علاوہ کسی کو رب قرار نہ دیا جائے۔

البتہ آیت کا اختتامی جملہ یعنی ”فَإِنْ تَوَلَّوْا فَتَوَلَّوْا الشَّهْدَ وَآبَاءَنَا مُسْلِمُونَ“ پہلے معنی کی تائید کرتا ہے کیونکہ اس کی بناء پر آیت کا معنی یوں ہے: آؤ اس کلمہ کی طرف، یعنی یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، کیونکہ اسلام جو کہ خدائی دین ہے اس کا مقتضائے حقیقی یہی ہے، اگرچہ اسلام بھی توحیدی عقیدہ کا لازمی حصہ ہے لیکن اس آیت مبارکہ میں جو دعوت دی گئی ہے (تعالوا) وہ عملی توحید کی طرف ہے کہ جو عملی طور پر غیر خدا کی عبادت کو ترک کرنا ہے نہ کہ صرف توحید کا عقیدہ رکھنا ہے، (ان دونوں میں فرق ہے، اس پر اچھی طرح غور کریں اور اسے بخوبی سمجھیں)۔

### کلمہ توحید کی حقیقت

○ ”أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ“  
(یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار نہ دیں، اور اللہ کے علاوہ ایک دوسرے کو رب بنا نہیں)

یہ جملہ ”کَلِمَاتٌ“ کی تفسیر کرتا ہے جو کہ اسلام یعنی بارگاہ رب العزت میں سر تسلیم خم کر دینے کا بنیادی تقاضا ہے۔ اور جملہ ”أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ“ سے مراد غیر اللہ کی عبادت و پرستش کی نفی ہے اللہ کی عبادت کا اثبات نہیں جیسا کہ سابقہ مباحث میں کلمہ اخلاص ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ کے معنی کا ذکر کرتے ہوئے بیان ہو چکا ہے کہ ”إِلَّا اللَّهُ“ استثناء کے لئے نہیں بلکہ بدل کے طور پر ہے اور اس بناء پر اس کا تقاضا یہ ہے کہ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ کا سیاق، شریک کی نفی کے بیان کے لئے ہونہ کہ معبود کے اثبات کے لئے، کیونکہ قرآن مجید معبود کے وجود کے اثبات اور اس کی حقیقت کو مسلم الثبوت امر قرار دیتا ہے کہ جس کے لئے کسی بیان و دلیل کی ضرورت نہیں۔

چونکہ سیاق کلام، شریک کی نفی ہے اور اس میں عبادت میں خدا کے شریک کی نفی کا بیان مقصود ہے تو ضروری تھا کہ ایسا جملہ ذکر کیا جائے جس سے شرک کی بنیاد ہی ختم ہو جبکہ جملہ ”أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ“ سے یہ مطلوب حاصل نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے اس کے فوراً بعد یوں ارشاد ہوا: ”وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ“ (کہ ہم خدا کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں اور نہ ہی ہم خدا کے علاوہ ایک دوسرے کو رب قرار دیں)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ”عبادت“ اس وقت تک ”عبادت خدا“ نہیں کہلا سکتی جب تک وہ شرک آمیز عقائد و نظریات سے پورے طور پر خالص و پاک

نہ ہو ورنہ وہ اللہ کی عبادت تو کہلائے گی مگر شرک کے ساتھ یعنی ایسی عبادت ہوگی جس کے ذریعے دو شریکوں (معبودوں) میں سے ایک کو معبود قرار دے کر اس کی پرستش کی گئی ہو، اس طرح کی عبادت، خدائے یکتا کی عبادت نہیں کہلا سکتی، اگرچہ اس کی نسبت خدا کی طرف ہوتی ہے اور اسے خدا کی عبادت کا نام دیا جاتا ہے لیکن اس کی کڑیاں شرک سے ملتی ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ عبادت کو تقسیم کر کے اس میں سے ایک حصہ خدا کے ساتھ مخصوص کر دیا جاتا ہے اور پھر اس کی بناء پر اسے ”عبادت خدا“ کہا جاتا ہے جبکہ اس میں اللہ کے علاوہ دیگر معبودوں کی عبادت بھی موجود ہوتی ہے۔

اور وہ خالص عبادت کہ جو صرف خدا کے لئے ہے اور اس میں معبود یکتا ذات خداوند متعال ہے اس کی طرف حضرت پیغمبر اسلامؐ نے حکم خدا، لوگوں کو بلا یا، اور اسی کا ثبوت اس آیت مبارکہ میں پایا جاتا ہے: ”أَلَا نَعْبُدُ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِمَّنْ دُونِ اللَّهِ“ اور یہی وہ غرض و مقصدِ اعلیٰ ہے جس پر انبیاء علیہم السلام کی سیرت اور اس عملی دعوت کا دار و مدار ہے جس کے ذریعے وہ اس عظیم مقصد کو دنیائے انسانیت کے گوشہ گوشہ تک پھیلانے کا ہدف حاصل کرنے آئے تھے، چنانچہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۳ ”كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً“ کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ نبوت ایک خدائی ذمہ داری اور حقیقی تحریک ہے کہ جس کے ذریعے اعلیٰ کلمہ حق اور دین کے پیغام کو عام کرنے کا ہدف ملحوظ و مقصود قرار پاتا ہے، اور دین کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسانی معاشرہ کو زندگی کی عادلانہ صورت عطا کی جائے کہ جس میں فردی زندگی کو درست سمت میں لانے کا ہدف بھی حاصل ہو جاتا ہے اور پھر پوری انسانی کائنات اپنی اس منزل کو پا لیتی ہے جو اس کی تخلیق کی اصل بنیاد و مقصد ہے یعنی ہر فرد بشر اپنی تخلیقی غرض و رعایت کو حاصل کر لیتا ہے، چنانچہ پورا معاشرہ عدل و انصاف کے ساتھ حریت و آزادی اور فطری کمالات سے بہرہ مندی کی سعادت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، اور جب معاشرہ اس پاکیزہ صفت و عظیم نعمت سے مالا مال ہوتا ہے تو اس کے ضمن میں ہر فرد کو زندگی کی گونا گوں جہتوں میں بھرپور بلکہ مطلق آزادی حاصل ہو جاتی ہے اور وہ اپنی سوچ اور ارادہ کی راہنمائی میں جو کچھ بھی کرنا چاہتا ہے کرنے لگتا ہے لیکن اسے اپنی انفرادی سوچ و ارادہ کی بنیاد پر کئے جانے والے کاموں اور آزادی کی نعمت سے بہرہ مندی و استفادہ میں ان امور و اقدامات کی بابت ہرگز آزادی حاصل نہیں ہوتی جو معاشرہ کی زندگی و بقاء کے لئے نقصان دہ ہوں، چنانچہ زیر نظر آیت مبارکہ کے اختتامی جملہ میں ان تمام امور کو خدا کی عبودیت و بندگی اور اس کے سامنے کامل طور پر سر تسلیم خم کر دینے سے وابستہ کر دیا گیا ہے اور غیبی طاقت و سلطنت کے سامنے عملی خضوع کو ان تمام اعمال کا محور قرار دیا گیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ تمام انبیاء الہی علیہم السلام نے نوع انسانی کو انفرادی و اجتماعی دونوں صورتوں میں اس راہ پر چلنے کی دعوت دی جو ان کی فطری و تخلیقی بنیادوں سے کامل مطابقت رکھتی ہے یعنی کلمہ توحید (یکتا پرستی) کہ جس کا بنیادی تقاضا ہی یہ ہے تمام اعمال کو خواہ ان کا تعلق فردی و نجی زندگی سے ہو یا اجتماعی و معاشرتی حیات سے ہو خدا سے کامل وابستگی و سپردگی اور عدل

وانصاف کے تقاضوں سے ہمرنگ وہم آہنگ کیا جائے، یعنی زندگی کے حقوق میں مساوات و برابری کا عملی تحفظ و نفاذ اور نیک ارادہ و عمل صالح میں حریت و آزادی سے بہرہ مندی کو یقینی بنایا جائے، اور ان مقاصد کا حصول سوائے اس کے ممکن نہیں کہ اختلاف کی جڑوں کو کاٹ دیا جائے، ناحق بغاوت و دشمنی کی بنیادوں کا قلع قمع کر دیا جائے، طاقتور کی بالادستی اور اس کے کمزور و ناتواں افراد پر حاکمانہ تسلط کی راہ بند کر دی جائے اور کوئی ضعیف انسان کسی قوی شخص کی غلامی اختیار نہ کرے، اور عقیدہ و عمل میں اس حقیقت کا ثبوت دیا جائے کہ کوئی معبود نہیں سوائے خدا کے! (لا الہ الا اللہ) ، کوئی رب نہیں سوائے خدا کے! (لا رب الا اللہ) اور کسی کو حکمرانی کا حق حاصل نہیں سوائے خدا کے! (لا حکم الا للہ) ، اور یہی وہ حقیقت ہے جس پر یہ آیت دلالت کرتی ہے: ” اَلَا نَعْبُدُ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَشْخُدُ بَعْضُنَا بَعْضًا اَمْ يَا بَاقِيَ دُوْنِ اللّٰهِ“، اسی کے مانند وہ آیت ہے جس میں خداوند عالم نے یوسف علیہ السلام کی بات ذکر کی ہے کہ انہوں نے اپنے ساتھی قیدی سے کہا :

” يٰصَاحِبِ السِّجْنِ اَنْرَا بَابَ مُتَقَرِّفٍۭۙ حَيِّرَۙ اَمْرَ اللّٰهِ اَلْوَا حِدُ الْقَهَّارِ ﴿۳۰﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖۙ اِلَّا اَسْمَاءٌ سَبَّيْتُمُوْهَا اَنْتُمْ وَاٰبَاؤُكُمْۙ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِہَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنْ اَلْحٰكَمُ اِلَّا اللّٰهُ ؕ اَمْرًاۙ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیْمُۙ“ (سورۃ یوسف، آیت ۴۰)

(اے میرے قید کے ساتھی! کیا گونا گوں ارباب بہتر ہیں یا اللہ، کہ جو یکتا و غلبہ والا ہے، جن کی تم پوجا کرتے ہو وہ کچھ بھی نہیں سوائے ان ناموں کے جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھے ہیں، کہ ان کے بارے میں خدا نے کوئی دلیل نازل نہیں کی، حکمرانی کسی کو حاصل نہیں سوائے خدا کے، اس نے حکم دیا ہے کہ تم کسی کی عبادت نہ کرو سوائے اس کے، کہ یہی مضبوط دین ہے)،

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

سورۃ توبہ، آیت: ۳۱

” اِنۡتَحٰذُوا۟ اَحۡبَابَہُمْ وَاٰۤهَابَہُمْۙ وَرَہْبَانِہُمْۙ اَمْ یَاۤبَاقِیۡنِ دُوۡنِ اللّٰهِ وَالنَّسِیۡمِۙ اِبۡنِ مَرۡیَمَ ؕ وَمَاۤ اُوۡرِذُوۡا اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡا اِلٰہًا وَّاحِدًاۙ اِلَّا اِلٰہُۙ سُبۡحٰنَہٗ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ“

(انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو خدا کے مقابلے میں رب بنا لیا اور مسیح بن مریم کو (رب بنا لیا)، حالانکہ

انہیں اس کے علاوہ کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ وہ ایک معبود کی پرستش کریں، کوئی معبود نہیں سوائے اس کے!)

اس موضوع کی بابت مذکورہ بالا آیتوں کے علاوہ دیگر متعدد آیات موجود ہیں۔

## دعوتِ انبیاء کا قرآنی تذکرہ

قرآن مجید میں بعض انبیاء علیہم السلام مثلاً نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ، ابراہیمؑ، شعیبؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی توحیدی دعوت کا تذکرہ نہایت واضح الفاظ میں ہوا ہے چنانچہ اس حوالہ سے چند آیات بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں جن میں ان ہستیوں کے عمل اور ردِ عمل سے مربوط مطالب مذکور ہیں :

حضرت نوحؑ کے تذکرہ میں ہے کہ انہوں نے بارگاہِ رب العزت میں عرض کی :

سورہ نوح، آیت : ۲۱

○ ” رَبِّ إِنَّهُمْ عَصَوْنِي وَاتَّبَعُوا مَنْ لَّمْ يَزِدْكَ مَالَهُ وَوَلَدُكَ إِلَّا خَسَارًا“

(پروردگارا ! ان لوگوں نے میری نافرمانی کی ہے اور ایسے شخص کی پیروی کی کہ جسے اس کے مال و اولاد سے

سوائے خسارہ و نقصان کے کچھ حاصل نہ ہوا)

حضرت ہودؑ نے اپنی قوم سے جو کہا اس کا تذکرہ یوں ہوا :

سورہ شعراء، آیت : ۱۳۰

○ ” أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رَآئِحَةٍ آيَةً تَعْبَثُونَ ﴿۱۳۰﴾ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ ﴿۱۳۱﴾ وَإِذَا

بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ“

(کیا تم ہر بلند جگہ پر بے مقصد نشانیاں بناتے ہو اور بڑے محلات تعمیر کرتے ہو کہ گویا ان میں ہمیشہ رہنے

والے ہو، اور جب تم کسی کمزور پر غصہ کرتے ہو تو نہایت جاہر و بے رحم بن کر کرتے ہو)

حضرت صالحؑ نے اپنی قوم سے یوں فرمایا :

سورہ شعراء، آیت : ۱۵۱

○ ” وَلَا تَطِيعُوا أَمْرَ السُّرَفِيِّينَ“

(اور تم اسراف کرنے والوں کے احکامات کی اطاعت نہ کرو)

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ (چچا) اور اپنی قوم سے یوں کہا :

سورۃ انبیاء، آیت: ۵۴

○ ” مَا هَذِهِ النَّاسِئِلُ الَّتِي أَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُونَ ﴿۵۴﴾ قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عَابِدِينَ ﴿۵۵﴾  
 قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۵۶﴾ “

(یہ صورتیں (مورتیں) کیا ہیں کہ تم جن کے گرویدہ ہو چکے ہو؟، انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آباء کو ان کی عبادت کرتے ہوئے پایا ہے، اس نے کہا کہ بے شک تم اور تمہارے آباء کھلی گمراہی میں تھے) خداوند عالم نے حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی کو فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا، اس کا ذکر قرآن مجید میں اس

طرح ہوا:

سورۃ طہ، آیت: ۴۷

○ ” إِذْ هَبْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ..... فَأْتِيهِ فَتُكْوِلُكَ إِتْرَاسُؤَلَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بِنْتِي  
 إِسْرَاءَ بِنْتِي وَلَا تَعَدِّ بِنْتَهُمْ “

(تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ اس نے سرکشی کی ہے..... اس کے پاس آ کر اس سے کہو کہ ہم دونوں تیرے رب کی طرف سے پیغام لائے ہیں (رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں)، تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور ان پر سختی و ظلم نہ کر،)

حضرت عیسیٰؑ نے جو کچھ اپنی قوم سے کہا اس کا ذکر اس طرح ہوا :

سورۃ زخرف، آیت: ۶۳

○ ” وَلَا بَيْنَكُمْ بَعْضُ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ ۚ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا ۚ  
 (اور تاکہ میں تمہارے لئے بعض ان مسائل کو واضح طور پر بیان کروں جن میں تم اختلاف رکھتے ہو، تم تقوائے الہی اختیار کرو اور میری اطاعت کرو)

مذکورہ بالا آیات سے اس حقیقت کی نشاندہی ہوتی ہے کہ فطری دین وہی ہے جو دشمنی و فساد کی نفی کرتا ہے کیونکہ یہ مظالم اور ناحق آمرانہ اعمال، سعادت و خوش بختی کی بنیادوں کو منہدم کر دیتے ہیں اور حق و حقیقت کی عمارتوں کو اوندھام نہ گرا دیتے ہیں۔

اور حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (جیسا کہ مشہور مؤرخ مسعودی نے کتاب مروج الذهب میں دس

ہجری کے واقعات میں لکھا ہے) حجۃ الوداع پر فرمایا:

” اَلَا وَاِنَّ الزَّمَانَ قَدْ اسْتَدَارَ ۖ بَيْنَهُ يَوْمَ يَخْلُقُ اللَّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ “

(یاد رکھو کہ زمانہ اپنی اسی شکل پر پلٹ گیا ہے جیسے خدا نے اسے اس دن پیدا کیا جب آسمانوں اور زمین کو خلق

فرمایا)۔

گویا آنحضرتؐ کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اب اپنی فطری راہ پر چل پڑے ہیں کیونکہ ان کے درمیان اسلامی اقدار عملی طور پر حکم فرما ہو گئے ہیں۔

بہر حال آیت مبارکہ ”أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ“ جہاں نبوت کے مقصدِ اعلیٰ کو بیان کرتی ہے وہاں حکم کے سبب و معیار کو بھی واضح کرتی ہے۔

اور جہاں تک اس پورے جملہ کا تعلق ہے ”أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا“ (ہم عبادت نہ کریں کسی کی سوائے خدا کے، اور ہم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ الوہیت ہی تمام موجودات کی توجہات کا مرکز اور ان کے قلبی اتصالات کا محور ہوتا ہے لہذا وہی کائنات میں پائی جانے والی کثیر اور ایک دوسری سے مرتبط و وابستہ اشیاء کے ہر کمال کا سرچشمہ ہے کیونکہ تمام موجودات اپنے وجود و بقاء میں محتاج ہونے کے حوالہ سے یکساں ہیں اور معبود کو ایسا ہونا چاہئے جس میں ہر وہ کمال پایا جائے جس کی ان موجودات کو ضرورت ہو اور یہ مقصد صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب وہ یعنی معبود یکتا ہو، اس کے ساتھ الوہیت میں کوئی شریک نہ ہو، اور ایسا مالک ہو کہ ہر چیز کی تدبیر و بقاء کا نظام اسی کے ہاتھ میں ہو، اس بناء پر ضروری ہے کہ ”اللہ“ کی عبادت و پرستش کی جائے کیونکہ وہ واحد و یکتا ہے کہ جس کا کوئی شریک نہیں، اور ضروری ہے کہ اس کی عبادت و پرستش میں کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ کیا جائے، اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ یہ جہاں اور جو کچھ بھی اس میں پایا جاتا ہے اس کی بابت یہ بات ہرگز درست و روا نہیں کہ وہ ایک محور و مرکز کے علاوہ کسی کے سامنے خاضع و سرخم کرے کیونکہ تمام اہل عالم اپنے وجودی نظام اور اس کی وابستگی کی اکائی و وحدت کے مرہون منت ہیں کہ اسی پر ان کی پرورش و تربیت کا دار و مدار ہے، ان سب کا ایک ہی رب ہے اور ایک ہی خالق ہے، اس کے سوا ان کا کوئی پروردگار اور پیدا کرنے والا نہیں۔

اور جہاں تک جملہ ”وَلَا يَشْخَذُ بِعُضْنَ بَعْضًا أَرْبَابًا لَّيِّنٌ دُونَ اللَّهِ“ کا تعلق ہے تو اس سے ایک اہم مطلب کی نشاندہی ہوتی ہے اور وہ یہ کہ انسانی معاشرہ اپنے افراد کی کثرت اور اشخاص کے مختلف و جدا جدا ہونے کے باوجود ایک ہی حقیقت کے حصے ہیں کہ جسے ”انسان“ اور اس کی نوع کا نام دیا جاتا ہے، اس میں کارخانہ تخلیق نے جو قوتیں و صلاحیتیں ودیعت کی ہیں اور جن حقوق سے نوازا ہے ان کا یکساں و مساوی ہونا اس امر کا تقاضی ہے کہ نوع انسانی کے تمام افراد زندگی کے حقوق اور ان سے استفادہ کرنے کے مواقع و موارد میں بھی برابر درجہ رکھتے ہوں، اور ان میں سے اگر کچھ افراد اپنی ذاتی صلاحیت کی بنیاد پر انسانی زندگی کے عمومی حقوق سے زیادہ یا مخصوص امتیازی صفات کے حامل و حقدار ہوں تو انہیں ان کی



صلاحیتوں کے مطابق ان کا مقام دیا جانا چاہیے اور اس مقام کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے انہیں معاشرتی زندگی کے حقوق سے بہرہ مند کیا جائے کیونکہ کارخانہ تخلیق میں نوع انسانی کے افراد کے درمیان صنفی خصوصیات متعین کر دی گئی ہیں مثلاً ازدواج، ولادت اور معالجہ کے حقوق و خصوصیات جو کہ انسانیت کے عمومی مسائل میں سے ہیں لیکن ان کی اختصاصی حیثیت اس طرح سے ہے کہ ازدواج کا حق اس انسان کو حاصل ہوتا ہے جو بالغ ہو خواہ مرد ہو یا عورت، اور بچہ جننے کی خصوصیت عورت کو عطا کی گئی اور معالجہ کا حق بیمار شخص کے حوالہ سے متعین ہوتا ہے، تو معلوم ہوا کہ افراد بشر اجتماعی و معاشرتی حیثیت میں اس طرح ہیں کہ سب ایک ہی جیسی حقیقت کے ایک ہی جیسے اجزاء و حصے ہیں لہذا کسی کو کسی پر اپنا ارادہ و خواہش مسلط کرنے کا حق حاصل نہیں سوائے ان موارد کے کہ جن میں طرفین ایک دوسرے کو اپنے ارادہ و چاہت کے استعمال کا برابر و عادلانہ حق دیں اور اسے عملی طور پر بھی ثابت کریں کہ اسے ہی زندگی کی خصوصیات سے استفادہ کی بابت باہمی تعاون کہا جاتا ہے لیکن جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ پورا معاشرہ یا کوئی ایک فرد کسی فرد کے تابع فرمان ہو جائے یعنی تمام افراد یا بعض افراد کسی ایک فرد کے زیر دست ہوں کہ جس سے وہ فرد انسانیت کا جزء ہونے کے دائرہ سے باہر بالاتر حیثیت اختیار کر لے اور برتری و بالاتری اور آمرانہ و حاکمانہ تسلط کے ذریعے دیگر افراد بشر سے انسانی برابری سے مافوق درجہ مل جائے کہ اسے رب قرار دیتے ہوئے اس کی چاہت و فرمان کو لازم الاتباع سمجھا جائے اور اسے مطلق العنان حکمرانی کا حق دے کر اس کے ہر امر و نہی کی اطاعت و فرمانبرداری کی جائے تو اس سے فطرت کی سراسر نفی اور انسانیت کی بنیادوں کا منہدم ہو جانا لازم آتا ہے، یعنی تمام انسانی حقوق پامال ہو جائیں گے اور تخلیقی اقدار و اصول کی عملی نفی ہو جائے گی، اس کے ساتھ ساتھ یہ خرابی پیدا ہوگی کہ ربوبیت جو کہ خداوند عالم کے ساتھ مختص و مخصوص ہے کہ اس کے سوا کوئی رب نہیں اس کی نفی ہو جائے گی کیونکہ کسی انسان کا خود کو اپنے جیسے انسان کے اس طرح سپرد کر دینا کہ وہ اس کے بارے میں جو چاہے فیصلہ و اقدام کرے جبکہ اسے اس کے بارے میں کسی قسم کے فیصلہ و اقدام کا حق حاصل نہ ہو درحقیقت خدا کو چھوڑ کر کسی کو رب قرار دینے سے عبارت ہے کہ اس طرح کا کام کوئی مسلمان اور اپنے آپ کو خدا کے تابع فرمان سمجھنے والا شخص ہرگز نہیں کر سکتا۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ جملہ ”وَلَا يَتَّخِذُ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ“ دو

امور کو آشکار کرتا ہے:

(۱) تمام افراد بشر ایک ہی حقیقت کے اجزاء ہیں،

(۲) ربوبیت، الوہیت و خدائی کی خصوصیات و مخصوص صفات میں سے ہے۔

## مسلمان ہونے کا کھلا اعلان

○ ” فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ “  
(پس اگر وہ رخ موڑ لیں تو کہہ دو کہ تم گواہ رہو ہم مسلمان ہیں)

اس آیت مبارکہ میں مسلمان ہونے کے کھلم کھلا اعلان کے حوالہ سے کہا گیا ہے کہ اگر وہ لوگ (اہل کتاب) کلمہ توحید کی پیروی پر تمہارا ساتھ نہ دیں بلکہ روگردانی کر لیں تو کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔  
اس آیت میں اہل کتاب کو اس بات پر گواہ بنانے کا ذکر ہے کہ وہ یعنی نبی اور ان کے پیروکار اس دین پر ہیں جو خدا کا پسندیدہ ہے یعنی اسلام! کہ اسی کے بارے میں ارشاد الہی ہے: ” إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ “ (آل عمران، آیت ۱۹)..... بے شک اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے..... اس واضح اظہار کے بعد کسی کے جھگڑا کرنے اور بحث و تہجیس کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کیونکہ حق اور اہل حق کے مقابلہ میں کوئی حجت کارگر نہیں ہو سکتی، اور اس بیان میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ عبادت میں توحید و یکتا پرستی اسلام کے لازمی و بنیادی اصولوں و تقاضوں میں سے ہے۔

## اہل کتاب کی توبیخ

○ ” يَا هَلْ أَكْتَبَ لِمَ تَحَايُونَ فِي إِبْرَاهِيمَ..... الخ “  
(اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں محاجہ کرتے ہو..... الخ)

یہ جملہ بظاہر سابقہ آیت کے خطابي جملہ کا تتمہ ہے اور وہ جملہ بھی اسی طرح سے ہے جو چار آیات کے بعد آئے گا جس میں ان سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا: ” يَا هَلْ أَكْتَبَ..... “، تو اس طرح یہ خطابي جملہ دراصل حضرت رسول خدا کے لئے ہے کہ وہ اہل کتاب سے کہیں، اگر چہ دو آیتوں کے بعد جو جملہ ذکر ہوا ہے وہ بظاہر خدا کا کلام ہے نہ کہ رسول کا کلام کہ جو انہوں نے خدا کے اذن کے ساتھ فرمایا ہو، کیونکہ اس میں یوں ارشاد ہوا: ” إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوا وَهَذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا “ (بے شک لوگوں میں سے ابراہیم کے زیادہ حق دار وہ افراد ہیں جنہوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں)،

حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں حاجہ سے مراد یہ ہے کہ ہر گروہ انہیں اپنے ساتھ ملحق کرے اور یہ دعویٰ کرے کہ ابراہیمؑ ہم میں سے ہیں یعنی یہودی یہ کہیں کہ ابراہیمؑ کہ خدا نے جن کی تعریف اپنی کتاب میں کی ہے وہ ہم میں سے ہیں اور نصاریٰ یہ کہیں کہ ابراہیمؑ حق پر تھے اور عیسیٰؑ کے ظہور پذیر ہونے کے ساتھ ہی حق بھی ظہور پذیر ہو گیا لہذا ابراہیمؑ ہم میں سے تھے، ان دونوں کے اس طرح کے اظہارات کے بعد ان کے درمیان لجاجت و تعصب کی آگ بھڑک اٹھی چنانچہ یہودی صریح لفظوں میں ادعاء کرنے لگیں کہ ابراہیمؑ تھے ہی یہودی، اور نصاریٰ مدعی ہوں کہ ابراہیمؑ تھے ہی نصرانی، جبکہ وہ دونوں گروہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ یہودیت اور نصرانیت کا ظہور پذیر ہونا تورات و انجیل کے نزول کے بعد ہے اور وہ دونوں حضرات یعنی موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ، حضرت ابراہیمؑ کے بعد تشریف لائے، تو یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ انہیں یہودی قرار دیا جائے یعنی وہ اس دین کی پیروی کرنے والے ہوں جو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ مختص ہے، یا انہیں نصرانی کہا جائے یعنی وہ اس شریعت کے پیروکار ہوں جو حضرت عیسیٰؑ سے مختص ہے، بنا بریں حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں کچھ کہنا ہو تو ضروری ہے کہ یوں کہا جائے کہ وہ حق پر تھے (حق کے پیروکار تھے) اور خالص دین کی پیروی کرنے والے تھے، اور وہ ہر طرح کے باطل سے پاک، صرف حق کی راہ پر چلنے والے، خداوند عالم کے کامل فرماں بردار اور بارگاہ رب العزت میں سر تسلیم خم کرنے والے تھے، بہر حال زیر نظر آیات مبارکہ درج ذیل آیات شریفہ سے ہم رنگ وہم سیاق ہیں :

سورہ بقرہ، آیت : ۱۳۰

○ ” اَمْ تَقُولُونَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَاٰسَافَ وَاٰدَمَ كَانُوْا هٰنَدًا اَوْ نَصْرٰى قُلْ ؕ اَنْتُمْ اَعْلَمُوْا اِمَّا اللّٰهُ ۗ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ “

(کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اسباط، یہودی تھے یا نصرانی؟ ان سے کہو کہ آیات بہتر جانتے ہو یا اللہ؟ اور کون اس شخص سے بڑا ظالم ہو سکتا ہے جو اس خدائی گواہی کو چھپائے جو اس کے پاس ہے)

جانتے اور نہ جانتے ہوئے حاجہ؟

○ ” هَآنَتُمْ هٰؤُلَآءِ حَآجَجْتُمْ فِیْمَا لَكُمْ بِہٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِیْمَا لَیْسَ لَكُمْ بِہٖ عِلْمٌ.....“

(اب تم اس چیز کی بابت حاجہ کرتے ہو جس کا تمہیں علم ہے، تو جس کا تمہیں علم ہی نہیں اس کے بارے میں کیوں حاجہ کرتے ہو؟)

یہ آیت مبارکہ اہل کتاب (مجاہد کرنے والوں) کے لئے ایک علم کو ثابت کرتی ہے اور ایک علم کی نفی کرتی ہے اور جس علم کی ان سے نفی کرتی ہے اسے اللہ کے لئے ثابت کرتی ہے، اسی بناء پر مفسرین نے لکھا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ تم ابراہیم کے بارے میں مجاہد و جھگڑا کرتے ہو جبکہ تمہیں ان کے بارے میں معلوم ہے یعنی تم علم رکھتے ہو کہ وہ نبی بن کر آئے تھے، اور جس چیز کے حوالہ سے ان کے بارے میں تمہیں علم نہیں یعنی یہ کہ آیا وہ یہودی تھے یا نصرانی، تو اس سلسلہ میں کیوں مجاہد و نزاع کرتے ہو؟ اس سلسلہ میں اللہ کو علم ہے مگر تمہیں علم نہیں، لہذا اس کی بابت تمہارا بحث و مباحثہ اور نزاع و جھگڑا کرنا بیجا ہے، یا اس علم سے مراد یہ ہے کہ تم عیسیٰؑ اور ان کی نبوت کے بارے میں کچھ جانتے ہو اور اس بناء پر تم مجاہد و مناظرہ اور بحث و گفتگو کرتے ہو لیکن جس چیز کا تمہیں کوئی علم نہیں اور وہ یہ کہ آیا ابراہیم یہودی تھے یا نصرانی؟ تو اس سلسلہ میں کیوں جھگڑا کرتے ہو اور دلیلیں لانے کی کوشش کرتے ہو؟

یہ ہیں وہ دو معانی جو مفسرین نے آیت کی تفسیر میں ذکر کئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی آیت کے کے ظاہر السباق سے مطابقت نہیں رکھتا، اور وہ اس طرح کہ پہلے معنی کے تناظر میں دیکھیں تو اس کی آیت سے عدم مطابقت اس حوالہ سے ہے کہ ان کا مجاہد ابراہیمؑ کے وجود اور ان کی نبوت کے بارے میں نہیں ہوا، اور دوسرے معنی کے حوالہ سے دیکھیں تو حضرت عیسیٰؑ کی بابت ان کے درمیان جو مجاہد و بحث ہوئی وہ بے بنیاد و نادرست تھی کیونکہ انہوں نے ان کے بارے میں غلط عقیدہ پیش کیا اور جھوٹا دعویٰ کیا، لہذا یہ بات کیونکر درست ہو سکتی ہے کہ ان کا مجاہد یعنی بر علم تھا؟ لیکن کلام الہی یقینی طور پر ان کی طرف سے ایک مجاہد کا اثبات کرتا ہے کہ جو بنی بر علم تھا جیسا کہ ایک مجاہد کا اثبات کرتا ہے کہ جو بنی بر علم نہ تھا، یعنی آیات مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے اس چیز کی بابت مجاہد کیا جس کا انہیں علم تھا اور اس چیز کی بابت بھی مجاہد کیا جس کا انہیں علم نہ تھا، تو اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سا مجاہد تھا جس میں وہ علم رکھتے تھے؟ البتہ ظاہر الایۃ سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں مجاہدے خود اہل کتاب ہی کے درمیان واقع ہوئے نہ کہ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان! ورنہ مسلمانوں کا اس مجاہد میں غلطی پر ہونا ثابت ہو جائے گا جس میں اہل کتاب کو علم تھا، اور یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ جس کا واضح و آشکار ہونا مسلم ہے۔

تاہم اس موضوع کی بابت جو مطلب قابل ذکر ہے اور اسے آیت کی تفسیر میں پیش کیا جاسکتا ہے (واللہ العالم) وہ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کے درمیان تمام اختلافی مسائل میں سب سے زیادہ اہم موضوع حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا تھا کہ ان کی بابت نصاریٰ کہتے تھے کہ وہ یا تو خدا ہیں، یا خدا کا بیٹا ہیں یا تین خداؤں میں سے ایک ہیں، تو نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کی بعثت و نبوت کے بارے میں یہودیوں سے مجاہد و مباحثات کرتے تھے جبکہ انہیں آنجنابؑ کے بارے میں علم تھا، اور یہودی نصرائیوں سے مجاہد و مباحثات میں حضرت عیسیٰؑ کی خدائی اور نبوت اور تثلیث (یعنی تین خداؤں میں سے ایک ہونا) کو نادرست قرار دیتے تھے، جبکہ انہیں بھی آنجنابؑ کے بارے میں علم تھا، تو یہ تھا ان کا وہ مجاہد جس میں وہ علم رکھتے تھے، لیکن ان

دونوں کا وہ محاجہ جس میں وہ علم سے بے بہرہ تھے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں تھا کہ آیا وہ یہودی تھے یا نصرانی؟ اس سلسلہ میں وہ ہرگز علم نہ رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود آپس میں دست و گریباں رہتے تھے۔

اور ان کے حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں جاہل و لاعلم ہونے سے مراد یہ نہیں کہ وہ یہ نہ جانتے تھے کہ تورات و انجیل ابراہیمؑ کے بعد نازل ہوئیں کیونکہ یہ تو ایک واضح حقیقت ہے، اور نہ ہی ان کے جہل سے مراد یہ ہے کہ وہ اس امر سے غافل تھے کہ پہلے گزرا ہوا انسان بعد میں آنے والے کے تابع نہیں ہوتا کیونکہ یہ تو عقلی بات ہے اور ان لوگوں کے بارے میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ”أَفَلَا تَعْقِلُونَ“ (کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے)، اگر ان کے جہل سے مراد یہ لیا جائے کہ وہ سابق کے لاحق کا تابع نہ ہونے کی مسلمہ حقیقت سے غافل تھے تو اس سے جملہ ”أَفَلَا تَعْقِلُونَ“ بے نتیجہ ہوگا جو کہ صحیح نہیں کیونکہ اس جملہ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بات اس قدر واضح ہے کہ اسے سمجھنے میں معمولی سی توجہ ہی کافی ہے، لہذا ثابت ہوا کہ یہود و نصاریٰ کو علم تھا کہ حضرت ابراہیمؑ تورات و انجیل کے نازل ہونے سے پہلے تشریف لائے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اس امر سے غافل تھے کہ ان کے اس جاننے کا مطلب و نتیجہ یہ بنتا ہے کہ وہ نہ یہودی تھے اور نہ ہی نصرانی، بلکہ وہ خدا کے خالص دین یعنی اسلام پر تھے کہ جو اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دینے اور اس کی بارگاہ میں کامل سر تسلیم خم کرنے سے عبارت ہے، لیکن یہودی کہتے تھے کہ دین حق تو ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہودیت ہے لہذا ابراہیمؑ لامحالہ یہودی تھے، اور نصاریٰ نے بھی اسی طرح کی بات کی اور اسی بناء پر حضرت ابراہیمؑ کو نصرانی قرار دیا، تو درحقیقت وہ دونوں اس حوالہ سے جہالت کا شکار ہوئے نہ کہ غفلت کا، اور وہ یہ کہ خدا کا دین ایک ہے اور وہ یہ کہ کامل طور پر خدا کے حضور سر تسلیم خم کر دینا، اور وہ ایک ہی حقیقت ہے، ایک ہی دین و آئین ہے کہ جو مور زمانہ اور وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں کی استعداد اور صلاحیتوں کے تدریجی طور پر بسوئے کمال رواں دواں ہونے کے ساتھ خدا کی طرف سے کامل سے کامل تر ہوتا چلا گیا اور وہ دین واحد کہ جس کا نام اسلام ہے یہودیت و نصرانیت سے پہلے موجود تھا اور یہودیت و نصرانیت اسلام کے سلسلہء کمال و تکامل کی دو کڑیاں ہیں، دو شعبے ہیں، دو مرحلے ہیں، اور انبیاء علیہم السلام میں سے ہر ایک اس دین کی بنیادیں کھڑی کرنے والوں میں شامل ہے اور ان حضرات میں سے جس نے بھی اس دین کی اساس مضبوط کرنے اور اس کی سر بلندی میں جتنا کردار ادا کیا اسے اسکے مطابق درجہ و مقام حاصل ہے، گویا خداوند عالم نے ان میں سے ہر ایک کو دین کی بنیادیں مضبوط کرنے کے مرحلہ در مرحلہ عمل میں جو ذمہ داری عطا کی اس کے تناظر میں اسے عظمت و مقام اور منزلت حاصل ہوگئی اور وہ اسی مقام و منزلت کے حوالہ سے پہچانا گیا۔

خلاصہ کلام یہ کہ یہود و نصاریٰ اس اہم و بنیادی نکتہ سے جاہل رہے کہ اگر حضرت ابراہیمؑ کو اسلام کے ایک مرحلہ کی تائیس کا منصب حاصل ہوا اور وہ مؤسس اسلام کہلائے اور اسلام چونکہ حقیقی دین خداوندی ہے کہ جو دیگر مراحل میں

یہودیت و نصرانیت کے نام سے ظہور پذیر ہوا اور وہ دونوں نام دراصل دین اسلام ہی کے کمالی مرحلوں کے نام ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ کو یہودی یا نصرانی قرار دیا جائے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ خالص مسلمان تھے اور انہیں اسی اسلام کے نام کی نسبت سے پہچانا گیا کہ انہوں نے خود جس کی تائیس کی، وہ اسلام دراصل اپنے بعد کے کمالی مراحل یعنی یہودیت و نصرانیت کی اصل و اساس ہے، ورنہ ان دونوں کی اپنی استقلالی حیثیت کچھ نہ تھی کیونکہ ان کی نسبت اپنی اصل کی طرف تھی اور یہ مسلمہ قاعدہ کلیہ ہے کہ ہمیشہ فرع اپنی اصل کی طرف منسوب ہوتی ہے کوئی اصل اپنی فرع کی طرف منسوب نہیں ہوتی، بنا بریں ضروری ہے کہ یہودیت و نصرانیت کو اسلام کی طرف منسوب کیا جائے اور اسلام سے ان کا جو رشتہ ناطہ ہے اسی حوالہ سے بات کی جائے نہ یہ کہ اس کے برعکس بات ہو۔

### ایک اہم سوال اور اس کا جواب

اس مقام پر عین ممکن ہے یہ سوال پیدا ہو کہ اگر اسلام اصل ہے اور دیگر ادیان اس کی فرع ہیں تو اس بناء پر حضرت ابراہیمؑ کو بھی مسلمان کہنا درست نہ ہوگا کیونکہ جس طرح یہودیت و نصرانیت حضرت ابراہیمؑ کے بعد ظہور پذیر ہوئیں اسی طرح اسلام یعنی شریعت محمدیہؐ بھی حضرت ابراہیمؑ کے بعد بلکہ یہودیت و نصرانیت کے بھی بعد ظہور پذیر ہوئی، اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو مسلمان کے نام سے موسوم کرنا ان کے شریعت محمدیہؐ کا پیروکار ہونے کو ثابت نہیں کرتا کیونکہ ”اسلام“ سے شریعت محمدیہؐ یا شریعت قرآن مراد لیما نزول قرآن اور پیغام محمدیؐ کے وسیع پیمانہ پر پھیل جانے کے بعد ہوا اور وہ ”اسلام“ کہ جس کی توصیف حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام نے فرمائی اس سے مراد خداوند عالم کی بارگاہ ذی جاہ میں کامل تسلیم اور اس کے مقام ربوبیت کے سامنے خاضع ہو جانا ہے جو کہ اصل دین الہی ہے، لہذا اس حوالہ سے کسی اعتراض کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

اور جہاں تک ان کے جہل کی بابت ہمارے مذکورہ بالا بیان کا تعلق ہے کہ وہ حقیقی دین سے نا آگاہ تھے جو کہ ایک ایسی حقیقت واحدہ ہے جو مختلف مراتب و درجات کی حامل اور تدریجی طور پر مرحلہ بہ مرحلہ کمال کو پہنچتی ہے، تو شاید اسی کا اشارہ جملہ ”وَ اللّٰهُ یُعَلِّمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ مَا كَانَ لِاِبْرٰهٖمَ یَهُودِیًّا.....“ میں ہوا ہے، اور اس کی تائید آیت مبارکہ : ”اِنَّ اَوْلٰی النَّاسِ بِاِبْرٰهٖمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ.....“ سے ہوتی ہے اور درج ذیل آیت کہ جو زیر بحث آیت مبارکہ کے بعد والی آیات میں سے ہے اس میں بھی اس کی تصدیق و تائید پائی جاتی ہے :

”قُلْ اَمَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنزِلَ عَلَیْنَا وَمَا اُنزِلَ عَلٰی اِبْرٰهٖمَ وَاِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَاٰلِ سَبَاطِ

وَمَا أَوْقَىٰ مُؤْمَسِي وَعَيْسَىٰ وَالنَّبِيِّونَ مِنْ رَبِّهِمْ إِلَّا نَفَقَتِي بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿۶۳﴾ وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ ۚ (آل عمران، آیت ۸۵)

(کہہ دو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا اور جو ابراہیم و اسماعیل و اسحاق و یعقوب و اسباط پر نازل کیا گیا، اور جو کچھ موسیٰ و عیسیٰ اور نبیوں کو ان کے پروردگار کی طرف سے عطا کیا گیا، ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم تو خدا کے حکم پر سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں (اسلام پر ہیں یعنی مسلمان ہیں)، اور جو شخص اسلام کے علاوہ کسی دین کو چاہے تو اس سے وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا)۔  
اس آیت کی تفسیر عنقریب پیش ہوگی۔

### ابراہیمؑ کے یہودی و نصرانی ہونے کی نفی

○ ” مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمٌ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا“  
(ابراہیم نہ یہودی تھا اور نہ نصرانی..... الخ)

اس آیت کی تفسیر سطور بالا میں ہو چکی ہے، اس موضوع کی بابت بعض حضرات کا کہنا ہے کہ جس طرح یہودی و نصرانی یہ دعویٰ کرتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ ان میں سے تھے اور ان کے دین پر تھے اسی طرح زمانہ جاہلیت کے بت پرست عرب بھی مدعی تھے کہ وہ خالص دین یعنی دین ابراہیمیؑ پر ہیں (دین حنیف جو کہ دین ابراہیمؑ ہے اس کے پیروکار ہیں) چنانچہ اسی بناء پر اہل کتاب انہیں ”حنفاء“ کے لقب سے یاد کرتے تھے اور ”حنیفیت“ سے وحمیت یعنی بت پرستی مراد لیتے تھے۔ اور جب خداوند عالم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ”حنیف“ کے لقب سے یاد کیا اور ارشاد فرمایا: ”وَلٰكِنْ كَانَ حَنِيفًا“ (لیکن وہ حنیف تھا) تو ضروری تھا کہ حنیف کے معنی کی وضاحت ہو، تاکہ اس سے بت پرستی کا تصور پیدا نہ ہو، لہذا اس کے فوراً بعد ارشاد فرمایا: ”مُسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ“ (مسلمان تھا اور مشرکوں میں سے نہ تھا) یعنی وہ خدا کے پسندیدہ دین یعنی اسلام پر تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا جیسا کہ جاہل عرب ہیں۔

## ابراہیم کے حقداروں کا تعین

○ ” إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوا وَهَذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا “  
(بے شک ابراہیم کے زیادہ حقدار وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لائے)

یہ آیت مبارکہ سابق الذکر مطلب کی وجہ و سبب اور زیر بحث موضوع میں حقیقت الامر کو بیان کرتی ہے، لہذا اس کا معنی (واللہ العالم) یہ ہے کہ اس جلیل القدر نبی یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قیاس ان لوگوں کے ساتھ کیا جائے جو ان کے بعد آئے خواہ وہ اس کے دین کے پیروکار ہوں یا ان کے علاوہ ہوں تو حق یہ ہے کہ انہیں (حضرت ابراہیم کو) اپنے بعد میں آنیوالوں کا تابع و پیروکار قرار نہ دیا جائے بلکہ اس سلسلہ میں انہی کی ذات کو معیار قرار دے کر ان سے اولویت و اقرابت کے حامل افراد کا تعین کیا جائے۔ بنا بریں اس صاحب شریعت و صاحب کتاب نبی سے زیادہ قرب کے حامل وہی لوگ ہوں گے جو حق کی پیروی میں اس کے ساتھ ساتھ شانہ بہ شانہ شریک ہوں اور جو دین وہ لائے اس کی کامل پیروی کریں، اس معنی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اولویت اور اقرابت حضرت پیغمبر اسلام اور ان کے ساتھ دیگر ایمان لانے والے حضرات کو حاصل ہوگی کیونکہ وہی سب اس اسلام پر ہیں جس پر خداوند عالم نے ابراہیم کو برگزیدہ فرمایا، اسی طرح وہ لوگ بھی آنجناب سے اولی و اقرب ہوں گے جو ان کی پیروی کریں گے نہ کہ وہ لوگ جو آیات الہی کا انکار اور حق کو باطل کا روپ دینے کے مرتکب ہوں۔

اور جملہ ”لَلَّذِينَ اتَّبَعُوا“ میں کنایہ و اشارہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کو مطلع و آگاہ کیا گیا ہے کہ تم ابراہیم کے حقدار اور ان کی نسبت اولویت و اقرابت کے حامل نہیں ہو کیونکہ تم نے اسلام اور اللہ تعالیٰ کے حضور تسلیم ہونے میں ان کی پیروی نہیں کی۔

اور جملہ ”وَهَذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا“ میں حضرت پیغمبر اسلام اور ان کے پیروکار و مؤمنین کو حضرت ابراہیم کے پیروکاروں میں سے انفرادیت کے ساتھ ذکر کرنے کی اصل وجہ آنحضرت کی تحلیل و تکریم کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ آپ کے لئے ”پیروکار“ ہونے کا لفظ استعمال نہ ہو کیونکہ آپ کا عظیم رتبہ و بلند مقام اس کا متقاضی ہے کہ اس طرح کے الفاظ کا اطلاق آپ پر نہ ہو، جیسا کہ اسی مطلب کا اشارہ درج ذیل آیت مبارکہ میں بھی پایا جاتا ہے:



سورۃ انعام، آیت: ۹۰:

○ ”أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَىٰ اللَّهُ فَبِهِدَاهُمُ اقْتَدَا“

(یہی وہ لوگ ہیں جنہیں خدا نے ہدایت کی، تو آپ ان کی ہدایت کی اقتداء کریں)

اس میں ”فہم اقتدہ“ (ان کی اقتداء کریں) کی بجائے ”فہداهم اقتدَا“ (ان کی ہدایت کی اقتداء کریں) کہا گیا ہے کیونکہ یہ جملہ ”فہم اقتدہ“ میں افراد و اشخاص کی اقتداء جبکہ دوسرے جملہ ”فہداهم اقتدَا“ میں اصل ہدایت الہی کی اقتداء و مطلوب مذکور ہے۔

اس آیت میں موضوع کی تکمیل اور مطالب کی تعلیل کا بیان اس جملہ پر تمام ہوتا ہے: ”وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ“ (اور اللہ مومنین کا ولی و حاکم ہے) کیونکہ ابراہیمؑ کی ولایت (یعنی ان کا ولی اللہ ہونا) کا سرچشمہ خدا کی ولایت ہے اور خدا ایمان والوں کا ولی و حاکم ہے نہ کہ ان کے علاوہ ان لوگوں کا جو خدا کی آیات کا انکار کرتے ہیں اور حق کو باطل کے روپ میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

## اہل کتاب کی ناحق خواہش و کوشش

○ ”وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَو يُضَلُّوكُمْ ۖ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ“

(اہل کتاب کے ایک گروہ کی خواہش ہے کہ وہ تمہیں گمراہ کر دیں، جبکہ وہ کسی کو گمراہ نہیں کرتے سوائے اپنے آپ کے، اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے)

عربی زبان میں لفظ ”طَّآئِفَةٌ“ کا معنی گروہ، چند لوگ ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ لوگ بالخصوص عرب اس زمانہ میں گروہ گروہ اور قبیلہ قبیلہ ہو کر بدوی و صحرائی طرز زندگی اپنائے ہوئے تھے، اور آب و دانہ کی تلاش میں اپنے مویشیوں کے ہمراہ گرمیوں اور سردیوں میں مختلف مقامات کو جایا کرتے تھے اور وہ ڈاکوؤں اور دشمنوں سے بچنے کے لئے گروہ گروہ بن کر چکر کاٹتے رہتے تھے لہذا اس حوالہ سے ہر گروہ کو ”طَّآئِفَةٌ“ کہا جانے لگا، پھر رفتہ رفتہ یہ لفظ اپنے صفتی معنی سے قطع نظر دلائلی معنی پر استعمال ہوتے ہوئے ”گروہ“ کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔

اس آیت مبارکہ میں اہل کتاب کے بارے میں ارشاد رب العزت ہے کہ وہ اپنے علاوہ کسی کو گمراہ نہیں کرتے

(يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی فضیلتوں کی پہلی کڑی حق کی طرف میلان اور اس کا اتباع و پیروی کرنا ہے، بنا بریں لوگوں کو حق سے پھیر کر باطل کی طرف لانے کی خواہش و چاہت چونکہ انسان کے باطنی اطوار و اندرونی صفاتی کیفیات میں سے ہے لہذا وہ ایک نفسانی رزیت و پست صفت ہے (جو کہ نہایت پست صفت ہے اور اس سے زیادہ پست صفت اور کیا ہو سکتی ہے) اور نفسانی گناہوں و معصیوں اور ناحق و بغاوتوں و پلید چاہتوں میں سے ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ حق کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ گمراہی کے سوا کچھ نہیں، لہذا اہل کتاب کا مؤمنین کو جو کہ حق پر ہیں گمراہ کرنے کی خواہش کرنا اور انہیں حق سے منحرف کر دینے کی چاہت بعینہ اپنے آپ کو گمراہ کرنے کی خواہش اور حق سے منحرف دروگرداں ہونے کی چاہت ہے البتہ وہ خود اس کا شعور نہیں رکھتے۔

اور اسی طرح اگر وہ کسی کے دل میں شبہ ڈال کر اسے گمراہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو دراصل انہوں نے سب سے پہلے اپنے آپ کو گمراہ کیا کیونکہ انسان جو بھی عمل انجام دے خواہ خیر ہو یا شر، وہ خود اپنے ہی لئے انجام دیتا ہے یعنی اس کا نفع و نقصان خود اسے ہی ہوتا ہے، چنانچہ ارشاد الہی ہے:

سورہ تم سجدہ، آیت: ۳۶

○ ” مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ ۝ “  
(جو شخص نیک عمل انجام دے وہ اس کے اپنے لئے فائدہ مند ہے اور جو شخص برا عمل کرے تو اس کا نقصان خود اسے ہی ہوگا، اور تیرا پروردگار بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں)

اگر کوئی شخص اہل کتاب کو گمراہ کرنے کی وجہ سے گمراہ ہوا تو وہ ان کے گمراہ کرنے کے نتیجہ میں نہیں ہوا بلکہ اپنے برے عمل اور پست و پلید ارادہ کے نتیجہ میں ہوا جو کہ خداوند عالم کے مقررہ اصولوں کے عین مطابق ہے (یعنی خدا نے یہ اصول مقرر کیا ہے کہ جو شخص بری نیت و برے عمل کا مرتکب ہوگا وہ حق سے دور ہو جائے گا اور باطل کی پستی و پلیدی اس کے دامن گیر ہو جائے گی، م) چنانچہ خدا کا ارشاد ہے:

سورہ روم، آیت: ۴۴

○ ” مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۖ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلَا نُفْسِهِمْ يَهْدُونَ ۝ “  
(جو شخص کفر اختیار کرے تو اس کا کفر اس کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگا اور جو شخص نیک عمل انجام دے تو اس طرح کے لوگ اپنے لئے توشیحہ آخرت جمع کرتے ہیں)

سورہ شوریٰ، آیت: ۳۱

○ ” وَمَا أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ آيَاتِكُمْ وَيَعْتَفُونَ عَنْ كَثِيرٍ ۖ وَمَا أَنْتُمْ بِبِعْزِزِينَ فِي

الْأَرْضِ ۗ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ۗ“

(جو مصیبت تم پر آئے وہ تمہارے ان اعمال کی وجہ سے ہوتی ہے جو تم نے خود اپنے ہاتھوں انجام دیئے، خدا تو

تمہارے کثیر گناہوں سے درگزر کرتا ہے، اور تم اپنی ان نافرمانیوں کی وجہ سے کہ روئے زمین پر جن کا ارتکاب

کرتے ہو خدا کو عاجز و ناتواں نہیں کر سکتے اور خدا کے علاوہ کوئی بھی تمہارا دلی مددگار نہیں)

اعمال کی خصوصیات و آثار کے بارے میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۷ ” حِطَّتْ أَعْيَابُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ“

کی تفسیر میں بعض مطالب بیان کئے جا چکے ہیں۔

بہر حال جملہ ” وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ“ کی تفسیری بحث میں جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے وہ

ان قرآنی معارف کا حصہ ہے جو افعالی توحید کے معنی و مفہوم سے حاصل ہوتے ہیں اور یہ بات واضح ہے کہ افعالی توحید

خداوند عالم کی علی الاطلاق ربوبیت و مالکیت کی فرع اور اس کی وسیع و جامع حقیقت کا مربوطہ حصہ ہے۔

بنا بریں زیر بحث آیت مبارکہ سے جو انحصاری معنی ظاہر ہوتا ہے اس کی توجیہ و تاویل ممکن و آسان ہو جاتی ہے، اور

دیگر مفسرین کرام نے اس آیت مبارکہ کے معنی کی بابت جو توجیہات ذکر کی ہیں وہ مذکورہ انحصاری معنی کی وضاحت کی بابت

کافی نہیں اور نہ ہی ان سے موضوع کی مربوطہ جہات کے آشکار ہونے میں مدد ملتی ہے، لہذا ہم نے ان کو یہاں ذکر کرنے سے

اجتناب برتا ہے۔

## اہل کتاب کو تنبیہ

○ ” يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأَنْتُمْ تَسْهَدُونَ“

(اے اہل کتاب تم خدا کی نشانیوں کا انکار کیوں کرتے ہو حالانکہ تم گواہ ہو)

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اللہ کی آیات کا انکار، خود اللہ کے انکار سے مختلف ہے کیونکہ خدا کا انکار کرنے سے مراد صریح

طور پر عقیدہ رکھنا ہے کہ خدائے یکتا کا کوئی وجود ہی نہیں جیسا کہ دشمنوں (بت پرستوں) اور دہریوں کا عقیدہ ہے اور آیات الہی

کا انکار کرنے سے مراد یہ ہے کہ حق کے واضح و آشکار ہونے اور حقیقت الامر سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد معارف الہیہ

میں سے کسی ایک کو قبول کرنے سے انکار کیا جائے، تو جہاں تک اہل کتاب کا تعلق ہے تو وہ عالم ہستی میں خدائے یکتا کے وجود کا انکار نہیں کرتے بلکہ وہ ان امور و حقائق کا انکار کرتے ہیں جن کا واضح ثبوت ان پر اور ان کے علاوہ دیگر اقوام پر نازل ہونے والی آسمانی کتب میں موجود ہے مثلاً حضرت پیغمبر اسلام محمد مصطفیٰ کی نبوت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بندہ خدا اور خدا کی طرف سے رسول ہونا، حضرت ابراہیم کا یہودی و نصرانی نہ ہونا، خدا کے ہاتھ کا ہمیشہ کھلا ہونا (قدرت خداوندی کی وسعت) اور خداوند عالم کا غنی و بے نیاز ہونا وغیرہ، تو قرآن کی زبان میں اہل کتاب کو ”آیات الہی کا انکار کرنے والے“ کہا گیا ہے نہ کہ خدا کا انکار کرنے والے! اور اس سے اس آیت کی نفی نہیں ہوتی جس میں خدانے ارشاد فرمایا:

سورۃ توبہ، آیت: ۲۹

○ ” قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ “

(اہل کتاب میں سے ان لوگوں سے قتال کرو جو خدا اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے اور نہ اللہ اور اس

کے رسول کے حرام کئے گئے کاموں (یا چیزوں) کو حرام قرار دیتے ہیں اور نہ ہی دین حق کو قبول کرتے ہیں)

اس آیت میں ان سے صریح الفاظ میں ایمان کی نفی کی گئی ہے کہ جسے ”کفر“ کہا جاتا ہے لیکن اس سے مراد خدا کا

انکار نہیں بلکہ آیات خدا کا انکار ہے کیونکہ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ خدا کے حرام کردہ کو حرام قرار نہیں دیتے اور دین حق کو

دین نہیں مانگتے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہیں غیر مومن کہنے سے مراد ان کے لازم الحال کو ظاہر کرنا ہے کیونکہ ان کی طرف

سے آیات الہی کے انکار کا لازم الحال، اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہ لانا ہے، اگر وہ خود اس کا شعور نہیں رکھتے اور انہیں

اس کی سمجھ ہی نہیں ہے، یعنی وہ خود بھی اس امر کا ادراک نہیں رکھتے کہ اس طرح وہ خدا کا انکار کرتے ہیں بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ

خدا پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن ظاہر بظاہر وہ آیات الہی کا انکار کرتے ہیں اور صریح الفاظ میں خدا کا انکار نہیں کرتے۔

اور جملہ ”وانتم تشهدون“ میں شہادت یعنی گواہی کا ذکر ہوا ہے جس کا معنی حضور اور وہ علم ہے جس کا سرچشمہ

”حس“ ہو، اس سے صاف ظاہر بلکہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے آیات خداوندی کا انکار کرنے سے مراد حضرت خاتم الانبیاء

محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنا ہے جبکہ تورات و انجیل میں آنحضرت کی آمد کی بشارت موجود ہے اور جو

نشانیوں ان کتابوں میں آنحضرت کے بارے میں ذکر کی گئی ہیں وہ سب آپ پر منطبق ہوتی ہیں۔

اس بیان سے بعض مفسرین کا یہ کہنا بھی نادرست ثابت ہو گیا کہ یہاں لفظ ”آیات“ عمومیت رکھتا ہے اور

اس سے تمام آیات مراد ہیں لہذا اسے آیات نبوت سے مخصوص و مختص کرنا درست نہیں بلکہ ان کے کفر سے مراد تمام آیات کا

انکار کرنا ہے۔ اس قول کی نادرستی واضح و ظاہر ہے۔

## ایک بار پھر اہل کتاب کی سرزنش

○ ”يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ.....“  
(اے اہل کتاب تم حق کو باطل کے روپ میں کیوں پیش کرتے ہو.....)

”تَكْفُرُونَ“ فعل مضارع، کا مصدر ”كَبَسَ“ (لام پر زبر کے ساتھ) ہے جس کا معنی غلط فہمی پیدا کرنا، دل میں شبہ ڈالنا اور حق کو باطل یا باطل کو حق کی صورت میں پیش کرنا ہے، تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ اے اہل کتاب، تم حق کو باطل کی شکل میں کیوں پیش کرتے ہو؟

اور جملہ ”وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ“ میں اس بات کا ثبوت یا اشارہ پایا جاتا ہے کہ ”لبس“ سے مراد دینی معارف و حقائق پر پردہ ڈالنا ہے اس سے مراد ان آیات کو چھپانا نہیں جو مشاہدہ میں آتی ہیں مثلاً وہ آیات کہ جن کی انہوں نے خود ہی تحریف کی یا ان کا کتمان کیا یا ان کے غیر مراد معانی سے ان کی تفسیر کی۔

یہ دو آیتیں یعنی ”يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ“ ○ ”يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْفُرُونَ الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ“ دراصل آیت مبارکہ ”وَدَّتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّوكُمْ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ“ کا ترجمہ ہے۔

بنابراین اہل کتاب کے بعض افراد کی غلط کاریوں کی بناء پر تمام اہل کتاب کو مورد عتاب و سرزنش قرار دینا اس حوالہ سے ہے کہ وہ سب طبیعت و نسل و صفات میں ایک جیسے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے برے اعمال سے راضی ہوتے ہیں، چنانچہ اس طرح کی نسبتیں قرآن مجید میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

## اہل کتاب کے ایک گروہ کا بیان

○ ”وَقَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِاللَّهِ.....“  
(اور اہل کتاب کے ایک گروہ نے کہا کہ تم ایمان لاؤ اس پر جو.....)

آیت مبارکہ میں لفظ ”وَجَهَ النَّهَارِ“ (دن کا چہرہ) ذکر ہوا ہے اور اس کے مقابلے میں ”اِخْرَآءَ“ کے الفاظ

استعمال ہوئے ہیں جس سے اس امر کا اشارہ ملتا ہے کہ ”وَجْهَ النَّهَارِ“ سے مراد دن کی ابتدائی گھڑیاں ہیں کیونکہ کسی چیز کا ”وَجْهٌ“ یعنی چہرہ ہی وہ پہلی چیز ہے جو دیکھنے والے کے سامنے اس چیز کا تشخص و تعین یقینی بناتا ہے، اس بناء پر دن کا چہرہ دراصل اس کی وہ ابتدائی گھڑیاں ہیں جن سے اس کا آغاز ہوتا ہے اور وہ اس کا تعین کرتی ہیں، اہل کتاب کے سیاق کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ پر دن کی ابتدائی گھڑیوں میں جو وحی آتی تھی وہ ان کے عقیدہ سے مطابقت رکھتی تھی اور دن کے آخری لمحات میں جو وحی نازل ہوتی تھی وہ ان کے عقیدہ کے مخالف ہوتی تھی، اسی وجہ سے وہ کہتے تھے کہ جو وحی دن کی ابتداء میں نازل ہو اس پر ایمان لاؤ اور جو دن کے آخری لمحوں میں نازل ہو اس کا انکار کرو۔

بناء پر اس جملہ ”بِالَّذِي نَزَّلَ عَلَيَّ الْآيَاتِ آمَنُوا“ سے مراد وحی کا وہ خاص حصہ ہے جو اہل کتاب کے عقائد سے مطابقت رکھتا تھا، اور جملہ ”وَجْهَ النَّهَارِ“ ظرف (ظرف زمان) ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور اس کا تعلق جملہ ”انزل“ سے ہے نہ کہ جملہ ”آمَنُوا“ (صیغہ امر) سے! کیونکہ وہ اس سے زیادہ قریب ہے (اور ادبی اصولوں کی روشنی میں جملوں کے ارتباطی حوالہ کا تعین قرب کی بناء پر ہوتا ہے)۔ اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہوگا: ”تم ایمان لاؤ اس پر جو دن کی ابتدائی گھڑیوں میں نازل ہو (آمَنُوا بِالَّذِي نَزَّلَ عَلَيَّ الْآيَاتِ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ) اور جملہ ”وَكَفَرُوا الْآخِرَةَ“ کا معنی یہ ہوگا کہ جو کچھ دن کے آخری لمحات میں نازل ہو اس کا انکار کر دو (واكفروا بما انزل في الآخرة)؛ ”دن کے آخری لمحوں میں“ ایسا ظرف ہے جو مجاز عقلی کی بناء پر اپنے مطرف کی جگہ پر آیا ہے..... اس کی بابت عقلی قرینہ موجود ہے..... چنانچہ اس کی مثال درج ذیل آیت مبارکہ ہے:

سورۃ سبأ، آیت: ۳۳

○ ”بَلْ مَكْرُؤًا بَيِّنًا وَاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ“  
(بلکہ شب و روز نے چال چلی)

اس میں چال چلنے کی نسبت بظاہر لیل و نہار کی طرف دی گئی ہے جبکہ حقیقت میں یہ طرف زمان ہے یعنی دن اور رات میں چال چلی گئی نہ کہ خود دن اور رات نے چال چلی ہو۔

اس بیان کی تصدیق و تائید ان روایات سے ہوتی ہے جو آیات کے شان نزول کی بابت آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے وارد ہوئی ہیں، ان روایات میں مذکور ہے کہ اہل کتاب نے یہ بات اس وقت کہی جب قبلہ کی تبدیلی کا حکم نازل ہوا، آنحضرتؐ نے صبح کی نماز بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھی جو کہ یہودیوں کا قبلہ تھا، پھر جب قبلہ کی تبدیلی کا حکم آیا تو آپؐ نے ظہر کی نماز کعبہ کی طرف رخ کر کے ادا کی، اس وقت یہودیوں میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ ”آمَنُوا بِالَّذِي نَزَّلَ عَلَيَّ الْآيَاتِ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ“ جو کچھ ایمان لانے والوں پر صبح کے وقت نازل ہو اس پر ایمان لے آؤ، اس

بیان سے ان کا مقصد بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا تھا، ”وَ اَكْفُرُوا بِالْاٰخِرَةِ“ (اور جو دن کے آخر میں نازل ہوا اس کا انکار کرو) اس سے مراد کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا تھا۔

اس مطلب کی تائید ان کے بعد آنے والے بیان سے بھی ہوتی ہے جس میں انہوں نے کہا: ”وَلَا تُؤْمِنُوْا اِلَّا بِمَا نَزَّلْنَا بِرُوحِنَا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ“ اور تم صرف اس کی بات پر ایمان لاؤ جو تمہارے دین کا پیروکار ہو۔ یعنی جو تمہارے دین کی پیروی نہیں کرتا اس پر اعتماد و بھروسہ کر کے اس پر ایمان نہ لاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اسرار اس پر عیاں ہو جائیں اور وہ بشارتیں و خوشخبریاں جو تمہارے پاس ہیں وہ آشکار ہوں اور ان بشارتوں میں نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کی نشانیوں میں سے ایک یہ ذکر کی گئی ہے کہ قبلہ تبدیل ہو جائے گا اور کعبہ کو قبلہ قرار دیا جائے گا۔

### وجہ النہار کے بارے میں بعض مفسرین کی رائے

لفظ ”وَجَّةَ النَّهَارِ“ کے بارے میں بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس کا تعلق صیغہ امر ”اٰمِنُوْا“ سے ہے اور اس سے مراد ابتدائے روز ہے، اور لفظ ”اٰخِرَةَ“ میں حرف ”فی“ محذوف ہے اور اس کا تعلق ”وَ اَكْفُرُوا“ سے ہے یعنی ”وَ اَكْفُرُوا فِيْ اٰخِرَةِ“، اور ”اٰمِنُوْا بِالَّذِيْ اُنزِلَ.....“ سے مراد یہ ہے کہ دن کی ابتداء میں کچھ لوگ قرآن پر ایمان لے آئیں اور ایمان لانے والوں کے ساتھ مل جائیں، پھر دن کے آخری لمحوں میں مرتد ہو جائیں یعنی اس کا انکار کر دیں اور یہ کہیں کہ وہ دن کی ابتداء میں جب ایمان لائے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں دعوت اسلام کی صحت و صداقت کی نشانی دکھائی دے رہی تھی لیکن دن کے آخر میں اس لئے انکار کیا کہ ان پر واضح ہو گیا کہ وہ غلط و نادرست تھا اور نبوت کی جو نشانیاں اور حقانیت کی جو بشارتیں ان کے پاس تھیں وہ نبی پر منطبق نہیں ہوئیں، تو یہ وہ چال تھی جو اہل کتاب نے چلی اور اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح مؤمنین اپنے دین کے بارے میں شک کا شکار ہو جائیں گے اور ان کے پختہ ارادے کمزور پڑ جائیں گے جس کے نتیجے میں ان کی قوت ختم ہو جائے گی اور ان کا مشن ناکام ہو جائے گا۔

یہ رائے فی نفسہ بعید از قیاس نہیں اور عین ممکن ہے کہ یہودیوں نے اس طرح کی چال چلی ہو کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے اسلام کے خلاف سازشیں کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی، بلکہ ہر ممکن طریقہ و حیلہ سے شیخ اسلام کو گل کرنے کی کوشش کی لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آیت مبارکہ کے الفاظ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ آیت کے الفاظ یہودیوں کی ممکنہ مذکورہ سازش کے وقوعی پہلو سے مطابقت نہیں رکھتے.....، بہر حال اس بحث کا تتمہ عنقریب ”روایات پر ایک نظر“ کے عنوان میں پیش کیا جائے گا، انشاء اللہ تعالیٰ،

## دوقول اور ان کی تحقیق

- (۱) بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ان کے بیان سے مراد یہ ہے کہ کعبہ کی طرف نماز پڑھنے کے حکم پر دن کی ابتداء میں ایمان لاؤ اور دن کے آخر میں اس کا انکار کر دو تا کہ وہ یعنی مومنین بھی اسلام سے روگردانی کر لیں،
- (۲) بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ان کے بیان کا معنی یہ ہے کہ تم نے چونکہ پہلے آخری نبی کی صفات کے حوالہ سے ان پر ایمان لانے کا اقرار کیا تھا لہذا اب اسی کی بناء پر دن کی ابتداء میں اس پر ایمان لے آؤ اور دن کے آخر میں یہ کہہ کر اس کا انکار کر دو کہ نبی آخر الزماں کے بارے میں جو صفات ہماری کتب میں مذکور ہیں وہ اس نبی (محمد) پر منطبق نہیں ہوتیں، اس طرح ممکن ہے کہ اس پر ایمان لانے والے شک میں مبتلا ہو جائیں اور پھر اپنے دین سے منہ پھیر لیں۔
- یہ دو قول آیت کے معنی کی بابت ذکر کئے گئے ہیں لیکن اس حوالہ سے تحقیقی بیان یہ ہے کہ آیت کے ظاہری الفاظ سے ان میں سے کسی کی صحت کی گواہی نہیں ملتی۔
- بہر حال اہل کتاب کے بیان سے مراد جو کچھ بھی ہو لیکن آیت میں اجمال نہیں پایا جاتا۔

## اہل کتاب کا تاکید و توضیحی بیان

○ ” وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِينَكُمْ“

(اور کسی پر ایمان نہ لاؤ سوائے اس کے کہ جو تمہارے دین کی پیروی کرے.....)

سیاق کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جملہ ” وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِينَكُمْ“ اہل کتاب ہی کا بیان ہے جو کہ ان کے اس بیان کا تتمہ ہے: ” اٰمِنُو بِالَّذِيْٓ اُنزِلَ عَلٰی الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجِهَ النَّهَارِ وَاَكْفُرُوْا بِالْاٰخِرَةِ“، اور اس کا تعلق ان کے اس بیان سے بھی ہے: ” اَنْ يُؤْتٰى اَحَدٌ مِّثْلَ مَا اُوْتِيْتُمْ اَوْ يٰحَا جُوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ“، جبکہ اس کے بعد والا جملہ ” قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هَدٰى اللّٰهُ“ جو کہ جملہ معترضہ ہے وہ خداوند عالم کی طرف سے ان کے تمام بیانات ” اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنزِلَ عَلٰی الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا“ سے ” لِمَنْ تَبِعَ دِينَكُمْ“ تک کا جواب ہے، اس طرح جملہ ” قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ“ خدا کی طرف سے ان کے اس بیان کا جواب ہے ” اَنْ يُؤْتٰى اَحَدٌ مِّثْلَ مَا اُوْتِيْتُمْ.....“



تو یہ سب کچھ درحقیقت کلام کے اجزاء کی ترکیب و ترتیب کے باہمی ارتباط اور دونوں آیتوں کے معانی کی ہم رنگی و یک رنگی اور اس کے ساتھ ساتھ ان دو آیتوں کے تناظر میں ان آیات پر نگاہ کرنے سے مستفاد ہے جن میں یہودیوں کے جدالی افکار اور سازشی مزاج کے عکاس اقوال ذکر کئے گئے ہیں۔

بہر حال آیت مبارکہ کا معنی..... واللہ اعلم..... یہ ہے کہ اہل کتاب کا ایک گروہ..... یعنی یہودیوں نے کہا۔ یعنی ایک دوسرے سے کہا: ”تم نبی اور ان پر ایمان لانے والوں کی تصدیق کرو لیکن صرف ان کی ابتدائے روز میں بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کی بابت! اور انہوں نے دن کے آخر میں کعبہ کی طرف رخ کر کے جو نمازیں پڑھیں ان کی بابت ان کی تصدیق نہ کرو اور تم اس سلسلہ میں بات کرنے میں کسی پر بھروسہ و اعتبار نہ کرو ورنہ وہ مؤمنوں کو بتادیں گے کہ جس نبی کے آنے کی بشارت دی گئی تھی اس کی نبوت کے دلائل و شواہد میں سے ایک یہ ہے کہ قبلہ بیت المقدس سے کعبہ کی طرف تبدیل ہو جائے گا (قبلہ کی تبدیلی اس نبی کی صداقت کے شواہد میں سے ایک ہے) اگر تم قبلہ کی تبدیلی اور کعبہ کے قبلہ قرار دیئے جانے کی تصدیق کرو اور نبوت کی صداقت کی ان نشانیوں کو ظاہر و انشاء کرو جن کا تمہیں علم ہو چکا ہے اور ان نشانیوں میں سے ایک کعبہ کا قبلہ قرار دیا جانا ہے تو اس سے تمہیں یہ نقصان ہوگا کہ جس طرح تمہیں قبلہ عطا کئے جانے کا اعزاز حاصل ہوا ہے اسی طرح مسلمانوں کو بھی اپنا قبلہ مل جائے گا اور وہ بھی اس اعزاز کے حامل ہو جائیں گے جس کے نتیجے میں تمہاری امتیازی خصوصیت اور قبلہ عطا کئے جانے کے اعزاز کی اہمیت جاتی رہے گی۔ اور دوسرا نقصان یہ ہوگا کہ وہ قیامت کے دن بارگاہ خداوندی میں تم پر حجت قائم کر سکیں گے کہ تم نے نئے قبلہ کے بارے میں سب کچھ جاننے اور اس کی حقیقت کے گواہ ہونے کے باوجود اس پر ایمان لانے سے انکار کیا“۔

خداوند عالم نے ان کی ان باتوں کا ترتیب وار جواب یوں دیا کہ انہوں نے کہا:

”ایمان لاؤ اس پر جو دن کے شروع میں نازل ہوا اور جو دن کے آخر میں نازل ہوا اس کا انکار کرو اور قبلہ کی تبدیلی کی بات مسلمانوں کو نہ بتاؤ ورنہ وہ حق کی ہدایت پالیں گے“، ( اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنزِلَ عَلٰی الْذٰلِیْنَ اٰمَنُوْا وَجِهَ الْوَجْهَ الْاٰخِرَ وَ اٰكْفُرُوْا الْاِخْرَکَ لَعَلَّہُمْ یَسْرِحُوْنَ )،

اس کے جواب میں خداوند عالم نے فرمایا: ”مؤمنین جس ہدایت کے محتاج ہیں وہ حق کی ہدایت ہے اور حق کی ہدایت تو وہی ہے جو خدا کی عطا کردہ ہدایت ہے“ (قُلْ اِنَّ الْاٰهْلَیْ هُدٰی اللّٰہِ) تمہاری ہدایت حق کی ہدایت نہیں اور مؤمنوں کو تمہاری ہدایت کی ہرگز ضرورت نہیں، اب یہ تم پر ہے کہ اسے مانو اور اس کا اتباع و پیروی کرو یا اس کا انکار کرو اور چاہو تو قبلہ کی تبدیلی کا راز آشکار کرو یا اس کا کتمان کرو۔

ان کی دوسری بات یہ تھی کہ ”اگر تم قبلہ کی تبدیلی کا راز مسلمانوں کو بتادو کہ نتیجتاً کعبہ قبلہ قرار پائے تو مسلمان بھی

تمہاری طرح کا اعزاز پالیں گے اور جو امتیازی خصوصیت تمہیں حاصل ہے وہ انہیں حاصل ہو جائے گی“ (أَنْ يُؤْتَىٰ أَحَدٌ مِّثْلَ مَا أُوتِيْتُمْ أَوْ يُحَاجُّوكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ“

اس کا جواب خداوند عالم نے اس طرح دیا: ”فضیلتیں خدا کے ہاتھ میں ہیں وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے“ (إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ) یعنی یہ فضیلت واعزاز تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے کہ تم چاہو تو اسے اپنے ساتھ مخصوص و مختص سمجھو اور اپنے علاوہ دوسروں کو اس سے محروم قرار دو۔

ان کی تیسری بات یہ تھی کہ ”کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس کی بناء پر تمہارے پروردگار کے پاس تمہارے خلاف حجت قائم کر سکیں“ (أَوْ يُحَاجُّوكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ) یعنی وہ خدا کو بتا دیں کہ قبلہ کی تبدیلی کے بارے میں انہیں معلوم تھا تو پھر تم انکار نہ کر سکو گے اور یہ نہ کہہ سکو گے کہ ہم نے تبدیلی قبلہ کی بات اپنی کتاب میں نہ دیکھی تھی“

ان کی یہ بات اس قدر واضح البطلان تھی کہ خداوند عالم نے اسے جواب کے قابل ہی نہ سمجھا جیسا کہ خدا نے ایک اور مقام پر بھی اسی طرح کیا اور ایک لطیف اشارہ کے ساتھ مطلب بیان کر دیا، ملاحظہ ہو:

سورۃ بقرہ، آیت: ۷۷

○ ”وَإِذْ الْقَوَّالِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَا بِعَضُوعِهِمْ إِلَىٰ بَعْضِهِمْ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ أَوْ لَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسْرُونَ وَمَا يُعْلِنُونَ“

(اور وہ جب ایمان لانے والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ کیا تم انہیں وہ راز بتاتے ہو جو خدا نے تم پر آشکار کیا ہے تاکہ وہ تمہارے پروردگار کے پاس تمہارے خلاف دلیل پیش کر سکیں کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے، آیا وہ جانتے نہیں کہ اللہ ہر ایک چیز کو جانتا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں اور جسے وہ ظاہر کرتے ہیں۔)

اس آیت میں جملہ ”أَوْ لَا يَعْلَمُونَ“ ان کی بات کا جواب نہیں کیونکہ اس میں حرف ”واو“ عطف کے لئے ہے جس کی بازگشت ان کے جملہ ”أَفَلَا تَعْقِلُونَ“ کی طرف ہے، اگر یہ جملہ (أَوْ لَا يَعْلَمُونَ) ان کی بات کا جواب ہوتا تو اس میں حرف عطف لانے کی ضرورت ہی نہ تھی بلکہ یوں کہا جاتا ”السا يعلمون“، بہر حال یہ جملہ ”أَوْ لَا يَعْلَمُونَ“ اس مطلب کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کی بات غیر معقول ہے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ خداوند عالم کے نزدیک پوشیدہ و ظاہر یکساں ہیں۔

بنا بریں جملہ ”وَلَا تُؤْمِنُوا“ کا معنی یہ ہوگا کہ ان پر اعتماد و بھروسہ نہ کریں اور ان کی بات کو درست قرار دے کر

اس کی تصدیق نہ کریں بلکہ راز کو راز ہی رہنے دیں ، لہذا جملہ ”وَلَا تُؤْمِنُوا“ سورہ برائت کی آیت ۶۱ کے جملہ ”وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ“ کی طرح ہے کیونکہ اس میں بھی ایمان کا معنی اعتماد و مہروسہ کرنا ہے۔

اور جملہ ”لَسَنَ تَتَّبِعَ“ سے مراد یہودی ہیں (یعنی تم یہودی صرف یہودیوں پر بھروسہ کرو)

زیر بحث پورے جملہ سے مراد، تورات میں مذکور قبلہ کی کعبہ کی طرف تبدیلی کی بات کو کسی کے سامنے ظاہر نہ کرنا ہے چنانچہ یہی بات سورہ بقرہ کی آیت ۱۳۶ میں بھی ذکر ہوئی ہے اور اس کی تفسیر میں مربوطہ مطالب ذکر ہو چکے ہیں، آیت اس طرح ہے:

”قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ --- وَإِنَّ الَّذِينَ أُوْتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ --- الَّذِينَ اتَّبَعْتُمْ يَكْفُرُونَ كَمَا يَعْرِفُونَ آبْنَاءَهُمْ وَإِنَّ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ“  
(پس تو اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کر لے۔۔ اور جن لوگوں کو کتاب دی وہ بخوبی جانتے ہیں کہ وان کے رب کی طرف سے حق ہے۔۔ وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی وہ اسے (رسول کو) اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، اور ان میں سے ایک گروہ جان بوجھ کر حق پر پردہ ڈالتا ہے)

زیر بحث آیت کے معنی کے تعین میں مفسرین کی طرف سے مختلف اقوال عام طور پر پیش کئے جاتے ہیں مثلاً:

(۱) جملہ ”وَلَا تُؤْمِنُوا“ اور جملہ ”مَا أُوْتِيْتُمْ أَوْ يَحَاجُّكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ“ میں جمع کے صیغہ کا مخاطب مؤمنین ہیں، اور دونوں موارد میں مفرد کے صیغہ ”قُل“ کا مخاطب حضرت پیغمبر اسلام ہیں۔

(۲) جملہ ”وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَنْ تَتَّبِعُ دِينَكُمْ“ یہودیوں کا بیان ہے اور جملہ ”قُلْ إِنَّ الْهُدَىٰ هُدَىٰ اللَّهِ أَنْ يُؤْتَىٰ أَحَدٌ...“ خداوند عالم کا کلام ہے جو یہودیوں کے بیان کے جواب میں ہے۔

اس اختلاف کی طرح مفسرین کرام کے درمیان ”إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ“ میں ”فضل“ کے معنی کی بابت بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے چنانچہ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس سے مراد ”دین“ ہے، بعض کہتے ہیں اس سے مراد دنیاوی نعمتیں ہیں اور بعض کا قول ہے کہ اس سے مراد غلبہ ہے اور دیگر حضرات نے دیگر آراء پیش کی ہیں۔

بہر حال یہ اقوال اپنی کثرت کے باوجود سیاق آیت سے مطابقت کے حامل دکھائی نہیں دیتے جیسا کہ ہم اس حوالہ سے اشارہ کر چکے ہیں لہذا اس سلسلہ میں ہم مزید بحث کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔

## سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے

○ ”قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ“  
(کہہ دو کہ فضل، خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ وسعت دینے والا، آگاہ ہے)

لفظ ”فضل“ کسی چیز کی درمیان حد سے ”زائد“ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اسے پسندیدہ چیز کے بارے میں استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ لفظ ”فضول“ مذموم و ناپسندیدہ چیز کے لئے استعمال ہوتا ہے، مشہور لغت دان راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ جس عطیہ کا دینا ضروری و لازمی نہ ہو اسے ”فضل“ کہا جاتا ہے جیسا کہ خدا نے ارشاد فرمایا: ”وَأَسْأَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ“، ”ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ“، ”ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ“، (ان تین آیتوں میں ”فضل“ سے مراد مادی نعمت ہائے خداوندی ہے)۔

بنابر اس آیت ”قل بفضل اللہ“، ”ولولا فضل اللہ“ میں بھی جو کہ بظاہر معنوی و روحانی امور و نعمات سے تعلق رکھتی ہیں لیکن مادی و معنوی دونوں قسموں کی نعمات کا ”فضل“ ہونا اس بناء پر ہے کہ خداوند عالم بندوں کے استحقاق سے زائد انہیں عطا فرماتا ہے۔

مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں جملہ ”إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ“ ایجاز اور مختصر گوئی کے باب سے ہے اور وہ اس طرح کہ گویا اس میں ایک قیاسی و منطقی برہان کے کبریٰ یعنی بنیادی امر کے بیان پر اکتفاء کی گئی ہے اور وہ یوں ہے کہ اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ کتاب کا نازل ہونا اور عطیہ خداوندی کا عطا کیا جانا کہ جسے تم اپنے ساتھ مخصوص و مختص قرار دے کر ایمان والوں پر اپنی برتری جتاتے ہو اور ایک دوسرے کو رسول کی آمد اور تبدیلی قبلہ کی بشارتوں کو چھپانے کی تاکید کرتے ہو یہ ایسی چیزیں نہیں کہ جن کی ذمہ داری خدا پر عائد ہوتی ہو بلکہ یہ تو خدا کی عنایت و فضل ہے اور ہر طرح کا فضل خدا کے ہاتھ میں ہے کہ مالکیت و حاکمیت اسی کے ساتھ مخصوص ہے لہذا اسے اختیار حاصل ہے کہ جسے چاہے اپنا فضل عطا کرے کہ اللہ وسعت والا، بہت جاننے والا ہے۔

بہر حال آیت میں یہودیوں کے اس بیان اور عملی اظہار کی ہمہ جہت نفی کا پہلو پایا جاتا ہے جس میں وہ خدائی نعمتوں کو اپنے ساتھ مخصوص قرار دیتے ہیں کیونکہ بعض لوگوں کا خدائی نعمتوں سے بہرہ ور ہونا اور بعض کا ان سے محروم ہونا جیسا کہ یہودی، دین اور قبلہ کی نعمت سے بہرہ ور ہوئے اور دوسرے اس سے محروم ہوئے تو اس کی تین احتمالی صورتیں ممکن ہیں یعنی تین وجوہات قابل تصور ہیں:

پہلی یہ کہ اس فیصلہ یعنی فضل و نعمت عطا کرنے میں خدا کے ساتھ کسی دوسرے کی عملداری و دخل ہو جو خدا کی مشیت کے پورا ہونے میں رکاوٹ بن جائے اور خدا کے فضل و عنایت کو کسی ایک جانب محدود کر کے اسے کسی بھی دوسری جانب سے روک لے (جیسا کہ یہودیوں کا عقیدہ ہے)۔

لیکن یہ احتمالی وجہ ہرگز قرین صحت نہیں ہو سکتی کیونکہ فضل، خدا کے ہاتھ میں ہے وہ خود جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ ”(إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ)۔“

دوسری یہ کہ خدا کا فضل و عنایت کم و نا کافی ہو جبکہ اس سے بہرہ مند ہونے والے زیادہ ہیں جس کی بناء پر ان میں سے بعض کو عطا کرنے اور بعض کو عطا نہ کرنے میں کسی ترجیحی حوالہ کی ضرورت ہو لہذا خدا عطیہ پانے والوں کے بارے میں فرضی ترجیحات کا سہارا لے۔

لیکن یہ احتمالی صورت اس لئے درست نہیں کہ خداوند عالم وسیع فضل والا ہے اور اس کی قدرت محدود نہیں۔ (واسع) تیسری وجہ یہ کہ اگرچہ اس کا فضل و عنایت وسیع ہے اور وہ اس کے اپنے ہی ہاتھ میں ہے لیکن ممکن ہے وہ لوگوں کے بارے میں لاعلمی کی وجہ سے صحیح حقدار کو نہ پہچان سکے اور اس کی جہالت و لاعلمی کی بناء پر دیگر حقدار محروم ہو جائیں۔ لیکن یہ احتمالی وجہ بھی صحیح نہیں کیونکہ خداوند عالم ”علیم“ ہے کہ جس پر جہل و لاعلمی طاری ہو ہی نہیں سکتی، (علیم)، خلاصہ کلام یہ کہ خداوند عالم کے فضل و عنایت کے اختصاص کی بابت یہودیوں کا ادعاء ہرگز درست نہیں کیونکہ اس سے خداوند عالم کا عجز و جہل ثابت ہوتا ہے جو کہ کسی بھی صورت میں قابل تصور نہیں۔

## خدا کی رحمت کے اختصاص کا بیان

○ ”يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ“  
(وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے مختص کرتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے)

اس آیت میں خداوند عالم کے وسیع اختیار و قدرت کو بیان کیا گیا ہے کہ جس کی بناء پر وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت عطا کرتا ہے بلکہ اپنی رحمت اس سے مختص کرتا ہے کیونکہ فضل و عنایت خدا کے ہاتھ میں ہے، وہ وسعت والا اور آگاہ ہے لہذا اسے حق حاصل ہے کہ اپنی نعمت اپنے بعض بندوں کے ساتھ مخصوص کر دے کیونکہ وہ اپنی ملکیت و مملوکہ چیز کے بارے میں تصرف کر سکتا ہے، اور چونکہ وہ اپنے فضل و عنایت میں تصرف کرنے میں کامل اختیار رکھتا ہے اور اس سلسلہ میں کسی بھی طرح

کی ممنوعیت و محدودیت اس کی بابت قابل تصور نہیں لہذا اس کے فضل و عطاء کے موارد کا تعین بھی اس کے ہاتھ میں ہے اور ایسا نہیں کہ اس پر لازم و واجب ہو کہ وہ اپنا ہر فضل ہر شخص کو عطا کرے کیونکہ یہ بھی ممنوع انصاف ہونے کی ایک صورت ہے بلکہ یہ اس کا حق ہے کہ جسے چاہے اپنے فضل و عنایت سے نوازے۔ (وہ اپنی عطا میں مورد اور حقدار کے تعین کا کامل اختیار رکھتا ہے، م)

زیر بحث آیت مبارکہ کا اختتام ان الفاظ میں ہوا: ”وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ“، یہ جملہ درحقیقت تمام سابقہ معانی کی تعلیل کے طور پر ہے یعنی ان امور کی علت و سبب اور بنیاد کو واضح کرنے کے لئے ہے کیونکہ علی الاطلاق فضل کی عظمت اس امر کی متقاضی ہے کہ اسے ہی یہ حق حاصل ہو کہ:

- (۱) اپنا فضل جسے چاہے عطا کرے۔
- (۲) اس کا فضل وسیع ہو کہ اس میں کسی طرح سے کمی نہ ہو۔
- (۳) وہ اپنے بندوں کے بارے میں بخوبی آگاہ ہوتا کہ ان کی حالت کے مطابق انہیں فضل سے نوازنے کا تعین کر سکے۔

(۴) اس سب کچھ کے ساتھ ساتھ اسے یہ حق حاصل ہو کہ وہ جسے چاہے اپنے فضل سے نوازے۔

### ایک اہم نکتہ

آیت مبارکہ میں ”إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ“ (فضل، اللہ کے ہاتھ میں ہے) کے بعد ”يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ“ کہا گیا ہے یعنی ”فضل“ کی بجائے ”رحمت“ کا لفظ استعمال کیا گیا جبکہ بظاہر یوں ہونا چاہیے تھا: ”يَخْتَصُّ بِفَضْلِهِ مَنْ يَشَاءُ“، تو اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ”فضل“ جو کہ غیر واجب عطیہ ہے وہ ”رحمت“ کی ایک قسم ہے، چنانچہ ”وسیع فضل“ کو ”وسیع رحمت“ سے تعبیر کرتے ہوئے یوں ارشاد ہوا:

سورہ اعراف، آیت ۱۵۶:

”وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ“ (میری رحمت ہر چیز پر وسعت رکھتی ہے)

اور ”فضل“ کے غیر واجب عطیہ ہونے کی بابت اس طرح ارشاد ہوا:

”وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا زَكَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ أَبَدًا“ (اور اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر

نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی ایک کبھی پاکیزگی نہ پاتا)..... سورہ نور، آیت ۱۵۶.....

ہر چیز کی بابت خدا کے کامل اختیار کا ذکر اس طرح ہوا:

سورہ اسرئیل، آیت ۱۰۰ :

”قُلْ لَوْ أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ حَزْآنَ آيَاتِ رَحْمَةِ رَبِّي إِذْ لَا مَسْكَتُمْ حَشِيئَةَ الْإِنْفَاقِ“

(کہہ دیجئے کہ اگر تم میرے پروردگار کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے پھر بھی ان کے ختم ہونے کے ڈر سے انفاق (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے) سے ہاتھ روکتے۔)

## اہل کتاب کے بارے میں!

○ ”وَمِنَ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنَهُ بِعُقُوبَتِ اللَّهِ بِرَبِّكَ.....“

(اور اہل کتاب میں سے کچھ وہ ہیں کہ اگر آپ انہیں سونے کی بور یوں سے لدے اونٹوں کی قطار بھی دیں تو وہ آپ کو واپس کر دیں گے۔۔۔)

اس آیت میں اہل کتاب کے بارے میں عہد و پیمان اور امانتوں کی بابت بیان ہوا ہے کہ ان میں اس حوالہ سے شدید مختلف صورت پائی جاتی ہے اور وہ یوں کہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اگر آپ انہیں سونے کی بور یوں سے لدے اونٹ بھی دیں تو وہ آپ کو واپس کر دیں گے اور کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ایک درہم بھی انہیں امانت دیں تو وہ واپس نہیں کریں گے، ان کے اس طرح کے فرق اور مختلف عملی صفت کے باوجود جو کہ بعض افراد میں خیانت کی شکل میں ہے اور وہ یقیناً قابل توجہ ہے وہ یہ کہ اگرچہ یہ پست صفت ان کے درمیان اس طرح پھیلی ہوئی ہے کہ پوری قوم کی طرف منسوب ہے لیکن اس کا اصل سبب ان لوگوں کی نظریاتی صفت ہے اور وہ یہ کہ وہ کہتے ہیں: ”لَيْسَ عَلَيْكَ فِي الْأَوْثَانِ سَبِيلٌ“ کہ امیوں کے بارے میں ہم پر کوئی ذمہ داری نہیں (یعنی ان کی امانتوں کی واپسی ہم پر ضروری نہیں)، وہ لوگ اپنے آپ کو ”اہل کتاب“ اور اپنے علاوہ دوسروں کو ”امی“ کہتے تھے، تو ان کا یہ کہنا کہ ہم پر امیوں کے بارے میں کوئی ذمہ داری یا قانون و ضابطہ لاگو نہیں ہوتا، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی غیر اسرائیلی کو اسرائیلی پر کوئی برتری حاصل نہیں، انہوں نے اس بات کو دینی رنگ دے کر ایک اعتقادی اصول بنا لیا چنانچہ اس کا ثبوت بعد والی آیت کے الفاظ سے ملتا ہے جس میں ارشاد ہوا: ”وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ“ (اور وہ خدا پر جھوٹ بولتے ہیں جبکہ انہیں معلوم ہے.....)

اس بناء پر یہودیوں کا نظریہ و عقیدہ تھا..... جیسا کہ اس دور میں بھی ہے..... کہ خداوند عالم نے انہیں اپنی خاص عنایات سے نوازا ہے اور جو اعزاز انہیں ملا ہے وہ ان کے علاوہ کسی کو بھی نہیں ملا اور وہ یہ کہ انہی میں نبوت، کتاب اور اقتدار

عطا کیا گیا لہذا انہیں سرداری و برتری اور دوسروں پر امتیاز حاصل ہے۔

اس باطل نظریہ و عقیدہ کی بناء پر انہوں نے اپنے لئے اس طرح نتیجہ اخذ کیا کہ قوانین و احکام اور ضابطوں کا اطلاق خود انہی کے درمیان ہوتا ہے، ان کے اور ان کے علاوہ دوسروں کے درمیان کوئی ضابطہ و قانون نافذ العمل نہیں یعنی سود کی حرمت، دوسروں کے اموال پر قبضہ کرنے کی ممانعت اور لوگوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا اور ان جیسے دیگر احکام و قوانین صرف اہل کتاب کے درمیان لازم الاجراء ہیں کہ کسی یہودی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے یہودی کا مال غصب کر لے یا اس کے مال میں خیانت کرے یا اس کی امانت واپس نہ کرے یا سود نہ لے لیکن اگر کسی غیر یہودی سے سود لے یا اس کے مال میں خیانت کرے یا اس کی امانت واپس نہ کرے تو اس کا ایسا کرنا حرام و ناجائز نہ ہوگا کیونکہ غیر یہودی کا یہودی پر کوئی حق نہیں،

خلاصہ یہ کہ اہل کتاب آپس میں ایک دوسرے پر حق رکھتے ہیں اور تمام احکام و قوانین کا اطلاق ان کے درمیان ہی ہوگا اور اہل کتاب کے علاوہ دیگر حضرات کا اہل کتاب پر کوئی قانونی و شرعی حق نہیں لہذا اہل کتاب کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ غیر اہل کتاب کے ساتھ جس طرح چاہیں برتاؤ کریں اور ان کے اموال و حقوق کے بارے میں جو اقدام و فیصلہ کریں انہیں کسی طرح کی باز پرس نہیں ہو سکتی، تو اس طرح کے نظریات ہی اس بات کا باعث بنے کہ یہودی، غیر یہودیوں کے ساتھ زبان بستہ حیوان کی طرح سلوک کریں اور ہر طرح کا امتیازی و غیر انسانی برتاؤ روا جائیں۔

حقیقت الامر یہ ہے کہ اس طرح کا عقیدہ ان کے پاس موجود کتب آسمانی مثلاً تورات وغیرہ میں بھی نہیں پایا جاتا بلکہ اس طرح کے نظریات انہوں نے اپنے علماء کی زبانوں سے سنے اور پھر ان کو اپنا لیا اور اس طرح اپنایا کہ اب ان کی حیثیت دینی اصولوں جیسی ہو گئی، اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو اپنے علاوہ کسی پر لاگو نہیں سمجھتے بلکہ بنی اسرائیل کے علاوہ کسی کو اس میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے اور اسے اپنی قومی شناخت قرار دیتے ہیں لہذا اس نظریہ و عقیدہ کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس اعزاز کو اپنے لئے مخصوص سمجھتے ہوئے اس پر عملی طور پر مباحثات کرتے رہتے ہیں اور اس حوالہ سے اپنی برتری کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو شخص اسرائیل سے نسبت رکھتا ہے وہ دوسروں پر عملی الاطلاق تقدم و برتری رکھتا ہے، ظاہر ہے کہ جب اس طرح کی باغیانہ سوچ کسی قوم میں پیدا اور راسخ ہو جائے تو انہیں زمین میں فساد پھیلانے اور انسانی اقدار کی پامالی جیسے اعمال کی راہ پر لاکھڑا کرتی ہے کہ جس سے انسانی معاشرہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے اور اس غیر انسانی سوچ کے مذموم آثار پھیلتے چلے جاتے ہیں۔

البتہ یہ بات اصولی طور پر درست ہے کہ عمومی حقوق بعض افراد اور گروہوں سے سلب کر لئے جاتے ہیں اور ایسا کرنا انسانی معاشرہ میں ناگزیر ہوتا ہے لیکن یہ اس وقت اور اس صورت میں ہوتا ہے کہ جب صالح انسانی معاشرہ میں کچھ لوگ عمومی حقوق اور معاشرتی اصولوں کو پامال کریں اور عملی طور پر ان کی ہنگ و بے حرمتی و بے احترامی کے مرتکب ہوں تو اس صورت میں



نہیں عمومی حقوق سے محروم کر دیا جاتا ہے..... تاکہ قانون کی حکمرانی کو عملی طور پر چیلنج کرنے کی جرأت کسی کو نہ ہو.....

اب سوال یہ ہے کہ اس حوالہ سے کیا معیار مقرر ہے جس کی بناء پر کسی کے بارے میں عمومی حقوق کے ثبوت یا انہی کا

تعیین ہو؟

تو اس سلسلہ میں اسلام نے دو اصول بتائے ہیں: ایک تو حید پرستی اور دوسرا اہل ذمہ ہونا (یعنی اسلامی حکومت کے ساتھ معاہدہ کی بنیاد پر معاشرتی قوانین کی پاسداری کا عہد کرنا کہ اس بناء پر اسلامی حکومت ان کی جان و مال و ناموس کی حفاظت کی ذمہ دار ہوتی ہے)، لہذا جو شخص تو حید پرست یعنی مسلمان نہ ہو اور نہ ہی اہل ذمہ میں سے ہو..... بلکہ اہل ذمہ کے ساتھ نبرد آزما ہو..... اسے معاشرتی حقوق حاصل نہیں ہوں گے بلکہ اسے زندہ رہنے کا بھی حق حاصل نہیں کیونکہ جو شخص دوسروں کو زندگی کے حق سے محروم کرنے کے درپے ہو اور کسی کے لئے زندہ رہنے کے حق کا قائل نہ ہو اسے زندہ رہنے کا کیا حق حاصل ہے؟ اس بناء پر اسلام نے جو معیار مقرر کیا ہے اور عمومی حقوق سے بہرہ مندی کا جو اصول بنایا ہے وہ فطرت سلیمہ کے عین مطابق ہے اور انسانی معاشرہ کی بقا کا راز اس کے عملی احترام میں مضمر ہے۔

ان مطالب کے ذکر کے بعد اب ہم اپنے سلسلہ بحث کی طرف لوٹتے ہیں کہ آیت مبارکہ ”وَمِنَ اَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ اِنْ تَاَمَنُوْهُ بِقِنطَارٍ“ میں دوبارہ ”اہل کتاب“ کا نام صراحت کے ساتھ لیا گیا ہے جبکہ اس سے پہلے ان کا نام صریحاً ذکر ہو چکا ہے اور اگر یہاں دوبارہ ان کا نام ذکر کرنے کی بجائے ضمیر کے ساتھ اشارہ کر دیا جاتا تو کافی تھا یعنی یوں کہہ دیا جاتا: ”وَمِنْهُمْ“ (اور ان میں سے)، لیکن اس کی بجائے اصل نام کے ساتھ مطلب کو بیان کیا گیا تو بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ ظاہر کی جگہ ضمیر لا کر ایک ممکنہ غلط فہمی کا راستہ روکا گیا ہے کیونکہ عین ممکن تھا کہ کوئی یہ سمجھتا کہ یہاں ”وَمِنْهُمْ“ سے وہ بعض افراد مراد ہیں جن کا ذکر سابقہ دو آیتوں میں ہوا ہے کہ جنہوں نے کہا: ”اٰمَنُوْا بِالَّذِيْ اُنزِلَ عَلٰی الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجِئَ النَّهَارُ وَاکْفُرُوْا اٰخِرَةَ“ کہ جو کچھ دن کی ابتداء میں نازل ہوا اس پر ایمان لے آؤ اور جو دن کے آخر میں نازل ہوا اس کا انکار کرو، جبکہ وہ لوگ مقصود نہیں تھے لہذا دوبارہ ضمیر کی بجائے ان کا نام لے کر مطلب کو بیان کیا گیا، اور جب اس طرح کی غلط فہمی کا موقع گزر گیا تو بعد والی آیت میں ضمیر کے ساتھ ان کی طرف اشارہ ہوا اور یوں ارشاد ہوا: ”وَ اِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِیْقًا يَّتَّبِعُوْنَ اٰسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ“ (اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب پڑھتے ہوئے اپنی زبانوں کو گھماتے ہیں.....)

اس مقام پر ایک قابل توجہ مطلب یہ بھی ہے کہ آیت مبارکہ میں ان کا اہل کتاب ہونا ان کے وصف کے طور پر ذکر ہوا ہے اور جب کسی کے بارے میں اظہار خیال یا بیان مطلب میں اس کے وصف کو ذکر کیا جائے تو اس کے اس مطلب کے سبب وجہ کا اظہار بھی مقصود ہوتا ہے، یہاں اہل کتاب کے بعض اعمال کے بیان میں ان کا نام دراصل ان کے وصف کے طور پر مذکور ہے لہذا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اعمال کی وجہ کا بیان و اظہار بھی مقصود ہے، یعنی جملہ ”وَمِنَ اَهْلِ

اَلْكِتَابِ مَنْ اِنْ تَأَمَّنْهُ بِقِنطَارٍ“ کے تسلسل میں ان کی یہ بات کہ ”لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأَمْثَلِ سَبِيْلٌ“ اور ان کا لوگوں کے اموال پر ناجائز قبضہ و غصب اس لئے تعجب و حیرت کا باعث نہ ہوتا کہ وہ امی ہوتے اور نبوت و کتاب سے بے خبر و بے بہرہ ہوتے، لیکن اس طرح کے اعمال کا ارتکاب اس لئے باعث تعجب ہے کہ وہ تو اہل کتاب ہیں اور انہیں کتاب میں مذکور حکم الہی کا علم ہے اور وہ جانتے ہیں کہ آسمانی کتاب انہیں اس طرح کے اعمال کے ارتکاب کی ہرگز اجازت نہیں دیتی اور انہیں لوگوں کے اموال پر ناجائز قبضہ کرنے کو مباح و جائز قرار نہیں دیتی لہذا ان کے اہل کتاب ہونے اور ان تمام مطالب سے آگاہ ہونے کے باوجود اس طرح کے اعمال کا ارتکاب کرنے پر نہایت حیرت ہے، اس بناء پر ان کو تنبیہ کرنا اور ان اعمال پر ان کی شدید سرزنش بجا ہے بلکہ نہایت ضروری ہے۔

آیت مبارکہ میں مذکور لفظ ”قنطار“ اور ”دینار“ کے معنی مشہور ہیں اور یہاں ان کا تقابلی تذکرہ اپنی ادبی خوبصورتی اور علم بدیع کی کمالی جہات کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ موضوع اور مورد بیان سے کامل مطابقت رکھتا ہے کیونکہ یہاں امانت کی بات ہو رہی ہے لہذا ”قنطار“ اور ”دینار“ کو مال کے کثیر اور قلیل ہونے سے کنایۃً ذکر کیا گیا ہے، اور اس سے مراد یہ ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں کہ وہ امانت میں ہرگز خیانت کے مرتکب نہیں ہوتے خواہ وہ جتنی زیادہ کیوں نہ ہو اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جو اس میں خیانت کا ارتکاب کرتے ہیں خواہ وہ کم ہی کیوں نہ ہو۔

اور جملہ ”تَأَمَّنْهُ بِقِنطَارٍ يَوْمَ ذَا لِيْلِكَ“ (اگر تو اسے سونے سے لدا اونٹ بھی امانت کے طور پر دے تو وہ تجھے واپس کر دے گا) کسی متعین شخص کی طرف اشارہ نہیں بلکہ ہر اس مخاطب سے کنایہ کے طور پر ہے جو اس کلام کا مخاطب قرار پائے، یعنی یہ ایک عمومی مطلب کا بیان ہے جو کسی ایک شخص سے مخصوص نہیں، بنا براین اس جملہ کا معنی یہ ہوگا کہ اگر کوئی بھی امانت دینے والا اسے امانت دے خواہ وہ سونے سے لدا اونٹ ہی کیوں نہ ہو وہ اسے واپس کر دے گا۔

اور جملہ ”سَادَمْتُ قَائِمًا“ میں حرف ”ہا“ کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ مصدر کا ہے لہذا عبارت کا معنی سمجھنے کے لئے اسے یوں فرض کرنا پڑے گا: ”اَلَا اِنْ تَدُوْمُ قَائِمًا عَلَيْهِ“ (مگر یہ کہ تو اس کے سر پر کھڑا ہی رہے)، یہاں قیام یعنی سر پر کھڑا رہنے کا لفظ تاکید اور فوری مطالبہ کی شدت کو بیان کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ یعنی امانت دینے والا شخص اپنی امانت واپس لینے میں سنجیدہ ہے اور فوریت چاہتا ہے، بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس جملہ میں حرف ”ہا“ طرف کا معنی دیتا ہے، لیکن یہ قول قابل توجہ نہیں۔

جملہ ”ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاَمْثَلِ سَبِيْلٌ“ میں حرف ”ذٰلِكَ“ کے ذریعے سابقہ ذکر کے لئے مطالب کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ ان میں سے کوئی ایسا بھی ہے کہ اگر آپ سونے سے لدا اونٹ بھی اس کے پاس امانت رکھیں تو وہ واپس کر دے گا اور کوئی ایسا بھی ہے کہ اگر اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھیں تو وہ واپس نہیں کرے گا، یعنی

بعض امانتدار ہیں اور بعض خیانت کرنے والے ہیں، ان کا یہ عمل اس وجہ سے ہے کہ وہ قائل ہیں کہ ہم پر امیوں کے بارے میں کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی (ان کے حوالہ سے ہم پر کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا)، ان کے اس نظریہ و قول نے ان کے درمیان روحی صفات کے مختلف ہونے کو جنم دیا مثلاً امانتداری اور لوگوں کے حقوق کا تحفظ، اور موہوم و خیالی اعزازات پر غرور کرنا، یعنی کچھ لوگ اس عقیدہ کو غلط سمجھتے ہوئے امانتداری کی صفت اپنا گئے اور کچھ لوگ اسے درست سمجھے ہوئے خیانت کار بن گئے، حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ خداوند عالم نے اپنی کتاب میں اس طرح کا کوئی ضابطہ قرار نہیں دیا اور نہ ہی اس طرح کے اعمال سے راضی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ حرف ”ذٰلِكَ“ آیت میں مذکور صرف دوسرے گروہ کی طرف اشارہ کے لئے ہو کہ جس کے بارے میں کہا گیا ہے: ”وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاَمَنُہٗ بِدِيْنِنَا سِرًا لِآيٰتِنَا لَا يُوَدِّعُ اِلَيْكَ“ (ان میں سے بعض وہ ہیں کہ اگر انہیں ایک دینار بھی امانت دیں تو وہ واپس نہیں کریں گے)، اس بناء پر پہلے گروہ یعنی امانتدار لوگوں کا ذکر دراصل دونوں قسم کے افراد کا پورا اور منصفانہ تذکرہ کرنے کے طور پر ہوا ہے تاکہ تصویر کے دونوں رخ واضح و آشکار ہوں۔

مذکورہ بالا دو امکانی پہلو ”يَقُولُوْنَ“ اور ”وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ“ کی ضمیر ہائے جمع کے بارے میں بھی پائے جاسکتے ہیں اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ معنی کے لحاظ سے ممکن ہے ان کی بازگشت تمام اہل کتاب کی طرف ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ صرف ان لوگوں کی طرف ہو جو امانتوں میں خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں کہ جن کے بارے میں کہا گیا ہے ”مَنْ اِنْ تَاَمَنُہٗ بِقِطْرٍ اَيْدِيٍّ اِلَيْكَ“، اسی طرح ”علینا“ میں جمع کی ضمیر کے بارے میں بھی دو احتمال پائے جاتے ہیں، ایک یہ کہ اس کی بازگشت تمام اہل کتاب کی طرف ہے اور دوسرا یہ کہ صرف خیانت کار لوگوں کی طرف ہے۔

بہر حال ان احتمالات کی بناء پر آیت کا معنی بھی مختلف ہو جائے گا البتہ یہ تمام احتمالات قرین صحت ہیں تاہم آپ ان کے بارے میں خود مزید غور و فکر کریں۔

## جان بوجھ کر جھوٹ بولنا

○ ”وَيَقُولُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكٰذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ“

(اور وہ جان بوجھ کر خدا پر جھوٹ بولتے ہیں)

یہ جملہ یہودیوں کے اس دعوے و اظہار کے باطل و نادرست ہونے کو ثابت کرتا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ امیوں

کو ہم پر کسی طرح کا اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں، اور وہ اپنے اس قول و عقیدہ کو آسمانی وحی اور دینی حکم پر مبنی سمجھتے ہیں،..... لیکن ان کا یہ قول و عقیدہ دراصل خدا پر تہمت اور جھوٹا الزام و نادرست نسبت ہے۔

## وفائے بہ عہد اور تقویٰ

○ ”بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ“

(ہاں، جو شخص اپنا عہد و پیمان پورا کرے اور تقویٰ اختیار کرے تو خدا تقویٰ اختیار کرنے والوں سے محبت کرتا ہے)

اس آیت مبارکہ میں یہودیوں کے ادعا کو رد کیا گیا ہے اور انہوں نے جس بات کی نفی کی تھی اور کہا تھا کہ ”لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّمِينَ سَبِيلٌ“ (ہم پر امیوں کے بارے میں کوئی قانون نہیں) اس کا اثبات ہوا ہے، اور ”أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ“ میں ایفاء سے مراد یہ ہے کہ عہد و پیمان کو پورا کرنے میں ہر طرح کی کمی اور بہانہ جوئی سے دوری اختیار کی جائے، یہ باب ”افعال“ ہے، اور ”توفیہ“ (جو کہ باب تفحیل سے ہے) کا معنی عطا کرنا اور پورا پورا دینا ہے، اور ”استیفاء“ (جو کہ باب استفعال سے ہے) کا معنی پورا پورا واپس لینا ہے۔

یہاں عہد و پیمان سے مراد یا تو وہ فطری عہد ہے جو خداوند عالم نے اپنے بندوں سے لیا ہے کہ وہ اس پر ایمان لائیں اور اس کی عبادت کریں جیسا کہ بعد والی آیت میں ارشاد ہوا: ”إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا“ (جو لوگ خدا سے کئے گئے وعدہ اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ دیتے ہیں)، یا اس سے مراد مطلق عہد و پیمان ہے یعنی ہر طرح کا وعدہ ہے کہ جس میں خدائی عہد بھی شامل ہے۔

جملہ ”فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ“ اس طرح ہے جیسے کسی جزئی مورد کی جگہ قاعدہ کلیہ لایا جائے، (علم منطقی میں جزئی مورد کو ”صغریٰ“ اور قاعدہ کلیہ کو ”کبریٰ“ کہتے ہیں) یہاں اختصار کی غرض سے ایسا کیا گیا ہے، اور عبارت کو اس طرح فرض و تصور کریں تو معنی واضح ہو جاتا ہے، ”بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ، فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ لِمَنْ مَتَّقَىٰ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ“ (ہاں! جو شخص اپنا وعدہ پورا کرے اور تقویٰ اختیار کرے تو خدا اسے دوست رکھتا ہے کیونکہ وہ متقی ہے اور خدا متقیوں کو دوست رکھتا ہے)، بنا بریں اس جملہ کا معنی و مقصود یہ ہوگا کہ خدائی اعزاز کا حصول اس قدر آسان نہیں کہ جو بھی چاہے اسے اپنے آپ سے منسوب کر لے اور ہر طرح کے حیلہ و وسیلہ مثلاً ذاتی و قومی بنیادوں پر خود کو اس کا

حقدار قرار دے بلکہ اس سے بہرہ ور ہونے میں بنیادی شرط یہ ہے کہ خدائی عہد و پیمان کو پورا کرے اور دین میں تقویٰ اختیار کرے، جب یہ شرطیں پوری ہو جائیں تو اعزاز کا حصول یقینی ہو جائے گا جو کہ عبارت ہے محبت و ولایت الہیہ سے!، کہ جو خدا کے متقی و پرہیزگار بندوں کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہوتی، اور اس کا اثر و نتیجہ خدائی نصرت اور پاکیزہ زندگی ہے کہ جس سے دنیا آباد اور اس سے مربوط تمام امور کی درستی کے ساتھ ساتھ اخروی درجات کی بلندی نصیب ہوتی ہے، تو یہ ہے عظمت اور خدائی اعزاز! نہ یہ کہ خدا کچھ لوگوں کو اپنے بندوں..... خواہ وہ صالح ہوں یا بدکار..... پر مسلط کر دے اور وہ ان پر جس طرح چاہیں آمرانہ طرز عمل اپنائیں اور جس طرح کا بھی سلوک کریں، اور کبھی یوں کہیں کہ ہم پر امیوں کو کوئی برتری حاصل نہیں ” لَيْسَ عَلَيْكُمْ فِي الْأَمِّينَ سَبِيْلٌ“، اور کبھی کہیں کہ ہم ہی ہیں اللہ کے خاص دوست، ہمارے سوا کوئی نہیں ” نَحْنُ اَوْلِيَاءُ اللّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ“، اور کبھی کہیں کہ ہم ہی خدا کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں ” نَحْنُ اَبْنَاءُ اللّٰهِ وَ اَحِبَّائُهُ“، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ خدا اس طرح ظالموں کو زمین میں تباہی پھیلانے اور اموال و نسلوں کو برباد کرنے کی اجازت دے۔

### عہد الہی کو بیچنا

○ ” اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا“  
(جو لوگ خدائی عہد و پیمان اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ دیتے ہیں)

اس آیت میں سابقہ آیت میں مذکور حکم کی وجہ و سبب کو بیان کیا گیا ہے، لہذا یہاں اس مطلب کا اظہار مقصود ہے کہ خدائی عظمت و اعزاز اس شخص کے ساتھ مخصوص ہے جو خدا سے کئے گئے وعدے کو پورا کرے اور تقویٰ اختیار کرے کیونکہ جو لوگ ان کے علاوہ ہیں یعنی وہ کہ جو خدا سے کئے ہوئے وعدے اور اپنی قسموں کو نہایت تھوڑی قیمت پر بیچتے ہیں انہیں کوئی عزت و اعزاز حاصل نہیں۔

اور چونکہ خدا سے کئے ہوئے وعدے کو توڑنا اور تقویٰ کو چھوڑنا دنیاوی رنگینیوں و شہوتوں سے لطف اندوز ہونے کی غرض سے ہے اور دنیاوی لذتوں کو اخروی لذتوں پر مقدم و ترجیح دینے کے طور پر ہے لہذا یہ اس طرح سے ہے کہ خدائی عہد و تقویٰ کی جگہ دنیاوی متاع کو رکھا جائے اور خدا سے کئے ہوئے وعدے کو تبدیل کر دیا جائے (وعدہ خلافی کی جائے)، اسی بناء پر اس طرح کے عمل کو معاملہ یعنی لین دین کا نام دیا گیا ہے کہ جس میں خدائی عہد و پیمان کو قابل فروخت مال کی حیثیت حاصل ہوتی ہے کہ جسے دنیاوی مال و متاع کے بدلے میں خریدا گیا ہو۔

آیت میں دنیا کے مال و متاع کو جو کہ قلیل ہے ”تھوڑی قیمت“ سے موسوم کیا گیا ہے، ”اشتراء“ کا معنی بیچنا ہے اس لئے ارشاد ہوا: ”يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيِّمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا“ یعنی وہ بیچتے ہیں خدائی عہد کو، اس سے مراد یہ ہے کہ وہ خدائی عہد و پیمان اور اپنی قسموں کو دنیاوی مال و متاع سے تبدیل کرتے ہیں۔

### بدعہدی کا انجام

○ ”أُولَئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ“  
(ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور نہ ہی خدا ان سے کلام کرے گا.....)

لفظ ”خلاق“ کا معنی حصہ اور ”تذکیرہ“ کا معنی کسی چیز کی اچھی پرورش کرنا ہے، یہاں چونکہ لوگوں کے اس گروہ کے بارے میں اظہار خیال مقصود ہے جو ان دیگر افراد کی توصیف کے مقابل میں قرار پایا ہے جن کے بارے میں ارشاد ہوا: ”صَنُ أَوْفَى بِعَهْدِهِ وَآتَى“.....، اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی بابت چند سلیبی اوصاف بیان کئے گئے ہیں مثلاً آخرت میں ان کے حصہ پانے کی نفی اور خدا کے ان کے ساتھ کلام کرنے کی نفی، تو اس سے درج ذیل نکات معلوم ہوتے ہیں:

(۱) لفظ ”أُولَئِكَ“ جو کہ دور کی طرف اشارہ کے لئے ہے اسے یہاں استعمال کر کے اس مطلب کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے کہ وہ لوگ بارگاہ خداوندی سے کوسوں دور ہیں جبکہ ان کے برعکس خدائی عہد و پیمان کو پورا کرنے والے متقی افراد کو بارگاہ ربوبیت سے قرب کا شرف حاصل ہے کیونکہ خداوند عالم ان سے محبت کرتا ہے، اور یہ اسی محبت کا نتیجہ ہے کہ وہ قرب الہی سے بہرہ مند ہیں۔

(۲) خدا کی محبت کے آثار یہ ہیں: آخرت میں حصہ پانا، خدا کا ان سے کلام کرنا اور قیامت کے دن ان پر نگاہ کرم کرنا، تذکیرہ اور مغفرت یعنی دردناک عذاب سے نجات پانا۔

ان کے مقابل میں خداوند عالم نے ان لوگوں کی بابت جنہوں نے عہد الہی کو توڑا اور اپنی قسموں پر پورا نہ اترے درج ذیل تین چیزیں ذکر کیں:

(۱) آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا، آخرت سے مراد جہان آخرت ہے (یہاں موصوف کی جگہ اس کی صفت کو ذکر کیا گیا ہے) اس سے مراد مرنے کے بعد آخرت کی زندگی ہے، یہ اس طرح ہے جیسے لفظ ”دنیا“ سے مراد دنیا کی زندگی ہے یعنی مرنے سے پہلے دنیا کی حیات ! اور آخرت میں ان کے حصہ پانے کی نفی کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے اس کے

مقابلے میں دنیا میں حصہ پانے کو ترجیح دی، دنیا کو آخرت پر مقدم کیا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ”ثمن قلیل“ (کم قیمت) سے مراد دنیا ہے، سابقہ مطالب میں ہم نے اسے متاع الدنیا سے اس لئے تعبیر کیا تھا کہ خداوند عالم نے اسے ”قلیل“ (کم) قرار دیا، چنانچہ اس کا ثبوت درج ذیل آیت میں پایا جاتا ہے:

سورۃ نساء، آیت: ۷۷

○ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ

(کہہ دیجئے کہ دنیا کا مال تھوڑا ہے)

ظاہر ہے کہ متاع دنیا وہی دنیا ہی ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

(۲) خداوند عالم قیامت کے دن نہ ان سے کلام کرے گا اور نہ ہی ان پر نظر کرے گا، یہ دو باتیں متقین کے ساتھ خدا کی محبت کے مقابل میں ذکر ہوئی ہیں کیونکہ محبت اس بات کا موجب بنتی ہے کہ محبت، محبوب سے ہمکلام رہنے اور اس کا دیدار کرتا رہنے کا مشتاق ہوتا ہے اور جب اس سے ملتا ہے تو اس سے لگا تار بات کرتا ہے اور اس کی نگاہ اس پر جمی رہتی ہے، اور چونکہ خداوند عالم ان آخرت فرودشوں کو دوست نہیں رکھتا لہذا قیامت کے دن ان سے کلام نہ کرے گا اور نہ ہی ان کی طرف نظر کرے گا جبکہ وہ دن حاضر ہونے اور پیشی کا دن ہے۔

اور کلام کرنے کو نگاہ کرنے سے پہلے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں کے درمیان قوت و ضعف کی نسبت پائی جاتی ہے کیونکہ کلام کرنا جذبہ محبت کی فراوانی کا ترجمان ہوتا ہے جبکہ نگاہ کرنا اس سے کمتر اور دوسرے درجہ کا حامل ہے، اس بناء پر کلام کرنے کو نگاہ کرنے پر مقدم کر کے ذکر کیا گیا ہے، گویا اس طرح کہا گیا کہ ہم انہیں نہ کسی بڑے شرف و اعزاز سے نوازیں گے اور نہ ہی چھوٹے اعزاز سے بہرہ مند کریں گے (یعنی نہ ان سے بات کریں گے اور نہ ہی ان کی طرف نگاہ کریں گے)۔

(۳) خدا ان کا تذکرہ نہیں کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب مقرر ہے، کلام میں تذکرہ نہ کرنے اور عذاب میں مبتلا کرنے کو مطلق صورت میں ذکر کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں یہ دونوں مقصود ہیں، یعنی نہ دنیا میں ان کا تذکرہ ہوگا اور نہ آخرت میں، اور دنیا میں بھی ان کے لئے دردناک عذاب ہے اور آخرت میں بھی دردناک عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

## کتاب پڑھتے ہوئے زبانیں پھیرنا

○ ” وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلْوَنَ أَلْسِنَتَهُمُ بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ “

(ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب پڑھتے وقت اپنی زبانوں کو پھیرتے ہیں تاکہ اسے کتاب ہی کا حصہ سمجھا جائے جبکہ وہ کتاب میں سے نہیں ہوتا)

” لسی “ کا معنی سی کا بننا ہے (اس میں بیچ و خم آنا)، سر اور زبان کے بننے سے مراد ان کا پھیرنا ہے یعنی انہیں غیر طبعی و غیر اصلی حالت میں لانا، اس کی قرآنی مثالیں ملاحظہ ہوں:

سورۃ منافقون، آیت: ۵

○ ” لَوَّؤُاْ لِسَانَهُمْ ”

(وہ اپنے سروں کو پھیر لیتے ہیں)

سورۃ نساء، آیت: ۴۶

○ ” لَيَّا بِلِأْسِنَتِهِمْ ”

(وہ اپنی زبانوں کو گھماتے ہیں)

اس بناء پر جملہ ” يَلْوَنَ أَلْسِنَتَهُمُ “ سے مراد یہ ہوگا کہ وہ اپنے جعل کردہ من گھڑت مطالب کو کہ جن کی جھوٹی نسبت خدا کی طرف دیتے ہیں اس لحن و انداز میں پڑھتے ہیں جس طرح تورات کو پڑھتے ہیں تاکہ یہ ظاہر کریں کہ وہ مطالب بھی تورات میں سے ہیں جبکہ وہ تورات میں سے نہیں،..... اس طرح لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرتے ہیں اور دھوکہ دینے ہیں.....

اس آیت میں لفظ ” کتاب “ تین دفعہ ذکر ہوا ہے تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی پیدا نہ ہونے پائے کیونکہ ان تینوں میں معانی مختلف ہیں چنانچہ پہلے لفظ ” کتاب “ سے مراد وہ تحریر ہے جسے انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا اور اسے خدا کی طرف منسوب کر دیا، اور دوسرے لفظ ” کتاب “ سے مراد وہ کتاب ہے جو خداوند عالم نے بذریعہ وحی نازل کی، اور تیسرے لفظ ” کتاب “ سے مراد بھی وہی آسمانی کتاب ہے جسے خداوند عالم نے وحی کے ذریعے نازل فرمایا اور اس کے دوبارہ ذکر کرنے کا



مقصد اس کی بابت غلط فہمی کا راستہ روکنا ہے اور اس بات کی طرف اشارہ و توجہ دلانا مقصود ہے کہ اللہ کی کتاب ان میں من گھڑت و جعلی مطالب پر مشتمل ہونے سے بالاتر ہے، کیونکہ لفظ کتاب میں وصفیت کا معنی پایا جاتا ہے جو کہ اس میں مذکور حکم کی علت و وجہ کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس کی مثال لفظ جلالہ ”اللہ“ کے دوبارہ ذکر کئے جانے میں ملتی ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

”وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ“ (اور وہ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے) کہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ”اللہ“ کی طرف سے نہیں ہے جو برحق معبود ہے اور حق کے سوا کچھ نہیں کہتا، چنانچہ اس کا ارشاد ہے: ”الْحَقُّ أَقُولُ“ (اور میں تو حق بات ہی کرتا ہوں)..... سورہ ص، آیت ۸۴.....

اور جملہ ”وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ“ پہلی تکذیب کے بعد دوبارہ تکذیب کو بیان کرتا ہے، اس میں ان کی خود ساختہ وحی کی تکذیب ہے کہ جسے انہوں نے خدا کی طرف منسوب کیا اور یہ تکرار یعنی دوبارہ تکذیب کرنا اس لئے ہے کہ یہودی لہجہ و انداز کے ذریعے لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیتے تھے اور خدا نے اسے ان الفاظ میں مسترد کیا:

”وَمَا مِنَ الْكُتُبِ“ (جبکہ وہ کتاب میں سے نہیں)، پھر وہ اپنی زبانوں سے کہتے تھے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے تو خدا نے پہلے ان کی تکذیب ان لفظوں میں کی: ”وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ“ (جبکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے) اور پھر فرمایا:

”وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ“ (اور وہ خدا پر جھوٹی نسبت دیتے ہیں) اس میں دو مطالب کا بیان مقصود تھا: پہلا یہ کہ جھوٹ بولنا اور جھوٹی نسبت دینا یہودیوں کی عادت و معمول ہے، دوسرا یہ کہ ان کا جھوٹی نسبت دینا ان کی لاعلمی یا غلط فہمی کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ جان بوجھ کر یعنی سب کچھ کا علم ہونے کے باوجود عمداً ایسا کرتے ہیں۔

## روایات پر ایک نظر

### اہل کتاب کو دعوت عام

تفسیر درمنثور میں آیہ مبارکہ ”قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ“ کے ذیل میں ابن جریر سے سعدی کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام نے انہیں یعنی نصاریٰ، مجوسی اور عیسائیوں کو دعوت دی اور فرمایا: اے اہل کتاب! آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر و مشترک ہے (يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ.....) (تفسیر درمنثور ج ۲ ص ۴۰)

اس مطلب پر مشتمل ایک روایت ابن جریر نے محمد بن جعفر بن زبیر سے بھی ذکر کی ہے، اور روایت سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت انہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اور ہم نے اس سورہ مبارکہ کی تفسیر کے آغاز ہی میں ایک روایت ذکر کی جس سے ثابت ہوتا تھا کہ ابتدائے سورہ سے لے کر تقریباً اسی (۸۰) سے کچھ زیادہ آیات نجران کے نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور زیر نظر آیت مبارکہ انہی آیات میں سے ایک ہے کیونکہ ابھی سلسلہ بحث انہی کے متعلق جاری ہے اور آیات کی مذکورہ تعداد پوری نہیں ہوئی۔

بعض روایات میں وارد ہوا ہے کہ پیغمبر اسلام نے مدینہ کے یہودیوں کو دعوت دی کہ وہ مشترک نکتہ کی طرف آئیں، کہ بلاخرانہوں نے جزیہ کو قبول کر لیا، یہ آیت کے نجران کے وفد کے بارے میں نازل ہونے کی نفی نہیں کرتی اور نہ ہی اس سے متصادم ہے۔

### بادشاہِ روم کے نام مکتوبِ نبویؐ

صحیح بخاری میں مؤلف نے اپنے اسناد سے ابن عباس کی ایک روایت بحوالہ ابوسفیان ذکر کی ہے، اس طویل حدیث میں اس خط کا تذکرہ ہے جو حضرت پیغمبر اسلامؐ نے بادشاہِ روم ہرقل کو لکھا، ہرقل نے آنحضرتؐ کا خط پڑھا تو اس میں یہ لکھا ہوا تھا:

”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ الَّذِیْ هَرَقَلَ عَظِیْمَ الرُّوْمِ، سَلَامٌ عَلَیْ مَنْ اتَّبَعَ الْهُدٰی، اِمَّا بَعْدُ، فَاِنِّیْ اَدْعُوْكَ بِدَعَايَةِ الْاِسْلَامِ، اِسْلَمْتَ تَسْلَمُ، وَاِسْلَمْتَ یُوْتٰکَ اللّٰهُ اَجْرًا مَّرْتِیْنِ، فَاِنْ تَوَلَّیْتَ فَاِنْ عَلَیْکَ اَثْمُ الْاَرِیْسِیْنِ، وَیَا اَهْلَ الْکِتَابِ تَعَالَوْا اِلَیْ کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنا وَبَیْنَکُمْ اَلَا نَعْبُدُ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نَشْرُکُ بِهٖ شَیْئًا وَلَا یَتَّخِذُ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوْا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ“

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے، جو مہربان و نہایت رحم کرنے والا ہے، یہ خط محمد رسول اللہ کی طرف سے روم کے شہنشاہ ہرقل کے نام ہے، سلام ہو اس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی، ابا بعد، میں آپ کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں، اسلام لائیں اور خدا کے فرمان پر تسلیم خم کر دیں تاکہ سلامتی کے ساتھ رہیں اور خداوند آپ کو دگنا اجر عطا کرے گا، لیکن اگر آپ اس سے منہ موڑیں تو تمام لوگوں (کمزور و محکوم طبقہ) کا گناہ آپ کے ذمہ ہوگا، اور اے اہل کتاب! اس کلمہ واحدہ کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر و مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو

شریک قرار نہ دیں اور ہم اللہ کے علاوہ آپس میں ایک دوسرے کو خدا نہ مانیں، پس اگر وہ روگردانی کریں تو ان سے کہو کہ تم گواہ ہو کہ ہم اسلام لائے ہیں..... خدا کے فرمان پر سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں.....

(صحیح بخاری ج ۳ ص ۵۷)

اس روایت کو مسلم نے اپنی صحیح میں، سیوطی نے ”درمنثور“ میں نسائی، عبدالرزاق، ابن ابی حاتم اور ابن عباس کے اسناد سے ذکر کیا ہے۔ (صحیح مسلم مع شرح نووی جلد ۱۲ صفحہ ۱۰۳) (تفسیر درمنثور جلد ۲ ص ۳۰)

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام نے جو خط قبیلوں کے سردار مقوقس کے نام لکھا اس میں بھی یہی الفاظ درج تھے: ”يَا هَٰؤُلَاءِ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ“ (اے اہل کتاب! تم آؤ اس کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر و مشترک ہے)

ایک خط جو حضرت پیغمبر اسلام کی طرف منسوب ہے اور کوئی رسم الخط کے ساتھ لکھا ہوا ہے وہ اس خط سے مشابہت رکھتا ہے جو آنحضرت نے ہرقل کے نام لکھا تھا، اس خط کو جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے محفوظ کر کے اس کی کاپیاں بنائی گئی ہیں اور اب وہ متعدد افراد کے پاس موجود ہے۔

بہر حال مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام نے کئی خطوط لکھے اور اس زمانہ کے بادشاہوں کی طرف وفود بھیجے، چنانچہ ایک خط روم کے بادشاہ ہرقل، ایک خط ایران کے فرماں روا بزرگ کسری اور ایک خط حبشہ کے حکمران نجاشی کے نام لکھا، یہ سب کچھ ۶ ہجری کو ہوا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زیر نظر آیت مبارکہ ۶ ہجری میں یا اس سے پہلے نازل ہوئی، جبکہ مؤرخین مثلاً طبری، ابن اثیر اور مقریزی نے لکھا ہے کہ نجران کے نصاریٰ کا وفد ۱۰ ہجری کو حضرت پیغمبر اسلام کی خدمت میں آیا، اور بعض مؤرخین مثلاً ابوالفداء نے البدایہ والنہایہ میں اس کے مانند سیرہ حلبیہ میں مذکور ہے کہ نصاریٰ کا وفد ۹ ہجری کو آیا، تو اس بناء پر آیت کا نزول ۹ ہجری یا ۱۰ ہجری کو ماننا پڑے گا۔

(ملاحظہ ہو: تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۱۳۹، الکامل فی التاریخ جلد ۲ صفحہ ۲۹۳، البدایہ والنہایہ جلد ۵ صفحہ ۵۲، سیرہ حلبی ج ۳ ص ۲۱۲)

ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت مبارکہ ان آیات میں سے ہے جو ہجرت کے پہلے سال میں نازل ہوئیں، چنانچہ اس سلسلہ میں روایات بھی موجود ہیں جو عنقریب ذکر ہوں گی۔

ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت دو بار نازل ہوئی، اس قول کو حافظ ابن حجر نے ذکر کیا ہے۔ آیت مبارکہ کے الفاظ البدایہ والنہایہ کے البتہ آیات کے سیاق سے جس قول کی تائید ملتی ہے..... جیسا کہ ابتدائے سورت میں اس کی بابت اشارہ ہو چکا ہے..... وہ یہ ہے کہ یہ آیت مبارکہ ۹ ہجری سے پہلے نازل ہوئی اور نصاریٰ کے وفد کی آمد کا واقعہ ۶ ہجری یا اس سے پہلے کا ہے،

اور یہ بات بعید نظر آتی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے دو دروازے حکمرانوں یعنی روم، قبط اور فارس کے بادشاہوں کو خطوط لکھے ہوں اور نجران والوں کو نظر انداز کر دیا ہو جبکہ وہ مدینہ کے نزدیک رہتے تھے۔

اس روایت میں ایک قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ کے مکتوب گرامی کا آغاز ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ سے ہوا ہے، اس سے نجران کے وفد کے بارے میں جو بعض روایات ہم ذکر کر چکے ہیں ان میں پایا جانے والا مستقیم ظاہر ہو جاتا ہے جیسا کہ بیہقی نے کتاب دلائل میں لکھا ہے:

”ان رسول اللہ ڪتب الی اهل نجران قبل ان ينزل علیه طس سليمان: بسم الله اله ابراهيم و اسحاق و يعقوب، من محمد رسول الله الی اسقف نجران، ان اسلمتم فانی احمد الیکم اللہ اله ابراهيم و اسحاق و يعقوب، اما بعد فانی ادعوکم الی عبادۃ اللہ من عبادۃ العباد والی ولایۃ اللہ من ولایۃ العباد (فان ابیتم فالجزیۃ وان ابیتم فقد اذنتکم بالحرب، والسلام“

(حضرت پیغمبر اسلامؐ نے اہل نجران کے نام خط لکھا اور یہ خط سورۃ طس سلیمان (نمل) کے نزول سے پہلے لکھا گیا، اس میں آپؐ نے یہ لکھا: شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو معبود ہے ابراہیم و اسحاق و یعقوب کا، اس کے بعد میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ بندوں کی بندگی چھوڑ کر اللہ کی بندگی اختیار کرو اور بندوں کی ولایت و حاکمیت کی قید سے نکل کر اللہ کی ولایت و حاکمیت کے دائرے میں آ جاؤ، اگر تم اسے قبول نہیں کرتے تو جزیرہ ادا کرنے کا کہتا ہوں اور اگر اس کا بھی انکار کرو تو تم سے اعلان جنگ کرتا ہوں، والسلام)..... تفسیر درمنثور ج ۲ ص ۳۸.....

اس روایت پر جو اشکال وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ سورۃ نمل ان سورتوں میں سے ہے جو مکہ میں نازل ہوئیں اور اس کی آیات کے مطالب سے اس بات کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ وہ ہجرت نبویؐ سے پہلے نازل ہوئی، تو اس کا نجران کے وفد کے واقعہ سے کیا ربط بنتا ہے اور کیونکر یہ بات درست قرار دی جاسکتی ہے کہ اس خط میں حضرت پیغمبر اسلامؐ نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کی بجائے بسم اللہ ابراہیم سے آغاز کیا، اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ اس خط میں دیگر مطالب بھی مذکور ہیں کہ جن کی توجیہ و تاویل ممکن نہیں مثلاً جزیرہ ادا کرنا، اعلان جنگ وغیرہ، کیونکہ اسلام ہجرت سے قبل اس قدر قوی نہ ہوا تھا کہ آنحضرتؐ دوسری قوموں سے جزیرہ کا مطالبہ کریں یا اعلان جنگ کریں، (واللہ اعلم)،

تفسیر ”درمنثور“ میں ہے کہ طبرانی نے ابن عباس کے حوالہ سے روایت ذکر کی ہے انہوں نے کہا کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے تمام کفار کو اپنے خطوط میں لکھا: ”تَعَالَوْ اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ.....“ (آؤ اس کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے.....) (تفسیر ”درمنثور“ جلد ۲ صفحہ ۴۰)

سبیل سکینہ

حیدرآباد لطیف آباد، پونٹ نمبر ۸-۷۱

## حضرت ابراہیمؑ کا دین ؟

”در مشور“ میں آیہ مبارکہ ”يَا اَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّوْنَ“ کی تفسیر میں مذکور ہے کہ ابن اسحاق اور ابن جریر، اور بیہقی نے کتاب دلائل میں جناب ابن عباسؓ سے روایت ذکر کی ہے انہوں نے کہا:

”اجتمعت نصاریٰ نجران و اخبار یهود عند رسول اللہ فتنزعوا عنده، فقالت الاخبار: ما كان ابراهيم الا يهودياً، وقالت النصارى، ما كان ابراهيم الا نصرانياً، فانزل الله فيهم: يا اهل الكتاب لم تحاجون في ابراهيم وما انزلت التوراة والانجيل الا من بعده افلا تعقلون، ها انتم هؤلاء حاججتم فيما لكم به علم فلم تحاجون فيما ليس لكم به علم والله يعلم وانتم لا تعلمون، ما كان ابراهيم يهودياً ولانصرانياً ولكن كان حنيفاً مسلماً وما كان من المشركين، ان اولى الناس بابراهيم للذين اتبعوه وهذا النبي والذين امنوا والله ولي المؤمنين“

(نجران کے نصاریٰ اور یہودیوں کے بزرگ علماء (اخبار) حضرت رسول خدا کے پاس اکٹھے ہوئے اور حضور کے سامنے حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں نزاع کرنے لگے، اخبار نے کہا کہ ابراہیمؑ تو بس یہودی تھے، نصاریٰ نے کہا کہ ابراہیمؑ تو بس نصرانی تھے، اس وقت خداوند عالم نے ان کے بارے میں یہ آیات نازل کیں: اے اہل کتاب! تم ابراہیمؑ کے بارے میں کیوں جھگڑا و بحث کرتے ہو حالانکہ تورات و انجیل تو ان کے بعد نازل ہوئی ہیں کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے، اللہ کو علم ہے لیکن تمہیں علم نہیں، ابراہیمؑ نہ یہودی تھا اور نہ نصرانی، بلکہ وہ خالص مسلمان تھا اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا، بے شک وہی لوگ ابراہیمؑ کے زیادہ حقدار ہیں جنہوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں، اور اللہ ایمان والوں کا ولی و حاکم ہے)

اس وقت ابورافع قرظی (بنی قریظہ کا یہودی) کہنے لگا کہ:

”الترید منا یا محمد ان نعبدک كما تعبد النصارى عیسیٰ بن مریم ؟“

اے محمد کیا آپ چاہتے ہیں کہ جس طرح نصاریٰ عیسیٰ بن مریمؑ کی پرستش کرتے ہیں اسی طرح ہم آپ کی پوجا کریں؟

”فقہل رجل من اهل نجران: اذلك ترید یا محمد ؟“

اس وقت اہل نجران میں سے ایک شخص نے کہا: اے محمد! کیا آپ بھی چاہتے ہیں؟

” فقال رسول الله (ص): معاذ الله ان اعبد الله ان اعبد غير الله او امر بعبادة غيره، ما بذلك

بعثنى ولا امرنى“ ،

حضرت پیغمبر اسلام نے ارشاد فرمایا: میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت کروں یا اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت کا حکم دوں، مجھے خدا نے ہرگز اس کام کے لئے نہیں بھیجا اور نہ ہی ایسا کرنے کا حکم دیا ہے،

”فانزل الله في ذلك من قولهما: ما كان لبشر ان يوئيه الله الكتاب والحكم والنبوة ثم يقول للناس كونوا عبادا لي من دون الله ولكن كونوا ربانيين بما كنتم تعلمون الكتاب وبما كنتم تدرسون، وليا امركم ان اتخذوا الملائكة والنبيين ارباباً اياً مكرم بالكفر بعد اذ انتم مسلمون“

اس وقت ان دونوں کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی: ”کسی بشر کے لئے یہ روا نہیں کہ خدا سے کتاب، حکومت اور نبوت عطا کرے تو وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میری عبادت کرو، بلکہ (اسے یہ کہنا چاہیے کہ) تم خدا پرست ہو کیونکہ تم کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور خود بھی پڑھتے ہو، اور وہ تمہیں یہ حکم نہیں دیتا کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو خدا قرار دے دو، کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے سکتا ہے جبکہ تم مسلمان ہو چکے ہو؟..... اس کے بعد آنحضرت نے اسی سورۃ مبارکہ کی آیت ۸۱ کی تلاوت کی جس میں خدا نے ان (یہود و نصاریٰ) سے اور ان کے آباء و اجداد سے رسول اللہ کے بارے میں بیثاق لیا کہ وہ جب آئیں تو ان پر ایمان لانا اور ان کی تصدیق کرنا، حضرت رسول خدا نے انہیں اس بیثاق اور اس پران کی طرف سے اقرار کو یاد دلایا، (تفسیر درمنثور ج ۲ ص ۳۰)

میں سمجھتا ہوں کہ یہ آیات مبارکہ (۷۹، ۸۰) ”مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُؤْتِيَهُ اللهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ“ اپنے سیاق کی بناء پر پیغمبر اسلام کی بجائے نہایت آسانی اور بھرپور مطابقت کے ساتھ حضرت عیسیٰ بن مریم پر منطبق ہوتی ہیں، اس سلسلہ میں مزید وضاحت ان آیات کی تفسیر میں ہوگی، البتہ مذکورہ بالا روایت میں ان آیات کے شان نزول کی بابت جو کچھ ذکر ہوا کہ وہ حضرت پیغمبر اسلام کے بارے میں نازل ہوئی ہیں شاید یہ بات جناب ابن عباس کی ذاتی رائے و استنباط ہو، ورنہ قرآنی اسلوب تو یہ ہے کہ اس طرح کے موضوعات کا تذکرہ سوال و جواب یا بیان ورد کی صورت میں کرتا ہے جبکہ یہاں ایسا نہیں ہوا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابن عباس کی اپنی سوچ ہے جس کا آیات کے شان نزول سے کوئی تعلق نہیں۔

## ایک سب آموز واقعہ

تفسیر ”خازن“ میں مذکور ہے کہ کلبی نے ابوصالح کے حوالہ سے ابن عباس سے، اور محمد بن اسحاق نے ابن شہاب کے حوالہ سے اپنے اسناد کے ساتھ مسلمانوں کی بسوئے حبشہ ہجرت کے بارے میں بیان کیا ہے کہ جب جعفر ابن ابی طالب اور چند صحابہ کرام نے حبشہ کی طرف ہجرت کی اور وہاں سکونت پذیر ہو گئے اور حضرت پیغمبر اسلام نے مدینہ کی طرف ہجرت کی اور جنگ بدر کا واقعہ پیش آیا تو قریش نے دارالندوہ میں اجتماع کیا اور فیصلہ کیا کہ ہم بدر میں مارے جانے والے اپنے افراد کا بدلہ محمد کے ان اصحاب سے لیں جو اس وقت حبشہ میں ہیں، چنانچہ انہوں نے کافی مال جمع کیا اور اسے نجاشی کو ہدیہ بھیجا کہ شاید وہ ان لوگوں کو ان کے سپرد کر دے، اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنے دو معتبر و سمجھدار افراد کا انتخاب کیا، چنانچہ عمرو بن عاص اور عمارہ بن ابی معیط کو وہ تمام اموال و ہدایا دے کر نجاشی کی طرف روانہ کیا، وہ دونوں کشتی پر سوار ہوئے اور حبشہ پہنچ گئے، جب وہ نجاشی کے دربار میں داخل ہوئے تو انہوں نے سب سے پہلے اسے سجدہ کیا اور پھر سلام کیا، اس کے بعد انہوں نے اپنا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہماری قوم کے افراد آپ کے خیر خواہ اور شکر گزار ہیں اور اہل حبشہ سے انہیں بہت محبت ہے، انہوں نے ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے تاکہ آپ کو ان لوگوں کے بارے میں باخبر کریں جو آپ کے علاقہ و ملک میں آباد ہوئے ہیں کہ وہ ایک ایسے شخص کے پیروکار ہیں جو جھوٹا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ وہ خدا کا رسول ہے، ہم میں سے کسی نے اس کی بات نہیں مانی سوائے چند بیوقوف لوگوں کے، ہم نے ان پر عرصہء حیات تنگ کر دیا تھا اور انہیں اپنے علاقہ میں ایک شعب میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا تاکہ کوئی شخص ان کے پاس نہ جاسکے، جس سے وہ نہایت تنگی کا شکار ہو گئے اور بھوک و پیاس سے مرنے لگے، اور جب پانی سر سے گزرنے لگا اور اس شخص کو ہر طرف مشکلات نے گھیر لیا تو مجبور ہو کر اس نے اپنے چچا زاد کو آپ کے پاس بھیجا تاکہ وہ آپ کے دین اور ملک و قوم کو تباہ کرے، لہذا اگر آپ ان کے شر سے بچنا چاہتے ہیں تو ان لوگوں کو ہمارے سپرد کر دیں ہم آپ کو ان کے شر سے بچا سکتے ہیں، اور ان کی نشانی ہم آپ کو بتائے دیتے ہیں کہ وہ جب آپ کے پاس آئیں گے وہ آپ کو سجدہ نہ کریں گے اور نہ ہی اس طرح سلام و ادائے احترام کریں گے جس طرح دوسرے لوگ آپ کو سلام و آداب بجالاتے ہیں کیونکہ وہ آپ کے دین اور آداب کے قائل ہی نہیں بلکہ اسے مسترد کرتے ہیں،

چنانچہ نجاشی نے مہاجرین اسلام کو دربار میں پیش ہونے کے لئے بلوایا، جو نبی وہ آئے تو سب سے پہلے جناب جعفر نے دروازہ پر کھڑے ہو کر دربار میں داخل ہونے کی اجازت طلب کی اور یہ الفاظ بلند آواز میں کہے:

خدا کی جماعت آپ سے اجازت طلب کرتی ہے،

نجاشی نے کہا: اس سے کہو کہ دوبارہ اپنا جملہ دہرائے،

جعفر نے دوبارہ وہی الفاظ بلند آواز میں کہے،

نجاشی نے کہا: بس، وہ خدا کی حفاظت و امان میں دربار میں داخل ہو جائیں، یہ بات سنتے ہی عمرو بن عاص نے اپنے ساتھی سے کہا: تو نے سنا ہے کہ ان لوگوں نے کس دریدہ دہنی کے ساتھ اپنے آپ کو خدا کی جماعت کہا اور بادشاہ نے انہیں کس طرح جواب دیا؟ گویا انہیں اس سے سخت دکھ ہوا، پھر مہاجرین دربار میں داخل ہوئے مگر انہوں نے نجاشی کو سجدہ نہ کیا، عمرو بن عاص نے موقع پا کر نجاشی سے کہا کہ آپ نے دیکھا ہے کہ یہ لوگ کس قدر متکبر ہیں کہ آپ کو سجدہ کرنا گوارا نہیں کرتے!

نجاشی نے مہاجرین سے پوچھا کہ تم لوگوں نے مجھے سجدہ کیوں نہیں کیا اور جس طرح دنیا بھر سے آنے والے مجھے سلام کرتے ہیں اور میرے سامنے آداب و بجالاتے ہیں تم نے اس طرح سلام و ادائے احترام کیوں نہیں کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم تو صرف اللہ کو سجدہ کرتے ہیں جس نے آپ کو اور آپ کے ملک کو پیدا کیا ہے، ہم نے جس طرح آپ کو سلام کیا ہے یہی ہمارا طرز سلام و آداب ہے، ہم بتوں کی پوجا کرتے تھے پھر خداوند عالم نے ہم میں ایک سچا نبی بھیجا تو اس نے ہمیں اس طرح سلام کرنے کا حکم دیا جو خدا کو پسند ہے اور وہ سلام ہے جو اہل بہشت کا طرز آداب ہے، ان کی بات سن کر نجاشی جان گیا کہ ان کی بات درست اور حق ہے اور یہ بات تورات و انجیل میں لکھی ہوئی ہے، نجاشی نے پوچھا کہ تم میں سے کس نے بلند آواز سے سلام کیا اور اجازت طلب کی تھی؟

جعفر نے کہا: وہ میں ہوں، اور آپ روئے زمین پر موجود بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ ہیں کہ جن کا تعلق اہل کتاب سے ہے، آپ کے حضور زیادہ باتیں کرنا اور ناروا بولنا صحیح نہیں البتہ میں چاہتا ہوں کہ اپنے ساتھیوں کی طرف سے ان دو حضرات کی باتوں کا جواب دوں، انہیں حکم دیں کہ وہ اپنی بات کریں لیکن اس طرح کہ ان میں سے ایک بولے اور دوسرا خاموش رہے اور آپ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کو سنتے رہیں، اس وقت عمرو بن عاص نے جعفر سے کہا: آپ بات کریں، جعفر نے نجاشی سے کہا:

آپ ان سے پوچھیں کہ ہم غلام تھے یا آزاد؟ اگر ہم غلام تھے اور اپنے آقاؤں سے دامن چھڑا کر بھاگ کے آئے ہیں تو آپ اے نجاشی! ہمیں ہمارے آقاؤں کے سپرد کر دیں،

نجاشی نے ان دو سے پوچھا، کیا یہ لوگ غلام ہیں یا آزاد؟

عمرو بن عاص نے کہا: یہ لوگ غلام نہیں ہیں بلکہ آزاد اور عزت دار لوگ ہیں،

نجاشی نے کہا: غلامی کا مسئلہ تو حل ہوا اور ثابت ہو گیا کہ وہ غلام نہیں،

جعفر نے کہا: ان سے پوچھیں کہ آیا ہم نے کوئی ناحق خون بہایا ہے کہ جس کا قصاص ہم سے کیا جائے؟



عمر نے کہا: نہیں، انہوں نے ایک قطرہ خون بھی نہیں بہایا۔

جعفر نے کہا: ان سے پوچھیں کہ آیا ہم نے لوگوں کا مال ناحق طور پر ان سے چھینا ہے کہ جسے واپس کرنا ہماری ذمہ

داری ہے؟

نجاشی نے کہا: اگر وہ مال سونے سے لداونٹ ہی کیوں نہ ہو وہ میں خود واپس کر دوں گا۔

عمر نے کہا: نہیں، ایک کوڑی بھی انہوں نے کسی کی نہیں لی ہے،

نجاشی نے پوچھا: تو پھر تم ان لوگوں سے کس چیز کا مطالبہ رکھتے ہو؟

عمر نے جواب دیا، بات یہ ہے کہ ہم اور یہ لوگ سب ایک دین پر تھے جو کہ ہمارے آباء و اجداد کا دین تھا مگر ان

لوگوں نے اسے چھوڑ دیا اور نئے دین کی پیروی کرنے لگے لہذا ہماری قوم کے افراد نے ہمیں بھیجا تا کہ آپ انہیں ہمارے سپرد

کریں،

نجاشی نے پوچھا: وہ کون سا دین تھا جس پر تم سب تھے اور انہوں نے اسے چھوڑ کر جس دین کی پیروی کی وہ کیا

ہے؟

جعفر نے اس کے جواب میں کہا: ہم نے جس دین کو چھوڑا ہے وہ شیطانی دین تھا، ہم خدا کا انکار کرتے تھے اور

پتھروں کی پوجا کرتے تھے، اور اب ہم نے جس دین کو اختیار کیا ہے وہ خدائی دین ہے جو کہ اسلام ہے اور وہ اللہ کی طرف سے

بھیجا ہوا ایک شخص لایا ہے اور ایک آسمانی کتاب بھی اس کے پاس ہے کہ جو عیسیٰ بن مریم کی کتاب جیسی ہے اور اس کے عین

مطابق ہے۔

نجاشی نے کہا: اے جعفر! تو نے بہت بڑی بات کہہ دی ہے!

پھر نجاشی نے حکم دیا کہ نفاہہ بجایا جائے، چنانچہ نفاہہ بجایا گیا جسے سن کر تمام قسیس و راہب جمع ہو گئے، جب وہ سب

نجاشی کے دربار میں آ گئے تو اس نے ان سے کہا: میں تمہیں اس اللہ کی قسم دیتا ہوں جس نے عیسیٰ پر انجیل نازل کی، کیا تم عیسیٰ

اور قیامت کے دن اور قیامت کے دن سے پہلے کسی خدا کی طرف سے بھیجے جانے والے نبی کا تذکرہ کہیں پاتے ہو؟

ان سب نے کہا: ہاں، خدا گواہ ہے ہمیں عیسیٰ نے اس کے آنے کی بشارت دی اور فرمایا ہے کہ جو اس پر ایمان

لائے گا گویا وہ مجھ پر ایمان لایا اور جو اس کا انکار کرے گا گویا اس نے میرا انکار کیا،

نجاشی نے جعفر سے پوچھا: وہ شخص تم سے کیا کہتا ہے؟ اور تمہیں کس چیز کا حکم دیتا ہے؟ اور کس چیز سے منع کرتا ہے؟

جعفر نے کہا: وہ خدا کی کتاب ہمارے سامنے پڑھتا ہے اور ہمیں نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے، وہ ہمیں

حکم دیتا ہے کہ ہمسایہ کے ساتھ نیک سلوک کرو، صلہ رحمی کرو اور یتیم پروری کرو، وہ ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم خدائے یکتا کی عبادت

کریں کہ جس کا کوئی شریک نہیں،

نجاشی نے کہا: جو کچھ وہ تم لوگوں کے سامنے پڑھتا ہے اس میں سے مجھے بھی سناؤ،  
جعفر نے سوہ عنکبوت اور سورۃ روم کی تلاوت کی، تو نجاشی اور اس کے درباریوں کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور وہ  
پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور انہوں نے کہا: کچھ اور بھی سنائیں اور اس پاکیزہ کلام سے مزید کچھ تلاوت کریں،  
جعفر نے سورۃ کہف کی تلاوت کی،

عمرو بن عاص نے صورتحال دیکھی تو اس سے رہانہ گیا اور نجاشی کو غصہ دلانے کے لئے اس کے پاس اس کے سوا  
چارہ کار نہ تھا کہ اسے ان کے بارے میں غلط معلومات دے کر اپنا مطلوب حاصل کرے چنانچہ اس نے نجاشی سے کہا کہ یہ  
لوگ عیسیٰ اور ان کی مادر گرامی کو برا بھلا کہتے ہیں،

جعفر نے سورۃ مریم کی تلاوت شروع کر دی اور جب عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریمؑ کا ذکر آیا تو نجاشی نے اپنے  
مساک کا ایک نہایت چھوڑا سا ٹکڑا اٹھایا اور کہنے لگا: خدا کی قسم! حضرت مسیح نے اس چھوٹے سے ٹکڑے کے برابر بھی اس  
سے زیادہ کچھ نہیں کہا جسے تم نے پڑھا اور جس کے تم قائل ہو،

پھر نجاشی نے جعفر اور ان کے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ آپ لوگ جائیں اور اب میری مملکت میں بے  
خوف و خطر زندگی بسر کریں، تمہیں کوئی شخص گزند نہیں پہنچا سکتا، تم امن و امان کے ساتھ رہو، اس کے بعد وہ کہنے لگا: میں تمہیں  
خوشخبری دیتا ہوں اور یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ کوئی شخص تمہاری طرف پھینکی و ٹیڑھی نظر اٹھا کے نہیں دیکھے گا، میری حکومت میں  
ابراہیمی گروہ کو کوئی خطرہ لاحق نہیں،

عمر نے پوچھا، اے نجاشی! ابراہیمی گروہ سے مراد کون لوگ ہیں (ہم یا یہ لوگ؟)  
نجاشی نے جواب دیا کہ ابراہیمی گروہ یہ مہاجرین ہیں جو میرے پاس آئے ہیں اور ان کا وہ بزرگ کہ جس کی  
طرف سے یہ لوگ یہاں آئے ہیں اور ہر وہ شخص جو ان کی پیروی کرے،  
نجاشی کی بات ان مشرکوں کو ناگوار گزری اور انہوں نے اسے قبول نہ کیا اور دعویٰ کرنے لگے کہ ہم بھی ابراہیمؑ کے  
دین پر ہیں (ہم ہی ابراہیمی گروہ ہیں)۔

پھر نجاشی نے عمرو اور عمارہ کو وہ مال واپس کر دیا جو وہ اس کے لئے لائے تھے اور ان سے کہا کہ تمہارا یہ ہدیہ دراصل  
رشوت ہے تم اسے لے لو، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، خداوند عالم نے یہ حکمرانی و سلطنت مجھ سے رشوت لے کر مجھے عطا  
نہیں کی،

جعفر نے اس رودار کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ پھر ہم وہاں سے واپس آئے اور ہم نے نجاشی کے دیار میں نہایت

عمدہ ہمسائیگی پائی، اس واقعہ اور نجاشی کے دربار میں ہونے والی گفتگو کو عمر و بن عاص و عمارہ اور جعفر کے درمیان ہونے والی گفتگو کے حوالہ سے خداوند عالم نے حضرت پیغمبر اسلامؐ پر جو کہ اس وقت مدینہ میں تھے یہ آیت نازل فرمائی: ”إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِأِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوا وَهَذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ“ (ابراہیم کے زیادہ حقدار وہ ہیں جنہوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لائے، اور اللہ ایمان لانے والوں کا ولی ہے)

یہ واقعہ متعدد دیگر اسناد سے بھی مذکور ہے اور اہل بیت علیہم السلام کے حوالہ سے بھی منقول ہے، ہم نے اس کے طولانی ہونے کے باوجود اسے یہاں اس لئے بیان کر دیا ہے کہ اس سے صدر اسلام کی تاریخ کے نہایت اہم مراحل و ادوار کا پتہ چلتا ہے اور یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس دور میں مسلمان مہاجرین کس قدر شدید حالات و بحرانون کا شکار ہوئے، البتہ یہ بات یاد رہے کہ اس واقعہ کا آیت مبارکہ کے نزول سے تعلق نہیں اور نہ ہی ہم نے اس آیت کے شان نزول کے طور پر ذکر کیا ہے،

### دین ابراہیمی کی وضاحت

تفسیر العیاشی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی مذکور ہے کہ آپؐ نے آیہ مبارکہ ”مَا كَانَ إِبْرَاهِيمَ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا“ کی تفسیر میں ارشاد فرمایا:

قال امير المؤمنين: لا يهودياً يصلى الى المغرب ولا نصرانياً يصلى الى المشرق لكن كان حنيفاً مسلماً على دين محمد

حضرت امیر المؤمنینؑ نے فرمایا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نہ یہودی تھے کہ مغرب کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے اور نہ نصرانی تھے کہ مشرق کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے بلکہ وہ خالص مسلمان اور دین محمدیؐ پر تھے۔

(تفسیر العیاشی ج ۱ ص ۱۷۷)

سابق الذکر مطالب میں اس حدیث کے معنی کی وضاحت ہو چکی ہے اور یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا دین محمدیؐ پر ہونا کیونکر ہے؟ اس روایت میں کعبہ کا قبلہ قرار دیا جانا بھی مورد توجہ واقعہ ہوا ہے، کیونکہ قبلہ کی تبدیلی کا حکم مدینہ منورہ میں نازل ہوا اور شہر مکہ اور خانہ کعبہ تقریباً مدینہ کی جنوبی سمت میں واقع ہے، چونکہ یہودیوں اور نصرانیوں نے کعبہ کا قبلہ ہونا تسلیم نہیں کیا لہذا وہ اس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کی بجائے مغرب و مشرق کی طرف رخ کرنے لگے چنانچہ یہودی نے مکہ سے مغرب کی جانب بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے لگے کیونکہ بیت المقدس مدینہ کی نسبت غربی سمت میں واقع ہے

اور نصاریٰ تو مشرق کی طرف ہی منہ کر کے نماز پڑھتے تھے، اس حوالہ سے ان دونوں گروہوں کو حد وسط سے روگردان قرار دیا گیا چنانچہ اس سلسلہ میں آیت مبارکہ کے الفاظ میں کہ جو مسلمانوں کے بارے میں وارد ہوئے انہیں ”درمیانی امت“ سے موسوم کیا گیا (و كذلك جعلناكم امة وسطاً.....)، بہر حال یہ روایت اس سے زیادہ کسی مطلب کو بیان نہیں کرتی بلکہ اسی خاص و لطیف نکتہ کی عکاسی کرتی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے (یعنی ابراہیمؑ کا دین محمدؐ پر ہونا اور مشرق کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرنا مدینہ سے جغرافیائی سمت کے حوالہ سے ہے)

### ”حنیف“ کا معنی

کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: ”حنیف“ کا معنی خالص و مخلص ہے یعنی حضرت ابراہیمؑ خالص توحید پرست تھے اور ان کے بارے میں شرک و بت پرستی کا ذرہ بھر گمان نہیں ہو سکتا، (کافی ج ۲ ص ۱۵ ا ح)

### آنحضرتؐ سے دوستی و دشمنی کا معیار

تفسیر ”مجمع البیان“ میں آیت مبارکہ ”إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ.....“ کے ذیل میں مذکور ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

”ان اولی الناس بالانبياء اعملهم بما جاؤا به، ثم تلا هذه الآية وقال: ان ولي محمد من اطاع الله وان بعدت لحيته، و ان عدو محمد من عصي الله وان قربت لحيته“  
(بے شک لوگوں میں سے انبیاء علیہم السلام کا زیادہ حقدار وہ ہے جو ان کے لئے ہوئے دین و آئین پر زیادہ عمل پیرا ہو، اس کے بعد امامؑ نے یہ آیت تلاوت فرمائی (إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ.....)، اور فرمایا: بے شک حضرت محمدؐ کا دوست و محبت وہ ہے جو خدا کا اطاعت گزار ہو خواہ وہ آنحضرتؐ کا قریبی نہ ہو، اور حضرت محمدؐ کا دشمن وہ ہے جو خدا کی نافرمانی کرتا ہو خواہ وہ آنحضرتؐ کا قرابت دار کیوں نہ ہو،

(تفسیر مجمع البیان ج ۲ ص ۲۵۸)

## آئمہ اطہار اور ان کے پیروکار

کافی اور تفسیر العیاشی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی مذکور ہے جس میں آپؑ نے فرمایا:  
حضرت ابراہیمؑ کے زیادہ حقدار آئمہ اور ان کے پیروکار ہیں، (ہم اللائمة ومن اتبعہم)  
(ملاحظہ ہو: کافی جلد ۱ صفحہ ۴۱۶ حدیث ۲۰، تفسیر العیاشی جلد ۱ صفحہ ۱۷۷ حدیث ۶۲)

## تم آل محمدؑ میں سے ہو!

تفسیر قمی اور تفسیر العیاشی میں عمر بن اذینہ کے حوالہ سے ایک روایت ذکر کی گئی ہے کہ امامؑ نے اس سے فرمایا:  
”انتم واللہ من آل محمد“ (خدا کی قسم! تم آل محمدؑ میں سے ہو) عمر بن اذینہ نے عرض کی: میری جان آپ پر خدا ہو،  
کیا ہم انہی میں سے ہیں؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: ”نعم واللہ من انفسہم؟“ ہاں! خدا کی قسم! خود انہی میں سے  
ہو، (امامؑ نے اس جملہ کو تین بار دہرایا) پھر امامؑ نے میری طرف اور میں نے امامؑ کی طرف بھرپور نگاہ کی، پھر امامؑ نے مجھ سے  
مخاطب ہو کر یہ آیت تلاوت فرمائی: ”ان اولی الناس.....“  
(تفسیر العیاشی جلد ۱، صفحہ ۱۷۷، تفسیر قمی جلد ۱ صفحہ ۱۰۵)

## تبدیلی قبلہ اور اہل کتاب کا رد عمل

تفسیر قمی میں آیت مبارکہ ”وَقَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُونَا“ کی تفسیر میں حضرت امام محمد باقر علیہ  
السلام کا ارشاد گرامی مذکور ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

”ان رسول اللہؐ لما قدم المدینة وهو یصلی نحو بیت المقدس اعجب ذلک القوم  
فلما صرفہ اللہ عن بیت المقدس الی بیت اللہ الحرام وجدت الیہود من ذلک، وكان صرف  
القبلة صلوة الظهر، فقالوا صلی محمد الغداة واستقبل قبلتنا فآمنوا بالذی انزل علی محمد  
وجه النهار واكفروا اخره یعنون القبيلة حين استقبل رسول اللہ المسجد الحرام“  
(جب حضرت پیغمبر اسلامؐ مدینہ تشریف لائے تو بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے تھے جس سے

سب لوگ خوش تھے اور جب تبدیلی قبلہ کا حکم آیا اور خداوند عالم نے بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ کی طرف رخ کرنے کا فرمان جاری کیا تو یہ بات یہودیوں کو سخت ناگوار گزری، قبلہ کی تبدیلی نماز ظہر کے دوران ہوئی، یہودیوں نے کہا کہ محمدؐ نے صبح کی نماز ہمارے قبلہ یعنی بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھی لہذا تم اسی پر ایمان لاؤ جو محمدؐ پر صبح کے وقت نازل ہوا اور جو ان پر دن کے آخر میں نازل ہوا اس کا انکار کرو، دراصل ”دن کے آخر“ سے ان کا مقصد ظہر کے وقت تبدیلی قبلہ کا حکم ہے)

(تفسیر قمی ج ۱ ص ۱۰۴)

اس روایت میں جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں جملہ ”وَجْهَ النَّهَارِ“ کو جملہ ”اَنْزِلَ“ کا ظرف قرار دیا گیا ہے نہ کہ ”اَمْثُوا“ کا، اس سلسلہ میں ہم اپنے سابقہ بیانات میں وضاحت کر چکے ہیں۔

## یہودیوں کی شاطرانہ کوشش

تفسیر ”درمنثور“ میں مذکور ہے کہ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے عوفی کے حوالہ سے آیت مبارکہ ”وَقَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ..... اَلْع“ کی تفسیر میں ابن عباس کی روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: ”ان طائفة من اليهود قالت: اذا لقيتم اصحاب محمد اول النهار فآمنوا، واذا كان آخره فصلوا صلوتكم لعلهم يقولون: هؤلاء اهل الكتاب وهم اعلم منا لعلهم ينقلبون عن دينهم“

یہودیوں کے ایک گروہ نے کہا کہ جب تم دن کی ابتداء میں محمدؐ کے ساتھیوں سے ملو تو ایمان لے آؤ (ایمان لانے کا اظہار کرو)، اور جب دن کا آخر ہو تو اپنی نمازیں..... اپنے طور پر بیت المقدس کی طرف رخ کر کے..... ادا کرو، شاید وہ آپس میں کہیں کہ یہ تو اہل کتاب ہیں اور یہ ہم سے زیادہ دین و شریعت کا علم رکھتے ہیں، ممکن ہے اس طرح بات کرنے سے وہ (مسلمان) اپنے دین سے روگردانی کر لیں،

(تفسیر درمنثور ج ۲ ص ۴۳)

مؤلف تفسیر درمنثور نے اس روایت کو سدی اور مجاہد کے حوالہ سے بھی ذکر کیا ہے۔

## عہد الہی کو بیچنے کا انجام

کافی میں آیت مبارکہ ”اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْكُرُوْنَ يَعْهَدُوْا لِلّٰهِ..... اَلْع“ کی تفسیر میں امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد گرامی مذکور ہے کہ آپؐ نے فرمایا: قرآن مجید میں ”عہد“ کی بابت یہ آیت نازل ہوئی ہے: ”اِنَّ الَّذِيْنَ

يَسْتُرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيَّمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ، والخلاق النصب، فمن لم يكن له نصيب في الآخرة فبإى شيى يدخل الجنة،“ اس آیت میں لفظ ”خلاق“ ذکر ہوا ہے جس کا معنی حصہ ہے تو جس شخص کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو وہ بہشت میں کیسے داخل ہو سکتا ہے؟ (کتاب کافی ج ۲ ص ۲۸)

## ایک تفسیری بحث

کتاب ”امالی“ میں شیخؒ نے اپنے اسناد سے عدی بن عدی کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے اپنے والد سے روایت بیان کی کہ انہوں نے کہا ”امرؤ القیس“ کا حضرموت کے ایک شخص سے کسی زمین کی ملکیت کے بارے میں جھگڑا تھا وہ دونوں حضرت پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپؐ نے امرؤ القیس سے پوچھا: کیا تیرے پاس اس زمین کی مالکیت کا ثبوت ہے؟ اس نے کہا: نہیں، آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: تو پھر مدعی علیہ کی قسم کے مطابق فیصلہ ہوگا، اس نے کہا خدا کی قسم! اس طرح تو میری زمین میرے ہاتھ سے چلی جائے گی، آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ اگر حقیقت میں زمین تیری ہے اور وہ جھوٹی قسم کھا کر تیری زمین لے گا تو خداوند عالم قیامت کے دن اس کی طرف نگاہ ہی نہ کرے گا اور نہ ہی اس کا تذکرہ کرے گا بلکہ وہ دردناک عذاب میں مبتلا ہوگا، یہ سننا ہی تھا تو وہ شخص خوفزدہ ہو گیا اور اس نے وہ زمین امرؤ القیس کو واپس کر دی۔

(کتاب امالی، ج ۱ ص ۳۶۸)

جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں اس روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ واقعہ ہی آیت مبارکہ کا شان نزول ہے اور اہل سنت کی اسناد سے متعدد روایات میں مذکور ہے کہ یہی واقعہ آیت کا شان نزول ہے، لیکن ان میں بھی تعارض پایا جاتا ہے اور وہ اس طرح کہ بعض روایات میں ہے کہ امرؤ القیس اور حضرموت کے ایک شخص کے درمیان نزاع تھا جیسا کہ مذکورہ بالا روایت میں ہے، اور بعض روایات میں ہے کہ اشعث بن قیس اور ایک یہودی شخص کے درمیان زمین کا جھگڑا تھا، اور بعض روایات میں ہے کہ یہ آیت ایک کافر کے بارے میں نازل ہوئی جو بازار میں کھڑا ہو کر سامان بیچ رہا تھا اور خدا کی قسمیں کھا کر کہہ رہا تھا کہ فلاں شخص یہ چیز اس قیمت پر خریدنا چاہتا تھا مگر میں نے نہیں دی، تو اس طرح وہ مسلمانوں کو دھوکہ دے کر زیادہ قیمت وصول کرنا چاہتا تھا، اس وقت یہ آیت اتری (إِنَّ الَّذِينَ يَسْتُرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيَّمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا..... الخ)، بہر حال آپ اس امر سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ ظاہر الایۃ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سابقہ آیات میں مذکور مطالب کی علت و سبب کے بیان پر مشتمل ہے لہذا اس سلسلہ میں جو روایات وارد ہوئی ہیں اور ان میں مختلف واقعات کا حوالہ دیا گیا ہے تو وہ مختلف واقعات کی آیت پر تطبیق کے باب سے ہے نہ یہ کہ وہ آیت کے شان نزول کے بیان میں ہیں۔

## آیات ۷۹ ، ۸۰

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ ﴿٧٩﴾  
 وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُتَّخَذُوا الِهْلَكَةَ وَالنَّبِيْنَ أَرْبَابًا أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكَفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿٨٠﴾

## ترجمہ

- ” کسی بشر کے لئے روا نہیں کہ جسے خدا کتاب، اقتدار اور نبوت دے تو وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میری عبادت کرو، لیکن (وہ کہتا ہے) کہ تم اللہ والے بنو کیونکہ تم کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور کتاب کو پڑھتے ہو“ (۷۹)
- ” اور وہ تمہیں ہرگز یہ حکم نہیں دیتا کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو رب بناؤ، کیا وہ تمہیں کفر اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے جبکہ تم مسلمان ہو چکے ہو“ (۸۰)



## تفسیر و بیان

ان آیات مبارکہ کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مربوط آیات کے فوراً بعد ذکر کیا جانا اس بات کا اشارہ دیتا ہے کہ یہ آیات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پاکیزگی اور ان کی ذات والا صفات کا ان مطالب سے منزہ ہونا ثابت کرتی ہیں جو اہل کتاب میں سے نصاریٰ آجنتاب کی طرف منسوب کرتے ہیں، گویا آیات کا مضمون یوں ہے:

جس طرح تم گمان کرتے ہو عیسیٰ ویسے نہیں، وہ نہ تو رب ہے اور نہ وہ خود رب ہونے کا دعویٰ دیتا ہے، اس کے رب نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ بشری مخلوق ہے، اسے اس کی ماں نے جنا اور گوارہ میں اس کی پرورش کی، بات صرف اتنی ہے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوا ہے اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے آدم کی خلقت، ماں اور باپ کے بغیر ہوئی، لہذا اللہ کے نزدیک اس کی مثال آدم جیسی ہے، اور جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے تو اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ نبی ہے کہ جسے کتاب، اقتدار اور نبوت عطا کی گئی ہے، تو جو اس طرح کا ہو وہ بندگی خدا کا اعزاز ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دے گا اور اس سے ہرگز یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ لوگوں سے کہے کہ مجھے رب مانو اور خدا کو چھوڑ کر میری عبادت کرو، اسی طرح یہ بھی اس کے لئے روا نہیں کہ اپنے علاوہ کسی دوسرے بندہ خدا مثلاً کسی بادشاہ یا نبی کے بارے میں اس طرح کی بات کرے کہ بندگان خدا میں سے کسی کو وہ منصب دے جو اس کا حق نہ ہو یا انبیاء الہی میں سے کسی سے اس کے خدائی منصب مثلاً رسالت کی نفی کر کے اس سے خدا کا عطا کردہ حق چھین لے۔

## خدائی ضابطہ اخلاق

○ ” مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنَّبُوءَةَ تَحْتَهُمْ يَقُولُ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ“

(کسی بشر کے لیے روا نہیں کہ جسے اللہ کتاب، اقتدار و نبوت عطا کرے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے عبادت گزار بنو)

لفظ ”بشر“ لفظ ”انسان“ کے مترادف ہے، یہ لفظ ایک انسان اور کثیر انسانوں کے لئے یکساں استعمال ہوتا ہے یعنی

ایک انسان کو بھی ”بشر“ کہتے ہیں اور انسانوں کے ایک گروہ اور کثیر تعداد کو بھی ”بشر“ کہا جاتا ہے۔  
لفظ ”بشر“ پر حرف لام یہاں ملکیت کا معنی دیتا ہے، اس بناء پر آیت کا معنی یوں ہوگا کہ کوئی بشر اس کا مالک نہیں یعنی اسے حق حاصل نہیں، اس کی قرآنی مثالیں یہ ہیں:

سورہ نور، آیت: ۱۶:

” مَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَتَّكِمَ بِهِذَا“

(ہمیں یہ حق حاصل نہیں کہ یہ بات زبان پر لائیں)

سورہ آل عمران، آیت: ۱۶۱:

” وَمَا كَانَ لِنَبِيِّ أَنْ يُغْلَ“

(کسی نبی کو حق حاصل نہیں کہ وہ خیانت کرے) یعنی کوئی نبی خیانت نہیں کر سکتا۔

جملہ ” أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَ وَالنُّبُوَّةَ“، حرف ”كَانَ“ (مَا كَانَ لِبَشَرٍ) کا اسم ہے، اس کے ساتھ ساتھ بعد والے جملہ ” ثُمَّ يَقُولُ لِلنَّاسِ“ کے لئے مقدمہ و تمہید کی حیثیت رکھتا ہے، اور اس جملہ کا مقدمہ و تمہید کے طور پر یہاں ذکر کیا جانا جبکہ اس کے بغیر بھی آیت کا معنی درست و واضح تھا ظاہر اس لئے ہے کہ جملہ ”مَا كَانَ لِبَشَرٍ“ کے معنی کی دوسری جہت معلوم رہے اور وہ یہ کہ اگر یوں کہا جاتا: ”مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يَقُولَ.....“ (کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے.....) تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ خدا کی طرف سے کسی انسان کو یہ حق نہیں دیا گیا جبکہ ممکن ہے وہ اس طرح کی بات خدا کی نافرمانی و سرکشی کرتے ہوئے کہے، لیکن جب یوں کہا جائے: ”مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولُ لِلنَّاسِ..... الخ“ (کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ جسے اللہ کتاب و اقتدار اور نبوت عطا کرے تو وہ لوگوں سے کہے.....) تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب خداوند عالم کسی کو علم اور فقہ سے نوازے اور اسے حقائق سے آگاہی دلائے اور آغوش ربانی میں اس کی تربیت کرے تو اسے بندگی کے طور و طریقوں کے دائرہ سے باہر جانے نہیں دیتا اور نہ ہی اسے یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ جو چاہے انجام دے خواہ وہ اس کا حق نہ بھی ہو! جیسا کہ خداوند عالم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ میں ارشاد فرمایا:

سورہ مائدہ، آیت: ۱۱۶:

” وَإِذْ قَالَ اللَّهُ لِيُحْيِيَ ابْنَ مَرْيَمَ إِنَّكَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمَّيِ الْهَيْمِينَ مِنْ دُونِ اللَّهِ قَالِ“

” سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقِّ“

(اور جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ بن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو دوسرے معبود

مانو؟ اس نے کہا: تیری ذات پاک ہے، میں ہرگز ایسا نہیں کر سکتا کہ وہ بات کہوں جس کا مجھے حق حاصل نہیں)

اس بیان سے جملہ ”أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ... الخ“ سے ایک اہم نکتہ معلوم ہو جاتا ہے وروہ یہ کہ یہاں فعل ماضی کی بجائے فعل مضارع استعمال ہوا ہے یعنی ”مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنِ اتَّاهَ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَ وَالنَّبُوءَةَ أَنْ يَقُولَ“ (کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ جسے خدا نے کتاب و اقتدار اور نبوت عطا کی ہو وہ لوگوں سے کہے.....) کی بجائے یوں کہا گیا: ”مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَ وَالنَّبُوءَةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ.....“ (کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ جسے خدا کتاب و اقتدار اور نبوت عطا کرے تو وہ لوگوں سے کہے.....) اور یہ اس لئے ہوا کہ اگر فعل ماضی استعمال کیا جاتا تو آیت کا معنی ہوں ہوتا کہ خدا نے کسی نبی کو یہ اجازت نہیں دی کہ وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میری بندگی کرو (جبکہ اس طرح کی اجازت دینا ممکن تھا) لیکن جملہ ”أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ“ سے یہ سمجھنا مقصود ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میری عبادت کرو، یعنی ربانی تربیت اور خدائی ہدیت اپنے مقصد سے تخطف پذیر نہیں ہو سکتی، چنانچہ ایک مقام پر یوں ارشاد الہی ہے:

سورہ انعام، آیت: ۸۹

○ ”أُولَئِكَ الَّذِينَ اتَّيْنَهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَ وَالنَّبُوءَةَ فَإِنْ يَكْفُرْ بِهَا هَؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَلْنَا بِهَا قَوْمًا لَيَكْفُرُنَّ بِهَا لَكَفْرٍ“

(یہ وہ افراد ہیں جنہیں ہم نے کتاب، حکومت اور نبوت عطا کی، اب اگر لوگ اس (شریعت) کا انکار کریں..... انہیں تسلیم نہ کریں... تو ہم نے اس (شریعت) پر کچھ لوگ مقرر کر دیئے ہیں جو ہرگز اس کا انکار کرنے والے نہیں)

بہر حال آیت سے یہ معنی سمجھا جاتا ہے کہ کسی انسان کے بس میں نہیں..... اسے یہ حق و اختیار حاصل نہیں..... کہ وہ ان خدائی نعمتوں یعنی کتاب و اقتدار و نبوت سے بہرہ ور ہو اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو اپنی پرستش کی دعوت دے، تو آیت مبارکہ اپنے سیاق کے حوالہ سے درج ذیل آیت کے مشابہ ہے:

سورہ نساء، آیت: ۷۳

○ ”لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ وَلَا الْمَلِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ (۳) وَأَمَّا الَّذِينَ اسْتَنْكَفُوا وَاسْتَكْبَرُوا فَيَعَذِّبُهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَلَا يَجِدُونَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا“

(نہ مسیح اس کا انکار کر سکتا ہے کہ وہ بندۂ خدا ہے اور نہ ہی مقرب فرشتے! (تا) اور جو لوگ اس کا انکار کرتے ہیں اور تکبر سے کام لیتے ہیں تو خدا انہیں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا اور وہ خدا کے سوا اپنے لئے کوئی ولی و مددگار نہیں پائیں گے)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ مسیح اور مقرب فرشتوں کا مقام و منزلت اس سے کہیں بالاتر ہے کہ وہ خدا کی عبادت و پرستش سے انکار کریں..... یا اسے عار سمجھیں..... کیونکہ خدا کی عبادت سے روگردانی و انکار دردناک عذاب کا سبب بنتا ہے، اور یہ کیونکہ ممکن ہے کہ خداوند عالم اپنے مکرم نبیوں اور اپنے مقرب فرشتوں کو عذاب میں مبتلا کرے۔

### ایک ادبی سوال اور اس کا جواب

اس مقام پر ممکن ہے کوئی شخص یہ سوال کرے کہ آیت مبارکہ میں حرف ”ثَمَّ“ ذکر ہوا ہے (ثَمَّ يَقُولُ لِلنَّاسِ.....) اور اردو میں اس کا ترجمہ ”پھر“ کیا جاتا ہے کہ جس میں ”اس کے بعد“ کا مفہوم پایا جاتا ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس سے ”اس کے باوجود“ یا ”اس کے ساتھ“ کا معنی مراد لیں جیسا کہ مذکورہ بالا بیان میں مراد لیا گیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے اپنے بیان میں یہ کہا ہے کہ ادعائے نبوت اور ادعائے ربوبیت اکٹھے نہیں ہو سکتے، یعنی ایسا ہونا ممکن نہیں کہ ایک شخص اپنے آپ کو خدا کا نبی کہلائے اور پھر لوگوں سے کہے کہ میں خدا ہوں میری عبادت کرو، اور اکٹھا ہونا اور ساتھ ساتھ ہونا جس طرح ان دو چیزوں کے درمیان قابل تصور ہے جو زماناً متحد ہوں یعنی ایک ہی وقت میں پائی جائیں، اسی طرح ان دو چیزوں کے درمیان بھی قابل تصور ہے جو ایک دوسرے کے بعد قرار پائیں، لہذا جو شخص نبوت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد لوگوں کو اپنی عبادت کی دعوت دے گا یا اس نے ان دونوں کو اکٹھا کر لیا یعنی حق اور باطل کو یکجا کر دیا، تو یہ اسی طرح ہے جیسے یہ کہا جائے کہ اس نے نبوت کے منصب پر فائز ہونے کے باوجود اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو اپنی بندگی کی دعوت دی،

اور جملہ ”كُونُوا عِبَادًا لِّىْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ“ میں لفظ ”عباد“ لفظ عبید کی طرح ”عبید“ کی جمع کا صیغہ ہے، ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ لفظ ”عباد“ عام طور پر خدا کی بندگی اور لفظ ”عبید“ بندوں کی بندگی کے موارد میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے: ”عباد اللہ“، اور بندوں کی بندگی میں ”عباد الناس“ کی بجائے ”عبید الناس“ کہا جاتا ہے۔ اور یہاں ”عبادًا لِّىْ“ کے ساتھ ”مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ“ اس لئے کہا کہ مقام اسی کا متقاضی ہے کیونکہ خداوند عالم کے ہاں صرف وہی عبادت قابل قبول ہوتی ہے جو خالص اس کی رضا و خوشنودی کے لئے انجام دی جائے جیسا کہ درج ذیل آیت

مبارکہ میں ارشاد ہوا:

سورۃ زمر، آیت: ۳:

○ ” اَلَا لِلّٰهِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ ۗ وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوا مِنْ دُوْنِہٖ اَوْلِیَاءَ ۗ مَا نَعْبُدُہُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَا اِلٰی اللّٰهِ ذُلْفٰی ۗ اِنَّ اللّٰہَ یَحْكُمُ بَیْنَهُمْ فِی مَا هُمْ فِیْہِ یُخْتَلِفُوْنَ ۗ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ کَذِبٌ کَفَّارٌ“

(آگاہ رہو کہ خالص دین صرف خدا کے لئے ہے، اور جو لوگ خدا کے علاوہ اولیاء بناتے ہیں (وہ کہتے ہیں) ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر صرف اس لئے کہ وہ ہمیں خدا کے قریب کر دیں، بے شک خدا ہی ان کے درمیان پائے جانے والے اختلافی امر کے بارے میں فیصلہ کرے گا کیونکہ خدا کسی جھوٹے، کافر کو ہدایت سے نہیں نوازتا)،

تو اس میں خداوند عالم نے اس شخص کی عبادت کو رد کر دیا جو اس کی عبادت کے ساتھ اس کے غیر کی عبادت کرے خواہ وہ تقرب، توسل اور شفاعت کی غرض سے کیوں نہ ہو،

اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی قابل توجہ و لازم الاتفات ہے کہ عبادت کی حقیقت ہی یہ ہے کہ معبود کی استقلالی حیثیت کا عقیدہ رکھا جائے، یہاں تک کہ شریک قرار دینے میں بھی استقلالی حوالہ ملحوظ ہے کیونکہ شریک، شریک ہونے کی حیثیت میں بھی اپنی حد تک ایک طرح کا استقلالی حوالہ و حیثیت رکھتا ہے، اور جہاں تک خداوند عالم کی ذات کا تعلق ہے تو اسے مطلق ربوبیت حاصل ہے اور اسے رب اور معبود ماننا اسی صورت میں صحیح و کامل قرار دیا جاسکتا ہے جب اس کے علاوہ ہر چیز کے استقلال کی ہر حوالہ سے نفی کی جائے، اس بناء پر غیر اللہ کی عبادت، صرف اسی کی عبادت ہی ہوگی اس کا خدا کی عبادت سے کوئی تعلق نہ ہوگا خواہ اس کے ساتھ خدا کو شریک عبادت کیوں نہ قرار دیں..... لیکن اس کا خدا سے کوئی تعلق نہ ہوگا کیونکہ اس میں خدا کے کامل استقلال کی عملی نفی کا پہلو پایا جاتا ہے.....

خدا کی ربوبیت کی دعوت

○ ” وَ لٰكِن كُوْنُوْا اٰرَآئِنَہٖنَّ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ“  
(لیکن تم اللہ والے بنو کیونکہ تم کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور تم اسے پڑھتے ہو)

”آرآئینہ“ جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد ”ربانی“ ہے، اس کی نسبت ”رب“ کی طرف ہے، لفظی طور پر اسے

”رسی“ ہونا چاہیے تھا لیکن اس میں الف اور نون کا اضافہ کیا گیا اور ”ربانی“ کہا گیا، یہ اضافہ نسبت کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے ہے جیسا کہ ”لحیانی“ اسے کہتے ہیں جس کی داڑھی (لحمیہ) لمبی ہو جبکہ لفظ ”لحمیہ“ کی بناء پر ”لحمی“ کہنا چاہئے لیکن الف و نون کے اضافہ سے اس کے لمبا ہونے کا بیان مقصود ہوتا ہے، عربی زبان میں اس طرح کے الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں، لہذا لفظ ”ربانی“ رب کے ساتھ شدید اختصاص اور اس کی بندگی و عبادت میں کثیر الاستعمال ہونے کا معنی دیتا ہے۔

اور لفظ ”بِمَا كُنْتُمْ“ میں حرف با سبب کے لئے ہے اور حرف ”ما“ مصدر ہے، اور کلام میں قول اور معنی دونوں کے تصور پر آیت کا معنی یوں کیا جائے گا: ”لیکن وہ کہتا ہے کہ تم رب والے ہو کیونکہ تم لوگوں کو کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور آپس میں اسے پڑھتے رہتے ہو“، ”ولكن يقول: كونا ربانيين بسبب تعليمكم الكتاب للناس ودراسكم اياه فيما بينكم“

لفظ ”دراسة“ (تَدْرُسُونَ) میں ”تعلیم“ کی نسبت زیادہ خصوصیت کا پہلو پایا جاتا ہے کیونکہ اسے عام طور پر کتاب پڑھنے سے حاصل ہونے والے علم (تحقیق) اور خوب توجہ کے ساتھ پڑھنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، لغت کے مشہور دانشور راجب اصفہانی نے لکھا ہے کہ ”درس الدار“ کا معنی گھر کے نشان کا باقی رہ جانا ہے، اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ چیز جس کا نشان باقی رہ گیا ہو خود محو و نابود ہو جائے، اس بناء پر ”درس“ کا معنی محو ہو جانا کیا گیا ہے، اسی طرح جب کہا جاتا ہے: ”درس الكتاب“ (اس نے کتاب پڑھی) اور ”درست العلم“ (میں نے علم پڑھا) تو اس سے مراد اس حاصل کئے ہوئے علم کے اثر کو ذہن میں محفوظ کرنا ہے اور چونکہ بار بار پڑھنے سے ذہن میں محفوظ کرنا یقینی ہوتا ہے لہذا بار بار اور لگاتار و باقاعدگی سے پڑھنے کو حفظ کر لینے سے تعبیر کیا جاتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں اس طرح ذکر ہوا ہے: ○ ”وَدْرَسُوا مَا فِيهِ“ (اور انہوں نے اسے یاد کر لیا جو کچھ اس میں ہے)، اور زیر بحث آیت میں یوں ارشاد ہوا: ○ ”بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكُتُبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ“ (بہ سبب اس کے، جو تم کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور بہ سبب اس کے، جو تم درس حاصل کرتے ہو)،

ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا: ○ ”وَمَا آتَيْنَاهُمْ مِنْ كُتُبٍ يَدْرُسُونَهَا“ (اور ہم نے اپنی جو کتاب انہیں دی وہ اس سے درس لیتے ہیں)،

خلاصہ کلام یہ کہ جو انسان اس مقام و منصب پر فائز ہو اس کی شان و شیوہ یہ ہے کہ وہ تمہیں ایمان کے زیور سے آراستہ ہونے کی دعوت دیتا ہے اور جس کتاب کی تم تعلیم دیتے ہو اور اس سے معارف الہیہ کے بنیادی اصولوں کا درس حاصل کرتے ہو اس پر یقین رکھنے کا کہتا ہے اور وہ تمہیں پاکیزہ کردار اور بلند پایہ اخلاق اپنانے اور ان اعمال صالحہ بجالانے کی تاکید

کرتا ہے جن کی لوگوں کو تم دعوت دیتے ہوتا کہ تم اس وسیلہ سے مادی دنیا کی آلودگی سے دور ہو کر اپنے پروردگار کی بارگاہ اقدس تک پہنچ جاؤ اور نبیؐ جتّا علمائے ربانی بن جاؤ۔

اوپر مذکورہ جملہ ”ہیسا کنتم“ فعل ماضی پر مشتمل ہے جو کہ گزرے ہوئے زمانہ میں وقوع پذیر ہونے والے کام پر دلالت کرتا ہے لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ آیت مبارکہ میں نصاریٰ پر اعتراض آمیز انداز سے اشارہ کیا گیا ہے کہ ان میں سے کچھ افراد کہتے ہیں کہ عیسیٰؑ نے ہی انہیں اپنے بارے میں بتایا ہے کہ وہ خدا کا بیٹا ہے اور ان کے اس بیان کی تفسیر بعض نصاریٰ نے کلمتہ اللہ ہونے سے کی ہے یعنی انہوں نے کہا کہ بیٹا ہونے سے مراد کلمہ خدا ہونا ہے، اور یہ باتیں انہوں نے اس لئے کہیں کہ بنی اسرائیل وہ واحد قوم تھی جن کے پاس آسمانی کتاب تھی جسے وہ ایک دوسرے کو تعلیم دیتے اور اس سے معارف و معارف حاصل کرتے تھے اور اس میں مذکور مطالب کے بارے میں آپس میں بحث و گفتگو کرتے تھے، چنانچہ وہ کتاب کی بابت آپس میں شدید اختلاف رائے کا شکار ہو گئے جس کا نتیجہ مطالب کی تہدیلی اور تحریف کی صورت میں ظاہر ہوا، اور حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کو اسی لئے مبعوث کیا گیا کہ وہ ان کے درمیان پائے جانے والے اختلافی موارد میں ان کی رہنمائی کریں اور جو بعض چیزیں ان پر حرام کی گئیں وہ حلال کریں، خلاصہ یہ کہ انہیں تعلیم و تدریس کے فرائض کی ادائیگی اور دینی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی دعوت دیں، یعنی کتاب الہی کی تعلیم اور اس سے علوم و معارف کسب کرنے میں ربانی یعنی خدا سے وابستہ و پیوستہ ہوں (خدا والے بنیں)۔

بہر حال آیت مبارکہ کی ایک حوالہ سے حضرت پیغمبر اسلامؐ پر تطبیق بھی ممکن ہے کیونکہ آپؐ بھی ان اہل کتاب کو مذکورہ بالا امور کی دعوت دیتے تھے جو کتاب الہی کی تعلیم دیتے اور اس سے درس لیتے تھے لیکن حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام پر اس کی تطبیق اس لئے زیادہ واضح طور پر ہے کہ وہ آنحضرتؐ سے پہلے تھے اور ان کی رسالت خاص طور پر بنی اسرائیل کے لئے تھی جبکہ حضرت پیغمبر اسلامؐ ایسے نہ تھے بلکہ ان کی رسالت کا دائرہ قیامت تک وسعت رکھتا ہے، البتہ دیگر اولوالعزم انبیاء اور صاحبان کتاب مثلاً حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ پر اس آیت کی تطبیق اس لئے نہیں ہو سکتی کہ ان کا واسطہ اہل کتاب لوگوں سے نہ تھا اور نہ ہی وہ کسی اہل کتاب قوم کے لئے جو کتاب کی تعلیم و تدریس میں مشغول ہو مبعوث ہوئے تھے۔

## غلط الزام کی دوسری صورت

○ ” وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا“  
(اور وہ تمہیں حکم نہیں دیتا کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو رب بناؤ)

یہ جملہ ”يَقُولُ“ پر عطف ہے البتہ یہ اس مشہور قرأت کی بناء پر ہے جس میں فعل مضارع ”يَأْمُرُ“ کو ر پر زیر کے ساتھ پڑھا جاتا ہے کیونکہ ”يَقُولُ“ بھی منصوب ہے یعنی لام پر زیر کے ساتھ پڑھا جاتا ہے، اس طرح دونوں جملوں کے ربط کے ساتھ آیت مبارکہ کا معنی یوں ہوگا: ”کسی انسان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ جسے خدا کی طرف سے کتاب و اقتدار اور نبوت عطا کی گئی ہو وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر مجھے رب مانو یا انہیں حکم دے کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب مانو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ایسے تھے جو فرشتوں کو خدا مانتے تھے جیسے صائبین، اور وہ لوگ اسے دینی اصول قرار دیتے تھے، اور کچھ لوگ ایسے تھے جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے جیسے زمانہ جاہلیت کے عرب، اور وہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے دین کے پیروکار ہیں۔

یہ تو تھا فرشتوں کو رب قرار دینے کا مسئلہ، اور جہاں تک نبیوں کو رب قرار دینے کا مسئلہ ہے تو وہ یہودیوں کا عقیدہ تھا اور وہ بر ملا کہتے تھے کہ ”عزیر ابن اللہ“ (عزیر خدا کا بیٹا ہے) چنانچہ اس کا تذکرہ قرآن مجید میں انہی لفظوں میں ہوا ہے حالانکہ موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے اس طرح کی بات کو رد و اقرار نہیں دیا تھا اور نہ ہی تورات میں اس کی بابت کوئی تذکرہ آیا ہے بلکہ تورات میں صرف خداوند عالم کی یکتائی اور ایک ہی رب کی بات ہوئی ہے، اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے اس طرح کا عقیدہ رکھنا جائز قرار دیا ہوتا تو انہیں اس کا حکم بھی دیتے، مگر ان کی شان و مقام اس سے بالاتر ہے کہ وہ کسی کو شرک کی راہ پر لائیں،

## آیات کے سیاق کی بابت ایک اہم نکتہ

یہاں یہ مطلب قابل ذکر ہے کہ زیر بحث دو آیتیں یعنی ”ثُمَّ يَقُولُ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ“ اور ”وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا“ دو حوالوں سے سیاق میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، وہ اس طرح کہ پہلی آیت میں مخاطبین عام افراد بشر (الناس) ہیں جبکہ دوسری آیت میں انہی افراد کو مخاطب قرار دیا گیا ہے جو



آیت کے اصل مخاطب ہیں (يَا مُرْكُم)، اور دوسرا یہ کہ پہلی آیت میں معبود بنانے کی بات ہے (كُونُوا عِبَادًا لِّي) جبکہ دوسری آیت میں رب قرار دینے کا حکم ہے ”اَسْرِبَابًا“۔

ان دو آیتوں کے سیاق کے مختلف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ پہلی صورت میں چونکہ سلسلہ کلام نصاریٰ کو عیسیٰ کی عبادت کرنے پر مورد اعتراض قرار دینے میں تھا کہ وہ صراحت کے ساتھ انہیں معبود سمجھتے تھے اور اس عقیدہ کو خود حضرت عیسیٰ کی دینی دعوت سے منسوب کرتے تھے اور کہتے تھے کہ انہوں نے ہی کہا ہے کہ میرے عبادت گزار بنو (كُونُوا عِبَادًا لِّي)، جبکہ فرشتوں اور نبیوں کو معبود قرار دینے کی بجائے انہیں رب (اَسْرِبَابًا) قرار دینے کی بات ہوئی، اور اس معنی میں ہے جو عیسیٰ کے علاوہ دوسروں کے بارے میں کہا گیا کیونکہ اس بناء پر وہ الوہیت سے التزامی صورت میں تضاد کی حامل ہے نہ کہ صراحت کے ساتھ! یہی وجہ ہے کہ ”الہة“ کی بجائے ”اَسْرِبَابًا“ کہا گیا ہے۔

اور سیاق کے مختلف ہونے کی دوسری صورت کا سبب یہ ہے کہ دونوں جملوں میں جو حکم مذکور ہے یعنی ”كُونُوا عِبَادًا لِّي“ (میرے عبادت گزار بنو)، ”يَا مُرْكُم اَنْ تَتَّخِذُوا“ (وہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم بناؤ) اس کے مخاطبین اگر کوئی ہو سکتے ہیں تو وہ اہل کتاب اور اس زمانہ کے عرب ہیں لیکن جو اہم بات قابل توجہ ہے وہ یہ کہ پہلی آیت میں ”قول“ (یعنی قول) جبکہ دوسری آیت میں ”امر“ (يَا مُرْكُم) استعمال ہوا ہے اور ”قول“ بالمشافہ اور آمنے سامنے بات کرنے کے موارد میں استعمال ہوتا ہے جبکہ آیت کے زمانہ نزول میں موجود لوگ حضرت عیسیٰ یا حضرت موسیٰ کے دور میں موجود نہ تھے، اس لئے ضروری تھا کہ..... ”ثم يقول لکم“ (پھر وہ تم سے کہے) کی بجائے یوں کہا جائے: ”ثُمَّ يَقُولُ لِلنَّاسِ“، لیکن جہاں تک ”امر“ کا تعلق ہے کہ جو دوسری آیت میں ذکر ہوا ہے (يَا مُرْكُم) تو اس میں بالمشافہ ہونا ضروری نہیں بلکہ وہ غائب کے بارے میں ممکن ہے کیونکہ جو حکم اسلاف اور پہلے گزرے ہوئے لوگوں کے بارے میں ہو وہ اخلاف یعنی بعد میں آنے والوں کے لئے بھی ہو سکتا ہے جب وہ ایک ہی قوم کے افراد ہوں، جبکہ ”قول“ اور بات کرنے میں آواز کا کانوں تک پہنچانا مقصود ہوتا ہے لہذا وہ بالمشافہ اور آمنے سامنے ہونے کا متقاضی ہوتا ہے ہوائے ان موارد کے کہ جن میں قول سے فقط مطلب و مطلوب سے آگاہی دلانا مقصود ہو۔

بنا برائے دونوں آیتوں کے سیاق میں بنیادی نکتہ مخاطبین کا حاضر و موجود ہونا اور صیغہ جمع کے ساتھ ان سب کو مخاطب قرار دینا ہے جیسا کہ دوسری آیت میں یہ نکتہ ملحوظ ہے ”وَلَا يَا مُرْكُم.....“..... اور پہلی آیت میں اس سیاق کا ملحوظ ہونا اسی وجہ سے ہے جو ذکر ہو چکی ہے.....

## اسلام کے بعد کفر؟

○ ” اَيُّكُمْ بِالْكَفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُسْلِمُونَ “  
(کیا وہ تمہیں اسلام لانے کے بعد کفر کا حکم دیتا ہے؟)

اس آیت میں بظاہر ان تمام اہل کتاب کو مخاطب قرار دیا گیا ہے جو اپنے آپ کو نبیوں سے منسوب قرار دیتے ہیں یا وہ لوگ جو نبیوں سے منسوب ہونے کے دعویدار ہیں جیسا کہ زمانہ جاہلیت کے عرب اپنے آپ کو ”حنفاء“ سمجھتے تھے۔ اس آیت میں تصوراتی بنیاد پر بات کی گئی ہے لہذا آیت کا معنی و مفہوم یوں ہوگا کہ گویا ان سے کہا گیا ہے کہ جب تم اس انسان کی دعوت پر لبیک کہتے ہو جسے کتاب، اقتدار اور نبوت عطا کی گئی ہے کہ اس بناء پر تم خدا کو تسلیم کرتے ہو اور اسلام کے زیور سے آراستہ ہو کر اپنے آپ کو اسلامی قالب میں ڈھال چکے ہو تو یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ وہ تمہیں کفر کا حکم دے اور تمہیں اس راہ سے گمراہ کر دے جس کی طرف اس نے خدا کے اذن و حکم کے ساتھ تمہیں ہدایت کی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام سے مراد وہی دین توحید ہے جو تمام انبیاء کے نزدیک دین خداوندی ہے جیسا کہ اس کا ثبوت درج ذیل آیات مبارکہ میں پایا جاتا ہے:

سورۃ آل عمران، آیت: ۱۹

○ ” اِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ “ (بے شک، دین، اللہ کے نزدیک اسلام ہے)  
اس کے بعد ارشاد ہوا: ” اَفَعَيَّرْتُمُوهُمْ اَلَّذِيْنَ يَبْعُوْنَ “ (کیا وہ خدائی دین کے علاوہ کچھ چاہتے ہیں)، اس کے تسلسل میں یوں ارشاد ہوا:

” وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْاٰسِرِيْنَ “

(آل عمران، آیت ۸۵)

(اور جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی دین چاہے تو اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے

والوں میں سے ہوگا)

## بعض مفسرین کا قول

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ آیت مبارکہ ”مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ.....“ سے مراد حضرت رسول خدا ہیں

کیونکہ اس آیت کے شان نزول میں ایک روایت موجود ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابورافع قرظی اور نجران کا ایک نصرانی حضرت رسول خدا کی خدمت میں آئے اور آپ سے عرض کی: "اترید ان نعبدک یا محمد" (اے محمد! کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی پرستش کریں؟) ان کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی: "مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ....." (کسی انسان کو روایا نہیں کہ جسے خدا کتاب دے.....) دونوں آیتوں کے آخر تک.....

اس مفسر نے اس روایت کی تائید میں اس جملہ کا حوالہ دیا جو ان آیتوں کے آخر میں ذکر ہوا ہے یعنی "بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ" اور کہا کہ چونکہ اسلام اسی دین کا نام ہے جو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ لائے لہذا یہاں "بشر" سے مراد آنحضرتؐ ہیں۔

لیکن یہ قول قرین صحت نہیں کیونکہ اس مفسر نے اس اسلام کہ جسے قرآنی اصطلاح میں توحیدی دین قرار دیا گیا ہے کہ جس پر تمام انبیاء الہی مبعوث ہوئے اور اسلام کے درمیان خلط ملط کیا ہے جو زمانہ نزول قرآن کے بعد مسلمانوں میں نئی اصطلاح کے ساتھ مشہور ہوا (یعنی وہ دین جو حضرت محمد ﷺ لائے اسے ہی اسلام کہتے ہیں)، بہر حال اس موضوع کی بابت ہم پہلے تفصیلی بحث کر چکے ہیں..... اور یہ ثابت کر چکے ہیں کہ قرآنی بیانات کی رو سے اسلام توحیدی دین کا نام ہے جس کی دعوت تمام انبیاء الہی علیہم السلام نے دی.....

## چند فصول پر مبنی خاتمہ بحث

### پہلی فصل:

#### حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ کا قرآنی تذکرہ

جب حضرت مسیحؑ کی والدہ گرامی قدر حضرت مریم بنت عمران کی والدہ حاملہ ہوئیں تو انہوں نے منت مان لی کہ جو بچہ ان کے شکم میں ہے جب وہ پیدا ہوا تو اسے آزادی دے کر مسجد کی خدمت گزاری میں دے دیں گی، منت ماننے وقت ان کا خیال تھا کہ وہ بچہ "لڑکا" ہوگا لیکن جب انہوں نے اسے جنا اور انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ لڑکی ہے تو وہ بہت غمگین و افسردہ ہو گئیں اور انہوں نے اس بچی کا نام "مریم" رکھا جس کا معنی "خادمہ" ہے۔ حضرت مریمؑ کے والد گرامی قدر جناب عمران، ان کی ولادت سے پہلے ہی انتقال کر چکے تھے تو ان کی والدہ انہیں مسجد میں لائیں اور انہیں مسجد کے کابھوں کے سپرد کر دیا کہ جن میں

سے ایک حضرت زکریا بھی تھے، کاہنوں نے حضرت مریمؑ کی کفالت کے بارے میں آپس میں شدید اختلاف کیا، چنانچہ طے پایا کہ قرعہ اندازی کی جائے قرعہ اندازی میں حضرت زکریا کا نام نکلا تو انہوں نے حضرت مریمؑ کی کفالت کی، اور جب وہ بالغ ہو گئیں تو حضرت زکریا نے ان کے اور کاہنوں کے درمیان پردہ بنا دیا اور وہ وہاں خدا کی عبادت میں مشغول رہتی تھیں، حضرت زکریا کے سوا کوئی ان کے پاس نہ آ سکتا، اور حضرت زکریا جب بھی محراب میں حضرت مریمؑ کے پاس آتے تو ان کے پاس کھانا پاتے، ایک دن انہوں نے پوچھا: اے مریم یہ کھانا تیرے پاس کہاں سے آتا ہے؟ (یسا مریم! انسی لک ہذا ۹۱) تو حضرت مریمؑ نے جواب دیا: ”هو من عند الله، واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب“ کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور خدا جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے روزی عطا کرتا ہے،

حضرت مریمؑ صدیقہ تھیں اور خدا کی عطا کردہ عصمت کی حامل تھیں، طاہرہ اور خدا کی برگزیدہ ہستی تھیں اور محدثہ تھیں، فرشتے ان سے ہمکلام ہوئے اور انہیں خدا کی طرف سے عطا کی جانے والی نعمت سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ خدانے انہیں جن لیا ہے اور انہیں پاک بنایا ہے، حضرت مریمؑ قارئین میں سے تھیں اور پوری کائنات کے لئے خدا کی نشانیوں میں سے ایک تھیں، (ملاحظہ ہو: سورۃ آل عمران، آیت ۳۵ تا ۴۴، سورۃ مریم آیت ۱۶، سورۃ انبیاء آیت ۱۹، سورۃ تحریم آیت ۱۲)

پھر خداوند عالم نے روح کو ان کے پاس بھیجا اور وہ اس وقت حجاب میں تھیں، روح (فرشتہ) ان کے سامنے انسان کی صورت میں آیا اور ان سے کہا کہ اسے خدانے بھیجا ہے تاکہ انہیں حکم الہی سے ایسے فرزند کی نعمت سے نوازے جو بغیر باپ کے متولد ہوگا، فرشتے نے انہیں خوشخبری دی کہ ان کے فرزند کے ہاتھوں عظیم معجزات رونما ہوں گے، اور انہیں یہ بھی بتایا کہ خداوند عالم روح القدس کے ذریعے ان کی تائید فرمائے گا اور اسے کتاب و حکمت اور تورات و انجیل کی تعلیم دے گا اور وہ بنی اسرائیل کی طرف بھیجا گیا خدا کا رسول ہوگا کہ جو واضح نشانیاں پیش کرے گا، اور انہیں اس فرزند کے بارے میں مزید بتایا اور ان کی تمام سرگذشت سے آگاہ کیا، پھر ان میں روح پھونکی تو وہ حاملہ ہو گئیں جس طرح ہر عورت اپنے بچہ کی حاملہ ہوتی ہے، (ملاحظہ ہو سورۃ آل عمران، آیات ۳۵ تا ۴۴)،

حاملہ ہونے کے بعد حضرت مریمؑ بہت دور مکان میں چلی گئیں، یہاں تک کہ انہیں دروزہ شروع ہوا..... یعنی بچہ کی پیدائش کا مرحلہ آ پہنچا..... تو وہ درد کی شدت کے ساتھ کھجور کے درخت کے قریب آ گئیں اور انہیں اس قدر تکلیف ہوئی کہ وہ اپنے آپ سے کہنے لگیں: اے کاش! میں اس سے پہلے ہی مر گئی ہوتی اور یہ سب کچھ بھول چکی ہوتی،..... میں سب کو بھول جاتی اور سب مجھے بھلا دیتے.....، اس وقت ہاتفِ نبی سے ایک آواز آئی کہ تمکین نہ ہو، تیرے پروردگار نے تیرے زیر پا ایک چشمہ جاری کر دیا ہے، کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلاؤ کہ اس سے تازہ خرے آگیں گے، پھر کھاؤ، پیو اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرو اور اگر کسی شخص کو وہاں دیکھو تو کہہ دو کہ میں نے رحمن کے لئے روزہ رکھنے کی منت مانی ہے لہذا آج میں کسی انسان

سے بات نہ کروں گی، پھر وہ اس بچے کو اٹھا کر اپنی قوم کے پاس آئی، (فَصَلِّتَهُ فَانْتَبَذَتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا ۝ فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَى جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يَلَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هَذَا وَكُنْتُ نَسِيًّا مَسِيًّا ۝ فَمَا دَانَهَا مِنْ تَحْتِهَا إِلَّا نَحْرُ نِي قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ۝ وَهُدًى نَحْنُ إِلَيْكَ يَجِدُكَ النَّخْلَةَ تَسْقِطُ عَلَيْكَ رَطْبًا جَدِيًّا ۝ فَكَلِمَاتٍ وَأَشْرِي يُوقِرِي عَيْنًا قَامَاتٍ يَبِينُ مِنَ الْبَشَرِ أَحَدًا فَقُوْنِي إِنْ نَذَرْتِ لِلرَّحْمَنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنْسِيًّا ۝ فَاتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهُ) ..... سورۃ مریم آیات ۲۰ تا ۲۷.....

ان آیات کے انداز بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حکم مادر میں ہونا اور جنم لینا اور بات کرنا اور دیگر وجودی امور دیگر افراد بشر کے امور ہی کی سطح سے تھے،

جب حضرت مریمؑ کی قوم نے انہیں اس حال میں دیکھا (کہ وہ بچہ گود میں اٹھائے ہوئے ہیں) تو ہر طرف سے ان پر طعن و تشنیع اور مذمت و ملامت کی بوجھاڑ کر دی کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ ایک لڑکی شوہر کے بغیر حاملہ ہو کر بچہ کی ماں بنی ہے، انہوں نے حضرت مریمؑ سے کہا:

”يٰۤاَحْتٰ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكَ اَمْرًا سَوِيًّا وَمَا كَانَتْ اُمُّكَ بَعِيًّا ۝ فَاسْأَلْتِ اِلَيْهِ طٰ قَالُوْا كَيْفَ نَكَلِمُكَ مِنْ كَانَ فِي الْهَيْدِ صَبِيًّا ۝ قَالَ اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ الَّذِي الْكَلْبُ وَجَعَلْنِي نَبِيًّا ۝ وَجَعَلْنِي مُبْرَكًا اَيُّنَ مَا كُنْتُ ۝ وَاَوْصِنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝ وَبَرًّا بِوَالِدِيْ ۝ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا سَفِيًّا ۝ وَالسَّلَامُ عَلٰى يَوْمِ وُلِدْتُ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا“ (سورۃ مریم، آیات ۲۷ تا ۳۳)

(اے مریم! تو نے یہ نہایت عجیب کام کیا ہے، اے ہارون کی بہن! تیرا باپ برا آدمی نہیں تھا اور نہ ہی تیری ماں بدکارہ تھی، مریم نے بچہ کی طرف اشارہ کیا..... کہ اس سے بات کرو..... انہوں نے کہا کہ ہم اس سے کیونکر بات کریں جو بچہ ابھی گہوارہ میں ہے، اس وقت عیسیٰ بول پڑے اور کہنے لگے، میں خدا کا بندہ ہوں، خدا نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے اور میں جہاں بھی رہوں مجھے با برکت قرار دیا ہے اور مجھے نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم دیا ہے اور یہ کہ جب تک میں زندہ رہوں اپنی والدہ کے ساتھ نیکی و نیک سلوک کرتا رہوں، خدا نے مجھے نہ تو ظالم و جابر بنایا ہے اور نہ ہی بدکار، مجھ پر سلام ہو جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں مردوں گا اور جس دن مجھے زندہ اٹھایا جائے گا۔)

حضرت عیسیٰؑ کا یہ بیان اپنے مستقبل کے لائحہ عمل کا نہایت عمدہ انداز و الفاظ میں اظہار تھا، انہوں نے اس بیان میں خوبصورت اسلوب کے ساتھ اپنے مشن کے اہم مقاصد ظاہر کئے یعنی یہ کہ وہ بہت جلد سرکشی و ظلم کے خاتمہ اور شریعت موسیٰؑ کے احیاء اور اس کے عملی نفاذ کی تقویت کے لئے کام کریں گے اور اس مقدس شریعت کے معارف کی تجدید کریں گے اور اس میں جن آیات کی بابت لوگ آپس میں اختلاف رائے رکھتے ہیں ان کی حقیقت بیان کریں گے،

پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوران کودکی سے جوانی کو پہنچنے اور اپنی والدہ کے ہمراہ عام انسانی زندگی کے مراحل طے کرنے میں مصروف ہو گئے، وہ دونوں کھاتے پیتے اور اسی طرح زندگی گزارتے تھے جس طرح دوسرے افراد بشر زندگی گزارتے ہیں اور ان تمام حالات و وجودی کیفیات سے دوچار ہوتے تھے جس طرح بنی نوع انسان کے دیگر افراد دوچار ہوتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے لئے رسول مبعوث کیا گیا اور خدا کی طرف سے انہیں حکم ملا کہ وہ بنی اسرائیل کو توحیدی دین کی دعوت دیں چنانچہ وہ ان لوگوں کو خدائے واحد کی پرستش کرنے کا کہتے تھے اور ان سے کہتے تھے:

”أَلَيْ قَدْ جِئْتَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مَنْ شَاءَ بِكُمْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَلْبَسُوا الْأَكْفَانَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيَى الْمَوْتَى بِإِذْنِ اللَّهِ وَأُنْبِتْكُمْ بِمَاتَاتٍ تَكُونُ وَمَاتَاتٍ خَرُونَ فِي بَيْوتِكُمْ، نَ فِي ذَلِكَ لَآيَةٌ لَكُمْ، إِنَّ اللَّهَ سَرِيبِي وَسَرَبْتُمْ فَأَعْبُدُوهُ“

(میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک نشانی لے کر آیا ہوں، میں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کا مجسمہ بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ خدا کے اذن کے ساتھ حقیقی پرندہ بن جائے گا، اور میں مادر زاد نابینا اور برص کے مریض کو شفا یاب کرتا ہوں، اور میں اللہ کے اذن سے مردوں کو زندہ کرتا ہوں اور میں تمہیں بناتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا کچھ گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو، اس میں تمہارے لئے نشانی ہے کیونکہ خدا میرا اور تمہارا پروردگار ہے پس تم اسی کی عبادت کرو)۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام لوگوں کو اپنی جدید شریعت کہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی تصدیق کرنے والی تھی کی طرف دعوت دیتے تھے، البتہ کچھ چیزیں جو یہودیوں پر سختی کرنے کے لئے حرام قرار دی گئیں تھیں انہیں حلال کیا یعنی جن احکام میں وہ چیزیں حرام قرار دی گئی تھیں انہیں منسوخ کیا، وہ لوگوں سے کہتے تھے:

”يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَةِ مَبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ“

(اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں، میں اپنی ما قبل کتاب تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں، میں اس رسول کی خوشخبری دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہے)،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے جن معجزات کا وعدہ کیا تھا ان سب کو پورا کیا مثلاً پرندہ خلق کرنا، مردوں کو زندہ کرنا، مادر زاد نابینا اور برص کے مریض کو شفا یاب کرنا اور قبیبی خبریں دینا، یہ سب کچھ انہوں نے اذن خدا کے ساتھ انجام دیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسلسل بنی اسرائیل کو خدا کی یکتائی اور اپنی جدید شریعت کی طرف دعوت دیتے رہے اور جب ان کے ایمان لانے سے مایوس ہوئے اور لوگوں کی طرف سے نافرمانی و دشمنی اور کاہنوں اور یہودی علماء کی طرف سے تکبر و سرتابی کے مظاہرے دیکھے تو اپنے اور ایمان لانے والے نہایت قلیل افراد میں سے کچھ لوگوں کو اپنا مددگار منتخب کیا تاکہ وہ خدا کی راہ میں ان کی نصرت کریں۔

پھر یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف عملی طور پر بغاوت شروع کر دی اور ان کو قتل کرنے کی ٹھان لی، لیکن خداوند عالم نے آنجنابؑ کو یہودیوں کے جنگل سے نجات بخشی اور انہیں اپنی طرف اٹھالیا، اس سلسلہ میں یہودی غلط فہمی کا شکار ہو گئے، کچھ لوگ گمانے کرنے لگے کہ انہوں نے عیسیٰؑ کو قتل کر دیا ہے، بعض لوگ کہنے لگے کہ انہوں نے انہیں سوئی پر چڑھا دیا ہے، لیکن خداوند عالم نے حقیقت حال ان پر واضح نہ کی اور انہیں اسی طرح غلط فہمی میں مبتلا رکھا،

(ملاحظہ ہوں آیات مبارکہ: سورۃ آل عمران ۵۸ تا ۶۵، سورۃ زخرف ۶۳ تا ۶۵، سورۃ صف ۶، ۱۳، سورۃ

مائدہ ۱۱۰-۱۱۱، سورۃ نساء ۱۵۷، ۱۵۸)

تو یہ ہے حضرت عیسیٰ بن مریمؑ اور ان کی والدہ کے قرآنی تذکرہ کا خلاصہ و اجمالی بیان!

## دوسری فصل:

### حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت اور بارگاہ الہی میں ان کا مقام

قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بائیس صفات ذکر کی گئی ہیں جن کی فہرست یہ ہے:

۱- وہ بندۂ خدا اور نبی تھے

(سورۃ مریم، آیت ۳۰)

۲- وہ بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے خدا کے رسول تھے

(سورۃ آل عمران - آیت ۴۹)

۳- وہ پانچ اولوالعزم رسولوں میں سے ایک تھے، صاحب شریعت اور صاحب کتاب (انجیل) تھے،

(سورۃ احزاب آیت ۷، سورۃ شوریٰ آیت ۱۳، سورۃ مائدہ آیت ۴۶)

۴- خداوند عالم نے ان کا نام ”مسیح عیسیٰ“ رکھا۔

(سورۃ آل عمران، آیت ۴۵)

۶۵۔ وہ ”کلمۃ اللہ“ اور ”روح اللہ“ تھے

(سورۃ نساء، آیت ۱۷۱)

۷۔ وہ ”امام“ تھے

(سورۃ احزاب، آیت ۷)

۸۔ وہ ”اعمال کے گواہ“ تھے

(سورۃ نساء، آیت ۱۵۹، سورۃ مائدہ، آیت ۱۱۷)

۹۔ وہ حضرت پیغمبر اسلامؐ کی آمد کی خوشخبری دینے والے تھے۔

(سورۃ صف، آیت ۶)

۱۰۔ وہ دنیا و آخرت میں محترم اور مقربین میں سے تھے

(سورۃ آل عمران، آیت ۴۵)

۱۲۔ وہ برگزیدگان الہی میں سے تھے۔

(سورۃ آل عمران، آیت ۳۳)

۱۳، ۱۴۔ وہ ”جنتین“ (خدا کے منتخب کردہ) اور ”صالحین“ میں سے تھے۔

(سورۃ انعام، آیات ۸۵، ۸۷)

۱۵ تا ۲۰۔ وہ ہر جگہ بابرکت تھے، پاکیزہ تھے، لوگوں کے لئے خدا کی نشانی تھے، اللہ کی رحمت تھے، اپنی والدہ کے

ساتھ نیک سلوک کرنے والے تھے اور ان افراد میں سے تھے جن پر خدا نے سلام کیا،

(سورۃ مریم، آیات ۱۹ تا ۳۳)

۲۱، ۲۲۔ وہ خدا کی طرف سے کتاب و حکمت کی تعلیم حاصل کرنے والے کا اعزاز پانے والوں میں سے تھے۔

(سورۃ آل عمران، آیت ۴۸)

یہ بائیس صفات کہ جو ولایت کے بلند پایہ مراتب میں سے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کی طرف سے عطا کردہ

عظیم اوصاف کا مجموعہ و لب لباب ہے کہ ان کے ذریعے خداوند عالم نے ان کی شان بلند کر دی،

ان صفات کی دو قسمیں ہیں:

(۱) کسبی

(۲) وہبی



پہلی قسم کی مثال: عبودیت و بندگی، قرب الہی اور صلاح و نیکی،

دوسری قسم کی مثال: نبوت، رسالت، کلمتہ اللہ و روح اللہ ہونا وغیرہ

ان دونوں قسموں سے مربوط صفات کے بارے میں ہم نے اس کتاب میں اپنی قوتِ فہم کے مطابق وضاحت کی

ہے، قارئین کرام خود ان امور میں ان مطالب کا مطالعہ کر سکتے ہیں،

## تیسری فصل:

حضرت عیسیٰؑ نے کیا کہا؟ اور ان کے بارے میں کیا کہا گیا؟

قرآن مجید نے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے کہ عیسیٰؑ عبد خدا اور رسول تھے، اور یہ کہ انہوں نے ہرگز وہ بات نہیں کی جو ان کی طرف منسوب کی گئی اور نہ ہی اپنے رسول ہونے کے علاوہ کسی حوالہ سے لوگوں سے بات کی، چنانچہ اس سلسلہ میں درج ذیل آیات میں ان کے متعلق یوں ارشاد ہوا:

سورۃ مائدہ، آیات ۱۱۶ تا ۱۱۹

○ ”وَإِذْ قَالَ اللَّهُ لِيَعْقِبِي ابْنَ مَرْيَمَ إِنَّكَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمَّيَ الْهَيْئِينَ مِنْ دُونِ اللَّهِ قَالُوا سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقِّ ۚ إِنْ كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ تَعَلَّمَ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ۝ مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنْ أَعْبُدُ وَاللَّهُ رَاقِبٌ وَّرَبُّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مِمَّا دُمْتُ فِيهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنْتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝ إِنْ تَعَدَّ بِهِمْ فَالَهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَإِنْ تَعَفَّرَ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ قَالَ اللَّهُ هَذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ“

(اور جب خدا نے کہا: اے عیسیٰ بن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا ہے کہ خدا کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو دو خدا مانو؟ اس نے کہا: حیرت ذاتِ پاک ہے، میرے لئے روانہ نہیں کہ میں وہ کچھ کہوں جس کا مجھے حق حاصل نہیں، اگر میں نے کہا ہوتا تو تو اس سے آگاہ ہوتا، تو تو میرے دل کی ہر بات کو جانتا ہے لیکن میں تیری کوئی بات نہیں جانتا، بے شک تو علام الغیوب ہے) (چھپی ہوئی چیزوں کو بہتر جاننے والا ہے) میں نے اس کے علاوہ لوگوں سے کچھ نہیں کہا جو تو نے مجھے حکم دیا ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے،

میں جب تک ان میں موجود تھا ان پر گواہ تھا اور جب تو نے میرا وقت پورا کر دیا تو تو خود ان پر نگران تھا اور تو ہر چیز پر گواہ اور اس کا دیکھنے والا ہے، اگر تو ان پر عذاب نازل کرے تو وہ تیرے ہی بندے ہیں اور اگر تو انہیں معاف کر دے تو تو ہی غلبہ والا، دانا ہے، خدا نے کہا (قیامت کے دن کہے گا) کہ یہ دن وہ ہے جب سچ بولنے والوں کو ان کا سچ بولنا فائدہ دے گا،

یہ نہایت بلند پایہ کلام کہ جو عبودیت کی حقیقتوں پر مشتمل اور ادب کی اعلیٰ ترین جہتوں کا حامل ہے اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنے پروردگار سے رابطہ بندگی کا کمال اور لوگوں سے تعلق کے حوالہ سے ہادیانہ و ناصحانہ اور شفیقانہ روش و طرز عمل واضح طور پر معلوم ہوتا ہے، یعنی خدا اور خلق دونوں سے تعلق کی بابت ان کے عملی موقف کی عکاسی و ترجمانی ہوتی ہے، چنانچہ اس میں مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اپنے آپ کو اپنے پروردگار کی نسبت ایک عبد سمجھتے تھے کہ جس کا کام اپنے مولا کے فرامین کی اطاعت کے سوا کچھ نہیں اور وہ اس کے حکم سے قطع نظر کسی چیز کا ارادہ ہی نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے فرمان کے بغیر کوئی عمل انجام دیتا ہے، اور اسے اس کے سوا کوئی حکم و فریضہ نہیں دیا گیا کہ وہ لوگوں کو خدائے یکتا کی بندگی کی طرف دعوت دیں، اسی بناء پر اس نے لوگوں سے صرف یہی کہا: ”اِنَّ اَعْبُدُ وَاللّٰهُ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ“ کہ تم اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے،

اسے خداوند عالم کی طرف لوگوں کی بابت صرف یہ ذمہ داری دی گئی تھی کہ ان کے اعمال پر نگران و گواہ ہو اور جب ضرورت ہو تو ان کے اعمال کے بارے میں گواہی دے، اس کے علاوہ کچھ نہیں، اب یہ کام خدا کا ہے کہ وہ قیامت کے دن لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کرے اور ان کے بارے میں کیا فیصلہ کرے، اس کا عیسیٰؑ سے کوئی تعلق نہیں، یعنی یہ فیصلہ خدا نے خود ہی کرنا ہے کہ لوگوں کو معاف کر دے یا سزا دے،

## حضرت عیسیٰؑ کی شفاعت اور خدا کی قدرت

مذکورہ بالا مطالب کے تناظر میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آپ نے شفاعت کی بحث میں جو کہ سابقہ مباحث میں ہو چکی ہے حضرت عیسیٰؑ کو قیامت کے دن شفاعت کرنے والوں میں شمار کیا اور آپ آپ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہوگا اور حضرت عیسیٰؑ کا اس سے کوئی تعلق نہ ہوگا، تو کیا یہ تضاد نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں یہ بات درست ہے کہ حضرت عیسیٰؑ قیامت کے دن شفاعت کرنے والوں میں سے ایک ہیں اور قرآن مجید میں اس حوالہ سے صریح یا شمل صریح بیان موجود ہے چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورۃ زخرف، آیت: ۸۶

○ ” وَلَا يَسْئَلُكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ“

(اور وہ لوگ شفاعت کا حق نہیں رکھتے جنہیں یہ خدا کے علاوہ پکارتے ہیں، شفاعت صرف وہی کر سکیں گے جو حق کے ساتھ گواہی دیں اور وہ علم رکھتے ہوں)

سورۃ نساء، آیت: ۱۵۹

○ ” وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا“

(اور وہ قیامت کے دن ان پر گواہ ہوگا)

اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گواہ کہا گیا ہے۔

سورۃ مائدہ، آیت: ۱۱۰

○ ” وَإِذْ عَلَّمْنَاكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْحِيدَ وَإِلَّا نُجِيبَ“

(اور جب میں نے تجھے کتاب، حکمت، تورات اور انجیل کی تعلیم دی)

اس آیت میں حضرت عیسیٰؑ کو خدا کی طرف سے کتاب و حکمت اور تورات و انجیل کا عالم کہا گیا ہے۔

شفاعت کی بحث میں تمام مربوطہ جہات وضاحت و تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکی ہیں اور اس سلسلہ میں سیر حاصل بحث ہو چکی ہے، لہذا شفاعت اور فدیہ دیئے جانے کے بارے میں نصاریٰ کے عقیدہ میں بہت فرق ہے، فدیہ دیئے جانے کے عقیدہ کی بناء پر قیامت کے دن جزاء کے نظام کی نفی ہوتی ہے، کیونکہ اس سے خداوند عالم کی علی الاطلاق حاکمیت بے نتیجہ و بے اثر ہو جاتی ہے کہ انشاء اللہ اس موضوع کی بابت تفصیلی مطالب عنقریب ذکر کئے جائیں گے۔

بہر حال یہ آیت مبارکہ صرف اسی عقیدہ کی نفی کرتی ہے اور جہاں تک شفاعت کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں آیت مبارکہ اثبات یا نفی میں سے کسی بھی پہلو کو بیان نہیں کرتی کیونکہ اگر وہ اس کے اثباتی پہلو کے بیان پر مشتمل ہوتی (جو کہ اس مورد مقام کے منافی ہے) تو ”وَإِنْ تَعَفُّوْا لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ“ کی بجائے ”وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ“ کہا جاتا، اور اگر شفاعت کی نفی کے بیان پر مشتمل ہوتی تو اس میں قیامت کے دن لوگوں کے اعمال پر گواہ ہونے کا تذکرہ ہی نہ ہوتا۔

بہر حال مذکورہ بالا آیات کے حوالہ سے جو کچھ بیان ہوا وہ اجمالی تذکرہ ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ تفصیلی مطالب ان آیات کی تفسیر (سورۃ مائدہ) میں پیش کئے جائیں گے۔

اور جہاں تک عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں لوگوں کے اظہارات کا تعلق ہے تو اگرچہ آنجنابؑ کے بعد لوگ مختلف

مذہب میں بٹ گئے اور گونا گوں مسالک کا شکار ہو گئے کہ کیم و بیش ان گروہوں کی تعداد..... مذہب و مسالک اور عقائد و نظریات میں اصولوں و کلیات اور جزئیات کے حوالہ سے..... ستر یا اس سے بھی زیادہ ہے، لیکن قرآن مجید نے صرف عیسائیوں کے انہی اظہارات کا تذکرہ کرنے پر توجہ مرکوز رکھی جو انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ گرامی قدر حضرت مریمؑ کے بارے میں کئے کیونکہ ان مطالب کا ربط توحید کی اصل و اساس سے تھا جو کہ تمام قرآنی معارف و بیانات اور فطری دین کی طرف دعوت کی اصل غرض و غایت ہے، البتہ اس موضوع کی بعض جزئیات مثلاً مسئلہ تحریف اور فدیہ دیئے جانے کی بات، تو ان کی بابت غیر معمولی توجہ نہیں دی اور نہ ہی ان کے بارے میں اہمیت کے ساتھ اظہار خیال ہوا، قرآن مجید میں عیسائیوں کے اظہارات یا ان کی طرف منسوب مطالب کا تذکرہ درج ذیل آیات مبارکہ میں پایا جاتا ہے:

سورۃ توبہ، آیت: ۳۰

○ ”وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ“

(اور نصرانیوں نے کہا کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے)

اس آیت میں ان کی طرف سے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دینے کا ذکر ہوا ہے جو کہ ان کے اظہارات کا حصہ ہے، اسی سلسلہ میں ایک آیت اس طرح گویا ہے:

سورۃ انبیاء، آیت: ۲۶

○ ”وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهُ“

(انہوں نے کہا کہ رحمن نے بیٹا بنایا ہوا ہے، خدا اس سے پاک ہے)

اس آیت میں عیسائیوں کے اظہارات کے حوالہ سے ان کے عقیدہ کا تذکرہ ہے۔

سورۃ مائدہ، آیت: ۷۲

○ ”لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ“

(کافر ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ ہی مسیح ابن مریم ہے)

اس آیت میں صریح لفظوں میں عیسائیوں کے اظہارات کا تذکرہ ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ہی نہیں بلکہ خدا سمجھتے ہیں۔

سورہ مائدہ، آیت: ۷۳

○ ” لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ“

(یقیناً کافر ہوئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے)

اس آیت میں تین خداؤں کے حوالہ سے عیسائیوں کے عقیدہ کا اظہار و تذکرہ ہوا ہے کہ وہ اللہ کو تیسرا معبود مانتے

ہیں یعنی پہلا حضرت عیسیٰؑ، دوسرا حضرت مریمؑ اور تیسرا اللہ!

سورہ نساء، آیت: ۱۷۱

○ ” وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ كَفَرْنَا أَنْتَهُمُ الْإِلٰهُ“

(اور تم تین خدا نہ کہو)

اس آیت میں انہیں عقیدہ ثلاثیت کی ممانعت کے حوالہ سے تذکرہ ہوا ہے،

یہ تمام آیات اگرچہ بظاہر مختلف الفاظ پر مشتمل ہونے کے حوالہ سے ایک دوسرے سے متفاوت مضامین و معانی کی

حامل ہیں کہ جن کی وجہ سے انہیں ان لوگوں کے مختلف مذاہب کے بیان پر مشتمل سمجھا گیا اور کہا گیا کہ ان آیات میں عیسائیوں

کے تین مختلف مسالک کا تذکرہ ہوا ہے مثلاً:

(۱) مکانیوں کا عقیدہ کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے حقیقی فرزند ہیں،

(۲) نسطوریوں کا عقیدہ کہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کا خدا کا بیٹا ہونا اس طرح سے ہے جیسے روشنی کسی صاف و شفاف

چیز مثلاً شیشہ پر پڑے،

(۳) یعقوبیوں کا عقیدہ کہ جو انقلاب یعنی خدا کی ماہیت کے تبدیل ہو جانے کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا

گوشت و خون بن گیا،

(یہ تفصیل شہرستانی نے اپنی کتاب ”اللسل والنحل“ میں ذکر کی ہے جو کہ تاریخ ادیان اقوام کی مشہور کتاب ہے)۔

لیکن ظاہر یہ ہے کہ قرآن مجید ان کے مختلف مذاہب کی خصوصیات کا ترجمان نہیں اور نہ ہی ان کی تفصیلات کا بیان

اس کا مقصد و مقصود ہے بلکہ اسے صرف ایک ہی موضوع سے سروکار ہے کہ جو ان سب کے درمیان قدر مشترک ہے اور وہ ہے

حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کا فرزند خدا ہونا! اور یہ کہ حضرت مسیحؑ کو الوہیت کا درجہ حاصل ہے، اسی طرح وہ امور جو عقیدہ

مسیحیت سے تعلق رکھتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ اس اعتقاد کے معنی اور تثلیث سے مراد کے تعین میں آپس میں اختلاف

رائے رکھتے ہیں اور اس حوالہ سے ان کے درمیان ایک وسیع جنگ چھڑی ہوئی ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن مجید میں ان

سب کے غلط عقائد و نظریات کی نفی میں ایک ہی طرز استدلال و اسلوب خطاب اپنایا گیا ہے اور ان سب کو ان کے درمیان

پائے جانے والے مشترک مسئلہ کے حوالہ سے مخاطب قرار دیا گیا ہے۔

اس مسئلہ کی مزید وضاحت یہ ہے کہ موجودہ تورات و انجیل دونوں میں ایک طرف تو واضح و صریح الفاظ میں خدا کی وحدانیت و یکتائی بیان کی گئی ہے لیکن دوسری طرف انجیل میں صراحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی صریح طور پر بیان ہوا ہے کہ بیٹا ہی باپ ہے اس کے علاوہ نہیں۔

اور انہوں نے بیٹا ہونے کی تاویل میں اسے اعزازی اور برکت کے لئے بھی قرار نہیں دیا حالانکہ انجیل میں اسے کئی مقامات پر صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ نے فرمایا:

”میں تم سے کہتا ہوں کہ تم اپنے دشمنوں سے دوستی کرو، اور جو تم پر لعنت کرے اس کے لئے دعائے برکت کرو، اور جو تم سے دشمنی کرے اس کے ساتھ نیکی کرو، اور جو تمہیں دھتکار دے اس کے ساتھ صلہ رحمی و پیوستگی کرو تا کہ اپنے باپ کے بیٹے بن کر رہو، وہ باپ کہ جو آسمانوں میں ہے کیونکہ وہ ایسی ذات ہے جس کا سورج نیکیوں اور بدکاروں سب کو برابر روشنی دیتا ہے اور اس کی بارش سچوں اور ظالموں دونوں قسم کے لوگوں پر برابر و مساوی طور پر برتی ہے، اگر تم صرف اس سے دوستی کرو جو تم سے دوستی کرے تو پھر کیا فضیلت اور کیا اجر؟ یہ تو عام افراد و معاشرہ اور باہم مل جل کر رہنے والوں کا شیوہ و طرز عمل ہے، اگر تم صرف اپنے بھائیوں کو سلام کرو تو پھر تمہاری کیا فضیلت ہے؟ تو کیا بت پرست اس کے علاوہ کرتے ہیں؟ (ان کا طرز عمل ایسا ہی ہے)، پس تم آؤ اور اپنے آسمانی باپ کی طرح کامل بنو کہ وہ کامل ہے“، (عربی متن ملاحظہ ہو)

(احبوا اعدائکم، وبارکوا علی لا عنیکم، واحسنوا الی من ابغضکم، وصلوا علی من یطربکم و یعسفکم کیما تکنونوا بنی ابیکم الذی فی السماوات لانه المشرق شمسہ علی الاخیار والاشرار والممطر علی الصدیقین والظالمین، واذ احببتم من یحبکم فأی اجر لکم؟ ایس العشارون یفعلون کذلک؟ وان سلمتم علی اخوتکم فقط فأی فضل لکم؟ ایس کذلک یفعل الوثنیون، کونوا کاملین مثل ابیکم السماوی فہو کامل)

(ملاحظہ ہو انجیل متی، آخراصحاح پنجم، مطبوعہ ۱۸۱۱ء، متن عربی، ہم نے انجیل کے مندرجات اسی سے لئے ہیں)

اسی طرح انجیل متی، اصحاح پنجم میں مذکور ہے کہ حضرت مسیحؑ نے فرمایا:

”فلیضیئ نورکم قدام الناس لیروا اعمالکم الحسنہ ویمجدوا اباکم الذی فی السماوات“

(تمہارا نور تمام لوگوں کے سامنے درخشاں ہونا چاہیے تاکہ وہ تمہارے نیک اعمال کا مشاہدہ کریں اور تمہارے آسمانی باپ کی مجد و تعریف کریں)

اسی انجیل میں حضرت مسیحؑ کا یہ فرمان مذکور ہے:

(۱) ” لا تصنعوا جميع مراحمكم قدام الناس كي يروكم فليس لكم اجر عند ابيكم

الذی فی السماوات“

(اور تم دکھاوے وریا کاری کی غرض سے اپنے رحم لانا اعمال انجام نہ دو ورنہ تمہارے باپ کے پاس کہ جو آسمانوں

میں ہے تمہارے لئے کوئی اجر نہ ہوگا)

(۲) اسی میں حضرت عیسیٰؑ کا یہ ارشاد گرامی قدر مذکور ہے جو انہوں نے نماز کے بارے میں فرمایا:

”وهكذا تصلون انتم يا ابانا الذی فی السماوات تقدس اسمک“

(اور تم اسی طرح نماز پڑھو، اے ہمارے باپ کہ جو آسمانوں میں ہے، تیرا نام مقدس ہے)۔

(۳) اسی میں حضرت مسیحؑ کا یہ فرمان مذکور ہے:

” فان غفرتم للناس خطايا هم غفر لكم ابوكم السماوی خطاياکم“

(اگر تم لوگوں کی غلطیاں معاف کرو تو تمہارا آسمانی باپ تمہاری غلطیاں معاف کر دے گا،

(یہ تینوں بیانات انجیل متی، اصحاح ۶ میں بھی ہیں)

انجیل لوقا، اصحاب ۶ میں اس طرح مذکور ہے کہ حضرت مسیحؑ نے ارشاد فرمایا:

” وكونوا رحماء مثل ابيکم الرحيم“

(اور تم اپنے رحیم باپ کی طرح رحم والے بنو)

انجیل یوحنا، اصحاب ۲۰ میں ہے کہ حضرت مسیحؑ نے مریم مجدلیہ سے فرمایا:

” امضی الی اخوتی وقلی لهم: انی صاعد الی ابي الذی هو ابوکم والہی الذی هو الہکم“

(میرے بھائیوں کے پاس جا کر ان سے کہو کہ میں اپنے باپ کی طرف کہ جو تمہارا بھی باپ ہے اور اپنے معبود کی

طرف کہ جو تمہارا بھی معبود ہے پر داز کرنے والا ہوں)

ان عبارتوں اور تینوں انجیلوں میں موجود ان جیسی دیگر عبارتوں میں لفظ ”باپ“ خداوند عالم اور حضرت عیسیٰؑ اور

دیگر کے لئے استعمال ہوا ہے اور جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا کہ یہ استعمال اعزازی بنیاد پر ہے، اگرچہ ان کے علاوہ دیگر بعض

عبارتوں میں بیٹا اور باپ ہونا اعزازی ہی نہیں بلکہ ایک طرح کی کمالی جہت و حیثیت میں ہے کہ جس کا نتیجہ دونوں کا ایک ہو

جانا ہے، چنانچہ انجیل یوحنا، اصحاب ۷ میں اس طرح مذکور ہے:

” تکلم المسيح بهذا ورفع عينيه الی السماء فقال: يا ابتہ قد حضرت الساعة فمجد

ابنک یمجد ابنک، ثم ذکر دعائہ لرسولہ من تلامذتہ ثم قال: ولست اسأل فی ہؤلاء فقط بل  
وفی الدین یؤمنون بی بقولہم لیکونوا باجمعہم واحداً کما انک یا ابت ثابت فی وانا ایضاً  
فیک لیکونوا ایضاً فینا واحداً لیؤمن العالم انک ارسلتہی وانا اعطیتہم الحد الذی اعطیتہی  
لیکونوا واحداً کما نحن واحد انا فیہم وانت فی ویکونوا کاملین لواحد لکی یعلم العالم انک  
ارسلتہی وانی اجبتہم کما احببتہی“

(حضرت مسیحؑ نے جب یہ بات کی تو انہوں نے اپنی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھائیں اور فرمایا: اے باپ! اب  
وہ وقت آ پہنچا ہے، اب اپنے بیٹے کی تعریف کر، تاکہ تیرا بیٹا بھی تیری تعریف کرے، اس کے بعد انہوں نے اپنے شاگردوں  
سے اپنے نمائندوں کے لئے جو دعا کی اس کا تذکرہ اس طرح ہوا کہ انہوں نے فرمایا: میں یہ دعا صرف انہی کے لئے نہیں کر رہا  
بلکہ یہ ان تمام لوگوں کے بارے میں ہے جو ان نمائندوں کے کہنے پر مجھ پر ایمان لائے ہیں، تاکہ وہ سب ایک ہوں کہ جس  
طرح سے اے میرے باپ! تو مجھ میں سایا ہے اور میں تجھ میں سما گیا ہوں، تاکہ وہ سب ہم میں سما جائیں، اور تاکہ پوری  
کائنات اس بات پر ایمان لائے کہ تو نے مجھے بھیجا ہے (میں تیرا بھیجا ہوا رسول ہوں) اور میں نے لوگوں کو عزت و آبرو سے  
نوازا ہے کہ جو تو نے مجھے عزت و آبرو عطا کی ہے تاکہ وہ اسی طرح ایک ہوں جس طرح ہم ایک ہیں، میں ان میں ہوں اور تو  
مجھ میں ہے اور وہ سب ایک کے لئے کامل ہوں تاکہ سارا عالم یہ جان لے کہ تو نے مجھے رسول بنایا ہے اور میں تجھ سے محبت کرتا  
ہوں جس طرح سے تو مجھ سے محبت کرتا ہے،)

لیکن موجودہ انجیلوں میں بعض ایسی عبارتیں اور الفاظ ہیں کہ جن کے ظاہر سے اس امر کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ بیٹا  
اور باپ ہونا اعزازی ہے،..... اگرچہ ان انجیلوں میں صریح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ احترام و اعزاز کے طور پر ہیں لیکن  
اس کے برعکس بعض مقامات میں ان نسبتوں کے اعزازی ہونے کی نفی پائی جاتی ہے..... مثلاً: انجیل یوحنا، اصحاب: ۱۴

” قال لہ لوقا: یا سید ما نعلم این تذهب؟ وکیف نقدر ان نعرف الطریق؟ قال لہ یسوع: انا هو  
الطریق و الحق والحیة لا یأتی احد الی ابی الابی، لو کنتم تعرفونی لعرفتم ابی ایضاً ومن الآن تعرفونہ  
وقدر ا یتموہ ایضاً، قال لہ فیلیس: یا سید ارنا الالب وحسبنا، قال لہ یسوع: انا معکم کل ہذا الزمان  
ولم تعرفنی یا فیلیس؟ من رانی فقد رای الالب فکیف تقول انت: ارنا الالب؟ اما تؤمن انی فی ابی و ابی  
فی، و هذا الکلام الذی اقولہ لکم لیس هو من ذاتی وحده، بل ابی الحال فی هو یفعل ہذا الافعال،  
امنوا بی، انا فی ابی و ابی فی“

(لوقا نے حضرت مسیحؑ سے کہا: اے آقا! ہمیں کچھ علم نہیں کہ آپ کہاں جاتے ہیں؟ اور ہم کس طرح راستہ سے



آگاہ ہو سکتے ہیں؟ عیسیٰؑ نے فرمایا: میں ہی وہ راستہ ہوں، مجھے حق اور زندگی کی قسم! کوئی شخص میرے بغیر میرے باپ تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا، اگر تم نے مجھے پہچانا ہوتا تو میرے باپ کو بھی پہچانا ہوتا، اور ابھی سے تم اسے پہچان گئے ہو کیونکہ تم نے اسے دیکھ بھی لیا ہے، اس وقت فیلیس نے پوچھا: اے آقا! آپ ہمیں ہمارے باپ کا دیدار کروادیں اور بس، یہی ہمارے لئے کافی ہے، یسوع نے فرمایا: اے فیلیس! میں اس پورے دور میں تمہارے ساتھ تھا تو کیا تو نے مجھے نہیں پہچانا؟ جس نے مجھے دیکھا گویا اس نے باپ کو دیکھا، تو تو کیونکر یہ کہتا ہے کہ ہمیں باپ کا دیدار کراؤ؟ کیا تو ابھی تک اس بات پر ایمان نہیں لایا کہ میں باپ میں ہوں اور باپ مجھ میں ہے (ہم ایک دوسرے میں حلول کر چکے ہیں)، یہ بات جو میں تم سے کہہ رہا ہوں یہ صرف میری اپنی بات نہیں ہے بلکہ یہ میری اور میرے باپ کی ہے جو مجھے میں حلول کر چکا ہے، وہی ہے جو یہ سب کام کر رہا ہے، میری اس بات پر یقین کے ساتھ ایمان لاؤ کہ میں اپنے باپ میں اور میرا باپ مجھ میں ہے)

اور انجیل یوحنا، اصحاح ۸ میں حضرت عیسیٰؑ یہ قول مذکور ہے:

”لکنی خرجت من اللہ و جئت ولم انت من عندی بل هو ارسلنی“

(لیکن میں خدا سے باہر نکلا اور آ گیا مگر میں اپنی طرف سے..... اپنی مرضی سے..... نہیں آیا بلکہ اس نے مجھے بھیجا

ہے)

انجیل یوحنا، اصحاح ۱۰ میں آنجناب کا یہ ارشاد مذکور ہے:

”أنا و ابی واحد نحن“

(میں اور میرا باپ ہم دو، ایک ہی ہیں)

اور انہوں نے اپنے شاگردوں سے جو کچھ کہا اس کا تذکرہ انجیل متی، اصحاح ۲۸ میں اس طرح ہوا کہ انہوں نے ان

سے کہا:

”اذہبوا وتلمذوا کل الامم وعمدوہم باسم الابن والابن وروح القدس“

(تم جاؤ اور ہر قوم کے افراد کو میرا شاگرد بناؤ اور انہیں باپ، بیٹا اور روح القدس کے نام پر تمہید کرو (نبیلاؤ)،

..... تمہید عیسائیوں کے ایک خاص مذہبی غسل کو کہتے ہیں جو ہر مسیح پر لازم و واجب ہوتا ہے تاکہ وہ گناہوں سے پاک ہو

جائے.....“

انجیل یوحنا، اصحاح ۱ میں اس طرح مذکور ہے:

”فی البدء كان الكلمة والكلمة كان عند الله، والله كان الكلمة منذ البدء كان هذا عند

الله كل به كان وبغيره لم يكن شيئ مما كان به كانت الحياة، والحياة كانت نور الناس“

(ابتداء میں وہ ایک کلمہ تھا، اور کلمہ خدا کے پاس تھا اور خدائی وہ کلمہ تھا، وہ شروع ہی سے خدا کے پاس تھا، ہر چیز اسی کے ذریعے وجود میں آئی اور اس کے بغیر کوئی چیز وجود پذیر نہ ہوئی، ان چیزوں میں سے ایک زندگی ہے اور زندگی لوگوں کا نور ہے)

تو مذکورہ بالا بیانات اور ان جیسے دیگر اظہارات جو انجیل میں مذکور ہیں کہ جن کے باعث نصاریٰ کو تین خدا ماننے کی راہ ملی،

بہر حال انجیل میں ان بیانات و اظہارات کے تذکرہ کا مقصد یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خدا کا بیٹا ہونے کے عقیدہ کا تحفظ ہو اور اس کے ساتھ ساتھ خداوند عالم کی وحدانیت و یکتائی کا نظریہ بھی محفوظ رہے، یعنی دونوں باتیں درست قرار پائیں کیونکہ حضرت عیسیٰ نے تو خود ہی خدا کی توحید کی تعلیم دی اور واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا:

”ان اول کل الوصایا: اسمع یا اسرائیل الرب الہنک اللہ واحد ہو“

(میری سب سے پہلی وصیت و نصیحت یہ ہے: اے اسرائیل! رب جو کہ تیرا معبود ہے وہی یکتا معبود ہے)

(ملاحظہ ہو: انجیل مرقس، اصحاح ۱۲)

ان کے اقوال کا خلاصہ یہ ہے (اگرچہ اس کی برگشت کسی معقول و قابل قبول معنی کی طرف نہیں ہوتی) کہ ذات خداوندی یکتا جو ہر ہے کہ اس کے تین ”اقنوم“ ہیں، ”اقنوم“ سے مراد وہ صفت ہے جو ذات کی جلوہ افروزی و تجلی کا ذریعہ ہوتی ہے کہ جس سے اس ذات کی جلوہ سامانیاں یقینی ہوتی ہیں، گویا وہ ذات کا مظہر ہوتی ہے، البتہ وہ صفت موصوف کی غیر نہیں ہوتی یعنی اس سے الگ حیثیت کی حامل نہیں ہوتی، اور وہ تین اقنوم جو ذات خداوندی کے مظاہر ہیں ان میں سے ایک اقنوم وجود ہے، دوسرا اقنوم علم جو کہ ”کلمہ“ ہے اور تیسرا اقنوم حیات ہے کہ جو روح ہے۔

یہ تین اقنوم ہی ہیں جن میں سے ایک کو باپ، دوسرے کو بیٹا اور تیسرے کو روح القدس کہا جاتا ہے، پہلا یعنی ”باپ“ اقنوم الوجود، دوسرا اقنوم العلم و الکلمہ اور تیسرا اقنوم الحیات کہلاتا ہے۔ تو بیٹا اقنوم الکلمہ اور اقنوم العلم ہے جو باپ..... جو کہ اقنوم الوجود ہے..... کے پاس سے روح القدس کے ہمراہ..... جو کہ اقنوم الحیات ہے کہ جس کے سبب سے تمام اشیاء و موجودات عالم ہستی روشنی حاصل کرتی ہیں..... نازل ہوا،

یہ ہے ان امور کا اجمالی بیان، اور اس کی تفصیل و تفسیر میں نصاریٰ اس قدر اختلاف کا شکار ہوئے کہ کئی گروہوں میں تقسیم ہو گئے یہاں تک کہ ان کے مختلف و متعدد مذاہب و مسلک کی تعداد ستر سے زیادہ ہو گئی، ان کی بابت کچھ مطالب جو اس کتاب میں سامنے آئے اور ان کے بیان کی گنجائش ہوئی عنقریب پیش کئے جائیں گے۔

اگر آپ مذکورہ بالا مطالب پر اچھی طرح غور کریں اور ان کے معانی پر بھرپور توجہ دیں تو آپ بخوبی آگاہ ہو جائیں

گئے کہ قرآن مجید میں نصاریٰ کے جو بیانات و اظہارات ذکر کئے گئے ہیں یا جن باتوں کی ان کی طرف نسبت دی گئی ہے ان سب کی بازگشت ایک ہی مطلب کی طرف ہوتی ہے (یعنی وحدت کی تثلیث) تو وہ نصرانیت میں جنم دینے والے تمام مذاہب و مسالک کے درمیان قدر مشترک ہے کہ جس کی وضاحت ”وحدت کی تثلیث“ کے معنی میں ہم پہلے پیش کر چکے ہیں چنانچہ اس حوالہ سے جو آیات ذکر ہو چکی ہیں ان کا اشارتی ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے:

○ ” وَقَالَتِ الْيَهُودُ الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ.....“

○ ” لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ.....“

○ ” لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَلَاثٌ ثَلَاثَةٌ.....“

○ ” وَلَا تَقُولُوا لِمَا كُفَرُوا بِهِ إِنَّهُمْ مُكْرِمُونَ.....“

بہر حال قرآن مجید میں اسی قدر مشترک کو بیان کرنے پر اکتفا ہوئی ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالہ سے نصرانیوں کے اقوال پر ان کے کثیر و متفرق ہونے کے باوجود جو اشکالات وارد ہوئے ہیں کہ جن کی بناء پر قرآن مجید میں ان کے خلاف حجت قائم کی گئی ہے ان سب کا محور ایک ہے اور وہ ایک ہی طرز و اسلوب کے حامل ہیں، اس سلسلہ میں بہت جلد وضاحت کی جائے گی۔

### چوتھی فصل:

### عقیدہ تثلیث کی نفی میں قرآنی بیانات

قرآن مجید میں عیسائیوں کے عقیدہ تثلیث اور اس کی بابت ان کے اقوال کو دو طریقوں و حوالوں سے رد کیا گیا

ہے:

۱۔ کلی و عمومی طریقہ و حوالہ

۲۔ مخصوص و مختص طریقہ و حوالہ

کلی و عام طریقہ اپناتے ہوئے بیان کیا گیا کہ کلی طور پر خدا کا صاحبِ فرزند ہونا محال اور فی نفسہ ناممکن ہے خواہ عیسیٰؑ کو بیٹا کہا جائے یا کسی دوسرے شخص کو!

اور مخصوص و مختص طریقہ اپناتے ہوئے بیان کیا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ تو خدا کے فرزند تھے اور نہ ہی معبود

تھے، بلکہ بندہ خدا اور مخلوق تھے۔

یعنی پہلی صورت میں اصل مسئلہ ملحوظ تھا جبکہ دوسری صورت میں خاص طور پر حضرت عیسیٰؑ کے حوالہ سے بات کی گئی،

### مزید وضاحت:

پہلی صورت کی وضاحت یہ ہے کہ کسی کا کسی سے متولد ہونا اور فرزند قرار پانا حقیقت میں اس طرح ہوتا ہے کہ ان زندہ مادی موجودات میں سے کوئی ایک اپنے جسم سے کوئی حصہ الگ کرے مثلاً کوئی انسان یا حیوان یا نباتات میں سے کوئی نبات اپنے جسمانی مادہ سے کچھ جدا کرے، پھر اسے تدریجی نشوونما کے ذریعے اپنی ہی نوع کا ایک فرد بنا دے جو اس ہی جیسا ہو اور وہ انہی خصوصیات و آثار کا حامل بنے جو اس انسان، حیوان یا نبات میں موجود ہیں جس سے یہ جدا ہوا، مثلاً کوئی حیوان اپنے آپ سے نطفہ کو جدا کرتا ہے، اور نبات (گھاس) اپنے آپ سے ”لقاح“..... اپنے مادہ منویہ..... کو جدا کرتی ہے، پھر اس کی تدریجی تربیت و نشوونما کا اہتمام کرتی ہے یہاں تک کہ وہ جدا ہونے والی چیز اس جیسا حیوان یا نبات بن جاتی ہے، اور یہ واضح و معلوم ہے کہ خداوند عالم کے حوالہ سے اس طرح کی کیفیت محال و ناممکن ہے کیونکہ:

۱۔ اس میں خدا کا مادی جسم والا ہونا تسلیم کرنا پڑے گا جبکہ اللہ تعالیٰ مادہ اور اس کی بنیادی احتیاجات مثلاً حرکت اور زمان و مکان وغیرہ سے پاک و منزہ ہے۔

۲۔ خداوند عالم اپنی علی الاطلاق الوہیت و ربوبیت کے حوالہ سے ہر چیز پر علی الاطلاق قومیت و برتری اور بے نیازی رکھتا ہے لہذا ہر چیز وجود میں آنے اور بقا پانے میں اس کی محتاج و دست نگر ہے (ہر چیز کی وجود پذیری و موجودیت اسی سے وابستہ ہے) تو پھر کسی ایسی چیز کا تصور کیونکر ممکن ہے جو اس کی ہم نوع ہو، مثل ہو، اپنی ذات و موجودیت میں اس کی محتاج نہ ہو بلکہ اس سے بے نیاز اپنی استقلالی حیثیت رکھتی ہو، اپنی ذات، اوصاف اور خصوصیات کے حوالہ سے لیکن خدا کی طرف ہو اور ان میں سے کسی کی بابت خدا کی احتیاج نہ رکھتی ہو؟

۳۔ اگر خداوند عالم کی بابت بچے پیدا کرنے جیسے اعمال کو روا سمجھیں تو اس سے افعال تدریجی انجام دینے کو بھی درست ماننا پڑے گا جبکہ وہ اس سے بالاتر ہے، اور اسے مادہ و حرکت کے عمومی نظام کے ماتحت تسلیم کرنا پڑے گا جو کہ قطعی طور پر نادرست اور خلاف واقع ہے بلکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ خداوند عالم کا ہر کام اس کے ارادہ و مشیت کے ساتھ انجام پذیر ہوتا ہے اور اس کی مشیت زمانی فاصلہ اور تدریج کی محتاج نہیں..... بلکہ اس طرح کے امور سے بالاتر ہے..... چنانچہ اس کا ثبوت واضح و صریح الفاظ کے ساتھ درج ذیل آیت مبارکہ میں پایا جاتا ہے:

سورہ بقرہ، آیت: ۱۱۷

” وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهُ بَلْ لَّهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهُ قِنْدٌۢ ﴿۱۱۷﴾“

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَاِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۸۰﴾

(اور انہوں نے کہا کہ خدا نے بیٹا بنا لیا ہے، وہ اس سے منزہ و پاک ہے، بلکہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اس کی ملکیت ہے، سب اس کے حضور خضوع کرنے والے ہیں، وہ آسمانوں اور زمین کا بغیر کسی نمونہ و مثال کے خالق ہے، اور وہ جب کسی چیز کا حتمی فیصلہ کر لیتا ہے تو اس سے کہتا ہے، ہو جا! تو وہ ہو جاتی ہے)

اس آیت میں لفظ ”سبحان“..... ہمارے بیان کردہ مطالب کی روشنی میں..... زیر بحث موضوع کی ایک مستقل دلیل ہے..... اس میں خدا کی پاکیزگی اور مادہ و مادیت کے تقاضوں سے منزہ ہونا ملحوظ و مقصود ہے، اور جملہ ”لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ كُلُّ لَهٗ قٰنِیْنُوْنَ“ دوسری دلیل ہے..... کہ اس میں خداوند عالم کا قیوم ہونا ملحوظ و مقصود ہے..... اور جملہ ”بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَاِذَا قَضٰى اَمْرًا.....“ تیسری دلیل ہے..... کہ اس میں تدریجی نشوونما کی نفی اور خداوند عالم کے ارادہ و مشیت کے فرمانی فاصلہ کی عدم احتیاج ملحوظ و مقصود ہے.....

جملہ ”بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ“ کے بارے میں بھی یہ امکان بھی پایا جاتا ہے کہ وہ صفت کی اپنے فاعل کی طرف اضافت کے باب سے ہو، اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوگا کہ خداوند عالم کی تخلیق کسی ایسی مثال کی بناء پر نہیں جو اس سے پہلے تھی لہذا اس کا بچہ پیدا کرنا غیر ممکن اور ناقابل تصور ہے کیونکہ اس طرح اس کی تخلیق سابقہ نمونہ کی بناء پر ہو جائے گی کیونکہ عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو عین و مثل خدا مانتے ہیں، بنا بریں یہ جملہ ہمارے زیر بحث موضوع کی ایک اور دلیل قرار پاتا ہے،..... اس حوالہ سے ہمارے موضوع کی چار دلیلیں اسی ایک آیت مبارکہ میں پائی جاتی ہیں یعنی لفظ ”سبحان“ پہلی دلیل، جملہ ”لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ كُلُّ لَهٗ قٰنِیْنُوْنَ“ دوسری دلیل، جملہ ”بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ“ تیسری دلیل اور جملہ ”اِذَا قَضٰى اَمْرًا.....“ چوتھی دلیل ہے،

اگر بالفرض ان کے قول ”اِنَّ حَدَّ اللّٰهِ وَاَلَدًا“ (خدا نے بیٹا بنا لیا ہے) کو مجازی و غیر حقیقی قرار دیں اور کہیں کہ انہوں نے یہ بات بیٹا اور بچہ کے معنی کے دائرہ کی وسعت کی بنیاد پر کی ہے اور وہ یوں کہ اس سے یہ مراد لیا جائے کہ ایک چیز دوسری چیز سے منفصل والا لگ ہوئی ہے جو کہ حقیقت میں اس کے مثل ہو کہ مادی اشیاء کے ایک دوسرے سے الگ ہونے یا زمانی تدریج کے بغیر ایسا ہو (یہی وہ بات ہے جو نصاریٰ کے قول و عقیدہ یعنی ”الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ“ (مسیح خدا کا بیٹا ہے) کی بابت بھرپور چھان بین کے بعد معلوم ہوتی ہے کہ ان کا مقصد بھی یہی ہے) لیکن اس کے باوجود مماثلت والا اشکال اپنی جگہ باقی رہ جاتا ہے۔

اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ باپ اور بیٹا ہونے کے اثبات کا لازمی نتیجہ ان کے عدد (ایک سے زیادہ ہونے) کا اثبات ہے جو کہ حقیقی کثرت کا اثبات ہی ہے، کیونکہ اس بناء پر باپ اور بیٹا کے درمیان نوعی وحدت فرض بھی کریں جیسا کہ نوع

انسانی سے باپ اور بیٹا ہوتے ہیں (ان میں سے ایک فرد کو باپ اور دوسرے کو بیٹا کہا جاتا ہے جبکہ وہ دونوں ایک ہی نوع انسانی کے افراد ہیں) لیکن وہ انسانی حقیقت میں ایک اور نوع انسان کے حوالہ سے دو فرد ہیں، لہذا اگر ہم معبود کو ایک مانیں تو اس کے علاوہ جو بھی ہے..... کہ جس میں بیٹا بھی شامل ہے..... وہ اس کا غیر، اس کا مملوک اور اس کا دست نگر و محتاج ہوگا اور جسے بیٹا سمجھا گیا ہے وہ اس کے مثل معبود نہ ہوگا کیونکہ خدا محتاج نہیں جبکہ وہ (بیٹا) اپنے وجود میں آنے کے لئے باپ کا محتاج ہوتا ہے، اور اگر یہ کہیں کہ وہ (بیٹا) اس جیسا ہے مگر اس کا محتاج نہیں بلکہ اس کی طرح اپنے وجود میں آنے میں استقلال رکھتا ہے اور کسی کا دست نگر نہیں تو اس سے عقیدہ توحید کی سرے ہی سے نفی ہو جائے گی اور خداوند عالم کی یکتائی بے بنیاد ہو جائے گی،

چنانچہ درج آیت مبارکہ بھی اسی مطلب پر دلالت کرتی ہے:

سورۃ نساء، آیت: ۱۷۱

○ ”وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةً ۖ إِنَّهُمْ أَحْسَنُ إِلَيْكُمْ ۗ إِنَّمَا اللَّهُ إِلَهٌ وَاحِدٌ ۖ سُبْحٰنَہٗٓ أَن تَكُونَ لَہٗ وَاٰلَہٗٓ لَهُ صَافِي السَّلٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَكُفِيَ بِاللّٰهِ وَكِيلًا“

(اور تم تین خداؤں کی بات نہ کرو، اس سے باز آ جاؤ تمہارے لئے بہتر ہوگا، بس اللہ ہی یکتا معبود ہے، اس کی ذات پاک و منزہ ہے اس سے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو، اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ کا سہارا ہی کافی ہے)

اور جہاں تک دوسری صورت کا تعلق ہے اور وہ یہ کہ بالخصوص حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ تو خدا کے بیٹے ہیں اور نہ ہی خدا کے ساتھ الوہیت کی حقیقت میں شریک ہیں تو اس کی دلیل آجنگاب کا بشر اور بشریت کی خصوصیات کا حامل ہونا ہے،..... تو ظاہر ہے کہ جو شخص لباس بشریت زیب تن کئے ہو وہ الوہیت کے مقام پر فائز نہیں ہو سکتا، اس کی وضاحت یہ ہے کہ حضرت مریمؑ ان کی حامل تھیں اور انہوں نے اپنے رحم میں ان کی نشوونما کی اور پھر جس طرح ہر ماں بچہ پیدا کرتی ہے انہوں نے بھی انہیں جنا، اس کے بعد اپنے نومولود کی اس طرح تربیت کی جس طرح ہر ماں اپنے نوزائیدہ بچہ کی نگہبانی و حضانت کے فرائض سرانجام دیتی ہے، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نشوونما اور زندگی کے مراحل طے کرنا شروع کیے اور عمر کے مدارج میں یکے بعد دیگرے ترقی و پیشرفت کرتے ہوئے بچپن سے جوانی اور پھر بڑھاپا تک پہنچے، ان تمام مراحل میں ان کی حالت ایک عام انسان جیسی تھی کہ جو اپنی طبع انسانی کے ساتھ زندگی کی گونا گوں کیفیات سے دوچار ہوتا ہے، چنانچہ وہ عام انسان کی طرح ان تمام کیفیتوں سے گزرے مثلاً بھوک، سیر ہونا، خوش و ناخوش ہونا، لذت و الم پانا، کھانا پینا، سونا و بیدار ہونا اور تھکن سختی اور راحت و آرام وغیرہ،

یہ تمام کیفیتیں ایسی ہیں جن کا مشاہدہ اس دور میں سب نے کیا جب آنجناب لوگوں کے درمیان رہے، تو کوئی مظلوم انسان اس بات میں شک نہیں کر سکتا کہ جو شخص اس طرح کی جسمانی کیفیات سے دوچار ہو وہ اپنے دیگر ہم نوع افراد بشر کی طرح ”انسان“ ہی ہے اور نتیجتاً اسی طرح وہ مخلوق اور کارخانہ صنعت الہی کا شاہکار ہے جس طرح اس کی نوع کے دیگر افراد ہیں، اور جہاں تک ان کے ہاتھوں خارق العادت و معجزات کے رونما ہونے کا تعلق ہے مثلاً مردوں کو زندہ کرنا، پرندہ کی تخلیق، مادرزاد نابینا اور برص کے مریض کا شفا یاب ہونا، اسی طرح ان کے اپنے وجود پانے میں جو خارق العادت امور ظاہر ہوئے مثلاً ان کا بغیر باپ کے پیدا ہونا وغیرہ تو وہ تمام غیر معمولی و خارق العادت ہیں کہ جو عالم طبیعت میں جاری و ساری عام نظام سے مطابقت نہیں رکھتے اور ان کا وقوع پذیر ہونا نادر ہے (وہ نادر الوجود ہیں) لیکن وہ ناممکن و محال ہرگز نہیں، حضرت آدم ہی کو دیکھ لیں کہ جن کے بارے میں آسمانی کتب واضح طور پر بیان کرتی ہیں کہ وہ مٹی سے پیدا کئے گئے اور بغیر باپ..... اور بغیر ماں..... کے پیدا ہوئے، اور انبیاء الہی مثلاً صالح، ابراہیم اور موسیٰ علیہم السلام کے ہاتھوں بے شمار معجزات و خارق العادت امور رونما ہوئے کہ جن کا تذکرہ آسمانی کتب میں ہوا ہے اور وہ ان حضرات کے لئے کسی طرح سے بھی الوہیت و خدائی کا اثبات نہیں کرتے اور نہ ہی ان اعمال کی بناء پر انہیں انسانیت کی وادی سے نکال کر خدائی کے منصب پر فائز ظاہر کرتے ہیں، یہ طریقہ استدلال وہی ہے جو قرآن مجید میں اختیار کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورہ مائدہ، آیت: ۷۵

○ ”لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَلَاثُ ثَلَاثَةٍ ۚ وَمِنْ إِلَهِ الْإِلَهِ وَالْوَّاحِدُ..... مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۗ وَأُمُّهُ صِدْقَةٌ ۗ كَا نَا يَا كَلْبَانَ الطَّعَامَ ۗ أَنْظَرُ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ نَحْمُ أَنْظَرُ أَلِيُّو فُكُونُ“

(کافر ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ، تین تین میں کا تیسرا ہے، حالانکہ خدائے یکتا کے سوا کوئی معبود نہیں..... مسیح بن مریم تو صرف رسول تھا کہ اس سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں اور اس کی ماں سچی تھی، وہ دونوں کھانا کھاتے تھے، آپ دیکھیں کہ ہم کس طرح یہ نشانیاں لوگوں کے لئے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں، پھر دیکھیں کہ وہ کس طرح اور کس قدر جھوٹ و الزام تراشیاں کرتے ہیں)

اس آیت میں حضرت مسیحؑ کا کھانا کھانا خاص طور پر مذکور ہے کیونکہ یہ ایسا عمل ہے جو تمام اعمال میں سے زیادہ واضح و مضبوط دلیل کی حیثیت رکھتا ہے کہ اسے انجام دینے والا شخص مادی جسمانی ضروریات سے دوچار ہوتا ہے اور اس سے اس کی احتیاج و دست گیری ظاہر و ثابت ہوتی ہے جو کہ یقینی طور پر الوہیت و خدائی کے منافی ہے کیونکہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جب طبعی طور پر بھوک اور پیاس لگے اور پھر وہ کچھ کھا کر پانی کر سیر و سیراب ہو جائے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سراپا

احتیاج ہے اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے پر خود قادر نہیں بلکہ اس مقصد کے لئے کسی دوسرے کا دست نگر ہونے کے بغیر اس کے پاس کوئی چارہ کار نہیں، تو اس طرح کے شخص کی خدائی کیا معنی رکھتی ہے؟ کیونکہ جو شخص اس حد تک احتیاجات میں گھرا ہوا ہو اور اپنے تئیں انہیں دور کرنے پر قادر نہ ہو وہ ناقص و نامکمل ہوتا ہے اور اس کے امور کی تدبیر اس کے ہاتھ میں نہیں ہوتی بلکہ کوئی دوسرا اس کے نظام حیات کو اپنے ہاتھ میں لئے ہوتا ہے یعنی وہ معبود غنی بالذات نہیں ہو سکتا بلکہ وہ اس ہستی کا خلق کردہ (مخلوق) اور اس کے نظام تدبیر کا پروردہ ہے جو پوری کائنات کا خالق اور مدبر ہے کہ ہر چیز کی تدبیر کی بازگشت اسی کی طرف ہوتی ہے۔ بنا براین ممکن ہے اسی کی طرف درج ذیل آیت مبارکہ کی بازگشت ہو،

سورہ مائدہ، آیت: ۱۷

○ ”لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ط قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُهْلِكَ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَ مَن فِي الْأَمْثَلِ جَمِيعًا ط وَاللَّهُ مَلِكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ط يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ط وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“

(یقیناً وہ لوگ کافر ہو گئے جنہوں نے کہا کہ اللہ ہی مسیح ابن مریم ہے، کہہ دیجئے تو پھر یہ بتائیں کہ اگر اللہ مسیح ابن مریم اور ان کی والدہ اور روئے زمین پر موجود تمام لوگوں کو ہلاک کرنا چاہے تو کون اسے روک سکتا ہے؟ اور اللہ ہی آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کا مالک ہے، وہ جو چاہتا ہے خلق کرتا ہے، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے)

یہی مطلب سابق الذکر آیت مبارکہ (یعنی سورہ مائدہ آیت ۷۵) کے بعد والی آیت ”۷۶“ میں نصاریٰ کو مخاطب قرار دے کر ان الفاظ میں مذکور ہے:

”قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ط وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ“  
(کہہ دیجئے کہ آیا تم اللہ کے علاوہ کسی ایسی چیز کی عبادت کرتے ہو جو تمہارے لئے نہ نقصان دہ اور نہ ہی فائدہ بخش ہے! اور اللہ سننے والا، بہت آگاہ ہے)

تو اس طرح کے دلائل پر مبنی بیانات میں اصل طلاق و معیار یہ ہے کہ جو کچھ حضرت مسیحؑ کی زندگی میں ان سے دیکھا گیا وہ یہ تھا کہ وہ انسانی زندگی میں جاری و ساری عام نظام کے تحت زندگی بسر کرتے تھے اور نوع انسانی کی تمام صفات و کیفیات ان میں پائی جاتی تھیں، وہ دیگر ہم نوع افراد جیسے افعال و اعمال انجام دیتے تھے مثلاً کھانا، پینا اور اس طرح کی دوسری انسانی ضرورتیں اور مخصوص بشری امور و اوصاف وغیرہ، اور اس طرح کے اعمال کی انجام دہی اور بشری صفات کا حامل ہونا ظاہری و خیالی طور پر نہیں تھا بلکہ حقیقی صورت میں تھا اور حضرت مسیحؑ ایک انسان..... نوع انسانی ہی کے ایک فرد..... تھے جن



میں مذکورہ بالا صفات و احوال اور افعال پائے جاتے تھے، چنانچہ موجودہ انجیلوں میں بھی یہی بات واضح طور پر مذکور ہے کہ آنجناب اپنے آپ کو انسان اور ابن الانسان کہتے تھے اور انجیلیں ان واقعات سے بھری ہوئی ہیں جن میں آنجناب کا کھانا، پینا، سونا، چلنا پھرنا، سفر کرنا، سفر کی تھکن، لوگوں سے باتیں کرنا اور اس طرح کے دیگر اعمال کا تذکرہ ہے کہ اسے کسی بھی صورت میں غیر انسانی حوالہ سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ان کی کسی دوسری صورت میں تاویل ہو سکتی ہے، اس بناء پر وہ تمام حوالے آنجناب پر منطبق ہوتے ہیں جو دیگر افراد بشر میں پائے جاتے ہیں اور وہ بھی دوسروں کی طرح کسی استقلالی مالکیت کے حامل نہیں بلکہ عین ممکن ہے کہ ان کے سلسلہ زندگی کا اختتام بنی نوع انسان کے دیگر افراد کی طرح ہو، اسی طرح ان کے عبادتی و دعائیہ اعمال بھی ہیں کہ ان کی بابت کوئی شک و شبہ نہیں پایا جاتا کہ وہ جو عبادتی عمل انجام دیتے تھے وہ خداوند عالم کا قرب حاصل کرنے اور بارگاہ ربوبیت میں خضوع و اطہارِ عمر کی غرض سے ہوتا تھا اور اس میں ہرگز یہ بات مقصود و ملحوظ نہیں ہوتی تھی کہ وہ ان عبادات و اعمال کو صرف لوگوں کو تعلیم دینے کے لئے انجام دیتے ہوں یا ان میں اس طرح کی دیگر اغراض ملحوظ ہوں، بلکہ وہ تمام عبادتیں خدا کی رضا و تقرب کے لئے انجام دیتے تھے، چنانچہ ان کی عبادت کے حوالہ سے درج ذیل آیت مبارکہ واضح دلیل ہے:

سورۃ نساء، آیت: ۱۷۲

○ "لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ وَلَا الْمَلِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ وَمَنْ يَسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرْهُمْ إِلَيْهِ جَبِيحًا"

(صبح ہرگز اس بات سے انکار و رد و گردانی نہیں کرتا کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور نہ ہی مقرب فرشتے ایسا کرتے ہیں، اور جو شخص اللہ کی عبادت و بندگی سے انکار و رد و گردانی اور تکبر کرے تو خدا سب کو اپنی طرف پلٹا دے گا)

تو حضرت مسیحؑ کا عبادت کرنا ہی سب سے بڑی اور پہلی دلیل ہے کہ وہ معبود نہ تھے بلکہ وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ الوہیت کسی اور ہستی کا حق ہے اور اس حق میں ان کا کوئی حصہ نہیں، اس بناء پر یہ بات کیا معنی رکھتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی کا بندہ و مملوک سمجھیں اور پھر اپنے آپ کو معبود و مالک قرار دیں؟ اور اسی حوالہ سے اپنی ذاتی حیثیت کے قائل ہوں جو اپنے معبود کے بارے میں سمجھتے ہیں؟ ایسا ہرگز ممکن نہیں کہ عبد بھی ہوں اور معبود بھی، مالک بھی ہوں اور مملوک بھی، مستقل بھی ہوں اور محتاج بھی، اور اپنے آپ کو اسی حیثیت کے حامل سمجھیں جو اپنے معبود کو سمجھتے ہوں! اسی طرح فرشتوں کا عبادت کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی بیٹیاں نہیں اور نہ ہی روح القدس معبود ہے بلکہ وہ سب اللہ کے عبادت گزار اور اس کے فرمانبردار ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں ارشاد الہی ہے:

سورہ انبیاء، آیت: ۲۸

○ ”وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهُ ۗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ ﴿۷۹﴾ لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرِ رَبِّهِ يَعْمَلُونَ ﴿۸۰﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ أَمَرَ تَتَّصِلُ وَهُم مِّنْ خَشِيَّتِهِ مُتَشَفِقُونَ“

(اور انہوں نے کہا کہ رحمن نے بیٹا بنایا ہے، اس کی ذات پاک ہے، بلکہ وہ (فرشتے) عزت والے بندگان خدا ہے جو خدا پر کسی بات میں سبقت نہیں کرتے اور وہ تو خدا کے فرمان پر عمل کرتے ہیں، خدا ان کے حال و مستقبل سے آگاہ ہے، اور وہ کسی کی شفاعت نہیں کریں گے مگر صرف اس کی جس سے خدا راضی ہو، اور وہ خشیت الہی سے لرزہ بر اندام رہتے ہیں)

اس کے علاوہ تمام انجیلوں میں جگہ جگہ یہ مطلب مذکور ہے کہ روح، خداوند عالم اور اس کے رسولوں کی اطاعت گزار ہے اور خدا کے تابع فرمان اور احکام و دستورات الہی پر عمل پیرا ہے، لہذا یہ بات بے معنی ہے کہ کوئی چیز اپنے آپ کو فرمان دے اور خود ہی اپنی اطاعت کرے، اور نہ ہی یہ بات معقول ہے کہ کوئی چیز خود اپنے تابع اور اپنی ہی مخلوق ہو، جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ حضرت مسیح خدا کی عبادت کرتے تھے اور ان کا خدا کی عبادت کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ خود خدا نہیں، تو اسی کے مانند یہ بات بھی ان کے غیر خدا ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ وہ لوگوں کو خدا کی عبادت کی دعوت دیتے تھے، ان کا یہی عمل یعنی لوگوں کو خداوند عالم کی عبادت کا حکم دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ خود کو معبود نہیں سمجھتے تھے، چنانچہ اس مطلب کی طرف درج ذیل آیت مبارکہ میں اشارہ ہوا ہے:

سورہ مائدہ، آیت: ۷۲

○ ”لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۗ وَقَالَ الْمَسِيحُ يَبْنِي إِسْرَائِيلَ ۗ وَاعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۗ إِنَّهُ مَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ ۗ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ“

(یقیناً کافر ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ مسیح ابن مریم ہی خدا ہے، حالانکہ مسیح نے کہا: اے بنی اسرائیل! تم اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے کہ جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرے تو خدا اس پر بہشت کو حرام کر دے گا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور ظالموں کی مدد کرنے والا کوئی نہیں)

اس آیت مبارکہ سے مطلوبہ معنی کا اثبات نہایت واضح ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ انجیلیوں اس مطلب کے تذکرہ سے بھڑکی ہوئی ہیں کہ حضرت مسیح لوگوں کو خداوند عالم

کی طرف بلا تے تھے، البتہ ان (انجیلوں) میں ”اعبدوا اللہ ربی و ربکم“ جیسا جامع جملہ موجود نہیں لیکن ایسی عبارتیں کثرت سے پائی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنجناب لوگوں کو خدا کی عبادت بجالانے کی دعوت دیتے تھے اور واضح و صریح الفاظ میں اس بات کا اقرار و اعتراف کرتے تھے کہ خداوند عالم ہی وہ پروردگار ہے جس کے دست قدرت میں ان (مسیح) کے تمام امور کی باگ ڈور ہے اور یہ کہ وہی تمام لوگوں کا رب ہے، انجیلوں میں کوئی ایسا جملہ نہیں ملتا جس سے ثابت ہو کہ آنجناب نے صراحتاً یا اشارتاً ایک دفعہ ہی سبھی لوگوں کو اپنی عبادت کا کہا ہو، اور جہاں تک ان کی طرف منسوب اس جملہ کا تعلق ہے: ”انا و ابی واحد نحن“..... انجیل یوحنا، اصحاب ۱۰..... (میں اور میرا باپ ہم ایک ہی ہیں) تو اگر اسے درست مانا جائے تو ضروری ہے کہ اس سے مراد یہ لیا جائے کہ میری اطاعت دراصل اللہ ہی کی اطاعت ہے، جیسا کہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

سورۃ نساء، آیت: ۸۰

○ ”مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ“

(جو شخص رسول کی اطاعت کرے گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی)

## پانچویں فصل:

### مسیح، شفاعت کرنے والے ہیں، فدیہ بننے والے نہیں

نصاریٰ کا گمان ہے کہ حضرت مسیح اپنے مقدس خون سے لوگوں کے گناہ کا فدیہ بنے ہیں، اسی حوالہ سے انہوں نے ”فادی“ کا لقب دیا۔ اور انہوں نے کہا کہ جب آدم نے خدا کی نافرمانی کرتے ہوئے درخت سے پھل کھایا تو وہ خطا کا ربن گئے اور ان کا یہ خطا کارانہ عمل ان کے دامن گیر ہو گیا اور اسی طرح ان کے بعد ان کی ذریت و اولاد میں سلسلہ در سلسلہ جڑ پکڑ گیا، یہی وجہ ہے کہ ان کی نسل میں خدا کی نافرمانی کا ایسا سلسلہ چلا کہ جو بھی پیدا ہوگا وہ خطا کار ہوگا اور خطا و نافرمانی کی سزا اخروی عذاب اور ہمیشہ کی تباہی ہے کہ جس سے چھٹکارا ممکن نہیں حالانکہ خداوند عالم رحم کرنے والا، عادل ہے،

اسی بیان سے ایک پیچیدہ و ناقابل حل اعتراض پیدا ہوا اور وہ یہ کہ اگر خداوند عالم آدم اور ان کی ذریت و نسل کو ان کی خطاؤں کی وجہ سے سزا دے تو یہ اس کی اس رحمت کے منافی ہے جس کی بناء پر اس نے انہیں پیدا کیا ہے اور اگر انہیں معاف کر دے تو یہ اس کے عدل کے منافی ہوگا کیونکہ عدل کا تقاضہ یہ ہے کہ مجرم کو اس کے جرم و غلط کاری پر سزا دی جائے جیسا کہ

تقاضائے عدل ہے کہ نیکی کرنے والے اطاعت گزار بندہ کو اس کی نیکی پر اجر و ثواب دے، (یہ عام نصاریٰ کا نظریہ ہے البتہ ان میں سے بعض مثلاً قیسین مارا سلتی کی رائے یہ ہے کہ جرم کے مرتکب کو سزا دینا روا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ وعدہ کی خلاف ورزی جائز نہیں البتہ وعید (جرم پر سزا کی دھمکی) کو واپس لیا جاسکتا ہے اور اس پر عمل نہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، یہ اعتراض و پیچیدگی حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے پہلے تک باقی تھی کہ بالآخر خداوند عالم نے حضرت مسیحؑ کی برکت سے اسے حل کر دیا اور وہ اس طرح کہ حضرت مسیحؑ (جو کہ خدا کے فرزند اور خود ہی خدا ہیں) نے آدمؑ کی نسل میں سے ایک خاتون یعنی حضرت مریمؑ الجول کے رحم میں حلول کیا اور اس سے اسی طرح پیدا ہوئے جیسے عام انسان پیدا ہوتے ہیں، لہذا وہ ایک کامل انسان تھے کیونکہ وہ انسان سے پیدا ہونے کے حوالہ سے انسان کے فرزند تھے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ کامل معبود تھے کیونکہ وہ خدا کے فرزند تھے اور خدا کا بیٹا جو کہ خود بھی خدا ہے وہ تمام گناہوں اور خطاؤں سے پاک و معصوم ہے۔

پھر حضرت مسیحؑ ایک قلیل عرصہ تک لوگوں میں رہے اور ان کے ساتھ گھل مل کر زندگی بسر کرتے رہے، ان کے ساتھ کھاتے پیتے تھے، ان سے ہم کلام ہوتے تھے اور ان کا اٹھنا بیٹھنا ان کے ساتھ تھا، یہاں تک کہ انہوں نے اپنے دشمنوں کو اپنے اوپر مسلط کر دیا تاکہ وہ انہیں نہایت سفاکی و بے دردی سے قتل کر دیں جو کہ انہیں سولی پر لٹکانے کی صورت میں ہوا حالانکہ کتاب الہی میں سولی والا ملعون قرار دیا گیا ہے مگر انہوں نے اس لعنت اور اس کی سختی و رنج کو برداشت کیا اور اپنے آپ کو فدا کر دیا تاکہ اس کے بندے آخرت کے عذاب سے نجات پائیں اور ہمیشہ باقی رہنے والی تباہی سے دوچار نہ ہوں، لہذا حضرت عیسیٰؑ اپنے ماننے والوں بلکہ تمام اہل عالم کے گناہوں کا کفارہ بن گئے، (یوحنا کے پہلے رسالہ کی پہلی فصل میں اس طرح مذکور ہے) کہ: اے میرے بیٹو! میں یہ الفاظ اس لئے تمہارے لئے لکھ رہا ہوں کہ تم گناہ کا ارتکاب نہ کرو اور اگر تم میں سے کوئی ایک گناہ کا مرتکب ہو تو خدا کے پاس ہمارا ایک عادل سہارا موجود ہے کہ جو حضرت یسوع مسیحؑ ہے اور وہی ہمارے گناہوں کی بخشش کا وسیلہ ہے بلکہ صرف ہمارے گناہوں کی بخشش کا وسیلہ ہی نہیں بلکہ تمام اہل عالم کے گناہوں کی بخشش کا وسیلہ ہے۔

یہ ہے نصاریٰ کا وہ قول و نظریہ جسے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں پیش کرتے ہیں کہ وہ کفارہ بنے، اسی نظریہ کو نصاریٰ نے اپنے مشن کی بنیاد اور اصل و اساس قرار دیا ہے اور یہ نظریہ ہی ان کے اعتقادات کا نقطہ آغاز و انجام اور محور ہے اور یہ اسی طرح سے بنیادی حیثیت کا حامل ہے جس طرح قرآن مجید میں توحید کو اسلام کی دعوت اور مقدس مشن کا محور و مرکزی نقطہ قرار دیا گیا ہے چنانچہ خداوند عالم نے اپنے رسول گرامی قدر حضرت محمد مصطفیٰؐ سے ارشاد فرمایا: "قُلْ هَذَا سَبِيلَ آدَعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِ ۗ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ مَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ" (سورۃ یوسف، آیت ۱۰۸)..... کہہ دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بصیرت و آگاہی کے ساتھ دعوت دیتا ہوں، میں اور ہر وہ شخص جو میرا پیروکار ہے اور اللہ کی ذات پاک ہے، اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں..... اور حضرت مسیح علیہ السلام نے

بھی (جیسا کہ انجیلوں میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے اور سطور بالا میں بھی اس کا ذکر ہو چکا ہے) اپنی نصیحتوں میں توحید و محبت الہی ہی کو بنیاد اور اصل و اساس و محور قرار دیا،

بہر حال علماء اسلام اور دیگر محققین نے نصاریٰ کے عقائد و نظریات پر کھل کر تفصیلی بحث کی ہے اور ان پر وارد ہونے والے اشکالات میں ان کے عقائد کے بطلان و نادرستی کو آشکار کر دیا ہے چنانچہ اہل علم و ارباب دانش حضرات نے اس سلسلہ میں متعدد کتابیں لکھیں، رسالے شائع کئے اور نصاریٰ کے عقائد باطلہ کی رد میں تحریروں کا ڈھیر لگا دیا اور ان میں اس حوالہ سے واضح دلائل کے ساتھ ثابت کیا کہ ان کے عقائد نہ تو معقول ہیں اور نہ ہی کتب عہدین سے مطابق رکھتے ہیں، لیکن یہاں جو بات ہمارے لئے اہمیت کی حامل ہے اور اس تفصیلی تذکرہ کی اصل غرض ہے وہ یہ کہ ہم ان جہات کو بیان کرنا چاہتے ہیں جو قرآنی تعلیمات کے بنیادی اصولوں کے منافی ہیں، اور اس بحث کے اختتام پر ہم اس فرق کو بیان کریں گے جو شفاعت ..... کہ جس کا اثبات قرآن مجید میں ہوا ہے ..... اور فدیہ و کفارہ ..... کہ نصاریٰ جس کے قائل ہیں ..... کے درمیان پایا جاتا ہے۔

یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید نے صریح لفظوں میں بیان کیا ہے کہ خداوند عالم نے لوگوں سے ان کی عقلوں کے عین مطابق بات کی ہے اور اپنے بیانات کو ان کی قوت فہم و ادراک سے قریب تر قرار دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان حق و باطل کے درمیان بخوبی تمیز کر سکتا ہے اور درست پہچان کرنے کے بعد حق کی پیروی کا دم بھرتے ہوئے باطل سے کنارہ کشی کرتا ہے بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ خیر و شر اور مفید و مضر کے درمیان تمیز کرتے ہوئے خیر و مفید کو اپناتا ہے اور شر و مضر کو جھٹلا دیتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہم نے قرآنی بیانات کے حوالہ سے جو کچھ ذکر کیا ہے کہ وہ عقل سلیم کے عین مطابق ہے اس کی تصدیق ہر اس شخص کے لئے آسان و یقینی ہے جو اس مقدس کتاب الہی کا مطالعہ کرے (قرآن مجید کی مقدس آیات کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص مذکورہ بالا مطالب کی تصدیق و تائید با آسانی و بالیقین کر سکتا ہے اور اس امر سے بخوبی آگاہ ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید نے خیر و شر اور مفید و مضر کی جو معیاری و اصولی پہچان کروائی ہے عقل سلیم بھی اس کی تصدیق کرتی ہے)۔

## عیسائیوں کے عقائد پر دس اعتراضات

پہلا اعتراض:

انہوں نے کہا ہے کہ حضرت آدمؑ نے ممنوعہ درخت سے پھل کھا کر خدا کی نافرمانی کا ارتکاب کیا۔

ان کی اس بات کو قرآن مجید میں دو طرح سے رد کیا گیا ہے:

(۱) خداوند عالم کی طرف سے حضرت آدم علیہ السلام کو درخت سے پھل کھانے کی نہی (ممانعت) ارشادی

(خیر خواہانہ) نبی کے باب سے تھی کہ جس میں نبی کرنے والے کی شخصیت و آقائی حیثیت کی عملداری کی بجائے نبی شدہ شخص کی بہتری و بھلائی مقصود ہوتی ہے، اور اس طرح کے احکامات کی بجائے آوری پر ثواب ملتا ہے اور نہ ان کی عدم بجا آوری پر عقاب و سزا دی جاتی ہے بلکہ ان کی حیثیت مشورہ دینے والے شخص کے اوامر و نواہی جیسی ہوتی ہے کہ جو وہ مشورہ طلب کرنے والے کو دیتا ہے، یا طیب و معالج کے اوامر و نواہی جیسی ہوتی ہے کہ جو بیمار شخص کی بہتری و صحت یابی کے لئے دیتا ہے، اس بناء پر ارشادی احکامات کی بجائے آوری کا فائدہ اس شخص کو پہنچتا ہے جسے وہ احکام صادر کئے جاتے ہیں اور ان کی عدم بجا آوری کا نقصان بھی اسے ہی پہنچتا ہے جس کے لئے وہ احکام و دستورات صادر ہوتے ہیں، گویا ان دستورات یا رہنمائیوں پر عمل کرنا اسی شخص کے فائدہ و مصلحت کو یقینی بناتا ہے جس کے لئے وہ دی گئیں اور ان کو ترک کرنا بھی اسی شخص کے مفسدہ و ضرر کا باعث بنتا ہے۔

اس حوالہ سے حضرت آدم علیہ السلام خدا کے ارشادی حکم یا خیر خواہانہ رہنمائی پر عمل نہ کر کے بہشت سے باہر نکلنے اور قرب الہی کی راحت اور رضائے خداوندی کے سرور سے محروم ہوئے، اور جہاں تک اخروی عقاب کا تعلق ہے تو وہ اس لئے اس کا شکار نہ ہوئے کہ انہوں نے کسی ایسے فرمان کی مخالفت نہیں کی جو مولا و آقا کی حیثیت میں ان کے لئے صادر کیا گیا ہو کہ جس کی عدم بجا آوری پر عقاب ہوتا ہے، اس موضوع کی تفصیلات کے لئے سورہ بقرہ کی آیات مبارکہ ۳۵ تا ۳۹ کا مطالعہ کریں۔

(۲) حضرت آدم علیہ السلام نبی تھے اور قرآن مجید انبیاء الہی علیہم السلام کی ذوات مقدسہ کو محصیت و نافرمانی سے پاک و منزہ قرار دیتا ہے اور انہیں گناہوں کی دلدل میں چھننے سے مبرا سمجھتا ہے اور اس بات کو واضح و صریح طور پر بیان کرتا ہے کہ وہ عظیم ہستیاں ہرگز اوامر خداوندی کی خلاف ورزی نہیں کرتیں، اس قرآنی بیان کو عقلی تائید بھی حاصل ہے اور عقل سلیم بھی یہی کہتی ہے کہ خداوند عالم کے منتخب کردہ انبیاء خدا کے فرامین کی نافرمانی کے مرتکب نہیں ہوتے کیونکہ وہ خود لوگوں کو خدا کے احکامات و دستورات کی اطاعت کی دعوت دیتے ہیں تو جو شخص منصبی حوالہ سے ایسا ہو وہ خود کیونکر ان دستورات سے سرتابی کر سکتا ہے؟ انبیاء الہی کی عصمت کے بارے میں تفصیلی تذکرہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۳ کی تفسیر میں ہو چکا ہے اس کی طرف رجوع کریں۔

دوسرا اعتراض:

انہوں نے کہا ہے کہ حضرت آدم نے جو خطا کی وہ ان کے دامن گیر ہو گئی، یہ بات درست نہیں کیونکہ قرآن مجید اس

حوالہ سے اس طرح گویا ہے:

○ ”فَتَلَقَىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۗ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ“ (سورہ طہ، آیت ۱۲۲)

(پھر اس کے پروردگار نے اسے چمن لیا تو اس کی توبہ قبول کی اور اسے ہدایت کی نعمت سے نوازا)

○ ”فَتَلَقَىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۗ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ“

(سورہ بقرہ، آیت ۷۷)

(پھر آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمات حاصل کئے تو خدا نے اس کی توبہ قبول کی کہ وہ توبہ قبول کرنے والا، نہایت

مہربان ہے)

عقل سلیم نے بھی اس قرآنی بیان کی تصدیق و تائید بلکہ وضاحت کی ہے کیونکہ نافرمانی و گناہ پر سزا و عقاب کا یقینی ہونا عقلی طور پر مولانا آقا کی شخصیت و مقام کے حوالہ سے اس بات کا متقاضی ہے کہ معصیت و نافرمانی سے اجتناب کیا جائے اور آقا کے احکام و دستورات کی خلاف ورزی نہ کی جائے تاکہ نظام الامور صحیح سمت میں اور مستحکم رہے کیونکہ اگر ثواب و عقاب نہ ہو اور اطاعت و فرمانبرداری پر جزاء اور معصیت و نافرمانی پر سزا نہ دی جائے تو حاکم کی حاکمیت کا سلسلہ برقرار رہے گا اور نہ کوئی شخص اطاعت و فرمانبرداری کو اہمیت دے گا یا معصیت و نافرمانی کی پرواہ کرے گا، لہذا جس طرح آقا و حاکم کی حاکمیت کے اہم ترین کاموں میں سے ایک یہ ہے کہ مجرموں کو ان کے جرائم کے ارتکاب پر سزا دے اور اطاعت گزاروں کو جزا و ثواب سے نوازے اسی طرح اس کے مولانا آقا ہونے کے حوالہ سے اس کے اختیارات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ اپنی حاکمیت کے دائرہ میں ہر طرح کا فیصلہ کر سکتا ہے اور اسے پورے طور پر یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہے تو خطا کاروں کی خطاؤں اور نافرمانی کرنے والوں کی نافرمانیوں سے غفور و درگزر کرے اور انہیں معاف کر دے کیونکہ ایسا کرنا ہی کامل اختیار کا حصہ ہے اور حاکمیت اعلیٰ کے شایان شان بھی یہی ہے کہ مواخذہ و عدم مواخذہ کا اختیار اسے حاصل ہو، یعنی اگر مقتضائے مصلحت یہ ہو کہ مجرموں کو کیفر کر دیا جائے تو ان کا مواخذہ ہوگا ورنہ انہیں معاف کرنے میں بہتری ہوگی، بلکہ طاقتور حکام کا خطا کاروں کو معافی دینا ایسا مستحسن عمل ہے جس کے فی الجملہ مثبت و مطلوب ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں پایا جاتا اور بنی نوع انسان کے عقلمند افراد اس روش کو اپناتے چلے آ رہے ہیں،

بنابراین کسی انسان سے خطا و معصیت کا سرزد ہونا اس کے اس سے دامن گیر و ہمیشہ باقی رہ جانے کا سبب نہیں قرار پاسکتا، یعنی ایسا نہیں کہ اگر کوئی شخص گناہ کا مرتکب ہو تو اب وہ ہمیشہ ہی گناہوں کا ارتکاب کرتا رہے گا کیونکہ اگر ایک بار گناہ کا ارتکاب اس کے دائمی طور پر باقی رہنے کا یقینی سبب ہو تو غفور و بخشش کا دروازہ ہی بند ہو جائے جبکہ غفور و بخشش خطاؤں کو بخوشی اور گناہ کے آثار کو مٹانے کا کام دیتے ہیں اور اگر خطاؤں و گناہوں کو دوام حاصل ہو اور وہ انسان کے ساتھ چسپے رہیں کہ ان کا جدا ہونا قابل تصور نہ ہو تو غفور و بخشش کی گنجائش ہی باقی نہ رہے گی اور سرے ہی سے اس کی نفی ہو جائے گی حالانکہ وحی الہی یعنی

قرآن مجید عفو و بخشش کے تذکرہ سے بھرا ہوا ہے اور اسی طرح کتب عہدین، تورات و انجیل میں بھی عفو و بخشش کا ذکر کثرت سے موجود ہے یہاں تک کہ زیر نظر بیان بھی عفو و بخشش کے اشاراتی تذکرہ سے خالی نہیں،

خلاصہ کلام یہ کہ کسی گناہ یا خطا و غلطی کا اس کے مرتکب میں ہمیشہ باقی رہ جاتا کہ توبہ و استغفار اور پشیمانی کے باوجود قابل عفو و بخشش نہ ہو ہرگز درست نہیں اور عقل سلیم و طبع مستقیم سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی..... بلکہ اس کی نفی ہوتی ہے.....،

### تیسرا اعتراض:

انہوں نے کہا ہے کہ آدم کی خطا جس طرح خود ان کے ساتھ چمٹ گئی اسی طرح قیامت تک آنے والی ان کی نسل و ذریت کے ساتھ بھی چمٹ گئی ہے کہ اب بنی نوع آدم کے تمام افراد خطا کار ہی ہوں گے۔

یہ بات اس لحاظ سے درست نہیں کہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک شخص کا گناہ اور اس کے آثار ان افراد میں بھی پائے جائیں جو آقا کے آقا ہونے کی حیثیت میں صادر ہونے والے احکام کی نافرمانی کے مرتکب نہ ہوئے ہوں، دوسرے لفظوں میں یہ کہ کسی شخص کی غلطی خود اس کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی اپنی پلٹ میں لے لے اور اس غلطی کے آثار کا دائرہ اس قدر وسیع ہو کہ جو لوگ اس کے مرتکب نہ بھی ہوئے ہوں وہ بھی اس کا شکار ہو جائیں، البتہ کسی شخص کے گناہ پر راضی ہونے والے افراد کا معاملہ اس سے مختلف ہے یعنی اگر کوئی قوم کسی معصیت کا ارتکاب کرے اور دوسری اقوام اس کی معصیت پر خوش اور قلبی طور پر اس کی تائید کریں تو وہ بھی اس معصیت کے آثار کا سامنا کریں گے لیکن جہاں تک ہمارے زیر بحث مسئلہ کا تعلق ہے تو اس میں غلطی و خطا پر راضی و خوش ہونے کا حوالہ نہیں پایا جاتا بلکہ صرف معصیت کا شخص کی نسل سے تعلق رکھنے کا حوالہ پایا جاتا ہے کہ قرآن مجید نے اس طرح کے حوالہ کی بنیاد پر گناہ اور اس کے آثار کے دائرہ کی وسعت کی نفی کی ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو کسی خطا و جرم کے ارتکاب کے بغیر سزا کا مستحق قرار دیا جائے یعنی کسی کے گنے کی سزا کسی اور کو ملے، یہ بات قرآنی اصولوں سے متصادم ہے چنانچہ ارشاد الہی ہے:

سورہ نجم، آیت ۳۹:

” اَلَا تَنْزُرُوْنَ اَزْمَاوُزْمَاۗ اٰخَرٰی ﴿۱﴾ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ،“

(کوئی شخص کسی کے گنے کی سزا نہیں بھگتے گا۔۔۔ اور یہ کہ انسان کو اس کے گنے کے صلہ کے سوا کچھ حاصل نہیں)۔

اس قرآنی اصول کی تائید عقل سلیم بھی کرتی ہے کیونکہ کسی شخص کو اس گناہ کی سزا دینا جس کا اس نے ارتکاب نہ کیا ہو

فقیح و مذموم ہے، مزید مطالب جاننے کے لئے سورہ بقرہ کی آیات مبارکہ: ۲۱۶ تا ۲۱۸ کی تفسیر کے ذیل میں ہونے والی افعال

کی بحث کی طرف رجوع کریں۔



## چوتھا اعتراض:

مسیحیوں کے اظہارات و بیانات اس بات پر مبنی ہیں کہ ہر خطا و گناہ کا اثر و نتیجہ..... یا سزا و کیفر..... ابدی ہلاکت ہے اور اس حوالہ سے گناہوں و خطاؤں کے درمیان کوئی فرق نہیں، ان کے اس نظریہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کوئی گناہ و خطا، چھوٹا اور بڑا ہونے کے حوالہ سے ایک دوسرے سے مختلف نہ ہو بلکہ سب گناہ ایک ہی جیسے ہوں یعنی کبیرہ اور تباہ کن ہوں جبکہ قرآن مجید کی تعلیمات میں اس بات کا واضح اظہار ہوا ہے کہ گناہوں و معاصی میں فرق ہے اور ہر خطا و معصیت دوسری خطا و معصیت سے مختلف ہے کہ ان میں سے بعض کبیرہ اور بعض صغیرہ گناہ ہیں، اور بعض گناہ قابل بخشش جبکہ بعض گناہ ناقابل معافی ہیں اور گناہوں میں سے بعض ایسے ہیں جو توبہ کے ذریعہ بخشش و معافی کے قابل ہیں مثلاً شرک کہ جس کے بارے میں ارشاد الہی ہے:

سورۃ نساء، آیت: ۳۱

○ ” اِنْ تَجْتَنِبُوا كِبَاۤرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ تُغْفَرْ عَنْكُمْ سِيۡۤاتِكُمْ“

(اگر تم ان کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرو جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے تو ہم تمہاری غلطیوں سے درگزر کریں گے)

سورۃ نساء، آیت: ۳۸

○ ” اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ“

(خدا ہرگز یہ معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے علاوہ جسے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے)

تو خداوند عالم نے محرمات اور ممنوعہ اعمال میں سے بعض گناہوں کو کبائر (بڑی نافرمانیاں) اور بعض کو غلطیاں و کوتاہیاں یعنی چھوٹی نافرمانیاں قرار دیا اور ان دونوں کا تذکرہ ایک دوسرے کے مقابل میں کیا جس سے ان کی اقسام کا واضح ثبوت ملتا ہے، اسی طرح بعض گناہوں کو ناقابل بخشش اور بعض کو معافی و بخشش کے قابل قرار دیا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ گناہوں میں بہر حال فرق ہے اور وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں لہذا ہر گناہ کو ابدی ہلاکت اور ہمیشہ دوزخ میں جلتا رہنے کا موجب قرار دینا درست نہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ عقل سلیم تمام گناہوں کو ایک ہی لڑی میں پرونا اور ایک جیسا قرار دینا صحیح نہیں سمجھتی کیونکہ ہر عمل یکساں حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ہر ایک اپنی مخصوص نوعیت و کیفیت کے ساتھ اپنا اثر رکھتا ہے، ہمارا نچا مارنا اور قتل کرنا ایک جیسا نہیں،

بری نظر سے دیکھنا اور زنا ایک دوسرے سے مختلف اعمال ہیں، یہی وجہ ہے کہ عقلائے عالم نے کسی بھی دور میں کسی گناہ و خطا کو کسی دوسرے گناہ و خطا کی جگہ قرار نہیں دیا بلکہ وہ ہر گناہ و جرم پر عذاب و سزا اور مواخذہ کا عمل اسی کے مطابق متعین کرتے ہیں اور مختلف جرائم پر مختلف سزاؤں کے قائل ہیں، اور یہ بات قرین حقیقت ہے کہ ہر جرم کو اس کی مربوطہ خصوصیات و حالات کے مطابق دیکھا جائے اور اس پر سزا اسی کے تناظر میں ملے ہو، بنا بریں یہ کیونکر ممکن ہے کہ اعمال کے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود سب کو ایک ہی رنگ دیا جائے اور سب کو ایک جیسا قرار دیا جائے بلکہ ضروری ہے کہ ان کی شدت و ضعف کی بناء پر سزاؤں کا تعین ہو کہ ان میں سے جو اس حد تک شدید اور بڑا گناہ ہو کہ جس کی سزا ہمیشہ باقی رہنے والا عذاب اور ابدی ہلاکت کے سوا کچھ نہ ہو جیسے شرک باللہ (خدا کے ساتھ کسی کو شریک عبادت قرار دینا) کہ جس کی بابت واضح قرآنی بیان موجود ہے، تو ایسا کرنا یقیناً قرین صحت ہوگا، اور یہ مطلب واضح و آشکار ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا ممنوعہ درخت سے پھل کھانا یعنی خداوند عالم کی طرف سے صادر ہونے والے حکم کی خلاف ورزی کو کفر باللہ اور اس طرح کے بڑے گناہوں کے باب میں نہیں قرار دیا جاسکتا، لہذا اس پر اس قدر سخت سزا و عقاب یعنی ہمیشہ کا عذاب مقرر کرنا بیجا ہوگا، (اس سلسلہ میں افعال کی بابت جو بحث سورہ بقرہ کی آیات ۲۱۶ تا ۲۱۸ میں ہو چکی ہے اس کا مطالعہ کریں)

### پانچواں اعتراض:

عیسائیوں کے عقائد میں سے ایک یہ ہے کہ خداوند عالم کی صفت ”رحمت“ اور ”عدالت“ کے درمیان تزام و تضاد کی صورت پیدا ہوئی تو اسے دور کرنے کے لئے حضرت عیسیٰؑ نازل ہوئے اور پھر پرواز کر گئے..... ان کا یہ بیان ان کی طرف سے نزول و صعود کی خاص توجیہ و تاویل پر مبنی ہے.....

اس عقیدہ و بیان اور اس کے آثار و نتائج پر بخوبی غور کرنے والا شخص اس امر سے آگاہ ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ معتقد ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی وہ ہستی ہے کہ پوری کائنات اور تمام مخلوق اپنے وجود پذیر ہونے میں اس کی طرف منسوب ہوتی ہے اور وہی سب کا منجنا ہے، لیکن اس کے باوجود اس کے افعال اس کے ارادہ اور ذاتی علم پر مبنی ہوتے ہیں اور وہ جس کام کا ارادہ کرتا ہے تو اس کی انجام دہی کی بابت تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتا ہے کہ اگر اس کی انجام دہی میں مصلحت معلوم ہو تو اسے انجام دیتا ہے..... ورنہ اسے ترک کر دیتا ہے..... اور یہ یقیناً اسی طرح سے ہے جیسے انسان جب کسی کام کی انجام دہی کو ترجیح دیتا ہے تو اپنے ذاتی فکری رجحان کی بناء پر اس کا ارادہ کرتا ہے اور اسے عملی جامہ پہنا دیتا ہے، تو خداوند عالم بھی مصلحت و مفیدہ کو مد نظر و ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے افعال کو ان پر منطبق کرتا ہے یعنی جس کام کی انجام دہی میں مصلحت سمجھتا ہے اسے انجام دیتا ہے چنانچہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مصلحت کی تشخیص میں غلطی کرے اور پھر اس کام کی انجام دہی پر نادوم و پشیمان ہو، اس حوالہ سے تورات کے

سفر تکوین کے اصحاب ششم میں یوں مرقوم ہے کہ خداوند عالم نے بنی نوع آدم کا زمین میں خلق کرنا ناپسند کیا (ملاحظہ ہو: تورات عربی، مطبوعہ ۱۸۱۱ عیسوی)۔ اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کسی کام کے بارے میں غور کرے مگر اس کی سوچ کسی جانب مرکوز نہ ہو اور وہ اس کی بابت فیصلہ نہ کر سکے کہ آیا اس کی انجام دہی بہتر ہے یا نہیں؟ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا کسی کام کے بارے میں غور و فکر کرنا اسے کسی نتیجہ تک نہ پہنچائے اور وہ اس کی بابت جہالت و لاعلمی کا شکار ہو،

خلاصہ یہ کہ مسیحیوں کی نظر میں خداوند عالم اپنے اوصاف و افعال میں انسان ہی کی طرح ہے کہ جو کچھ کرتا ہے اس کے بارے میں پہلے غور و فکر کرتا ہے اور مصلحت اندیشی کی بناء پر اس کی انجام دہی کا فیصلہ کرتا ہے، گویا وہ اپنے افعال میں ملحوظ مصلحتوں کے تابع اور ان کی بناء پر مجبور و بے کس ہوتا ہے لہذا اس بات کا امکان باقی رہتا ہے کہ مصلحت کی تشخیص میں صحیح جانب اختیار کرے یا غلطی و غلط فہمی کا شکار ہو جائے اور حقیقت سے غفلت و حق سے گمراہ ہو، اور یہ بھی ممکن ہوتا ہے کہ کسی کام کی مصلحت سے آگاہ ہو یا جاہل و نا آگاہ ہو، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی وہ بیرونی عوامل پر غالب آئے یا وہ اس پر غالب آ جائیں، لہذا اس کی قدرت بھی اس کے علم کی طرح محدود ہے۔

عیسائیوں کے اس عقیدہ کی رو سے جب اس طرح کی کیفیات خداوند عالم کے بارے میں ممکن ہوں تو وہ تمام حالتیں و کیفیتیں بھی اس کی بابت ممکن و روا سمجھی جائیں گی جو ہر اس فاعل یعنی کسی بھی کام کرنے والے کی بابت ممکن ہوتی ہیں جو اپنے کام کو غور و فکر اور مصلحت اندیشی کی بناء پر انجام دیتا ہے کہ وہ کبھی اپنے کئے پر خوش و مسرور اور کبھی ناخوش و مغموم ہوتا ہے، کبھی اپنے کام کو خوب و اچھا قرار دیتا ہے اور کبھی اس پر نادم و پشیمان ہوتا ہے، کبھی اپنے کئے پر نازاں اور کبھی شرمندہ ہوتا ہے، تو جو اس طرح کا ہو وہ ان مادی جسمانی موجودات میں سے ایک ہو گا کہ جن پر حرکت، تغیر و تبدل اور مرحلہ بہ مرحلہ کمال پانے کے عمومی ضابطہ (کمال) کا اطلاق ہوتا ہے، اور جو اس طرح کا ہو وہ ممکن الوجود مخلوق ہے بلکہ عام انسان سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت و مقام نہیں اور وہ واجب الوجود نہ ہو گا کہ جو ہر چیز کا خالق و آفریدگار ہے۔

قارئین کرام! اگر آپ کتب عہدین کا مطالعہ کریں تو ہمارے اس بیان کی صداقت و حقانیت آپ پر واضح و عیاں ہو جائے گی جو ہم نے ان کی طرف منسوب کیا ہے کہ وہ خداوند عالم کو جسمانی سمجھتے ہیں اور اسے جسمانیت کی تمام خصوصیات و اوصاف سے متصف کرتے ہیں اور بالخصوص انسانی صفات کا حامل قرار دیتے ہیں۔

جبکہ قرآن مجید مذکورہ بالا تمام امور میں خداوند عالم کو منزہ و پاک سمجھتا ہے اور تمام خرابی و بیہودہ نسبتوں سے مبرا قرار دیتا ہے چنانچہ واضح لفظوں میں بیان ہوا ہے: ”سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یَصِفُوْنَ“ ..... سورہ صافات، آیت ۱۵۹..... (خدا اس سے پاک ہے جس سے وہ لوگ اس کی توصیف کرتے ہیں)۔ اور عقلی یقینی دلائل سے بھی اس حقیقت کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ خداوند عالم تمام کمائی صفات کی جامع ذات ہے (اس میں تمام صفات کمالیہ یکجا ہیں)، اصل وجود اسی سے مختص ہے کہ

جس میں عدم کا سرے ہی سے تصور و گمان ہی ممکن نہیں، وہ قدرت مطلقہ رکھتا ہے کہ عجز سے ہرگز دوچار نہیں ہوتا، اس کا علم علی الاطلاق ہے کہ جس پر جہل ہرگز طاری نہیں ہوتا، وہ سراسر زندگی ہے کہ جو علی الاطلاق ہے یعنی ہر طرح کی قید و شرط سے مبرا ہے اور اس میں موت و فنا کا کوئی امکان نہیں پایا جاتا، جب عقلی ٹھوس دلائل سے یہ سب کچھ اس کی بابت ثابت ہے تو اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا گمان ہی بیجا ہے، اس کے وجود میں یا اس کے علم یا قدرت و حیات میں کسی طرح کا تغیر ناقابل تصور ہے، اسی طرح اس کی بابت جسم و جسمانیات کا بھی گمان نہیں ہو سکتا کیونکہ اجسام اور جسمانیات پر تغیرات و تبدیلیاں چھائی رہتی ہیں اور وہ ہر طرح کی ممکنہ حالتوں، ناداریوں اور احتیاجات کی زد میں رہتی ہیں، تو جب خداوند عالم جسم و جسمانیات سے پاک ہے تو اس پر مختلف حالتیں اور گونا گوں کیفیتیں بھی طاری نہیں ہو سکتیں مثلاً غفلت، سہو و نسیان، غلط فہمی، ندامت و پشیمانی، تحیر و سرگردانی، بیرونی عوامل سے اثر پذیری، شرمندگی، خواری و مغلوبیت اور اس طرح کی دیگر کیفیات وغیرہ، چنانچہ ان تمام امور کے حوالہ سے ہم نے اسی کتاب میں موزوں و مناسب مقامات پر تفصیلی بحثیں کی ہیں کہ قارئین کرام کی نظروں سے ضرور گزریں گی، اب یہ کام اہل بصیرت و ارباب فکر و فہم کا ہے کہ وہ ان دونوں یعنی قرآنی بیانات اور کتب عہدین میں مذکور مطالب کے درمیان تقابلی جائزہ لیں اور دیکھیں کہ قرآن مجید نے کائنات کے معبود کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے اس میں اور کتب عہدین میں اس حوالہ سے جو کچھ مذکور ہے اس میں کیا بنیادی فرق ہے؟ قرآن مجید خدا کے بارے میں ہر کمالی صفت کا اثبات کرتا ہے اور اسے ہر نقص و ناقص صفت سے پاک و منزہ قرار دیتا ہے اور نتیجتاً اسے محدود و معین دنیا میں بسنے والوں کے افہام و ادراک کی دسترس سے بالاتر ایک عظیم و برتر ہستی تسلیم کرتا ہے جبکہ یہود و نصاریٰ کی کتب میں خداوند عالم کے بارے میں جو کچھ مذکور ہے وہ یونانیوں کی من گھڑت باتوں، قدیم ہند اور چین والوں کے خرافات و نامعقولات مطالب کے سوا کچھ نہیں جو کہ پہلے افراد بشر کے ادہام نے تراشے اور ان کی ناقص فکری قوت نے جو کچھ سمجھا انہوں نے اسے ہی درست قرار دے کر اپنا لیا، ان دو مقابل نظر یاتی مطالب کا بخور مطالعہ و جائزہ لینے سے حق و حقیقت کی اصل صورت نظر آ جائے گی اور معقول و فطری حقائق کے مقابلے میں نامعقول مطالب و خرافات کی قلعی کھل جائے گی کہ پھر کسی طرح کے اشتباہ و غلط فہمی کی گنجائش ہی باقی نہ رہے گی.....م

### چھٹا اعتراض:

دین مسیحیت کے پیروکاروں کا کہنا ہے کہ خدا نے اپنے بیٹے مسیح کو بھیجا اور اسے حکم دیا کہ ارحام میں سے ایک رحم میں حلول کرے تاکہ ایک انسان کی صورت میں متولد ہو جو کہ خدا ہو، یہ وہی نامعقول قول و نظریہ ہے جسے قرآن مجید نے رد کیا اور اس کے باطل و بے بنیاد ہونے پر ٹھوس دلائل ذکر

کئے۔ بلکہ اس کی نادرستی کو آشکار کرنا ہی قرآن مجید کا اصل ہدف ہے، اس سلسلہ میں ہم سابقہ بیانات میں بھرپور وضاحت کر چکے ہیں اور یہاں اسے دوبارہ بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتے، اور یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ اس عقیدہ و نظریہ کو عقلی تائید بھی حاصل نہیں چنانچہ جب آپ ان صفات کے بارے میں بخوبی غور کریں جن کا واجب الوجود ذات میں پایا جانا ضروری ہے مثلاً سرمدی ثبات..... ازلی وابدی ہونا..... عدم تغیر و تبدل، عدم محدودیت (نامحدود ہونا)، ہر چیز پر کامل تسلط اور زمان و مکان اور ان کے لوازم و آثار سے پاک و منزہ ہونا، اور اس کے ساتھ ساتھ آپ انسان کے تکوینی و تخلیقی مراحل اور وجود میں آنے کے حالات یعنی نطفہ سے لے کر رحم میں جنین بننے تک کے مرحلوں پر غور کریں..... خواہ ان مراحل کی بابت ”ملکانیوں“ کے بیانات کو درست قرار دیں یا ”نسطوریوں“ یا ”یعقوبیوں“ یا ان کے علاوہ دیگر حضرات کے نظریات کو بنیاد بنا لیں..... تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ جسم و جسمانیات اور اس کے اوصاف و آثار کے حامل اور جسمانیات اور زبان و مکالم اور حرکت و تغیر وغیرہ سے پاک و منزہ ہستی کے درمیان تقابلی نسبت ہی نہیں پائی جاتی، لہذا ان دونوں کے درمیان یکسانیت کا تصور ہی غیر معقول ہے کیونکہ ان کے درمیان کوئی وجہ اشتراک ہی نہیں پائی جاتی، اور مسیحیوں کے اس غیر معقول نظریہ کا عقلی اصولوں سے عدم مطابقت کا حامل ہونا ہی اس بات کا سبب بنا کی قدیسین کے سربراہوں مثلاً بولس وغیرہ نے فلسفہ اور عقلی مباحث کی خدمت اور ان کے نادرست ہونے کے بارے میں کھل کر بیانات دیئے، چنانچہ بولس کا کہنا ہے کہ

”میں نے اس سلسلہ میں جو عملی اقدام کیا ہے اور جو کچھ لکھا اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ فلسفیوں کے نظریات اور فقہاء کے بیانات کو فطرت و نادرست ثابت کروں بلکہ ان کی آراء و اظہارات کا نام و نشان مٹا دوں، یہ فلسفہ و حکمت کے مدعی کجا، یہ مؤلف و اہل قلم کجا، یہ محقق اور اس دور کے اہل نظر کجا اور ہمارے نظریات کجا؟ (ان بیچاروں کو ہمارے اعتقادی اصولوں تک دسترس ہی حاصل نہیں) اگر یہودی ہم سے کسی معجزہ کا مطالبہ کریں اور اگر یونانیوں کو یہ جرأت ہو کہ وہ اپنے فلسفیانہ اصولوں کے ساتھ ہمارا سامنا کریں تو ہم پکار پکار کر کہیں گے کہ حضرت مسیح انہی معجزہ و فلسفہ کی سول پر چڑھے“،

(رسالہ بولس، اصحاح اول)

اس طرح کی دیگر باتیں بولس اور اس جیسے دیگر مسیحی علماء کے بیانات میں کثرت سے پائی جاتی ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے اظہارات کا مقصد بیان بازی اور پروپیگنڈہ کا بازار گرم کرنے کے سوا کچھ نہیں، ان بیانات اور نظریات پر بخوبی غور کرنے اور بولس وغیرہ کے رسائل و کتب کا بنظر فائر مطالعہ کرنے والا ہر شخص ان کے طرز تکلم و انداز بیان ہی سے ان کے بارے میں ہمارے موقف کی تصدیق کرے گا اور اسے حق و باطل کے درمیان فرق سے آگاہی حاصل ہو جائے گی، مسیحیوں کے مذکورہ بالا نظریات و عقائد اور اقوال و آراء کے تناظر میں ان کے اس عقیدہ کی قلعی بھی کھل جاتی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ ”خداوند عالم گناہوں و خطاؤں سے معصوم و پاک ہے“ کیونکہ وہ جس خدا کے قائل ہیں اور اس کے بارے میں انہوں نے جو تصویر کشی کی ہے اس کے مطابق وہ خطاؤں سے محفوظ و مبرا نہیں قرار پایا یعنی اس کا فہم و ادراک اور فعل

و عمل میں غلطی سے پاک ہونا ثابت نہیں ہوتا، اور جہاں تک خطا و گناہ سے معصوم و مصون ہونے کے اس معنی کا تعلق ہے کہ وہ اپنے مولا و آقا کی نافرمانی کا مرتکب نہیں ہوتا تو یہ بات خداوند عالم کے حوالہ سے ناقابل تصور ہے کیونکہ وہ خدا کے لئے کسی مولا و آقا کے قائل نہیں کہ جس کی فرمانبرداری واجب و لازم ہو اور اس کی نافرمانی سے محفوظ و معصوم ہونے کی بات کی جائے، لیکن فہم و ادراک اور فعل و عمل میں ہر طرح کی غلطی و خطا سے محفوظ ہونا جو کہ خدا کے لئے یقیناً ثابت ہے مسیحی حضرات اس کے قائل نہیں، بنا بریں ان کے عقیدہ کے مطابق خداوند عالم معصوم عن الخطاء قرار نہیں پاتا۔

### ساتواں اعتراض:

مسیحی حضرات کہتے ہیں کہ ”حضرت مسیح جب انسان کی صورت میں آئے تو انہوں نے ایک عام انسان کی طرح دیگر افراد انسان سے معاشرت کی اور ان میں انہی کی طرح بن کر رہے، یہاں تک کہ اپنے آپ پر اپنے دشمنوں کو مسلط کر دیا“، ان کے اس نظریہ پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس صورت میں واجب الوجود، واجب الوجود ہونے کے باوجود ممکن الوجود کی صفات کا حامل ہوگا یعنی ایک ہی وقت میں واجب الوجود بھی ہوگا اور ممکن الوجود بھی ہوگا اور ایک ہی وقت میں خدا بھی ہوگا اور انسان بھی ہوگا، گویا یہ بات درست پائے گی کہ واجب الوجود اپنی مخلوق میں سے ایک ہو جائے یعنی موجودات عالم میں سے ہر نوع کی حقیقت سے متصف ہو مثلاً کبھی انسانوں میں سے ایک انسان ہو جائے، کبھی گھوڑا، کبھی پرندہ، کبھی کیڑا مکوڑا، اور کبھی کچھ اور ہو جائے، اور کبھی ایک سے زیادہ نوع بن جائے مثلاً ایک ہی وقت میں انسان، گھوڑا اور حشرات الارض میں سے کوئی ایک ہو، یعنی ایک ہونے کے ساتھ ساتھ متعدد اور کئی ایک ہو، اسی طرح یہ بھی جائز و درست قرار پائے گا کہ اس سے ہر طرح کا فعل سرزد ہو اور وہ موجودات عالم کے افعال میں کسی بھی فعل کو انجام دے کیونکہ جب اس کا اپنی مخلوق سے مختص افعال کا انجام دینا بھی جائز ہوگا، اور پھر یہ بھی درست و روا ہوگا کہ اس سے متقابل و متضاد افعال سرزد ہوں مثلاً عدل و ظلم، اور یہ بھی ممکن و جائز ہوگا کہ وہ متقابل و متضاد صفات سے متصف ہو مثلاً علم و جہل، قدرت و عجز، حیات و موت اور بے نیازی و ناداری،..... خداوند عالم اس طرح ہونے سے بلند و برتر و ماورا ہے۔،

یہ اعتراض سابقہ اعتراض (۶) سے مختلف ہے۔

### آٹھواں اعتراض:

ان کا کہنا ہے کہ ”خدا نے سولی پر چڑھنا اور لعنت کا طوق پہننا بھی خود ہی اختیار کیا کیونکہ سولی پر لٹکا جانے والا شخص ملعون ہوتا ہے“،

ان کی اس بات پر ہمارا اعتراض و سوال یہ ہے کہ آخر وہ اس سے کیا مراد لیتے ہیں کہ ”خدا نے لعنت کا طوق پہننے کو اختیار کیا؟“ اور اس لعنت سے کیا مراد ہے؟ کیا اس سے مراد وہی لعنت ہے جو عرف عام میں مشہور ہے اور لعنت میں اس کا معنی رحمت، کرامت و عزت و حرمت وغیرہ سے محرومی و دوری ہے؟ اگر ان کی مراد وہی معنی ہے جو عرف و لغت میں کیا جاتا ہے تو پھر اس کا انطباق خداوند عالم کی ذات پر کیونکر ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو رحمت سے دور و محروم کرتا ہے یا کوئی دوسرا اسے رحمت سے دور و محروم کرتا ہے؟ کیا رحمت کا معنی ”وجود و ہستی کا عطا کرنا، نعمتوں سے نوازنا اور وجود و ہستی کی خصوصیات و آسائشوں سے بہرہ ور کرنا“ کے علاوہ کچھ ہے؟ جب ایسا ہے تو ان سب سے محرومی و دوری اور لعنت کی بازگشت مال یا جاہ و جلال وغیرہ سے دنیا یا آخرت یا دونوں جہانوں میں محرومی کی طرف ہوگی، یعنی جو شخص لعنت کے مذکورہ معنی کا حامل ہوگا وہ دنیا و آخرت یا دنیا و آخرت دونوں میں مال یا جاہ و جلال وغیرہ سے محروم قرار پائے گا، اس بناء پر خداوند عالم کا اپنے لئے لعنت اختیار کرنا کیا معنی رکھتا ہے اور کس حوالہ و نسبت سے اس معنی کو اس کی ذات اقدس پر منطبق کیا جاسکتا ہے؟ حالانکہ خداوند عالم خود غنی بالذات ہے اور وہ جہان ہستی کی ہر چیز کو محرومی و ناداری سے بچاتا ہے،

اور جہاں تک قرآنی تعلیمات کا تعلق ہے تو ان میں اس طرح کے عجیب و غریب مطالب کی پورے طور پر نفی پائی جاتی ہے چنانچہ صریح و واضح الفاظ میں ارشاد خداوندی ہے:

سورہ فاطر، آیت: ۱۵

○ ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمْ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ“

(اے لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو اور اللہ ہی ہے جو غنی و بے نیاز ہے)

اور قرآن مجید میں خداوند عالم کے جو مقدس و مبارک اسماء گرامی و صفات عالیہ ذکر ہوئی ہیں ان کے حوالہ و تناظر میں اس کی بابت کسی طرح کی محرومی و ناداری، احتیاج و نقص، فقدان و عدم، بدی و برائی، ذلت و خواری اور اس طرح کے امور کا تصور ہی ممکن نہیں، اس کی ذات اس قسم کے امور سے منزہ و پاک اور ماوراء ہے۔

اس مقام پر عین ممکن ہے کہ مسیحیوں کے زیر بحث عقیدہ کے حوالہ سے کوئی شخص یہ کہے کہ ذلت و خواری اور لعنت اختیار کرنے کی بات خدا کی انسان کے ساتھ یکجائی کی بنا پر ہے کہ وہ ایک مادی و جسمانی انسان میں حلول کر گیا ہے لہذا اس کا تمام مذکورہ بالا امور سے متصف و حامل ہونا درست قرار پاتا ہے ورنہ اس حوالہ کے علاوہ اس کی ذات اس طرح کے امور و صفات سے یقینی طور پر بالاتر اور ماوراء و منزہ ہے۔

اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ آیا خدا کی انسان کے ساتھ یکجائی اس بات کا موجب بنی کہ خدا لعنت اور دیگر مذکورہ بالا سنگین قسم کے امور سے حقیقی طور پر متصف و حامل ہو یا مجازی طور پر؟ اگر پہلی صورت ہو یعنی حقیقی طور پر ان کا حامل ہوا

ہو تو اس سے وہی مشکل پیش آئے گی جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، اور اگر دوسری صورت ہو تو وہی اشکال دوبارہ لازم آئے گا، یعنی حضرت مسیح کے جنم لینے کی کہانی، خدا کی رحمت و عدل کے تزام و تصادم کی بابت پیدا ہونے والے اشکال کی دوری کا باعث نہیں بنی کیونکہ غیر خدا کا مصائب اور سختی و لعنت سے دوچار ہونا فدیہ یعنی خداوند عالم کے بنی نوع انسان کے لئے فدیہ ہو جانے کی بات پوری نہیں ہوتی، اور یہ ایک واضح حقیقت ہے۔

### نواں اعتراض:

مسیحوں کا کہنا ہے کہ ”حضرت عیسیٰ مسیح کا سولی پر چڑھنا تمام مؤمنین بلکہ پوری کائنات کے گناہوں و خطاؤں کا کفارہ ہے۔“

ان کے اس عقیدہ و نظریہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے گناہوں، خطاؤں اور ان پر اخروی عذاب کے حقیقی معنی کو سمجھا ہی نہیں اور نہ ہی اس مطلب کو سمجھ پائے کہ اخروی عذاب کیونکر لاحق ہوگا؟ بلکہ وہ تو یہ بھی نہیں سمجھے کہ گناہوں و خطاؤں اور ان پر مقرر کی گئی سزاؤں کی قانون گزاری کے ربط و ارتباط کی حقیقت کیا ہے اور اس قانون گزاری کا فلسفہ اور اصل راز کیا ہے؟ اور اس حوالہ سے جو کچھ قرآنی بیانات و ارشادات سے ظاہر و معلوم ہوتا ہے وہ ان حضرات کے تصوراتی نظریات سے ہرگز مطابقت و ہم رنگی نہیں رکھتا بلکہ ان بیانات سے ان حضرات کی عدم آگاہی کا ثبوت ملتا ہے.....

اور ہم اسی کتاب کی بعض سابق بحثوں کے جن میں سورۃ بقرہ کی آیت ۲۶ (إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَعِجُ أَنْ يُصْرَبَ بِمَثَلًا صَاح) کی تفسیر اور سورۃ بقرہ آیت ۲۱۳ کے ذیل میں مذکور مطالب شامل ہیں، بیان کر چکے ہیں کہ وہ احکام و قوانین کہ جن کی خلاف ورزی اور ان سے سرتابی اور پھر گناہ و خطا کا ارتکاب ہوتا ہے وہ ایسے قرار دیئے گئے اور طے کردہ امور ہیں جن کو قانونی حیثیت دینے میں مقصد و مقصود یہ ہوتا ہے کہ ان پر عمل کر کے اور ان کا عملی احترام و پاسداری کرنے سے انسانی معاشرہ کی عمومی مصلحتوں کا تحفظ کیا جائے اور ان احکام و قوانین کی نافرمانی و خلاف ورزی پر مقرر کیا جانے والا عقاب و سزا صرف اس غرض سے ہے کہ اس کی وجہ سے احکام و قوانین پر عمل کرنے کا جو فریضہ افراد بشر پر عائد کیا گیا تھا اس کی ادائیگی سے منہ موڑنے اور فرماں برداری سے سرتابی کے ارتکاب سے روکا جاسکے، یہ ہے احکام و قوانین اور ان پر مقرر کی جانے والی سزاؤں کی بابت انسانی معاشرہ کے بانی عقلاء حضرات کا موقف!

لیکن جہاں تک قرآنی تعلیمات و ارشادات کا تعلق ہے تو ان میں اس سے کہیں بالاتر و اعلیٰ ترین موقف و مقصد ملحوظ و مقصود ہے کہ جس کی تائید سابق الذکر عقلی مباحث سے بھی ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جو شخص خداوند عالم کی طرف سے اپنے لئے مقرر کئے گئے احکام و دستورات کی پیروی کرے اس کے باطن میں نہایت پاکیزہ و پسندیدہ صفات جنم لیتی ہیں اور جو شخص ان



دستورات کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو اور فرمانبرداری کی راہ اختیار نہ کرے اس کا باطن ناپاک و نہایت پست صفتوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے، اسی بناء پر اخروی نعمت یا نعمت کے اسباب فراہم ہوتے ہیں کہ ان احکام و قوانین اور دستورات خداوندی پر عمل کرنے والا شخص نعمت کا حقدار اور نافرمانی و سرکشی کرنے والا شخص نعمت و عذاب کا مستحق قرار پاتا ہے، یہ نعمت کہ جسے بہشت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے درحقیقت خداوند عالم کے قرب سے عبارت ہے اور یہ نعمت کہ جسے دوزخ کہا جاتا ہے درحقیقت خداوند عالم کے قرب سے دوری کی صورت ہے، بنا براین نیکیاں یا خطائیں ان حقیقی امور سے وابستہ و پیوستہ ہوتی ہیں جن کی اصل و اساس ایک حقیقی نظام پر قائم ہے نہ کہ قرار دیئے جانے والے اور خود طے کردہ نظام پر!

اور یہ حقیقت بھی واضح و آشکار ہے کہ شریعت الہیہ اور خدائی قوانین و دستورات دراصل خداوند عالم کے نظام خلقت کی تکمیل کا تہہ اور نگوینی ہدایت کو اس کی مقصودہ غرض و غایت اور خلقت کے ہدف و مقصد سے ہم کنار کرنا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ خداوند عالم کی شان خالقیت و مقام ربوبیت کی عملداری ہی اس صورت میں ہے کہ وہ جہان ہستی کی تمام موجودات کو ان کے وجودی کمالات سے بہرہ ور کرنا چاہتا ہے کہ ہر چیز اپنی نوعی حیثیت میں اپنے وجودی کمال اور اپنی ذات کے بنیادی ہدف کو پالے، اور انسان کا وجودی کمال یہ ہے کہ وہ دنیا میں ایک صالح نوعی نظام کے تحت زندگی بسر کرے اور آخرت میں خدائی نعمتوں سے مالا مال سعادتمند زندگی سے لطف اندوز ہو، اور ان دواہم و بنیادی مقاصد کے حصول کا یقینی راستہ وہ دین ہے جو معاشرہ کی اصلاح کے ضامن صالح اصولوں و قوانین اور عبادات کے نام پر قرب خداوندی کی بنیادی جہتوں کا حامل ہو کہ ان قوانین و دستورات اور عبادتی احکام پر عمل کر کے انسان اپنی دنیاوی زندگی کے امور کو منظم کرے اور اپنے باطن و ذات اور اعمال میں اخروی سعادتوں اور خدائی اعزازات و کرامتوں سے بہرہ ور ہونے کی صلاحیت پیدا کرے، اور یہ سب کچھ اس کے دل کی نورانیت اور نفس کی پاکیزگی پر موقوف ہے کہ جو دستورات الہی کو عملی جامہ پہنانے کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے، تو یہ ہے حقیقت الامر!

مذکورہ بالا مطالب سے یہ حقیقت ثابت ہوئی کہ انسان کا خدا سے قرب و بعد ہی حقیقت میں اس کی دائمی سعادت و شقاوت اور دنیا میں اس کی معاشرتی زندگی کی بہتری..... یا بُتری..... کے دو معیار ہیں اور دین وہ واحد ذریعہ و سبب ہے جو اس قرب و بعد کے پیدا ہونے کی راہوں کی صحیح نشاندہی کرتا ہے اور یہ تمام مطالب حقائق اور حقیقی امور ہیں ان میں کسی طرح کا بے معنی و بے بنیاد حوالہ نہیں پایا جاتا۔

اب اگر یہ فرض کریں کہ ایک گناہ کا ارتکاب مثلاً آدم کا ممنوعہ درخت سے پھل کھانا خود ان کے لئے بلکہ ان کی تمام نسل کی دائمی ہلاکت و تباہی کا باعث ہو اور اس دائمی ہلاکت سے نجات کا راستہ حضرت مسیح کے فدیہ بننے کے سوا کوئی نہ ہو تو پھر حضرت مسیح سے پہلے کسی دین و شریعت کا بننا بے فائدہ ہوگا اور پھر اس کے باوجود کسی قانون گزاری کا اثر کیا ہوگا؟ یعنی حضرت

مسح سے پہلے، ان کے ساتھ اور ان کے بعد کسی دین و آئین کا فائدہ ہی کیا ہوگا؟ کیونکہ جب گناہ کے ارتکاب کی بناء پر دائمی عذاب اور اخروی عذاب کو حتمی ثابت قرار دیا جائے کہ اس سے نجات پانے کے لئے کوئی عمل کام آئے گا اور نہ توبہ کارگر ہوگی سوائے فدیہ یعنی حضرت مسح کے اپنی جان بطور فدیہ دینے کے! تو پھر خداوند عالم کی طرف سے شریعتوں کا بنانا، احکام و دستورات صادر کرنا، کتابوں کا نازل کرنا اور انبیاء و پیغمبروں کا بھیجنا سب کچھ بے معنی و بے مقصد ہو جائے گا اور اسی طرح اطاعت و فرمانبرداری پر جزا و بہشت کے وعدے، معصیت و نافرمانی پر سزا و دوزخ کی وعید اور عذاب سے ڈرانا اور بندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے پر انعام کی خوشخبری وغیرہ کی حیثیت خواب و خیال سے زیادہ نہ ہوگی اور ان کے قرین صحت ہونے کی بات ہوا کا جھوٹکا کہلائے گی، عذاب کے لازمی و یقینی اور ہلاکت کے حتمی ہونے کے مفروضہ کے بعد مذکورہ بالا امور کی وقعت ہی کیا ہوگی؟ لیکن اگر سابقہ شریعتوں پر عمل کر کے وجودی کمال سے بہرہ ور ہونے والوں کو دیکھیں کہ جن میں سابقہ امتوں کے انبیاء کرام و اولیائے الہی اور اسی طرح پیغمبر بزرگوار حضرات ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام بھی شامل ہیں کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ مسح سے پہلے اور مسیحیوں کے بقول ان کے فدیہ قرار پانے سے قبل زندگی گزری اور دنیا سے چلے گئے تو ان کے بارے میں کیا کہیں گے؟ ان کے بارے میں آپ کیا کہیں گے کہ انہوں نے شقاوت پر زندگی بسر کی یا سعادت پر؟ اور مرنے کے بعد اور جہان آخرت میں جاتے ہوئے کس چیز سے ان کا سامنا ہوا؟ آیا عقاب و عذاب اور ہلاکت و نابودی نے انہیں گھیر لیا یا ثواب اور سعادت مند زندگی ان کا مقدر بنی؟ جبکہ حضرت مسح نے صراحت کے ساتھ کہا کہ انہیں گناہگاروں اور خطا کاروں کو چمکانا دلانے کے لئے بھیجا گیا لیکن جو لوگ نیک و صالح اور اطاعت گزار ہیں انہیں ان چیزوں کی ضرورت نہیں، (ملاحظہ ہو: انجیل لوقا، اسحاق پنجم، اس میں مذکور ہے کہ یہودیوں اور ان کے خشک مقدس کاہنوں و ملاؤں نے حضرت مسح کے شاگردوں کو سخت تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ تم گناہگاروں اور خطا کاروں کے ساتھ مل کر کیوں کھاتے پیتے ہو؟ تو یسوع نے انہیں جواب دیا کہ جو لوگ صحت مند اور صحیح و سالم ہیں انہیں طبیب و معالج کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن جو لوگ بیمار ہیں انہیں طبیب و معالج کی ضرورت ہوتی ہے اور میں اس لئے نہیں آیا کہ صدیقین کو دعوت دوں لیکن خطا کاروں کو توبہ کرنے کا کہتا ہوں)۔

خلاصہ کلام یہ کہ مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں حضرت مسح کے فدیہ ہونے سے پہلے کسی بھی شریعت الہیہ اور دینی تعلیمات کی پاکیزہ حقیقتوں کی تشکیل میں کوئی ایسی صحیح غرض باقی دکھائی نہیں دے گی جو اسے عبث و بے مقصد ہونے سے بچا سکے اور نہ ہی اس انوکھے سلسلہ کے قیام کی بابت خدائی مصلحت کا کوئی حوالہ متعین ہو سکے گا، البتہ صرف یہ بات کہی جاسکے گی (کہ جس کا نادرست ہونا عنقریب بیان کیا جائے گا) کہ خداوند عالم کو معلوم تھا کہ اگر آدم کی خطا کا مداوا نہ ہوا تو شریعتوں کی تشکیل بے فائدہ ہوگی لہذا اس نے احتیاطاً ان کی تشکیل کو صورت بخشی کہ شاید وہ دن بھی آئے جب آدم کی خطا کا مداوا ہو سکے اور پھر ان شریعتوں کی تشکیل کا پھل مل جائے کہ جس سے تخلیق عالم اور تشریح دین کی مقصود و مطلوب غرض حاصل ہو اور اس کی تمنائیں

برائیں چنانچہ خدا نے اس راز کو اپنے نبیوں و پیغمبروں اور عام لوگوں پر آشکار کئے بغیر شریعتوں کی تشکیل کا کام کیا اور یہ بات ان سے پوشیدہ رکھی کہ جب تک آدمؑ کی خطا کا مداوا نہ ہو جائے اس وقت تک تمام انبیاء و مومنین کی کاوشیں نتیجہ بخش ثابت نہ ہوں گی اور شریعتوں کی تشکیل بے غرض و بے مقصد رہے گی بلکہ خدا نے انبیاء اور اہل ایمان و بنی نوع آدم کے سامنے دینی دستورات و احکام صادر کرنے کا سنجیدگی و مبنی بر حقیقت ہونا ظاہر کیا۔

اس مفروضہ کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ (معاذ اللہ) خدا نے لوگوں کو اور اپنے آپ کو بھی دھوکہ میں رکھا اور وہ اس طرح کہ لوگوں کو یوں دھوکہ میں رکھا کہ ان کو اس غلط فہمی میں مبتلا رکھا کہ اگر وہ ان شرعی احکام و دینی دستورات پر عمل کریں تو وہ سعادت مند ہو جائیں گے اور وہ ان کے گناہوں کو بخش دے گا، اور اپنے آپ کو اس طرح دھوکہ میں رکھا کہ حضرت مسیحؑ کے فدیہ ہونے ذریعے آدمؑ کی خطا کا مداوا ہو جانے کے بعد ان شریعتوں کا وجود بے مقصد و بے فائدہ ہو جائے گا اور اس کا لوگوں کی سعادت مندی میں اس طرح کوئی کردار نہ ہوگا جس طرح مداوا ہونے سے پہلے وہ بے نتیجہ تھیں، تو یہ ہے فدیہ ہونے کے وقت سے پہلے دینی دستورات کی قانون گزاری کا حال! اور یہی حال بلکہ بے مقصد ہونے میں اس سے زیادہ واضح و روشن صورت حال فدیہ ہونے کے زمانہ اور اس کے بعد کی ہے، بنا برائیں دینی حقائق پر ایمان لانے کا کیا فائدہ؟ اور اعمال صالحہ بجا لانے سے کیا حاصل؟ کیونکہ خطاؤں کا مداوا ہو جانے کے بعد عقیدہ و عمل کی کوئی حیثیت ہی باقی نہ رہے گی بلکہ خداوند عالم کی طرف سے تمام بنی نوع انسان پر مغفرت و رحمت کا نازل ہونا لازمی و ضروری ہوگا خواہ کوئی مومن ہو یا کافر، نیک ہو یا برا، اور خواہ کوئی تقویٰ و پرہیزگاری میں ہر ترقی و پرہیزگار سے زیادہ مقام رکھتا ہو یا کوئی برے اعمال انجام دینے میں دوسروں سے کہیں آگے بڑھا ہو اور یعنی متقی ترین شخص اور گنہگار ترین شخص کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہے گا، بلکہ وہ سب خطاؤں کا مداوا ہونے سے پہلے تک دائمی ہلاکت کا شکار ہونے میں مشترک تھے اور فدیہ کے ذریعے خطاؤں کا مداوا ہونے کے بعد رحمت خداوندی سے فیض یاب ہونے میں بھی یکساں ہوں گے کیونکہ مفروضہ صورت میں اگر فدیہ نہ ہوتا تو خطاؤں کے مداوا میں کوئی عمل صالح فائدہ مند نہ ہوتا۔

## حضرت عیسیٰؑ کی بشارت کے حوالہ سے ایک سوال!

اس مقام پر ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ حضرت مسیحؑ کا فدیہ ہونا صرف اسی کے لئے فائدہ مند ہوگا جو ان پر ایمان لائے لہذا دعوت دیدیہ سود مند ہے، چنانچہ حضرت مسیحؑ نے اپنی ایک بشارت میں صریح الفاظ میں یوں کہا ہے:

”میں صاف صاف تم سے کہتا ہوں کہ جو شخص لوگوں کے سامنے مجھ پر ایمان لانے کا اظہار و اعتراف کرے تو مبنی

نوع انسان کے تمام افراد قیامت کے دن فرشتگان الہی کے روبرو اس شخص کی تصدیق کریں گے اور اس کے ایمان کی توثیق کریں گے، اور جو شخص لوگوں کے سامنے میرا انکار کرے تو تمام افراد بشر قیامت کے دن فرشتوں کے روبرو اس کی تکذیب کریں گے، جو شخص کسی فرد بشر کے بارے میں غلط الفاظ ادا کرے تو اسے معاف کر دیا جائے گا اور جو شخص روح القدس کے بارے میں بدکلامی کرے تو اسے ہرگز معاف نہیں کیا جائے گا،

(انجیل لوقا، اصحاح ۱۲)

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے تو یہ بات اس مطلب سے متصادم ہے جو یوحنا کے رسالہ میں مذکور ہے کہ جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں اور دوسری بات یہ کہ اس سے سابق الذکر تمام اصولوں کی سرے ہی سے نفی ہو جائے گی کیونکہ اس مفروضہ کی بناء پر آدم سے لے کر قیامت تک آنے والے افراد میں سے محدودے چند کے علاوہ کوئی بھی نجات اور گناہوں سے چھٹکارا نہیں پاسکے گا اور صرف وہی چند لوگ ہی نجات یافتہ ہو گے جو حضرت مسیح اور روح القدس پر ایمان لائے ہوں گے اور وہ بھی ان کے مختلف گروہوں و فرقوں میں صرف ایک فرقہ، نہ کہ تمام فرقوں کے افراد! ان کے علاوہ سب دائمی ہلاکت کا شکار رہیں گے، اب یہ معلوم نہیں کہ حضرت مسیح سے پہلے گزرے ہوئے انبیاء عالی قدر اور ان کی امتوں میں سے نیک و صالح افراد پر کیا گزرے گی؟ اور ان انبیاء الہی کی دعوت حق کہ جس میں وہ کتاب و حکمت لائے اس کی حیثیت و وقعت کیا ہوگی؟ اور اس دعوت حق کو قرین صحت و صداقت قرار دیا جائے گا یا جھوٹ پر مبنی کہا جائے گا؟ اور پھر ان انجیلوں کے بارے میں سوال پیدا ہو جائے گا جو تورات اور اس کی تعلیمات کی تصدیق کرتی ہیں اور ان میں روح القدس اور مذہب وغیرہ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، کہ ان کی تصدیق میں کہاں تک صداقت پائی جاتی ہے یا وہ کسی جھوٹی کتاب کی تصدیق کرتی ہیں؟

حضرت عیسیٰؑ کی آمد کے حوالہ سے ایک سوال

یہاں ایک اور سوال بھی ممکن ہے اور وہ یہ کہ سابقہ کتب آسمانی میں جہاں تک ہمیں معلوم ہے حضرت مسیحؑ کی تشریف آوری کی خوشخبری دی گئی ہے اور یہی بات دین مسیحؑ کی طرف اجمالی دعوت ہے، اگرچہ ان کتب میں حضرت مسیحؑ کی تشریف آوری و نزول کی کیفیت تفصیلی طور پر مذکور نہیں لیکن اس سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ خداوند عالم اپنے انبیاء کو حضرت مسیحؑ کی آمد سے مطلع و آگاہ اور اس کی خوشخبری دیتا رہتا تاکہ لوگ ان پر ایمان لائیں اور ان کے اعمال سے طیب نفس پائیں۔

جواب:

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس طرح کی خوشخبری کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے آنے والے انبیاء سے کوئی ربط نہیں بنتا بلکہ ان کی بابت اس خوشخبری کا حوالہ غیب گوئی کی ناقابل قبول صورت کے سوا کچھ نہیں، اور اگر اس طرح کی بشارت و خوشخبری کو درست قرار بھی دیا جائے تو گناہوں سے خلاصی و چھٹکارا پانے کی بشارت تو کہا جاسکتا ہے لیکن حضرت مسیح پر ایمان لانے اور ان کی شریعت کی پیروی کی دعوت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

دوسری بات یہ کہ اس سے فروغ دین میں اخلاقیات اور اعمال صالحہ کی انجام دہی کی دعوت کے بے مقصد ہو جانے کا حوالہ باقی رہ جائے گا یہاں تک کہ حضرت مسیح بھی اس کی تائید کرتے ہیں اور انجیلیں بھی اس سے بھری پڑی ہیں۔

تیسری بات یہ کہ خطاؤں کی بابت ذکر کیا گیا اہم ترین مشکل حوالہ اور سلسلہ تخلیق و ہدایت کے خدائی نظام کے بے مقصد ہو جانے کا مسئلہ جوں کا توں رہے گا کیونکہ خداوند عالم نے بنی نوع انسان کو خلق فرمایا تاکہ ان سب کو اپنی رحمت سے نوازے اور سب پر اپنی نعمتوں اور سعادتوں کے دروازے کھول دے، جبکہ مسیحیوں..... بولس اور ان جیسے دیگر اکابر مسیحی علماء کے بیانات کے مطابق رحمت و نعمت اور سعادت کی بجائے خداوند عالم نے محدودے چند افراد کے علاوہ سب کو اپنے عقاب و غضب کا نشانہ بنایا اور سب کو دائمی ہلاکت سے دوچار کر دیا۔

تو یہ ہیں بولس کے بیانات و اطہارات کے نادرست ہونے کی چند عقلی جہات و حوالے! اور ان کی تائید و تصدیق بلکہ انہی حقائق کا بیانی تسلسل قرآن مجید کی مقدس آیات مبارکہ میں دکھائی دیتا ہے، چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہ طہ، آیت: ۵۰

○ ”الَّذِي أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ حَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ“

(اس نے ہر چیز کو اس کی خلقت عطا کی، پھر ہدایت کی)

اس آیت مبارکہ میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ ہر چیز کو اس کے مقصد تخلیق کی راہ دکھائی گئی ہے اور وجودی تقاضوں کی تکمیل کی ہدایت و راہنمائی کی گئی ہے کہ جس میں تکوینی و تشریحی دونوں قسم کی ہدایت شامل ہے، تو ثابت ہوا کہ ہدایت کے وسیع سلسلہ کا قیام دراصل سنت الہیہ ہے اور اس سلسلہ کی ایک کڑی انسان کو دینی ہدایت سے نوازنا ہے کہ اس دینی ہدایت کے پہلا مرحلہ میں خداوند عالم نے حضرت آدمؑ اور ان کے ہمراہیوں کو جنت سے نیچے اتارتے ہوئے فرمایا:

سورہ بقرہ، آیت: ۳۹

○ ”قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۚ فَاِذَا يَٰٓتِيَنٰكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىۡ فَلَا خَوْفٌ

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكٰذَبُوْا بِآيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّٰرِۙ

هُمَ فِيهَا خَالِدُونَ“

(ہم نے کہا: تم سب یہاں سے نیچے چلے جاؤ، پھر جب تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا تو ایسے لوگ نہ خوفزدہ ہوں گے اور نہ ہی محزون و غمگین ہوں گے، اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا تو وہی ہمیشہ دوزخ میں رہنے والے ہیں)۔

اس آیت میں جہاں خدا کی طرف سے دینی سلسلہ ہدایت کے پہلے مرحلہ کا ذکر ہوا ہے وہاں قیامت تک آنے والی شریعتوں و دستوراتِ خداوندی کی تفصیلات کا خلاصہ و لب لباب بھی بیان کر دیا گیا ہے جس میں شریعتوں کی تشکیل اور وعدہ و وعید کے یقینی نظام کا واضح اشارہ موجود ہے، اپنے بیان و گفتار کی بابت خداوند عالم کا صریح ارشاد ہے:

سورہ ص، آیت: ۸۴

○ ”الْحَقُّ أَقُولُ“

(میں حق بات ہی کہتا ہوں)

اپنے نظام کے درست بنیاد پر استوار ہونے کی بابت فرمایا:

سورہ ق، آیت: ۲۹

○ ”مَا يَبْدَأُ الْقَوْلَ لَكُمْ يَوْمَ مَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ“

(میرے ہاں بات میں تبدیلی نہیں آتی اور میں بندوں پر ہرگز ظلم کرنے والا نہیں)

اس آیت میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ خدا جس چیز کا پختہ ارادہ کر لیتا ہے اس کی بابت تردد و غیر یقینی کی کیفیت کا شکار نہیں ہوتا اور جس حکم و فیصلہ کو نافذ کرتا ہے اسے نقص نہیں کرتا..... اسے غیر مؤثر نہیں کرتا..... جس کام کی انجام دہی کو طے کر لیتا ہے اسے گزرتا ہے، اپنے ہر فیصلہ پر قائم رہتا ہے، اس کا کام اس کے ارادہ کی سمت سے باہر نہیں جاتا یعنی ایسا نہیں کہ کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرے اور پھر اس کی انجام دہی میں متردد ہو جائے..... کہ اسے انجام دے یا نہ دے..... یا کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرے اور پھر کسی وجہ سے اسے انجام نہ دے، یا یہ کہ کسی کام کا ارادہ کرے اور نہایت پختگی کے ساتھ اس کی انجام دہی کا فیصلہ کرے اور پھر کوئی ایسی رکاوٹ پیدا ہو جس کا رکاوٹ ہونا عقلی طور پر درست ہو یا اس کام کی انجام دہی کی راہ میں کوئی ایسا اشکال پیدا ہو اور عملی طور پر مشکلات پیش آئیں کہ اس کام کو انجام نہ دے، تو یہ سب میر دنی عامل کی کارگزاری کی مختلف صورتیں ہیں کہ جو ارادہ الہی پر غالب آنے کے اسباب کی نشاندہی کرتی ہیں جبکہ قرآن مجید نے واضح طور پر اس کی نفی کرتے ہوئے خداوند عالم کے غلبہ کو بیان کیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۃ یوسف، آیت: ۲۱:

○ ”وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِهِ“

(اور اللہ اپنے ہر امر پر غالب ہے)

اور ارشاد ہوا:

سورۃ طلاق، آیت: ۳:

○ ”اِنَّ اللّٰهَ بِاِلْمِ اَمْرِهِ“

(بے شک اللہ اپنے امر..... و مراد..... کو پانے والا ہے)

ایک آیت میں حضرت موسیٰ کا قول ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

سورۃ آلہ، آیت: ۵۲:

○ ”عَلِمَهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ لَا يَبْصُرُ رَآئِيْ وَلَا يَنْسِي“

(اس کا علم میرے رب کے پاس کتاب میں ہے، کہ میرا رب نہ تو گمراہ ہوتا ہے اور نہ ہی بھولتا ہے)

ایک مقام پر قیامت کے دن محاسبہ کے حوالہ سے اس کے مبنی بر عدل ہونے کی بابت یوں ارشاد ہوا:

سورۃ مؤمن، آیت: ۱۷:

○ ”اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۗ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ۗ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ“

(آج ہر شخص کو اس کے کئے کی پوری پوری جزا دی جائے گی، آج کوئی ظلم نہیں ہوگا، بے شک خدا جلد حساب

کرنے والا ہے)

ان آیات اور ان سے مشابہ آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے کائنات کو خلق فرمایا تو اپنی مخلوق کے

بارے میں ہرگز غفلت نہیں برتی اور نہ ہی ان سے سرزد ہونے والے افعال و اعمال سے نا آگاہی و جہالت میں رہا اور نہ اپنے

کسی کام پر ندامت و پشیمانی کا شکار ہوا، پھر اس نے اپنی مخلوق کے لئے قوانین بنائے اور قانون گزاری کے عمل میں کسی غیر یقینی

کی حالت و کیفیت یا غیر سنجیدگی، خوف و امید کی بناء پر کوئی فیصلہ نہیں کیا بلکہ نہایت پختگی و یقین کے ساتھ تشریح و قانون گزاری

کے مراحل انجام دیئے، پھر اس نے..... اپنے عدل کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے..... ہر شخص کے لئے اس کے عمل کے مطابق

جزا مقرر کی کہ اگر وہ عمل اچھا ہوا تو اس پر جزا و انعام اور اگر برا ہوا تو سزا دے گا، یہ سب کچھ اس نے کسی سے مطلوب و محکوم ہو کر

انجام نہیں دیا اور نہ ہی قیامت کے دن کوئی اس پر غالب و حاکم ہوگا، اس کے کسی کام میں کوئی شریک نہیں اور نہ ہی فدیہ، قرہبی

تعلق اور اس کے اذن کے بغیر شفاعت وغیرہ کا اس کے امور میں کوئی دخل ہے اور نہ ہی ان میں سے کوئی چیز قیامت کے دن

اس کے عدل کی راہ میں حائل ہو سکے گی کیونکہ یہ سب کچھ اس کے مالک علی الاطلاق ہونے کے منافی ہے جبکہ وہ اپنی تمام مخلوق کا علی الاطلاق اور بلا شرکت غیرے حاکم و مالک ہے۔

### دسواں اعتراض:

مسیحیوں کے بیانات و عقائد اور اظہارات میں حضرت مسیحؑ کے فدیہ ہونے کے بارے میں جو مطالب موجود ہیں ان پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ فدیہ کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کوئی ایسا کام کرے..... ایسے فعل کا مرتکب ہو..... جس کے نتیجے میں جانی و بدنی یا مالی سزا کا مستحق ٹھہرے اور اس سزا سے بچنے کے لئے اس کے بدلہ میں کوئی چیز عوض قرار دے، وہ چیز خواہ کچھ بھی ہو اسے ”فدیہ“ کہا جاتا ہے، تو ”فدیہ“ ہر اس عوض کو کہتے ہیں جو کسی بھی برے نتیجے و انجام سے بچنے کے لئے دیا جائے مثلاً جنگی قیدی اپنی رہائی کے لئے کوئی دوسرا شخص یا کوئی مال دیتا ہے، تو اسے ”فدیہ“ کہتے ہیں، یا جرم و جنایت پر مقررہ سزا سے بچنے کے لئے مال دیا جاتا ہے تو اس بدل و عوض کو ”فدیہ“ سے موسوم کیا جاتا ہے، بنا بریں ”فدیہ“ یعنی فدیہ دینا ایک طرح کا معاملہ ہے جس کے ذریعے کسی حقدار کا حق..... جانی، مالی، تسلطی وغیرہ..... فدیہ دینے والے سے لے کر اس کو عطا کیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں فدیہ دینے والا شخص سزا و کیفر سے بچ جاتا ہے۔

اس بیان سے یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ جو امور خداوند عالم سے تعلق رکھتے ہیں ان میں ”فدیہ“ معقول نہیں کیونکہ سلطنت و حاکمیت الہی انسانوں کی طے کردہ حاکمیت و تسلط کے برعکس حقیقی و اصل اور ناقابل تبدیلی حاکمیت و تسلط ہے اور اس میں کسی کی دخل اندازی و تصرف محال و ناممکن ہے، بنا بریں تمام اشیاء عالم اور جہان ہستی کی موجودات اپنی ذوات اور اصل وجود اور ان کے آثار کے ساتھ خداوند عالم کے ساتھ قائم و وابستہ ہیں تو یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ کسی واقع الامر اور حقیقت کی اصل صورت میں تبدیلی کا تصور ہو، اور جس چیز کا تصور ہی ممکن نہ ہو تو اس کا وقوع پذیر ہونا کیونکر ممکن ہوگا، البتہ جہاں تک ہم افراد بشر کے درمیان راجح و موجود حاکمیت و سلطنت اور حقوق کا تعلق ہے تو وہ سب اور ان جیسے دیگر امور ہمارے ہی طے کردہ اور بنائے ہوئے ہیں کہ جن کی باگ ڈور ہمارے ہی ہاتھوں میں ہے اور یہ ہم ہی ہیں جو اپنی زندگی و معاشی مصلحتوں کو ملحوظ و پیش نظر رکھتے ہوئے کبھی تو ان کو کالعدم کرتے ہیں اور کبھی ان میں تبدیلیاں و ترامیم کرتے ہیں۔

(اس سلسلہ میں سورہ فاتحہ کی آیت ۴ (مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ) اور سورہ آل عمران کی آیت ۲۶ (قُلِ اللّٰهُمَّ

مَلِكِ النَّارِ) کی تفسیر میں ذکر کی گئی بحثوں و مطالب کا مطالعہ کریں)

”فدیہ“ کے حوالہ سے خداوند عالم نے بالخصوص اس کی نفی کی اور یوں ارشاد فرمایا :



سورہ حدید، آیت: ۱۵

○ "فَالْيَوْمَ لَا يُوَفِّقُ خُلُوفًا مِنْكُمْ فِدْيَةً وَلَا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مَأْوَاهُمْ النَّارُ"

(آج تم سے کوئی فدیہ نہیں لیا جائے گا اور نہ ہی کفر اختیار کرنے والوں سے، تمہارا ٹھکانہ جہنم کی آگ ہے)

اسی حوالہ سے یہ مطلب پہلے ذکر کی جا چکا ہے کہ خداوند عالم نے حضرت مسیح کے تذکرہ میں ان سے ہونے والی گفتگو اس طرح بیان کی:

سورہ مائدہ، آیت: ۱۱۸

○ "وَإِذْ قَالَ اللَّهُ لِيَعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ إِنِّي أَنْتَ لِلنَّاسِ الْخَادِعُونَ وَإِنِّي أَهْبَأُ الْهَيْبِينَ مِنْ دُونِ اللَّهِ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقِّ (۱) مَا قُلْتَ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنْ أَعْبُدُ وَاللَّهُ سَرِيبٌ وَسَرَابٌ كُمْ وَكُنْتَ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا أَمَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ وَأَنْتَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝ (۲) إِنْ تَعَذَّلْتُمْ عَنْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۝ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ"

(اور جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ بن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا ہے کہ تم مجھے اور میری ماں کو خدا کے علاوہ دو معبود بناؤ، اس (عیسیٰ) نے کہا: تیری ذات پاک ہے مجھے یہ بات روا نہیں کہ میں کوئی ایسی بات کروں جس کا مجھے حق نہ ہو (۲) میں نے ان سے صرف وہی کچھ کہا ہے جس کا تو نے مجھے حکم دیا اور وہ یہ کہ تم اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے، اور میں ان پر گواہ ہوں جب تک میں ان میں موجود ہوں، پھر جب تو میرا وقت پورا کر دے گا تو تو خود ان پر نگہبان ہے اور تو ہر چیز پر گواہ ہے، اگر تو ان پر عذاب نازل کرے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انہیں معاف کر دے تو بے شک تو غالب و طاقتور اور دانا ہے)

اس آیت مبارکہ میں حضرت مسیح کا جملہ "كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ" اس معنی و مطلب کو بیان کرتا ہے کہ

آنجناب نے گویا یوں کہا:

پروردگارا! میری ذمہ داری اس کے علاوہ کچھ نہ تھی کہ میں تیرے حکم و فرمان کے مطابق عمل کرتے ہوئے تیرے پیغامات لوگوں تک پہنچاؤں، اور ان کے اعمال پر گواہ رہوں..... اس ادا نے رسالت کے سوا تو نے کوئی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں اور جو کچھ تو نے مجھے سونپا اسے میں نے پوری طرح ادا کر دیا..... اب تو انہیں ہلاک کرے، نجات بخشے، انہیں عذاب میں مبتلا کرے یا معاف کر دے یہ سب کچھ تیرے ہاتھ میں ہے، اس میں کسی کا کوئی تعلق و دخل نہیں اور نہ ہی مجھے اس سلسلہ میں کسی قسم کا کوئی اختیار حاصل ہے کہ جس کی بناء پر میں انہیں تیرے عذاب سے نکال باہر کروں یا ان پر تیرے تسلط کو ختم

کروں..... اگر تو انہیں ان کے کسے کی سزا دے اور عذاب میں مبتلا کرے تو انہیں اس سے بچانے کی مجھ پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی.....

حضرت مسیحؑ کے اس بیان سے ان کے فدیہ قرار پانے کی واضح نئی ہوتی ہے کیونکہ اگر یہاں ”فدیہ“ کا مسئلہ ہوتا اور حضرت مسیحؑ لوگوں کو ان کے گناہوں کی سزا سے بچانے کے لئے خود فدا ہوئے ہوتے تو ان کے اعمال سے اپنے آپ کو لا تعلق قرار دے کر عذاب یا مغفرت دونوں کا معاملہ خداوند عالم کی مرضی پر نہ چھوڑتے اور ان دونوں کی بابت اپنے آپ کو کلی طور پر بے تعلق قرار نہ دیتے۔ اور ہرگز یوں نہ کہتے کہ میں نے تیری عائد کردہ ذمہ داری کو پورا کر دیا ہے اب ان کے بارے میں تو خود ہی فیصلہ کرنے والا ہے بلکہ بارگاہ رب العزت میں یوں عرض کرتے کہ جب میں نے اپنے آپ کو ان کے گناہوں کا فدیہ بنا دیا ہے تو اب تو ان پر عذاب نازل نہ کر.....

مذکورہ بالا مطلب کا اظہار درج ذیل آیات مبارکہ میں بھی ہوا ہے:

سورہ بقرہ، آیت: ۳۸

○ ”وَ اتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ“

(اور اس دن سے ڈرو جب کسی کو کسی کے بدلہ میں کوئی سزا نہیں دی جائے گی اور نہ ہی کسی کی شفاعت قبول کی جائے گی اور نہ ہی کسی سے کوئی عوض لیا جائے گا اور نہ ہی لوگوں کی مدد کی جائے گی)

سورہ بقرہ، آیت: ۲۵۴

○ ”يَوْمَ لَا يَنْفَعُ فِيهِمْ وَلَا خَلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ“

(اس دن کوئی لین دین نہ ہوگا، نہ کوئی دوستی ہوگی اور نہ ہی شفاعت)

سورہ مؤمن، آیت: ۳۳

○ ”يَوْمَ تَوَلَّوْا مُدْبِرِينَ مَّا لَكُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ“

(اس دن جب تم پیٹھ پھیر کر لوٹو گے، تمہیں کوئی شخص خدا سے بچانے والا نہ ہوگا)

ان تین آیات میں تین مختلف الفاظ ذکر ہوئے ہیں:

(۱) عدل بمعنی عوض و بدل، (وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ)

(۲) بیع (معاملہ و لین دین یا سودے بازی)، (لَا يَنْفَعُ فِيهِ)

(۳) عصمت (بچاؤ)، (مَّا لَكُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ)

یہ تینوں الفاظ فدیہ کی تطبیقی صورتوں کو ظاہر کرتے ہیں اور ان کی نفی سے فدیہ کی بھی نفی ہو جاتی ہے،..... اگر عوض و بدل کی گنجائش ہوتی یا معاملہ ولین دین ممکن ہوتا یا کوئی شخص کسی مجرم و گناہگار کو اس کے کئے کی سزا سے بچا سکتا تو یقیناً اسے ”فدیہ“ کی ایک صورت کہا جاتا لیکن آیات مبارکہ میں ان کی نفی ہوئی ہے جس سے فدیہ کی خود بخود نفی ہو جاتی ہے۔

البتہ قرآن مجید میں حضرت مسیحؑ کی شفاعت کا اثبات ہوا ہے، نہ کہ ان کے فدیہ ہونے کا کہ جس کا اثبات مسیحی حضرات کرتے ہیں، ان دونوں میں فرق یہ ہے (جیسا کہ سورۃ بقرہ کی آیت مبارکہ ۴۸ ”وَ اتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي .....“ کی تفسیر میں اس حوالہ سے بحث ہو چکی ہے) کہ شفاعت دراصل شفاعت کرنے والے کے اس شخص سے قرب اور اس کے نزدیک بلند مقام و مرتبت ہونے کا مظہر ہوتی ہے جس سے شفاعت کی جاتی ہے اور اس میں ہرگز یہ حوالہ نہیں ہوتا کہ شفاعت کرنے والا اس شخص کی طرف سے اس کام کا مالک و مختار ہے یا اس شخص کو اس کے اختیار و سلطنت سے محروم کر دیتا ہے یا اس کے اس فیصلہ کو کالعدم کر دیتا ہے جو اس نے جرم کا ارتکاب کرنے والے کے لئے سزا کی بابت صادر کیا ہے یا سرے سے سزا کے قانون کو ختم و غیر موثر کر دیتا ہے، بلکہ شفاعت کی اصل حقیقت ایک دعا و استدعا کی ہے کہ شفاعت کرنے والا اس ذات کے حضور کہ جس سے شفاعت کرتا ہے یعنی پروردگار، یہ درخواست کرتا ہے کہ وہ اپنے مسلمہ مالکانہ اختیارات استعمال کرتے ہوئے جرم کے مرتکب کو سزا کا مستحق ہونے کے باوجود معاف کر دے کیونکہ معاف کر دینا مولا کا حق و اختیار ہے جبکہ وہ چاہے تو اس کی نافرمانی کی بناء پر سزا و عقوبت کے قانون کے مطابق اس کے ساتھ برتاؤ کر سکتا ہے۔

بنا برائیں شفاعت کرنے والا، مولا سے غفور و درگزر اور معاف کر دینے کا اختیار استعمال کرنے کی درخواست کرتا ہے اور اس سے عرض گزار ہوتا ہے کہ نافرمانی پر سزا کے مستحق شخص پر رحم کرتے ہوئے اس سلسلہ میں اپنے معاف کر دینے کا حق استعمال کرے، کہ اس میں مولا کی مالکیت و حاکمیت کے اختیارات سلب ہونے کی کوئی صورت نہیں پائی جاتی، جبکہ فدیہ میں ایسا نہیں کیونکہ ”فدیہ“ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے ایک طرح کا معاملہ ولین دین ہے جس کے ذریعے کسی چیز کا حاکمانہ اختیار کسی دوسری چیز میں تبدیل کر دیا جاتا ہے جو کہ ”فدیہ“ کا عمل کہلاتا ہے اور جس کے عوض فدیہ دیا جاتا ہے اس پر فدیہ قبول و وصول کرنے والے کا کوئی اختیار و سلطنت باقی نہیں رہتی چنانچہ اس مطلب کی دلیل درج ذیل آیت مبارکہ میں پائی جاتی ہے:

سورۃ زخرف، آیت: ۸۶

○ ”وَلَا يَسْئَلُكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ“

(اور وہ اللہ کے علاوہ جنہیں پکارتے ہیں وہ شفاعت کا حق نہیں رکھتے سوائے اس کے کہ جو علم و آگاہی کے

ساتھ حق کی گواہی دے)

اس آیت مبارکہ میں شفاعت کا حق نہ رکھنے والوں میں سے مستثنیٰ کئے گئے افراد کی شفاعت کے واقع ہونے کا

صریح بیان موجود ہے اور حضرت مسیحؑ ان افراد میں شامل ہیں جنہیں ان کے پیروکار خدا کے علاوہ معبود قرار دے کر پکارتے تھے جبکہ قرآن مجید نے واضح لفظوں میں آنجنابؑ کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ خداوند عالم نے انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دی اور وہ قیامت کے دن گواہوں میں سے ہوں گے، چنانچہ اس حوالہ سے ارشاد ہوا:

سورۃ آل عمران، آیت: ۴۸

○ ”وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ“

(اور اسے کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے)

سورۃ بقرہ، آیت: ۱۷۱

○ ”وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ“

(اور میں جب تک ان میں موجود رہا ان پر گواہ و ناظر تھا)

سورۃ نساء، آیت: ۱۸۹

○ ”وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا“

(اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوگا)

جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں کہ مذکورہ بالا آیات مبارکہ میں حضرت مسیحؑ کے گواہ ہونے کا ثبوت پایا جاتا ہے چنانچہ اس موضوع کی بابت سورۃ بقرہ کی آیت ۴۸ ”وَإِن تَقُوا اللَّهَ لَتَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم مِّنْ لَّدُنْهُ عَن نَّفْسِهِمْ شَيْئًا.....“ کی تفسیر میں تفصیلی تذکرہ ہو چکا ہے۔

## چھٹی فصل:

### حضرت مسیحؑ کے بارے میں نظریات کا سرچشمہ؟

قرآن مجید اس بات کی قطعی نفی کرتا ہے کہ حضرت مسیحؑ نے اپنے پیروکاروں کو ان عقائد و نظریات کی تعلیم دی اور ان کے درمیان پائے جانے والے بے بنیاد خیالات کو عام کیا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اس طرح کے خرافات و باطل نظریات میں اپنے دینی رہنماؤں کی پیروی کی اور اس سلسلہ میں تمام امور انہی کو سونپ کر ان کے پیچھے چل پڑے جبکہ ان کے دینی رہنماؤں نے یہ بے بنیاد و غلط عقائد و نظریات قدیم بت پرستوں سے لئے، چنانچہ اس حوالہ سے قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے:

سورۃ توبہ، آیت: ۳۱

○ "وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ذَٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهَوْنَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ قَتَلْتَهُمُ اللَّهُ ۗ أَنَّى يُؤْفَكُونَ ۝۳۱  
 اتَّخَذُوا أَحْبَابَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَهًا وَاحِدًا ۚ لَآ إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ سُبْحٰنَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ....."

(اور یہودیوں نے کہا کہ عزیز اللہ کا بیٹا ہے، اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے، یہ سب ان کی زبانی باتیں ہیں، وہ اپنے سے پہلے گزرے ہوئے کافروں کی باتوں کی پیروی و اندھی تقلید کرتے ہیں، خدا انہیں مارے، یہ کہاں بھٹکے جا رہے ہیں، انہوں نے اپنے احبار (دینی رہنماؤں) اور راہبوں (دنیا سے قطع تعلق کرنے والے مقدس ما بوں) کو اور عیسیٰ بن مریم کو خدا کے علاوہ رب بنا لیا ہے حالانکہ انہیں اس کے علاوہ کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ وہ صرف ایک معبود کی پرستش کریں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کی ذات پاک ہے اس سے جو وہ شرک کرتے ہیں (اس کے ساتھ دوسرے معبود قرار دیتے ہیں)۔)

اس آیت کے فقرہ "يُضَاهَوْنَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ" میں جن کافروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان سے زمانہء جاہلیت کے بت پرست عرب مراد نہیں کیونکہ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے اور کہتے تھے "ان الملائكة بنات الله" (فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں) اور جہاں تک یہود و نصاریٰ کے خدا کا بیٹا قرار دینے کے عقیدہ کا تعلق ہے تو اس کا تاریخی پس منظر ان کے عربوں سے تعلقات و روابط اور آمد و رفت اور میل جول سے بہت پہلے ہے اور اس حوالہ سے یہودی اس عقیدہ میں دوسروں (نصاریٰ) پر سبقت رکھتے ہیں جبکہ آیت مبارکہ میں "مِنْ قَبْلُ" کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ یہودیوں و نصاریوں سے پہلے یہ عقیدہ رکھتے تھے، اس کے علاوہ یہ مطلب بھی قابل توجہ ہے کہ بت پرستی کا عقیدہ خود عربوں کی ایجاد نہیں بلکہ انہوں نے دوسروں سے لیا اور اسے اختیار کیا۔

بت پرستی کے حوالہ سے کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے کعبہ کی چھت پر بت رکھا اور لوگوں کو اس کی پوجا کی دعوت دی اس کا نام "عمر بن لُحی" تھا کہ جو شاپور ذوالاکتاف کے زمانہ حکومت میں رہتا تھا اور وہ مکہ میں اپنی قوم کا سردار تھا اور خانہ کعبہ کی حفاظتی اور انتظامی ذمہ داریاں بھی اس نے سنبھال رکھی تھیں، پھر اس نے ارض شام کے شہر "بلقاء" کا ایک سفر کیا اور وہاں دیکھا کہ لوگ بتوں کی پرستش کر رہے تھے، تو اس نے ان سے ان بتوں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ بت ہمارے ارباب (خدا) ہیں جنہیں ہم نے آسمانی شکلوں اور بشری صورتوں میں بنایا ہے، ہم ان سے مدد طلب کرتے ہیں تو یہ ہماری مدد کرتے ہیں اور ہم ان سے بارش طلب کرتے ہیں تو یہ ہمیں بارش سے نوازتے ہیں، عمر بن لُحی نے ان سے ایک بت

مانگا تو انہوں نے اسے ”ہبل“ نامی بت دے دیا، پھر وہ مکہ واپس آیا تو اس نے وہ بت خانہ کعبہ کی چھت پر رکھ دیا اور لوگوں کو اس کی پوجا کرنے کی دعوت دی، اس کے ساتھ دو بت ”اساف اور نائلہ“ میاں بیوی کی شکلوں میں تھے تو اس نے لوگوں کو ان کی پرستش کی دعوت دی اور کہا کہ ان کے ذریعے اللہ کا قرب طلب کریں (اس واقعہ کو کتاب ”المسلل والنحل اور تاریخ کی دیگر کتب میں ذکر کیا گیا ہے)، عجیب بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں حضرت نوحؑ کے تذکرہ میں عربوں کے چند بتوں کے نام ذکر کئے گئے ہیں اور حضرت نوحؑ کا اپنی قوم کے بارے میں شکوہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: خدایا! یہ لوگ کہتے ہیں کہ اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑو اور نہ ہی ”وذ“، ”سواع“، ”یعوث“، ”یعوق“ اور ”نسر“ کو چھوڑو، (وَقَالُوا لَا تَدْرُسُنَ إِلَهَتِكُمْ وَلَا تَدْرُسُنَّ وَذَاوَالسُّوَاعِ وَلَا يُعُوثُ وَيَعُوقُ وَنَسْرًا)..... سورۃ نوح، آیت ۲۳.....

اس کے علاوہ بت پرستی کے حوالہ سے یہ بات ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے کہ روم، یونان، مصر، شام اور ہندوستان کے بت پرست فلسطین اور اس کے اردگرد کے علاقوں میں رہنے والے اہل کتاب سے زیادہ نزدیک تھے جس کی وجہ سے ان کے عقائد و بی نظریات کا اہل کتاب تک پہنچنا نہایت آسان اور اس کے اسباب و وسائل نہایت فراوان تھے۔

یاد رہے کہ آیت مبارکہ میں جن کافروں کے عقائد و نظریات کی اندھی تقلید کرنے کے حوالہ سے اہل کتاب کے فرزندئ خدا کے عقیدہ کا تذکرہ ہوا ہے ان سے قدیم ہندوستان و چین کے بت پرستوں اور مغرب سے روم و یونان اور شمالی افریقہ کے بت پرستوں کے علاوہ کوئی دوسرا امر انہیں، جیسا کہ تاریخ بیان کرتی ہے کہ ان کے دینی عقائد و نظریات کی مثالیں یہود و نصاریٰ کے ہاں موجود عقائد و نظریات میں دکھائی دیتی ہیں مثلاً بیٹا ہونا، باپ ہونا، تثلیث اور سولی پر چڑھنا، فدیہ ہونا وغیرہ۔

تو یہ وہ تاریخی حقائق ہیں جن کی طرف قرآن مجید توجہ دلاتا ہے اور ان کے بارے میں بھرپور آگاہ کرتا ہے۔  
سابقہ آیات کی مانند اس حقیقت کا ثبوت درج ذیل آیت مبارکہ میں بھی پایا جاتا ہے:

سورۃ مائدہ، آیت: ۷۷

○ ”قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ“

(کہہ دو، اے اہل کتاب! تم اپنے دین میں ناحق غلو..... حد سے باہر نکلنا اور تجاوز..... سے کام نہ لو اور نہ ہی ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی کرو جو اس سے پہلے گمراہ ہو گئے اور کثیر لوگوں کو گمراہ کیا اور سیدھی راہ سے بھٹک گئے)

اس آیت مبارکہ میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ ان کا دین میں ناحق غلو و تجاوز اور حد سے بڑھ جانا ان لوگوں کی

اندھی تقلید اور ان کی خواہشوں کی پیروی کرنے کے باعث ہوا جو ان سے پہلے گمراہی کا شکار ہو چکے تھے، یہاں ”ان لوگوں“ سے ان کے احبار و علماء اور راہب حضرات مراد نہیں کیونکہ آیت کے الفاظ میں کوئی قید ذکر نہیں کی گئی بلکہ مطلق اور ہر طرح کی اضافی شرط سے خالی ہیں چنانچہ ”أَهُوَ آءَقْوَرٌ قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيرًا“ کہا گیا، اور جیسا کہ بیان ہو چکا ہے ان سے مراد زمانہ جاہلیت کے عرب بھی نہیں، اور ان لوگوں کی پہچان کر داتے ہوئے کہا گیا کہ انہوں نے کثیر افراد کو گمرا کر دیا (وَأَضَلُّوا كَثِيرًا) تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ لوگ ایسے گمراہ کرنے والے رہنما تھے جن کی تقلید و پیروی کی جاتی تھی جبکہ اس دور میں عربوں کی حالت یہ تھی کہ وہ نہایت پسماندہ و ان پڑھ تھے اور علم و تمدن اور ترقی سے بے بہرہ تھے تو کسی کا ان کی پیروی کرنا ناقابل تصور تھا جبکہ اس دور میں دوسری ترقی یافتہ و مہذب اقوام فارس، روم اور دیار ہند وغیرہ میں آباد تھیں۔

بنا بر این آیت مبارکہ میں ”قوم“ سے مراد مذکورہ بالا میں سے کوئی بھی نہیں سوائے چین و ہند اور مغرب میں رہنے والے بت پرستوں کے !

## ساتویں فصل:

### اہل کتاب کی طرف منسوب کتاب کون سی اور کیسی ہے؟

اگرچہ اہل کتاب کے تشخص و تعین سے مربوط روایت میں مجوس کو بھی ان میں شامل کیا گیا ہے کہ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی بھی خاص کتاب ہو یا ان آسمانی کتابوں میں سے کسی ایک سے ان کی نسبت ہو جن کا ذکر قرآن مجید نے کیا ہے مثلاً حضرت نوحؑ کی کتاب، حضرت ابراہیمؑ کے صحیفے، حضرت موسیٰؑ کی تورات، حضرت عیسیٰؑ کی انجیل، حضرت داؤدؑ کی زبور، لیکن قرآن مجید نے نہ تو مجوس کے بارے میں کوئی خاص تذکرہ کیا ہے اور نہ ہی ان سے مخصوص کسی کتاب کا ذکر کیا ہے، اور ان کے پاس جو کتاب ہے کہ جسے ”اوستا“ کہتے ہیں اس کا ذکر بھی نہیں ہوا اور نہ ہی ان کی کسی بھی کتاب کا تذکرہ ہوا ہے۔ اور قرآن مجید میں جہاں بھی لفظ ”اہل کتاب“ ذکر ہوا ہے اس سے مراد یہودی و نصرانی ہیں اور اس نسبت کی وجہ وہی کتاب ہے جو خداوند عالم نے ان میں نازل فرمائی۔

یہودیوں کے پاس جو مقدس کتب موجود ہیں ان کی تعداد ۳۵ ہے جن میں سے ایک تورات ہے جو حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی اور وہ پانچ اسفار پر مشتمل ہے (یعنی: سفر خلیقہ، سفر خروج، سفر احبار، سفر عدد، سفر استثناء)۔ ان میں سے کتب المورخین ہیں جن کی تعداد بارہ ہے:

(۱) یوشع کی کتاب

- (۲) بنی اسرائیل کے قاضیوں کی کتاب
- (۳) راعوث کی کتاب
- (۴) سموئیل کے اسفار میں سے پہلا حصہ
- (۵) سموئیل کے اسفار میں سے دوسرا حصہ
- (۶) اسفار الملوک سے پہلا حصہ
- (۷) اسفار الملوک سے دوسرا حصہ
- (۸) اخبار الایام کا پہلا حصہ
- (۹) اخبار الایام کا دوسرا حصہ
- (۱۰) عزرا کا پہلا سفر
- (۱۱) عزرا کا دوسرا سفر
- (۱۲) استیر کا سفر

اس کے علاوہ ان کی کتب میں سے ایک حضرت ایوبؑ کی کتاب ہے، اور حضرت داؤدؑ کی زبور اور حضرت سلیمانؑ

کی تین کتب ہیں:

- (۱) کتاب الامثال
  - (۲) کتاب الجامعہ
  - (۳) کتاب تسبیح التسبیح
- اس کے علاوہ کتب النبوات ہیں جن کی تعداد سترہ ہے:
- (۱) کتاب نبوت اشعیا
  - (۲) کتاب نبوت ارمیا
  - (۳) کتاب مراثی ارمیا
  - (۴) کتاب حزقیال
  - (۵) کتاب نبوت دانیال
  - (۶) کتاب نبوت یوشع
  - (۷) کتاب نبوت یوئیل



- (۸) کتاب نبوت عاموس
- (۹) کتاب نبوت عمویذیا
- (۱۰) کتاب نبوت یونان
- (۱۱) کتاب نبوت میخا
- (۱۲) کتاب نبوت ناحوم
- (۱۳) کتاب نبوت حقیوق
- (۱۴) کتاب نبوت صفوینیا
- (۱۵) کتاب نبوت حجی
- (۱۶) کتاب نبوت زکریا
- (۱۷) کتاب نبوت ملاخیا

مذکورہ بالا تمام کتب میں سے قرآن مجید میں صرف دو کتابوں کا ذکر آیا ہے:

(۱) حضرت موسیٰؑ پر نازل ہونے والی تورات،

(۲) حضرت داؤد پر نازل ہونے والی زبور۔

اور نصرانیوں کے پاس جو مقدس کتب موجود ہیں ان کی فہرست یہ ہے:

- (۱) انجیل متی
  - (۲) انجیل مرقس
  - (۳) انجیل لوقا
  - (۴) انجیل یوحنا
  - (۵) کتاب اعمال الرسل
  - (۶) کتاب روایئے یوحنا
- ان کے علاوہ درج ذیل چند رسائل ہیں:
- (۱) بولس کے چودہ رسالے
  - (۲) یعقوب کارسالہ
  - (۳) بطرس کے دور رسالے

(۴) یوحنا کے تین رسالے

(۵) یہود کا رسالہ

مذکورہ بالا تمام کتب و رسالے میں سے قرآن مجید نے کسی کا بالخصوص ذکر نہیں کیا البتہ صرف یہی تذکرہ کیا ہے کہ ایک آسمانی کتاب جسے خداوند عالم نے حضرت عیسیٰؑ پر نازل فرمایا اس کا نام ”انجیل“ ہے، اور وہ چار انجیلیں نہیں بلکہ صرف ایک انجیل ہے، لیکن نصاریٰ نہ تو اسے جانتے و پہچانتے ہیں اور نہ ہی اسے مانتے ہیں البتہ ان کے بزرگوں کے بیانات و اظہارات کے اشاراتی حوالوں میں اس بات کا اعتراف دکھائی دیتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے پاس ایک کتاب تھی جس کا نام انجیل تھا، چنانچہ اہل غلطیہ کے نام بولس کے ایک خط میں اس طرح مرقوم ہے کہ: مجھے تعجب ہے کہ تم اتنی جلدی حضرت مسیحؑ کی نعمت سے روگردانی کر کے دوسری انجیل کو اپنا چلکے ہو جبکہ وہ حقیقی انجیل نہیں البتہ کچھ لوگ جبراً اسے تم پر ٹھونسا چاہتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ وہ اصل انجیل میں رد و بدل کر دیں یعنی تحریف کریں،

اس کے علاوہ نجار نے نقص الانبیاء میں بولس کے مذکورہ بالا خط اور اس کے دیگر خطوط کے اقتباسات کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ ان چار معروف انجیلوں کے علاوہ ایک انجیل تھی جسے انجیل المسیح کہا جاتا تھا۔  
تاہم قرآن مجید اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ حقیقی تورات کا کچھ حصہ یہودیوں کے پاس موجود ہے اور اسی طرح حقیقی انجیل کا بعض حصہ نصرانیوں کے پاس موجود ہے چنانچہ ارشاد الہی ہے:

سورہ مائدہ، آیت: ۴۳

○ ” وَكَيْفَ يُحْكُمُونَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرَةُ فِيهَا حُكْمُ اللَّهِ“

(اور وہ کیوں کرتے حکم پر سر تسلیم خم کرتے حالانکہ ان کے پاس تورات ہے جس میں خدا کا حکم موجود ہے)

سورہ مائدہ، آیت: ۱۳

○ ” وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصْرَىٰ أَخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ فَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ“

(اور ان میں سے جنہوں نے کہا ہم نصاریٰ ہیں، ہم نے عہد و پیمانے لے لیا پھر انہوں نے اس میں سے کہ جس

کی انہیں یاد دہانی کروائی گئی کچھ حصہ بھلا دیا)

ان آیات کی ہمارے مقصود و مطلوب پر دلالت ظاہر و واضح ہے۔

## ایک تاریخی بحث

اس بحث میں دو حوالوں سے مطالب ذکر کئے جائیں گے، ایک موجودہ تورات کے بارے میں اور دوسرا حضرت مسیح اور انجیل کے بارے میں !

### ۱۔ موجودہ تورات کا تذکرہ

بنی اسرائیل جو کہ آل یعقوب کے نواسے و پوتے ہیں وہ پہلے صحرائین، دیہاتی، بد وقتا کی طرح زندگی بسر کرتے تھے، پھر فرعون مصر نے انہیں شہروں میں منتقل کر دیا اور ان کے ساتھ قیدی غلاموں جیسا برتاؤ کرتے تھے، بالآخر خداوند عالم نے انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے فرعون اور اس کے بدترین غیر انسانی سلوک سے نجات بخشی۔

وہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں اپنے امام یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد ان کے جانشین حضرت یوشع کی ہدایت و رہنمائی کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے، پھر ایک عرصہ تک ان کی باگ ڈور اور تدبیر امور اس دور کے قاضیوں مثلاً ایہود اور جدعون وغیرہ کے ہاتھوں میں رہی، اس کے بعد ان پر سلطنتی نظام حکومت قائم ہو گیا، اور ان کا پہلا بادشاہ ”شاؤل“ تھا کہ جسے قرآن مجید نے ”طالوت“ کے نام سے موسوم کیا ہے، طالوت کے بعد داؤد اور پھر سلیمان نے تخت سلطنت سنبھالا۔

پھر مملکت تقسیم ہو گئی اور اقتدار کی مرکزیت ٹوٹ پھوٹ سے دو چار ہو گئی لیکن اس سب کچھ کے باوجود ان میں کثیر بادشاہوں نے حکمرانی کی مثلاً رحجام، ایام، یرجام، یہوشافا، یہورام اور ان کے علاوہ تیس سے زیادہ بادشاہ آئے، مگر مملکت کی تقسیم اور ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے بعد ان کی طاقت میں کمی کارحجان جوں کا توں رہا اور پھر صورتحال یہ ہو گئی کہ بائبل کے بادشاہوں نے ان پر غلبہ پالیا اور وہ اور وہاں شہنشاہ کی حیثیت کے طور پر قبضہ میں لے لیا، اور یہ تقریباً چھ سو سال قبل از مسیح کی بات ہے، اسی دوران ”بخت نصر“ (ہنوکلنصر) نے بائبل کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی، پھر جب یہودیوں نے اس کی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو اس نے ان کی سرکوبی کے لئے اپنی فوج بھیج دی جس نے انہیں گھیرے میں لے کر ان کے علاقہ کو فتح کر لیا، اور ان کے سلطنتی خزانوں سمیت خزان الہیکل (مسجد اقصیٰ) کی لوٹ مار کی، اور ان کے

ثروت مندوں، طاقتوروں اور صنعت گروں میں تقریباً دس ہزار افراد کو یرغمال بنا کر اپنے ساتھ بابل لے گئے، یہاں تک کہ اس سرزمین پر چند کمزور و ناتواں اور نادار لوگوں کے سوا کوئی باقی نہ رہا، بخت نصر نے ”صدقیا“ نامی شخص کو اپنی نمائندگی و نیابت میں وہاں کا بادشاہ مقرر کر دیا جو کہ بنی اسرائیل کا آخری بادشاہ تھا اور اس کو بادشاہ بنانے میں یہ شرط رکھ دی کہ وہ اس (بخت نصر) کے تابع فرمان رہے گا۔

”صدقیا“ تقریباً دس سال تک اسی طرح بادشاہ رہا، اس دوران اس نے اپنے پاؤں مضبوط کر لئے اور اپنا اقتدار مضبوط و مستحکم دیکھتے ہی فراغتِ مصر میں سے ایک حکمران سے روابط قائم کر کے بخت نصر سے بغاوت کا اعلان کر دیا اور اس کے حکم و فرمان کی اطاعت و پیروی سے انکار کر دیا، اس پر بخت نصر شدید غصہ میں آیا اور اس نے کئی فوجی دستے ان کی طرف روانہ کر دیئے جنہوں نے ان کے تمام علاقوں کا محاصرہ کر لیا، ”صدقیا“ کے عوام نے قلعوں میں پناہ لی اور وہ ڈیڑھ برس تک انہی قلعوں میں پھنس کر رہے گئے جس کے نتیجے میں قحط اور گونا گوں بیماریوں کا شکار ہو گئے، بخت نصر اپنے موقف پر ڈٹا رہا اور اس نے محاصرہ برقرار رکھا بالآخر اس نے ان کے تمام قلعوں کو فتح کر لیا اور ان پر قابو پالیا، یہ واقعہ میلاد مسیح سے پانچ سو چھیاسی برس پہلے ہوا، بخت نصر نے ان کے قتل عام کا حکم دے دیا چنانچہ ان کے خون کی ہولی کھیلی گئی اور ان کے گھروں کو مسمار کر دیا گیا یہاں تک کہ خانہ خدا کو بھی خاک سے یکساں کر دیا گیا، بخت نصر کے سپاہیوں نے وہاں ہر طرح کی دینی علامات و نشانی کو توڑ کر دیا اور ان کے ہیکل و عبادت گاہ کو ٹٹی کے ٹیلے میں تبدیل کر دیا، ان خونخوئی و وحشت ناک کاروائیوں میں تورات اور وہ صندوق کہ جس میں تورات رکھی ہوئی تھی ضائع ہو گئی یہاں تک کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

یہ صورت حال کم و بیش پچاس برس تک جوں کی توں رہی، اور جو لوگ بابل میں باقی رہ گئے تھے ان کے پاس نہ تو ان کی آسمانی کتاب سے کچھ باقی تھا اور نہ ہی ان کی عبادت گاہ اور ملک و دیار سے کچھ بچا تھا بلکہ وہ سب کچھ مٹی کے ٹیلے میں بدل چکا تھا۔

پھر جب فارس کے بادشاہوں میں سے ”کورش“ تخت نشین ہوا اور اس نے بابل کے لوگوں سے جو سلوک کیا سو کیا کہ بالآخر اس نے بابل کو فتح کر لیا اور بابل میں داخل ہو گیا، اس نے بابل میں موجود بنی اسرائیلی قیدیوں کو رہا کر دیا، اور اپنے مقرب بارگاہ افراد میں سے مشہور و معروف شخص کو جس کا نام ”عزرا“ تھا اسرائیلیوں پر حاکم مقرر کر دیا اور اسے اجازت دی کہ ان کے لئے تورات لکھوائے اور ”ہیکل“ کو دوبارہ تعمیر کرے اور انہیں ان کی سابقہ زندگی کی طرف لوٹا دے، چنانچہ عزرا نے چار سو ستاون قبل از مسیح میں بنی اسرائیل کو بیت المقدس واپس بھیج دیا اور پھر اس نے کتب عہد عتیق کی جمع آوری و تصحیح کا کام انجام دیا اور یہ وہی تورات ہے جو آج یہودیوں کے پاس موجود درج ہے۔

(یہ تفصیلات ”قاموس کتاب مقدس“ مؤلفہ مسٹر ہاکس امریکی ہمدانی، اور دیگر کتب تاریخ سے ماخوذ ہیں)

قارئین کرام! مذکورہ بالا تفصیلات پر غور کرنے سے آپ بخوبی اس حقیقت سے آگاہ ہو سکتے ہیں کہ موجودہ تورات جو کہ اس وقت یہودیوں کے پاس ہے اس کا سلسلہ سند حضرت موسیٰ علیہ السلام تک نہیں پہنچتا اور پچاس برس تک اس کا سلسلہ سند حضرت موسیٰ سے منقطع رہا اور پھر صرف ایک شخص تک منتہی ہوا جس کا نام ”عزرا“ ہے کہ جس کے بارے میں پانچ حوالوں سے سوالات جنم لیتے ہیں:

(۱) اس شخص کی ذاتی پہچان ہی نہیں ہو سکی..... کہ وہ کون ہے؟.....

(۲) اس کا تورات کے بارے میں علم و آگاہی اور اس حوالہ سے اس کی علمی منزلت و فکری مقام واضح نہیں۔

(۳) اس کی علمی امانتداری ہمارے لئے مجہول ہے۔

(۴) اس نے اسفار تورات کے نام سے جو کچھ اکٹھا کیا اس کا ماخذ کیا ہے؟ (اس نے یہ سب کچھ کہاں سے

حاصل کیا؟)

(۵) تصحیح کے عمل میں اس نے کس معیار کو اختیار کیا؟

ان پانچ حوالوں سے جنم لینے والے سوالات کی وجہ سے موجودہ تورات کی اعتباری حیثیت مخدوش و مشکوک ہو جاتی

ہے۔

یہ ناگوار سانحہ ایک ناگوار اثر کا باعث بنا اور وہ یہ کہ مغرب کے متعدد تاریخ نگاروں و محققین نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وجود ہی کا انکار کر دیا اور آجنا پاور آپ سے تعلق رکھنے والے امور کے بارے میں صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ایک فرضی و خیالی شخص ہے اس کا حقیقی وجود نہیں، اور یہ اسی طرح ہے جیسے اس سے پہلے اسی طرح کے اظہارات انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کئے، لیکن کوئی مسلمان اس قسم کی باتوں کو قرین صحت نہیں مان سکتا کیونکہ قرآن مجید نے آجنا پاور کے حقیقی وجود کا ذکر نہایت صراحت کے ساتھ کیا ہے اور واضح الفاظ میں ان کے بارے میں مطالب ذکر کئے ہیں۔

## (۲) مسیح اور انجیل کی تاریخی حیثیت

یہودی اپنی قومی تاریخ اور اپنے ماضی کے حالات و واقعات کو محفوظ کرنے کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اس سلسلہ میں انہوں نے بھرپور عملی اقدامات اٹھائے ہیں، لیکن اس کے باوجود اگر آپ ان کی تمام دینی کتب اور مذہبی نگارشات کا بغور جائزہ لیں تو آپ کو کہیں بھی حضرت عیسیٰ بن مریم علیہا السلام کا نام دکھائی نہیں دے گا۔ نہ تو ان کی اولاد کی کیفیت کے

بارے میں اور نہ ہی ان کے بطور نبی ظہور پذیر ہونے اور لوگوں کو اپنی پیروی کی دعوت دینے کے بارے میں، نہ ہی ان کی سیرت اور ان معجزات کے بارے میں جو خداوند عالم نے ان کے دست مبارک پر ظاہر فرمائے اور نہ ہی ان کی زندگی ختم ہونے کے بارے میں، کہ آیا وہ طبعی موت سے دنیا سے گئے یا انہیں قتل کر دیا گیا یا سولی پر لٹکا یا گیا؟ ان امور میں سے کسی بھی مطلب کا کوئی حوالہ ان کی کتابوں و تحریروں میں آپ کو نہیں ملے گا، اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کا کیا سبب ہے؟ کیا وجہ ہے کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حالات سے آگاہ و باخبر نہیں؟ یا باخبر ہونے کے باوجود انہوں نے ان کے حالات پر پردہ کیوں ڈالا؟

قرآن مجید ان کے بارے میں بیان کرتا ہے کہ انہوں نے حضرت مریمؑ کو قذف کیا..... ان پر برائی (زنا) کی تہمت لگائی..... اور حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کے حوالہ سے ان پر بہتان تراشی کی، اور انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو قتل کرنے کا دعویٰ بھی کیا، چنانچہ ان کے بارے میں خداوند عالم نے اس طرح بیان کیا:

سورہ نساء، آیت: ۷۵

○ "وَبِكْفَرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلَىٰ مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا ﴿٧٥﴾ وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَىٰ

ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ ۗ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا

فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ ۗ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۗ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ۗ"

(اور ان کے کفر کی وجہ سے، اور یہ کہ انہوں نے مریم پر بہت بڑا بہتان لگایا، اور یہ کہ انہوں نے کہا: ہم نے اللہ کے رسول مسیح عیسیٰ بن مریم کو قتل کیا ہے حالانکہ انہوں نے اسے قتل نہیں کیا، اور نہ ہی اسے سولی پر چڑھایا، بلکہ ان کے لئے اس کا شبیہ بنا دیا گیا..... اس کی بابت حقیقت حال ان پر واضح نہ ہو سکی.....، جن لوگوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا وہ اس کی بابت شک میں ہیں، وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، وہ صرف گمان ہی گمان کرتے ہیں، وہ انہیں قتل کرنے میں کوئی یقین نہیں رکھتے۔ انہوں نے اسے یقیناً قتل نہیں کیا۔)

اس صریح و واضح قرآنی بیان کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ وہ کس بناء پر حضرت مسیحؑ کو قتل کر دینے کے دعویدار ہیں جبکہ ان کی کتب میں بھی اس حوالہ سے کوئی بات مذکور نہیں، تو کیا اس کی بنیاد ان کے درمیان مشہور قومی واقعات تو نہیں جن کا وہ آپس میں تذکرہ کرتے رہتے تھے؟ کیونکہ وہ واقعات سنے سنائے ہی ہوتے تھے کہ جن کا ذکر کسی کتاب میں نہیں ہوا کہ جس طرح ایسی کہانیاں و قصے ہر قوم کے درمیان مشہور ہوتے ہیں کہ جب تک ان کے بارے میں ٹھوس ثبوت اور صحیح حوالہ نہ ملے ان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے یہ سب باتیں حضرت مسیحؑ کے حیر و کاروں (نصارئیں) سے بار بار سنی ہوں کیونکہ وہ لوگ آنجنابؑ کی ولادت، ظہور اور دعوت کا تذکرہ کرتے رہتے تھے، پھر انہوں نے ان کی باتیں سن کر

حضرت مریمؑ پر الزام تراشی کی ہو اور حضرت مسیحؑ کے قتل کا دعویٰ کر دیا ہو! تو اس حوالہ سے کوئی بات واضح نہیں ہو سکی سوائے اس کے کہ قرآن مجید نے..... جیسا کہ سابق الذکر آیت مبارکہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے..... صریح لفظوں میں ان سے منسوب اس دعویٰ کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم نے مسیح کو قتل کیا ہے، البتہ ان کے سولی پر چڑھانے کی بات بھی نہیں ہوئی، اور قرآن یہ بھی بیان کرتا ہے کہ وہ لوگ اس کے بارے میں شک میں ہیں اور ان کے بارے میں اختلاف رائے رکھتے ہیں!

اور جہاں تک حضرت مسیحؑ، انجیل اور بشارت کے حوالہ سے نصاریٰ کے ہاں مسلم الثبوت مطالب و حقائق کا تعلق ہے تو وہ یہ ہے کہ ان کے پاس حضرت مسیحؑ اور ان سے تعلق رکھنے والے امور و مطالب کی بابت جو کچھ موجود ہے اس کا مدرک و ماخذ ان کے ہاں موجود کتب مقدسہ ہیں یعنی چار انجیلیں..... انجیل متی، انجیل مرقس، انجیل لوقا، انجیل یوحنا..... کتاب اعمال الرسل کہ جسے لوقا نے لکھا، اور بولس، بطرس، یعقوب، یوحنا اور یہوذا کے لکھے ہوئے چند رسائل کہ جن کی اعتباری حیثیت کی طرف ہے، لہذا ضروری ہے کہ ان چار انجیلوں کے بارے میں کچھ جانیں:

### (۱) انجیل متی:

تصنیف اور نشر ہونے کے حوالہ سے انجیلوں میں سے یہ سب سے قدیمی انجیل ہے کہ بعض مسیحی مورخین نے کہا ہے کہ ۶۰ تا ۷۰ء کے درمیان لکھی گئی ہے۔ (ملاحظہ ہو کتاب قاموس الكتاب المقدس، مؤلفہ مسٹر ہاکس، لفظ ”متی“ کے ذیل میں!)۔ بہر حال وہ حضرت مسیحؑ کے بعد لکھی گئی۔

انجیل متی کے حوالہ سے تمام قدیم و جدید مسیحی محققین نے لکھا ہے کہ وہ اصل میں عبرانی زبان میں لکھی گئی، پھر یونانی و دیگر زبانوں میں اس کا ترجمہ کر دیا گیا، اور جہاں تک اس کے اصل عبرانی نسخہ کا تعلق ہے تو وہ اب مفقود و نایاب ہے اور جو تراجم اس وقت موجود ہیں وہ مجہول الحال ہیں اور ان کے مترجمین کے بارے میں بھی معلوم نہیں کہ وہ کون تھے؟ (ملاحظہ ہو: کتاب میزان الحق، کتاب قاموس الكتاب المقدس میں بھی اس حوالہ سے احتمال موجود ہے)

### (۲) انجیل مرقس:

مرقس دراصل بطرس کا شاگرد تھا اور وہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں میں سے نہیں تھا، اس کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس نے اپنی انجیل بطرس کے کہنے بلکہ اسی کے حکم پر لکھی، اور وہ حضرت مسیحؑ کو خدا نہیں سمجھتا تھا (یہ بات عبد الوہاب نجار سے منقول ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب قصص الانبیاء میں اسے لکھا ہے اور ان کا مدرک و ماخذ بطرت قرمانج کی کتاب مروج

الاخبار فی تراجم الاخبار ہے) اسی بناء پر بعض حضرات نے لکھا ہے کہ مرس نے اپنی انجیل قبائلیوں اور دیہاتیوں کے لئے لکھی چنانچہ اس نے اس میں حضرت مسیحؑ کو خدا کا بھیجا ہوا رسول اور شرايع خداوندی کے مبلغ کے طور پر چھو ایا (کتاب قاموس الکتب المقدس میں لکھا ہے کہ اہل علم و ارباب تحقیق نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ مرس نے اپنی انجیل کو رومی زبان میں لکھا اور وہ بطرس اور بولس کی وفات کے بعد منظر عام پر آئی، لیکن یہ بات کوئی زیادہ درست نہیں کیونکہ اس کی انجیل سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اسے قبائلیوں اور دیہاتیوں کے لئے لکھا نہ کہ شہریوں اور بالخصوص رومیوں کے لئے!)۔ اب آپ خود اس کے بیان پر غور کریں۔

### (۳) انجیل لوقا:

لوقا بھی حضرت مسیحؑ کے حواریوں سے نہ تھا اور نہ ہی اس نے آنجنابؑ کو دیکھا، بلکہ اس نے نصرانیت کا مسلک بولس سے حاصل کیا حالانکہ بولس ایک نہایت متعصب یہودی تھا اور نصرانیت کے سخت خلاف تھا، وہ مسیحؑ پر ایمان لانے والوں کو اذیت و آزار کا نشانہ بناتا تھا اور مطالب کو ان کے سامنے توڑ مروڑ کر بیان کرتا تھا، ناگاہ اس نے پلٹا کھایا اور اس بات کا دعویٰ کرنے لگا کہ اس پر غشی طاری ہو گئی تھی اور عالم غشی میں حضرت مسیحؑ نے اسے چھوا..... ان سے ملاقات ہوئی..... تو انہوں نے اسے اپنے پیروکاروں کو اذیت و آزار کا نشانہ بنانے پر سخت لہجہ میں مورد مذمت و ملامت قرار دیا، اسی حال میں وہ حضرت مسیحؑ پر ایمان لایا اور آنجنابؑ نے اسے حکم دیا کہ وہ لوگوں کو اس کی انجیل کی بشارت دے۔

اور اسی بولس نے موجودہ نصرانیت کی بنیادیں مضبوط کیں اور وہ اب جس صورت میں ہے یہ بولس ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے (ملاحظہ ہو: کتاب ”قاموس الکتب المقدس، لفظ بولس) چنانچہ اس نے اپنی تعلیمات کی بنیاد ہی یہ قرار دی کہ نجات حاصل کرنے کے لئے حضرت مسیحؑ پر ایمان لانا ہی کافی ہے اور اس کے لئے کسی عمل کی ضرورت نہیں، اس نے مردار اور خنزیر کا گوشت کھانا بھی مسیحیوں کے لئے حلال کر دیا، اور ختنہ و دیگر عملی فرائض جو تورات میں مذکور ہیں سب حرام کر دیئے (ملاحظہ ہو: کتاب اعمال الرسل، اور بولس کے رسائل) حالانکہ انجیل تو تورات کی تصدیق کرنے کے لئے نازل ہوئی تھی اور اس نے صرف چند چیزوں کو حلال کیا،

خلاصہ کلام یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس لئے تشریف لائے تاکہ تورات کے احکام و دستورات کو عملی طور پر نافذ و قائم کریں اور مقدس کتاب الہی سے روگردانی اور اس کی نافرمانی کرنے والوں کو دوبارہ اس کی طرف لوٹادیں نہ یہ کہ عمل کو غیر ضروری قرار دے کر صرف ایمان لانے کو سعادت و خوش بختی کا ضامن بنائیں۔



بہر حال لوقا نے اپنی انجیل، مرقس کی انجیل کے بعد لکھی کہ اس وقت بطرس اور بولس وفات پا چکے تھے، متعدد مسیحی دانشوروں نے صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ لوقا کی انجیل دوسری انجیلوں کی الہامی کتاب نہیں جیسا کہ اس کی انجیل کے ابتدائی صفحات میں درج مطالب سے بھی اس کے الہامی کتاب نہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے، (اس نے اس میں کہا ہے: چونکہ اکثر لوگوں نے ان واقعات کو غلط رنگ دے دیا جن کے بارے میں ہم بخوبی آگاہ ہیں اور ہمارے پاس جو معلومات ہیں وہ ہم نے اپنے ان پہلے لوگوں سے حاصل کیں جنہوں نے ان واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور وہ دین مسیحیت کے خد متکار تھے لہذا اس نے مناسب سمجھا کہ ان واقعات پر ایک کتاب لکھوں کیونکہ میں نے ہر چیز پر نہایت تحقیق کی اور بخوبی چھان بین کر کے اسے دیکھا، تو اے محترم ہاؤنڈیل! میں اپنی کاوش آپ کو پیش کرتا ہوں)۔ اس بیان سے واضح طور پر ظاہر و ثابت ہوتا ہے کہ وہ کتاب لوقا کے اپنے نظریات کا مجموعہ ہے الہامی کتاب نہیں ہے اور یہی بات مسٹر کدل کی کتاب رسالۃ الالہام میں بھی مذکور ہے، اور جیروم نے بھی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ہمارے متقدمین نے انجیل لوقا کے پہلے دو ابواب کو شک کی نگاہ سے دیکھا ہے کیونکہ وہ دو ابواب فرقہ ماریونی کے پاس انجیل لوقا کا جو نسخہ موجود ہے اس میں شامل نہیں، اور اکہارن نے بھی اپنی کتاب کے صفحہ ۹۵ پر یقین کے ساتھ اس مطلب کو لکھا ہے کہ انجیل لوقا کے صفحہ ۴۳ تا ۷۳ پر جو کہ اس کے باب ۲۲ سے مربوط ہیں مذکورہ مطالب اضافہ اور بعد میں شامل کئے گئے ہیں، اور اکہارن ہی نے اپنی کتاب کے صفحہ ۶۱ پر لکھا ہے کہ لوقا نے اپنی انجیل میں جو معجزات درج کئے ہیں ان میں حقیقت و بناوٹ اور سچ و جھوٹ کو اس طرح مخلوط کر دیا ہے کہ اس میں واقع الامر کے اظہار و بیان کی بجائے شاعرانہ انداز زیادہ پایا جاتا ہے اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے؟ اور کلی میٹیس کا کہنا ہے کہ انجیل مٹی اور انجیل مرقس میں تحریر کے حوالہ سے فرق ہے اور اگر کسی مقام پر ان دونوں میں ایک ہی مطلب بیان کیا گیا ہو تو ان دونوں میں مذکور مطلب کو انجیل لوقا میں مذکور مطلب پر ترجیح دی جائے گی

(ملاحظہ ہو کتاب قصص الانبیاء، مولفہ عبد الوہاب تجار، صفحہ ۷۷ تا ۷۹)

### (۴) انجیل یوحنا :

یوحنا کے بارے میں اکثر نصرانیوں نے کہا ہے کہ یہ وہی یوحنا بن زبدي الصیاد ہے جو حضرت مسیح کے ان بارہ شاگردوں میں سے ایک ہے جنہیں ”حواری“ کہا جاتا ہے اور یہی وہ ہے جو حضرت مسیح کو اپنے تمام شاگردوں میں سے سب سے زیادہ محبوب و عزیز تھا، (ملاحظہ ہو: قاموس الکتب المقدس، مادہ ”یوحنا“)

یوحنا کی انجیل کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے کہ ”شیرینطوس“ اور ”امیسون“ اور ان کے ہم نوا ساتھیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت مسیح ایک انسان ہیں کہ جنہیں خلق کیا گیا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ اپنی والدہ سے پہلے موجود نہ تھے بلکہ اپنی

والدہ کے بطن سے پیدا ہوئے، چنانچہ اسی عقیدہ کی بناء پر ایشیا کے مسیحی علماء (اسقف) اور ان کے علاوہ دیگر اکابرین ۹۶ء میں یوحنا کے پاس اکٹھے ہوئے اور اس سے درخواست کی کہ ان کے لئے انجیل لکھیں اور اس میں ایسے مطالب درج کریں جو دوسروں نے اپنی انجیلوں میں نہ لکھے ہوں اور مخصوص انداز میں اور ہر طرح کے ابہام سے خالی اسلوب کے ساتھ حضرت مسیحؑ کی وجودی ماہیت کو بیان کریں، چنانچہ یوحنا ان کی درخواست کو رد نہ کر سکا اور اس نے ان کی خواہش کے مطابق انجیل لکھی، (ملاحظہ ہو: کتاب قصص الانبیاء، بحوالہ جرس زوین الطحوی اللبثانی)

البتہ انجیل یوحنا کی تالیف کی بابت مورخین کے اقوال مختلف ہیں، بعض نے ۶۵ء، بعض نے ۹۶ء اور بعض نے ۹۸ء لکھا ہے۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ انجیل اس یوحنا کی لکھی ہوئی نہیں جو حضرت مسیحؑ کا شاگرد تھا۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ وہ مدرسہ اسکندریہ کے ایک طالب علم کی تالیف ہے (یہ مطالب کیتھولک ہرالڈ کی کتاب کی ساتویں جلد کے صفحہ ۲۰۵ مطبوعہ ۱۸۴۴ء سے لئے گئے ہیں اور اس نے اسٹادلن سے اخذ کئے ہیں) (کتاب قصص الانبیاء)، (کتاب قاموس الکتب المقدس میں مادہ یوحنا میں بھی ان مطالب کی طرف اشارہ ہوا ہے)، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ ساری انجیل اور اسی طرح وہ رسائل جو یوحنا کی طرف منسوب ہیں ان میں سے کوئی بھی یوحنا کی تالیف نہیں بلکہ دوسری صدی کے شروع میں بعض مسیحیوں نے لکھے اور ان کی نسبت یوحنا کی طرف دے دی تاکہ ان کی اعتباری حیثیت قائم ہو اور لوگ ان کا احترام کریں، (منقول از برٹھفیدر، بحوالہ کتاب الفاروق جلد اول،..... قصص الانبیاء.....)

بعض مسیحی دانشوروں نے لکھا ہے کہ انجیل یوحنا اصل میں بیس ابواب پر مشتمل تھی، پھر یوحنا کی وفات کے بعد افاس کے کلیسا نے اپنی طرف سے اس میں اکیسواں باب شامل کر دیا (سابقہ حوالہ)۔

تو یہ ہے ان چار انجیلوں کی تاریخ! اگر ہم چاہیں کہ ان انجیلوں کے سلسلہء اسناد سے آگاہ ہوں تو ان میں سے قدر متیقن افراد کا تعین کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام انجیلوں کا سلسلہء سند درج ذیل سات افراد تک پہنچتا ہے:

(۱) متی

(۲) مرقس

(۳) لوقا

(۴) یوحنا

(۵) بطرس

(۶) بولس

(۷) یہود

ان تمام حضرات نے مذکورہ بالا چار انجیلوں ہی کو مورد اعتماد قرار دیا اور ان چار انجیلوں میں سب سے زیادہ قائل اعتماد بلکہ مرکزی حیثیت ان میں سے سب سے مقدم انجیل ہے جو کہ انجیل متی ہے کہ جس کے بارے میں بیان ہو چکا ہے کہ اس کا اصل نسخہ مفقود ہو چکا ہے اور جو ترجمہ شدہ انجیل متی اس وقت موجود ہے اس کے مترجم کا تعین نہیں ہو سکا کہ جس کی بناء پر اس کی اعتباری حیثیت واضح ہو، کیونکہ جب تک مترجم کے بارے میں معلوم نہ ہو تو یہ کہنا بھی مشکل ہوگا کہ وہ حضرت مسیح کو خدا کا رسول سمجھتا تھا یا ان کی خدائی کا قائل تھا؟ ان ترجمہ شدہ انجیلوں میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص ظہور پذیر ہوا کہ جس کا نام عیسیٰ بن یوسف النجار تھا، اس نے لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دی، اور وہ دعویٰ کرتا تھا کہ وہ خدا کا بیٹا ہے اور کسی بشری باپ سے پیدا نہیں ہوا اور اسے اس کے باپ نے اسے بھیجا ہے تاکہ خود سولی پر چڑھ کر اور قتل ہو کر لوگوں کے گناہوں کو فدیہ بنے، اور اس نے مردوں کو زندہ کیا، مادرزاد نابینا اور برص کے مریض کو تندرست کیا اور جن زدہ لوگوں کو ان کے ابدان سے جنات کو نکال کر شفا یاب کر دیا، اور اس کے بارہ شاگرد تھے کہ جن میں سے ایک ”متی“ تھا جس نے انجیل لکھی، اور خدا نے انہیں برکت دی اور انہیں دین مسیحیت کی تبلیغ کے لئے بھیجا۔ الخ،

تویہ ہے دین مسیحیت کا تاریخی پس منظر اور روئے زمین پر مشرق و مغرب میں ان کے کرد و فری کا داستان کا خلاصہ، جس کے تمام تراصول و فروع کا محور ایک ہی شخص ہے جو مجہول الحال اور بے نام و نشان ہے اور اس کی کوئی صفت و اثر معلوم نہیں۔

اسی نہایت کمزور و بے بنیاد پس منظر کا نتیجہ ہے کہ یورپ کے بعض آزاد خیال دانشوروں نے یہ راگ الاپا کہ عیسیٰ بن مریم ایک خیالی و فرضی شخص کا نام ہے جسے بعض دین پرست نما لوگوں نے حکومت ہائے وقت کے خلاف یا ان کی حمایت میں عوام الناس کو جوش دلانے کی غرض سے گھڑ لیا ہے اور انہیں اس کا حقیقی وجود باور کرانے کی کوشش کی، اسی سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ بھی تاریخ میں موجود ہے کہ خرافی عقائد کے حوالہ سے دونوں کامل شباهت رکھتے ہیں اور وہ ہے ”کرشنا“ کا مسئلہ، کہ جس کے بارے میں قدیم ہندو بت پرست دعویٰ کرتے تھے کہ وہ خدا کا بیٹا ہے اور خدا کے حامل لاہوت سے نازل ہوا اور اس نے اپنے آپ کو سولی پر چڑھا کر لوگوں پر فدیہ بنایا تاکہ ان کے گناہوں و خطاؤں سے انہیں نجات بخشے، یعنی یہی باتیں حضرت عیسیٰ کے بارے میں مسیحی حضرات کرتے ہیں کہ اس کی تفصیلات عنقریب ذکر کی جائیں گی انشاء اللہ،

انہی خرافاتی بیانات و نظریات کے باعث بعض نقاد دانشوروں کو جرأت ہوئی کہ وہ کہیں کہ دنیا میں دو مسیح آئے:

ایک وہ مسیح جسے سولی پر نہیں چڑھایا گیا اور دوسرا وہ مسیح جسے سولی پر چڑھایا گیا اور ان دونوں کے درمیان پچاس صدیوں سے زائد عرصہ گزرا۔

جبکہ میلادی عیسوی تاریخ کا آغاز جو کہ ہمارے موجودہ سال (۱۹۵۶)..... اس کتاب (المیزان) کی تالیف کا سال..... کی بنیاد ہے وہ ان دو مسیحوں میں سے کسی ایک کے زمانہ ظہور سے مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ جس مسیح کو سولی پر نہیں چڑھایا گیا وہ دوسو پچاس برس اس سے پہلے تھا اور وہ تقریباً ساٹھ سال زندہ رہا، اور دوسرا مسیح کہ جسے سولی پر چڑھایا گیا وہ اس عیسوی میلادی تاریخ کے آغاز کے دو سو نوے برس بعد ظہور پذیر ہوا اور وہ ۳۳ برس زندہ رہا، (ملاحظہ ہو: زعمیم فاضل ”بہروز“ کی تازہ ترین تصنیف جو انہوں نے بشارات نبویہ کے موضوع پر لکھی کہ اس سے اقتباسات، سورۃ نساء کی آخری آیات کی تفسیر میں پیش کرنے کی کوشش کریں گے) تاہم جو بات قدر متیقن ہے وہ یہ کہ مسیحیت کی تاریخ میں درستی نہیں پائی جاتی، بلکہ اس کی عدم صحت کے بارے میں خود مسیحیوں نے بھی کہا ہے کہ میلادی تاریخ حضرت مسیحؑ کے روز ولادت سے مطابقت نہیں رکھتی، ان کا یہ اعتراف تاریخ کی حرکت رک جانے کا کھلا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

اس کے علاوہ کئی دیگر امور بھی ہیں جن کی وجہ سے مسیحیوں کی انجیلوں کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہوئے ہیں مثلاً: وہ کہتے ہیں کہ میلادی مسیح کی پہلی دو صدیوں میں متعدد انجیلیں لکھی گئیں جن کی تعداد ایک سو سے زیادہ تک بتائی جاتی ہے کہ مشہور چار انجیلیں بھی انہی میں سے ہیں، لیکن کلیسا نے ان تمام انجیلوں میں سے صرف مشہور چار انجیلوں کو قابل اعتماد قرار دیا اور ان کے علاوہ باقی سب کو ممنوع کر دیا، ان چار انجیلوں کو اس لئے قانونی حیثیت دی گئی کہ وہ کلیسا کی تعلیمات سے مطابقت رکھتی تھیں۔

اسی حوالہ سے دوسری صدی کے فیلسوف ”فیلسوس“ نے اپنی کتاب ”الخطاب الحقیقی“ میں نصرانیوں کو موردِ ندامت و ملامت قرار دیا کہ انہوں نے انجیلوں کو کھلونا بنا دیا اور جب چاہا اور جو چاہا اس میں شامل کر دیا کہ جو کچھ کل لکھا سے آج منادیا اور جو کچھ آج لکھا سے کل منادیا، اور ۸۴ء میں پاپ ”دانا سیوس“ نے حکم دیا کہ عہد قدیم و عہد جدید کا جدید لائٹنی زبان میں ترجمہ کیا جائے اور اسے ہی دنیا بھر کے کلیسیوں میں قانونی حیثیت دی جائے، اس دور کا بادشاہ ”نیو دوسیس“ مسیحی علماء کے تنازعات سے تنگ آچکا تھا اور انجیل کے بارے میں ان کے بیانات و خصائصانہ نظہارات سے سخت نالاں تھا، بالآخر وہ ترجمہ کہ جس کا نام ”فولکان“ رکھا گیا پایہ تکمیل کو پہنچا اور وہ صرف چار انجیلوں (انجیل متی، انجیل مرقس، انجیل لوقا، انجیل یوحنا) کا ترجمہ تھا۔ اور ان چار انجیلوں کو مرتب کرنے والے نے کہا تھا کہ ”ہم نے انجیلوں کے قدیم یونانی نسخوں کو ایک دوسرے کے سامنے رکھ کر ان کو مرتب کیا ہے، یعنی تحقیق اور چھان بین کے بعد دین مسیحیت سے متصادم و منافی مطالب کو نکال کر باقی کو اسی حال پر رہنے دیا“، اس کے بعد اسی نئے مرتب شدہ ترجمہ کو ادارہ ”تریدینٹینی“ نے ۱۵۴۶ء میں یعنی گیارہ صدیاں گزرنے

کے بعد مورد تائید قرار دیا مگر ۱۵۹۰ء میں سیستوس پنجم نے اسے نادرست قرار دے کر اس کی دوبارہ طباعت کا حکم دے دیا، پھر کلیہ مضوس ہشتم نے اسے بھی نادرست قرار دے دیا اور حکم دیا کہ اسے نئے سرے سے طبع کیا جائے چنانچہ اس وقت کیتھولک فرقہ کے پاس وہی موجود ہے، (منقول از تفسیر الجواہر جلد ۲، صفحہ ۱۲۱ طبع دوم)

جو انجیلیں متروک ہو گئی تھیں ان میں سے ایک انجیل برنا با ہے کہ اس کا ایک نسخہ چند سال پہلے دریافت ہوا اور اس کا عربی و فارسی زبانوں میں ترجمہ کر دیا گیا، یہ وہ انجیل ہے جس میں مذکور تمام واقعات ان مطالب سے مطابقت رکھتے ہیں جو قرآن مجید میں حضرت مسیح عیسیٰؑ بن مریم سے متعلق موجود ہیں، وہ انجیل ایطالیائی زبان میں تھی کہ مصری دانشور ڈاکٹر خلیل سعادہ نے اس کا عربی میں اور فاضل دانشور ”سردار کابلی“ نے ایران میں اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہ تاریخی مواد جسے غیر یہودی دانشوروں نے بھی ذکر کیا ہے اس میں ان مطالب کی تفصیلات نہیں ملتیں جن کی نسبت انجیل نے حضرت مسیح کے دعوتی مشن کی طرف دی مثلاً ان کا خدا کا بیٹا ہونا اور لوگوں کے گناہوں و خطاؤں کے عوض فدیہ ہونا وغیرہ۔

مشہور امریکی مورخ ”ہنڈرک ولیم وان لون“ نے تاریخ بشر کے موضوع پر اپنی کتاب میں ایک خط کا تذکرہ کیا ہے جسے رومی طبیب ”اسکولا پیوس کولتوس“ نے ۶۲ء میں اپنے بھائی ”جلادیوس انس“ کے نام لکھا کہ جو فلسطین میں تعینات رومی فوج کا سپاہی تھا، اس خط میں اس نے لکھا کہ میں روم میں ایک بیمار کی عیادت کے لئے گیا جس کا نام بولس تھا اور میں اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا، اس نے مجھے دین مسیحیت قبول کرنے کی دعوت دی اور مجھے حضرت مسیح اور ان کے دینی مشن کے بارے میں قدرے آگاہی دلائی، مگر اس کے بعد میرا اور اس کا رابطہ منقطع ہو گیا اور میں نے اسے نہ دیکھا یہاں تک کہ طویل عرصہ تک اس کی تلاش کے بعد میں نے سنا کہ ”اوستی“ میں اسے قتل کر دیا گیا ہے، اب تم چونکہ فلسطین میں ہو لہذا براہ کرم اس اسرائیلی نبی کے بارے میں معلوم کرو جس کے متعلق بولس نے مجھے بتایا تھا اور خود بولس کے بارے میں بھی معلومات حاصل کر کے مجھے مطلع کرو۔

”جلادیوس انس“ نے ڈیڑھ ماہ بعد یورشلم کی فوجی چھاؤنی سے اپنے بھائی حکیم ”اسکولا پیوس کولتوس“ کو اس کے خط کا جواب بھیجا اور اس میں لکھا کہ میں نے اس شہر کے معمر اور بزرگ افراد سے عیسیٰ مسیح کے بارے میں پوچھا مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ اس سلسلہ میں مجھے کچھ بتانا پسند نہیں کرتے (یہ ۶۲ء کی بات ہے اور جن لوگوں سے اس نے پوچھا وہ یقیناً بوڑھے تھے) بالآخر ایک دن ایک زیتون فروش سے ملاقات ہوئی تو میں نے اس سے عیسیٰ مسیح کے بارے میں پوچھا تو اس نے خندہ پیشانی سے پیش آ کر مجھے ایک شخص جس کا نام یوسف ہے کا بتایا اور کہا کہ اس کام کے لئے تم اس کے پاس جاؤ کیونکہ وہ عیسیٰ مسیح کے محبوب و پیروکاروں میں سے ہے اور وہ ان کے حالات و واقعات سے بخوبی آگاہ و مطلع ہے اور وہی تمہیں ان سوالوں کا صحیح و

درست جواب دے سکتا ہے، چنانچہ کئی دنوں کی تلاش و کوشش کے بعد آج مجھے یوسف سے ملنے میں کامیابی ہوئی ہے، وہ نہایت معروض رسیدہ شخص تھا اور وہ کسی زمانہ میں اس علاقہ کے بعض دریاؤں سے مچھلیاں پکڑتا تھا، اگرچہ اب وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا مگر اس کے ہوش و حواس بالکل درست تھے اور اس کی قوت حافظہ پوری طرح کام کرتی تھی چنانچہ اس نے وہ تمام واقعات مجھے سنائے جو اس نے اپنی زندگی میں دیکھے تھے اور ان حالات کے بارے میں بھی بتایا جو ہنگاموں کے عروج میں رونما ہوئے اس نے مجھے بتایا کہ ”فونیوس فیلاطوس“ سامراء کا حاکم تھا اور یہودیہ (فلسطین) میں قیصر روم کے ایک گورنر ”ٹی بریوس“ کی حکومت تھی، اس کی حکومت کے دنوں میں یورٹلم میں فسادات پھوٹ پڑے لہذا ”فونیوس فیلاطوس“ ہنگاموں کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھانے کے لئے وہاں گیا، ہنگاموں و فسادات کی اصل وجہ یہ تھی کہ ”ناصرہ“ کے رہنے والے ایک شخص نے جس کا نام ”ابن نجار“ تھا حکومت کے خلاف تحریک شروع کر دی اور لوگوں کو مظاہروں و ہنگاموں پر اکسارہا تھا، لیکن جب اس کے بارے میں تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ جس ابن نجار کو ظلم ٹھہرایا جا رہا ہے وہ ایک عقلمند نوجوان ہے اور اس نے کوئی سیاسی تحریک نہیں چلائی اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی سیاسی کام کیا ہے، اور جو کچھ اس کے بارے میں کہا گیا تھا وہ پروپیگنڈہ سے زیادہ کچھ نہ تھا اور یہ تہمت و پروپیگنڈہ یہودی انتہاپسندوں کی کارستانی تھی کیونکہ وہ اس کے سخت دشمن اور اس سے نفرت کرتے تھے اور اسی بناء پر انہوں نے حاکم یعنی فیلاطوس کو غلط اطلاع دی کہ ناصرہ کا یہ نوجوان لوگوں سے کہتا پھرتا ہے کہ جو شخص خواہ وہ یونانی ہو یا رومی یا فلسطینی، اگر عدل و شفقت کے ساتھ لوگوں سے برتاؤ کرے تو خدا کے نزدیک وہ اس شخص کی طرح ہوگا جس نے اپنی زندگی خدا کی کتاب کے مطالعہ اور اس کی آیات کی تلاوت میں گزاری ہو، یہودیوں کے پروپیگنڈہ سے کی قلعی کھل گئی اور فیلاطوس نے ان کے الزامات پر کان نہ دھرے، لیکن جب اس نے سنا کہ لوگ معبد کے گرد جمع ہو گئے ہیں اور ان کا جم غفیر وہاں موجود ہے اور وہ عیسیٰ اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتارنا اور ان کے کٹڑے کٹڑے کرنا چاہتے ہیں تو اس نے سوچا کہ بہتر ہے اس نجار نوجوان کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دے تاکہ وہ ان ہنگاموں و فسادات میں لوگوں کے ہاتھوں مارا نہ جائے۔

فیلاطوس تمام تر تحقیق کے بعد اس اصل سبب سے پوری طرح آگاہ نہ ہو سکا کہ آخر یہ لوگ عیسیٰ سے اس قدر نالاں کیوں ہیں؟ چنانچہ وہ جب بھی لوگوں سے ان کے بارے میں بات کرتا اور ان سے حقیقت الامر معلوم کرنے کی طرف بڑھتا تو وہ اسے کچھ بتانے کی بجائے شور مچانا شروع کر دیتے اور اونچی اونچی آوازوں کے ساتھ کہنے لگتے: وہ کافر ہے، وہ ملحد ہے، وہ خائن ہے، بالآخر فیلاطوس کی کوشش نتیجہ بخش ثابت نہ ہوئی اور اس نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ ہو خود عیسیٰ ہی سے بات کرے، اس نے عیسیٰ کو بلوایا اور ان سے پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں اور جس دین کی تبلیغ آپ کر رہے ہیں اس سے آپ کا مقصد کیا ہے؟ عیسیٰ نے اسے جواب دیا کہ نہ تو مجھے حکومت چاہیے اور نہ مجھے کسی سیاسی کام سے کوئی غرض ہے، میں صرف روحانی زندگی کی

تبلیغ کرتا ہوں، میں روحانی زندگی کو جسمانی زندگی سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں اور میرا نظریہ یہ ہے کہ افراد بشر ایک دوسرے کے ساتھ نیکی و نیک سلوک کریں اور ہر شخص اس خدائے واحد و یکتا کی عبادت و پرستش کرے جو مخلوقات کے تمام ارباب و حیات و زندہ لوگوں کے باپ کا درجہ رکھتا ہے۔

فیلاطوس ایک تعلیم یافتہ شخص تھا اور راقیسیون اور دیگر فلاسفہ کے نظریات و مسالک سے بخوبی آگاہی رکھتا تھا، اس نے عیسیٰ کی باتیں غور سے سنیں تو اسے ان میں کوئی قابل گرفت بات نہ ملی کہ جس کی بناء پر ان کا مواخذہ کرے، لہذا اس نے ایک بار پھر عزم کر لیا کہ اس سچی کھری اور عمدہ و مضبوط باتیں کرنے والے دانا و سلیم الطبع نبی کو یہودیوں کے شر سے نجات دلائے اور اسے قتل کرنے کے فیصلہ پر عملدرآمد کرنے میں حیلہ سازی سے کام لے کر اسے انجام نہ ہونے دے، لیکن یہودی اس پر خاموش نہ ہوئے اور انہوں نے گوارا نہ کیا کہ عیسیٰ کو اسی طرح آزاد چھوڑ دیا جائے بلکہ انہوں نے یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ فیلاطوس بھی عیسیٰ کے دھوکہ و فریب کا شکار ہو گیا ہے اور اس کی من گھڑت باتوں میں آ کر قیصر کے ساتھ خیانت کرنا چاہتا ہے، چنانچہ انہوں نے اس کے خلاف شواہد اکٹھا کرنے شروع کر دیئے اور اجتماعی یادداشتیں مرتب کیں جن میں ان کی طرف سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ قیصر اسے حکومت سے معزول کر دے، اس سے پہلے بھی فلسطین میں ہنگامے اور فسادات پھوٹ چکے تھے اور انقلاب در انقلاب رونما ہو چکے تھے جس کے نتیجے میں قیصر کے حامیوں و تخلص لوگوں کی تعداد میں خاصی کمی آگئی تھی اور وہ لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے اور ان کی صدائے احتجاج کو دبانے میں ناکام ہو چکا تھا لہذا اس نے اپنے گورنروں اور حکومتی کارندوں کو حکم دے دیا تھا کہ لوگوں کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کریں جس سے وہ احتجاج کرنے پر مجبور ہوں اور قیصر کی حمایت چھوڑ دیں۔ اسی وجہ سے فیلاطوس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ کار باقی نہ تھا کہ وہ امن عامہ کے پیش نظر لوگوں کے مطالبہ کو پورا کرتے ہوئے اس کے قتل کا ناگوار فیصلہ کرے اور اس پر عمل درآمد کو یقینی بنائے۔ لیکن عیسیٰ نے اس کے قتل پر کوئی رد عمل ظاہر نہ کیا اور کسی طرح سے جزع فزع اور اضطراب کا اظہار نہ کیا بلکہ نہایت صبر و بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے برداشت کیا اور اس کے قتل سے پہلے ہی اس کے قتل میں ملوث افراد کو معاف کر دیا، یہاں تک کہ اس کے سولی پر لٹکائے جانے کا حکم نافذ ہو گیا اور اس نے تختہ دار پر جان دے دی جبکہ لوگ اس کا مذاق اڑاتے اور اسے برا بھلا کہتے تھے۔

”جلاد یوس انسا“ نے اپنے خط کے آخر میں لکھا کہ یہ وہ باتیں ہیں جو یوسف نے عیسیٰ مسیح کے بارے میں مجھے بتائیں اور یہ سب کچھ بیان کرتے ہوئے اس کی آنکھیں اشکبار تھیں اور وہ زار و قطار رو رہا تھا، میں نے جاتے ہوئے اسے سونے کے چند سکے دیئے مگر اس نے انہیں قبول نہ کیا اور کہنے لگا کہ یہاں دیگر ایسے افراد موجود ہیں جو مجھ سے زیادہ نادار ہیں، یہاں تک کہ وہ دو۔ پھر میں نے اس سے تیرے پیار و دوست ”بولس“ کے بارے میں پوچھا لیکن وہ اس کے بارے میں زیادہ کچھ نہ جانتا تھا، اس نے اس کے بارے میں صرف اتنا کہا کہ وہ خیمہ سازی کا کام کرتا تھا پھر اس نے وہ کام چھوڑ کر اس جدید

مذہب کی تبلیغ شروع کر دی جو کہ اس مہربان و رحم کرنے والے رب و معبود کا مذہب ہے جس کے اور ”یہودہ“ (یہودیوں کے معبود) کے مذہب کہ جس کے بارے میں یہودی علماء سے ہم سنتے رہتے ہیں اس قدر فرق ہے جتنا آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔

اور جہاں تک بولس کا تعلق ہے تو بظاہر یہ ہے کہ اس نے پہلے وسطی ایشیا کا سفر کیا، پھر یونان چلا گیا اور وہ جہاں بھی گیا وہاں کے غلاموں اور کنیزوں سے کہتا تھا کہ وہ سب باپ کے بیٹے ہیں اور باپ ان سب سے محبت کرتا ہے اور ان پر مہربان ہے اور اس نے لوگوں میں سے کسی خاص گروہ کو سعادتمندی سے نہیں نوازا بلکہ سبھی اس سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور تمام افراد بشر اس سے استفادہ کر سکتے ہیں خواہ وہ نادار ہوں یا اثر و تمند! مگر شرط یہ ہے کہ وہ آپس میں بھائی چارہ کے ساتھ زندگی بسر کریں اور پاکیزگی و سچائی کے ساتھ اپنے سفر حیات کو طے کریں۔

(یہ ہے ان مطالب کا خلاصہ جو امریکی مؤرخ نے اپنی تالیف ”تاریخ بشر“ میں مذکورہ بالا خط کے حوالہ سے لکھے ہیں۔ اور ہم نے اس کتاب سے صرف انہی مطالب کے ذکر کرنے پر اکتفاء کیا ہے جن کا تعلق ہمارے زیر بحث موضوع سے تھا)۔

بہر حال اس خط کے جملوں و فقروں کے متن پر غور کرنے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ مسیحیت کا مشن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں ظہور پذیر ہوا اور اس میں خداوند عالم کی طرف سے ایک نبی کے مبعوث بہ رسالت ہونے کے سوا کچھ نہ تھا، اور اس میں الوہیت کے ادعاء، لاہوت کے ظہور و نزول اور فدیہ کے موضوعات میں سے کوئی بات مذکور نہ تھی۔

پھر حضرت عیسیٰؑ کے چند شاگردوں یا ان سے منسوب افراد مثلاً بولس اور اس کے شاگردوں کے شاگرد حضرت عیسیٰؑ کے سولی پر چڑھنے کے بعد دنیا کے مختلف خطوں مثلاً ہندوستان، افریقہ، روم وغیرہ میں گئے اور مسیحیت کے مشن کو عام کرنے میں کوشاں ہو گئے لیکن کچھ زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ ان مبلغین کے درمیان اصولی اختلافات پیدا ہو گئے اور وہ دین مسیح کی اصل بنیادوں ہی کی بابت آپس میں الجھ گئے مثلاً مسیح کی لاہوتیت، مسیح کی الوہیت، شریعت موسیٰؑ پر عمل کرتے ہوئے مسیح پر ایمان لانے کی کفایت اور یہ کہ آیا دین مسیح اصل اور دین موسیٰؑ کا نسخ ہے (اس کی وجہ سے شریعت موسیٰؑ منسوخ ہو گئی) وہ تورات کی شریعت و دستورات کے تابع اور اس کا تکمیل کنندہ ہے؟ انہی امور کے حوالہ سے ان کے درمیان کئی گروہ اور فرقے وجود میں آ گئے، چنانچہ کتاب ”اعمال الرسل“ اور بولس کے کتبوبات میں ان مطالب کی طرف اشارہ موجود ہے۔

البتہ جو ہم کتبہ قابل توجہ و لائق التفات ہے وہ یہ کہ وہ اقوام کہ جن میں سب سے پہلے دین مسیحیت ظہور پذیر ہوا اور اس کا پیغام پھیلا مثلاً روم و ہند وغیرہ، وہ سب اس سے پہلے بت پرست تھے، کچھ صابئی تھے، کچھ برہمنی اور کچھ بودائی تھے، اسی



وجہ سے اس میں کچھ تصوف کے اصول، کچھ برہمنیوں کی فلاسفی اور زیادہ تر یہ عقیدہ و نظر نمایاں تھا کہ لاہوت نے ناسوت کے قالب میں ظہور کیا، اس کے ساتھ ساتھ مسیحیوں کے اعتقادی اصول یعنی تثلیث الواحد..... ایک کا تین ہونا.....، لاہوت کا ناسوت کے لباس میں نازل ہونا اور خلق اللہ کے گناہوں کے کفاح کے لئے فدیہ ہو کر سولی پر چڑھنے کو قبول کرنا بھی قدیم ہند، چین، مصر، کلدان، آشور اور فارس وغیرہ میں رہنے والے بت پرستوں میں عام مشہور و رائج تھے، اسی طرح مغرب کے قدیم بت پرستوں مثلاً رومیوں، اسکندینیوں وغیرہ کے ہاں بھی یہ نظریات و عقائد عام تھے چنانچہ ادیان و مذاہب قدیم کے بارے میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان بھی ان عقائد کا تذکرہ و حوالہ ملتا ہے، ان میں سے ایک کتاب ”تورات اور اس کے مشابہ دیگر ادیان کے خرافات“ میں اس کے مؤلف ”دوان“ نے لکھا ہے کہ جب ہم اہل ہند کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سب سے بڑی اور مشہور ترین لاہوتی عبادت، تثلیث ہے اور وہ اسے اپنی زبان میں ”تری مورتی“ کہتے ہیں جو کہ سنسکرتی زبان میں دو لفظوں کا مجموعہ ہے: ”تری“ اور ”مورتی“، تری کا معنی تین اور مورتی کا معنی صورتیں و شکلیں ہے جو کہ تین اقنوم سے عبارت ہے یعنی: ”برہما“، ”فشو“، ”سیفا“، اور وہ تین اقنوم ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں کہ جو اپنی اکائی سے جدا نہیں ہوتے اور وہ ان کے عقیدہ و گمان کے مطابق ایک معبود ہے۔ اور ان کے عقیدہ کے مطابق ”برہما“ باپ، ”فشو“ بیٹا اور ”سیفا“ روح القدس ہے۔ اور وہ ”سیفا“ کو ”کرشنا“ جس سے متولد ہوا، (اسے ہی انگریزی زبان میں ”کرس“ کہا جاتا ہے یعنی مخلص مسیح)۔ بنا برائیں ”فشو“ وہی معبود ہے جو ناسوت کے لباس میں زمین پر ظہور پذیر ہوا تاکہ لوگوں کو نجات بخشنے اور وہ ان تین اقنوم میں سے ایک ہے جو درحقیقت خدائے یکتا ہے۔ اور اہل ہند اس تیسرے اقنوم کو کبوتر کی صورت میں رمز قرار دیتے تھے..... یا رمز کے طور پر ذبح یا قتل کرتے تھے..... جیسا کہ اسی طرح کا عقیدہ مسیحیوں کا ہے۔ (یہ ہے ”دوان“ کے بیان کردہ مطالب، کہ جو اس نے اپنی کتاب میں درج کئے ہیں)۔

یہاں یہ مطلب قابل ذکر ہے کہ سولی پر لٹکانا بہت پرانی رسم و طریقہ ہے اور یہ طریقہ اس شخص کے لئے اختیار کیا جاتا تھا جو بہت بڑے جرم کا مرتکب ہوا ہو اور اس کا فعل نہایت شرمناک ہو، صلیب یعنی سولی پر چڑھنا موت کے گھاٹ اتارنے کی کرہناک صورت ہے اور اس کا نام ہی خوفناک ہے، اس کا طریقہ یہ تھا کہ لکڑی کے دو تختوں کو اس طرح آپس میں جوڑتے تھے کہ ان میں سے ایک کا بالائی حصہ دوسرے کے درمیان اس صورت میں پھنس جائے کہ صلیب کی طرح کا ہو جائے اور ایک انسان کو اس پر لٹایا جاسکے، پھر مجرم کو اس پر رکھا جاتا تھا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو صلیب کے دونوں جانبوں پھیلا دیا جاتا تھا اور اس کے دونوں پاؤں تختہ دار کے دو عمومی جانب میٹوں سے باندھ دیئے جاتے تھے، کبھی باندھنے کی بجائے اس کے دونوں پاؤں کھینچے جاتے تھے، پھر تختے کو اس طرح اوپر کی طرف اٹھایا جاتا تھا کہ مجرم کے پاؤں اور زمین کے درمیان دو ذراع یعنی تقریباً ایک میٹر کا فاصلہ ہو، اسی حالت میں اسے ایک دن یا چند دنوں تک رہنے دیا جاتا تھا پھر پنڈلیوں تک اس کے دونوں

پاؤں کاٹ دیئے جاتے تھے کہ وہ پھانسی پر لٹکا ہوا ہی مر جائے یا پھر اسے تختہ سے نیچے اتار کر اس کا سر قلم کر دیتے تھے، البتہ مجرم کو تختہ دار پر لٹکانے سے پہلے کوڑے مارے جاتے تھے اور اس کا مثلہ کیا جاتا تھا یعنی اس کے ہونٹ، ناک، انگلیاں اور نازک اعضاء کو کاٹا جاتا تھا، سزا کا یہ طریقہ اس قدر وحشت ناک تھا کہ جس قوم کا فرد سولی پر لٹکا یا جاتا تھا وہ اس کے لئے نہایت معیوب و باعث شرم سمجھا جاتا تھا۔

مسٹر ”فیر“ نے اپنی کتاب ”اصل الوہمیہ“ (بت پرستی کی اصل حقیقت) میں لکھا ہے کہ جس طرح ہم ہندوؤں میں ”ٹالوٹ“ کو پاتے ہیں کہ جو ”برہما“، ”فشنو“ اور ”سیفا“ کا مجموعہ ہے اسی طرح بودائیوں میں بھی ”ٹالوٹ“ پایا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی قائل ہیں کہ ”بوڈ“ معبود ہے اور اس کے تین اقنوم ہیں۔ اسی طرح ”بوڈیو“ (جینسٹ) کا عقیدہ ہے کہ ”جیفا“ تین اقنوم کا مجموعہ ہے اور چینی ”بوڈہ“ کی عبادت کرتے ہیں اور اسے ”فو“ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور ہندوؤں کی طرح وہ بھی قائل ہیں کہ وہ تین اقنوم کا مجموعہ ہے۔

”دوان“ نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں لکھا ہے کہ مصر کے کلیسائے منیس کے بزرگ علماء (قسیس) ابتدائی دینی تعلیم حاصل کرنے والوں کو ”مقدس ٹالوٹ“ کا اس طرح تعارف کرواتے تھے کہ پہلے نے دوسرے کو خلق کیا، دوسرے نے تیسرے کو خلق کیا اور پھر وہ تینوں ایک ہو گئے، اس طرح مقدس ٹالوٹ وجود میں آیا۔

ایک دن مصر کے بادشاہ ”تولیسو“ نے اپنے دور کے مشہور کاہن ”تیشوکی“ سے پوچھا کہ کیا اس سے پہلے کوئی کاہن گزرا ہے جو اس سے بڑا تھا یا اس کے بعد کوئی کاہن آئے گا جو اس سے بڑا ہوگا؟ تو اس نے جواب دیا کہ ہاں: ایک ہے جو اس سے بڑا اور عظیم تر ہے اور وہ خدا (اللہ) ہے جو ہر چیز سے پہلے ہے اور اس کے بعد کلمہ ہے اور ان دونوں کے ساتھ روح القدس ہے، اور یہ تینوں ایک ہی طبع وجودی رکھتے ہیں اور ذات میں ایک ہیں، وہی ابدی قوت کا سرچشمہ ہیں، پس اب تو چلا جا اے فانی! اور اے قلیل زندگی والے!

”بونویک“ نے اپنی کتاب ”عقائد قدماء المصریین“ میں لکھا ہے کہ مصریوں کے دینی عقائد میں یہ عجیب و غریب بات عام ہے کہ وہ کلمہ کی لاہوتیت کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر چیز اسی کے ذریعے وجود پذیر ہوئی اور خود اس کا وجود خدا سے ہے اور وہی خدا ہے، (اسی عبارت سے انجیل یوحنا کی ابتداء ہوتی ہے)۔

”ہیجن“ نے بھی اپنی کتاب ”انگلو ساکسن“ میں لکھا ہے کہ اہل فارس ”متروس“ کو کلمہ، واسطہ فیض وجود اور فارس کا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔

کتاب ”سکان اوربہ الاولین“ (قدیم یورپ کے باسی) سے منقول ہے کہ قدیم بت پرستوں کا عقیدہ تھا کہ معبود، تین اقنوم والا ہے۔

اسی طرح یونانیوں، رومیوں، فنلاندیوں، اسکینڈینیویوں سے بھی مذکورہ بالا تالوث کا عقیدہ منقول ہے، اور کلہ کا عقیدہ کلدانیوں، آشوریوں اور فینیقیوں سے منقول ہے۔

ان مطالب کے ذکر کے ساتھ ساتھ دو ان نے اپنی کتاب ”تورات اور اس کے مشابہ دیگر ادیان کے خرافات“ میں صفحہ ۱۸۱ و ۱۸۲ پر لکھا ہے جس کا تلخیصی ترجمہ یہ ہے:

”خداؤں میں سے ایک خدا کے بارے میں یہ عقیدہ کہ اس نے اپنے آپ کو ذبح کروا کر لوگوں کے گناہوں کا کفارہ وفد یہ بنا دیا قدیم ترین ہندویت پرستوں اور دیگر کا ہے۔“

اس مطلب کے شواہد ذکر کرتے ہوئے مولف نے لکھا ہے کہ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ ”کرشنا“ نوزائیدہ کہ جو فشو ہی ہے کہ نہ جس کی ابتداء ہے اور نہ انتہا، محبت و مہربانی کے طور پر زمین کو اس کے بوجھ سے کہ جسے اس نے اٹھایا ہوا تھا نجات دلانے کے لئے آیا اور اپنے آپ کو قربان کر کے انسان کو نجات بخشی۔

دوان نے لکھا ہے کہ مشر مور نے کرشنا کی تختہ دار پر لکھی ہوئی تصویر بنائی اور اسے اس تصویر کے عین مطابق بنایا جو ہندوؤں کی کتابوں میں بنی ہوئی ہے یعنی ایک انسان کی شکل ہے جس کے دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں پر کیلیں لگی ہوئی ہیں اور اس کی قمیص پر انسان کے لٹائے ہوئے دل کی تصویر بنی ہوئی ہے۔

اور دوان نے لکھا ہے کہ میں نے کرشنا کی ایک تصویر دیکھی ہے جس میں اسے تختہ دار پر لٹکایا ہوا دکھایا گیا ہے اور اس کے سر پر سونے کا تاج ہے، اور رخصانی قائل ہیں کہ جب حضرت یسوع مسیح کو تختہ دار پر لٹکایا گیا تو ان کے سر پر کانٹوں کا تاج تھا۔

”ہوک“ نے اپنے سفر نامہ کی جلد اول ص ۳۲۶ پر لکھا ہے کہ بت پرست ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ بعض معبودوں نے انسان کی صورت ڈھال لی اور نوع انسانی کی نجات کے لئے اپنے آپ کو اس کے گناہوں کے عوض فدیہ کر دیا۔

مورلیفور لیمس کی کتاب ”الہنود“ صفحہ ۲۶ کا حوالہ دیتے ہوئے ”ہوک“ نے لکھا ہے کہ بت پرست ہندو اصل خطا کا عقیدہ رکھتے ہیں، چنانچہ اس کا ثبوت ان کی ان دعاؤں و مناجات کے الفاظ سے ملتا ہے جو انہوں نے ”کیا تری“ کے بعد کہیں اور ان میں یوں پکارا:

”اے میرے معبود! میں گناہگار ہوں، میں خطا کار ہوں، غلطی کا مرتکب ہوں، میری طبع و وجودی ہی شری ہے، میری ماں نے مجھے گناہ کے ساتھ جنا ہے، اب تو مجھے نجات عطا کر، اے حد قوتی آنکھ والے! اے گناہگاروں و خطا کاروں کو ان کے جرائم سے چھٹکارا بخشنے والے!“

مشہور مسیحی عالم قسبس ”جارج کوکس“ نے اپنی کتاب ”الديانات القديمة“ (قدیم ادیان و مذاہب) میں ہندوؤں

کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندو اپنے معبود ”کرشنا“ کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ نہایت شجاع و بہادر اور سراپا لالا ہوت تھا کیونکہ اس نے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کر دیا۔..... تاکہ گناہگاروں کے گناہوں کا عوض و کفارہ ہو جائے.....

”ہمجین“ نے ”اندرادا الکرود و بوس“ کہ جو نیپال و تبت کا سفر کرنے والا پہلا یورپی باشندہ ہے کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس نے ”اندر“ کہ ہندو جس کی پرستش کرتے ہیں کے بارے میں کہا کہ اس نے افراد بشر کو ان کے گناہوں سے نجات دلانے کے لئے تختہ دار پر اپنا خون بہا دیا اور اپنے ہاتھ پاؤں صلیب کی کیلون کو دے دیئے۔ ہندوؤں کی کتابوں میں اب بھی اس کی تختہ دار پر لٹکی ہوئی تصویر موجود ہے، اور مشہور راہب ”جورجیوس“ کی کتاب میں اسی معبود ”اندر“ کی تختہ دار پر لٹکی ہوئی تصویر موجود ہے، اس تصویر میں صلیب کو اس طرح دکھایا گیا ہے کہ دونوں جانب عرض میں برابر اور طول میں مختلف ہے یعنی سولی کا بالائی حصہ اس کے نچلے حصہ سے چھوٹا ہے اور بالائی حصہ میں ”اندر“ معبود کی شکل (چہرہ) نمایاں ہے کہ اگر یہ شکل یعنی چہرہ نہ ہوتا تو کسی کو معلوم نہ ہو سکتا کہ تختہ دار پر لٹکے ہوئے کسی انسان کی تصویر ہے۔

اور جہاں تک بودائیوں کا ”بوذا“ کے بارے میں عقیدہ کا تعلق ہے تو وہ اس سلسلہ میں دیگر ادیان و مذاہب کی نسبت نصاریٰ کے عقیدہ سے زیادہ مطابقت رکھتے ہیں یہاں تک کہ وہ بوذا کو ”مسح“ کا نام دیتے ہیں اور اسے یکتا مولود اور کائنات کا نجات دہندہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ کامل انسان اور کامل معبود ہے کہ جو ناسوت کے قالب میں ڈھلا، اور وہ تختہ دار پر لٹک گیا تاکہ نوع بشر کے گناہوں کا کفارہ بنے اور انہیں گناہوں سے پاک کر دے کہ پھر ان پر ان کا مواخذہ نہ ہو سکے بلکہ وہ ملکوت سماوی کے وارث بن جائیں، یہ مطلب مغرب کے اکثر علماء نے بیان کیا ہے مثلاً ”ہوک“ نے اپنے سفر نامہ میں اور ”موالز“ نے اپنی کتاب ”تاریخ الآداب السنسکریتیہ“ (سنسکریتی ادب کی تاریخ) میں اور ان کے علاوہ دیگر متعدد تاریخ نویسوں نے اسے لکھا ہے۔

قارئین کرام! مذکورہ بالا مطالب تفسیر المنار جلد ۶ میں سورۃ نساء کی تفسیر میں مذکور ہیں اور بیشتر دائرۃ المعارف اور کتاب ”الحقائد الوعوبیہ فی الدیانات النصرانیہ“ (دین مسیحیت میں بت پرستی کے عقائد) اور دیگر کتب میں بھی موجود ہیں، یہ ہے لاہوت کے ناسوت کے لباس میں آنے کے عقیدہ کا نمونہ یا چند حقائق کی ایک جھلک! اور یہ ہے حضرت مسیح کے سولی پر چڑھنے اور گناہگاروں کے گناہ کے عوض فدیہ و کفارہ بننے کی ان داستانوں کا خلاصہ و پس منظر جو ان قدیم ادیان میں مذکور ہیں جن پر سابقہ امتوں نے اپنے عقائد کی بنیادیں کھڑی کیں اور ان کو اپنے دینی نظریات کا محور بنایا اور یہ کام اسی دن سے شروع ہو گیا جب دین مسیحیت کے تمام کمرے ارضی میں پھیلنے کا آغاز ہوا اور مسیحیوں کی تبلیغی سرگرمیاں زور پکڑ گئیں، تو اس سلسلہ کے وسعت پذیر ہونے سے پہلے ہی لوگوں کے دلوں میں ان نظریات نے گھر کر لیا تھا اور مسیحی مبلغین نے دنیا کے گوشہ گوشہ میں ان کو عام کر دیا تھا۔ تو اس سب کچھ کے باوجود کیا اس حوالہ سے کوئی شک و شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ مسیحی مبلغین

نے اپنے اصول و فروع کو بت پرستی کے قالب میں ڈھال کر لوگوں کو اپنی طرف راغب و متوجہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تاکہ لوگ ان کی دعوت پر آسانی سے لبیک کہیں اور ان کی تعلیمات کو صمیم قلب سے قبول کر لیں۔ چنانچہ اس کی تصدیق و تائید بولس اور اس کے علاوہ دیگر حضرات کے ان اظہارات سے ہوتی ہے جن میں انہوں نے فلسفہ اور فلاسفہ کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا اور عقلی طریقہء استدلال کو کلی طور پر نادرست قرار دیا اور کہا کہ رب کریم بیوقوف کی بیوقوفی کو عقلمندی عقل پر ترجیح دیتا ہے، اس کے اس طرح کے اظہارات کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کا تبلیغاتی تعلیمات کا مقابلہ عقلی استدلال کی قوت کے حامل مکاتب فکر سے ہوا کہ جنہوں نے ان کی غیر معقول تعلیمات و مضحکہ خیز اصولوں کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور اس حوالہ سے واضح موقف اختیار کیا کہ استدلال کی صحیح و معقول بنیاد کے بغیر ان کے دینی معارف ہرگز قابل قبول نہیں، بنا بریں مسیحی مبلغین نے اس کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ دیکھا کہ اپنے تبلیغی مشن کو مکاشفہ اور روح مقدس کی کامل آمیختگی کی بنیاد پر استوار کریں، گویا انہوں نے اس روش و اسلوب کو اختیار کیا جسے اہل تصوف کے جاہل افراد اپناتے ہیں جو کہ عقلی طور و طریقہ سے قطعی اجنبی بلکہ اس ایک برعکس ہے۔

اس کے علاوہ جیسا کہ کتاب ”اعمال الرسل و التوارخ“ میں ہے کہ مسیحی مبلغین نے رہبانیت اور ترک دنیا کی روش اختیار کرتے ہوئے دنیا کے گونا گوں ملکوں کا سفر کیا اور سیار تبلیغ کی راہ میں چل پڑے، چنانچہ انہوں نے ہر خطہ و علاقہ میں جا کر دین مسیحیت کی تبلیغ کا بازار گرم کیا اور ان کی اس سعی و پیہم اور وسیع کوشش کو دیکھ کر ہر خطہ و علاقہ کے عوام نے ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا، ان کی کامیابی کا دنیا بھر میں بالعموم اور امپراطوری روم میں بالخصوص ایک راز یہ بھی تھا کہ لوگ اپنے معاشرتی عمومی حالات سے فکری و روحانی طور پر سخت پریشان تھے اور حکمرانوں کے ظلم و استبداد اور جبر و جور کی چکی میں پسے ہوئے تھے یہاں تک کہ حکام نے عوام الناس کو اپنی بندگی کے بندھنوں میں جکڑ رکھا تھا اور انہیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا تھا جس کے باعث معاشرہ طبقاتی امتیازات کی لپیٹ میں آچکا تھا کہ حکمران طبقہ اور عوام کے درمیان ایک دوسرے سے بہت دوریاں پیدا ہو چکی تھیں اور دو متمددوں و عیش پرستوں کا طرز زندگی معاشرہ کے نادار و مساکین اور غلاموں کی عمومی زندگی سے ناقابل قیاس حد تک مختلف ہو چکا تھا، اس نہایت شدید طبقاتی امتیازات سے بھرے ہوئے ماحول میں زندگی بسر کرنے والوں نے مسیحی مبلغین کے تبلیغی اظہارات کو اپنے لئے نجات کی نوید سمجھا کیونکہ وہ مبلغین اپنے بیانات میں بھائی چارہ، باہمی محبت و رواداری، انسانی برابری، افراد بشر کی ایک دوسرے سے اچھی معاشرت، دنیا کی آلودہ و فانی زندگی کی عیش و عشرت کو چھوڑ کر ملکوت سماوی کی صاف ستھری و سعادت مند زندگی کی طرف توجہ کرنے کی دعوت عام دیتے تھے اسی وجہ سے حکمران طبقہ سلاطین و ملوک اور قیصری تخت و تاج کے رسیا ان مبلغین کی باتوں کو درخور اعتناء نہیں سمجھتے تھے البتہ انہیں اذیت و آزار کا نشانہ بھی نہیں بناتے تھے اور نہ ہی انہیں سیاست کے بازار میں دھکیل کر سیاسی چالوں کا شکار کرتے تھے اور نہ انہیں معاشرے سے نکال باہر

کرتے تھے، اسی کے نتیجے میں ان کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی گئی اور کسی شور و غل وغیرہ کے بغیر ان کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، ان کی افرادی قوت اور اجتماعی طاقت میں اضافہ ہونے لگا یہاں تک کہ سلطنت روم، افریقہ، ہندوستان اور دیگر ممالک میں ان کے حامیوں اور پیروکاروں کی کثرت وجود میں آ گئی، چنانچہ اپنی روز افزوں تعداد کے ساتھ ساتھ انہوں نے کلیسا بنانے شروع کر دیئے اور ان کے دروازے عوام الناس پر کھول دیئے، اس طرح ہر کلیسا کی تعمیر کے نتیجے میں ایک بت خانہ بند ہوتا گیا اور اس کے دروازے بزرگان قوم کی طرف سے ان کے عبادت خانوں کے مسمار ہونے کے باعث کسی بھی احتجاج و مزاحمت کو درخور اعتناء نہیں سمجھتے تھے اور نہ سلاطین و حکام وقت کے سامنے ان کے احکام و دستورات کی خلاف ورزی و تمرد کا راستہ اختیار کرتے تھے، ان کی اس روش کے نتیجے میں بسا اوقات ان کی ہلاکت و قتل اور قید و بند تک نوبت پہنچ جاتی تھی کہ ان کے کچھ افراد کو قتل کر دیا جاتا تھا، کچھ کو جیل میں ڈال دیا جاتا تھا اور کچھ کو شہر بدر و ملک بدر کر دیا جاتا تھا، یہ سلسلہ سلطان قیصر ”کنستانتین“ کے برسر اقتدار آنے تک جاری رہا، اس نے دین مسیحیت قبول کر لیا اور اپنے مسیحی ہونے کا برملا اظہار و اعلان کر دیا بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ اس نے دین مسیحیت کو اپنی مملکت کا آئینی دین قرار دے دیا چنانچہ روم اور اس کے تابع دیگر ممالک میں کلیسا تعمیر ہوئے، یہ سب چوتھی صدی عیسوی کے نصف آخر میں ہوا۔ ان ایام میں کلیسائے روم نصرانیت کا مرکز قرار دیا گیا کہ وہاں سے مسیحی مبلغین و علماء دنیا کے گوشہ گوشہ کو بھیجے جاتے تھے تاکہ ہر علاقہ و ملک میں کلیساؤں کا جال بچھادیں، دیہ اور مدارس تعمیر کروائیں اور انجیل کی تعلیم دلوائیں۔

اس مقام پر جو اہم بات قابل توجہ ہے وہ یہ کہ ان مبلغین نے اپنی تبلیغ کا محور انجیل کے مسلمہ اصولوں کو قرار دیا مثلاً باپ، بیٹا، روح القدس، سولی پر چڑھایا جانا، فد یہ ہونا اور اس طرح کے دیگر وہ نظریات جو دین مسیحیت کے بنیادی اصول سمجھے جاتے ہیں کہ مبلغین نے ان اصولوں مسلم الثبوت امور قرار دے کر اپنی تمام تبلیغات و تعلیمات کو انہی پر استوار کیا۔ یہی بات ان کے تمام دینی افکار و اعمال کے کمزور و متزلزل بنیادوں پر قائم ہونے کی پہلی کڑی ہے کیونکہ عمارت خواہ چٹنی بلند و بالا و مضبوط و مستحکم کیوں نہ ہو لیکن وہ اپنی اس بنیاد کی کمزوری کو دور نہیں کر سکتی جس پر اسے بنایا گیا ہو..... بلکہ اپنی کمزور بنیاد کی وجہ سے ہر لمحہ منہدم ہونے کے خطرہ سے دوچار ہوتی ہے..... اور ان مبلغین نے دین مسیحیت کی عمارت عقیدہ تثلیث، تختہ دار پر چڑھنا اور فد یہ قرار پانا کی بنیاد پر کھڑی کی جو کہ غیر معقول ہے..... عقل اس طرح کے عقیدہ کو درست قرار نہیں دیتی..... چنانچہ اس کے غیر معقول ہونے کا اعتراف متعدد مسیحی محققین نے بھی کیا ہے لیکن یہ کہہ کر اپنے بے بس ہونے کا اظہار کیا کہ یہ ان دینی مسائل میں سے ہے جن کو تعبد و اطاعت قبول کرنا ضروری ہوتا ہے اور یہ بات صرف دین مسیحیت میں نہیں بلکہ دیگر ادیان کی بابت بھی یہی صورت حال ہے کہ ان کے مسائل و مطالب اور اصول عقائد کو عقل محال و ناممکن قرار دیتی ہے جبکہ انہیں تسلیم کرنا ضروری ہوتا ہے۔

ان محققین کی یہ بات بلکہ غلط توجیہ و تاویل دراصل ان کی غلط دینی بنیاد کا نتیجہ ہے کیونکہ کسی محال و ناممکن مسئلہ کا دین حق میں تصور کیونکر ممکن ہے؟ ہم تو دین کو عقل کی بنیاد پر برحق تشخیص دے کر تسلیم کرتے ہیں، تو یہ کس طرح قابل تصور ہے کہ کسی برحق عقیدہ کی بنیاد ایسے امر پر قائم ہو جسے عقل باطل و نادرست اور محال و ناممکن قرار دے؟ کیا یہ واضح و صریح تناقض نہیں؟ (یعنی حق کو باطل پر استوار کرنا نہیں؟)۔ البتہ یہ بات ممکن ہے کہ دین میں ایسے امور پائے جائیں جو عام طور پر وقوع پذیر نہ ہوتے ہوں جبکہ ممکن الوقوع ہوں اور ان کا وقوع پذیر ہونا دائرہ امکان میں ہو لیکن جہاں تک کسی ایسے مسئلہ کا تعلق ہے جو ذاتاً محال و ناممکن ہو تو اس کا دینی حقائق میں سے ہونا ہرگز ممکن و قابل تصور نہیں، چنانچہ یہی طرز بحث باعث ہوا کہ نصرانیت کے ظہور پذیر ہونے اور اس کی تبلیغ کے ابتدائی ایام ہی میں روم و اسکندریہ اور دیگر ممالک کے مسیحی دینی مدارس میں زیر تعلیم طلبہ کے درمیان تنازعات کی آگ بھڑک اٹھی اور ان کے اہل تحقیق اور ارباب فکر و نظر اس حوالہ سے شدید اختلافات کا شکار ہو گئے۔ کلیسا کی طرف سے بگڑتی ہوئی صورتحال پر قابو پانے اور شیرازہ ملت کے مزید بکھرنے کو روکنے کے لئے شدید وسیع اقدامات کئے گئے اور نت نئے عقائد و بدعات کا سدباب کرنے کے لئے ایک مرکزی تحقیقاتی بورڈ قائم کیا گیا جو دینی مبلغین و علماء پر کڑی نظر رکھے اور سب کو ایک ہی جیسے اصول اپنانے کی تلقین و تاکید کرے کہ اگر ان میں سے کوئی اس کی ہدایت پر کان نہ دھرے اور اپنی من مانی و ڈھٹائی پر قائم رہے تو اسے دائرہ دین سے خارج کرنے، ملک بدر کرنے، معاشرتی قطع روابط اور قتل کئے جانے کی سزاؤں میں سے کوئی سزا دے، چنانچہ سب سے پہلا بورڈ جو اس غرض سے تشکیل پایا وہ بقیہ کا تھا جو ”اربوس“ کے خلاف بنا کیونکہ اس نے کہا تھا کہ اقنوم بیٹا، اقنوم باپ کے برابر نہیں ہو سکتا اور اللہ... یعنی اقنوم باپ... قدیم ہے جبکہ مسیح... یعنی اقنوم بیٹا... مخلوق ہے۔ اس کے ان اظہارات و نظریات کی مذمت و روک تھام کے لئے تین سوتیرہ استغف و دانشور قسطنطنیہ میں اکٹھے ہوئے اور سب کے سب اس دور کے حاکم ”کنستانتین“ کے دربار میں آئے اور اپنے عقائد کا اجتنابی طور پر برملا اظہار کرتے ہوئے کہا:

(۱) ”ہم خدائے یکتا پر ایمان رکھتے ہیں جو باپ ہے، ہر چیز کا مالک ہے، دیکھی جانے والی اور نہ دیکھی جانے والی تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا ہے“،

(۲) ”اور ہم یکتا فرزند یسوع مسیح پر ایمان رکھتے ہیں جو خدائے یکتا کا بیٹا ہے، تمام مخلوق سے بے ہمتا ہے، وہ مصنوع نہیں بلکہ برحق معبود ہے جو برحق معبود سے ہے اور اپنے باپ کے جو ہر ذات سے ہے کہ جس باپ کے ہاتھوں ہر جہان اور ہر چیز وجود پذیر ہوئی، وہ ہمارے لئے اور ہماری نجات کے لئے آسمان سے اتر اور روح القدس سے مجسم ہوا اور مریم البجول سے متولد ہوا، اسے ”فیلاطوس“ کے دور میں تختہ دار پر چڑھایا گیا اور پھر دفن کر دیا گیا، پھر وہ تین دن کے بعد قبر سے باہر نکلا اور آسمان کی طرف پرواز کر گیا اور اپنے باپ کے دائیں جانب بیٹھ گیا، وہ مردوں اور زندوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے

لئے دوبارہ زمین پر اترنے کو تیار ہے۔“

(۳) ” اور ہم روح القدس پر ایمان رکھتے ہیں جو یکتا ہے کہ جو اس کے باپ سے نکلتی ہے،“

(۴) ” اور ہم گناہوں کی بخشش کے لئے معمودیہ واحدہ پر ایمان رکھتے ہیں “ (معمودیہ واحدہ سے مراد باطنی

پاکیزگی و تقدس ہے)۔

(۵) ” اور ہم جماعت واحدہ قدسیہ مسیحیت، جاٹلیقیہ پر ایمان رکھتے ہیں۔“

(۶) ” اور ہم مرنے کے بعد اپنے ابدان کے دوبارہ اٹھنے اور ہمیشہ باقی رہنے والی زندگی پر ایمان رکھتے ہیں۔“

(ملاحظہ ہو کتاب ”اللسل والخل“ مؤلفہ شہرستانی)

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مذکورہ بالا عقائد میں انہوں نے مرنے کے بعد اپنے ابدان کے دوبارہ اٹھنے اور ابدی زندگی کا جو ذکر کیا ہے وہ معاد جسمانی کے عقیدہ سے مطابقت دیکھتا ہے جبکہ نصاریٰ، انجیل کی تعلیمات کے مطابق معاد روحانی کے قائل ہیں، میرے خیال میں انجیل، قیامت کے دن جسمانی دنیاوی لذتوں سے بہرہ ور ہونے کو ثابت نہیں کرتی، اور نہ ہی اس میں انسان روح مجرد و خالی از جسم ہونے کا کوئی ثبوت پایا جاتا ہے بلکہ اس میں یہ ثبوت ملتا ہے کہ قیامت کے دن انسان فرشتوں کی طرح کا ہو جائے گا کہ جن کے درمیان ازدواجی تعلق نہیں پایا جاتا، اس سے بالاتر بات یہ ہے کہ کتب عہدین میں تو خداوند عالم اور فرشتوں سب کا قیامت کے دن جسم بن جانا ثابت ہوتا ہے۔

بہر حال یہ ہے اس مرکزی بورڈ کے اجتماع و اجلاس کی کہانی، اس کے بعد دیگر متعدد بورڈ قائم ہوئے جن میں نئے وجود میں آنے والے مسیحی مذاہب و مسالک اور فرقوں سے اظہار برائت کیا گیا مثلاً نسطوریہ، یعقوبیہ، الیانیہ، الیلاریسیہ، مقدانوسیہ، سہالیوسیہ، نوٹوسیہ، پولسیہ اور دیگر متعدد فرقے!

لیکن ان تمام مسالک کے وجود میں آنے کے باوجود مرکزی کلیسا کی طرف سے اعتقادات پر کڑی نظر رکھنے کا سلسلہ باقی و جاری رہا اور اس حوالہ سے ہرگز بے توجہی نہیں ہوئی بلکہ اس میں وسعت پیدا ہوئی اور روز بروز دین مسیحیت کے مشن کو عام کرنے کا عمل مضبوط ہوتا گیا، یہاں تک کہ ۳۹۶ء یعنی پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں اس کا دائرہ روس کے علاوہ یورپ کے دیگر ممالک تک پھیل گیا، مثلاً فرانس، انگلینڈ، اسٹریا، سپین، پرتگال، بیلجیئم، ہالینڈ وغیرہ، ایک طرف تو دین مسیحیت کے پرچار کا سلسلہ وسیع ہو رہا تھا اور دنیا بھر میں اس کا چرچا عام تھا اور دوسری طرف شمالی اقوام اور صحرائین قبائلیوں کی طرف سے سلطنت روم کے خلاف تحریک زور پکڑ گئی اور پے در پے جنگوں اور فسادات سے قیصروں کی حاکمیت کی جڑیں کمزور ہو رہی تھیں، بالآخر معاملہ یہاں تک پہنچا کہ اہل روم اور روم کی فاتح قوموں نے اجتماعی طور پر یہ فیصلہ کیا کہ امور مملکت کی باگ ڈور اسی طرح مرکزی کلیسا کے سپرد کر دی جائے جس طرح دینی امور کا نظام اس کے ہاتھ میں ہے، چنانچہ کلیسا روحانی و



دینی اور جسمانی دونوں سلطنت کا مرکز بن گیا، ان ایام یعنی ۵۹۰ء میں چونکہ کلیسا کا سربراہ پاپ گریگور تھا لہذا امور مملکت کا نظام بھی اسی کے ہاتھ میں آ گیا۔ اور اس طرح کلیسائے روم کو پورے جہان مسیحیت پر مطلق حکمرانی حاصل ہو گئی، لیکن زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ سلطنت روم دو حصوں میں تقسیم ہو گئی، ایک حصہ مغربی روم کی سلطنت کا تھا جس کا دارالخلافہ روم تھا اور دوسرا حصہ مشرقی روم کی سلطنت کا تھا جس کا مرکزی مقام قسطنطنیہ (استنبول) تھا، مشرقی روم کے حکمران اپنے آپ کو اپنی مملکت کے دینی رہنما سمجھتے تھے اور مغربی کلیسائے روم سے ہدایات لینے کے پابند نہیں تھے، اسی سے دین مسیحیت کے پیروکاروں کی مسلکی تقسیم ہوئی اور وہ دو واضح فرقوں میں بٹ گئے: ایک کیتھولک کہلائے جو کلیسائے روم کے تابع ہوئے اور دوسرا فرقہ ارتودوکس کہلائے جو کلیسائے قسطنطنیہ (استنبول) کے پیروکار ہوئے،

یہ صورتحال قسطنطنیہ کے عثمانیوں کے ہاتھوں فتح ہونے تک جاری رہی یہاں تک کہ مشرقی روم کے آخری حکمران ”بالی اولوکوس“ کو جو اس وقت کا سربراہ کلیسا بھی تھا کلیسا ایا صوفیا میں قتل کر دیا گیا۔ قیصر روم کے قتل کے بعد قیصر ہائے روس اس کے دینی منصب کی وراثت کے مدعی ہو گئے، انہوں نے اپنے دعوے پر یہ دلیل دی کہ وہ اس کے سببی رشتہ دار ہیں اور آپس میں سببی رشتہ داریوں کا وسیع سلسلہ ہے، یہ دسویں صدی عیسوی کی بات ہے اور اس وقت روسی، دین مسیحیت اختیار کر چکے تھے، اس طرح روسی سلاطین اپنی سرزمین کے کلیساؤں کے قیسیں و سربراہ بھی بن گئے تھے کہ جو کلیسائے روم کے تابع نہ تھے، یہ واقعات ۱۲۵۴ء میں وقوع پذیر ہوئے۔

یہ حالات تقریباً پانچ صدیوں تک جوں کے توں رہے یہاں تک کہ ”تزار نیولا“ کو قتل کر دیا گیا کہ جو سلطنت روس کا آخری تاجدار تھا، اسے اس کے تمام اہل خانہ سمیت ۱۹۱۸ء میں کمیونسٹوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا، اس طرح کلیسائے روم اپنی تقسیم سے پہلے کی حالت کو پلٹ آیا یعنی دوبارہ مغربی و مشرقی روم کے تمام کلیساؤں کا مرکز بن گیا۔ لیکن ایک سنگین بحران سے دوچار ہوا اور وہ یہ کہ جب قرون وسطیٰ میں لوگوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کی باگ ڈور سربراہ کلیسا کے ہاتھوں میں تھی اور وہ ان کی زندگی کے سفید و سیاہ کا مالک تھا، گویا وہ دور کلیسا کے کمال و عروج کا بلند ترین زمانہ تھا کہ جس میں کلیساؤں کے آقا ہی لوگوں کے ارادوں پر حاکم تھے، تو اس کے نتیجے میں لوگوں کی زندگی اجیرن بن چکی تھی لہذا اس کے رد عمل کے طور پر متدین لوگوں کی کثیر تعداد کلیسا کی حاکمیت کے خلاف سراپا احتجاج بن گئی اور ان پابندیوں سے آزادی کا مطالبہ کر دیا جو کلیسا کے آقاؤں نے ان پر عائد کر رکھی تھیں۔ چنانچہ ان میں کئی لوگوں نے سربراہان کلیسا اور ہر پوپ کی حکم عدولی کے ساتھ ساتھ انجیل کی تعلیمات و دستورات پر عمل کرنے میں صرف اپنے مقامی علماء و کشیشوں کی ہدایات و فتاویٰ کو حرف آخر قرار دے دیا، اس فرقہ کو ”ارندوکس“ کہا جاتا ہے۔

ان کے علاوہ ایک گروہ ایسا سامنے آیا جس نے کلیسائے روم کی پیروی اور پاپائے روم کے کسی بھی حکم کو ماننے سے

انکار کر دیا لہذا وہ کلیسائے روم کے بارے میں انجیل کی ہدایات کو تسلیم ہی نہیں کرتے اور نہ ہی اس کے فرامین کو ذر خوراعتنا سمجھتے ہیں، ان لوگوں کو پروٹسٹنٹ کہتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ دنیا نے مسیحیت تین حصوں میں تقسیم ہو گئی اور ان میں تین نمایاں فرقے تشکیل پائے گئے:

(۱) کیتھولک: وہ کلیسائے روم اور اس کی تعلیمات کے پیروکار ہیں۔

(۲) ارتودکس: وہ کلیسائے روم کی تعلیمات کی پیروی تو کرتے تھے مگر خود کلیسا کے تابع نہ تھے، یہ فرقہ کلیسا میں

تقسیم و فرقہ بندی اور بالخصوص کلیسائے قسطنطنیہ کے ماسکو (روس) منتقل ہونے کے بعد وجود میں آیا۔

(۳) پروٹسٹنٹ: یہ نہ کلیسا اور نہ ہی اس کی تعلیمات کی پیروی کرتے تھے بلکہ انہوں نے اپنا مستقل طریقہ اختیار

کر لیا۔ یہ فرقہ گیارہویں صدی عیسوی میں ظہور پذیر ہوا۔

یہ ہے مسیحیت کے بیس صدیوں تک رونما ہونے والے واقعات اور نشیب و فراز کا اجمالی بیان! اور جو حضرات ہماری اس کتاب کی تالیف کے مقصد و مقصود سے آگاہی رکھتے ہیں انہیں بخوبی معلوم ہے کہ ہم نے مسیحیت کے تاریخی پس منظر و پیش منظر کے حوالہ سے جو مطالب ذکر کئے ہیں ان میں درج ذیل تین اہم نکات و اغراض ملحوظ ہیں:

(۱) بحث و تحقیق کرنے والے شخص کو ان کے مذہب کے تاریخی نشیب و فراز سے بخوبی آگاہی حاصل ہو اور اسے

معلوم ہو کہ دین مسیحیت میں جو عقائد موجود ہیں وہ کس طرح اور کہاں سے ان میں آئے اور کیوں کہ وہ نظریات دینی رنگ اختیار کر گئے؟ آیا دینی ورثہ کے طور پر نسل در نسل منتقل ہوتے رہے یا دیگر ادیان کے پیروکاروں سے میل جول کے نتیجے میں ان میں آگئے؟ یا بت پرستوں کے عقائد مسیحی علماء کو اس قدر پسند آ گئے کہ انہوں نے وہ سب اپنے دین میں داخل کر دیئے؟ یا یہ کہ مسیحی بزرگوں اور مبلغین نے دوسروں سے الفت کے رشتے قائم کرنے اور استوار و برقرار رکھنے کی غرض سے ان کے عقائد و نظریات کو اپنالیا؟ یا یہ کہ بت پرستوں کے عقائد ہی کو اپنالیا اور انہیں اپنے دین کے اصولوں کی حیثیت دے دی؟

(۲) کلیسا بالخصوص کلیسائے روم کا اقتدار تاریخی طور پر وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور قرون وسطیٰ میں اپنے

انہنی عروج کو پہنچ گیا، یہاں تک کہ دینی و دنیاوی دونوں اقتدار سے حاصل ہو گئے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بادشاہوں کے تقرر و معزولی کا اختیار بھی اسی کے پاس تھا، کلیسا کے آقاؤں کے فیصلہ پر ہی تخت و تاج سلطنت کسی کو ملتا یا اس سے چھٹتا تھا، (ملاحظہ ہو کتاب ”الفتوحات الاسلامیہ“) چنانچہ اس حوالہ سے بیان کیا جاتا ہے کہ بابائے روم نے ایک مرتبہ جرمن بادشاہ کو سخت سردی کے موسم میں حکم دیا کہ وہ تین دن تک اپنے محل کے دروازہ پر ننگے پاؤں کھڑا رہے، کیونکہ بادشاہ سے کوئی غلطی سرزد ہوئی تھی جس کی معافی کے لئے بابائے روم نے یہ سزا مقرر کی۔

اسی طرح ایک دفعہ ایک بادشاہ بابائے روم کے پاس اپنے کسی گناہ کو بخشوانے کے لئے آیا تو اس نے بادشاہ کے

تاج کو پاؤں کی ٹھوکر سے نیچے گرا دیا۔

مسیحی علماء اپنے پیروکاروں کو مسلمانوں کے بارے میں اس طرح بتاتے رہتے تھے کہ ان لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اسلام بت پرستی کا دین ہے چنانچہ اس کا ثبوت سالہا سال جاری رہنے والی ان صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کے خلاف لوگوں کے جذبات براہیختہ کرنے کی غرض سے دیئے جانے والے بیانات، نعروں و اشعار میں پایا جاتا ہے۔

”ہنری دوکاستری“ نے اپنی کتاب ”دین اسلام“ کی پہلی فصل میں لکھا ہے کہ مسلمان بتوں کی پوجا کرتے ہیں اور

تین خداؤں پر ان کا ایمان ہے کہ با ترتیب جن کے نام یہ ہیں:

(۱) ”ماہوم“ کہ جسے ”بافومید“ اور ”ماہومند“ بھی کہا جاتا ہے، یہ ان کا پہلا معبود ہے اور وہی ”محمد“ ہے۔

(۲) ”ایلین“، یہ ”محمد“ کے بعد ان کا دوسرا معبود ہے۔

(۳) ”ترفا جان“، یہ ان کا تیسرا خدا ہے۔

اور مسلمانوں کے بعض بیانات و اطہارات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تین خداؤں کے علاوہ ان کے دیگر دو خدا بھی ہیں کہ ایک کا نام ”مارتوان“ اور دوسرے کا نام ”جوین“ ہے لیکن ان دو کا مقام و مرتبہ پہلے تین خداؤں کے بعد اور کمتر ہے، اور مسلمان کہتے تھے کہ محمد نے اپنے مشن کی بنیاد یہ رکھی کہ اپنی خدائی کا دعویٰ کیا، اور کبھی کہا کہ محمد نے اپنے لئے ایک طلائی بت بنایا جو خود اسی سے مختص تھا۔

مشہور مسیحی شاعر ”رچرڈ“ نے فرانسسی فوجیوں کو مسلمانوں کے خلاف براہیختہ کرنے کی غرض سے جو اشعار کہے ان میں واضح لفظوں میں ان سے کہا:

”قیام کرو اور ماہومند اور ترفا جان کو سرنگوں کر دو اور انہیں نذر آتش کر دو تا کہ تمہیں تمہارے خدا کا تقرب حاصل

ہو“،

”رولان“ نے اپنے اشعار میں ”ماہوم“ کو مسلمانوں کا خدا قرار دیتے ہوئے کہا:

”اسے بھرپور سونے اور چاندی سے بنایا گیا کہ اسے دیکھ کر آپ کو یقین ہو جائے گا کہ کوئی بنانے والا اس سے زیادہ خوبصورت بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتا چہ جائیکہ ایسا بنا سکے کہ اس کا جسم عظیم، اس کی بناوٹ عمدہ و دلکش اور اس کے سراپا میں جلالت کے آثار نمایاں ہوں، ہاں! ”ماہوم“ سونے اور چاندی سے بنا ہوا ہے اور اس کی چمک دمک آنکھوں کو چندھیا دیتی ہے، اسے ایک ہاتھی پر بٹھایا گیا ہے جو نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب و دلربا ہے، یوں تو اس کے اندر کچھ نہیں مگر دیکھنے والا اس کے پیٹ سے ایک روشنی پھوٹی محسوس کرتا ہے کہ اسے نہایت قیمتی چمکدار پتھروں و ہیروں سے اس طرح سجایا گیا ہے کہ اس کے ظاہر سے اس کا باطن دکھائی دیتا ہے، وہ اپنی بناوٹ و سجاوٹ میں اپنی مثال آپ ہے، اور چونکہ مسلمانوں کے یہ

خدا نہیں سختی و شدت کی حالت میں وحی کرتے تھے لہذا بعض جنگوں میں مسلمان فرار ہوئے تو مد مقابل فوج کے سربراہ نے ان کے مکہ میں مقیم خدا (محمدؐ) کو گرفتار کرنے کے لئے اپنے سپاہیوں کو ان کا پیچھا کرنے کا حکم دیا، چنانچہ اس واقعہ کے ایک عینی گواہ کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کا خدا (یعنی محمدؐ) مسلمانوں کے پاس آیا تو اس کے پیروکاروں کا جم غفیر اس کے گرد جمع ہو گیا اور وہ سب خوشی میں بیٹھا باجے اور ڈھول اور چاندی کے بنے ہوئے نقارے بجاتے ہوئے نغمہ سرا ہو کر رقص کرنے لگے اور اسی طرح اسے خوشیوں و رنگینیوں کے ساتھ لشکر گاہ تک لے آئے، لشکر گاہ میں اس کا خلیفہ اس کی آمد کا انتظار کر رہا تھا، اس کے آتے ہی وہ اس کے سامنے احترام کے انداز میں کھڑا ہو گیا اور پھر نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ اس کی عبادت و پرستش کرنے لگا،

”رحمہ“ ہی نے اس معبود ”ماہوم“ کے بارے میں جس کا تذکرہ ابھی آپ نے پڑھا یوں کہا:

”جادوگروں نے ایک جن کو سخر کر کے اسے اس بت کے پیٹ میں رکھ دیا چنانچہ وہ جن پہلے اونچی آواز نکالتا ہے، پھر بلائیں لیتا ہے پھر مسلمانوں سے گفتگو کرتا ہے اور مسلمان پوری توجہ کے ساتھ اس کی باتیں سنتے ہیں“،

بہر حال اس طرح کے بے بنیاد مطالب بلکہ ناروا تہمتیں مسیحیوں کی ان کتب میں جو صلیبی جنگوں کے دور میں لکھی گئیں بلکہ ان جنگوں کے بعد ان کی تاریخ کے حوالہ سے تالیف ہوئیں ان سب میں کثرت سے پائی جاتی ہیں، یہاں تک کہ ان کی اس طرح کی مضحکہ خیز و نامعقول باتیں سن کر ان کتب کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص تعجب و حیرت زدہ ہو جاتا ہے اور ایسی کیفیت کا شکار ہو جاتا ہے کہ اس کے لئے ان کی کسی بھی بات کی تصدیق مشکل ہو جاتی ہے کیونکہ وہ مطالب ہی ایسے ہیں کہ کوئی مسلمان ان کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا چہ جائیکہ عالم بیداری میں ان کا مشاہدہ کرے۔

(۳) بحث و تحقیق کرنے والے اہل فکر و نظر اور ارباب فہم و تدبر گذشتہ صدیوں سے آج تک دین مسیحیت میں آنے والے نشیب و فراز اور ترقی کے سفر کے مراحل کی کیفیتوں سے آگاہی حاصل کریں اور اس حقیقت سے آشنا ہوں کہ بت پرستی کے عقائد کو مخفیانہ طور پر اور نہایت ماہرانہ انداز میں دین مسیحیت میں داخل کیا گیا چنانچہ پہلے حضرت مسیحؑ کی بابت غلو کیا گیا اور انہیں حد سے بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا، اس کے بعد تدریجاً تثلیث یعنی تین خداؤں: باپ، بیٹا اور روح القدس کے عقیدہ کو دین کی اصل و اساس قرار دے دیا گیا، اور پھر صلیب یعنی سولی پر چڑھنے..... اور فدیہ و کفارہ ہونے کا نظریہ شامل کیا گیا، اس کا نتیجہ عمل سے بے نیازی اور اعتقاد ہی کو کافی سمجھنے کی صورت میں ظاہر ہوا، یہ سب کچھ پہلے دین کی شکل میں تھا اور کلیسا کے آقاؤں کے ہاتھوں میں عبادت یعنی نماز و روزہ وغیرہ کی بجائے آوری کے احکامات صادر کرنے کی باگ ڈور تھی، اور لوگ انہی کے فرامین و دستورات پر عمل کرتے تھے، لیکن الحاد و بے دینی بڑھتی جا رہی تھی اور اس کا دامن اس قدر وسیع ہو گیا کہ اس کے نتیجے میں گروہ بندی کا بازار گرم ہو گیا اور پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ پروٹسٹنٹ پیدا ہوئے اور ان کا فتنہ زور پکڑ گیا، چنانچہ دین و شریعت کے احکام و دستورات کہ جن کے نتیجے میں معاشرہ ہرج و مرج کا شکار ہو چکا تھا اور سیاسی خلفشار و بحران پیدا

ہو گئے تھے ان کی جگہ ان رسمی قوانین نے لے لی جو قانون کے دائرہ سے باہر آزادی کی بنیاد پر بنائے گئے تھے یعنی وہ احکام جو افراد معاشرہ کو قانون کی پاسداری کے علاوہ زندگی کے دیگر امور میں آزادی دلاتے تھے معاشرہ پر حکم فرما ہو گئے، اسی وجہ سے دین مسیحیت روز بروز کمزور ہوتا گیا اور اس کی تعلیمات کی روشنی ماند پڑ گئی کہ جسے بچانے کی ہر کوشش ناکامی سے دوچار ہونے لگی، یہاں تک کہ تدریجی طور پر اخلاق و فضائل انسانی کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں اور پھر مادہ آزادی نے اشتراکیت کے پھیلاؤ میں اہم کردار ادا کیا، کمیونزم و اشتراکیت نے دو بنیادوں پر اپنی جڑیں مضبوط کیں: (۱) دیا لکٹیک میٹریالیزم (تغیر و تحول کے اصولوں پر مبنی مادہ پرستی) کا فلسفہ، (۲) دینی نظریات یعنی عقیدہ لاهوت، پاکیزہ اخلاق اور دینی اقدار سے روگردانی، اس کے نتیجہ میں انسانیت کی معنوی و روحانی عظمتیں پامال ہو گئیں اور ان کی جگہ درندگی و وحشی گری کے مجموعہ مرکب مادی میوانی طرز عمل نے لے لی، کہ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا اس پر ٹوٹ پڑی اور اس کی گرویدہ بن گئی۔

اس اثناء میں وہ دینی تحریکیں جو پوری دنیا پر چھا چکی تھیں وہ اپنے منطقی انجام کو پہنچیں کیونکہ وہ سیاسی چالوں کے سوا کچھ نہیں کہ جو سیاستدانوں کی سیاست بازی کی مختلف شکلیں ہیں اور وہ ان کے ذریعے اپنے مخصوص مقاصد و مفادات کو تحفظ دینے کے درپے ہوتے ہیں، تو حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دور کی سیاست ایک فن ہے کہ جس کا فنکار اپنے مقصد کے حصول کے لئے ہر دروازہ پر دستک دیتا ہے اور ہر پناہ گاہ کا رخ کرتا ہے۔

ڈاکٹر جوزف شیلر نے کہ جو شکاگو کے لوٹر ان کالج میں دینی علوم کا پروفیسر ہے، کہتا ہے کہ امریکہ میں جوئی دینی تحریک سامنے آئی ہے اس کا ہدف اس کے سوا کچھ نہیں کہ جدید تمدن میں زندگی کے امور کو دین سے ہم آہنگ کیا جائے اور یہ بات لوگوں کو باور کرائی جائے کہ جدید تمدن کا دین سے کوئی تضاد و تصادم نہیں کیونکہ اگر یہ ہدف حاصل نہ ہو تو اس بات کا خطرہ باقی رہے گا کہ عوام الناس جدید تمدن سے حاصل نتائج کی بناء پر اپنے آپ کو دین حق کے صحیح پیروکار سمجھنے لگیں اور پھر حقیقی دینی تحریک... اگر کبھی ان کے درمیان ظہور پذیر ہو..... تو اپنے آپ کو اس سے بے نیاز سمجھتے ہوئے اسے درخور اعتناء قرار نہ دیں، (ملاحظہ ہو امریکی رسالہ "لائف" شماره ۶ فروری ۱۹۵۶ء)

امریکہ میں روسی کلیسائے اور ٹوڈوکس کے سب سے بڑے حامی ڈاکٹر جارج فلوروفسکی کا کہنا ہے کہ امریکہ میں جو دینی تعلیمات سامنے آئی ہیں وہ دلوں کو جھوٹی تسلیاں دینے کے سوا کچھ نہیں کیونکہ اگر وہ حقیقی معنی میں حیات بخش دینی تعلیمات ہوتیں تو ضروری تھا کہ حقیقی و عمیق بنیادوں پر استوار ہوتیں، (مذکورہ بالا امریکی رسالہ "لائف" سے اقتباس)

قارئین کرام! آپ خود توجہ فرمائیں کہ دیٹی کارواں کہاں سے چلا اور کہاں پر رک گیا، ابتداء میں احیائے دین (عقیدہ) و اخلاق (پاکیزہ عادات) اور شریعت (اعمال) کے نام پر جلوہ گر ہوا اور بالآخر ان تمام امور سے روگردانی اور ان کی جگہ حیوانی لذتوں سے لطف اندوز ہونے پر اختتام پذیر ہو گیا، اس تمام ترتیب تبدیلی کا اصل سبب صرف اور صرف بولس کہ جسے

”قدیس“ کہا جاتا تھا کے فکری انحراف کا عروج تھا۔ اور اسے ”حضرت مسیح کا حواری وقوت بازو“ بھی کہا جاتا تھا، بہتر یہ ہے کہ مسیحی حضرات اس جدید تمدن کو کہ جس کے بارے میں دنیا اعتراف کرتی ہے کہ اس نے عالم انسانیت کو تباہی کے کنارے پر لا کھڑا کیا ہے بولسی تمدن سے موسوم کریں کیونکہ بولس ہی اس نام کا زیادہ حقدار ہے نہ کہ حضرت مسیح کہ جسے مسیحی حضرات جدید تہذیب و تمدن کا قائد اور پرچم دار قرار دیتے ہیں! (یہ منصب حضرت مسیح کو دینے کی بجائے بولس کو دیں تو زیادہ بہتر ہے کیونکہ یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے۔)

## روایات پر ایک نظر

### تفسیر قمی کی ایک روایت

تفسیر قمی میں آیہ مبارکہ ”مَا كَانَ لِكَيْفِ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ“ کی تفسیر میں یوں مذکور ہے:

”ان عیسیٰ لم يقل للناس انی خلقتکم فكونوا عباداً لی من دون الله، ولكن قال لهم كونوا ربانین ای علماء“

حضرت عیسیٰؑ نے لوگوں سے یہ نہیں کہا کہ میں نے تمہیں پیدا کیا ہے لہذا تم خدا کی بجائے میری پرستش کرو، بلکہ انہوں نے لوگوں سے کہا: تم رب والے بنو یعنی علماء بنو، (تفسیر قمی جلد ۱ ص ۱۰۶)

ہمارے سابقہ بیانات میں مذکورہ بالا روایت کی صحت کے قرائن موجود ہیں، اس روایت میں امام علیہ السلام کا ارشاد گرامی کہ ”حضرت عیسیٰؑ نے لوگوں سے یہ نہیں کہا کہ میں نے تمہیں پیدا کیا“ دراصل اس طرح کی بات نہ کرنے کا حوالہ دے کر احتجاج کے برابر ہے کیونکہ اگر انہوں نے کہا ہوتا کہ میری پرستش کرو تو ضروری تھا کہ اس سے پہلے انہیں مطلع و آگاہ کرتے کہ اس نے انہیں پیدا کیا ہے، جبکہ انہوں نے ان سے نہ تو اس طرح کی بات کی اور نہ ہی ایسا کام کیا..... انہیں اپنے خالق ہونے کی بابت کوئی خبر دی اور نہ ہی انہیں خلق کیا کہ جس کی بناء پر ان سے اپنی پرستش کا کہتے.....

تفسیر قمی ہی میں آیہ مبارکہ ”وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا.....“ کی تفسیر میں مذکور ہے کہ امام نے اس کی بابت ارشاد فرمایا:

”كان قوم يعبدون الملائكة، وقوم من النصارى زعموا ان عيسى رب، واليهود قالوا: عزير ابن الله، فقال الله: ولا يامرکم ان تتخذوا الملائكة والنبيين ارباباً“  
 ( چونکہ ایک قوم فرشتوں کی عبادت کرتی تھی اور قوم نصاریٰ کا عقیدہ تھا کہ عیسیٰ رب ہیں، یہودی معتقد تھے کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے، تو خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ وہ (عیسیٰ) تمہیں فرشتوں اور نبیوں کو رب بنانے کا حکم نہیں دیتا۔  
 (ملاحظہ ہو: تفسیر قمی، جلد اول صفحہ ۱۰۶)

اس موضوع کی بابت گذشتہ مباحث میں گونا گوں حوالوں سے تفصیلی تذکرہ ہو چکا ہے۔

### اہل نجران کی پیغمبر اسلام سے گفتگو

تفسیر ”درمنثور“ میں ہے کہ ابن اسحاق، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور بیہقی نے کتاب الدلائل میں جناب عبد اللہ ابن عباس کے حوالہ سے بیان کیا کہ انہوں نے کہا:

قال ابو رافع القرظي حين اجتمعت الاحبار من اليهود والنصارى من اهل نجران عند رسول الله صلى الله عليه و الله وسلم، ودعاهم الى الاسلام: اتريدنا محمد ان نعبدك كما تعبد النصارى عيسى بن مريم؟ فقال رجل من اهل نجران نصراني، يقال له الرئيس: او ذاك تريد منا يا محمد؟ فقال رسول الله: معاذ الله ان نعبد غير الله او نامر بعبادة غيره ما بذلك بعثني ولا بذلك امرني، فانزل الله من قولهما: ”ما كان لبشر ان يؤتبه الله الكتاب -- الى -- بعد اذ انتم مسلمون“--

(ابو رافع قرظی) یہودی الاصل کہ جو بعد میں مشرف بہ اسلام ہوا۔ نے بیان کیا ہے کہ جو نجران کے یہودی و عیسائی علماء حضرت پیغمبر اسلام کی خدمت میں آئے اور آنحضرت نے انہیں اسلام کی دعوت دی انہوں نے کہا: اے محمد! کیا تو چاہتا ہے کہ ہم اسی طرح تیری عبادت کریں جس طرح نصاریٰ عیسیٰ بن مریم کی پرستش کرتے ہیں؟ وہاں موجود ایک نصرانی نے جسے ”رئیس“ کہا جاتا تھا آنحضرت سے پوچھا: کیا واقعی تو ہمیں ایسا ہی کہتا ہے؟ اس وقت حضرت پیغمبر اسلام نے ارشاد فرمایا: خدا کی پناہ! کہ ہم خدا کے علاوہ کسی کی عبادت کریں یا اس کے علاوہ کسی کی عبادت کا حکم دیں، نہ تو خدا نے مجھے اس کام کے لئے بھیجا اور نہ ہی مجھے اس کا حکم دیا، تب یہ آئے مبارک نازل ہوئی: ”کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ خدا تو اسے کتاب و حکومت و نبوت عطا کرے پھر وہ لوگوں سے کہتا پھرے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میری عبادت کرو۔۔۔۔۔ تا آخر آیت ۸۰ یعنی

”بعد اذ انتم مسلمون“ بعد اس کے تم مسلمان ہو۔

(تفسیر ”درمنثور“ جلد ۲ صفحہ ۴۶)

### غیر خدا کو سجدہ کرنے کی ممانعت

تفسیر ”درمنثور“ ہی میں ہے کہ عبد بن حمید نے حسن سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا:

”بلغنی ان رجلاً قال: يا رسول الله! نسلم عليك كما يسلم بعضنا على بعض افلا

نسجد لك؟ قال (ص): لاء، ولكن اكرموا نبيكم، واعرفوا الحق لاهله فانته لا ينبغي ان يسجد

لاحد من دون الله، فانزل الله: ”ما كان لبشر ان يؤتيه الله الكتاب..... الخ

(مجھے معلوم ہوا ہے کہ ایک شخص حضرت پیغمبر اسلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کی: اے اللہ کے

رسول! ہم تو آپ کو اسی طرح سلام کرتے ہیں جس طرح ہم ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں، کیا بہتر نہیں کہ ہم آپ کو سجدہ

کریں؟ آنحضرت نے ارشاد فرمایا: نہیں، بلکہ تم اپنے نبی کا احترام و اکرام کرو اور حق کو اس کے اہل کے لئے جانو (جو جس کا

حق ہے وہی اسے دو)، کیونکہ خدا کے علاوہ کسی کے لئے سجدہ ریز ہونا روا نہیں، اسی وقت یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی: ”کسی

انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ جب خدا سے کتاب و حکومت و نبوت عطا کرے تو وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میری

پرستش کرو۔۔۔“ (تفسیر ”درمنثور“ جلد ۲ صفحہ ۴۷)

اس آیت مبارکہ کے شان نزول کی بابت مذکورہ بالا دو واقعات کے علاوہ دیگر واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں، البتہ

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ راویوں کے طرز تفکر کا نتیجہ ہے اور ہر ایک کے زاویہ نظر کی بات ہے، اس سلسلہ میں ہم پہلے تفصیلی تذکرہ

کر چکے ہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک آیت کے نزول کے متعدد اسباب ہوں،..... ایک آیت کا ایک سے زیادہ واقعات

کے حوالہ سے نازل ہونا ممکن ہے..... واللہ اعلم..... خدا بہتر آگاہ ہے.....



## آیات ۸۱ تا ۸۵

- وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ ۚ قَالَ ۚ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذٰلِكُمْ إِصْرِي ۗ قَالُوا ۚ أَقْرَرْنَا ۚ قَالَ فَاشْهَدُوا ۚ وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ ۝
- فَمَنْ تَوَلَّىٰ بَعْدَ ذٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ ۝
- أَفَغَيَّرَ دِينَ اللَّهِ يَبْعُونَ وَلَهُ ۙ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ۝
- قُلْ ۙ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنزِلَ عَلَيْنَا وَمَا اُنزِلَ عَلَىٰ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيٰعْقُوْبَ ۗ وَالْاَسْبٰطِ وَمَا اَوْتِيَ مُوسٰى وَعِيسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَبِّهِمْ ۗ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِنْهُمْ ۗ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝
- وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

## ترجمہ

” اس وقت کو یاد کرو جب اللہ نے نبیوں سے عہد و پیمان لیا کہ جب میں تمہیں کتاب و حکمت دوں اور پھر تمہارے پاس وہ رسول آئے جو اس کی تصدیق کرتا ہو جو تمہارے پاس ہے (دین و شریعت)، تو تم پر لازم ہے کہ اس پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو، خدا نے پوچھا: کیا تم نے اقرار کر لیا ہے اور اس پر میرے ساتھ عہد کرتے ہو؟ انہوں نے عرض کی: ہمیں اقرار ہے، خدا نے کہا: تو تم گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں“

(۸۱)

” تو جو شخص اس کے بعد بھی روگردانی کرے تو ایسے لوگ ہی فاسق (و نافرمان) ہیں“

(۸۲)

” کیا وہ دین الہی کے علاوہ کسی دین کو چاہتے ہیں حالانکہ آسمانوں اور زمین کے تمام بانیوں نے طوعاً و کرہاً، خدا ہی کے سامنے سر تسلیم خم کیا ہے اور اسی کی طرف انہیں لوٹایا جائے گا“

(۸۳)

”کہہ دیجئے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں، اور جو کچھ ہم پر نازل کیا گیا اس پر ایمان لائے ہیں اور جو کچھ ابراہیم و اسماعیل و اسحاق و یعقوب و اسباط (ان کی نسل) پر نازل کیا گیا اور جو کچھ موسیٰ و عیسیٰ اور نبیوں کو ان کے پروردگار کی طرف سے عطا کیا گیا اس پر ایمان لائے ہیں، ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم خدا ہی کے حضور سر تسلیم خم کرنے والے ہیں“

سبیل سکیں سر پر  
پسند کرے

(۸۴)

”جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی دین تلاش کرے..... پسند کرے..... تو اس سے وہ دین قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں سے ہوگا“

(۸۵)

## تفسیر و بیان

یہ آیات مبارکہ اپنی ناقص آیات سے ارتباط سے خالی نہیں کیونکہ ان سب کا سیاق ایک ہے اور تمام آیات میں وہی ایک سیاق جاری و ساری ہے،..... گویا یہ آیات سابقہ آیات کا تتمہ ہے.....، اور وہ اس طرح سے کہ جب خداوند عالم نے اہل کتاب کے بارے میں بیان کر دیا کہ وہ ہمیشہ اپنے پاس موجود علم الکتاب سے منہ موڑتے رہے، کلمات خداوندی میں تحریف کر کے انہیں جا بجا کرتے رہے، لوگوں کو دین کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا کرتے رہے، انبیاء الہی کے درمیان فرق کے قائل ہوئے، حضرت پیغمبر اسلامؐ کی نبوت کا انکار کرتے رہے، اور اس بات کی نفی کر دی کہ موسیٰؑ و عیسیٰؑ جیسے انبیاء میں سے کوئی نبی لوگوں سے یہ کہے کہ اسے یاد گیر نیویں اور فرشتوں کو رب بناؤ، جیسا کہ نصاریٰ کے صریح لفظوں میں اور یہودیوں کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے، (یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد) خداوند عالم نے ان لوگوں کی شدید مذمت کی اور نہایت شدید لہجہ میں فرمایا کہ ایسا کیونکر ممکن ہے جبکہ خدا نے نبیوں سے عہد لے لیا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے آئے ہوئے ہر نبی پر ایمان لائیں اور اس کی نصرت کریں خواہ وہ ان سے پہلے آیا ہو یا ان کے بعد آئے، اور وہ اس طرح کہ ہر نبی اپنے ناقص نبی کی تصدیق کرے اور اپنے بعد آنے والے نبی کی خوشخبری دے، جس طرح حضرت عیسیٰؑ نے حضرت موسیٰؑ کی نبوت اور ان کی شریعت کی تصدیق کی اور حضرت محمد مصطفیٰؐ کی تشریف آوری کی بشارت و خوشخبری دی، اسی طرح خداوند عالم نے انبیاء سے وعدہ لیا کہ اپنی اپنی امتوں سے بھی ایسا کرنے کا عہد و پیمانہ لیں اور انہیں اس پر گواہ بنا لیں، خداوند عالم نے واضح طور پر بیان کر دیا کہ یہی وہ اسلام ہے جو آسمانوں اور زمین میں تمام رہنے والوں کا دین و آئین ہے۔

اس کے بعد خداوند عالم نے حضرت پیغمبر اسلامؐ کو حکم دیا کہ وہ بھی اس عہد و پیمانہ پر عمل کریں اور صمیم قلب سے اسے قبول کرتے ہوئے اسے عملی جامہ پہنائیں کہ اللہ پر ایمان لائیں اور انبیاء الہی کے درمیان کوئی فرق کئے بغیر ان پر جو کچھ نازل کیا گیا اس پر ایمان لائیں اور خدا کے حضور سر تسلیم خم کر دیں..... اس کی مطلق اطاعت کا دم بھریں۔ اور یہ سب کچھ خود بھی کریں اور اپنی امت کو بھی ایسا کرنے کا حکم دیں، یہ ہے آنحضرتؐ سے میثاق و عہد لینے کا معنی، کہ آنحضرتؐ سے بلا واسطہ لیا گیا اور آپؐ کی امت سے آپؐ کے ذریعے لیا گیا، مزید تفصیل عنقریب بیان ہوگی۔

سبیل یکینہ سنہ ۱۴۰۰ھ  
حیدرآباد، سندھ، پاکستان

## انبیاء سے عہد و پیمان

○ ”وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْنَاكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ“

(اور اس وقت کو یاد کرو جب اللہ نے نبیوں سے وعدہ لے لیا کہ جب میں تمہیں کتاب و حکمت دے دوں، پھر تمہارے پاس وہ رسول آئے جو اس سب کچھ کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا)

یہ آیت مبارکہ ایک عہد و پیمان سے آگاہی دلا رہی ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سے کون سا عہد و پیمان مراد ہے؟ آیا وہ عہد و پیمان مراد ہے جو خداوند عالم نے لوگوں سے نبیوں کے بارے میں لیا؟ یا وہ عہد و پیمان مراد ہے جو خود نبیوں سے لیا؟ دونوں کے بارے میں آیات مبارکہ سے شواہد ملتے ہیں، چنانچہ جملہ ”ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ“ سے ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں سے انبیاء کے لئے لیا جانے والا عہد و پیمان مراد ہے، جیسا کہ جملہ ”أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ أَصْرِي“ اور جملہ ”قُلْ أَمِنَّا بِاللَّهِ.....“ سے خود انبیاء سے لئے جانے والے عہد و پیمان کا ثبوت ملتا ہے، تو درحقیقت وہی عہد و پیمان ہے جو انبیاء کے لئے لیا گیا اور خود انہی سے لیا گیا اگرچہ دوسروں سے ان کے ذریعے لیا گیا۔

بنامہ ایں یہ بات درست ہے کہ آیت مبارکہ میں ”مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ“ میں ”مِيثَاقُ“ سے یا تو وہ ميثاق مراد ہے جو انبیاء سے لیا گیا یا وہ ميثاق ہے جو ان کے لئے لیا گیا، تاہم وہ حقیقت میں ایک ہی ميثاق ہے، اور ”النَّبِيِّينَ“ سے وہ انبیاء مراد ہو سکتے ہیں جن کے لئے عہد لیا گیا اور وہ انبیاء بھی مراد ہو سکتے ہیں جن سے عہد لیا گیا لیکن آیت مبارکہ ”مِمَّا كَانَ لِنَبِيِّكَ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ.....“..... دو آیتوں کے آخر تک، کاسیاق اور زیر نظر آیت مبارکہ (وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ) سے اس کے ربط کے تناظر میں اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ ”النَّبِيِّينَ“ سے مراد وہی انبیاء مراد ہیں جن سے عہد لیا گیا، کیونکہ وحدت سیاق سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء الہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب و حکمت و نبوت ملنے کے بعد لوگوں کو شرک کی دعوت نہیں دے سکتے، اور یہ ممکن بھی کیونکر ہے حالانکہ ان سے تو یہ عہد لیا گیا ہے کہ وہ ان تمام نبیوں پر ایمان لائیں گے اور ان کی مدد کریں گے جو لوگوں کو توحید و خدا کی وحدانیت کی دعوت دیتے ہیں؟ اس بناء پر موضوع کی مناسبت و موزونیت اسی میں ہے کہ ابتدائے سخن میں انبیاء سے لئے جانے والے ميثاق کا حوالہ دیا جائے۔

## ایک ادبی حوالہ !

آیت میں جملہ ”لَمَّا آتَيْنٰكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَحِكْمَةٍ“ میں دو طرح کی قرأتیں ہیں، ایک مشہور قرأت ہے جس کی رو سے ”لَمَّا“ میں لام پر زبر ہے اور دوسری قرأت حمزہ کی ہے جس میں ”لَمَّا“ کے لام کے نیچے زیر ہے کہ اس میں لام کو بضر تعلیل اور حرف ”ما“ کو موصولہ قرار دیا گیا ہے، البتہ ان دو قرأتوں میں سے پہلی قرأت کو ترجیح دی جاتی ہے کہ جس کی بناء پر لام پر زبر اور ”ما“ مخففہ یعنی بغیر شدہ کے پڑھا جائے گا تو اس میں موصولہ ہوگا اور جملہ ”آتَيْنٰكُمْ“ ..... کہ جسے ”آتَيْنٰكُمْ“ بھی پڑھا گیا ہے..... اس کا صلہ ہوگا اور اس میں صلہ سے موصول کی طرف پلٹنے والی ضمیر محذوف سمجھی جائے گی کیونکہ جملہ ”مِّنْ كِتٰبٍ وَحِكْمَةٍ“ سے اس ضمیر کا ثبوت ملتا ہے، تو یہاں موصول مبتدأ اور جملہ ”لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ“ اس کی خبر قرار پانے کا لہذا ”لَمَّا“ کا لام ابتدا سے اور ”لَتُؤْمِنُنَّ“ کا لام، لام القسم ہوگا، اور پورا جملہ ”لَمَّا آتَيْنٰكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَحِكْمَةٍ..... الخ“ اس بیثاق کا بیان ہے جو لیا گیا، تو آیت مبارکہ کا معنی یہ ہوگا کہ ”اس وقت کو خاطر میں لاؤ جب خدا نے نبیوں سے عہد لیا جو کہ یہ تھا کہ میں نے تمہیں کتاب و حکمت سے جو کچھ عطا کیا ہے تو پھر جب وہ رسول آجائے جو اس کتاب و حکمت کی تصدیق کرنے والا ہو تو تم نے یقیناً اس پر ایمان لانا ہے اور اس کی مدد کرنی ہے۔“

یہاں پر یہ بھی ممکن ہے کہ ”لَمَّا“ میں ما حرف شرط ہو اور جملہ ”لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ“ اس کی جزا ہو، اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ”یاد کرو اس وقت کو جب خدا نے نبیوں سے عہد لیا کہ اگر میں تمہیں کتاب و حکمت دوں اور پھر ایک رسول تمہارے پاس آئے جو اس کتاب و حکمت کی تصدیق کرنے والا ہو تو تم ضرور اس پر ایمان لانا اور اس کی نصرت کرنا“، یہ بات قرین قیاس بھی ہے کیونکہ اہل ادب کے ہاں جملہ شرطیہ کی جزا میں اس لام القسم کا آنا کہ جس کی قسم جزاء میں ذکر نہ کی گئی عام شہرت رکھتا ہے، (”لَتُؤْمِنُنَّ“ اور ”لَتَنْصُرُنَّ“ میں لام، لام القسم ہے) تو اس طرح آیت کا معنی سلیس و آسان تر اور روشن و واضح تر ہے، اس کے ساتھ ساتھ بیثاق و عہد کے موارد میں شرط کا ذکر بھی معمول کی بات ہے۔

بہر حال ”لَمَّا“ میں لام کے نیچے زیر ہو تو لام کو حرف تعلیل اور موصولہ ہوگا، لیکن ترجیح اسی میں ہے کہ لام کو مفتوح یعنی زیر کے ساتھ پڑھا جائے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ جملہ ”آتَيْنٰكُمْ“ اور جملہ ”جَاءَكُمْ“ میں ”كُمْ“ کا مخاطب کون ہے؟ ابتدائے نظر میں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں انبیاء مخاطب ہیں لیکن اس کے بعد والا جملہ ”عَاقِرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلٰیٰ ذٰلِكُمْ اِحْرٰی“ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں انبیاء اور ان کی امتیں دونوں ہی مخاطب ہیں یعنی خطاب تو انبیاء سے مختص ہے یعنی انہیں ہی مخاطب کیا گیا ہے لیکن اس میں جو حکم مذکور ہے وہ انبیاء اور ان کی امتوں دونوں کے لئے ہے، لہذا امتوں پر بھی

اس رسول پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا اسی طرح واجب و ضروری ہے جس طرح خود انبیاء پر واجب و لازم ہے۔ آیت مبارکہ میں ایک اور حوالہ بھی قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ جملہ ”ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ“ میں حرف ”ثُمَّ“ (پھر) زمانی تا آخر کو ثابت کرتا ہے (مستقبل)۔ یعنی سابق نبی پر لازم ہے کہ لاحق نبی پر ایمان لائے اور اس کی نصرت و مدد کرے۔ البتہ جملہ ”كُلُّ اٰمِنٍ بِاللّٰهِ.....“ سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایمان لانے اور نصرت کرنے کے عہد و پیمانے سے سابق و لاحق تمام انبیاء سے لیا جانے والا عہد و پیمانہ ہے یعنی لاحق پر واجب ہے کہ سابق پر اور سابق پر واجب ہے کہ لاحق پر ایمان لائے اور اس کی نصرت و مدد کرے۔

بہر حال اس طرح کا استفادہ کلامی، قرآنی ہی سے ممکن ہے ورنہ آیت کے الفاظ اس پر دلالت نہیں کرتے، اس سلسلہ میں مزید مطالب عنقریب بیان کئے جائیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ،

### ادبی حوالہ سے ایک اہم نکتہ کا التفات

ادبی حوالہ سے جملہ ”لَتَوْمِنُنَّ بِهِ وَكَلْتَصْرِفُهُ“ میں ضمیر ”ہ“ کی بازگشت اگرچہ بظاہر ”رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ“ کی طرف ہو سکتی ہے کیونکہ کسی نبی کا کسی دوسرے نبی پر ایمان لانا بلا مانع ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں جیسا کہ اس کا ثبوت سورۃ بقرہ کی آیت ۲۸۵ میں موجود ہے جس میں ارشاد الہی ہے: ”اٰمِنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلُّ اٰمِنٍ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ.....“ (رسول ایمان لایا اس پر جو کچھ اس کی طرف اس کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا اور مومنین ایمان لائے، ہر ایک ایمان لایا اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر.....) لیکن جملہ ”قَوْلُوا اٰمِنًا بِاللّٰهِ وَمَا اُنزِلَ اِلَيْنَا وَمَا اُنزِلَ اِلَىٰ اِبْرٰهٖمَ.....“ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ”لَتَوْمِنُنَّ بِهِ“ کی ضمیر کی بازگشت ”لَمَّا اَتَيْتُكُمْ مِنْ كُتُبٍ وَحِكْمَةٍ“ کی طرف ہے اور ”لَتَصْرِفُهُ“ کی ضمیر کی بازگشت ”رَسُولٌ“ کی طرف ہے، اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ میں نے تمہیں جو کتاب و حکمت عطا کی ہے اس پر ضرور ایمان لانا اور اس رسول کی نصرت ضرور کرنا جو تمہارے پاس تمہاری کتاب و حکمت کی تصدیق کرنے والا بن کر آئے۔

## عہد الہی کا اقرار و پختگی

○ ”قَالَ أَقَدَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَيَّ ذَلِكُمْ إِيصْرِي قَالُوا أَأَقْدَرْنَا“  
(خدا نے پوچھا: کیا تم نے اقرار کر لیا اور اس پر میرے ساتھ پختہ عہد کر لیا ہے؟ انہوں نے عرض کی: ہاں ہم نے اقرار کر لیا)

یہاں استفہام یعنی خداوند عالم کا ان سے اقرار کے بارے میں پوچھنا مطلب کی پختگی کی غرض سے تھا اور ”اقرار“ کا معنی معروف ہے، ”اصر“ کا معنی عہد و پیمانہ ہے اور یہاں ”أَخَذْتُمْ“ کا مفعول یہ واقع ہوا ہے، اور اخذ العہد میں آخذ یعنی عہد لینے والے کے علاوہ ماخوذ منہ یعنی جس سے عہد لیا گیا ہو، ضروری ہوتا ہے اور وہ آیت مبارکہ میں انبیاء کی امتوں کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، لہذا آیت کا معنی یہ ہوگا کہ کیا تم نے اس عہد و پیمانہ کا اقرار کر لیا ہے؟ اور کیا تم نے میری عہد پر اپنی امتوں سے وفا کرنے کا وعدہ لے لیا ہے؟ انبیاء نے کہا: ہاں، ہم اپنے اقرار پر ہیں۔

اخذ العہد کے بارے میں بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انبیاء نے اسے اپنے لئے قبول کر لیا، تو اس بناء پر جملہ ”وَأَخَذْتُمْ عَلَيَّ ذَلِكُمْ“ جملہ ”أَقْدَرْتُمْ“ کا عطف بیان ہے، کیونکہ انبیاء نے جواب میں ”أَخَذْنَا“ کی بجائے ”أَقْدَرْنَا“ کہا، لہذا میثاق سے مراد انبیاء سے لیا جانے والا عہد و میثاق ہے کہ جس میں ان کے علاوہ کوئی دوسرا شامل نہیں۔

لیکن جملہ ”قَالَ فَاشْهَدُوا“ اس قول کی صحت کو مخدوش کر دیتا ہے کیونکہ گواہی ہمیشہ کسی دوسرے کے بارے میں ہوتی ہے نہ کہ خود اپنے بارے میں یا اپنے خلاف! اسی طرح جملہ ”قُلْ أَمَّا بِلَهِ“ (کہہ دو کہ ہم ایمان لائے) بھی اس قول کی بابت ”فَاشْهَدُوا“ جیسا کردار ادا کرتا ہے کیونکہ اگر ان کے علاوہ کوئی دوسرا اس میں شامل نہ ہوتا تو یوں کہا جاتا: ”قُلْ أَمَّا بِلَهِ“ (کہہ دو کہ میں ایمان لایا) تو صاف ظاہر ہے کہ ”أَمَّا“ آنحضرت اور آپ کی امت دونوں کی طرف سے اظہار ایمان ہے۔ لیکن یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان دو جملوں: ”فَاشْهَدُوا“ اور ”قُلْ أَمَّا بِلَهِ“ سے امتوں کا انبیاء کے ساتھ اشتراک عمل ثابت ہوتا ہے، البتہ جملہ ”وَأَخَذْتُمْ“ سے اس سلسلہ میں کسی مطلب کا ثبوت نہیں ملتا۔



## گواہی کا اظہار

○ ” قَالَ فَاشْهَدُوا وَإِنَّا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ “  
(اس نے کہا تم گواہی دو اور میں تمہارے ساتھ گواہی دینے والوں میں سے ہوں)

بظاہر شہادت و گواہی..... جیسا کہ سابق الذکر مطالب میں بیان ہو چکا ہے..... کسی دوسرے کے بارے میں (اس حق میں یا اس کے خلاف) ہوتی ہے، تو اس آیت میں جس شہادت و گواہی کا ذکر ہے اس سے انبیاء اور ان کی امتوں دونوں کی گواہی مراد ہے چنانچہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہی بات جملہ ”قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ“ سے ثابت ہوتی ہے اور آیت کا سیاق بھی اسی کی تصدیق کرتا ہے کیونکہ ان آیات میں اہل کتاب کو پیغمبر اسلام کی دعوت حق پر لیک نہ کہنے پر اسی طرح مورد مذمت قرار دیا گیا ہے جس طرح حضرت عیسیٰؑ و حضرت موسیٰ علیہما السلام کی طرف ناروا نسبتیں دینے کی بناء پر ان کی مذمت کی گئی چنانچہ آیت مبارکہ ”اَفَعْبِدُوْا اللّٰهَ يَبْعُوْنَ“ اور دیگر آیات سے ان کی مذمت کا ثبوت ملتا ہے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ جملہ ”فَاشْهَدُوا“ سے بعض انبیاء کی دوسرے بعض انبیاء کے بارے میں گواہی دینا مراد ہے،

اسی طرح ایک قول یہ بھی ہے کہ ”فَاشْهَدُوا“ کا مخاطب انبیاء نہیں بلکہ ملائکہ ہیں۔

اگرچہ یہ دو احتمال قرین قیاس قرار دیے جاسکتے ہیں لیکن آیت کے الفاظ سے ان میں سے کسی کا اشارہ و ثبوت نہیں ملتا کیونکہ اس حوالہ سے کلام میں کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا بلکہ جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا اور آگاہ ہو چکے ہیں کہ کلام میں اس کے برعکس اور اس کی نفی کا قرینہ پایا جاتا ہے۔

## ایک لطیف نکتہ

اس آیت مبارکہ میں ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ جملہ ”وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّنَ (۳) ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ“ کو سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۳ ”كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً“ کی تفسیر میں ذکر کئے گئے مطالب کے تناظر میں دیکھا جائے تو نبوت و رسالت کے درمیان پائے جانے والے فرق سے آگاہی حاصل ہوتی ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ

رسول، نبی سے انحصار ہوتا ہے یعنی سلسلہ ہدایت کی ان دو کڑیوں کا رتبہ میں فرق یہ ہے کہ ہر نبی، رسول نہیں ہوتا مگر ہر رسول، نبی ہوتا ہے،..... اور رسالت کا درجہ نبوت سے بالاتر ہے..... لہذا آیت مبارکہ کے الفاظ اس حقیقت پر دلالت کرتے ہیں کہ جو عہد و پیمانہ سے لیا گیا وہ دراصل مقام نبوت سے مقام رسالت کے لئے لیا گیا تھا لیکن اس کا الٹ نہیں یعنی مقام رسالت سے مقام نبوت کے لئے کوئی عہد نہیں لیا گیا۔

اس لطیف نکتہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے زیر بحث آیہ مبارکہ کی تفسیر میں بعض مفسرین کے ان ذکر کردہ مطالب پر بحث و تحقیق کی راہ کھل جاتی ہے جن میں انہوں نے کہا کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ تمام انبیاء سے تمام انبیاء کے لئے پیمانہ لیا گیا کہ وہ ایک دوسرے کی تصدیق کریں یعنی ہر نبی دوسرے نبی کی نبوت کو تسلیم کرے اور اس پر ایمان لانے کا حکم دے، گویا آیہ مبارکہ اس مطلب کو بیان کرتی ہے کہ دین ایک ہے اور تمام انبیاء اسی کی دعوت دیتے ہیں،..... اس پر بحث و مباحثہ کا امکان کسی وضاحت کا محتاج نہیں.....

آیت کے معنی کا خلاصہ یہ ہے کہ خداوند عالم نے تمام انبیاء اور ان کی امتوں سے یہ عہد و پیمانہ لیا کہ اگر اللہ انہیں کتاب و حکمت عطا کرے اور ان کے پاس وہ رسول آئے جو ان کے پاس موجود خدا کی عطا کردہ..... کتاب و حکمت..... کی تصدیق کرنے والا ہو تو وہ خدا کی دی ہوئی کتاب و حکمت پر ضرور ایمان لائیں اور اس رسول کی نصرت و مدد کریں تو یہی کام انبیاء کی طرف سے ایک دوسرے کی تصدیق کرنے کا نام ہے یعنی بعد میں آنے والے نبی کی طرف سے اپنے ما قبل اور اپنے ہم عصر نبی کی تصدیق اور پہلے آنے والے نبی کی طرف سے بعد میں آنے والے نبی کی تشریف آوری کی بشارت و خوشخبری ہے اور امت کو اس پر ایمان لانے اور اس کی اطاعت کا تاکید فرمان ہے۔ اسی طرح امت کی طرف سے ان انبیاء پر ایمان لانے، ان کی تصدیق کرنے اور ان کی نصرت و مدد کرنے کا معنی بھی یہی ہے، اسی کو دین کا ایک ہونا کہا جاتا ہے..... اور اسی سے دین کی وحدت کا ثبوت ملتا ہے.....

اس مقام پر ایک قول یہ بھی ہے کہ جسے بعض مفسرین نے پیش کیا ہے اور وہ یہ کہ آیہ مبارکہ سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے انبیاء سے عہد و پیمانہ لیا کہ وہ حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق کریں اور اپنی امتوں کو ان کی بشارت و تشریف آوری کی بشارت و خوشخبری دیں۔

اگرچہ یہ مطلب اصل میں صحیح ہے اور جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں آیات کے سیاق سے تو اس کا ثبوت ملتا ہے البتہ زیر نظر آیہ مبارکہ کے الفاظ اس پر دلالت نہیں کرتے کیونکہ آیت کے الفاظ میں عمومیت پائی جاتی ہے اور اس میں تمام انبیاء شامل ہیں، بلکہ آیت کا مورد مغل یہ ہے کہ وہ اہل کتاب کے خلاف احتجاج کے مقام میں ہے اور انہیں اپنی کتابوں میں تشریف کرنے، آیات نبوت کا کتمان کرنے..... انہیں چھپانے..... اور واضح و صریح حق سے دشمنی و عناد رکھنے پر مورد مذمت قرار

دے رہی ہے۔

## میثاق کی تاکید

○ ” فَمَنْ تَوَلَّى بَعْدَ ذَلِكَ “  
(جو شخص اس کے باوجود منہ موڑے)  
یہ جملہ انبیاء سے لئے گئے مذکورہ عہد و پیمان کی تاکید مزید کرتا ہے، اس کا معنی واضح ہے۔

## دین الہی کے علاوہ دوسرا دین کیوں؟

○ ” أَفَعَيَّرُوا لِلَّهِ بَدْعُونَ “  
(کیا وہ دین الہی کے علاوہ چاہتے ہیں؟)

یہ جملہ انبیاء سے عہد و پیمان لینے کے بیان پر مشتمل آیت کی فرغ و نتیجہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس بناء پر اس کا معنی یہ ہے کہ اب جبکہ یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ خدا کا دین ایک ہے اور اسی پر تمام انبیاء اور ان کی امتوں سے عہد لیا گیا کہ ہر پہلے آنے والا نبی اپنے بعد آنے والے نبی کی آمد کی بشارت دے اور جو کچھ وہ لائے اس پر ایمان لا کر اس کی تصدیق کرے، تو اس کے بعد یہ اہل کتاب کیا چاہتے ہیں اور آپ کا انکار کیوں کرتے ہیں؟ ان کے ظاہر الحال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسرے دین کی تلاش میں ہیں، تو کیا وہ اسلام کہ جو تو حیدی دین ہے کے علاوہ کسی دین کو پسند کرتے ہیں؟ اور اسی وجہ سے وہ آپ کی تصدیق نہیں کرتے..... آپ پر ایمان نہیں لاتے..... اور نہ ہی وہ دین اسلام کو اختیار کرتے ہیں حالانکہ ان پر دین سے وابستہ رہنا واجب و لازمی ہے کیونکہ وہ فطری دین ہے، اس کی بنیاد فطرت پر استوار ہے، لہذا ضروری ہے کہ اسے ہی دین و آئین زندگی اور دستور حیات قرار دیں اور اسلام کی حقانیت کی دلیل اس حقیقت کو قرار دیں کہ آسمانوں اور زمین میں بسنے والے تمام عقلمند و باشعور افراد نے جس طرح تکوینی و تخلیقی طور پر خدائے واحد کے حضور سر تسلیم خم کر دیا اسی طرح اب تشریحی حوالہ سے بھی اس کو مانیں اور اس کے فرامین و دستورات کو فکری و عملی طور پر تسلیم کریں۔

## تمام مخلوق بارگاہِ ربوبیت میں سرنخم!

○ ”وَلَا أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا“  
(اور اسی کے حضور سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے ہر وہ شخص جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے طوعاً و کرہاً)۔

اس آیت مبارکہ میں جس اسلام (سر تسلیم خم کرنے) کا ذکر ہوا ہے اس کے مصداقی اطلاق کا دائرہ وسیع ہے، اس میں آسمانوں اور زمین کے بسنے والے لے کہ جن میں اپنے آپ کو غیر مسلم کہلانے والے اہل کتاب بھی ہیں، سب کے سب شامل ہیں، اور ”اسلم“ فعل ماضی کا صیغہ ہے جس سے گذشتہ زمانہ میں وقوع پذیر ہونے والے امر کا ثبوت ملتا ہے اور یہاں اس سے مراد عالم تکوین میں امر خداوندی کو تسلیم کرنا ہے، عبودیت و بندگی کے طور پر عملی فرمانبرداری مقصود نہیں، چنانچہ اس کی تصدیق یا ثبوت ”طوعاً و کرہاً“ کے الفاظ میں موجود ہے۔

یاناہیں جملہ ”وَلَا أَسْلَمَ“ (اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کر لیا ہے) ان موارد میں استعمال ہونے والے جملوں کی طرح ہے جہاں اصل مطلب و مقصود کے بیان کی بجائے اس کی دلیل و سبب کے بیان پر اکتفاء کی جاتی ہے، لہذا آیت کی توضیحی عبارت یوں فرض کی جائے گی:

”ا فغیر الاسلام بیغون؟ وهو دین اللہ لان من فی السموات والارض مسلمون له منقادون لامره، فان رضوا به كان انقيادهم طوعاً من انفسهم، وان كرهوا ماشائه، و ارادوا غيره كان الامر امره وجرى عليهم كرهاً من غير طوع“

(کیا وہ اسلام کے علاوہ کوئی دین تلاش کرتے ہیں؟ حالانکہ اسلام خدا کا دین ہے کیونکہ آسمان اور زمین میں موجود ہر شخص اسی کے تابع اور اس کے حکم کا فرمان بردار ہے، لہذا اگر وہ اس کے حکم پر راضی ہو جائیں تو ان کی فرماں برداری خود ان کی اختیار کردہ ہوگی، اور اگر خواستہ خدا کو ناپسند کریں اور اس کے علاوہ کچھ چاہیں تو حکم اسی کا ہوگا البتہ ان پر ان کی ناپسندیدگی اور عدم اطاعت کے ساتھ نافذ ہوگا)۔

اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ ”طوعاً و کرہاً“ میں حرف واو، تقسیم کے لئے ہے، اور ”طوع“ سے ان کی اس چیز میں رضایت مراد ہے جس میں خدا کو ان کی رضایت مطلوب ہو، اور ”کرہ“ سے ان کی اس چیز میں عدم رضایت و ناپسندیدگی مراد ہے جو خدا ان کے لئے چاہے مثلاً موت، فقر، بیماری اور اس طرح کی دیگر چیزیں!

## سب کی بازگشت اللہ کی طرف!

○ ”وَاللّٰیہُ یُرْجَعُوْنَ“

(اور اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے)

خدا کی طرف سب کی بازگشت ایک ایسا امر ہے جو اسلام کو دین کے طور پر تسلیم کرنے کے واجب و لازمی ہونے کا سبب ہے، کیونکہ اللہ کی طرف ان کی بازگشت ان کے حقیقی آقا و مولا کی طرف بازگشت ہے، نہ کہ اس کی طرف ہے جسے ان کا کفر و شرک لے جاتا ہے۔

## دائرۃ ایمان کی وسعت

○ ”قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنزِلَ عَلَيْنَا“

(کہہ دو کہ ہم اللہ پر اور جو کچھ ہم پر نازل کیا گیا اس پر ایمان لائے)

اس جملہ میں خدا نے حضرت پیغمبر اسلامؐ کو حکم دیا کہ عہد و پیمان اور میثاق کے مطابق عمل کرتے ہوئے خود بھی کہیں اور اپنی امت سے بھی کہلوائیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا.....، یہ فرمان الہی خود اس حقیقت کی دلیل ہے کہ وہ میثاق، انبیاء اور ان کی امتوں دونوں سے لیا گیا تھا، چنانچہ سطور بالا میں اس مطلب کی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔

## سابقہ انبیاء پر ایمان

○ ”وَمَا اُنزِلَ عَلٰی اِبْرٰہِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ..... الخ“

(اور اس پر ایمان لائے جو نازل کیا گیا ابراہیم و اسماعیل پر.....)

اس آیت مبارکہ میں جن انبیاء کے اسماء گرامی قدر مذکور ہیں وہ ال ابراہیم سے ہیں، یہ آیت اس مطلب کے بیان

سے خالی نہیں کہ ”اسباط“ سے ذریت یعقوبؑ سے انبیاء یا اسباط بنی اسرائیل مراد ہیں مثلاً حضرت داؤد، حضرت سلیمانؑ حضرت یونسؑ، حضرت ایوبؑ اور دیگر حضرات انبیاء کرامؑ !

## تمام انبیاء الہی پر ایمان کا ذکر!

○ ”وَالَّذِينَ مِنْ سَائِبِهِمْ.....“

(اور ان کے پروردگار کی طرف سے تمام انبیاء.....)

یہ جملہ کلام کا مصداق دائرہ وسیع کرتا ہے تاکہ اس میں حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ اور ان کے علاوہ سب اس میں شامل ہوں، پھر ان تمام انبیاء کو اس جملہ میں یکجا بیان فرمایا: ”لَا نَفْرَقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ“ (ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم تو خدا کے حضور سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں)۔

## میثاق پر عمل کرنے کا تاکید بیان

○ ”وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ وَدِينًا فَلاَن يُقْبَلْ مِنْهُ“

(اور جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی دین چاہے تو اس سے قبول نہ کیا جائے گا)

اس آیت میں اس مورد کی نفی کی گئی ہے جس کے بارے میں میثاق نہیں لیا گیا یعنی اسلام کے علاوہ دوسرا دین! تو یہ بیان میثاق پر لازمی عمل کرنے کی تاکید صورت ہے۔

(اللہ تعالیٰ نے اسلام کو حقیقی معنی میں دین کا نام دیا ہے البتہ اس کے علاوہ جو راہ و روش اپنائی جائے اسے دین سے موسوم تو کیا جاسکتا ہے مگر وہ خدائی دین نہیں کہلا سکتا، خدائی دین صرف اسلام ہے جو کہ دین فطرت ہے اور اسی کی تعلیم و تبلیغ تمام انبیاء کرتے رہے اور ان سب میں بنیادی اصول یکساں ہیں۔ م)

## روایات پر ایک نظر

### انبیاء سے خدائی عہد و پیمان

تفسیر مجمع البیان میں مذکور ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

”ان اللہ اخذ الميثاق على الانبياء قبل نبينا ان يخبروا اممهم بمبعثه ، و يبشروهم به و

يامروهم بتصديقه“

(خداوند عالم نے ہمارے نبی سے ما قبل انبیاء کرام سے عہد لیا کہ وہ اپنی امتوں کو آنحضرتؐ کی تشریف آوری و بعثت اور صفات و اوصاف سے آگاہ کریں اور انہیں ان کی آمد کی بشارت و خوشخبری دیں اور انہیں ان کی تصدیق کرنے ..... ان پر ایمان لانے ..... کا حکم دیں۔

(مجمع البیان ج ۱ ص ۳۶۸)

### ہر نبی سے ایک ہی وعدہ

تفسیر ”درمنثور“ میں ابن جریر کی بیان کردہ روایت ذکر کی گئی ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علی ابن ابی طالبؑ نے

ارشاد فرمایا:

”لم يبعث الله نبياً ادم فممن بعده الا اخذ عليه العهد في محمد (ص) لئن بعث وهو

حي ليومنن به ولينصرنه ويأمره فيأخذ العهد على قومه ، ثم تلا: ”واذ اخذ الله ميثاق النبين لما

آتيتكم من كتاب وحكمة..... الخ“

(حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے بعد خدا نے جس نبی کو بھی مبعوث فرمایا اس سے حضرت محمدؐ مصطفیٰ کی بعثت

کے بارے میں عہد و پیمان لیا کہ اگر اس کی زندگی میں آنحضرتؐ مبعوث ہوئے تو ضرور ان پر ایمان لائے اور ان کی مدد

کرے، اور اسے حکم دیا کہ وہ اپنی امت سے یہی عہد لے، پھر انام نے یہ آیت تلاوت کی :

”وَإِذَا خَذَا اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ... الخ“

(تفسیر درمنثور ج ۲ ص ۴۷)

## میثاق کے انطباقی مورد کا بیان

تفسیر مجمع البیان اور جوامع میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے ایک روایت مذکور ہے کہ آپؑ نے زیر نظر آیت مبارکہ کی تفسیر میں ارشاد فرمایا:

”وَإِذَا خَذَا اللَّهُ مِيثَاقَ أُمَّةٍ مِنَ النَّبِيِّينَ كُلِّ أُمَّةٍ بِتَصْدِيقِ نَبِيِّهَا وَالْعَمَلُ بِمَا جَاءَهُمْ بِهِ فَمَا وَفَّوْا بِهِ وَتَرَكُوا كَثِيرًا مِنْ شَرَائِعِهِمْ وَحَرَفُوا كَثِيرًا“

(یاد کرو اس وقت کو جب خدا نے انبیاءؑ کی امتوں سے عہد لیا کہ ہر امت اپنے نبی کی تصدیق کرے) (اس پر ایمان لائے) اور وہ جو حکم الہی لائیں اس پر عمل کرے، لیکن امتوں نے اس عہد کو پورا نہ کیا اور ان کے اکثر فرامین و دستورات کو ترک کر دیا اور کثیر احکام میں رد و بدل کر دی۔

(تفسیر مجمع البیان ج ۲ ص ۴۵۸)

اس روایت میں آیت مبارکہ کے ایک واضح مصداق کو بیان کیا گیا ہے، لہذا اس سے آیت میں انبیاءؑ اور ان کی امتوں دونوں کے مراد ہونے کی نفی نہیں ہوتی۔

## اقرار و عہد کی وضاحت

تفسیر مجمع البیان میں مذکور ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ نے ارشاد فرمایا: خداوند عالم نے انبیاء علیہم السلام سے

پوچھا:

”عَأَقْرَبْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذٰلِكُمْ اٰصْرِي“

(کیا تم نے اقرار کر لیا ہے اور اس پر پختہ عہد لے لیا)

تو اس سے مراد یہ ہے کہ کیا تم نے اقرار کر کے اس پر اپنی امتوں سے عہد لے لیا ہے (أَقْرَبْتُمْ وَأَخَذْتُمْ الْعَهْدَ

بذٰلِكَ عَلَىٰ اِمْتِكُمْ)؟



قالوا: أقررنا بما امرتنا بالاقرار به ،

انہوں نے (انبیاء اور ان کی امتوں نے) کہا: ہاں، تو نے ہمیں جس چیز کے اقرار کا حکم دیا ہم نے اس کا اقرار کر لیا

ہے۔

” قال الله: فاشهدوا بذلك على اممكم وانا معكم من الشاهدين عليكم و على

اممكم“

(خدا نے فرمایا کہ تم اس میں اپنی امتوں کے گواہ رہو ، اور میں تم پر اور تمہاری امتوں پر گواہ ہوں)۔

(تفسیر مجمع البیان جلد ۲ صفحہ ۴۶۸)

## گواہی کے معنی کی وضاحت

تفسیر ”درمنثور“ میں ابن جریر سے روایت مذکور ہے کہ انہوں نے کہا حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب نے آیت مبارکہ ”قَالَ فَاشْهَدُوا“ کی تفسیر میں ارشاد فرمایا:

” قال فاشهدوا على اممكم بذلك وانا معكم من الشاهدين عليكم وعليهم فمن تولي عنك يا محمد بعد هذا العهد من جميع الامم فالولئك هم الفاسقون، هم العاصون في الكفر“ (تم اپنی امتوں پر اس کے گواہ رہو اور میں تم پر اور ان پر تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں، تو تمام امتوں میں سے جو شخص اس عہد و پیمان کے بعد تم سے روگرداں ہوا، اے محمد! تو ایسے لوگ ہی فاسق و نافرمان اور کفر کی حالت میں گناہگار ہیں)۔

اس روایت کے معنی کی توجیہ ذکر ہو چکی ہے۔

## عالم ذر کے حوالہ سے عہد و پیمان کا تذکرہ !

تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے آپ نے ارشاد فرمایا:

” قال لهم في الدر: أقررتم و اخذتم على ذلكم اصري اى عهدى ؟ قالوا اقررنا، قال

الله للملائكة فاشهدوا“

خداوند عالم نے ان سے کہا: کیا تم نے اقرار کر لیا اور اس پر میرے اصرار یعنی عہد کو پختہ بنا دیا؟ انہوں نے کہا: ہم نے اقرار کر لیا ہے، تب خداوند عالم نے فرشتوں سے فرمایا: تم گواہ رہو!

(تفسیر قمی، جلد ۲ ص ۱۰۷)

آیت کے الفاظ سے اس روایت کی نفی تو نہیں ہوتی البتہ سابق الذکر مطالب سے بظاہر یہ معنی سمجھا نہیں جاتا۔

## اعمال کی گویائی

تفسیر ”درمنثور“ میں آیت مبارکہ ”ومن یتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منه“ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ احمد نے، اور ”الاوسط“ میں طبرانی نے ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام نے ارشاد فرمایا:

”تجیی الاعمال یوم القیامۃ فتجیی الصلوٰۃ فتقول: یا رب! انا الصلوٰۃ، فیقول: انک علی خیر، و تجیی الصدقۃ فتقول: یا رب! انا الصدقۃ، فیقول: انک علی خیر، ثم تجیی الصیام فیقول: انا الصیام، فیقول: انک علی خیر، ثم تجیی الاعمال ولکل ذلک یقول اللہ: انک علی خیر، یک الیوم اخذ، و یک اعطی، قال اللہ فی کتابہ: ومن یتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منه وهو فی الآخرة لمن الخاسرین“

قیامت کے دن اعمال آئیں گے..... بارگاہ خداوندی میں پیش ہوں گے..... نماز آئے گی اور کہے گی: پروردگار! میں نماز ہوں، خداوند عالم کہے گا: تو خیر پر ہے، اور صدقہ آئے گا اور کہے گا: پروردگار! میں صدقہ ہوں، خداوند عالم کہے گا: تو خیر پر ہے، پھر روزہ آئے گا اور کہے گا: پروردگار! میں روزہ ہوں، خدا کہے گا: تو خیر پر ہے، اس کے بعد سب اعمال یکے بعد دیگرے آئیں گے اور خداوند عالم ہر ایک سے کہے گا: تو خیر پر ہے اور آج تو ہی میرے اخذ و عطا کا معیار ہے۔ خداوند عالم نے اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا ہے: ”جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی دین چاہے تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ قیامت کے دن نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔“

(تفسیر ”درمنثور“ ج ۲ ص ۴۸)

کتاب ”توحید“ صدوق حدیث ۷، اور کتاب تفسیر العیاشی ج ۱ ص ۱۸۲ حدیث ۷۸ میں حضرت امام جعفر صادق علیہا السلام کا ارشاد گرامی مذکور ہے آپ نے اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرمایا کہ اسی سے لوگوں کی توحید و یکتا پرستی کا پتہ چلتا ہے،

اس توحید و یکتا پرستی سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے جو کچھ اپنے بندوں سے کہا اور طلب کیا اور انہیں حکم دیا اس پر سر تسلیم خم کر کے اسے عملی جامہ پہنایا جائے۔

اگر اس سے ہر شریک کی نفی مقصود ہو تو ”طوعاً و کرہاً“ سے اعتیاری و اضطراری دلالت مراد ہوگی۔

قارئین کرام! یہاں کچھ دیگر روایات بھی موجود ہیں جو تفسیر العیاشی، تفسیر قمی اور دیگر کتب تفسیر میں ذکر کی گئی ہیں ان میں آیہ مبارکہ ”وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ“ کی معنوی تفسیر کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے کہ ”لَتَشُوْا وَنُؤِيْهِ“ سے مراد یہ ہے کہ تم پیغمبر اسلام پر ایمان لانا، اور ”وَلَتَنْصُرُوْهُ“ سے مراد یہ ہے کہ تم امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب کی نصرت کرنا، یعنی ”لَتَشُوْا وَنُؤِيْهِ“ میں ”ہہ“ کی ضمیر کی بازگشت حضرت پیغمبر اسلام کی طرف ہے اور ”لَتَنْصُرُوْهُ“ میں ضمیر ”ہ“ کی بازگشت حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کی طرف ہے۔ لیکن آیت کے الفاظ اس پر دلالت نہیں کرتے، البتہ تفسیر العیاشی میں ایک روایت مذکور ہے جس میں سلام بن مستعیر نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی بیان کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: انہوں نے اپنے آپ کو اس نام سے موسوم کیا ہے کہ خداوند عالم نے حضرت علی بن ابی طالب کے علاوہ کسی کو اس نام سے موسوم نہیں کیا البتہ ابھی اس کی تاویل سامنے نہیں آئی، سلام بن مستعیر نے کہا کہ میں نے پوچھا: میری جان آپ پر قربان ہو، یہ بتائیے کہ اس کی تاویل کب آئے گی؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا کہ اس کی تاویل اس وقت آئے گی جب خداوند عالم انبیاء و مومنین کو آجانب کے روبرو اکٹھا کرے گا کہ اس کی نصرت کریں، اور یہی معنی ہے اس آیہ مبارکہ کا:

”وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كُتُبٍ وَحِكْمَةٍ..... تَا..... وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ“

(ملاحظہ ہو: تفسیر العیاشی، ج ۱ ص ۱۸۱)

مذکورہ بالا بیان سے روایت کے مصداقی معنی کے تعین کی بابت پیدا ہونے والے اشکال کا معاملہ آسان ہو جاتا ہے کیونکہ اشکال اسی صورت میں پیدا ہوگا جب روایات میں آیت کی تفسیر بیان کی گئی ہو لیکن اگر تفسیر کی بجائے تاویل یعنی مصداقی معنی کے تعین کا حوالہ ہو تو اشکال ختم ہو جائے گا کیونکہ تاویل لفظ کی ملحوظ معنی پر دلالت کا نام نہیں اور نہ ہی اس کا لفظ سے کوئی تعلق ہوتا ہے چنانچہ اس موضوع کی بابت سورۃ آل عمران آیت ۷۱ ”هُوَ الَّذِي آتَىٰكَ الْكِتَابَ.....“ کی تفسیر میں مربوط مطالب ذکر ہو چکے ہیں۔

## آیات ۸۶ تا ۹۱

- کَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِبْرَانِيهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ  
الْبَيِّنَاتُ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۸۶﴾
- أُولَئِكَ جَزَاءُ وَّهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْبَلَاءِ كَمَا وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿۸۷﴾
- خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿۸۸﴾
- إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا ۗ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۸۹﴾
- إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِبْرَانِيهِمْ ثُمَّ آذَوْا كُفْرًا لَنْ نُقْبَلَ تَوْبَتَهُمْ ۗ وَأُولَئِكَ  
هُمُ الضَّالُّونَ ﴿۹۰﴾
- إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفْرًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَ  
لَوْ أَقْتَدَى بِهِ ۗ أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ﴿۹۱﴾

## ترجمہ

- ” ان لوگوں کو خدا کس طرح ہدایت کی راہ پر لائے جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے اور انہوں نے رسول کے برحق ہونے کی گواہی بھی دی اور ان کے پاس واضح دلائل بھی آگئے، ہاں، خدا ظالموں کو ہدایت کی نعمت عطا نہیں کرتا
- (۸۶)
- ” ان لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر خدا، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے “
- (۸۷)
- ” وہ ہمیشہ اس کا شکار رہیں گے، ان کی سزا میں کمی نہ کی جائے گی اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائے گی “
- (۸۸)
- ” سوائے ان لوگوں کے کہ جنہوں نے بعد میں توبہ کی اور پھر اپنی اصلاح کر لی، تو خدا معاف کرنے والا، نہایت مہربان ہے “
- (۸۹)
- ” جو لوگ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے پھر کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے ان کی توبہ ہرگز قبول نہ ہوگی اور وہی حق کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں “
- (۹۰)
- ” جو لوگ کافر ہوئے اور مرتے دم تک کافر رہے وہ پوری زمین سونا بھر کر فدیہ بھی دیں تب بھی ان سے قبول نہ کیا جائے گا، انہی کے لئے دردناک عذاب ہوگا اور ان کی کوئی مدد نہ کی جائے گی “
- (۹۱)

## تفسیر و بیان

ان آیات مبارکہ کے بارے میں دو امکانی پہلو موجود ہیں ایک یہ کہ ان کا ربط و تعلق ما قبل آیات شریفہ سے ہے جو کہ اہل کتاب کے بارے میں مطالب پر مشتمل ہیں اور دوسرا یہ کہ ان کا سابقہ آیات سے کوئی ربط و تعلق نہیں بلکہ یہ اپنے موضوع میں مستقل حیثیت رکھتی ہیں، ان دونوں احتمالات اور ممکنہ پہلوؤں کا حوالہ ایک ظاہر و واضح حقیقت ہے۔

### ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے والے

○ ”كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ“

(خدا کیونکر ان لوگوں کو ہدایت کی نعمت عطا کرے جو ایمان لانے کے بعد دوبارہ کافر ہو گئے)

”كَيْفَ يَهْدِي“ کے الفاظ استفہام انکاری کی ایک صورت ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ لوگ ہدایت خداوندی کی نعمت سے بہرہ ور نہیں ہوں گے، یہاں ان کے ہدایت پانے کو بعید قرار دینے سے مراد یہ ہے کہ ممکن ہی نہیں وہ ہدایت یافتہ ہو سکیں، چنانچہ اس کا اشارہ آیت مبارکہ کے اختتامی الفاظ میں موجود ہے جس میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ”وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ“ کہ خدا ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔ اس طرح کے جملوں کی بابت متعدد بار بیان ہو چکا ہے کہ ان میں مذکورہ وصف سے حکم کی علت و سبب کا پتہ چلتا ہے، تو اس بناء پر یہاں جو وصف مذکور ہے اس کے تناظر میں کہا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں میں اس وصف کے ہوتے ہوئے خدا انہیں ہدایت سے ہرگز نہیں نوازے گا۔ البتہ اس سے ان کے توبہ کرنے اور ایمان کی راہ پر واپس آجانے کی صورت میں خدا کی ہدایت سے بہرہ ور ہونے کے امکان کی نفی نہیں ہوتی، یعنی ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے کی صورت میں خدائی نعمت ہدایت سے محرومی اور دوبارہ ایمان لانے اور اپنے کئے پر ندامت کے بعد توبہ کرنے کی صورت میں خدائی نعمت ہدایت سے بہرہ ور ہونے کا حقدار بننے میں منافات نہیں پائی جاتی۔

## رسول کے برحق ہونے کی گواہی

○ ”وَشَهِدُوا ان الرَسُولَ حَقٌّ“  
(اور انہوں نے گواہی دی کہ رسول حق ہے)

اگر اس جملہ میں شہادت و گواہی دینے والوں سے مراد اہل کتاب ہوں تو ان کے گواہی دینے سے مراد یہ ہوگا کہ انہوں نے ان آیات نبوت کو حضرت پیغمبر اسلام پر کامل منطبق پایا، یعنی ان آیات کی تطبیق کا مشاہدہ کیا، چنانچہ اس کی تائید بعد والے الفاظ ”وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ“ سے بھی ہوتی ہے، اور اگر گواہی دینے والوں سے مراد وہ لوگ ہوں جو مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہو گئے تو ان کی گواہی سے مراد یہ ہوگا کہ انہوں نے رسالت کا اقرار ظاہری طور پر اور جہالت و نا آگاہی اور جاہلانہ قومی تعصب وغیرہ کی بناء پر نہیں کیا بلکہ حق و حقیقت کے واضح و آشکار ہونے کی بناء پر کیا چنانچہ اس کی تائید بھی اسی بعد والے جملہ ”وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ“ سے ہوتی ہے۔

بہر حال گواہی دینے والوں سے مراد خواہ اہل کتاب ہوں یا دوسرے لوگ ہوں، دونوں صورتوں میں ”وَشَهِدُوا“ اَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ کے الفاظ کا ابتدائی کلام سے انضمام اس بات کی دلیل ہے کہ ”کفر میں کفر“ سے مراد حق کے ظاہر و آشکار ہونے اور حجت پوری ہونے کے بعد کفر اختیار کرنا اور انکار کر دینا ہے، تو وہ حق سے عناد و دشمنی اور اہل حق سے بے بنیاد الجھنے کی بناء پر ہوگا جو کہ ناحق بغاوت و سرکشی اور ایسا ظلم ہے کہ جس کا مرتکب نجات و فلاح نہیں ہو سکتا۔

## ایک ادبی نکتہ

جملہ ”وَشَهِدُوا“ کے بارے میں بعض اہل ادب کا کہنا ہے کہ وہ ”إِيْمَانِهِمْ“ پر عطف ہے اور ”ایمان“ اگر چہ اسم ہے کہ جس کا عطف فعل کی طرف نہیں ہوتا لیکن یہاں اس لئے فعل کی طرف اس کا عطف ہوا ہے کہ اس میں فعل کا معنی پایا جاتا ہے، اس بناء پر آیت کا معنی سمجھنے کے لئے عبارت کو اس طرح فرض کرنا پڑے گا: ”كُفِرُوا بَعْدَ اَنْ اٰمَنُوا وَ شَهِدُوا.....“ (انہوں نے کفر اختیار کیا بعد اس کے کہ ایمان لائے اور گواہی دی.....)

”وَشَهِدُوا“ میں حرف واو کے بارے میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ حال کا معنی دیتا ہے اور یہ جملہ حالیہ ہے لہذا اس میں حرف ”قد“ فرض کر کے آیت کا معنی سمجھنے میں آسانی ہوگی، گویا عبارت اس طرح قرار پائے گی: ”كُفِرُوا بَعْدَ

ان امنوا وقد شهدوا.....“ (انہوں نے کفر اختیار کیا بعد اس کے کہ وہ ایمان لائے حالانکہ انہوں نے گواہی دی.....)

### لنتنت کی صورت میں سزا

○ ”أُولَٰئِكَ جَزَاءُ ۤأُوۡهُمْ أَنۢ عَلَيۡهِمۡ لَعۡنَةُ ٱللّٰهِ..... الخ“  
(انہی لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی لعنت ہے.....)

اس جملہ میں ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے والوں کی طرف اللہ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت کی بازگشت کو بیان کیا گیا تو اس موضوع یعنی لعنت کی بازگشت..... یا ان پر لعنت برسنا..... کے بارے میں سورہ بقرہ کی آیت ۱۵۹ ”أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ ٱللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ ٱللّعۡنُونَ“ کی تفسیر میں مربوطہ مطالب بیان کئے جا چکے ہیں اور یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ لعنت کرنے والوں (اللہ، فرشتے، تمام افراد بشر، تمام لعنت کرنے والی موجودات) کی لعنت سے کیا مراد ہے اور اس کے نازل ہونے کا کیا معنی ہے؟

### سچی توبہ و اصلاح نفس

○ ”إِلَّا ٱلَّذِينَ تَابُوا۟ مِنۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ وَٱصۡلَحُوا۟..... الخ“  
(البتہ جو لوگ اس کے بعد توبہ کر لیں اور نیک راہ پر چل پڑیں..... الخ)

یہاں سچی توبہ کا ذکر ہے اور آیت سے مراد یہ ہے کہ ان کی توبہ ایسی ہونی چاہیے جو کفر کی گندگی کو ان سے دھو دے اور ان کے باطن کو ایمان کی پاکیزگی عطا کر دے، ان کے دامن پر لگے ہوئے کفر کے داغ دھبے مٹا دے اور ان کے باطن کو پاک کر دے۔ اور جہاں تک اعمال صالحہ کا تعلق ہے (وَٱصۡلَحُوا۟) تو وہ صمیم قلب سے کی جانے والی توبہ کی فرع اور لازمی آثار میں سے ضرور ہے لیکن ایسا نہیں کہ وہ اس کی بنیاد اور اصل و اساس ہے یا اس کے سہارے پر قائم و استوار ہے کیونکہ آیت میں اس طرح کا کوئی اشارہ نہیں ملتا جس سے اعمال صالحہ کے بارے میں اس کا توبہ سے مذکورہ تعلق ثابت ہو۔

اور ”إِلَّا ٱلَّذِينَ تَابُوا۟ مِنۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ وَٱصۡلَحُوا۟“ کے بعد ”فَإِنَّ ٱللّٰهَ غَفُورٌۭ رَّحِيمٌۭ“ کے الفاظ



درحقیقت، علت کو معلول کی جگہ پر لانے کی ایک صورت ہے، یعنی خدا کے غفور و رحیم ہونے کو اس کے مغفرت کرنے اور رحم فرمانے کی جگہ ذکر کیا گیا ہے، لہذا آیت کے فہم المعنی کے لئے عبارت کو اس طرح فرض کیا جائے گا: ”فیغفر اللہ لہ و یرحمہ فان اللہ غفور رحیم“ (تو اللہ اسے بخش دے گا اور اس پر رحم کرے گا کیونکہ اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے)

## ایمان کے بعد کفر میں اضافہ کے مراحل

○ ”إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ شَرُّ أُمَّةٍ كَفَرُوا..... الخ“  
(جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا پھر وہ کفر میں بڑھتے چلے گئے..... الخ)

یہ دو آیتیں (۹۰، ۹۱) آیت ۸۶ کے ابتدائی الفاظ ”كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا“ کی وجہ و سبب کو بیان کرتی ہیں، تو یہ اس طرح سے ہے جیسے کسی قاعدہ کلیہ کو اس کے ایک خاص فرد پر منطبق کیا جائے، بنا بریں آیت کا معنی ہوں ہوگا کہ جو شخص حق کے ظاہر ہونے اور حجت کے پورا ہونے کے باوجود کفر اختیار کرے اور پھر سچے دل سے توبہ (توبہ نصوح) بھی نہ کرے تو وہ درج ذیل دو قسم کے لوگوں میں سے ایک ہوگا:

(۱) وہ کافر، جو کفر اختیار کرتا ہے پھر کفر میں بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ طغیان و سرکشی کا مرتکب ہو جاتا ہے کہ پھر اس کی صلاح و اصلاح کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا، ایسے شخص کو خداوند عالم نہ توبہ ایت کی نعمت عطا کرتا ہے اور نہ ہی اس کی توبہ قبول کرتا ہے لیکن اس کا توبہ کرنا اور حق کی راہ پر واپس آنا حقیقی طور پر نہیں ہوتا، وہ گمراہی کے دلدل میں اس طرح پھنس چکا ہوتا ہے کہ اس کے ہدایت پانے کی توقع و امید ہی ختم ہو جاتی ہے۔

(۲) وہ کافر، جو توبہ کئے بغیر اپنے کفر اور حق سے عناد و دشمنی کے ساتھ ہی مر جاتا ہے، تو ایسے شخص کو آخر دی ہدایت حاصل نہیں ہوگی یعنی خداوند عالم اسے صمیم قلب سے اپنے پروردگار کی طرف واپس نہ آنے کی وجہ سے بہشت میں آنے ہی نہ دے گا اور اس وقت نہ کوئی شفاعت کرنے والا اور مددگار ایسا ہوگا جو اس کی شفاعت کرے یا اس کی مدد کرے؟

اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت ۹۰ کا آخری جملہ ”وَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ“ چونکہ جملہ اسمیہ ہے اور اس میں حرف ”أُولَٰئِكَ“ ذکر کیا گیا ہے کہ جو دور کے اشارہ کے لئے آتا ہے، اور ”هُم“ ضمیر فعل بھی ہے اور جملہ اسمیہ کی خبر یعنی ”الظَّالِمُونَ“ پر الف و لام لایا گیا ہے لہذا ان تمام خصوصیات کے حوالہ سے اس سے ان لوگوں کے گمراہی کی اس آخری حد میں ہونے کا ثبوت پایا جاتا ہے، ان کی ہدایت کی امید ہی نہیں کی جاسکتی۔

اسی طرح جملہ ”وَمَا لَهُمْ مِّنْ نَّاصِرِينَ“ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انہیں ان لوگوں کی شفاعت کوئی فائدہ نہ پہنچائے گی جو قیامت کے دن مدد کرنے والے ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کچھ ایسے افراد ہوں گے جو شفاعت و مدد کریں گے مگر انہیں یعنی ایمان کے بعد کفر اختیار کر کے کفر میں بڑھتے رہنے والوں کو ان کی شفاعت نفع نہ دے گی چنانچہ آیت مبارکہ میں لفظ ”ناصرین“ جمع کے صیغہ میں ذکر ہوا ہے جس سے ایسے افراد اور مستیوں کا قیامت کے دن موجود ہونا ثابت ہوتا ہے جو دوسروں کی مدد کریں گے، اس کی مثال سورہ بقرہ کی آیت ۴۸ کے جملہ ”فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِينَ“ کی تفسیر میں شفاعت کے موضوع پر ہونے والی بحث و استدلال میں موجود ہے (رجوع کریں) زیر نظر سلسلہ بحث کی دوسری آیت (۹۱) قیامت کے دن فدیہ اور مددگاروں کی نفی کے واضح و صریح بیان پر مشتمل ہے کیونکہ وہ دونوں عوض و بدل کی طرح ہیں اور عوض و بدل اسی چیز کا ہوتا ہے جس سے انسان ہاتھ دھو بیٹھے اور اسے کھو دے، تو یہاں وہ لوگ دنیا میں توبہ سے ہاتھ دھو بیٹھے کہ جس کا عوض و بدل آخرت میں کوئی چیز نہیں ہوگی۔

مذکورہ بالا مطالب سے معلوم ہوتا ہے کہ جملہ ”وَمَا تَأْتُواهُم كُفَّارًا“ (اور وہ مر گئے جبکہ وہ کافر تھے) اس معنی میں ہے کہ وہ توبہ نہ کر سکے، بنا براین اس بیان میں جو حصر نمایاں ہے وہ درج ذیل آیت مبارکہ سے مخدوش و بے اثر نہیں ہوتا:

سورہ نساء، آیت: ۱۸

○ ”وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ وَاللَّنْ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارًا“ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا“

(اور ان لوگوں کی توبہ کی کوئی حیثیت نہیں جو برائیوں پر برائیاں کئے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ ان میں سے کسی کو موت آ جائے تو وہ کہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں، اور نہ ہی وہ لوگ جو مر جاتے ہیں جبکہ وہ کافر ہوتے ہیں، انہی لوگوں کے لئے ہم نے دردناک عذاب مقرر کیا ہے)

اس آیت میں ”إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ“ (ان میں سے کسی ایک کو موت آ جائے) سے مراد موت کے آثار کا ظاہر ہونا اور دنیا سے سلسلہ تعلق کا منقطع ہونا ہے کہ پھر اس وقت توبہ کا مقام باقی نہیں رہتا..... گویا کفر کی حالت میں مرنا اور موت کے آثار ظاہر ہونے کے وقت توبہ کرنا دونوں برابر ہیں.....

جملہ ”مِلَّةٌ الْأَرْضِ ذَهَبًا“ میں لفظ ”مِلَّةٌ“ سے مراد کسی چیز کی وہ مقدار ہے جس سے برتن پورا بھر جائے، یہاں ”الْأَرْضِ“ یعنی زمین کو برتن تصور کیا گیا ہے کہ جسے سونے سے بھر دیا جائے، لہذا یہ جملہ استعارہ تخیلیہ اور استعارہ بالکنایہ ہے،..... استعارہ تخیلیہ اس بناء پر ہے کہ سونے سے بھرا ہوا اتنا بڑا برتن صرف عام خیال میں قابل تصور ہے حقیقی وجود میں نہیں! اور استعارہ بالکنایہ اس حوالہ سے ہے کہ اگر بالفرض ایسا برتن موجود بھی ہو تب بھی وہ کسی کام کا نہیں ہوگا

کیونکہ سونے کی قیمت تو دنیا ہی میں دیکھی جاتی ہے اور اسے قیمتی چیز سمجھا جاتا ہے لیکن آخرت میں ایسی مادی اشیاء کی کوئی قدر و حقیقت نہیں ہوگی، اس طرح آیت مبارکہ میں ”وَلِلْأَرْضِ كَثْرَةٌ دَهَبًا“ سے دراصل ایک تصور اتنی شے کا تذکرہ کر کے سمجھایا گیا ہے کہ خواہ کتنی قیمتی چیز فدیہ و عوض کیوں نہ دی جائے کہ وہ پورے کرۂ ارض کے سونے سے بھرا ہوا ہونے کی صورت میں کیوں نہ ہو لیکن اس کا ہرگز کوئی فائدہ نہ ہوگا.....

## روایات پر ایک نظر

### حارث بن سوید کا واقعہ

تفسیر ”مجمع البیان“ میں آیت مبارکہ ”كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا.....“ کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ یہ آیت انصار کے ایک شخص حارث بن سوید بن صامت کے بارے میں نازل ہوئی کہ جس نے محمد بن زیاد الجبلی کو بے گناہ قتل کیا اور فرار ہو کر مکہ چلا گیا اور اسلام سے مرتد ہو گیا، وہ مکہ کے مشرکوں کے ساتھ ہو گیا، پھر وہ اپنے کئے پر پشیمان ہوا اور اس نے اپنی قوم کو پیغام بھجوایا کہ وہ حضرت پیغمبر اسلام سے دریافت کریں کہ کیا میرے لئے توبہ کی گنجائش ہے؟ اس کی قوم والوں نے آنحضرتؐ سے پوچھا تو اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی کہ جس میں ”إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا“ کے الفاظ میں توبہ کی گنجائش موجود ہونے کا تذکرہ تھا، چنانچہ اس کی قوم کا ایک شخص وہ آیت مبارکہ حارث کے پاس لے آیا (مکہ آکر آیت کے نازل ہونے بتایا) تو حارث نے کہا: میں بخوبی جانتا ہوں کہ توبہ سچا ہے اور حضرت پیغمبر اسلامؐ تجھ سے زیادہ سچے ہیں اور اللہ تعالیٰ تم سب سے زیادہ سچا ہے، پھر وہ مدینہ منورہ واپس آ گیا اور توبہ کر کے اپنے اسلام کو خوبصورت بنا گیا (صحیح معنی میں مسلمان ہو گیا)،..... اس روایت کو مجاہد اور سدی نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔

(تفسیر ”مجمع البیان“ جلد ۲ ص ۷۱ ص ۷۲)

### ”در منشور“ کی ایک روایت

تفسیر ”در منشور“ میں ہے کہ ابن اسحاق اور ابن منذر نے جناب عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ

حارث بن سوید نے جنگ احد کے دن محمد بن زیاد اور بنی ضعیجہ کے ایک شخص قیس بن زید کو قتل کر دیا تھا اور فرار کر کے مشرکین قریش کے پاس چلا گیا اور کچھ عرصہ تک ان کے ساتھ مکہ میں رہا، پھر اس نے اپنے بھائی جلاس کو پیغام بھجوایا کہ اس کے لئے توبہ طلب کرے تاکہ وہ اپنی قوم میں واپس آسکے، تو اس وقت خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی: ”كَيْفَ يَصْدَى اللَّهُ قَوْمًا..... الخ“۔

(تفسیر ”درمنثور“ ج ۲ ص ۴۹)

یہ واقعہ متعدد اسناد سے بیان کیا گیا ہے اور اس کی بابت روایات مختلف ہیں، ان روایات میں سے ایک روایت عکرمہ سے ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یہ آیت ابو عامر راہب، حارث بن سوید بن صامت اور وحوش بن اسلم سمیت ان بارہ افراد کے بارے میں نازل ہوئی جو اسلام سے روگرداں ہو گئے تھے اور قریش کے ساتھ ملحق ہو گئے تھے، پھر انہوں نے اپنے خاندان کو خطوط بھیجے کہ آیا ان کے لئے توبہ کی گنجائش ہے؟ (ان کے خاندان والوں نے آنحضرتؐ سے پوچھا) تو یہ آیات نازل ہوئیں: ”إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ..... الخ“۔

یہ روایت بھی تفسیر ”درمنثور“ ج ۲ ص ۴۹ میں مذکور ہے، انہی روایات میں سے ایک روایت ”مجمع البیان“ میں آیت مبارکہ ”إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ أَزَادُوا..... الخ“ کی تفسیر میں مذکور ہے کہ یہ آیت حارث بن سوید کے گیارہ ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی اور وہ یوں کہ جب حارث واپس آ گیا تو انہوں نے کہا کہ ابھی ہم کفر کی حالت ہی میں مکہ میں قیام پذیر رہتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہمارے لئے حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں، پھر جب ہم واپسی کا ارادہ کریں گے تو واپس چلے جائیں گے اور جو کچھ حارث پر بنی وہ ہم پر بھی بن جائے گی، جب حضرت پیغمبر اسلامؐ نے مکہ فتح کر لیا تو ان میں سے جو شخص دائرہ اسلام میں آ گیا اس کی توبہ قبول ہو گئی اور جو اسی طرح کفر کی حالت میں مر گیا تو ایسے لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ”إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارًا..... الخ“، مؤلف نے اس روایت کو بعض راویوں کی طرف منسوب کیا ہے۔

تاہم آیت کے شان نزول کی بابت ایک قول یہ ہے کہ وہ اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی،

اور بعض اہل تحقیق نے کہا کہ آیت ”إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ أَزَادُوا كُفْرًا..... الخ“ خاص طور پر یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ وہ ایمان لائے پھر حضرت عیسیٰؑ کا کفر کیا (انہیں تسلیم کرنے سے انکار کیا) اور پھر اپنے کفر میں اضافہ کرتے ہوئے حضرت پیغمبر اسلامؐ محمد مصطفیٰؐ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا،

بعض مفسرین نے آیت کے شان نزول کے بارے میں دیگر اظہارات بھی کئے ہیں، لیکن ان تمام اقوال و مختلف روایات میں ذکر کی گئی آراء میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب سابقہ مفسرین کے اجتہادی نکتہ ہائے نظر ہیں جیسا

کہ ان میں سے بعض حضرات اس مطلب کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کا اقرار و اعتراف بھی کیا ہے، اور جہاں تک حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف منسوب مذکورہ روایت کا تعلق ہے تو وہ مرسلہ ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے، البتہ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی آیت یا متعدد آیات کے شان نزول میں بھی ایک سے زیادہ واقعات ہوں، (واللہ اعلم)

## آیات ۹۲ تا ۹۵

- لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تَحِبُّونَ ۗ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿۹۲﴾
- كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حَلَالًا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَى نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنزَّلَ التَّوْرَةُ ۗ قُلْ فَاتَّبُوا التَّوْرَةَ فَاتَّبَعُوا مَا نَزَّلْنَا عَلَيْهَا ۗ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۹۳﴾
- فَمَنْ أَقْتَرَى عَلَى اللَّهِ الْكِبَابَ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ قُلْ وَلِيكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۹۴﴾
- قُلْ صَدَقَ اللَّهُ ۗ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۹۵﴾

## ترجمہ

- ” تم ہرگز نیک نہیں بن سکتے جب تک کہ اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے خدا کی راہ میں خرچ نہ کرو، اور تم جو کچھ بھی خرچ کرو خدا اس سے بخوبی آگاہ ہے“ (۹۲)
- ” تمام کھانے بنی اسرائیل کے لئے حلال تھے سوائے اس کے جو اسرائیل نے تورات نازل ہونے سے پہلے اپنے اوپر حرام کر لئے تھے، ان سے کہیے کہ تم سچے ہو تو تورات لے آؤ اور اسے پڑھو“ (۹۳)
- ” اب جو بھی اس کے بعد خدا پر بہتان تراشی کرے گا اس کا شمار ظالموں میں ہوگا“ (۹۴)
- ” کہہ دیجئے کہ خدا نے سچ کہا ہے، بس تم ابراہیمؑ کے آئین کی پیروی کرو کہ جو خالص خدا پرست تھے اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے“ (۹۵)

## تفسیر و بیان

ان آیات مبارکہ میں سے پہلی آیت کا ماقبل آیات سے ربط و تعلق واضح نہیں ہے اور یہ ممکن ہے کہ اس کا نزول ان دیگر آیات مبارکہ کے ضمن میں نہ ہوا ہو جن کا ایک دوسرے سے مرتبط ہونا ہر طرح کے شک و گمان سے خالی ہے، اس کی مثال سابق الذکر آیت ۶۳ (سورۃ آل عمران) کی تفسیر میں تاریخ نزول کے حوالہ سے کی گئی بحث میں موجود ہے۔ اور وہاں بھی اس کی تطبیق کے حوالہ سے تاریخ نزول کے مختلف ہونے کی بناء پر صورتحال قدرے مشکل ہو جاتی ہے اور یہاں بھی اس طرح کا مسئلہ ہے.....

البتہ اس کے نزول کی بابت یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں خطاب کا رخ نبی اسرائیل کی طرف ہے اور اب تک انہی کی طرف ہے، بنا بریں آیت کا خلاصہ معنی یہ ہے کہ انہیں ان کی دنیا پرستی اور دنیا کے فنا پذیر مال و دولت کو دین خداوندی پر ترجیح دینے کی وجہ سے مورد مذمت و ملامت قرار دینے کے بعد ارشاد ہوا کہ تم اپنے آپ کو خدا اور اس کے انبیاء سے منسوب کرنے میں جھوٹے ہو اور اپنے آپ کو نیک و متقی کہلانے میں بھی سچے نہیں ہو کیونکہ تم تو دنیا کے خوشنما مال و دولت سے اس قدر محبت کرتے ہو اور اس کے فدائی بن چکے ہو کہ اسے خرچ کرنے میں بخل سے کام لیتے ہو اور اگر کچھ خرچ بھی کرتے ہو تو وہ اس قدر رومی و ناچیز ہوتا ہے کہ جسے کوئی پسند نہیں کرتا اور نہ ہی اس سے محرومی کو خاطر میں لاتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک نیکی نہیں پاسکتا جب تک اپنے مال میں سے نہایت قیمتی اور اپنی دل پسند چیز کا انفاق (خدا کی راہ میں خرچ) نہ کرے کیونکہ جو چیز خدا کی راہ میں خرچ کی جائے وہ خدا کے ہاں محفوظ رہتی ہے۔

تو یہ ہے آیت کے بارے میں اس کے اپنے ماقبل اور مابعد سے ربط و تعلق کی بابت بعض حضرات کے تو جہمی بیان کا خلاصہ، لیکن اس طرح کی باتیں کرنا بے نتیجہ کوشش اور موہوم تصورات کی دنیا میں گھومنے کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن جہاں تک دیگر آیات کا تعلق ہے تو ان کا سابقہ بیانات سے مرتبط ہونا ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر ہے،



## پسندیدہ مال کا انفاق

○ "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ"

(تم ہرگز نیکی نہیں پاسکتے جب تک کہ وہ کچھ خرچ نہ کرو جسے پسند کرتے ہو)

”تَنَالُوا“ فعل مضارع مخاطب کا صیغہ ہے، اس کی اصل ”نیل“ ہے جس کا معنی کسی چیز تک پہنچنا ہے۔ لفظ ”بِر“ کا رخیہ میں وسعت کا حامل ہونا ہے، مشہور لغت دان راغب اصفہانی کا کہنا ہے کہ لفظ ”بِر“ (ب پر زبر کے ساتھ)..... خشکی..... ”بحر“ کے مقابل میں آتا ہے اور چونکہ اس لفظ ”بِر“ سے وسعت کا معنی ہی ذہنوں میں جلوہ گر ہوتا ہے لہذا اسی مناسبت سے لفظ ”بِر“ (ب کے نیچے زبر کے ساتھ)..... نیکی..... کو کا رخیہ میں وسعت کے معنی میں استعمال کرنے کے لئے بنایا گیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر و لائق توجہ ہے کہ کا رخیہ سے اس کی مراد دل اور اعضاء و جوارح دونوں کے اعمال ہیں، دل کا عمل جیسے عقیدہ حق اور پاک نیت، اور اعضاء کا عمل جیسے خدا کی عبادت اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا، چنانچہ ان دونوں قسموں کا یکجا ذکر درج ذیل آیت مبارکہ میں ہوا ہے:

سورۃ بقرہ، آیت: ۱۷۷

○ "لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ

الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ

وَابْنِ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ ۗ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ ۗ وَالْمُوفُونَ

بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا ۗ وَالصَّادِقِينَ فِي الْبُيُوتِ وَالصَّادِقِينَ فِي الْبُيُوتِ ۗ وَالصَّادِقِينَ فِي الْبُيُوتِ ۗ..... الخ“

(نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے رخ مشرق و مغرب کی طرف کر لو بلکہ نیک وہ شخص ہے جو ایمان لائے اللہ پر اور قیامت

کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر، اور نبیوں پر، اور اللہ کی محبت میں مال دے قریبوں کو، یتیموں کو، مسکینوں

کو، مسافروں کو، مانگنے والوں کو اور غلام آزاد کرانے میں، اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے اور وہ لوگ

اپنے کئے ہوئے وعدوں کو پورا کرنے والے ہیں اور تکلیفوں، زحمتوں و سختیوں اور سخت دقت میں صبر سے کام

لینے والے ہیں..... الخ)

اس آیت کو زیر نظر آیت مبارکہ کے ساتھ ملا کر دیکھیں تو واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ مال کی محبت کے باوجود اسے اللہ کی راہ و رضا میں خرچ کرنا ”بز“ کے ان بنیادی ارکان میں سے ایک ہے جن کے یکجا ہونے کے بغیر ”بز“ وجود میں نہیں آسکتا، البتہ آیت مبارکہ میں انفاق کو ”بز“ کے حصول کی غرض قرار دیا جانا اس بات کا عکاس ہے کہ خداوند عالم نے اسے خاص توجہ و اہمیت دی ہے کیونکہ اس کی بابت طبع انسانی میں مال اکٹھا کرنے کی قلبی چاہت دلگڑ پایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اسے اپنی جان کا حصہ سمجھتا ہے کہ اگر اس سے محروم ہو تو گویا اپنی زندگی کے ایک حصہ سے محروم ہو گیا جبکہ دیگر عبادات و اعمال میں ایسا نہیں ہوتا کہ ان میں کمی یا ان کی عدم ادائیگی سے کسی چیز سے محرومی کا احساس پیدا ہو۔

اس بیان سے بعض مفسرین کے اس قول میں پائی جانے والی خامی بھی ظاہر ہو جاتی ہے جس میں انہوں نے کہا کہ ”بز“ سے مراد ہی اپنی پسندیدہ چیز کا انفاق ہے۔ گویا انہوں نے آیت مبارکہ ”لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ“ کو اس مقولہ جیسا قرار دیا ہے کہ کوئی شخص کسی سے کہے کہ تو بھوک کی تکلیف سے اس وقت تک نجات نہیں پاسکتا جب تک کہ کھانا نہ کھائے..... کھانا کھانے کے بغیر تیری بھوک ختم نہیں ہو سکتی..... لیکن اس قول کا ہمارے ذکر کردہ مطالب کے تناظر میں ناقابل قبول ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔

سورۃ بقرہ کی مذکورہ بالا آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ”بز“ سے اس کا ظاہری لغوی معنی مراد ہے یعنی کار خیر میں وسعت! کیونکہ اس میں ”بز“ کو تمام نیکیوں خواہ وہ اعتقادی ہوں یا عملی ہوں سب کا جامع قرار دیا گیا ہے۔ بنا بریں بعض مفسرین کا یہ کہنا کہ ”بز“ سے مراد خداوند عالم کا احسان و انعام ہے اور بعض حضرات کا یہ کہنا کہ اس سے مراد بہشت ہے، قرین صحت نہیں۔

## اللہ بخوبی آگاہ ہے

○ ”وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ“  
(اور تم جو کچھ بھی خرچ کرو اللہ اس سے بخوبی آگاہ ہے)

یہ جملہ انفاق کرنے والوں کے سرور و تسکین قلب کے لئے ہے کہ وہ اپنے پسندیدہ و محبوب مال میں سے جو کچھ خرچ کرتے ہیں وہ ضائع و بے اجر و بے نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ کے جس نے اس کے انفاق کا انہیں حکم دیا ہے وہ انہیں اور ان کے عمل انفاق سے بخوبی آگاہ ہے۔

## بنی اسرائیل کے لئے ہر غذا کی حلیت

○ ” كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حَلَالًا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلَ عَلَى نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنزَلَ التَّوْرَةُ “

(ہر کھانا بنی اسرائیل کے لئے حلال تھا مگر وہ کہ جسے اسرائیل نے تورات نازل ہونے سے پہلے اپنے اوپر حرام کر دیا)

لفظ ”طعام“ سے مراد ہر وہ چیز ہے جو غذا کے طور پر کھائی جائے، البتہ اہل حجاز کی لغت میں اسے صرف گندم کے لئے بولا جاتا تھا کہ جب بھی اسے استعمال کیا جاتا تو اس سے گندم ہی مراد لی جاتی تھی۔

لفظ ”حلّ“ حرمت کے مقابل میں آتا ہے، گویا اسے اس لفظ ”حلّ“ سے لیا گیا ہے جو ”عقد“ (گرہ لگانا) اور ”عقل“ (باندھ دینا) کے مقابل میں آتا ہے تو اس بناء پر اس کا معنی آ زاد کرنا و آزادی دینا ہوگا۔

یہاں اسرائیل سے حضرت یعقوب نبی اللہ علیہ السلام مراد ہیں، انہیں اس نام سے اس لئے موسوم کیا گیا کہ وہ اللہ کی راہ میں سخت مجاہدت کرتے تھے اور اس میں کامیاب و کامران تھے، اہل کتاب کا کہنا ہے کہ اسرائیل کا معنی اللہ پر کامیابی و غلبہ پانے والا ہے اور حضرت یعقوب کو اس لئے اسرائیل کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ”فنیشیل“ کے مقام پر خدا سے کشتی لڑی اور اسے چت کر دیا، (بحوالہ تورات)، مگر قرآن مجید اس کی تکذیب کرتا ہے اور عقل اسے محال و ناممکن قرار دیتی ہے۔

جملہ ” إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلَ عَلَى نَفْسِهِ “ مذکورہ بالا طعام سے استثناء کے بیان پر مشتمل ہے اور جملہ ”من قبل ان تنزل التوراة“ کا تعلق پہلے جملہ میں مذکور حرف ”کان“ سے ہے، لہذا آیت کا معنی یہ ہوگا کہ خداوند عالم نے تورات کے نزول سے پہلے کھانے کی کوئی چیز بنی اسرائیل پر حرام قرار نہیں دی سوائے اس کے کہ جسے اسرائیل نے خود اپنے اوپر حرام کر دیا تھا۔

## ایک اہم نکتہ

آیت مبارکہ کے جملہ ”قُلْ فَأَنذَرْتُكُمْ يَوْمَ تُلَاقُوا بِالنَّاصِرَةِ فَاتْلُوا هَذَا إِنَّ كُنتُمْ صَادِقِينَ“ میں اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ تورات نازل ہونے سے پہلے بنی اسرائیل اپنے لئے ہر طعام کے حلال ہونے کو تسلیم نہیں کرتے تھے چنانچہ اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ وہ شریعتوں کے منسوخ ہونے یعنی احکام میں نسخ کے قائل ہی نہیں بلکہ اسے محال سمجھتے ہیں، ان کے اس عقیدہ کی بابت

تفصیلی تذکرہ سورہ بقرہ کی آیت ۱۰۶ کی تفسیر میں ہو چکا ہے، بنا براین وہ طبعاً اس آیت میں مذکورہ مطالب کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے جس میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ”فَظَلَمَ مِنَ الَّذِينَ هَادُوا أَحْرَمُوا عَلَيهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ“ کہ یہودیوں کے ظلم کی وجہ سے ہم نے ان پر وہ پاک چیزیں حرام کر دیں جو ان کے لئے حلال کی گئی تھیں، (سورہ نساء، آیت ۱۶۰)۔

اسی طرح آیت ۹۵ کے الفاظ ”قُلْ صَدَقَ اللَّهُ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا“ سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ جس چیز کا انکار کرتے تھے (یعنی تورات سے پہلے ہر طعام کا حلال ہونا اور ان کے ظلم کی وجہ سے پاک چیزوں کے حلال ہونے کے حکم کا منسوخ ہو کر ان چیزوں کا ان پر حرام کیا جانا) اسے مسلمانوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے اور حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اس بیان پر اعتراض کرنے کا ذریعہ قرار دیتے تھے کہ جس میں آنحضرت نے اپنے پروردگار کی طرف سے لوگوں کو آگاہ کیا کہ دین خداوندی وہی آئین ابراہیمی ہے اور وہی آئین فطرت ہے کہ جس میں کوئی افراط پایا جاتا ہے اور نہ تفریط پائی جاتی ہے، تو یہ کیونکر ممکن ہے حالانکہ وہ تو اس بات کے قائل تھے کہ ابراہیمؑ یہودی تھے اور تورات کے احکام پر عمل کرتے تھے، پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ ان کا آئین ان احکام پر مشتمل ہو جو تورات سے مختلف بلکہ اس کے برعکس ہوں یعنی اس میں تورات کی حرام کردہ چیزوں کو حلال قرار دیا گیا ہو جبکہ منسوخ ہونا روا نہیں۔

بنا براین یہ بات واضح ہو گئی کہ آیت مبارکہ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے مقام میں ہے کہ یہودی جسے پھیلانے کے درپے تھے، اس کے ساتھ ساتھ آیت میں اصل غلط فہمی کا تذکرہ نہ کیا جاتا یہ ثابت کرتا ہے کہ ان کا مقصد صرف مومنین کو اس میں مبتلا کرنا تھا اور انہیں ہی اس کا شکار کرنا مقصود تھا، چنانچہ اس طرح کے موارد میں قرآنی روش و اسلوب یہی ہے، ملاحظہ ہو:

سورہ مائدہ، آیت: ۶۳

○ ”وَقَالَتِ الْيَهُودُ دِينُ اللَّهِ مَعْلُومَةٌ“

(اور یہودیوں نے کہا کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں)

سورہ بقرہ، آیت: ۸۰

○ ”وَقَالُوا لَنْ نَسْتَنَافِثَ النَّاسَ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً“

(اور انہوں نے کہا کہ ہمیں جنہم کی آگ محدودے چند دنوں کے سوا ہرگز نہیں چھوئے گی)

سورہ بقرہ، آیت: ۸۸

○ ”وَقَالُوا اقْتُلُوا بَنِي آدَمَ“

(اور انہوں نے کہا کہ ہمارے دل بند ہیں)

یہ اور دیگر متعدد آیات میں مذکورہ بالا قرآنی اسلوب بیان کا ثبوت ملتا ہے، اسی طرح زیر بحث آیت مبارکہ کے بعد والی آیات میں سے درج ذیل آیت میں بھی یہ روش معمول ہوئی ہے:

سورہ آل عمران، آیت: ۱۰۰

○ ” قُلْ يَا هَلْ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ عَنِ سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ تَبِعُونَهَا عَوَجًا وَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ وَمَا اللَّهُ بِعَافٍ لِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۱۰۰﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَطِيعُوا أَمْرًا فَرِيقًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كُفْرِينَ “

(کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب! تم کیوں روکتے ہو اللہ کی راہ سے اسے کہ جو ایمان لایا ہے، تم اس راہ میں کچی پیدا کرنے کے درپے ہو جبکہ تم خود گواہ ہو..... کہ وہ راستہ درست ہے..... اور اللہ تمہارے اعمال سے عافل نہیں، اے ایمان والو! اگر تم اہل کتاب کے کسی گروہ کے اطاعت گزار بن گئے تو وہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد دوبارہ کافر بنا دیں گے)

بہر حال مذکورہ بالا مطالب سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہودی غلط فہمی پر مبنی اپنے اظہارات حضرت پیغمبر اسلام کے سامنے نہیں کرتے تھے بلکہ صرف مؤمنین کے سامنے کرتے تھے اور جب بھی ان سے ملتے اور ان سے گفتگو کرتے تو انہیں اس طرح کے اظہارات کے ذریعے غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے تھے، ان کے بیانات و اظہارات کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ مؤمنین سے کہتے تھے کہ یہ تمہارا نبی کیونکر سچا ہو سکتا ہے جو کہ نوح کی باتیں کرتا ہے اور کہتا ہے کہ خداوند عالم نے بنی اسرائیل کے ظلم کی وجہ سے ان پر پاک و طیب چیزیں حرام کر دیں حالانکہ ایسا کرنا سابقہ حکم کو منسوخ کرنا ہے یعنی حلال چیز کو حرام کرنا ہے جو کہ خداوند عالم کے بارے میں اس طرح کا نظریہ قائم کرنا جائز نہیں کیونکہ جو چیز حرام کر دی گئی ہے وہ ہمیشہ کیلئے حرام ہے اور حکم خداوندی میں تبدیلی ممکن ہی نہیں، ان کے اس طرح کے بیانات و اظہارات کا جواب کہ جو آنحضرت نے خداوند عالم کے فرمان کے مطابق دیا وہ یہ تھا کہ تورات واضح طور پر بیان کر رہی ہے کہ اس کے نزول سے پہلے ہر طعام حلال تھا لہذا اگر تم اپنی باتوں میں سچے ہو تو تورات لے آؤ میں اسے پڑھتا ہوں..... تمہیں پڑھ کر سنا تا ہوں کہ اس میں وہی کچھ لکھا ہوا ہے جو میں نے کہا ہے..... اسی سوال و جواب کا ذکر آیت مبارکہ ۹۳ ” كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حَلَالًا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَى نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنزَلَ التَّوْرَةُ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَةِ فَاتْلُوهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ “ میں ہوا ہے۔ اور اگر تم تورات لانے سے انکار کرتے ہو اور اسے پڑھ کر حقیقت سے آگاہ نہیں ہونا چاہتے تو پھر اعتراف کر لو کہ تم خدا پر جھوٹ باندھتے ہو..... اس کی طرف جھوٹی نسبت دیتے ہو..... اور یہ کہ تم ظالم ہو (اس کا ذکر آیت ۹۴ میں یوں ہوا: ” فَكَيْفَ اقْتَرَى عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ “)۔ اسی سے یہ بات ثابت و واضح ہو جاتی ہے کہ میں اپنے

مشن میں سچا ہوں لہذا تم بھی میرے دین و ملت کی پیروی کرو جو کہ ابراہیمؑ خلیل اللہ کا دین و آئین ہے (اس مطلب کو آیت ۹۵ میں یوں بیان کیا گیا ہے: ”قُلْ صَدَقَ اللَّهُ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ“)-  
 تو یہ ہے زیر نظر آیت مبارکہ کے حوالہ سے مربوط مطالب کا بیان کہ جسے ہم نے پیش کیا ہے، البتہ آیت کے معنی و تفسیر میں دیگر مفسرین کرام نے مختلف بیانات پیش کئے ہیں لیکن جو بات تمام حضرات کے بیانات میں قدر مشترک ہے وہ یہ کہ سب نے کہا ہے کہ یہ آیت یہودیوں کی طرف سے پھیلانی جانے والی اس غلط فہمی کی تفصیلات بیان کرتی ہے جو انہوں نے نسخ کے حوالہ سے پیدا کرنے کی کوشش کی۔

### آیت کی بابت عجیب قول

زیر بحث آیت مبارکہ کے حوالہ سے بعض مفسرین نے نہایت عجیب اظہار خیال کیا ہے اور وہ یہ کہ یہ آیت دراصل یہودیوں کی طرف سے نسخ کے بارے میں پیدا کی جانے والے غلط فہمی کے جواب پر مشتمل ہے اور وہ اس طرح کہ گویا یہودی کہتے تھے کہ اے محمدؐ! اگر آپ ابراہیمؑ اور ان کے بعد آنے والے نبیوں کے دین پر ہیں جیسا کہ آپ خود اس کے مدعی ہیں تو پھر جو کچھ حضرت ابراہیمؑ اور دیگر انبیاءؑ پر حرام تھا اسے حلال کیوں کرتے ہیں مثلاً اونٹ کا گوشت وغیرہ، آپ نے تو ان چیزوں کو مباح و حلال قرار دے دیا جو انبیاءؑ پر حرام تھیں تو پھر آپ کے لئے ہر گز روا نہیں کہ اپنے آپ کو انبیاءؑ کا تصدیق کنندہ اور ان کے دین و آئین سے اتفاق کرنے والا ہونے کا دعویٰ کریں، اور بالخصوص حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں ان سے اپنی نسبت کا اظہار کرتے ہوئے یہ نہ کہیں کہ میں دوسروں سے زیادہ ان کا حقدار ہوں۔

ان کے اس بہتان اور غلط فہمی پیدا کرنے والے اظہارات کے جواب کا خلاصہ و لب لباب یہ ہے کہ ہر طعام تمام انسانوں کے لئے حلال تھا اور ان میں بنی اسرائیل بھی شامل ہیں لیکن بنی اسرائیل نے خود اپنے ہاتھوں اور اپنے مظالم و گناہوں کے ارتکاب کی بناء پر کچھ چیزیں اپنے لئے حرام قرار دے دیں، چنانچہ اس سلسلہ میں ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہ نساء، آیت ۱۶۰:

”فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّت لَّهُمْ“

(یہودیوں کے مظالم کی وجہ سے ہم نے وہ پاک چیزیں ان کے لئے حرام کر دیں جو ان کے لئے حلال تھیں)۔

تو اس آیت میں ”اسرائیل“ سے مراد صرف حضرت یعقوب علیہ السلام نہیں بلکہ پوری قوم بنی اسرائیل مراد ہے چنانچہ اس طرح کا استعمال بنی اسرائیل کے ہاں عام ہے کہ وہ لفظ ”اسرائیل“ کے استعمال سے پوری قوم مراد لیتے ہیں، اور

طیبات کو اپنے اوپر حرام قرار دینے کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے مظالم کا ارتکاب کیا اور گناہوں و برائیوں کو انجام دینے کے رسیا ہو گئے جس کے نتیجہ میں طیب و پاک چیزیں ان پر حرام کر دی گئیں، اور جملہ ”مِنْ قَبْلِ أَنْ تَنْزَلَ السُّورَةُ“ کا تعلق جملہ ”حَدَّمَ إِسْرَائِيلُ“ سے ہے، اور اگر یہاں ”اسرائیل“ سے صرف حضرت یعقوب علیہ السلام مراد ہوتے تو جملہ ”مِنْ قَبْلِ أَنْ تَنْزَلَ السُّورَةُ“ زائد اور بے معنی ہو جاتا کیونکہ یہ بات ایک واضح و روشن حقیقت ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام تورات کے نزول سے پہلے تھے لہذا اسے کلام میں بیان کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

یہ ہے اس مفسر کے بیان کا خلاصہ، اس کے مانند دیگر مفسر نے بھی اظہار خیال کیا ہے البتہ انہوں نے اپنے بیان میں کہا کہ بنی اسرائیل کے اپنے اوپر پاکیزہ چیزیں حرام قرار دینے سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے ان چیزوں کو خود اپنے اوپر حرام کر دیا تھا اور ان کا ایسا کرنا ان کے کسی نبی پر خدا کی طرف سے بذریعہ وحی، حکم صادر ہونے کی بناء پر نہ تھا بلکہ یہ اسی طرح سے تھا جیسے زمانہ جاہلیت کے عرب عام طور پر کچھ چیزوں کو اپنے لئے حرام قرار دیتے تھے چنانچہ ان کی اس عام عادت کے تذکرے خداوند عالم نے اپنی مقدس کتاب میں کئے ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں مفسرین کرام نے اپنے اظہارات سے بیجا و غیر ضروری تکلف سے کام لیا یعنی اپنے آپ کو زحمت میں مبتلا کیا اور ایسی تفسیر پیش کی جو اہل نظر کے ہاں پسندیدہ واقع نہیں ہوتی کیونکہ اس سے کلام کی صورت بگڑ جاتی ہے اور اس کا جاری سلسلہ اپنی اصل شکل پر باقی نہیں رہتا، ان کے اپنے آپ کو اس طرح زحمت میں مبتلا کرنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں حضرات نے جملہ ”مِنْ قَبْلِ أَنْ تَنْزَلَ السُّورَةُ“ کا تعلق جملہ ”حَدَّمَ إِسْرَائِيلُ“ سے جوڑا ہے حالانکہ اس کا تعلق آیت کے ابتدائی الفاظ ”كَانَ جَدًّا“ سے ہے اور جملہ ”إِلَّا مَا حَدَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَى نَفْسِهِ“ جملہ استثنائیہ معترضہ ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں ”اسرائیل“ سے بنی اسرائیل مراد لینے کی کوئی وجہ نہیں اور ان دو مفسرین نے یہ گمان کر لیا کہ اگر اسرائیل سے بنی اسرائیل مراد نہ لیں تو آیت کا معنی درست نہیں بنتا۔

اس کے علاوہ یہ بات قابل ذکر و لائق توجہ ہے کہ اگرچہ لفظ ”اسرائیل“ سے بنی اسرائیل مراد لینے میں کوئی حرج نہیں جیسا کہ لفظ ”بکھر“ سے بنی بکر، لفظ ”مغلب“ سے بنی تغلب، لفظ ”عموار“ سے بنی تزار اور لفظ ”عدنان“ سے بنی عدنان مراد لئے جاتے ہیں لیکن بالخصوص بنی اسرائیل کے بارے میں اس طرح کا استعمال نزول آیت کے زمانہ میں رائج نہ تھا اور نہ ہی قرآن مجید میں اس لفظ کے استعمال میں (اس مورد کے علاوہ کہ جس کے بارے میں یہ حضرات دعویٰ کرتے ہیں) اس طرح کی روش اپنائی گئی ہے حالانکہ قرآن مجید میں لفظ ”بنی اسرائیل“ تقریباً چالیس بار ذکر ہوا ہے کہ ان میں سے ایک یہی مورد ہے کہ جس میں ارشاد ہوا: ”كُلُّ الظَّالِمِ كَانَ جَدًّا لِبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَدَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَى

نَفْسِهِ“ تو ان کے قول کی بناء پر آیت مبارکہ کے ان دو مقامات میں کیا فرق ہے کہ جس کی وجہ سے ان کے بارے میں پہلے ”بنی اسرائیل“ اور پھر ”اسرائیل“ کہا گیا جبکہ یہ مقام غلط فہمی پیدا ہونے کے واضح ترین موارد میں سے ایک ہے، یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ مفسرین کی کثیر تعداد نے جملہ ”إِلَّا صَاحَرَّمِ إِسْرَائِيلَ عَلَى نَفْسِهِ“ میں لفظ ”إِسْرَائِيلَ“ سے حضرت یعقوب علیہ السلام کو مراد لیا ہے نہ کہ ان کی اولاد کو! چنانچہ اس کی بہترین دلیل و شاہد یہ ہے کہ آیت میں لفظ ”عَلَى نَفْسِهِ“ مذکور ہے اور ضمیر مفرد مذکر ”ہ“ کی بازگشت ”اسرائیل“ کی طرف ہوتی ہے اور اگر اس سے ”بنی اسرائیل“ مراد ہوتے تو ضروری تھا کہ یوں کہا جاتا: ”عَلَى نَفْسِهَا“ یا ”عَلَى أَنْفُسِهِمْ“، لیکن اس کی بجائے ”عَلَى نَفْسِهِ“ کہا گیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سے فرد واحد یعنی حضرت یعقوب (اسرائیل) مراد ہیں،

### خدا کی طرف سے کھلا اعلان

○ ”قُلْ فَأْتُوا بِالْبُرْهَانِ فَإِن لَّوْهَاءَ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ“  
(کہہ دو کہ پھر تورات لے آؤ تاکہ میں اسے پڑھوں، اگر تم سچے ہو!)

اس میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ تم تورات لے آؤ اور میں تمہارے سامنے اس کی تلاوت کروں تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ دونوں فریقوں میں سے کون حق پر ہے؟ میں یا تم؟  
یہ جملہ دراصل خدا کی طرف سے حضرت پیغمبر اسلام پر ان لوگوں کو جواب دینے کے لئے القاء ہوا۔

خدا پر جھوٹا الزام لگانے والے!

○ ”فَمَنْ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ“  
(تو جو شخص اس کے باوجود خدا پر جھوٹا الزام لگائے تو ایسے لوگ ہی ظالم ہیں)

آیت کے الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خداوند عالم کا کلام ہے جو اس نے اپنے پیغمبر کو مخاطب قرار دے کر کیا ہے اور اس کا مقصد اور بنیادی غرض یہ ہے کہ آنحضرتؐ کو خوشحال و خورسند کیا جائے کہ ان کے یہودی دشمن ہی ظالم و



ستمگار ہیں کیونکہ انہوں نے خدا پر جھوٹ باندھا ہے اور غلط بیانی سے کام لیا ہے۔

اس کلام خداوندی میں جہاں آنحضرتؐ کے لئے طیب نفس کا سامان کیا گیا ہے وہاں یہودیوں کی مذمت کا پہلو بھی ملتا ہے، گویا کنایہ ہی کنایہ میں بات کی گئی ہے۔

اور جہاں تک اس رائے اور احتمالی نظریہ کا تعلق ہے کہ یہ جملہ آنحضرتؐ کے کلام کا تتمہ ہے تو یہ اس لئے قرین قیاس نظر نہیں آتا کہ ظاہر الکلام میں ”ذٰلِكَ“ مفرد کا اشارہ مذکور ہے یعنی ”مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ“، بہر حال اس حوالہ سے بھی کلام کنایہ پر مشتمل ہے اور اس میں مغلوب واقع ہونے والے دشمن و مد مقابل کے سامنے مسلم الثبوت مطلب کو پردے میں رکھ کر پیش کیا گیا ہے تاکہ اس کے دل میں اسے تسلیم کرنے کی راہ ہموار ہو جائے چنانچہ اس کی مثال درج ذیل آیت مبارکہ میں ملتی ہے:

سورۃ سباء، آیت: ۲۳

○ ” اِنَّا اَوْ اَيَّاكُمْ لَعَلَّ هُدًى اَوْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ “ (ہم یا تم، ہدایت کی راہ پر یا کھلی گمراہی میں ہیں) اور جملہ ”مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ“ میں حرف ”ذٰلِكَ“ کا اشارہ سابق الذکر دلیل و برہان کی طرف ہے..... اس سے مراد یہ ہے کہ اس واضح و مضبوط دلیل کے باوجود جو شخص خدا پر جھوٹ باندھے تو ایسے لوگ ظالم و ستمگار ہیں..... اب یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ ہر جھوٹ باندھنے والا..... جھوٹا الزام لگانے والا..... ظالم ہوتا ہے تو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ جو شخص اس کے بعد جھوٹ باندھے وہ ظالم ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اس لئے کہا گیا کہ بقولے، حقیقت کے آشکار ہونے سے قبل ”ظلم“، تحقق پذیر ہوتا ہی نہیں اور جملہ ”فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ“ (وہی ظالم ہیں) میں ”قصر القلب“ کی روش اپنائی گئی ہے یعنی اس سے یہ اظہار مقصود ہے کہ ہر صورت میں وہی ظالم ہیں اور ظالم بس وہی ہیں۔

## آئین ابراہیمیؑ کی پیروی کا حکم

○ ” قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيفًا..... “

(کہہ دو کہ اللہ نے سچ کہا ہے، پس تم آئین ابراہیمؑ کے جو خالص و مخلص تھا، کی پیروی کرو)

اس آیت مبارکہ کے ذریعے یہودیوں کو دعوت دی گئی کہ جب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ میں نے جو کچھ تمہیں بتایا ہے اور جس دین و آئین کو اختیار کرنے کا تم سے کہا ہے وہ برحق ہے اور اس میں حق میرے ساتھ ہے تو تمہیں چاہیے کہ تم

میرے دین و آئین کی پیروی کرو اور اونٹ کے گوشت سمیت ان تمام پاک چیزوں کے حلال ہونے کا اقرار کرو جو خداوند عالم نے تم پر حلال کیں اور اگر اس نے اس سے پہلے ان چیزوں کو حرام قرار دیا تھا تو وہ تمہارے مظالم اور زیادتیوں کی سزا کے طور پر تھا جیسا کہ اس کے بارے میں خداوند عالم نے خود ہی تمہیں باخبر کر دیا ہے۔

یہاں جملہ ”فَاتَّخِذُوا مِلَّةَ اٰبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا“ دین مصطفویٰ کی پیروی کے اشاراتی ذکر یعنی کنایہ کے طور پر ہے، اور یعنی تم اس کا نام اس لئے نہیں لیا گیا کیونکہ وہ لوگ دین ابراہیمی کے معتقد تھے اور آنحضرت نے دین ابراہیمی کی پیروی کا حکم دے کر اس مطلب کی طرف اشارہ فرمایا کہ میں جس دین کی تمہیں دعوت دیتا ہوں وہ خالص فطری دین و آئین ابراہیمی ہی ہے کیونکہ فطرت ہرگز انسان کو پاک گوشت اور دیگر پاک چیزیں کھانے سے منع نہیں کرتی۔

## روایات پر ایک نظر

### اونٹ کے گوشت کی کہانی

کافی اور تفسیر العیاشی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپ نے ارشاد فرمایا:

”ان اسرائیل کان اذا اکل لحم الابل هیج علیہ وجع الخاصرة فحرم علی نفسه لحم

الابل و ذلك قبل ان تنزل التوراة ، فلما نزلت التوراة لم یحرمه ولم یأكله“

جناب اسرائیل جب بھی اونٹ کا گوشت کھاتے تو ان کے پہلو کا درد شدید ہو جاتا لہذا انہوں نے اپنے لئے اونٹ

کا گوشت حرام کر دیا، اور یہ تورات کے نازل ہونے سے پہلے تھا، پھر جب تورات نازل ہو گئی تو انہوں نے نہ تو اسے حرام قرار

دیا اور نہ ہی خود کھایا، (کافی ج ۵ ص ۳۰۶ ح ۹۷۔ تفسیر العیاشی، جلد اول ص ۱۸۴)

اس سے قریب المعنی روایت اہل سنت والجماعت کی اسناد سے بھی ذکر کی گئی ہے۔

اس روایت میں جملہ ”لم یحرمه ولم یأكله“ (انہوں نے نہ تو اسے حرام قرار دیا اور نہ ہی خود کھایا) میں

فاعل کی ضمیر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف لٹتی ہیں کیونکہ مقام و مورد اس پر دلالت کرتا ہے لہذا اس کا معنی یہ ہوگا کہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اونٹ کا گوشت حرام قرار نہ دیا اور خود بھی نہ کھایا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ جملہ ”ولم یاکلہ“ باب تفعیل (فماکیل) سے ہو کہ جس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے کسی کو کھلایا بھی نہیں، اس کا ثبوتی اشارہ لغت کی مشہور کتاب تاج اللغات میں پایا جاتا ہے کہ جس میں لکھا ہوا ہے کہ مادہ ”اکل“ میں باب تفعیل اور باب مفاعلہ ایک ہی معنی میں آتا ہے..... ”فماکیل“ یعنی کسی کو کچھ کھلانا اور ”مواکلہ“ ایک دوسرے کو کچھ کھلانا ہے.....

## آیات ۹۶ ، ۹۷

- اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًىٰ لِلْعَالَمِيْنَ ﴿۹۶﴾
- فِيْهِ اٰيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ دَخَلَهُ كَانَ اٰمِنًا ۗ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حُجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۗ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾

## ترجمہ

- ” یقیناً سب سے پہلا وہ گھر جو لوگوں کے لئے..... بغرض عبادت..... بنایا گیا وہ مکہ میں ہے جو کہ بابرکت اور کائنات کی ہدایت کا سرچشمہ ہے “

(۹۶)

- ” اس گھر میں واضح نشانیاں اور مقام ابراہیم ہے، جو شخص اس گھر میں داخل ہو وہ امن میں آ گیا، اور جو شخص استطاعت سے رکھتا ہو اس پر خدا کی عبادت کی غرض سے اس گھر کا حج واجب ہے، اور جو شخص انکار کرے تو خدا پوری کائنات سے بے نیاز ہے “

(۹۷)

## تفسیر و بیان

یہ دو آیتیں یہودیوں کی طرف سے نسخ کے بارے میں مؤمنین پر کئے جانے والے اعتراض..... یا غلط فہمی..... کے جواب میں ہیں اور اعتراض یا غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش وہی تھی جس کا تعلق بیت المقدس سے کعبہ کی طرف قبلہ کی تبدیلی سے تھا، چنانچہ اس سلسلہ میں سورہ بقرہ کی آیت ۱۴۴ ” قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ.....“ کی تفسیر میں مربوطہ مطالب ذکر ہو چکے ہیں اور یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ قبلہ کی تبدیلی اہل کتاب بالخصوص یہودیوں کے لئے روحانی و مادی دونوں حوالوں سے نہایت اہم مسئلہ تھا اور وہ اسے اپنے لئے حیاتی اور زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ سمجھتے تھے اس کے ساتھ ساتھ یہ بات نہایت اہمیت کی حامل تھی کہ یہ بات ان کے عقیدہ نسخ سے متصادم تھی کیونکہ وہ نسخ کو ناجائز و محال سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے قبلہ کی تبدیلی کا حکم آنے کا بعد ان کے اور مسلمانوں کے درمیان بحثوں و تنازعات کا بازار عرصہ دراز تک گرم رہا۔

آیت مبارکہ کے ابتدائی الفاظ ” اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ.....“ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب نے مسئلہ نسخ اور قبلہ کی تبدیلی کے حکم کو دین ابراہیمی کی طرف منسوب کرنے کو یکجا کر دیا، چنانچہ ان کے اظہارات و بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ کہتے تھے کہ آئین ابراہیمی میں کعبہ، کیونکہ قبلہ قرار پاسکتا ہے جبکہ خدا نے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا ہے تو کیا اس کا مطلب آئین ابراہیم میں جو کہ حق و برحق ہے مسئلہ نسخ کو درست ماننا نہیں؟ حالانکہ نسخ ایک محال و باطل اور ناجائز کام ہے!

ان کے جواب میں آیت کے الفاظ یوں آئے ” اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ“ اس سے مراد یہ ہے کہ کعبہ ہی ہر جگہ مثلاً بیت المقدس سے پہلے عبادت کی غرض سے بنایا گیا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اسے حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کیا اور اس کی تعمیر کا مقصد صرف عبادت تھا، اس میں پائی جانے والی نشانیاں مثلاً مقام ابراہیمؑ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے، اور جہاں تک بیت المقدس کا تعلق ہے تو اسے حضرت سلیمانؑ نے تعمیر کیا جو کہ حضرت ابراہیمؑ سے کئی صدیاں بعد میں آئے۔

## پہلا عبادت خانہ

○ ” اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبَارَكًا ..... الخ “  
(بے شک وہ پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ مکہ میں ہے جو بابرکت ہے..... الخ)

لفظ ”بَيْتٍ“ کا معنی واضح و مشہور ہے (یعنی گھر)، اور آیت میں اسے لوگوں کے لئے بنائے جانے سے مراد یہ ہے کہ اسے لوگوں کے لئے اس لئے بنایا گیا کہ وہ اپنی عبادات، مجالس اور وہ اس طرح کہ اسے عبادت خداوندی کا ذریعہ و وسیلہ بنائیں، خدا کی عبادت و پرستش کے لئے اس سے مدد لیں، اس کی طرف رخ کر کے بندگی پروردگار کریں، دور دراز سے اس کے پاس آ کر اپنے فریضہ عبادت کی ادائیگی کو یقینی بنائیں اور اس کے علاوہ تقرب الہی کے دیگر اعمال انجام دیں۔ اس کا ثبوت آیت مبارکہ کے الفاظ ہیں کہ جن میں اسے بابرکت اور عالمین کے لئے مایہ ہدایت قرار دیا گیا ہے، چنانچہ کعبہ کو ”لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ“ سے تعبیر کر کے لوگوں کے اس کے پاس آ کر طواف کرنے، نماز پڑھنے و عبادات و دیگر اعمال بجالانے کی طرف لطیف اشارہ کیا گیا ہے، لیکن جہاں تک روئے زمین پر اس کے سب سے پہلا گھر ہونے اور لوگوں کے فائدہ کے لئے بنائے جانے کا تعلق ہے تو آیت کے الفاظ میں اس کا ثبوت نہیں پایا جاتا..... کہ اس سے پہلے کوئی گھر روئے زمین پر نہیں بنایا گیا تھا.....،

لفظ ”بکة“ سے مراد سر زمین مکہ ہے کہ جہاں یہ گھر واقع ہے، اسے لفظ ”بکہ“ سے موسوم کرنے کی وجہ وہاں لوگوں کے جم غفیر کا اکٹھا ہونا ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ ”بکہ“ ہی مکہ ہے اور اس میں ب کو میم میں تبدیل کر دیا گیا ہے جیسا کہ عربوں میں لفظ ”لازم“ کو لازب اور لفظ ”راقم“ کو راتب پڑھا جاتا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ ”بکہ“ خانہ کعبہ کا نام ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ یہ مسجد الحرام کا نام ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ”مطاف“ (طواف کرنے کے مخصوص احاطہ) کا نام ہے۔

لفظ ”مُبَارَكًا“ جو کہ باب مفاعلہ (مبارکہ) سے ہے کہ جس کا اشتقاق ”برکت“ سے ہے، اس کا معنی خیر کثیر ہے۔

”مبارکہ“ کا معنی اس پر خیر کثیر نازل کرنا اور اسے خیر کثیر کا گہوارا قرار دینا ہے، اگرچہ اس میں دنیوی و اخروی دونوں برکات شامل ہیں لیکن چونکہ اس کا تقابل ”هَدَىٰ لِلْعَالَمِيْنَ“ سے ہوا ہے لہذا اس سے مراد صرف دنیوی برکات کا نزول ہے کہ جس میں رزق کی فراوانی، حج و زیارت کے ذریعے وہاں جمع ہونے اور اس کے ادائے احترام کے لئے تقریبی اعمال

انجام دینے کی غرض سے اس کو آباد رکھنے جیسے امور سرفہرست ہیں، چنانچہ اس معنی کی بازگشت درج ذیل آیت مبارکہ کی طرف ہوتی ہے:

سورۃ ابراہیم، آیت: ۳۷

○ ”رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَنَا مِنَ النَّاسِ نَفْسًا يَتُوبُونَ إِلَيْهِمْ وَأَسْأَلُهُمْ فِي هَؤُلَاءِ الْأَمْثِلِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ“  
(اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی اولاد کو تیرے گھر کے پاس ایک غیر آباد علاقہ میں قیام پذیر کیا ہے تاکہ وہ نماز قائم کریں، لہذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف جھکا دے اور انہیں پھلوں کا رزق عطا فرما، تاکہ وہ شکر گزار بنیں)

اور قرآن مجید کے ”هُدًى لِّلْعَالَمِينَ“ ہونے سے مراد یہ ہے کہ چونکہ خداوند عالم نے اسے عبادت کی غرض سے بنایا اور اس کے پاس متعدد اطاعتی اعمال کی تشریح فرمائی لہذا اس حوالہ سے گویا وہ لوگوں کو ان کی اخروی سعادت کی نشاندہی کرتا ہے اور انہیں قرب خداوندی کی عظیم منزل پر فائز کرتا ہے، اور یہ سلسلہ اس وقت سے جاری ہے جب حضرت ابراہیم نے اسے تعمیر کیا کہ یہ مقدس گھر خدا کے قرب کا قصد کرنے والوں کا مرکز اور عبادت گزاروں کا معبد بنا ہوا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن مجید میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ فریضہ حج سب سے پہلے عہد ابراہیمی میں اس وقت شروع ہوا جب حضرت ابراہیم نے خانہ کعبہ کی تعمیر کا کام مکمل کر لیا، آیت ملاحظہ ہو:

سورۃ بقرہ آیت: ۱۲۵

○ ”وَعَهَدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنَّ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ“

(اور ہم نے ابراہیم و اسماعیل سے عہد لیا کہ وہ میرے گھر کو پاک بنائیں طواف کرنے والوں کے لئے اور اعکاف انجام دینے والوں کے لئے اور رکوع و سجود بجالانے والوں کے لئے!)

حضرت ابراہیم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد الہی ہوا:

سورۃ حج، آیت: ۲۷

○ ”وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَبِيقٍ“  
(اور لوگوں میں حج کا اعلان کرو کہ وہ دور دراز علاقوں سے پیدل چل کر اور سوار یوں پر سوار ہو کر تیرے پاس آئیں)

یہ آیت مبارکہ جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں اس مطلب پر دلالت کرتی ہے کہ حج کے اعلان پر دو دروازے کے عشاّر و قبائل نہایت گرمجوشی کے ساتھ لبیک کہیں گے اور جوق در جوق بیت اللہ کی طرف آئیں گے۔

اور یہ آیت اس بات کی دلیل بھی ہے کہ یہ خدائی شعائر یعنی حج حضرت شعیبؑ کے زمانہ تک لوگوں میں معروف و رائج تھا جیسا کہ درج ذیل آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے حضرت شعیب کا موسیٰؑ سے یہ کہنا ذکر کیا ہے کہ جس میں حج کا تذکرہ ہے، ملاحظہ ہو:

سورہ قصص، آیت: ۲۷

”إِنِّي أُرِيدُ أَنْ نَمُنَّكَ إِحْدَى ابْنَتِي هَاتَيْنِ عَلَى أَنْ تَأْجُرَنِي ثَلَاثِي حَجَّجَ قَانَ أَتَيْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ“

(میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تجھ سے کروں بشرطیکہ میری طرف سے آٹھ حج بجا لاؤ، اگر دس پورے کرو تو وہ تمہاری طرف سے ہوگا.....)

اگرچہ آیت کے ظاہری الفاظ سے اعمال حج بجالانا ثابت ہوتا ہے لیکن یہاں مناسک حج مراد نہیں بلکہ آٹھ سال خدمت انجام دینا مراد ہے اور لفظ ”حج“ ایک سال کے معنی میں ہے تو ”ثمانی حج“ سے مراد آٹھ سال ہے کیونکہ اس زمانہ میں تاریخ کا حساب، حج کے ایام سے ہوتا تھا اور سالوں کی گنتی کا معیار بھی حج تھا کہ اسی کی بناء پر سالوں کو شمار کیا جاتا تھا لہذا آیت میں بھی وہی مراد مقصود ہے۔

اسی طرح دعوتِ ابراہیمیٰ میں بھی اس حقیقت کے شواہد کثرت کے ساتھ پائے جاتے ہیں کہ بیت اللہ ہی مرکز عبادت اور مینار ہدایت رہا۔ (تفصیلات کے لئے سورہ ابراہیم کا مطالعہ کریں)۔

تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بھی عرب، خانہ کعبہ کو نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور شریعتِ ابراہیمیہ میں قرار پانے والا فریضہ سمجھتے ہوئے حج کرنے آتے تھے، اور تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ عربوں کے علاوہ دیگر لوگ بھی خانہ کعبہ کی تعظیم کرتے اور اسے نہایت احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہی بات اس کے ”ہدی للعالَمین“ ہونے کی دلیل ہے کہ اس کے ذریعہ لوگ قلبی توجہ کے ساتھ خداوند عالم کا ذکر کرتے تھے، اور ظہور اسلام کے بعد کی صورت حال واضح ہے کہ روئے زمین کے مشرق و مغرب میں خانہ کعبہ کا نام عام ہے اور اس نے لوگوں کی سوچوں اور دلوں میں اپنی محبت اور اپنی یاد کا چراغ روشن کر دیا ہے اور مسلمانوں کی عبادات، اطاعتی اعمال، قیام و قعود، اٹھنا بیٹھنا، جانور ذبح کرنا اور زندگی کے تمام دیگر امور میں بیت اللہ کی طرف رخ کرنا بنیادی عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

بنابر ایں خانہ کعبہ ہدایت کے تمام حوالوں کا امین ہے یعنی فکر اور سوچ سے لے کر عمل کے وسیع دائرہ تک اسے ہی



مرکزیت حاصل ہے اور خدا کے مخلص بندوں میں سے طاہر و پاک افراد ہی اس سے وابستہ رہتے ہیں ان کے علاوہ کوئی اسے چھو بھی نہیں سکتا۔

اس کے علاوہ یہ کہ خانہ کعبہ تمام مسلمانان عالم کو ان کی دنیوی سعادت کی راہ بھی دکھاتا بلکہ اس پر لاتا ہے کہ جو وحدت کلمہ اور اتحاد امت اور باہمی ہم آہنگی و یکجہتی کے عملی آثار و فوائد سے عبارت ہے، اس کے ساتھ ساتھ وہ غیر مسلم دنیا کے لئے بھی ہادی و راہنما کا کام کرتا ہے کہ انہیں خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے اور انہیں امت کی وحدت و اتحاد و ہم آہنگی و یکجہتی اور مختلف و پراگندہ قوتوں کے یکجا ہونے کے بعد نتائج و فوائد سے آگاہی دلاتا ہے۔

ان مطالب سے یہ ثابت ہوا کہ:

(۱) خانہ کعبہ دنیا و آخرت دونوں کی سعادت کے حصول کی راہ دکھاتا ہے اور اس میں ہدایت کے تمام مدارج و مراتب شامل ہیں لہذا اس کی ہدایت، مطلق ہے کہ جس کا دائرہ وسیع اور تمام اقسام کا جامع ہے۔

(۲) خانہ کعبہ تمام عالمین کے لئے ہادی و راہنما ہے نہ کہ کسی خاص زمانہ اور مخصوص قوم و قبلہ کے لئے، مثلاً آل ابراہیمؑ کے لئے یا عربوں یا صرف مسلمانوں کے لئے، بلکہ اس کی ہدایت کا دائرہ وسیع ہے، وہ ہر زمانہ اور ہر قوم کے لئے سرچشمہ ہدایت ہے۔

## واضح نشانیاں اور مقام ابراہیمؑ

○ ”فِيهَا آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ اِبْرَاهِيمَ“

(اس میں واضح نشانیاں، مقام ابراہیمؑ ہے)

آیات کی توصیف بیانات سے ہوئی ہے یعنی آیات کو بیانات (واضح نشانیاں) کہا گیا ہے اس سے آیات کا اس خصوصیت سے بہرہ ور ہونا ثابت ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اس خصوصیت کے بارے میں ابہام دور نہیں ہوتا بلکہ صورتحال غیر واضح رہتی ہے کیونکہ یہاں بیت اللہ کی خصوصیات کا تذکرہ مقصود ہے اور اس امتیازی صفت کا بیان مطلوب ہے جس کی بناء پر اسے دیگر جگہوں پر برتری حاصل ہے لہذا اس حوالہ سے مقامی مناسبت واضح بیان کی متقاضی ہے کہ ایسی توصیف ہو جس میں ابہام تو بجائے خود، اجمال بھی نہ پایا جائے۔

بنا بریں یہ کہنا بجا ہوگا کہ جملہ ”مَقَامُ اِبْرَاهِيمَ“ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ اٰمِنًا وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ ..... الخ“

در اصل ”اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ“ کی تفسیر و توضیح ہے یعنی آیات سے مراد، مقام ابراہیم، بیت اللہ میں داخل ہونے کا باعث امن ہونا اور تمام مستطیع لوگوں پر اس کا حج واجب ہونا ہے۔

لیکن بعض مفسرین کا یہ اظہار خیال درست نہیں کہ یہ تین جملے (مقام ابراہیم، وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ اٰمِنًا، وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حَٰجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا،، ”اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ“ کا بدل یا عطف بیان ہے، کیونکہ اگر ایسا ہو تو اس میں کلام کو یوں فرض کرنا پڑے گا: ”ہی مقام ابراہیم..... الخ“ کہ وہ آیات یہ ہیں: ”مَقَامُ اِبْرٰهِيْمَ..... الخ“، اور اس میں حرف ”ان“ بھی فرض کرنا پڑے گا کہ ”وَمَنْ دَخَلَهُ“ خواہ جملہ انشائیہ ہو یا جملہ خبریہ ہو اس کی بازگشت مفرد کی طرف ہے، اور یہ بھی کہنا پڑے گا کہ جملہ انشائیہ ”وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ.....“ کی بازگشت جملہ خبریہ کی طرف ہے کہ اس بناء پر پھر اسے سابقہ جملہ کی طرف عطف کر کے اسے مفرد کی حیثیت دی جائے گی یا اس میں بھی حرف ”ان“ مقدر مانا جائے گا، لیکن کلام الہی میں ایسا کوئی ثبوت یا اشارہ نہیں ملتا جس کی بناء پر ان تمام امور میں سے کسی ایک کی تائید ہوتی ہو، لہذا ان تین جملوں کو نہ تو ”اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ“ کا بدل قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی عطف بیان مانا جاسکتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں جملے ایک خاص غرض کے لئے لائے گئے ہیں اور وہ یہ کہ بتایا جائے کہ مقام ابراہیم اسی جگہ ہے اور یہ کہ بیت اللہ کا حج واجب ہے، اس بناء پر ان تین جملوں کا ذکر کیا جانا اہم ترین مقصد کا حامل ہے، اس کی مثال ہمارے روزمرہ کے اظہارات میں بھی موجود ہے اور وہ یہ کہ ہم ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ فلاں شخص شریف آدمی ہے، وہ فلاں کا بیٹا ہے، مہمان نواز ہے، ہمیں بھی اس جیسا ہونا چاہیے..... تو اس میں آخری تین جملے (وہ فلاں کا بیٹا ہے، مہمان نواز ہے، ہمیں بھی اس جیسا ہونا چاہیے) پہلے جملہ کا نہ تو بدل ہے اور نہ ہی عطف بیان ہیں.....

مقام ابراہیم کا تذکرہ

○ ”مَقَامُ اِبْرٰهِيْمَ“  
(ابراہیم کا مقام)

یہ الفاظ یعنی ”مَقَامُ اِبْرٰهِيْمَ“ ایک محذوف خبر کا مبتداء ہے لہذا اصل جملہ یوں تصور کیا جائے گا: ”فیہ مقام

ابراہیم“ (اس میں مقام ابراہیم ہے)۔

مقام ابراہیم اس پتھر کو کہتے ہیں جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کا نشان ثبت ہے، کثیر روایات سے

ثابت ہوتا ہے کہ اسی جگہ وہ پتھر مدفون ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ کی دیواریں کھڑی کی تھیں، اس کا محل وقوع مطاف کے نزدیک ملتزم کے بالمقابل ہے، اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عم الرسول حضرت ابوطالب علیہ السلام نے اپنے قصیدہ لامیہ میں یوں ارشاد فرمایا:

”و موطىء ابراهيم في الصخر رطبة على قدميه جافياً غير فاعل“

(ابراہیم کے قدموں کی جگہ تازہ نرم پتھر میں ہے کہ جس پر ان کے بغیر نعلین کے پاؤں ثبت ہیں)

لفظ ”مَقَامُ اِبْرَاهِيمَ“ سے یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ یا تو بیت اللہ ہی مقام ابراہیم ہے یا بیت میں مقام ابراہیم واقع ہے کہ یہاں وہ عبادت الہی بجالاتے تھے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ آیت سے فہم المعنی کے لئے عبادت کو یوں فرض کیا جائے: ”ہی مقام ابراہیم والامن والحج“ (وہ آیات مقام ابراہیم، امن اور حج سے عبارت ہے) اور پھر ان دو جملوں: ”وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا“ اور ”وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مِمَّنْ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا“ جو کہ ایک فرمان اور حکم انشائی پر مشتمل ہیں دو خبری جملوں کی حیثیت دی جائے (انشائی جملوں کو خبری جملے قرار دیا جائے)، تو یہ بات قرآن مجید کے نہایت عمدہ ترین اسلوب بیان کا ایک نمونہ ہوگا کہ اس میں کلام سے دو مقصد و معنی ملحوظ ہیں یعنی جو کلام کسی خاص معنی و غرض کے لئے ہے اسے اس غرض کے ساتھ ساتھ کسی دوسری غرض و معنی کے لئے بھی استعمال کیا جائے تو ایک کی جگہ دوسری کو لا کر سننے والے کی توجہ ایک معنی سے دوسرے معنی کی طرف منتقل ہو جائے اور ایک کلام دو معنوں کا افادہ کرے۔ اور اس میں دونوں ملحوظ جہتیں محفوظ رہیں، اور یہ اس ی طرح سے ہے جیسے کسی کے کلام کو بیان کرنے میں خیر دینے کا اسلوب اپنایا جائے، اس کی قرآنی مثالیں ملاحظہ ہوں:

سورہ بقرہ، آیت ۲۸۵:

○ ”كُلُّ اٰمِنٍ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ“

(سبھی ایمان لائے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر، ہم اس کے رسولوں میں سے کسی ایک کے درمیان فرق نہیں کرتے)

اس آیت میں پہلے ہر شخص کے ایمان لانے کا تذکرہ ہوا، پھر ان کی زبانی انبیاء الہی علیہم السلام کے درمیان عدم تفریق کی بات بیان کی گئی۔

اس کی مانند ایک آیت یہ ہے:

سورہ بقرہ، آیت: ۲۵۸

○ ”اَلَمْ تَرَ اِيَّ الَّذِي حَاجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖۤ اَنْ اَشۡهَدُ اللّٰهَ التَّمٰلِكُ اِدۡقَالَ اِبْرٰهٖمَ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحٰبِ

وَيُيَسِّرُ الْقَالَ آتَا سُحْيًا وَأَمِيتُ ط قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالسَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ ط وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ “

(کیا تو نے نہیں دیکھا اس شخص کو جو ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں بحث و نزاع کر رہا تھا کہ خدا نے اسے حکمرانی عطا کی تھی، جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے تو اس نے کہا میں بھی زندہ کرتا ہوں اور موت دیتا ہوں، ابراہیم نے کہا کہ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو مغرب سے نکال لے، تو کافر مہوت ہو گیا، اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا)۔

ایک آیت میں یوں ارشاد ہوا:

سورہ بقرہ، آیت: ۲۵۹

○ ” أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا ط قَالَ أَلَىٰ هَذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِنَا ط فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ط قَالَ كَمْ لَبِثْتُ ط قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ط قَالَ بَلْ لَبِثْتُ مِائَةَ عَامٍ فَانظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ط وَانظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ وَانظُرْ إِلَىٰ الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ط فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ ط قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ “

(یا اس شخص کی طرح کہ جو ایک ہستی سے گزرا جو کہ اوندھے منہ گری ہوئی تھی (بناہ و برباد ہو چکی تھی) تو اس نے کہا کہ اللہ اسے مرنے کے بعد کس طرح زندہ کرے گا؟ تو اللہ نے اسے ایک سو سال تک موت کے منہ میں دے دیا، پھر اسے اٹھایا اور پوچھا کہ تو کتنی دیر یہاں قیام پذیر رہا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ! خدا نے کہا کہ تو ایک سو سال یہاں قیام پذیر رہا ہے، تو اپنا کھانا پانی دیکھ کہ ابھی تک خراب نہیں ہوئے اور اپنے گدھے (سواری) کو دیکھ، ہم نے یہ سب اس لئے کیا ہے تاکہ تجھے لوگوں کے لئے نشانی بنا دیں، اب تو ہڈیوں کو دیکھ کہ کس طرح ہم ان کو جوڑتے ہیں اور پھر ان کو گوشت کا لباس پہناتے ہیں، جب یہ تمام حقائق اس پر واضح ہو گئے تو کہنے لگا کہ میں بخوبی آگاہ ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے)

مذکورہ بالا دونوں آیتوں (۲۵۸، ۲۵۹) میں جو اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے اس کی وضاحت دوسری آیت

(۲۵۹) کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔

دیگر دو آیتیں ملاحظہ ہوں:

سورۃ شعراء، آیت: ۸۹

○ ”يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ﴿۸۹﴾ إِلَّا مَنْ آتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ“

(اس دن نہ مال کوئی فائدہ دے گا اور نہ ہی اولاد کام آئے گی سوائے اس شخص کے کہ جو بارگاہِ الہی میں قلبِ سلیم کے ساتھ آئے۔)

سورۃ بقرہ، آیت: ۱۷۷

○ ”لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ  
وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ  
بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالصَّرَاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ  
صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ“

(نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے رخ مشرق یا مغرب کی طرف کر لو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ جو شخص اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر، کتابوں پر اور نبیوں پر ایمان لائے اور اللہ کی محبت میں اپنا مال دے قریبیوں کو، یتیموں کو، مسکینوں کو، مسافروں کو، مانگنے والوں کو اور غلام آزاد کرانے میں! اور نماز قائم کرے، اور زکوٰۃ ادا کرے، اور وہ اپنے وعدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب بھی وعدہ کریں، اور تکلیفوں و سختیوں اور شدت کے وقت صبر کرنے والے ہوں، وہی لوگ سچے اور وہی پرہیزگار ہیں)

تو اس آیت میں نیکی کی جگہ نیک شخص کا ذکر ہوا ہے۔

سورۃ بقرہ، آیت: ۱۷۱

○ ”وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دَعَاةَ وَوَيْدَاءٍ صُمْرًا بِكُمْ عَمِي  
فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ“

(کافروں کی مثال اس شخص جیسی ہے جو ریوڑ کو چیخ چیخ کر آواز دیتا ہے کہ جسے جو سنتا نہیں سوائے اس کی پکار اور ہم ہمہ کے، وہ گونگے، بہرے اور اندھے ہیں، وہ کچھ بھی نہیں سمجھتے (عقل سے عاری ہیں)

اس طرح کے اسلوب بیان پر مشتمل متعدد آیات قرآن مجید میں موجود ہیں کہ جن میں مثالوں کے ذریعے مطلوبہ معنی پیش کیا گیا ہے۔

یہاں آیت مبارکہ ”فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حُجُّ

الْبَيْتِ مَنْ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ، انشاء اور اخبار کے درمیان مردود ہونے کے حوالہ سے درج ذیل آیت مبارکہ کی طرح ہے:

سورہ ص، آیت: ۴۴

○ ”وَأَذْكُرُ عَبْدًا آيُوبَ إِذْ نَادَى رَبَّهُ أَلَيْسَ لِي مَسْئِمَةُ الشَّيْطَانِ بِضَبٍّ وَعَذَابٍ ۗ أُرْغَضَ بِرَجْلِكَ هَذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَشَرَابٌ ۗ وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمَثَلَهُمْ مَعَهُمْ رَاحَةً مِّمَّا وَذَكَرَ لِي لِأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْتًا قَاصِرًا بِهِ وَلَا تَحْنُطْ ۗ إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ“

(ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو کہ جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ شیطان نے مجھے سخت تکلیف ودکھ پہنچایا ہے (ہم نے اس سے کہا) اپنا پاؤں زمین پر مارو، یہ ٹھنڈا اور پینے کا پانی ہے (اس سے غسل کرو اور اسے پیو) اور ہم نے اپنی رحمت سے اسے اس کے اہل و عیال اور ان جیسے دیگر بھی عطا کئے، جو کہ صاحبان عقل کے لئے مایہ نصیحت ہے، اور (ہم نے اس سے کہا) سینکوں کا ایک گچھا ہاتھ میں لے لو اور اسی سے اسے مارو اور اپنی قسم کی خلاف ورزی نہ کرو، ہم نے اسے صابر اور بہترین بندہ پایا، بے شک وہ بڑی لو لگانے والا تھا۔

اس آیت مبارکہ میں بھی ہماری زیر بحث آیت کی طرح خبری اور انشائی دونوں طرح کے جملے پائے جاتے ہیں اور

ان کے درمیان اس قدر آمیزش ہے کہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔

اور ہم نے جو مطالب پیش کئے ہیں وہ ان مطالب سے مختلف ہیں جو دیگر مفسرین نے زیر بحث آیت مبارکہ کی تفسیر میں پیش کیے اور کہا کہ یہ تین جملے (مَقَامُ إِبْرَاهِيمَ ، وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا ، وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ) ابتدائی الفاظ ”فِيهِ الْبَيْتُ بَيْتُ“ کا بدل ہیں، اگر ہم ان کو بدل ہی قرار دیں تو بہتر ہے کہ صرف الفاظ ”مقام ابراہیم“ ہی کو بدل قرار دیں اور دوسرے دو جملوں کو جملہ ہائے مسأله (نئے جملے، مستقل کلام) قرار دیں کہ جو بدل قرار پائے، دو مخدوف جملوں کی نشاندہی کرتے ہیں، اس بناء پر آیت سے فہم المعنی کے لئے عبارت یوں فرض کرنی پڑے گی، ”فیه آیات بینات مقام ابراہیم و أمن الداخل و حج المستطیع للبيت“، (اس میں واضح نشانیاں مقام ابراہیم اور داخل ہونے والے کے لئے امن اور استطاعت رکھنے والے کے لئے بیت اللہ کا حج) اور یہ بات ہر طرح کے شک و شبہ سے خالی ہے کہ مذکورہ تین امور میں سے ہر ایک اپنے تئیں خداوند عالم کے وجود کی روشن دلیل و نشانی ہے اور اس کے عظیم مقام و مرتبہ کی یاد تازہ کرتی ہے کیونکہ لفظ ”آیت“ کا معنی ہی علامت و نشانی اور کسی چیز کے وجود پر دلالت کرنے والی چیز ہے خواہ جس حوالہ و بنیاد پر دلالت کرے، تو ”مقام ابراہیم“ سے بالاتر کون سی علامت و نشانی ایسی ہو سکتی ہے جو اہل دنیا کی نگاہ میں خداوند عالم کا عظیم و بلند

مقام یاد دلائے، اور بیت اللہ سے بڑھ کر کون سی ایسی عمارت ہے جو اپنے اندر داخل ہونے والوں کے لئے امن و امان کا گہوارہ ہو؟ اور اعمال و مناسک حج سے بالاتر کون سے ایسے عبادتی اعمال ہیں جو سالہا سال سے افراد بشر کی اجتماعی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں کہ ہر سال لاکھوں کروڑوں انسان ان اعمال کی انجام دہی کے ذریعے خدا کی بارگاہ میں اظہار عبودیت و بندگی کرتے ہیں اور گردش میل و نہاران کی تازگی کو کم نہیں کر سکتی؟ تو ان امور کا آیت و علامت ہونا ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔

اب رہی یہ بات کہ آیا ضروری ہے کہ ہر آیت و علامت خارق العادت ہو اور عالم الطبیعہ میں جاری و ساری نظام و اصولوں سے ماوراء ہو؟ تو اس کا جواب منفی ہے اور اسے ہرگز واجب و لازمی قرار نہیں دیا جاسکتا، نہ تو لفظ ”آیت“ اپنے مفہوم کے ساتھ اس پر دلالت کرتا ہے اور نہ ہی قرآنی استعمال سے اس کا اس معنی میں منحصر ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ کسی چیز کا مجزہ و خارق العادت ہونا اس لفظ کے مفاد یقین میں سے ایک تو ہو سکتا ہے لیکن اس کا معنی ہرگز نہیں ہو سکتا چنانچہ سورہ بقرہ، آیت ۱۰۶ ”مَا تَسْمَعُ مِنْ آيَةٍ اَوْ نَسِيهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّمَّا آذَوْا بِهَا“ (ہم جو آیت منسوخ کرتے ہیں اسے بھلواتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی لے آتے ہیں) اس آیت مبارکہ میں لفظ ”آیت“ وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے یہاں تک کہ اس میں شریعت کے منسوخ احکام بھی شامل ہیں، اور سورہ شعراء، آیت ۱۲۸ میں لفظ ”آیت“ کو علامت و نشانی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا: ”اَتَّبِعُونَ بِكُلِّ رِيٍّ آيَةً تَعْبَثُونَ“ (کیا تم ہر بلند جگہ پر بے مقصد نشانیاں بناتے رہتے ہو؟)۔ اس کے علاوہ بھی قرآن مجید میں متعدد آیات موجود ہیں جن میں لفظ ”آیت“ مجزہ کے علاوہ دیگر معانی میں استعمال ہوا ہے۔

مذکورہ بالا مطالب سے بعض مفسرین کی طرف سے ”مقام ابراہیم“ کو خارق العادت اور آیت المجزہ قرار دینے پر مصر ہونے کا راز بھی کھل جاتا ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امن اور حج کا تذکرہ آیت کے مقصودہ معنی کو واضح کرنے کی غرض کے علاوہ کے لئے ہوا ہے، لفظ ”آیت“ کی وضاحت کے لئے نہیں ہوا۔

اسی طرح ان مفسرین کرام کے اظہارات سے بھی پردہ اٹھ جاتا ہے جنہوں نے ”آیات بینات“ سے قطعی طور پر ان تین چیزوں کے علاوہ خانہ کعبہ کی دیگر خصوصیات مراد لی ہیں، (ہم نے ان اقوال و آراء کو یہاں ذکر کرنے سے گریز کیا ہے لہذا جو شخص ان سے آگاہی حاصل کرنا چاہے وہ ان تفاسیر کا مطالعہ کرے جن میں وہ تفصیلات مذکور ہیں) کیونکہ اس قول کی بنیاد بھی یہ ہے کہ لفظ ”آیات بینات“ سے مجزہ و خارق العادت امور مراد ہوں، جبکہ اس مطلب کا کوئی ثبوت و دلیل ہمارے پاس موجود نہیں جیسا کہ ہم سابقہ بیانات میں ذکر کر چکے ہیں۔

بنا برائے حق بات تو یہ ہے کہ جملہ ”وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ اٰمِنًا“ کسی تکوینی خصوصیت کو بیان نہیں کرتا بلکہ ایک تشریحی حکم و عملی دستور کے بیان پر مشتمل ہے، البتہ یہ بات ممکن ہے کہ اس جملہ خبریہ کے بارے میں یہ کہا جائے کہ اس میں ایک

سابقہ تشریحی حکم کی خبر دی گئی ہے کہ جو امن کی غرض کا حامل ہے چنانچہ سورۃ بقرہ اور سورۃ ابراہیم میں مذکورہ دعا دعوت ابراہیمی سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے اور اس کی مزید تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ بعثت نبویؐ سے قبل بھی زمانہ جاہلیت میں عرب بیت اللہ کو اس مقام کا حامل سمجھتے تھے اور اس کی کڑیاں بلکہ بنیاد حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے ملتی ہے۔

## امن و امان سے کیا مراد ہے؟

ممکن ہے کہ جملہ ”وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا“ (جو اس میں داخل ہوا وہ دائرہ امن میں آ گیا) سے یہ سمجھا جائے کہ اس کے ذریعے مطلع کیا گیا ہے کہ امن و امان کو تباہ کرنے والے حوادث و ہولناکیاں فتنے اس گھر میں وقوع پذیر نہیں ہوں گے اور نہ ہی دیگر علاقوں میں رونما ہونے والے وحشت ناک واقعات اس مقدس گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔

لیکن اس قول و رائے کا نادرست ہونا اس میں وقوع پذیر ہونے والے ناگوار واقعات، قتل و غارت اور تباہ کن جنگوں ہی سے ثابت ہوتا ہے بالخصوص وہ واقعات جو زیر بحث آیت مبارکہ کے نزول سے پہلے وہاں رونما ہوئے۔

اور جہاں تک سورۃ عنکبوت کی آیت ۶۷ کا تعلق ہے کہ جس میں ارشاد الہی ہوا:

”أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا مَّأْمُونًا وَّيُنَظَّفُونَ النَّاسَ مِنْ حَوْلِهِمْ“

(کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے حرم کو امن و امان کی جگہ قرار دیا ہے جبکہ اس کے ارد گرد کے علاقے دشمنوں

کے حملوں کا نشانہ بنے ہوئے ہیں)

تو اس سے صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ حرم میں امن و امان قائم و باقی رہے گا، اس سے زیادہ کوئی مطلب ثابت نہیں ہوتا اور وہ صرف اس حوالہ سے کہ لوگ اس کو نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھیں گے اور اس کی تعظیم واجب و لازمی قرار دیں گے کہ جس کا ثبوت و حکم شریعت ابراہیمیؑ میں موجود ہے اور بالآخر خداوند عالم اسے عبادتی حیثیت عطا کرے گا اور اسے تشریحی فرمان میں ڈھال دے گا۔

یہی صورت حضرت ابراہیمؑ کی دعاؤں میں ملتی ہے جن میں انہوں نے بارگاہ الہی میں عرض کیا: (ملاحظہ ہو)

سورۃ ابراہیم، آیت: ۳۵

○ ”رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْبَلَدَ آمِنًا“

(پروردگارا! اس شہر کو گوارا امن بنا دے)



سورۃ بقرہ، آیت: ۱۲۶

○ ”رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا“

(پروردگارا! اس شہر کو امن دینے والا بنا دے)

ان دعاؤں میں حضرت ابراہیمؑ نے خداوند عالم سے شہر مکہ کے لئے امن مانگا ہے، تو خداوند عالم نے ان کی دعا کو شرف قبولیت عطا کرتے ہوئے ایک تشریحی فرمان جاری کر کے اسے گوارا امن بنا دیا اور ایسا عبادتی حکم جاری کر دیا کہ لوگ جو ق در جو ق اس کی طرف آئیں اور ہر زمانہ میں اپنے قلبی لگاؤ کے ساتھ حکم خداوندی پر سر تسلیم خم کرنے کا عملی مظاہرہ کرتے رہیں۔

### فریضہ حج کا فرمان

○ ”وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا“

(اور اللہ کے لئے لوگوں پر بیت کا حج واجب ہے جو بھی اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو)

لفظ ”حج“، ح کے نیچے زیر کے ساتھ..... اور ح پر زبر کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے..... کا معنی قصد و ارادہ ہے، پھر وہ ان اعمال کی انجام دہی کے لئے بیت اللہ کا قصد کرنے کے معنی میں استعمال سے مختص ہو گیا جو شریعت نے بیان کئے۔

لفظ ”سَبِيْلًا“ ادبی حوالہ سے فعل ”استطاع“ سے تیز واقع ہوا ہے۔

یہ آیت مبارکہ فریضہ حج کے فرمان خداوندی پر مشتمل ہے اور یہ وہی اعمال و مناسک حج ہیں جن کا آغاز حضرت ابراہیمؑ سے ہوا چنانچہ اس کا ثبوت سورۃ حج کی آیت ۲۷ میں ان الفاظ میں ملتا ہے، ”وَاذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ“..... لوگوں میں فریضہ حج کا اعلان کرو..... اس میں خداوند عالم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ لوگوں کو فریضہ حج سے آگاہی دلائیں اور ان میں اس فرمان خدائی کا اعلان کریں۔ اس سے یہ بھی ظاہر و واضح ہوتا ہے کہ جملہ ”وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ“ جملہ ”وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا“ کی طرح سابقہ تشریحی حکم کی خبر دیتا ہے، اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ جملہ انشائیہ ہو یعنی اس میں سابقہ حکم سے آگاہی دلانے کی بجائے مستقل فرمان جاری کرنا مقصود ہو البتہ امضائی صورت میں! یعنی حضرت ابراہیمؑ کے شروع کردہ اعمال حج پر مہر تصدیق ثبت کرنے کی صورت میں ہو، لیکن سیاق الکلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جملہ خبریہ ہونا زیادہ اقرب الی الواقع ہے یعنی تشریحی حکم کی خبر پر مشتمل ہونا زیادہ واضح و روشن ہے۔

## حج کا انکار

○ ”وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ“  
(اور جو شخص حج کو ترک کرے تو خدا، عالمین سے بے نیاز ہے)

یہاں لفظ ”کفر“ سے مراد فروع دین کا انکار ہے اور یہ اسی طرح ہے جیسے نماز و زکوٰۃ کو ترک کرنا کفر ہے، تو ”کفر“ سے مراد ترک کرنا ہے، اس بناء پر یہ کلام ایسا قرار پائے گا جس میں سبب کی جگہ مسبب اور سرچشمہ اثر کی جگہ اثر کو لایا گیا ہو جیسا کہ جملہ ”فان الله غني عن العالمين“ معلول کی جگہ علت کو ذکر کرنے کے طور پر ہے۔ لہذا آیت سے فہم المعنی کے لئے عبارت کو اس طرح فرض کرنا پڑے گا: ”ومن ترك الحج فلا يضر الله شيئاً فان الله غني عن العالمين“ (اور جو شخص حج کو ترک کرے یعنی اسے انجام نہ دے تو وہ خدا کو کوئی ضرر و نقصان نہیں پہنچائے گا کیونکہ خدا تمام عالمین سے بے نیاز ہے)۔

## روایات پر ایک نظر

## پہلا گھر ہونے کا معنی

ابن شہر آشوب نے حضرت امیر المؤمنین سے روایت کی ہے کہ آپ نے آیت مبارکہ ”ان اول بيت وضع للناس..... الخ“ کی تفسیر میں اس شخص کے جواب میں جس نے امام سے پوچھا کہ کیا خانہ کعبہ ہی پہلا گھر ہے؟ ارشاد فرمایا: ”لا، قد كان قبله بيوت ولكن اول بيت وضع للناس مباركا فيه الهدى والرحمة والبركة، واول من بناه ابراهيم ثم بناه قوم من العرب من جرهم، ثم هدم فبنت العمالقة، ثم هدم فبناه قريش“،

نہیں ایسا نہیں ہے، بلکہ اس سے پہلے بھی دیگر گھر موجود تھے، لیکن خانہ کعبہ وہ پہلا برکت والا گھر ہے جو لوگوں کے لئے بنایا گیا کہ جس میں ہدایت، رحمت اور برکت ہے، اور سب سے پہلے اسے حضرت ابراہیمؑ نے بنایا، پھر جرہم کے عربوں

نے بنایا، پھر وہ گر گیا تو عمالقہ نے اسے تعمیر کیا، پھر گر گیا تو قریش نے اس کی تعمیر نو کی،  
(ملاحظہ ہو، تفسیر البرہان، جلد اول ص ۳۰۱)

### در منشور کی روایت

تفسیر ”در منشور“ میں مذکور ہے کہ ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے شععی کے حوالہ سے امام علی بن ابی طالب علیہما السلام سے روایت کی ہے کہ آپ نے آیت مبارکہ ” اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ “ کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: ”كانت البيوت قبله ولكن كان اول بيت وضع لعبادة الله“، اس سے پہلے گھر تو موجود تھے مگر وہ پہلا گھر ہے جو لوگوں کے لئے خدا کی عبادت کی غرض سے بنایا گیا، (تفسیر ”در منشور“، جلد دوم، صفحہ ۵۲)

اس روایت کے مانند ابن جریر نے مطر کے حوالہ سے ایک روایت بیان کی ہے، البتہ اس مطلب کی حامل روایات کثرت سے موجود ہیں۔

### بکہ اور مکہ

کتاب علل الشرائع میں حضرت امام جعفر صادق سے منقول ہے آپ نے ارشاد فرمایا: ”موضع البيت بكة والقرية مكة“، بکہ وہ جگہ ہے جہاں خانہ خدا واقع ہے اور ”مکہ“ بستی کا نام ہے، (علل الشرائع، صفحہ ۳۹۷ باب ۱۳۷)

### بکہ کی وجہ تسمیہ

علل الشرائع ہی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان مذکور ہے، آپ نے ارشاد فرمایا:  
”الما سميت بكة بكة لان الناس يبكون فيها“  
بکہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ لوگ یہاں کثرت کے ساتھ جمع ہوتے ہیں (ہجوم کرتے ہیں)۔  
(علل الشرائع، ص ۳۹۷ باب ۱۳۷)

”یکون“ سے مراد، یزدجون ہے یعنی ازدحام کرتے ہیں۔

اسی کتاب میں ایک روایت حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

”انما سمیت مکة بكة، لانه یک بها الرجال والنساء، والمرأة تصلى بين یدیک و

عن یمینک و عن شمالک و معک و لابس بذلک، انما یکره ذلک فی سائر البلدان“

مکہ کو بکہ اس لئے کہا جانے لگا کہ وہاں مردوں اور عورتوں کا مخلوط ہجوم ہوتا تھا، (اب بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ) عورت

تمہارے سامنے، تمہارے دائیں و بائیں اور تمہارے ساتھ کھڑی ہو کر نماز ادا کرتی ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں جبکہ دیگر

مقامات میں اس طرح کھڑے ہو کر نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

(علل الشرائع، باب ۱۳۷، صفحہ ۳۹۷)

## کعبہ کی منفرد ساخت

کتاب علل الشرائع میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے آپ نے ارشاد فرمایا: خداوند عالم نے جب

زمین کو خلق کرنا چاہا تو ہواؤں کو حکم دیا کہ پانی پر تھیں بیٹھیں، تو اس سے موجیں بنتی گئیں، پھر وہ تہہ بہ تہہ جھاگ بنتا گیا اور پھر

ایک جگہ جمع ہو گیا، اسی جگہ خانہ کعبہ واقع ہے، پھر اسے جھاگ کا پہاڑ بنا دیا، اور پھر اس کے نیچے سے زمین کو پھیلا دیا، اسی

مطلب کو آیہ مبارکہ ”ان اول بیت وضع للناس للذی بکة مبارکاً“ میں بیان کیا گیا ہے، تو روئے زمین پر

خلق ہونے والا سب سے پہلا مقام خانہ کعبہ ہے کہ زمین کا دامن اسی سے پھیلتا چلا گیا۔

”لما اراد اللہ ان یخلق الارض امر الرياح فضر بن متن الماء حتی صار موجاً، ثم ازبد

فصار زبداً واحداً، تجمعه فی موضع البیت، ثم جعله جبلاً من زبد، ثم دحی الارض من تحته،

وهو قول اللہ ”ان اول بیت وضع للناس للذی بکة مبارکاً“، فاول بقعة خلقت من الارض

الکعبة، ثم مدت الارض منها“۔ (علل الشرائع، باب ۱۳۷، صفحہ ۳۹۸)

دحو الارض یعنی زمین کے کعبہ کے نیچے سے پھیلائے جانے کے بارے میں کثرت سے روایات وارد ہوئی ہیں کہ

جو نہ تو کتاب اللہ سے متصادم ہیں اور نہ ہی عقلی دلائل سے ان کی نفی ہوتی ہے، البتہ علم الطبیعہ کے قدیم ماہرین نے زمین کے

بارے میں اس کے بسیط و قدیم مخضر ہونے کا نظریہ پیش کیا ہے جس کا مذکورہ بالا روایات کے تناظر میں نادرست ہونا ثابت ہے

کہ جس کی وضاحت ضروری نہیں۔

بہر حال یہ ہیں وہ روایات جو آیت مبارکہ ”ان اول بیت وضع للناس للذي ببكة مباركاً“ کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں اور ان میں بیت یعنی خانہ کعبہ کو روئے زمین پر واقع سب سے پہلا گھر قرار دیا گیا ہے، اگرچہ پہلی دو روایتیں آیت مبارکہ کے متن سے مطابقت کی حامل ہونے کے حوالہ سے زیادہ واضح ہیں۔

## آیات بینات سے کیا مراد ہے؟

کتاب کافی اور تفسیر العیاشی میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے ”فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ“ کی تفسیر کے حوالہ سے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا کہ اس سے کیا مراد ہے؟ تو امام نے ارشاد فرمایا: اس سے مقام ابراہیمؑ کہ جہاں حضرت ابراہیمؑ پتھر پر کھڑے ہوئے تو ان کے قدموں کے نشان نقش و ثبت ہو گئے، اور حجر الاسود اور منزل اسماعیل مراد ہے۔

”انه سئل ما هذه البينات؟ قال (ع): مقام ابراهيم حيث قام على الحجر فاثرت فيه قدماه، والحجر الاسود و منزل اسماعيل“

(کافی، جلد ۳ ص ۲۲۳ حدیث اول) (تفسیر العیاشی، جلد اول، ص ۱۸۷)

یاد رہے کہ ”آیات بینات“ کی تفسیر میں دیگر روایات بھی وارد ہوئی ہیں کہ ان میں جو چیزیں ذکر کی گئی ہیں شاید اس کی وجہ صرف ان کو شمار کرنا ہو، اگرچہ ان میں سے بعض کا ذکر آیات مبارکہ میں نہیں ہوا۔

سبیل سکینہ

حیدرآباد لطیف آباد، پوسٹ نمبر ۸-۷۶

مسجد الحرام کی توسیع کی کوشش

تفسیر العیاشی میں عبدالصمد سے روایت ذکر کی گئی کہ انہوں نے کہا: ”طلب ابو جعفر ان يشتري من اهل مكة بيوتهم ان يزيد في المسجد فأبوا، فأرغبهم فامتنعوا، فضايق بذلك، فأتى ابا عبد الله (عليه السلام) فقال له: انى سألت هؤلاء شيئاً من منازلهم وافيتهم لنزيد في المسجد وقد منعوا في ذلك فقد غممني غماً شديداً، فقال ابو عبد الله (ع): لم يغمك ذلك وحتك عليهم ظاهراً، فقال: وبما احتج عليهم؟ فقال (ع): بكتاب الله، فقال: فى ائى موضع؟ فقال (ع): قول الله: ”ان اول بيت وضع للناس للذي ببكة“، وقد اخبرك الله: ان اول بيت وضع للناس هو الذى ببكة، فان كانوا هم تولوا قبل البيت فلهم الفيتهم، وان كان البيت قديماً فيهم فله فئاته،

فدعاهم ابو جعفر فاحتج عليهم بهذا، فقالوا له: اصنع ما احببت “

ابو جعفر (منصور دوانیقی) نے اہل مکہ سے درخواست کی کہ مسجد الحرام کے نزدیک اپنے گھروں کو اس کے ہاتھوں فروخت کریں تاکہ وہ مسجد میں توسیع کر سکے، مگر ان لوگوں نے انکار کر دیا، ابو جعفر نے انہیں راضی کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہ مانے اور اپنے انکار پر ڈٹے رہے۔ بالآخر ابو جعفر، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور تمام روئیداد بیان کرتے ہوئے امام کی خدمت میں عرض کی کہ میں نے ان لوگوں سے مسجد الحرام کی توسیع کی غرض سے کہا کہ وہ مسجد کے اطراف میں موجود اپنے گھر اس کے ہاتھوں بیچیں تاکہ وہ اس منصوبہ کو مکمل کر سکے مگر انہوں نے میری پیشکش قبول نہیں کی جس کی وجہ سے مجھے سخت رنج پہنچا ہے، امام نے ارشاد فرمایا: تم رنجیدہ و غمگین نہ ہو کیونکہ تیرا موقف قوی اور ان پر تیری دلیل واضح ہے، ابو جعفر نے پوچھا: میری دلیل و منطق کیا ہے؟ امام نے ارشاد فرمایا: خدا کی کتاب! اس نے پوچھا: یہ بات کتاب خدا میں کہاں مرقوم ہے؟ امام نے ارشاد فرمایا: یہ آیت مبارکہ ہے: ”إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ.....“، اس میں خداوند عالم نے تجھے آگاہ کیا ہے کہ سب سے پہلے گھر جو روئے زمین پر لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ مکہ میں ہے (تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کعبہ سے پہلے کوئی گھر وہاں نہ تھا..... گویا کعبہ سے تعلق رکھنے والے علاقہ میں گھر بنائے)، پس اگر ان لوگوں نے بیت اللہ سے پہلے وہاں گھر بنائے تھے تو وہ اس علاقہ و سرزمین کے مالک ہیں اور اگر بیت اللہ ان سے قدیم تھا (پہلے اور پہلا گھر تھا) تو وہ علاقہ اسی سے تعلق رکھتا ہے، امام کا ارشاد گرامی سن کر ابو جعفر نے اہل مکہ کو بلایا اور اپنے موقف و دلیل سے آگاہ کیا تو وہ کہنے لگے: آپ جو چاہتے ہیں وہ کر لیں۔ مسجد الحرام کے اپنے توسیعی منصوبہ پر عمل کریں.....

(تفسیر العیاشی، جلد اول، صفحہ ۱۸۵)

## سبیل سکینہ

حیدرآباد لطیف آباد، پرنٹ نمبر ۷۱۸۸

## مسجد الحرام کی توسیع پر لطیف استدلال

حسن بن علی بن نعمان سے روایت ہے: ”لما بنی المهدی فی المسجد الحرام بقیت دار فی تربیع المسجد فطلبها من اربابها فامتنعوا، فسئل عن ذلك الفقهاء، فكل قال له: انه لا ينبغي ان تدخل شيئاً فی المسجد الحرام غصباً، فقال له علی بن يقطين: يا امير المؤمنين انى اكتب الى موسى بن جعفر عليهما السلام لا خبرك بوجه الامر فى ذلك، فكتب الى والى المدينة ان يسأل موسى بن جعفر عليهما السلام عن دار اردنا ان ندخلها فى المسجد الحرام فامتنع عليهما صاحبها فكيف المخرج من ذلك؟ فقال ذلك لابی الحسن، فقال ابو الحسن عليه السلام:

فلا بد من الجوانب فی هذا؟ فقال له: الامر لنا بد منه، فقال له: اكتب: بسم الله الرحمن الرحيم، ان كانت الكعبة هي النازلة بالناس فالناس اولی بفنائها، وان كان الناس هم النازلون ببناء الكعبة فالكعبة اولی بفنائها، فلما اتى الكتاب الى المهدي اخذ الكتاب فقبله، ثم امر بهدم الدار، فأتى اهل الدار ابا الحسن عليه السلام فسألوه ان يكتب الى المهدي كتاباً فی ثمن دارهم، فكتب اليه ان ارضخ لهم شيئاً فارضاهم“

جب خلیفہ مہدی عباسی نے مسجد الحرام کا توسیعی منصوبہ شروع کیا تو مسجد کو مربع شکل دینے میں ایک مکان آڑے تھا، اس نے گھروالوں سے وہ جگہ مانگی تا کہ مسجد کی توسیع مکمل ہو سکے مگر انہوں نے انکار کر دیا، مہدی عباسی نے اس سلسلہ میں فقہاء سے استفسار کیا تو سب نے بالاتفاق یہی کہا کہ مسجد الحرام میں کوئی جگہ غصبی طور پر داخل کرنا جائز نہیں، اس وقت علی بن یقطین نے اس سے کہا کہ میں حضرت امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام کو خط لکھتا ہوں پھر تمہیں اس مسئلہ کا جواب دوں گا، چنانچہ علی بن یقطین نے والی امدیہ کو خط لکھا کہ وہ حضرت امام موسیٰ بن جعفر علیہما السلام سے دریافت کرے کہ مسجد الحرام کے نزدیک ایک گھر ہے کہ جسے میں مسجد الحرام میں شامل کرنا چاہتا ہوں مگر اس گھر کا مالک راضی نہیں ہو رہا، اس سلسلہ میں کیا کروں؟ والی امدیہ امام کی خدمت میں حاضر ہوا اور مسئلہ دریافت کیا، امام ابو الحسن موسیٰ کاظم علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: کیا اس کا جواب ضروری ہے؟ والی امدیہ نے کہا: ہاں، یہ نہایت ضروری ہے، امام نے فرمایا: تو لکھو: بسم الله الرحمن الرحيم: اگر خانہ کعبہ، مکہ کی تعمیر کے بعد بنا ہے تو لوگ اپنی زمین پر کعبہ سے زیادہ حق رکھتے ہیں، اور اگر کعبہ پہلے بنا اور اس کے بعد لوگوں نے اس کے ارد گرد مکانات تعمیر کئے تو اس سر زمین پر کعبہ کا حق ہے۔ جب یہ خط مہدی عباسی کے ہاتھ میں پہنچا تو اس نے اس کا بوسہ دیا اور حکم دیا کہ اس شخص کے گھر کو گرا دیا جائے، گھر والے حضرت امام ابو الحسن علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ آپ مہدی عباسی کو خط لکھیں کہ انہیں گھر کی قیمت (معاوضہ) ادا کرے، امام نے مہدی عباسی کو خط لکھا کہ ان لوگوں کو کچھ رقم دے کر راضی کر لو، مہدی نے امام کے حکم کے مطابق ان لوگوں کو راضی کیا۔

(تفسیر العیاشی، جلد اول، ص ۱۸۶)

مسجد الحرام کی توسیع کے حوالہ سے مذکورہ بالا دو روایتیں نہایت لطیف استدلال پر مشتمل ہیں اور اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسجد الحرام کی توسیع کا کام سب سے پہلے منصور دوانیقی نے کیا اور اسے مہدی عباسی نے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

## فریضہ حج کی وضاحت

کتاب کافی میں ایک روایت ذکر کی گئی ہے کہ آیت مبارکہ ”وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ الْيَسْرَةَ سَبِيْلًا“ کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ”یعنی بہ الحج والعمرة جميعاً لانهما مفروضان“، اس سے حج اور عمرہ دونوں مراد ہیں کیونکہ وہ دونوں واجب ہیں۔  
یہ روایت تفسیر العیاشی میں بھی ذکر کی گئی ہے، البتہ اس میں لفظ ”حج“ کو اس کے لغوی معنی یعنی قصد سے تفسیر کیا گیا ہے۔

## انکار سے مراد ترک کرنا ہے

تفسیر العیاشی میں مذکور ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے جملہ ”ومن کفر“ کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ اس سے مراد ”من ترک“ ہے، یعنی ”جس نے انکار کیا“ سے مراد ”جس نے ترک کیا“ ہے۔  
(تفسیر العیاشی، جلد اول، صفحہ ۱۹۲)  
اس روایت کو شیخ طوسی نے تہذیب میں ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو، التہذیب، جلد ۵ ص ۱۸ حدیث ۴)  
قارئین کرام! آپ بخوبی آگاہ ہیں کہ کفر بھی ایمان کی طرح کئی درجات رکھتا ہے اور یہاں کفر سے مراد فروع دین کا انکار ہے۔

## کون کافر ہے؟

کتاب کافی میں علی بن جعفر سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنے بھائی امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام کے حوالہ سے بیان کیا کہ آپ نے ایک حدیث میں میرے اس سوال کے جواب میں کہ آیا ہم میں سے جو شخص فریضہ حج ادا نہ کرے کیا وہ کافر ہے؟ ارشاد فرمایا: نہیں، وہ کافر نہیں، بلکہ کافر وہ ہے جو حج کے واجب ہونے کا انکار کرے۔  
(فروع کافی، جلد ۴ ص ۲۶۵)  
اس موضوع کی بابت کثیر روایات موجود ہیں اور مذکورہ بالا روایت میں ”کفر“ کی تفسیر اس کا انکار کرنے کے معنی



میں کی گئی ہے، البتہ آیت مبارکہ سے اس کا عندیہ نہیں ملتا، لہذا اس میں ”کفر“ سے اس کا لغوی معنی یعنی حق پوشی مراد ہے اور اس کا مصداق تعین ہر مورد کے مخصوص حوالوں کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

## ایک تاریخی بحث

یہ بات قطعی و یقینی اور شہرہ آفاق و تو اتر کی حامل ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے کعبہ کو بنایا اور جب اس کی تعمیر کا کام پایہ تکمیل کو پہنچا تو اس کے اطراف میں جو لوگ سکونت پذیر ہوئے وہ ان کے فرزند ارجمند حضرت اسماعیل علیہ السلام اور یمنی قبائل میں سے بنی جرہم کے افراد تھے۔

خانہ کعبہ کی عمارت مربع شکل میں تھی اور اس کے چار کونے چاروں سمتوں یعنی شمال، جنوب، مشرق و مغرب کی طرف اس طرح قائم ہیں کہ تند و تیز ہوائیں اور شدید ترین طوفان بھی اسے نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

کعبہ حضرت ابراہیم کی تعمیر کردہ صورت و حالت پر باقی تھا کہ پہلی بار عمالقہ نے اس کی مرمت کی سعادت حاصل کی، پھر قبیلہ جرہم نے اس کی تعمیر نو کی (یا اس کے برعکس یعنی پہلے جرہم والوں نے اور پھر عمالقہ نے اس کی تعمیر نو کی، جیسا کہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام سے منقول روایت میں بیان ہوا ہے)۔

یہاں تک کہ کعبہ کی تولیت کی ذمہ داری حضرت پیغمبر اسلام کے ایک جد جناب قصی بن کلاب کے ہاتھوں میں آئی (یہ دوسری صدی قبل از ہجرت کا واقعہ ہے) چنانچہ انہوں نے اس کی بوسیدہ عمارت کو گرا کر دوبارہ تعمیر کرایا اور اس کی بنیادیں بہت مضبوط کیں، اور روم کے درخت کی لکڑی اور کھجور کے درخت کی شاخوں سے اس کی چھت بنائی، انہوں نے خانہ کعبہ کے قریب ایک عمارت تعمیر کروائی جسے ”دار الندوہ“ کا نام دیا، وہ جگہ ان کے مرکز حکومت اور اپنے ساتھیوں سے مشاورت کے لئے مخصوص تھی، (جسے آج کی زبان میں پارلیمنٹ ہاؤس کہا جاتا ہے)، پھر انہوں نے قریش کے مختلف گروہوں کے درمیان خانہ کعبہ کے اطراف وارد گرد کے علاقے تقسیم کر دیئے تو ہر گروہ نے کعبہ کے ارد گرد مطاف کے نزدیک اپنے گھر تعمیر کئے اور اپنے گھروں کے دروازے مطاف کے سامنے رکھے۔

بحث نبوی سے پانچ برس پہلے سیلاب کی وجہ سے کعبہ منہدم ہو گیا تو قریش کے مختلف گروہوں نے اس کی تعمیر نو کے لئے متعلقہ کاموں کی ذمہ داریاں آپس میں تقسیم کر لیں۔ چنانچہ جو معمار اسے تعمیر کر رہا تھا وہ روم کا باشندہ تھا جس کا نام ”یا قوم“ تھا اور اس کی مدد کرنے والا ترکھان ایک مصری باشندہ تھا، جب حجر الاسود رکھنے کا وقت آیا تو وہ آپس میں جھگڑ پڑے کہ ان میں سے کون حجر الاسود نصب کرنے کے اعزاز کا حقدار ہے، وہ دونوں گروہ اس سلسلہ میں کسی نتیجہ تک نہ پہنچے، بالآخر

انہوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ اس مسئلہ کے حل کے لئے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فیصلہ کروائیں کیونکہ دونوں فریق آخضرؑ کی عقلمندی، فکری قوت و فراست اور دانائی و معاملہ سنجی کے بلند پایہ مقام سے آگاہ تھے، اس وقت آخضرؑ کا سن مبارک ۳۵ برس تھا، آخضرؑ نے ان سے فرمایا کہ ایک چادر لے آئیں، آپؐ نے حجر الاسود کو اس میں رکھ دیا اور تمام قبائل کو حکم دیا کہ وہ چادر کو لے کر آئیں اور ہر قبیلہ کے افراد چادر میں ہاتھ ڈالیں تاکہ سب اس عزت و اعزاز سے بہرہ مند ہو جائیں، آپؐ کے حکم و فیصلہ کے مطابق قبائل نے چادر کو لے کر آٹھایا اور تابلند کیا کہ رکن شرقی میں واقع اس کے نصب کرنے کی جگہ تک پہنچ گئی تو آپؐ نے حجر الاسود کو خود اپنے ہاتھ میں لے کر دست مبارک سے اس کی اصل جگہ پر نصب کر دیا۔ (اس طرح قبائل کے درمیان جو سنگین تنازعہ شروع ہو چکا تھا نہایت خوش اسلوبی سے حل ہو گیا)۔

ادھر خانہ کعبہ کے تعمیری اخراجات نے ان لوگوں کی کمزوری تھی لہذا انہوں نے اس کی اونچائی اسی حد تک کافی سمجھی جو اب ہے۔ اسی وجہ سے حجر اسماعیل کی جانب سے کچھ زمین حجر الاسود کی جانب باقی رہ گئی کیونکہ عمارت میں اس قدر وسعت نہ تھی۔

خانہ کعبہ اسی صورت میں باقی رہا یہاں تک کہ یزید بن معاویہ کے دور میں عبداللہ بن زبیر نے حجاز پر قبضہ کر لیا اور یزید نے اس کے مقابلے میں حصین کو سردار لشکر بنا کر بھیجا تو اس نے عبداللہ بن زبیر سے زبردست جنگ کی جس میں یزید کے فوجیوں نے کعبہ پر منہجیت سے پتھروں کی بارش کر دی جس سے کعبہ منہدم ہو گیا اور اس کا غلاف اور بعض لکڑیاں جل گئیں، پھر یزید کی موت کے بعد جنگ رک گئی تو ابن زبیر نے سوچا کہ عمارت کے باقی ماندہ حصہ کو مکمل طور پر گرا کر اسے دوبارہ تعمیر کرے، اس نے یمن سے صاف ستھری گچ و مضبوط چونا منگوا کر اس سے کعبہ کی تعمیر نو کی اور حجر کو بیت کا حصہ بنا دیا، اس نے دروازہ کو زمین تک نیچا رکھا اور قدیمی دروازہ کے بالمقابل ایک دوسرا دروازہ بنا دیا تاکہ لوگ ایک دروازہ سے داخل ہوں اور دوسرے دروازہ سے باہر نکلیں، اس نے عمارت کی بلندی ستائیس ذراع..... تقریباً ساڑھے تیرہ میٹر..... رکھی، جب عمارت مکمل ہو گئی تو اس نے کعبہ کو اندر اور باہر سے نہایت عمدہ و قیمتی عطر سے معطر کر دیا اور نہایت عمدہ ریشمی غلاف اس پر چڑھادیا، یہ سارا کام ۱۷ رجب ۶۳ ہجری کو پایہ تکمیل تک پہنچا۔

پھر جب عبدالملک بن مروان تخت خلافت پر بیٹھا تو اس نے عبداللہ بن زبیر سے جنگ کرنے کے لئے حجاج بن یوسف کی سربراہی میں ایک لشکر بھیجا، حجاج کے لشکر نے ابن زبیر کو شکست دی اور اسے قتل کر کے خود خانہ کعبہ میں داخل ہو گیا، پھر عبدالملک بن مروان کو کعبہ کی تعمیر کی بابت عبداللہ بن زبیر کے اقدامات سے آگاہ کیا، عبدالملک نے حکم دیا کہ اسے اس کی پہلی شکل میں لوٹا دیا جائے، چنانچہ حجاج نے اسے شمالی سمت سے تقریباً ساڑھے چھ ذراع گرا دیا، اور پھر اس دیوار کو قریش کی قائم کردہ بنیاد پر تعمیر کر دیا اور غربی دروازہ کو بند کر کے شرقی دروازہ کو سطح زمین سے اونچا کر دیا، پھر باقی ماندہ پتھروں سے اس کا

فرش بنا دیا۔

پھر جب ۹۶۰ ہجری میں سلیمان عثمانی سلطنت پر بیٹھا تو اس نے کعبہ کی چھت کو تبدیل کر دیا، پھر ۱۱۲۱ ہجری میں احمد عثمانی تخت نشین ہوا تو اس نے کعبہ کی مرمت کروائی، پھر ۱۰۳۹ ہجری میں شدید سیلاب کی وجہ سے کعبہ کی شمالی و شرقی اور غربی دیواروں کو سخت نقصان پہنچا اور وہ گر گئیں تو عثمانی سلطنت کے چوتھے تاجدار مراد نے اس کی مکمل مرمت کروائی جو کہ آج تک یعنی ۱۳۷۵ ہجری قمری (۱۳۳۸ھ شمسی) تک اسی حالت میں باقی ہے۔ (یہ تاریخ اس کتاب (المیزان) کی تالیف کے وقت تھی)

### کعبہ کی شکل

کعبہ تقریباً مربع شکل میں بنا ہوا ہے، اسے نیلگوں تخت پتھروں سے بنایا گیا ہے، اس کی بلندی سولہ میٹر ہے جبکہ عہد نبوی میں اس کی بلندی اس سے کم تھی جیسا کہ روایات میں مذکور ہے کہ فتح مکہ کے دن حضرت پیغمبر اسلام نے کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں کو توڑنے کے لئے حضرت علیؓ کو اپنے کندھوں پر اٹھایا، اس کی شمالی سمت کہ جس میں میزابِ رحمت..... اور حجر اسماعیل..... واقع ہے، اور جنوبی سمت جو کہ شمالی سمت کے عین مقابل ہے کا طول دس میٹر اور دس سٹی میٹر ہے، اور جس جانب دروازہ ہے وہ اور اس کے عین مقابل سمت کا طول بارہ میٹر ہے، دروازہ زمین سے دو میٹر بلندی پر نصب ہے، اور حجر الاسود خانہ کعبہ میں داخل ہونے والے کے بائیں طرف واقع ہے (جب کوئی شخص کعبہ کے اندر داخل ہوتا ہے تو اس کے بائیں طرف کونے پر حجر الاسود نصب ہے) حجر الاسود مطاف کی زمین سے ڈیڑھ میٹر بلندی پر واقع ہے، حجر الاسود بیضوی شکل کا ناتراشیدہ بھاری پتھر ہے، اس کا رنگ سیاہ و سرخی مائل ہے اور اس میں سرخ رنگ کے داغ اور زرد رنگ کی لکیریں دکھائی دیتی ہیں جو کہ اس کی اندرونی ٹوٹ پھوٹ کے نشانات ہیں۔ اس کا قطر تقریباً تین میٹر ہے۔

کعبہ کے چار کونوں کو قدیم الایام سے ”ارکان“ کہا جاتا ہے، شمالی کونہ کورن عراقی، غربی کونہ کورن شمالی، جنوبی کونہ کورن یمانی اور شرقی کونہ کورن جہاں حجر الاسود نصب ہے رکن الاسود سے موسوم کیا جاتا ہے اور دروازہ کعبہ اور حجر الاسود کے درمیان کی جگہ کو ”ملترم“ کہتے ہیں کیونکہ طواف کرنے والا شخص دعا و استغاثہ کرتے وقت اس سے چپکا ہوتا ہے۔

اور وہ پر نالہ جو شمالی دیوار پر ہے کہ جسے میزابِ رحمت (رحمت کا پر نالہ) کہتے ہیں اسے حجاج بن یوسف نے بنوایا تھا، پھر سلطان سلیمان نے ۹۵۳ ہجری میں اسے تبدیل کر کے ایک چاندی کا پر نالہ لگوا دیا، پھر ۱۰۲۱ ہجری میں سلطان احمد نے تبدیل کر دیا اور سے بنا ہوا خوبصورت مینا کاری کے ساتھ سنہری نقش و نگار کا حامل پر نالہ لگوا دیا، پھر ۱۲۷۳ ہجری کے اواخر

میں سلطان عبدالمجید عثمانی نے اسے تبدیل کر کے اس جگہ سونے کا پرنا لہ نصب کروا دیا جو کہ اب تک موجود ہے، اس پرنا لہ کے روبرو ایک قوسی دیوار ہے جسے ”حطیم“ کہا جاتا ہے یہ نیم دائرہ کی شکل میں ہے کہ جس کی دو طرفیں کعبہ کی شمالی و غربی سمتوں کو ہیں اور ان سے دو میٹر اور تین سنی میٹر دور ہیں، حطیم کی بلندی ایک میٹر ہے اور یہ ڈیڑھ میٹر میں پھیلی ہوئی ہے، اس کے اندرونی حصہ میں خوبصورت پتھروں سے نقش و نگاری ہوئی ہے، اس کے اندرونی وسطی حصہ اور کعبہ کی دیوار کے وسط کے درمیان آٹھ میٹر اور ۴۴ سنی میٹر کا فاصلہ ہے، حطیم اور دیوار کعبہ کے درمیان جگہ کو حجر اسماعیل کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی تعمیر کردہ عمارت میں اس سے تقریباً تین میٹر، کعبہ کے اندر تھا پھر باہر آ گیا، (اسی لئے طواف میں اس جگہ کو شامل کرنے کا حکم ہوتا ہے کہ عہد ابراہیمی کے کعبہ کا مکمل طواف ہو جائے) اور اس کا باقی حصہ حضرت ہاجرہ اور ان کے فرزند کے موشیوں کے لئے مخصوص تھا، کہا جاتا ہے کہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیلؑ اسی جگہ مدفون ہیں، اور جہاں تک خانہ کعبہ کے اندر واقع ہونے والی تبدیلیوں اور بیت اللہ کی مروجہ رسوم و عادات کا تعلق ہے تو چونکہ وہ تفصیلات ہماری تفسیری بحث سے خارج ہیں اس لئے ان کے تذکرہ کی یہاں ضرورت نہیں۔

## غلاف کعبہ

سورۃ بقرہ کی تفسیر میں حضرت ہاجرہ و حضرت اسماعیلؑ اور ان کے اس سرزمین میں آنے کے واقعات پر مشتمل روایات میں بیان ہو چکا ہے کہ جب خانہ کعبہ کی تعمیر کا کام مکمل ہو گیا تو حضرت ہاجرہ نے اپنی چادر کعبہ کے دروازہ پر لٹکا دی، اور جہاں تک کعبہ کے غلاف کا تعلق ہے کہ جس سے پورے کعبہ کو ڈھانپا جاتا ہے تو اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے خانہ کعبہ کو غلاف اوڑھایا وہ یمن کا باسی تھا جس کا نام ابو بکر اسعد تھا، اس نے چاندی کے تاروں سے بنے ہوئے کپڑے کا غلاف بنایا اور خانہ کعبہ پر چڑھادیا، اس کے بعد اس کے جانشینوں نے یہ کام سنبھالا، پھر لوگ مختلف چادروں کا غلاف بناتے رہے اور تہہ بہ تہہ اس پر ڈالتے رہے کہ جب بھی کوئی چادر پرانی ہو جاتی تو اسے اتار کر اس کی جگہ دوسری چادر چڑھا دی جاتی تھی، یہ سلسلہ قصی بن کلاب کے دور تک اسی طرح جاری رہا، قصی نے اس کام کو منظم و باقاعدگی عطا کرنے کی غرض سے تمام عرب قبائل کو اس میں شریک کیا اور ہر قبیلہ کو اس میں حصہ شامل کرنے کی دعوت دی تاکہ ہر سال نوبت بہ نوبت نیا غلاف بنایا جائے اور موسم حج میں کعبہ پر چڑھایا جائے، یہ سلسلہ قصی کی اولاد تک جاری رہا چنانچہ ایک سال ابو بکر بن مغیرہ غلاف دیتا تھا اور دوسرے سال قبائل قریش غلاف دیتے تھے۔

عہد نبویؐ میں خود آنحضرتؐ نے کعبہ کو یمنی کپڑے کا غلاف پہنایا، اس کے بعد یہ سنت جاری ہو گئی مگر جب خلیفہ

مہدی عباسی حج بیت اللہ کو آیا تو کعبہ کے خدام نے اس سے شکایت کی کہ کعبہ کی چھت پر ریشمی کپڑوں کا ڈھیر لگ گیا ہے اور اس بات کا اندیشہ لاحق ہو گیا ہے کہ کپڑوں کے وزن سے کعبہ کی چھت گر جائے گی، مہدی عباسی نے حکم دیا کہ چھت پر پڑے ہوئے تمام کپڑے نیچے اتار لئے جائیں اور ہر سال صرف ایک غلاف چڑھایا جائے، یہ رسم اب تک باقی ہے، یاد رہے کہ بیرونی غلاف کعبہ کے علاوہ کعبہ کے اندر بھی ایک غلاف ہوتا ہے کہ جس کی ابتداء جناب عباس بن عبدالمطلب کی والدہ گرامی نے کی جو کہ اپنے فرزند جناب عباس کے بارے میں مانی ہوئی نذر کی ادائیگی کے طور پر تھی۔

### کعبہ کا مقام و منزلت

خانہ کعبہ کو تمام اقوام و امتوں کے نزدیک عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا چنانچہ ہندو بھی اس کی تعظیم کرتے اور کہتے تھے کہ ”سیفا“ کی روح کہ جسے وہ اقوام سوم سمجھتے ہیں حجر الاسود میں حلول کر گئی اور یہ اس وقت ہوا جب وہ اپنی زوجہ کے ہمراہ بلا دجاجز آئے۔

اور فارس کے صاحبین و آتش پرست اور کدانی حضرات بھی خانہ کعبہ کی تعظیم کرتے اور اس کا احترام کرتے تھے اور اسے سات با احترام گھروں میں سے ایک سمجھتے تھے۔ وہ سات گھر یہ ہیں:

- (۱) کعبہ،
- (۲) مارس، جو کہ اصفہان کے ایک پہاڑ پر واقع ہے۔
- (۳) مندوسان، کہ جو ہندوستان میں ہے۔
- (۴) نوبہار، جو کہ شہر بلخ میں واقع ہے۔
- (۵) بیت غمدان، کہ جو شہر صنعاء میں ہے۔
- (۶) کلوسان، جو کہ خراسان کے شہر فرغانہ میں واقع ہے۔
- (۷) ایک گھر جو چین کے بالائی علاقہ میں واقع ہے۔

کلدانیوں کی طرف سے منقول ہے کہ وہ خانہ کعبہ کو قدیمی ہونے اور طویل عمر والا ہونے کی بناء پر رطل کا گھر سمجھتے

ہیں۔

اہل فارس بھی کعبہ کی تعظیم و احترام کرتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ ہر مزیکی روح اس میں حلول کر گئی، وہ لوگ کعبہ

کی زیارت کرنے بھی جاتے تھے۔

یہودی بھی خانہ کعبہ کی تعظیم و احترام کرتے تھے اور اس میں شریعت ابراہیمی کے مطابق عبادت الہی بجالاتے تھے، چنانچہ کعبہ میں تصویریں اور مجسمے رکھے ہوئے تھے جن میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے مجسمے شامل تھے کہ جن کے ہاتھوں میں ازلام کی چھڑیاں تھیں، ان میں حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰ مسیحؑ کے مجسمے بھی شامل تھے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نصاریٰ بھی یہودیوں کی طرح کعبہ کی تعظیم و احترام کرتے تھے۔

عرب بھی کعبہ کی تعظیم و احترام کرتے اور اسے خانہ خدا سمجھتے تھے، اور دنیا کے گوشہ گوشہ سے اس کی زیارت کے لئے آتے تھے، وہ اسے حضرت ابراہیمؑ کا تمیز کردہ گھر سمجھتے تھے اور حج بیت اللہ عربوں کے دین و آئین کا حصہ بن چکا تھا کہ جسے وہ نسل در نسل انجام دیتے رہتے تھے۔

## کعبہ کی تولیت

کعبہ کی تولیت سب سے پہلے حضرت اسماعیلؑ کے پاس تھی، پھر ان کے بعد ان کی اولاد نے یہ ذمہ داری سنبھالی، یہاں تک کہ قبیلہ جرہم نے ان پر غلبہ پالیا اور کعبہ کی تولیت ان سے چھین لی، پھر عمالقمہ اس کے مالک بن گئے، عمالقمہ بنی کرکرا ایک گروہ تھا جنہوں نے قبیلہ جرہم سے کئی جنگیں لڑیں اور ان پر غالب آئے، عمالقمہ مکہ کے نچلے علاقہ میں آکر رہتے تھے جبکہ جرہم والے مکہ کے بالائی علاقہ میں رہتے تھے اور ان میں ان کے بادشاہ بھی ہوئے تھے مگر زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ جرہم والے عمالقمہ پر غالب آگئے اور کعبہ کی تولیت پھر ان کے پاس آگئی جو کہ تقریباً تین سو سال تک ان کے پاس رہی، اس عرصہ میں انہوں نے عہد ابراہیمی میں تعمیر شدہ بیت اللہ میں غیر معمولی اضافے کئے۔

پھر جب نسل اسماعیل بڑھ گئی اور ان کی تعداد و قوت اور شان و شوکت میں اضافہ ہوا مگر مکہ میں ان پر عرصہ حیات ٹھک ہو گیا تو انہوں نے جرہم والوں کو مکہ سے نکال باہر کرنے کی ٹھان لی اور اس مقصد کے لئے ان کے ساتھ نبرد آزما ہو گئے یہاں تک کہ طویل جنگوں کے بعد بالآخر وہ جرہم پر غالب آگئے اور انہوں نے ان کو مکہ سے نکال باہر کر دیا، اس زمانہ میں بنی اسماعیل کی بزرگ شخصیت عمر بن لُحی تھا جو خزاعہ کا بزرگ تھا، سرزمین مکہ کا اقتدار اس کے ہاتھوں میں آ گیا اور اس نے کعبہ کی تولیت کی ذمہ داری سنبھالی، اسی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ وہی شخص ہے جس نے کعبہ پر بت رکھے اور لوگوں کو ان کی عبادت و پرستش کی دعوت دی، سب سے پہلا بت جو اس نے کعبہ پر رکھا وہ ”ہبل“ تھا کہ جسے وہ شام سے اپنے ساتھ لایا تھا، اس بت کو وہاں نصب کرنے کے بعد اس نے مزید کئی بت وہاں لاکر رکھے، یہاں تک کہ کثیر تعداد میں بت جمع ہو گئے اور

عربوں میں بت پرستی کا بازار گرم ہو گیا جس کے نتیجے میں حنیفیت و یکتا پرستی قصہ پارینہ بن کر رہ گئی، چنانچہ اس حوالہ سے ”شحنہ بن خلف جرہمی“ نے اپنے اشعار میں عمرو بن لُحی کو مخاطب کر کے یوں کہا :

يا عمرو انك قد احدثت الہة  
شنتى بمكة حول البيت انصاباً  
وكان لليت رب واحد ابداً  
فقد جعلت لہ في الناس ارباباً  
لتعرفن بان اللہ في مهل  
سيمطفي دونكم لبيت حجاباً

(اے عمرو، تو نے ہی نئے خداؤں کو مکہ میں لا کر بیت اللہ کے پاس انہیں رکھ دیا ہے، خانہ خدا کا ایک ہی پروردگار ہمیشہ سے چلا آ رہا تھا مگر تو نے لوگوں کو کئی پروردگاروں کی چوکتوں پر جھکا دیا، بہت جلد تجھے معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ عنقریب تیرے علاوہ بیت کی پردہ داری کے لئے کسی کو چن لے گا)

حلیل خزاعی کے دور تک خانہ کعبہ کی تولیت بنی خزاعہ کے پاس رہی مگر حلیل نے اپنے بعد اس ذمہ داری کے لئے اپنی بیٹی زوجہ قصی بن کلاب کو معین کیا اور خانہ کعبہ کے دروازہ کے کھولنے اور بند کرنے کا اختیار بنی خزاعہ کے ایک شخص جس کا نام ابوغضبان خزاعی تھا، کے سپرد کیا، ابوغضبان نے اس منصب کو ایک اونٹ اور ایک مشک شراب کے عوض قصی بن کلاب کے ہاتھوں فروخت کر دیا، اس کا ایسا کرنا عربوں میں احمقانہ معاملہ کے لئے ضرب المثل بن گیا اور جو شخص کسی اچھی و قیمتی چیز کا سودا کسی ردی و نہایت معمولی یا بے قدر و بے فائدہ یا نقصان دہ چیز کے ساتھ کرتا تو اس کے بارے میں کہا جاتا: ”اخصر من صیفة ابی غضبان“ کہ یہ معاملہ تو ابوغضبان کے معاملہ سے بھی زیادہ نقصان و خسارہ والا ہے۔

بہر حال کعبہ کی تولیت قریش کے پاس آ گئی اور قصی بن کلاب نے ایک بار پھر کعبہ کی تعمیر نو کی جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، یہ صورت حال فتح مکہ تک باقی رہی، آنحضرتؐ مکہ پر فتح پانے کے بعد خانہ کعبہ میں داخل ہوئے اور حکم دیا کہ تمام تصویریں اور مجسمے جو کر دیئے جائیں، اور بتوں کے بارے میں حکم دیا کہ ان کو منہدم کر دیا جائے چنانچہ آپؐ کے فرمان کے مطابق بتوں کو ریزہ ریزہ کر دیا گیا، مقام ابراہیمؑ یعنی وہ پتھر کہ جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں قوموں کے نشانات ثبت تھے اور اسے کعبہ کے جوار میں ایک برتن میں رکھا گیا تھا آپؐ نے اسے اس کی اصل جگہ پر منتقل کر کے وہاں دفن کر دیا جو کہ اس وقت معروف و مشہور ہے۔ اب اس پر ایک گنبد نما بنایا گیا ہے، اس کے چار ستون اور چھت ہے اور خانہ خدا کے زائرین طواف کے بعد وہاں نماز ادا کرتے ہیں۔

کعبہ کے بارے میں روایات و احادیث کثرت سے موجود ہیں جن میں کعبہ اور اس سے تعلق رکھنے والے دینی امور و اشیاء کی تفصیلات مذکور ہیں، ہم نے ان میں سے انہی چند کو ذکر کرنے پر اکتفاء کی ہے جو آیات الحج اور آیات کعبہ کے بارے میں تدبر و فکر کرنے والے اہل بحث و تحقیق کی بنیادی ضرورت کو پورا کر سکیں۔

اس گھر کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بابرکت اور سرچشمہ ہدایت بنایا ہے کہ اس کی عظمت کے بارے میں کسی اہل اسلام نے اختلاف نہیں کیا۔



## آیات ۹۸ تا ۱۰۱

- قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ ﴿۹۸﴾
- قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ مِن مَّا حَرَّمَ اللَّهُ لَكُمْ إِذْ تَبْعُونَهَا عِوَجًا وَأَنْتُمْ شَاهِدُونَ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۹۹﴾
- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا فَرِيقًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كُفْرًا ۖ ﴿۱۰۰﴾
- وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ ۗ وَمَنْ يَعْتَصِم بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۱۰۱﴾

## ترجمہ

” کہہ دو، اے اہل کتاب! تم اللہ کی نشانیوں کا انکار کیوں کرتے ہو جبکہ خدا تمہارے اعمال پر ناظر و گواہ ہے “

(۹۸)

” کہہ دو، اے اہل کتاب! جو شخص ایمان لایا ہے اسے اللہ کی راہ سے کیوں روکتے ہو، تم اسے ٹیڑھا کرنا چاہتے ہو جبکہ تم..... اس کے برحق ہونے پر..... گواہ و آگاہ ہو، اور اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں “

(۹۹)

” اے اہل ایمان! اگر تم ان اہل کتاب کے کسی گروہ کی فرماں برداری کرو تو وہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد دوبارہ کفر کی طرف پلٹا دیں گے “

(۱۰۰)

” اور تم کیونکر کفر اختیار کر سکتے ہو جبکہ تمہارے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور تم میں اس کا رسول بھی ہے، بہر حال جو شخص خدا سے وابستہ ہو وہ صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت یافتہ ہو گیا “

(۱۰۱)

## تفسیر و بیان

یہ آیات مبارکہ جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں سیاق کی پوسنگی کی بناء پر اس مطلب پر دلالت کر رہی ہیں کہ اہل کتاب (البتہ ان کا ایک گروہ یعنی یہودی، یا یہودیوں کا ایک گروہ) آیات الہی کا انکار کرتے تھے اور مؤمنین کو اللہ کی راہ سے روکتے تھے اور وہ اس طرح کہ انہیں راہ خدا کا تعارف اس طرح کرواتے کہ وہ اسے ٹیڑھی وغیر مستقیم سمجھیں کہ جس سے منزل مقصود تک رسائی ممکن نہیں ہوتی، اور وہ گمراہی کے لئے، ٹیڑھے اور کج راستہ کو خدا کے راستوں سے تمثیل دیتے تھے، ان کی کوشش ہوتی تھی کہ مؤمنین کے دلوں میں شہے و وسوسے ڈالتے رہیں تاکہ وہ حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھیں یعنی جس راہ و عقیدہ کو اپنائے ہوئے ہیں اور اسے حق سمجھتے ہیں اسے باطل قرار دیں اور جس راہ و عقیدہ کی دعوت یہودی انہیں دیتے ہیں جو کہ باطل ہے اسے حق قرار دیں، چنانچہ سابقہ آیات سے اہل کتاب کے اخراہی طریقہ عمل اپنانے کا ثبوت فراہم ہو چکا ہے کہ وہ تورات کے نزول سے قبل ہر طعام کے حلال ہونے کا انکار کرتے تھے اور قبلہ کی تبدیلی یعنی بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کے حکم کی منسوخی کا انکار کرتے تھے۔ تو زیر بحث آیات مبارکہ (۹۸ تا ۱۰۱) انہی سابقہ آیات کی تکمیل و تکمیل کرتی ہیں اور انہی مطالب کو بیان کرتی ہیں یعنی تورات سے پہلے ہر طعام کا حلال ہونا اور کعبہ کا ہی وہ پہلا گھر ہونا جسے لوگوں کے لئے بنایا گیا، تو ان آیات میں یہودیوں کو آیات خداوندی کے انکار اور مؤمنین کے دلوں میں شبہات اور وسوسے ڈال کر انہیں ان کے دین کے بارے میں بدظن کرنے کی کوششوں پر سخت توبیخ اور مورد مذمت قرار دیا گیا، اس کے ساتھ ساتھ مؤمنین کو خبردار کیا گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ان اہل کتاب کی ہاں میں ہاں ملائیں اور ان کا کہنا مان کر دین حق کا انکار کر دیں، اور مؤمنین کو اس بات کی تشویق دلائی گئی کہ وہ اللہ سے وابستہ رہیں تو ایمان کے راستہ کی ہدایت سے بہرہ مند رہیں گے اور ان کی ہدایت کو دوام حاصل ہوگا۔

تفسیر المنار جلد چہارم میں سورۃ مبارکہ آل عمران کی تفسیر میں زیر نظر آیت پر بحث کرتے ہوئے سیوطی کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے کتاب لباب العقول میں زید بن اسلم کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ شاش بن قیس

..... جو کہ ایک یہودی شخص تھا..... ایک دفعہ اوس و خزرج کے چند لوگوں کے پاس سے گزرا اور دیکھا کہ وہ آپس میں دوستانہ ماحول میں باتیں کر رہے ہیں تو جل بھن گیا اور ان دو قبیلوں کی طویل جنگوں کے بعد آپس میں محبت و انس کا منظر دیکھ کر برداشت نہ کر سکا، اس نے یہودی نوجوان کو جو اس کے ساتھ تھا، حکم دیا کہ وہ ان میں بیٹھ جائے اور ان کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی غرض سے انہیں جنگ و بیعت میں دونوں قبیلوں کے مارے جانے والے افراد کی یاد دلائے تاکہ ان کے دلوں میں ایک دوسرے سے نفرت کی آگ بھڑک اٹھے، اس نوجوان نے اس منصوبہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ابن قیس کی ہدایت پر عمل کیا اور فریقین کو ان کے مقتولین کی یاد دلائی، بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور وہ دونوں قبیلے ایک بار پھر آپس میں دست و گریباں ہو گئے، چنانچہ قبیلہ اوس کے ایک شخص بنام اوس بن قریظی اور خزرج کے ایک شخص بنام جبار بن صخر کے درمیان تند و تیز جملوں کا تبادلہ ہوا اور وہ آپس میں سخت الجھ گئے، اس طرح ان دو قبیلوں کے درمیان ایک بار پھر دشمنی کی آگ شعلہ ور ہو گئی اور دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ گئے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ دوبارہ ان کے درمیان جنگ چھڑنے لگی، اس صورتحال کی اطلاع حضرت پیغمبر اسلامؐ کو پہنچتی تو آپؐ خود ان کے پاس تشریف لائے اور انہیں نصیحت کی اور ان کے درمیان مصالحت کروادی، ان لوگوں نے آنحضرتؐ کے ارشادات و فرامین پر پوری طرح توجہ دی اور آپؐ کے احکامات کی اطاعت و فرماں برداری کا ثبوت دیا، اس وقت اوس و خزرج کے بارے میں خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا فَرِيقًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كُفْرًا“

(اے ایمان والو! اگر تم ان اہل کتاب کے کسی گروہ کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد دوبارہ کافر بنا دیں گے)۔

اور شاش بن قیس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

”يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصَدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ مِن آٰمَنَ..... الخ“

(اے اہل کتاب! تم اس شخص کو اللہ کی راہ سے کیوں روکتے ہو جو ایمان لایا ہے.....)

یہ روایت ”درمنثور“ میں زید بن اسلم کی بیان کردہ تفصیلی روایت کا خلاصہ ہے، اس سے قریب المعنی روایات جناب عبداللہ ابن عباس اور دیگر راویوں سے بھی منقول ہیں۔

بہر حال، زیر نظر آیات مبارکہ ہمارے بیان کردہ مطالب سے تطبیق کے حوالہ سے مذکورہ روایت کی نسبت زیادہ نزدیک اور واضح ہیں چنانچہ یہ حقیقت ظاہر و آشکار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ ان آیات میں کفر و ایمان، یہودیوں کی گواہی و آگاہی، آیات الہی کا مومنین کے سامنے پڑھا جانا اور اس طرح کے دیگر امور و مطالب ذکر کئے گئے ہیں اور یہ سب کچھ

ہمارے ذکر کردہ مطالب سے موزونیت کا حامل ہے، اور اس کی تائید و تصدیق درج ذیل آیت مبارکہ سے ہوتی ہے:

سورہ بقرہ، آیت: ۱۰۹

○ ”وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ  
أَنْفُسِهِمْ.....“

(کثیر اہل کتاب چاہتے ہیں کہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد دوبارہ کافر بنا دیں، یہ ان کے حسد کی واضح نشانی ہے)

بنا برائیں حق وہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے اور وہ یہ کہ زیر بحث آیات مبارکہ سابقہ آیات کا تتمہ ہے اور ان کی تکمیل

کرتی ہیں۔

## اہل کتاب کی توبیح

○ ”قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ.....“

(کہہ دو، اے اہل کتاب! تم اللہ کی آیات کا انکار کیوں کرتے ہو.....)

ان آیات کی وحدت سیاق کی بناء پر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تورات کے نزول سے قبل ہر طعام کا حلال ہونا اور دین

اسلام میں کعبہ کا قبلہ ہونا ملحوظ و مقصود ہے۔

سبیل سیکینئر سنٹر  
حیدرآباد، سندھ، پاکستان

ایک بار پھر توبیح و سرزنش

○ ”قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصَدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ مِن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ.....“

(کہہ دو، اے اہل کتاب! جو شخص ایمان لا چکا ہے تم اسے اللہ کی راہ سے کیوں روکتے ہو، تم اسے ٹیڑھا

دکھانے کے درپے ہو)

لفظ ”صد“ کا معنی پھیر دینا ہے۔

”تَبَعُونَهَا“ سے مراد یہ ہے کہ تم راستہ کے بارے میں خواہاں و کوشاں ہو۔  
 ”عَوَجًا“ میں لفظ ”عوج“ سے پھرا ہوا، تحریف شدہ مراد ہے، تو آیت کا مرادی معنی یہ ہے کہ تم کیوں اللہ کے  
 راستہ کو ٹیڑھا اور ناہموار بنا کر ہر کرنے کے درپے ہو۔

## اہل کتاب کی گواہی و آگاہی کا حوالہ

سبیل سلینس  
 حیدرآباد، سندھ، پاکستان

○ ”وَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ“  
 (اور تم گواہ..... و آگاہ..... ہو)

اس سے مراد یہ ہے کہ تم جانتے ہو کہ تو رات کے نزول سے پہلے ہر طعام حلال تھا اور یہ بھی جانتے ہو کہ قبلہ کی تبدیلی  
 نبوت کی خصوصیات و نشانیوں میں سے ہے (یہ آنحضرتؐ کی صداقت کا ثبوت ہے کہ جسے تم نے اپنی کتابوں میں پڑھ رکھا  
 ہے کہ پیغمبر آخرا زمانہ کے عہد نبوت میں قبلہ تبدیل ہو کر بیت المقدس سے کعبہ کی طرف ہو جائے گا یعنی کعبہ قبلہ قرار پائے  
 گا)

یہاں یہ نکتہ قابل ذکر و لائق توجہ ہے کہ اس آیت میں اہل کتاب کو گواہ کہا گیا ہے (وَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ) جبکہ سابقہ  
 آیت میں خداوند عالم نے خود کو ان کے اعمال و افعال اور کفر پر گواہ ذکر کیا ہے (وَاللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ)، تو تقابلی و  
 محاذاتی تذکرہ میں جو معنوی لطافت پائی جاتی ہے وہ کسی بیان کی محتاج نہیں اور وہ یہ کہ وہ جس چیز کا انکار کرتے ہیں اس کی  
 حقانیت کے گواہ ہیں (اس کے برحق ہونے سے بخوبی آگاہ ہیں) اور اللہ ان کے انکار اور کفر کا گواہ ہے۔ تو دونوں حوالوں سے  
 گواہی کا تذکرہ کلام کی معنوی خصوصیت اور مطلب کی لطیف جہت کو واضح کرتا ہے۔

یہاں ایک لطیف نکتہ یہ بھی ہے کہ اس آیت میں گواہی کی نسبت ان کی طرف دینے کے بعد سابقہ آیت کے ذیلی  
 جملہ یعنی ”وَاللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ“ (اور اللہ تمہارے اعمال پر گواہ ہے) کو اس آیت کے ذیلی جملہ میں ان لفظوں  
 میں تبدیل کر دیا گیا: ”وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ“ (اور اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے)۔ تو اس سے یہ معلوم  
 ہو گیا کہ کلام میں مقصود یہ ہے کہ وہ دین اسلام کی حقانیت کے گواہ..... اور اس سے آگاہ..... ہیں، اور خداوند عالم ان تمام پر  
 گواہ..... اور ان سے آگاہ..... ہے۔

## ایمان والو! خبردار رہو

○ ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا (تا) وَفِيكُمْ رَسُولُهُ ..... الخ“

اس آیت میں اہل ایمان کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اہل کتاب کے ایک گروہ کا کہا مان لیں، اس میں لفظ ”فریق“ (گروہ) سے..... جیسا کہ بیان ہو چکا ہے..... یہودی مراد ہیں یا یہودیوں کا ایک گروہ، اور جملہ ”وَإِنَّكُمْ تَشْتَلِي عَلَيْهِمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ.....“ کے ذریعے اس مطلب کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تم یہودیوں کی فتنہ انگیزی کا شکار ہو کر آیات خداوندی کے منکر کیونکر ہو سکتے ہو جبکہ تم میں اللہ کا رسول موجود ہے کہ جس کے ذریعے حق سے وابستہ ہونا تمہارے لئے ممکن ہے اور تم آیات الہی پر پوری طرح توجہ و التفات کر کے ان کے معانی میں غور و فکر اور تدبر کرو کہ اگر اس کے باوجود کوئی چیز غیر واضح ہو تو حضرت پیغمبر اسلام کی طرف رجوع کر کے آیات سے فہم المعانی کا مرحلہ باآسانی طے کر سکتے ہو، یا یہ کہ تم ابتداء ہی میں آنحضرت کی طرف رجوع کر کے حق و حقیقت سے آگاہی و وابستگی اور طلب ہدایت کے تمام تقاضے پورے کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہو کیونکہ خدا کا رسول تم میں موجود ہے کہ جو نہ تو پردے میں چھپا ہوا ہے اور نہ ہی تم سے دور ہے کہ اس تک رسائی دشوار ہو، تم ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے حق کی راہنمائی حاصل کر سکتے ہو جس سے یہودیوں کی طرف سے ہونے والی فتنہ پروری کی کوششیں دم توڑ جائیں گی اور تم حق کی سیدھی راہ پر گامزن ہو جاؤ گے کیونکہ آیات الہی اور رسول خدا سے تمسک اختیار کرنا دراصل خود خدا سے وابستہ ہونا ہے اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خدا سے وابستگی کا نتیجہ صراط مستقیم کی ہدایت سے بہرہ مند ہونا ہے۔

بنا برائیں ”وَكَيفَ تَكْفُرُونَ“ میں ”کفر“ سے مراد ایمان کے بعد کفر اختیار کرنا ہے، اور جملہ ”وَإِنَّكُمْ تَشْتَلِي عَلَيْهِمْ“ اس بات سے کنایہ کے طور پر ہے کہ کفر سے بچنے کے لئے آیات الہی اور رسول خدا سے اعتصام و وابستگی ممکن ہے یعنی جو شخص آیات الہی اور رسول خدا سے وابستہ رہے وہ ایمان کے بعد کفر کے دلدل میں پھنسنے سے بچ سکتا ہے، اور جملہ ”وَمَنْ يَعْصِمْ بِاللَّهِ“ اس حقیقت کی بابت قاعدہ کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور صراط مستقیم کی ہدایت سے مراد پختہ ایمان کی نعمت سے بہرہ مند ہونا ہے جو کہ ایسا راستہ ہے جس میں نہ تو کوئی اختلاف پایا جاتا ہے اور نہ ہی اس کا راہی منزل مقصود سے ہٹ سکتا ہے بلکہ وہ اپنے راہیوں کو درمیانی حد میں رکھتا ہے اور انہیں ادھر ادھر سے بٹکنے نہیں دیتا یعنی انہیں ایسی درمیانی حد میں رکھتا ہے کہ وہ گمراہ ہونے سے محفوظ رہتے ہیں۔

یہاں ایک لطیف ادبی نکتہ موجود ہے اور وہ یہ کہ جملہ ”فَقَدْ هَدَىٰ“ میں ماضی مجہول کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جو وقوع پذیر ہونے والے کام کو ثابت کرتا ہے، اس میں فاعل کا عدم ذکر اس کام کے خود بخود وقوع پذیر ہونے کی دلیل ہے کہ خواہ اس کے فاعل کی طرف توجہ و التفات ہو یا نہ ہو۔

بہر حال اس آیت مبارکہ میں ہر اس حق سے آشنائی و آگاہی حاصل کرنے میں کتاب و سنت کے کافی ہونے کا ثبوت ملتا ہے جس کی بابت گمراہ ہونے کا امکان و اندیشہ ہو۔



## آیات ۱۰۲ تا ۱۱۰

- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَسَنَ تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿۱۰۲﴾
- وَأَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا ۗ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۰۳﴾
- وَلَتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۱۰۴﴾
- وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۗ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۰۵﴾
- يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكْفَرْتُمْ بَعْدَ
- إِيَابِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿۱۰۶﴾

- وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۱۰۲﴾
- تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۗ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعَالَمِينَ ﴿۱۰۳﴾
- وَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿۱۰۴﴾
- كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۗ مِنْهُمْ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُونَ ﴿۱۰۵﴾

## ترجمہ

” اے اہل ایمان ! تم تقوائے الہی اختیار کرو جس طرح اس کا حق ہے، اور تم نہ مرنا مگر مسلمان ہونے کی حالت میں ! “ (۱۰۲)

” اور تم سب ہی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور ایک دوسرے سے جدا نہ ہو، اور تم اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ جب تم ایک دوسرے سے دشمنی رکھتے تھے تو اس نے تمہارے دلوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا کہ جس کے نتیجے میں تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے اور تم تو دوزخ کے کنارے پہنچ گئے تھے مگر اس نے تمہیں اس سے نجات عطا کی، اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیتوں کو واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاسکو “ (۱۰۳)

” اور یہ ضروری ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ ایسے ہوں جو نیکی کی طرف بلائیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کریں کہ وہی فلاح و کامیابی سے ہمکنار ہوں گے “ (۱۰۴)

” اور تم تفرقہ اندازی کرنے والوں اور واضح نشانیاں آجانے کے باوجود اختلاف کی راہ پر چلنے والوں جیسے نہ بنو، کہ انہی کے لئے بہت بڑا عذاب مقرر ہے “ (۱۰۵)

- ” اس دن (روز قیامت) کچھ چہرے سفید اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے، تو جن لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے ان سے کہا جائے گا کہ کیا تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے تھے، تو اب تم اپنے کفر اختیار کرنے کا مزہ چکھو“
- (۱۰۶)
- ” اور جن کے چہرے سفید ہوں گے تو وہ اللہ کی رحمت سے بہرہ مند ہوں گے، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے“
- (۱۰۷)
- ” یہ اللہ کی آیات ہیں جو حق کے ساتھ ہم آپ کے سامنے پڑھتے ہیں اور خدا تو کائنات پر ظلم کرنا نہیں چاہتا“
- (۱۰۸)
- ” اور خدا ہی زمین و آسمان کی ہر چیز کا مالک ہے، اور خدا ہی کی طرف تمام امور کی بازگشت ہوگی“
- (۱۰۹)
- ” تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے پیدا کیا گیا ہے، تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہو اور تم خدا پر ایمان رکھتے ہو، اگر اہل کتاب ایمان لاتے تو ان کے لئے بہتر تھا، ان میں سے کچھ لوگ ایمان لائے ہیں اور اکثر فاسق و بدکار ہیں“
- (۱۱۰)

## تفسیر و بیان

یہ آیات مبارکہ سابقہ دو آیتوں کا تتمہ ہے جن میں مؤمنین کو اہل کتاب کی فتنہ پروریوں اور وسوسہ انگیزیوں کے بارے میں خبردار کرتے ہوئے ان سے اپنے آپ کو بچا کر رکھنے کا کہا گیا تھا، اور یہ بھی کہا گیا تھا کہ ان کے پاس وہ شخصیت موجود ہے جس سے وابستگی اختیار کر کے وہ گمراہی اور ہلاکت کے گہرے کھڈ میں گرنے سے بچ سکتے ہیں، تو یہ مطلب ان آیات مبارکہ میں یکے بعد دیگر مذکور ہے، گویا ”بات سے بات نکلتی ہے“ کے باب سے ہے، اور لطیف و قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس سلسلہ بیان میں اگرچہ مؤمنین سے مخاطب ہو کر بات کی گئی ہے لیکن سابقہ سیاق یعنی اہل کتاب کے بارے میں مطالب ذکر کرنے کی روش میں تبدیلی محسوس نہیں ہوتی بلکہ تبدیلی پائی ہی نہیں جاتی، اس کا ثبوت ان آیات کے بعد والی آیت (۱۱۱) کے ابتدائی جملوں میں موجود ہے جن میں ارشاد ہوا: ”لَنْ يَضُرَّكُمْ إِلَّا أَذًى.....“ (وہ تمہیں پریشان کرنے کے سوا کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتے)،

### تقویٰ اختیار کرنے کا فرمان خداوندی

○ ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ“  
(اے ایمان والو! تقوای الہی اختیار کرو جو تقویٰ اختیار کرنے کا حق ہے)

سابقہ بیانات میں تقویٰ کے بارے میں وضاحت ہو چکی ہے اور یہ بیان ہو چکا ہے کہ تقویٰ، احتراز اور اپنے آپ کو بچانے کے معنی میں آتا ہے لہذا جب اس کی اضافت خداوند عالم کے ساتھ ہو یعنی کہا جائے ”تقوای الہی“ تو اس سے مراد اس کے عذاب سے بچنا ہوتا ہے، چنانچہ اس حوالہ سے درج ذیل آیت مبارکہ میں ہوں ذکر ہوا:

سورہ بقرہ، آیت: ۲۴

○ ”فَاتَّقُوا النَّاسَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ“  
(پس تم اس آگ کا تقویٰ اختیار کرو (اس سے اپنے آپ کو بچاؤ) جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں)

تو تقوائے الہی کا حصول اس کے ارادہ و چاہت اور مرضی کے عین مطابق عمل کرنے اور زندگی بسر کرنے سے یقینی ہوتا ہے یعنی اس کے تمام فرامین و احکامات کی اطاعت کی جائے، اس کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کیا جائے، اس کی طرف سے آنے والی آزمائشوں پر صبر کیا جائے، آخری دو کاموں کی بازگشت شکر کی طرف ہوتی ہے کیونکہ شکر سے مراد ہی یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کے اصل مقام پر رکھا جائے (جو کام اس سے موزوں ہو وہ انجام دیا جائے، نعمت شکر کی متقاضی ہوتی ہے اور مصیبت و آزمائش صبر چاہتی ہے)۔ خلاصہ یہ کہ تقوائے الہی یہ ہے کہ ہر حال میں خدا کی اطاعت و فرماں برداری کا عملی دم بھریں اور کبھی اس کی مصیبت و نافرمانی نہ کریں اور ہر حال میں اس کے سامنے خضوع اور سر تسلیم خم کریں خواہ وہ کچھ عطا کرے یا نہ کرے یا موجود عطیہ کو روک لے۔

یہ ہے لفظ ”تقویٰ“ کا مرادی معنی، اب اگر اس کے ساتھ ”حَقِّ تَقْوٰیہ“ کے الفاظ کا اضافہ کیا جائے یعنی جو تقویٰ اختیار کرنے کا حق ہے، تو چونکہ اس میں تقویٰ کی حقیقت اور اعلیٰ ترین مدارج و مراتب جلوہ گر ہوئے ہیں اور اس میں باطل کی آمیزش کا تصور ہی نہیں ہوتا لہذا تقوائے الہی کی نسبت سے اس کا معنی خالص عبودیت و بندگی ہوگا کہ جس میں انانیت و غفلت کی آمیزش نہیں ہو سکتی یعنی وہ اطاعت ہی اطاعت ہے کہ جس میں مصیبت و نافرمانی کا شائبہ نہیں پایا جاتا، وہ شکر ہی شکر ہے کہ جس میں کفرانِ نعمت کو راہ نہیں ملتی، وہ ذکر ہی ذکر ہے کہ جس میں نسیان آ ہی نہیں سکتا، اور وہی حقیقی اسلام ہے کہ جو اسلام کے درجات و مراتب میں سب سے بلند درجہ و مقام ہے۔ بنا بریں جملہ ”وَلَا تَتَوَشَّوْاۤ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ“ کا معنی یہ ہوگا کہ گویا یوں کہا گیا ہے: ”دوموا علیٰ ہذہ الحال (حق التقویٰ) حتی تموتوا“ کہ اسی حالت پر یعنی حق التقویٰ پر قائم و دائم رہو یہاں تک کہ تم پر موت آجائے یعنی مرنے تک تقویٰ کی اسی حالت اور رتبہ و درجہ پر قائم رہو، یہ معنی درج ذیل آیت مبارکہ میں تقویٰ کے معنی سے مختلف ہے:

سورہ تغابن، آیت: ۱۶

○ ”فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ“

(تم تقوائے الہی اختیار کرو جس قدر کر سکتے ہو)

اس آیت میں تقویٰ اختیار کرنے کے حکم کا معنی یہ ہے کہ تم جس قدر استطاعت و قدرت رکھتے ہو اس کے مطابق اپنے کسی بھی کام میں تقویٰ کو نہ چھوڑو، یعنی اپنے مقدر و مقرر تقویٰ اختیار کرنے میں کوتاہی نہ کرو، البتہ جہاں تک استطاعت و توانائی کا تعلق ہے تو وہ افراد کی قوتوں، ہمتوں اور سوچوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف ہوتی ہے، اور یہ بات ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ حق التقویٰ کا جو معنی ہم نے ذکر کیا ہے وہ اکثر لوگوں کے بس سے باہر ہے کیونکہ اس باطنی سفر میں جو مراحل و منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں اور جن خطرات سے گزرنا و ٹھننا پڑتا ہے وہ اہل علم و اربابِ دانش کے سوا کسی کی سمجھ میں ہی

نہیں آسکتے، اور اس میں جو باریکیاں اور لطیف حقیقتیں ہیں ان سے آگاہی و التفات اہل اخلاص کے سوا کسی کے بس میں نہیں، چنانچہ تقویٰ کے مراحل میں سے کچھ ایسے مراحل بھی ہیں کہ جن کے بارے میں عامتہ الناس یہ خیال کرتے ہیں کہ نفس انسانی اس پر قادر ہی نہیں اور قطعی و یقینی طور پر اس سے عاجز و ناتوانی کا نظریہ اپنالیتے ہیں جبکہ حق التقویٰ کی منزل پر فائز افراد اس مرحلہ کو نہ صرف یہ کہ مقدور اور انسانی دسترس میں سمجھتے ہیں بلکہ اپنی عظیم ہمتوں کے ساتھ اس سے زیادہ مشکل مرحلوں کو سر کر چکے ہوتے ہیں۔

اس بیان کی روشنی میں جملہ ”فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ“ ایسا کلام قرار پاتا ہے کہ ہر طبقہ، فکر و فہم کے افراد اپنے مقدور کے مطابق اس کا معنی کر کے اسے اپنی باطنی کیفیات پر منطبق کرتے ہیں اور اپنی قدرت و طاقت کے مطابق اس کا تعین کرتے ہیں، اور اس کلام ”فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ“ کے ذریعہ جملہ ”اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ“ سے یہ مراد لیتے ہیں کہ اس میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ حق التقویٰ کی طرف قدم بڑھاؤ اور اس تک رسائی کے پختہ ارادہ و عزم کے ساتھ اپنی ہمتیں و توانائیاں بروئے کار لاؤ، تو یہ کاوشیں اسی طرح سے ہیں جیسے صراطِ مستقیم کی ہدایت پانے میں معمول ہوتی ہیں کہ جس تک رسائی محدودے چند خدا پرستوں کے سوا کسی کے بس میں نہیں ہوتی جبکہ ہر شخص اس کا دعویٰ و نظر آتا ہے، لہذا ان دو آیتوں یعنی ”اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ“ اور ”فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ“ کا حاصلہ نتیجہ یہ ہے کہ پہلے تمام لوگوں کو تقویٰ اختیار کرنے اور حق التقویٰ کی منزل پانے کی دعوت دی گئی اور پھر اس منزل تک رسائی کے لئے اپنی مقدور بھر کاوشیں بروئے کار لانے کا حکم دیا گیا، تو ان دونوں دستورات کا حاصل یہ ہوگا کہ تمام لوگ تقویٰ کی راہ پر گامزن ہو جائیں البتہ ہر شخص اپنی قدرت و طاقت اور فکر و فہم کی قوت و توانائی کے مطابق اس کے مراحل طے کرے اور اس کے مراتب و درجات سے بہرہ مند ہو۔ اور خداوند عالم کی طرف سے حاصل ہونے والی توفیق و تائید کے ساتھ تقویٰ کے بلند ترین درجات کے حصول میں کوشاں ہو۔

یہ ہے مذکورہ بالا دو آیتوں کے معانی میں غور و فکر اور تدبر کے بعد حاصل ہونے والا نتیجہ! اسی سے ظاہر و واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا دو آیتیں معنی و مطلوب کے حوالہ سے نہ تو ایک دوسرے سے کلی طور پر مختلف ہیں اور نہ ہی ایک دوسرے کے عین مطابق! یعنی ایسا نہیں کہ جو کچھ جملہ ”اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ“ میں مقصود ہے بعینہ وہی معنی جملہ ”فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ“ میں مقصود و مدنظر ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پہلی آیت مبارکہ ”اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ“ اصل مقصود و منزل مقصود تک پہنچنے کی دعوت دیتی ہے جبکہ دوسری آیت ”فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ“ اس تک پہنچنے کی کیفیت کو واضح کرتی ہے۔

## تاحیات اسلام پر رہو

○ ”وَلَا تَهْوَتْهُنَّ إِلَّا وَآنْتُمْ مُسْلِمُونَ“  
(اور تم ہرگز نہ مرنا مگر یہ کہ تم مسلمان ہو)

اس جملہ میں ارشاد ہوا کہ تم نہ مرنا مگر یہ کہ تم مسلمان ہو، یعنی مسلمان ہونے کی حالت میں مرنا، اب دیکھنا یہ ہے کہ موت تو ایک غیر اختیاری چیز ہے اس سے روکنے سے کیا مراد ہے؟  
اس میں شک نہیں کہ موت تکوینی امور میں سے ہے جو کہ ہمارے دائرہ اختیار سے باہر ہیں لہذا اس اور اس جیسے امور کے بارے میں امر اور نہی بھی تکوینی ہوں گے، چنانچہ اس کی مثالیں درج ذیل آیتوں میں موجود ہیں:

سورۃ بقرہ، آیت: ۲۳۳

○ ”فَقَالَ لَهُمْ اللَّهُ مُوتُوا“

(خدا نے ان سے کہا: تم مر جاؤ)

سورۃ یس، آیت: ۸۲

○ ”أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ“

(یہ کہ اس سے کہے: ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے)

پہلی آیت میں مرنے کا حکم ہے اور دوسری آیت میں وجود پذیر ہونے کا حکم ہے۔  
البتہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی غیر اختیاری چیز کی اضافت اختیاری چیز کی طرف کر دی جاتی ہے اور وہ دونوں خاص ترکیب پالیتے ہیں، پھر اس ترکیب یافتہ چیز کو اختیاری قرار دے کر اس کی نسبت اصحاب اختیار کی طرف دی جاتی ہے کہ جس کی بناء پر اس کی بابت امر و نہی اختیاری جہت کے حامل ہو جاتے ہیں چنانچہ ارشاد الہی ہے:

سورۃ بقرہ، آیت: ۱۳۷

○ ”فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ“

(پس تو شک کرنے والوں میں سے ہرگز نہ ہو)

سورۃ ہود، آیت: ۴۴

○ ”وَلَا تَكُنْ مَعَ الْكَافِرِينَ“

(اور تو کافروں کا ساتھی نہ بن)



سورۃ توبہ، آیت: ۱۱۹

○ ” وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ”

(اور تم سچوں کے ساتھ ہو جاؤ)

اس طرح دیگر آیات بھی موجود ہیں،

ان آیات میں ”ہونے“ اور ”نہ ہونے“ کا جو امر و نہی ہے اس کا اختیار ہونا ایک اختیاری چیز سے تعلق کے حوالہ سے ہے ورنہ اصل ”ہونا“ اور ”نہ ہونا“ اختیاری نہیں بلکہ تکوینی ہے اور تکوینی امور میں انسان کے اختیار کا کوئی دخل و اثر نہیں ہوتا لیکن اسے اختیاری امور یعنی شک کرنا، کفر و انکار کرنا اور صداقت اپنانا سے مرتبط کر کے اختیاری قرار دینے کے بعد اس کی بابت خداوند عالم نے جو امر و نہی صادر کئے وہ مولا کے فرمان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بنا بریں اسلام کے بغیر مرنے سے نہی کرنا اسے اختیاری قرار دینے کی بناء پر ہے کہ جس کی بازگشت کنایۃً اس بات کی طرف ہے کہ زندگی کے آخری لمحوں تک ہر حال میں اسلام سے وابستہ رہیں اور اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں کہ اگر موت آئے تو اسی حالت میں آئے جب تم اسلام پر قائم ہو تو اس وقت کہا جاسکے گا کہ مرنے والا اسلام کے ساتھ مرا ہے، (اسلام پر مرنا یا اسلام کے ساتھ مرنے کا مطلب یہی ہے کہ اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنے کی عمومی پابندی کے ساتھ مرا ہے، لہذا اسے محاورۃً اسلام پر مرنا کہا جاتا ہے)

اتحاد و عدم تفرقہ کا حکم

○ ” وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ”

(اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تفرقہ پیدا نہ کرو)

اس سے پہلے آیت مبارکہ (۱۰۱) میں ارشاد ہوا کہ تم کس طرح کفر اختیار کر سکتے ہو جبکہ تمہارے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور اس کا رسول تم میں موجود ہے اور جو شخص اللہ سے وابستہ ہو وہ صراطِ مستقیم کی ہدایت پا گیا (وَ كَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُسَلِّيٰ عَلَيْهِمْ عَلَيْهِمُ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ ۗ وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ) اس میں آیات الہی اور رسولِ خدا (کتاب و سنت) سے تمسک اختیار کرنا خدا سے تمسک اختیار کرنا قرار دیا گیا ہے کہ جو یہ تمسک اختیار

کرے وہ خدا کی امان میں ہے اور اس کا ہدایت پانا یقینی اور خدا کی طرف سے ضمانت کا حامل ہے، اور جو شخص رسول خدا کے دامن سے وابستہ ہو گیا وہ کتاب اللہ کے دامن سے وابستہ ہو گیا کیونکہ کتاب اللہ ہی اس کا حکم دیتی ہے چنانچہ اس سلسلہ کی ایک آیت میں یوں ارشاد ہوا:

سورہ حشر، آیت ۷:

○ ” وَمَا أَلَيْسَ لَكُمْ الرَّسُولُ وَالْحُدُودُ وَمَا نَهَيْكُمْ عَنْهُ فَأَلَيْسَ لَكُمْ ”

(جو کچھ رسول تمہیں دیں (حکم دیں) اسے لے لو (اس پر عمل کرو)، اور جس چیز سے وہ تمہیں روکیں اس سے رک جاؤ)

تو زیر نظر آیت مبارکہ (۱۰۲) میں جل جلالہ سے وابستہ ہونے کا حکم دیا گیا جبکہ اسی مطلب کو سابقہ آیت (۱۰۱) میں ”يَعْتَصِمُ بِاللَّهِ“ یعنی اللہ سے وابستہ ہونے کے الفاظ میں بیان کیا گیا تھا تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جل جلالہ یعنی اللہ کی رسی سے مراد وہی کتاب ہے جو خداوند عالم کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور وہی ہے جو بندہ اور پروردگار کے درمیان ربط و رابطہ کا وسیلہ بنتی ہے اور آسمان کا زمین سے تعلق جوڑتی ہے، اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ جل جلالہ یعنی اللہ کی رسی سے مراد قرآن مجید اور حضرت پیغمبر اسلام محمد مصطفیٰ ہیں اور سابقہ ذکر کئے گئے مطالب سے آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ ان سب کی بازگشت ایک ہی حقیقت کی طرف ہے۔

اور قرآن مجید اگرچہ حق التقویٰ اور پختہ اسلام ہی اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے لیکن زیر نظر آیت مبارکہ میں جو غرض و مقصد ملحوظ ہے وہ سابقہ آیت میں مذکور و ملحوظ امور یعنی حق التقویٰ اختیار کرنے اور اسلام پر مرنے کے حکم میں مقصود و غرض سے مختلف ہے کیونکہ سابقہ آیت میں مذکور حکم میں فرد فرد کو مخاطب کیا گیا ہے جبکہ اس آیت میں اجتماعی حوالہ سے بات کی گئی ہے اور فرد فرد کی بجائے تمام افراد کو اجتماعی صورت میں مخاطب کیا گیا ہے چنانچہ اس میں لفظ ”جَبِيْبًا“ اور جملہ ”وَلَا تَفَرَّقُوا“ سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

تو معلوم ہوا کہ ان آیات مبارکہ میں جہاں ہر فرد کو کتاب و سنت سے تمسک اختیار کرنے اور وابستہ رہنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں اسلامی معاشرہ کو معاشرہ کی حیثیت میں کتاب و سنت سے وابستہ رہنے کا دستور و فرمان صادر کیا گیا ہے۔

## نعمت خداوندی کی یاد!

○ ”وَإِذْ كَرِهْنَا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلْفَ بَدِينٍ قُلُوبِكُمْ فَاصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا“

(اور تم اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ جب تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے پھر اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی تو تم اس کی نعمت کے طفیل ایک دوسرے کے بھائی بن گئے)۔

جملہ ”إِذْ كُنْتُمْ“ اس نعمت کو بیان کرتا ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے، اس بناء پر جملہ ”وَ كُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرٍ قَاوِمِينَ الْآرَامَةَ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا“ بھی جملہ ”إِذْ كُنْتُمْ“ پر عطف ہوگا۔

یہاں نعمت کو ذکر کرنا دراصل قرآن مجید میں جاری سلسلہ بیان و اسلوب سخن کی بناء پر ہے اور وہ یہ کہ قرآن مجید اپنی تعلیمات کے ساتھ علل و اسباب کو بھی ذکر کرتا ہے اور اس طرح لوگوں کو خیر و سعادت اور ہدایت کی راہ دکھاتا ہے تاکہ لوگ اندھی تقلید کی مذموم روش سے دور رہیں..... بلکہ دلیل و برہان اور پختہ ثبوت کے ساتھ عقیدہ و عمل کا سلسلہ قائم کریں..... اور یہ بات تعلیمات الہی کے حوالہ سے بعید از قیاس ہے کہ ان میں لوگوں کو سعادت و خوش بخشی کی ہدایت سے نوازا جائے جو کہ علم نافع اور عمل صالح سے عبارت ہے اور پھر انہیں تقلید کی تاریکی اور جہالت کی ظلمت میں دھکیل دیا جائے، بلکہ ضروری و لازم ہے کہ کسی بھی دانشمند و محقق پر کوئی بات غیر واضح و مبہم نہ رہے اور نہ ہی کسی طرح کی غلط فہمی کا شائبہ ہو، بنا بریں یہ واضح ہوا کہ خداوند عالم لوگوں کو ان کی سعادت کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے اور انہیں اس کے اسرار و رموز اور علل و اسباب سے بھی آگاہی دلاتا ہے تاکہ وہ حقائق کے ایک دوسرے سے ربط و تعلق سے بخوبی واقف ہوں اور یہ جان لیں کہ تمام دینی حقائق و معارف کا سرچشمہ فیض خداوند عالم کی یکتا ذات ہے اور لوگوں پر واجب و لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور سر تسلیم خم کریں کیونکہ وہ رب العالمین ہے اور اس کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہیں کیونکہ وہ اس ہستی کی رسی..... و راستہ..... ہے جو تمام موجودات عالم ہستی کا پروردگار ہے، چنانچہ اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بعد والی آیات مبارکہ میں یوں ارشاد فرمایا:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ“ (۱۰۸)،

”وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ“ (۱۰۹)،

(یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم آپ کے سامنے پڑھتے ہیں حق کے ساتھ، اور اللہ کا حکم پر ظلم نہیں کرنا چاہتا)، (اور

اللہ کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ کی طرف تمام امور کی بازگشت ہے)۔

خلاصہ کلام یہ کہ خداوند عالم نے لوگوں کو حکم دیا کہ جب تک کسی بات کی اصل وجہ و بنیاد معلوم نہ ہو اسے قبول نہ کریں اور جب تک کسی کام کی حقیقت سے آگاہی حاصل نہ ہو اس کو نہ اپنائیں، یعنی قول و فعل میں دلیل و مقصد معلوم ہونا ضروری ہے۔ پھر خداوند عالم نے اس قاعدہ کلیہ اور عمومی ضابطہ سے استثناء کرتے ہوئے انہیں حکم دیا کہ جہاں تک اس کی اپنی ذات اور اس کے رسول گرامی قدر کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں ان کا فریضہ ہے کہ اس کے حضور سر تسلیم خم کر دیں اور کسی دلیل و وجہ کے پیچھے جانے کے بجائے اس کے ہر حکم پر عمل پیرا ہو جائیں اور صرف یہی بات ان کے لئے اطاعت میں کافی ہے کہ وہ ان کا معبود اور علی الاطلاق مالک ہے، لہذا انہیں اس کے علاوہ کچھ بھی چاہنے کا حق حاصل نہیں کہ جو خدا نے ان کے بارے میں ارادہ کیا ہے اور انہیں صرف وہی کام کرنے کا حق اور اجازت ہے جو خدا نے ان کے بارے میں فیصلہ کیا ہے، اسی طرح ان پر لازم ہے کہ وہ رسول اللہ کے ہر فرمان کی اطاعت و فرمانبرداری کریں اور ان کی علی الاطلاق اطاعت کریں یعنی وہ کچھ انہیں کہیں اسے بجالائیں اور جس سے روکیں اسے ترک کریں، اور اس سلسلہ میں صرف یہی بنیاد قرار دیں کہ اس کا حکم رسول اللہ نے دیا ہے کیونکہ وہ خدا کا بھیجا ہوا پیغامبر ہے کہ جس کا کام خدا کے احکامات و پیغامات پہنچانے کے سوا کچھ نہیں، وہ تو آیا ہی اسی لئے ہے کہ لوگوں کو اللہ کے فرامین و دستورات سے آگاہ کرے۔

ان دو استثنائی دستورات کے بعد خداوند عالم اپنے بندوں کو اصول و معارف کے حقائق کے بارے میں آگاہی دلاتا ہے اور انہیں سعادت و خوش بختی کے راستوں و طریقوں کی ہدایت و رہنمائی کرتا ہے، اور پھر ان تمام امور کی عمومی بنیادی وجہ سے بھی آگاہ کرتا ہے تاکہ وہ معارف کے ایک دوسرے سے ربط و تعلق اور سعادت کے طریقوں سے روشناس ہوں کہ اس طرح وہ عقیدہ توحید کے تقاضوں کو کامل طور پر پورا کریں اور اس خدا پسند روش کو اپنائیں کہ جس کی بنیاد پر تفکر و تدبر کے صحیح و درست راستہ پر گامزن ہوں اور اظہار حق کی اصل راہ کو پہچان لیں، جس کے نتیجہ میں ان کی زندگی، علم و یقین پر استوار ہو اور وہ اندھی تقلید کے بندھنوں سے آزاد ہو جائیں اور پھر اس کا عملی نتیجہ و فائدہ یہ ہوگا کہ وہ جب بھی دینی معارف یا ان سے تعلق رکھنے والے امور میں سے کسی کی بھی دلیل و وجہ اور بنیادی حقیقت سے آگاہی حاصل کر لیں گے تو اسے قبول کرنے میں دیر نہ کریں گے اور اگر انہیں کسی بات کی گہرائی تک جانے اور اس کی دلیل سے آگاہ ہونے میں کامیابی نہ ہو تو وہ اسے جلد بازی کے ساتھ رد کر دینے اور اس کا انکار کرنے کی راہ نہیں اپنائیں گے بلکہ اس کے بارے میں مزید بحث و تحقیق اور غور و فکر کریں گے اور پھر اس کے قبول یا عدم قبول کا فیصلہ کریں گے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر بلکہ واجب الاتقیات ہے کہ کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دین کی بنیاد یہ ہے کہ کسی سے بھی خواہ وہ خدا اور رسول خدا ہی کیوں نہ ہو کوئی بات دلیل کے بغیر قبول نہ کی جائے، کیونکہ یہ تو نہایت احمقانہ و سفیہانہ نظریہ ہے کہ جس کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں اور نہ ہی اس کی کوئی معقول بنیاد ہے بلکہ اس کی بازگشت تو اس بات

کی طرف ہوگی کہ خداوند عالم اپنے بندوں سے چاہتا ہے کہ وہ دلیل کے باوجود دلیل تلاش کریں کیونکہ اس کی ربوبیت اور اس کا مالک علی الاطلاق ہونا ہی ہر دلیل کی بنیاد اور اس بات اصل و اساس ہے کہ اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں اور رسولؐ کی رسالت خود ایک مضبوط دلیل ہے کہ وہ جو کچھ بھی پیش کرتا ہے اس کا سرچشمہ خدا ہے اور وہ خدا کے فرامین و پیغامات و احکام بندوں تک پہنچاتا ہے (غور کریں) یا اس کی بازگشت اس بات کی طرف ہوگی کہ وہ جن چیزوں میں اپنی ربوبیت کی بنیاد پر تصرف و فیصلہ کرتا ہے ان میں اپنی ربوبیت کو بے اثر کر دے جبکہ ایسا کرنا کھلاتا ناقض ہے۔

حاصل الکلام یہ کہ اسلامی طریقہ و روش اور سنت و سیرت نبویؐ دعوت الی العلم اور اندھی تقلید سے دوری اختیار کرنے کے سوا کچھ نہیں اور جو لوگ خود اندھی تقلید کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور اپنے آپ کو ترقی یافتہ و دانشور سمجھ کر کتاب و سنت کی پیروی کو تقلید کا نام دیتے ہوئے زبان اعتراض و تنقید دراز کرتے ہیں دراصل وہ خود اندھی تقلید کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔

اور شاید آیت میں مذکور مطلب یعنی **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ** (اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنا) اور **وَلَا تَفَرَّقُوا** یعنی عدم تفرقہ کو ”نعمت“ سے تعبیر کر کے **”وَإِذْ كُرِّدْنَا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ“** کہنے کی وجہ بھی یہی ہو کہ جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اور وہ یہ کہ تمہیں اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے اور تفرقہ پیدا کرنے کا حکم دینے کی دلیل یہ ہے کہ تم نے خود ہی باہمی دشمنی و صداوت کی تلخی چکھ لی ہے اور محبت و الفت اور بھائی چارہ کے شیریں آثار و نتائج بھی دیکھ لئے ہیں کہ تفرقہ و جدائی کے نتیجے میں تم آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی زد میں آ گئے تھے جبکہ اتحاد و یکجہتی اور باہمی محبت کے نتیجے میں تم نے اس سے نجات پائی، تو ہم تمہیں اس دلیل سے آگہی دلا رہے ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے ذریعے ہم اپنی بات کو ٹھوس بنیاد پر استوار کرنا چاہتے ہیں کہ اس کے بغیر ہماری بات کا حق ہونا ثابت نہ ہوگا، نہیں ایسا نہیں، بلکہ ہماری بات ہر حال میں حق ہے خواہ ہم اس کے ساتھ دلیل ذکر کریں یا نہ کریں، ہم جو بات کرتے ہیں وہ حق ہی ہوتی ہے اور یہاں دلیل ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تمہارا باہم متحد ہونا اور تفرقہ کا شکار نہ ہونا ہماری طرف سے تم پر نعمت ہے اور اسی سے اس حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ کہ ہم تمہیں جو بھی حکم دیتے ہیں اس میں تمہارے لئے سعادت و خوش بختی راحت و آرام اور کامیابی و کامرانی ہے۔

اور خداوند عالم نے زیر نظر آیت مبارکہ میں دو دلیلیں ذکر کی ہیں، ایک اعتصام بہ حبل اللہ کے ضروری و لازم ہونے پر اور دوسری عدم تفرقہ پر، پہلی دلیل جملہ **”إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً.....“** کے ذریعے بیان کی جو کہ تجربہ پر مبنی ہے اور دوسری دلیل جملہ **”وَ كُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ.....“** کے ذریعے بیان کی کہ جو عقلی استدلال پر مبنی ہے۔

اور جملہ **”فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا“** میں دراصل اسی مطلب کو دوبارہ بیان کیا گیا ہے جو جملہ **”وَإِذْ كُرِّدْنَا“**

نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ.....“ میں بیان کیا گیا، اور ”نعمت“ سے مراد دلوں کا ایک دوسرے سے قریب کرنا اور ان میں الفت پیدا کرنا ہے۔ اور یہ نعمت جس ”اخوت“ کو جنم دیتی ہے اس سے مراد بھی وہی دلوں کا ایک دوسرے سے قرب اور الفت ہے، بنا بریں یہاں ”اخوت“ و برادری کے رشتہ کی بات ادعائی ہے، یعنی وہ واقعی و حقیقی برادری کا رشتہ مقصود نہیں جو دو حقیقی بھائیوں کہ جو والدین کے حوالہ سے بھائی بنتے ہیں کے درمیان پایا جاتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں اس اخوت کی طرف اشارہ ہو جو درج ذیل آیت میں مقصود ہے:

سورہ حجرات، آیت : ۱۰

○ ”إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ“

(بے شک، مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں)

کیونکہ اس آیت میں مومنین کے درمیان ایمانی اخوت و برادری کا جو شرعی رشتہ قائم کیا گیا ہے اس کی بناء پر ان کے درمیان متعدد آثار اور اہم حقوق کا سلسلہ و نظام قائم ہو گیا ہے۔

## آگ کے شعلوں کی زد میں!

○ ”وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا“

(اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے پھر اس نے تمہیں اس سے بچالیا)

”شَفَا حُفْرَةٍ“ گڑھے کے اس کنارے کو کہتے ہیں کہ اگر کوئی اس پر کھڑا ہو تو اس میں گرنے والا ہی لگتا ہے۔ اگر یہاں آگ سے مراد دوزخ کی آگ ہو تو آیت کا معنی یہ ہوگا کہ تم کافر تھے اور دوزخ کے کنارے پر پہنچ گئے تھے کہ اس میں گرنے میں ایک لمحہ سے زیادہ باقی نہ رہا تھا جو کہ موت سے عمارت ہے کہ جو انسان کی آنکھ کی سیاہی اور سفیدی سے بھی زیادہ اس سے نزدیک ہے، پھر خدا نے تمہیں ایمان کے ذریعے اس سے نجات عطا کی۔

اور اگر اس سے مراد ان کی اتر معاشرتی حالت کو بیان کرنا ہو کہ جو ان کے ایمان لانے سے پہلے ان کی تھی تو اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ایمان لانے کے بعد ان کے دلوں میں الفت پیدا ہو گئی اور وہ ایک دوسرے کے دشمن ہونے کی دلدل سے نکل کر ایمانی بھائی چارہ سے بہرہ مند ہو گئے۔

اس طرح لفظ ”نار“ (آگ) سے مراد جنگیں اور لڑائی جھگڑے ہوں گے اور اس طرح کا استعمال عام درج ہے جو

کہ مجازی طور پر ہوتا ہے، یعنی شدید جنگ اور سخت لڑائی کو آگ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس بناء پر اصل مقصود اس مطلب کو بیان کرتا ہے کہ جو معاشرہ پر اگندہ دلوں اور مختلف و گونا گوں مقاصد اور نفس پرستی پر مبنی ہو تو لامحالہ وہ اتحاد و یکجہتی کے راستہ سے دور ہونے کی وجہ سے ایک ہی منزل مقصود تک پہنچنے کی متحدہ کاوشوں سے محروم ہو گا بلکہ افراد کے ذاتی مفادات و بیہودہ شخصی ترجیحات کی بھینٹ چڑھ کر شدید ترین اختلافات اور سخت ترین دشمنی سے دوچار ہو گا۔ اور یہ صورتحال انہیں تنازعات کی پست ترین منزل تک لے جائے گی اور انہیں ہمیشہ کشت و خون کی دلدل میں چھننے کا اندیشہ لاحق رہے گا کہ جو ان کے زوال و نابودی کا پیش خیمہ ہی نہیں بلکہ یقینی سبب بن جائے گا، اور یہی وہ آگ ہے جو جہالت کے گہرے کھڈے کے کنارے لاکھڑا کرتی ہے کہ جس میں گرنے والے کو نجات کا کوئی راستہ اور چھٹکارے کا کوئی وسیلہ نہیں مل سکتا۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ اس آیت مبارکہ کے نزول سے پہلے کچھ مسلمان ایسے تھے جو کفر کو چھوڑ کر ایمان کے دائرے میں داخل ہو گئے تھے اور ان آیات میں انہی کو مخاطب قرار دے کر ان کے ماضی کے حوالہ سے بات کی جا رہی ہے کہ وہ اسلام لانے سے پہلے کی زندگی میں مسلسل لڑائی بھگڑوں میں اس حد تک چلے گئے تھے کہ نہ تو انہیں امن و امان نصیب تھا اور نہ ہی راحت و آرام، اور نہ انہیں اس صورتحال سے نکلنے کی راہ سوچنے کی فرصت تھی، بلکہ وہ معاشرتی امن کی حقیقت سے بھی آگاہی نہیں رکھتے تھے کہ جو معاشرے کو جاہ و جلال، مال و دولت اور عزت و حفاظت جان سے مالا مال کر دے، پھر جب اجتماعی صورت میں انہوں نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیا اور سعادت و خوش بختی کے آثار واضح طور پر انہیں دکھائی دینے لگے تو انہوں نے ان نعمتوں کی شیرینی چکھی اور وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو گئے کہ جو کچھ خداوند عالم نے ان سے نعمتوں کے عطیہ اور سعادت کی حقیقی لذت کے بارے میں کہا تھا وہ سچ اور حق تھا۔ لہذا اس آیت میں نعمتوں کی جو یاد دہانی کرائی گئی وہ ان لوگوں اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی اپنا مطلوبہ اثر چھوڑتی ہے اور سب کو دعوت فکر و عمل دیتی ہے۔ اسی وجہ سے کلام کو مشاہدہ اور زمینی حقائق لمس کرنے کا اہم بنایا گیا ہے اور فرضی و خیالی اور تصوراتی خاکوں کو بنایا نہیں بنایا گیا ہے کیونکہ مشاہدہ اور بیان کا تقابل ہی نہیں ہو سکتا..... عیاں را چہ نسبت بہ عیاں..... اور نہ ہی تجربات کو مفروضات کے برابر قرار دیا جاسکتا ہے، اسی بناء پر بعد والے جملہ ”وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا.....“ میں گزرے ہوئے لوگوں کے انجام کار کا حوالہ دے کر لوگوں کو خبردار کیا گیا کیونکہ ایمان لانے والوں نے اپنی آنکھوں سے ان کا برا انجام دیکھا اور اپنے کانوں سے ان پر جو گزری اسے سنا، لہذا مومنین پر لازم ہو گیا کہ وہ ان لوگوں کے انجام کار سے عبرت حاصل کریں اور جو کچھ ان پر گزری اس سے سبق لیں تاکہ ان کے اختیار کردہ راستہ پر نہ چلیں اور ان کے انجام جیسی صورتحال سے دوچار نہ ہوں۔

یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد خداوند عالم نے انہیں اس خصوصیت سے آگاہ کیا جس کی بناء پر انہیں مخاطب قرار دیا گیا، چنانچہ ارشاد ہوا: ”كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ“، اسی طرح خدا تمہیں اپنی نشانیوں سے آگاہی

دلالتا ہے تاکہ تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ،

## امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے والی امت !

○ ”وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ“  
(تم میں سے کچھ لوگ ایسے ہونے چاہئیں جو نیکی کی دعوت دیں اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کریں)

قطعی و یقینی تجربات اس حقیقت کا ثبوت دیتے ہیں کہ انسان اپنی زندگی میں جو معلومات حاصل کرتا ہے..... اور ان میں سے صرف انہی معلومات کو اپنے لئے جمع و محفوظ کرتا ہے جو اس کے لئے فائدہ مند ہوں..... خواہ وہ جہاں سے اور جس طریقہ سے بھی انہیں حاصل کرے اور جس طرح بھی انہیں محفوظ کرے، لیکن اگر ان معلومات کو ہمیشہ ملحوظ و مد نظر قرار نہ دے اور نہ ہی انہیں بار بار عملی جامہ پہنائے تو وہ معلومات جاتی رہیں گی اور بالآخر ان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ انسان کے ہر عمل کا اور مدار علم پر ہوتا ہے کہ علم کے قوی ہونے سے عمل میں قوت آتی ہے اور علم کے ضعیف ہونے سے عمل میں کمزوری پیدا ہوتی ہے، علم کے صالح و درست ہونے سے عمل بھی صالح و درست ہوتا ہے اور علم کے فاسد و خراب ہونے سے عمل بھی فاسد و خراب ہوتا ہے، چنانچہ اس کی مثال درج ذیل آیت مبارکہ میں پاک زمین اور ناپاک زمین سے دیتے ہوئے یوں ارشاد الہی ہوا:

سورہ اعراف، آیت: ۵۸

○ ”الْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَحْسَبُ نَبَاتَهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي خَبثَ لَا يَخْتَرِحُ إِلَّا تَنَكُّدًا“

(پاک زمین کی پیداوار اس کے پروردگار کے اذن سے نکلتی ہے اور ناپاک زمین خس و خاشاک کے سوا کچھ پیدا نہیں کرتی)

اور یہ حقیقت بھی ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ علم و عمل اثر گزار کی حوالہ سے ایک دوسرے کے برعکس ہیں، علم عمل کا مضبوط ترین داعی ہے، اور جو عمل وقوع پذیر ہو اور اس کے اثر کا بھی مشاہدہ ہو جائے وہ نہایت طاقتور معلم بن جاتا ہے جو انسان کو علم کی دولت عطا کرتا ہے۔

بہر حال مذکورہ بالا امور ہی علم نافع اور عمل صالح کے حامل صالح معاشرہ کو ان کی معرفت و ثقافت کے تحفظ کی دعوت



دیتے ہیں اور افراد معاشرہ کو اس بات کی تاکید و تلقین کرتے ہیں کہ جو شخص خیر و نیکی کے راستے سے ہٹ جائے اسے واپس اس کی طرف لوٹائیں اور جو شخص خیر و نیکی کے راستے سے کلی طور پر منہ موڑ چکا ہو اسے اس کے حال پر نہ چھوڑیں کہ وہ شر اور برائی کے گہرے کھڈ میں گر جائے بلکہ اسے ہلاکت و نابودی کی وادی میں گرنے سے روکیں اور اسے خیر و نیکی کے راستے سے دور نہ جانے دیں۔

اسی کا نام خیر و نیکی کی دعوت دینا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے، اسی کی طرف خداوند عالم نے اس آیت میں توجہ مبذول کروائی ہے، ”يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ“ (وہ خیر کی دعوت دیتے ہیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے ہیں)۔

اس بیان سے وہ بنیادی نکتہ بھی معلوم ہو جاتا ہے جس کی بناء پر خداوند عالم نے خیر و شر کو ”معروف اور منکر“ سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ یہ کلام سابقہ آیت مبارکہ کے ان الفاظ پر مبنی ہے: ”وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا...“ (اور تم سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تفرقہ پیدا نہ کرو)، ظاہر ہے کہ جس معاشرہ کی اصل و اساس ہی اعتصام بحبل اللہ اور عدم تفرقہ ہو اس میں ”معروف“ یعنی پسندیدہ کام ہی ”خیر“ و نیکی قرار پائے گا اور ”منکر“ یعنی ناپسندیدہ کام ہی ”شر“ اور برائی کہلائے گا اور اگر بالفرض یہ نکتہ اس وجہ تسمیہ میں ملحوظ نہ بھی ہوتی تو ”خیر“ کو ”معروف“ اور ”شر“ کو ”منکر“ سے موسوم کرنے میں یہی بات کافی ہے کہ دینی نقطہ نگاہ میں ”خیر“ کو معروف اور ”شر“ کو منکر قرار دیا گیا ہے، کہ جس میں افراد کے عملی حوالہ کا عمل دخل نہیں۔

## ایک ادبی حوالہ !

جملہ ”وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ“ میں حرف ”من“ کے بارے میں دو قول ذکر کئے گئے ہیں:

(۱) بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ جمعیض کے معنی میں ہے یعنی اس میں بعض افراد مقصود ہیں، اس قول کی دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور اسی طرح خیر و نیکی کی دعوت دینا واجب کفائی اعمال میں سے ہے..... کہ جو تمام افراد پر واجب ہوتے ہیں مگر بعض کے انجام دینے سے دوسروں سے ساقط ہو جاتے ہیں.....

(۲) ایک قول یہ ہے کہ یہاں حرف ”من“ بیان یہ ہے یعنی ان افراد کی نشاندہی کرنے کے لئے جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور دعوت الی الخیر دیتے ہیں، اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اس طرح کے صالح معاشرہ کے ذریعے تم ایسی امت بن جاؤ جو دعوت الی الخیر دینے والی ہو اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے والی ہو، گویا یہ اسی طرح ہے جیسے کہا جائے:

”لیکن لی منک صدیق ای کن صدیقاً لی“ کہ تجھ سے میرا ایک دوست ہونا چاہیے یعنی تو میرا دوست بن جا..... تو اس سے بظاہر یہ مراد ہے کہ حرف ”من“ کو بیانیہ قرار دینے کا مطلب اسے ابتدائیہ قرار دینا ہے یعنی ایسی امت نہیں جو دعوت الی الخیر دے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرے۔

بہر حال کہنے کی بات یہ ہے کہ حرف ”من“ کو تجویز کے لئے قرار دینا یا بیانیہ مانیں، دونوں صورتوں میں اس بحث کا کوئی عملی نتیجہ نہیں نکلے گا اور اس سے خاطر خواہ فائدہ حاصل نہ ہوگا کیونکہ دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ایسے امور و اعمال ہیں کہ اگر واجب ہوں تو طبعاً واجب کفائی ہوں گے کیونکہ دعوت اور امر و نہی سے مطلوبہ غرض حاصل ہونے کے بعد دوبارہ ان کا انجام دینا بے معنی ہوگا، اگر فرض کیا جائے کہ تمام افراد امت دعوت الی الخیر دینے والے ہوں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے والے ہوں تو اس کا یقینی طور پر مطلب یہ ہوگا کہ امت میں کچھ افراد ایسے ضرور ہیں جو ان فرائض کو ادا کرتے ہیں، تو یہ کام بہر حال بعض افراد کے ذمہ بنتا ہے کہ جو اسے ادا کرتے ہیں، لہذا اگر آیت میں بعض افراد مخاطب ہوں تو مطلوب حاصل ہے کہ وہی افراد مقصود ہوں گے جو یہ فریضہ ادا کرتے ہیں اور اگر تمام افراد مخاطب ہوں تو تب بھی انہی بعض کے حوالہ سے ہوگا، دوسرے لفظوں میں یہ کہ ان فرائض و واجبات کے بارے میں تمام افراد ہی اجر و ثواب پائیں گے، اسی لئے سلسلہ بیان کے آخر میں ارشاد ہوا: ”وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ“ (وہی لوگ کامیاب ہیں)، بتا برائیں بظاہر یہی بات درست ہے کہ حرف ”من“ تجویز کے لئے ہے یعنی اس میں بعض افراد مقصود ہیں، اور عام محاوروں اور استعمال ہونے والے جملوں میں بھی اس طرح کی ترکیب و ترتیب میں ایسا ہی ملحوظ و مقصود ہوتا ہے اور اگر اس کے علاوہ مقصود ہو تو اس کے لئے اضافہ و استثنائی دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ مذکورہ تین موضوعات یعنی دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، طویل و عمیق تفسیری بحثوں کے حامل ہیں کہ انشاء اللہ کسی موزوں مقام پر ان سے مربوط مطالب ذکر کئے جائیں گے اور ان کے ساتھ ساتھ دیگر متعلقہ علمی، اخلاقی اور معاشرتی بحثیں بھی پیش کی جائیں گی۔

## تفرقہ پیدا کرنے والوں سے اجتناب کا حکم

○ ”وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَنَفَرُوا وَآخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ“

(اور ان لوگوں جیسے نہ بنو جنہوں نے تفرقہ کیا اور واضح نشانیاں آ جانے کے بعد بھی باہم اختلاف کا شکار ہو گئے.....)

بعید نہیں کہ جملہ ”مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ“ کا تعلق صرف ”وَاحْتَفَلُوا“ سے ہو، اس صورت میں اختلاف سے مراد اعتقادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہونا ہے اور ”تَفَرَّقُوا“ میں تفرقہ سے مراد جسمانی طور پر ایک دوسرے سے جدا ہونا ہے۔ یہاں تفرقہ کا ذکر اختلاف سے پہلے اس لئے ہے کہ جسمانی طور پر جدائی و دوری اعتقادی طور پر ایک دوسرے سے جدا و بعید ہونے کا مقدمہ و تمہید ہوتی ہے، کیونکہ کسی قوم کا یکجا و متحد ہونا و جسمانی طور پر ایک دوسرے کے قریب ہونا اعتقادی لحاظ سے بھی انہیں ایک دوسرے سے قریب کر دیتا ہے اور میل جول کے نتیجے میں ایک دوسرے کی توانائیوں سے استفادہ کرنے کی راہ ہموار ہو جاتی ہے جس سے ان کے درمیان اختلافات کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں، لیکن اگر وہ ایک دوسرے سے جدا ہوں اور ان کے درمیان تفرقہ پیدا ہو جائے کہ ان کا میل جول باقی نہ رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مختلف مذاہب و مسلک میں بٹ جائیں گے اور ان کے درمیان فکری و نظریاتی ہم آہنگی کی بجائے تفرقہ و مسلک گرائی کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائیں گی اور پھر وحدت و اتحاد کے خواب چکنا چور ہو جائیں گے، شاید اسی مطلب کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ارشاد الہی ہوا: ”وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا“ تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو ایک دوسرے سے جدا ہو گئے یعنی پہلے جسمانی طور پر ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور ان کی اجتماعی حیثیت ختم ہو گئی اور پھر اس کے نتیجے میں وہ عقائد و نظریات میں ایک دوسرے سے اختلاف کا شکار ہو گئے۔ اسی اختلاف کو خداوند عالم نے اپنے مقدس کلام میں کئی مقامات پر دشمنی و بغاوت کا شاخسانہ قرار دیا ہے، چنانچہ درج ذیل آیت میں یوں ارشاد ہوا:

سورہ بقرہ، آیت: ۲۱۳

○ ”وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ“

(اور اس میں نہیں اختلاف کیا مگر صرف ان لوگوں نے جنہیں وہ دیا گیا، بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح

نشانیوں آچکی تھیں، انہوں نے ایسا آپس میں دشمنی کی بنیاد پر کیا)

البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ عقائد و نظریات میں اختلاف کا ہونا ناگزیر ہوتا ہے کیونکہ ہر شخص کی قوت فہم دوسرے سے مختلف ہونے کی وجہ سے عقائد و نظریات کا مختلف ہونا ناگزیر ہوتا ہے اسی طرح اس اختلاف کا دور کرنا اور تمام افراد کو ایک پلیٹ فارم پر واپس لانا بھی ضروری اور ناگزیر ہوتا ہے اور اس کا ایک بنیادی ذریعہ لوگوں کا جسمانی طور پر ایک دوسرے سے قریب ہونا ہے کہ ان کے باہمی میل جول سے نظریات کا اختلاف بھی ختم ہو سکتا ہے، البتہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ اختلاف کا دور ہونا ممکن بھی ہے اور قابل عمل بھی البتہ بالواسطہ! اور اگر اس واسطہ و ذریعہ کو نہ اپنایا جائے تو یہ ان کی طرف سے ظلم و بغاوت کہلائے گا اور اپنے ہی ہاتھوں اپنے آپ کو اختلافات کی بناء پر ہلاکت و تباہی سے دوچار کرنا ہوگا۔

اسی وجہ سے قرآن مجید نے اتحاد و یکجہتی کی دعوت دی، اور اس کی بابت بھرپور تاکید کی اور لوگوں کو اختلاف کا شکار

ہونے سے سخت منع کیا، قرآن مجید کا اس سلسلہ میں اس قدر تاکید کرنا اس بنیاد پر ہے کہ خداوند عالم اس امت کے بارے میں بخوبی آگاہ ہے کہ اس میں پیدا ہونے والے اختلافات کا دامن وسیع ہوگا اور وہ سابقہ امتوں کی طرح بلکہ ان سے کہیں زیادہ اختلافات کی لپیٹ میں آئیں گے، چنانچہ قرآنی اسلوب بیان کے بارے میں ہم کئی بار ذکر کر چکے ہیں کہ جب بھی اس میں کسی چیز سے ممانعت کی بابت سخت الفاظ و انداز اختیار کیا جائے اور اس کے قریب جانے سے نہایت سختی کے ساتھ نبی کی جائے تو اس سے اس کام کے وقوع پذیر ہونے اور لوگوں کی طرف سے اس کا ارتکاب کرنے کے واضح اشارے ملتے ہیں کہ لوگ اسے انجام دیں گے اور اس کا شکار ہوں گے، امت کے درمیان اختلافات کے جنم لینے کے بارے میں جہاں قرآن مجید نے واضح اشارے دیئے ہیں وہاں حضرت پیغمبر اسلامؐ نے بھی اس کے وقوع پذیر ہونے اور امت کے اس میں مبتلا ہونے کے بارے میں پیشگوئی کی اور متعدد حوالوں سے ارشاد فرمایا کہ ان کی امت میں رفتہ رفتہ اختلاف پیدا ہوگا اور پھر پھیلتا چلا جائے گا یہاں تک کہ انہیں گرد ہوں اور فرقوں میں بانٹ دے گا۔ اور ان کی امت کے درمیان اختلافات اسی طرح پھیل جائیں گے جس طرح یہود و نصاریٰ کے درمیان پھیلے۔ اس سلسلہ میں اصل روایت ”روایات پر ایک نظر“ میں ذکر کی جائے گی، انشاء اللہ تعالیٰ،

قرآنی پیشگوئی کی تصدیق، امت کے درمیان واقع ہونے والے شدید ترین اختلافات سے ہوگئی چنانچہ آنحضرتؐ کی رحلت کو زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ امت اختلافات سے دوچار ہوگئی اور گونا گوں مذاہب و مسلک میں تقسیم ہوگئی، اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ فروعی اختلافات اصولی اختلافات کی صورت اختیار کر گئے اور ہر فرقہ و گروہ دوسرے فرقہ کو کافر کہنے لگا، ایک دوسرے پر کفر کے الزامات لگانے کا سلسلہ عہد صحابہ سے شروع ہوا اور اب تک جاری و ساری ہے، چنانچہ جب بھی کسی نے دو مذاہب و مسلک کے درمیان اختلافات ختم کرانے اور انہیں ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی اس نے تیسرے مذاہب کو جنم دے دیا۔

جب ہم امت اسلامیہ میں وقوع پذیر ہونے والے اختلافات کا تجزیہ و تحلیل کرتے ہیں اور اس کے پس منظر پر غور کرتے ہیں تو اس منحوس سلسلہ کی کڑیاں منافقین سے جڑی ہوئی نظر آتی ہیں کہ جن کے بارے میں قرآن مجید نے نہایت سخت الفاظ استعمال کئے اور ان کی شیطانی چالوں، دغا بازیوں اور مکر و فریب پر مبنی حرکتوں سے پردہ اٹھایا، چنانچہ آپ اگر منافقین کے بارے میں قرآنی بیانات پر بخوبی غور کریں اور دیکھیں کہ خداوند عالم نے ان کے بارے میں سورہ بقرہ، سورہ توبہ، سورہ احزاب اور سورہ منافقون و دیگر سورتوں میں جو کچھ ارشاد فرمایا اور ان کی باطنی ناپاکی کو برملا کیا تو آپ کی حیرت کی انتہاء نہ رہے گی جبکہ یہ سب کچھ عہد نبویؐ میں ان کی حالت کی عکاسی کرتا ہے کہ ابھی نزول وحی کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا تھا، پھر جب آنحضرتؐ کا وصال ہو گیا تو ان کا تذکرہ بھی رک گیا اور دفعۃً ان کی آوازیں دب گئیں۔

بہر حال آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کے درمیان گروہ بندی کی آگ بھڑک اٹھی اور گونا گوں مذاہب و مسالک نے ان کے درمیان دوریاں پیدا کر دیں، ظلم و استبداد کے ذریعے وجود میں آنے والی حکومتوں نے لوگوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا اور ان کی سعادت آمیز زندگی کو گمراہی و بدبختی میں بدل دیا (واللہ المستعان) خدا سے دعا و امید ہے کہ ہمیں توفیق دے کہ اس موضوع کی بابت تفصیلی و تکمیلی تذکرہ سورۃ برأت کی تفسیر میں کر سکیں، انشاء اللہ تعالیٰ۔

### چہروں کے سفید و سیاہ ہونے کا دن

○ ”يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌُ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌُ..... الخ“  
(جس دن کچھ چہرے سفید اور کچھ چہرے سیاہ ہو جائیں گے.....)

یہاں چونکہ کفرانِ نعمت کی بات ہو رہی تھی اور وہ یعنی کفرانِ نعمت بھی خیانت کی طرح محسوس و شرمندگی کا باعث بنتا ہے لہذا خداوند عالم نے تمثیلی طور پر عذاب کی مختلف قسموں میں سے اسی قسم کو بیان کیا ہے جو محسوس و شرمندگی سے ہم رنگ ہے یعنی چہرے کا سیاہ ہونا (منہ کالا ہونا)، کہ جسے دنیا میں شرمندگی کی علامت کے طور پر جانا جاتا ہے، چنانچہ جملہ ”فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكْفَرْتُمْ بَعْدَ آيْمَانِكُمْ“ (جن لوگوں کے منہ کالے ہوں گے..... ان سے کہا جائے گا..... کیا تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے ہو؟)، اسی طرح نعمت خداوندی کا شکر ادا کرنے والوں کے اجر و ثواب کے اشاراتی تذکرہ میں اس چیز کو ذکر کیا جو شکر سے موزونیت رکھتی ہے یعنی چہرہ کا سفید ہونا، کہ جسے دنیا میں رضایت و پسندیدگی سے کنایہ قرار دیا جاتا ہے۔

### آیات الہی کی تلاوت

○ ”تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوَهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ“  
(یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم تیرے سامنے حق کے ساتھ پڑھتے ہیں)

”بِالْحَقِّ“ (بجا، بالحق مجبور) کا تعلق جملہ ”نَتْلُوَهَا“ سے ہے، حق کے ساتھ تلاوت کرنے سے مراد برحق

تلاوت کرنا ہے، یعنی وہ باطل و شیطانی نہیں،

ممکن ہے ”بِالْحَقِّ“ کا تعلق ”آیات“ سے ہو، البتہ اس حوالہ سے کہ اس میں وصفی معنی کا پہلو پایا جاتا ہے۔  
ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ظرف ”بِالْحَقِّ“ مستنقر ہو کہ جس کا متعلق لفظوں میں ذکر نہ کیا گیا ہو..... بلکہ مقدر یعنی تصور میں فرض کر کے جملہ سے فہم المعنی مقصود قرار پائے.....

ان احتمالات کی بناء پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جو آیات ان دو گروہوں یعنی کافروں اور مشاکروں کے ساتھ خدا کے برتاؤ کو آشکار کرتی ہیں وہ حق کے ساتھ ساتھ ہیں اور ان کی بابت باطل و ظلم کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا، اس حوالہ سے یہی احتمال آیت کے بعد والے جملہ سے زیادہ ہم رنگ نظر آتا ہے جس میں ارشاد ہوا: ”وَمَا اللَّهُ بِيُدُّ ظُلْمًا لِّلْعَالَمِينَ“ (اللہ عالمین پر ظلم نہیں کرنا چاہتا)۔

خدا اور ظلم؟ یہ نہیں ہو سکتا

○ ”وَمَا اللَّهُ بِيُدُّ ظُلْمًا لِّلْعَالَمِينَ“

(اور اللہ عالمین پر ظلم نہیں کرنا چاہتا)

اس جملے میں لفظ ”ظُلْمًا“ کمرہ ہے جو کی نفی کے سیاق میں ہے کہ علم الادب کی رو سے جب کمرہ، نفی کے سیاق میں آئے تو استغراق کا فائدہ دیتا ہے..... یعنی اس میں عمومیت پائی جاتی ہے اور تمام افراد و مصداق اس میں شامل ہوتے ہیں.....

اور لفظ ”لِّلْعَالَمِينَ“ جو کہ جمع محلی باللام ہے (یعنی عالمین جو کہ عالم کی جمع کا صیغہ ہے اس پر الف و لام آیا ہے) اور علم الادب میں اس طرح کا صیغہ بھی استغراق و عمومیت کا فائدہ دیتا ہے، لہذا آیت کا معنی یہ ہوگا کہ خداوند عالم کوئی ظلم بھی تمام عالمین، تمام افراد و کائنات کے لئے نہیں چاہتا، (کائنات و موجودات ہستی کے کسی بھی فرد پر ظلم کرنا نہیں چاہتا) اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ لوگوں کے درمیان تفرقہ اندازی ایسا کام ہے جس کا محسوس اثر تمام عالمین اور تمام افراد بشر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

## سب کچھ اللہ کا ہے

”وَلِلّٰهِ صَافِي السَّمٰوٰتِ وَصَافِي الْاَرْضِ وَ اِلٰى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْسُ“

(اور اللہ کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور اللہ کی طرف تمام امور کی بازگشت ہے)

اس سے پہلے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ وہ کسی پر ظلم کرنا نہیں چاہتا، تو اس کے بعد اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے اس حوالہ سے پیدا ہونے والے ممکنہ منفی خیالات اور ظلم کرنے کے خدشات کو رد کرنے کے لئے یوں فرمایا کہ وہ ہی موجودات عالم کی ہر چیز کا ہر حوالہ سے مالک ہے، تو اسے اختیار ہے کہ وہ ان کے بارے میں جو اور جس طرح چاہے فیصلہ کرے، لہذا اس کی بابت یہ تصور ہی نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی غیر مملوکہ اشیاء کے بارے میں کوئی فیصلہ کرے کہ جسے ظلم و زیادتی قرار دیا جائے۔ اور ویسے بھی جو شخص ظلم کرنا چاہتا ہے وہ اس وقت ایسا کرتا ہے جب اس کا کوئی مقصد کسی غیر مملوکہ چیز پر ظلم و زیادتی کرنے کے علاوہ حاصل نہ ہوتا ہو اور اس کے علاوہ اس کی ضرورت پوری نہ ہوتی ہو، جبکہ خدا تو غنی و بے نیاز ہے اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اسی کا ہے۔

یہ مطالب بعض مفسرین نے زیر نظر آیت مبارکہ کی تفسیر میں پیش کئے ہیں، لیکن یہ ظاہر الّا یہ سے مطابقت نہیں رکھتے، کیونکہ ان میں خداوند عالم کے غنی و بے نیاز ہونے کو اصل و اساس قرار دیا گیا ہے یعنی وہ کسی پر ظلم اس لئے نہیں کرتا کہ وہ ہر ایک سے بے نیاز ہے، کسی کا محتاج نہیں اور نہ ہی اسے کوئی ایسی ضرورت لاحق و درپیش ہوتی ہے جس کو پورا کرنے کے لئے وہ اپنی غیر مملوکہ چیز یا شخص پر ظلم و زیادتی کرے، جبکہ آیت مبارکہ میں خدا کے غنی و بے نیاز ہونے کی بجائے اس کی مالکیت مذکور ہے، بہر حال اس کا ہر شے کا مالک ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالم نہیں۔

اس کے علاوہ ایک دلیل یہ بھی ہے کہ تمام امور خواہ کچھ بھی ہوں ان کی بازگشت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، خدا کے علاوہ کوئی چیز کسی کے دست قدرت و اختیار میں نہیں کہ جسے خدا اس کے ہاتھ سے چھین لے اور اسے اپنے ہاتھ میں لے کر اس کے بارے میں خود جو چاہے انجام دے کہ اس صورت میں اسے ظلم و زیادتی کہا جائے، چنانچہ اسی دلیل کی طرف جملہ ”والیہ ترجع الامور“ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

یہ دونوں دلیلیں جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں اور ایک دوسرے کی لازم و ملزوم ہیں، ان میں سے پہلی دلیل اس بات پر مبنی ہے کہ ہر چیز خدا کے لئے ہے، اس کی ملکیت ہے، اور دوسری اس بات پر مبنی ہے کہ کوئی چیز غیر خدا کی ملکیت نہیں۔

## بہترین امت کا اعزاز

○ ”كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ“  
(تم بہترین امت ہو کہ جسے لوگوں کے لئے لایا گیا ہے)

یہاں امت کا لوگوں کے لئے لایا۔ نکالا جانا۔ ذکر کیا گیا ہے جس کا معنی (واللہ اعلم) یہ ہے کہ اسے ان کے لئے ظاہر کیا گیا ہے۔

آیت میں جملہ ”أُخْرِجَتْ“ ذکر ہوا ہے، ”اخراج“ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حدود اور خلق کے جانے کا لطیف اشارہ پایا جاتا ہے یعنی خداوند عالم یہ بتانا چاہتا ہے کہ اس امت کو میں نے خلق کیا اور جو عطا کیا، چنانچہ اس کا ثبوت درج ذیل آیت مبارکہ میں پایا جاتا ہے:

سورۃ اعلیٰ، آیت: ۳

○ ”الَّذِينَ أَخْرَجَ الْمَوْجِي“  
(وہ کہ جس نے گھاس کو نکالا..... یعنی اگایا.....)

اس میں بھی لفظ ”اخراج“ استعمال ہوا ہے۔

زیر نظر آیت میں مؤمنین سے خطاب کیا گیا ہے جو کہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں لفظ ”الناس“ سے مراد عام افراد بشر ہیں، اور جیسا کہ کہا گیا ہے فعل ”كُنْتُمْ“ یہاں وقت اور زمانہ کی قید سے خالی ہے، اور لفظ ”امت“ کسی ہدف و غرض اور مقصد کے حامل گروہ اور فرد، دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

یہاں ایمان باللہ کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بعد ذکر کیا گیا ہے جو کہ جزء کے بعد کل اور فرع کے بعد اصل کا ذکر کرنے کے طور پر ہے۔

بتا برائیں آیت مبارکہ کا معنی یہ ہے کہ تم اے اہل اسلام (گروہ مسلمانان) بہترین امت ہو کہ جسے اللہ نے لوگوں کے لئے اور ان کی ہدایت کی غرض سے ظاہر کیا، کیونکہ تم سب اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور میرے عائد کردہ فریضے یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ادا کرتے ہو، تو امت مسلمہ کا تمام لوگوں پر امتیازی حیثیت و اعزاز کا حامل قرار دیا جانا امت کے بعض افراد کے حقیقتہً ایمان اور صحیح معنی میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے عملی اقدامات اٹھانے کی بنیاد و حولہ سے ہے۔



یہ ہے مفسرین کرام کے ان بیانات کا خلاصہ جو انہوں نے زیر نظر آیت کے حوالہ سے پیش کئے ہیں۔  
 اور بظاہر (واللہ اعلم) آیت سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ”کُنْتُمْ“ وقت و زمانہ سے خالی ”ہونے“ کا معنی دیتا ہے، اور  
 آیت مبارکہ میں صدر اسلام کے مؤمنین یعنی مہاجرین و انصاری کی تعریف کی گئی ہے کہ وہ دوسروں پر ایمان لانے کے حوالہ  
 سے سبقت رکھتے ہیں۔

اور یہاں ”ایمان“ سے مراد، اس خدائی دعوت پر لبیک کہنا اور ایمان لانا ہے جس میں خداوند عالم نے لوگوں کو  
 اعتصام بحبل اللہ (اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنا) اور کفر کے مقابلے میں عدم تفرقہ کا حکم دیا ہے کہ جس کا ثبوت ماقبل  
 جملہ ”اَكْفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ.....“ میں موجود ہے؟ اور اہل کتاب کے ایمان سے مراد بھی یہی ہے، نتیجتاً آیت  
 مبارکہ کی بازگشت اس معنی کی طرف ہوگی کہ اے امت مسلمہ کے افراد! تم اپنے وجود میں آنے اور لوگوں کے سامنے جلوہ گر  
 ہونے کی ابتداء ہی سے بہترین امت تھے کیونکہ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے اور کرتے ہو اور تم اللہ کی رسی کو  
 مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے اور تھامے ہوئے ہو اور تم یک جان و یک دل ہو کر یہ سب کچھ کرتے تھے اور کرتے ہو، گویا تم  
 سب ایک ہو، اگر اہل کتاب بھی تمہاری طرح یہ سب کرتے تو ان کے لئے بہتر تھا مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ آپس میں  
 اختلاف کیا اور ان میں سے کچھ لوگ مؤمن ہوئے اور اکثر فاسق ہو گئے۔ قارئین کرام! آپ ملاحظہ کریں کہ آیات مبارکہ  
 میں کئی التفاتی موارد پائے جاتے ہیں یعنی ان میں خطاب کا انداز تبدیل کیا گیا ہے، غائب سے مخاطب، مخاطب جمع سے  
 مخاطب مفرد اور بالعکس یعنی مخاطب مفرد سے مخاطب جمع کا انداز اختیار کیا گیا ہے، اسی طرح بعض مقامات پر اسم ظاہر کو ضمیر کی  
 جگہ لایا گیا ہے، اور کئی مقامات پر ضمیر کی بجائے لفظ جلالہ (اللہ) کو بار بار ذکر کیا گیا ہے، تو ان تمام تبدیلیوں کی وجوہات اور  
 اصل راز سے آیات کے معانی میں غور و فکر کرنے والے حضرات بخوبی آگاہ ہو سکتے ہیں۔

سبیل سکس  
 جیسا بلینڈ آر پینڈ ٹیر ۰۰۰

## روایات پر ایک نظر

### حقیقی تقوائے الہی

کتاب معانی الاخبار اور تفسیر العیاشی میں ابوبصیر سے مروی ہے انہوں نے کہا: میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیت مبارکہ ”اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ“ کی تفسیر پوچھی کہ اس میں حقیقی تقوائے الہی سے کیا مراد ہے؟ تو امام نے ارشاد فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور نافرمانی نہ کی جائے، اسے یاد رکھا جائے، بھلایا نہ جائے، اور اس کا شکر ادا کیا جائے کفران نہ کیا جائے،

(عن ابی بصیر قال: سألت ابا عبد الله عليه السلام عن قول الله عز وجل ”اتقوا الله حق تقاته“، قال: يطاع فلا يعصى، ويذكر فلا ينسى، ويشكر فلا يكفر“  
(معانی الاخبار صفحہ ۲۴۰، تفسیر العیاشی ج ۱ ص ۱۹۴ ح ۱۲۰)

### سبیل سکینہ

سیدہ زہد لطف آباد، پبلسٹ نمبر ۸-۵۱

### ایک حدیث نبویؐ

تفسیر ”درمنثور“ میں ہے کہ حاکم اور ابن مردویہ نے ایک حوالہ سے ابن مسعود کی روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے

کہا:

”قال رسول الله (ص): اتقوا الله حق تقاته ان يطاع فلا يعصى، ويذكر فلا ينسى،  
حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: تقوائے الہی اختیار کرو جیسا کہ تقویٰ اختیار کرنے کا حق ہے اور وہ اس طرح  
اس کی اطاعت کی جائے نافرمانی نہ کی جائے اور اس کو یاد رکھا جائے بھلایا نہ جائے۔

(تفسیر ”درمنثور“ جلد ۲ ص ۵۹)

## دوسری حدیث نبویؐ

کتاب ”درمنثور“ میں ہے کہ خطیب نے انس سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا:  
 ” قال رسول اللہ (ص): لا يتقى الله عبد حق تقاته حتى يعلم ان ما اصابه لم يكن  
 ليخطئه، وما اخطاه لم يكن ليصيبه “  
 حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: کوئی بندہ اس وقت تک تقوائے الہی کا پورا پورا حق ادا نہیں کر سکتا جب تک  
 کہ اسے اس بات کا علم (یقین) حاصل نہ ہو کہ اسے جو کچھ ملا ہے وہ اسے ہی ملنا تھا اور اسے اس سے ہرگز محروم نہ ہونا تھا، اور  
 جو اسے نہیں ملا وہ اسے ملنا ہی نہیں تھا اور اسے اس نے پانا ہی نہ تھا،

(تفسیر ”درمنثور“ جلد دوم ص ۶۰)

ہمارے سابقہ بیان میں واضح کیا جا چکا ہے کہ پہلی دو روایتوں سے آیت سے فہم المعنی کی کیفیت کیا ہے، اور جہاں  
 تک تیسری حدیث کا تعلق ہے تو اس میں آیت کی تفسیر تقویٰ کے اصل معنی کی بجائے اس کے لازم المعنی سے کی گئی ہے، اور یہ  
 نہایت واضح امر ہے۔

## حق التقویٰ کا لطیف معنی

تفسیر ”البرہان“ میں شہر ابن آشوب کی سند سے بحوالہ تفسیر کعب، عبدخیر سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا:  
 سألت علي بن ابي طالب عن قوله تعالى: ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ“، میں نے حضرت علیؑ  
 بن ابی طالبؑ سے آیت مبارکہ ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ“ کی تفسیر پوچھی، تو امامؑ نے ارشاد  
 فرمایا: واللہ ما عمل بها غیر بیت رسول اللہ، نحن ذکرناہ فلا ننسأه، ونحن شکرناہ فلن  
 نکفره، ونحن اطعناہ فلم نعصه، فلما نزلت هذه الآية قال الصحابة لا نطيعك ولا نطيق ذلك، فانزل اللہ:  
 فاتقوا اللہ ما استطعتم، قال و کعب ما أطقتم.....، خدا کی قسم، سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھرانہ  
 کے، کسی نے اس آیت پر عمل نہیں کیا، ہم ہی نے ہمیشہ اسے یاد رکھا اسے کبھی فراموش نہیں کیا، ہم ہی نے سدا اس کا شکر ادا کیا،  
 کبھی اس کا کفران نہیں کیا، اور ہم نے ہمیشہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری کی، کبھی اس کی معصیت و نافرمانی نہیں کی، جب یہ

آیت نازل ہوئی تو صحابہ نے کہا: ہم تو اس کی توان نہیں رکھتے، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ”فاتقوا اللہ ما استطعتم“ (پس جتنا کر سکتے ہو تقوایے الہی اختیار کرو)، وکجج نے ”ما استطعتم“ کا معنی یہ کیا: ”ما اطلقتم“ یعنی جتنی تم طاقت رکھتے ہو،

(تفسیر البرہان، ج ۱ ص ۳۰۴ ح ۳)

### تقویٰ بقدر استطاعت

تفسیر العیاشی میں ابوبصیر سے روایت ذکر کی گئی ہے انہوں نے کہا: ”سألت ابا عبد اللہ (علیہ السلام) عن قول اللہ: ”اتقوا اللہ حق تقاہہ“، قال (ع): منسوخة، قلت: وما نسختها؟ قال (ع): قول اللہ ”فاتقوا اللہ ما استطعتم“، میں نے امام ابو عبد اللہ جعفر صادق علیہ السلام سے آیت مبارکہ ”اتقوا اللہ حق تقاہہ“ کا معنی پوچھا، تو امام نے ارشاد فرمایا: وہ منسوخ ہو گئی ہے، میں نے عرض کی: کس آیت نے اسے منسوخ کیا ہے؟ امام نے فرمایا: اس آیت نے: ”فاتقوا اللہ ما استطعتم“ (پس تم تقوایے الہی اختیار کرو جس قدر کر سکتے ہو)،

(تفسیر العیاشی، ج ۱ ص ۱۹۴)

مؤلف: وکجج کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر العیاشی میں اس آیت کے منسوخ ہونے کی جو بات کی گئی ہے اس سے مراد تقویٰ کے مراتب کا بیان ہے، اور جہاں تک نسخ کے اصطلاحی معنی کا تعلق ہے جیسا کہ بعض مفسرین کرام نے یہاں مراد لیا ہے تو وہ ظاہر القرآن سے مطابقت نہیں رکھتا، بلکہ قرآن اسے رد کرتا ہے۔

### اسلام و تسلیم میں یکسانیت

تفسیر مجمع البیان میں مذکور ہے کہ حضرت امام جعفر صادق سے روایت کی گئی ہے آپ نے ”وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ“ کو ”وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ“ (لام پر ہڈہ کے ساتھ) پڑھا۔

(ملاحظہ ہو: تفسیر مجمع البیان ج ۲ ص ۲۸۲)

## اللہ کی رسی

تفسیر ”درمنثور“ میں آیت مبارکہ ”وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا“ کے ضمن میں مذکور ہے کہ ابن ابی شیبہ اور ابن جریر نے ابوسعید خدری سے روایت کی کہ اس آیت کی تفسیر میں حضرت پیغمبر اسلام نے ارشاد فرمایا: ”کتاب اللہ ہو حبل اللہ الممدود من السماء الى الارض“، خدا کی کتاب ہی خدا کی وہ رسی ہے جو آسمان سے زمین تک کھینچی ہوئی ہے۔

(تفسیر ”درمنثور“ ج ۲ ص ۶۰)

## قرآن: وسیلہ ربط باخدا

تفسیر ”درمنثور“ ہی میں ہے کہ ابن ابی شیبہ نے ابی شریح الخزاعی سے روایت کی، انہوں نے کہا: قال رسول اللہ (ص): ان هذا القرآن سبب طرفه بيد الله، وطرفه بايد يكم، فتمسكوا به فانكم لن تزلوا ولن تضلوا بعده ابدأ“

حضرت پیغمبر اسلام نے ارشاد فرمایا: یہ قرآن وسیلہ ربط ہے کہ جس کا ایک سرا خدا کے ہاتھ میں اور دوسرا سرا تمہارے ہاتھوں میں ہے، پس تم اس سے وابستہ ہو جاؤ، کہ اس سے وابستگی کے بعد تم ہرگز فنانہ پاؤ گے اور نہ ہی کبھی گمراہ ہو گے۔

(تفسیر ”درمنثور“، جلد ۲ صفحہ ۶۰)

## امام زین العابدین کا فرمان

کتاب معانی الاخبار میں امام زین العابدین علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے آپ نے ایک حدیث میں ارشاد

فرمایا:

”وحبل الله هو القرآن“

حبل اللہ سے مراد قرآن ہی ہے۔ (معانی الاخبار، ص ۱۳۲، ح ۱۷)

اس مطلب و مضمون پر مشتمل متعدد روایات موجود ہیں جو فریقین شیعہ و سنی کی کتب میں ذکر کی گئی ہیں۔

## آل محمد، حبیل اللہ ہیں

تفسیر العیاشی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:  
 ”ال محمد ہم حبیل اللہ الذی امر بالاعتصام بہ فقال: ”وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا  
 وَلَا تَفَرَّقُوا“

آل محمد ہی حبیل اللہ ہیں کہ جس سے وابستہ ہونے کا حکم دیا گیا ہے چنانچہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: تم سب اللہ  
 کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تفرقہ پیدا نہ کرو۔

تفسیر العیاشی، جلد اول ص ۱۹۴ حدیث (۱۲۲)

اس مطلب پر مشتمل دیگر روایات بھی وارد ہوئی ہیں، اور ہمارے سابقہ بیان میں جو کچھ ذکر ہو چکا ہے اس سے اس  
 مطلب کی تائید ہوئی ہے، اور ابھی مزید روایات بھی ذکر کی جائیں گی جن میں اس مطلب کے تائیدی حوالے موجود ہیں،

## حدیث ثقلین کا حوالہ:

تفسیر ”در منثور“ میں ہے کہ طبرانی نے زید بن ارقم سے روایت کی ہے، انہوں نے کہا:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم: انسی لکم فرط، و انکم واردون علی  
 الحوض، فانظر وا کیف تخلفونی فی الثقلین؟ قیل: وما الثقلان یا رسول اللہ؟ قال (ص):  
 الکبیر کتاب اللہ عزوجل سبب طرفہ بید اللہ، و طرفہ بایدیکم، فتمسکوا بہ لن تزالوا ولن  
 تضلوا، و الا صغر عترتی، و انہما لن یفترقا حتی یردا علی الحوض، و سألت لہما ذلک ربی فلا  
 تقدموہما فتهلکوا، و لا تعلموہما فانہما اعلم منکم،

حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: میں تم سے پہلے جانے والا ہوں اور تم حوض کوثر پر میرے پاس آؤ گے، بس تم  
 خیال رکھنا کہ میرے بعد ثقلین کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو؟ پوچھا گیا: ثقلین (دو گراں قدر چیزوں) سے کیا مراد ہے اے اللہ  
 کے رسول! تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: پہلی بھاری بڑی چیز اللہ کی کتاب ہے کہ جس کا ایک سرا خدا کے ہاتھ میں اور دوسرا  
 تمہارے ہاتھوں میں ہے، بس تم میرے بعد اس سے تمسک اختیار کرنا، اسی سے وابستہ رہنا کہ اس کے نتیجے میں تباہی و گمراہی  
 سے ہمیشہ کے لئے بچ جاؤ گے، اور دوسری چھوٹی بھاری، گراں قدر چیز میری عترت ہے، اور وہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے

جدانہ ہوں گے یہاں تک کہ دونوں میرے پاس حوض کوثر پہنچ جائیں گے، اور میں نے تمہارے لئے ان کے بارے میں اپنے پروردگار سے استدعا کی ہے، پس تم ہرگز ان سے آگے نہ بڑھنا ورنہ تباہ ہو جاؤ گے، اور ہرگز انہیں کچھ تعلیم دینے کا نہ سوچنا کہ وہ دونوں تم سے زیادہ علم رکھتے ہیں،

(تفسیر ”درمنثور“ ج ۲ ص ۶۰)

حدیث ثقلین، ان احادیث متواترہ میں سے ہے جن کے بارے میں فریقین شیعہ و سنی اجماع و اتفاق رائے رکھتے ہیں،..... دونوں کے نزدیک متفق علیہ ہے.....، اور ہم اس سورہ کی تفسیر کی ابتداء میں بیان کر چکے ہیں کہ بعض علمائے حدیث نے اس کے راویوں کی تعداد پینتیس (۳۵) صحابہ کرام تک ذکر کی ہے کہ جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں، اور حدیث شناسوں و راویوں کی کثیر تعداد نے اسے بیان کیا ہے۔

## ۷۲ فرقوں کا تذکرہ

تفسیر ”درمنثور“ میں ہے کہ ابن ماجہ، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اس سے روایت کی ہے انہوں نے کہا:

”قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم: افتقرت بنو اسرائيل على احدى وسبعين فرقة، وان امتى ستفترق على اثنتين وسبعين فرقة، كلهم في النار الواحدة، قالوا: يا رسول الله! ومن هذه الواحدة؟ قال: الجماعة ثم قال (ص): **وَاعْتَصِبُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا**“

حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: بنی اسرائیل ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے اور بہت جلد میری امت بھی بہتر فرقوں میں بٹ جائے گی کہ وہ سب جہنم کی آگ میں جلیں گے سوائے ایک فرقہ کے، اصحاب نے پوچھا: اے اللہ کے سول! وہ ایک فرقہ کون سا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: وہ جماعت ہے، پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: **وَاعْتَصِبُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا** “ تم سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو،

(تفسیر ”درمنثور“ جلد اول صفحہ ۶۰، ۶۱)

یہ روایت بھی شہرہ آفاق روایات میں سے ہے، البتہ شیعہ محدثین نے اسے عبارت میں قدرے فرق کے ساتھ ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو: کتاب خصال (صدوقؒ)، کتاب معانی الاخبار، کتاب احتجاج (طبرسیؒ)، کتاب الامالی، کتاب سلیم بن قیس، تفسیر العیاشی)۔ کتاب خصال میں شیخ صدوقؒ نے اپنے اسناد سے سلمان بن مہران کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے امام جعفر بن محمد علیہما السلام کے حوالہ سے بیان کیا کہ امامؑ نے اپنے آباء گرامی قدر سے حوالہ سے حضرت امیر المؤمنینؑ کا ارشاد

گرمای ذکر کیا کہ انہوں نے فرمایا:

سمعت رسول اللہ (ص) يقول: ان امة موسى افرقت بعدة على احدى وسبعين فرقة، فرقة منها ناجية وسبعون في النار، وافرقت امة عيسى بعدة على اثنين وسبعين فرقة، فرقة منها ناجية واحدى وسبعون في النار، وان امتي ستفترق بعدى على ثلاث وسبعين فرقة، فرقة منها ناجية، واثنان وسبعون في النار،

میں نے حضرت پیغمبر اسلام سے سنا آپ نے ارشاد فرمایا: حضرت موسیٰ کی امت آجانب کے بعد اکہتر فرقوں میں بٹ گئی، ان میں سے ایک فرقہ نجات پانے والا ہے اور باقی ستر (۷۰) جہنم میں جائیں گے، اور حضرت عیسیٰ کی امت، ان کے بعد بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئی، ان میں سے ایک فرقہ نجات پانے والا جبکہ دیگر اکہتر (۷۱) فرقے دوزخ کی آگ میں جلیں گے، اور میری امت میرے بعد بہت جلد بہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی کہ جن میں سے ایک فرقہ نجات پانے والا جبکہ بہتر (۷۲) فرقے دوزخ کی آگ میں جلیں گے،

(کتاب خصال، ص ۵۸۵، ح ۱۱۔ کتاب معانی الاخبار، ص ۳۲۳، ح ۱۷۔ کتاب الاحجاج، ج ۱، ص ۳۹۱۔ کتاب سلیم بن قیس، ص ۲۱۴۔ کتاب تفسیر العیاشی، ج ۱، ص ۳۳۱)

یہ حدیث درج ذیل حدیث کے عین مطابق ہے:

تفسیر ”درمنثور“ میں ہے کہ ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم (انہوں نے اس حدیث کی صحت کا واضح اظہار کیا) نے ابوہریرہ سے روایت کی کہ انہوں نے کہا:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم: افرقت اليهود على احدى وسبعين فرقة، وافرقت النصارى على اثنين وسبعين فرقة، وتفترق امتي على ثلاث وسبعين فرقة “  
حضرت رسول خدا نے ارشاد فرمایا: یہودی اکہتر (۷۱) فرقوں میں بٹ گئے، عیسائی بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت بہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی،

(تفسیر ”درمنثور“ جلد ۲ ص ۶۲)

## بنی اسرائیل سے ممالک و تقابیل

تفسیر ”درمنثور“ میں ہے کہ حاکم نے عبد اللہ بن عمر کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا:



”قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم: يأتي على امتي ما أتى على بني اسرائيل حذو النعل بالنعل حتى لو كان فيهم من نكح امه علانية كان في امتي مثله، ان بني اسرائيل افترقوا على احدى و سبعين ملة، وتفرق امتي على ثلاث و سبعين ملة، كلها في النار الا ملة واحدة، فقل لئ: ما الواحدة؟ قال (ص): ما انا عليه اليوم واصحابي،“

حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: میری امت کا حال بھی بچینہ بنی اسرائیل جیسا ہوگا، یہاں تک کہ اگر بنی اسرائیل میں کوئی ایسا شخص آیا ہو جس نے اپنی ماں کے ساتھ بد فعلی کی ہو تو میری امت میں بھی ایسی شخص ہوگا، بنی اسرائیل اکہتر (۷۱) گروہ بنے اور میری امت تہتر (۷۳) گروہوں میں بٹ جائے گی، وہ سب جہنم میں جائیں گے سوائے ایک گروہ کے! پوچھا گیا کہ وہ ایک گروہ کون سا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: اسی نظریہ کے حامل جو آج میرا اور میرے اصحاب کا ہے۔ (تفسیر درمنثور ج ۲ ص ۶۲)

اس حدیث کے مانند کتاب جامع الاصول میں ترمذی کے حوالہ سے ابن عمرو بن عاص کی روایت مذکور ہے جس میں یہی حدیث نبویؐ بیان کی گئی ہے، (ملاحظہ ہو: جامع الاصول، ج ۱۰، ص ۴۰۸)

## امام جعفر صادقؑ کی روایت

کتاب کمال الدین و تمام النعمہ میں مؤلف نے اپنے اسناد سے غیاث بن ابراہیم کی روایت ذکر کی ہے، انہوں نے کہا کہ حضرت امام جعفر صادقؑ علیہ السلام نے اپنے آباء کے حوالہ سے بیان فرمایا:

”قال رسول الله (ص): كل ما في الامم السالفة فانه يكون في هذه الامة مثله حذو النعل بالنعل والقذة بالقذة“

حضرت رسول خداؐ نے ارشاد فرمایا: جو کچھ سابقہ امتوں میں تھا اسی جیسا اس امت میں بھی ہوگا، صدر صدر اور مطابق النعل بالنعل!

(کمال الدین و تمام النعمہ، ص ۵۷۶)

## امت کی خیانت

تفسیر تہی میں حضرت رسول خداؐ سے روایت ذکر کی گئی ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

” لتركبن سنة من كان قبلكم حذوا النعل بالنعل، والقذة بالقذة، لا تخطون طريقهم ولا يخطى، شبر بشبر، وذراع بذراع، وباع بباع، حتى ان لو كان من قبلكم دخل حجر ضب لدخلتموه، قالوا: اليهود والنصارى تعنى يا رسول الله (ص)؟ قال (ص): فما اعنى؟ لتقضون من دينكم الامانة و آخره الصلاة“

تم اپنے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کے طرز عمل کو صد در صد اپناؤ گے اور تم ان کی روش سے ذرہ بھر فرق نہ کرو گے بلکہ ان کے مطابق اس طرح عمل کرو گے کہ تمہارے اور ان کے اعمال میں بالشت با بالشت، بازو بازو اور باع با باع جیسی ہم رنگی کی صورت ہوگی (یعنی ایک جیسے اعمال ہوں گے)،..... وجب کا معنی بالشت، ذراع کا معنی کہنی سے انگلیوں کے سروں تک کا فاصلہ اور باع کا معنی انگلیوں کے سروں اور کلائیوں کے درمیان کا وہ فاصلہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنے ہاتھوں کو دائیں اور بائیں دونوں طرف کو کھولتا ہے تو اس کے درمیانی خلا کو باع کہتے ہیں..... یہاں تک کہ اگر تمہارے پیشرو لوگوں میں سے کوئی شخص گوہ کے بل میں بھی داخل ہوا ہو تو تم بھی اس میں داخل ہو گے، صحابہ نے کہا: کیا آپ کی مراد یہود و نصاریٰ ہے اے اللہ کے رسول! آنحضرتؐ نے فرمایا: تو میں اور کسے مراد لے رہا ہوں، تم اسلام کی رسی کو کٹڑے کٹڑے کر کے چٹا چم سب سے پہلے اپنے دین کے دستور کی خلاف ورزی کرتے ہوئے امانتوں میں خیانت کرو گے اور پھر نوبت نماز ترک کرنے تک پہنچ جائے گی،

(تفسیر فی، جلد ۲ ص ۲۱۳)

## بنی اسرائیل سے مماثلت کی آخری حد

کتاب جامع الاصول میں صحاح کے حوالہ سے ماخوذ اور صحیح ترمذی کے حوالہ سے حضرت پیغمبر اسلامؐ کا ارشاد گرامی مروی ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

” والذی نفسی بیدہ لتركبن سنن من كان قبلکم حذوا النعل بالنعل والقذة بالقذة حتی ان كان فيهم من اتى امه يكون فيكم، فلا ادري اتعبدون العجل أم لا؟“

مجھے تم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھوں میں میری جان ہے تم اپنے پیشرو لوگوں کے طرز عمل کو سونی صدا اور کامل برابری کے ساتھ اپناؤ گے (جو کچھ انہوں نے کیا تم بھی بعینہ اسی طرح کرو گے)، یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی شخص اپنی ماں سے بد فعلی کا مرتکب ہوا ہوگا تو تم میں بھی اس جیسا شخص پیدا ہوگا، اب یہ مجھے معلوم نہیں کہ آیا تم بھی مچھڑے کی پوجا کرو گے یا نہ کرو گے؟

یہ بھی مشہور روایات میں سے ایک ہے اور اسے اہل سنت نے صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث میں ذکر کیا ہے، اور شیعہ محدثین نے بھی اپنی جوامع میں ذکر کیا ہے۔

## انس بن مالک کی روایت

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں انس بن مالک کی روایت ذکر کی گئی ہے جس میں انہوں نے کہا:

”ان رسول اللہ (ص) قال: لیردن علی الحوض رجال ممن صاحبنی حتی اذا رفعوا

اختلجوا دونی، فلا قولن: ای رب أصحابی فلیقالن: انک لا تدری ما أحدثوا بعدک“

حضرت پیغمبر اسلام نے ارشاد فرمایا: میرے صحابہ میں ہی سے کچھ لوگ حوض کوثر پر میرے پاس آئیں گے، جوں ہی وہ نزدیک آئیں گے تو انہیں پکڑ کر مجھ سے دور لے جایا جائے گا، اس وقت میں پکاروں گا: میرے پروردگارا! یہ میرے صحابہ ہیں، تو فوراً جواب آئے گا: کیا تمہیں معلوم نہیں کہ انہوں نے تیرے بعد کیا کارستانیاں کی ہیں۔

(صحیح بخاری، ج ۸، ص ۱۳۹۔ صحیح مسلم مع شرح نووی، ج ۱۵، ص ۶۴)

## صحابہ کا ارتداد

صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہی میں ابو ہریرہ کی ایک روایت ذکر کی گئی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام نے ارشاد فرمایا:

”یرد علی یوم القیامة رھط من اصحابی ..... او قال من امتی ..... فیحلون عن الحوض

فاقول: یارب اصحابی، فیقول: لا علم لک بما أحدثوا بعدک؟، ارتدوا علی اعقابہم الفھقوری

فیحلون“

قیامت کے دن میرے اصحاب ..... یا فرمایا: میری امت ..... میں سے کچھ لوگ میرے پاس آئیں گے مگر انہیں حوض کوثر سے اٹھا دیا جائے گا، میں کہوں گا: پروردگارا! یہ میرے اصحاب ہیں، خداوند عالم ارشاد فرمائے گا: کیا تمہیں معلوم نہیں کہ انہوں نے تیرے بعد کیا کارستانیاں کیں، یہ لوگ تیرے بعد اپنے پچھلے پاؤں پلٹ گئے (مرتد ہو گئے) تو اب وہ یہاں سے دھکا رہ گئے۔

(صحیح بخاری، ج ۹، ص ۵۸، صحیح مسلم مع شرح نووی، ج ۳، ص ۱۳۶)

یہ روایت بھی مشہور روایات میں سے ایک ہے اور اسے فریقین شیعہ و سنی محدثین نے اپنی صحاح اور جوامع میں ذکر کیا ہے اور اس کے راویوں میں متعدد صحابہ کرام مثلاً ابن مسعود، انس بن مالک، سہل بن سعد، ابو ہریرہ، ابو سعید خدری، عائشہ، ام سلمہ اور اسماء بنت ابی بکر اور دیگر شامل ہیں، اور اسے بعض آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے بھی روایت کیا گیا ہے۔ اس طرح کی روایات اپنی کثرت اور تفنن یعنی گونا گوں اسلوب بیان کے حوالہ سے ان مطالب کی تصدیق کرتی ہیں جو آیات کریمہ کے ظواہر سے استفادہ کر کے ہم نے پیش کئے ہیں، اور آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد امت میں یکے بعد دیگرے رونما ہونے والے واقعات سے ان روایات میں مذکور مطالب کی تصدیق ہوتی ہے۔

## جاہلیت کی موت!

تفسیر ”در منثور“ میں ہے کہ حاکم نے..... کہ جنہوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے..... ابن عمر کے حوالہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا:

”قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم: من خرج من الجماعة قيد شبر فقد خلع ربة الاسلام من عنقه حتى يراجعه، ومن مات وليس عليه امام جماعة فان موتة ميتة جاهلية“  
حضرت رسول خداؐ نے ارشاد فرمایا: جو شخص ایک بالشت بھی جماعت سے باہر نکل جائے گویا اس نے اسلام کا ہارا اپنی گردن سے اتار دیا جب تک کہ دوبارہ جماعت میں واپس نہ آجائے، اور جو شخص اس حال میں مر جائے کہ اس پر کوئی ایسا امام و رہبر نہ ہو جو جماعت کی ہدایت کر رہا ہو تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔

(تفسیر ”در منثور“ جلد ۲ ص ۶۱)

یہ روایت بھی اپنے مطلب و مضمون کے حوالہ سے مشہور روایات میں سے ایک ہے اور فریقین نے آنحضرتؐ سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

”من مات ولم يعرف امام زمانه فقد مات ميتة جاهلية“  
جو شخص مر جائے جبکہ وہ اپنے زمانہ کے امام کو نہ پہچانتا ہو تو گویا وہ جاہلیت کی موت مرا،

ہمیشہ حق پر!

کتاب جامع الاصول میں ترمذی اور سنن ابوداؤد کے حوالہ سے حضرت رسول خداؐ کا فرمان مذکور ہے کہ آپؐ نے

ارشاد فرمایا:

” لا تزال طائفة من امتی علی الحق “  
میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ حق پر ہوگا،

(جامع الاصول، ج ۱۰، ص ۴۱۰، حدیث ۷۴۷۵)

## اہل بدعت و باطل پرست !

”مجمع البیان“ میں آیہ مبارکہ ” اَكْفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ “ کی تفسیر میں حضرت امیر المؤمنینؑ سے منقول ہے  
آپ نے ارشاد فرمایا:

” ہم اهل البدع والاهواء والآراء الباطلة من هذه الامة “  
(..... ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے والوں سے مراد.....) اس امت سے اہل بدعت، نفسانی خواہشوں کے  
پیر و کار اور باطل نظریات والے ہیں،

(مجمع البیان، ج ۲، ص ۳۸۵)

## درمیانی امت !

مجمع البیان اور تفسیر العیاشی میں آیت مبارکہ ” كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ “ کی تفسیر میں ابو عمرو زبیری  
سے مروی ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا:

” الامة التي وجبت لها دعوة ابراهيم وهم الامة التي بعث الله فيها ومنها وليها، وهم  
الامة الوسطى، وهم خير امة اخرجت للناس “،

اس سے مراد وہ امت ہے جس کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا مستجاب ہوئی، اور وہ امت وہ لوگ ہیں جن  
میں اور جن میں سے اور جن کی طرف انبیاء بھیجے گئے، اور وہی لوگ درمیانی امت ہیں اور وہی لوگ بہترین امت ہے جسے  
لوگوں کے لئے بھیجا گیا،

(مجمع البیان، تفسیر سورۃ آل عمران، آیت ۱۱، تفسیر العیاشی، ج ۱، ص ۱۹۵، حدیث ۱۳۰)

## اہل بیتؑ: بہترین امت!

تفسیر ”درمنثور“ میں ہے کہ ابن ابی حاتم نے ابو جعفر امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا: آیت مبارکہ ”لَنْ نُّنْتِمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ“ میں بہترین امت سے اہل بیتؑ نئی مراد ہیں۔  
(تفسیر ”درمنثور“ ج ۲، ص ۶۴)

## پانچ خدائی عطیے و امتیازات

تفسیر ”درمنثور“ میں ہے کہ احمد زحرف بن علی کے حوالہ سے روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا:  
”قال رسول الله (ص): اعطيت مالم يعط احد من الانبياء: نصرت بالرعب، واعطيت مفاتيح الارض، وسميت احمد، وجعل التراب لي طهوراً، وجعلت امتي خيرة الامم“،  
حضرت رسول خداؑ نے ارشاد فرمایا: مجھے وہ کچھ عطا کیا گیا ہے جو کسی نبی کو نہیں دیا گیا:

(۱) رعب و دبدبہ کے ذریعے دشمنوں کے مقابلہ میں میری مدد کی گئی،

(۲) زمین کی کنجیاں مجھے دی گئیں،

(۳) مجھے ”احمد“ کے نام سے موسوم کیا گیا،

(۴) خاک کو میرے لئے پاک کرنے والی قرار دیا گیا،

(۵) میری امت کو بہترین امت قرار دیا گیا،

(تفسیر ”درمنثور“، جلد دوم، صفحہ ۶۴)

## آیات ۱۱۱ تا ۱۲۰

- لَنْ يَضُرُّكُمْ إِلَّا أَدْمَىٰ ۖ وَإِنْ يُقَاتِلُوكُمْ يُؤَلُّوْكُمْ ۖ أَلَا ذُبَارٌ تَتَمَّلُونَ ۚ لَا يُضْرُونَ ﴿۱۱۱﴾
- ضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةَ أَيْنَ مَا تَقَفُوا ۖ أَلَا يَجِبُ مِنَ اللَّهِ وَجِبٌ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءُ وُ  
بِعَصَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةَ ۖ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ  
وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۖ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿۱۱۲﴾
- لَيْسُوا سَوَاءً ۖ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَابِلَةٌ يَتَّبِعُونَ آيَاتِ اللَّهِ أَنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ﴿۱۱۳﴾
- يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ  
فِي الْخَيْرَاتِ ۖ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۱۱۴﴾
- وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوهُ ۖ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ﴿۱۱۵﴾
- إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ  
أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۱۱۶﴾

- مَثَلُ مَا يُنْفِقُونَ فِي هَذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ أَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوا  
 أَنْفُسَهُمْ فَأَهْلَكَتُهُ<sup>ط</sup> وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَكِنْ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۱۱۰﴾
- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا<sup>ط</sup> وَدُومًا  
 عَنْتُمْ<sup>ج</sup> قَدْ بَدَأَ الْبَعْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ<sup>ط</sup> وَمَا تَخْفَى صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ<sup>ط</sup> قَدْ  
 بَيَّنَّا لَكُمْ الْآيَاتِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۱۱۱﴾
- هَآأَنْتُمْ أَوْلَىٰ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ<sup>ج</sup> وَإِذَا الْقُوكُمْ قَالُوا  
 آمَنَّا<sup>ط</sup> وَإِذَا خَلُوا عَصُوا عَلَيْكُمْ أَلَا نَأْمَلُ مِنَ الْعَيْظِ<sup>ط</sup> قُلْ مُؤْتُوا بَعْضِكُمْ<sup>ط</sup> إِنْ أَلَّ اللَّهُ  
 عَلَيْهِمْ<sup>ط</sup> بَدَاتِ الصُّدُورِ ﴿۱۱۲﴾
- إِنْ تَسْسَكُمُ حَسَنَةٌ تَسُومُهُمْ<sup>ط</sup> وَإِنْ تَصِبْكُمُ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا<sup>ط</sup> وَإِنْ تَصِيرُوا وَتَتَّقُوا  
 لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا<sup>ط</sup> إِنْ أَلَّ اللَّهُ بِمَا يَعْبَلُونَ مُحِيطٌ ﴿۱۱۳﴾



## ترجمہ

- ”وہ ہرگز تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے سوائے معمولی اذیت و آزار کے، اور اگر تم سے قتال کریں
- (۱۱۱) ” گے تو وہ تمہارے سامنے پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے، پھر ان کی کوئی مدد نہ کی جائے گی “
- ” ان پر ذلت چھائی رہے گی وہ جہاں بھی ہوں، مگر یہ کہ وہ اللہ کی رسی کو تھام لیں یا یہ کہ انہیں
- لوگوں کا سہارا مل جائے، وہ خدا کے غضب کا شکار رہیں گے اور ان پر بیچارگی چھائی رہے گی،
- کیونکہ وہ خدا کی آیات کا انکار کرنے کے مرتکب ہوئے اور انہوں نے اللہ کے نبیوں کو ناحق
- (۱۱۲) ” قتل کیا، یہ سب ان کی نافرمانی اور زیادتیوں کا نتیجہ ہے “
- ” وہ سب برابر نہیں، اہل کتاب میں سے کچھ افراد ایسے ہیں جو دین پر قائم ہیں، جو راتوں
- (۱۱۳) ” کو آیات الہی کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدہ گزاری میں مصروف رہتے ہیں “
- ” وہ خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے
- (۱۱۴) ” ہیں، اور نیکیوں میں تندہی و تیزی سے کام لیتے ہیں، اور وہی صالحین میں سے ہیں “
- ” وہ جو بھی نیک کام کریں گے اس کی ناشکری ہرگز نہ ہوگی، اللہ متقی لوگوں سے بخوبی آگاہ ہے “
- (۱۱۵) ” یہ ایک حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا انہیں ان کے اموال اور اولاد اللہ سے ذرہ
- ” بھرے نیاز نہیں کر سکتے، اور وہی جہنمی ہیں کہ وہ ہنیدہ اسی میں رہیں گے “
- (۱۱۶)

- ” وہ اس دنیاوی زندگی میں جو کچھ خرچ کرتے ہیں وہ اس نہایت ٹھنڈی ہوا کی طرح ہے جو ظالموں کی کھیتی پر پڑی تو اسے تباہ کر دیا، خدا نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کے مرتکب ہوئے “
- (۱۱۷)
- ” اے اہل ایمان ! تم اپنوں کے سوا کسی کو اپنا راز دار نہ بناؤ وہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑیں گے، وہ تمہیں صرف دکھی دیکھنا چاہتے ہیں، ان کی دشمنی و عداوت ان کی زبان سے ظاہر ہو چکی ہے اور جو کچھ ان کے دلوں میں ہے وہ اس سے کہیں بڑا ہے، ہم نے تو واضح نشانیاں پیش کر دی ہیں اگر تم عقل سے کام لینے والے بنو“
- (۱۱۸)
- ” ہاں، تم تو ان سے دوستی کرتے ہو مگر وہ تم سے دوستی نہیں کرتے حالانکہ تم تمام کی تمام کتاب پر ایمان رکھتے ہو، (ان کی حالت یہ ہے کہ جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اور جب اکیلے ہوتے ہیں تو غصہ میں انگلیاں کاٹتے ہیں، ان سے کہیں کہ تم اپنے حصہ ہی میں مر جاؤ، یقیناً خدا تمہارے دلوں کی باتوں سے بخوبی آگاہ ہے“
- (۱۱۹)
- ” اگر تمہیں کوئی نیکی واچھائی ملے تو انہیں دکھ پہنچتا ہے اور اگر تمہیں کوئی تکلیف ہو تو اس سے وہ خوش ہوتے ہیں، اگر تم صبر سے کام لو اور تقویٰ اختیار کرو تو ان کی کوئی چال تمہیں ذرہ بھر نقصان نہیں پہنچا سکتی، بے شک خدا ان کے اعمال پر حاوی ہے “
- (۱۲۰)

## تفسیر و بیان

یہ آیات مبارکہ..... جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں..... اسی غرض و مقصد کو بیان کر رہی ہیں جو ان سے ما قبل آیات میں مورد توجہ قرار پا چکا ہے کہ جس میں اہل کتاب بالخصوص یہودیوں کے بارے میں بیان کیا گیا کہ وہ آیات الہی کا انکار کرتے ہیں، اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں، اور مومنین کو اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں، بنا براین سابقہ دس آیات ”بات سے بات نکلتی ہے“ کے طور پر ہیں لہذا زیر بحث آیات مبارکہ کا ان سے اتصال و ربط اسی طرح باقی ہے۔

### اذیت و آزار!

○ ”لَنْ يَصُرُّوْكُمْ اِلَّا اَذًى.....“

(وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے سوائے اذیت و آزار کے.....)

لفظ ”اَذًى“..... جیسا کہ راغب نے مفردات القرآن میں لکھا ہے..... کا معنی ہر وہ تکلیف ہے جو کسی جاندار کو پہنچے۔ خواہ اس کی جان کو ہو یا جسم کو ہو یا دنیاوی یا اخروی نتائج و آثار کے حوالہ سے ہو!

### ذلت و عزت!

○ ”صُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذَّلٰلَةُ اَيْنَ مَا شَفَقُوْا اِلَّا بِحَبْلِ مِنَ اللّٰهِ وَحَبْلِ مِنَ النَّاسِ“

(ان پر ذلت ڈال دی گئی وہ جہاں بھی ہوں سوائے اس کے کہ وہ اللہ کی رسی کو تھام لیں اور لوگوں کے ساتھ مل جائیں)

لفظ ”ذلت“ اپنے معنی کی حامل نوع کے لئے بنایا گیا ہے۔

اور لفظ ”ذَلَّ“ (ذال پر ضمہ کے ساتھ) ذلت کی اس حالت و کیفیت کو کہتے ہیں جو قہر و غلبہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اور ذال کے نیچے ذیر کے ساتھ ”ذَلَّ“ اس ذلت کو کہتے ہیں جس کا سبب تعصب اور تکبر ہو..... یہ معانی راغب نے مفردات القرآن میں لکھے ہیں.....، البتہ اس کا عمومی و جامع معنی کہ جو ”ذَلَّ“ (ذال پر پیش کے ساتھ) اور ”ذَلَّ“ (ذال کے نیچے ذیر کے ساتھ) اور اس کے دیگر مشتقات میں پایا جاتا ہے اور قابل تطبیق ہے وہ مقابل کے سامنے انکساری و مطاوعت اور رام ہو جانا ہے، اس کے مقابل میں لفظ ”عزَّ“ ہے کہ جس کا معنی مد مقابل یا کسی کے سامنے عجز و انکساری اور اس کی مطاوعت نہ کرنا ہے۔

جملہ ”ثَقِفُوا“ کا معنی یہ ہے کہ وہ جہاں بھی پائے جائیں..... جس مقام پر ہوں.....،

لفظ ”حَبِل“ اس سبب کو کہتے ہیں جس کو تمام کر بچاؤ کا اقدام کیا جاتا ہے۔ اس لفظ کو استعارہ کے طور پر ہر اس چیز کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو امن، بچاؤ اور حفاظت کا سبب ہو جیسے عہد کرنا، ذمہ میں لے لینا اور امان و پناہ دینا بھی اسی معنی میں آتے ہیں..... اور انہیں بھی حبل سے تعبیر کیا جاتا ہے.....، یہاں آیت مبارکہ میں مراد یہ ہے (واللہ اعلم) کہ ذلت ان کی تقدیر میں لکھی جا چکی ہے اور اس طرح ان کی لوح حیات پر ثبت ہو چکی ہے جیسے کسی دھات پر مہر ثبت ہو جاتی ہے یا جیسے خیمہ انسان کے سر پر نصب ہوتا ہے، اسی طرح ذلت ان کے لئے لکھی جا چکی ہے یا اس پر مسلط ہو چکی ہے اور اس سے نجات صرف اسی صورت میں مل سکتی ہے کہ وہ اللہ کی رسی کو تمام لیں اور اس کے ذریعے خدائی توفیق و عنایت سے بہرہ مند ہو جائیں، اور انسانیت کی مضبوط رسی سے وابستہ ہو جائیں۔

یہاں آیت مبارکہ میں لفظ ”حَبِل“ دو بار ذکر ہوا ہے (بِحَبْلِ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلِ مِنَ النَّاسِ) اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں اضافتوں میں اس کا معنی مختلف ہے یعنی جب حبل من اللہ کہا جائے تو اس کا معنی وہ نہیں ہوگا جو حبل من الناس میں ہے، بلکہ خدا کی طرف اضافت میں اس کا معنی قضاء و قدر اور کونینی یا تشریحی حکم و فیصلہ ہے اور لوگوں کی طرف نسبت و اضافت میں اس کا معنی عملی یکجہتی ہے۔

اور ”صَدِيتْ عَلَيْهِمُ الذَّلَّةُ“ (ذلت ان پر ڈال دی گئی) سے مراد تشریحی طور پر ان کا ذلت سے دوچار کیا جانا ہے۔ چنانچہ اس کا ثبوت جملہ ”أَيِّنَ مَا تَثَقَّفُوا“ میں موجود ہے کیونکہ بظاہر اس کا معنی یہ ہے کہ مؤمنین جہاں بھی انہیں پائیں یعنی ان پر تسلط و بالادستی حاصل کر لیں، یہ معنی ان کی تشریحی ذلت سے اس لئے موزونیت رکھتا ہے کہ اس کے آثار میں سے ایک ”جزیہ“ ہے،..... یعنی جب مؤمنین ان پر غلبہ پالیں اور انہیں قبضہ میں لے لیں تو ان سے جزیہ لیں جو کہ خدا کی طرف سے مقررہ سزا کے طور پر ان کی ذلت کی ایک صورت ہے.....،

اس طرح آیت کا معنی یہ ہوگا کہ وہ لوگ شریعت اسلامیہ کی رو سے ذلیل ہیں مگر یہ کہ وہ یا ذمہ اسلام میں آجائیں

یا کسی بھی طرح لوگوں (مسلمانوں) سے امان حاصل کر لیں۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آیت ”ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ“ (ان پر ذلت ڈال دی گئی) شرعی حکم صادر کرنے کے مقام میں نہیں بلکہ خدائی فیصلہ اور قضاء و قدر سے آگاہ کرنے کی صورت میں ہے کیونکہ ظہور اسلام کے وقت یہودی سخت ذلت سے دوچار تھے کہ وہ مجوسیوں کو جزیہ دیتے تھے اور ان کے بعض گروہ نصاریٰ کی آمریت کا شکار تھے۔

اگرچہ یہ معنی کسی حد تک درست معلوم ہوتا ہے اور شاید اس کی تائید اس کے بعد آیت کے آخر تک کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے کیونکہ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہودیوں کی ذلت و بیچارگی کا سبب ان کا اپنا کیا دھرا ہے اور وہ یہ کہ وہ آیات الہی کا انکار کرتے تھے، انبیاء کو قتل کر دیتے تھے اور ہمیشہ دوسروں پر زیادتی کرتے تھے، لیکن اس سے آیت میں اہل کتاب سے صرف یہودی مراد لینے پڑیں گے جبکہ اس طرح کی تخصیص کی بظاہر کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی، بہر حال اس سلسلہ میں عنقریب آیہ مبارکہ ”وَ اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ“ ..... سورۃ مائدہ، آیت ۶۴ ..... کی تفسیر میں مزید مطالب ذکر کئے جائیں گے۔

## غضبِ الہی کی بارش

سبیل سائنس  
حیدرآباد، سندھ، پاکستان

○ ”وَبَاغُوا وَبِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ“  
(اور وہ غضبِ الہی میں گھر گئے اور ان پر رسوائی ڈال دی گئی)

”باؤا“ کا معنی اختیار کرنا، بنا لینا ہے، عربی زبان میں جب یہ کہا جاتا ہے: ”باؤا مہائۃ و مکائنا“ تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک جگہ اپنے لئے اختیار کر لی، اسے اپنا ٹھکانہ بنا لیا، یا یہ کہ ایک جگہ واپس آ گئے۔ لفظ ”مسکنۃ“ شدید ترین فقر و ناداری کو کہتے ہیں، اور بظاہر اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ انسان فقر و ناداری اور محرومی کی اس حد تک پہنچ جائے کہ اس سے چھٹکارے کا راستہ اسے دکھائی نہ دے، اس معنی کی روشنی میں آیت کے صدر اور ذیل میں پائی جانے والی عمدہ موزونیت واضح و ظاہر ہو جائے گی۔

## عصیان اور اعتداء

○ ” ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَاكَانُوا يَعْتَدُونَ ”

(یہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے معصیت و نافرمانی کی اور وہ زیادتیاں کرتے تھے)

اس جملہ کا معنی یہ ہے کہ ان پر ذلت و سکت اس لئے ڈال دی گئی کہ وہ عصیان و ترک اطاعت کے مرتکب ہوئے جبکہ وہ اس سے پہلے زیادتیوں پر زیادتیاں کرتے چلے آ رہے تھے۔

تمام اہل کتاب برابر نہیں

نہن سلینٹہ مکتبہ  
حیدرآباد، سندھ، پاکستان

○ ” لَيْسُوا سَوَاءً..... (۳) مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ”

لفظ ”سَوَاءً“ (برابر) مصدر ہے اور اس سے وصفی معنی مراد لیا گیا ہے، مقصود یہ ہے کہ اہل کتاب سب کے سب اس حوالہ سے ایک جیسے نہیں اور اس وصف و حکم سے سب برابر نہیں، کیونکہ ان میں سے کچھ افراد ایسے بھی ہیں جو آیات الہی کی تلاوت کرتے ہیں، شب و روز عبادت بجالاتے ہیں، خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں، نیکیوں کی انجام دہی میں بڑھ چڑھ کر کام کرتے ہیں،..... الخ، اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ جملہ ”مِنَ اَهْلِ الْكِتٰبِ.....“ ان کے بارے میں خدائی حکم کا سبب بیان کرنے کے مقام میں ہے کہ جس کے ذریعے تمام اہل کتاب کا برابر نہ ہونا بیان کیا گیا ہے۔

آیت مبارکہ میں ”اُمَّةٌ“ کے ساتھ لفظ ”قَابِلَةٌ“ کے مختلف معانی کئے گئے ہیں، بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ خدا کے حکم و فرمان پر قائم و ثابت قدم ہیں، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ عادل ہیں، بعض حضرات نے اس کا معنی اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ صحیح و درست مذہب و ملت والے افراد ہیں، لیکن حق یہ ہے کہ لفظ ”قَابِلَةٌ“ میں اطلاق پایا جاتا ہے اور مذکورہ تمام معانی میں اس کا استعمال کیا جانا ممکن ہے البتہ ”کتاب“ اور ان کے اعمال صالحہ کا ذکر کیا جانا اس کا تعین کر دیتا ہے کہ اس سے ان کا ایمان اور اطاعت پر قائم و ثابت قدم ہونا مراد ہے۔

لفظ ”اَنۡآءٌ“ جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد ”اِنۡی“ ہے۔ (ہمزہ کے نیچے زیر یا زبر کے ساتھ!) بعض حضرات کا کہنا

ہے کہ یہ ”انوَ“ کی جمع ہے کہ جس کا معنی ”وقت“ ہے، اس بناء پر لفظ ”انآء“ کا معنی اوقات ہوگا۔  
 مسارعت کا معنی مبادرت اور جلدی کرنا ہے، یہ ”سرعت“ سے باب مفاعلہ ہے، مجمع البیان میں مؤلف نے کہا ہے  
 کہ ”سرعت“ اور ”عجلت“ میں یہ فرق ہے کہ ”سرعت“ اس کام میں جلدی کرنے کو کہتے ہیں جس میں جلدی کرنا جائز اور روا  
 ہو، اس حوالہ سے وہ پسندیدہ صفت کہلاتی ہے۔ اس کے مقابل میں ”ابطاء“ (کندروی، سستی) ہے جو کہ مذموم صفت ہے۔  
 اور ”عجلت“ اس کام میں جلدی کرنے کو کہتے ہیں جس میں جلدی نہیں کرنی چاہیے، اس حوالہ سے وہ مذموم ونا پسندیدہ  
 صفت کہلاتی ہے اور اس کے مقابل میں ”انسات“ ..... تانی و بے رغبتی ..... ہے جو کہ پسندیدہ صفت ہے، (ملاحظہ ہو: مجمع  
 البیان جلد ۲ ص ۴۸۸)۔

ظاہراً ”سرعت“ اصل میں حرکت کا وصف اور ”عجلت“ متحرک (حرکت کرنے والا) کا وصف ہے، ..... سرعت  
 یعنی تیز رفتاری اور عجلت یعنی تیز رفتاری، البتہ ان کے استعمالی موارد ان کے درمیان پائے جانے والے فرق کو واضح کرتے  
 ہیں.....“

لفظ ”خیرات“ تمام اعمال صالحہ کے لئے استعمال ہوتا ہے خواہ عبادات ہوں، یا مالی انفاق ہو، خواہ عدل ہو اور یا  
 حاجت روائی ہو، سب کو ”خیر“ کہا جاتا ہے۔ یہاں یہ لفظ دو خصوصیات کا حامل ہے، ایک یہ کہ جمع کا صیغہ ہے ”خیرات“ جس کا  
 معنی ہے نیکیاں، اور دوسرا یہ کہ اس پر الف و لام آیا ہے ”الخیرات“ کہ جو استغراق یعنی تمام معانی کا حامل ہے، لہذا تمام نیکیاں  
 و نیک اعمال اس میں شامل ہیں۔ البتہ عام طور پر اسے مالی نیکیوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے لفظ  
 ”خیر“ عام طور پر مال اور مالی موارد میں استعمال ہوتا ہے۔

اس آیت میں خداوند عالم نے اہل کتاب کی تمام اچھی صفات کو ذکر کیا ہے یعنی ایمان، امر بالمعروف و نہی عن  
 المنکر، ہر کار خیر میں جلدی کرنا (نیکیوں میں آگے بڑھنا)، پھر ان کی توصیف میں کہا کہ وہ صالحین میں سے ہیں اور انکی وجہ  
 سے وہ صراط مستقیم والے اور نبیوں، بچوں اور شہیدوں کے ساتھی ہیں، چنانچہ سورۃ الحمد کی آخری آیت میں یوں ارشاد ہوا:  
 ”إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۚ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ“،  
 (ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت فرما، ان لوگوں کا راستہ جنہیں تو نے نعمتیں عطا کیں کہ جن پر تیرا غضب نازل نہیں اور نہ ہی وہ گمراہ  
 ہیں) اور سورۃ نساء، آیت ۶۹ میں یوں ارشاد ہوا: ”فَأُولَٰئِكَ هُمُ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَ  
 الشُّهَدَاءِ وَالصُّلِحِينَ.....“ (وہی ہیں جو ان لوگوں کے ساتھ ہیں جن پر اللہ نے نعمتیں نازل کیں نبیوں میں سے، صدیقین  
 میں سے اور شہیدوں و صالحین میں سے)۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت میں جن کی تعریف کی گئی ہے ان سے عبد اللہ  
 بن سلام اور ان کے ساتھی مراد ہیں۔

## کار خیر کا نیک انجام

○ ” وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوا ”

(اور وہ جو بھی نیک کام کریں اس کی ناقدری ہرگز نہ کی جائے گی)

یہاں ”کفر“ سے مراد ”کفران“ ہے جو شکر کے مقابل میں آتا ہے۔ یعنی خداوند عالم ان کے کار خیر پر ان کا شکریہ ادا کرتا ہے اور ان کے کار خیر کو..... قبول کر کے اس کی برکات..... ان کی طرف لوٹا دیتا ہے کہ اسے ضائع و بے نتیجہ نہیں چھوڑتا، جیسا کہ درج ذیل آیت میں یوں ارشاد فرمایا:

سورۃ بقرہ، آیت: ۱۵۸

○ ” وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ”

(اور جو شخص اپنی پسند سے نیکی کرے تو اللہ شکر گزار اور بہت زیادہ جاننے والا ہے)

سورۃ بقرہ، آیت: ۲۷۲

○ ” وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا نُفْسِكُمْ..... وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ”

(اور تم جو نیکی کرو وہ تمہارے اپنے لئے ہے..... اور تم جو نیک کام کرو..... انفاق کرو..... تو تمہیں پورا پورا دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا)

## کفار خسارے میں ہیں

○ ” إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ..... ”

(جن لوگوں نے کفر اختیار کیا انہیں فائدہ نہ دیں گے۔۔۔)

وحدت سیاق سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن کا تذکرہ یہاں ہوا ہے کہ انہوں نے کفر اختیار کیا (الذین کفروا) ان سے مراد اہل کتاب کا وہ گروہ ہے جنہوں نے نبیؐ کی دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ وہ اسلام کے خلاف



سازشیں کرتے رہے اور انہوں نے اپنے تمام وسائل شیع اسلام گل کرنے میں لگا دیئے اور اس مقصد کے لئے کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس آیت میں اہل کتاب کی بجائے مشرکین ملحوظ ہیں اور یہ واقعہ احد کے تذکرہ کا تمہیدی بیان ہے کہ جس کی بابت بہت جلد اشارہ ہوگا۔

لیکن یہ رائے بعد میں آنے والے جملہ ”وَتَشُومُونَ بِالْكِتَابِ كَلْبًا“ وَإِذْ أَلْفَوْكُمْ قَائِلًا آمِنًا“ (آیت ۱۱۹) کے تناظر میں قرین صحت نظر نہیں آتی، کیونکہ اس میں یہودیوں کے مسلمانوں سے طرز عمل کا ذکر ہے نہ کہ مشرکین کے طرز عمل دروش کا!

اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں تک آیات کا اتصال و پیوستگی اپنے مقام پر باقی ہے اور اس میں کوئی خلل و انقطاع واقع نہیں ہوا۔

بعض مفسرین نے زیر نظر آیت کے بارے میں کہا ہے کہ یہ مشرکین کے طرز عمل کو بیان کرتی ہے جبکہ ”تَشُومُونَ بِالْكِتَابِ.....“ والی آیت یہودیوں کے بارے میں ہے، لیکن یہ نظریہ درست نہیں۔

## دنیاوی زندگی کی مماثلت

○ ”مَثَلُ مَا يُنْفِقُونَ فِي هَذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا.....“

(اس دنیاوی زندگی میں وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں۔۔۔)

اس آیت میں لفظ ”صَر“ ذکر کیا گیا ہے اس کا معنی سخت سردی ہے۔ یہاں اسے تمثیلی صورت میں ذکر کرتے ہوئے دنیاوی زندگی میں انفاق سے اس لئے مقید کیا گیا ہے تاکہ اس بات کا ثبوت دیا جاسکے کہ وہ لوگ (یہودی) اخروی زندگی سے منقطع ہیں اور ان کا انفاق ان کی دنیاوی زندگی کے سوا انہیں کوئی فائدہ نہ دے گا اور ”حَرِث قَوْم“ کو ”ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ“ سے اس لئے مقید کیا گیا ہے تاکہ بعد والے جملہ ”وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ“ سے اس کا ربط بخوبی واضح ہو۔

خلاصہ کلام یہ کہ یہودیوں کا اپنی دنیاوی زندگی میں انفاق اور مال خرچ کرنا اگرچہ ان کی نظر میں ان کی دنیاوی زندگی کی بہتری و رفقاء اور ان کے غلط مقاصد کے حصول کے لئے ہے لیکن وہ اس سے شقاوت و بدبختی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں کر سکیں گے بلکہ وہ جس چیز کو اپنے لئے فائدہ مند اور سعادت بخش سمجھتے ہیں وہ اس ہوا کی طرح ہے جس میں سخت سردی

ہو جو ظالموں کی کھیتی کو تباہ کر دے، اور یہ صرف اس ظلم کی بناء پر ہے جو انہوں نے اپنے اوپر کیا ہے کیونکہ برے عمل کا نتیجہ برا ہی ہوتا ہے۔

## رازداری کا اصول

○ ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِلِطَانَتِهِمْ دُونَكُمْ.....“  
(اے ایمان والو! تم اپنے سوا کسی کو رازدار نہ بناؤ۔۔۔)

اس آیت میں ”ولیحہ“ یعنی رازداری و قریبی رشتہ داری کو ”بِلِطَانَتِهِمْ“ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ جس کا معنی کپڑے کا استر ہے، یعنی وہ کپڑا جو بدن سے بیرونی کپڑے کی نسبت زیادہ نزدیک ہوتا ہے، یہاں اس لئے اس کے ساتھ تشبیہ دے کر بیان کیا گیا ہے کہ استر انسان کے اندر اور جسم کی چھپی ہوئی جگہوں سے زیادہ آگاہ ہوتا ہے، چنانچہ نزدیک ترین شخص کی مثال بطنہ یعنی استر سے دی گئی ہے۔

”لَا يَأْتُونَكُم“ کا معنی یہ ہے کہ تمہارے بارے میں کوئی کسریاقتی نہ چھوڑیں گے۔

”خَبَالًا“ کا معنی شر اور فساد ہے، اسی وجہ سے جنون و دیوانہ پن کو ”خبل“ کہتے ہیں کیونکہ اس میں عقل کی خرابی

ہوتی ہے۔

جملہ ”وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ“ میں حرف ”ما“ مصدر یہ ہے، اس بناء پر اس کا معنی یوں کیا جائے گا: ”ودوا واحبوا

عنتکم و شدہ ضررکم“ وہ تمہاری سخت تکلیف اور شدید نقصان کے خواہاں ہیں۔

جملہ ”فَدَنْبَاتِ الْبَعْضَاءِ مِنْ أَقْوَابِهِمْ“ سے مراد یہ ہے کہ ان کی دشمنی اور عداوت ان کی زبانوں پر آگئی ہے

اور اپنے اندر چھپی ہوئی آگ کو ظاہر کر چکے ہیں کہ ان کا طرزِ سخن ہی تم سے ایسا ہے کہ اب سب کچھ آشکار ہو چکا ہے، تو اس میں

ایک نہایت لطیف استعارہ و کنایہ سے کام لیا گیا ہے، اس میں یہ راز نہیں کھولا گیا کہ ان کے سینوں میں کیا چھپا ہوا ہے بلکہ اسے

پردہ ابہام ہی میں رہنے دیا گیا اور جملہ ”وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ“ (اور جو کچھ ان کے سینوں میں چھپا ہوا ہے وہ بہت

بڑا ہے) کے ذریعے اشارہ کیا گیا ہے کہ ان کے سینوں یعنی دلوں میں چھپی ہوئی بات تنوع اور بہت بڑی ہونے کی وجہ سے

لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتی، چنانچہ لفظ ”اکبر“ اس پوشیدہ راز کے توصیف سے باہر ہونے کا تاکید ہی اشارہ ہے۔

جملہ ”هَاتَتْكُمْ أَوْلَادَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ.....“ میں ظاہر حرف ”أَوْلَادَهُ“ اسم اشارہ ہے اور حرف ”هَاتَ“

تعبیر اور متوجہ کرنے کے لئے ہے، حرف ”ہَا“ اور حرف ”أُولَآءِ“ کے درمیان ”انتم“ ذکر ہوا ہے، لہذا آیت کا معنی اس طرح کیا جائے گا: ”انتم ہولاء“ تم وہی ہو..... تم ہی ہو..... اور یہ اسی طرح ہے جیسے عربی زبان میں کہا جاتا ہے: ”زید ہذا و ہند ہذہ کذا و کذا“ یزید اور یہ ہند، اس طرح ہے اور اس طرح ہے۔

جملہ ”وَتُوْمِنُوْنَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ“ میں کتاب پر الف و لام (الکتاب) جنس کا معنی دیتا ہے، اس بناء پر جملہ کا معنی یہ ہوگا کہ تم تو تمام آسمانی کتابوں پر کہ جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں ایمان رکھتے ہو، خواہ وہ تمہاری کتاب ہے یا ان کی کتاب ہے، جبکہ وہ تمہاری کتاب پر ایمان نہیں رکھتے۔

جملہ ”وَإِذْ التَّقْوَىٰ قَالُوا آمَنَّا“ (اور جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لائے ہیں) میں اہل کتاب کے نفاق کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ منافقانہ طور پر جب تم سے ملتے ہیں تو ایمان کا اظہار کرتے ہیں۔

جملہ ”وَإِذَا خَلَوْا عَصَوْا عَيْتَكُمْ إِلَّا تَأْمِيلًا مِنَ الْعَيْظِ“ (اور جب وہ اکیلے ہوتے ہیں تو غصہ کی وجہ سے اپنی انگلیاں کاٹنے لگتے ہیں) میں ”عص“ کا معنی دانتوں سے سختی کے ساتھ کاٹنا ہے۔

”انامل“، انملہ کی جمع کا صیغہ ہے جس کا معنی انگلی کا سراہ ہے۔  
”غیظ“ کا معنی سخت غصہ و کینہ ہے۔

”عص الانامل“ غصہ اور کینہ کی بناء پر سخت حسرت و افسوس کے اظہار کے موقع پر بولی جانے والی ضرب المثل ہے۔

جملہ ”قُلْ مَوْتُوْا بَعِيْظِكُمْ“ (کہہ دیجئے کہ تم اپنے غصہ و کینہ ہی میں مر جاؤ) دراصل فرمان کی صورت میں ان پر بددعا ہے۔ اسی سے اس کا ربط و اتصال اس سے ملحق جملہ ”إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ“ سے قائم ہو جاتا ہے لہذا اس کا معنی یہ ہوگا: ”اللہم امتہم بغیظہم انک علیم بذات الصدور“ (کہو: اے اللہ! انہیں ان کے کینہ کی وجہ سے موت دے دے، کہ بے شک تو سینوں میں چھپی ہوئی باتوں کو بخوبی جانتا ہے، یعنی جو کچھ دلوں اور سوجوں میں ہے تو اس سے اچھی طرح آگاہی رکھتا ہے۔

جملہ ”إِنْ تَسْتَسْكِمُ حَسَنَةً تَسُوْهُمْ“ (اگر تمہیں کوئی اچھائی..... اچھی چیز و نیکی..... ملے تو انہیں تکلیف ہوتی ہے) میں ”مسائت“..... کہ جو ”تَسُوْهُمْ“ کا مصدر ہے..... کا معنی سرور و خوشی کے مقابل میں آتا ہے یعنی ناخوشی، بہر حال اس آیت میں رہنمائی کی گئی ہے کہ ان کی چالوں سے بچنے اور ان کے دلوں میں چھپے ہوئے کینہ و دشمنی سے محفوظ رہنے کے لئے صبر اور تقویٰ بنیادی شرطیں ہیں یعنی اگر تم ان کے شر سے بچنے کے خواہاں ہو تو صبر اور تقویٰ اختیار کرو۔

الحمد رب العالمین وله الشکر علی نعمة التمام و

توفیق التمام،

وصلی اللہ علی محمد و آلہ الطاہرین،

ترجمہ المیزان جلد ۳

بروز منگل ۱۹ فروری ۲۰۰۸ء تمام ہوا۔

”اللهم تقبل منی باحسن القبول ووفقنی لما فیہ

رضاک یا ولی التوفیق“

العبد حسن رضا غدیری

لندن

سید سلیمان سکینی  
سید ابوالطیب آباد، پتہ نمبر ۸۰۰۹

## ہماری مطبوعات

- زینب زینب ہے** (حضرت زینب بنت علی کی سیرت و تاریخ پر منفرد معلوماتی مستند کتاب)
- علیؑ مولا** (مولانا بیت کے موضوع پر ایمان افروز مجموعہ حقائق، احادیث نبویؐ کی روشنی میں!)
- صحیفہ علیؑ** (مولائے کائنات حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کے ارشادات و فرمودات کی تشریح و تفسیر)
- کتب اہل بیتؑ** (تاریخی حقائق پر مبنی نہایت اہم اسلامی موضوعات کے تجزیاتی تذکرہ کی حامل کتاب)
- صحیفہ پنجتنؑ** (انگریزی) (پنجتن پاک کے چودہ سواتوال زریں پر مشتمل رہنمائے سعادت)
- تحفۃ المؤمنین** (روزمرہ کی دعاؤں اور تعقیبات پر مشتمل مجموعہ بمع ترجمہ اردو و انگریزی)
- ترجمہ البر ان فی تفسیر القرآن** (جلد ۱-۲-۳) (۲۰ جلدوں پر مشتمل دنیائے اسلام کی عظیم علمی تفسیر قرآن)
- اسلامی جہاد اور دہشت گردی** (موضوع کی مناسبت سے قرآنی آیات و تاریخی حوالوں کے استناد سے مزین مجموعہ مقالات)
- تحفۃ الابرار** (تعقیبات نماز اور اہم دعاؤں پر مشتمل مختصر کتاب)
- ولادت امام مہدیؑ** (امام زمانہ کی ولادت کے اثبات پر آیات و روایات اور تاریخی دلائل سے مزین علمی مجموعہ)
- ذکر حسینؑ** (واقعہ کربلا اور قیام امام حسینؑ کے موضوع پر گرانقدر مقالات کا مجموعہ)
- یاد حسینؑ** (علامہ مفتی مزمل حسین مینٹی الغدیریؒ کے قلم سے واقعات کربلا کا اجمالی تذکرہ، قافلہ حسینؑ کی مدینہ سے روانگی سے واقعات شہادت تک!)

ہماری مطبوعات ملک کے اہم شہروں اور کتب خانوں سے دستاب ہیں

الغدیر / اکیڈمی حسینیہ ہال، ہوپ روڈ، لاکھنؤ، لاہور - 54900 (پاکستان)

F:/ADD/ADD BOOKS